معیار و تحقیق

ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ

۲

ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ

مجلسِ ادارت:

تقسیم کار:

صدر دفتر:

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ــــ ۱۱۰۰۲۵

شاخیں:

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، نئی دہلی ــــ ۱۱۰۰۰۶
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی ــــ ۴۰۰۰۰۳
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ــــ ۲۰۰۲

۱۹۹۱ء

قیمت ــــــ دو سو پچاس رُپے (۲۵۰)

ڈاکٹر سلیم الدین احمد نے لبرٹی آرٹ پریس پرو پرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی سے چھپوا کر، ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ سے شائع کیا ــــــ ● ایڈیٹر. عابد رضا بیدار

۱۹۱۷ء کے آخر میں پنڈت جواہر لال نہرو یورپ کے دورے پر گئے اور اشتراکی خیالات کا اثر اپنے ساتھ لائے۔ ۱۹۲۷ء میں کانگریس کا جو اجلاس مدراس میں ہوا اس میں بائیں بازو کا غلبہ تھا۔ چونکہ اس جلسے میں گاندھی جی شریک نہیں ہوئے تھے اس لیے انقلاب پسندوں نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کر دیا اور بائیں بازو کے نوجوانوں کے سربراہ جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس کانگریس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔" ۲۰۹

کانگریس پارٹی میں مارکسی افکار و نظریات کے اثر و نفوذ کا جائزہ لیتے ہوئے کم و بیش ان ہی نتائج تک ہندوستانیات اور اردو کے ایک نابغ نظر اسکالر رالف رسل بھی پہنچے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون "کل ہند ترقی پسند مصنفین میں قیادت کا عمل" میں اسی زمانے کا ذکر کرتے ہوئے واضح لفظوں میں بتایا ہے کہ برطانیہ کے خلاف جد وجہد کے گاندھیائی طریقہ کار کی ناکامی نے لوگوں کو اس مسئلے کے مارکسی حل کی طرف مائل کیا۔ موصوف کا خیال ہے کہ نہرو جی نے اس نقطۂ نظر کو بڑی خوبی سے پیش کیا' موصوف نے اس سلسلے میں سجاد ظہیر کی اس سیاسی اور سماجی حیثیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کی طرف خلیل الرحمٰن اعظمی کی نگاہ نہیں جا سکی۔

"اسی زمانے میں جب کانگریس نے حکمت عملی کے طور پر انقلابی اصلاحات کے پروگرام کو اپنایا' تو کمیونسٹ بشمول سجاد ظہیر' آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رکن بن گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ۱۹۳۷ء میں کانگریس نے انتخابات میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں اور کئی صوبوں میں کانگریسی وزارتیں وجود میں آئیں' برطانیہ کے لوگ عام طور پر یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ رجحان کس شدت سے ہندوستان میں برگ و بار لا رہا ہے" (ص ۵۰)

خلیل الرحمٰن اعظمی کی نگاہ اگر اس نکتے پر ہوتی تو وہ نسبتاً مزید بہتر انداز میں سجاد ظہیر کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے اثر و رسوخ کے پس منظر میں ترقی پسند ادبی تحریک کی مقبولیت اور ترقی کی رفتار کا جائزہ لے سکتے تھے۔ تاہم خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس زمانے کی ادبی صورت حال کے ایسے سیاسی اور سماجی حوالوں کو کہیں نظر انداز نہیں کیا جن کے بغیر ترقی پسند ادبی تحریک کا پس منظر ادھورا رہتا ۔۔۔۔ جہاں تک زیر بحث تحریک کے ان عناصر کی نشاندہی کا سوال ہے جو ادبی میلان کے طور پر اردو شعر و ادب میں انقلاب روس کے بعد سے ہی نمایاں ہو کر سامنے آنے لگے تھے' تو اس سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے سیر حاصل بحث کی ہے' اور دوسرے شعرا کے مقابلے میں اقبال کے کلام میں انقلاب کے واضح اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ "اقبال کی

نظم 'خضرِ راہ' میں نہ صرف یہ کہ پہلی بار سرمایہ دارانہ نظام اور محنت کش طبقے کی کشمکش کو زیرِ بحث لایا گیا ہے بلکہ اس نظم میں کانگریس کے اعتدال پسند رہنماؤں کے برخلاف انقلابی نقطۂ نظر پیش کیا گیا اور ع

"گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند   می نہ دانی اول آں بنیاد را ویراں کنند"

کو مطمحِ نظر بنا کر سرمایہ دارانہ نظام کی حیلہ گیری کو بے نقاب کیا گیا اور مزدور طبقے کو متحد منظم ہونے کا پیغام دیا گیا

ع "اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے   مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے"

ترقی پسند ادبی تحریک سے بہت پہلے اقبال کی شاعری میں ترقی پسند عناصر کی بات اس اعتبار سے اور اہمیت اختیار کر لیتی ہے کہ ہندوستان میں اس تحریک کی سرگرمیوں میں شروع سے اقبال کی سرپرستی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو اس تحریک کے سرگرم کارکنوں اور خود اس تحریک پر مذہب دشمنی کا الزام ابتدا سے ہی عائد نہ ہوا ہوتا اور اس طرح وہ حلقے بھی تحریک کے ساتھ ہوتے جو اس تاثر کی بنا پر ہمیشہ ترقی پسند تحریک سے برگشتہ رہے۔ سجاد ظہیر نے اپنی کتاب "روشنائی" میں علامہ اقبال سے اپنی دیرینہ عقیدت اور ملاقات کا ذکر ضرور کیا ہے مگر پوری ملاقات کے دوران ایک اجنبی مہمان کی موجودگی اور کنور محمد اشرف کی طنز آمیز گفتگو کی وجہ سے اصل مسئلے پر کوئی خاص بات نہ ہو سکی۔ علامہ اقبال نے سجاد ظہیر سے یہ کہا تھا کہ وہ ان سے رابطہ رکھیں، مگر سجاد ظہیر نے دوبارہ ملنے میں دیر کی اور اسی دوران اقبال اس دنیا سے رخصت ہو گئے (ص ۲۰)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے تحقیقی مقالے میں ۱۹۳۶ء کے بعد شائع ہونے والے ان ادبی رسائل اور جرائد کا نہایت عالمانہ جائزہ لیا ہے جن میں ترقی پسند تحریک سے متعلق مباحث اٹھائے گئے اور اس تحریک کی موافقت اور مخالفت میں مضامین شائع کیے گئے۔ موصوف نے مذکورہ ادبی رسالوں میں چھپنے والی تخلیقات کا مطالعہ کر کے یہ اندازہ بھی لگانے کی کوشش کی ہے کہ ترقی پسند تحریک کو کن تخلیق کاروں نے کیا سمجھا اور کس طرح ترقی پسندی کے نام سے دہشت پسندی، نراجیت، اور تخریبی عناصر کے اظہار کا چلن عام ہوا۔ یہی سبب تھا کہ جب ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا اپنا رسالہ "نیا ادب" کے نام سے شائع ہوا تو اس کے پہلے ہی شمارے کے اداریے میں اس رجحان پر سخت تنقید کی گئی۔

ملک کے نئے ادیبوں میں جو اپنے کو ترقی پسند بھی کہتے ہیں، ایک خطرناک رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ ستارۂ تخریب کی پوجا کرتے ہیں۔ ان نئے ادیبوں کی ذہنی بغاوت کی نوعیت بڑی حد تک تخریبی ہے۔ یہ لوگ پرانے سماج کے پیدا کیے ہوئے آرٹ، ادب اور اصول اخلاق کے طلسم کو

آنِ واحد میں توڑ ڈالنے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ انگارے، شعلے، چنگاری،
آگ، شرارے، آتش پارے، انقلاب، انقلابی شرارے، طوفان، خون، باغی اور اسی قسم
کے آتشیں لفظوں کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔" (ص ۵۸)

یہاں شاید یہ بتلانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے کئی سال قبل ۱۹۳۲ء میں چند
نوجوان لکھنے والوں نے اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی 'انگارے' ہی کے نام سے شائع کیا تھا۔ انگارے کے
افسانہ نگار سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر اس وقت تحریک میں سرگرم کارکن کی حیثیت سے شامل تھے۔
انگارے کے افسانوں میں مروجہ اخلاقی اور مذہبی عقائد پر طنز و استہزا کا رنگ غالب تھا ــــ ترقی پسند
مصنفین کی انجمن نے تنظیم کی شکل اختیار کرنے کے بعد اس نوع کی انتہا پسندی سے احتراز کیا اور 'نیا ادب' کے
اداریوں کے ذریعے نئی تحریک کے ساتھ وابستہ ہونے والی افراط و تفریط پر قدغن لگانے اور توازن برقرار رکھنے
کی کوشش جاری رکھی ــــ 'نیا ادب' نے اپنی ادارتی پالیسی میں اس حد تک لچک ضرور رکھی تھی کہ بسا اوقات
اس کے شماروں میں مخالف نقطۂ نظر رکھنے والے مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ نواب جعفر علی خاں اثر کا مضمون
'نیا ادب، کدھر جا رہا ہے'، خود 'نیا ادب' (جنوری فروری ۴۰ء) میں شائع ہوا۔ اس مضمون کا جواب اکتوبر ۱۹۴۰ء
کے شمارے میں سراج مبین کے نام سے شائع ہوا۔ سجاد ظہیر نے اپنی کتاب روشنائی ص ۲۶۴ میں اس بات کا
اعتراف کیا ہے کہ وہ مضمون خود انہوں نے لکھا تھا اور کسی مصلحت کی بنا پر فرضی نام سے شائع کرایا تھا۔
سجاد ظہیر نے اس مضمون میں بہت تفصیل سے جعفر علی خاں اثر کے اس نقطۂ نظر کا جواب دیا ہے کہ اصلاح کے
مقابلے میں انقلاب کی ضرورت کیوں کر ہے؟ ــــ

خلیل الرحمٰن اعظمی نے ترقی پسند تحریک کی مخالفت میں لکھے جانے والے اہم مضامین کا ذکر کرتے
ہوئے رشید احمد صدیقی کے اس مدلل اور مفصل مضمون کا ذکر کیا ہے جو رسالہ آفتاب (علی گڑھ) کے خاص نمبر
میں شائع ہوا اور آج کل اور بعض دوسرے رسائل میں نقل ہو کر ادبی حلقوں میں عرصے تک موضوعِ بحث بنا
رہا ــــ رشید احمد صدیقی کے اس مضمون کی اشاعت سے قبل 'نیا ادب' کا لفظ ترقی پسند ادب کے معنی میں
استعمال کیا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ اس طرح ترقی پسند ادب اور ایسے ادیبوں کے تخلیق کردہ ادب کے درمیان بھی
عموماً کوئی خطِ فاصل نہیں قائم کیا جاتا تھا جن کو ترقی پسند نقاد ہیئت پرست کہہ کر مطعون کرنے لگے تھے۔
اس سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں کہ:

رشید صاحب کے اس مضمون نے ترقی پسند ادب کی تاریخ میں ایک اہم رول ادا کیا ہے کیوں کہ اس کے بعد ترقی پسند نقاد بھی 'نیا ادب' اور ترقی پسند ادب کو علٰحدہ علیحدہ دیکھنے لگے اور جو رجحانات خلط ملط ہو رہے تھے ان کے بارے میں کھل کر لکھنے لگے اور ان سے ترقی پسند عناصر اور غیر ترقی پسند عناصر کی تمیز کرنے لگے" (ص ۴۷)

خلیل الرحمن اعظمی کے اس بیان کی تصدیق پروفیسر احتشام حسین کے اس جوابی مضمون سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے آج کل (دہلی) میں شائع کرایا تھا۔ اس مضمون میں احتشام حسین نے رشید احمد صدیقی کے مقالے کو ترقی پسند تحریک کے منفی اثرات کے بارے میں پہلا سنجیدہ اور اہم مقالہ قرار دیا اور کہا کہ اس مضمون کی تہہ میں خلوص کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی موصوف نے رشید احمد صدیقی سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ :-

زیر نظر مقالے میں ترقی پسند ادب سے متعلق بعض ایسی کمزوریاں یا خرابی منسوب کر دی گئی ہیں جن کا تعلق ترقی پسند ادب سے نہیں ہے۔ اگر اس مقالے کی سرخی ترقی پسند ادب کی جگہ 'نیا ادب' یا جدید ادب' وغیرہ ہوتی تو یہ عرض کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی ——" (ص ۵)

ترقی پسند ادب اور جدید ادب کے درمیان حد فاصل کھینچنے کا ذکر آگیا ہے تو ترقی پسند ادبی تحریک' کے حوالے سے دونوں ادبی رجحانات کے بارے میں مصنف کے زاویہ نظر کی طرف اشارہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی 'ترقی پسند شاعری کے عنوان کے تحت فیض احمد فیض کی شاعری کی فکری اور فنی خوبیوں کا جائزہ نہایت چابکدستی اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ لیتے ہیں' —— جب فیض کے ساتھ ن م راشد کا ذکر آجاتا ہے تو راشد اور فیض کو بجا طور پر جدید شاعری میں ذہن کے عنصر کو داخل کرنے کا ذمہ دار بتاتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ دونوں شعراء میں بنیادی فرق کی نشاندہی اس طرح کرتے ہیں :

فیض اور راشد میں دو حیثیتوں سے نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک تو فیض کا اسلوب ہندوستانی شاعری کے لیے بالکل اجنبی نہیں ہے کیونکہ اس میں قدیم ادب کی بہت سی روایتوں کا زیر و بم سنائی دیتا ہے۔ دوسرے فیض کا نقطۂ نظر اثباتی ہے' اور وہ زندگی کے تلخ اور سنگین حقائق کو انگیز کر کے اس میں ایک صحت مند زاویۂ نظر پیدا کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے راشد کا اسلوب ایک انفرادیت کا اعلان ہے ایسی انفرادیت جس کی محرک ان کی شکست خوردگی اور کلبیت ہے" (ص ۱۲۸)

خلیل الرحمن اعظمی نے آگے چل کر یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ" ابتدائی دور میں بہت کم لوگوں کو دونوں کی شاعری

کے بنیادی فرق کا احساس تھا۔ غالباً اختر انصاری نے ایک ادبی ڈائری، میں پہلی بار تقابلی مطالعہ کیا" ہم خلیل الرحمن اعظمی کی مندرجہ بالا رائے کو بھی اختر انصاری کی ادعائیت کے عکس کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دے سکتے۔ اس لیے کہ اگر اعظمی نے آزادانہ طور پر فیض اور راشد کی شاعری کے مابین یہ فرق محسوس کیا ہوتا تو وہ راشد پر اپنے ایک اہم مضمون ن' م' راشد کا ذہنی ارتقاء (مطبوعہ شعر و حکمت' راشد نمبر) میں راشد کی اس مابہ الامتیاز خصوصیت یا خامی کا ذکر کہیں نہ کہیں ضرور کرتے ـــــ جہاں تک فیض کی شاعری میں قدیم ادب کی روایت کے زیر و بم کا سوال ہے تو راشد کے بارے میں بھی یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ ان کے شعری ڈکشن کا خمیر ہی فارسی روایت سے اٹھا ہے اور فارسی زبان و ادب کو اردو کی شعری روایت میں جو دخل رہا ہے اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ـــــ ترقی پسند شاعری اور جدید شاعری کی بحث کے دوران ہمیں حلقہ ارباب ذوق کے مکتب فکر اور اس مکتب فکر کے تصور شعر کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ رالف رسل نے اپنے مضمون انجمن ترقی پسند مصنفین میں قیادت کا عمل، میں اس نکتے پر نظر رکھی ہے مگر ساتھ ہی ترقی پسند ادیبوں اور حلقہ ارباب ذوق کے بعض ادیبوں کے درمیان اشتراک عمل کی نفسیات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

> کرشن چندر نے دو جلدوں میں مشتمل ترقی پسند ادب کا ایک انتخاب 'نئے زاویے' کے نام سے مرتب کیا تھا اس میں راشد کی نظم 'انتقام' کو جگہ دی تھی ...... یہ وہی راشد ہیں جن سے ترقی پسند شاعر فیض نے اپنے مجموعۂ کلام کے لیے پیش لفظ لکھایا تھا۔ شاید اس خیال سے کہ اس مجموعۂ کلام کو ترقی پسند تو خریدیں گے ہی، مگر ایک جدید شاعر کے دیباچے کی وجہ سے اس بات کا بھی امکان تھا کہ جدید لوگ بھی اس کے خریداروں میں شامل ہو جائیں گے' اسی طرح کرشن چندر نے راشد کے مجموعے ماورا کے لیے پیش لفظ لکھا۔"
>
> رسالہ افکار، جون ۸۳ء علیگڑھ (مدیر ابو الکلام قاسمی)

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، میں یوں تو شعری اور ادبی سرمایے کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف نے ترقی پسند شاعری، افسانہ، ناول، ڈرامہ، طنز و مزاح، رپورتاژ وغیرہ پر الگ الگ اور تفصیل سے بحث کی اور ہر صنف کے نمائندہ قلم کاروں کے فنی اور تحریکی امتیازات کو نہایت غیر جانبداری اور بصیرت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اس ضمن میں ترقی پسند تنقید سے متعلق باب اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے کہ اس باب میں نہ صرف یہ کہ ترقی پسند تنقید کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے بلکہ اس مطالعے کے ذریعے ترقی پسند تصور ادب اور مارکسی جمالیات کے بنیادی مسائل سامنے آتے ہیں۔ ترقی پسند شعری اور ادبی نقطۂ نظر

کے بارے میں اس پایے کے فنی مباحث عزیز احمد کی کتاب ترقی پسند ادب کے علاوہ کہیں اور ڈھونڈھے سے نہیں ملتے ـــــ خلیل الرحمن اعظمی نے ترقی پسند تنقید کو، ترقی پسند ادبی تصورات، ادیب کی انفرادیت، ادیب کی جانبداری ادب ایک آرٹ کار، مواد اور ہئیت کا رشتہ، رمزیت و اشاریت اور ترقی پسند تنقید کے اثرات جیسے ذیلی موضوعات قائم کر کے تنقیدی مباحث کو مختلف خانوں میں تقسیم کر دیا ہے، اور اس طرح مختلف ترقی پسند نقادوں کے مضامین اور کتب سے متعلقہ موضوعات سے متعلق خیالات کی درجہ بندی کر دی ہے ـــــ اپنے تحقیقی مقالے میں اس طریق کار کو اختیار کر کے خلیل الرحمن اعظمی نے اپنی وسعت مطالعہ اور موضوع پر غیر معمولی گرفت کا ثبوت تو فراہم کیا ہی ہے، ساتھ ہی تنقید و تحقیق میں تجزیاتی انداز مطالعہ کے لیے ایک موڈل یا مثالی نمونہ بھی پیش کر دیا ہے۔ اعظمی نے اپنے اس طریق کار کے بارے میں جو احتیاط برتی ہے اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل جملوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

> اس سے پہلے کہ ہم ترقی پسند تحریک کی خصوصیات پر کوئی تبصرہ کریں، ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ اس تنقیدی سرمایے سے مختلف مباحث پر ایسے اقتباسات جمع کیے جائیں جن سے اس تنقید اور خود ترقی پسند تحریک کے فکری خد و خال نمایاں ہو سکیں اور اس کے نشیب و فراز کی ایک تصویر ذہن میں مرتب ہو سکے۔ دوسرے کے خیالات کو اپنے الفاظ میں پیش کرنے یا ان کا خلاصہ بیان کر کے اس پر محاکمہ کرنے میں ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ ہم نے اس میں کسی قسم کی تحریف تو نہیں کی ہے۔
>
> ۱۵ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمن اعظمی (ترقی پسند تنقید کے باب کی تمہید)

خلیل الرحمن اعظمی نے اپنے پورے تحقیقی مقالے میں اپنے اس غیر جانب دارانہ رویّے کا عملی ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس سلسلے میں موصوف نے ضروری مواد کی تلاش و جستجو میں انیسویں اور بیسویں صدی کی سیاسی اور سماجی صورت حال کی اہم تاریخی کتب سے لے کر شعری، افسانوی اور تنقیدی کتب اور رسائل کے ذخیرے سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور اپنی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیت اور بصیرت کا ایک عمدہ نقش چھوڑا ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی کی غیر جانبداری اور معروضیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ترقی پسند ادبی تحریک کے مطالعہ میں یہ معروضی فاصلہ اس وقت برقرار رکھا جبکہ ان کا شمار غالی ترقی پسند ادیبوں میں ہوا کرتا تھا۔

●●

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی
شعبۂ اردو، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

ڈاکٹر سہیل احمد خان کا تھیسس

داستانوں کی علامتی کائنات

داستانوں کی علامتی کائنات، سہیل احمد خاں کا تحقیقی مقالہ ہے۔ عنوان سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ اس مقالہ میں داستانوں کو کسی نئے سیاق و سباق میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہوگی۔ اس کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ آیا داستانوں کے مطالعے کی علامتی جہت کا کوئی جواز کہیں سے فراہم ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ مقالہ نگار نے اپنے پیش لفظ میں اس مفروضہ سوال کی اہمیت کو سمجھا ہے اور اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ تاہم موضوع کی وسعت اور ہمہ گیری کو پیش نظر رکھیے تو مقالے کا غیر معمولی اختصار کئی اور ضمنی سوالات کی گنجائش پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں مقالہ نگار سوائے اس کے کوئی اور وضاحت نہیں کرتا کہ اس نے داستانوں میں پائی جانے والی چند مشترک اقدار کو اپنا موضوع بحث بنایا ہے جن کو تمثیلی یا علامتی انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔ مقالہ نگار کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ اگر تمثیل، علامت اور استعارے کو ان کے اصطلاحی معانی اور منفرد امتیازات کو سامنے رکھ کر ان اصطلاحات کا استعمال کیا جائے تو خلط مبحث کا اندیشہ ہو سکتا ہے، اس لئے انھوں نے بالعموم داستانوں کے رمزیہ پہلو پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ سہیل احمد خاں کے تحقیقی نقطۂ نظر کو ہم کسی نئی حقیقت کے انکشاف سے تو نہیں تعبیر کر سکتے لیکن پرانے حقائق اور معلومات کی نئی تعبیر اور توجیہہ ضرور قرار دے سکتے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں تحقیق کے دائرۂ کار میں نئے حقائق و معلومات کی دریافت کے ساتھ ساتھ پرانی تحریروں کی تفہیم نو اور تعبیر نو کے رجحان کو شامل کر کے تحقیق و تنقید کے فاصلے کو کم کرنے کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، یہ مقالہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مزید برآں یہ کہ تحقیق اور تنقید کے نئے اور مثبت وسائل کو بروئے کار لا کر اردو کے تحقیقی سرمایے میں بعض نئے ابعاد کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ تحقیقی بنیادوں کی استواری کے متوازی پرانے ادبی سرمائے کی تنقیدی قدر قیمت کے تعین کی طرف خاصی توجہ صرف کی گئی ہے اور نسبتاً پرانی تحریروں کی پرکھ کے لئے نئے تنقیدی رویوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ سہیل احمد خاں کے تحقیقی مقالے کو اس اعتبار سے توجہ کے قابل سمجھا جا سکتا ہے کہ

اس میں داستانوں میں بیان کیے گئے واقعات اور واقعات کی جزئیات سے زیادہ ان بنیادی محرکات کو موضوع بحث بنانے کی کوشش کی گئی ہے جو داستانوں کے کردار، واقعات اور بظاہر ازکار رفتہ نظر آنے والی تفصیلات کی تہہ میں، ہر جگہ کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ اردو داستانوں کے پورے سرمایے کو پیش نظر رکھیے تو ان میں مختلف اور متنوع اسالیب بیان اور قصہ گوئی کے نت نئے انداز سے واسطہ پڑتا ہے، مگر جو چیز بیش تر داستانوں میں مشترک اقدار کی حیثیت سے سامنے آتی ہے وہ قدیم طرزِ فکر اور تہذیبی رویہ ہے۔ سہیل احمد خاں اپنے مقالے میں پرانی طرزِ فکر اور تہذیبی رویے کی رمزیت اور معنویت کی تلاش کی تمہید اس طرح باندھتے ہیں،

" اگر اس تصنیف کے حدود کا تعین پہلے سے کر لیا جائے تو بعض غلط فہمیاں رفع ہو سکتی ہیں۔ یہ نہ تو داستانوں کا تاریخی مطالعہ ہے اور نہ عمرانیاتی تجزیہ۔ اس جائزے کا تعلق داستانوں کی فکری سطح سے ہے۔ . . . اگر قصوں کی بنیادی سطح کو کھنگالا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان قصوں کا مجموعی انداز علامتی یا رمزی ہے اور جن عناصر کو ہمارے نقاد داستان کے غیر ضروری عناصر سمجھتے ہیں وہ قصے کی ساخت میں بڑا اہم مقام رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی معنویت کے لیے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ داستانوں کی تمثیلی، استعاراتی یا علامتی سطح بھی ہے۔ اس رمزی سطح تک پہنچنے کے لیے داستانوں کو اور انداز سے دیکھنا ہوگا۔ اس سطح پر داستانیں حکمت اور تربیتِ نفس سے مربوط ہیں"۔ ص ۷

سہیل احمد خاں کے اس زاویۂ نظر کو اس وقت تک بخوبی نہیں سمجھا جا سکتا جب تک ہم اپنے ذہن میں داستانوں کی تحقیق و تنقید کے ان جائزوں کو تازہ نہ کر لیں جو اب تک ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ اردو میں داستانوں کی تفہیم و تعبیر کے سلسلے میں کلیم الدین احمد، گیان چند جین اور وقار عظیم نے باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان مصنفین کی کتابوں کے علاوہ داستانوں پر بالعموم جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے وہ اگر ان کی کتابوں کی بازگشت نہیں تو کم سے کم ان ہی حضرات کے زاویہ ہائے نظر کی توسیع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان بزرگوں نے اردو قصہ گوئی کی تاریخ میں داستانوں کی قدر و قیمت کا تعین اس دور میں کرنے کی کوشش کی جب انہیں قصۂ پارینہ یا ماضی کے بے مصرف سرمایے کی حیثیت دی جاتی تھی۔ داستان کے فن یا مختلف داستانوں پر جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے ان کو مندرجہ ذیل نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) داستانیں انسانی تہذیب کی طفولیت اور نابالغیتِ فکر کا اظہار کرتی ہیں۔

(۲) داستانوں میں توہم پرست ذہن کارفرما دکھائی دیتا ہے۔

(۳) فوق فطری عناصر اور فوق بشری کرداروں کے وسیلے سے فطری قوتوں پر قابو نہ پا سکنے کی تلافی کا رجحان سامنے آتا ہے۔

(۴) رومانی فضا کی تخلیق اور غیر حقیقی واقعات کا سہارا درحقیقت تلخ حقائق سے فرار کی ایک شکل ہے۔

(۵) داستانوں کی خرضی فتوحات قدیم انسانوں کی ناکامیوں اور ناآسودہ حسرتوں کا نعم البدل ہیں۔

(۶) قصہ گوئی فی نفسہٖ زندگی کی مشقتوں اور صعوبتوں کو بھولنے اور گوارہ کرنے کا ایک وسیلہ رہی ہے۔

(۷) داستانوں کی ہیئت، پلاٹ سازی، کردار نگاری اور واقعات کی منطقی ترتیب جیسے فکشن کے فنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔

ان نکات کا لب لباب یہ ہے کہ ہماری داستانیں، معاشرتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ معاشرتی دستاویز انسانی تہذیب و ثقافت سے لے کر قدیم انداز فکر اور عقائد و مسلمات تک کو ہمارے سامنے آئینہ بنا کر پیش کر دیتی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ داستانوں کی ان تعبیرات کا سرچشمہ درحقیقت ہمارا واقعیت پسندانہ نقطۂ نظر رہا ہے۔ اور اب تک بالعموم داستانوں کو فکشن کی فنی پرکھ کے نسبتاً نئے اصولوں کو استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

سہیل احمد خاں اپنے مقالے میں داستانوں کی ان تعبیرات کی اہمیت سے انکار تو نہیں کرتے لیکن جن بنیادوں پر وہ اپنے طرز مطالعہ کی راہیں استوار کرتے ہیں وہ ان تعبیرات سے خاصی مختلف ہیں۔ ہر معاشرہ اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی اقدار سے پہچانا جاتا ہے۔ ہماری داستانیں جس معاشرے اور جس تہذیب کی نمائندگی کرتی ہیں اس تہذیب میں دنیا کو التباس سمجھنے اور کائنات کے تمام حقائق کو کسی مرکزی حقیقت کے محور پر گردش کرتا دیکھنے کی تصور کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جہاں ایک طرف فکشن کے نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ داستانوں اور پریوں کی کہانیوں میں حقیقی زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں کی تلافی کی بھرپور کوشش ملتی ہے، وہیں ہندو تہذیب اور فنون لطیفہ کے مفسر کمار سوامی سے لے کر روایتی تہذیبی تصورات کی تعبیر (مابعد الطبیعیاتی اصولوں کی روشنی میں) کرنے والے مصنفین روایتی تہذیب اور قدیم ثقافت کے تمام وسائلِ اظہار کو قدیم ادوار کے مسلمہ تصورات و اقدار کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سہیل احمد خاں اپنے تحقیقی مقالے میں موخر الذکر انداز تعبیر کو بنیاد بنا کر داستانوں کی علامتی معنویت کا سراغ لگاتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں صرف تین ابواب قائم کرتے ہیں۔ ہیرو، تبدیلیٔ قالب اور طلسم۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیرو کے کردار کی پیش کش کے مختلف رویے داستانوں کی کردار نگاری کے بنیادی محرکات کو بے نقاب کر سکتے ہیں اور اس طرح قالب کی تبدیلی اور طلسم کے معاملات داستان گوئی کے بیش تر بنیادوں کا احاطہ کر لیتے ہیں، لیکن بھوت، پریت، دیو اور عفریت جیسی مخلوقات کو افراد قصہ کے طور پر قبول کرنے کا کوئی جواز فراہم نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں ان معتقدات کی بھی کوئی علامتی تشریح قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتی جو آج اسی طرح ہمارے معاشرے میں جاری و ساری ہیں جس طرح داستانوں کے عہد میں رائج دکھائی دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پرانی داستانوں میں سامنے آنے والے معتقدات کو رمزیہ نقطۂ نظر سے دیکھ کر ان کی

علامتی تشریح کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے تو آج ہم اس نوع کے معتقدات کو حقیقی زندگی کے مظاہر کے طور پر کیسے قبول کر سکتے ہیں؟ اور اگر آج کے جدید عہد میں بھی پرانے انداز کے تصورات اور مابعد الطبیعیاتی معتقدات بعض حلقوں کے لئے قابل قبول ہیں تو ہمیں ان کا حقیقی جواز پرانے عہد میں ڈھونڈنا پڑے گا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ اس تحقیقی مقالے کے ابتدائی حصے میں پہلے ان تمام عناصر کو الگ کر کے دکھایا جاتا جن عناصر کی واقعاتی اور حقیقی حیثیت قدیم وجدید، دونوں ادوار میں یکساں طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ اس میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں کہ قدیم عہد میں حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کا فقدان تھا، سائنسی ترقی نہ ہونے کے سبب توہم پرستی عام تھی، انسانی کمزوریوں کا براہ راست اعتراف نہ کر کے ساری ذمہ داری بعض ناقابل تسخیر قوتوں پر رکھی جاتی تھی اور اپنی نارسائی کے احساس کے نتیجے میں رونما ہونے والے خواب وخیال کو ایک رومانی اور تخیلاتی دنیا کی شکل دے دی جاتی تھی۔ اب رہا سوال یہ کہ پرانے معاشرے میں حیات وکائنات کے بارے میں جو تصورات عام تھے اور ریگتی اور متصوفانہ رجحانات کو انسانی معاشرے میں جو حیثیت حاصل تھی، اس کے پیش نظر داستانوں میں اظہار پانے والے عناصر کی علامتی تشریح وتعبیر کیوں کر ممکن ہے؟۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ قدیم تصورات اور مابعد الطبیعیاتی میلانات کے عمل دخل کی حیثیت کیا تھی؟۔ آیا یہ تصورات اور میلانات محض بعض لوگوں کے طرز فکر کی حیثیت رکھتے تھے یا ان کو پرانی زندگی اور روایتی تہذیب نے اس حد تک اپنے ساتھ خلط ملط کر لیا تھا کہ حقیقت اور مجاز کے درمیان حد فاصل قائم کرنا ممکن ہی نہیں تھا؟۔ اگر موخر الذکر بات تسلیم کر لی جائے تو ہم پر یہ علمی ذمہ داری یقیناً عائد ہوتی ہے کہ ہم قدیم تہذیب کے مظاہر کو صرف سرسری نظر سے نہ دیکھیں اور آج کے حقیقت پسندانہ اور مادیت زدہ معاشرے کے پیمانوں پر قدیم تہذیب کے ہر مظہر کو پرکھنے کی کوشش نہ کریں۔

سہیل احمد خاں نے کم وبیش ان ہی بنیادوں پر داستانوں کے اُن بعض بنیادی عناصر کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جن کا سلسلہ پرانے مسلمات اور بڑی حد تک مابعد الطبیعیاتی رویوں سے جا ملتا ہے۔ اس سلسلے میں موصوف نے جن عناصر کی بطور خاص نشان دہی کی ہے وہ طلسم، تبدیلیٔ قالب اور ہیرو کا تصور ہیں۔ 'طلسم' بیشتر داستانوں میں ایک ایسے مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتا ہے جس کے گرد کردار اور واقعات کا طویل سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں کسی مفروضہ کو پیش نظر رکھ کر داستانوں میں طلسم کی تلاش وجستجو سے زیادہ منطقی اور حقیقی طریقۂ کار یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ کیا کسی داستان میں طلسم کی اصلیت اور ماہیت کے بارے میں کچھ بیان کیا گیا ہے یا نہیں؟۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے عاشق حسین بزم کی "طلسم کن فیکون" غیر مطبوعہ سے اپنی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" میں ایک اقتباس نقل کر کے طلسم کی حقیقت کے بارے میں خود داستان گو کے نقطۂ نظر کو نمایاں کیا ہے۔ "طلسم کن فیکون" کی عبارت ہے کہ:-

"دنیا بھی ایک طلسم ہے اور بانی اس طلسمِ عالم کا حکیمِ مطلق یعنی پروردگار ہے۔ اور چونکہ طلسم کے واسطے شکست ہونا اس کا ایک خاص وقت میں ضروری ہے۔ لہٰذا دنیا کے شکست ہونے کا بھی ایک وقت مقرر ہے، جس کا نام حشر ہے۔ اور ہر طلسم کا طلسم کشا ایک ہوتا ہے۔ اس طلسم کے طلسم کشا تمام دنیا کے لوگ ہیں اور ہر شخص کا دل ایک لوح ہے۔ اور باطن اس طلسم کا ملکِ عدم ہے اور ظاہر اس طلسم کا عالمِ وجود ہے، اور ظاہر میں آنے کا راستہ شکمِ مادر ہے اور طلسمِ باطن میں جانے کا راستہ دہانِ گور۔ ۔ طلسمِ ظاہر کے تین در بند ہیں، پہلا در بند عالمِ طفلی، دوسرا در بند عالمِ جوانی، تیسرا در بند عالمِ پیری۔"

طلسم ہوش ربا میں بھی طلسم باندھنے اور طلسم کو توڑنے کے مسئلے کو وجود و عدم کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ طلسم کے لفظی اور اصطلاحی معنی تو ایسے نقش کے ہیں جن کو آفات سے تحفظ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن طلسم کو افسوں اور مایا یا التباس کے معنی میں بالعموم استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ طلسم ہوش ربا کی پہلی جلد میں طلسم کی اصطلاح کو استعمال کرتے ہوئے دنیا کے التباس کی طرف اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

"دنیا بھی مثل طلسم کے ہے اور باطل ہونا اس طلسم کا روزِ قیامت ہے کہ جو لوگ اس طلسم میں پھنس گئے وہ اس کے ٹوٹنے سے اپنے مسکنِ اصلی پر پہنچیں گے۔ اگر ناری ہیں تو جہنم میں اور ناجی ہیں تو فردوس میں۔ ۔ آنے کا اس طلسم میں دنیا کا یہ راستہ ہے (راستہ کی وضاحت کے طور پر عدم سے وجود تک کے سفر کے مختلف مدارج تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں) اور جانے کا دہانِ گور ہے۔"

اس ضمن میں پرانے شواہد شاعری اور نثر میں ہر جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے سر دست میر تقی میر کے ایک ایسے شعر کا حوالہ دینا نامناسب نہ ہوگا جس کی مدد سے فلسفۂ مایا کی مزید وضاحت کی جا سکتی ہے:

عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے — کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

اس شعر میں حکیم اور طلسم دونوں کی معنویت کائنات کے غیر حقیقی وجود سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے، لیکن طلسم کا لفظ بجائے خود اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ جب تک کائنات کا طلسم ٹوٹتا نہیں اس وقت تک اس دائرۂ عمل میں آنے والی ہر چیز حقیقت کا التباس پیدا کرتی ہے، اور اس طرح طلسم بند مقام کے اسیر لوگ بالعموم اس وقت تک زندگی کے مظاہر کو واقعیت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے اور ان پر یقین رکھتے ہیں جب تک وہ طلسم کی مجازی حیثیت سے آگاہ نہ ہو جائیں۔ شیخ فریدالدین عطار نے اسرار نامہ میں اس نکتے کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

توئی معنی، و بیرونِ تو اسم است — توئی گنج و ہمہ عالم طلسم است

اب اگر ہم طلسم کی اس معنویت کو پیش نظر رکھ کر طلسماتی داستانوں کے واقعات اور جزئیات کا

جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ ان داستانوں میں ایک طرف ظاہر طلسم بندی اور فسوں کاری کے واقعات بیان کئے گئے ہیں اور دوسری طرف بیش تر غیر طلسمی واقعات ان مظاہر فطرت کے سیاق وسباق میں بیان کئے گئے ہیں جن کے توسط سے داستان کہنے والا ہمیں کسی بڑی حقیقت اور گہری معنویت سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت طلسم ہوش ربا کی علامتی اہمیت، کے عنوان سے لکھے ہوئے شمیم احمد کے اس مضمون سے بھی ہوتی جس میں طلسم ظاہر اور طلسم باطن کے فرق کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے:

"طلسم ہوش ربا دو طبقوں میں بٹا ہوا ہے ایک طلسم ظاہر، ایک طلسم باطن۔ طلسم ظاہر ہویدا ہے اور طلسم باطن انسانی نظروں سے پوشیدہ ہے۔۔۔ طلسم ہوش ربا کی اصلی طاقت اس کے حجرہ ہا ہے ہفت بلا ہیں جو تعداد میں سات ہیں، پانچ طلسم ظاہر میں اور دو طلسم باطن میں۔ انسان کے طلسم ظاہر میں بھی پانچ قوتیں موجود ہیں جن کو حواسِ خمسہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور حکما نے اس کو حواس ظاہری کہا ہے، اور انہی کی رو سے انسان کے دو حواس باطنی بھی ہیں۔ جن کو مشرقی حکیموں نے قوت مدرکہ اور قوت متخیلہ سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ ساتوں حواس طلسم ہوش ربا کے حجرہ ہا ہے بلا کی طرح انسان کی تمام قوتوں اور شعور کا منبع ہیں۔" (۲۰۰۲ء ۵، شمیم احمد)

جب طلسم کی اس معنویت کی تطبیق طلسم خیال، بوستان خیال، طلسم گوہر بار اور بعض دوسری داستانوں سے کرنے کے بعد سہیل احمد خاں داستانوں میں طلسم کے عنصر کی نئی تعبیر کے لیے دلائل فراہم کرتے ہیں تو ان کے مطالعے کی سنجیدگی سے انکار کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ سہیل احمد کے استدلالی طریق کار اور دستاویزی تصدیق و توثیق سے گذرنے کے بعد ان کی یہ باتیں اگر کلیتاً اتفاق پر مجبور نہیں کرتیں تو کم از کم غور و فکر کے لئے نئی راہیں ضرور استوار کرتی ہیں:

"طلسم کی علامت کی معنویت بے حد گہری ہے اور اس کی کئی سطحیں ہیں۔ طلسمات کے حوالے سے لکھی گئی نثری داستانوں اور روایتی شاعری میں کائنات کو نظر فریب طلسم کہا گیا ہے، اور فتح طلسم کے مراحل دراصل معرفت کے حصول کے مراحل ہیں۔ کائنات میں انسانی زندگی کے مراحل طفلی، جوانی اور پیری، طلسم دراصل طلسم کے مشابہ ہیں، اور انسان کا وجود خود ایک طلسم ہے۔ اس طرح طلسم کی فتح دراصل باطن کی فتح ہے۔ اس علامت کے پس منظر میں حقیقت کا وہ تصور ہے جس پر روایتی ادب کی بنیاد ہے ـــــ" (داستانوں کی علامتی معنویت ص ۹۹)

سہیل احمد خاں نے داستانوں کے جن چند بنیادی عناصر کی مدد سے داستانوں کی علامتی اور تمثیلی معنویت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ان میں ایک اہم عنصر 'تبدیلیٔ قالب' اور 'قلب ماہیت' سے تعلق رکھتا ہے۔ اردو میں داستانوں کے فن پر لکھی گئی تنقید نے تبدیلیٔ قالب کے مسئلے کو اس سے زیادہ اہمیت نہیں دی کہ چونکہ پرانا انسان

ایسی باتوں پر اپنی کم علمی یا توہم پرستی کے سبب یقین رکھتا تھا اس لئے وہ انسانی کرداروں کو کبھی جانور، کبھی پرندہ اور کبھی دیو اور پری کی شکل میں تبدیل ہوتا ہوا دکھاتا ہے۔ بعض نقادوں نے قلب ماہیت کے عمل کو تناسخ کے عقیدے سے مربوط کرکے پیش کیا ہے . . . یہ بات اس لیے اقرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ تناسخ میں، موت کے بعد انسانی روح کوئی اور صورت اختیار کرتی ہے، جب کہ داستانوں کا انسان، سفر کے مختلف مراحل میں یا اپنی منزلِ مقصود کی تلاش کے عمل میں اس نوع کی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا ہے۔

تبدیلیٔ قالب کا مسئلہ یوں تو جدید دور میں بھی فکشن کا موضوع رہا ہے، لیکن قدیم داستانوں کی قلب ماہیت اور جدید فکشن کے کرداروں کی تبدیلیٔ قالب میں بہت نمایاں فرق ہے۔ جدید فکشن میں انسان کا کیڑے مکوڑے، گینڈے یا دوسرے کسی جانور کی شکل میں تبدیل ہو جانا درحقیقت انسان کے ذہنی، اخلاقی، روحانی اور نفسیاتی انحطاط اور زوال کی نمائندگی کرتا ہے، جب کہ داستانوں میں جہاں کہیں قلب ماہیت کا عمل سامنے آتا ہے وہاں اس کے طویل سفر کے کسی خاص مرحلے سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی ـــ داستانوں کے کردار قالب کی تبدیلی سے ایک ہی بار نہیں بسا اوقات بار بار گذرتے ہیں مگر پھر وہ لوٹ کر انسانی شکل وصورت میں واپس آجاتے ہیں اور اس طرح یہ مراحل ان کی منزل کی جستجو کی راہ میں دشوار گذار مراحل جیسی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ داستانوں کے برخلاف نئے ناولوں اور افسانوں میں انسانی کردار صرف ایک بار اس عمل سے گذرتا ہے

اس قسم کی تبدیلی انسان کے زوال یا مقامِ انسانیت سے گر جانے کی عبرت ناک صورت حال کو سامنے لاتی ہے، اور بالعموم کردار کو اپنی حقیقی صورت میں واپس آنا میسر نہیں آتا۔

داستانوں میں تبدیلیٔ قالب کا سبب کبھی حفاظتی اقدام ہوتا ہے، کبھی آزمائش کی شکل میں کردار کو اس تبدیلی سے گذرنا پڑتا ہے اور عام طور سے کسی مہم کو سر کرنے کی راہیں تبدیلیٔ قالب کے عمل سے آسان ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے سہیل احمد لکھتے ہیں کہ :۔

" . . . یہ دراصل وجود کی مختلف سطحوں میں رابطے کی وضاحت ہے۔ چنانچہ نباتات، جمادات اور حیوانات، وجود کے دائرے کے مختلف درجات ہیں (بدھ کی جاتک کہانیوں میں بدھ کا مختلف مخلوقات میں جنم بھی اسی معنویت سے مربوط ہے) اس سلسلے میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ یہ واردات مرکزی کردار کی مسافت یا اس کی آزمائشوں کے راستے میں ظاہر ہوتی ہے۔ مختلف داستانوں میں اس واردات کا بار بار ظاہر ہونا اس حقیقت کی ترجمانی ہے کہ یہ داستانوں کی مجموعی ساخت میں آزمائش کا ایک ضروری مرحلہ ہے۔ یہ

اس وقت ہوتی ہے جب داستانوں کا مرکزی کردار کسی نادر شے، خزانے یا کسی شہزادی ادوسرے لفظوں میں اپنی منزل ا کی تلاش میں سفر کرتا ہے، اس کا یہ سفر صرف خارجی سفر نہیں یہ دراصل اپنی ذات کی پہچان کا سفر ہے" ص ۵۱

سہیل احمد خاں اس سلسلے میں فسانۂ عجائب میں جان عالم کی تبدیلی قالب، "آرائش محفل" میں رونما ہونے والی قلب ماہیت اور مذہب عشق میں تاج الملوک کے عورت یا حبشی بن جانے کے واقعات کا تجزیاتی مطالعہ کرتے

طلسم اور قلبِ ماہیت کے علاوہ سہیل احمد خاں نے داستانوں میں ہیرو کے کردار کو بھی رمزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں "ہیرو کی لاتعداد شکلیں ہیں لیکن خصوصیات کے اعتبار سے ان میں بڑی مماثلت ہے۔ اس لئے بعض نفسیات دانوں کے نزدیک یہ انسانی شخصیت کا ایک بھید ہے جو ایک بنیادی سانچے میں ظاہر ہوا۔ گل گامیش سے اوڈیپس اور حاتم تک مختلف ثقافتوں میں اس کی بدلتی ہوئی کیفیات کے پیچھے ایک چہرہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم داستانوں اور حکایتوں کے مرکزی کرداروں کی تفہیم، ہر تہذیب اور ثقافت میں الگ الگ انداز نظر سے کی جاسکتی ہے، تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ ہیرو کے کردار میں تہذیبِ نفس اور داخلی ذات کے جن مراحل کی طرف اشارے ملتے ہیں ان کو تمثیلی یا علامتی انداز میں ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ بہ صورت دیگر داستانوں کی کردار نگاری ہمیں غیر حقیقی اور غیر فطری دکھائی دیتی رہے گی۔ سہیل احمد نے اپنی بات ثابت کرنے کے لئے مختلف تہذیبوں میں ان اقدار کے وجود پر اصرار کیا ہے جن کی روشنی میں تہذیبی اور معاشرتی تبدیلی کے باوجود ہیرو کے سفر کی علامتی یا تمثیلی حیثیت متاثر نہیں ہوتی۔

"مختلف تہذیبوں میں ہیرو کے سفر کی معنویت کا تربیتِ نفس کے کسی نظام سے گہرا رشتہ دکھائی دیتا ہے۔ لوک کہانیوں اور پریوں کی حکایتوں کو بھی محض انسانی ذہن کا بچپن کہہ کر ٹال دینا درست نہیں۔ ان میں بھی یہ رمزی سطح کارفرما ہوتی ہے، صرف ہمارا دیکھنے کا طریقہ بدل گیا ہے۔

علامتوں کی یہ زبان آفاقی ہے۔ مختلف تہذیبوں کے تربیت نفس کے نظام آپس میں بڑی مماثلت رکھتے ہیں۔ کوئی کہانی ایک تہذیب میں اپنے نظام کے ساتھ مربوط ہوتی ہے مگر دوسری میں پہنچ کر اس تہذیب کے تربیتِ نفس کے نظام کے ساتھ وابستہ بھی ہوجاتی ہے۔" (ص ۷۰)

تہذیب ذات اور ترتیب نفس کے مسئلے کی روشنی میں ہیرو کے کردار کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے سہیل احمد نے حاتم کے کردار کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حاتم کے سفر کے مراحل اور تصوف کے مختلف پہلوؤں کے مابین مماثلت کے کئی پہلو ہیں۔ اس تشریح سے ہیرو کی آفاقی معنویت میں خلل نہیں پڑتا بلکہ ایک مخصوص تہذیبی پس منظر

میں یہ معنویت اور اجاگر ہو سکتی ہے۔ حاتم ایک مکمل ہیرو ہے اس لیے اسے ایک نمائندہ کردار کے طور پر چنا جا سکتا ہے۔ حاتم کا کردار اس اعتبار سے بھی داستانی ہیرو کے کردار کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے کہ اس کو کئی داستانوں میں مثالی کردار کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ حاتم کی شہرت یوں تو جود و سخا اور انسانی ہمدردی کی بناء پر قائم ہے، مگر اس بنیادی صفت کے ساتھ اس کے کردار کے ان گنت پہلو اس وقت سامنے آتے ہیں جب ہم اسے برزخ سوداگر کی بیٹی کے سات سوالات کے جواب کی تلاش میں مہمات سر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مصنف نے حاتم کے اس سفر کو اپنے وجود کی پہچان کا سفر اور اس کی مہم جوئی کو عرفانِ ذات کے مراحل سے گذرنے کا عمل بتاتا ہے۔ حاتم اپنے سفر میں سات سوالوں سے نبرد آزما دکھائی دیتا ہے۔ پہلے وہ سیمرغ کی تلاش کرتا ہے جس کے دوران اسے پرندوں کی وادیوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہ وادیاں تصوف کے ان مراحل سے مشابہ ہیں جن کو صوفیوں نے وادیوں کا نام بھی دیا ہے۔ فریدالدین عطار کی مثنوی "منطق الطیر" میں ان سات وادیوں کے نام اس طرح ہیں (۱) وادیٔ طلب (۲) وادیٔ عشق (۳) وادیٔ معرفت (۴) وادی استغنا (۵) وادیٔ توحید (۶) وادیٔ حیرت اور (۷) وادیٔ فقر و فنا و بقا۔ ان مرحلوں یا وادیوں کو سامنے رکھ کر حاتم کے مہم جویانہ سفر پر ایک طائرانہ نگاہ بھی ڈالی جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کبھی کوہ ندا کا سفر کرتا ہے، کبھی ہرن کو بھیڑیئے سے چھڑاتا ہے، کبھی وادیٔ عشق سے گذرتا ہے، کبھی پیچھے مڑ کر دیکھنے سے پتھر بن جانے کے اندیشے سے گذرتا ہے اور کبھی ایسے مناظر دیکھتا ہے کہ حیرت و استعجاب میں غرق ہو جاتا ہے۔

داستانوں کی علامتی کائنات کے مصنف نے حاتم کے سفر کے ان تمام مراحل کو تصوف کی وادیوں کی مختلف کیفیات پر منطبق کر کے سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس طرح اپنے مقدمے میں قائم کئے گئے مفروضات کے لئے دلیلیں فراہم کی ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس تحقیقی مقالے کے آغاز میں قائم کئے ہوئے مفروضے کتاب کے مطالعہ کے دوران صرف مفروضے نہیں رہ جاتے۔ استدلالی طریق کار اور تحقیقی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا حقِ ادا ادا کرنے کے سبب غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لئے داستانوں کی علامتی کائنات کو بحیثیت مجموعی تحقیق و تنقید کو ہم آمیز کرنے اور دریافت شدہ حقائق کی نئی تعبیر و توجیہہ کرنے کے سلسلے میں ایک اہم اقدام قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات ہنوز تشنۂ توجہ رہتی ہے کہ پہلے داستانوں کو ان کی نوعیت اور حکایتیات کی درجہ بندی کی بنیاد پر الگ خانوں میں تقسیم کیا جائے اور اس کے بعد اپنے موضوع کے دائرے میں آنے والی داستانوں کے مخصوص عناصر کی تعبیر نو کی کوشش کی جائے۔ اگر اس مطالعے میں اس نوع کی حد بندی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا تو ہر چند کہ زیر بحث مقالے کا ایجاز و اختصار ضرور متاثر ہوتا لیکن تحقیقی تجزیے کے یہی نتائج نسبتاً زیادہ ٹھوس انداز میں سامنے لائے جا سکتے تھے۔

سہیل احمد خاں نے اپنے مقالے کے آغاز میں اس مطالعے کا جو دائرہ کار متعین کیا ہے وہ اس بات کا بھی

متقاضی تھا کہ زبان اور ثقافت کے رشتے کی تفہیم کے لیے جو جدید ترین تنقیدی رویّے سامنے آ رہے ہیں ان سے بھی کماحقہ استفادے کی کوشش کی جاتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے نفسیات، انثراپولوجی، لسانیات اور مذاہب کے تقابلی مطالعے کے جدید تر رویّوں کو سمجھنے اور انہیں بہ طریق احسن استعمال کرنے کی کوشش بھی کی ہے، لیکن پچھلے برسوں میں ساختیاتی مطالعے کے ماہرین نے اساطیر اور قدیم تہذیب و ثقافت کا جس انداز و طریق کار کو داستانوں کی تمثیلی یا علامتی معنویت کی تفہیم میں بہت مفید طریقے پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ ساختیاتی مطالعے کا آغاز ہی اساطیر کے بارے میں غور و خوض سے ہوا ہے۔

ساختیات اور مابعد ساختیات کے دانشوروں نے کسی بھی قدیم کلچر کی صحیح تفہیم کا ذریعہ اس کلچر کے وسائل اظہار بالخصوص اس کی زبان کو قرار دیا ہے اور وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ ہم اس کا واضح ادراک کریں یا نہ کریں لیکن ہم سب لوگ دراصل علامت اور تمثیل کی دنیا میں رہتے ہیں، اور ایسی دنیا میں حقائق کا ادراک چیزوں کے وجود سے نہیں بلکہ ان کے درمیان پائے جانے والے رشتوں کی مدد سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

داستانوں کی علامتی کائنات' کا موضوع، اس تحقیقی مطالعے میں جس سنجیدہ تنقیدی اور تحقیقی کاوش سے گوارا کیا ہے وہ یقیناً سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، تاہم مذکورہ بالا جدید ترین تنقیدی زاویہ ہائے نظر کو شامل کر کے اس تصنیف کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ کیا جا سکتا تھا۔

••

ڈاکٹر سہیل احمد خاں

جواب

ابوالکلام قاسمی صاحب نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ "داستانوں کی علامتی کائنات" دراصل میرے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے "اردو داستانوں کا علامتی مطالعہ" کے تین ابواب پر مشتمل ہے۔ میری تصنیف کے دیباچے میں یہ وضاحت موجود ہے نیز وہاں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ میری ایک دوسری کتاب "سرچشمے" کے مباحث کا بھی اس کتاب سے ربط ہے۔ قارئین کے سامنے یہ حقیقت رہے تو بہتر ہے پی ایچ۔ ڈی کے لیے جو مقالہ گیا تھا وہ بھی اردو میں لکھے جانے والے مقالوں کی نسبت مختصر تھا اور مقالوں کے عام بے جا تفصیل اور غیر متعلق مباحث کے بیان کے انداز سے گریز کیا گیا تھا۔ اس کا بھی وہ حصہ کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے جس میں مصنف کا داستان کی بعض علامتوں کے بارے میں بنیادی نقطہ نظر موجود ہے اس میں کوئی "نیا انکشاف" ہو یا نہ ہو بہت سادہ داد ایسا ضرور ہے جیسے داستانوں

تنقید میں پہلے استعمال کیا گیا اختصار کی شکایت ہو سکتی ہے مگر کیا ان مقالوں سے آپ کو شکایت نہ ہوگی جن میں پس منظر تاریخی حالات پر صد ہا صفحات شائع کر کے اصل موضوع تک آئے ہیں اور ان ابواب کا اصل موضوع سے کوئی ربط قائم کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

بعض مقامات پر قاسمی صاحب نے کچھ ایسا لہجہ اختیار کیا ہے جیسے وہ یہ امور اپنی طرف سے سامنے لا رہے ہوں حالانکہ وہ مباحث تصنیف میں موجود ہیں۔ مثلاً "طلسم" کے سلسلے کے اقتباسات اور اسی سلسلے میں درج شدہ عطار اور میر کے اشعار۔ ایسے مقامات پر یہ تشریح ضروری تھی کہ یہ مصنف کا نقطۂ نظر ہے۔ قاسمی صاحب کے تبصرے میں یہ چیزیں اس طرح وارد ہوئی ہیں جیسے مصنف انکا ذکر بھول گیا ہو اور یہ خلا تبصرہ نگار پُر کر رہے ہیں۔

تبصرے کے آخر میں قاسمی صاحب نے ساختیاتی مطالعے کی اہمیت پر زور دیا ہے مجھے اس اندازِ نظر کی اہمیت سے انکار نہیں بلکہ میں نے خود اپنی اس مختصر تصنیف میں نئے نقادوں سے یہ سوال کیا ساختیاتی مطالعے کے لیے صرف شاعری ہی کو منتخب کیا جاتا رہے گا اور داستان کو اس زاویۂ نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا؟ مگر میری راہ دوسری ہے۔ میں نے داستانوں کو کسی جدید نظریے کی کسوٹی پر پرکھنے کے بجائے یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس تہذیب میں داستانیں لکھی گئیں اس میں کائنات کو جس صوفیانہ فکر کی وساطت سے دیکھا جاتا تھا داستانوں کی علامتی سطحوں کا ادراک بھی اسی فکر کے حوالے سے ممکن ہے۔ اگر کوئی اور نقاد ساختیاتی انداز یا کوئی دوسرا انداز اپنانا چاہتا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ داستانوں کے بارے میں مختلف تنقیدی انداز سامنے آئیں تو داستانوں سے علمی دلچسپی اور بڑھے گی اور خود میری تصنیف کا بنیادی مقصد بھی یہی بتانا ہے کہ داستانوں کو محض غیر عقلی اور بچکانہ کہہ کر رد کرنا درست نہیں، داستانوں میں جو گہری اور بلند تر سطحیں ہیں ان کو بھی پیشِ نظر رکھا جانا چاہیے۔ امید ہے ان امور کی وضاحت سے قارئین بعض مباحث کو زیادہ واضح انداز میں دیکھ سکیں گے۔

●●

جناب احمد جمال پاشا
ذکیہ آفاق کالج ۔ سیوان

ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور کا تھیسس

طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ

" طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" خواجہ عبدالغفور کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر بمبئی یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی تھی۔ خواجہ صاحب "پیش لفظ" میں لکھتے ہیں:

"راقم الحروف نے .... بمبئی کے کتب خانوں اور ریسرچ سینٹر سے ..... بھرپور استفادہ کیا .... ہے .... رہبر، رہنما اور استاد کی حیثیت سے ڈاکٹر ایس نظام الدین گوریکر... سے ------ مکمل طور پر استفادہ کیا ہے ــــ"

ڈیمائی سائز کے ۲۵۲ صفحات پر مشتمل اس مقالے کو "اسٹیٹ فیڈریشن آف یونیسکو ایسوسی ایشن" کے اہتمام میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹، گولا مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲ نے جون ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔ اس مقالے کے ص ۵۲ پر فاضل مقالہ نگار کی توصیف میں ایک اقتباس درج ہے جو سالنامہ نقوش ۱۹۷۹ء (پیش لفظ۔ کنہیا لال کپور) میں شائع ہوا تھا جس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ مقالہ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۳ء کے درمیان مکمل ہوا ہوگا۔ کتاب میں اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔

ابتدا میں فہرست ہے جس میں ظرافت کی اصطلاحات کے انگریزی ہندی مترادفات درج ہیں ــ فہرست خاصی متاثر کن ہے۔ ناشر کا "حرف چند" ــ مقالہ نگار کا "پیش لفظ"۔ پہلے باب میں "انشائے لطیف" ــ دوسرے میں ــ "بذلہ سنجی" ــ تیسرے میں ــ "طنز" ــ چوتھے میں ــ "اردو کی خصوصی منظوم اصناف" ــ پانچویں میں ــ "تضحیک و تعریض" ــ چھٹے میں ــ "دوسری زبانوں سے مزاح" ــ ساتویں میں ــ "متفرقات" ــ آٹھویں میں ــ مزاحیہ شاعر ــ مزاحیہ نثر نگار اور نواں باب ــ "حرف آخر" ــ ہے۔

(۱) پہلے باب میں مقالے کے صفحہ ۳ پر ڈاکٹر قمر رئیس اور صفحہ ۴ پر کرشن چندر کے اقتباس درج ہیں۔ جن میں

فاضل مقالہ نگار کی لطیفہ گوئی کی صلاحیت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ مگر کوئی حوالہ درج نہیں کہ کہاں سے انہیں اخذ کیا گیا ہے۔

(۲) مقالے کے صفحہ ۱۶ پر "سٹائر" کے سلسلے میں "طنزیات و مضحکات" رشید احمد صدیقی سے اقتباس درج کیا گیا ہے مگر صفحہ نمبر درج نہیں ہے۔

(۳) ص ۷ پر نظام الدین گوریکر "اردو میں تحقیق کی رفتار جامعہ بمبئی میں" مطبوعہ "نوائے ادب" بمبئی اکتوبر ۱۹۷۸ء سے بلا صفحہ نمبر کے حوالے کے لکھتے ہیں:

ادب پر ریسرچ کے معنی صرف یہی نہیں کہ محض موضوع زیر بحث کے تعلق سے کلیتاً نئی نئی باتیں ہی معلوم کی جائیں بلکہ پرانی باتوں کی بھی چھان بین ضروری ہے اور ان کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کرتے ہوئے ان کی قدریں قائم کی جائیں۔ لایعنی اور بے تعلق باتوں کو چھانٹ کر کام کی باتوں کی افادیت اور اہمیت کو قابل قبول بنایا جائے۔ اس روش میں تاریخی پس منظر، سماجی ماحول، تہذیب و تمدن کی سطحیں نظر انداز نہیں کی جا سکتی ہیں۔ ریسرچ سے پہلے سوچ ضروری ہے۔ یعنی جستجو در جستجو سے تلاش در تلاش کا سلسلہ قائم ہوتا ہے۔ اور مقالہ نویسی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زیر سطح اور زیر سمندر خزانوں کو کھنگال کر گہر گرانمایہ کو نکال لیا جائے۔ ان کی افادیت، ان کی قدر و قیمت متعین کی جائے۔"[1]

عرض ہے کہ ڈاکٹر ایس نظام الدین گوریکر کا مضمون "نوائے ادب" بمبئی اکتوبر ۱۹۷۸ء کے شمارے میں ص ۶۶ تا ۷۱ موجود ہے۔ ہم نے اسے چھان مارا مگر مندرجہ بالا عبارت ہمیں کہیں نہ ملی۔ گوریکر صاحب کے مضمون میں یہ اقتباس کہیں بھی شامل نہیں۔

(۴) ص ۲۳ پر ہنسی کے جسمانی ردعمل کی بحث جیپ مین کے حوالے سے ہے۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ جیپ مین نے یہ باتیں کہاں پر کہی ہیں۔؟ کہی بھی ہیں یا نہیں؟

ص ۲۶ پر پہلا حوالہ حاشیے پر سالنامہ "ادب لطیف" ۱۹۶۱ء کا ہے۔ دوسرا ڈاکٹر نظام الدین گوریکر کا۔ تیسرا حوالہ کنہیا لال کپور "بال و پر۔ دیباچہ" کا ہے۔ ہم نے "بال و پر" کا معائنہ کیا مگر افسوس کہ "بال و پر" میں سرے سے کوئی "دیباچہ" شامل نہیں ہے۔ چوتھا حوالہ "مولوی عبدالباری آسی: تذکرہ خندۂ گل نگار پریس لکھنؤ ۱۹۲۹ء" کا ہے۔ عرض ہے کہ صاحب تذکرہ عبدالباری آسی تھے۔ یہ صحیح ہے کہ "تذکرہ خندۂ گل" مولوی عبدالباری آسی کے صفحہ ۸ پر یہ عبارت درج ہے:

---

[1] طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ۔ خواجہ عبدالغفور ص ۱۷/ ۱۸۔

"مطبوعہ نگار مشین پریس نظیر آباد لکھنؤ لکھتے ہیں" (۱۹۲۹ء)
مگر طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے جب "تذکرہ خندۂ گل" سے استفادہ کیا گیا تو اسی تذکرے کے صفحہ ، کی دوسری سطر میں "تذکرہ نگار کے حالات" کے متعلق یہ بات نظر سے گذری ہوگی۔ صاحب تذکرہ لکھتے ہیں: میری پیدائش ۱۸۹۳ء میں ہوئی ـــــ"[1]

ایسی صورت میں جب کہ پیدائش ۱۸۹۳ء میں ہوئی تو اس صاحب کمال نے اپنی پیدائش سے فقط ۳۶ سال پیشتر ۱۸۲۹ء میں کیسے "تذکرہ خندۂ گل" مرتب کر لیا ـــــ؟ دراصل سالِ اشاعت ۱۹۲۹ء ہے "اودھ پنچ" وغیرہ میں ۱۹۲۹ء کے شماروں میں "تذکرہ خندۂ گل" کے اشتہار اور تبصرے نظر آتے ہیں۔

(۵) صفحہ ۲۶ پر درج ذیل عبارت کھٹکتی ہے:-

"ڈاکٹر وزیر آغا' خیال پارے۔ غلام جیلانی اصغر' کچھ جھوٹ کی حمایت میں۔ جیل آذر' نیم پلیٹ ـــــ انور سدید' دسمبر۔ کامل القادری' فٹ نوٹ ـــــ سلیم آغا قزلباش' بلبلہ ـــــ راحت کھٹی' سفید بال۔ طارق جامی' لکھنا ـــــ انجم انصار' منگنی کی انگوٹھی ـــــ ان سب انشائیوں میں طنز و مزاح ظرافت بذلہ سنجی تفنن سب ہی بھرپور ہیں۔"[2]

گذارش ہے کہ "خیال پارے" ڈاکٹر وزیر آغا کا انشائیہ نہیں ان کے انشائیوں کے اولین مجموعے کا نام ہے۔ خیال پارے" کے انشائیوں اور مذکورہ انشائیوں میں کہیں کہیں تبسم زیر لب کی کیفیت تو ہے مگر ان کے طنز و مزاح ، بذلہ سنجی اور تفنن سے بھرپور ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب کے سب "انشائیے" ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریک سے وابستہ انشائیہ نگاروں کے انشائیے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی طنزیہ مزاحیہ مضمون نہیں ہے۔ نہ ان میں ظرافت پائی جاتی ہے۔

(۶) صفحہ ۳۰ پر فرماتے ہیں:

" خندہ دنداں نما اور تبسم زیر لب میں بڑا فرق ہے . . . . لہٰذا مزاح نگاری پل صراط پر سے گذرنے کا عمل ہے۔ اور پل صراط کے بارے میں سنا ہے کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔"

اس پیراگراف سے پہلے ڈاکٹر لوہیا کا ایک لطیفہ درج ہے۔ مگر پیراگراف واوین میں نہیں ہے۔ نیچے حاشیے (ص ۲۶)

---

[1] تذکرہ خندۂ گل. مولوی عبدالباری آسی ص ۱ [2] طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ: خواجہ عبدالغفور ص ۲۶ ـ

پر یوں ادھورا حوالہ درج ہے!

"ڈاکٹر وزیر آغا پیش لفظ تبسم ــــ"

نہ تو مصنف کا نام درج ہے نہ صفحہ نمبر جبکہ حوالہ یوں ہونا چاہیے تھا:

"تبسم / رام لال نابھوی (پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا) ص ۵/۶"

اور اس پیراگراف پر بھی واضح کر دینا چاہیے تھا کہ یہ عبارت فاضل مقالہ نگار کی نہیں ڈاکٹر وزیر آغا کی ہے۔ جب کہ ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ یہ عبارت مقالہ نگار کی ہے ــــ نہ کہ وزیر آغا کی۔

(۷) صفحہ ۲۱ پر مقالہ نگار کی لطیفہ گوئی کی تعریف میں دو اقتباسات راقم الحروف کے درج ہیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں سے اخذ کیے گئے ہیں ــــ؟

(۸) صفحہ ۴۷ پر میاں بیوی کے جھگڑے پر ایک لطیفہ درج ہے جن کے اخیر میں "ذقت کا کوروی اور ان کے معام" اخلاق حسین عارف کے مضمون سے مقالہ نگار کی لطیفہ گوئی کی تعریف میں ایک اقتباس درج ہے مگر کتاب یا مضمون کا حوالہ اور صفحہ نمبر درج نہیں ہے ــــ

(۹) دوسرے باب "بذلہ سنجی" میں بکثرت اساتذہ کے اشعار بلا کسی حوالے کے درج ہیں۔ اکثر اشعار شاعر کے تخلص تک سے بے نیاز ہیں۔

(۱۰) صفحہ ۶۰ پر منظوم پیروڈی لکھنے والوں میں "شفیق ناظم شعریٰ" درج ہے جبکہ اصل نام شفیق فاطمہ شعریٰ ہے۔

(۱۱) صفحہ ۶۶ پر ملّا رموزی کی گلابی اردو کا ایک نمونہ بلا حوالے کے درج ہے۔

(۱۲) صفحہ ۷۰/۷۱ پر آتش اور ناسخ کے بارے میں ایک طویل عبارت کہیں سے بلا حوالے کے درج کر دی گئی ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد اسمبلی کے امیدواروں کی حریفانہ چشمک پر ایک عدد لطیفہ درج ہے۔

(۱۳) تیسرے باب "طنز" ص ۹۷ پر پہلا حوالہ "کنہیا لال کپور ..... پیش لفظ" ــــ سالنامہ نقوش سے مقالہ نگار نے جو عبارت درج کی ہے ــــ "طنز" "تنقید ہے ..... مزاح نگار ..... دور دور کی کوڑی لاتا ہے" یہ تقریباً آدھے صفحہ کی عبارت کنہیا لال کپور کی ہے۔ مگر کپور کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبارت فاضل مقالہ نگار کی ہے جب کہ یہ عبارت کپور کے پیش لفظ سالنامہ نقوش ۱۹۷۹ء کے ص ۵۲ میں موجود ہے۔

(۱۴) دوسرا حوالہ صفحہ ۸۰ پر "نریش ندیم ــــ قسط وار، عصری ادب '۸'، '۷۹'" ہے۔ جس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ صفحہ نمبر ہے جبکہ "۸، ۷۹" ــــ اکتوبر ۷۸ء تا جنوری ۱۹۷۹ء کا شمارہ ہے۔ اقتباس کا حوالہ دیا گیا ہے مگر

صفحہ نمبر درج نہیں کیا گیا۔ جبکہ مذکورہ اقتباس "عصری ادب" مذکورہ شمارے کے صفحہ ۱۷۱، ۴۷۲ پر پیش کیا گیا ہے۔

(۱۵) ساتویں باب "متفرقات" میں "مکاتیب" عنوان کے تحت مقالہ نگار نے دو ایسے خط چھاپے ہیں جن میں اس کی تعریف و توصیف ہے۔

دوسرا حوالہ نقوش، مکاتیب نمبر۔ اردو کے منفرد مکتوب نگار، مالک رام ـــــ تیسرا تنقیدیں خورشید الاسلام' چوتھا ـــــ احسن مارہروی اور پانچواں ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی کا ہے۔ مگر کوئی اقتباس یا عبارت واوین میں نہ ہونے کی وجہ سے پتہ نہیں چلتا کہ مقالہ نگار نے کس کی کون سی عبارت یا خیال اپنایا ہے۔

(۱۶) صفحہ ۱۹۶ پر ایک حوالہ ڈاکٹر ایس، آر کلکرنی کا ہے۔ مگر اقتباس ندارد ـــــ غالباً جز بھر کل میں سما گیا ہے۔

(۱۷) صفحہ ۲۰۷ پر درج ہے۔ "زمیندار لاہور (میں) . . . . . حاجی لق لق مزاحیہ کالم لکھتے تھے "

جبکہ ص ۲۲۹ پر کہتے ہیں ـــــ " حاجی لق لق مدینہ بجنور کے مزاحیہ کالم بھی لکھا کرتے تھے۔"

(۱۸) صفحہ ۲۴۴ پر صالحہ عابد حسین کے بارے میں لکھتے ہیں :

" مزاحیہ شاعری بھی (کرتی ہیں) اور یہ شعر درج ہے :

نامکمل ہے ابھی وردی پولیس کی اے حضور ؛؛ چوڑیوں کا بھی اضافہ اس میں ہونا چاہیے

یہ شعر تو شوکت تھانوی کا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں شوکت تھانوی "سرپنچ" ہفتہ وار کے ایڈیٹر تھے۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں حامد ڈاکو کا زور تھا۔ جب پولیس پکڑنے میں ناکام ہوئی تو "سرپنچ" میں ـــــ نہتی اور مظلوم پولیس۔ مسلح اور ظالم حامد ڈاکو۔ کی سرخی سے بہت ہی سخت اداریہ لکھا گیا۔ جس پر یہ شعر چسپاں کیا گیا :

نامکمل ہے ابھی وردی پولیس کی اے حضور ؛؛ چوڑیوں کا بھی اضافہ اس میں ہونا چاہیے

راقم الحروف کی کتاب "شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت" سے مقالہ نگار نے یہ شعر لے کر صالحہ عابد حسین سے منسوب کر دیا۔

(۱۹) مذکورہ کتاب کے صفحہ ۵۵ سے مقالہ نگار نے مقالے کے ص ۲۰۵ پر شوکت تھانوی کی کالم نگاری کے بارے میں یہ عبارت بلا حوالہ لے کے نقل کر دی۔ ملاحظہ ہو :

" دو دو باتیں، فلمزار، چٹکیاں، کھلکھلستان، بے پر کی، گپ شپ، کٹ پیس، گرما گرم، الم غلم پھبتیاں، توتو میں میں، حضرتِ عشق، دیوار قہقہہ، تیر بہدف ـــــ"

سی عبارت کو دہراتے ہوئے لکھتے ہیں ـــــ

" شوکت تھانوی نے اس کی (سرپنچ) عرصے تک ادارت کی اور مزاحیہ کالم ان ناموں سے لکھتے رہے۔"

فاضل مقالہ نگار شوکت تھانوی کے مزاحیہ کالموں کو ان کے قلمی نام سمجھے کہ ان ناموں سے وہ مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔ حالانکہ ہمیشہ وہ اپنے نام سے کالم لکھتے اور یہ نام تو ان کے نہیں ان کے کالموں کے ہیں۔

(۲۰) صفحہ ۲۴ پر مقالہ نگار نے "چیپ مین" کو "چاپ مین" لکھا ہے ــــ صفحہ ۲۰ پر مانٹین کو "مونٹیج" صفحہ ۲۰۵ پر منشی سجاد حسین کاکوروی کو منشی سیّد محمد سجاد حسین لکھا ہے۔ اسی صفحہ پر مرزا بچھو بیگ ستم ظریف" لکھا ہے۔ جبکہ وہ "مرزا مچھو بیگ ستم ظریف" تھے ــــ منشی سجاد حسین کاکوروی کے ساتھیوں میں "محفوظ علی بدایونی" کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ وہ منشی محفوظ علی کاکوروی تھے۔ "احمد علی منڈوی کوئی صاحب نہیں تھے۔ صحیح نام 'احمد علی کسمنڈوی' ہے۔

(۲۱) مقالہ نگار کا یہ انکشاف کہ ــــ "مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری نے اودھ پنچ کو اور بھی زیادہ شہرت دی ــــ" مقالہ نگار کی ناواقفیت کا اظہار کرتا ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری کبھی اودھ پنچ میں شائع نہیں ہوا۔ جب دیوانِ حالی شائع ہوا تو اس کے مقدمے میں لکھنوی شاعری پر کچھ اعتراضات تھے جن کے خلاف "اودھ پنچ" میں لکھا جانے لگا۔ لیکن اودھ پنچ کی دھوم تو اس کے نکلتے ہی ہو گئی تھی۔

(۲۲) اسی صفحہ پر مقالہ نگار اردو مزاحیہ اخبارات اور انکے اڈیٹروں سے واقفیت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

۱۔ اودھ پنچ لکھنؤ، منشی سید سجاد حسین، ۲۔ مدراس پنچ، نواب سید محمد آزاد، ۳۔ انڈین پنچ لکھنؤ، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، ۴۔ بنگال پنچ کلکتہ، احمد علی شوق، ۵۔ لاہور پنچ، پنڈت رتن ناتھ سرشار، ۶۔ جالندھر پنچ، منشی جوالا پرشاد برق، ۷۔ آگرہ پنچ، ؟ ، ۸۔ پنجاب پنچ، (لاہور) آقا بیدار بخت، ۹۔ باوا آدم پنچ، بنارس، ۱۰۔ لکھنؤ پنچ ــــ عاشق لکھنوی، ۱۱۔ راجپوتانہ پنچ (اجمیر) ۱۲۔ "سرپنچ (سید پور۔ ضلع غازی پور ۱۹۳۱ء ظریف لکھنوی، چودھری محمد علی شہباز، احمق پھپھوندوی ان کے اہم قلمی معاونین تھے۔"

عرض یہ کرنا ہے کہ "مدراس پنچ" کے اڈیٹر نواب سید محمد آزاد نہیں بلکہ غلام محی الدین حنیف تھے ــــ "انڈین پنچ" لکھنؤ کے اڈیٹر پنڈت تربھون ناتھ ہجر نہیں منشی نوروز علی شیدا تھے۔ "بنگال پنچ" کے اڈیٹر منشی احمد علی شوق قدوائی نہیں غلام حضرت خاں تھے۔ "لاہور پنچ کے اڈیٹر پنڈت رتن ناتھ سرشار نہیں تھے۔ "جالندھر پنچ" کے اڈیٹر منشی جوالا پرشاد برق نہیں تھے۔ "پنجاب پنچ" کے اڈیٹر آقا بیدار بخت نہیں بلکہ منشی نثار علی شہرت تھے۔ "لکھنؤ پنچ" کے اڈیٹر عاشق لکھنوی دراصل مرزا مچھو بیگ ستم ظریف تھے۔

"سرپنچ۔ سید پور ضلع غازی پور سے ۱۰ دسمبر ۱۸۸۲ء سے جاری ہوا ... اس کے مالک بابو شیو پرشاد اور مہتمم مولوی محمد یٰسین شفق تھے۔"[۱]

---

[۱] تاریخ صحافت اردو جلد سوم امداد صابری ص ۲۲۲

سید پور کا " سرپنچ " ۱۹۲۱ء نہیں ۱۸۸۲ء میں نکلا تھا۔ اس کے ظریف لکھنوی، چودھری محمد علی اور احمق پھپھوندوی کیسے قلمی معاونین ہو سکتے تھے۔؟ سوائے شہباز بلند پرواز کے ـــ البتہ سرپنچ" لکھنؤ" ۱۹۲۴ء کے قلمی معاونین ظریف لکھنوی، چودھری محمد علی ردولوی اور احمق پھپھوندوی وغیرہ تھے۔

(۲۳) مقالہ نگار نے صفحہ ۲۰۶ پر لکھا ہے: "مذاق رامپور ـــ ہفت روزہ اجراء ۷ جنوری ۱۸۵۵ء، اڈیٹر حفیظ احمد رضا ـــ" حالانکہ "مذاق" رامپور کے اڈیٹر مولوی عبدالجلیل نعمانی تھے۔

(۲۴) مقالہ نگار نے ص ۷ ۱ پر "آرتھر کوئلو" لکھا ہے۔ حالانکہ نام "آرتھر کوئلر ہے" ـــ صفحہ ۲۴۱ پر ایک مزاح نگار کا نام "محمد خالد" لکھا ہے۔ جبکہ ان کا نام "محمد خالد اختر" ہے۔ فرماتے ہیں: "نوجوان لکھنے والوں میں ممتاز ہے ـــ" جو آدمی ۴۵ سال سے لکھ رہا ہے اور ۷۰ سال سے زائد کا ہے اسے نوجوان لکھنا ناواقفیت کی دلیل ہے ـــ

(۲۵) مولانا عبدالمجید سالک کے ایک مشہور مضمون کا عنوان لکھتے ہیں "من کہ ایک معتبر ہوں ـــ" حالانکہ مضمون کا نام "منکہ ایک معتبر نائی" ہے۔ چراغ حسن حسرت کے لیے لکھتے ہیں: "کولمبس کے نام سے مزاحیہ کالم لکھے۔" جبکہ وہ کالم سندباد جہازی کے نام سے لکھتے تھے۔

(۲۶) صفحہ ۲۴۷ کنہیا لال کپور کی کتابوں کے ناموں میں "کامریڈ" بھی شامل ہے۔ جبکہ کپور کی اس نام کی کوئی کتاب نہیں ہے۔

(۲۷) صفحہ ۲۵۲ پر لکھتے ہیں: "احمد دین ـــ ادب کے باوا آدم"۔ صحیح نام امجد حسین ہے اور مجموعے کا نام "جملۂ معترضہ" ہے۔

(۲۸) صفحہ ۳۴ پر "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" میں ظرافت کا فنی تجزیہ یوں کرتے ہیں۔ "تجربے اور مشاہدے سے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ: کون سا لطیفہ سامعین کو ہنسا سکتا ہے۔"

ص ۴۲ پر "سہ جہتی مزاح" کے بارے میں مزاح کے فن سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"جو بات دل چسپ ترین ہوتی ہے وہ تو لطیفہ بن ہی جاتا ہے اسلیے ضروری ہے کہ لطیفہ بھی سہ جہتی ہے۔"

طنز کی تعریف کرنے کے بعد "شگفتہ طنز" کی سرخی کے تحت میاں بیوی کے اور دوسرے لطیفے ص ۸۲ پر درج ہیں۔

(۲۹) طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" عملاً "لطائف کا جائزہ" ہے۔ ۱۹۷۲ء میں خواجہ عبدالغفور کی لطائف پر کتاب "شگوفہ زار" چھپی تھی جسے کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ ۱۹۸۲ء میں طنز و مزاح کا

تنقیدی جائزہ" کے نام سے دوبارہ چھاپ دیا گیا۔ ہم اپنے دعویٰ کے ثبوت میں "شگوفہ زار" اور "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" کا موازنہ پیش کرتے ہیں جس سے ثابت ہو جائے گا کہ یہ ایک جعلی تھیسس ہے:

فہرست

"شگوفہ زار"	"طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ"
خواجہ عبدالغفور	خواجہ عبدالغفور
۱۹۷۲ء	۱۹۸۳ء
اصل اور مترادف اصطلاح اردو اور انگریزی میں تعارف کرشن چندر	اصل اور مترادف اصطلاح اردو اور انگریزی اور ہندی میں تعارف خواجہ عبدالغفور
ص ۳ فہرست مزاح HUMOUR	ص ۲۷ مزاح HUMOUR प्रहास विनोद

فہرست کے آخر میں

ص ۲۷۴ مزاحیہ شعرا	ص ۲۱۹ مزاحیہ شاعر
ص ۲۹۶ مزاحیہ نثر نگار	مزاحیہ نثر نگار
حرف آخر	ص ۲۱۔ زندگی کی تلخیوں اور اداسیوں سے مدافعت کا ایک ہی حربہ ہے کہ حس مزاح کی لطافت سے کام لیا جائے
ص ۴۲ "زندگی کی تلخیوں اور اداسیوں سے مدافعت کا ایک ہی حربہ ہے کہ حس مزاح کی لطافت سے کام لیا جائے۔	

یہ تو فقط ایک جھلک ہے ورنہ "شگوفہ زار" میں ص ۲۲ سے ۴۲ تک جو عبارت ہے وہی عبارت "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" میں ص ۲۱ تا ۲۵ موجود ہے ـــــ طوالت سے بچنے کے لیے اب ہم دونوں کتابوں کے مشترک عنوانات، مواد صفحات کا موازنہ پیش کرتے ہیں۔ اصل عبارت کے حوالے دینے پر آئیں تو اتنی ہی ضخیم ایک تیسری کتاب تیار ہو جائے گی ملاحظہ ہو:

شگوفہ زار ـــــ عبدالغفور مطبوعہ ۱۹۷۲ء		طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ خواجہ عبدالغفور مطبوعہ ۱۹۸۳ء
ص ۲۲ تا ۴۳	حس مزاح	ص ۲۱ تا ۲۵
ص ۴۴ تا ۵۰	مزاح	ص ۲۷ تا ۲۹
ص ۵۰ تا ۵۱	خالص مزاح	ص ۲۹ تا ۳۰
ص ۵۲ تا ۶۳	بے معنی مزاح	ص ۳۱ تا ۳۲

سمن زار۔ خواجہ عبدالغفور، مطبوعہ دسمبر ۱۹۷۸ء

ص ۱۱۔ الکشن کی مہم ص ۳۳ الکشن کی گل کاریاں

لالہ زار۔ خواجہ عبدالغفور، مطبوعہ ۱۹۷۵ء

ص ۶۴ خود برداشتہ مزاح ص ۳۷

"شگوفہ زار"		طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ
ص ۵۴ تا ۵۷	ظرافت	ص ۳۴ تا ۴۴
ص ۵۸ تا ۶۲	طنز	ص ۷۹ تا ۸۲
ص ۶۳ تا ۶۴	شگفتہ طنز	ص ۸۲ تا ۸۳
ص ۶۵	مذاق	ص ۸۴
ص ۱۱۷ تا ۱۱۹	ہنسی اور قہقہہ کی مختلف اشکال	ص ۸۹ تا ۹۱
ص ۱۲۰	ہجو ہجا	ص ۶۵
ص ۱۲۸	ہزل	ص ۹۷
ص ۱۶۱	ریختی	ص ۹۹
ص ۱۶۶	واسوخت	ص ۱۰۴
ص ۱۳۰	دل آزاری	ص ۱۱۳
ص ۱۳۶	پھکڑ بازی	ص ۱۱۶
ص ۱۳۸	ضلع جگت	ص ۱۱۸
ص ۱۴۰	پھبتی	ص ۱۱۹
ص ۸۰ تا ۸۱ دوسری زبان کے الفاظ سے مزاح		ص ۱۲۵ تا ۱۲۶ دوسری زبانوں سے مزاح
ص ۲۱۴	تکیہ کلام	ص ۱۴۸
ص ۲۲۸	مضحکات	ص ۱۴۹
ص ۲۲۷	محاکات	ص ۱۶۱
ص ۱۵۷	عریانیت	ص ۱۱۴

ص ۱۶۹	چرکینیات	ص ۱۷۸
ص ۱۷۳	مسخرہ	ص ۱۸۳
ص ۱۸۳	نقالی	ص ۱۸۷

گل و گلزار خواجہ عبدالغفور مطبوعہ ۱۹۷۶ء

ص ۱۱۴ جدید دکنی	ص ۱۹۴ دکنی اُردو

شگوفہ زار

ص ۲۷۴ اردو میں صحافت اور ظرافت	ص ۲۰۵ صحافت میں طنز و مزاح

سمن زار ــــــ خواجہ عبدالغفور

ص ۱۱۱	کارٹون	ص ۲۰۸

شگوفہ زار

ص ۹۸	مرقع	ص ۲۱۵
ص ۲۲۰	مزاحیہ کردار	ص ۲۱۶
ص ۲۷۹	مزاحیہ شاعر	ص ۲۲۱
ص ۲۹۵ مزاح نگار		ص ۲۳۷ مزاحیہ نثر نگار
ص ۸۱۴	حرفِ آخر	ص ۲۵۲

اس موازنے کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے خواجہ عبدالغفور کی قہقہہ زار" شگوفہ زار، لالہ زار، گل گلزار اور سمن زار ۱۹۷۸ء تک شائع ہوچکی تھیں۔ مقالہ نگار نے "شگوفہ زار" کو "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" میں تبدیل کرنے کے لیے کچھ اضافہ و ترمیم سے کام لیتے ہوئے اپنی دوسری کتابوں سے مواد بھی اس میں جابجا شامل کرلیا۔ اس کے ساتھ مولوی عبدالباری آسی کی تذکرہ خندۂ گل " رشید احمد صدیقی کی "طنزیات و مضحکات" وزیر آغا کی "اردو ادب میں طنز و مزاح" اور فرقت کاکوروی کی "اُردو ادب میں طنز و مزاح" وغیرہ سے بلا حوالے کے مواد اس میں شامل کرلیا ہے۔ اسلیئے "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" جس میں کتابیات اور اشاریہ تک نہیں شامل نہ تحقیق کے اصول برتے گئے ہیں، اسے لطائف کا ایک ایسا جائزہ کہا جاسکتا ہے جس میں سوائے تواتر کے ساتھ سرقے اور توارد کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اور یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق کی ایک بدنما تصویر پیش کرتا ہے۔

جناب احمد یوسف
خدابخش لائبریری فیلو

ڈاکٹر روحی حسن مجید کا تھیسس

فضل حق آزاد عظیم آبادی۔ عصر حیات اور فن

یہ مقالہ مئی ۱۹۶۳ء میں پی ایچ ڈی کے لئے پٹنہ یونیورسٹی میں داخل کیا گیا تھا۔ نگراں تھے ڈاکٹر اختر اورینوی ستمبر ۱۹۶۴ء میں روحی حسن مجید کا یہ مقالہ پٹنہ یونیورسٹی نے منظور کیا اور پی ایچ ڈی کی سند دی اور جون ۱۹۸۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

ابتدا میں ہمیں تین صفحے کا ایک دیباچہ ملتا ہے۔ پھر پہلا باب "حیات آزاد" ہے، جو صفحہ ۴ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۲۳ پر ختم ہوتا ہے۔

دوسرا باب ـــــ آزاد کا فن۔ صفحہ ۲۴ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۴۱ پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرا باب آزاد کی مختلف ادبی حیثیتیں ایک جائزہ۔ یہ باب صفحہ ۴۱ سے شروع ہوتا ہے اور ۵۹ پر ختم ہوتا ہے۔ چوتھا باب آزاد کی اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ یہ باب صفحہ ۶۱ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۱۸۸ پر ختم ہوتا ہے ـــ پانچواں باب۔ آزاد اپنے عہد میں۔ یہ باب صفحہ ۱۸۸ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۲۲۸ پر ختم ہوتا ہے۔ چھٹا باب۔ آزاد کے اثرات۔(۱) اردو شاعری کے مستقبل اور شاعروں کی جدید نسل پر۔ یہ باب صفحہ ۲۲۸ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۲۳۱ پر ختم ہوتا ہے۔ کتابیات۔ ۴ صفحے ۲۳۱ تا ۲۳۵۔ شعری حصہ۔ صفحہ ۲۳۷ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۴۰۰ پر ختم ہوتا ہے۔

روحی حسن مجید نے اپنے مقالہ میں فضل حق آزاد کے حالات زندگی اور ان کے فن کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ آزاد کے حالات زندگی کے باب میں ہمیں ۲۹ صفحے ملتے ہیں۔ جسے کچھ تو آزاد کی اسی خود نوشت سوانح عمری سے ترتیب دیا گیا ہے، جو ۱۹۵۰ء میں 'صدائے عام' پٹنہ کے عید نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ یا پھر پروفیسر

عبدالمجید شمس کے بیانوں سے پروفیسر موصوف شاہو بیگھہ کے رہنے والے آزاد کے ہم وطن قریبی رشتہ دار اور شاگرد تھے۔
ضرورت اس بات کی تھی کہ مقالہ نگار کچھ اور ایسے لوگوں سے معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتیں جن کا تعلق شاہو بیگھہ سے تھا۔ یا پھر جو ان کے ملنے والے یا رشتہ دار تھے۔ یہ مقالہ آزاد کی وفات کے ۲۲ سال بعد ۱۹۶۴ء میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس وقت مقالہ نگار کو خاصی تعداد میں ایسے لوگ مل جاتے، جنھوں نے آزاد کو دیکھا تھا، ان سے ملے تھے اور ان کے حالات زندگی سے کسی نہ کسی حد تک واقف تھے۔

یہاں میں شاہو بیگھہ کے ایک صاحب سے آپ کا تعارف کراتا ہوں جو اب ستر بہتر کی لپیٹ میں آچکے ہیں، رشتے میں فضل حق آزاد کے بھتیجے ہیں اور ان سے بہت قریب رہ چکے ہیں ——— سید محمد مصطفیٰ صاحب ریٹائرڈ ڈیولپمینٹ آفیسر L I C۔ ان کی نظر سے اس مقالے کا ابتدائی باب، جو ان کے حالات زندگی سے متعلق ہے، گزرا، تو انہوں نے کئی باتوں سے اختلاف کیا۔ مثلاً مقالہ نگار ازدواج کے باب میں لکھتی ہیں۔
ان کا ازدواج شیخ نثار حسین رئیس لودیکٹرہ پٹنہ سٹی مشہور بہ شیخ کنداں کی صاحبزادی سے ہوا۔ اس رشتے کی وجہ سے علامہ کو تیس ہزار روپئے سالانہ کی جائداد ملی، اس کے علاوہ سامان جہیز بھی کافی ملا۔
اب مصطفیٰ صاحب کا بیان سنیں ——— یہ صحیح ہے کہ علامہ کو جہیز میں کافی سامان ملا سونے کے چاول تک ملے تھے، لیکن تیس ہزار سالانہ آمدنی کی جائداد نہیں ملی تھی بلکہ ہوا یہ تھا کہ شیخ نثار حسین کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ فضل الرحمٰن اور ان کی بہن (یعنی شیخ نثار حسین کی صاحبزادی اور علامہ فضل حق آزاد کی زوجہ) کے معاملات طے نہیں ہو رہے تھے۔ یہ دیکھ کر آزاد کے رشتے کے ایک چچا مولوی عبدالحکیم صاحب جو معاملات زمینداری سے کماحقہ واقف تھے اور دوررس نگاہیں رکھتے تھے۔ آزاد کی درخواست پر شیخ فضل الرحمٰن سے ملے۔ انہیں بہت کچھ سمجھایا بجھایا۔ چنانچہ وہ بہن سے معاملات طے کرنے پر راضی ہو گئے۔
تب مولوی عبدالحکیم نے شیخ فضل الرحمٰن سے کہا "عزیزم اجازت دو تو آراضیات کا تخمینہ میں خود ہی کر لوں"۔ شیخ فضل الرحمٰن اس بات پر بھی تیار ہو گئے۔ اس کے بعد مولوی عبدالحکیم نے ایک مواضعات کا ایک سروے کیا اور دیکھا کہ کم و بیش سبھی ٹھیکے پر تھے، لیکن ان کی دوراندیش نگاہوں نے یہ بھانپ لیا کہ ان آراضیات کی آمدنی بڑھائی بھی جا سکتی ہے۔ وہ اس طرح کے سارے معاملات بدانتظامی اور بے توجہی کا شکار رہتے تھے۔ مثلاً یہ کہ ۸۰ بیگھہ زمین ہے تو وہ ۲۰۰/- روپئے سالانہ کے ٹھیکے پر دی ہوئی ہے، یا ڈھائی سو بیگھہ زمین کے ٹھیکے میں ہزار روپئے سالانہ ملتے ہیں۔ چنانچہ مولوی عبدالحکیم نے ان ٹھیکوں کی رقم کا

حساب کرکے ۔/۵۰۰۰ ہزار روپے سالانہ آمدنی کی جائیداد پر شیخ فضل الرحمن سے تصفیہ کرلیا۔اس جائیداد کے حصول کے بعد انہوں نے اس کا نظم و نسق بہتر کیا، آراضیات کی گل اندازی کروائی اور ٹھیکے کی رقم میں اضافہ کیا۔اس طرح مولوی عبدالحکیم کی نگرانی میں کئی سال کی محنت کے بعد یہ آمدنی ۔/۵۰۰۰ سالانہ سے بڑھ کر ۔/۲۰۰۰۰ روپے سالانہ ہوگئی۔

پھر مقالہ نگار پٹنہ میں آزاد کی کوٹھی کے متعلق لکھتی ہیں ـــــ محلہ پیر بہوڑ میں داتا پیر بہوڑ کے ٹھیک سامنے سڑک کی دوسری جانب اس جگہ، جہاں آجکل سائنس کالج کی عمارت کا کچھ حصہ اور یونیورسٹی آفس کی عمارت ہے، علامہ آزاد نے ایک شاندار کوٹھی بنوائی اور وہیں رہنے لگے۔

اول تو یہ کہ داتا پیر بہوڑ کے ٹھیک سامنے سائنس کالج کی عمارت نہیں ہے بلکہ یونیورسٹی لائبریری ہے، اسی لئے یہ بیان یوں بھی غلط ہے۔اس پر یہ کہ مصطفٰے صاحب کہتے ہیں کہ کوٹھی وہاں تھی جہاں اج پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ جغرافیہ کی عمارت کھڑی ہے۔علامہ آزاد اپنی خود نوشت (صدائے عام ـ عید نمبر ۱۹۵۰ء) میں لکھتے ہیں۔

"۴۵ ہزار روپے میں مکان بنایا، گورنمنٹ نے ۲۲ ہزار بمعذرت قیمت ادا کرکے حاصل کرلیا اور توڑ پھوڑ کر میدان کر دیا۔"

سید محمد مصطفٰے صاحب کہتے ہیں کہ علامہ کو تسامح ہوا، وہ کوٹھی حکومت نے ۵۵۰۰۰ روپے میں خریدی تھی۔وہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس اس کا دستاویزی ثبوت تھا، لیکن اب کاغذات نہیں ملتے ہیں۔

مقالہ نگار نے ایک ذیلی باب 'آزاد بحیثیت نقاد' اس مقالے میں شامل کیا ہے۔ ذیل میں آزاد کے کچھ تنقیدی افکار ملاحظہ فرمائیں۔

ایک مضمون 'حد سے باہر' میں لکھتے ہیں۔"ہندوستان جو مغربی خیالات اور مغربی شاعری کے انداز پر اٹھا جاتا ہے اور دن بدن یہاں کی طبیعتیں اسی رنگ کی شاعری میں ڈوبتی جاتی ہیں کیا کسی کا قلم انہیں روک سکتا ہے.... وہ لوگ جو زمانے کا رخ پہچانتے ہیں انہیں کا قلم کچھ اس مضمون کی قدر کرسکتا ہے۔پرانی روشنی پر مرنے والے اس کی قدر کیا جانیں۔آج حالی کی شاعری بری لگتی ہے، کل دیکھنا ان کا کلام سنہرے حرفوں اور سنہری جلدوں میں ہوگا۔ناسخ و آتش کے زمانے کی شاعری خواب و خیال میں بھی نہ ہوگی۔عمدہ شاعری وہ ہے جس میں مضامین عمدہ ہوں، پھر سنجیدہ خوانی اور مشینی صنعتوں سے انہیں

آراستہ کرو۔ یہ ان کی زینت ہے۔ کھوسٹ اور غیر مہذب مضامین میں عمدہ قافیے آئے بھی تو کیا ہوا؟۔ حد سے باہر" یہ مضمون ۱۸۸۶ء میں ماہنامہ آزاد کے ایک ایڈیٹوریل کے جواب میں لکھا گیا۔ یہ آزاد کے مسودات میں موجود ہے" ص۵۰

"لیکن آتے آتے جب نظم کی بنیاد چند قواعد پر ٹھہر گئی اور ان کا وسیع دائرہ تنگ کر دیا گیا تو اس شفاف چشمے کا بہتا ہوا پانی بھی ان جھاڑیوں میں رک کر بہنے لگا اور اس کے ساتھ ہی وہ صاف طبیعتیں بھی مکدر ہو گئیں۔ پھر نظم کی وہ اصل خوبیاں بھی جن کا موقع انسان کو عالم تصویر بنا دینا تھا باقی نہ رہیں۔ استعارات کے پیچ در پیچ سلسلوں اور قواعد کی سخت بندشوں نے ہم کو ایسا جکڑا کہ اس محدود دائرے سے باہر قدم نہ نکل سکے، عمر بھر چلے لیکن جہاں سے چلے تھے وہیں رہے۔ پھر بھی وہ تیز قدم جن کی طبیعتیں مناسب نظم کے قدرتی سرمائے سے مالا مال تھیں، نہ رکے پر نہ رکے اور اسی میدان سے وہ چھلانگیں مارنے لگے کہ قواعد باندھنے والوں کی فکر میں ان کے گرد قدم تک بھی نہ پہنچ سکیں (حد سے باہر ۱۸۸۶ء۔ ص۵۱)

"جب یہ سوال کیا جائے کہ شاعری مقدم ہے یا قواعد شاعری تو جواب یہی ہوگا کہ شاعری" (حد سے باہر ۱۸۸۶ء ص۵۲) "تو ان کی (سعدی) یہ منزلت قواعد شاعری کی پابندی کے لحاظ سے تھی۔ نہیں بلکہ ان نیچرل مضامین کی بدولت جن کا پسندیدہ ہونا بھی نیچرل ہے۔ پھر یہ چند ٹوٹے پھوٹے قاعدے کیا کسی طرح انہیں صدمہ پہنچا سکتے ہیں، نہیں ہرگز نہیں کیونکہ اگر وہ ان کے مطابق نہیں تو وہ خود غلط ہیں" (حد سے باہر ۱۸۸۶ء" ص۵۳) ہر شعر کہنے والا شاعر نہیں ہو سکتا.... میں پوچھتا ہوں کہ قواعد فن شاعری جس طرح اب ہیں کیا بلا کم و کاست ہمیشہ سے یونہی ہیں ؟۔ کیا ان کی مکمل قدریں ایک ہی وقت میں ہو گئی تھیں؟. کیا ان کی ترمیم و تنسیخ ہمیشہ کے لئے ممنوع ہو گئی ہے" (حد سے باہر ۱۸۸۶ء ص۵۳)

"گویا نظم طبعی ایک چڑھتا ہوا دریا ہے کہ اپنے چڑھاؤ میں کچھ اونچ نیچ دیکھتا ہی نہیں۔ گھاس پھونس جو کچھ بھی اس کے سامنے آجائے، سب کو لیتا ہی چلا جاتا ہے۔ بڑا سے بڑا درخت بھی اپنی پھیلی ہوئی گنجان شاخوں سے اس کی موجوں کے تھپیڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا" (حد سے باہر ۱۸۸۶ء ص۵۴)

"جب دماغ سے اجسام تک محسوسات کی الکٹریسیٹی کا تار بندھ جاتا ہے تو دماغ میں ایک روشنی پہنچ جاتی ہے جس کا نام ادراک یا انکشاف ہے۔ جب ہم اپنے مدرکات و محسوسات کی طرف رجوع کرتے

اور دماغی محافظ خانے کی سیر کرتے ہیں تو اسی کا نام خیال کرنا ہے۔" (تاثیر خیال۔ تاج ۲۲ ستمبر ۱۹۰۲ء ص۱ کتاب کا ص۵۵)

"جس طرح شہد کی مکھی اور بھونرے پھولوں پر لپٹے ان کا رس چوستے اور شہد بنا کر نکالتے ہیں، چاہئے کہ ہماری آنکھیں بھی مناظر قدرت پر اسی طرح لوٹ ہوں جس طرح پھولوں پر بھونرے۔۔۔۔ اور ہم بھی اپنے خیالات کو اچھی طرح پکائیں یہاں تک کہ وہ شہد بن جائیں، پھر شہد بن کر ٹپکیں، اور جو دماغ ہی میں شہد نہیں بنے ہیں ان کو زبان کی شکر فشانی کس طرح شہد بنا سکتی ہے۔" (قوت بیانیہ۔ تاج ۲۲ ستمبر ۱۹۰۲ء ص۲ کتاب کا ص۵۵)

"قوت دماغی سے وہ دماغی مراد نہیں ہے جس کو افعال اعصاب اور انتظام بدن ہی فعل ہے کیونکہ یہ حیوانوں میں انسان سے زیادہ ہے بلکہ دماغ کی وہ طاقت مراد ہے، جو احساس حواس خمسہ کی جانچ پڑتال چھان بین ٹھیک کرتی اور اس سے جو خیالات پیدا ہوتے ہیں ان کو منظم کرتی ہے، ان سے ایک نتیجہ نکالتی اور ان کو زبان یا قلم کے حوالے کرتی ہے۔ اس طرح کے زبان و قلم سے ٹھیک وہی باتیں ادا ہوں جو اس کے مافی الذہن ہیں۔ (قوت دماغی۔ تاج ۲۲ ستمبر ۱۹۰۲ء ص۲ کتاب کا ص۵۶)

"لطف کلام تو یہ ہے کہ سنتے ہیں کانوں سے دل تک اتر جائے۔۔۔۔ پھر تمام جسم میں بجلی کی طرح پھیل جائے، نہ یہ کہ کانوں سے دل تک اترتے اترتے گھنٹوں کا وقفہ ہو اور دماغ کو پہاڑ کی چڑھائی چڑھنا پڑے۔

(لطف کلام تاج ۸ دسمبر ۱۹۰۲ء ص۲۔ کتاب کا ص۵۶)

"شاعری و فن شاعری، دو چیزیں ہیں، علیحدہ علیحدہ اور دونوں میں وہی نسبت ہے جو عمارت کو فن تعمیر سے۔۔۔۔ جس طرح فن تعمیر کے دو بڑے اصول استحکام و عافیت دائر و سائر ہیں، اسی طرح فن شاعری میں بھی حالات و مذاق دو قوی اصول ہیں جن کو اس فن میں بہت بڑا دخل ہے۔" شاعری و فن شاعری تاج باگی پور ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء ص۲۔ کتاب کا ص۵۷)

"صرف قابلیت سے کوئی شاعر میر تقی میر یا میر درد نہیں ہو سکتا۔ فن شاعری و لوازمات شاعری کے علاوہ شاعر کی خود اپنی خو بو، طبیعت و طینت دل و دماغ پر نظر چاہیے۔ میر صاحب کا ہر شعر اپنی معنی کے علاوہ ایک عالم رکھتا ہے جس کو ان کی ذات، مقام و مراتب اور ان کے زمانے کے حالات سے ایسا تعلق ہو سکتا جو ہر کو اپنی صورت سے ہو سکتا ہے۔ (لطف کلام تاج ۸ دسمبر ۱۹۰۲ء ص۲ کتاب کا ص۵۸)

آزاد کے تنقیدی افکار جو ۱۸۹۸ء اور ۱۹۰۲ء میں شائع ہو چکے ہیں، ایسے ہیں کہ آج بھی جب کہ [illegible] آزاد کے [illegible] مقالہ نگار نے انہیں ذیلی باب "آزاد کا [illegible]"

میں شامل کیا ہے۔ اگر وہ ان افکار کے ساتھ میں ان کے معاصرین کے تنقیدی افکار کو سامنے رکھ کر ان سے ان کا تقابلی مطالعہ کرتیں اور یہ دکھانے کی کوشش کرتیں کہ آزاد اپنے ان تنقیدی افکار کے سبب نقد و نظر کی دنیا میں ایک بڑا مقام پیدا کر لیتے ہیں تو یہ آزاد کے ساتھ عین انصاف ہوتا۔ لیکن یہ ذیلی باب جو گیارہ صفحوں پر محیط ہے، خاصی بے توجہی کا شکار ہو گیا۔ مقالہ نگار آزاد کی اس حیثیت کو قائم کرانے میں ناکام رہیں اور ان کا یہ کہنا بھی رائیگاں گیا کہ "آزاد کے تنقیدی اشارے ان کے گہرے ناقدانہ شعور کی جھلک دکھاتے ہیں اور یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ذہنی طور پر اپنے زمانے سے کس قدر آگے تھے۔" (ص۵۹)

جیسا کہ میں نے اوپر کی سطروں میں تحریر کیا ہے، مقالہ نگار نے اس مقالے میں کلام آزاد کی ترتیب و تدوین کی ہے اور ۲۱۳ صفحوں میں ان کی نظموں، مثنویوں، غزلوں، قطعوں اور رباعیوں کو یکجا کیا ہے۔

۱۸۷۲ء میں سرسید نے مروجہ شاعری پر جو تنقید کی ہے اسے مقالہ نگار نے اپنے مقالے میں شامل کیا ہے۔

"ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف، تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات بن جاتے ہیں۔" (درس علیگڈھ ۱۹۵۶ء ص۳۶۔ کتاب کا ص۶۵)

اس کے بعد مقالہ نگار نے محمد حسین آزاد کے اس خطبہ صدارت کا اقتباس پیش کیا ہے جسے انہوں نے ۱۸۷۴ء کے ایک تاریخی جلسے میں پڑھا تھا۔

"فصاحت اس کو نہیں کہتے کہ مبالغے اور بلند پروازیوں کے بازوؤں سے اڑتے قافیوں کے پروں سے فرکرتے گئے، لفاظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم .... قہر یا غضب جو خیال ہمارے دل میں ہوں، اس کے بیان سے وہی اثر وہی خوشی سننے والوں پر چھا جائے جو اصل کے مشاہدے سے ہوتا ہے (خطبہ صدارت محمد حسین آزاد ۱۸۷۴ء)

مقالہ نگار خود بھی لکھتی ہیں "حالی، مولانا محمد حسین آزاد کی ادبی تحریک جو در اصل نظریاتی طور پر سرسید کی عقلی و علمی اور اصلاحی منصوبے کا ایک اہم جزو تھی اس غیر فطری ذریعہ اظہار کے خلاف پہلی بار اعلان جہاد کرتی ہے (ص۶۲)

یہ ۱۸۷۴ء کی کانفرنس کی طرف اشارہ ہے۔ مقالہ نگار نے قاضی رضا حسین کا ذکر بھی کیا ہے جو بہار میں سرسید کے رفیق تھے اور جن کی معیت میں فضل حق آزاد نے الہ آباد اور حیدر آباد کا سفر کیا تھا۔

جامعہ علی گڑھ کے قیام کے لئے سرمایہ کی فراہمی کا مسئلہ جب درپیش ہوا تو سرسید، حالی، شبلی کے

ساتھ آپ بھی اس مشن میں حیدر آباد گئے۔" (ص۱)

اور پھر یہ بھی لکھتی ہیں کہ بہار میں تو گویا وہ ان شاعروں میں پہلے ہیں جنہوں نے سرسید اور حالی کی اصلاح ادب و معاشرت کی تحریک کا عملی طور پر ساتھ دیا۔ فضل حق آزاد نے ایک طرف سچے اور پاکیزہ قومی جذبات کا اظہار کر کے مقصدی شاعری، ور نظم نگاری کو فروغ دیا، دوسری طرف قومی اور ملی کاموں میں حصہ لے کر اپنی ہوشمندی کا ثبوت دیا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں بھی ان کی شرکت ہوتی رہی۔ ندوۃ العلما کے سالانہ جلسوں میں بھی وہ برابر شریک ہوتے تھے۔" (ص۱)

لیکن ان سب کے باوجود وہ اس بات کو واضح طور پر نہیں پیش کر سکیں کہ کیا فی الواقع وہ سرسید اسکول کے شاعر ہیں یا یہ کہ وہ نظم نگاری میں نظیر کی روایات کی توسیع کرتے ہیں کیوں کہ یہاں نظموں کے انتخاب میں شبنم، شفق، بہار برق تاب، سیر صبح، دانۂ رزق، دھوپ، افیون، رمضان، شب بارات جیسی نظمیں بھی شامل ہیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے نظیر سے قریب تر دکھائی دیتی ہیں۔

جس شاعر کا ذکر کیا جائے اگر وہ شاعر چند در چند وجوہ کے سبب وہ مقام نہ پا سکا ہو جس کا وہ مستحق ہے تو مقالہ نگار کو اس کا صحیح مقام دلوانے کی سعی کرنی چاہیے۔ اگر وہ اس کوشش میں کامیاب رہا تو مقالہ بھی کامیاب ہے۔ اس مقالے میں مقالہ نگار نہ تو بحیثیت شاعر فضل حق آزاد کو وہ مقام دلا سکی ہیں جس کے وہ حقدار تھے، اور نہ وہ نقاد کی حیثیت سے ان کے مقام کو ESTABLISH کرا سکی ہیں۔

انہیں آزاد کی نظموں کا تجزیہ کرنا چاہیے تھا۔ ان کے مواد و اسلوب پر بحث کرنی چاہیے تھی، اور پھر ان کے ہم عصروں اور ان کے پیشروؤں سے نظم و غزل میں ان کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہیے تھا۔

مقالہ نگار نے تین ذیلی ابواب، معرکۂ آزاد و شاد، معرکۂ آزاد و شوق نیموی اور معارضۂ آزاد و اقبال میں ادبی نوک جھونک اور معرکہ آرائیوں کے قصے سنائے ہیں جو قطعی لاحاصل ہیں۔ اس نوع کی بحثیں جن میں کچھ عروضی غلطیاں اور زبان و بیان کی خرابیاں سامنے آتی ہیں، ہر دور میں ہوتی رہی ہیں، لیکن کبھی ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے اور نہ ان بحثوں کے سبب اساتذہ کے مقام میں کوئی فرق آیا ہے۔ شاد، شوق نیموی اقبال اور آزاد سبھی اپنے اپنے مقام پر قائم رہے ان بحثوں میں ہٹ دھرمیاں اور کج بحثیاں شروع ہو جاتی تھیں اور ان کا کوئی ایڈوکیٹو پرپس نہیں ہوتا تھا۔

چھٹے باب۔ "آزاد کے اثرات" میں ہم یہ سمجھتے تھے کہ مقالہ نگار آزاد کی شاعری کے امپیکٹ کو کھلے

کوشش کرینگی، لیکن خلاف امید انہوں نے یہ تحریر کیا ہے کہ آزاد استادی اور شاگردی کے رواج کے سخت
الف تھے، لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر عبدالمجید شمس کے علاوہ ایک اور شاگرد محمد عبدالغفار خاں مدیر ترجمان سرحد،
ت سر کے متعلق بھی یہ گمان ہے کہ وہ آزاد سے اصلاح لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

پھر وہ ڈاکٹر اختر اورینوی کا ایک اقتباس پیش کرتی ہیں جو درج ذیل ہے۔

"عصر جدید کی اردو نظم نگاری کو حالی محمد حسین آزاد اور علامہ اقبال کے ساتھ ساتھ علامہ آزاد عظیم آبادی نے بھی متاثر کیا ہے۔ ان کے آخری دور کے ہم عصر شعرائے بہار جناب شفق عماد پوری ڈاکٹر عظیم الدین سرپر کابری اور مسلم عظیم آبادی نے آزاد کی پیش کردہ روایات کا احترام کرتے ہوئے بہار میں قومی، جذبی اور موضوعاتی شاعری کو فروغ پہنچایا۔" ص ۲۲۹)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اختر اورینوی کو اپنا پہلا جملہ کمزور سا دکھائی دیا، تو انہوں نے فی الفور
امہ آزاد کو بہار کے شعراء کی صف میں ایک اعلیٰ مقام پر فائز کر دیا۔

اس مقالے کے ابواب اور ذیلی ابواب کی تفصیل میں مضمون کے ابتدائی حصے میں دے چکا ہوں
لئے ان کے سلسلے میں مزید کچھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس مقالے کی سینوپسس
طور پر بنائی جاتی تو یقینی اس کے سود مند نتائج برآمد ہوتے۔

(۱) فضل حق آزاد۔ حالات زندگی۔ ۵۰ صفحے (۲) فضل حق آزاد کی نثر نگاری اور انکے تنقیدی افکار
صفحے (۳) آزاد اور ان کا ادبی ماحول ۵۰ صفحے (۴) آزاد کی شاعری کا مطالعہ ۸۳ صفحے (۵) کتابیات
صفحے (۶) شعری حصہ ۱۶۲ صفحے کل ۴۰۰ صفحے۔

چھوٹے چھوٹے ذیلی ابواب کا سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار کھل کر کوئی بات کہنے میں ناکام رہتا ہے۔

کتابیات میں مقالہ نگار نے اردو کی ۳۰ کتابوں کی فہرست پیش کی ہے۔ اس فہرست میں احمد اللہ ندوی کا
رہ "مسلم شعرائے بہار" شامل نہیں ہے۔ انگریزی کی اٹھارہ کتابیں شامل ہیں جن میں مارکسی نقاد CRISTOPHER
CODWELL کی ILLUTION & REALITY بھی ہے اور مولانا آزاد کی انڈیا ونس فریڈم بھی ہے
ان کتابوں کا اس تحقیقی مقالے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دواوین، شعری مجموعوں اور بیاضوں کی فہرست میں ۲۵ کتابیں ہیں، جنمیں تین بیاض
ر بیاض آزاد نمبر۱، بیاض نمبر۲، بیاض شہبانہ پھر تین مجموعے انگریزی میں شیلی کیٹس ورڈس ورتھ اور ٹی ایس ایلیٹ کے ہیں۔ اسکے
رسائل و جرائد کی فہرست پیش کی گئی ہے جس میں ۲۰ رسالے شامل ہیں، اس میں البنچ بانکی پور کی ۱۲ فروری ۱۸۸۵ء سے دسمبر ۱۹۰۶ء
کی مکمل فائل اور "ندیم" گیا ۱۹۳۱ء تا ۱۹۴۳ء کی مکمل فائل بھی شامل ہے

ڈاکٹر روحی حسن مجید
مجیدولا سلطان گنج، پٹنہ

جواب

حیاتِ آزاد کے سلسلے میں ہو سکتا ہے کہ سید محمد مصطفےٰ صاحب کی یادداشت، کے حوالے سے مقالہ نگار کو چند غیر اہم جزویات میں اختلاف ہو، مگر وہ ایسے اہم نکتے نہیں جن کا آزاد کے فکر و فن پر کوئی پائیدار اثر پہنچتا ہو۔ لہٰذا میں اصولاً اس غیر متعلق اعتراض کا جواب دینا نہیں چاہتی۔

اب رہا مقالہ نگار کا وہ اعتراض جس کا تعلق آزاد کی تخلیقی صلاحیت سے ہے۔ فرماتے ہیں:

"جس شاعر کا ذکر کیا جائے اگر وہ شاعر چند در چند وجوہ کے سبب وہ مقام نہ پا سکا ہو جس کا وہ مستحق ہے تو مقالہ نگار کو اس کا صحیح مقام دلوانے کی سعی کرنی چاہیے۔ اگر وہ اس کوشش میں کامیاب رہا تو مقالہ بھی کامیاب ہے۔ اس مقالے میں مقالہ نگار نہ تو بحیثیت شاعر فضل حق آزاد کو وہ مقام دلا سکی ہیں جس کے وہ حق دار تھے اور نہ وہ نقاد کی حیثیت سے ان کے مقام کو ESTABLISH کرا سکی ہیں"

میرے خیال میں ایک توضیحی رجحان کے ساتھ اجتماعی نقطۂ نظر سے پیش کیے ہوئے مقالے سے نہ اس طرح کی امید کی جا سکتی ہے اور نہ اس نوعیت کا اعتراض حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے۔ مقالہ نگار نے آزاد کے عصر و حیات اور فکر و فن کا تمہیدی جائزہ لیتے ہوئے اردو دنیا کو آزاد کی شاعری سے روشناس کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"اس مقالہ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مستند طور پر آزاد کی شاعری کا مقام متعین کیا جائے۔ اس سلسلے میں ان کی زندگی کے حالات اور اس کے عہد کے واقعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ریاست بہار اور خصوصاً عظیم آباد کی ادبی روایات کا جائزہ لیتے ہوئے آزاد کا اس کے ہمعصر شعراء سے موازنہ بھی کیا گیا ہے نیز یہ سعی بھی ہوئی ہے کہ آزاد کی صحافت، نثر نگاری، تنقیدی شعور اور فارسی و عربی شاعری پر صلاحیت کا تذکرہ بھی مناسب طور پر کر دیا جائے تاکہ ان کی "ہمہ جہت تخلیقی صلاحیت" کا کچھ اندازہ ہو سکے ..... آزاد کے ان مطبوعہ و غیر مطبوعہ شعری کارناموں کا انتخاب شامل ہو جائے جو مختلف ذرائع سے دستیاب ہو سکے ہیں۔" (دیباچہ صفحہ اول)

بقول مقالہ نگار، یہ مقالہ درحقیقت آزاد کی شخصیت کے گوناگوں تخلیقی پہلو MULTIPLE CREATIVE FACETS

کو اُجاگر کرنے کی سعی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اردو دنیا کو کلام آزاد سے مستفیض کرنے کی ایک تدبیر۔ اس وسیع اجتماعی طریقۂ کار کے تحت فنکار کے ہر ہر پہلو کو یکساں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ پیش کرنا نہ اس مقالے کا مقصد تھا اور نہ اس کی تدوین میں اس کی گنجائش تھی۔

لہٰذا اس سے دست کشی، مقالے کی ناکامیابی کی دلیل نہیں بلکہ اس کے منصوبے کی ایک ناگزیر کڑی ہے، یا اس کے حسن ترتیب کی بندش۔

IN FACT, WITHIN THE CONSTRAINTS OF ITS BROAD AIMS AND MULTIDISCIPLINARY PERSPECTIVE, THIS IS NOT THE SHORT COMING OF THE WORK UNDERTAKEN, BUT, RATHER THE REQUIREMENT OF THE TASK IN HAND.

مختصراً آپ اس تصنیف کو ایک تعارف، ایک آغاز، ایک تمہید، ایک عنوان کہیے۔ آپ اسے ایک OVERTUVE ہی سمجھئے اس امید اور یقین کا، جس سے فیضیاب ہو کر دوسرے مقالہ نگار آزاد کی تخلیقی صلاحیت کے انفرادی پہلو کو امتیازی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ پیش کر سکیں گے۔

بہرحال میرا ذاتی مشورہ تو یہ ہے کہ مقالہ نگار فضل حق آزاد کے "عمر حیات اور فن" کو نئی ترتیب دینے کی کوشش کے بجائے، اپنے پسندیدہ عنوانات میں سے کسی ایک عنوان پر تفصیلی مقالہ پیش کریں ۔ وہ اردو دنیا کے لیے یقیناً "سودمند" ثابت ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی اس بات کی بے حد مسرت ہوگی کہ میری یہ حقیر تحقیقی کوشش رائیگاں نہ ہوئی بلکہ مستقبل کے محققین کی دلچسپی اور کلام آزاد سے روشناسی کا باعث بنی۔

●

ڈاکٹر سید اعجاز حسن امام اعظم
شعبۂ اُردو
مہاراج مہیش ٹھاکر متھلا کالج، دربھنگا

ڈاکٹر عبدالقیوم کا تھیسس

محسن دربھنگوی۔ حیات اور شاعری

جناب عبدالقیوم نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ایک تحقیقی مقالہ "محسن دربھنگوی۔ حیات اور شاعری" کے عنوان سے جناب ڈاکٹر محمد طیب صدیقی ریڈر شعبۂ اُردو ایل' این۔ متھلا یونیورسٹی دربھنگا کی نگرانی میں تیار کیا ہے۔ اس مقالہ پر ایل' این، متھلا یونیورسٹی، دربھنگا نے ۱۹۸۵ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی تفویض کر دی ہے۔ یہ مقالہ ۲۲۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ تحقیق کا کام جس قدر عرق ریزی کا ہے اسی قدر کچھ فارمولائی بھی ہے۔ اور یہ کام جو خاص طور پر یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ اس میں تحقیق کے کچھ ضابطے ہیں جن کی پابندی لازمی و ضروری ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مواد کی کمی کے سبب غیر ضروری عناصر کو بھی داخلِ تحقیق کر لیا جاتا ہے تاکہ تھیسس کی ضخامت سے بھی کام کی قدر و قیمت کا تعین کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ ریسرچ ٹاپک کی منظوری کے سلسلہ میں جو پینل یونیورسٹی کے اساتذہ کی ہوتی ہے اس میں یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایسے حضرات بھی شامل ہوں جو تحقیق کے موضوع سے متعلق ممکنہ واقفیت بھی رکھتے ہوں۔ ایسی صورت میں سیناپسس SYNOPSIS بنانے میں اگر کوئی نئی تکنک اپنائی جائے تو SYNOPSIS اور ٹاپک کی منظوری دشوار ہو جائے۔ اس لیے ایک فارمولے کے مطابق ہی SYNOPSIS تیار کرنے کا کام بھی کیا جاتا ہے۔ اس لیے تحقیقی جھول باقی رہ جاتا ہے۔ ان دشواریوں کو عبور کرنے کے لیے قدرے ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن عام طور پر محقق اس پر توجہ نہیں دیتا اور نگراں بھی انتہائی کرخت انداز میں ابواب کے عین مطابق ہی کام کرنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے کام کرنے والا اگر ابواب میں ترمیم و تنسیخ کی خواہش بھی رکھتا ہے تو بھی وہ کچھ زیادہ مقر نہیں ہوتا۔ ریسرچ تھیسسوں کا کم و بیش یہی حال ہے۔ اسے خامی نہ مان کر معیار تصور کیا جاتا ہے اور زیرِ نظر تھیسس یعنی محسن دربھنگوی" حیات اور شاعری" بھی اس معیار کے عین مطابق ہے۔

اس تھیسس (THESIS) کے پانچ ابواب ہیں۔ باب اول میں" دربھنگا کا سیاسی اور سماجی پس منظر" پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کی تاریخی اہمیت ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ محقق کو تاریخ سے گہری دلچسپی ہی ہے اور ایک پھیلے ہوئے تاریخی حالات کو جس کا تعلق دربھنگا سے ہے بہت ہی اختصار کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس

باب میں محقق نے بڑی محنت کی ہے۔ اور اس نے ان بادشاہوں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق دربھنگا سے بالواسطہ یا بلاواسطہ رہا ہے۔ جن میں قابل ذکر: لچھوی خاندان، گپت خاندان، ہرش وردن، کرناٹک خاندان، محمد بن بختیار خلجی، بہلول لودی، عہد عالمگیری کے فوجداران نواب نصیری خاں، غلام محمد خاں، ہادی خاں، اسفندیار خاں، فدائی خاں، ملا اور شیخ محمد جیون وغیرہ فوجداری کے منصب پر فائز تھے۔ اس باب میں محقق نے ہمیں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دربھنگا کی سرزمین عہد قدیم سے ہی حکمرانوں کی سرپرستی کے سبب علم و ادب کا گہوارہ رہی ہے۔ اور ان کی توجہ دربھنگے کی جانب اگر سیاسی اعتبار سے اہمیت کا حامل رہی ہے تو دوسری طرف یہاں کے دانشوروں علماء اور فضلاء نے بھی حکمرانوں کی توجہ مبذول کرائی۔ کیونکہ دربھنگا مسلمانوں کی آمد کی ابتدا سے ہی اسلامی تہذیب سے متاثر ہو رہا تھا۔ اس کا سبب جیسا کہ ڈاکٹر اختر اورینوی "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" میں رقم طراز ہیں:

"پروفیسر حسن عسکری نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ شمالی بہار عہد غلامان میں ہی سلطنت دہلی کے ماتحت ہو گیا تھا ممالک محروسہ میں دربھنگا کا نام تاریخ میں ملتا ہے اس عہد میں دہلی سے بنگال جانے والی فوجیں شمالی بہار سے آزادانہ گزرتی تھیں۔" (ص ۸۶)

اس باب میں دربھنگا کا ادبی و لسانی پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایک اہم بات یہ بتائی گئی ہے کہ اردو کے زبان و اسلوب کے پیش نظر ماہرین لسانیات نے ہند ترکمانی تہذیب کا مرقع یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ تہذیب کا ثمرہ قرار دیا اور دربھنگا کی سرزمین کو ہند و مسلم اتحاد کی جیتی جاگتی تصویر بتایا۔ محقق نے یہ بھی بتایا ہے کہ فوجی چھاؤنی ہونے کے سبب بہت سے خاندان دربھنگا میں سکونت پذیر بھی ہو گئے۔ نیز یہ کہ صوبہ بہار کی تین ہند آریائی علاقائی بولیاں ہیں:

مگہی، بھوجپوری اور میتھلی۔ ان سب بولیوں میں ریختہ کی شکلیں پیدا ہوئیں اور بہار میں ہی ریختہ اردو کے لیے بنیادی زمین بنی۔ باب دوم میں متھلا میں اردو زبان و ادب کے ارتقا کے عنوان سے محقق نے کچھ اہم باتیں بتائی ہیں۔ جس میں قابل ذکر یہ ہیں۔ سنسکرت کا جید اور عظیم المرتبت فن کار "کالی داس" کا تعلق دربھنگا کی سرزمین سے تھا اور میتھلی کا باوا آدم "ودیاپتی" متھلا ہی کا رہنے والا ہے۔ اس بات کو بتانے کی ضرورت محقق کو اس لیے پڑی کہ ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں کا سلسلہ دربھنگا اور متھلا میں عرصۂ دراز سے رہا ہے بلکہ اس کے خمیر میں۔ مزید برآں یہ لکھتے ہیں کہ زیب النسا شہنشاہِ عالمگیر (اورنگ زیب) کی بیٹی کے استاد ملا ابوالحسن کا تعلق اسی دربھنگا کی سرزمین سے تھا۔ جو عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ ان فارسی اور عربی ادبیات کے ماہرین کی موجودگی اردو ادب کا خام مواد تیار کرنے میں معاون ہوئی۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہی زمانہ دربھنگا میں اردو شاعری کی ابتدا کا ہے۔ فرد دربھنگوی کا ذکر خاص طور سے کیا ہے اور انھیں غلام ہمدانی مصحفی لکھنوی کا شاگرد بتایا ہے۔ یہ زمانہ ۱۱۶۶ھ تا ۱۲۴۰ھ کا ہے۔

عالمگیر ثانی اور شاہ عالم کا دور ۱۱۶۷ سے ۱۱۷۳ھ ہے۔ اس کے بعد کامل دربھنگوی، خیر رحمانی دربھنگوی کا ذکر کیا ہے۔ لکھنوی شعرا کا انداز اور زبان کی صفائی ان شعرا کے یہاں بھی ملتی ہے۔ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ فرد دربھنگوی کا ایک مطلع ملاحظہ فرمایئے ؎ کبھی کعبہ کبھی بت خانہ ہے مسکن اپنا ؛ دین و مذہب کہوں کیا شیخ و برہمن اپنا

ذبیح دربھنگوی، کلیم متھراپوری، کاشف دربھنگوی، عاجز ستمل پوری، عالی دربھنگوی، اکبر متھراپوری، شجر دربھنگوی، وصال دربھنگوی، طیب دربھنگوی، بسمل دربھنگوی، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، اسحاق دربھنگوی، بیدل دھرم پوری، عارف حسین، سعادت پیغمبر پوری، خیر رحمانی، مائل دھرم پوری، ناظم صدیقی دربھنگوی، قمر دربھنگوی، حکیم سوزاں، نظر دربھنگوی، بہار دربھنگوی، فطرت دربھنگوی، شبنم دربھنگوی، ہری بھگت نارائن شوخ وغیرہ۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم شعراء دونوں شامل ہیں۔ نثر نگاروں میں مولانا مرشد حسن کامل، اجودھیا پرشاد بہار، منشی بہاری لال فطرت، کالی پرشاد، مولوی منیر الدین حسین برق، خلیل بریلوی، مولانا خیر رحمانی، عبدالرحمان وصال پیغمبر پوری، مولوی محمد اسحاق، مولانا فرمان علی طیب، عبدالحلیم ناظم صدیقی، مولانا عارف حسین نقشبندی، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، سلیمان اشرف، شرف عالم آرزو جلیلی، مظہر امام وغیرہ۔

اسی باب دوم کے تحت ایک ذیلی گوشہ اخبارات و رسائل کے سلسلہ میں بھی ہے اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شہر دربھنگا میں علمی و ادبی سرگرمیاں کس نہج پر تھیں۔ ۱۹۰۴ء میں "مسیحا" کے نام سے ایک ماہنامہ شائع ہوا جس کے مدیر ابوالحسنات ناصر دہلوی تھے۔ "البدر" یہ ہفتہ وار تھا۔ اس کی اشاعت ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ اس کے مدیران تھے محمد نظیر وکیل، عبدالغفار عبرت، اور طٰہٰ الٰہی فکری۔ ماہنامہ "پروانہ" فروری ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ مدیران تھے۔ طٰہٰ الٰہی فکری، محمد قمر الدین قمر۔ ۱۹۲۹ء میں ماہنامہ "بشریٰ" ملکی چک دربھنگا سے شائع ہوا۔ اس رسالہ کے مدیران حکیم عبدالعزیز طیب شہر اور سوزاں سہسرامی تھے۔ اسی ملکی چک سے ان ہی بزرگوں کی ادارت میں ماہنامہ "آفتاب" ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ "مجلہ سلفیہ" ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا جس کے مدیر ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی (مدرسہ احمدیہ سلفیہ لہریا سرائے دربھنگا) تھے۔ "ہونہار" یہ ماہنامہ پستک بھنڈار لہریا سرائے، دربھنگا سے شائع ہوا۔ جس کے سال اشاعت کے بارے میں محقق نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں "الہدیٰ" ہفت روزہ پھر پندرہ روزہ شائع ہوا جو ہنوز جاری ہے۔ یہ مدرسہ احمدیہ سلفیہ لہریا سرائے دربھنگا کا ایک آرگن ہے۔ اس کے مدیر ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں ماہنامہ "ہمالہ" شائع ہوا جس کے لیے خصوصاً شاؔش مظفر پوری کو دربھنگا بلایا گیا۔ اس کے دیگر مدیران حسنین سید جامعی اور عبدالعلیم آسی تھے ——— "صبح زندگی" ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا اس کے مدیر بقول

محقق محمد ہاشم ہیں حالانکہ اس کے مدیر سلمان احمد تھے۔ ۱۹۴۹ء میں دوماہی "نئی کرن" منظر عام پر آیا جس کی ادارت میں مظہر امام اور منظر شہاب کا نام درج ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ہفت روزہ "سلام" شائع ہوا جس کے مدیر سلمان ندوی تھے۔ ماہنامہ "افق" ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا اس کے مدیر شمیم سیفی تھے۔ "نادی" اور "شگوفہ" احمدیہ سلفیہ لہریا سرائے دربھنگا کا سوونیر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ "سیرت" ہفت روزہ ۱۹۵۸ء میں زین العابدین الحسنی جالوی کی ادارت میں شائع ہوا۔ "رفتار نو" دوماہی ۱۹۶۱ء میں منظر امام اور مجاز نوری کی ادارت میں شائع ہوا۔ ماہنامہ "شباب" اسلم آزاد کی ادارت میں ۱۹۶۱ء میں مولانگر سے شائع ہوا ——— ہفت روزہ "قومی تنظیم" جواب پٹنہ سے روزانہ شائع ہو رہا ہے ۱۹۶۲ء میں مدیر عمر فرید صاحب کی ادارت میں شائع ہوا۔ "اشرف العرفان" یہ ماہنامہ ۱۹۶۸ء میں مدیر حکیم عبدالمنان پوہدی بیلا (دایہ بینی پور دربھنگا) شائع ہوا۔ "حسن و شباب" مطیع الرحمٰن غوثی اور ڈاکٹر دہر ناصری کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ لیکن محقق نے سال اشاعت نہیں درج کیا ہے اور اس کا مدیر مولانا عبدالعلیم آسی کو قرار دیا ہے۔ "ہم اور آپ" ہفت روزہ شوکت خلیل، شاکر خلیق اور شمیم سیفی کی ادارت میں شائع ہوا۔ سن اشاعت درج نہیں ہے۔ "توازن" سہ ماہی جس کے مرتب نجیب اختر، نگراں ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی تھے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ "جدید سلسلۂ جنگ" ایک نیم ادبی اخبار ہے جس کے ایڈیٹر محمد مطیع الرحمٰن نعمانی ہیں۔

ان اخبارات و رسائل کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دربھنگا میں زبان اور ادب کی ترویج و اشاعت کا سلسلہ عرصۂ دراز سے رہا ہے۔ محقق موصوف نے دربھنگے کے دینی مدارس کا تذکرہ نہیں کیا حالانکہ انھیں اداروں نے زمانہ قدیم سے علم و زبان کی قندیل روشن رکھی اور بڑے بڑے علمائے نے انھیں مدرسوں سے استفادہ کیا، جن میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اور علمائے پھلواری شریف قابل ذکر ہیں۔

باب سوم میں محسن دربھنگوی اور ان کے آباو اجداد کا تذکرہ ہے۔ اس میں ایک کرسی نامہ پیش کیا گیا ہے۔ اس تذکرہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ محسن دربھنگوی کے جدّ اعلیٰ کے خاندان کے افراد جو اب بھی راجپوت ہیں جو بیلا گونڈ سنگھ میں آباد ہیں اور محسن کا موجودہ خاندان بیلا آدم میں بسا ہوا ہے۔ یہ ضلع مظفر پور میں پڑتا ہے۔ محسن دربھنگوی کے والد مولوی محمود عالم مرحوم دربھنگا کورٹ سے منسلک تھے۔ ان کی دو شادیاں تھیں۔ پہلی شادی سے مولوی محمد محسن اور تین بہنیں سلمہ خاتون، آمنہ خاتون، اور حسنہ خاتون اور دوسری بیوی سے دو لڑکے محمد انس اور مسعود عالم اور دو لڑکیاں آمنہ اور میمونہ تھیں۔ آپ کا خاندان دہلی سے آکر عہد شاہجہانی میں مقیم ہوا۔ زمین داری کے بعد کاشت کاری کا پیشہ اختیار کیا۔ فارسی اور عربی کی تعلیم ان کے خاندان میں موجود تھی لیکن انگریزی کی تعلیم سے بیگانہ تھے۔ انگریزی کی تعلیم محسن دربھنگوی کے والد سے

شروع ہوئی۔ جنھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی اور دسویں جماعت پاس کیا۔ مولوی محمد محسن خود ہی فرماتے ہیں کہ ان کی والدہ کا انتقال جب ہوا تو ان کے والد موجود نہیں تھے۔ بعد میں زندگی بھر ان کی زبان پر امیر خسروؒ کا یہ شعر رہا ؎

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم　　　پس از آں کہ من نہ مانم بہ چہ کار خواہی آمد

ان کی والدہ شاہ پور بگھونی ضلع سمستی پور کی تھیں۔ ان کے نانا منشی جنت حسین تاج پور کورٹ میں مختار تھے۔ عورتیں گھر ہی پر تعلیم حاصل کیا کرتی تھیں۔ ماں کا سایہ عہدِ طفلی میں ہی محسن کے سر سے اٹھ گیا۔ محمد محسن ۱۲ر جولائی ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ بعد ازاں مکتب میں داخل کیے گئے۔ محسن ۱۹۱۳ء میں نارتھ بروک ضلع اسکول دربھنگا میں داخل ہوئے اور میٹریکولیشن فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ ۱۹۲۱ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جی۔ بی۔ بی۔ کالج مظفر پور، جو آجکل ایل۔ ایس۔ کالج کے نام سے جانا جاتا ہے، داخلہ لیا۔ ابتدائی دو سال سائنس کے مضامین کے ساتھ وقت برباد کیا۔ انھیں سائنس سے کوئی ذوق نہیں تھا۔ مظفر پور رام گنج میں مقیم رہے۔ جہاں سے کالج کی دوری ڈیڑھ میل تھی۔ صحت کی خرابی کے سبب وہ آئی۔ ایس سی۔ کا امتحان دیے بغیر دربھنگا لوٹ آئے۔ مگر اپنے طبعی ذوق کے سبب اپنی دلچسپی کی کتابیں پڑھتے رہے۔ تین سال ضائع کرنے کے بعد ۱۹۲۴ء میں بی۔ این۔ کالج پٹنہ میں آئی۔ اے۔ میں داخلہ لیا۔ اس دوران ادبی کتابیں پڑھنے کا ذوق تیز تر ہوا۔ انگریزی اور اردو ادب کی بیشتر کتابیں پڑھیں۔ ۱۹۲۶ء میں آئی۔ اے۔ پاس کیا اور ۱۹۲۷ء میں بی۔ اے۔ کی تعلیم کے لیے جی۔ بی۔ بی۔ کالج مظفر پور لوٹ آئے۔ اس بار ہوسٹل میں قیام کیا۔ درسی کتابوں سے زیادہ اپنی پسند کی کتابیں پڑھتے رہے۔ اسی کالج کے "بزم ادب" کے سکریٹری رہے۔ ان کے ہم جماعت پروفیسر سید اجتبیٰ حسین رضوی، سید صباح الدین عبدالرحمان، محمد اسماعیل وحشی، بابو شیو کمار پرشاد، اور بابو رام چندر پرشاد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہیں سے محسن کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ کالج کے پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد اور بابو اودھ بہاری بیدلؔ اس وقت کے صاحبِ طرز اور معتبر شاعر تھے۔ ظاہر ہے کہ محسن نے ان سے ضرور کسبِ فیض کیا ہوگا۔ جس کی وضاحت فاضل محقق نے نہیں کی ہے۔

۱۹۳۲ء میں انھوں نے بی۔ ایڈ۔ کیا اور اس کے قبل ۱۹۳۰ء میں مظفر پور ضلع اسکول میں عارضی طور پر تقرری ہوئی جہاں انھوں نے انگریزی اور جغرافیہ کا درس دیا۔ ۱۹۳۴ء میں شیعہ مسلم ہائی اسکول لہریا سرائے دربھنگا میں ہیڈ ماسٹر ہوگئے جہاں مستقل ۱۹۶۵ء تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

محسن کی شادی ۱۹۳۶ء میں معصومہ خاتون بنت محمد ابراہیم ہیش پٹی (سمستی پور) سے ہوئی۔ معصومہ خاتون مولوی محسن کی خالہ زاد بہن بھی تھیں۔ ۱۹۶۴ء میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا۔ محسن دربھنگوی کے تین بچے ایام طفلی میں ہی فوت کر گئے

زندہ بچوں میں سب سے بڑی لڑکی شہناز بانو ہے۔ جس کی شادی ڈاکٹر ظفر مناف جیلانی کھہرولی سے ہوئی۔ دوسری لڑکی شہزاد بانو
تیسری لڑکی شگفتہ بانو، چوتھی لڑکی خجستہ بانو تھیں۔ تمام لڑکیوں کو انھوں نے پڑھایا۔ اسی درمیان میں شفیع مسلم ہائی اسکول
لہریا سرائے دربھنگا سے فرصت لے کر کٹیہار چلے گئے۔ اور کٹیہار سے لوٹ کر پھر شفیع مسلم ہائی اسکول دربھنگا میں آئے۔
اور یہیں سے ۳۱ اگست ۱۹۶۸ء کو اپنے منصب سے سبک دوش ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کھہرولی کے لوگوں کی ایما پر
۱۹۶۹ء میں درسگاہ اسلامی کھہرولی کے مدرس اول رہے۔ ۱۹۷۳ء میں ایچ۔ بی۔ صغرا حسن میموریل گرلس ہائی اسکول دربھنگا
کا قیام عمل میں آیا تو وہاں بہ حیثیت ہیڈ ماسٹر رہے۔ اور ۱۹۷۱ء تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے اپنی بڑی بیٹی شہناز بانو
کے گھر ہی یعنی کھہرولی میں قیام تادم تحریر رہے۔ محسن کو دربھنگا میں استاد شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں کی
زیادہ تر ادبی انجمنوں اور مجلسوں کی صدارت آپ کے ذمہ ہوتی تھی۔

باب چہارم میں ادبی انجمنوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان انجمنوں کی حیثیت مقامی تھی۔ اس میں کچھ فعال انجمنیں تھیں
کچھ غیر فعال اور کچھ انجمنیں جو کالجوں میں قائم تھیں۔ ان کا بھی ذکر ہے۔ زیادہ تر انجمنیں شعری نشستیں اور مشاعرے کیا کرتی تھیں
جس میں محسن دربھنگوی استاد شاعر کی طرح اپنے شاگردوں کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے اور عام طور پر صدارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔

باب پنجم میں محقق نے محسن دربھنگوی کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ یہ بھی اطلاع فراہم کی ہے کہ ۱۹۲۱ء سے
اب تک وہ شعر گوئی کی طرف متوجہ رہے فارسی اور اردو کی کئی صنفوں میں انھوں نے اپنی تخلیقی اور جمالی شخصیت کا
اظہار کیا ہے۔ اشاعت کی طرف سے بے اعتنائی برتتے رہے۔ لیکن اب تک ان کے دو مجموعے اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔
۱۹۵۹ء میں ان کا مجموعۂ کلام "تلخ و شیریں" شائع ہوا۔ اس میں نظمیں بھی ہیں غزلیں بھی، رباعیات بھی اور کچھ فارسی کلام بھی۔
انھیں شاعری کا ملکہ خداداد تھا۔ مگر اس کی طرف یکسوئی کے ساتھ توجہ نہیں دی۔ معروف محقق شاداں فاروقی کے حوالے
سے لکھا ہے کہ حضرت کی شاعری تغزل سے مملو ہے۔ جس پر فارسیت کی گہری چھاپ ہے۔ اور جس کے مطالعے سے دورِ آشفتہ سر
یاد آنے لگتا ہے۔ شیراز کی تیرہ و تار گلیاں ہی نہیں بلکہ غالب اور مومن کی دلی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ ان ہی اساتذہ
جیسی فارسی ترکیبیں بے تکلف ان کے قلم سے نکل جاتی ہیں۔ محسن کے کلام کا ایک بڑا حصہ سہل ممتنع کی ایک بہترین مثال ہے۔
سیدھے سادے الفاظ میں مطلب برا ری بھی کرتے ہیں اور زبان کو شیرینی سے مالا مال بھی۔ اس مجموعہ میں قابل قدر نظمیں
"صبح تحسین"، "ناز و نیاز"، "تمام رات"، "نذر آتش" اور "کنیز فارس کا گیت"۔ "صبح تحسین" قصیدے کا آہنگ رکھتی ہے۔ یہ
نظم ترتیب و تنظیم اور معنوی ارتقا کے حساب سے خوب صورت ہے۔ "ناز و نیاز" ایک نیم عاشقانہ اور نیم مزاحیہ نظم ہے۔
اس کی ہیئت قصیدے سے مستعار ہے۔ اس کی زمین دشوار ہے لیکن روانی اور بے ساختگی کے اعتبار سے یہ کامیاب تجربہ ہے۔

لب ولہجہ رومانی ہے۔ روایت کے تخلیقی استعمال سے شاعر نے نظم میں وقار اور گہری معنویت پیدا کی ہے۔ "تمام رات" نظم آتش اور جگر کے رومانی تجربات کے درمیان ایک نقطۂ مفاہمت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں روانی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ "کنیز فارس کا گیت" ایک تاریخی پس منظر میں ایک تراشیدہ شعری تخلیق ہے۔ "ٹینی سن" کی ایک نظم اور بغداد کی تاریخی روایت کے مابین "الف لیلیٰ کا ایک خواب" شاعر کے تخیل و تجربے کا حسین شاہکار ہے۔ "مئے ناب" کے تحت آٹھ نظمیں ہیں۔ اُردو کی رومانی نظموں کے ارتقا میں اس نظم کی اہمیت مسلّم ہے۔ اختر شیرانی کی احساسی روایت اور جگر کی سادگیٔ اظہار ایک نغمہ نو کی صورت میں ڈھلی ہے۔ "شکوہ جوابِ شکوہ" شاعر کے باطنی احساسات کی نمائندگی کرتی ہے۔ "تلخ و شیریں" معنویت کا ایک دلکش اور بھرپور اظہار ہے۔ "عزتِ نفس" ایک بے باک اور پر اثر نظم ہے۔ جوش کے یہاں بغاوت ہے لیکن محسن کے یہاں توازن۔ لہجہ برقرار رہتا ہے۔ "اس پار" ایک خوبصورت ہندی گیت ہے۔ "تہنیت" بہ ظاہر ایک رسمی نظم ہے۔ لیکن اس میں بھی محسن نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ نظم "فرار" نے داخلی کیفیت کے اظہار میں بڑا فن کارانہ رویہ اپنایا ہے۔ "بیزاری" قصیدے کی ٹکنک اور آہنگ رکھتی ہے۔ عصری حسّیت کی دردمندانہ عکاسی اس نظم میں موجود ہے۔ "فراق" فنی اعتبار سے ایک کمزور نظم ہے۔ "بازگشت" ایک مختصر شعری تجربہ ہے۔ "نالے" انسان کی بے بسی اور کس مپرسی کی تصویر ہے۔ "خیر و شر" حق و باطل کی رزم آرائی ہے۔ جس میں حق کی قدر و قیمت کو شاعرانہ اسلوب میں روشن کیا ہے۔ محقق نے اس نظم کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے۔ "تجلیٔ حیات"، "اے دنیا"، "صبحِ پیری"، "بچے اور پھول"، "حسن تلافی"، "ترکِ آرزو"، "رشحات"، "فاتحۂ طعام"، "ملت کالج کا مشاعرہ" وغیرہ۔

محسن دربھنگوی کا دوسرا مجموعۂ کلام "نالۂ نغمہ" ۱۹۸۵ء میں طبع ہوا۔ اس میں چودہ ۱۴ نظمیں ہیں۔ "بادۂ مسموم"، "افکارِ پریشاں"، "ہدیۂ محبت"، "راہِ نجات"، "فراقِ جاوداں"، "علی گڑھ"، "حکایتِ چمن"، "مجلس مشاورت"، "روداد مے کشی کدہ"، "برسات کی یادیں"، "تنہائی"، "ہماری محفل"، "نقوشِ داغ"، "آن" وغیرہ۔ محسن کی مختلف نظموں کے تجزیے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ محسن دربھنگوی کی نظم نگاری نے اُردو ادب میں ایک انفرادی روایت قائم کی ہے۔ جو توازن اُن کے یہاں ہے وہ اقبال کے یہاں بھی ملتا ہے۔ نظم کی ٹکنک اور تعمیر کے فن میں اقبال کے بعد محسن کا مقام سب سے بلند ہے۔ فیض و فراق بھی اس شعورِ فن سے متصف نہیں۔ یہی محسن کی فن کارانہ انفرادیت ہے۔ یہ محقق کے خیالات ہیں اور صاف ظاہر ہے کہ محسن دربھنگوی کو یہ ادبی مقام تفویض کرنے میں انھوں نے تنقیدی دیانت داری کا ثبوت نہیں دیا ہے۔

محسن دربھنگوی نے غزل کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ محسن کی تغزل کی دنیا محدود سہی لیکن منفرد اور ممتاز ہے۔ اس میں عاشقانہ جلال بھی ہے اور قلندرانہ جمال بھی۔ خیال اور اسلوبِ بیان کو مکمل گرفت حاصل ہے۔

محقق نے لکھا ہے کہ بعض گوناگوں مسائل اور اسباب کی بنا پر گو کہ اردو کی شانہ آرائی اس خلوص اور توجہ کے ساتھ نہ کرسکے جس انہماک اور لگن کی بنیاد پر فیض، جمیل اور فراق وغیرہ نے ہمہ گیر مقبولیت اور شہرت حاصل کی لیکن جمالیاتی شعور تخلیقی امکانات اور فنی توانائی کے اعتبار سے محسن دربھنگوی ان میں سے کسی سے بھی کمتر نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

میں کہاں اور روش عام کہاں اے محسن — کچھ نہ ہوگا تو مرے شعر میں ندرت ہوگی

محسن اپنے کلام کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں: "اردو اشعار ہوں یا فارسی میں اپنی بات صاف صاف کہہ دیتا ہوں۔ پچھلی نسل کا آدمی ہوں اور اس نسل کے کہنے والے صفائی اور سادگی ہی کو فن کا کمال سمجھتے تھے۔ (پیش لفظ۔ نالۂ نغمہ ص ۷/۲)

محسن دربھنگوی کی فارسی شاعری کو بھی محقق زیر بحث لائے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ کہنہ مشق استاد کی طرح خود اعتمادی کے ساتھ اہل زمانہ کو درس بھی دیتے ہیں جسمیں ان کی ژرف نگاہی بھی ہوتی ہے۔ فارسی شاعری میں انکا اپنا کوئی رنگ نہیں۔ متقدمین شعراء جیسے امیر خسرو، حافظ اور ملا طغریٰ وغیرہ کی زمین میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ انکی شاعری میں امیر خسرو کی غنائیت حافظ کی شیرینیت اور ملا طغریٰ کی سی ایمائیت تو نہیں ہے لیکن ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو فارسی زبان پر عبور حاصل ہے۔

محقق کو جتنی محنت کرنی چاہیے تھی اس سے وہ پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہوسکے لیکن انکا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ محسن دربھنگوی پر کام کرکے انھوں نے اس مقولہ کو ثابت کر دیا ہے کہ چراغ سے چراغ جلنے کا دستور ازل تا ابد ہے۔ محقق نے سرزمین دربھنگا کی جو ادبی تاریخ پیش کی ہے اسمیں بہت سی اہم شخصیتوں کا ذکر چھوٹ گیا ہے اور ترتیب میں بھی یکسوئی کی کمی کے سبب کچھ اہم نکات جو محسن دربھنگوی کی زندگی اور شاعرانہ عظمت کو متعین کرنے میں کارآمد ہوسکتے تھے مثلاً انکی نجی زندگی کے وہ ابواب جن میں انکی شخصیت کی خامیاں بھی ہوسکتی تھیں، اس کو یکسر نظرانداز کر دیا ہے۔ حالانکہ محقق کا کام یہ ہے کہ وہ مخفی گوشوں کو باہر نکالتا ہے۔ اس سلسلہ میں سنجیدگی سے محقق نے غور نہیں کیا ہے۔ حالانکہ انکی شاعری میں جو عناصر موجود ہیں وہ بھی ان کی نجی زندگی کا پرتو ہیں اور نجی پس منظر کے علم کے بغیر نظم کی وہ محاکاتی خوبیاں جو اجاگر ہوسکتی تھیں نہیں ہوسکی ہیں۔ محسن کی شعری حیثیت متعین کرنے میں محقق اپنی تنقیدی صلاحیت کو بروئے کار نہیں لاسکے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اپنے طور پر اشعار کی پرکھ غیر جانبداری سے کرتے اور اس کے حسن و قبح کو تفصیل سے پیش کرتے۔ لیکن انھوں نے قصیدہ کے انداز سے محسن کی شاعری پر تبصرہ کرکے اپنے تحقیقی یا تنقیدی شعور سے کام نہیں لیا۔ محقق کی تساہلی کے سبب محسن کا وہ کلام بھی منظر عام پر نہیں آسکا جسمیں انھوں نے خود ترمیم و تنسیخ کی ہوگی کوئی تحریری عکس بھی پیش نہیں کیا ہے، جس سے یہ اندازہ ہوسکے کہ محسن دربھنگوی شعر کس طرح کہتے تھے کیونکہ طرز تحریر سے بھی شخصیت کے کچھ گوشے سامنے آتے ہیں۔ اسکے علاوہ محسن دربھنگوی ابھی بقید حیات ہیں اور انکا غیر مطبوعہ تمام کلام بہ آسانی فراہم کیا جاسکتا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ فاضل محقق غیر مطبوعہ کلام کی افادیت محسوس نہ کرسکے۔ اور جو بنیادی فرق ان کی شاعری میں وقت اور حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا ہے اس کی بھرپور عکاسی نہیں کی۔ پھر بھی اس تحقیق کو اس لیے اہمیت دی جائیگی کہ یہ تاریخ کا ایک حصہ ہے اور دربھنگا کی سرزمین اردو کی زلفیں سنوارنے میں عرصۂ دراز سے فعال رہی ہے۔ محسن دربھنگوی کے ذکر کے بغیر اردو کی تاریخ میں ایک خلیج حائل ہوجاتی۔ اس خلیج کو پاٹنے میں محقق نے بڑا کام کیا ہے اور اس اعتبار سے وہ قابل مبارکباد ہیں۔ ●●

ڈاکٹر عبدالقیوم
شعبۂ اردو، للت نرائن
متھلا یونیورسٹی دربھنگہ

جواب

محسن دربھنگوی ۔ حیات اور شاعری
ایک جائزہ

محسن دربھنگوی ۔ حیات اور شاعری (ایک جائزہ) کے عنوان سے ڈاکٹر سید اعجاز حسن امام اعظم (شعبۂ اردو مہاراجہ مہیش ٹھاکر کالج دربھنگہ) نے میرے تحقیقی مقالہ پر تبصرہ کیا ہے

محسن دربھنگوی نے ۱۹۲۶ء میں آئی۔اے۔ پاس کیا، ۱۹۲۸ء میں بی۔اے۔ کی تعلیم کے لیے جی۔بی۔بی کالج (موجودہ لنگٹ سنگھ کالج) مظفرپور لوٹ آئے۔ اس بار ان کا قیام ہاسٹل میں رہا، وہ اس زمانے میں کالج کی "بزم ادب" کے سکریٹری رہے۔ ان کے ہم جماعت سید اجتبیٰ حسین رضوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، محمد اسمٰعیل وحشی، ابو شیو کمار پرساد، اور بابو رام چندر پرساد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہیں سے محسن کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ کالج کے پرنسپل رام پرساد کھوسلہ ناشاد اور بابو اودھ بہاری سنگھ بیدل اس وقت کے صاحب طرز اور معتبر شاعر تھے

مذکورہ کالج کے ماحول کے پیش نظر تبصرہ نگار نے بڑی آسانی سے یہ کہدیا کہ "ظاہر ہے کہ محسن نے ان سے ضرور کسب فیض کیا ہوگا"، لیکن فاضل تبصرہ نگار نے ان ضوابط سے یقینی طور پر روگردانی کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے تحت تحقیقی کام عمل میں آتا ہے، ظاہر ہے تحقیق کے میدان میں قیاس آرائی کی گنجائش نہیں۔ اور نہ ہی تحقیق کی سنگلاخ زمین اس طرح کی زبان کو برداشت کر سکتی ہے کہ "ایسا ہوا ہوگا، اگر ایسا ہوا ہوتا، ایسا کیا ہوگا اور ایسا ہونا چاہئے تھا۔ وغیرہ وغیرہ بلکہ وہ حقائق اور شواہد کی روشنی میں مدلل و مصدقہ حوالات کے ساتھ سفر کرنے کی عادی ہوتی ہے۔ جہاں تصدیق شدہ حوالات پیش کیے جاتے ہیں نہ کے الفاظ کے گھروندے بنائے جاتے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے لیکن قطعی طور پر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تحقیق کی راہ میں آپ کو جو سنگ ریزے ملیں ان سبھوں کو اپنے دامن میں سمیٹتے چلے جائیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میرے ساتھی تبصرہ نگار نے میری تحریروں پر یوں خامہ فرسائی کی ہے:۔

"محقق موصوف نے دربھنگے کے دینی مدارس کا تذکرہ نہیں کیا حالانکہ انہیں اداروں نے زمانہ قدیم سے

علم وزبان کی قندیل روشن رکھی اور بڑے بڑے علما نے انہیں مدرسوں سے استفادہ کیا جن میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اور علمائے پھلواری شریف خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔"

یہ کوئی نئی بات نہیں کہ دربھنگا کے دینی مدارس اور دیگر ادبی اداروں نے زمانہ قدیم سے اب تک علم وزبان کی ندیل روشن رکھی ہے۔ اور بڑے بڑے علما وفضلا نے انہیں مدرسوں اور دیگر علمی و تعلیمی اداروں سے اکتساب فیض یا ہے۔ اس سرزمین نے بے شمار مایہ ناز ادبا و فن کار پیدا کیے ہیں۔ جن میں نہ صرف علامہ سید سلیمان ندوی اور علمائے بلواری شریف ہی قابل ذکر ہیں بلکہ اگر سرزمین متھلا یعنی شمالی بہار کے دینی مدارس اور علمی ادارے اور ان اداروں ے استفادہ کرنے والے مشاہیر اور اہل قلم کا ذکر کیا جائے تو غالباً بقصہ زلف دراز سے دراز تر ہو جائے۔

البتہ اتنی بات تبصرہ نگار کو یقینی طور پر ذہن نشیں ہونی چاہئے تھی کہ تحقیق اس شئے کی ہوتی ہے جو شئے قیق طلب ہو نہ کہ تحقیق شدہ، لہذا تحقیق شدہ شئے کے لیے تحقیق کے نام پر خامہ فرسائی تضیع اوقات کے مترادف ہے۔

تبصرہ نگار لکھتے ہیں :-

"محسن کی مختلف نظموں کے تجزیئے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ محسن دربھنگوی کی نظم نگاری نے اردو ادب ما ایک انفرادی روایت قائم کی ہے جو توازن ان کے یہاں ہے وہ اقبال کے یہاں بھی ملتا ہے نظم کی ٹکنیک اور تعمیر ے فن میں اقبال کے بعد محسن کا مقام سب سے بلند ہے۔ فیض اور فراق بھی اس شعور فن سے متصف نہیں۔ یہی محسن ا فن کارانہ انفرادیت ہے۔ یہ محقق کے خیالات ہیں اور صاف ظاہر ہے کہ محسن دربھنگوی کو یہ ادبی مقام تفویض لے میں انہوں نے تنقیدی دیانت داری کا ثبوت نہیں دیا۔

محسن دربھنگوی نے غزل کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ محسن کے تغزل کی دنیا محدود سہی ن منفرد اور ممتاز ہے۔ اس میں عاشقانہ جلال بھی ہے اور قلندرانہ جمال بھی۔ خیال اور اسلوب پر ان کو مکمل گرفت اصل ہے برجستہ اور برمحل الفاظ کے استعمال نے ان کی غزل گوئی کو ایک نایاب نہیں تو کمیاب شئے ضرور بنا دیا ہے۔ محقق لکھا ہے کہ بعض گوناگوں مسائل اور اسباب کی بنا پر گیسوئے اردو کی شانہ آرائی اس خلوص اور توجہ کے ساتھ نہ کر سکے ں انہماک اور لگن کی بنیاد پر فیض، جمیل اور فراق وغیرہ نے ہمہ گیر مقبولیت اور شہرت حاصل کی ہے لیکن جمالیاتی شعور نی امکانات اور فنی توانائی کے اعتبار سے محسن دربھنگوی ان میں سے کسی سے بھی کمتر نہیں فرماتے ہیں: ؎

مبا کہاں اور روشن عام کہاں اے محسن — کچھ نہ ہوگا تو میرے شعر میں ندرت ہوگی

ن اپنے کلام کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں :-

"اردو اشعار ہوں یا فارسی، میں اپنی بات صاف صاف کہہ دیتا ہوں، اور اس نسل کے کہنے والے صفائی
اور سادگی ہی کو فن کا کمال سمجھتے ہیں۔" (پیش لفظ نالہ و نغمہ۔ ص ۱۰۶)

میرے خیال میں موصوف کا یہ اعتراض کہ یہ محقق کے خیالات ہیں اور صاف ظاہر ہے کہ محسن در بھنگوی کو یہ ادبی مقام تفویض کرنے میں انہوں (محقق) نے تنقیدی دیانت داری کا ثبوت نہیں دیا قطعی طور پر بے بنیاد ہے جو خود انہیں (تبصرہ نگار) کے بیان مذکورہ دواوین کی دوسری عبارت سے واضح ہے، اور جس کی انہوں نے زیر لب تائید فرمائی ہے۔ دراصل تنقید کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ جب کوئی ناقد قلم اٹھاتا ہے تو اپنے ذہن و دماغ کے دریچے کو کھلا نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کا ذہن کسی نہ کسی "مکتبۂ فکر" یا "ازم" کا شکار ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی کے کلام پر رائے زنی کرتے وقت وہ غیر جانب دار نہیں رہ پاتا۔ اتنا ہی نہیں سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے اپنی صلاحیت کو بروئے کار لانے کی کوشش نہیں کرتا۔ جس کی وجہ سے اس کی نظر سمندر کے سطح آب پر مرکوز ہو کر ہی رہ جاتی ہے۔ اور وہ ورطۂ موج میں پوشیدہ گوہر کی تلاش میں نکل کر بھی نامراد اور ناکام واپس لوٹ جاتا ہے۔ عام طور سے یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی کچھ چیزیں سرسری طور پر دیکھ لی گئیں۔ اور اپنی رائے کا برملا اظہار فرما دیا گیا۔ لیکن ان کا دیوان یا کلیات پڑھنے کی، یا ان کے تمام مجموعے کو پڑھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی گئی چنانچہ ان کی رائے صدا بہ صحرا ہو کر رہ جاتی ہے میرے خیال میں لائق تبصرہ نگار کی نظر سے محسن در بھنگوی کا تمام کلام نہیں گذرا اور اگر گذرا بھی تو موصوف نے محض سرسری طور پر اس کا مطالعہ کیا۔ جبکہ ضرورت تھی عمیق مطالعے کی۔ یا پھر نفسیاتی طور پر وہ اقبال، یہاں تک کہ فیض اور فراق سے اس قدر مرعوب ہیں کہ ان لوگوں کے علاوہ دیگر لوگوں کو ان کا ذہن قبول کرنے سے قاصر ہے اور ان کے ذہن کی تنقیدی رو ایک محدود دائرے سے باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ محسن در بھنگوی نے چونکہ گمنام زندگی بسر کی ان کی شہرت و مقبولیت دیار متھلا سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کا بنیادی سبب درویشانہ بے نیازی اور قلندرانہ افتاد طبع ہے۔ اپنے کلام کی اشاعت کی طرف انہوں نے کبھی کوئی توجہ نہیں دی البتہ خموشی کے ساتھ گلستانِ شعر و سخن کی آبیاری کرتے رہے اور تسلسل کے ساتھ اپنے تخیلی تجربوں کو حرف و نوا کے پیکر میں ڈھالتے رہے چنانچہ کسی شاعر کی عظمت اور انفرادیت کے لیے اگر ان کا شہرۂ آفاق ہونا ہی ضروری ہے تو یقیناً محسن اس میدان میں دوسروں کے مقابلے بہت پیچھے نظر آئیں گے اور اگر ان کے کلام کی بنیاد پر ان کے مرتبہ کا یقین کیا جائے تو میں پھر کہہ سکتا ہوں کہ وہ اردو کے صف اول کے شعرا میں نمایاں مقام پانے کے مستحق ہیں

یہ صحیح ہے کہ میرے مقالے میں محسن کے کلام کا تحریری عکس نہیں ڈالا جاسکا لیکن موصوف کا یہ کہنا کہ "طرز تحریر سے بھی شخصیت کے کچھ گوشے سامنے آتے ہیں"، میں قطعی طور پر اس سے اختلاف کرتا ہوں کہ کسی شخصیت کی تحریر سے اس کی شخصیت کے گوشے اجاگر ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو ہر "کاتب" بلند شخصیت کا حامل ہونا چاہیئے تھا اور نہ ہی کسی شاعر کے ترمیم و تنسیخ کیے ہوئے اشعار کے نمونے سے اس کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر ہم لوگوں کے سامنے غالب کا وہ دیوان ضرور ہوتا جس میں انہوں نے خود ترمیم و تنسیخ کی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ محسن دربھنگوی بقید حیات ہیں اور ان کا غیر مطبوعہ کلام نہ صرف یہ کہ بہ آسانی فراہم کیا جاسکتا تھا بلکہ ان کا "غیر مطبوعہ کلام"، تھیسس (THESIS کے لکھے جانے تک جو ان کے پاس موجود تھا، حاصل کیا جاچکا ہے۔ جو اس مقالہ کے صفحہ نمبر ۲۳۱ سے ۲۳۳ تک میں شامل ہے اتنا ہی نہیں فہرست مضامین میں بھی "غیر مطبوعہ کلام" کے عنوان سے درج ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ہمارے فاضل تبصرہ نگار کی نگاہ سے نہ معلوم یہ عنوان کس طرح اوجھل رہا؟ یا ان کی تساہلی کی سبب پوری تھیسس پڑھی نہ جاسکی۔ اتنا ہی نہیں میں نے نہ صرف یہ کہ ان کے غیر مطبوعہ اردو کلام پر اکتفا کیا ہے بلکہ فارسی کے "غیر مطبوعہ کلام" بھی تھیسس میں شامل کیے گئے ہیں۔

پھر بھی لائق تبصرہ نگار نے محسن دربھنگوی ۔ حیات اور شاعری کے عنوان سے جو تبصرہ تحریر کیا ہے اس میں جس انداز سے انہوں نے کوتاہیوں کی طرف انگشت نمائی کی ہے گرچہ جگہ جگہ ان سے بھول بھی ہوئی ہے لیکن ایک معیار قائم رکھتے ہوئے مقالہ کا حق ادا کیا ہے۔ جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

••

ڈاکٹر محمد انصار اللہ
شعبہ اردو
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن منشاؔ کا تھیسس

میر نظام الدین ممنون دہلوی حیات شخصیت اور شاعری

استاد مرحوم قاضی عبدالودود صاحب فرماتے تھے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کے مقالوں کے ساتھ ان کے ممتحنین کی رپورٹیں بھی شائع ہونی چاہئیں۔ اور اردو میں کتابوں کے چھپنے پر پابندی عائد کر دینی چاہیئے۔ قاضی صاحب کی عمدہ یادگار" ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ" نے ان کانفرنسوں کا سلسلہ قایم کر کے عملاً قاضی صاحب کے دونوں ارشادات کے بدل کی ایک مثبت صورت پیدا کر لی ہے۔ بے صلاحیت، بداندیش ان اجلاسوں کی کارروائیوں کو "کیچڑ اچھالنے" سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن اگر اسی طور پر ہم اپنے کاموں کا جایزہ لیتے رہے تو یقیناً ہمارے یہاں تحقیق کا معیار بہت بلند ہو جائیگا۔

راقم کو مختلف زبانوں اور علوم کے تحقیقی کاموں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اور میرا تجربہ یہ ہے کہ اردو میں تحقیق کا معیار نسبتاً بہتر ہے۔ اپنے کاموں کے احتساب کے لیے ہمارا آمادہ ہو جانا بھی اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ ہمارے پاس جو سرمایہ ہے اس میں جان ہے اور وہ یقینی طور پر اس قابل ہے کہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ راقم نے گزشتہ سال بھی عرض کیا تھا کہ تقریری اور ترقی کی خاطر جو کام کیے جا رہے ہیں، تحقیق کے وزن و وقار کو مجروح انہوں نے کیا ہے۔ چنانچہ گذشتہ سال میں نے جس کام کا جائزہ پیش کیا تھا اس کے بارے میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں کس کس قسم کی غلطیاں اور خرابیاں پائی جا سکتی ہیں تو وہ اس مقالے کو دیکھ لے۔ آج کی محفل میں اپنے اسی موقف کا اعادہ کرتے ہوئے مختلف نوعیت کے ایک ایسے مقالے کو متعارف کرانے کی اجازت چاہتا ہوں جس پر ناگپور یونیورسٹی نے پی ایچ۔ ڈی کی سند عطا کی ہے اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی مالی اعانت سے اسے شایع بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے ہر مقالے کے ممتحنین ایک سے زاید یونیورسٹیوں کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ اسلیے کسی مقالے کے لیے کسی ایک یونیورسٹی کو پوری طرح ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

آج جس مقالے کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے، اس کا عنوان ہے "مطالعۂ میر نظام الدین ممنونؔ دہلوی، حیات

شخصیت اور شاعری" نام جتنا بڑا ہے۔ اپنی ضخامت کے اعتبار سے اتنا ہی چھوٹا ہے۔ یعنی کتابی سایز کے صرف چھیاسی صفحوں میں سما گیا ہے۔ سرورق، حالات مصنف، انتساب اور مشمولات کے چار صفحے ان کے علاوہ ہیں ان کو شامل کرلیں تو مجموعی ضخامت نوے صفحوں کی ہو جاتی ہے۔ چھپوا لینے کے بعد مصنف کو غالباً اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ضخامت کی طرح قیمت بھی اس کی بہت تھوڑی ہے۔ اس پر"قیمت گیارہ روپے" چھپی تھی۔ جسے قلمزد کرکے "۱۴ روپے" بنا دیا گیا ہے۔ اور راقم کو یہ اسی قیمت پر حاصل ہوا ہے۔ اس کی قیمت اور ضخامت کی وجہ سے اسے مقالہ کے بجائے رسالہ یا کتابچہ کہنا اچھا لگتا ہے۔

اس رسالے کے مصنف ایک کہن سال بزرگ ڈاکٹر محمد منشاء الرحمان منشا صاحب ہیں جنہوں نے اس کا انتساب "بصد خلوص و احترام حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے نام" کیا ہے "حالات مصنف" کے تحت دی ہوئی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف زیر تبصرہ رسالے کے علاوہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ آٹھ کتابوں کے خالق مصنف، مرتب یا مترجم ہیں۔ موصوف اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ایم اے ہیں۔ بی ٹی بھی کیا ہے اور "یہ بہ قامت کہتر بہ قیمت کمتر" مقالہ تصنیف فرما کر ڈاکٹریٹ بھی حاصل کر چکے ہیں۔

رسالے کے شروع میں کوئی ایسی فہرست نہیں ہے جس میں صفحوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہو۔ البتہ مشمولات کے تحت یہ بتا دیا گیا ہے کہ اس میں کیا کچھ ہے۔ مشمولات میں آخری عنوان "کتابیات" ہے۔ لیکن رسالے کے آخر میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ اشاریہ کا تو شاید خیال بھی نہیں آیا تھا۔

رسالے کا آغاز بسملہ کے بعد دیباچے سے ہوتا ہے جس میں مشمولات کے تحت جو کچھ ایک صفحہ میں تھا اسے سوا تین صفحوں میں پھیلا دیا گیا ہے۔ اس دیباچے سے پتا چلتا ہے کہ "دیوان ممنون" کے چار مخطوطات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ: "دیوان ممنون کا حصۂ غزلیات مرتب کرکے اس مقالے کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے" لیکن کتابیات کی طرح یہ حصۂ غزلیات بھی چھپا ہوا نظر نہیں آتا۔ اشاریے کی طرح اس کا ذکر بھی مشمولات میں نہیں ہے مصنف کی مطبوعہ، غیر مطبوعہ تصانیف میں بھی اس کا نام شامل نہیں ہے۔

مصنف صاحب مزاجاً بہت محتاط شخص ہیں۔ انہوں نے ممنون سے متعلق واقعات کے تعین میں بعض ان مصنفوں کی تحریروں سے مدد لی ہے جن کے زمانے تک ممنون کے پوتے اور نواسے بھی انتقال کر چکے ہوں گے البتہ خود مصنف صاحب کی اوایل عمری میں ان میں سے کچھ زندہ اور موجود رہے ہوں گے مثلاً: سید عبدالحئی مصنف گلِ رعنا، سید راس مسعود مولف انتخاب زریں، عرشی مرتب دیوانِ غالب، خواجہ معین اجمیری مرتب بیاض

یادداشت، اصباح الدین مولف بزم تیموریہ، سر عبدالقادر مدیر مخزن، ڈاکٹر محمود الہی، نیاز فتحپوری۔

جملۂ معترضہ کے طور پر یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کاتبوں کی ستم رانیوں کی تو بہت سی حکایتیں مشہور رہیں۔ لیکن یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی ان کے احسان کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اپنی بہت سی غلطیوں کو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ان کے سر منڈھ کر ہم صاف بری ہو جاتے ہیں۔ راقم نے ایک کل ہند سمینار میں لسانیات کے استاذ الاساتذہ کی زبان سے نہ صرف لَسّانی (لام مفتوح، سین مہملہ بالتشدید) سنا ہے بلکہ ایک موقع پر جب ان سے کہا گیا تو پہلے انہوں نے "مطعن" لکھا پھر اسے مٹا کر "مطمئن" بنایا اور پھر "مطئین" لکھا۔ اور پھر سب کو مٹا کر آگے بڑھ گئے اب اگر کاتب ان کے املا کو من و عن نقل کر دے اور کوئی شخص گرفت کرے تو ظاہر ہے کہ وہ خود اور ہر شخص اس کے لیے بیچارے کاتب ہی کو مورد الزام ٹھہرائیگا۔ زیر تبصرہ رسالے کے مصنف نے رسم خط اور املا کے اصولوں کا ماہر ہونے کا کہیں دعوا نہیں کیا ہے اس لیے اگر اس میں اوقات اور املا کے اصول کی پابندی نہیں کی گئی ہے تو اس پر معترض ہونے کے لیے کوئی جواز نہیں ہے۔ محض بیان واقعہ کے طور پر دو تین نقاموں کی نشاندہی کی جاتی ہے :- صفحہ۔ ۱۲ عظیم اہل و فضل ــ صفحہ۔ ۱۳ اشعرا کا ہجوم رہا کرتا تھا۔ صفحہ۔ ۲۰ شکوۂ لفظ و معنی۔ صفحہ، ۲۰ معیار و اعتبار رکھتی تھی ــ لطف زبان کے بھی کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں :- صفحہ ۱ ممنون یقیناً بڑی عظمت و مرتبت والے شاعر ضرور ہوئے ہوں گے ــ صفحہ ۲ مستند معلومات فراہم کی گئی ہے۔ صفحہ ۲ سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو .... تکمیل کے لیے جاری رکھی تھی۔

توصیفی کلمات کے استعمال میں بے احتیاطی اردو کے تحقیقی مقالوں میں عام ہے۔ یہ کتابچہ بھی اس وصف سے خالی نہیں ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس میں" ان تمام کے متعلق ممکنہ معلومات فراہم کی گئی ہیں"، ممکنہ معلومات کے فراہم کرنے کا دعوا تو کیا جاتا ہے لیکن اگر واقعی اس بات کی کوشش بھی کی جانے لگے تو اردو تحقیق کا معیار بہت بلند ہو جائے۔ قول اور عمل کے فرق نے ہی معیار کو گرا رکھا ہے۔ اس رسالے میں بھی سامنے کی بہت سی باتیں درج نہیں ہیں۔ تفصیل آگے آئیگی۔

صفحہ ۶ پر ہے کہ "منت عربی اور فارسی کے بے مثل جاننے والے تھے"۔ یہ دعوا منت کے کسی معاصر نے نہیں کیا ہے۔ منت کے عربی کا بے مثل جاننے والا ہونا ممکن بھی نہیں تھا۔ صفحہ ۶ پر ہے" اصل نام سید نظام الدین" تھا کلمہ "سید" نام کا جز ہرگز نہیں تھا۔ خود مصنف نے اپنے رسالے کے سر ورق پر اس کلمہ کو نام میں شامل نہیں کیا ہے۔ اسی صفحہ پر ہے کہ ممنون" تخلص کے ساتھ ایسے مشہور ہوئے کہ لوگ اصل نام بھول گئے" یہ نہیں بتایا کہ کون لوگ اصل نام بھول گئے

اس رسالے کے سرورق پر تخلص اور نام دونوں ایک ہی قلم سے لکھے گیے ہیں۔ ممنون کا نام لکھنے میں کسی ایک شخص نے غلطی بھی نہیں کی ہے۔ بھول جانے کا تو سوال بھی نہیں۔ صفحہ ۵ پر ہے کہ ممنونؔ استادشہ بھی تھے۔ اور اس کے لیے حاشیے پر دو کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یعنی مولوی کریم الدین۔ تذکرہ طبقات الشعراء ہند اور سید نورالحسن خاں تذکرہ طورکلیم۔ دونوں کتابوں کے نام غلط ہیں۔ کریم الدین کے تذکرے کا نام "طبقات شعرائے ہند" ہے اور اس میں یہ بات کہیں نہیں لکھی ہے کہ ممنونؔ استادشہ تھے۔ نورالحسن خاں کے تذکرے کا نام "طورِ کلیم" (اضافت کے ساتھ) ہے۔ یہ تذکرہ ممنونؔ کی وفات کے کوئی پینتیس برس بعد لکھا گیا تھا۔ نورالحسن خاں براہ راست ممنون سے بالکل واقف نہیں تھے۔ ان کے بعد ان کے بھائی نے اپنا تذکرہ "بزمِ سخن" لکھا۔ انہوں نے نورالحسن خاں کے اس بیان کو قبول نہیں کیا کہ ممنونؔ استادشہ تھے۔ کسی دوسرے تذکرے میں بھی یہ بات مذکور نہیں ہے۔

یہ افسوسناک ہے کہ مقالہ نگار نے اپنے موضوع کو "ہیرو" بنالیا ہے۔ چنانچہ رسالے کے پہلے جملے میں بھی اس سے اپنی دیرینہ وابستگی (بلکہ بچپن کی یاری!) کا اظہار کیا ہے۔ اور آخری جملے میں بھی یہی کہا ہے۔ یہ وابستگی تحقیق کے لیے انتہائی مضر ہوتی ہے اور اہل تحقیق کو اس سے بچنے کی ہمیشہ کوشش کرنی چاہیے۔ اسی وابستگی کا نتیجہ یہ ہے کہ مصنف نے بار بار ممنونؔ کو استادشہ لکھا ہے۔ (دیکھو صفحہ ۱۳، ۱۴، ۱۸ وغیرہ)

صفحہ ۷ پر ہے کہ "شاہ ولی اللہ صاحب نے "عجالۂ نافعہ" نامی رسالہ انہیں (منتؔ) کے لیے لکھا تھا" یہ بات بھی تذکرہ "طورِ کلیم" کے حوالے سے لکھی ہے۔ یہاں اضافہ یہ ہے کہ تذکرہ کا نام "طور و کلیم" لکھنے کے علاوہ اس کے مصنف کے نام کو درست کرکے "سید نورالحسین خاں" بنادیا گیا ہے۔ رسالۂ مذکور کو دیکھنا تو کجا اس کے لیے کسی قدیم ماخذ سے رجوع کرنے کی بھی زحمت نہیں کی گیی۔ صفحہ ۸ "اودھ کے امرا سے روابط کے نتیجہ میں منتؔ ... تبدیلی عقاید پر مجبور ہوے اور اثنا عشری ہوگیے"۔ حوالے میں "مولوی عبدالقادر دستورالفصاحت" لکھا ہے۔ مولوی عبدالقادر کا دستورالفصاحت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دستورالفصاحت احد علی خاں یکتاؔ کی تالیف ہے۔ جیسے مولوی امتیاز علی عرشیؔ نے مرتب کیا ہے۔ مولوی عبدالقادر نے اپنا روزنامچہ تحریر کیا تھا جس کے اقتباس عرشی صاحب نے دستورالفصاحت میں نقل کردیے ہیں۔ اس روزنامچہ کے اقتباس میں منتؔ کے مجبور ہوجانے کا ہرگز کوئی ذکر نہیں ہے۔ منتؔ کے لیے اگر کوئی مجبوری تھی تو وہ تھی جس کا قدرت اللہ قاسمؔ نے ذکر کیا ہے کہ "رقاصہ زنے مفتوح گرفتہ" (مجموعۂ نغز۔ حصہ ۲ ص ۲۱۵) یہ مقصد آبائی مذہب کو ترک کیے بغیر پورا نہیں ہوسکتا تھا۔

صفحہ ۸ سے صفحہ ۹ تک منتؔ کے بیٹوں کا ذکر ہے۔ مجموعۂ نغز سے گلستانِ سخن تک مختلف تذکروں کا اگر مطالعہ

کیا جاتا تو ان کے بارے میں بہتر معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ منت کے بڑے بیٹے شمس الدین احسان کا ذکر "گلزار ابراہیم" میں موجود ہے۔ دوسرے بیٹے میر صادق علی صفدری کے بارے میں "خوش معرکۂ زیبا" کا حوالہ دیا گیا ہے۔ لیکن مشفق خواجہ کے مرتب کردہ "خوش معرکۂ زیبا" میں اس کا نام تک نہیں آیا ہے۔ صفدری کے قتل کے بارے میں تفصیل گلستان سخن میں موجود ہے۔ اسے دیکھنا چاہیے تھا۔ باقر علی جعفری کے مرنے کی تاریخ جو ممنون نے کہی اس طرح نقل کی گئی ہے:۔

سرچوں برداشت از بکاہ آں گاہ ۔۔۔ گفت صد حیف میر باقر رفت

(۲۶ + ۱۲۳۳ = ۱۲۵۹)

معلوم نہیں مصنف نے ۱۲۵۳ کس طرح لکھ دیا ہے۔ مرزا قادر بخش صابر کا بھی جعفری کے بارے میں کہنا ہے کہ "چند سال ہوئے کہ مرا" (گلستانِ سخن ص ۱۸۶) صابر کا تذکرہ ۱۲۷۱ھ میں مکمل ہوا۔ اس سے بھی ۱۲۵۹ ہی کی تائید ہو سکتی ہے۔

صفحہ ۱۰ پر ممنون کی ولادت سے متعلق بحث ہے نتیجہ کے طور پر کہا گیا ہے کہ "ممنون کی ولادت ۱۱۷۶ اور ۱۱۸۰ھ کے مابین قرار پائے گی۔ اس سلسلے میں منت سے متعلق عاشق کا یہ بیان دیکھا جائے کہ "در عمر چہل ورنہ سالگی... در سنہ یکہزار و دوصد و ہشت و یک اجل در رسید (نشترِ عشق) یعنی منت ۱۱۵۹ھ کے قریب پیدا ہوئے ہوں گے پہلے بیٹے کی پیدائش کے وقت اگر وہ بیس برس کے ہوں تو اس کا سال ولادت ۱۱۷۹ھ کے قریب ہونا چاہیے۔ نظام الدین جو شاعر ہو کر ممنون کہلائے اس سال کے بعد پیدا ہوئے ہوں گے۔

تذکرہ "صبحِ گلشن" میں لکھا ہے کہ "ممنون تا زمانِ تالیفِ آفتاب عالمتاب بعمر شصت و پنج سالگی در قیدِ حیات بود" (ص ۵۱۸) تذکرہ آفتاب عالمتاب ۱۲۶۹ھ میں مکمل ہوا تھا لیکن اس کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اگر صبحِ گلشن کے مولف نے اس سے پچیس برس قبل کے نسخہ کا حوالہ دیا ہو تو اس سے ہمارے مذکورہ قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ ایک اور قرینہ یہ بھی ہے کہ میر حسن کے تذکرے کے علاوہ علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے "گلزار ابراہیم" میں بھی ممنون کا نام نہیں آیا ہے۔ اگر ممنون کا سالِ ولادت ۱۱۶۷ھ کے قریب ہوتا تو چونکہ انہوں نے کمسنی میں شعر گوئی شروع کر دی تھی "گلزار ابراہیم" میں جو ۱۱۹۸ھ میں لکھا گیا ممنون کا ذکر ہونا چاہیے۔ غرض مختلف قرائن اسی حق میں ہیں کہ ممنون ۸۱ — ۱۱۸۰ھ کے آس پاس پیدا ہوئے ہوں گے۔

صفحہ ۱۱۔ ممنون نے "فارسی درسیات تمام وکمال پڑھیں" یہی بات اس طرح بھی کہی گئی ہے کہ "گیارہ سال کی عمر تک انہوں نے تمام درسی کتابیں پڑھ لیں" اول تو یہ نہیں معلوم کہ گیارہ سال کی تخصیص کیوں ہے۔ دوئم یہ نہیں بتایا گیا کہ درسی کتابیں کس درجے یا سطح تک کی پڑھ لی تھیں۔ پھر "تمام" یا "تمام وکمال" کتابوں کا پڑھ لینا

خواہ بالکل ابتدائی درجے سے متعلق ہی ہو، خلافِ قیاس ہے پھر اس مکرر دعوے کے لیے کوئی سند بھی پیش کرنی ضروری تھی۔

مصنف کے بیان میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ ممنون نے شعر کہنا کب شروع کیا تھا۔ انہوں نے یہ اطلاع ضرور دی ہے کہ لکھنؤ کے "موزوں گو" ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ لکھنؤ پہنچنے کے وقت ممنون کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ اس سے پہلے انہوں نے شعر گوئی شروع نہ کی ہوگی۔

صفحہ ۱۱۔ شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر جیسے عظیم اہلِ فضل سے ممنون نے تعلیم حاصل کی ہوگی۔ یہ محض قیاس ہے۔ نو دس برس کا بچہ ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر تو ہو سکتا ہے لیکن ان کے علم و فضل سے مستفید ہونے کی لیاقت بھی رکھتا ہو، یہ بات معمولاً ممکن نہیں۔ صفحہ ۱۱۔ ممنون صاحب لکھنؤ سے دہلی واپس آئے تو شاہ نصیر اور ان کے معاصرین کا طوطی بول رہا تھا۔ ذوق، غالب اور مومن کی شاعری کا غلغلہ بلند تھا۔ اس سے پہلے مقالہ نگار نے بتایا ہے کہ ۱۲۱۲ھ کے قریب ممنون دہلی آ گئے تھے۔ اس وقت ذوق اور غالب تو محض بچے تھے اور مومن پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ شاعری کا غلغلہ کس طرح بلند ہوتا؟ پھر تسلسل کے ساتھ یہ بات لکھی گئی ہے کہ بادشاہ کے استاد مقرر ہوئے اور رئیس گاہ سلطانی سے فخر الشعرا خطاب ملا۔ ممنون شاہ عالم بادشاہ کے استاد تو ہو نہیں سکتے تھے۔ مصنف کی تحریروں میں ایسے اشارے ہیں کہ انہیں اکبر شاہ ثانی کا استاد سمجھا جائے لیکن خطابِ مذکور اکبر شاہ نے نہیں بلکہ ان کے والد شاہ عالم ثانی نے عطا کیا تھا۔ قدرت اللہ قاسم نے اپنا تذکرہ شاہ عالم کے عہد میں مکمل کر لیا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے "بہ قدر شناسی حضرت ظلِ سبحانی بخطاب مستطاب فخر الشعرای عز و احترام داشت"۔ (مجموعۂ نغز حصہ ۲ ص ۲۱۲) یہی بات اس اندراج سے بھی ظاہر ہوتی جو دیوانِ ممنون کے نسخۂ بھوپال سے مصنف نے نقل کیا ہے۔

مصنف کا کہنا ہے کہ ۱۲۱۷ھ کے لگ بھگ ممنون شاہی ملازمت سے الگ ہو کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی نوکری اختیار کر چکے تھے۔ اکبر شاہ ۱۲۲۱ھ میں تخت نشیں ہوئے۔ بادشاہ ہونے کے بعد انہوں نے ممنون سے شاعری میں رجوع کیا ہو۔ اس کا امکان نہیں ہے۔ اس سے بھی ممنون کو "استاد شہ" بتانا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

صفحہ ۱۵۔ ترکِ دربار کا سبب درباری لوگوں کی ریشہ دوانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ دعوا بھی محض قیاس پر مبنی ہے۔ اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ مقالہ نگار نے ممنون کو خود دار اور غیور ثابت کرنے کے لیے کئی باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً شاہ عالم کے دربار میں رسائی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ انہیں "کسی کی سعی و سفارش کی ضرورت درپیش نہ ہوئی۔ ان کی غیور طبیعت کسی کی بھی سفارش کا سہارا کیوں لیتی" (ص ۱۱) شاہی دربار

میں بغیر کسی کی سعی و سفارش کے پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ممنون کے حالات میں یہ بات بھی نہیں بتائی گئی کہ وہ لکھنؤ سے دہلی کیوں واپس آئے تھے۔ یا ان کے والد دہلی سے لکھنؤ کیوں گیے تھے۔ اگر یہ تفصیلات معلوم ہو جائیں تو سعی و سفارش کا حال بھی کھل جائے۔ لکھنؤ میں منت کی ملازمت کے لیے جن لوگوں نے سفارش کی مقالہ نگار کو ان کا حال بھی نہیں معلوم۔ ان سفارش کرنے والوں میں ایک شخص بھگوان داس ہندی تھا جس نے خود لکھا ہے "راقم او (منت) را بملازمت مہاراج ٹکیت رائے رسانیدہ بدرماہہ صد روپیہ ممتاز گردانید" (سفینۂ ہندی ص ۱۹۲) ضرورت اس بات کی ہے کہ حالات کی بالتفصیل جستجو کی جائے اور محض قیاس سے بے سروپا باتیں منسوب کر کے کسی شخص یا شاعر کو مشین یا فرشتہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

صفحہ ۱۹۔ ممنون کی تاریخ وفات کا تعین مولوی امام بخش صہبائی کے اس قطعہ سے اچھی طرح ہو جاتا ہے فرماتے ہیں"

میر ممنون از جہاں بگذشت و نزد عالمے زندگی را از ممات او بود حکم ممات

۱۲۶۰

اس تحریر نے راقم کو بڑی پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ دوسرے مصرع سے کسی بھی طرح ۱۲۶۰ کے عدد برآمد نہیں ہوتے پھر ایک شعر کا قطعہ اس سے پہلے سننے میں نہیں آیا تھا۔ یہ معمہ گلستانِ سخن سے حل ہوا۔ اس میں یہ قطعہ دو شعر کا ہے اور دوسرا شعر یہ ہے :

سر بجیبِ عقل بُردم، گفت آنکہ پیرِ عقل شاعرِ شیریں زبانِ ہند تاریخ یافت

۱۲۶۰

اب پتا چلا کہ مقالہ نگار نے صرف ایک شعر نقل کیا اور غور کیے بغیر دوسرے مصرع کے نیچے ۱۲۶۰ لکھ دیا حالانکہ مادۂ تاریخ شاعر نے دوسرے مصرع میں نظم کیا تھا۔

صہبائی کے اس شعر سے صرف وفات کے سال کا پتا چلتا ہے۔ تاریخ تو نہیں۔ البتہ زمانے کا کسی قدر بہتر تعین غالب کے اس خط کی مدد سے ہو جاتا ہے جو مصنف نے صفحہ ۱۸ پر نقل کیا ہے۔ ممنون ۱۲۶۰ھ کے بعد مرے ہونگے۔

ص ۲۳۔ ممنون تمام اہل خاندان کی پرورش اور تربیت کے فرائض بھی نہایت مسرت کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ مصنف شاید خاندان کو بیوی اور بیٹوں تک محدود سمجھتے ہیں" تمام اہل خاندان" میں بہت لوگ شامل ہوتے ہیں اور ان سب کو جمع کر لینا بھی آسان نہیں۔ سلاطین دہلی بھی اپنے خاندان کے تمام افراد کو لال قلعہ میں جگہ دینے پر قادر نہیں رہ گیے تھے۔ پھر مصنف کو یہ بات کس طرح معلوم ہوئی کہ یہ خدمت ممنون" نہایت مسرت کے ساتھ" انجام دیتے تھے" قہر درویش" کی صورت بھی ہوتی ہے۔ یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ ممنون روزگار کی تلاش میں شہر شہر مارے مارے پھرتے رہے۔" اجمیر سے دہلی آکر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے" اس کے لیے بھی کوئی ثبوت

پیش نہیں کیا گیا۔ ص ۲۲ پر یہ دعوا کیا گیا ہے کہ ممنونؔ کی شخصیت، گھریلو حالات اور خاندانی تفصیلات کے متعلق اردو تذکرے اس سے زیادہ معلومات بہم نہیں پہنچاتے۔ صحیح بس یہ ہے کہ مصنف نے اس سے حالات کی جستجو ہی نہیں کی ورنہ بعض باتوں کا اضافہ تو سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔ اور مزید یہ ہے کہ ممنونؔ کے دو بھتیجوں کا ذکر تو قادر بخش صابرؔ ہی کے تذکرے میں موجود ہے۔ یعنی میر علی نقی سیدؔ اور میر ابوالقاسم محبؔ۔

کہا گیا ہے کہ ممنونؔ کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے لیکن مقالہ نگار نے صرف اٹھارہ شاگردوں کے نام لکھے ہیں۔ اور ان ناموں میں صحت کا التزام بھی نہیں کیا ہے۔ مثلاً مہتابؔ کا نام خود داری خاں لکھا ہے یہ خداوردی خاں ہے (ایضاً ص ۱۰)۔ ممنونؔ کے تلامذہ کی فہرست میں کئی ناموں کا اضافہ آسانی سے ممکن تھا۔ مثلاً قدرت اللہ قاسمؔ کے تذکرے میں یہ نام بھی ہیں۔ رغبتؔ میر ابوالمعالی، مظفرؔ شیخ حسن علی لکھنوی، مفتونؔ شیخ عبدالرحیم۔ اسی طرح صابر کے تذکرے میں ان کے درج ذیل شاگردوں کا حال بھی منقول ہے مثلاً سید میر علی نقی، صادقؔ شیخ محمد صادق قریشی، محبؔ میر ابوالقاسم۔ اس کے بعد زیر تبصرہ رسالے کا تنقیدی حصہ شروع ہوتا ہے جس میں مختلف لوگوں کی آرا بار بار نقل کی گئی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کا ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے جس میں ممنونؔ کا نام بھی نہیں آیا ہے۔ معاصرین دہلی کے عنوان سے بہادر شاہ کے قلعہ معلّا کا ذکر کیا ہے جہاں شیفتہؔ، صہبائیؔ، آزردہؔ، مومنؔ، ذوقؔ، غالبؔ، شاہ نصیرؔ، رنگینؔ، انشاؔ اور مصحفیؔ شعری مجلسوں کو آراستہ رکھتے تھے۔ ان سب شاعروں کو مرزا فرحت اللہ بیگؔ بھی اپنے یادگار مشاعرے میں جمع نہیں کر سکے تھے۔ یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ ممنونؔ نے کوئی اسّی برس کی عمر پائی تھی۔ اس طویل عمر میں انہیں بہادر شاہ ظفرؔ کے عہد کے صرف سات سال ملے تھے۔ اور ان سات میں سے بھی زیادہ مدت ان کی غالباً اجمیر میں گذری تھی۔ چنانچہ شیفتہؔ نے لکھا ہے کہ "از چندگاہ بکوہستان اجمیر بسگزارد" اس لحاظ سے ممنونؔ کا تعلق بہادر شاہ کے دربار سے بہت ہی کم تھا۔

ممنونؔ کی تصانیف کے سلسلے میں مصنف نے ان کے کلام کے انتخابوں کا ذکر کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے اپنا دیوان کب مرتب کیا تھا۔ اس ذکر کے باوجود کہ دیوانِ ممنونؔ کے چار مخطوطے دستیاب ہیں۔ ان مخطوطوں کے بارے میں کوئی بات بتانے کی زحمت نہیں کی ہے۔ ممنونؔ کے یہاں ایسے قصیدے بھی ہیں جو کسی دوسرے سودا سے منسوب ہو گئے ہیں۔ ان قصیدوں کے بارے میں بھی کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔ مختلف مقاموں پر قیام کے نتیجے میں ممنونؔ کی زبان میں کس طور پر تبدیلی آئی؟ ان کی شاعری کس طرح متاثر ہوئی اور پھر نئی نسل پر ان کے اثرات کس حد تک مرتب ہوئے؟ یہ وہ موضوعات و مسایل تھے جن سے بحث ضروری تھی۔ مقالہ نگار کا دعوا کچھ بھی ہو اس کام سے ممنونؔ کے حالات اور ان کے علمی کاموں سے کماحقہٗ تعارف حاصل نہیں ہوتا۔

●●

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ
۱۱۔ اسٹاف کی ٹاؤن
ناگپور

جواب

آپ کا رجسٹری مکتوب موصول ہوا اس سے پہلے بھی دو خطوط مل چکے تھے میری نظر میں ان کا جواب دینا ضروری نہیں تھا اسلئے خاموش رہا۔ اب تازہ رجسٹری خط نے جواب لازم کر دیا اسلئے عرض ہے کہ میرے تحقیقی مقالہ بعنوان "میر نظام الدین ممنون دہلوی۔ حیات شخصیت اور شاعری مع مرتبہ دیوان ممنون" کے بارے میں فاضل دانشور محقق ڈاکٹر انصار اللہ صاحب نے تبصرہ فرماتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کے تعلق سے مجھے تو صرف یہی کہنا ہے کہ

ع خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی

میں نے تو ممنون دہلوی جیسے یگانہ روزگار کے حالات زندگی مفصل انداز میں جمع کر کے ان کی شخصیت اور شاعری کا کماحقہٗ جائزہ لیا ہے اور ان کا دیوان مرتب کر کے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس مقالہ مع مرتبہ دیوان ممنون پر مجھے ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ترین سند بھی تفویض ہوئی ہے میرا تحقیقی مقالہ مع مرتبہ دیوان ممنون ۷۲۳ صفحات پر مشتمل ہے جو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی مالی اعانت سے شائع ہوا ہے۔ اسی مقالہ کا مختصر خلاصہ (۸۶ صفحہ پر مشتمل) میں نے طلبا کے استفادہ کیلئے الگ سے شائع کروایا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہی مختصر خلاصہ والا نسخہ جناب انصار اللہ صاحب کے ہاتھ آیا اور انہوں نے فاضلانہ انداز میں اس پر اظہار خیال فرما کر اپنے ذوق تحقیق کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ اور مشفقانہ شکوہ طرازی کے ساتھ مجھے سہل انگاری کا مورد ٹھہرایا ہے۔ ماشاء اللہ اور سبحان اللہ کہتے ہوئے نظیری کا یہی شعر ان کی نذر کرتا ہوں

تا منفعل ز رنجش بے جانہ بینمش | می آرم اعتراف گناہِ نبودہ را

میرا مکمل "ضخیم مقالہ" اور "مختصر خلاصہ" یہ دونوں کتابیں آپ کی لائبریری میں موجود ہیں۔ اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی۔ ضرور دیکھ لیجئے اور خود فیصلہ فرمایئے کہ قصور تبصرہ نویس کا ہے یا مقالہ نگار کا۔ ایک بات اور کہتے چلوں کہ میرا مطبوعہ تھیسس مع دیوان مرتبہ دیکھ کر شہرہ آفاق محقق جناب مالک رام صاحب نے پروفیسر احتشام حسین مرحوم اور سجاد ظہیر مرحوم سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ "منشا صاحب نے ممنون دہلوی کو درحقیقت زندہ کر دیا ہے۔ اب تو انہیں "منشا ممنون" کے نام سے پکارا جانا چاہیے" یہ کہتے ہوئے دل کھول کر مبارکباد دی تھی۔ خیر انصار اللہ صاحب کی رائے بھی میرے سر آنکھوں پر ہے۔ اس کیلئے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

••

ڈاکٹر محمد انصار اللہ
شعبۂ اردو
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

پروفیسر عتیق احمد صدیقی کا تھیسس

قصائد سودا

اُردو میں پی ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کی اسناد کے لیے منظور شدہ ایسے مقالوں کی جن میں تحقیقی نقطۂ نظر سے خامیاں موجود ہوں، کچھ کمی نہیں ہے۔ لیکن تلاش ایسے مقالے کی تھی جو اس اعتبار سے جامع حیثیات ہو۔ بڑی جستجو کے بعد نگاہ انتخاب پروفیسر عتیق احمد صدیقی صاحب کے مقالے پر پڑی۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ تدوینِ متن کے ضابطوں سے لے کر املا اور تلفظ تک کی ہر قسم کی اغلاط اس میں موجود ہیں۔ اس مقالے کا جائزہ بہت اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے، اس توقع کے ساتھ کہ آئندہ کام کرنے والوں کے لیے یہ بہتری کا سبب بنے گا۔

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام اردو میں تحقیق کے معیار کو بحال کرنے کے تعمیری مقصد سے، مختلف یونیورسٹیوں میں پی ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کی اعلاترین علمی اسناد کے واسطے منظور شدہ مقالوں کے جائزے کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے، نہایت مبارک اور لائقِ تحسین ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اصلاح کے زعم یا شوق میں کونپلوں کو چھانٹنے کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔ جڑ پر نظر رکھنی ضروری ہے تاکہ مرض کا سبب دور ہو اور نہالِ تحقیق کو پنپنے اور بار آور ہونے کے مواقع حاصل ہو سکیں۔

اردو کے نقطۂ نظر سے ہندوستان ہی میں نہیں پوری اردو دنیا میں مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ امتیازی حیثیت کی مالک ہے۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کے اثرات دور رس ہی نہیں، دیرپا بھی ہوتے ہیں۔ تحقیق سے متعلق یہاں کے ہر دلعزیز استاد کا یہ مصرع آج بھی زبانوں پر جاری ہے کہ ع پھر علی گڑھ میں چلی بادِ وبائے تحقیق

ایک دوسرے معتبر استاد کا یہ قول بھی ذہنوں میں محفوظ چلا آتا ہے کہ: "میں باریک تحقیق کا قائل نہیں ہوں" لیکن تحقیق سے متعلق یہ اولین ارشادات نہیں ہیں۔ "خشتِ اوّل" تو اور بھی پہلے کج ہو چکی تھی۔ اس کے جائزے کا یہ موقع نہیں صرف ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے، جس سے حقیقتِ حال کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا۔

تیس برس سے زیادہ ہو چکے جب "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" کی اسکیم میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا تقرر اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے ہوا۔ اس زمانے میں اس اسکیم کا بلیٹن بھی چھپتا تھا۔ پہلا بلیٹن پروفیسر رشید احمد صدیقی نے نکالا۔ پھر دوسرا

بلیٹن پروفیسر آل احمد سرور کی دستخط سے ستمبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس دوسرے بلیٹن کے صفو نمبر ۹ پر مضامین کا تعارف اس طرح شروع ہوا ہے "مواد کا دوسرا حصہ دکنیات سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس سلسلے میں چند مضامین ترتیب دیے ہیں، جن کا خلاصہ درجِ ذیل ہے "اس کے بعد یہ عنوان ہے:

" خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی طرف منسوب رسایل پر ایک نظر" اس کے تحت درج ذیل رسالوں سے بحث کی گئی ہے:

۱۔ معراج العاشقین اور ہدایت نامہ ۲۔ تلاوۃ الوجود ۳۔ وجود نامہ ۴۔ رسالہ ارشاد نامہ اور ذکر نامہ ۵۔ رسالہ وجودیہ ۶۔ مجموعۂ رسائل ۷۔ درالاسرار ۸۔ مشاہدۃ الاکبر ۹۔ کھیتی کا رسالہ ۱۰۔ شکار نامہ ۱۱۔ پند ارشاد نامہ ۱۲۔ ایک مجموعے میں تین رسالے ہیں (صفحہ ۹ تا ۱۶) چار برس کے بعد ۱۹۶۲ء میں علی گڑھ تاریخِ ادب اردو کی پہلی جلد چھپ کر آئی تو حیرت ہوئی کہ یہ پورا حصہ پروفیسر عبدالقادر سروری کے مقالے میں شامل تھا جس کا عنوان یہ ہے:

" تیسرا باب ـــــ اردو ادب بہمنی دور میں" زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ:

۱۔ رسالۂ وجودیہ ۲۔ مجموعۂ رسائل ۳۔ مشاہدۃ الاکبر ۴۔ کھیتی کا رسالہ ۵۔ پند ارشاد نامہ ۶۔ ایک مجموعے میں تین رسالے۔ کے بارے میں بلیٹن میں نذیر احمد صاحب کے نام سے جو خلاصہ چھپا تھا، علی گڑھ تاریخِ ادب اردو میں صفحہ ۱۴۲ سے ۱۵۷ تک لفظ بہ لفظ سروری صاحب کے نام سے موجود ہے۔ باقی چھ رسالوں کے بارے میں جیسا کہ ہونا بھی چاہیے تھا، کتاب میں زیادہ تفصیلی اور طویل بحث ہے۔

راقم نے ذاتی طور پر ڈاکٹر نذیر احمد سے اس بارے میں استفسار کیا تھا۔ وہ قدرے منغّض ہوئے اور اس مذکور کو ٹال گئے ـــ یہی بات جب سرور صاحب سے کہی گئی تھی تو حسبِ عادت انھوں نے مسکرا کر فرمایا تھا کہ: "بھائی دنیا کے کام اعتبار سے ہی چلتے ہیں" سرور صاحب میں مروّت بہت زیادہ ہے اور مروت اور تحقیق میں ایک قسم کا تضاد ہے ـ سرور صاحب کو بلیٹن پر دستخط کرتے وقت اصل مضامین کو دیکھ لینا چاہیے تھا۔ لیکن راقم نے سنا ہے کہ اس زمانے میں نذیر احمد صاحب سرور صاحب کے نہایت قریب تھے البتہ جب کتاب چھپ کر آئی، اس وقت نذیر احمد صاحب کا شعبۂ فارسی میں تقرر ہو چکا تھا۔ بدگمان کہتے ہیں کہ اس کتاب کی فروخت کے ممنوع قرار دیے جانے میں نذیر احمد صاحب کا بھی ہاتھ تھا۔ واللہ اعلم۔

تحقیق کا کام غالباً اسی شخص کو زیب دیتا ہے جو قاضی عبدالودود کی طرح بے غرض بھی ہو اور بے باک بھی۔ تقرر اور ترقی کے خواہاں سے اس میدان میں اعلا کارکردگی کی توقع کم ہوتی ہے۔ انگریزی میں مشہور ہے کہ چمکنے والی ہر چیز سونا نہیں ہوتی۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب فرماتے تھے۔

دنیا میں ہر ناممکن بات ہوتی ہے۔ وہ بھی ہوتا ہے جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔" یونیورسٹیوں میں تحقیق کے ... اس کا جائزہ لیتے ہوئے ان حقائق کو ذہن میں رکھنا لازم ہے۔

پروفیسر عتیق احمد صدیقی صدر شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جن کے مقالے کا یہاں جائزہ پیش کیا جائے گا، دہلی یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اپنے بارے میں انھوں نے راقم کو بتایا کہ ۱۹۶۰ء میں انھوں نے ایم اے کیا۔ پھر ۱۹۶۴ء میں میواتی بولی کا تفصیلی مطالعہ (A DESCRIPTIVE STUDY OF MEWATI DILECT) کے عنوان سے وہیں ریسرچ شروع کی۔ درمیانی مدت کا حال راقم کو معلوم نہیں) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ۱۹۶۶ء میں ہوا۔ اس کے چند سال کے بعد انھوں نے "قصائدِ سودا کی تنقیدی تدوین" (A CRITICAL EDITION OF QASAED-E-SAUDA) کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ پیش کرنے کی اجازت طلب کی۔ یونیورسٹی کے ضابطے کے مطابق پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبہ کی حیثیت سے رسمی طور پر نگراں مقرر ہوئے۔

راقم کی اطلاع کے مطابق عتیق صاحب کی درخواست پیش ہونے سے بیشتر یعنی ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی "کلیاتِ سودا" مرتب کر کے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی سند لے چکے تھے (جائزہ جلد ۱ ص ۵۲۹) کیا یہ بات عبرت کی نہیں ہے کہ لندن یونیورسٹی میں جہاں اردو محض ایک غیر زبان ہے، پی ایچ ڈی کے لیے پورا کلیاتِ سودا قبول کیا جائے اور مسلم یونیورسٹی میں کہ جسے اردو کے لیے امتیازی حیثیت حاصل ہے کئی برس کے بعد سودا کے محض چند قصیدوں کو یکجا کر دینا کافی تسلیم کر لیا جائے۔

پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے سودا کے قصیدوں کا جو مجموعہ تیار کیا تھا، ۱۹۷۲ء کے وسط میں اسے ممتحنین کی منظوری حاصل ہو گئی۔ اس میں ڈاکٹر شمس الدین کے مرتب کردہ کلیات کا ذکر نہیں ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ اس میں ڈاکٹر شمس الدین کے کام پر کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

قصائدِ سودا کی تدوین کے سلسلے میں پہلا کام یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ قصیدے فراہم کر لیے جائیں یعنی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ایسے تمام مجموعے جمع کیے جائیں جن میں سودا کے قصیدے مندرج ہیں۔ جناب مشفق خواجہ نے کلیاتِ سودا کے چار اور کلامِ سودا کے انتخابوں کے ایک درجن مطبوعہ نسخوں کا تعارف کرایا ہے (جائزہ جلد ۱ ص ۵۲۷ تا ۵۴۱) ان میں ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کا کلیاتِ سودا بھی شامل ہے۔ زیرِ تبصرہ مجموعے (جسے آئندہ "قصائدِ سودا" ہی کہا جائے گا) کے مرتب نے صرف دو مطبوعہ نسخوں کا ذکر کیا ہے۔

جناب مشفق خواجہ نے سودا کے کلیات، دیوان اور قصیدوں کے مجموعوں اور انتخابوں پر مشتمل ایک سو اٹھاسٹھ
قلمی نسخوں کے علاوہ، "قصیدہ باب الجنت" کے ایک نسخہ کا بھی تعارف کرایا ہے (ایضاً جلد اص ۴۷، ۲۴۷، ۴۹تا ۵۲، ۵۴۵) اس فہرست کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا گیا ہے۔ مختلف کتب خانوں میں اور بھی بہت نسخے موجود ہوں گے۔

مرتب قصائد سودا نے کل (۱۷+۱۶) تینتیس مخطوطوں کا ذکر کیا ہے۔ سودا کے قصیدے مختلف بیاضوں اور متفرق انتخابوں میں بھی شامل ہیں۔ ان کی طرف بالکل نظر نہیں کی گئی ہے۔

مرتب قصائد سودا (پروفیسر عتیق احمد صدیقی، آئندہ ہر جگہ "مرتب" لکھا جائے گا) نے "مطبوعہ و مخطوطہ" مختلف نسخوں کا جو تعارف تحریر کیا ہے، اس میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ نسخہ نمبر ۱، ۱۹۲۲ء کا مطبوعہ ہے اور نسخہ نمبر ۲، ۱۹۱۶ء کا۔

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ (آئندہ صرف "انجمن") کے چھ نسخوں کا ذکر نمبر ۳، ۴، ۵، ۱۴، ۱۵ اور ۵ پر ہے۔ جناب مشفق خواجہ نے لکھا ہے:

"انجمن ترقی اردو ہند میں کلام سودا کے بیس نسخے ہیں۔" (جائزہ جلد اص ۵۱۷) اور ان نسخوں کا تعارف محمد ابرار حسین فاروقی سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ کے جون ۱۹۵۲ء کے شمارے میں کرا چکے تھے۔

اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، حیدر آباد (۔۔ آصفیہ) کے مخطوطات کی فہرست (جلد اول) میں جو ۱۹۶۱ء میں چھپی تھی، کلیات سودا کے تین، دیوان سودا کے ایک اور قصائد سودا کے تین (کُل سات) نسخوں کا ذکر ہے۔ مرتب نے ان میں سے صرف تین کا ذکر نمبر ۱۲، ۱۳، الف پر کیا ہے۔

مرتب نے کتب خانہ خدا بخش پٹنہ میں چار نسخوں کا ذکر کیا ہے، جب کہ اس کتب خانے کی اس فہرست سے جو ۱۹۶۲ء میں چھپی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کلیات سودا کے پانچ، منتخبات دیوان سودا کے ایک نسخہ کے علاوہ ایک "بیاض مجموعۂ قصائد و مراثی سودا و دبیر" بھی موجود ہے۔

مرتب نے جو "تعارف نسخ" لکھا ہے اس میں رامپور، پٹنہ، حیدر آباد وغیرہ کے مختلف کتب خانوں کا ذکر تو آیا ہے لیکن کسی بھی کتب خانے میں موجود تمام نسخوں کو دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ اس سے ان کتب خانوں کے بارے میں بھی غلط فہمی کی صورت پیدا ہوئی ہے کہ وہاں بس یہی چند نسخے موجود ہیں۔

"تعارف نسخ" کی ذیل میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کل پچیس نسخوں کا ذکر آیا ہے لیکن قصائد سودا میں ان سب سے بھی پوری طرح استفادہ نہیں کیا ہے۔ صفحہ ۶۰ پر لکھا ہے:

جن نسخوں کے پورے متن کا مقابلہ کیا گیا ہے ان کو ہندسی اعداد سے ظاہر کیا گیا ہے اور جن سے جزوی طور پر چند

قصائد کا مقابلہ کیا گیا ہے انھیں ابجدی اعداد کے ذریعہ ۔"

اس بیان کے مطابق چھ نسخے "جزوی طور پر" دیکھے گیے ہیں لیکن 'ہندسی اعداد سے ظاہر' کیے جانے والے بھی تمام نسخوں کے "پورے متن" کو نہیں دیکھا گیا ہے۔ نسخہ نمبر ۱ کے بارے میں اعتراف ہے: "یہ نسخہ صرف اسی قصیدے کے متن کے مقابلے کے لیے استعمال کیا گیا ہے" (ص ۹۸) 'صرف سات قصائد کا اس سے تقابل کیا گیا'۔ (ص ۱۰۶)

جن نسخوں سے استفادہ کرنے کا دعویٰ ہے ان کی تعداد الگ الگ جگہوں پر الگ الگ بتائی ہے مثلاً صفحہ ۲۲ پر: "کلیات سودا کے نسخوں کی بڑی تعداد ہے ۔ یہاں تقریباً پچیس نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔" اور صفحہ ۱۲ پر ہے:

"اٹھارہ مخطوطات کو کلی طور پر اور چار مخطوطات کو جزوی طور پر استعمال کیا گیا ہے۔" تعارف نسخ میں جن نسخوں کو "ہندسی اعداد سے ظاہر کیا گیا ہے" ان کی تعداد (۳ تا ۱۹) کل سترہ ہے۔ ان میں نسخہ نمبر ۱۱ اور نسخہ نمبر ۷ کا حال بیان ہوا۔ ان کو نکال دیں تو جن نسخوں سے کلی طور پر استفادہ کیا ہو گا ان کی تعداد پندرہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

○

مرتب کا دعویٰ ہے کہ سودا کے کلام میں تمام اصناف میں الحاق ہے لیکن قصیدے اس سے پاک ہیں (قصائد سودا ص ۳۵) اسی لیے انھوں نے "تعارفِ نسخ" کی بحثوں میں اس طرف بالکل نظر نہیں کی۔ کسی بھی نسخے میں جو کچھ لکھا ہے، اسے اخذ کر لیا گیا ہے۔ تحقیق کے اصولوں کے مطابق اتنی بات ہی اس مجموعے کے نامعتبر ہونے کے لیے کافی ہے۔

نسخہ نمبر ۱ عبد الباری آسی کا مرتب کردہ کلیاتِ سودا جو مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۹۳۲ء میں چھپا تھا، اس کے بارے میں ڈاکٹر شمس الدین کی رائے ہے:

"اس میں ہر قسم کی بے شمار غلطیوں کے علاوہ الحاقی کلام بھی بہت سا شامل ہے ـــــ یہ ایڈیشن بھی قریب قریب اتنا ہی ناقابلِ اعتبار ہے جتنا کہ ... پہلا ایڈیشن"۔ (جائزہ جلد ۱ ص ۵۲۸)

نسخہ نمبر ۲ یہ مطبع نولکشور کانپور میں چھپا ہوا ۱۹۱۶ء کا ایڈیشن ہے۔ اقتباس بالا میں "پہلا ایڈیشن" سے یہی نسخہ مراد ہے۔ مرتب نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

اس نسخہ کے مؤلف غلام احمد ہیں۔ مولف کے دعوے کے مطابق یہ کلیات دیگر تمام نسخوں سے جامع تر ہے" (ص ۹) مولف، مرتب، مدوّن اور جامع وغیرہ لفظوں میں فرق کیا جانا چاہیے۔ غلام احمد کلیاتِ سودا کے مولف نہیں ہو سکتے۔ "مولف کے دعوے" سے ظاہر ہے کہ اس وقت کلیاتِ سودا کے اور نسخے بھی موجود تھے۔ ان کے بارے میں تو کیا، مرتب نے خود غلام احمد کے مرتب کردہ نسخے کے قدیم تر ایڈیشن کے بارے میں بھی معلومات حاصل نہیں کی ہیں۔

نسخہ نمبر ۳:- انجمن کا نسخہ (نمبر ۱۲ / ر ۸۹۱) ہے۔ اس کی کتابت کی تاریخ اس طرح لکھی ہے: "تمت تمام شد دیوان مرزا رفیع السودا، بتاریخ ششم رجب روز پنجشنبہ ۱۲۰۳ھ" (قصائدِ سودا ص ۸۰)

ترقیمہ میں سال جب لفظوں میں ظاہر کیا گیا ہو، شبہ کا امکان کم ہوتا ہے لیکن جب وہ صرف ہندسوں میں ہو تو بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ترقیمہ میں ۱۲۰۳ھ کے مقابلے میں ۱۲۳۰ ہونا زیادہ قرینِ صحت ہے۔ ۶ رجب ۱۲۳۰ھ کو جمعرات کا دن تھا۔ کلنڈر کے علاوہ اس کی توثیق نسخہ نمبر ۱ کے ترقیمہ سے بھی ہوتی ہے جہاں تاریخ اس طرح درج ہے۔

"تاریخ ۱۳ شعبان المعظم ۱۲۳۰ھ، روز جمعہ" (ایضاً ص ۱۰۶) اگر اس سال میں رجب کا چاند انتیس کو دیکھا گیا ہو تو ۱۳ شعبان کو جمعہ کا دن ہوگا۔ نسخہ کے کاتب اور مقامِ کتابت کا کہیں اظہار نہیں ہوا ہے۔ کاتب نے اس قصیدے کو جس کا پہلا مصرع یہ ہے ع ہے اشتہار تجھ سے مرا اے فلک جناب

"نواب آصف الدولہ بہادر" سے منسوب کیا ہے۔ اسی طرح بسنت خاں کی مدح میں جو پہلا قصیدہ ہے اسے "در تعریفِ مارغ فتح جنگ" بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ کاتب نے احتیاط سے کام نہیں لیا ہے۔ وہ کم سواد ہے۔ اکثر لفظوں کو اس نے غلط لکھا ہے (قصائدِ سودا ص ۸۲، ۸۳) اس نسخے میں چند قصیدے ایسے بھی ہیں جن کا تصنیف کردہ سودا ہونا مشتبہ ہے دو قصیدے وہ ہیں جو کلیاتِ ممنون میں بھی درج ہیں۔

مرتب نے بار بار یہ دعویٰ کیا ہے کہ "متن میں بیشتر اس نسخہ کا اتباع کیا گیا ہے" (ایضاً ۸۳) لیکن حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ بیشتر قصیدوں میں اس کے متن کو قبول نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں جو اختلاف پایا گیا ہے اس کی نشاندہی کم و بیش ہر قصیدے کے حاشیہ پر کی گئی ہے۔

نسخہ نمبر ۴:- بھی انجمن میں (نمبر ۱۵۵ / ۸۹۱ پر) محفوظ ہے۔ ناقص الآخر ہے اور بقول مرتب "سِن کتابت، زمانۂ کتابت اور مقامِ کتابت کا کوئی حال اس سے معلوم نہیں ہوتا..... آخری قصیدہ "گر خاں یہ رنگ" ہے۔ اس کا عنوان "در مدحِ خلفِ حسن رضا خاں" ہے۔ قصیدے کے متن میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہ انتساب کسی اور نسخہ میں نہیں۔ خود قصیدہ کے اشعار ۱۱، ۱۵ سے اس کی تردید ہوتی ہے۔" (قصائدِ سودا ص ۸۴) یعنی اس نسخے کا کاتب بھی غیر محتاط ہے اور نسخہ نمبر ۳ کے کاتب کی طرح اس نے بھی قصیدوں کو سمجھ کر نقل نہیں کیا ہے۔ یہ نسخہ بھی اتنا ہی نامعتبر ہے جتنا نمبر ۳۔

نسخہ نمبر ۵:- بھی انجمن میں (۱۲۱ / ۸۹۱ پر) ہے۔ آصف الدولہ، حسن رضا، حکیم محمد کاظم کی مدح میں لکھے گئے قصیدے وغیرہ موجود ہونے کی وجہ سے مرتب کا کہنا ہے کہ:

یہ نسخہ دہلی میں اور سودا کے دہلی چھوڑنے ۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۴ء سے قبل ہی لکھا گیا..... اس نسخہ میں محمد شاہ عالم بہادر

کی شان میں لکھا ہوا قصیدہ "ہے اشتہار ـــــ الخ" بھی موجود نہیں ہے جو یقیناً ۱۱۶۱ھ سے پیشتر لکھا گیا ہے۔" (قصائدِ سودا ص ۴۲) سودا ۱۱۶۸ھ میں دہلی چھوڑ چکے تھے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں۔ اگر محض بعض قصیدوں کا نہ ہونا کافی ثبوت ہے تو اسے ۱۱۶۱ھ سے پہلے کا کیوں نہیں مانا گیا؟ قصیدہ "ہے اشتہار ـــــ الخ" کے بارے میں مرتب کا یقین محض بے بنیاد ہے۔ وہ محمد شاہ کی مدح میں نہیں ہے۔ یہ ایک مجہول الحال نسخہ ہے۔ اس میں قصیدہ (نمبر ۵۵) ایسا ہے جو بجز نسخہ نمبر ۲ کے کسی دوسرے نسخے میں موجود نہیں۔ اور وہ قصیدہ کسی طرح سودا کا کہا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ قصیدہ نمبر ۲۵ میں جو اشعار الحاقی معلوم ہوتے ہیں وہ سب بھی اس نسخے میں موجود ہیں۔

نسخہ نمبر ۶ رضا لائبریری رامپور (نمبر ۳۸۸د) میں ہے۔ مرتب کا کہنا ہے کہ: "نسخہ کے درمیان بعض مقامات پر ۱۲۲۹ھ درج ہے۔ کہیں کہیں ایسا شبہ ہوتا ہے کہ اس کو ۱۲۱۹ بنانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔" (قصائدِ سودا ص ۸۸) اس کی کتابت کے وقت تک سودا کی وفات کو کئی برس ہو چکے تھے، باوجود اس کے اس نسخے کے کئی اندراجات لائق توجہ ہیں مثلاً قصیدہ نمبر ۲۵ میں جو الحاقی اشعار ہیں وہ اس نسخے میں غیر موجود ہیں۔ ایسے قصیدے بھی جن پر الحاقی ہونے کا شبہ ہے اس نسخے میں نہیں ہیں۔

نسخہ نمبر ۷ یہ بھی رضا لائبریری کا نسخہ (نمبر ۳۸۹د) ہے۔ اس میں ترقیمہ نہیں ہے۔ بقولِ مرتب "صرف تیرہ قصائد متداولہ اس میں درج کئے گئے ہیں" (قصائدِ سودا ص ۹۰)۔ ظاہراً اس میں بھی الحاقی حصہ نہیں معلوم ہوتا۔

نسخہ نمبر ۸ دو جلدوں میں جونپور میں ۱۲۲۳ھ میں لکھا گیا تھا۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں (نمبر ۲۱۶ - A / نمبر ۲۱۶ - B) محفوظ ہے۔ اس میں بھی ممدوحین کے نام اور ان سے متعلق اشعار بھی بدلے ہوئے ہیں (قصائدِ سودا ص ۹۲ تا ۹۳) کچھ قصیدوں میں جن شعروں پر الحاقی ہونے کا گمان ہے وہ بھی اس میں موجود ہیں۔ سیف الدولہ کو قصیدہ نمبر ۲۷، ۲۸ میں پسر سادات خاں بہادر اور قصیدہ نمبر ۲۹ کے عنوان میں پسر صلابت خاں بہادر لکھا ہے۔ بے احتیاطی کی یہ صورت ہے جس کی مثال ملنی آسان نہیں۔

نسخہ نمبر ۹ بھی خدا بخش لائبریری میں ہے۔ اس میں بھی شعروں کے متن میں اختلاف ملتا ہے لیکن کچھ ایسے شعر جن پر الحاقی ہونے کا گمان ہے، اس میں نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نسخہ لائق توجہ ہے۔ قصیدہ در مدح جانسن کا عنوان اس نسخہ میں اس طرح لکھا ہے: "فی المدح جانشین" (جان شین) شاید اسی کو "جانشین" پڑھ لیا گیا۔ نسخہ نمبر ۲ کے کاتب نے غالباً اسی بنا پر اس قصیدہ کا عنوان "در مدح خلفِ حسن رضا خاں" لکھ دیا ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہو تو ان دونوں نسخوں میں ایک تعلق سمجھا جا سکتا ہے۔

نسخہ نمبر ۱۰ عہد غازی الدین حیدر بادشاہ کا لکھا ہوا ہے۔ اس وقت سودا کی وفات کو یقیناً تیس برس سے زائد ہو چکے تھے، باوجود اس کے قصیدہ نمبر ۲۵ کے وہ اشعار جن پر الحاقی ہونے کا گمان ہے اس نسخہ میں نہیں ہیں۔

نسخہ نمبر ۱۱ بھی خدا بخش لائبریری میں (نمبر ۱۱۸پ) ہے۔ اس کے زمانۂ کتابت کے بارے میں مرتب کا کہنا ہے کہ:۔
"قصیدہ ع دکھانا جائے اس سے ـــــ الخ ... کا عنوان 'قصیدہ فی المدح ممتاز الدولہ بہادر جانشین صاحب حسام جنگ حفظ اللہ تعالیٰ' درج ہے ... اس نسخہ کی کتابت تک رچرڈ جانسن لکھنؤ میں موجود ہوں گے اور ... کتابت لکھنؤ میں ہوئی ہوگی۔" (قصائدِ سودا ص ۹۸) چوں کہ اس نسخے سے اسی ایک قصیدے کا مقابلہ کیا گیا ہے، اس کی کیفیت کا اندازہ حواشی سے نہیں کیا جا سکا ہے۔

نسخہ نمبر ۱۲ کے بارے میں مرتب نے بس یہ لکھا ہے کہ کاتب یا کتابت کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کُل اٹھائیس قصیدے درج ہیں۔ (قصائدِ سودا ص ۹۹) بظاہر اس میں وہ قصیدے نہیں ہیں جن پر الحاقی ہونے کا شبہ ہے۔

نسخہ نمبر ۱۳ آصفیہ میں ہے اور بقول مرتب "غالباً ۱۲۲۹ھ میں لکھا گیا۔" (قصائدِ سودا ص ۱۰۰) لیکن جناب مشفق خواجہ کے خیال میں تاریخِ کتابت ۱۲۳۹ھ ہے۔ اس میں قصیدہ نمبر ۵ جس کا پہلا مصرع یہ ہے ـــــــــ
"لختِ دل بکھرے ہیں یوں آہ سے ہنگامِ قلق"۔ موجود ہے اور وہ کلیاتِ ممنون میں بھی شامل ہے۔ بعض دوسرے قصیدوں کے عنوان میں بھی اس نسخے میں اختلاف ملتا ہے۔ یہ نسخہ بھی بعض دوسرے نسخوں کی طرح قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

نسخہ نمبر ۱۴ انجمن میں ہے۔ خیال ہے کہ سودا کے انتقال کے چند سال کے بعد اس کی کتابت مکمل ہوئی تھی۔ اس میں بعض ایسے قصیدے اور قصیدوں کے ایسے اشعار شامل ہیں جن پر الحاقی ہونے کا گمان ہے۔

نسخہ نمبر ۱۵ بھی انجمن میں (ر $\frac{۱۲/۷/۸۹۱}{۸}$ پ) ہے تیرھویں صدی کے نصفِ آخر میں اس کی کتابت ہوئی ہوگی۔ اس میں بقول مرتب: "مندرجہ ذیل دو قصائد ہیں جو کسی اور نسخے میں نہیں ملے ع ہوئے جو قطرہ ریز ـــــ الخ در مدح حضرتِ امام تقی اور ع ہوا کے فیض سے ایسا ـــــ الخ در مدح حضرتِ امام نقی ـــــ کسی دوسرے نسخے سے ان قصائد کی تصدیق نہیں ہو سکی۔" (قصائدِ سودا ص ۱۰۲) ان میں سے پہلا قصیدہ کلیاتِ ممنون میں شامل ہے۔ یہ نسخہ نہایت نامعتبر ہے۔

نسخہ نمبر ۱۶ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (حبیب گنج کلکشن $\frac{۵۴}{۴}$) میں ہے۔ کہا گیا ہے کہ: "(اس میں شامل) سب قصائد سودا کے دہلی چھوڑنے سے قبل لکھے گئے، لیکن محمد شاہ کی مدح کا قصیدہ ع ـــــ ہے اشتہار تجھ سے ـــــ الخ اس میں شامل نہیں۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس نسخے میں وہ سب کلام شامل نہیں جو اس وقت تک معرضِ وجود میں آ چکا تھا۔" (قصائدِ سودا ص ۱۰۵)

کہا جا چکا ہے کہ یہ غلط ہے کہ قصیدہ ع ہے اشتہار تجھ سے ـــــ الخ محمد شاہ کی مدح میں ہے۔ اس کا ممدوح شاہ عالم ثانی ہے۔ اس نسخہ کا زمانۂ کتابت ۱۱۷۴ھ ہے۔ حافظ محمود خاں شیرانی کا کہنا ہے کہ:

"وزیرالممالک نواب غازی الدین خاں عماد الملک بہ روایت تاریخ مظفری و سیرالمتاخرین وصولی زر کے لیے حسب الحکم احمد شاہ ابدالی ۱۱۷۰ھ میں فرخ آباد پہنچے ہیں۔" (مقالات جلد ۳ ص ۹۸) اور سودا بھی انھیں کے ساتھ دہلی سے نکلے تھے۔ یہ بات خلافِ قیاس ہے کہ چار برس تک سودا نے کوئی قصیدہ نہ کہا ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس مدت کا کہا ہوا کوئی قصیدہ کاتب کو دستیاب ہوا ہو اس لیے یہ دعویٰ کہ اس نسخے میں جو کلام ہے وہ سب سودا کے دہلی چھوڑنے سے پہلے ہی کا ہے صحیح نہیں ہو سکتا۔ باوجود اس کے یہ نسخہ دو اعتبار سے اہم ہے:

۱۔ بہ اعتبارِ زمانہ یہ قدیم ہے اس وقت تک الحاق کے مواقع کم سے کم تھے۔ جو کلام اس نسخے میں ہے وہ بہ گمان غالب الحاق سے خالی ہے۔

۲۔ اگر اس کلام کو جو اس نسخہ میں ہے الگ کر لیا جائے تو سودا کے کلام کا وہ بڑا حصہ غالباً اپنی اصل صورت میں سامنے آجائے گا جو ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰-۶۱ء تک وجود میں آچکا تھا۔ اس میں لفظوں کے تلفظ اور جملوں کی ساخت وہی ہوگی جو دہلی میں رائج تھی۔ بعد کے کلام میں بخوبی ممکن ہے کہ پورب کے علاقوں کی لفظیات اور وہاں کے لب و لہجہ کا اثر بھی سودا کے کلام میں آگیا ہو۔ سودا کی زبانِ بیان اور اندازِ فکر میں ارتقا کو سمجھنے میں یہ کلام معاون ہو سکتا ہے۔

کاتب کو اعتراف ہے کہ وہ "پریشاں خاطر شکستہ روزگار" تھا اور اس نے کتابت کا کام ایسے حال میں کیا ہے کہ "اسبابِ کتابت درست نداشت" اس لیے امکان ہے کہ بعض لفظ چھوٹ گئے ہوں یا لکھنے میں غلطی ہو گئی ہو۔ اس کے باوجود یہ نسخہ اکثر نسخوں کے مقابلے میں زیادہ اہم اور لائق ترجیح ہے۔

نسخہ نمبر ۱۷: آزاد لائبریری (یونیورسٹی کلکشن نمبر ۲/۳۷ پر) ہے۔ محرم ۱۲۲۱ھ میں مکمل ہوا اور بقول مرتب "اس کا کاتب بے انتہا غلط نگار ہے۔ پہلے ہی قصیدے میں تیرہ مصرعے ناموزوں ہو گئے ہیں۔" (قصائدِ سودا ص ۱۰۶) شاید اسی وجہ سے انھوں نے اس سے "صرف سات قصائد کا تقابل" کیا ہے۔ حواشی سے اس نسخے میں ایسے اغلاط کا ثبوت نہیں ملتا جو اس کو نامعتبر قرار دے سکیں۔

نسخہ نمبر ۱۸: بھی آزاد لائبریری میں (سبحان اللہ کلکشن ۸۶ پر) محفوظ ہے۔ اس میں بعض ممدوحین کا نام صحیح لکھا ہے۔ متن میں بھی کوئی شدید اختلاف نہیں معلوم ہوتا۔ یہ نسخہ "ناقص الآخر ہے" شاید اتنی ہی خرابی کی وجہ سے مرتب نے اس نسخہ کو مناسب اہمیت نہیں دی ہے۔ اس میں وہ قصیدے نہیں معلوم ہوتے جن پر الحاقی ہونے کا شبہ ہے۔

نسخہ نمبر ۱۹: مرتب کا بیان ہے کہ:

انڈیا آفس لندن کی ملکیت ہے ــــــ اس کا فوٹو اسٹیٹ ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل صاحب کے پاس ہے....

اس پر کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ چونکہ سودا کی طرف سے یہ تحفہ رچرڈ جانسن کو دیا گیا، اس لیے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۱۹۵ھ سے بیشتر یہ پیشکش عمل میں آئی۔" (قصائدِ سودا، ص ۱۰۹) اس خیال کی کہ یہ نسخہ خود سودا نے پیش کیا تھا بنیاد صرف یہ ہے کہ "ورق ۲ کے الف صفحہ پر حاشیے سے باہر صرف یہ عبارت درج ہے: (MR. RICHARD JOHNSON - THE GIFT OF AUTHOR MIRZA SAUDA)" (ایضاً، ص ۱۰۹) یہ نہیں معلوم کہ یہ الفاظ کس نے کب اور کس بنیاد پر لکھے تھے۔ اس اندراج کی صحیح تردید نسخہ کے ورق ۳ کے درجِ ذیل اندراجوں سے ہوتی ہے:

"دیوان مرزا رفیع سودا گزرانیدہ میر حسین صاحب در بلدۂ لکھنؤ داخلِ کتابخانہ سرکار دشد" اور "دیوانِ سرکار نواب صاحب ممتاز الدولہ مفخر الملک حسام جنگ مسٹر رچارڈ جانسن صاحب بہادر دام اقبالہ" اگرچہ ان عبارتوں کے لکھنے والوں کے نام کا بھی پتا نہیں، یہ اندراج اس وقت کے معلوم ہوتے ہیں جب یہ نسخہ کتابخانۂ جانسن میں داخل ہوا۔ بظاہر کتاب خانہ کے کسی کارپرداز نے یہ اندراج کیے ہوں گے۔ [illegible] یہ صراحت ملتی ہے کہ یہ پیشکش میر حسین صاحب کی طرف سے ہے (سودا کی طرف سے نہیں)۔ یہ نہیں معلوم کہ یہ میر حسین کون تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں کسی انگریزی داں نے جانسن کا نام لکھنے کے علاوہ فارسی کے اندراج کو سمجھے بغیر یہ لکھ دیا کہ یہ سودا کا تحفہ ہے۔ اس اندراج کا ماسکی اعتبار نہیں۔ واضح رہے کہ یہ اندراج خود جانسن کے ہاتھ کا نہیں ہے۔

نسخہ بطورِ خاص جانسن کے لیے نہیں لکھوایا گیا تھا بلکہ میر حسین کے پاس یہ موجود تھا۔ انھوں نے وہی اسے دیا۔ اگر یہ نسخہ اس کے لیے لکھوایا جاتا تو اس قصیدے پر جو جانسن کی مدح میں ہے اس کا نام اہتمام سے لکھا جاتا لیکن بصورتِ موجودہ اس نسخہ میں اس قصیدے پر "کوئی عنوان نہیں ہے۔" (قصائدِ سودا، ص ۱۱۰)

اس نسخے کو غالباً اسی بنا پر کہ یہ سودا کی طرف سے پیش کیا ہوا مانا گیا ہے شیخ چاند سے عتیق احمد صدیقی تک سب محققین نے "معتبر" کہا ہے حالانکہ اس میں ہر قسم کی غلطیاں موجود ہیں۔ ایک صریحی غلطی یہ ہے کہ سودا کے قصیدے "ہے اشتہار تجھ سے" الخ کو اس نسخے میں عالمگیر ثانی سے منسوب کیا ہے (قصائدِ سودا، ص ۱۵، ۲۴۰) ایک دوسرے قصیدے "کہے ہے کاتب دیواں" الخ کو بھی اس نسخے کے کاتب نے عالمگیر ثانی ہی کے نام سے نقل کیا ہے۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ یہ کاتب غیر محتاط ہے۔ اس نے قصیدے کو بغیر سمجھے ہوئے نقل کیا ہے۔ خود مرتب نے مختلف قصیدوں میں بکثرت اختلافوں کی نشاندہی کی ہے اور عموماً ان کو قبول نہیں کیا ہے۔

اب وہ چھ نسخے ہیں جن کو مرتب نے بقولِ خود محض "جزوی طور پر" استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے تعارف میں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ نسخہ الف آصفیہ میں ہے اور ۱۲ محرم ۱۲۱۲ھ کو اس کی کتابت مکمل ہوئی تھی۔ مرتب

کا کہنا ہے اس میں صرف سات قصیدے ہیں۔ اختلافِ متن کی صرف وہ صورت درج کی گئی ہے جو دوسرے نسخوں میں نہیں ہے۔ کتابت کی خامیوں کے باوجود یہ نسخہ قابلِ توجہ ہے۔ نسخہ (ب) ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدر آباد میں ہے۔ ۱۲۱۳ھ میں اس کی کتابت ہوئی تھی۔ مرتب کا کہنا ہے کہ کاتب خاصا غلط نویس ہے۔ بہت سے مصرعے ناموزوں لکھے ہیں نسخہ (ج)، (د) کے بارے میں بالکل کوئی اطلاع نہیں دی گئی ہے بجز اس کے کہ یہ ادارۂ ادبیاتِ اردو میں ہیں۔ نسخہ (ہ) انجمن میں ہے اور ۱۲۶۹ھ میں اس کی کتابت ہوئی تھی۔ اس نسخے میں قصیدوں کے متن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس میں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن پر الحاقی ہونے کا گمان ہے۔ نسخہ (و) آزاد لائبریری (یونیورسٹی کلکشن) کا نسخہ ہے اس میں چھیالیس قصیدے ہیں لیکن مرتب نے اس میں سے صرف اس قصیدے کا مقابلہ کیا ہے جو جانسن کی مدح میں ہے —— (قصائد سودا ص ۱۱۴) باقی قصیدوں کا مقابلہ نہ کرنے کا سبب مرتب کو یقیناً معلوم ہوگا۔

یہ مختصر سا جائزہ اس تعارف اور قصائد کے حواشی کی روشنی میں پیش کیا گیا جو مرتب کے تحریر کردہ ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن نسخوں کو گویا بنیادی اہمیت دی گئی ہے وہ قابلِ اعتماد نہیں تھے اور جن نسخوں سے محض سرسری طور پر استفادہ کیا گیا ہے ان میں بعض ایسے تھے جن کی طرف بہتر انداز سے توجہ کی ضرورت تھی۔ سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ کام کی ابتدا اس مفروضے سے کی گئی ہے کہ قصیدے الحاق سے بالکل پاک ہیں۔ اگر یہ ہے تو پھر مختلف نسخوں کے اختلاف کی نشاندہی کا کام تو وہ شخص بھی کر سکتا ہے جو اردو پڑھ لینے کی اہلیت رکھتا ہے۔

متن کی فراہمی کے بعد اس کی تفہیم و ترتیب کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کے لیے متعلق اور غیر متعلق کتابوں کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ غیر متعلق کتابوں میں بھی کبھی کبھی ایسی باتیں مل جاتی ہیں جو دوسرے مآخذ میں نہیں ملتیں۔ مثال کے طور پر نہال چند لاہوری کے قصۂ گل بکاولی میں اب تک کی معلومات کے مطابق ناسخ کا پہلا شعر ملتا ہے ؎

مسی آلودہ لب پر رنگِ پاں ہے تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے

کہا جا چکا کہ مرتب نے قصائدِ سودا کے بھی محض گنے چنے نسخے دیکھے ہیں اور ان میں سے بھی کسی کو بس دیکھنے کا نام کیا ہے یعنی چھیالیس قصیدوں میں سے صرف ایک دیکھ لیا اور یہ استحقاق حاصل کر لیا کہ اس مخطوطے ہی نہیں اس کتاب خانے کو بھی دیکھنے کا دعویٰ کر سکیں جہاں وہ مخطوطہ محفوظ ہے۔ جب کام کے کرنے کا انداز یہ ہو تو یہ توقع کہ بالواسطہ طور پر متعلق اور غیر متعلق مآخذ کا مطالعہ کرنے کی کوئی کوشش کی گئی ہوگی بالکل فضول ہے۔

"کتابیات" کی ابتدا اس جملے سے ہوتی ہے: "اس مقدمہ کی تیاری میں ان کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔ چونکہ

یہ کتابیات صرف "مقدمہ" سے متعلق ہے، معلوم ہوا کہ قصائد کے متن کی ترتیب و تصحیح کے لیے بجز چند نسخوں کے کسی کتاب سے استفادہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اس سے تدوین کے بارے میں اس غلط تصور کا پتا چلتا ہے کہ یہ کام محض نقل نویس، کلرک، یا کاتب کا ہے۔ اس کے لیے نہ علم کی ضرورت ہے، نہ مطالعہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ متن کے اختلاف ضرور سامنے آجاتے ہیں لیکن متن کا تعین نہیں ہوتا۔ قصائدِ سودا کا معاملہ بھی یہی ہے۔ کتابوں کے بیچ بیچ میں رسالوں اور کتابوں میں شامل مضامین کو بھی کتاب کی حیثیت سے درج کر دیا گیا ہے مثلاً

کتابیات میں نصف سے زائد ایسی کتابوں کے نام ہیں جن کا حوالہ کہیں نہیں ملتا۔ مقدمہ میں ایک جگہ "نکات الشعرا" کا ذکر آیا ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سودا کے بارے میں اس تذکرے میں جو لکھا ہے مرتب نے وہ پڑھ لیا ہے۔ اس میں جملہ یہ ہے۔

"قصیدۂ در ہجو اسپ۔۔۔ تضحیکِ روزگار دور از حد مقدور در اد صنعتہا بکار بردہ۔" (ص ۳۱)

اسی طرح قائم کے تذکرے میں ہے:

"قصیدہ کوہ دو پیکر در زمینۂ بہار و بحرِ بیکراں و تضحیکِ روزگار و غیرہ از تصانیف اوست۔" (ص ۳۵) ان اقتباسوں سے ان قصیدوں کے زمانے کے تعین میں مدد لی جاسکتی ہے لیکن مرتب نے ان کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ قائم کے تذکرے کے بعض اور اندراج بھی جن کا ذکر آگے آئے گا مفیدِ مطلب تھے لیکن ایسی تمام کتابوں کے بارے میں مشکل یہ آپڑی تھی کہ یہ فارسی زبان میں ہیں۔

○

"مقدمہ"، عملِ تدوین کے شعبوں میں سے نہیں ہے لیکن چوں کہ اسی میں مدوّن اپنے طریقۂ عمل، تجربوں اور نتیجوں کا بیان کرتا ہے، اس کی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ضابطے کے مطابق پی ایچ۔ ڈی کے ہر مقالے کے ساتھ اس کا خلاصہ بھی منسلک کیا جاتا ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ یونیورسٹیوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ ممتحنین عدیم الفرصت لوگ ہوتے ہیں اور وہ پورے مقالے کو دیکھنے کی زحمت نہیں اٹھا سکتے۔ مقالے کا خلاصہ ان کی خدمت میں بھیجا جاتا ہے اور ممتحنین کو غالباً صرف اسی کو دیکھ کر فیصلہ دینا ہوتا ہے۔ اصل مقالے میں کیا لکھا ہے شاید اس سے ممتحنین کو بہت زیادہ سروکار نہیں ہوتا ہے۔

مرتب نے اپنے مقالے کے شروع میں "مقدمے" کا خلاصہ "دیباچہ" کے عنوان سے شامل کیا ہے۔ خیال کیا جانا چاہیے کہ ممتحنین نے اسی کو دیکھ کر غالباً مقالے کو منظوری دی ہوگی۔ اس کا جائزہ لینے سے پہلے کتاب کے دوسرے اندراجات

کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ پی ایچ ڈی کے مقالے کے عنوان کو مختصر کرکے کتاب کا نام "قصائدِ سودا" مقرر کیا گیا ہے۔ صفحہ ۲ پر جو اندراج ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اترپردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ معلوم ہوا ہے کہ اس پر "اکادمی" نے انعام بھی دیا تھا۔

کتاب میں کہیں یہ اندراج نہیں ہے کہ یہی وہ کام ہے جس پر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے پی ایچ۔ ڈی کی سند تفویض کی تھی۔ کتاب کے دیباچے میں نگراں یا ممتحنین کا کہیں شکریہ بھی ادا نہیں کیا گیا ہے۔ ممتحنین کی رپورٹ یا ان کا کوئی اقتباس بھی کتاب میں شامل نہیں ہے۔

صفحہ ۳ پر "فہرست" ہے۔ اس میں ص ۳۔ ۵ پر قصائد لکھا ہے جو صفحہ ۱۱۹ سے شروع ہوتے ہیں اور نمبر ۵ پر کتابیات ہے جو صفحہ ۱۱۵ سے صفحہ ۱۱۸ تک ہے۔ ترتیب میں اس اُلٹ پھیر کی وجہ معلوم نہیں۔

صفحہ ۶: "مندرجہ ذیل غیر مطبوعہ قصائد مختلف مخطوطات سے حاصل کرکے یہاں پیش کیے جارہے ہیں۔" یہی فہرست صفحہ ۱۲ پر بھی ہے۔ یہ کل دس قصیدے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے بارے میں الحاقی ہونے کا گمان ہے۔ تین قصیدے ایسے ہیں جو کلیاتِ ممنون میں بھی ہیں۔ مرتب نے اگر مخطوطات کو واقعی دیکھنے کی کوشش کی ہوتی تو یقیناً سودا کے کئی نئے قصیدے اور بھی مل سکتے تھے۔ کئی قصیدے تو مطبوعہ کتابوں میں بھی ایسے مل جاتے ہیں جو اس مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ ان کا ذکر حسب موقع کیا جائے گا۔

ایسا کوئی حوالہ نہیں مل سکا کہ قصائد کی تاریخی ترتیب کا تعین کیا جا سکتا۔" تاریخی ترتیب کا ذکر تو بار بار کیا گیا ہے لیکن کوشش بالکل نہیں کی گئی ہے۔ سب سے آسان اور سامنے کی ایک صورت تو یہی تھی کہ نسخہ نمبر ۱۶ کے قصیدوں کو پہلے جزو کی حیثیت سے لکھ دیا جاتا اور باقی کلام کو دوسرے جز میں الگ کر دیتے۔ اس طرح ۱۱۷۴ھ/۶۱-۱۷۶۰ء سے پہلے تک کے قصیدے الگ ہو جاتے۔ چار قصیدوں کا ذکر قائم کے تذکرے میں موجود ہے۔ وہ یقینی طور پر ۱۱۶۸ھ/۵۵-۱۷۵۴ء سے پہلے کے کہے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اور قصیدوں کے بارے میں بھی ترتیب کے لیے اشارے مل سکتے تھے۔ بے شک یہ کام نقل نویس کا نہیں تھا۔ اس کے لیے مطالعہ اور محنت کی ضرورت تھی۔

"ممدوحین کی تاریخی ترتیب کے مطابق ان (قصائد) کو مرتب کیا گیا ہے۔" یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ بسنت خاں محمد شاہی دور کا امیر تھا۔ اس کی مدح کے قصیدوں کو عالمگیر ثانی کی مدح کے قصیدوں کے بعد جگہ دی گئی ہے۔ قصیدہ نمبر ۲۶ ع ہے اشتہار تجھ سے ــــــ الخ کو محمد شاہ کی مدح میں خیال کرکے عالمگیر ثانی کے قصیدوں سے پہلے لکھا ہے۔ دراصل تاریخی ترتیب کا خیال کرنے سے پہلے ممدوحین کے تعین کی کوشش کی جانی چاہیے تھی۔ یہ کام بھی نہیں کیا گیا ہے۔ بعض بحثیں

جو کتاب میں ملتی ہیں نہایت سرسری اور عموماً بے نتیجہ ہیں۔ قصائد کے زمانے کے تعین کے سلسلے میں یہ جاننا بھی ضروری ہے مدّاح اور ممدوح کے مابین رابطہ کی صورت کب پیدا ہوئی اور رابطہ کی نوعیت کیا تھی۔ کتاب میں اس سلسلے کی کوئی بحث موجود نہیں ہے۔ "داخلی اور خارجی شواہد سے ممدوحین کا تعیّن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔" یہ بھی محض دعویٰ ہے۔ حقیقت سے اسے بھی کچھ تعلق نہیں ہے۔ داخلی اور خارجی شواہد تک پہنچنے کے لیے متعلق عہد اور علاقے کے مفصّل واقعات کا علم ضروری ہے۔ کتابیات میں دہلی اور فرخ آباد وغیرہ کے اس عہد کے واقعات اور اس زمانے کے امراء کے حالات سے متعلق کسی ایک کتاب کا نام بھی شامل نہیں ہے۔

بعض ایسے قصیدوں کے ممدوح کی شخصیت کا بھی تعیّن نہیں کیا گیا ہے جن کے بارے میں بظاہر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ مثال کے طور پر قصیدہ ۲۷ کے ممدوح کا نام اس طرح لکھا ہے:

"قصیدہ در مدح نواب سیف الدولہ احمد علی خاں بہادر پسر صلابت خاں" حاشیہ پر نسخہ ۴ کے حوالے سے "پسر سادات خاں بہادر" اور نسخہ ۱ کے حوالے سے "نواسۂ سادات خاں کلاں" لکھا ہے۔ پھر صفحہ ۷۰۲ پر نسخہ ۴ ہی کے حوالے سے حاشیہ پر ان کو "پسر صلابت خاں بہادر" بتایا ہے۔ حافظ محمود خاں شیرانی نے سیف الدولہ کو "پسر صلابت خاں بخشی احدیاں" بتایا ہے (مقالات ج ۳ ص ۹۸) اور قائم کے تذکرے میں ہے:

"پسر نواب سعادت خاں امیر الامراکہ عہد میرزا احمد کہ عبارت از سیف الدولہ بہادر است مشق سخن بخدمت آں سید جلیل (میر شمس الدین فقیر) می نمود" (مخزن نکات ص ۳۳)

قائم کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ سیف الدولہ احمد شاہ بادشاہ کے امرا میں سے تھے۔ شاعر تھے اور شمس الدین فقیر سے اصلاح لیتے تھے۔ سوداؔ ان کی خدمت میں احمد شاہ کے آخر زمانے میں پہنچے ہوں گے چنانچہ ان کا قصیدہ "رزمیۂ بہار" اسی زمانے کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیف الدولہ کے اخلاف نے لکھنؤ میں آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے دو صاحبزادے یعنی امیر علی خاں امیرؔ و شوقؔ اور مرزا مظفر علی خاں بریاںؔ مشہور تذکرہ نویس سعادت خاں ناصر کے شاگرد تھے (خوش معرکہ ج ۱ ص ۲۲۲، ۷۸) سیف الدولہ کے بارے میں مزید تفصیلات اس کے قصیدوں کے سلسلے میں بیان ہوں گی۔ "اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ ائمۂ اطہار کی شان میں جو قصیدے ہیں ان میں سے بیشتر سوداؔ کے ابتدائی مشقی دور میں لکھے گئے ہیں۔"

صفحہ ۷ "ممنون کے کلیات میں تین قصائد ہیں جن میں بہت سے اشعار سوداؔ کے غیر مطبوعہ قصائد سے ماخوذ ہیں" ان شعروں کے خالق ممنون نہیں تھے، سوداؔ ہی تھے، اس بات کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہے۔ کلیاتِ سوداؔ

کہ ان بعض نسخوں کی بنیاد پر جو مرتب کے سامنے تھے فیصلہ کرنا درست نہیں کیوں کہ ان میں سے کئی الحاقی کلام سے خالی نہیں ہیں۔

"دو قصائد ۱۲۰۲ھ کے ایک مخطوطے میں درج ہیں اور یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اس وقت تک ممنون ایسے قصائد کہہ سکے ہوں"۔ یہ بحث آچکی ہے کہ اس نسخہ کا سال کتابت ۱۲۰۲ھ کے بجائے ۱۲۴۲ھ ماننا زیادہ قرینِ صحت ہے اور اس زمانے میں ممنون قصیدے کہہ سکتے تھے۔

مختلف کتب خانوں کی سیر و سیاحت کے بعد مرتب نے جتنے مخطوطات دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے، اس سے زیادہ تعداد میں مخطوطے اس زمانے میں صرف علی گڑھ کے کتب خانوں میں موجود تھے۔ تعجب اس پر ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور نے جو اس زمانے میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری بھی تھے، نگراں اور ممتحن دونوں حیثیتوں میں یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ انجمن کے کتب خانے میں محفوظ تمام نسخے بھی قصائدِ سودا کی اس تدوین کے سلسلے میں نہیں دیکھے گئے۔

"جس نے مروجہ مرثیہ گوئی پر بے دے کر کے مرثیہ کو ادبی شان کی راہ پر ڈالا (وہی) نے زبانِ اردو کو پاک صاف کرنے میں اولیت کا شرف حاصل کیا۔۔۔ معاصرین و متقدمین کے کلام پر تنقید کر کے آئندہ کے لیے راہ ہموار کی وہ سودا ہیں۔"

اپنے عہد کی مرثیہ گوئی پر سودا نے بے دے کہاں کی ہے اور اس سے معاصر مرثیہ گو کس حد تک متاثر ہوئی تھی؟ یہ تفصیلات نہیں بتائی گئیں۔ مقدمے میں جا بجا طرح طرح کے دعوے کیے گئے ہیں اور ان کے لیے سند پیش نہیں کی گئی۔۔۔ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے اغلاط اور متروکاتِ زبان کی مثالیں سودا کے مرثیوں سے دی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جاننا چاہیے کہ جب زمانۂ سابق کے شعرا کا یہ احتیاط ہوں بلکہ یہ حال تھا جب تا تمہ ہر لڑکے از ہزار وانہ کے اذ لب بار و پر لکھا گیا تو اس زمانے کے مرثیہ گو بھی بہت سی افراط و تفریط کو کام فرماتے تھے جیسا کہ شیہ مشہورہ مرزا کا یہ مصرع سودا ۔۔۔

لے سبیل تا بدشنہ و برچھی سے تا خنجر

اس مصرعے سے مثال دو امروں کی حاصل ہوتی ہے ۔۔۔ (نورالمخیص، معلا ص ۹) اصلاحِ زبان سے متعلق جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ بھی بے حقیقت ہے۔ شاہ حاتم اپنے دیوان زادہ کے دیباچے میں اصلاحِ زبان سے متعلق اپنے خیالات قلم بند کر چکے تھے۔ سودا ان کے شاگرد تھے لیکن شاہ حاتم کے بیان کردہ اصولوں پر پوری طرح عمل نہیں کر سکے۔ ان کے قصائد میں بھی زبان کے ہر قسم کے سقم موجود ہیں۔ زبان کو پاک و صاف کرنے میں، اولیت کا شرف تو انھیں بالکل حاصل نہیں ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں انھیں خصوصیت بھی نہیں ہے۔

معاصرین و متقدمین کے کلام پر گردیزی، میر، قائم، میر حسن اور مصحفی وغیرہم کی بعض تنقیدیں ان کے تذکروں میں محفوظ ہیں اور ان تنقیدوں نے واقعی آئندہ کے لیے راہ ہموار کی ہے۔ مرتب کے علم میں اگر سودا کی کچھ تنقیدیں ہیں، اور وہ دوسروں کے مقابلے میں

زیادہ وقیع ہیں تو ان کی تفصیلات کا بیان ہونا چاہیے تھا تاکہ ان کی کمیت اور کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا۔ بصورتِ موجودہ یہ تمام دعوے بے بنیاد اور بے اصل ہونے کے علاوہ موضوع سے غیر متعلق بھی ہیں۔

"صرف دوسروں کی ہجو کہہ کر ہی نہیں بلکہ اپنی ہجو سن کر بھی خوش ہونے والے سودا تھے۔" یہ کس طرح معلوم ہوا کہ سودا اپنی ہجو سن کر خوش ہوتے تھے؟ یہ خلافِ فطرت بات ہے، اس لیے ثبوت بہت ضروری تھا۔ واقعات اس حق میں ہیں کہ سودا اپنی مرضی کے خلاف معمولی بات بھی برداشت نہیں کرتے تھے (رہا قہرِ درویش برجانِ درویش کی صورت ہو تو اور بات تھی) میر ضاحک نے ایک شعر کہہ دیا تھا، اس کے جواب میں سودا نے ترجیع بند، مثنوی اور ایک قصیدہ، ہجویہ تین چیزیں لکھ ڈالیں۔ (خوش معرکہ ج ۱ ص ۶ تا ۸)

"کلیاتِ سودا کے نسخۂ مصطفائی سے لے کر انتخابِ سودا (رشید حسن خاں) تک کلامِ سودا کے بہت سے نسخے طبع ہوئے لیکن ان میں سودا کے تمام تر قصائد جمع نہیں ہو سکے۔"

تمام تر میں "تر" کا استعمال غیر ضروری ہے۔ مقدمہ میں کئی مقاموں پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ سودا کا کلیات پہلی بار فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں مرتب ہوا تھا۔۴۔ اپریل ۱۸۰۲ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین جلدوں میں طباعت کی غرض سے پریس بھیجا گیا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ چھپ نہیں سکا۔ (جائزہ ج ۱ ص ۵۲۷) نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں بھی سودا کے تمام قصیدے شامل ہو گئے تھے یا نہیں؟ اس کے حجم سے سودا کے کلام کی ضخامت اور مقدار کا صرف قیاس کیا جا سکتا ہے۔

نسخۂ مصطفائی سے مرتب کی مراد ایک ایسے نسخے سے ہے جس کا انھوں نے صرف ذکر پڑھا ہے (قصائد سودا ص ۷۹) وہ نسخہ پہلی بار ۱۸۵۶ء میں چھپا تھا۔ اس کو بھی کلامِ سودا کا پہلا مطبوعہ نسخہ سمجھنا صحیح نہیں۔ کلامِ سودا کا پہلا انتخاب ۱۸۱۰ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی طرف سے شائع ہوا تھا جسے کاظم علی خاں اور محمد اسلام نے ترتیب دیا تھا۔ یہی انتخاب دوسری بار ہوگلی کے مطبع اخوان الصفا نے ۱۸۴۷ء میں چھاپا تھا۔ شیخ چاند کی اطلاع کے مطابق ۱۸۵۲ء میں منشی کریم الدین نے بھی ایک انتخاب چھاپا تھا۔ (جائزہ ج ۱ ص ۵۳۷ تا ۵۴۰)

کسی نسخے کا دستیاب نہ ہونا بہت افسوس ناک نہیں ہے لیکن ڈاکٹریٹ کی سند کے امیدوار کا اپنے موضوع سے متعلق مطبوعہ چیزوں سے بھی ناواقف رہ جانا عبرتناک ہے۔

صفحہ ۱۲ "مطبوعہ قصائد کی تصحیح کے لیے اٹھارہ مخطوطات کو کلی طور پر اور چار مخطوطات کو جزوی طور پر استعمال کیا گیا ہے۔" یہ بیان بھی شبہ سے بالاتر نہیں ہے۔ اس سے متعلق بحث کی جا چکی ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ جن نسخوں سے کلی طور پر استفادہ کیا گیا ہے ان کی تعداد دس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس اقتباس میں بات صرف مطبوعہ قصائد کی کہی گئی ہے —

غیر مطبوعہ قصیدوں کے بارے میں کیا عمل رہا ہے، اس کا مذکور نہیں ہے۔ موضوع سے متعلق کوئی مآخذ ہو خواہ وہ مطبوعہ ہو یا غیر مطبوعہ، اسے جزوی طور پر استعمال کرنے کیلیے کوئی جواز نہیں ہے۔ اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کو کام سے دلچسپی نہیں ہے۔

"اشعار کی تعداد کو بھی کبھی کبھی قصیدے کی تعریف میں شامل کیا گیا ہے لیکن اس میں اتنا اختلاف ہے کہ کوئی متعین بات کہنا مشکل ہے۔" "کبھی کبھی" سے کیا مراد ہے؟ وضاحت ضروری ہے، مرتب نے "کبھی کبھی" کی قسم کے لفظوں کا استعمال بہت کیا ہے۔ اختلاف خواہ کتنا ہی ہو، یہ یقینی ہے کہ قصیدہ صرف پانچ یا سات شعر کا نہیں ہو سکتا لیکن مرتب نے صرف پانچ شعر کے مجموعے کو بھی قصیدہ مانا ہے (قصائدِ سودا ص ۹۷م) شاید اسی لیے اس نے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ قصیدے کے لیے کم سے کم کتنے شعر ضروری ہیں۔

"ہیئت میں مطلع، ردیف و قافیہ کی پابندی کا التزام برابر رکھا گیا ہے۔" التزام کے ساتھ "برابر" کہنا غیر ضروری ہے۔ قصائد سودا کے مقدمہ میں غیر ضروری لفظوں کا استعمال بہت ہوا ہے۔ فارسی اور اردو کی تمام اصنافِ شعر میں اوّل روز سے قافیہ کی پابندی کی گئی ہے۔ اردو میں کسی دور میں بھی (بجز آزاد نظموں کے) غیر مقفیٰ شعر کہنے کا چلن نہیں رہا ہے۔ اکثر شاعروں نے مطلع اور ردیف کا بھی اہتمام کیا ہے لیکن مرتب جو بات کہنا چاہتا ہے وہ ان لفظوں میں ادا نہیں ہو سکی ہے۔ کہنا یہ تھا کہ قصیدے میں غزل کی طرح مطلع، ردیف اور قافیہ کا التزام کیا گیا ہے۔ اس میں ردیف کے التزام کی بات غلط ہے۔ خود سودا نے بھی اپنے قصیدوں میں ردیف کا التزام نہیں کیا ہے۔

"سودا نے اکثر قصائد غیر مردّف لکھے ہیں۔"

صفحہ ۱۳ مرتب نے قصیدے کے بارے میں جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اسکے مطابق درج ذیل نظموں کو بھی قصیدہ کہا جانا چاہیے:

۱۔ سہرے اور تہنیت نامے ——— مرتب نے تہنیتِ عید کو قصائدِ سودا میں شامل کیا ہے۔ ۲۔ غزلیں جن میں محبوب کی مدح اور رقیب روسیاہ وغیرہ کی مذمت کی گئی ہے۔ ۳۔ طنزیہ اور ظریفانہ نظمیں جو غزل کی ہیئت میں ہیں اور ان میں کسی کی مذمت کی گئی ہے۔

دراصل مرتب سے بنیادی غلطی یہ ہوئی ہے کہ اس نے اجزائے ترکیبی کو ہیئت میں شامل نہیں کیا ہے۔

"ان قطعات میں شامل کرنے کے مقابلے میں قصائد میں شامل کرنے کے حق میں ان کا موضوع اور ان کی ہیئت مؤید ہے.... ان کو یہاں قصائد میں شامل کرلینا انسب معلوم ہوا۔"

قصیدے کی تشبیب میں تین، گریز میں ایک، مدح میں چار اور خاتمہ اور دعا میں ایک ایک شعر ہو تو بھی دس شعروں سے کم سے قصیدہ تشکیل نہیں پاتا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قصیدہ وہ نظم ہے جو عموماً غزل کی ہیئت میں ہوتی ہے۔

جس میں کم سے کم ایک درجن شعر ہوں اور جس کے پانچ اجزاے ترکیبی (خطابیہ کی صورت میں تین) ہوں۔ اگر یہ سب شرطیں پوری نہ ہوں تو وہ نظم قصیدہ نہیں ہوگی۔ اس طرح قصائدِ سودا میں قطعوں کا شامل کیا جانا اصولاً غیر صحیح ہے۔

اس مقام پر یہ بات مکرر کہی جاتی ہے کہ مرتب نے سودا کے قصیدوں کی جستجو میں ضروری حد تک کوشش نہیں کی مطبوعہ کلیاتِ سودا میں فاخر مکین سے متعلق ایک طویل قطعہ ہے جس کے چار شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

ہے اور زیر فلک ذاتِ میرزا فاخر	سلامت ان کو رکھے حق سدا برُوے زمیں
سو کب انھوں کو ہے اصلاح کا کسو کو دماغ	قبول کب کرے ان کی متانتِ رنگیں سے
کہا بعد تامل کہ دوں جواب تجھے	جو میری بات کا اے یار تجھ کو ہووے یقیں
جو چاہے یہ کہ کہے ہند کا زباں داں شعر	تو بہتر اس کے لیے ریختہ کا ہے آئیں

یہ قطعہ غزل کی ہیئت میں ہے، اس کے باوجود اسے قصائدِ سودا میں شامل نہیں کیا گیا[1]۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مرتب نے جس قطعہ کو چاہا ہے لے لیا ہے اور جسے چاہا ہے چھوڑ دیا ہے۔ کوئی اصول پیشِ نظر نہیں رہا ہے۔

صفحہ ۱۴: "سودا اچھے خاصے دنیادار آدمی تھے .... وہ ایک سہارے کو چھوڑ کر دوسرا سہارا اختیار کرتے تھے۔ اس انتخاب میں ان کی عملی فراست ہمیشہ ان کی رہنمائی کرتی رہی۔"

مرتب نے اس قسم کی باتیں محض اپنے قیاس سے کہی ہیں۔ واقعات ان کے مؤید نہیں ہیں۔ کسی معاصر نے ایسا نہیں کہا ہے۔ قائم کا بیان ہے کہ "سودا .. بہ رفاقت وزیر الممالک نواب غازی الدین خاں بہادر در بلدۂ فرخ آباد رسیدند۔ خاں (مہربان خاں رند) موصوف از نواب وزیر درخواستہ مرزاے موصوف بہ رفاقتِ خود گرفت۔"——
(مخزنِ نکات ص ۵۵) لکھنؤ جانے کی بابت مردان علی خاں مبتلا نے لکھا ہے:

---

[1] کتب خانۂ خدا بخش پٹنہ میں راقم کو مطبع نولکشور کانپور میں ۱۸۷۳ء کا چھپا ہوا کلیاتِ سودا کا نسخہ دیکھنے کو ملا۔ اس کے دیوانِ پنجم میں جو قطعات درج ہیں ان میں سے کچھ "قصائدِ سودا" کے زیرِ نظر مجموعے میں شامل ہیں لیکن ذیل کے قطعے باوجودیکہ وہ غزل کی ہیئت میں ہیں اس مجموعے کے زینت نہیں بن سکے۔ وجہ مرتب کے علم میں ہوگی۔ ۱۔ قطعہ تاریخ ہجو شیخ صنعت اللہ کتخدا شدہ بود۔ ۸ شعر ۲۔ قطعہ بطریق طنز شاعری لعنتہ ۱۴ شعر ۳۔ قطعہ کہ در سوال بادشاہ و جواب درویش گوشہ نشین بے پروا کہ ترک دنیا کردہ بود ۲۹ شعر ۴۔ قطعہ در بیان بہرہ ۱۰ شعر ۵۔ قطعہ مبارکباد فتح تعریف نواب شجاع الدولہ بہادر ۱۵ شعر ۶۔ قطعہ مبارکباد عید در مدح نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ بہادر ۸ شعر ۷۔ قطعہ مبارکباد تولد شدنِ پسرِ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر ۱۳ شعر ۸۔ مبارکباد در مدح نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ ۱۵ شعر ۹۔ قطعہ مبارکباد کدخدائی مہربان خاں ۱۲ شعر ۱۰۔ قطعہ بطور پند ۱۱ شعر۔

"چندے در فرخ آباد نزد نواب احمد خاں گزرانید و بعد وفاتِ او بہ لکھنؤ آمد" (گلشن سخن ص ۱۴۰) لکھنو میں شجاع الدولہ کے مرنے کے بعد آصف الدولہ کے متوسل ہوئے بظاہر اس میں سودا کی مجبوری کو تو دخل تھا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ انھوں نے احمد خاں کو چھوڑ کر یا شجاع الدولہ کو چھوڑ کر آصف الدولہ کو اپنا مربی بنا لیا ہو۔ مختلف امرا سے وابستہ ہونے کی بنیاد پر سودا کو دنیا دار بتانا اور ایک سہارے کو چھوڑ کر دوسرا سہارا اختیار کرنے کا الزام لگانا مناسب نہیں۔

"ان کے ممدوحین کی جتنی بڑی تعداد ہے اتنی کسی بھی اردو شاعر کے ممدوحین کی نہیں۔" یہ دعویٰ کرنے والے نے نہ تو سودا کے ممدوحین کی فہرست تیار کی اور نہ اس نے یہی بتایا کہ کتنے قصیدہ گویوں کے ممدوحین کی فہرستیں اس کے پیش نظر تھیں۔ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ رنگین اور منیر وغیرہ کے ممدوحین کی تعداد بھی کچھ کم نہ ہوگی۔

"ایسے قصائد کی بھی خاصی تعداد ہے جن کو ایک سے زیادہ ممدوحین سے منسوب کیے جانے کی نشاندہی ہوتی ہے [illegible] بعض قصائد سے واضح طور پر مترشح ہوتا ہے کہ سودا نے خود ہی انھیں مختلف اشخاص کی نذر کیا ہے۔"

نشاندہی ہوتی ہے، کی جاتی ہے۔ مترشح ہونے اور واقعی ہونے میں بڑا فرق ہے۔ راقم نے [illegible] سے مطالعہ کیا۔ اسے قصائد سودا میں ایک قصیدہ بھی ایسا نہیں مل سکا جس کے بارے میں یہ بات ثابت [illegible] جا سکتی ہو کہ سودا نے اسے ایک سے زائد شخصوں کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ سعادت خاں ناصر نے سودا کی ایک اہم [illegible] بارے میں اطلاع دی ہے کہ اصلاً وہ میر ضاحک کی مذمت میں تھی۔ پھر "بعد خرابی بصرہ" سودا اسے مولوی ساجد کے نام کرنے پر رضامند ہو سکے (خوش معرکہ ج ۱ ص ۷) یہ واقعہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ یہ بات سودا کی عادت میں داخل نہیں تھی کہ وہ ایک ہجو یا قصیدہ کو ایک ممدوح کے اور دوسرے سے منسوب کر دیتے۔

صفحہ ۱۰۱ "جب متن قصیدہ میں ممدوح کا نام بھی مذکور نہ ہو تو اس تعین میں اور بھی زیادہ دشواری ہوتی ہے۔ صرف عنوان قصیدہ میں تبدیلی ایک کے بجائے دوسرے نام سے نسبت کا سبب بن سکتی ہے۔"

یہ خیال بہت صحیح نہیں کہ قصیدے کے ممدوح کا پتا صرف عنوان سے چلتا ہے۔ یہ بات صرف وہ کہہ سکتا ہے جس نے قصیدوں کے متن کو کبھی بغور پڑھا نہ ہو۔ عام طور سے قصیدے کے شعروں میں ایسے اشارے موجود ہوتے ہیں جو ممدوح کے تعین میں معاون ہوتے ہیں چنانچہ اس کی مثالیں آگے آتی ہیں۔ "قصیدہ ۱۲ بے اشتہار تجھ سے [illegible] نسخہ [illegible] (عہ ۱۹) ... میں یہ قصیدہ عالمگیر ثانی کے نام سے منسوب ہے ... نسخہ [illegible] آصف الدولہ بہادر۔ نسخہ آسی میں اسے "در ثنائے ... عالی گوہر محمد شاہ عالم بہادر" لکھا گیا ہے۔ خود قصیدے میں کوئی نام مذکور نہیں ... نسخہ [illegible] میں "در مدح شاہ عالم بادشاہ غازی" ... [illegible]

"درمدح محمد شاہ عالم بہادر متخلص بہ آفتاب... یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ قصیدہ شاہ عالم کی مدح میں لکھا گیا۔"
قصیدے میں سلطنت اور تخت وغیرہ کا صریحاً مذکور ہے۔ یہ آصف الدولہ کی مدح میں نہیں ہو سکتا۔
نسخہ ۱۳ کے بارے میں کہا جا چکا ہے کہ وہ کئی اعتبار سے نامعتبر ہے۔ ایک شعر میں ممدوح کی جوانی کا مذکور ہے۔ وہ عالمگیر ثانی نہیں ہو سکتا۔ نسخہ ۱۹ کے متعلق بھی یہ بحث آ چکی ہے کہ اس کے تمام مندرجات قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ سودا کو محمد شاہ اور احمد شاہ کے دربار میں رسائی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ یہ قصیدہ ان دونوں کی مدح میں بھی نہیں ہو سکتا۔ ممدوح یقینی طور پر شاہ عالم ثانی ہے۔

صفحہ ۱۸ "ع کہے ہے کاتب دوراں سے منشی تقدیر، نسخہ ۱۹ میں اسے درمدح عالمگیر ثانی .... اور یہ اس نسخہ کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔ دیگر تمام نسخوں میں اسے عماد الملک سے ہی منسوب کیا گیا ہے۔"

نسخہ ۱۹ کا کاتب غیر محتاط اور ناسمجھ ہے۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے ممدوح کا نام لکھ دیا ہے۔ اس قصیدے میں عالمگیر کا نام صرف ایک جگہ آیا ہے، اس طرح ع کیا ہے زندہ سر نو سے جن نے عالمگیر۔

یہ مصرع خود بتا رہا ہے کہ یہ عالمگیر کی مدح میں نہیں ہے۔ جس نے عالمگیر کو دوبارہ زندہ کر دیا تھا وہ عماد الملک کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔" قصیدہ ع میں گو ہر سخن کو دیا سنگ، رنگ ڈھنگ
میں موجود ایک شعر سے اس کا درمدحِ شجاع الدولہ ہونا معلوم ہوتا ہے ؎

یعنی شجاع الدولہ بہادر کے فیض کا پہنچا ہے جس کے لاکھوں ہی فرسنگ رنگ ڈھنگ

لیکن نسخہ ۸، ۱۵، ۱۸ میں یہ شعر موجود نہیں .... نسخہ ۸ اور ۱۵ سے بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ اس قصیدے کا ممدوح کون ہے۔ نسخہ ۱۸ میں اس کے برخلاف شہادت ملتی ہے۔ .. اس میں مندرجہ ذیل شعر ہے ؎

یعنی عماد ملک بہادر کے فیض سے پہنچا ہے جس کے لاکھوں ہی فرسنگ رنگ ڈھنگ

نسخہ ۸ اور ۱۵ میں یہ شعر بھی نہیں ہے .... یہ بات بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ سودا نے اپنے قیام دہلی کے وقت یہ قصیدہ عماد الملک کی مدح میں لکھا ہو اور پھر شجاع الدولہ کے دربار سے وابستگی کے بعد اس میں ترمیم کر کے ..... "شجاع الدولہ کا نام شامل کر دیا۔"

اقتباسِ بالا میں دوسری بار جو ۱۸، ۱۵ لکھا ہے وہاں ۱۸ کی جگہ ۸ چاہیے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ پہلے شعر میں "شجاع الدولہ بہادر" موزوں نہیں ہے "شجاع دولہ" موزوں ہو گا۔ کاتب نہ صرف غلط نویس ہے بلکہ غیر موزوں طبع بھی ہے۔ اس کی تحریر لائق اعتنا نہیں۔ قصیدے میں بہت اختصار کے ساتھ ممدوح کے ہاتھی گھوڑے اور کمان کی ستائش

ہے لیکن اس کے لشکر، دربار یا دولت و امارت کی مدح نہیں کی ہے۔ شجاع الدولہ آخر تک با اقتدار اور صاحبِ افواج رہے۔ ان کی مدح میں ان چیزوں کا بیان غالباً ضروری تھا۔ یہ قصیدہ عماد الملک کی مدح میں ہے اور اس زمانے کا ہے جب وہ کالپی میں زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ اس زمانے میں وہ با اختیار نہیں تھے۔ اس وقت ان کے ساتھ صرف ان کے ذاتی کمالات تھے جن کا ذکر قاسم نے اس طرح کیا ہے :

"امیرے بود صاحب شمشیر.... از سوادِ حضرت دہلی بآئینے رجم شیاطین نمود کہ ہرگز متصور و مطلقاً متوقع نبود۔ در آخر ہا بہ ثمرۂ نمک حرامی کہ با ولی نعمتِ قدیمی از وے بظہور رسید.... در بلدۂ کالپی جان بجاں بخش سپرد.... قطع نظر از صنائع سپاہ گری و.... صفت زبانی و صفت قلمی.... و انشا پردازی.... و سخن طرازی.... بالسویہ متفرد بکمالِ فصاحت یگفت" (مجموعۂ نغز ج ا ص ۲۷۷) ان کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ شاعر ان سے داد کے متمنی رہتے تھے۔ انشا کے حال میں مرزا علی لطف نے لکھا ہے : "سال گذشتہ انھوں نے (انشا) نے ایک قصیدہ زبان ریختہ میں غیر منقوطہ یعنی جس کے اشعار میں کوئی حرف صاحبِ نقطہ نہیں ہے، نواب عماد الملک کی مدح میں لکھ کر کالپی بھجوایا اور صلے میں اس کے انعام تحسین و آفریں کا بہت سا پایا۔" (گلشنِ ہند ص ۴۱)

عماد الملک سودا کے قدیمی ولی نعمت تھے اور "(سودا) از چند سال بہ سببِ اختلاط عالی جاہ غازی الدین خاں عماد الملک بہادر بگفتنِ اشعار فارسی پرداختہ" (معاصر حصہ ۲ ص ۱۱۰)

جب غازی الدین خاں عماد الملک کالپی پہنچے اور سودا کو اطلاع ملی تو انھوں نے حاضر ہو کر ان کی خدمت میں یہ قصیدہ پیش کیا ہوگا۔ اس میں انھوں نے فارسی کی تراکیب کا بہ کثرت استعمال کیا ہے اور مقامی لفظوں کو ان ترکیبوں سے بڑے سلیقے کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ قصیدہ کی تقریب کچھ نہیں ہے، بجز اس کے کہ شاعر اپنی مشاقی اور کہنہ مشقی کی داد چاہتا ہے۔ مرتب نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ :

"خدا بخش لائبریری کے نسخہ نمبر ۱۱۴ میں اس قصیدے پر ۱۱۸۸ھ درج ہے۔ یہ شاید اس قصیدہ کا سنِ تصنیف ہے۔ یہی سال شجاع الدولہ کی وفات کا بھی ہے۔" (قصائدِ سودا ص ۲۰۹)

شجاع الدولہ سے اس قصیدے کو کوئی تعلق نہیں۔ عماد الملک کے کالپی پہنچنے کا زمانہ ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء کے قریب کا ہوگا۔ اسی وقت یہ قصیدہ لکھا گیا ہے۔ قصیدے میں ممدوح اور مقام مدح کو متعین کرنے والے کئی اشارے موجود ہیں۔ ان کی کیفیت اس قصیدے کے سلسلے میں مذکور ہوگی۔

صفحہ ۱۹ "قصیدہ نگار شعرا کی روایت میں یہ بات معیوب نہیں رہی ہے کہ ایک قصیدہ کسی ممدوح کے لیے لکھا

اور کسی وقت ... دوسرے ممدوح کی نذر کر دیا۔ سودا کے یہاں بھی اس کی مثالیں ہیں۔... کلام سودا کے مخطوطات اس کی شہادت پیش کرتے ہیں۔" قصیدہ نگار شعرا کی روایت سے بحث یہاں غیر ضروری ہے۔ سودا کے حالات میں یہ بات کہیں مذکور نہیں ہے کہ وہ ایک ہی قصیدہ کو کبھی ایک ممدوح کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور کبھی دوسرے ممدوح کے سامنے پڑھ دیتے تھے۔ کلامِ سودا کے مخطوطات میں ممدوحین کے ناموں کے اندراج میں جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کی کئی مثالیں گذشتہ اوراق میں آ چکی ہیں۔ محض ان کی بنیاد پر سودا کو الزام دینا سرتاسر ظلم ہے۔

"قصیدہ ؏ اشعار کا بستانِ جہاں کے ہے عجب ڈھنگ" شجاع الدولہ سے منسوب ہے۔ اس میں چوالیس اشعار ہیں۔ ۱۳ سے ۱۷ تک اشعار صنعت توشیح میں لکھے گئے ہیں۔ ان سے شجاع الدولہ کا نام برآمد ہوتا ہے۔... نسخہ ۸ میں چوالیس کے بجائے صرف ابتدائی اکیس اشعار پر قصیدہ ختم ہو گیا ہے لیکن اسی نسخہ میں ایک اور قصیدہ ... در مدح نواب معتمد الدولہ ظفر جنگ یعقوب علی خاں اور ہے۔... اوّل الذکر قصیدے میں جو صنعت توشیح میں ہیں وہ اور چند دیگر اشعار حذف ہو گئے ہیں۔... یہ نسخہ ۱۲۱۴ فصلی (مطابق ۱۲۲۳ھ) میں جونپور میں لکھا گیا۔ قصیدے کے اس متن کی تائید ۱۲۶۸ھ کے ایک نسخہ سے ہوتی ہے جو حیدرآباد میں لکھا گیا۔ اس میں ... متن اور ترتیب اشعار نسخہ ۸ کے مطابق ہے۔ شجاع الدولہ کی مدح میں قصیدہ ؏ اشجار کا بستانِ جہاں کے ہے عجب ڈھنگ۔ اس میں موجود نہیں ہے۔"

نواب یعقوب علی خاں ظفر جنگ کے حالات فی الوقت معلوم نہیں ہو سکے البتہ قاسم کے تذکرے میں ملا محمد حسن موزوں کے حال میں ان کا نام آیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاید دہلی کے امرا میں تھے اور ۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ (مجموعہ نغز ج ۲ ص ۲۲۷) سودا کے ممدوحین میں کسی جگہ ان کا نام دیکھنے میں نہیں آیا ہے۔ تاوقتیکہ کسی اور ذریعے سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے یہ بات قابلِ یقین نہیں کہ سودا نے ان کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا۔ قصیدے میں ممدوح کی شجاعت اور قوت کا بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے ؎

آہن کا کہیں گڑھ ہو تو دروازوں پہ اس کے قالب تہی سنتے ہی کریں جتنے ہوں سرہنگ

شاعر کا دعویٰ ہے کہ اس نے اس قصیدے میں "سخنِ واقعی" نظم کیے ہیں ؎

کتنے سخنِ واقعی میں عرض کیے ہیں خواہ ان کو گہر سمجھے تو اب خواہ انھیں سنگ

یہ قصیدہ غالباً ایسے موقع پر پیش کیا گیا ہے جب شجاع الدولہ کو کوئی جنگی معرکہ درپیش تھا۔

صفحہ ۲۰ "ایک تہنیتی اور مدحیہ قصیدہ ؏ نوید زیرِ فلک یوں ہوئی ہے شہرۂ عام

نسخہ ۱۸ میں اس کا عنوان ہے: "قطعہ مبارکبادِ عید در مدح بادشاہ عالمگیر خلد اللہ ملکہٗ۔" اسی سے غالباً نسخہ ۱ میں اخذ کیا

گیا ہے اور یہی عنوان دیا گیا ہے ...۔ نسخۂ ۵ میں یہ اشعار درج ذیل صورت میں ہیں ؎

عمادِ دولت ودیں آصف سلیماں جاہ ضعیف کفر سدا جس سے اور قوی اسلام

وغیرہ نسخۂ ۵ میں بھی یہی قرات ملتی ہے۔ باقی نسخوں میں عماد دولت ودیں' کے بجائے 'شجاعِ دولت ودیں' کر دیا گیا ہے۔ باقی متن ۵ کے مطابق ہے۔ اپنی منصبی حیثیت میں عماد الملک اور شجاع الدولہ دونوں ہمسر ہیں، اس لیے کسی تبدیلی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔" اوّل تو یہ قصیدہ نہیں ہے۔ صرف نو شعروں پر مشتمل ایک قطعہ ہے۔ اس کا شعر ۵ اس طرح ہے ؎

یہ بارگاہ ہے ایسے جناب کی جس کا گنے ہے آپ کو نہ پشت سے سپہر غلام

"بارگاہ" محل شاہی، بادشاہی خیمہ کو کہتے ہیں لیکن اس کا اطلاق بزرگوں کے مکان پر بھی ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں بات واضح ہو گئی ہے۔ آسمان نو پشت سے نہ عماد الملک کا غلام خود کو گنتا رہا ہے اور نہ شجاع الدولہ کا۔ اس کا تعلق صرف عالم گیر ثانی سے ہے جس کے گھرانے میں نو پشت سے سلطنت چلی آتی تھی، اس طرح:

عالمگیر ثانی، ابن معز الدین جہاں دار شاہ، ابن شاہ عالم بہادر شاہ۔ ابن عالمگیر اورنگ زیب، ابن شاہجہان، ابن جہانگیر۔ ابن اکبر، ابن ہمایوں، ابن بابر۔

اس شعر کے متن میں کسی بھی نسخے میں اختلاف نہیں ہے اس لیے یہ قطعہ یقینی طور پر عالمگیر ثانی کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس پس منظر میں اس کے دوسرے شعروں کا متن درست کر لیا جانا چاہیے۔

صفحہ ۲۱ "ایک اور قصیدہ ع صباحِ عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں بہادر کی مدح میں ہے ...۔ نسخۂ ۱۸ میں اس قصیدے کے سر عنوان 'در مدحِ نواب شجاع الدولہ بہادر رستم جنگ' درج ہے اور ان دو اشعار کا متن بھی بدلا ہوا ہے (جن میں سرفراز الدولہ کا نام تھا)... پہلے یہ قصیدہ شجاع الدولہ کے لیے ہی کہا گیا ہو اور پھر ... سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کی خدمت میں پیش کر دیا گیا ہو۔"

اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ امر یہ ہے کہ بہو بیگم صاحبہ زوجۂ شجاع الدولہ سنی تھیں۔ ان کے زمانے میں علی الاعلان کوئی ایسی بات غالباً نہیں کہی جاتی تھی جس سے سنی شیعہ کا اختلاف ظاہر ہو اور وہ سنیوں کے لیے رنج کا سبب ہو۔ بہو بیگم صاحبہ سے نواب آصف الدولہ کی نہیں بن سکی اور نواب فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے۔ یہاں پہنچ کر شیعی عقیدے کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ مرزا ابوطالب اصفہانی نے ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء کے واقعات میں سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کے بارے میں یہ ذکر کیا ہے کہ وہ نواب آصف الدولہ کے نائب مقرر ہوئے (تاریخِ آصفی ص ۵۲) سودا نے زیر بحث قصیدہ ان کی خدمت میں پیش کیا اور صریحاً کہا ؎

ترے مخالفِ مذہب ہوں کیسے ہی عابد　　　نہ سمجھیو کہ انھوں کا بہ خیر ہو انجام

خدا کو ان کی عبادت سے ہے یہی منظور　　　ثواب روزِ جزا ان کا آوے تیرے کام

نواب سرفراز الدولہ "امی محض" تھے لیکن ابوطالب اصفہانی کا کہنا ہے کہ وہ سپہ گری اور دوسرے ہنر جانتے تھے (تاریخ آصفی صفحہ ۳۰) اپنے قصیدے میں سودا نے ان کی تلوار، گھوڑے، ہاتھی کی تعریف کی ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے جس سے ان کا صاحب علم ہونا ظاہر ہو۔ اتنی بات البتہ صحیح ہے کہ سرفراز الدولہ علم و شعر کی سرپرستی کرتے تھے۔ سودا کے ایک شاگرد مرزا احسن علی احسن کے بارے میں سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے :

"نواب سرفراز الدولہ مرزا احسن رضا خاں کے رفیق بلکہ خاص الخاص" (خوش معرکہ ج ۱ ص ۵۸)

سودا نے بھی اپنی شاعری کو واسطہ بنا کر عرض کیا ہے کہ ؎

عوض میں اس کے صلہ کے کروں میں تجھ سے عرض　　　قبول ہو تو مرا حرف اے ذوی الاکرام

مجھے تو گوشۂ خاطر میں اپنے دے جاگہ　　　کہ تا بسر کروں لیل و نہار با آرام

سودا نواب شجاع الدولہ کے آخر زمانے میں اودھ میں پہنچے تھے۔ بھگوان داس ہندی نے لکھا ہے: "آخر وارد لکھنؤ گشتہ، قصیدۂ مدح بہ جناب وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بہادر مرحوم گزرانید۔ آں عالی جاہ دو صد روپیہ درماہہ سامان و مقرر نمود، خلعت داد۔ چوں آں عالی جاہ وفات یافت ہمراہ وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر مرحوم بہماں درماہہ حاضر می ماند ـــــ" (ہندی ص ۱۰۵) سودا آصف الدولہ کے ساتھ ہی فیض آباد سے لکھنؤ آ گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تریسٹھ چونسٹھ کی ہو رہی تھی اور وہ سپہ گری کے لائق نہیں رہ گئے تھے۔ شاعروں میں ان کے مخالف بلکہ دشمن بھی تھے۔ شاید کچھ دن شجاع الدولہ کی وفات کے بعد انھیں بے روزگاری میں بھی کاٹنے پڑے تھے۔ جب سرفراز الدولہ کی خدمت میں رسائی حاصل ہوئی تو انھوں نے عقیدے کو بیچ میں ڈال کر ان سے گوشۂ خاطر میں جگہ طلب کی۔ یہ طلب سودا نے سرفراز الدولہ ہی سے کی تھی، اس کی تائید سودا کے ایک دوسرے قصیدے سے ہوتی ہے جس میں سودا نے اپنے بارے میں کہا ہے ؎

سپہ گری میں تو گذرا شباب کا عالم　　　نہیں وہ عمر کہ اب آوں میں بکار لساق

اور قصیدے کے آخر میں عرض کیا ہے ؎

عوض میں دے مجھے اس نقدی کے تو ایسا گاؤں　　　بسر ہو عمر مری جس سے زیر کہنہ رواق

ان معروضات کی روشنی میں غالب گمان یہ ہے کہ یہ قصیدہ سرفراز الدولہ ہی کی مدح میں لکھا گیا تھا۔ اگرچہ نسخۂ ۱۸۰۸ء میں قصیدوں کے عنوان عموماً صحیح معلوم ہوتے ہیں، اس قصیدے کا جو عنوان اس میں ہے کسی دوسرے ماخذ سے اس کی تائید نہیں

ہوتی اس لیے فی الوقت اس کو تسلیم کرنا احتیاط کے خلاف ہے۔

صفحہ ۲۳ "رچرڈ جانسن کی مدح میں جو قصیدہ ہے۔ بچھانہ جائے اس سے رو ے گلرخاں بہ رنگ، لکھا گیا... نسخہ ۱۹!.... میں اس قصیدے کا کوئی عنوان درج نہیں ہے.... نسخہ ۲۱ میں اس قصیدے کا عنوان 'در مدح خلف حسن رضاخاں' درج ہوا ہے۔ اشعار میں کوئی تبدیلی نہیں ہے.... نسخہ ۱۱ میں.... فی المدح جانشین' درج ہے۔"

قصیدے میں یہ کہہ کر کہ تیری وہ ذات، گو تو ہیں ہے شہر فرنگ

شاعر نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ممدوح بادشاہ نہیں ہے اور اس کا تعلق "فرنگ" سے ہے۔ نسخہ ۱۹ اگرچہ خود جانسن کے کتب خانے کا ہے، اس کا کاتب کوئی ایسا شخص ہے جس نے قصیدوں کو سمجھ کر لکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس نسخہ میں عنوان نہ ہونے سے قصیدے کی نوعیت متاثر نہیں ہوتی۔

نسخہ ۹ میں اور نسخہ ۱۱ میں بھی جانسن کو "جانشین" لکھا ہے (قصائد سودا ص ۹۵، ۵) اس کو نسخہ ۲۱ کے کاتب نے "جان شین" کے بجائے "جانشین" پڑھ لیا ہوگا اور اتفاق سے اس سے پہلے حسن رضاخاں کی مدح کا قصیدہ ہوگا۔ اس سے اس نے "جانشینِ حسن رضاخاں" خیال کر کے اپنے لفظوں میں عنوان مرتب کر لیا ہوگا یعنی "خلف حسن رضاخاں" قصیدے کے متن پر اس نے توجہ نہیں کی اور اسے بجنسہ رہنے دیا۔ عنوان کے اس فرق کو بہت اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

صفحہ ۴۴ "اور بھی کئی قصائد کے بارے میں نشاندہی کی جا سکتی ہے کہ ان کا انتساب مختلف ناموں سے ہوا کہ مختلف نسخے اس بات کی شہادت دیتے ہیں۔"

اگر نشاندہی کی جا سکتی ہے تو اس کام کو نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ چوں کہ یہ کام نہیں کیا گیا محض کہنے سے کوئی نتیجہ نہیں۔ جتنے قصیدوں کے بارے میں صراحت سے دعویٰ کیا گیا ہے ان سے بحث کی جا چکی اور یہ واضح ہے کہ سودا نے خود کسی قصیدے کو ایک سے زائد ممدوحین سے منسوب نہیں کیا۔ کسی ذریعہ سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ سودا ایسا کرتے تھے۔ مختلف نسخوں میں جو اختلاف ملتا ہے اس کے لیے کاتب ذمہ دار ہیں۔

دراصل مرتب نے عنوان میں یا متن میں آئے ہوئے ناموں کو کل سمجھ لیا ہے۔ قصیدے کے دوسرے شعروں پر نظر نہیں کی۔ ان کا غلطی میں مبتلا ہو جانا قدرتی تھا۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جو کاتب متن کے ایک لفظ میں تبدیلی کر سکتا ہے وہ ایک شعر یا عنوان میں کسی نام کو بھی بدل سکتا ہے۔ مدون کا کام ہی یہ ہے کہ وہ غور و فکر اور محنت کے بعد ان غلط تحریروں میں سے صحیح متن حاصل کرلے۔ خذف ریزوں کے ڈھیر میں سے موتیوں کا نکال لانا ہی مدوّن سے متوقع اور مطلوب ہوتا ہے۔

"جہاں انتساب کو متنی تصدیق حاصل ہو اسے کاتب کے سر نہیں منڈھا جا سکتا" کاتب کی لکھی ہوئی ہر تحریر

قابلِ اعتماد نہیں ہوتی۔ کسی مخطوطے میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اُسے "متنی تصدیق" ہرگز حاصل نہیں ہے۔ اگر اسے تصدیق شدہ مان لیا جائے تو مدوّن کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ مدوّن کو جب کوئی نسخہ ملتا ہے تو وہ اس کے ہر جملے، ہر فقرہ، بلکہ ہر لفظ اور ہر حرف کو اچھی طرح دیکھتا، غور کرتا، سمجھتا اور پرکھتا ہے۔ جب وہ تمام قراین اور شواہد کی روشنی میں اس کی تصحیح کر دیتا ہے تب وہ "مصدقہ متن" کہلاتا ہے۔ کسی مخطوطے میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے اس کی پوری پوری ذمہ داری کاتب ہی کی ہوتی ہے۔

"ان (سودا) کو دربار داری کا سلیقہ بھی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کب کس شخص کی مدح کی جائے اور کس طرح اپنے فن کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کی جائے۔ وہ کسی ایک دربار سے وابستہ نہیں رہے۔"

یہ بڑا بے دردانہ بیان ہے۔ سوداؔ کے بارے میں یہ بات ثابت نہیں ہے کہ وہ محض "قیمت وصول" کرنے کے لیے ایک دربار سے دوسرے دربار میں گئے تھے۔ مرتب نے سودا پر یہ الزام بار بار لگایا ہے اور ایک جگہ بھی ثبوت پیش نہیں کیا۔ اپنے معاملات اور اپنے عمل پر دوسرے کا بھی قیاس کرنا ظلم ہے۔ سودا کے زمانہ میں "حقِ نمک" کا بھی خیال رکھا جاتا تھا اور کسی سے اس باب میں لغزش ہو جاتی تھی تو خواہ وہ کسی درجے کا آدمی ہو لوگ اس پر گرفت کرتے تھے۔ غازی الدین خاں عماد الملک جیسے شخص کے بارے میں قاسم نے لکھا ہے:

"بہ ثمرۂ نمک حرامی کہ با ولی نعمتِ قدیمی، از وے بظہور رسید ـــــ الخ" حالانکہ قاسم اُنکی لیاقتوں کے نہایت معترف تھے۔ سوداؔ نے جو ہجویں کہیں اور سودا کی جو ہجویں کہی گئیں، ان سب کو جمع کرکے تفصیلی مطالعہ کی ضرورت ہے۔ مرتب نے سوداؔ کے قصائد اور ہجویات کو جمع کرنے کا دعویٰ کیا لیکن افسوس ہے کہ یہ مجموعہ متداول ہجویات سے بھی خالی ہے۔ سودا پر معاصرین کے ہاتھوں جو گذری اس کا کچھ حال اس مجموعے سے معلوم نہیں ہوتا۔ بڑھاپے میں جب سوداؔ سپہ گری کے قابل نہیں رہ گئے، اس وقت کی اپنی حالت کا بیان کرتے ہوئے انھوں نے خود کہا ہے ؎

سو اب تو اس سے بھی نوبت گذر گئی ہے مگر   گلے میں کرتا، بیا کفش، ہاتھ میں ہو چماق

صفحہ ۲۶ "ائمۂ معصومین کی شان میں قصیدے ان (ممدوحین) کی خوشنودیِ مزاج کا سبب بن سکتے تھے اور بالواسطہ اس کے لیے مالی منفعت کا ذریعہ بھی۔"

دہلی میں سوداؔ کے ممدوحین میں شاید سیف الدولہ کے سوا کوئی شیعہ نہیں تھا۔ اودھ میں پہنچنے کے بعد البتہ ان کے اکثر ممدوحین شیعہ تھے۔ اگر جیسا کہ مرتب کا دعویٰ ہے کہ ائمہ کی مدح میں کہے ہوئے سوداؔ کے بیشتر قصیدے دہلی کے زمانۂ قیام کے تھے تو ان سے سوداؔ کو وہ منفعت حاصل نہیں ہو سکتی تھی جس کا اس اقتباس میں ذکر ہے۔

یہ افسوس ناک ہے کہ کسی شخص کے ہر عمل کو اسی نظر سے دیکھا جائے کہ اس سے مالی منفعت مقصود تھی خصوصاً

بلکہ اس کے لیے کوئی ثبوت بھی موجود نہ ہو۔ دنیا میں بہت سے کام مالی نفع کے بغیر بھی کیے جاتے ہیں۔ ائمہ کی مدح بر بنائے عقیدت اور حصولِ ثواب بھی ہو سکتی ہے لازم نہیں کہ اس سے دنیاوی ممدوحین کی خوشنودی بھی مقصود ہو۔ اس سلسلے میں سودا کی دعاؤں پر بھی نظر کرنی ضروری ہے۔

"سودا کی حیات میں دو نسخے مرتب ہوئے" اس دعوے کی حقیقت بس اتنی ہے کہ مرتب نے صرف دو کا حال سنا ہے ورنہ سودا جیسے مقبول شاعر کے کلام کو ان کی زندگی میں کتنے دوستوں اور دشمنوں نے جمع کیا ہو گا اس کا تو اندازہ کر لینا بھی آسان نہیں۔ سودا کے کلام کے مرتب ہو جانے کا ذکر سب سے پہلے لچھمی نراین شفیق نے اپنے تذکرے چمنستانِ شعرا (تالیف ۱۱۷۵ھ/۶۲-۱۷۶۱ء) میں کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:"

"کلیاتش متضمن بر قصائد و مثنوی و... مخمس و ترجیع بند و قطعہ و رباعی و مرثیہ قریب دو ہزار بیت بہ نظرِ امعان رسیدہ۔"

شفیق کے اس بیان کی صحت اس طرح ثابت ہے کہ ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰-۶۱ء کا لکھا ہوا دیوانِ سودا کا نسخہ دستیاب ہے۔ مگر یہ نسخہ بھی کسی قدیم تر نسخے کی نقل ہے جو شاید سودا کے دہلی چھوڑنے سے پہلے مرتب ہوا ہو گا۔

سودا کی زندگی میں مرتب ہونے والے ان کے کلام کے مجموعوں کی فہرست ہنوز تیار نہیں کی جا سکی ہے پھر بھی جناب مشفق خواجہ نے کئی نسخوں کا ذکر کیا ہے (جائزہ ج ۱ ص ۵۰۱ تا ۵۴۲)

"یہ تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس (نسخہ ۱۶) میں جو کلام موجود ہے وہ قیامِ دہلی کے زمانے کا ہے۔" اس نسخے کے بارے میں بعض باتیں عرض کی جا چکی ہیں۔ اس کے کاتب صادق علی مرزا کا کہنا ہے کہ دیوانِ سودا کا ایک نسخہ حافظ نظارت خاں کے پاس تھا۔ موصوف کی فرمائش سے کاتب نے پریشانی کے عالم میں اسے نقل کیا اور ۷ ربیع الثانی ۱۱۷۴ھ کو اس کام سے فراغت پائی۔ اس صادق علی مرزا کے بارے میں حکیم قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے:

"صادق، مرزا صادق علی خاں مرحوم عرف مرزا مدد اللہ مردے بود از شاہجہاں آباد... نقشہائے بدیعہ می نگاشت شاگرد رشید... میاں نعمت خاں... با سرآمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا ربط مستحکم داشت و یارِ جانی و دوستدارِ روحانی می انگاشت۔" (مجموعۂ نغز ج ۲ ص ۱۷۹)

حافظ نظارت خاں کے بارے میں البتہ کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب کے پاس جو نسخہ تھا، مسودہ کی صورت میں تھا۔ صادق نے اسے اہتمام سے نقل[۱] کیا۔ وہ اصل نسخہ کچھ پہلے کا لکھا ہوا ہو گا۔ صادق سے نقل کروانے میں مصلحت یہ بھی ہو گی کہ اسے سودا کا کلام یاد ہو گا یا خود اس کے پاس کچھ مسودے ہوں گے اور یہ پوری صحت کے ساتھ سودا کے کلام کو لکھ سکتا تھا۔ امکان ہے کہ اس نے نقل کرتے وقت اپنے مسودوں میں سے کچھ کلام کا اضافہ

---

[۱] ایک خیال یہ بھی ہے کہ آر اے لائبریری کا یہ نسخہ بعد کی نقل ہے۔ اس بارے میں مزید تفصیلات کے حصول کے بعد ہی قطعی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

بھی کر دیا ہو اس لیے یہ دعویٰ صحیح نہیں ہوگا کہ نسخہ م۱۶ میں سودا کے قیام دہلی تک ہی کا کلام ہے ۔

" سودا کے غیر مطبوعہ قصائد میں سے کئی دہلی میں لکھے گئے کیوں یہ ان کے پہلے یا دوسرے مرتبہ کلیات میں شامل نہیں ہو سکے اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا لیکن یہ امکان ہے کہ ان کو ابتدائی مشق کا نتیجہ قرار دے کر سودا نے خود ہی ان کو نظر انداز کرنے کے قابل سمجھا ہو اور یوں یہ ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکے ۔"

جس کلام کو سودا نے اپنے دیوان میں شامل نہیں کیا جسے ان کے یار جانی صادق علی مرزا نے (نسخہ م۱۶ میں) شامل نہیں کیا اس کو سودا کے کلام میں بغیر کسی قطعی ثبوت کے شامل کر دینا صحیح نہیں ہو سکتا بلکہ ایسے کلام کو سودا سے منسوب کرنے کے لیے بھی ایسی شہادت درکار ہے جسے رد نہ کیا جا سکتا ہو ۔

پہلے اور دوسرے مرتبہ کلیات سے اگر کلیات مطبوعہ مطبع مصطفائی اور کلیات مرتبہ آسی مراد ہیں تو ان میں کسی قصیدے کی عدم شرکت کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے مرتبین نے تمام نسخے نہیں دیکھے تھے لیکن اگر اشارہ قلمی نسخوں کی طرف ہے تو اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ کلام سرے سے سودا کا ہو ہی نہیں ۔ بعض نسخوں میں کسی کلام کے نہ ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ شاعر کے نو مشقی کے زمانے کا کلام ہے وغیرہ اس قسم کی قیاس آرائی گمراہ کن ہو سکتی ہے ۔

صفحہ ۳۰ " حضرت فاطمہ ۔ ۔ ۔ ۔ اور حضرت امام زین العابدین کی شان میں (جو قصیدے ہیں) ان کے بہت سے اشعار سودا کی ابتدائی مشق کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں ۔ ان میں ۔ ۔ ۔ سست بندشیں استعمال کی گئی ہیں اور حشو و زوائد سے کام لیا گیا ہے ۔ ۔ بہت سے قدیم الفاظ آ گئے ہیں مثلاً ۔ ۔ ۔ نَیں بجائے نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ بعض پُر کن ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصائد ان قصیدوں سے بھی پہلے لکھے گئے ہیں جو نسخہ م۱۶ میں شامل ہیں ۔"

سست بندشوں ، حشو و زوائد اور قدیم الفاظ کی مثالیں پیش نہیں کی گئی ہیں ۔ صرف ایک لفظ 'نیں' کا ذکر کیا ہے ۔ اس کا استعمال ثناء اللہ خاں فراق کے اس شعر میں بھی موجود ہے ؎

غنچہ اس غم سے جگر ٹکڑے کرے ہے بار بار   صحن گلشن میں ہی نیں ماتم سرائے عندلیب

بعض لفظوں یا بندشوں کو محض اپنے قیاس سے قدیم یا جدید قرار دے لینا اور اس کی بنیاد پر کسی کلام کے زمانے کے بارے میں حکم لگانا عموماً گمراہ کن ہوتا ہے ۔ جن دو قصیدوں کا اس اقتباس میں ذکر کیا گیا ہے وہ کسی بھی معتبر نسخے میں دستیاب نہیں ہوئے ہیں ۔ داخلی شواہد بھی اس امر کے موجود ہیں کہ وہ سودا کے کہے ہوئے نہیں ہیں ۔ قوی امکان ہے کہ وہ دونوں الحاقی ہوں ۔ تفصیل ان قصیدوں سے متعلق بحث میں آئے گی ۔

ائمہ کی مدح میں سودا کے کہے ہوئے صرف ان نو قصیدوں کے بارے میں جو نسخہ م۱۶ میں شامل ہیں یہ خیال

کیا جاسکتا ہے کہ وہ دہلی میں لکھے گئے ہوں گے۔ باقی کے بارے میں اتنی بات بھی نہیں کہی جاسکتی۔ دہلی کے زمانۂ قیام میں کسی قصیدے کا کہہ لیا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ نومشقی کے زمانے کا ہے کیوں کہ دہلی چھوڑنے کے وقت سوداؔ کی عمر پینتالیس سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

صفحہ ۴۲ "کلیاتِ سودا کے نسخوں کی بڑی تعداد ہے۔ یہاں تقریباً پچیس نسخوں سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن ان میں سے کوئی نسخہ بھی اپنی جگہ مکمّل نہیں کہا جاسکتا۔" تقریباً پچیس کیا؟ جب یہ معلوم تھا کہ بڑی تعداد تو صرف تقریباً پچیس پر ہی کیوں قناعت کی؟ کہا جا چکا ہے کہ یہ تقریباً پچیس کی تعداد بھی غلط بلکہ مبالغہ آمیز ہے۔

نسخے کے مکمّل ہونے سے کیا مراد ہے؟ نسخہ ۱۶ جو ۱۱۶۴ھ میں لکھا گیا' اس زمانے تک بڑی حد تک مکمّل تھا۔ دوسرے نسخوں کے کاتبوں نے بھی اپنی دسترس کے مطابق نسخہ کو مکمّل کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ مکمّل سے اگر یہ مراد ہے کہ اس میں سوداؔ کا تمام کلام مندرج ہو تو ایسا نسخہ مرتب بھی تیار کردینے سے قاصر رہا ہے۔ اس میں وہ کلام بھی نہیں ہے جو عام مطبوعہ کتابوں میں موجود ہے مثال کے طور پر میر ضاحک کی ایک ہجو کے یہ اشعار ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے نقل کیے ہیں ؎

کیجیو میری ہجو تو اے بھڑوے نٹ — تو سہی دوں بانس سے تجھ کو الٹ
جو ترے دل میں ہے کہ تو شوق سے — دیکھ تو ٹک یار بھی ہیں کیا اکٹ
ہجو کی ہے تو نے اُن کی آج تک — جوں بھی ان سے مر نہیں سکتی ہے جَٹ
مادر و خواہر تلک تو دے مجھے — گالیاں تو سُن کے پی جاؤں میں چٹ
عجب دنیا کیا ہے جو مجھ میں نہیں — جو تو چاہے کہ نہیں اس میں کپٹ
جورو بیٹی کو بھی گر دے گا تو کیا — کون سی یہاں جاوے گی کھٹ
مولوی صاحب کو جو پھر کچھ کہا — دیکھیو کیا کروں گا چٹ دپٹ

(لکھنؤ کا دبستاں ص ۱۰۱)

صفحہ ۴۳ "یہاں صرف اُن قصائد کا ذکر کیا گیا ہے جو تین یا تین سے کم نسخوں میں پائے گئے ہیں۔" یہ کل نو قصیدے ہیں۔ ان کا ذکر صفحہ ۱۲ کے علاوہ صفحہ ۶ پر بھی دوسرے عنوان سے آچکا ہے۔ ان قصیدوں کا تصنیف کردۂ سودا ہونا بہت مشتبہ ہے کیوں کہ یہ کسی معتبر نسخے میں مندرج نہیں ہیں اور ان میں سے تین ممنون کے کلیات میں بھی شامل ہیں۔

صفحہ ۴۵ "سوداؔ کے کلام میں تمام اصنافِ سخن میں الحاقی حصے مل جاتے ہیں لیکن قصیدہ اس سے مبرا ہے۔ یہاں دوسروں کے کلام سے التباس نہیں ہوا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ سوداؔ نے قصیدہ نگاری میں جو منفرد انداز پیدا کیا تھا وہ اُس دور کے کسی شاعر کو حاصل نہیں تھا۔ یہاں وہ اپنے اندازِ قد سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ اسی باعث دیگر ہم عصر شعرا کا کلام

ان کے قصائد میں شامل نہیں ہو پایا۔ "مبرا بضمِ میم و فتحِ موحدہ و تشدیدِ رائے مہملہ، بے زار شدہ، دور شدہ، پاک کردہ شدہ" (غیاث ص ۴۷۷) قصیدہ اس سے مبرا ہے۔ میں مبرا کا استعمال مناسبِ موقع نہیں ہے۔

مرتب کو شاید یہ خیال ہے کہ الحاق صرف ہمعصر شعرا کے کلام کا ہوتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ الحاق کا سلسلہ عموماً بعد میں شروع ہوتا ہے۔ معاصرین ہی نہیں متاخرین کا کلام بھی کسی شاعر کے کلام میں شامل ہو سکتا ہے۔ عبرت کا مقام ہے کہ سودا کے اندازِ قد کو پہچان لینے کا دعویٰ وہ کر رہا ہے جو سودا کے قصیدوں کے ممدوح کو کاتب کے قائم ہوئے عنوانوں سے پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ جب یہ بات مان لی گئی کہ سودا کے دیوان میں تمام اصناف میں الحاق ہے تو قصیدوں کو اس سے بری نہیں مانا جا سکتا کیونکہ یہ بالکل خلافِ قیاس ہے۔ قصائد سودا میں کئی قصیدے الحاقی ہیں۔ تفصیلی بحث ہر قصیدے کی ذیل میں آئے گی۔

صفحہ ۳۶ "سودا کے تین قصیدے قابلِ توجہ ہیں: قصیدہ ۵ در مدح حضرت علی ع لختِ دل بکھرے ہیں یوں آہ سے ہنگامِ قلق، قصیدہ ۱۰ در مدح امام حسن ع ہوا ہے دشت برنگِ چمن طرب مانوس، قصیدہ ۱۸ در مدح امام تقی ع ہووے جو قطرہ ریز یہ چشمِ تر آب میں۔ قصیدہ ۵ نسخہ ۳ اور ۱۳ میں ہے۔ قصیدہ ۱۰ نسخہ ۳، ۱۳ اور ۱۵ میں ہے اور قصیدہ ۱۸ صرف نسخہ ۱۵ میں ہے۔" ان تینوں نسخوں سے متعلق بحث کی جا چکی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو شبہ سے بالاتر ہو۔ ان تینوں قصیدوں کا تصنیف کردہ سودا ہونا مشتبہ ہے۔

صفحہ ۳۷ تا ۳۹ "(آصفیہ کے نسخہ کلیاتِ ممنون میں) مذکورہ تینوں قصیدے موجود ہیں۔۔۔۔ ان تین قصیدوں میں سے دو قصیدے۔۔۔۔ نسخہ ۱۳ میں موجود ہیں جس کی کتابت ۱۲۰۳ھ میں مکمل ہوئی۔۔۔۔ اس کی تکمیل کے وقت ممنون کی عمر تقریباً انیس سال کی تھی۔" کہا جا چکا کہ نسخہ ۱۳ کا سالِ کتابت ۱۲۰۳ھ کے مقابلے میں ۱۲۳۰ھ زیادہ قرینِ صحت ہے۔ اس وقت تک ممنون کا قابلِ ذکر شاعروں میں شمار ہونے لگا تھا۔ امکان ہے کہ کاتب نے انکے قصیدے کو غلطی سے سودا کے قصیدوں میں شامل کر لیا ہے۔

صفحہ ۷۶ "اگرچہ ہجوِ شاہ ولی اللہ ع کروں چمن میں اگر جا کے میں غزلخوانی، میں بھی انھوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ـــــــ الخ" کتابیات میں شاہ ولی اللہ سے متعلق عبدالقیوم مظاہری کی کتاب کا نام بھی شامل ہے لیکن اس کا حوالہ مقدمہ میں راقم کو کہیں نہیں ملا۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد غالباً ان مقاموں کی جہاں اس ہجو میں متعلق شخص کے نسب اور عقائد کا بیان ہوا ہے تردید یا توثیق کی جا سکتی تھی۔ مقدمہ میں یا کسی دوسرے مقام پر بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ شاہ صاحب کے خلاف ہجو لکھنے پر سودا کو کس واقعہ یا شخص نے آمادہ کیا تھا۔

قصائد سودا میں جس ہجو کو شاہ ولی اللہ سے منسوب کیا گیا ہے، اس کا یہ عنوان کہاں سے لیا گیا؟ نسخہ ۱، ۲، ۴، ۶، ۱۰ کے علاوہ سودا کے یار جانی صادق علی مرزا کے لکھے ہوئے نسخہ ۱۶ کے عنوان کو بھی کیوں نظر انداز کر دیا

گیا؟ ان سوالوں کا جواب قصائدِ سودا کے کسی اندراج سے نہیں ملتا۔ ہجو کے متن میں کسی بھی شخص کا نام موجود نہیں ہے۔
صرف نسخۂ۹ میں یہ عنوان بتایا گیا ہے : "در ہجو شاہ ولی اللہ" (قصائدِ سودا ص ۲۷۴)
اور شاید نسخۂ۳ میں وہ عنوان ہو جو اس ہجو کے اوپر درج ہے۔ محض ان دو نسخوں کے اندراج کی بنیاد پر یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ یہ ہجو سودا نے شاہ صاحب ہی کے لیے کہی تھی۔ "ہجو مولوی ساجد ع "ساجد کیوں نہ وہ پرواز کرے تا بہ فلک"... اس کو پڑھ کر تو واقعی شرم کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں"۔ یہ ہجو بھی مولوی ساجد کی نہیں ہے بلکہ میر ضاحک کی ہے۔ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے : "اول ... ترجیع بند کہا، بعد اس کے یہ قصیدہ ؎

ضاحکا کیوں نہ وہ پرواز کرے زیر فلک   پہنچی پشتین سے ہو نطفے کی حلّت جس تک

(کل آٹھ شعر) بعد خرابی بصرہ بہ استدعائے میر حسن پسر میر غلام حسین ضاحک یہ ہجو مولوی ساجد شاہ آبادی کے نام پر ہوئی۔ باقی ترجیع بند اور مخمس اور مثنوی ہنوز بدستور" (خوش معرکہ ج ۱ ص ۷ تا ۸)
مرتب نے متداول مطبوعہ تذکروں اور دوسرے مآخذ کو نہیں دیکھا۔ ان سے اس قسم کی بہت اطلاعات حاصل ہو سکتی تھیں۔ ناصر نے اس ہجو کے صرف آٹھ شعر نقل کیے ہیں۔ اس نے شعروں کی صحیح تعداد نہیں بتائی۔ مذکورہ مطلع قصائدِ سودا میں بجنسہٖ موجود ہے۔ صرف "ضاحکا" کی جگہ "ساجدا" کر دیا گیا ہے۔ خیال ہے کہ شعروں میں کچھ تبدیل نہیں کی گئی۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو نام کی تبدیلی کا مقصد فوت ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس ہجو میں آخری چھ شعروں میں نسب اور عقیدے کی بحث ہے۔ اگر یہ شعر بعد میں شامل نہیں کیے گئے تو ان سے میر ضاحک کے عقیدے کا قیاس کیا جانا چاہیے۔ ان شعروں کے تعین میں سودا کے کہے ہوئے مذکورہ ترجیع بند اور مثنوی ہجویہ سے مدد مل سکتی ہے۔ رسالہ قومی زبان کراچی کے مارچ ۱۹۶۷ء کے شمارے میں ڈاکٹر وحید قریشی نے سحر البیان کے ایک نادر قلمی نسخے کا تعارف شائع کیا ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر موصوف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نسخہ مصنف کے ہاتھ لکھا ہوا۔ اس میں چاروں خلفا کی مدح موجود ہے۔ اس طرح ؎

الٰہی بصدق ابا بکر خاص   کہ بودش بہ محبوب تو اختصاص
الٰہی بگرداں بعدل عمر   درخت امید مرا بارور
الٰہی بہ عثمان شہ شرمگیں   نگہدار شرع بہ دنیا و دیں
الٰہی بعلم (بہ) نور علی   درو چشم کن در جہاں منجلی؟

ان شعروں سے ضاحک کے عقیدے کے بارے میں اندازہ کرنے میں بھی شاید کچھ مدد مل سکے۔

قصاید کی ترتیب صفحہ ۱۷ ”سودا کے تمام قلمی نسخوں میں جن سے یہاں استفادہ کیا گیا ہے کوئی بھی نسخہ کسی تاریخی ترتیب سے مدوّن نہیں ہوا۔“ ”کسی تاریخی ترتیب“ سے کیا مراد ہے؟ تاریخی ترتیب سے تو زیر تبصرہ مجموعہ بھی مرتب نہیں ہوا ہے۔ اگر اس ضرورت کا واقعی احساس تھا تو یہ کام مرتب نے کیوں نہیں کیا؟ ”ہر نسخے کے کاتب نے اپنی پسند سے قصائد کو مقدم و موخر کر کے لکھا ہے۔“ بالکل یہی کام مرتب نے بھی کیا ہے۔ جس قصیدے کو چاہا ہے مقدم کر دیا ہے، جسے چاہا موخر کر دیا ہے۔ ”بعض قصیدوں میں یہ ذرا سا اہتمام برتا گیا کہ نعت و منقبت کے قصیدے پہلے درج ہوں، اور بعد میں دیگر مدحیہ قصائد۔“ بعض قصیدوں میں نہیں نسخوں میں۔ اور بس اتنا ہی اہتمام اس ”قصائدِ سودا“ میں بھی ہے۔ ”بعض قصائد میں اشعار کی ترتیب بھی متفرق نسخوں میں مختلف ہے۔“ لیکن اس کا اظہار قصائدِ سودا کے حواشی سے عموماً نہیں ہوتا ہے۔ ”یہ طے کرنا مشکل تھا کہ ... کسی ایک نسخہ کا اتباع کیا جائے یا سب کو چھوڑ کر کوئی نئی ترتیب قائم کی جائے۔“ کسی ایک نسخہ کو بنیاد بنا کر حاشیہ پر باقی نسخوں کے اختلافوں کو ظاہر کر دینا نقل نویس کا کام ہے۔ مدوّن کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مآخذ کے مطالعہ کے بعد متن کی صحیح ترین صورت پیش کرے۔ اس عمل کے نتیجہ میں ایک نئی ترتیب بھی وجود میں آ سکتی ہے۔

صفحہ ۳۷ ”نسخہ ۳ بعض لحاظ سے قابلِ ترجیح تھا۔ قصائد کی تعداد کے اعتبار سے یہ سب سے زیادہ مکمل نسخہ ہے ... قریب کے زمانے ۱۲۰۲ھ میں لکھا گیا ہے۔ تحریر کی صحت کا کافی اہتمام رکھا گیا ہے ـــــ الخ“ قصائد کی تعداد کا زیادہ ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مرتب کے وسائل بہت تھے اور غالباً دوسرے مختلف نسخے اسے دستیاب تھے۔ یہ صورتِ حال اس کے بعد کے زمانے میں لکھے جانے کی بھی غماز ہو سکتی ہے۔ نسخہ کے کاتب، مقام کتابت کا بالکل پتا نہیں چلتا۔ آخر میں جو تاریخ لکھی ہے اس پر اعتماد کر لینا خلافِ احتیاط ہے۔ پھر یہ بات کہی جا چکی کہ مندرجہ تاریخ ۱۲۳۰ھ کی معلوم ہوتی ہے ۱۲۰۲ھ کی نہیں۔ تحریر کی صحت کا اندازہ اس طرح ہو جاتا ہے کہ مرتب نے تقریباً سبھی قصیدوں میں اس کے اختلافوں کی حاشیہ پر نشاندہی کی ہے یعنی ان کو قبول نہیں کیا ہے۔

”(نسخہ ۳ میں) قصائد بڑی حد تک تاریخی ترتیب میں رکھے گئے ہیں۔“ اس دعوے کی صحت کا اندازہ مرتب ہی کے ان لفظوں سے کیا جانا چاہیے کہ ”بسنت خاں کی مدح میں دونوں قصائد الگ الگ درج تھے ان کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ سیف الدولہ کا ... تیسرا (قصیدہ) ان سے الگ تھا، ان کو بھی یکجا کر دیا گیا۔ بسنت خاں عہدِ محمد شاہی کا خواجہ سرا تھا اس لیے اس سے متعلق قصیدوں کو عالمگیر ثانی اور شاہ عالم کے قصیدوں سے پہلے جگہ دی گئی کہ تاریخی ترتیب میں بسنت خاں پہلے ہی آتا ہے۔“ ”قصیدہ ۶ ہے اشتہار تجھے ـــــ الخ کے بارے میں یہ مانا گیا ہے کہ یہ محمد شاہ کی شان میں

بلکہ شاہ عالم کی شان میں ہے، اس لیے عالمگیر ثانی کے قصیدے کے بعد رکھا گیا ہے۔"

یہ بیان غلط ہے۔ قصیدہ ۲۴ ہے اشتہار ـــــ الخ صفحہ ۲۴۴ سے، عالمگیر ثانی کی مدح کا قصیدہ ۲۴ کھے ہمیشہ الخ صفحہ ۲۴۳ سے، پھر بسنت خاں کا قصیدہ صفحہ ۲۴۵ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان قصیدوں کا نمبر شمار بھی بے ترتیب ہے یعنی: قصیدہ ۲۳، ۲۴، ۲۴ درمدحِ بسنت خاں صفحہ ۲۴۵، ۲۵۱ پر، قصیدہ نمبر ۲۲ درمدحِ عالمگیر ثانی صفحہ ۲۴۳ پر، قصیدہ ۲۶ درمدحِ شاہ عالم صفحہ ۲۴۰ پر ہے اور ان سب سے پہلے قصیدہ ۲۳ (مکرر) امام آخرالزماں کی مدح میں ہے۔ شمار ۲۵ کسی بھی قصیدہ پر درج نہیں ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ نمبر شمار کسی بھی ترتیب کو ظاہر نہیں کرتے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ مرتب کو سودا کے ممدوحین کے زمانے کا اندازہ نہیں ہے اور وہ اس بات کو متعین کرنے میں بھی ناکام ہے کہ کون سا قصیدہ کس ممدوح کے لیے ہے۔ اس کی صورت اس طرح ہے کہ بسنت خاں بہ گمان غالب پہلا امیر ہے جس سے سودا متوسل ہوئے۔ بھگوانداس ہندی نے لکھا ہے:

"اوّل بہ میاں بسنت علی خاں خواجہ سرائے بادشاہی پیوستہ، بعدہٗ با عالیجاہ غازی الدین خاں بہادر ملازمت نمودہ رشد و عزت بہم رساند۔" (سفینۂ ہندی ص ۱۰۵) سیف الدولہ احمد شاہی دور کے امیر ہیں۔ شاید ان کے آخر زمانے میں سودا کی رسائی اِن تک ہوئی تھی۔ پھر غازی الدین خاں عماد الملک کی سودا نے ملازمت اختیار کی۔ ان کے واسطے سے عالمگیر ثانی کے دربار میں پہنچے۔ اس سے پہلے کسی بادشاہ تک سودا کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ قصیدہ ع کھے ہمیشہ تری تیغ ـــــ الخ پہلا قصیدہ معلوم ہوتا ہے جو سودا نے شاہی دربار میں پیش کیا۔ پھر وہ قطعہ تہنیت پیش کیا جو قصائد سودا میں شجاع الدولہ سے منسوب ہے یعنی ع: نوید زیرِ فلک یوں ہوئی ہے شہرۂ عام۔

ممکن ہے کہ اور قصیدے بھی کہے ہوں۔ احمد خاں بنگش اور مہربان خاں رند کا نمبر ان کے بعد آتا ہے۔ پھر ایک قصیدہ شاہ عالم کی خدمت میں پیش کیا۔ ان کے بعد شجاع الدولہ کی خدمت میں پہنچے۔ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد براہِ راست یا غالباً سرفراز الدولہ کے واسطے سے آصف الدولہ کے ملازم ہوئے اور انھیں کی ملازمت میں مرے۔ یہ تفصیل قطعی نہیں ہے۔ آئندہ تحقیق سے اس میں کسی قدر ردّ و بدل ہو سکتی ہے لیکن اس کو نگاہ رکھے بغیر سودا کے قصیدوں کی تاریخی ترتیب ممکن نہیں ہے۔

متن "مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ موجود ہو تو متن شبہ سے بالاتر ہو جاتا ہے۔" یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ مصنف بھی آدمی ہوتا ہے۔ اس سے بھی سہو ہو سکتا ہے۔" اغلاط یا اختلاف کا امکان نہ قربِ زمانی سے کم ہوتا ہے نہ بُعدِ مکانی سے زیادہ۔ غالباً پھر صحت کا انحصار صرف اس پر رہ جاتا ہے کہ کاتب کون ہے۔" تدوین کا کام ذہن کی ترتیب سے

متعلق ہے۔ کام شروع کرنے سے پہلے مدوّن کیلیے لازم ہے کہ وہ مصنف کے ماحول، اس کے حالات و مشاغل، علم و مطالعہ
اور فکر و مزاج کے میلان وغیرہ سے بحدِّ امکان بہتر سے بہتر طور پر واقفیت حاصل کرے تاکہ وہ متن کو اگر اسی نظر سے
نہیں تو قریب قریب اسی نگاہ سے دیکھ سکے جس سے اسے مصنف نے دیکھا تھا۔
یہ مدوّن کی ذمہ داری ہے کہ وہ غور و فکر کے بعد مخطوطہ کے بارے میں خود رائے قائم کرے۔ دوسروں کی
رائے پر انحصار اکثر غلطی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مرتب کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ اس نے نسخہ ۱۹ کو محض دوسروں کے کہنے سے
معتبر مان لیا ہے۔ اسی طرح نسخہ ۳ کو اس نے محض اس بنا پر قابلِ ترجیح قرار دے دیا ہے کہ اس پر ۱۲۰۲ھ لکھا ہوا ہے۔
"سودا کی حیات کے تین نسخے دستیاب ہیں"۔ اس جملے کے نیچے چار نسخوں کا اندراج ہے یعنی نسخہ ۱۶، ۱۹، ب، ج۔
ان میں سے نسخہ ب کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ ۱۲۱۲ھ میں مرتب ہوا (قصائد سودا ص ۱۱۲) اور نسخہ ج کا بالکل تعارف کرایا
ہی نہیں ہے۔ اسی طرح صرف دو نسخے باقی رہ جاتے ہیں۔ صفحہ ۲۹ پر بھی یہی لکھا ہے کہ:
"سودا کی حیات میں دو نسخے مرتب ہوئے"۔ "مرتب ہونے والی بات تو بالکل غلط ہے اور اس کی تفصیل
پہلے آ چکی ہے البتہ جو نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان میں سے دو کو مرتب نے سودا کی زندگی کا لکھا ہوا مانا ہے۔ ان میں
سے نسخہ ۱۹ کا معاملہ یہ ہے کہ بقولِ مرتب "اس پر کوئی ترقیمہ نہیں ہے"۔ (قصائدِ سودا ص ۱۰۹)
ایک مجہول سے اندراج کی بنیاد پر یہ خیال کر لیا گیا ہے کہ یہ نسخہ سودا نے رچرڈ جانسن کی خدمت میں پیش کیا
تھا حالانکہ نسخہ کے اندرونی اندراج سے صریحاً یہ ظاہر ہے کہ یہ پیشکش "میر حسین صاحب" نے کی تھی۔ اس اندراج سے
بھی یہ نہیں معلوم ہوتا ہے پیشکش کب کی گئی تھی۔
لیکن اب جب کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ یہ مصنف (سودا) کا تحفہ نہیں ہے بلکہ میر حسین صاحب کا پیش کردہ ہے تو
۱۱۹۵ھ کی قید ختم ہو جاتی ہے۔ جانسن اس کے کئی برس بعد تک لکھنؤ میں رہا ہے۔ میر حسین نے اس مدت میں کسی بھی وقت
پیش کر دیا ہوگا چنانچہ اس کے بارے میں یہ بات ثابت نہیں کہ یہ سودا کی زندگی میں لکھا گیا تھا اور یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ یہ
معتبر ہے۔ مرتب کو سودا کی زندگی کا لکھا ہوا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہوا ہے اور وہ واقعی بہت بیش قیمت نسخہ ہے لیکن
مرتب نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کے بارے میں ان کے الفاظ یہ ہیں: "اس نسخہ کو دوسرے نسخوں پر ترجیح دینے کی کوئی
وجہ موجود نہیں .... کاتب کم سواد ہے جو بعض معمولی لفظوں کی املا میں بھی غلطی کرتا ہے"۔ (قصائد سودا ص ۱۰۵)
اس کو دوسرے نسخوں پر ترجیح دینے کی وجہیں دو ہیں: ۱۔ یہ کلیاتِ سودا کی غالباً اولین ترتیب کی نقل ہے۔
۲۔ اس کا کاتب وہ شخص ہے جسے سودا کا "یار جانی و دوستدار روحانی" کہا گیا ہے۔ اس نسخے میں املا کا جو فرق ملتا ہے اس

پر بھی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ "کم سواد" کہہ کر اس سے سرسری گذر جانا مناسب نہیں۔ مثال کے طور پر اس نسخہ میں عمدہ 'زیادہ'، 'رتبہ'، 'عرصہ' وغیرہ لفظوں کو الفِ آخر کے ساتھ لکھا ہے۔ بخوبی ممکن ہے کہ یہ شاہ حاتم کی اصلاحات کا اثر ہو۔ یہ نسخہ بجائے خود اس لائق ہے کہ پی ایچ۔ ڈی کی سند کے لیے اس کے تحقیقی جائزہ کا کام کیا جائے۔

متنِ قصاید ہر قصیدے پر عنوان تحریر کرنے کا التزام کیا گیا ہے۔ کچھ قصیدوں پر کسی بھی نسخے میں عنوان نہیں ملا تو مرتب نے اپنے طور پر عنوان مقرر کر لیا مثلاً قصیدہ ۱۹ بیشتر عنوان کے بارے میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ اسے کس نسخے سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہوگا کہ عنوان لازماً نسخہ ۳ ہی سے لیے گئے ہیں۔ ایسی مثال بھی ہے کہ اس نسخے کا عنوان واضح اور بہتر تھا، باوجود اس کے دوسرا عنوان قائم کیا گیا اور یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں سے لیا ہے مثلاً قصیدہ ۱۵ کا عنوان یہ لکھا گیا ہے: "قصیدہ در منقبت حضرات امام کاظمین" (صفحہ ۱۹۸) معلوم نہیں کہ یہ کہاں سے اخذ کیا گیا ہے۔ نسخہ ۵، ۱۴ میں 'حضرت امام موسیٰ کاظم' لکھا تھا اور نسخہ ۳ میں: "جناب پیر و مرشد حضرت امام موسیٰ کاظم حضرت امام محمد تقی" ظاہر ہے کہ یہ عنوان زیادہ واضح ہے۔ اس کے باوجود اسے قبول نہ کرنے اور حاشیہ پر جگہ دینے کی وجہ معلوم نہیں۔ عام طور سے قصیدوں کے اوپر ایک عنوان درج ہے۔ اس کے بارے میں نہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کہاں سے لیا گیا ہے، نہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دوسرے مختلف نسخوں میں وہی عنوان ہے، یا کچھ اور ہے۔ اگر وہی ہے تو بجنسہ ہے یا کسی قدر فرق کے ساتھ۔ صرف چند قصیدوں کے بارے میں یہ اظہار کیا گیا ہے کہ بعض نسخوں میں عنوان مختلف ہے۔

صفحہ ۲۷ پر یہ بحث ہے کہ قصیدوں کے شعروں کی ترتیب میں بھی مختلف نسخوں میں فرق ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں قصیدوں کے متن اور حاشیہ پر عموماً نظر نہیں آتی ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ اختلاف موجود ہی نہ ہو لیکن اس کا امکان کم ہے۔ دوسری صورت جو زیادہ قرینِ قیاس ہے یہ ہے کہ مرتب نے اپنے طور پر ترتیب درست کر لی ہو اور اختلاف کی نشاندہی کو ضروری خیال نہ کیا ہو۔ اگر یہ ہے تو افسوس ناک ہے۔ یہ تدوین کے اصول کے خلاف ہے۔

قصائد سودا کی زیرِ نظر ترتیب سے املا اور تلفظ اور متعلق امور کا بالکل علم نہیں ہوتا۔ اس میں کلام سودا کو زمانۂ حال کے تلفظ اور املا کے مطابق ڈھالنے کی کوشش میں متن کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ یہی معاملہ تذکیر و تانیث کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ مختلف نسخوں میں قصیدوں میں الحاقی شعر بھی شامل ہو گئے ہیں۔ بہت غور و فکر کے بعد ایسے اختلافی شعروں کے بارے میں یہ متعین کرنے کی ضرورت تھی کہ ان کو متن میں شامل کیا جائے یا نہیں۔ قصائد سودا میں بعض ایسے شعر بھی متن میں لکھے ہوئے ہیں جن کی نہ ضرورت ہے اور نہ کوئی جواز مثلاً قصیدہ ۲ میں یہ دو شعر ہیں ؎

پس جو ایسا ہو تو کر سکتا ہے کوئی اسکا وصف　　　جز درود اس کی ثنا میں کیا کہے میری زباں

سُن چکا سودا زباں سے میری اس مرکب کا وصف   اس کے راکب کی ثنا و مدح اور تیرا دہاں

دوسرا شعر نسخہ ۴، ۸، ۱۰، ۱۷ میں نہیں ہے۔ پہلے شعر کے بعد اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ معنی کے اعتبار سے بھی پہلا شعر بہتر ہے اور کافی بھی۔ تدوین کا کام بہت محنت سے انجام پاتا ہے اس لیے اس کی پیشکش میں بھی احتیاط اور اہتمام ضروری ہے۔ متن کی صحیح قرأت کے لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ اعلان کی صورت میں نون منقوطہ اور ادغام کے موقع پر نون غنہ لکھا جائے۔ ۲۔ ہائے مخلوط (ھ) اور ہائے غیر مخلوط (ہ) کی شکل اہتمام کے ساتھ تحریر میں لائی جائے۔ ۳۔ اُس، اِس یا ایسے تمام لفظوں میں جن کی قرأت میں غلطی کا اندیشہ یا امکان ہو اعراب بنائے جائیں۔ ۴۔ ہمزۂ وصلی اور اضافتوں کے بنانے کا التزام کیا جائے۔ ۵۔ مفرد لفظوں کو توڑ کر ہرگز نہ لکھا جائے۔ اسی طرح مرکب لفظوں کو ملا کر ہی لکھا جائے۔

قصائد سودا میں تحریر کے ضابطوں کی پابندی نہیں کی گئی ہے جس کی وجہ سے مختلف قسم کی دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں مثلاً صفحہ ۱۸۰ پر آٹھویں شعر کا مصرع یہ ہے ع کریں ہیں نہ ورقِ آسماں کو تاہی "نہ" صحیح نہیں۔ اسے "نُہ" پیش کے ساتھ لکھنا چاہیے۔ اور آسماں اعلان نون کے ساتھ! اسی طرح صفحہ ۱۹۸ پر شعر ۷ کا مصرع یہ ہے ع ——— سٹکا جو راستی سے گیارہ زناں تلک، یہ "نہ گیارہ" "زناں ہے"، "نہ گیا ——رہ——زناں" ہے۔ ملا کر "رہزناں" لکھیں تو غلطی کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔ قصائدِ سودا میں بہت مصرعے ناموزوں ہیں اور تدوینِ متن کے سلسلے میں اس سے زیادہ خرابی کی چیز کوئی اور نہیں ہوتی ہے۔ قدیم تحریروں میں یائے معروف اور یائے مجہول میں فرق نہیں ہوتا تھا۔ مدوّن کو اس پہلو پر بہت احتیاط سے نظر کرنی چاہیے تاکہ مذکر لفظ مونث اور مونث کلمہ مذکر نہ پڑھ لیا جائے۔ اس کے لیے تذکیر و تانیث کے ضابطوں اور زبان کے روزمرہ پر قدرت ہونی ضروری ہے۔ قصائد سودا میں اس باب میں کوئی اہتمام نہیں معلوم ہوتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر مقاموں میں متن غلط ہوگیا ہے۔ یائے مجہول اور یائے معروف سے وحدت و جمعیت کے معاملے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ قصائدِ سودا میں اس اعتبار سے بھی اکثر مقاموں پر فرق دکھایا جاسکتا ہے۔

اس جائزے میں صفحہ کے لیے (ص) شعر کے واسطے (ش) کا استعمال علامت کے طور پر کیا گیا ہے۔ شعر کا نمبر خط کے اوپر اور مصرع کا خط کے نیچے لکھا گیا ہے مثلاً صفحہ ۱۸۵ شعر ۱۰ کے مصرعِ ثانی کو اس طرح ظاہر کیا ہے: ص ۱۸۵ ش $\frac{10}{2}$

قصیدہ ۱۔ ص ۱۱۹ ش $\frac{2}{2}$ ع ہوتی جب تیغ زنگ آلودہ کم جاتی ہے پہچانی۔ نسخہ ۸، ۹، ۱۶ کے علاوہ گلشنِ ہند میں بھی "آلود" اور یہی مناسب تر۔ آلودہ میں 'ہ' زائد اور غیر ضروری ۲۔ ص ۱۲۰ ش $\frac{6}{2}$ ع وگرنہ دیکھ آئینہ کہ پتھر ہوگیا پانی "آئینہ دیکھ" صیغۂ امر ——— اس کا مخاطب 'تو' اور اس صورت میں پتھر کا

پانی ہونا ثابت نہیں ـــــ نسخہ ۶ کے علاوہ تمام نسخوں میں 'کہ' کی جگہ 'کو' اور یہ مناسب تر۔ ۳۔ ص ۱۲۱ ش ۹/۲ ع زباں پر اس کے گذرے حرف حسب جاگہ شفاعت کا۔ 'زباں' مؤنث ـــــ 'اس کی' چاہیے۔ ۴۔ ص ۱۲۲ ش ۲/۳ ع کرے ہے مور چڑھ کر سینۂ دو پر سلیمانی۔ یہ 'سینۂ دَو' ہے۔ ۵۔ ص ۱۲۳ ۲/۳ ع کہ دیکھا جس نے اس کو اُن نے دیکھی شکل یزدانی۔ 'اُن' کی مناسبت سے 'جن' چاہیے۔ یہی نسخہ ۶، ۱۳، ۱۹ میں بھی ـــــ مصرع کو اس طرح لکھیں ع کہ دیکھا جن نے اس کو ان نے دیکھی شکلِ یزدانی۔

قصیدہ ۲، ۶ ش ۱/۲ ع کرتے ہیں اٹھ ہر ایک دن مل کے خیالِ خام دو 'دن' بے محل نسخہ ۴، ۶، ۱۵ میں 'دَم' (بمعنی لحظہ، سانس) اور یہی مناسب۔ ۷ ش ۹/۲ ع خورد و بزرگ دہر میں نسبت جام و شیشہ جان "خرد بالضم ضدِ بزرگ و بمعنی ریزۂ ہر چیز، بایں ہر دو معنی بواو نوشتن نباید" غیاث ص ۱۵۴) ۸۔ ش ۱/۲ سے کہتی ہے مجھ سے مغفرت ہوگئی خوب یہ غزل ہمرہ نعت و منقبت کرائے انعام دو۔ دوسرے مصرع کی مناسبت سے 'ہووے گی' ـــــ نسخہ ۳، ۱۰، ۱۳، ۱۷ کے علاوہ سب میں یہی۔ شعر اس طرح لکھا جائے ؎ ـــــ

کہتی ہے مجھ سے مغفرت ہووے گی خوب یہ غزل ہمرہ نعت و منقبت کرائے انصرام دو

۹۔ ص ۱۲۵ ش ۱/۲ ؎ اپنی یہ عرض اس سے ہے کہ تو بھلا یہ کیونکہ ہووے ہو ایک زمیں سو سنگلاخ تسپہ رہنے ہیں کام دو۔ 'کیونکہ' کو الگ الگ، 'تسپر' کو ملا کر لکھنا نادرست 'تسپر' ناموزوں، صحیح 'تس پہ'۔ شعر اس طرح لکھیں ؎

اپنی یہ عرض اس سے ہے کہ تو بھلا یہ کیونکہ ہو ایک زمیں سو سنگلاخ تس پہ بنے ہیں کام دو

۱۰۔ ش ۲/۳ ع وقتِ مراجعت کریں کونچ یکے مقام دو۔ کونچ کے بجائے کوچ فصیح تر اور یہی نسخہ ۱، ۲، ۴، ۶، ۹، ۱۸، ۱۹ میں۔ وقت کے نیچے اضافت بھی ضروری۔

قصیدہ ۳، ۱۱۔ ش ۱ ؎ میل کھینچے دیدۂ بینا میں یہ تاریک عقل :: پُر کرے کحل الجواہر سے کے چشمِ سرمہ داں اس میں احمد شاہ بادشاہ کے واقعہ کی طرف غالباً اشارہ ـــــ اگر یہ ہے تو اس وقت تک سودا عماد الملک کے ملازم نہ ہوں گے۔ ۱۲۔ ش ۱۰ ؎ ماہ کے خاطر مقرر وقتِ شب ہے ایک ناں :: پر جو یہ چاہے سدا جاری وہ ہووے سو کہاں 'خاطر' مؤنث ہے (مفید ص ۳۰) دوسرے مصرع میں 'ساری' (کل۔ ہر چیز میں پہنچ جانے والی) مناسب تر اور یہی نسخہ ۶ کے علاوہ سب میں۔ شعر اس طرح ہوگا ؎

ماہ کی خاطر مقرر وقتِ سب ہے ایک ناں پر جو چاہے سدا ساری وہ ہووے کہاں

اس میں زمانے کے ادبار کی طرف واضح اشارہ۔ ۱۳۔ ش ۱۱ ؎ یک لب ناں کے لیے حیراں ہو شہر شہر ::

مثلِ ماہ نو پڑے پھرتے ہیں عالی ہمتاں۔ پہلا مصرع ناموزوں۔ نسخہ ۲، ۱۵، ۱۷ کے علاوہ سب میں اس طرح ؎

یک لبِ ناں کے لیے حیران ہوتے شہر شہر   مثلِ ماہِ نو پڑے پھرتے ہیں عالی ہمتاں

دوسرے مصرعے کی مناسبت سے یہی بہتر اور موزوں بھی۔ دہلی میں "شہرے شہر" خلاف توقع۔ ۱۴۔ ص ۱۳۱ ش ۳ ؎
یہ سخن نکلا زباں سے جوں ہی پیرِ عقل کے 'زباں' مونث ہے۔ 'جوں ہی' اصلاً 'جو نہیں' ہوگا اور اس کا جدید تلفظ "جوں ہی"۔
مصرع اس طرح ہے ؏ یہ سخن نکلا زباں سے جوں ہی پیرِ عقل کی۔ ۱۵۔ ص ۱۴۴ ش ۱ ؏ نقش سم جس دشت پر ہو اس
کے جست و خیز کا۔ اور ص ۱۵۳ ش ۱ ؏ جست و خیز اس کی بیاں کیجیے گر پیشِ حکیم 'جُست و خیز' مونث ہے (مفید ص ۲۵)
دوسرا مصرع درست، پہلے میں 'اس کی' چاہیے۔ ۱۶۔ ص ۱۲۹ ش ۱۱ ؏ ہے عجب احوال دنیا میں کوئی جاوے کہاں۔
دوسرے مصرع میں نسخہ ۳، ۵، ۱۲ میں 'دنیا کا' جسے مرتب نے قبول نہیں کیا۔

قصیدہ ۴، ۱۷۔ ص ۱۳۸ ش ۳ ؎ عجب نہیں عوضِ اشک چشم سے میرے ؛ چوے برنگِ سحابِ تگرگ وار گرہ
چشم مونث ہے۔ پہلے مصرع میں 'چشم سے میری' چاہیے۔ دوسرے مصرع میں 'تگرگ بار' مناسب تر اور یہی نسخہ ۱۷ کے سوا تمام
نسخوں میں ۱۸۔ ش ۹ ؏ گر اس کے عدل میں خس مُنہ پہ موج کی آجائے 'منہ' مذکر ہے۔ 'منہ پہ موج کے' چاہیے۔

قصیدہ ۵، ۱۹۔ یہ قصیدہ کلیاتِ ممنون میں ہے۔ اس کا تصنیف کردہ سودا ہونا مشتبہ۔ مقطع یہ ہے ؎

تیرے مداحوں سے شاہا ہے یہ سودا کمتر   ہے تلطف کا سزاوار عنایت کا محق

"محق بضم میم و کسر حا آنکہ حق بجانب او باشد" (غیاث ص ۳۸۷) قافیہ میں محق (بہ فتحہ ثانی) نظم ہوا ہے جو غلط ہے تلطف
عنایت کی مناسبت سے سودا کے مقابلے میں تخلص ممنون زیادہ پھبتا ہے۔ ۲۰۔ ش ۴ ؎ گرمیِ آہِ شرربار سے میری ہر شب ؛
شکل عنبر کے بنی ہے یہ سپہرِ ازرق۔ شکل مونث اور سپہر مذکر ہے (مفید ص ۳۱) دوسرا مصرع اس طرح ہوگا ؏ شکل عنبر کی
بنے ہے یہ سپہرِ ازرق۔ ۲۱۔ ش ۱۳ ؎ کفِ بخشش کی تیرے دیکھ کے گوہرباری ؛ دستِ افسوس عدد سودہ رہے تا مرفق۔
'تیرے' ناموزوں، 'ترے' موزوں ہوگا۔ دوسرے مصرع میں "سودہ" نہیں "سودہ" ہے۔ ۲۲۔ ش ۱۶ ؏ نہیں انگور میں
جوں غنچہ کمال رازق۔ مصرع کے معنی واضح نہیں ہیں۔ نسخہ ۱۳ میں ہے ؏ نہیں انگور میں جو غنچہ پامال عرق۔ اور یہ غالباً بہتر ہے۔

قصیدہ ۶، ۲۳۔ عنوان معلوم نہیں کہاں سے لیا گیا۔ نسخہ ۵ میں اسے حضرت علی کے بجائے حضرت امام
محمد نقی (کذا) سے منسوب کیا گیا ہے لیکن ذیل کے شعر حضرت علی سے انتساب کے مؤید ؎

شاہِ مرداں تری خلقت جو نہ ہوتی منظور   ہوتے عنصر نہ کبھو مل کے بہم چاروں ایک

اور ؎

سخن و نطق و زباں اور فصاحت اں کی   سُن کے سحباں کہے یہ لا و نعم چاروں ایک

۲۴۔ ش ۱۲ ؎ حکم رکھتے ہیں ترے آگے یہ میدان جدال ؛ نیزہ و
قضا، سیف و قلم چاروں ایک۔ پہلے مصرع میں 'یہ' غلط؛ 'بہ میدان' چاہیے۔ یہ شعر نسخہ ۵ میں غیر موجود ہے۔ ۲۵ ش ۹
شیشے موتی سے نہیں کام کسو کے ان کو ؛ ہو کے اس بات پہ کھاتے ہیں قسم چاروں ایک یہ اگلے پچھلے شعر سے غیر مربوط اور نسخہ ۱
، ۴، ۱۲ میں غیر موجود۔

قصیدہ ۷، ۲۶۔ عنوان کا معاملہ وہی۔ ایک نسخے میں جس کا حوالہ قصائد سودا میں نہیں ہے اس کا ترقیمہ
اس طرح: "ایں قصیدۂ عدیم النظیر نیز از کلیاتِ مرزا رفیع سودا در ۱۲۲۲ یکہزار و دو صد و بست و دو ہجری در کلکتہ نقل گرفت
یں۔۔۔۔ در زبانِ ہندی ہرگز نبودہ است و نخواہد بود۔ ایزد تعالیٰ موجب مغفرت او گرداند۔" (جائزہ ج ۱، ص ۲۴۷ تا ۲۴۸)
۔۳ کے اختلافات حاشیہ پر موجود ہیں۔ ۲۷۔ ص ۱۴۸ اش ۸ ؎ بارسے آب رواں عکس ہجوم گل کے ؛ لوٹے ہے سبزہ
زلبکہ ہوا ہے بے کل۔ اضافتوں کے علاوہ "ہوا" پر پیش بنانا ضروری تھا اور 'بیکل' کو ملا کر لکھا جائے۔ ش ۹
شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے ؛ شمع ساں گرمی نظارہ سے جاتی ہے پگھل۔ یہ شعر نسخہ ۵، ۸، ۱۲، ۱۵ میں غیر موجود۔
کا مضمون ش ۱۰ سے مربوط ہے اس لیے حذف شاید بہ سبب بے احتیاطی۔ ۲۸۔ ص ۱۴۹ اش ۱ ؎ فکر رہتی ہے
یہ کہ زباں سے اپنی ؛ کہیں دعوائے خدائی نکریں لات و ہبل۔ اردو میں کلمہ 'بہ' اور 'نہ' کو کلمہ مابعد سے ملا کر لکھنا
صحیح نہیں: 'نہ کریں' کو الگ الگ لکھا جائے۔ لفظ 'فکر' دہلی میں عموماً مذکر آتا ہے۔ جلال کہتے ہیں: "دہلی والے اس
مذکر باندھتے ہیں اور اب تک اسی پر اڑے ہوئے ہیں۔ ظفر ع گئے وہ دن کہ جو تھا فکر جان جانے کا" (مفید
شیہ ص ۱۳۱) نسخہ ۱، ۱۸ میں 'فکر رہتا ہے' اور یہی زیادہ قرینِ صحت۔ ۲۹۔ ص ۱۵۳ اش ۱۲ ؎ میخ سے نعل کے
کی میں اگردوں تشبیہ ؛ کرے دوری کو تمام اپنی بیک آن زحل۔ میخ مونث، نعل مذکر، مصرع اس طرح ہوگا
میخ سے نعل کی اس کے میں اگردوں تشبیہ۔ یہ شعر نسخہ ۵ میں محذوف۔ ۳۰۔ ص ۱۴۸ اش ۲/۱ ع شاخ میں گاؤ زمیں کے
ہے جو پھوٹے کونپل۔ شاخ مونث۔ مصرع میں 'گاؤ زمیں کی ہے' چاہیے۔ ۳۱۔ ص ۱۵۰ ش ۲/۱ ع جو ثمر شاخ سے اترا
سو گرا سر کے بل۔ یہاں "بَل" نادرست۔ میر رشک لکھتے ہیں: "موحدہ مخلوط الہا مفتوح بہ لام رد جانب طرف بود،
چنانکہ گویند سر کے بھل و آنکھوں کے بھل" (نفس اللغہ ص ۸۲) نسخہ ۶، ۸، ۹، ۱۹ میں بھی 'بھل' اور یہی درست
۔ص ۱۵۲ اش ۲/۱ ع ہوا شارہ جو تیرا قضا کو کہ نہ چل، مصرع ناموزوں۔ صحیح اس طرح ع ہوا اشارہ جو تیرا قضا کو کہ نہ چل۔

قصیدہ ۸، ۳۲۔ ص ۱۶۴ اش ۲ ؎ کہتے پھریں دشمن کہ تب غم سے ہمارا ؛ آتش کدہ و سینہ سوزاں ہے برابر
"تاغم" غلط "تبِ غم" صحیح۔ یہ شعر نسخہ ۶ میں غیر موجود لیکن معنی کے اعتبار سے ضروری۔

قصیدہ نمبر ۹ یہ قصیدہ صرف نسخہ نمبر ۳، نمبر ۱۳، نمبر ۱۵ میں۔ اِن نسخوں میں مختلف قسم کی بے احتیاطیوں کی مثالیں گذشتہ اوراق میں آ چکی ہیں یہ تینوں نسخے بعد کے ہیں۔ تاوقتیکہ بہتر ماٰخذ سے توثیق نہ ہو، ان کے مشمولات معتبر نہیں۔

ص ۱۵۶۔ ش ۵ ۔۵ تیرے دہن کو دیکھکے غنچہ ہوا خجل ∴ نرگس نین کو دیکھکے آنکھیں چرا گئی

ص ۱۷۰۔ ش ۲ ۔۵ نرگس نے جان چشم پری کو کیا خجل ∴ ہیگی ہوا وہاں کی فرح بخش دلکشا

یہ دونوں شعر نسخہ نمبر ۱۵ میں نہیں ہیں۔

ص ۱۶۶۔ ش ۱ ۔۵ تو نے نقاب مُنہ سے اٹھایا چمن میں گل ∴ اے گلبدن ہزار کے دل سے اتر گیا

ش ۲ ۔۵ ہے باغ باغ، باغ میں کلچیں کھلے ہیں گل ∴ چاروں طرف بہار ہے اور ابر کی ہوا

یہ دونوں شعر غالبًا نسخہ نمبر ۱۳، نمبر ۱۵ سے لیے گئے ہیں۔ نسخہ نمبر ۳ میں صرف ایک شعر یعنی پہلے شعر کا پہلا اور دوسرے شعر کا دوسرا مصرع موجود ہے۔ ص ۱۶۶۔ ش ۱ ع قمری نے یوں کہا ترے کاکل کو دیکھ کر۔ قول حلال، کاکل، صلصل مؤنث آتے ہیں (مغید ص ۵۲)

قصیدہ نمبر ۱۰ یہ قصیدہ بھی صرف نسخہ نمبر ۳، نمبر ۱۳، نمبر ۱۵ میں ہی موجود، چنانچہ اتنا ہی مشتبہ جتنا قصیدہ نمبر ۵ یا نمبر ۹۔ یہ قصیدہ کلیاتِ ممنون میں شامل۔

۳۵۔ ص ۱۷۲۔ ش ۸ ۔۵ شتاب مرغِ غزلخواں تو مدح کو پڑھ کہ کیا ہے مسندِ دولت پہ شاہ گل نے جلوس

پہلے مصرع کا کلمہ "کہ" پرختم ہونا محلِ نظر ہے۔ دلّی میں انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں مولوی کریم الدین "پڑھ" کو "پڈھ" لکھتے رہے ہیں۔ اس شعر میں "پڑھ" ہونا بھی غور طلب ہے۔

۳۶۔ ص ۱۷۳۔ ش ۱ ۔۵ سیاہ بخت ہو اور پایمال خاک نشیں جہاں میں سایہ صفت تیرا حاسدِ منحوس

ش ۷ ۔۵ ہمیشہ دوست ہوں شودا برنگِ گل خنداں بسانِ خار ہو پامال حاسدِ منحوس

ظاہراً پہلا شعر دوسرے کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ شاعر نے کوئی ایک ہی شعر کہا ہوگا۔

قصیدہ نمبر ۱۱ ۳۷۔ اسی کے عدل میں ہے یہ کہ چیونٹے کے حضور محال کیا ہے کہ دم مارے اژدرِ خونخوار

"چیونٹے" کے مقابلے میں "چیونٹی" بہتر۔ یہی ذیل کے مصرع میں بھی ہے ع ترے دیار کی چیونٹی کے زور سے شاہا

۳۸۔ ص ۱۸۰۔ ش ۲/۷ ع گریں جو اُن پہ ترے آتشِ غضب کے شرار، آتش مونث ہے "تری آتش" چاہیے۔

قصیدہ نمبر ۱۲۔ ۳۹۔ ص ۱۸۲۔ ش ۱/۱ ع قسم ہے تجھ سے کیے جائیں جہاں تک نالے "تک" ناموزوں۔ "تلک" چاہیے۔ ۴۰۔ ش ۲/۱۲ ع فلک سے آئی زمیں پر یہ نظر استمداد۔ نسخہ نمبر ۱۵ میں "بطرز استمداد" اور یہی موزوں

۴۱۔ ص ۱۸۲۔ ش ۲/۱ ع جو صبر آئے تو پھر یہاں کہاں شکیبائی نیہاں" ناموزوں "یہاں" چاہیے۔

۴۲۔ ذیل کے شعر میں اپنے شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں جانے کو مستحسن بتایا ہے۔

جو منقبت کہے اس کی جناب عالی کی اور اپنے شہر کے تیں چھوڑ جائے اور بلاد

اور خاتمہ کے قریب ایک شعر میں کہا ہے ؎

وطن کے اپنے سب اخلاص مند دور کیے نہ آدم اب تو رہا ہے یہاں نہ آدم زاد

ان شعروں سے شاید قصیدے کے زمانے اور مقام تصنیف کے تعین میں مدد مل سکے۔ ۴۳۔ ص ۱۸۶۔ ش ۲/۴
ع فلک کے سقف تلے آہ کے ستون استاد۔ جلال کہتے ہیں کہ "سقف مونث ہے" (مفید ص ۴۴) فلک کی سقف چاہیے۔
۴۴۔ ص ۱۹۶۔ ش ۱۱ ؎ ترے قدم کی برکت سے خوش قدوں میں یہ عین ناز کی رفتار میں نعم کی طرح
ناز کی تو میر کے ایک شعر میں موجود ہے لیکن برکت (بہ تشدید کاف) دیکھنے میں نہیں آیا۔

قصیدہ ۱۶/۱ ۴۵۔ حسب معمول عنوان کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ سودا کے متداول قصیدوں میں شاید
یہی ایک ہے جس میں قدسی کا ایک شعر اس طرح تضمین ہوا ہے ؎

کدھر کو جاؤں کہ تادل مرا کرے واشد وہیں خیال میں قدسی کا یہ سخن گذرا
دمے بہ بزم حریفاں شگفتہ سو چوں قدح کہ جاں برائے تو دارد در آستیں مینا

سودا کے قدسی سے متاثر ہونے کا ذکر آب حیات میں بھی موجود ہے ص ۱۶۴
۴۶۔ ۲۱۱ ش ۲/۱ ع ترے دیار کے چیونٹے کی حدِ استغنا۔ سلیمان کی نسبت سے "چیونٹی" چاہیے۔
۴۷۔ ش ۵/۴ ع جو کچھ لکھا نہ ہو تقدیر میں اگر اس کے۔ تقدیر مونث ہے۔ مصرع میں "اس کی" چاہیے۔

قصیدہ ۱۷ کا عنوان کا معاملہ وہی ہے ـــــ اس کے طویل عنوان میں یہ کلمات بھی شامل: "کنایۂ وطعن
بر شاعر فاخر مکین و اکسیر استادِ او" اس سلسلے میں افسر الدولہ فیاض الدین حیدر کا مضمون "معارضۂ سودا و مکین پر کچھ نئی روشنی"
(معاصر پٹنہ حصہ ۱۹) دیکھنا چاہیے۔ سودا اور مکین کے مابین مراسم ۱۱۸۸/۷۷-۱۷۷۴ء کے قریب قائم ہوئے۔ سودا نے
ان سے اصلاح کی خواہش بھی کی لیکن مکین نے بے نیازی سے کام لیا۔ تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ ان معاملوں کی طرف
سودا کے ایک طویل قطعہ میں اشارہ ملتا ہے جو غزل کی ہیئت میں ہے اور مطبوعہ کلیاتِ سودا میں شامل ہے۔ اس
کے چند شعر نقل کیے جا چکے ہیں۔ تین مزید شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں جن میں مکین نے سودا سے خطاب کیا ہے ؎

کوئی زباں ہو لازم ہے خوبی مضموں زبانِ فرس پہ کچھ منحصر سخن تو نہیں
اگر فہیم ہے تو چشم دل سے کر تو نظر زباں کا مرتبہ سعدی سے لیکے تا بہ حزیں
کہاں تک ان کی زباں کو درست بولیگا زبان اپنی میں تو باندھ معنی رنگیں

(کالجو الہ معاصر حصہ ۱۹ ص ۶۸)

معلوم نہیں مرتب نے اسے قصائدِ سودا میں کیوں شریک نہیں کیا۔

شجاع الدولہ نے ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی تھی۔ یکین سے سودا کا بگاڑ عہد آصف الدولہ میں ہوا تھا۔ یہ قصیدہ بھی اسی زمانے کا ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ سودا نے اس میں اما ایسے وقت میں سے کسی کی پشت پناہی حاصل کرنے کے بجائے "امام ثامن" سے کیوں رجوع کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس وقت سودا بے روزگاری سے دوچار رہے ہوں۔ قصیدے میں براہِ راست مرزا فاخر مکین کا کہیں نام نہیں لیا ہے۔ مطلع میں ضرور صنعت ایہام کا سہارا لے کر مکین کے استاد اکسیر پر لطیف طنز کیا ہے ؎

مستغنی ذاتی نہ ہوس کی ہو تسخیر　　　معدن ہے جہاں سونے کا داں خاک ہے اکسیر

تلامذہ کی مختلف حرکتوں کی بعد استاد کا نام لیے ہوئے خوب مذمت کی ہے۔ اُس میں اِس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ انھوں نے سودا کے کسی شعر پر سرقہ کا الزام لگایا تھا ؎

پھر کہتے ہیں یوں ہے کسی استاد کا یہ شعر　　　سرقہ یہ کیا جس نے بڑا ہے کوئی لے پیر

سرقہ کونہ سمجھیں۔ توارد کو گر اں سے　　　پوچھے جو کوئی کیا ہیں یہ دونوں، کرو تقریر

پھر بعد تامل یہ جواب اس کے یہ دی ہوش　　　رو بہ کہیں سرقہ کو، توارد کو کہیں شیر

اس بحث سے گماں ہوتا ہے کہ جس چیز کو سودا توارد کہنا چاہتے ہیں فاخر مکین کے تلامذہ اسے سرقہ کہہ رہے تھے یعنی ان کا الزام پوری طرح بے بنیاد نہیں تھا۔ ۴۹۔ قصیدے کے متن میں بعض مصرعے ناموروں ہیں مثلاً ص ۲۱۴ ش ۲ مصرع ______ نادانی سے کب کرتے اپنے تئیں تشہیر "کرتے" کے بعد "ہیں" ہو تو مصرع موزوں ہوگا۔ ۵۰۔ تذکیر و تانیث کا فرق تو کئی جگہ ہے جیسے ص ۲۱۰ ش ۸/۱ مصرع کہ اس کی عوض مدح تہہ بہ دو جہاں کی۔ ۵۱۔ ص ۲۱۹ ش ۸/۲ مصرع کیا میں ہوں میری کیا ہے قلم کیا مری تحریر۔ لیکن اسی قصائد سودا میں ایک سے زیادہ مقاموں پر قلم کو مذکر بھی لکھا ہے۔ اسی قصیدے میں ص ۲۱۴ پر ش ۵/۱ ہے مصرع یوں صفحہ پہ بولے ہے صریر اس کے قلم کی۔ حالاں کہتے ہیں "عربی میں جو خامہ کے معنی پر ہے مذکر آتا ہے" (مصدر ص ۵۷) اور ذوق دہلوی نے بھی کہا ہے مصرع الف الحمد کا ساں گر آگو با قلم میرا چنانچہ اوّل الذکر مصرع میں بھی اس کا بہ تانیث نظم ہونا غلط ہے نسخہ ۳ اور ۱۰ میں "مرا کیا ہے قلم" اور یہی درست۔ ۵۲۔ ص ۲۱۸ ش ۱/۲ مصرع جوں مردمکِ چشم میں چھوٹے کے بڑے گل اس میں بھی چھوٹی چاہیے۔ ۵۳۔ ص ۲۱۸ ش ۵

جس دشت میں ناچے اہل حرم نزاک بار　　　ہے سے ادنیٰ آن سے دھوکے یہ کھو شیر

دوسرے مصرع میں "دھوکے" سے پتہ چلتا ہے کہ اوّل نسخہ ۱۰ میں ۸ پتہ ہے۔

قصیدہ نمبر ۱۸ یہ قصیدہ صرف نسخہ نمبر ۱۵ میں ہے۔ کسی دوسرے نسخہ میں نہیں ہے البتہ ممنون کے کلیات میں موجود ہے۔ اس کا تصنیف کردۂ ممنون ہونا زیادہ قرینِ قیاس۔ ۵۴۔ ۲۲۰ ش ۳/۱ ع ویران بنا ہے ہستی کو رکھتا ہے خوب کام "بنا ہے ہستی" صحیح نہیں "بنائے ہستی" چاہیے۔ ۵۵۔ ۲۲۲ ش ۴/۲ ع تیغ بلا میں ڈوبے عدو تا سر آب میں "تیغ بر ہر چیز برندہ اطلاق کنند" (غیاث ص ۱۱۱) تیغ میں ڈوبنے کی بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

قصیدہ نمبر ۲۰ ص ۲۲۵ ش ۴/۳ ع صیقل اس آئینہ کی گرد شکست کر رنگ ہے "شکست" کے نیچے اضافت ہو اور "کہ" محذوف تو مصرع موزوں ہوگا۔ ۵۶ ص ۲۲۶ ش ۱/۱۲ ع مانگ لے جو مانگتا ہے تو صلہ اس کا کہ یہاں "یہاں" ناموزوں "یہاں" ہو تو موزوں ہوگا اور یہی عہدِ سودا کا مروّجہ تلفّظ ہے۔ نسخہ نمبر ۱، نمبر ۲، نمبر ۹، نمبر ۱۵ میں "کہ" محذوف ہے۔ اوّل الذکر دو بیسویں صدی کے مجموعہ اور ثانی الذکر دو بعد کے لکھے ہوئے مخطوطے ہیں۔ ان میں مصرع کو موزوں کرنے کے لیے "کہ" کو حذف کر دیا گیا ہوگا۔ ۵۷۔ ص ۲۲۷ ش ۱/۱۲ ع منہ پہ تیغ برق دم الماس پیکر کے ترے۔ تیغ مونث ہے۔ "پیکر کے تری" چاہیے۔ ۵۸۔ ص ۲۲۸ ش ۱/۵ ع گرد جولانگاہ کا اس کے کہوں میں کیا دماغ گرد اور جولانگاہ دونوں مونث ہیں۔ "اس کی" ہونا چاہیے۔

قصیدہ نمبر ۲۱ اس کے عنوان کا بھی وہی حال ہے۔ یہ قصیدہ نسخہ نمبر ۱۶ میں ہے یعنی ۱۱۷۴ھ/۶۱-۱۷۶۰ء سے پہلے لکھا گیا تھا۔ اس کی زبان بھی قدیمانہ ہے لیکن مرتب نے بعد اس کا خیال کیے ہوئے نسبتاً بعد کے نسخوں کی مدد سے اس کے متن کا تعین کیا ہے جو اصل سے مطابقت نہیں رکھتا مثلاً ۵۹۔ ص ۲۳۱۔ ش ۵ ؎

اس خاکداں پہ ہو نہ اگر اس کا بار حلم　　　اہلِ جہاں کے آئے سر اوپر عجب وبال

نسخہ نمبر ۱۶ کے مطابق اس کا متن اس طرح تھا ؎

اس خاکداں اوپر جو نہ ہوا اس کا بار حلم　　　اہلِ جہاں کے آئے عجب سر اوپر وبال

یہی متن نسخہ نمبر ۲، نمبر ۸، نمبر ۱۳ میں بھی ہے۔ ۶۰۔ ص ۲۳۱ ش ۱۱ ؎

جس دن سے اس کے عہد نے جگ کو دیا شرف　　　تب سے شراب پر ہے خموں بیچ یہ وبال

دوسرے مصرعے کا متن اس طرح ہے ع ہر خم کے بیچ تب سے ہے یہ وبال نسخہ نمبر ۱۶ کے علاوہ نمبر ۲، نمبر ۵، نمبر ۸، نمبر ۱۵ میں بھی یہی ہے۔

۶۱۔ ص ۲۳۲ ش ۲ ؎　　سرعت اس کے ساتھ یہ دعوائے ہمسری　　　لاگے جو دوڑنے نگہ دیدۂ غزال

نسخہ نمبر ۵، نمبر ۸، نمبر ۵، نمبر ۱۶ میں شعر کا متن اس طرح ہے ؎

سرعت میں اس کی راہ سنی کر کے ہمسری　　　ساتھ اس کے دوڑے گر نگہِ دیدۂ غزال

غور کریں تو یہی متن بہ لحاظِ معنی اور بیان بھی بہتر ہے۔ نسخہ ۱۶ سے انحراف اسی صورت میں مناسب تھا جب اس میں واضح طور پر غلطی یا اشتباہ کی صورت معلوم ہو۔ بصورتِ دیگر جدید نسخوں کے مندرجات کے مطابق متن کو تبدیل کر لینا تصرف کی ذیل میں آتا ہے۔ اس قصیدے کے متن کا بطورِ مجموعی یہی معاملہ ہے۔

قصیدہ ۲۲ - ۶۲۔ عنوان کا یہاں بھی وہی حال ہے۔ اس کے عنوان میں یہ الفاظ شامل ہیں: "طعن بر شاعر کہ ایراد بر شعر میرزا گرفتہ بود"۔ ظاہراً یہ قصیدہ بھی انہیں حالات میں لکھا گیا تھا جن میں قصیدہ ۲۱ لکھا گیا تھا۔ دونوں کے مطالب میں بڑی یکسانی ہے۔ اس میں شاعر نے صریحاً کہا ہے کہ ؎

میں نے سنا کہ تجھ کو مرے ایک شعر پر	دزدی کا اپنے معنی کے ہے وہم مہرباں
شاید یہ اتفاق توارد ہو پر مجھے	لفظوں کا اپنے غم کہ ہوئے کس پہ رائیگاں

پہلے قصیدے میں تلامذہ پر لعن طعن کی تھی اور اس قصیدے میں براہ راست اس شخص سے خطاب ہے جس کے شعر کے سرقہ کا مرزا پر الزام لگایا گیا ہے۔ بظاہر وہ مرزا فاخر مکین ہی ہیں۔ دونوں قصیدے نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھے گئے تھے اور اس وقت بہ گمانِ غالب سودا کو کسی موقر امیر کی پشت پناہی حاصل نہیں تھی اسی لیے انھوں نے ائمہ سے استعانت چاہی ہے۔ ۶۳۔ قصیدے کے متن میں بے احتیاطی کی وجہ سے بعض مصرعے ناموزوں ہو گئے ہیں مثلاً: ص ۲۳۵ ش ۲/۱ ع گر یہاں کہے تو ریختہ ایراں میں فارسی "یہاں" ناموزوں ہے "یہاں" چاہیے۔ ۶۴۔ ص ۲۳۶۔ ش ۲/۱۱ — ع دیواں کا ہر ورق ہے یہ مرا بہ ز بوستاں۔ مصرع کو اس طرح لکھیں تو موزوں ہوگا ع دیواں کا ہر ورق ہے مرا، بہ ز بوستان —— اور یہی نسخہ ۳، ۱۰ میں ہے۔ ۶۵۔ تذکیر و تانیث کا فرق بھی کئی شعروں میں ہے جیسے ص ۲۳۵ ش ۲/۱ ع دزدی کا اپنے معنی کے ہے وہم مہرباں۔ دزدی مونث ہے۔ "معنی کی ہے" ہونا چاہیے۔ ۶۶۔ ص ۲۳۵ ش ۲/۱ طبعِ شریف پر جو نہ آوے ترے گراں۔ طبع مونث ہے۔ "آوے تری" چاہیے۔ ۶۷۔ ص ۲۳۵ ش ۱/۱ ع زنہار ہمسری کا مرے تو نہ کر خیال۔ ہمسری مونث ہے "مری" ہوگا۔ ۶۸۔ ص ۲۳۸ ش ۲/۱ ع ہیبت سے تیرے عدل کے شاہا یہ زیرِ چرخ ہیبت مونث ہے۔ "تیرے عدل کی" ہونا چاہیے۔

قصیدہ ۲۳ - ۶۹۔ نمبر شمار ۲۶ لکھا ہے۔ صحیح ۲۳ ہے۔ ممدوح کا نام مختلف نسخوں میں مختلف ہے۔ اس کا تعین اس طرح ہوتا ہے: ص ۲۴۱ ش ۸ ؎

بخشی جو تجھ کو حق نے جوانی میں سلطنت	شب زمانہ کو یہ ہوئی خواہشِ شباب

ممدوح کا شباب ہے اور اسے ابھی سلطنت ملی ہے۔ وہ بجز شاہ عالم ثانی کے کوئی نہیں ہے۔ نسخہ ۳ میں ممدوح کا نام نواب

آصف الدولہ بہادر" ۱۹ میں عالمگیر ثانی اور قصائدِ سودا میں بطور عنوان "قصیدہ در مدح محمد شاہ عالم بہادر بادشاہ غازی"
(قصائد سودا ص ۲۴۰) لکھا ہے۔ یہ سب غلط ہیں۔ شاہ عالم کا لقب محمد شاہ عالم نہیں تھا۔ مجمع الانتخاب یا کسی اور کتاب
میں اگر ایسا ہے تو غلط ہے۔ ۱۰) ۔ بعض شعروں کا متن محلِ نظر ہے جیسے

قطرہ تجھ ابرِ فیض سے پہنچے جو سوئے بحر   حاوے رگڑنے چرخ کو موجِ دُرِ خوشِ آب

اول تو لفظ پہنچے کا یہ تلفظ عہدِ سودا میں رائج نہیں تھا۔ ثانیاً "رگڑنے" بے محل ہے۔ نسخہ ۸ میں "اکڑتی" ہے وہی بہتر ہے۔
۱) ۔ ص ۲ ع۔ در دستِ محتسب کوی' تاپائے احتساب "تا" کی مناسبت سے "از دست" بہتر ہے اور نسخہ ۹ کے علاوہ
تمام نسخوں میں یہی ہے۔ ۲) ۔ تذکیر و تانیث کا فرق اس قصیدے کے بعض شعروں میں بھی ہے مثلاً
ص ۲۴۰ ش ۵ ع: دریا کو سیرِ کشتی سے تیرے ہو یہ شرف   ۔ سیر مونث ہے "تیری" چاہیے۔

قصیدہ ۲۴ ۳) ۔ شمارہ ۲۲ چھپا ہے۔ صحیح ۲۴ ہے۔ عنوان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں۔ ممدوح
کا ذکر ان شعروں میں ہے ؎

یہ نام پاک کہ کہتے ہیں جس کو عالمگیر   خدا ہمیشہ رکھے زیب و زینتِ افواہ
بجا ہے تجھ کو سلیماں جلال گر کہیے   کہ ہے وزیر کا تیرے خطاب آصف جاہ

عالمگیر ثانی کے اس وزیر کا نام میر شہاب الدین تھا لیکن اِس کے خطابات تاریخ کی عام کتابوں میں وزیر الممالک نواب
غازی الدین عماد الملک لکھے ہیں۔ ان میں غازی الدین خان اس کا موروثی خطاب تھا۔ ممکن ہے کہ آصف جاہ بھی
خطاب موروثی ہو۔ سودا اِن کے ملازم اور متوسّل تھے۔ وہ خطاب کے باب میں غلطی نہیں کر سکتے۔ انھوں نے قصیدہ ۲۱
میں بھی کہا ہے ع: یعنی نواب سلیماں فر دنام آصف جاہ۔ ۴) ۔ ذیل کے شعر سے گمان ہوتا ہے کہ یہ پہلا موقع
تھا جب سودا کی رسائی شاہی دربار میں ہوئی تھی ؎

تجھ آستاں پہ وہ لے اب مدد سے طالع کے   ہوا ہے آن کے حاضر یہ بندۂ درگاہ

طالع مونث ہے۔ پہلے مصرع میں "طالع کی" چاہیے۔ ۵) ۔ یہ قصیدہ نسخہ ۱۶ میں مندرج ہے۔ مرتب نے بعض
جگہ نامناسب طور پر اس کے اندراج کو نظر انداز کیا ہے مثلاً ص ۲۴۴ ۔ ش ۵ ؎

امیدِ عفو ترا (کذا) گر نہ بیچ ضامن ہو   کوئی نہ کر سکے ہرگز کسی طرح کا گناہ

پہلے مصرع میں "کذا" لکھنے سے ظاہر ہے کہ متن کی اس صورت سے مرتب مطمئن نہیں۔ نسخہ ۱۶ میں یہ مصرع اس طرح ہے
؎ امیدِ عفو ترا تا نہ بیچ ضامن ہو۔ اور یہی نسخہ ۳، ۶، ۹، ۱۹ میں بھی اور بہتر بھی ۶) ۔ تذکیر و تانیث کا فرق حسبِ معمول

اس قصیدے کے مصرعوں میں بھی ہے مثلاً ص ۲۴۴ ش ۱/۲ ع جہاں پناہ ترے درگہ عدالت میں۔ درگہ مونث ہے "تری درگہ" ہو۔ ۷۔ ص ۲۴۳ ش ۱/۲ ع کرے جب آنے کا تو عزم پشت پر اس کے۔ پشت مونث ہے۔ "پشت پر اس کی" چاہیے۔

قصیدہ نمبر ۲۵-۸۔ نسخہ نمبر ۳ میں "در تعریف باغ فتح جنگ اور نمبر ۱۳ میں در مدح باغ نواب فتح جنگ خاں۔ دونوں نسخے جیسا کہ قصیدوں کے گذشتہ جائزہ سے بھی ظاہر ہے اکثر اعتبار سے یکساں۔ نسخہ نمبر ۸ میں اس قصیدہ کا عنوان "در مدح نواب عماد الملک فتح جنگ بہادر" لیکن عماد الملک کا خطاب فتح جنگ کہیں مذکور نہیں۔ قصیدے کا عنوان مرتب نے یہ مقرر کیا ہے: "قصیدہ در مدح بسنت خاں محمد شاہی" اس کا ماخذ کیا ہے معلوم نہیں۔ حاشیے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلع دوم کا عنوان نسخہ نمبر ۱۹ میں "ایضاً در مدح بسنت خاں" ہے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ عنوان اور متن کے معاملے میں مرتب نے نسخہ نمبر ۲ کے مندرجات کو قبول نہیں کیا ہے۔ یہ قصیدہ نسخہ نمبر ۱۶ میں بھی ہے لیکن اس میں عنوان کیا ہے معلوم نہیں۔ قصیدے میں درج ذیل شعر ایسے ہیں جو نسخہ نمبر ۱۶ میں غیر موجود ہیں ص ۲۴۸ ش ۴ ؎

پر تو نہیں کہ نیچے دو پاؤں ہیں مگر　　گوڑے رگڑنے کی ہے سدا جن کو آرزو

یہ نسخہ نمبر ۲، نمبر ۵، نمبر ۸، ۱۳ میں غیر موجود ——— مضمون اور زبان بھی بے میل معلوم ہوتی ہے۔

ص ۲۴۸ ش ۸ ؎　تقصیر عفو کی ہے ترے یا مرا گناہ　　انصاف یہ نہیں مجھے مجرم جو سمجھے تو

ش ۹ ؎　تیرے کرم نے مجھ کو بد آموز کر دیا　　تھی ورنہ معصیت کی کب اس روسیہ کو خو

ش ۱۰ ؎　تیری ہی ذات سے متعلق ہے عفو و جرم　　آنکھوں میں دل میں چشم میں ہر جا ہے تو ہی تو

ش ۱۱ ؎　لیکن غلط یہ حرف کیا بندگی میں عرض　　کس طرح سے محیط سمندر پہ ہو سبو

ص ۲۴۹ ش ۱ ؎　مولا میں سچ کہوں کہ ہوں مجھ سے یہ خطا　　مدت سے دل میں تھی مرے بخشش کی آرزو

ان شعروں میں اگرچہ تقصیر کے لیے عفو کی درخواست ہے لیکن بیان کا انداز ایسا ہے کہ تمام الزام ممدوح کو دیدیا گیا ہے ظاہر ہے کہ یہ انداز پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ یہ اشعار بہ گمان غالب سودا کے قصیدے کے نہیں ہو سکتے۔ یہ سب نسخہ نمبر ۴، نمبر ۶، نمبر ۹، نمبر ۱۰، نمبر ۱۹ میں بھی نہیں ہیں۔ متن میں ان کا شامل کیا جانا مناسب نہیں۔ ۸۔ ذیل کے دو شعر نسخہ نمبر ۲، نمبر ۵، نمبر ۸ نمبر ۱۳ میں نہیں ہیں اور یہ چاروں نسخے اکثر اعتبار سے یکساں ہیں ؎

جب سے ترے قدم سے جدا ہوکے رہ گئے　　نے دیں کی ہے تلاش نہ دنیا کی جستجو

مانند برگ خشک کہ ہو نخل سے جدا　　کرتے پھرے ہیں دشت میں نالے ہر ایک سو

ر درج ذیل شعر کے بعد ہیں اور قطعہ بند ہیں ؎

بعد از سلام شوق یہ کہیو ہمارے دوست کل بوستانِ دل کی تمنا کے رنگ و بو

لیے ان کے حذف کیے جانے سے قصیدے میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ انھیں چاروں نسخوں (۲، ۵، ۸، ۱۳) میں
ل کے سات شعر اور بھی شامل ہیں (حاشیہ ص ۲۴۷) ان کو متن میں داخل کرنا بھی مناسب نہیں۔ خود مرتب نے بھی
ہیں حاشیہ پر جگہ دی ہے گویا انھیں الحاقی تسلیم کیا ہے۔ ممدوح کا ذکر قصیدے میں اس طرح آیا ہے ؎

باہم گلے میں ڈال کے باہیں برنگِ تاک مستی سے وہ چلیں کج و وا کج ہر ایک سو

القصہ حسن کے خوبی نے تاثیر سے کہا جو مدعا ہو باغ سے کر اس کی گفتگو

بولی کہ مدعا تو یہی ہے کہ تا ابد اس میں بسنت خاں بہادر ہو اور تو

نسخہ ۵ میں پہلے شعر کے دوسرے مصرع کی جگہ یہ مصرع لکھا ہے ع نواب فتح جنگ بہادر ہو اور تو۔ اس نسخہ میں تیسرا شعر محذوف ـــ نسخہ ۲، ۵، ۱۳ میں اس کے برخلاف تیسرا شعر اس طرح ہے ؎

بولی یہ مدعا ہے کہ اس جا میں تا ابد نواب فتح جنگ بہادر ہو اور تو

اسی طرح ایک دوسرے شعر میں ممدوح کا نام اس طرح آیا ہے ؎

اڑتا ہے جو بکھیر و تو کہتا ہے اس سے یہ جا دے بسنت خاں بہادر کنے جو تو

دوسرے مصرع کو نسخہ ۲، ۵، ۸، ۱۳ میں اس طرح لکھا ہے ع حاضر ہو فتح جنگ بہادر کنے جو تو۔ یہ سب نسخے بعد کے ہیں اور یکساں طور پر تصرف شدہ کلام ان میں نقل ہوا ہے۔ ان نسخوں کے مندرجات قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ کتابت میں بے احتیاطی کی سبھی صورتیں اس قصیدے کے متن میں بھی موجود ہیں۔ ایک مصرع اس طرح لکھا ہے ع ہووے ازل سے تا ابد ہر چمن کے بیچ۔ اردو میں "بہ ابد" الگ الگ لکھا جائے گا۔

قصیدہ ۲۶- ۷۹ ع تا مہر و ماہ فلک پر یارب رہیں درخشاں۔ ماہ کی جگہ "مہ" چاہیے۔

قصیدہ ۲۷- ۸۰ ص ۲۶۴ ش ۲/۱ ع گر پھینکنے میں نعل سے اس کی جھڑیں شرار شرار اور نعل دونوں مذکر ہیں۔ بد اس کے "درست ہوگا۔ ۸۱- ص ۲۶۲ ش ۲/۱ ع لٹکا رہے تو یلوں کے تئیں کھینچ کر کتار "تو یلوں" میں حرف "ی" پر زبر لگانا مناسب ہے۔ ۸۲- ص ۲۷۲ ش ۲/۱ ع کف نرگس پہ کاسۂ زریں۔ اس کتاب میں دوسرے مقاموں پر کاسہ بھی لکھا ہے۔ ص ۲۴۹ ش ۲/۱ میں ہے ع کاسہ پہ بھی گدا کے یہ وارد کرے ہے سنگ یہ متعین کرنا ضروری تھا کہ عہدِ سودا میں کون سا املا جاری تھا۔ نسخہ ۱۶ سے اس باب میں مدد مل سکتی تھی۔ ۸۳- ص ۲۷۲ ش ۵/۲ ع ـــ

یاد کر تیرے تیغ و خنجر کیں۔ تیغ مذکر نہیں ہے "تیرے تیغ" غلط ۔ ۸۴۔ یہ واقعہ شعبان ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء کا ہے۔ سودا نے بادشاہ کے جلوس کا ذکر اس شعر میں کیا ہے ؎

نہیں ہے معجزِ عیسیٰ سے کم تری تدبیر ۔۔۔ کیا ہے زندہ دوبارہ جہاں میں عالمگیر

معلوم ہوتا ہے کہ سودا پہلے سے عالمگیر ثانی کی ملازمت میں تھے۔ ان کے توسّل سے وہ نئے بادشاہ تک پہنچ گئے۔ عالمگیر کے جلوس کے بعد عماد الملک کو وزارت تفویض ہونے کے موقع پر سودا نے یہ قصیدہ کہا ہوگا۔ اپنے ممدوح کو انھوں نے امیر ابن امیر کہا ہے کہ رہے تو کارکشا اے امیر ابنِ امیر اس کی کیفیت ذیل کے شجرے سے معلوم ہوتی ہے۔

میر شہاب الدین عماد الملک غازی الدین خاں ۔۔۔ ابن امیر الامرا غازی الدین خاں فیروز جنگ

ابن نواب نظام الملک آصف جاہ بہادر ۔۔۔ ابنِ شہاب الدین خاں نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ

ابن عابد خاں قلیچ خاں

قصیدے میں ضمناً سلطان جلال الدین اکبر کی فتوحات کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس طرح ؎

اگرچہ فتح دکن بیچ جا کے اکبر نے ۔۔۔ کیا ہے بھاگ نگر اور قلعہ آسیر

یہ درست ہے کہ اکبر نے ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۱ء میں قلعہ آسیر کو فتح کر لیا تھا لیکن بھاگ نگر کا ذکر محلِ نظر ہے۔ یہ شہر ۱۰۰۲ھ/ ۱۵۹۴ء میں اس نام سے موسوم ہوا تھا اور اس پر اکبر کو قبضہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ قصیدہ میں ضمناً اورنگ زیب عالمگیر کی فتوحات کی طرف بھی اشارہ ہے ؎

عزیمت اسم کی تیرے اگر پڑھے کوئی ۔۔۔ کرے وہ ہند میں بیٹھا ستارے کو تسخیر

قلعہ ستارہ کو اورنگ زیب نے ۱۱۱۱ھ/۱۷۰۰۔۱۶۹۹ء میں فتح کیا تھا اور اس کی بڑی خوشی منائی گئی تھی۔ شاعر نے اس نام کو بطرزِ ایہام نظم کر کے عالمگیر ثانی سے متعلق ایک نیا مضمون پیدا کر دیا ہے۔ ۸۵۔ یہ قصیدہ نسخۂ ۱۶ میں مندرج ہے۔ متن کی تعیین میں اس سے مدد لینی مناسب تھی۔ بعض مصرعے اس کے اس میں بہتر ہیں مثلاً کہ شیر کا بچہ گو سپاہ ہے ہمشیر متن میں اس کو اس طرح لکھا ہے کہ بچہ شیر کا اور گو سفند ہے ہمشیر، مصرع کی پہلی صورت نسخۂ ۱۶ کے علاوہ نسخۂ ۱، ۲، ۶، ۱۸، ۱۹ میں بھی ہے۔ ۸۶۔ متن کی تحریر میں بھی احتیاط کی ضرورت تھی مثال کے طور پر ایک مصرع یہ ہے کہ گماں میں خلق کے آتا ہے دیکھ کر بہ نگاہ "بہ نگاہ" غلط۔ یہ بنگاہ ہے: "بُنگاہ و بُنگہ بالضم جائے رخت واسباب و خانہ و خلیجانہ" (غیاث ص ۷۲)

قصیدہ ۲۱ ۸۷۔ یہ قصیدہ بھی عماد الملک کی مدح میں ہے۔ شمس البیان میں اسے "قصیدۂ سالگرہ" بتایا ہے۔

بات ذیل کے شعروں میں بھی ہے ؎

آج اس شخص کی ہے سالگرہ کی شادی — کہ بہ صورت ہے وہ انسان و بہ سیرت ہے ملک

یعنی نواب سلیماں فرِ نام آصفجاہ — عہد میں جس کے یہ غیور بزرگ و کوچک

حاشیہ یہ قصیدہ ۱۱۶۸ھ/۵۵-۱۷۵۴ء میں یا اس کے بعد (قبل ۱۱۷۱ھ) کہا گیا ہوگا۔ یہ قصیدہ بھی نسخہ ۱۶ میں موجود ہے لیکن اس نسخے کے مندرجات سے اس کے متن کی تعین میں بھی مدد نہیں لی گئی ہے۔ اس نسخے میں ذیل کے شعر نہیں ہیں ؎

چل سکے ہے نہ کسی امر میں تدبیرِ حکیم — مہر سے رائے کی تیری وہ نہ لے تا دستک

یا رتجھ حلم میں ہے یہ کہ ترے وقت خرام — ہووے ذرہ بھی اگر مرکزِ خاکی پہ دھمک

دستِ دوراں سے موالید کا سر رشتۂ کار — نعرۂ قہر کی ہیبت سے ترے جائے ٹھٹک

پیل دنبا نہیں کچھ پیل کو پشہ کا کام — حولِ قوت سے ترے چاہیئے ٹک اس کو کمک

پہلا تیسرا اور چوتھا شعر نسخہ ۳، ۵، ۱۴، ۱۵ میں بھی غیر موجود ہے اور دوسرا نسخہ ۴، ۶، ۱۰، ۱۹ میں نہیں ہے۔ ان کے علاوہ درج ذیل شعر بھی نسخہ ۱۶ کے علاوہ نسخہ ۵، ۸، ۱۴، ۱۵ میں مندرج نہیں ہے ؎

اس قدر ہے وہ سبکرو کہ کبھو چلتے وقت — پاؤں کی اس کے دلِ مور کو پہنچے نہ دھمک

ان شعروں کو متن میں شامل کرنا مناسب نہیں تھا۔ چند شعر دوسرے نسخوں میں کتابت سے رہ گئے ہیں۔ وہ نسخہ ۱۶ میں موجود تھے اس لیے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ۸۸ بے احتیاطی نے بھی بعض شعروں کے متن میں نقص پیدا کیا ہے مثلاً ص ۲۸۱ ش ۴ ع، مدق پا لگے کہنے کہ نہ دیکھا ہوگا۔ یہ قطعہ شعروں کا ایک مصرع ہے جس میں ماضی کا صیغہ (لگی) نظم ہوا ہے۔ اس کی مناسبت "لگی کہنے" چاہیے۔ ۸۹۔ ص ۲۸۱ ش ۱۱ ع بات اس لطف سے بہکی تھی دہن سے اس کے۔ سیاق و سباق کی روشنی میں یہاں "بہکے تھی" ہوگا۔ ۹۰۔ ص ۲۸۷ ش ۲ ع جائے کس در پہ کوئی پہنچ کے ایسے در تک "پہنچ" ناموروں۔ "پھونچ" ہوگا کہ یہی عہدِ سودا کا تلفظ تھا۔

قصیدہ ۳۲-۹۱۔ یہ قصیدہ اگرچہ عماد الملک کی مدح میں ہے نسخہ ۱۶ میں غیر موجود ہے۔ قصیدے میں عماد الملک کو با اختیار اور صاحبِ اقتدار ظاہر کیا گیا ہے اس لیے اس کا نسخۂ مذکور میں نہ ہونا محلِ تعجب ہے۔ مرتب کے بیان کے مطابق یہ صرف نسخہ ۱، ۲، ۳، ۸ میں موجود ہے۔ اوّل الذکر تو مطبوعہ نسخے ہیں۔ ان کی اہمیت کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اتفاق سے جن دو قلمی نسخوں میں یہ مندرج ہے وہ دونوں ایسے ہیں جن میں ایسے قصائد مندرج ہیں جن پر الحاقی ہونے کا شبہ ہے اس لیے تا وقتیکہ کوئی بہتر شہادت نہ مل جائے اسے سودا کا تصنیف کردہ تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ اس قصیدے

میں ش ۵/۴ ناموزوں اور ش۔۱ نسخہ ۳۱ میں غیر موجود ہے۔ قصیدے کے شعروں کی مجموعی تعداد صرف بارہ ہے۔ یہ تعداد بھی اس کے قصیدہ تسلیم کیے جانے میں تامل کا سبب ہے۔

قصیدہ ۵ ص ۲۴۳ نسخہ ع ۳۲ میں اس کا عنوان ”در تعریفِ خانِ ذیشان قدر دان سوا خان مہربان خان بہادر“ اور نسخہ ع ۱، ۱۲ میں ”در لطایف فنِ شعر و طعنِ شاعری“ یہ اُن گنے چُنے قصیدوں میں سے ہے جن کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ عنوان کہاں سے لیا گیا ہے۔ اس کا عنوان نسخہ ع ۱۸ سے ماخوذ ہے۔ اس عنوان میں کلماتِ ”در حقِ جہلا و ہجو فدوی“ شامل ہیں لیکن خود قصیدے کے متن میں فدوی کا نام نہیں آیا ہے۔ محمد ولی اللہ فرخ آبادی نے فدوی کے بارے میں لکھا ہے :

فدوی شاعر مشہور، در عہد نواب احمد خاں بہ فرخ آباد آمدہ با میرزا رفیع سودا در مہاجات مطارحات نمودہ (تاریخ فرخ آباد) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سودا وہاں پہلے سے موجود تھے۔ فدوی بعد میں پہنچا اور ہجوگوئی کا سلسلہ شروع ہوا۔ نوبت گالی گلوچ تک پہنچی چنانچہ سعادت خاں ناصر نے ایک مخمس کا بند نقل کیا ہے جس کا مصرعِ آخر یہ ہے —
ع کہ فدوی جگ میں کہاتا ہے اُلّو پٹھے کا۔ فدوی نے یہ سُن کر سودا سے کہا ”اللہ مبارک کرے“۔ (خوش معرکہ ج ۱ ص ۱۲۶)
اس بارے میں عرض یہ ہے کہ اُلّو کا پٹھا تو سنا تھا۔ یہ ”پٹھے کا اُلّو“ سودا کا ایجاد ہے۔

جہاں گالی گلوچ تک نوبت پہنچی ہو، وہاں نام بھی نہ لینا اور اپنی بات کو محض اشاروں میں کہنا دو وجہوں سے ممکن ہے : ۱۔ نواب مہربان خاں کا احترام ملحوظ رہا ہو اور ۲۔ فدوی سے بہت زیادہ بے تکلفی یا بگاڑ کی صورت نہ ہوئی ہو۔ دوسری صورت میں یہ قصیدہ فدوی کے فرخ آباد پہنچنے کے کچھ ہی مدت بعد کا کہا ہوا ہوگا۔

قصیدہ ۲ ۱/۲ - ۹۲۔ اس قصیدے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ سعادت خاں ناصر نے سودا کے اودھ میں پہنچنے کے بارے میں لکھا ہے کہ سودا جب فرخ آباد پہنچے تو شجاع الدولہ نے شقۂ خاص لکھ کر ان کو لکھ کر طلب کیا مگر یہ نہ گئے۔ آخر احمد خاں بنگش کی وفات (۱۱۸۴ھ / ۱۷۷۰ء) کے بعد مجبور ہو کر وہاں جانا پڑا۔ شجاع الدولہ گراں خاطر تھے لیکن بالآخر مَن گئے۔ اس قصیدے میں سودا نے خود کو ”پیر غلام“ کہا ہے ؎

مطلب اس سے یہ جو سودا ہے ترا پیرِ غلام — اور کیا ہو سکے جُز یہ کہ دُعا بعدِ نماز

اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں اول یہ کہ اس وقت سودا بوڑھے ہو چکے تھے۔ دوسرا یہ نماز پڑھتے تھے تو اسے انھوں نے بہت انکساری سے عرض کیا کہ ؎

غرض اس مدح سے تو یہ نہ سمجھیو ممدوح — کہ طمع پر تری مدّاح کی ہو عرضِ نیاز
خلعت و اسپ گہر تیرے نہ اگے کچھ چیز — نہ وہ ہیں اس لیے تجھ پاس کروں دست دراز
ہے تصدّق جو مقرّر مری خاطر اُس میں — نمکین شیریں کو ہے ذائقے سے میرے ساز

بہرِ پوشش مجھے ملتا ہے وہ جامہ جس کا　　دامنِ آلودگیِ حرص سے رہتا ہے باز

مجھ کو کچھ کام نہیں تو مجھے جوں چاہے سو رکھ　　میں ہوں بندہ ترا اور تو ہے مرا بندہ نواز

یہ انکساری غالباً اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ابھی شاعر ملازمت کا خواہاں ہے اور اس کے لیے کوئی چیز مقرر نہیں ہوئی ہے۔ وہ نواب کی خدمت میں بے تکلف بھی نہیں ہے۔ ذیل کے شعر سے بھی مذکورہ خیال کی تائید ہوئی ہے ؎

عدل جس کا یہ ہو، لازم ہے کہ اب اس کے حضور　　جا دوں اس مطلعِ ثانی کے تئیں کرنے کو نیاز

۹۳۔ اس قصیدے کے متن میں بھی بے احتیاطی کی وجہ سے بعض مصرعے نادرست ہیں مثلاً ص ۲۹۶ ش ۲/۱ ع
شاخ تک پا نہ پڑے نخل کے بادست دراز۔ شاخ مونث ہے "نخل کی" چاہیے۔

قصیدہ نمبر ۳۵- ۹۴۔ عنوان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں البتہ ش ۱۲ اس امر کا مؤید کہ یہ قصیدہ شجاع الدولہ کی مدح میں ہیں۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اسے "در مدحِ احمد خاں بنگش" کہتے ہیں۔ (لکھنؤ کا دبستان ص ۷۷۹) شیرانی نے لکھا ہے: "کلیاتِ سودا میں نواب احمد خاں بنگش کی تعریف میں مجھے کوئی قصیدہ نہیں ملا۔ مولانا (آزاد) کو ممکن ہے احمد علی خاں (سیف الدولہ) کے نام پر بنگش کا دھوکا ہو گیا ہو۔" (مقالاتِ شیرانی ج ۳ ص ۹۹) اس مجموعے میں بھی کوئی قصیدہ بنگش کی مدح میں نہیں ہے اور یہ بات تعجب کی ہے۔[1] ۹۰۔ اس قصیدے کے متن میں بھی احتیاط نہیں کی گئی۔ لفظوں کا املا جدید تلفظ کے مطابق کیا ہے، ذیل کا مصرع بھی توجہ طلب ہے ع کہ بہ از مطلع الانوار کیا جائے خیال۔ نسخہ نمبر ۳، ۱۳ کے علاوہ تمام نسخوں میں یہ اس طرح ہے ع کہ از مطلع الانوار کیا جائے خیال۔

قصیدہ نمبر ۳۶ - ۹۶۔ عنوان کا معاملہ وہی۔ شاعر نے ممدوح کا نام اس طرح بتایا ہے ؎

ان بیتوں کے حرفِ سرِ مصرع پہ نظر کر　　جو اسم شریف اس کے سمجھ کلبِ آہنگ

اس کے بعد ش ۱۳ سے ش ۲۰ تک صنعتِ توشیح میں نام "شجاع الدولہ بہادر" نظم کیا ہے۔ ش ۹ بھی اسی کا مؤید ہے ؎

دنیا میں توقع نہیں انساں کو کسو سے　　چھٹ اس کے، وزیر اب ہے جسے ہند کا اورنگ

اس زمانے میں شجاع الدولہ ہی "وزیر الممالک" تھے۔ شعر ۱۲ سے متعلق مرتب نے یہ حاشیہ لکھا ہے: ۹۷۔ "نسخہ نمبر ۸ میں قصیدہ یہاں ختم ہو گیا۔ باقی اشعار کچھ اضافہ کے ساتھ دوسرے ممدوح کے لیے۔ دیکھیے اسی زمین کا دوسرا قصیدہ" لیکن یہ دوسرا قصیدہ الگ کہیں نہیں لکھا ہے اور نہ ممدوح کا نام لکھا ہے۔ صفحہ ۱۹ پر البتہ یہ بحث ہے کہ اس قصیدے کے کچھ شعروں کو نسخہ نمبر ۸ میں ایک دوسرے قصیدے کی صورت میں لکھا ہے اور اس کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے:
"قصیدہ در مدح نواب معتمد الدولہ ظفر جنگ یعقوب علی خاں" اس میں قباحت یہ ہے کہ مذکورہ شعر نمبر ۲۱ اس طرح ہے ؎

---

[1] کلیات سودا (مطبوعہ ۱۸۷۰ء) میں احمد خاں بنگش سے متعلق چار قطعے موجود ہیں۔ ان میں سب سے طویل قطعہ پانچ شعروں پر مشتمل ہے۔ مرتب کے اصول کے مطابق اسے قصائد سودا میں شامل کیا جا سکتا تھا۔

لکھو وصفِ شجاعت میں قلم مطلعِ ثانی　　　دل مدح سے غائب کی مرا اب ہے بہت تنگ

یہ شعر مزید شعروں کا متقاضی ہے اس لیے قصیدے کو اس پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ایک قصیدے کی اس طور دو قصیدوں کی صورت میں تقسیم کی کسی دوسرے نسخے سے تائید نہیں ہوتی اور نسخہ نمبر ۸ کلامِ سودا کے ان نسخوں میں سے ہے جن میں ممدوح کے نام میں فرق بھی ملتا ہے اس لیے محض اس پر اعتماد کر کے اس ایک قصیدے کو دو میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ قصیدے میں ممدوح کی تلوار، گھوڑے اور اس کی شجاعت ہوا ہے۔ ایک شعر یہ ہے ؎

آہن کا نہیں گر طبہ ہو تو دروازوں پہ اس کے　　　قالب تہی سنتے ہی کریں جتنے ہوں سرہنگ

قصیدہ نمبر ۱۴ یہ قصیدہ از روے عنوان "در مدح حکیم میر محمد کاظم" ہے لیکن نسخہ نمبر ۱۹ میں اسے "مدح نواب شجاع الدولہ" کا ہے۔ قصیدے کے مضامین اول الذکر کے مؤید ہیں غلطی اس وجہ سے ہوئی کہ قصیدے کے آخر میں یہ شعر ہے ؎

اسمِ پاک اس کا ہے نواب شجاع الدولہ　　　منبعِ جود و سخا یعنی وزیرِ اعظم

یہ شعر نسخہ نمبر ۱۹ میں نہیں ہے۔ اس کا قصیدے سے تعلق بھی نہیں ہے۔ قصیدے میں ممدوح کا نام اس طرح نظم ہوا ہے ؎

سو توان باتوں میں ہے حوصلہ طبیبوں میں کسے　　　اس زمانے میں بجز میر محمد کاظم

اس قصیدے میں ایک شعر میں قلم کو مؤنث لکھا ہے۔ ع نامے میں اس کی قلم کے ہے مسیحا کا دم "نامے"، مونث ہے۔ قلم مذکر ہے۔ مصرع اس طرح ہوگا ع نامے میں اس کے قلم کی ہے مسیحا کا دم

قصیدہ نمبر ۱۴ اس قصیدے کے ممدوح کے بارے میں اختلاف نہیں ہے البتہ بے احتیاطی نے کہیں کہیں تذکیر و تانیث میں فرق پیدا کر دیا ہے مثلاً ص ۲۲۶ ش ۳ ع جا سے ہی اترے قلمرو میں قلم رو مونث ہے۔ تری قلمرو چاہیے۔

اس میں درج ذیل تین شعر ایسے جو نسخہ نمبر ۱۸ میں غیر موجود

ص ۲۴۴ ش ۱۱ ے　کون ہے جس کے تازی و کچھی　　　نہ پھڑکتا بہ زیرِ راں ہووے

ش ۱۲ ے　نہیں بر میں کسی کے اب وہ لباس　　　کہ نہ قیمت جو گراں ہووے

ص ۲۴۵ ش ۱۴ ے　لعل و یاقوت کی طرح اس جا　　　آب و آتش کے تن میں جاں ہووے

یہ نہیں معلوم کہ یہ شعر کس نسخے سے لیے گیے ہیں۔

قصیدہ نمبر ۴۳ اس قصیدے میں سودا نے خیر آباد[1] کے عامل کی شکایت کی ہے ؎

جو کچھ کہ میرے تن میں لہو تھا سواب کی سال　　　عامل نے خیر آباد کے پی کر کیا تمام

---

[1] عامل خیر آباد سے شروع میں سودا کے شاید اچھے مراسم تھے۔ کلیات (مطبوعہ نولکشور، ۱۹۳۲ء) میں "قطعہ عامل خیر آباد" کے عنوان سے تین سطر کا قطعہ درج ہے بعد میں کسی وجہ سے سودا اس سے بگڑ گئے تو اب سے اس کی شکایت کی۔

قصیدہ نواب کی خدمت میں اس عامل سے انتقام لینے کیلیے پیش کیا گیا ہے یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ خیر آباد سے سودا کا تعلق کس طور پر تھا۔

قصیدہ نمبر ۴۴ اس قصیدے میں کتابت میں بے احتیاطی کی وجہ سے بعض شعروں میں سقم پیدا ہو گیا ہے مثلاً ص ۳۳۶ شعر ۱/۲ ع۲ پٹ کر جائے دیو دو سے لڑا نظ "دو" نہیں یہ "دَد" ہے۔ یہی ش ۵۴ میں بھی۔ ص ۳۳۶ ش ۱/۲ ع۲ — نہ پر راون کے پھول جائے بسنت "پر" ناموزوں "پہ" چاہیے۔

قصیدہ نمبر ۴۷ یہ قصیدہ سرفراز الدولہ کی مدح میں ہے لیکن نسخہ نمبر ۱۸ میں اسے "نواب شجاع الدولہ بہادر رستم جنگ" سے منسوب کیا گیا ہے ممدوح کا نام قصیدے میں اس طرح ۔

اسی کے عہد مبارک کا ہے مگر یہ سبب ۔۔۔ جس افتخارِ زماں کا حسن رضا خاں نام

زہے وہ خانِ رفیع المکانِ عالی قدر ۔۔۔ زہے وہ خانِ فلک مرتبت ذوی الاکرام

نسخہ نمبر ۱۸ میں پہلے شعر میں "شجاع الدولہ کا نام" اور دوسرا شعر اس طرح ہے ؎

زہے وزیرِ رفیع المکانِ عالی قدر ۔۔۔ زہے خدیوِ فلک مرتبت ذوی الاکرام

"خدیو بضم اول وکسر دال ویائے مجہول بمعنی خداوند، بکسرتین بمعنی بادشاہ و خداوند و بمعنی گفتہ کہ امالۂ لفظ خدائے است" (غیاث ص ۱۵۳) اس کلمہ کا استعمال شجاع الدولہ کے لیے محل نظر ہے بظاہر شعر کی پہلی صورت ہی معتبر ہے۔ صرف مطبوعہ نسخوں میں اس قصیدے میں تین شعر زائد (قصائد سودا، حاشیہ ص ۳۴۴ میں) ان کا مآخذ نہیں معلوم۔ یہ بھی بہ گمان غالب الحاقی۔ نسخہ نمبر ۹ میں دس شعر محذوف (ایضاً حاشیہ ص ۳۴۱) یہ غالباً سہواً۔ اس قصیدے کے مضامین سے مقدمہ کے سلسلے میں بحث کی جا چکی ہے۔ یہاں یہ ادر کہنا ہے کہ بعض لفظوں کی تذکیر و تانیث میں بھی فرق ہے مثلاً ص ۳۴۲ ش ۲/۲۶ ع۲ صدا کھڑکنے کی ہے دیگ کی صلائے عام۔ کھڑکنا مذکر ہے۔ دیگ کے چاہیے۔

قصیدہ نمبر ۴۹ یہ رچرڈ جانسن کی مدح میں قصیدہ ہے۔ اس کے متن میں تذکیر و تانیث کا فرق چند شعروں میں ہے مثلاً ص ۳۴۹ ش ۲/۲ ع۲ اس کی حسد کی تلخی کا اب کیا کروں بیاں۔ حسد مذکر ہے "اس کے حسد چاہیے۔ ص ۳۵۰۔ ش ۷ ع۲ سایہ تلے سپر کے ترے جس کو ہو پناہ۔ سپر اور پناہ دونوں مونث ہیں "سایہ تلے سپر کے تری" ہونا چاہیے ذیل کے مصرع میں کتابت کی غلطی ع۲ خالی جو در سے لے کے چمن سے ہے تا بہ گنگ۔ چمن غلط ہے "چمَن چاہیے۔

قصیدہ نمبر ۵۱ یہ قصیدہ بھی نسخہ نمبر ۱۶ میں موجود ہے۔ اس میں میاں مسکین منصور علی خاں وغیرہ کے نام نظم ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے حالات کی جستجو کریں تو اس قصیدے کی تفہیم میں سہولت ہو گی۔ اس قصیدے کے متن کی بھی نسخہ نمبر ۱۶ کی مدد سے تصحیح کی جانی چاہیے۔

قصیدہ نمبر ۵۲ یہ ہجو دراصل میر ضاحک کی ہے۔ اس کے ش ۱، ۱۶، ۲۱ تا ۲۵ (کل سات شعر) سعادت خاں

ناصر نے نقل کیے ہیں ۔ شعر ۱۲
نہیں وہ ماں کہ جو بیٹی کی نہ ہو اپنی سوت　　نہیں دماد کہ جو ساس سے جاوے نہ اٹک

ناصر نے دوسرا مصرع اس طرح لکھا ہے ع نہیں وہ ساس جو داماد سے جاے نہ اٹک (خوش معرکہ ج ۱ ص) ناصر کا کہنا ہے میر حسن کی التجا پر سودا نے اس ہجو کو مولوی ساجد سے منسوب کر دیا تھا۔ ناصر کے اس بیان کی روشنی میں اس ہجو سے ضاحک کے بارے میں سودا کے خیالوں کا قیاس کیا جانا چاہیے۔

قصیدہ نمبر ۵۴ عنوان کے رو سے یہ شاہ ولی اللہ کی ہجو ہے۔ یہی بات نسخہ نمبر ۹ میں بھی ہے لیکن کسی اور نسخے سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ یہ ہجو نسخہ نمبر ۱۶ میں بھی شامل ہے۔ اس میں اس کا عنوان ہے "در ہجو نیا اصب اخرج" ——— یہی قرین قیاس ہے کیوں کہ عماد الملک کے دور اقتدار میں سودا کے لیے شاہ ولی اللہ اور مولوی ساجد کی ہجو کہنی ممکن نہیں تھی۔ اس ہجو کے متن کی تدوین بھی نسخہ نمبر ۱۶ کی مدد سے کی جانی چاہیے۔ اس میں کچھ شعر ایسے ہیں جو مختلف نسخوں میں درج نہیں ہیں ———

قصیدہ نمبر ۵۵ یہ ہجو صرف نسخہ نمبر ۳، نمبر ۵ میں ہے۔ تاوقتیکہ کسی بہتر ماخذ سے توثیق نہ ہو اس کی سودا کے مستند کلام میں شمار کرنا مناسب نہیں۔ اس کا مضمون نامربوط ہے۔ مذمت شیخ جی کی مقصود ہے لیکن داستان ختم اس شعر پر ہوتی ہے۔

سودا اب تو نے شرابی کی خرابی دیکھا　　چھوڑ شیشہ کے تئیں جام میں افیون کو گھول

ایسی بے ربط نظم کی سودا سے توقع نہیں "خرابی دیکھا" بھی محل نظر ہے۔ یہ بات بھی ثبوت طلب ہے کہ سودا افیون گھولتے تھے۔

قصیدہ نمبر ۹۶ یہ محض پانچ شعر ندرت کی ہجو میں ہیں۔ سعادت خاں ناصر نے سودا کے ذکر میں لکھا ہے:

"شاہ جہاں آباد کہ پایۂ تخت اور اہلِ فضل و کمال سارے زمانے کے وہاں فراہم تھے کوئی اس سے عہدہ برآنہ ہوسکا۔ مولوی ندرت کاشمیری کہ فاضل اور علامۂ عصر تھا اس کے مقابلے میں ایسا شرمندہ ہوا کہ سوائے ترک دہلی کچھ اس سے بن نہ آیا" (خوش معرکہ ج ۱ ص ۴) لیکن محض پانچ شعر پر کسی طرح قصیدہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

قصیدہ نمبر ۵۷ اصولاً یہ بھی قصیدہ کی ذیل میں نہیں آتا۔ کل آٹھ شعر ہیں۔ ان میں سے بھی تین شعر نسخہ نمبر ۱ میں غیر موجود ہیں۔

قصیدہ نمبر ۵۸ یہ صرف چار نسخوں میں مندرج ہے یعنی نمبر ۳، نمبر ۵، نمبر ۱۲، ع۔ اس میں ایک عبدالصمد خاں کا نام آیا ہے۔ ان کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہوسکی۔ اس قصیدہ کا نام شاعر نے "مضحکۂ دہر" مقرر کیا ہے ع سودا نے قصیدہ یہ کہا مضحکۂ دہر۔ اس کا متن نہایت بے احتیاطی سے لکھا گیا ہے جس کے نتیجہ میں مصرعوں میں بے ربطی بھی پیدا ہوگئی ہے اور بعض مصرعے ناموزوں بھی ہیں مثلاً ص ۳۸۱ ش ۲ سہ

خرگوش بغزا نہیں وہ کھاتے ہیں کچھ اور　　پائی تھی غذاؤں سے بھی کچھ اس کی حلاوت

پہلے مصرع میں "ہیں" دوسرے میں "تھی"، یہ عیب ہے۔ ش ۹ ع القصہ سُن اس بات کے تئیں عبدالصمد خاں "کے

تئیں عبدالصمد خاں "ناموزوں"، "کتیں عبدِ صمد خاں" ہونا چاہیے۔ ش ۱۱ ع تیار کرتا ہوں میں اب اس کی بریانی "بریانی" نا بندی
مش ۱۰ ع دوسرے نے کہا سُن کے یہ تشخیص غلط ہے ش ۱۲ ع تیسرے نے کہا ان کو جو یہ دردِ جگر ہے۔ ان مصرعوں میں
دُوسرے اور تیسرے چاہیے۔ ص ۲۸۲ ش ۱۱ ع خادم تھا کھڑا اس کے اوپر شمع سا روتا "شمع ساں" ہونا چاہیے ص ۲۸۴
ش ۹ ع کھاتے نہ اگر عبدالصمد خاں کی ضیافت یہاں بھی عبدِ صمد خاں موزوں ہوگا۔

قصیدہ ۵۹ یہ فارسی زبان میں ہے۔ سودا کے اردو قصائد میں اس ایک فارسی قصیدے کی شمولیت کا کیا جواز ہے، معلوم نہیں۔ اس کے متن میں بھی کئی طرح کے سقم موجود ہیں مثلاً ص ۲۸۵ ش ۶ ع سے بینش کی جامۂ احرام در بر ست یہ "بینش" ہے ش ۷ ع بے آہوے حرم بنظر نوک نشتر است "پے آہوے حرم" چاہیے۔ ش ۱۱ ع زاہد چنا چنا نست تشنہ حرم بقولِ کس۔ یہ مصرع سمجھ میں نہ آسکا۔ چناں غالباً چناں ہوگا۔ ص ۲۸۷ ش ۲ ع جاروب صحن شکل خطوط شعاعی ست: "شعاعی است" ہو تو موزوں ہوگا۔ ص ۲۸۸ س ۴ ع خوش لہجہ طوطیست خطیبش کہ نطق او "طوطی است" لکھیں تو مصرع موزوں ہوگا۔ ش ۵ ع سدرہ صعوبت فردائے محشر ست: "سدرۂ صعوبتِ فردائے محشر است" ہے۔ اس میں سے ایک شعر نسخہ ۱ء ۲ میں اور ایک شعر نسخہ ۳ میں غیر موجود۔

کتاب کے آخر میں قصیدوں میں آئے ہوئے تمام اسما کا اشاریہ بھی شامل کیا جانا چاہیے تھا۔ اس سے قصیدوں کے مطالعہ میں ایک حد تک سہولت کی صورت ہو جاتی۔

مآخذ

۱۔ اردو مخطوطات (جلد اوّل) کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (مرتب) نصیر الدین ہاشمی، مطبع ابراہیمیہ حیدر آباد ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء
۲۔ آبِ حیات، مولانا محمد حسین آزاد یو پی اردو اکادمی پہلا فوٹو آفسیٹ اڈیشن ۱۹۸۲ء
۳۔ انتخابِ گنج شریف۔ سید حاجی محمد نوشہ گنج بخش قادری (مرتب) سید شرافت نوشاہی، دار المورخین لاہور ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء
۴۔ بلیٹن ۲ علی گڈھ تاریخ ادب اردو پروفیسر آل احمد سرور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۸ء
۵۔ تذکرہ نیرنگِ سودا عبدالرفیع اثر کاکوروی لالہ رام نرائن بک سیلرز الہ آباد ۱۹۲۵ء
۶۔ تذکرہ ہندی غلام ہمدانی مصحفی (مرتب) مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۳ء
۷۔ تلخیصِ معلّا کلب حسین خان نادر (مرتب) محمد انصار اللہ لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ ۱۹۷۶ء
۸۔ جائزہ مخطوطات جلد اول مشفق خواجہ مرکزی اُردو بورڈ، لاہور ۱۹۷۹ء
۹۔ خوش معرکۂ زیبا (دو جلد) سعادت خاں ناصر (مرتب) مشفق خواجہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۰/۱۹۷۲ء

۱۰۔ دستور الفصاحت   احمد علی یکتا (مرتب) امتیاز علی عرشی   ہندوستان پریس رامپور   ۱۹۴۳ء

۱۱۔ دیوان ذوق   مؤلفہ مولانا محمد حسین آزاد (علی پرنٹنگ ورکس دہلی   ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۳ء

۱۲۔ سفینۂ ہندی   بھگوان داس ہندی (مرتب) عطا کاکوی   لیبل لیتھو پریس پٹنہ   ۱۹۵۸ء

۱۳۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو (جلد اول)   شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ   ۱۹۶۲ء

۱۴۔ غیاث اللغات   محمد غیاث الدین   مطبع انوار محمدی لکھنؤ (بار سوم) ۱۳۰۸ء

۱۵۔ فہرست مخطوطات اردو (جلد اول) خدا بخش لائبریری پٹنہ   بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ   ۱۹۶۲ء

۱۶۔ قصائد سودا   عتیق احمد صدیقی   سرسید بک ڈپو علی گڑھ   ۱۹۷۶ء

۱۷۔ گلدستۂ نازنیناں   مولوی کریم الدین   مطبع رفاہ عام دہلی   ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء

۱۸۔ گلشن سخن   مردان علی خاں مبتلا (مرتب) سید مسعود حسن رضوی   انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ   ۱۹۶۵ء

۱۹۔ گلشن گفتار   خواجہ خاں حمید (مرتب) سید محمد ایم اے   خورشید پریس حیدرآباد (طبع اول)

۲۰۔ گلشن ہند   میرزا علی لطف (مع گلزار ابراہیم) (مرتب) شبلی و عبدالحق   مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ   ۱۹۳۴ء

۲۱۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری   ابواللیث صدیقی   ادبی دنیا دہلی (پہلی بار)

۲۲۔ لغات کشوری

۲۳۔ مجموعۂ نغز   مولفہ حکیم قدرت اللہ قاسم (مرتب) محمود شیرانی   نیشنل اکاڈمی دہلی   ۱۹۷۳ء

۲۴۔ مخزن نکات   قائم چاندپوری (مرتب) مولوی عبدالحق   انجمن ترقی اردو اورنگ آباد   ۱۹۲۹ء

۲۵۔ مفید الشعرا (رسالہ تذکیر و تانیث) جلال لکھنوی   مطبع مجیدی کانپور   ۱۹۲۲ء

۲۶۔ مقالات شیرانی جلد ۲/۳   حافظ محمود خاں شیرانی (مرتب) مظہر محمود شیرانی   مجلس ترقی ادب لاہور   ۱۹۶۶/ ۱۹۶۹ء

۲۷۔ نادرات شاہی۔ شاہ عالم ثانی (مرتب) امتیاز علی عرشی   ہندوستان پریس رامپور   ۱۹۴۴ء

۲۸۔ نفس اللغۃ (حصہ ا) میر علی اوسط رشک   نیر پریس لکھنؤ   طبع اول   ۱۳۱۹ھ

۲۹۔ نکات الشعرا   محمد تقی میر (مرتب) مولوی عبدالحق   انجمن ترقی اردو اورنگ آباد   ۱۹۳۵ء

۳۰۔ واقعات دار الحکومت دہلی جلد ا   مولوی محمد بشیر الدین احمد   ۱۹۱۹-۲۰ء

رسائل   ۳۱۔ سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ جون ۱۹۵۳ء، جولائی تا ستمبر ۱۹۵۴ء، ۳   ۱۹۶۶ء

۳۲۔ معاصر پٹنہ حصہ ۲، ۱۹۰۲ ۔ ۳۳۔ قومی زبان کراچی مارچ ۱۹۶۷ء

پروفیسر عتیق احمد صدیقی
شعبۂ اردو، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

جواب

میں اس سے قبل لکھ چکا ہوں کہ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھنا چاہتا۔ اور یہی مکرر عرض ہے۔

••

ڈاکٹر محمد انصار اللہ
شعبۂ اردو
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا تحقیقی

مقدمہ تاریخ زبان اردو

کلیۃً تو نہیں ہے لیکن عملاً اور عموماً شہرت اور علم و تحقیق میں بَیر معلوم ہوتا ہے چنانچہ محقق بے بدل قاضی عبد الودود صاحب کو بھی وہ شہرت نصیب نہیں ہو سکی تھی جو علمی اعتبار سے بہت کمتر درجے کے لوگوں کو حاصل ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں بڑے خوش نصیب ہیں۔ ان کا جب بھی خیال آتا ہے، کانوں میں بیرنگ کا یہ شعر گونجنے لگتا ہے

نہیں موقوف اولاد و کمال و خلق و دولت پر بڑی تقدیر ہے دنیا میں جس کو نام ملتا ہے

وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی کے پہلے پروفیسر ایمریٹس ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں علی گڑھ کے تیسرے پی ایچ ڈی ہیں۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "مقدمہ تاریخ زبانِ اردو" کے نام سے چھپا اور نصابوں میں شامل ہو کر اس طرح بِکا کہ باید و شاید گذشتہ سال اس کا ساتواں ایڈیشن چھپا ہے۔ اس کے "پیش لفظ" میں فرمایا ہے: "سرسید بکڈپو نے پانچ ایڈیشن اور شایع کیے جن میں صرف تیسرے ایڈیشن (۱۹۵۸ء) میں تبدیلیاں اور اضافے کیے گئے تھے اب اس ساتویں اشاعت میں ترمیمات کی گئی ہیں۔" یہ ابتدائی بیان بھی صحیح نہیں ہے۔ راقم کے پاس اس کتاب کا ۱۹۷۰ء کا ایڈیشن موجود ہے۔ جس پر یہ اندراج ہے "چہارم بعد اضافہ و نظرِ ثانی" اس چوتھے ایڈیشن میں ہر قسم کی غلطیاں ہیں۔ مثلاً اس نوع کے بے اصل دعوے کیے گئے ہیں کہ "جایسی کی پدماوت اور تلسی داس کی رامائن کو چھوڑ کر اس کا جو بھی قابلِ قدر اور گراں مایہ ادب ہے سب برج بھاشا میں ہے" (ص ۱۵۵)۔ "قدیم اردو میں بیشتر ڈ کی آواز ملتی ہے۔ ڑ کی آواز اٹھارہویں صدی کی ابتدا کا ارتقا ہے" (ص ۱۸۰)۔ اس میں مصرع ناموزوں اور لفظوں کا تلفظ بھی غلط لکھا ہوا ہے۔ راقم نے اپنے مختلف مضامین کے ذریعے ان میں سے بعض اغلاط کی نشاندہی کی تھی چنانچہ ذیل کے دو مضمون قابل ذکر ہیں: "کچھ ڑ کے بارے میں۔ ہماری زبان علی گڑھ ۔ ۸ نومبر ۱۹۷۳ء ۔ اردو کیا ہے؟ ہماری زبان علی گڑھ ۸، ۱۵ دسمبر ۱۹۷۳ء"

ماہنامہ شاعر بمبئی کے معاصر اردو ادب نمبر ۱۹۷۰ء میں راقم نے بعض اغلاط کی نشاندہی کرنے کے بعد یہ عرض کیا تھا کہ "اعلاترین سطحوں پر بھی تعصبات کارفرما نظر آتے ہیں" اور نام لے کر یہ کہا تھا کہ ہمارے "بڑے" عمداً دوسرے کے کاموں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس قسم کے مضامین سے نہ تو کسی شخص کو موزوں طبع بنایا جا سکتا ہے، نہ اس کا تلفظ درست کیا جا سکتا ہے اور نہ ان میں وسعتِ قلب پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ ان سے متوقع

فایدہ حاصل ہوگیا۔ زیرِ تبصرہ کتاب کا پانچواں ایڈیشن چھپ کر آیا تو اس میں کئی غلطیاں درست ہو چکی تھیں۔

تازہ ترین ایڈیشن کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اس میں سے التزاماً پوربی کے شاعروں جایسی، عثمان وغیرہ کے ذکر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ ایک یہ جملہ البتہ باقی رکھا گیا ہے "مشرقی ہندی کی سب سے اہم بولی اودھی کو ہندی ادب میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ اس کے دو مشہور شاعر ملک محمد جایسی اور تلسی داس ہیں جو ہندی ادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں" (ص ۹۴) اور اس طرح اودھی کے سارے سرمایے کو جدید ہندی کی جھولی میں ڈال کر اپنے کام کو آسان بنا لیا گیا ہے۔ اس ایڈیشن میں یورپ کی زبانوں کے اثرات کی نفی کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ جہاں کچھ نہیں بن سکا وہاں بات کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیے ہیں مثلاً خیر المجالس کا وہ اقتباس نقل کیا ہے جس میں یہ جملہ بھی آیا ہے "جو منڈا سا باندھی سو پاین پسری" (ص ۸۲) اس میں شاید کھڑی بولی کا ڈول، پٹ یا کینڈا نظر نہیں آ سکا۔ اس لیے آگے بڑھ گیے۔

راقم نے گذشتہ چند برسوں میں اردو اور پوربی کے تعلق کو تاریخی واقعات اور قدیم متون کے حوالے سے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس قسم کے قیاسی دعووں کی قطعی طور پر تردید کر دی ہے کہ بابا فرید نے اردو کو دلوئی کہا یا شیخ عبدالقدوس نے برج سے مماثل زبان میں شعر کہے تھے وغیرہ۔ ان مقالات نے قیاسی دعووں کی عمارت کو متزلزل کر دیا تھا اس لیے کتاب مذکور کے زیرِ تبصرہ ایڈیشن میں وہ طنطنہ بھی کم ہو گیا ہے۔ چنانچہ چوتھے باب کا عنوان تھا "تنقید۔ لسانیاتی نظریوں کی" اب اس کا عنوان ہے "اردو کی ابتدا۔ لسانی نظریات" اسی طرح پانچویں باب کا عنوان تھا "تشکیل اک نئے لسانی نظریئے کی" اب عنوان یہ ہے "زبان دہلی و پیرامنش"

یہ صورتِ حال خوش آیند ہے۔ کیونکہ اس سے اتنی بات تو ظاہر ہے کہ غلطیوں کا احساس ہو گیا۔ کچھ کی تصحیح ہو گئی باقی کی درستی بھی رفتہ رفتہ ہو جائیگی۔ قطع نظر اس سے کہ اس نئے ایڈیشن میں صفحہ ۸۱ پر خسرو کے جو فارسی اشعار نقل ہوئے ہیں ان میں ایک سے زائد مصرعے ناموزوں ہیں۔ بعض لفظوں کا تلفظ بھی درست نہیں ہے۔ وغیرہ۔ فی الوقت صرف واقعاتی امور سے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہے:

صفحہ ۱۱ "موجودہ بہاری — راجہ، لاجہ" راقم نے پٹنہ میں کسی کی زبان سے لاجہ نہیں سنا، البتہ کالا کو کریا اور بالا کو بارا ضرور سنا ہے یہی تلفظ اودھ میں زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے۔ شیخ احمد عبدالحق ردولوی سے منسوب ایک شعر یہ ہے:

کنوا (کنواں) ہوے تو پاٹوں، سمند کہے (کس کہے) پاٹن جائی
بارا ہوے تو برجوں (جوان) اچھل کہہ (بچے) برجن جائی

صفحہ ۲۱ "پنجاب میں گورکھ پنتھیوں نے اسی زبان کو آزمانا کار بنا یا" گورکھ پنتھیوں کا تعلق عموماً پورب کے علاقے سے ہے محض پنجاب میں پہنچ جانے سے ان کی زبان پنجابی یا بقول مسعود صاحب "شورسینی" نہیں ہو جاتی۔ ص ۳۰ "تنتہ مسلمان آناً فاناً شمالی ہند کو زیر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے" یہ صورت حال تو ۱۱۹۰ تک بھی پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ ص ۳۲ بہار

کی بولی ہنگھی "یہی ملا ہر جگہ ہے۔ لیکن اس بولی کا نام منگھی" ہے۔ "مہاراشٹری اَپ بھرنش۔ اس کا خاص مرکز موجودہ برار تھا۔" علاء الدین خلجی نے جب دیوگڑھ کو فتح کیا تو وہاں کے راجا رام دیو نے برار کا علاقہ اس کے حوالے کر دیا تھا۔ یعنی برار پر پہلے سے یادو راجاؤں کا قبضہ چلا آتا تھا جو اصلاً پورب کے رہنے والے تھے۔ ان کے بعد کڑے کا حاکم علاء الدین قابض ہو گیا اور مسعود صاحب کا کہنا ہے: "جس علاقے کے لوگ حکومت قایم کرنے میں کامیاب ہو جاتے اس علاقے کی بولی آناً فاناً شاہی سرپرستی میں معیاری زبان کی حیثیت سے پھیل جاتی تھی۔" (ص ۴۲) اگر یہ اصول صحیح ہے تو برار کی بولی جو ہو سکتی تھی ظاہر ہے۔ ص ۴۹۔ اودھی: "یہ ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔" میں اسے بہتان سمجھتا ہوں۔ اودھی کی تمام قدیم تصانیف بلا استثنا فارسی خط میں لکھی جاتی رہی ہیں۔ ص ۵۸: "اردو نے اپنے دورانِ ارتقا میں "او" کی شکل کو کبھی اختیار نہیں کیا" خسرو سے منسوب شعروں میں یہ فقرے دیکھے جائیں: 'ہر گاہ بگو ہی دہی لیہو دہی' اور: 'نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں' ص ۷۰: "شمال میں اکبر اور جہانگیر کے عہد سے پہلے کے نمونے زیادہ معتبر نہیں۔ اس لئے صوفیائے کرام کے تبرکات لسانی تجزیے کے لئے غیر اہم قرار پائیں گے۔" اس کے برخلاف وہ چیزیں جن کے بارے میں خود اس بات کے معترف ہیں کہ "جعلی اور بعد کی تصنیف" قرار دی گئی ہیں۔ لسانی تجزیئے کے لئے مفید تسلیم کی گئی ہیں اور ان سے مفید مطلب نتائج برآمد کئے گئے ہیں۔ (دیکھو ص ۴، تا ۷۰) صوفیائے کرام کے تبرکات کے "زیادہ معتبر" نہ ہونے کی کوئی وجہ اس موقع پر نہیں بتائی گئی ہے۔ ص ۸۷: "شہاب الدین غوری دہلی اور اجمیر پر قابض ہو جاتا ہے۔" دہلی پر قبضہ غوری نے نہیں بلکہ ایبک نے کیا تھا اور دہلی کو پایۂ تخت ایبک کے بیٹے آرام شاہ کے عہد کے بعد التمش نے بنایا تھا۔

ص ۸۸: "تغلقوں کے عہد میں دہلی کے بازاروں میں ہریانہ کی آبادی کا جمگھٹ تھا۔" اس دعوے کے لئے کوئی سند پیش نہیں کی گئی۔ "تاریخ فرشتہ" اور دوسری کتابوں سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ فیروز تغلق کے عہد میں دو لاکھ پوربی دہلی میں جمع کئے گئے تھے جو بعد میں صاحب اختیار ہو کر بادشاہ گر بن گئے تھے۔ ص ۱۰۸: "فتوحاتِ دکن کا سلسلہ علاء الدین خلجی کی فتوحات سے شروع ہوتا ہے۔" علاء الدین خلجی کڑے کے صوبیدار کی حیثیت سے دکن پر حملہ آور ہوا تھا جہاں یادو خاندان حکمراں تھا۔ اور وہ یادو خاندان پورب کا رہنے والا تھا۔ ان کے ساتھ وہاں زبان دہلوی نہیں گئی تھی۔ علاء الدین نے کڑے اور اودھ کے لشکر کے ذریعے سے دہلی پر قبضہ حاصل کیا تھا۔ قبضہ حاصل کرنے کے بعد اس نے ان لشکریوں کو دہلی سے نکال نہیں دیا تھا اور ان لشکریوں نے اپنی زبان کو چھوڑ کر محکوموں اور مغلوں کی زبان بولنی نہیں شروع کر دی تھی۔ ص ۱۰۹: "دکن میں ترک مسلمان کا مترادف ہو جاتا ہے۔" یہ صورت شمال میں بھی تھی اور آج بھی ہے۔ ملک محمد جائسی نے بھی کہا ہے: ع دلی نگر آدتُر کا لوں۔ ص ۱۰۵: "برکت اللہ پیمی مارہروی کے ہندی کلام کا مجموعہ پیم پرکاش کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔" شاہ برکت اللہ بلگرام (قدیمی نام سری نگر) کے رہنے والے تھے۔ خود کہتے ہیں:

ہم باسی سرینگر کے، آئے بسے سب چھوڑ   مار ہرے سے نگر موں، جہاں ساہ نہیں چور ر

ان کی زبان پوربی تھی۔ برج سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اپنے علاقے کی زبان تلفظ کرتے تھے۔ ان کی جو غزل نقل کی گئی ہے اس کا آخری مصرع یہ ہے مصرع: جب عشق سدہ بدھ کہری، تب سمجھ پری یعنی برلگا (ہر لیگا) تب سمجھ پڑے گی۔ اس کا مطلع بھی دیکھیے:

گھر تج کے جا جنگل میں پری، تب سمجھ پری   تن من میں پیم کی آگ بری تب سمجھ پری

یعنی جنگل میں پڑیگا اور آگ برے گی (جلیگی) تب سمجھ پڑے گی۔ پیمی کی کتاب کا نام "پیم پرکاس" (سین مہملہ کے ساتھ) ہے نہ کہ پیم پرکاش۔ ص ۱۱۱ "مثنوی کدم راو پدم راؤ ۱۴۲۱ء اور ۱۴۳۵ء کے درمیان کی تصنیف ہے"۔ ثبوت یا حوالہ کوئی نہیں۔ وہ اشعار جن میں بادشاہ کی مدح ہے اگر سمجھ لیے جائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کتاب ۹۲۹ھ میں لکھی جا رہی تھی۔ ص ۸، "دہلی و پیرامنش کی زبان کے پہلے شاعر امیر خسرو ہیں"۔ یہ دعوا خود خسرو نے تو کہیں کبھی نہیں کیا ہے۔ انہوں نے اپنی ایک فارسی مثنوی میں ہندوستان کی مختلف بولیوں کا ذکر کرتے ہوئے دہلی اور مضافات کی ان بولیوں کا جن کا کوئی نام نہیں تھا، ذکر کر دیا ہے کہ مصرع: دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد۔ خسرو سے ایک بات اپنی طرف سے منسوب کر کے اس کا بار بار اعلان کرنا سننے والوں کو فریب میں مبتلا کرے گا۔

مقدمۂ تاریخ زبان اردو میں جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھنے کے بعد جو بات سامنے آتی ہے یہ ہے کہ اردو ایک جدید زبان ہے۔ اور وہ سنسکرت اور ہندی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ ص ۱۸ پر ہے "مغربی زبان پر سنسکرت کا اثر گہرا تھا۔ وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے مشرقی زبانوں کی بہ نسبت قدیم آریائی زبان سے زیادہ قریب تھی۔ ص ۱۷ تا ۱۵، یہ ساری بحث قدیم ہندی تصانیف پر مبنی ہے۔ کہا گیا ہے کہ "ذیل کی کتب مستند خیال کی جاتی ہیں۔ کھومان راسو، بیسل دیو راسو، پرتھوی راج راسو، جے چند پرکاش اور ہمیر راسو"۔ ان کتابوں میں سے دو کے بارے میں ہندی کے بدوانوں کی آرا نقل کی جاتی ہیں: بیسل دیو راسو مصنف کے بارے میں کچھ نہیں معلوم اس میں تاریخی نظر بالکل نہیں ہے۔ زمانے کے تعین کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ قیاس ہے کہ ۱۲۴۳ء کے آس پاس ہوگا۔ قدیم ترین مخطوطہ ۱۶۶۹ء کا ہے۔ (ہندی ساہتیہ کوش جلد ۲ ص ۳۷۰) پرتھوی راج راسو۔ راجستھان کے کچھ بدوان راسو کو سولہویں سترھویں صدی کی تصنیف بتاتے ہیں۔ یہ بات اس کی موجودہ ضخیم صورت کے لئے صحیح ہے۔ لیکن اپنی اصل صورت میں یہ قدیم رہی ہوگی۔ (ایضاً ص ۳۴۳) باقی کتابوں کا نام ہندی ساہتیہ کوش میں نہیں آیا ہے۔ فی الوقت ان کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ ص ۸۶ "ہندی شعرا میں پندرہویں صدی کی ہندوستان کی سب سے مستند شکل ہمیں کبیر ہی کے کلام میں ملتی ہے"۔ کبیر اور نامدیو وغیرہ سے برکت اللہ پیمی تک کے ہندی کلام میں ہی اردو کا سراغ تلاش

کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور نتیجے کے طور پر کہا گیا ہے کہ "افضل کی بکٹ کہانی جدید اردو کا پہلا ادبی و لسانی نقش ہے جو سور داس کی برنج اور کبیر داس کی سدھکڑی کے برعکس کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔" (ص ۹۲) یعنی یہ شکل ہندی کی ہی ایک شاخ ہے۔ جو مسلمانوں کے زیر اثر اپنی اصل سے الگ ہو گئی ہے۔ ص ۷۰ پر اردو (ادبی ہندوستانی) سے بجنور وغیرہ کی زبان کے "قریب ترین" ہونے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ "ان مقامات پر مسلمانوں کی تعداد کثیر ہے۔"

آخر میں یہ ذکر بھی مناسب ہے کہ حافظ محمود خاں شیرانی کی "پنجاب میں اردو" ان کی پہلی مربوط تصنیف ہے نو عمری کی اس تصنیف میں ان سے بھی فرو گذاشتیں ہوئی ہیں۔ لیکن انہوں نے حقایق کے اعتراف میں بخل نہیں کیا۔ مثلاً لفظ "سھتا" کی تحقیق میں انہوں نے ایک جملہ اس طرح لکھا تھا: "برکت شیخ تھیا اک موا اک نہا" بعد میں انہوں نے اس کی تصحیح کی اور اس کو اس طرح نقل کیا: "برکت شیخ پٹھا اک موا اک نٹھا" (مقالات شیرانی جلد ا ص ۱۴۱) جولائی ۱۹۸۲ میں انور احمد خاں فریدی نے اس کی قرات اس طرح شایع کی: "برکت پیر پٹھا اک موا اک نٹھا" (اخبار اردو، کراچی) ان سب کو دیکھے بغیر مقدمہ "تاریخ زبان اردو" کے اس جدید ایڈیشن میں "پنجاب میں اردو" کے پہلے اقتباس کو نقل کر کے یہ رائے دی گئی ہے کہ: "اردو کے استخراج کے متعلق پروفیسر موصوف کا تاریخی اور لسانی استدلال تقریباً ہر جگہ اس قسم کا ہے۔۔۔ یہ شیخ تھیا نہیں ہے بلکہ برکت شیخ تھپا (یا تھبا) ہے۔ شیخ تھپا سندھ میں اس عہد کے ایک بڑے بزرگ گذرے ہیں۔" (ص ۲۱۷)۔ علمی معاملات میں اس سے زیادہ گمراہ کن اور افسوس ناک صورتِ حال اور کیا ہو گی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو کے اس ایڈیشن میں ہریانی بولی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ صفحہ ۴۳ پر ہے: "دہلی کے شمال مغربی اضلاع کرنال، روہتک، حصار وغیرہ کی بولی ان تینوں ناموں (ہریانوی، بانگرو یا جاٹو) سے پکاری جاتی ہے۔ لیکن اس کا ہریانوی نام زیادہ موزوں ہے۔ اس سلسلے میں شیرانی کے ایک خط کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

"ہریانی کا لفظ میرا اپنا اختیار کردہ ہے سرکاری رپورٹ میں اس علاقہ کی زبان جٹو بھٹی، باگڑی، بانگرو، چمرواوغیرہ ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ نام مقامیوں کو پسند نہیں۔ ویسے بھی بھلے نہیں معلوم ہوتے۔ اس لئے میں نے ہریانی کی اصطلاح کو اختیار کر لیا۔ اس اصطلاح کا تمام دہلی کے گرد و نواح کی زبان پر اطلاق درست نہیں ہوگا۔ ایسی اردو کے نمونے اور علاقوں سے بھی دستیاب ہوں گے۔ مثلاً صوبہ اجمیر، آگرہ، الہ آباد وغیرہ۔" (مکاتیب حافظ محمود خاں شیرانی ص ۲۱۱)

جو لوگ واقعی اہل علم ہیں وہ دوسروں کے کاموں کی قدر کرتے ہیں۔ ان کے مزاج میں انکسار ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ علم کا سمندر نہایت وسیع ہے۔

●●

ڈاکٹر مسعود حسین خاں
جاوید منزل، جامعہ اردو روڈ
علیگڑھ

جواب

میرا مختصر سا جواب یہ ہے : ؎

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہلِ مرکب، ابدالدّہر بماند

امید ہے آپ اسے مضمون کے ساتھ ضرور شائع فرمائیں گے۔

●●

جناب انیس رفیع
اردو سکشن آل انڈیا ریڈیو کلکتہ

ڈاکٹر سیّد الابرار کا تھیسس

جدید اردو ادب میں ہجرت کا موضوع
افسانے اور ناولوں کے حوالے سے

یہ ہے ڈاکٹر سید الابرار کی پی ایچ۔ ڈی کی تھیسس کا موضوع۔ اس مقالے پر انھیں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے مل چکی ہے۔ مگر یہ مقالہ کتابی صورت میں اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔ موضوع پر کشش اور اچھوتا ہے۔ دعوت فکر بھی دیتا ہے۔ ادب اور خاص کر اردو ادب کی طرف یہ ایک SOCIO POLITICAL اپروچ رکھتا ہے۔ ہندستان کی یونیورسٹیوں کے اردو ریسرچ کے موضوعات عموماً تاریخی، لسانیاتی، شخصی، صنفی یا فنی قسم کے ہوا کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو موضوعات نصابی سوالات کا چربہ لگتے ہیں جس سے ریسرچ کی اہمیت اور افادیت دونوں متاثر ہوتی ہیں۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی CENTRE OF INDIAN LANGUAGES نے روایتی اور گھِسے پٹے موضوع سے ہٹ کر ایک CHALLANGING موضوع کا انتخاب کر کے دیگر یونیورسٹیوں کے اردو سربراہوں کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ یعنی ادبی تحقیق کو سماجی علوم کا درجہ بخشنا اور سماجی نظریات و تصورات کے حوالے سے موضوع کی تازہ بہ تازہ جہتیں تلاش کرنا شاید اس مرکز کا طرۂ امتیاز ہیں۔ دراصل سماجی، تاریخی اور سیاسی تناظر میں کی گئی تحقیق نہ صرف یہ کہ محقق کو معتبر بناتی ہے بلکہ موضوع کے اکہرے پن کو ختم کر کے ایسے گوشے نمایاں کرتی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب نئے گوشے سامنے آتے ہیں تو غور و فکر کے نئے باب بھی وا ہوتے ہی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے مفروضوں اور PARA- METRES کے استعمال میں جس اعتماد کا مظاہرہ ڈاکٹر ابرار نے کیا ہے، بہت کم تھیسس نویس اس اعتماد کو پا سکتے ہیں۔

انسانی المیے کی تاریخ میں ہجرت یا نقل مکانی ایسا المیہ ہے جو نسل در نسل پشت در پشت بھلائے نہیں بھولتا۔ یہ ناسٹلجیائی دکھ یا دیدہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتے جب تک کہ اس قوت کی کارفرمائی جو اس المیے کی ذمہ دار ہے متاثرہ فرد یا گروہ کی اجتماعی جدوجہد اور جارحیت سے مسخر نہ ہو جائے۔ ایسا نہ ہوتے تک انسان میں ایک خلش باقی رہتی ہے جو سلسلہ جہاد کو جاری رکھتی ہے۔ موجودہ صدی میں اس کی مثال فلسطینیوں کے انخلا اور پھر ان کی مسلسل

جدوجہد سے دی جاسکتی ہے۔ دراصل فلسطینی مہاجروں کی یہ جنگ اس وقت جاری رہے گی جب تک وہ اپنی کھوئی ہوئی زمین واپس نہ لے لیں۔ ممکن ہے اس عمل پر ان کی پیڑھیاں لگ جائیں۔ ادب اور ادیب ان حالات میں محض مُنہ تکو نہیں ہوتے۔ خارجی بکھراؤ اور داخلی خلش و کشمکش کو اپنے محسوسات سے میز کر کے ایک ایسا تخلیقی۔ DOCU MENT تیار کرتا ہے جو موجود اور آنے والی نسل کو نہ صرف ہونے والے جبر سے مطلع کرتا ہے بلکہ اس جبر سے نبرد آزمائی کا حوصلہ بھی بخشتا ہے۔ اگر آپ دنیا کے بڑے ادب کا سماجیاتی مطالعہ کریں تو آپ پائیں گے کہ دنیا کی جتنی معرکۃ الآرا تصانیف یا فن پارے ہیں وہ سب کسی نہ کسی المیے کا حصہ ہیں۔ اور جن کا اوّل و آخر مدعا سماجی ناانصافیوں اور برائیوں کا خاتمہ ہے۔ مگر جبر و استبداد کے مخالف آدمی کا جو حشر ہوتا ہے وہی حشر ایسی بے باک تصنیفات کا بھی ہوتا ہے۔ یہ بھی آدمی کی طرح قید و بند کی صعوبتیں جھیلتی ہیں۔ بہت ساری مشہور زمانہ کتابوں نے پابندیاں جھیلی ہیں۔ ملک بدر ہوئی ہیں۔ معتوب رہی ہیں۔ ایک حالیہ مثال لے لیجیے کافکا کی جس کی چیزیں خود اس کے وطن میں معتوب ہیں۔ مگر اب جیکوسلاواکیہ میں گوشہ گمنامی میں پڑی اس کی کتابوں پر توجہ کی گئی ہے۔ اور انھیں مشتہر بھی کیا جا رہا ہے۔ اردو ادب بھی ایسے شہ پاروں سے خالی نہیں۔ کیونکہ برصغیر کی تقسیم کے المیہ نے اردو اور اردو کے قلمکاروں کے سینوں کو ہے! ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ اردو بھی مہاجر ہوئی ہے۔ اس نے بھی دُکھ اور رویہ جھیلے ہیں۔ ڈاکٹر ابرار اور ان کے رہنما ڈاکٹر محمد حسن اور ایس آر قدوائی قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے ایسے زندہ موضوع پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس سے قبل کہ ہم مقالے کے مواد اور پیش کش کا جائزہ لیں ہم یہ دیکھ لیں کہ سماجی علوم میں ہجرت کی تعریف اور قسمیں کیا ہیں۔ عام طور سے ہجرت اس نقل مکانی کو کہتے ہیں جو کسی خاص مقصدی نظریے یا جبری حالات کے پیش نظر واقع ہوا ہو۔ اس کی پانچ قسمیں بھی بتائی گئی ہیں۔ ۱۔ قدیمی PRIMITIVE ۔ ۲۔ جبری FORCED ۔ ۳۔ سلسلہ وار CHAIN ۴۔ رضاکار FREE ۔ ۵۔ اجتماعی MASS ۔

قدیمی PRIMITIVE : زمانہ قدیم میں جب انسان قانونِ فطرت کے تابع زندگی بسر کرتا تھا اور اس کے عمل و سکنات کسی سماجی نظم یا اصول سے آشنا نہ تھے تب جانی تحفظ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ قدرتی آفات بھوک مری، جانوروں اور پڑوسیوں سے خطرہ انسانی آبادی کو محفوظ علاقے کی تلاش میں دربدر کرتے رہے ہیں۔ ہمارے قدما۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے پر مجبور ہوئے ہیں۔

جبری FORCED : جبری یا غیر رضاکارانہ (INVOLUNTARY) ہجرت اسے کہتے ہیں جب کوئی حاکم کوئی طبقہ یا کوئی قوت انسانی آبادی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جانے پر مجبور کر دے اور وہ آبادی

کسی دوسرے ہمدرد علاقے میں پناہ گزیں ہو جائے یا وہاں غلاموں کی حیثیت اختیار کرے۔ بلکہ جبری ہجرت کے زمرے میں وہ غلام بھی آتے ہیں جنھیں دوسرے ممالک کے آقاؤں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا تھا۔ اور اس طرح بے چارے بے وطن ہو کر نئے آقاؤں کے ملک میں چلے جاتے تھے۔

سلسلہ وار CHAIN : یہ وہ منتقلی ہے جس میں افراد کسی خاص علاقے یا کسی خاص خطے کی تعریف و توصیف سے متاثر ہو کر اپنے خطے کو خیر باد کہتے ہیں اور نئے خطے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس طرح کی ہجرت اجتماعی یا اچانک نہیں ہوتی بلکہ قسطوں میں سلسلہ وار ہوتی ہے قصہ یہ ہے کہ پہلے ایک فرد یا ایک گروہ جاتا ہے اور خطوط اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس علاقے یا خطے کے گن گان کرتا ہے۔ اور ان کے مخاطبین متاثر یا مسحور ہو کر وہاں جا کر بس جاتے ہیں۔ کناڈا، آسٹریلیا اور امریکہ کی آبادی کو ہی لے لیجیے۔ یہ ایسے ہی مہاجروں پر مشتمل ہے۔

رضاکارانہ FREE : یہ ایک معتدل طریقہ ہجرت ہے۔ اس میں نہ کسی خطے کے لیے کوئی خاص کشش کارفرما ہوتی ہے اور نہ ہی نقل مکانی کیلئے کوئی زور زبردستی ہوتی ہے۔ بلکہ یہ ہجرت تاجرانہ اصولوں یعنی نفع اور نقصان کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

اجتماعی MASS : اجتماعی یا عام ہجرت کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب افراد کسی خاص معاشرت اور جغرافیائی خطے میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگے اور نتیجتاً اپنا علاقہ ترک کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ترا دسی چودھری جیسے لوگوں کی مثال اس ضمن میں دی جا سکتی ہے۔

ہجرت یا نقل مکانی کی جو قسمیں بیان کی گئیں ان میں حالات تو مختلف ہو سکتے ہیں مگر اپنی مٹی (اپنا ماحول جس کا وہ پروردہ ہے) اپنی تہذیب کو خیرباد کہہ کے ایک اجنبی معاشرے ایک بیگانہ تہذیب کو اختیار کرنے کا کرب ایک ہی ہے مختلف نہیں ہے۔ اور یہی وہ کرب مہاجر کو تاعمر ناسٹلجیائی گھیرے میں محصور رکھتا ہے۔ اور وہ بیگانہ ماحول میں اپنی پرانی شناخت کی بازیافت کی کوشش میں نئے اقدار سے متصادم ہوتا ہے۔ فتح کی صورت میں وہ اپنے اقدار مقامی باشندوں پر مسلط کرتا ہے اور شکست کی صورت میں ٹوٹ پھوٹ کر نئے معاشرتی ڈھانچے میں مدغم ہو جاتا ہے۔ مگر وہ چبھن، وہ خلش اسے بے قرار کیے رہتی ہے اور یہی بے قراری اس مقالے کے موضوع کی محرک ہے۔

ڈاکٹر ابرار نے اپنے مقالہ کے ابتدائیہ میں کہا ہے کہ "میرا موضوع نیا ہے' اس لیے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہجرت کا مسئلہ بالکل نیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پہلے برصغیر کے اندر یا باہر جتنی بھی ہجرتیں ہوئی ہیں ان کے محرکات اتنے پیچیدہ اور تہ در تہ نہیں ہیں"۔ اگر ہم غور کریں تو پائیں گے کہ ڈاکٹر ابرار کا یہ دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے۔ میں نے ہجرت کے جو پانچ اقسام کا ذکر اوپر کیا برصغیر کی ہجرت میں ان پانچوں اقسام کے خصائص موجود ہیں۔

اس ہجرت کے محرکات میں عدم تحفظ، جبر، رضامندی، مسلسل اور عام انخلا (MASS EXODUS) سبھی شامل ہیں۔

تھیسس ابھی چھپی نہیں ہے اس لیے اس کا مختصر احوال گوش گزار کر دوں ۵۳۲ صفحات کی یہ تھیسس دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں ۴ ابواب اور حوالے ہیں اور دوسرے حصے میں تین ابواب اور حوالے ہیں تھیسس کا اختتام کتابیات پر ہوتا ہے۔

ہندستان کی ہزاروں سالہ تاریخ میں بہت ساری ہجرتیں ہوئیں ہیں جن میں سے کچھ ہجرتیں بہت زیادہ سماجی اور تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ جس طرح سے آریاؤں کی ہجرت وسط ایشیا کے لوگوں کی ہجرت اور بیسویں صدی کے اوسط میں ہندستان و پاکستان کی ہجرتیں یہ تمام ہجرتیں مختلف تاریخی حالات میں واقع ہوئیں۔ ان تینوں ہجرتوں کے درمیان دو تہذیبی رشتوں کی آمیزش اور آویزش سے بہت ساری سماجی و تہذیبی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اور نئے رشتوں کی تخلیق ہوئی۔ ان میں سے ہجرت کا تیسرا واقعہ ان دونوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے ــ جب بیسویں صدی کا آدمی چودھویں صدی اور پندرہویں صدی کے آدمی کے مقابلے میں زیادہ باشعور، ترقی یافتہ اور سماجی و تہذیبی طور پر منظم تھا اور ماقبل کے مہاجرین کے مقابلہ میں ایک علم زیادہ رکھتا تھا یعنی اسکے پاس سیاسی شعور بھی تھا گرچہ ابھی یہ شعور پختہ نہیں تھا۔

بیسویں صدی کی یہ ہجرت تقسیم برصغیر کے بعد پیش آئی وہ اپنے پس منظر اور جن واقعات کے ساتھ واقع ہوئی۔ وہ جدید ہندستانی تاریخ کے ساتھ عالمی تاریخ میں ایک زبردست سماجی، سیاسی اور تاریخی اہمیت رکھتی ہے ــ جو ہندستان کے ہزاروں سال پرانے سماجی رشتوں و تہذیبی و مذہبی عقائد سے جڑے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ہندستان اور پاکستان دونوں طرف کے مہاجرین کے درمیان جن ناسٹلجیائی رشتوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے ان میں جس طرح کے مذہبی، تہذیبی اور سماجی مظاہر نظر آتے ہیں ان کو ہندستان کی ہزاروں سالہ پرانی سماجی اور تہذیبی تاریخ کے مطالعہ کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔ جس کے موضوعات میں زبان، نسل، علاقہ، مذہب، رسم و رواج اور تہذیبی عقائد شامل ہیں۔ وہ تہذیبی عقائد جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فیض احمد فیض نے اپنی کتاب "ہماری قومی ثقافت" بحوالہ مذکورہ تھیسس ص ۱۷۹ میں لکھا ہے کہ "دین اسلام جس ملک میں پہنچا اس کی تہذیب کا اظہار وہاں کے قومی ڈھانچے میں ڈھل کر ہوا۔ چنانچہ ایرانیوں نے اسلام کے زمانے میں بہت فن پیدا کیا مصریوں نے اسلام قبول کر لینے کے بعد کافی بڑی تہذیب پیدا کی۔"

تھیسس کے حصہ اوّل کے پہلے باب میں مقالہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مہاجر ادب سے مراد کیا ہے۔ اس کی تعریف انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ جب کسی خاص ترقّی یافتہ تہذیب کے ماننے والے کسی ایسے علاقے میں جاتے ہیں جو تہذیبی اور ادبی اعتبار سے ان کے مزاج سے مختلف ہے تو کیا ان کا پیدا کردہ ادب مہاجر ادب کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً انگلستان سے ہجرت کر کے ایران میں آئے اور پورے ایران کو دینی تہذیب کے رنگ میں رنگنے

میں کامیاب ہوئے۔ تہذیبی ہجرت کی مقالہ نویس نے تین صورتیں بیان کی ہیں۔ پہلی وہ جس میں مہاجروں کا قد آور کلچر نئے علاقے کے کمزور کلچر کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ دوسری صورت بالکل اس کی الٹی ہے اور تیسری میں دونوں ترقی یافتہ کلچر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہوں۔ اور ایک نیا تہذیبی مرکب تیار کر لیا۔ جو آویزش اور آمیزش کے عمل کا نتیجہ ہے۔ آویزش کی صورت میں مہاجر اپنے فطری جذبوں کو ڈسپلن کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے وہ مذہبی اصلاح اور مختلف آدرشوں کا سہارا لیتا ہے اور اپنی تہذیب کو ایک نئی شکل دیتا ہے اور کبھی کبھی وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی روح پر سے تمام اختیارات کھو چکا ہے جو بعض حالات سے گزرنے کی بنا پر احساس گناہ میں بدل جاتا ہے اور جس کے لیے وہ راہ نجات ڈھونڈنے لگتا ہے اور کبھی کبھی وہ اپنی تہذیب کا باقی ماندہ نئی تہذیب کے جوڑنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ آویزش کی صورت وہ ہے جب مہاجر اپنی گمشدہ تہذیب کے کرب میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کے تمام مانوس تہذیبی رشتے ایک مقام پڑ کر رک جاتے ہیں۔ اور وہ ایک غیر مانوس اور ناموافق ماحول کے تمام چیلنج کو ایک خاموش تماشائی کی طرح سہنے لگتا ہے۔

پہلے قصے کے باب دوم میں تہذیبی آویزش اور آمیزش کی مثال میں ڈاکٹر ابرار نے بتایا ہے کہ تہذیبی آویزش اور آمیزش کی مثال تہذیب کے دو خطوط ہیں۔ جس میں پہلا خط اقدار اور مادی شعور ہے دوسرا مذہب، جمالیاتی احساس اور معاشرتی زندگی ہے مادی شعور کی مثال انھوں نے ایران میں فاتحین کے ساتھ عرب مہاجرین کے داخلہ سے دیا ہے، عرب مہاجرین نے جہاں اپنے تہذیبی اور معاشرتی اثاثہ سے ایرانیوں کو بہت زیادہ متاثر کیا وہیں ایرانیوں کے مادی اور معاشی نظام کے حسنِ ترتیب کے سامنے سر جھکایا۔ خدا کا تصور جو ایرانیوں کا عقیدہ تھا اسے قبول کرتے ہوئے عربوں نے اپنے یہاں قبولیت کی ایک نئی شکل پیدا کی اور اسے ظلِ اللہ کا نام دے دیا۔

ان باتوں کی وضاحت کے ساتھ مقالہ نگار نے ان رسوم کو بھی پیش کیا ہے جو آج بھی روزمرہ کی ہندستانی زندگی میں شامل ہیں۔ اور آویزش، آمیزش کی عمدہ مثال پیش کرتے ہیں۔ جیسے شادی بیاہ کی رسمیں۔ لگن دھرنا، مایوں بٹھانا، ابٹن، حنابندی، چالیسواں، تیجا وغیرہ وغیرہ۔

تیسرے باب میں تہذیبی آویزش کا سوال اور تقسیم ہند ڈیل کیا گیا ہے۔ اس میں مقالہ نویس نے بتایا ہے کہ تقسیم ہند تہذیبی آویزش اور آمیزش ایک لحاظ سے غالب اور دوسرے لحاظ سے مغلوب شکل ہے۔ جس کی وضاحت میں کہا ہے۔ جن دو مختلف زبانوں میں مسلمان مہاجرین فاتحین کے ساتھ ہندستان میں داخل ہوئے۔ ایک اجتماعی داخلہ کے ان دو رجحانات کی توضیح مقالہ نویس نے تہذیب ثقافت اور سماجیات کے پس منظر میں کی ہے۔ جس کا تاریخی پس منظر محمد بن قاسم سے لے کر ترکوں، ایرانیوں اور مغلوں پر مشتمل ہے۔ ان کے سماجی، معاشی اور فوجی نظام کے

لوگ کے ساتھ۔ اس کے ساتھ ہی مقالہ نویس نے ان مذہبی سماجی تہذیبی اور ثقافتی تحریکات پس ذکر کیا ہے جو انیسویں اور بیسویں صدی میں تقسیم ہند تک چلیں۔

باب چہارم ہجرت کے باب میں اُردو ناول کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں لکھے گئے ناولوں کے تین جہات کو لیا ہے۔ پہلی جہت آویزش کا عمل ہے۔ جس کے تحت دو ناول آتے ہیں۔ ا۔"آگ کا دریا": قرۃ العین حیدر۔ ۲۔"تلاش بہاراں": جمیلہ ہاشمی۔ آمیزش کے عمل کے زمرے میں بھی دو ناول لکھے گئے ہیں۔ ا۔ اداس نسلیں: عبداللہ حسن۔ ۲۔ چاند گرہن: انتظار حسین۔ تیسری جہت آمیزش کے عمل کی دوسری شکل ہے جس میں ایک مہاجر کا احساس منفی طاقتوں کے ریلے میں بے نیل و مرام بہا جا رہا ہے اور اس میں اس کا راہ نجات ڈھونڈنے کی جدوجہد۔ اس زمرے میں بھی یہ ناول شامل ہیں۔ ا۔"آنگن": خدیجہ مستور۔ ۲۔"علی پور کا ایلی": ممتاز مفتی۔ ۳۔"خدا کی بستی": شوکت صدیقی۔

ناولوں پر فاضل مصنف کی تجزیاتی کمینٹری

آگ کا دریا میں تہذیبی آویزش کا ایک بھرپور مزاج ویدک کال سے لے کر موریہ خاندان کے ادوار اور یہاں سے چل کر مسلم فاتحین اور صوفیا کی آمد تک گوتم، چمپا احمد، اور ریکاں کے کردار میں دکھائی دیتا ہے اور یہ ناول تقسیم ہند کے درمیان چلتی ہوئی تحریکات اور پلٹتے ہوئے رجحانات کے پس منظر کا سلسلہ ماضی بعید میں بہت دور تک لے جاتا ہے۔ تقسیم کے پہلے اور تقسیم ہند کے پس منظر میں "آگ کا دریا" اپنی ایک اہمیت رکھتا ہے۔ یہ پورے تاریخی ادوار کی کم و بیش ایک صاف دکھائی دینے والی تصویر پیش کرتا ہے۔

تلاش بہاراں یہ ناول جس میں مصنفہ نے بتایا ہے کہ حکومت کی باگ ڈور غیر ملکی طاقت کے ہاتھ میں آجانے سے ملکی سرپرستی کا معیار مشرقی سے مغربی ہو گیا۔ جس نے یہاں کی مذہبی تہذیبی اور سماجی یک جہتی کو پامال کر دیا۔ اور خارجی زندگی کے تمام امور پر غیر روایتی اور مغربی قدروں کی سکہ بندی ہو گئی۔ نتیجہ کے طور پر نئے اور پرانے کا ٹکراؤ سارے ملک میں شروع ہو گیا۔ اور بیک وقت دو طرح کی زندگی گذارنے اور دو طرح کے ماحول کے تقاضوں کے ساتھ چلنے کی صورت میں مذہب، تہذیب اور سماج کی وہ روح جو کل تک اس کے تمام رشتوں کے درمیان یکجہتی کا سبب بنی ہوئی تھیں ختم ہونے لگی۔ مذہب تہذیب متشدد اور فرقہ پرست ہونے لگے جو آگے چل کر ہندو مسلم نفاق کی صورت میں ظاہر ہوا اور تقسیم ملک کا سبب بن گیا۔

اداس نسلیں اس ناول میں نعیم اداس نسل کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس پر گاؤں سے ہم رشتہ قدروں کا بہت اثر ہے۔ مگر اپنی انگریزی تعلیم کی وجہ سے وہ ایک بڑے شہر کے گاؤں اور زمین سے کٹے ہوئے جاگیردار کی لڑکی سے

شادی کرتا ہے۔ نعیم جب آزادی کی جنگ شروع ہوتی ہے تو وہ مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ایک تحریک کو آگے لے کر بڑھتا ہے جب بورژوائی طاقتیں ایک ازدواجی رشتہ کا کمند پھینک کے اس کو اپنے آپ میں مدغم اور گم کرنا چاہتی ہیں ان دو رشتوں کا تضاد نعیم کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ تو وہ زندگی و سماج کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور آخر میں فرقہ پرستوں جو اس کو آخر آخر تک ایک انقلابی نہیں صرف ایک مسلمان سمجھتے ہیں اور جب وہ مجبور ہو کر پاکستان جانے والے قافلے میں شامل ہوتا ہے تو راستے ہی میں انتقال کر جاتا ہے اور اس طرح اسے نہ پاکستان ملتا ہے نہ ہندوستان۔

<u>چاند گہن</u> یہ ناول تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے فسادات کے درمیان مہاجرین کے انخلا سے لے کر پاکستان جانے تک مختصر عرصۂ حیات پر مشتمل ہے۔ انتظار حسین نے اس ناول میں مہاجرین کے تہذیبی ماحول، عادات، اطوار، رسم، عقائد اور طرز زندگی کی تصویر کشی جس امسلاک اور جذباتی کے ساتھ کیا ہے اسمیں مہاجرین کے ساتھ انکا پورا الگٹمنٹ جھلکتا ہے۔

<u>آنگن</u> خدیجہ مستور کے ناول آنگن میں ایک مسلم جاگیردار اور اس کے متعلقین تحریک جنگ آزادی اور اس کے ارتقا کو تین زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ ایک زاویہ چھوٹے چچا کا ہے کہ ملک تقسیم نہ ہو بس برطانوی اقتدار ختم ہو غیر ضروری خاندانی، سماجی روایتوں کا دہاڑ ختم ہو۔ ذہن کو بھی آزاد کیا جائے۔ دوسرا زاویہ جمیل اور چھمی کا ہے ایک طرف وہ آزادی کی تحریک کو مذہب اور فرقہ کی جنگ سے الگ نہیں کرنا چاہتے لیکن دوسری طرف اپنا وطن، اپنی زمین چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان جو جہاں ہے وہیں اس کا پاکستان بن جائے۔ تیسرا زاویہ عالیہ کے ماموں اور اماں کا ہے جو انگریزی اقتدار اور بابوشاہی انگریزی ادا کے حامی ہیں۔ اور آزادی کی جنگ سے وہ ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے الگ ہے۔ مقالہ نگار نے اداس نسلیں کے مقابلہ میں اس ناول کو زیادہ EFFECTIVE اور SUBTLE قرار دیا ہے۔

<u>علی پور کا ایلی</u> ممتاز مفتی نے اس ناول میں ایک مسلم جاگیردارانہ ماحول میں جاگیردار اور کمپنی کے بیچ قائم ایک تہذیبی مظہر کو جنگ آزادی کے پس منظر میں پیش کیا ہے، جو بظاہر اسلامی لیکن بباطن ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔

<u>خدا کی بستی</u>: اس ناول میں ایک SLUM کا ماحول پیش کیا گیا ہے جہاں ایک تہذیب کی ذہنی شکل بنے جو ایک نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ سماج میں ہوتی ہے۔ جب قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کا ایک جتھا کراچی جا کر ایک محلہ میں آباد ہو جاتا ہے جہاں لٹے ہوئے مہاجر کو جہالت، افلاس، جرم و سزا اور استحصال کا جبر سہنا پڑتا ہے۔ ایک کرپٹ اور بدتر سماجی ماحول میں اصلاح اور تبدیلی لانے کے لیے مسلم انٹلی جینس سے تعلق رکھنے والے چند افراد صفدر رشید، ڈاکٹر زیدی، پروفیسر علی احمد اور ایک نوجوان مسلمان سامنے آتے ہیں اور ترقی پسند تحریک چلا کر معاشرے کی خرابی دور کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس تحریک کو سرمایہ پرست طاقتیں مذہب کی آڑ میں کچل دیتی ہیں۔

ان ناولوں کی روشنی میں مقالہ نگار نے مہاجرین کے تمام رویوں، یعنی ترقی تبدیلی اور وقت کی طرف مہاجرین کے رویے صنعتی ترقی کی طرف مہاجرین کے رویے۔ تہذیب مذہب اور روایت کی طرف مہاجرین کے رویے عورت کی طرف مہاجرین کے رویے صنعتی ترقی و تبدیلی کی طرف مہاجرین کے رویے کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

تھیسس کے دوسرے حصے میں ہجرت کے باب میں اردو افسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ناول کی طرح ہجرت کے باب میں لکھے جانے والے افسانے ایک مہاجر کی عصری اور گذشتہ سماجی و تہذیبی زندگی کو وسیع تناظر میں نہیں پیش کر رہے ہیں جس میں ہر تبدیلی برصغیر کے صدیوں پرانے سماجی اور تہذیبی سلسلے سے وسیع طور پر جڑی ہوئی ہے جن کا ہر واقع اور حادثہ معقول تاریخی اور عمرانی جواز رکھتا ہو۔ افسانوں میں واقعات، حادثات اور تبدیلیوں کا پارہ دوز تاریخی سلسلہ ملتا ہے جس طرح سے واقعات کا بکھرا ہوا سلسلہ جن کو آج اور کل میں پرکھنے کے لیے جوڑ سے جوڑ ملا کر دیکھا جائے۔ ان افسانوں میں مہاجرین کے مذہبی، تہذیبی، سماجی اور ثقافتی رویوں کی تلاش اس ٹھوس ثبوت کے ساتھ نہیں کی جاسکتی جو ناولوں کے سلسلے میں کی گئی ہے۔ باوجود اس کے ہر واقع اور حادثہ کی موضوعی رو کو تاریخ اور سماج کے معروضی سلسلے سے جوڑنے کی کوشش کی گئی اور افسانوی حصے کے پورے سیاق و سباق کو تین باب میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ۱۔ نئی اور پرانی یاد کا تصادم ۲۔ عصری تجرید۔ ۳۔ عصری خواب۔ نئی اور پرانی یادداشت کے تصادم کے تحت مقالہ نویس نے ایک مہاجر کی یادداشت کو داخلی اور خارجی دو رشتوں میں بانٹ دیا ہے جن میں داخلی رشتے کا تعلق ان عقائد سے ہے جن پر کوئی معاشرہ اپنا ایمان نہیں رکھتا ہے جس میں اچھائی اور برائی، خوبصورتی اور بدصورتی، سلیقہ اور بدسلیقگی کا معیار شامل ہے۔ خارجی سطح پر مہاجر کی مذہبی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ جہاں ایک مذہب پر مقامی تہذیب کا رنگ اتنا غالب ہے کہ وہ تہذیب سے الگ ہو کر لامقام اور لامحدود ہو جاتا ہے۔ جس طرح سے کسی چیز کو حرکت اور عمل کی صورت اختیار کرنے کے لیے بنیاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح سے تہذیب بھی ایک بنیاد ہے جو مذہب کو مقام اور حد عطا کرتی ہے۔ مقالہ نویس نے اس باب میں مزید بتایا ہے کہ ہجرت کے سلسلے میں لکھے گئے افسانے جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں اس کی رو سے تہذیب کو مذہب کا پابند نہیں بنایا جاسکتا ہے بلکہ مذہب کو اپنا عمل جاری رکھنے کے لیے کسی تہذیب کا پابند ہونا ضروری ہے۔

عصری تجرید۔ نئی اور پرانی یادوں کے ٹکراؤ کے بعد ایک تیسری بات سمجھوتہ کے ماحول کا ابھرنا جس میں فاضل مقالہ نگار نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ مہاجرین ماضی کے کن تجربوں اور یادداشتوں سے انحراف کر رہا ہے اور نئے سماجی انضمام کے لیے نئے تقاضوں کے زیر اثر حال کی طرف بڑھنے کی اس کی رفتار کیا ہے اور عصری سماجی تقاضوں کے مطابق اپنے عصری سماجی تہذیبی اور معاشی مسائل کو حل کر کے کس حد تک اس نے اپنے آپ کو حال کے لائق بنایا ہے۔

عصری خواب۔ تجربہ کے ان سہ جہت رشتوں، دیہی شہری اور قصباتی، جو ایک خواب کی شکل بنتی ہے وہ خواب ایک ایسے سماج کا ہے جو ترقی کا ایک متوازن ماڈل رکھتا ہے جس میں ترقی کی تمام بنیادیں مادی ہیں۔ جس کے سماجی شعور کی حدیں اور ترقی کے رشتے ترقی کے بین الاقوامی رشتے سے جڑے ہوئے ہیں۔ جو فرقہ واریت، مذہبی تہذیبی عصبیت کے منفی اثرات سے پاک ہوں۔ اور جس کی تشکیل میں تغیر اور مانوس تجربوں کے رشتے بنیادی رشتے کی حیثیت رکھتے ہوں۔ وہ اجنبی نہیں اور درآمد شدہ نہ ہوں۔ جس میں سماجی مرتبے کی بنیاد محض ماضی کی بنیاد پر نہ ہوں بلکہ مسلسل جدوجہد اور اجتماعی ترقی کے رشتوں پر ہوں تاکہ ہجرت کے اس بڑے واقعے کی طرح اسے پھر اسی طرح کے کسی دوسرے حادثہ انجان اور بے سمجھ تبدیلی کے انداز میں اچانک ٹکرانا نہ پڑے۔ اور اس کے ساتھ ہی تہذیب و ثقافت کے نئے رشتوں کی تشکیل میں فرد اور سماج کے درمیان اجنبیت کا سوال نہ ہو اور جس میں ہر تبدیلی اور نیا پن جانے پہچانے اور سوچے سمجھے تجربوں کی شکل میں مانوس دکھائی دے کہانیوں میں انتظار حسین کی کنکری اور شہر افسوس کے ساتھ ممتاز مفتی، بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، آغا سہیل اور قرۃ العین حیدر کی کہانیاں شامل ہیں۔ ان افسانوں میں مہاجرین کے مذہبی اور تہذیبی عقائد کی توضیح مثالوں اور کہانیوں کے اقتباسات کے ساتھ کی گئی ہے۔

مقالے کے ابواب و مواد سے پتہ چلا کہ محقق نے اپنی تحقیق کا جو دائرہ اپنی رہنمائی کے لیے خود ہی طے کیا تھا اس میں خوب خوب چکر لگائے ہیں۔ زبان کی سلاست اور بیان کی قطعیت ان کے پراعتماد ہونے کی دلیل فراہم کرتا ہے۔ زبان کے سلسلے میں انھوں نے اختراع سے بھی کام لیا ہے۔ جیسے انگریزی کے بہت سارے الفاظ کو اردو ترکیب دے کر استعمال کیا ہے۔ جیسے NOSTALGIA کو ناسٹلجیائی احساس وغیرہ۔ تخلیقی ادب کو جب سماجیاتی تناظر میں EVALUATE کیا جاتا ہے تو وہاں اظہار کے لیے مناسب زبان، الفاظ یا جملے زبان پر قدرت ہونے کے باوجود نہیں ملتے کیونکہ تخلیق کی تحریری فضا، حالات، تہ داری محقق کے لیے اجنبی پاتے ہوئے جو مقالے کا موضوع دیکھ کر مجھے خدشہ تھا کہ ڈاکٹر ابرار اس کڑے امتحان سے گذر پائیں گے یا نہیں مگر خوشی ہوئی جب انھوں نے اس سلسلے کا حل اپنی اختراعی صلاحیتوں کے ذریعہ پا لیا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے موضوع کا تجزیہ مارکسی نکتہ نگاہ سے کیا ہے جس سے ہجرت کے محرکات اور تقسیم ہند کے نتیجہ میں تخلیق ہونے والے ادب کا ایک سماجی SCIENTIFIC تجزیہ ہوا ہے۔ ہم اس مقالے کو ایک طرح سے نظری تنقید بھی کہہ سکتے ہیں۔ چند باتیں فروگذاشت کی بھی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ مقالے کے سرٹیفکیٹ میں جو ان کے SUPERVIS- جناب S.R.QIDWAI صاحب نے دی ہے اس میں انگریزی میں عنوان یوں ہے۔ SEARCH OF OR IDENTIFY IN URDU NOVELS AND SHORT STORIES OF IMMIGRANTS WRITERS.

اور اردو میں مقالے کا موضوع اس طرح لکھا گیا ہے "جدید اردو ادب میں ہجرت کا موضوع اور شناخت کا مسئلہ" افسانے اور ناول کے حوالے سے " اگر دیکھا جائے تو دونوں عنوانات کے SCOPE الگ ہیں۔ انگریزی عنوان سے پتہ چلتا ہے کہ محقق کا SUBJECT اردو کے مہاجر قلم کاروں کے ناول میں شناخت کی تلاش جبکہ اردو عنوان کے اسکوپ میں مہاجر قلم کاروں کی بات شامل نہیں ہے بلکہ صرف اردو ادب کے ناول اور افسانوں کی بات آئی ہے۔ لگتا ہے ڈاکٹر ابرار نے انگریزی عنوان کے تحت کام کیا ہے۔ اور ایسے ہی ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کو اپنے مطالعہ میں لیا ہے، جو واقعی ہجرت کے تجربے سے گذر چکے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مقالے کی ضخامت چار گنا زیادہ ہوتی۔ ممکن ہے غیر ضروری طوالت سے بچنے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے ایسا کیا ہے مگر اس SHORT CUT کی وجہ سے مقالہ میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے مثال کے طور پر انھوں نے چند گنے چنے شہرت یافتہ ناول نگاروں پر ہی اکتفا ہے جیسے قرۃ العین حیدر، جمیلہ ہاشمی، عبداللہ حسین، انتظار حسین، خدیجہ مستور، ممتاز مفتی۔

افسانوں میں انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، بانو قدسیہ، آغا سہیل یعنی یہ پوری تھیسس ان ہی ایک دو جن ناول اور افسانے کے گرد چکر کاٹتی ہے۔ انھوں نے پاکستان سے ہندستان آئے ہوئے مہاجر ادیبوں کی تحقیقات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ جو اس مقالے کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ افسانوں کے آئینے میں جو تجزیہ تھیسس کے دوسرے حصے میں پیش کیا ہے وہ پہلے حصے کے مقابلے میں سرسری لگتا ہے۔

اس کے علاوہ ہجرت ایک ایسا سماجی اور تاریخی موضوع ہے جس کا مختصر GENESIS ہونا بھی مقالے میں ضروری تھا۔ خاص کر ہند و پاک کے ہجرت کے باب میں یہ بہت ضروری تھا کیونکہ اسلامی تاریخ میں ہجرت کی جو اہمیت ہے اس کے اثرات اور اس کی نفسیات کی تلاش بھی ہند و پاک ہجرت میں ضروری تھی۔ ممکن ہے ایک طبقہ کے لیے جو مذہبی تاریخ کی روشنی میں ہجرت کو تکلیف دہ عمل نہ سمجھتا ہو ہجرت قابل قبول ہو اور نئی جگہ پر خود کو اجنبی محسوس نہ کرتے ہو۔ ممکن ہے کہ کچھ مہاجر ادیبوں نے اس زاویے سے بھی افسانے اور ناول لکھے ہوں۔

تیسری بات یہ کہ مہاجر ادب کے تعلق سے اگر بین الاقوامی مہاجر ادب نہیں تو کم از کم ہندستان کے دیگر زبانوں کے مہاجر ادیبوں کے نئے افسانے اور ناولوں کا مختصر ہی سہی مگر دیگر تقابلی جائزہ اس مقالے میں تکمیل کی صورت پیدا کرنے کیلئے ضروری تھا۔

چوتھی بات: مقالے کی نصف سے بھی زائد ضخامت حوالوں کی نذر ہو گئی ہے۔

پانچویں بات: کتابیات اور REFERENCE سے پتہ چلتا ہے (جیسا کہ پہلے بھی میں نے کہا ہے) کہ یہ مقالہ کسی خاص سماجی نظریہ اور تصور کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ مثلاً آرنلڈ ٹوائن کو چھوڑ کر جن متعلقہ علوم کی کتابیات سے استفادہ

کیا گیا ہے وہ ایک مخصوص سماجی اور سیاسی نظریہ کو نظام کے باب میں لکھی گئی ہیں۔ گرچہ اس مقالے کا تجزیاتی رویہ LEFT-ORIENTED ہے مگر فاضل مقالہ نگار نے ایسے ناول اور افسانے منتخب کیے ہیں جنھیں طبقاتی کشمکش اور ٹکراؤ کی جھلک تو ہے مگر خود ناول نگار یا افسانہ نگار LEFT ORIENTED نہیں ہیں لہٰذا ان کا ابرمِج سماجی رشتوں کی طرف زیادہ پیاد LIBERAL ہے اگر اسے REACTIONARY نہ کہا جائے تو "خدا کی بستی" اس سے مستثنیٰ ہے۔

پھر بھی اُردو تحقیق کے اس اچھوتے میدان میں قدم رکھنا کا ہدار دکی مثال ہے ڈاکٹر سید الابرار نے اس تحقیق کو پائے تکمیل تک پہنچا کر کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ جب ڈاکٹر صاحب اس موضوع کو کتابی صورت میں شائع کریں گے تو ان باتوں کی طرف بھی دھیان دیں گے جن کی کمی مقالے میں کھٹکتی ہے اور خاص کر جن باتوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے

●●

ڈاکٹر سید الابرار
ہوڑہ کلکتہ

جواب

ادارۂ تحقیقات اردو کی جانب سے منعقدہ "اردو ریسرچ کانگریس" میں میری تھیسس "جدید اردو ادب میں ہجرت کا موضوع" پر انیس رفیع کا تبصرہ قابل قدر، جامع اور مدلل ہے۔

میں نے اپنی تھیسس میں اُن کی سماجی، ثقافتی رشتوں اور رسوتوں کو ہجرت کے موضوع پر لکھے گئے افسانوی پیکروں میں پکڑنے اور اپنے دائرۂ ذہن میں لینے کی کوشش کی ہے، جو ہجرت کے بعد ناستالجیا کی علامت بن گئے، کرب، درد، ویرانہ اور سر راہ تنہائی کی شکل میں، جس کو فاضل مبصر نے اپنے حیطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے اور جن باتوں کو بہت غور سے دیکھا ہے۔

ناچیز محقق فاضل مبصر محترم انیس رفیع کی بصارت اور بصیرت دونوں کی اس سلسلے میں داد دیتا ہے، اور تبصرہ کے ساتھ عطا کردہ اُن کے اس تمغہ کو بصد احترام قبول کرتا ہے:

"مقالے کا موضوع دیکھ کر مجھے خدشہ ہوا تھا کہ ڈاکٹر ابرار اس کڑوے امتحان سے گزر پائیں گے بھی یا نہیں، مگر خوشی ہوئی جب انھوں نے اس مسئلے کا حل اپنی اختراعی صلاحیتوں کے ذریعہ پایا۔"

●●

جناب انیس رفیع
اردو سیکشن آل انڈیا ریڈیو کلکتہ

ڈاکٹر جاوید نہال کا تھیسس

انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب

بیسویں صدی کے آخر میں بنگال کے انیسویں صدی کے ادب پر گفتگو، جس کا موقع اردو ریسرچ کانگریس نے آج فراہم کیا ہے، ڈاکٹر جاوید نہال کی تھیسس "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" کے حوالے سے ہے۔ اس سے پہلے کہ کتاب پر تفصیلی باتیں ہوں یہ کہہ دینا مناسب ہے کہ ساتویں دہائی میں مرتب ہونے والا مقالہ اپنے موضوع کے اعتبار سے رہبر مقالہ (PIONEER WORK) کہلانے کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" کی اشاعت سے قبل تک یہ کتاب متعدد اعتبار سے اول حوالے کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کا اندازہ ہم اہم ناقدین کی آرا سے لگا سکتے ہیں۔ جیسے اختر اورینوی نے بنگال کی لسانی ترقی پر اس مقالے کو اہم ترین باب قرار دیا۔ محمد حسن صاحب نے بتایا کہ اس کی اشاعت سے اردو نثر کی گم شدہ کڑی دریافت ہوگئی ہے۔ نیر مسعود کا خیال ہے کہ اس مقالے پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہو یا نہ ملی ہو مگر اس موضوع پر تمام مقالوں سے بلند ہے۔ اس تھیسس کی افادیت کا اعتراف نوجوان محقق ڈاکٹر عبیدہ کو بھی ہے۔ وہ اپنے معتبر FROM IN اور مبسوط مقالے "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" کے حرف آغاز میں رقم طراز ہیں "موجودہ دور میں عتیق صدیقی کی گل کرسٹ اور اس کا عہد اور جاوید نہال کی "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" فورٹ ولیم کالج کے ذیل میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

تاہم ڈاکٹر جاوید نہال کی یہ تھیسس بھی اس روایتی تحقیقی معیار کو توڑ کر آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔ عام طور پر تحقیقی کوششوں کے تین اہم مدارج ہوتے ہیں۔ اول مواد کی فراہمی، دوئم LIFTING & SHIFTING AND SHAPING OF سوئم PROPER PLACING OF FACTS THE FACTS پروفیسر جاوید نہال صاحب کی یہ تصنیف بھی ایک تحقیقی مقالہ ہے اس لئے موصوف کو بھی تین عام مدارج سے گزرنا پڑا ہوگا۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں مصنف نے سخت محنت کی ہے اس کا اندازہ کتاب کی ضخامت سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر تحقیقی چھان بین کو ذرا اور وسیع کیا جاتا تو شاید نواب مرشد آباد کی ذاتی لائبریری سے مرزا داؤد جیسے اہلِ علم اور شاعر کا قلمی نسخہ دستیاب ہو جاتا۔ اس کے علاوہ مٹیا برج

کی پرانی لائبریریوں سے بھی وہاں کے صوفی شعرا اور علما کے قلمی نسخے حاصل ہوسکتے تھے۔ لیکن مقالے میں اس کے برعکس مدناپور، آسنسول، اسلام پور جیسے اردو مراکز کا ذکر تک نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کے بنگال میں قیام سے ان کی زبان کے الفاظ جو اردو اور اردو ادب میں داخل ہوئے نہال صاحب نے اسے بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا البتہ پروفیسر عبدالرؤف نے ان زبانوں کے الفاظ کا اردو میں استعمال پر کام کیا ہے اس کے علاوہ حکومتِ مغربی بنگال کے ARCHIVES جو کیلا بگان اور محمد علی پارک کے آس پاس ہی واقع ہے اور مصنّف کے گھر سے دور بھی نہیں، کے ذخیرے سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں اور بہت سارے گمنام نسخے، حوالے، سرکاری دستاویز مل جاتے جن سے ۱۹ صدی کی اردو تاریخ کی معلومات میں اور اضافہ ہوتا اور یہ کتاب اور بھی جامع ہوجاتی۔ کلکتہ اور اس کے نواح میں ذاتی لائبریریاں بھی اچھا SOURCE تھیں۔ ٹیٹاگڑھ کھردہ میں مثال کے طور پر عبدالصمد خاں کی ذاتی لائبریری میں تقریباً پچاس ہزار ادبی اور نیم ادبی اردو کتابیں رسالے اور نسخے ہیں مگر ذاتی لائبریریوں کا خیال بھی ان کو نہیں آیا۔

یہ بات اردو کی بنیاد کے ساتھ ساتھ بنگال میں اردو ادب کی بنیاد کے لئے بھی صحیح ہے کہ بنگال میں اردو کی تاریخ صوفیائے کرام نے بنائی اور ان کی تبلیغی ضرورتیں اردو کی تشکیل کا سبب بنیں۔ لیکن صوفیا کرام کی تبلیغی ضرورتوں سے اردو زبان کی تشکیل یونہی نہیں ہوگئی بلکہ اس کے لئے پہلے انہوں نے اپنے مشن کی تبلیغ کیلئے جہاں ایک مشترکہ زبان کے تار و پود کو جمع کیا وہیں ایک معاشرے کے تار و پود کو IDENTIFY بھی کیا اور ایک منفرد لسانی ڈھانچے کی تشکیل کی عوامی بولیوں کے اختلاط سے۔ لیکن ان کی اس تاریخ ساز حیثیت کے باوجود ان کا ذکر کتاب میں ضمناً ہوا ہے۔ مثلاً "یوں تو بنگال میں کئی صوفی شاعر اور ادیب گزرے ہیں ان صوفیوں اور اولیاء کرام کی اردو کے لئے مساعی جمیلہ اور خاموش خدمات کو اردو ادب اور زبان کی تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی ہے۔" اس اقرار کے باوجود مصنّف نے جو SHABBY TREATMENT ان صوفیوں کو دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مٹکل کوٹ والے سید مرشد علی قادری کے علاوہ شاید تفصیل سے کسی کا بھی ذکر نہیں۔ حالانکہ اردو زبان و ادب کی ترقی و بقا میں صوفیا کرام کا جو حصہ رہا ہے، بالخصوص بنگال میں، اس کے لئے مصنف ایک الگ باب رکھ سکتے تھے۔ یہ اطلاع حوصلہ افزا ہے کہ صوفیا کرام کی ادبی خدمات پر پروفیسر ستار شاہدی، ڈاکٹر ایم، اے نصر اور دوسرے DISCIPLINES کے اسکالر کام کر رہے ہیں۔

موصوف جب نثری ارتقا پر روشنی ڈال رہے تھے تو ان کے ذہن سے یہ بات محو ہوگئی کہ اردو میں ڈرامہ کی بھی ایک صنف ہے جو انیسویں صدی کے کلکتہ میں واجد علی شاہ کے وجود سے فروغ پا رہی تھی۔ ڈرامے کے بارے میں بھی وہ اتنا کہہ کر رہ جاتے ہیں "نواب آزاد نے ڈرامے پر بھی خاصی توجہ دی تھی ۔۔۔ اور نوابی دربار ناول سے زیادہ ڈرامہ ہے ۔ میرا خیال ہے کہ بنگال میں انیسویں صدی کے آخری نصف میں کل کارخانوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہو چکا تھا اور اس کے نتیجے میں MIGRATING LABOUR کی خطیر تعداد کلکتہ اور اس کے نواح میں آکر بس چکی تھی یہ بیشتر بہار اور مشرقی یوپی سے آئے تھے اور پرب تہوار کے موقع پر جاترا پارٹی والوں کی مدد سے نوٹنکی کھیلا کرتے تھے ۔ کمرہٹی، ٹیٹاگڑھ، رانی گنج، آسنسول، ہگلی، ہوڑہ کے ورکروں میں اچھی خاصی تعداد مسلمان مزدوروں کی تھی ان ورکروں نے بہت سے ڈرامے کھیلے ہوں گے جس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے ۔ مگر سینہ بہ سینہ ان کے تذکرے چلے آرہے ہیں۔ اگر SPOT SURVEY مزدور بستیوں میں کیا جاتا تو ایسے ڈراموں کا بھی پتہ چل جاتا جن کی وجہ سے اردو زبان کو مقبولیت ملی۔ خصوصاً مٹیا برج میں اس کی تلاش شد و مد کے ساتھ ہونی چاہیئے تھی۔

مواد کی فراہمی کے سلسلے میں ایک اور زبردست کوتاہی کی طرف اشارہ ضروری ہے ۔ شہر کلکتہ کی URDU SPEFKING آبادی کی ایک خاصی تعداد ایسی ہے جو اردو کے نام پر ایک الگ اردو زبان بولتی ہے جسے عرف عام میں ہم کلکتیا زبان کہتے ہیں۔ یہ اردو کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے اور اس کا اپنا LITERATURE بھی ہے ۔ ایک مثال

دیکھو بے دل کرجاں سے اُٹھس ہے ای دھواں کٹھو کہاں سے اُٹھس ہے

دراصل یہ بہار، یوپی، دلی اور بنگال کی بولیوں کے اختلاط سے پیدا ہوئی تھی ۔ یہ زبان ٹھیک اسی طرح سے ہے جیسے گجراتی، مراٹھی زبان کے اختلاط سے بمبیا زبان یا بمبیا اردو کہلاتی ہے ۔ اس زبان میں طبع زاد شاعری بھی ہوئی ہے اور ناول اور افسانے بھی لکھے گئے ہیں ۔ مولانا آزاد کالج میں اس زبان کا ایک قدیم ناول موجود ہے ۔ پتہ نہیں اب وہ کتاب وہاں کی لائبریری میں دستیاب بھی ہے کہ نہیں ۔ کیوں کہ ۱۹۶۰ء میں ہی وہ کتاب بڑی خراب حالت میں تھی ۔ اس زبان کا مطالعہ بھی اس مقالے میں ہونا چاہیئے تھا، مگر نہیں ہوا ۔

درج بالا کیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ محقق کے پاس ریاضت اور عرق ریزی کے لئے یا تو معقول ذرائع

دائرے کو پھیلا
بنگال کی محدود تجسّس دنیا میں فراہم نہ ہوسکے یا وہ اس کتاب کی تکمیل میں زمان اور مکان کے
نہیں سکے۔ وسائل اور سہولت وہ ایسی ناگزیر ضرورتیں ہیں جن کی کمی تحقیق کو لازمی طور پر بے وزن اور بے وقعت
کردیتی ہے۔ اس بات کو ماننا ہوگا کہ سہولتوں کا فقدان اور وسائل کی کمی نہال صاحب کے لئے زبردست
رکاوٹیں تھیں۔ اس کا اندازہ آپ اس حقیقت سے لگا سکتے ہیں کہ انہوں نے یہ کام ۱۹۵۹ء میں شروع کیا
تھا اور ڈگری ۱۹۷۳ء میں تفویض ہوئی SOURCE MATARIAL کا اچھا خاصہ ذخیرہ PARTITION کی نذر
ہوگیا۔ جو کچھ یہاں بچا اُن تک رسائی مختلف عملی دشواریوں کی بنا پر بھرپور نہ ہوسکی۔ جس دور میں انہوں نے
تحقیق کا ارادہ ظ، انصاری کی تحریک پر کیا تھا وہ دور بنگال میں اردو کے لئے TRYING TIME کا تھا۔
کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کا الگ شعبہ بھی نہیں تھا۔ یہ MODERN INDIAN LANGUAGES کا ایک حصّہ تھا۔ اس میں
جو اساتذہ تھے انہیں ریسرچ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا ایک اچھے گائڈ کا مسئلہ بھی تھا۔ ڈاکٹر زبیر صدیقی
ان کے گائڈ ہوئے جو اسلامک ہسٹری کے استاد تھے۔

اب آیئے دوسرے اسٹیج میں موصوف نے کیا کیا، دیکھا جائے۔ یہاں بھی انہوں نے سخت ٹھوکریں
کھائی ہیں۔ روا روی میں کچھ چیزیں ایسی نقل ہوگئی ہیں جن کا سرے سے بنگال کی اردو تاریخ سے براہ راست
نہ بالواسطہ تعلق ہے۔ بنگال کے سیاسی اور تاریخی حالات کا تذکرہ کم از کم اس کتاب میں اردو کے CONTENT
میں ہونا چاہیئے تھا۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ بنگال پڑھ رہے ہیں۔ کسی کسی پیراگراف پر
اور یجنل ORIGINAL سے ہو بہو نقل ہونے کا گمان ہوتا ہے ORIGINAL سے نقل کا حق محقق کو ہے
مگر اتنا بھی نہیں کہ موضوع تحقیق کا مزاج ہی مجروح ہوجائے۔ کتاب میں بنگال میں اردو کے لسانی، معاشرتی،
تہذیبی پہلوؤں کا ذکر ضمناً ہوا ہے اور اس سلسلے میں مشہور محققین اور ماہر لسانیات کے خیالات کو جمع کردیا
گیا ہے ———— سنیتی کمار چٹرجی، ڈاکٹر ایس کے ڈے اور گل کرسٹ وغیرہ کے خیالات۔
ان تسامحات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حقائق کی SIFTING کے وقت انہیں ذہنی یکسوئی میسر نہ تھی یا
اس سے کام ہی نہیں لیا۔

تیسرے مرحلے میں بھی پروفیسر موصوف کی کمزوریاں نمایاں ہیں۔ ان کے بیانات میں منطقی الجھاؤ
اور امکانی حقائق کی بہتات ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مصنف جگہ جگہ ٹھوس نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر رہ گئے ہیں۔
شاید اس کی وجہ ان کی سہولت اور عجلت پسندی ہے یا پھر یہ کہ وہ FULL TIME RESEARCH

WORKER نہیں تھے۔ ورنہ قلم چلاتے وقت سوچتے کہ اردو کی صنفی اور شخصی اہمیت کو مدّنظر رکھتے ہوئے اسی طرح کی CONTRIBUTION دیتے۔ بنگال کے اس خاص اردو شعری و نثری ماحول کا ذکر اس کتاب میں [illegible]س رسما ہوا ہے اور ثبوت میں صرف چند اشعار اور اقتباسات نقل کیے گئے ہیں جبکہ اس عہد کی نثر و شاعری میں جو خوبیاں اور کوائف خاص طور پر جھلکتے ہیں ان کی نشاندہی اور شناخت کے لیے ضرورت تھی کہ اس دور کے شعرا کی شاعری اور نثاروں کی نثر کا ایسا محاسبہ کیا جاتا جس سے اس دور کے اردو ادب کی زیادہ جامع تصویر ابھرتی۔ مگر یہاں حال یہ ہے کہ واجد علی شاہ اختر جیسی قدآور اور عہد ساز شخصیت پر محض ۶ صفحات صرف کیے گئے ہیں۔ لیکن اس میں بھی ان کی ادبی شخصیت اور ان کے ادب کا کوئی معقول تحقیقی مطالعہ نہیں کر سکے ہیں۔ ان کی ادبی، فنی، تہذیبی سرگرمیاں اور معاشرتی بلندگامی اس بات کی متقاضی تھیں کہ ان پر خصوصی توجہ صرف کی جاتی تاکہ اس عہد زریں کے CONTRIBUTION کا سارا نقشہ قاری کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا۔

بنگال میں اردو ادب کی تحقیقی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے بے حد ضروری تھا کہ لفظی و معنوی تحقیق و تنقید کے کم از کم ان مروجہ اصول کو ہی بروے کار لایا جاتا جو انیسویں صدی کے وسط تک شعر و ادب کے خاص پیمانے تصور کیے جاتے تھے۔

اُردو کے اہم مراکز اور اسکولوں کو جن میں دلّی، علی گڑھ، لکھنؤ اور عظیم آباد بھی شامل ہیں، اس بات سے انکار نہیں کہ برطانوی حکومت نے اپنے انتظامیہ میں مقامی باشندوں کو شامل کرنے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے نوکر شاہوں کو ہندوستانی زبان سکھانے کے لیے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی تھی — — اس دور کے برگزیدہ ادیب شاعر اس کالج میں جمع ہو گئے تھے۔ اور اس اجتماع نے ایک طرح سے دلی اور لکھنؤ سے جو گہوارہ ہائے اردو تھے مرکزیت چھین لی تھی۔ زبان کوئی بھی ہو وہ وہیں پنپتی ہے جہاں سیاسی و معاشی اقتدار کا مرکز ہوتا ہے اور ارباب اقتدار سیاسی مصلحت بینیوں کی بنا پر اس زبان کو مراعات خصوصی بخشتے ہیں۔ انیسویں صدی میں فروغ اردو کے لیے فورٹ ولیم کالج کی جو گرانقدر خدمات ہیں اس پر تحقیقی کام کا ہونا بہت ضروری تھا۔ اس سے قبل فورٹ ولیم کالج پر جو کچھ بھی کام ہوا ہے وہ غیر تشفی بخش اور تشنہ تھا۔ وفا راشدی نے بھی بنگال میں اردو کی تاریخ مرتب کی ہے لیکن وہ اتنی جامع نہیں جتنی زیر بحث کتاب۔ اس کے علاوہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے بھی بنگال میں اردو پر کام کیا ہے

لیکن ان کی تصنیف پر کچھ کچھ کمپائلیشن اور DICTIONARY OF POETS کا گمان ہوتا ہے۔ لطیف الرحمٰن صاحب کی کتاب "نساخ سے وحشت تک" ایک ایسی کتاب ہے جس پر کسی حد تک بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

زبان اور بیان کی سلاست و روانی اس کتاب کی خوبیوں میں کسی طرح غیر اہم نہیں۔ اور یہی بات پروفیسر موصوف کو دیگر معروف مرتبینِ تاریخ اردو سے ممتاز کرتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں ان پر فکشن کی زبان کا شدید حملہ ہوا ہے اور حملے کی تاب نہ لاکر وہ یہ بھی لکھ دیتے ہیں "..... اور اردو زبان بنگال کے گاؤں گاؤں میں پھیل گئی"۔ تحقیق کی یہ زبان معتبر نہیں۔ تحقیق کی زبان مفہوم کی قطعیت کی ضامن ہوتی ہے۔

اس کتاب میں جن جن ذرائع سے مواد کی تحقیق ہوئی ہے ' ماخذ میں ان کا تذکرہ نہال صاحب فٹ نوٹ میں کرتے گئے ہیں کتاب کی ترتیب کا سب سے اہم جز ہے "اشاریہ" جو آخر میں ہے 'اشاریے اردو تصانیف میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ کتاب میں چند فوٹو گراف غیر ضروری ہیں عموماً ریسرچ کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔ اوّل KNOWING LESS & LESS ABOUT MORE & MORE دوئم KNOWING MORE & MORE ABOUT LESS & LESS پروفیسر موصوف کی یہ تصنیف بلا چون و چرا زمرۂ اول میں لکھی جائے گی۔

○ ○

ڈاکٹر احمر لاری
گورکھپور یونیورسٹی

ڈاکٹر جاوید نہال کا تحقیقی مقالہ

انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب

مقالے کا جائزہ لینے سے قبل میں ڈاکٹر صاحب اور مقالے کے متعلق بطور تمہید چند باتیں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس سے جائزے میں سہولت ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ انہوں نے یہ مقالہ اس وقت قلم بند کیا جب وہ مولانا آزاد کالج کے شعبۂ اردو میں استاد تھے۔ انہیں اس مقالے پر کلکتہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری دی ہے۔ بغیر پی، ایچ ڈی ڈی لٹ کی ڈگری ملنے کا مطلب یہ ہوا کہ جب انہوں نے ڈی۔ لٹ میں داخلہ لیا ہوگا تو انہیں بی اے اور ایم۔ اے کے درجات کو پڑھانے کا کم از کم سات سال کا تجربہ ضرور رہا ہوگا۔ گویا انہوں نے ایم۔ اے کرنے کے فوراً بعد تحقیق کے میدان میں قدم نہیں رکھا، بلکہ ایک پختہ کار استاد کی حیثیت سے اس راہ پر گامزن ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا بیشتر مواد کلکتہ ہی میں ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری اور نیشنل لائبریری میں دستیاب ہے، اس لیے انہیں مواد کی فراہمی کے لیے دور دراز کے سفر کے مسائل بھی درپیش نہ تھے۔ یہ مقالہ انہوں نے "چھ سال کی طویل محنت اور عرق ریزی کے بعد کئی سو کتابوں کی مدد سے[1]"، سپرد قلم کیا ہے اور یہ مع ضمیمہ ۳۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقالے کے شروع اور آخر میں چند اہم علمی و ادبی شخصیتوں کے تاثرات بھی درج ہیں جن میں انہوں نے اس مقالے کی بے حد تعریف کی ہے۔

یہ مقالہ پہلی بار ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں ابواب کی تقسیم نہیں ہے۔ مقدمے سے لیکر اشاریۂ کتب تک ۸۲ عنوانات شائع کیے گئے ہیں۔ آخر میں ایک ضمیمہ بھی۔ چند مجموعی عنوانات سے قطع نظر، یہ عنوانات مصنف کی بنیاد پر ہیں۔ اصل کتاب میں ۷۲، اور ضمیمے میں ۵ مصنفین شامل ہیں، یعنی اس مقالے میں ۷۷ مصنفین

---

[1] ڈاکٹر جاوید نہال انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب لسان راہ، ص: ز کتاب کے شروع میں سنہ اشاعت درج ہیں سرورق آخری صفحہ پر احمد سعید ملیح آبادی اور ڈاکٹر عطا کریم کے تاثرات دیے ہوئے ہیں ان کے آخر میں تاریخ اور سنہ درج ہے۔ انہیں کی بنیاد پر سنہ اشاعت کا تعین کیا گیا ہے۔

اور ان کی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ مقالہ، یوں تو انیسویں صدی کے پورے بنگال کے اردو ادب کا احاطہ کرتا ہے، لیکن اس میں فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کی طرف خصوصی توجہ کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب دیباچے میں (جو نشان راہ" کے عنوان سے لکھا گیا ہے) رقم طراز ہیں:

فورٹ ولیم کالج کے ۴۵ سالہ عہد میں قصہ کہانیوں، تاریخ، مذہب اور علم و ادب کے موضوعات پر تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں تالیف و تصنیف ہوئیں۔ اس کالج کے بہت سے ایسے منشیوں کی تخلیقات، مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں جن کا ذکر کسی اردو کتاب میں بھی نہیں ملتا اور ان کی تالیفات گمنامی کی دبیز چادر میں لپٹی ہوئی ہیں ــــ میں نے اسی میدان کو اپنی ادبی جولانگاہ بنایا . . . . یہ بے حد مشکل کام تھا کیونکہ اس کے قبل بنگال میں اردو پر جو دو ایک کتابیں تالیف و ترتیب ہوئیں، ان میں فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کا تفصیلی حال تو کجا، ان کے نام اور ان کی تالیفات کے سلسلے میں غلط بیانی ہوئی ہے۔ ان میں بہتیری کتابیں ان کے مؤلفین کی جگہ دوسروں سے منسوب کر دی گئی ہیں۔"[1]

ڈاکٹر صاحب نے اپنے پیش رو مصنفین پر جن کوتاہیوں اور تسامحات کا الزام عائد کیا ہے خود ان کا مقالہ بھی ان سے بری نہیں۔ بلکہ انھوں نے اپنی گراں قدر تحقیق کاوشوں سے ان کوتاہیوں اور تسامحات میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہے۔ بریں بنا ان کا مقالہ آئندہ کے محققین کے لیے انتہائی گمراہ کن ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مقدمہ میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا سے بحث کی ہے اور اس کا رشتہ بنگال اور بنگالی سے جوڑتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے: "مسلمانی بنگلہ اصل میں اردو کی بنگالی شکل ہے، صرف فعل بدل گئے ہیں، لہجے اور صوت کے اعتبار سے کچھ فرق نہیں۔" (ص ۱۴) جسے لسانیات سے ذرا بھی مس ہوگا وہ ان کے اس عالمانہ بیان پر سر دھنے بغیر نہیں رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کی عمر، سنہ پیدائش اور سنہ وفات کے تعین میں بڑی بے اصولی برتی ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں نہ تو کوئی حوالہ دیا ہے اور نہ ہی دلائل و براہین کے ذریعے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ صرف دعویٰ کرنے پر اکتفا کیا ہے، دلیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ گویا ع مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

---

[1] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، "نشان راہ"، ص ۵، ۶۔

۱۔ "سید حیدر بخش حیدری کی ولادت دلی میں ہوئی۔ سنہ پیدائش پر اختلاف ہے۔ مگر جس وقت حیدری کلکتہ آئے تھے ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ چنانچہ ان کا سنہ پیدائش ۱۷۶۰ء قرار دیا جاسکتا ہے۔" (ص ۱۱۹)

کلکتہ آنے کے وقت حیدری کی عمر کا تعین بغیر کسی حوالے یا دلیل کے کیا گیا ہے۔

۲۔ "ولا کا سنہ پیدائش معلوم نہیں۔ لیکن کوائف سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں ۱۷۷۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔" (ص ۱۶۲)

کوائف پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔

۳۔ "جوان کے سنہ وفات پر اختلاف ہے۔ لیکن ۱۸۲۷ء تک وہ بقید حیات تھے۔ ان کا انتقال بھی کلکتہ میں ہوا۔ قیاس ہے کہ ۱۸۴۰ء اور ۱۸۴۵ء کے درمیان جوان دار فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کر چکے تھے۔" (ص ۱۸۸)

یہ بات کہ کاظم علی جوان ۱۸۲۷ء تک بقید حیات تھے، بغیر کسی حوالے کے کہی گئی ہے۔ ان کا قیاس بھی صحیح نہیں۔ جوآن کا انتقال کالج کی ملازمت کے دوران ہی ۳ جولائی ۱۸۱۶ء کو ہوا تھا۔[۱]

۴۔ "تارنی چرن متر ابنگال کے سپوت ہیں، جن کو ہندوستانی زبان سے زبردست شغف تھا۔ ضلع ہوگلی کے ایک گاؤں میں ۱۷۷۲ء میں ان کا جنم ہوا تھا، مگر ان کا خاندان کلکتے میں آباد ہو گیا تھا۔" (ص ۲۸۰)

سنہ پیدائش یا جائے پیدائش کے متعلق کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مصنفین اور ان کی تصانیف کے متعلق اکثر و بیشتر ناقص یا غلط معلومات فراہم کی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

۵۔ (الف) گلکرسٹ کی تالیف "مشرقی زباں داں" (ORIENTAL LINGUIST) کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ کتاب گلکرسٹ کی واپسی کے بعد ۱۸۰۶ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔" (ص ۱۷)

یہ سنہ "مشرقی زباں داں" کی پہلی اشاعت کا نہیں ہے۔ پہلی بار یہ ۱۷۹۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔[۲] اس کا ایک نسخہ نیشنل لائبریری کلکتہ میں موجود ہے۔ ہندوستان سے اڈنبرا واپس جانے کے بعد گلکرسٹ نے THE BRITISH INDIA MONITOR کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس میں

---

[۱] سا گروار شنے، فورٹ ولیم کالج (ہندی)، ص ۹۳۔ [۲] ڈاکٹر عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، (ص ۸۴ - ص ۹۰ -

ORIENTAL LINGUIST.T کے علاوہ دوسری کتابوں کے اجزا بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کی پہلی جلد ۱۸۰۶ء
میں اور دوسری جلد ۱۸۰۸ء میں اڈنبرا سے شائع ہوئی تھی[۱]

(ب) گلکرسٹ کی تالیف "ہندوستان کی مقبول ترین زبان (THE STRANGERS EAST INDIA
GUIDE TO THE HINDUSTANI OR GREAT POPULAR LANGUAGE OF INDIA)
کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ بھی گلکرسٹ کی کتاب ہے اور رومن لپی میں لکھی گئی ہے۔ ۱۸۰۸ء میں ہندستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔" (ص ۴۲)
موصوف کی یہ اطلاع ناقص ہے کہ یہ کتاب رومن لپی میں لکھی گئی ہے۔ گلکرسٹ نے قواعد کے تمام رموز و نکات اور دیگر تفصیلات انگریزی میں لکھے ہیں۔ البتہ مثالیں ہندوستانی زبان اور رومن رسم الخط میں ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ کتاب پہلی بار ۱۸۰۸ء میں نہیں بلکہ ۱۸۰۲ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی، دوسری بار یہ ۱۸۰۸ء میں ہندوستانی پریس ہی سے شائع ہوئی اور تیسری بار ۱۸۲۰ء میں لندن سے شائع ہوئی۔[۲]

۲۰۔ (الف) تھامس روبک کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جان بارتھوک گلکرسٹ کی ہندوستان سے مراجعت کے بعد ان کی جگہ پروفیسر جیمس مویٹ کو ملی جیمس مویٹ پروفیسر مقرر کیے گئے اور نائب پروفیسر ولیم ٹیلر ہوئے۔ ولیم ٹیلر کے بعد یہ عہدہ تامس روبک کو ملا۔" (ص ۷۷)

ولیم ٹیلر شعبۂ ہندوستانی کے نائب پروفیسر کبھی نہیں رہے۔ گلکرسٹ کے انگلستان واپس جانے کے بعد جیمس مویٹ پروفیسر ہوئے۔ اس وقت ولیم میک ڈوگل نائب پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ ۲۰ جنوری ۱۸۰۸ء کو جب جیمس مویٹ اپنے عہدے سے مستعفی ہوئے تو ولیم ٹیلر کو پروفیسر کا عہدہ ملا اور وہ اس عہدے پر ۲۲ مئی ۱۸۲۳ء تک کام کرتے رہے۔ اس دوران ۱۹ نومبر ۱۸۱۲ء تا ۲۳ دسمبر ۱۸۱۶ء رسل مارٹن نائب پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کے مستعفی ہونے کے بعد تھامس روبک کو دسمبر ۱۸۱۶ء میں نائب پروفیسر مقرر کیا گیا اور وہ اپنی وفات تک اس عہدے پر برقرار رہے[۳] ۸ دسمبر ۱۸۱۹ء کو کلکتے ہی میں ان کا انتقال ہوا۔[۴]

۱۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات (ص ۹۲) ۲۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات (ص ۸ ۱۸ اور ۱۸ ۶۔ ۶۱۹ ۔ ۳۔ لکشمی ساگر وارشنے فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۳ ۱۔ ۴۔ ستی رنجن بھٹاچاریہ، بنگال میں اردو زبان و ادب، ص ۴۴۔

(ب) تھامس روبک کی تالیف "اینلس آف دی کالج آف فورٹ ولیم (ANNALS OF THE FORT WILLIAM COLLEGE) کے بارے میں لکھتے ہیں: اس میں ۱۸۱۶ء تک کی روداد تفصیل سے درج ہے۔ پروفیسر تھامس روبک کی یہ کتاب ۱۸۱۶ء میں ہندوستانی پریس سے ہی شائع ہوئی تھی۔" (ص ۶۳)

دراصل یہ کتاب ۱۸۱۹ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی تھی اور اس میں ۱۸۱۸ء تک کی روداد درج ہے۔ یہ کتاب میرے پیش نظر ہے اور میرے مآخذ میں شامل ہے۔

۷۔ (الف) موصوف نے میر شیر علی افسوس کے بارے میں مختلف اور متضاد بیانات دیے ہیں ص ۱۰۴ پر لکھتے ہیں: "مختلف شہروں کا چکر کاٹنے اور کئی درباروں سے وابستگی کے بعد وہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ آئے اور ہندوستانی شعبہ کے روح رواں جان گلکرسٹ کی سفارش پر کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے نائب میر منشی مقرر کیے گیے۔"

افسوس نے "باغ اردو" کے دیباچے میں خود لکھا ہے کہ لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ نے ان کو بلوایا، ان کا کلام سنا اور یہ مژدہ سنایا کہ وہ اسی وقت سے کمپنی کے ملازم مقرر کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ملازمت حاصل کر لینے کے بعد افسوس کلکتہ آئے اور فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی میں مترجم کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ نہ تو انہیں گلکرسٹ کی سفارش کی ضرورت تھی اور نہ ہی وہ نائب میر منشی مقرر کیے گیے۔

(ب) ص ۲۸۸ پر لکھتے ہیں: "میر بہادر علی حسینی کو میر منشی کے عہدے سے الگ کر دیا گیا۔ ان کی جگہ ۱۸۰۶ء میں میر شیر علی افسوس کو میر منشی مقرر کیا گیا۔" جب کہ وہ ص ۸۸ پر لکھ چکے ہیں کہ "میر بہادر علی حسینی ۱۸۰۸ء کے دسمبر میں میر منشی کے عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے اور میر شیر علی افسوس ان کے جانشین ہوئے تھے۔"

صحیح صورت حال یہ ہے کہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۰۴ء کو کالج کونسل کی کارروائی کے مطابق میر بہادر علی حسینی کو میر منشی کے عہدے سے ہٹا کر مترجم مقرر کیا گیا اور اسی تاریخ سے افسوس کو میر منشی کا عہدہ سونپا گیا۔ جس پر وہ اپنی حیات کے وقت تک برقرار رہے[۱] ۱۹ دسمبر ۱۸۰۹ء کو ان کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ تارنی چرن مترا میر منشی مقرر ہوئے[۲]

---

[۱] ڈاکٹر عبیدہ بیگم فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ص ۳۴۱ [۲] لکشمی ساگر واشنے: فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۷۹، عتیق صدیقی: گلکرسٹ اور اس کا عہد، فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۸۴۔

(۸) اب چند کتابوں کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی کاوشوں کے نمونے دیکھیے:

"اتالیق ہندی" THE HINDEE MORAL PERCEPTOR. ڈاکٹر صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں: "اتالیق ہندی کا ترجمہ گلکرسٹ نے خود انگریزی اور ہندوستانی میں کیا تھا۔ اشعار اور قطعات کے ترجمے میں اس نے مظہر علی خاں ولاؔ سے مدد حاصل کی تھی۔ ولاؔ کے علاوہ کالج کے دوسرے منشیوں نے بھی گل کرسٹ کی معاونت کی تھی۔" (ص ۷۰)

"اتالیق ہندی" کا دیباچہ اور اس کے مشمولات ان تمام بیانات کی نفی کرتے ہیں۔ دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ گلکرسٹ نے "پند نامۂ سعدی" کا ترجمہ انگریزی نظم میں کیا تھا اور اس نے گلیڈون GLADWIN کا انگریزی نثر میں کیا ہوا ترجمہ شامل کر لیا تھا۔ کتاب کے آخر میں مظہر علی خاں ولاؔ کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہے۔ ایک جانب سعدیؔ کے فارسی اشعار ہیں اور دوسری جانب ولاؔ کے ترجمہ کیے ہوئے اردو اشعار۔ "اتالیق ہندی" کا ایک نسخہ نیشنل لائبریری کلکتہ میں موجود ہے۔[۱]

(۹) "نقلیات ہندی" THE HINDEE STORY TELLER. ڈاکٹر صاحب "نقلیات ہندی" کے بارے میں لکھتے ہیں: "گلکرسٹ کی یہ کتاب ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔ گلکرسٹ کے ایما اور خاص انتظام میں فارسی، رومن اور دیوناگری لپیوں میں شائع کی گئی تھی۔ اس میں ہندی کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور گلکرسٹ کے تراجم درج ہیں۔ "نقلیات ہندی" کا اردو ترجمہ گلکرسٹ کے ایما اور فرمائش پر تارنی چرن مترا نے کیا تھا۔ "نقلیات ہندی" کا دیباچہ خود گل کرسٹ نے لکھا ہے، اور ناقدانہ اور عالمانہ انداز میں لکھا ہے۔" (ص ۴۷)

ان کے اس بیان میں کئی تسامحات ہیں۔ "نقلیات ہندی" مختصر نقلوں کا مجموعہ ہے اور اس کی زبان ہندوستانی ہے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسے میر بہادر علی حسینی نے (جو اس زمانے میں ہیڈ منشی تھے) مختلف منشیوں کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ پہلی جلد میں گلکرسٹ کا انگریزی میں تحریر کردہ دیباچہ اور افتتاحیہ شامل ہے۔ دوسری جلد میں صرف دیباچہ ہے۔ پہلی جلد ۱۸۰۲ء میں اور دوسری جلد ۱۸۰۳ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔ "نقلیات ہندی" کی پہلی جلد رومن، فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں ہے۔ "نقلیات ہندی" کی دونوں جلدیں ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کی لائبریری میں موجود ہیں۔ گلکرسٹ اور تارنی چرن مترا کا اس ترجمے سے

---

[۱] ڈاکٹر عبید دستگیر: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ص ۵۰۰۔ ۵۰۱۔

[ک]وئی تعلق نہیں۔ تارنی چرن مترا نے غلام اکبر اور نور محمد کے ساتھ مل کر صرف اس کی تصحیح کا کام انجام دیا تھا۔ اس [س]لسلے میں گلکرسٹ کا یہ بیان ملاحظہ ہو: اس نے ۱۹ر اگست ۱۸۰۲ء کو انعام کے لیے سفارشی فہرست میں "نقلیات ہندی" کی دونوں جلدوں پر کل دو سو روپے انعام کی سفارش کی تھی اور رائے کے کالم میں لکھا تھا:

" THE HEAD MOONSHEE, WHO COLLECTED, TRANSLATED AND PREPARED)
THESE STORIES FROM VERIOUS SOURCES IN HIS OWN HOUSE WITH THE
AID OF OTHER MOONSHEE OCCASIONALLY.

(۱۰) "نقلیات لقمانی" یا "مشرقی داستان گو" انگریزی میں بھی اس کتاب کے دو نام ہیں (ORIENTAL FABULIST OR POLYGLOT TRANSLATION.)

ڈاکٹر صاحب نے "نقلیات لقمانی" اور "مشرقی داستان گو" کو دو الگ الگ کتابیں سمجھا ہے۔ اس کے برعکس "نقلیات ہندی" اور "نقلیات لقمانی" کو جو واقعی دو کتابیں ہیں وہ ایک ہی کتاب سمجھتے ہیں "مشرقی داستان گو" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> "مشرقی داستان گو" گلکرسٹ کی عمدہ مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ اس کتاب میں حکیم لقمان کی حکایات اور مشرقی کہانیاں فارسی، برج بھاشا اور سنسکرت سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں گل کرسٹ کو کالج کے منشیوں سے مدد ملتی تھی۔ ان میں تارنی چرن مترا، مظہر علی خاں ولاؔ، میر بہادر علی حسینی اور للوکب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (ص ۴۷)

[ڈ]اکٹر صاحب کو معلوم نہیں کیوں کر مغالطہ ہوا ہے کہ یہ حکایتیں فارسی، برج بھاشا اور سنسکرت سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ [در]اصل اس کتاب میں ACSOP'S FABLES (حکایات لقمان) اور دیگر قدیم قصوں کے انگریزی سے [ہن]دوستانی، فارسی، عربی، برج بھاشا، بنگلہ اور سنسکرت میں ترجمے درج ہیں۔ مختلف زبانوں کے یہ ترجمے رومن [رس]م الخط میں شائع کیے گئے ہیں۔ اس کے مترجمین میں تارنی چرن مترا، امانت اللہ، شدل مشر پنڈت، میر بہادر علی [حسی]نی، میر شیر علی افسوس، للو لال جی کوی اور غلام اشرف شامل تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مظہر علی ولاؔ کا نام بھی مترجمین [میں] شامل کر دیا ہے، جو صحیح نہیں۔ گلکرسٹ نے ہدایت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیا تھا۔ یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی[۲]
آئندہ صفحات میں ڈاکٹر صاحب نے "نقلیات لقمانی" کو ایک دوسری کتاب کی حیثیت سے پیش کیا ہے

---

[۱] [ڈاک]ٹر عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات۔ ص ۴۱۶ - ۴۱۸ [۲] ڈاکٹر عبیدہ بیگم فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات۔ ص ۴۲۰۔

اور اسے مکمل طور پر تارنی چرن متر کا کارنامہ قرار دیا ہے (ص ۲۸۱ - ۲۸۳) لیکن جو تفصیلات پیش کی ہیں اور مثالیں دی ہیں میر بہادر علی حسینی کی مرتبہ "نقلیات ہندی" سے متعلق اور ماخوذ ہیں۔ انکا نقلیات لقمانی" سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

(۱۱) تاریخِ آشام (آسام)۔ ڈاکٹر صاحب نے میر بہادر علی حسینی کی " تاریخِ آشام" کو چار مقالات (ابواب) پر مشتمل قرار دیا ہے (ص ۸۹)۔ یہ بات صحیح نہیں۔ حسینی نے ولی احمد شہاب الدین طالش کی فارسی تاریخ "فتحیہ عبریہ" کا "تاریخ آشام" کے نام سے ۱۸۰۵ء میں ترجمہ کیا تھا اور یہ اپنے اصل ماخذ کی طرح ایک مقدمہ اور دو مقالات پر مشتمل ہے۔[۱] موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب چھپ نہ سکی، حالانکہ یہ ۱۸۰۵ء ہی میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔[۲]

(۱۲) " آرائشِ محفل" از میر شیر علی افسوس۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں "سلاطین ہنود اور مسلمین کی جامع اور مبسوط تاریخ بیان ہوئی ہے۔" (ص ۱۰۳) جبکہ یہ کتاب صرف سلاطینِ ہنود کے ذکر پر مشتمل ہے۔ افسوس مسلمان بادشاہوں کا حال بھی لکھنا چاہتے تھے، جیسا کہ "آرائشِ محفل" کے دیباچے سے ظاہر ہے، مگر وہ یہ کام انجام نہ دے سکے۔[۳]

دوسروں کے بیانات سے غلط نتائج اخذ کرنے کی بھی ایک مثال دیکھیے۔ ڈاکٹر صاحب میر شیر علی افسوس کے حال میں لکھتے ہیں :

"سخن شعرا میں نساخ نے افسوس کے حال میں لکھا ہے کہ دیوان ان کا نظر سے گذرا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ افسوس کا دیوان شائع ہو چکا تھا، مگر اسکے کلام کی کوئی کاپی شاید ہی دستیاب ہوسکے۔" ص ۱۱۱

نساخ کے بیان سے یہ بات قطعی واضح نہیں کہ انہوں نے افسوس کا دیوان قلمی صورت میں دیکھا تھا یا مطبوعہ شکل میں؛ حقیقت یہ ہے کہ افسوس کا دیوان ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب مرحوم نے اپنے مضمون "اصولِ تحقیق" میں لکھا ہے کہ "تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے"[۴] ان کے نزدیک تحقیق کے لیے ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ "بات اہم ہو یا غیر اہم، محقق کو حق تحقیق ادا کرنا چاہیے ——— مزید یہ کہ اگر بے احتیاطی عادت بن گئی تو ان امور میں بھی جو خود لکھنے والے کی نظر میں اہم ہیں، اس سے گریز نہیں"[۵] سطور بالا میں زیر بحث مقالے کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے

۱؎ ڈاکٹر عبیدہ بیگم: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۴۶ ۔ ۲؎ ۵۴۵ ۔ ۳؎ سید منقبت الحسن: کلکتہ کے قدیم اردو مطابع اور ان کی مطبوعات ایک تذکرہ ص ۲۰ و ۴۴ ۔ ۴؎ ایضاً ۵؎ ڈاکٹر عبیدہ بیگم فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ص ۵۳۹ ۔ ۶؎ ۵۴ ۔ ۷؎ رہبر تحقیق ۔ ص ۱۰۹ ۔ ۸؎ رہبر تحقیق ص ۱۱۰ ۔

اس سے یہ بات واضح ہے کہ ڈاکٹر جاوید نہال صاحب نے تحقیق کی اس بنیادی شرط کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے مآخذ و مصادر سے استفادہ کرنے میں بے احتیاطی برتی ہے۔ جن کتابوں پر تبصرہ کیا ہے، خواہ وہ قلمی ہوں یا مطبوعہ، ان کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ہے، اسی لیے ناقص اور غلط معلومات فراہم کی ہیں۔ انہوں نے ایسے بیانات دیے ہیں یا ایسے مفروضے قائم کیے ہیں، جن کے لیے ان کے پاس کوئی حوالہ یا سند نہیں۔ انہیں دلائل و براہین کے ذریعے پایۂ استناد عطا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی ہے۔ مجھے یہ بھی شک ہے کہ اکثر مقامات پر انہوں نے ثانوی ذرائع سے استفادہ کیا ہے اور حوالۂ اصل ماخذ کا دیا ہے۔ جیساکہ تمہید میں عرض کر چکا ہوں، ڈاکٹر صاحب نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔ تحقیق کے درمیان میں بھی وہ اسی روش پر قائم ہیں۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ●●

ڈاکٹر جاوید نہال

۳۸۔ رپن لین، کلکتہ

جواب

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اپنی مصروفیات اور ناسازی طبیعت کی وجہ سے دونوں مقالے کو میں بالاستیعاب پڑھ نہیں سکا ہوں۔ لہذا کوئی رائے دینے سے قاصر ہوں میری ذاتی رائے ہے کہ فاضل مقالہ نگاروں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق رائے قائم کی ہے۔ اور ہر شخص کی اپنی صوابدید ہوتی ہے۔

لہذا میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے مجلہ میں مقالہ شائع کرنا چاہتے ہیں تو من و عن شائع کر دیجیے اور انہوں نے جن خامیوں اور کمزوریوں کی طرف نشاندہی کی ہوگی وہ میرے لیے مشعل راہ بن سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں میری تھیسس دو چار اتفاقی غلطیوں اور بعض جگہ تکرار کے علاوہ مکمل ہے۔

ڈاکٹر سید حسین احمد
درگاہ شاہ ارزانی، پٹنہ

ڈاکٹر اسما سعیدی کا تھیسس

دیوان حسرت عظیم آبادی

ڈاکٹر اسما سعیدی نے دیوان حسرت عظیم آبادی کو ایڈٹ کیا ہے اور اس پر ایک طویل تحقیقی مقدمہ لکھا ہے، جس پر دانش گاہ علی گڈھ نے انہیں ۱۹۶۸ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے نوازا ہے۔ دیوان حسرت مع مقدمہ ۱۹۷۸ء میں ترقی اردو بورڈ دہلی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔

۴ صفحات پر مشتمل گزارش مرتب، ہفت ابواب پر مقدمہ، ۲۶۳ صفحات پر مشتمل متن دیوان، صفحات پر مشتمل فہرست کتب، ص۴۸۰ پر چند مستند آرا کے عنوان سے قاضی عبدالودود صاحب کے تاثرات اور ص۴۸۱ سے ص۴۸۴ تک ممتحن کی رپورٹ کی نقلیں ہیں۔ پوری کتاب ۴۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر اسما سعیدی "گزارش مرتب" میں ص۱ پر تحریر کرتی ہیں:

"میرے اس تحقیقی کام کو ڈاکٹر خورشید الاسلام صاحب، پروفیسر آل احمد سرور صاحب امتیاز علی عرشی صاحب اور قاضی عبدالودود صاحب وغیرہ اصحاب علم نے بہت پسند فرمایا تھا۔ حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔ اس کام سے متعلق ممتحنین ڈاکٹر نجیب اشرف ندوی مرحوم، ڈاکٹر عبدالقادر سروری صاحب مرحوم اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب کی رپورٹیں بہت عمدہ آئی تھیں۔ یونیورسٹی میں ان کا چرچا تھا۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب وائس چانسلر تھے، موصوف بھی بہت خوش ہوئے تھے، ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنے کے بعد ان کی نقول لے آئی تھی، یہاں کرنل سید بشیر حسین زیدی صاحب سابق وائس چانسلر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے بھی انھیں دیکھ کر اظہار مسرت فرمایا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے شرف ملاقات حاصل ہوا تو موصوف نے مبارک باد دی۔ رپورٹیں پڑھ کر بہت خوش ہوئے، فرمایا میں جانتا تھا تم بہت اچھا کام کروگی۔"

قاضی عبدالودود صاحب اپنے تاثرات میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اسما سعیدی نے دیوان حسرت کا ناقدانہ نسخہ بڑی احتیاط سے مرتب کیا ہے۔ اور حسرت کی زندگی اور ان کے عہد سے متعلق کوئی اہم بات نظر انداز نہیں کی۔" (۲۷ اپریل ۱۹۷۵) دیوان اطمینان بخش طور پر مرتب کیا ہے اور اس پر ایک محققانہ مقالہ لکھا ہے۔" (۱۴ اپریل ۱۹۷۸ء)

گزارش مرتب اور قاضی عبدالودود صاحب کے تاثرات پڑھنے کے بعد مجھے بھی جناب ہنس راج رتن اور دوسرے تبصرہ نگاروں کی طرح اس تھیسس کی تعریف و توصیف میں زمزمہ خواں ہو جانا چاہیے تھا لیکن ؂

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش　　خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

باب اول کا عنوان ہے "تاریخی پس منظر" اس عنوان کے تحت ڈاکٹر اسما سعیدی نے عہد بہادر شاہ اول سے لیکر عہد مبارک الدولہ تک کا ذکر کیا ہے۔ سیر المتاخرین، مظفر نامہ، تاریخ علی وردی خاں، تاریخ سلیم اللہ اور FALL OF THE MUGHAL EMPIRE کی مدد سے اس دور کے سیاسی حالات کی ایک جھلک پیش کی ہے۔

باب اول "تاریخی پس منظر" میں بحث و مباحثہ کی کافی گنجائش ہے، تاریخی غلطیاں بھی موجود ہیں، مثلاً ڈاکٹر اسما سعیدی ص ۲۸ پر تحریر کرتی ہیں "عبدالرشید خاں نے ہیبت جنگ کو قتل کیا" لیکن صاحب سیر المتاخرین لکھتے ہیں کہ رشید نے کمر سے کٹاری نکال کر ہیبت جنگ کے پیٹ پر ماری مگر اضطراب کی وجہ سے کارگر نہ ہوئی۔ مراد شیر خاں نے جو ہاتھ میں تلوار لیے تھا ایسا مارا کہ ہیبت جنگ کے شانہ سے گذر کر تہیگاہ تک جا پہونچا۔ اسی طرح کی غلطیاں دوسری جگہ بھی موجود ہیں لیکن باب دوم، سوم، چہارم اور پنجم زیادہ اہم ہیں، اس لیے ان ابواب کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

"بیدل عظیم آبادی نہیں تھے (ص ۵۷)" "تصانیف بیدل کی گواہی سے پتہ نہیں چلتا کہ وطن کہاں تھا اور پیدائش کہاں کی ہے۔" (بحوالہ قاضی صاحب۔

خود قاضی صاحب کے دریافت کردہ حوالے، لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی کا تذکرہ "شام غریباں" کی طرف رجوع کیا جاتا تو بیدل کا مولد و وطن مل جاتا۔ شفیق نے شاہ محمد شفیع وارد کی تالیف "مرآۃ الواردات" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "بیدل بنگال کے مقام اکبر نگر عرف راج محل میں تولد ہوئے اور ایک عرصے تک زندگی اسی مقام پر بہ اطمینان بسر کی"

"علی ابراہیم خاں کے خالو ظاہر حسین خاں اور دردمند کے دوستانہ تعلقات تھے۔" (ص ۶۳)

تعجب ہے کہ گلزار ابراہیم کی اتنی آسان عبارتیں سمجھ میں نہ آسکیں جس میں لکھا ہے کہ "علی ابراہیم خاں کے ماموں زاہد حسین خاں اور دردمند میں دوستانہ تعلقات تھے (رجوع تذکرہ گلزار ابراہیم)

"مرزا علی لطف نے حالات دردمند میں کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ دردمند کا سنہ انتقال ۱۱۷۶ھ غلط درج کرکے عام غلط فہمی پیدا کردی۔ تذکرہ گلزار ابراہیم مخطوطہ رضا لائبریری میں ۱۱۷۹ھ مندرج ہے۔ علی ابراہیم خاں کے معتبر بیان وشہادت کے پیش نظر کوئی وجہ نہیں کہ ان کے تحریر کردہ ۱۱۷۹ھ کو مستند اور صحیح نہ مانا جائے۔"

گلزار ابراہیم کے کئی نسخے پٹنہ میں ہیں۔ سبھی میں دردمند کا سنہ انتقال ۱۱۷۶ھ درج ہے۔ اگر گلزار ابراہیم مخطوطہ رضا لائبریری بخط مصنف ہے تو اس کو ترجیح دی جاسکتی ہے، ورنہ ۱۱۷۹ھ کتابت کی غلطی ہے۔

فغاں کے مرشدآباد جانے کا کئی جگہ تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور مخزن نکات کی عبارت بھی پیش کی گئی ہے۔ لیکن فغاں کا مرشدآباد جانا قدیم تذکروں سے ثابت نہیں۔ مخزن نکات نسخہ لندن میں بھی مرشدآباد جانے کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ اس میں درج ہے کہ "نواب غازی الدین خاں وزیرالمالک سے رنجش کے باعث بڑی ذلت سے شہر سے نکل کر پٹنہ پہنچے۔" نکات الشعرا، تذکرہ ریختہ گویاں، تذکرہ شورش، تذکرہ مسرت افزا، تذکرہ میرحسن، عقد ثریا، ریاض الفصحا، گلشن سخن وغیرہم میں مرشدآباد جانے کا ذکر نہیں ہے۔

"جس زمانے میں شورش نے حال فغاں سپرد تذکرہ کیا ہے فغاں کو عظیم آباد آئے ہوئے تھوڑی مدت ہوئی تھی (ص ۵۶) تھوڑی مدت سے مطلب زیادہ سے زیادہ دس سال؛ اور فغاں کا ترجمہ شورش نے تقریباً ۱۱۹۱ھ میں سپرد تذکرہ کیا ہے لہٰذا مقالہ نگار کے مطابق فغاں ۱۱۸۱ھ کے قریب عظیم آباد آئے ہوں گے۔ لیکن تذکرہ شورش نسخہ جونپور میں درج ہے کہ:

"فغاں تخلص در عشرہ ماہ محرم قبل از شمشیر خانی در عظیم آباد تشریف آوردہ"

جس طرح نادرشاہی، غارت گری اور کشت وخون کے لیے پورے ہندوستان میں مشہور ہے، اسی طرح "شمشیر خانی" شورش کے زمانے میں بہار میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ شمشیر خاں اور سردار خاں مہابت جنگ کے دو فوجی افسر تھے۔ مہابت جنگ نے ان دونوں کو معزول کردیا تھا۔ شمشیر خاں نے اپنی معزولی کا انتقام لینے کے لیے مہابت جنگ کے داماد ہیبت جنگ کے خلاف صف آرائی کی تو اس کی فوج نے عظیم آباد میں لوٹ، غارت گری اور کشت وخون کا بازار گرم کیا۔ شورش نے شمشیر خانی کی تلمیح سے یہی مراد لی ہے اور یہ واقعہ ۱۱۶۱ھ کے اوائل کا ہے (تفصیل کے لئے رجوع بسیرالمتاخرین) لہٰذا فغاں پہلی

مرتبہ محرم ۱۱۶۱ھ میں عظیم آباد آئے اور دوسری مرتبہ بقول شورش: "بعد تخلل سلطنت شاہ موصوف باز تشریف بہ عظیم آباد آوردہ" احمد شاہ ۱۱۶۸ھ میں معزول ہوئے لہٰذا فغاں دوسری مرتبہ ۶۹/۱۱۶۸ھ میں عظیم آباد آئے۔ شورش کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۱۶۹ھ میں فغان عظیم آباد میں موجود تھے "باحقر دوستی بسیار داشت و در محفل مشاعرہ تشریف می آورد۔" اور شورش نے جس مشاعرہ کا ذکر کیا ہے وہ ۱۱۶۹ھ میں ہوا تھا۔

" جناب ڈاکٹر ممتاز احمد کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ فغاں کو ظریف الملک کا خطاب احمد شاہ نے دیا میر حسن گردیزی، قائم، میر حسن کسی نے بھی اشارۃً اس کا ذکر نہیں کیا قاضی صاحب موصوف نے "نشتر عشق" کے حوالے سے اس کی تردید کی ہے فغاں کو ظریف الملک کا خطاب شتاب رائے نے دلوایا تھا"

تحقیق، حق کی تلاش کا نام ہے نہ کہ بھاری بھرکم شخصیت سے مرعوب ہو جانے کا۔ محترمہ نے قاضی صاحب کے فیصلے کو حرف آخر کا درجہ دیا ہے۔ ماخذ دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ قاضی صاحب جس زمانہ میں پروفیسر اختر اورینوی کی کتاب "بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا" پر تبصرہ کر رہے تھے، اس وقت تذکرہ شورش کا نسخہ جونپور میں نہیں ملا تھا لیکن محترمہ جس زمانے میں ریسرچ کر رہی تھیں۔ اس وقت تذکرہ شورش نسخہ جونپور مل چکا تھا لہٰذا محترمہ کو نسخہ جونپور سے استفادہ کرنا چاہیے تھا، کیونکہ شورش عظیم آبادی تھے، دوسرے فغاں کے گہرے دوستوں میں تھے۔ شورش خطاب کے متعلق صاف صاف لکھتے ہیں کہ:

"بخدمت مہاراجہ شتاب رائے دوستی پیدا نمودہ و بوسیلہ ظرافت چناں پیش آمدہ کہ التمغا ہم رسانیدہ و خطاب ظریف الملک مصاحب الدولہ یکہ تاز جنگ یافتہ۔"

شورش کے اس بیان کی تصدیق دیوان فغاں نسخہ دسنہ سے بھی ہوتی ہے۔ نسخہ دسنہ کے آخر میں ان کے خطابات ظریف الملک، مصاحب الدولہ، کوکہ خاں بہادر یکہ تاز جنگ مندرج ہیں۔ ہاں ڈاکٹر ممتاز احمد کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ فغاں کو ظریف الملک کا خطاب احمد شاہ نے دیا تھا۔ شورش نے اس بات کی طرف بھی اپنے تذکرہ میں اشارہ کیا ہے کہ فغاں کو احمد شاہ نے کون سا خطاب دیا تھا۔ شورش ترجمہ فغاں میں لکھتا ہے:

" بموجب طلب احمد شاہ بادشاہ روانہ طرف دہلی گردید در آنجا کوکا خان خطاب یافتہ "

فغاں کے مدفن کے متعلق عشقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ "مقبرہ آغا حسیناں میں مدفون ہوئے"۔ تعجب ہے کہ محترمہ ریسرچ کے سلسلے میں تقریباً دو ماہ تک پٹنہ میں رہیں لیکن انہوں نے فغاں کا مزار نہیں دیکھا۔ فغاں کا مزار مقبرہ حسیناں

میں نہیں ہے بلکہ محلہ دول پورہ میں شیر شاہی مسجد کے اتر جانب ہے، جس پر سنگ موسیٰ کی لوح لگی ہوئی ہے اور حکیم ابوالحسن مغفورں کی کہی ہوئی تاریخ رحلت کندہ ہے۔

مد شورش کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ (میر) ضیا نے مہاراجہ کلیان سنگھ کی ملازمت کچھ مدت کے لیے ترک کر کے خانہ نشینی اختیار کر لی تھی لیکن بدستور سابق پھر بحال ہو گئے تھے"۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ ضیا نے دوبارہ نوکری قبول کی تھی۔ شورش صاف صاف لکھتا ہے: " وقتیکہ راجہ بہادر صوبیدار عظیم آباد شدند طلبیدہ باز رفیق ساختند لکن میر موصوف ناز دستار بر سر نہ نہادند" (رجوع تذکرہ شورش نسخہ جونپور)

دو روزے بخاطر مبارک الیشان محبت الٰہی پیدا شد ترک روزگار نمودہ واز کمال غیرت و فراست خانہ نشینی اختیار نمودہ" (ص ۲ ضیا، بحوالہ شورش) جبکہ تذکرہ شورش نسخہ جونپور میں درج ہے کہ" در محفل ہولی مردمان بے ادبی کمال نمودند خانہ نشینی اختیار فرمودند"۔

ضیا کا زمانہ انتقال ۱۲۰۲ھ سے ۱۲۱۵ھ متعین کیا گیا ہے۔ لیکن بزم سخن، سخن شعرا اور طور کلیم میں ضیا کا سال انتقال ۱۱۹۴ھ درج ہے۔

ڈاکٹر اسما سعیدی (مقالہ نگار) نے ترجمہ عشق میں قاضی عبدالودود صاحب کے حوالے سے لکھا ہے:

"خواجہ محمدی خاں کے ساتھ تخمیناً ۱۱۶۲ھ کے لگ بھگ دہلی سے رخصت ہوئے اور آخر عشرہ ہفتم میں پٹنہ میں مستقل طور پر مقیم ہوئے"۔ تخمیناً کے ساتھ لگ بھگ لکھنا عبارت کی کمزوری ہے۔ عشق ۱۱۶۲ھ میں دہلی سے نہیں بلکہ ۱۱۶۹ھ میں مرشدآباد سے عظیم آباد آئے تھے۔ عشق کے سلسلے میں سب سے زیادہ معتبر شورش ہیں کیونکہ انہیں نہ صرف حضرت عشق سے عقیدت تھی بلکہ ان ہی کی فرمائش پر شورش نے تذکرہ بھی لکھا تھا۔ شورش ترجمہ عشق میں لکھتا ہے:

" از بست دو سال در عظیم آباد تشریف آورده و ترک روزگار نمودہ استقامت فرمودہ"

یعنی وہ قطعیت کے ساتھ لکھتا ہے کہ عشق عظیم آباد میں ۲۲ سال سے مقیم ہیں۔ اور یہ بیان ۱۱۹۱ھ کا ہے اس لیے کہ تذکرہ شورش میں ترجمہ غلام علی اظہر اس بات کا شاہد ہے کہ شورش نے یہ تذکرہ ۱۱۹۱ھ میں لکھنا شروع کیا کیونکہ ترجمہ غلام علی اظہر میں شورش لکھتا ہے: " قریب پنجاہ غزل ریختہ طرح فرمودہ۔ قبل ازیں ارادہ تحریر تذکرہ نہ بود والا نہ البتہ جمع می ساخت الحال در ۱۱۹۱ھ مزاج احقر بایں طرف مائل شدہ۔" تذکرہ شورش نسخہ جونپور کے دیباچہ میں عشق کے مرشدآباد سے عظیم آباد آنے کا بھی ذکر موجود ہے۔

"حضرت شاہ رکن الدین عشق عرف حضرت مرزا گھسیٹا صاحب مدظلہ العالی از مرشدآباد ترک روزگار نمودہ نیز بعظیم آباد تشریف آوردہ اند۔"

ڈاکٹر اسما سعیدی (مقالہ نگار) نے ترجمہ میر الم میں قاضی صاحب کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ مرشدآباد میں الم کے تعلقات راجہ دولبھ رام پسر جانکی رام سے تھے۔" لیکن انہوں نے یہ تحریر نہیں کیا ہے کہ عظیم آباد میں ان کی ملاقات کن کن لوگوں سے تھی۔ شاید انھوں نے اس بات کی تلاش اس لیے نہیں کی کہ قاضی صاحب کی تحریروں میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔

شورش ترجمہ میر الم میں لکھتا ہے:

"وقتیکہ در شہر عظیم آباد رسید نذیباں محمد روشن جوشش و میاں محمد وارث نالاں برائے ملاقات آورفتند و از کلام ایشاں مستفید شدند۔"

میر وارث علی نالاں کے سال وفات کے متعلق ص۸۲ پر لکھتی ہیں کہ "ان کے سال انتقال کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ علی ابراہیم خاں کی سطور ذیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ نالاں ۱۱۹۵ھ تک زندہ تھے۔" اور ص۸۳ پر تحریر کرتی ہیں " وفات نالاں پر جوشش کا قطعہ تاریخ دیوان جوشش میں ہے نام و تخلص میر وارث علی نالاں سے تاریخ نکلتی ہے۔"

محترمہ کی عبارت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جوشش کے قطعہ تاریخ پر وہ مشکوک ہیں۔ حالانکہ مشکوک ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، نالاں جوشش کے دوستوں میں تھے جس کا اشارہ دل اور شورش نے کیا ہے۔ دوست کے انتقال پر جوشش نے قطعہ تاریخ رحلت کہا ہے جو قاضی صاحب کے ایڈٹ کردہ دیوان جوشش کے علاوہ دیوان جوشش نسخہ مرشدآباد جسے پروفیسر کلیم الدین احمد نے ایڈٹ کیا ہے، میں بھی موجود ہے۔

محترمہ دل کے ترجمے میں لکھتی ہیں:

"جوشش کے والد جسونت ناگر عہد علی وردی خاں کے ممتاز فوجی سرداروں میں سے تھے۔"

لیکن محترمہ کو یہ خبر نہیں ہے کہ خود دل بھی جری سپاہی تھے، جنگ کے دوران ایک ہاتھ اور ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی، ساتھ ہی ان کا دوسرا ہاتھ بھی زخمی ہو گیا تھا۔ (رجوع ترجمہ تذکرہ شورش نسخہ جونپور)

نالاں اور مشتاق، دل کے دوستوں میں تھے، اس کی بھی اطلاع محترمہ کو نہیں ہے، بقول دل:

اگر مشتاق ہے تو جوشش و نالاں کی تحسین کا ::: تو کر مضموں ترا اے دل میرے دیواں کی خاطر

نالاں دلؔ کی مالی مدد بھی کرتے تھے، دیوان دلؔ میں نالاں کی مدح میں ۱۲ اشعار کا ایک قطعہ ہے، جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

ہے یہ امید ترے دست کرم سے نالاںؔ   قطعہ کا میرے ملے نقد طلاقات صلا

محترمہ نے اپنی تالیف میں دلؔ کا تذکرہ بحیثیت شاعر درج کیا ہے۔ انھوں نے دل کے عروج ہندی کے دو نسخوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن دیوان کے متعلق بالکل خاموش ہیں، جبکہ دیوان دلؔ ۱۹۷۲ء میں مہر نیمروز کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔

مقالہ نگار نے صـ۹۲-۹۳ پر بحوالہ شورش میر محمد رضا جرات کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں میر محمد رضا جرأت کا تذکرہ کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ نہ جرأت ریختہ گو تھے اور نہ حسرتؔ سے ان کے تعلقات تھے۔ ڈاکٹر سعیدی نے خود ہی جو تذکرہ شورش کی عبارت پیش کی ہے اس سے بھی جرأت کی ریختہ گوئی یا حسرت سے کسی قسم کے کوئی تعلقات ثابت نہیں ہوتے۔

سلامت علی سلامتؔ کے متعلق تحریر کرتی ہیں :

"سلامت کے حالات پردہ خفا میں ہیں۔ شورش نے بھی ان کے بارے میں بہت مختصر لکھا ہے اور موصوف ہی کے حوالے سے اسی قدر مختصر فہرست اسپرنگر میں درج ہے۔ تذکرہ شورش میں مندرج ہے۔۔۔۔ میر سلامت علی سلامت تخلص متوطن پورنیہ عملہ پرگنہ ارول سرکار صوبۂ بہار است۔"

"شورش" کے علاوہ دوسرے تذکروں میں بھی سلامت کے حالات موجود ہیں۔ تذکرہ مسرت افزا میں سلامت کے متعلق تفصیل درج ہے، لیکن صاحب مسرت افزا ان کا وطن پورنیہ نہیں بتاتے بلکہ انکے متعلق لکھتے ہیں کہ سرکار غازی پور کے قصبہ زمانیہ میں پیدا ہوئے۔ آج کل نواب سعادت علی خاں کی رفاقت سے سرفراز ہیں۔ تذکرہ شورش نسخہ جونپور میں متوطن پورنیہ نہیں درج ہے بلکہ اس کی پوری عبارت یہ ہے:

"سلامت علی سلامت تخلص بیک واسطہ شاگرد میر است۔"

سلامت کو متوطن پورنیہ سمجھنا غلط ہے۔ یہ تذکرہ شورش نسخہ آکسفورڈ میں تصرف کا نتیجہ ہے۔

مقالہ نگار صـ۹۹ پر رقمطراز ہیں :

"ان کی غزلیات میں عشق حقیقی و مجازی دونوں طرح کے مضامین پائے جاتے ہیں، شورش

فدوی، جوشش، راسخ کے یہاں متصوفانہ مضامین کی کمی نہیں۔"

یہ حقیقت ہے کہ یہاں کے شعرا کا مزاج نیم عارفانہ اور نیم عاشقانہ رہا ہے، اسی لیے ان کے کلام میں دونوں طرح کے مضامین پائے جاتے ہیں لیکن صرف شورش، فدوی جوشش اور راسخ کے یہاں صوفیانہ مضامین کی کمی نہیں، لکھنا غلط ہے کیونکہ شاہ رکن الدین عشق، سعد اللہ شاہ، جعفر علی خاں راغب، حمزا علی رند اور غلام یحییٰ حضور کے دیوان کا بیشتر حصہ صوفیانہ اشعار پر مشتمل ہے۔

ص۱۰۱ پر تحریر کرتی ہیں:

"یہ شعرا ریختہ کے دلدادہ تھے۔ ریختی سے انہیں لگاؤ نہیں تھا۔"

یہ کہنا درست نہیں کیونکہ علی بخش دعا کا ایک دیوان ریختی پر مشتمل ہے اور کتب خانہ خدا بخش میں موجود ہے (No.H L 2483) دعا کے علاوہ مہدی عظیم آبادی کے دیوان میں بھی ریختی کے اشعار موجود ہیں۔

"ہجویہ شاعری جس مخصوص ماحول و حالات کے تحت وجود میں آتی ہے اس کے عدم وجود کی بنا پر شعرائے عظیم آباد و مرشدآباد و پورنیہ میں اس کی مثال شاذ ہیں۔ دو مثنویاں حضور کی ایک امین کی اور تین جوشش کی مثنویاں ہجویہ ہیں۔" ص۱۰۱-۱۰۰

ہجویہ شاعری کے لیے کس طرح کے مخصوص ماحول و حالات کی ضرورت پڑتی ہے۔ ڈاکٹر سیدی کو یہ بتانا ضروری تھا حضور، امین اور جوشش کے علاوہ فغاں کی ۹ مثنویاں ہجویہ ہیں جو دیوان فغاں مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں موجود ہیں اور ان کے عنوانات یہ ہیں ہجو حامی (۱۲۷ اشعار) ہجو دانیال (۵۲ اشعار) ہجو آخوند صاحب (۲۹ اشعار) ہجو لاغر (۱۰۱ اشعار) ہجو شاہ عبدالرحمان الہ آبادی (۹۷ اشعار) ہجو برادر (۹ اشعار) ہجو بسنت خاں (۴۴ اشعار) سرگزشت لشکر راجہ رام نرائن بہادر (۱۶ اشعار) ہجو معصوم (۳۴ اشعار)

"راسخ کی مثنوی شہر آشوب اور شاہ آیت اللہ جوہری و مذاقی کا شہر آشوب اس دور کے عظیم آباد کے نشیب و فراز اور حالات و حوادث کی اچھی عکاسی کرتے ہیں۔" ص۱۰۲

شہر آشوب میں شاہ آیت اللہ کا تخلص جوہری کے ساتھ مذاقی بھی لکھنا غلط ہے۔ شاہ آیت اللہ نے صرف مرثیہ میں مذاقی تخلص استعمال کیا ہے۔ راسخ اور شاہ آیت اللہ کے علاوہ راسخ کے ہم عصر شاعر جعفر خاں راغب کی بھی مثنوی شہر آشوب کتب خانہ خدا بخش میں موجود ہے۔

محترمہ ڈاکٹر اسما سعیدی صفحہ ۱۰۶ پر تحریر کرتی ہیں :

"۱۱۶۲ھ سے پہلے حسرت کی شادی حزیں کی بہن سے عظیم آباد میں ہو گئی ہو گی۔"

۱۱۶۲ھ میں نہیں بلکہ ۱۱۶۹ھ میں حسرت کی شادی حزیں کی بہن سے عظیم آباد میں نہیں پورنیہ میں ہوئی تھی۔ شورش لکھتا ہے :

"ہمراہ الیشان بہ پرنیہ تشریف بردہ آں جا داروغہ دیوان خانہ نواب شوکت جنگ بہادر شدہ بعدازاں از ہمشیرہ میر باقر مذکور منسوب گشتہ۔"

"شوکت جنگ کا عہد مسند نشینی ربیع الاول ۱۱۶۹ھ تا محرم ۱۱۶۹ھ بہت مختصر رہا۔" (صفحہ ۱۰۰)

۲۵ جمادی الاول ۱۱۶۹ھ کو سید احمد خان صولت جنگ کا انتقال ہوا، ظاہر ہے کہ ۲۵ جمادی الاول کے بعد ہی شوکت جنگ مسند نشین ہوا ہوگا اور ۲۱ محرم ۱۱۷۰ھ کو سراج الدولہ اور شوکت جنگ سے راج محل کے قریب مقابلہ ہوا اور شوکت جنگ مارا گیا۔

لہٰذا شوکت جنگ کا عہد مسند نشینی ۲۵ جمادی الاول ۱۱۶۹ھ تا ۲۱ محرم ۱۱۷۰ھ رہا۔

"اس بات کا انکشاف نہیں ہوا کہ وہ (حسرت) شوکت جنگ کے یہاں کس خدمت پر مامور تھے۔ قیاس ہے کسی اچھی جگہ پر ہوں گے۔" (صفحہ ۱۰۷)

شورش نے صاف صاف لکھا ہے کہ حسرت شوکت جنگ کے یہاں داروغہ دیوان خانہ تھے۔

"ممکن ہے..... انھیں سراج الدولہ سے خطاب صیبت قلی خاں ملا ہو۔ حسرت کے سلسلے میں سب سے قدیم تذکرے تذکرۂ شورش، تذکرہ مسرت افزا، تذکرہ گلزار ابراہیم، تذکرۂ گلشن ہند، تذکرہ عشقی میں ان کا زمانہ تصانیف ۱۱۸۷ھ (۷۴-۱۷۷۳ء) کے بعد کا ہے۔ ان میں بھی حالات حسرت کے متعلق تفاصیل نہیں ملتیں۔ ان سے خطاب پر روشنی ڈالنے کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔"

تذکرہ نگاروں نے حالات حسرت تفصیل سے لکھا ہے اور ان کے خطاب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر اسما سعیدی ان تذکروں کو نہ دیکھیں تو تذکرہ نگاروں کا کیا قصور ہے۔

شورش ترجمہ حسرت میں لکھتا ہے کہ :

"نواب سراج الدولہ گرویدہ و در رفاقت آں کار ہا نمودہ و از فضل الٰہی بعزت و حرمت ماندہ بلکہ خطاب خانی و جاگیر یافتہ۔"

شورش کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ سراج الدولہ نے حسرت کو خاں کا خطاب دیا تھا اور جاگیر بھی عطا

ی تھی۔ اور ہیبت قلی حسرت کا لقب تھا نہ کہ خطاب، تفصیل کے لیے دیکھیں، گلزار ابراہیم، گلشن سخن، گلشن ہند، تذکرہ سخن شعرا، تذکرہ سراپا سخن، تذکرہ خمخانہ جاوید وغیرھم۔

"ڈاکٹر حسنین اور ڈاکٹر ممتاز احمد نے بغیر کسی حوالے کے تحریر کیا ہے کہ حسرت عالی جاہ میر محمد قاسم کی سرکار میں تھے لیکن میر قاسم سے حسرت کا کسی قسم کا تعلق ثابت نہیں۔ ۱۵ نومبر ۱۹۵۸ء کے ہماری زبان میں جناب قاضی عبدالودود بھی اس کی تغلیط کر چکے ہیں۔" (ص ۱۰۸)

تحقیق حق کی تلاش کا نام ہے، اور حق کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ کسی شاعر یا ادیب کے حالات زندگی کو صحیح طور پر جاننے کیلئے مختلف تذکروں کو خود سے پڑھنا چاہیے اور نہ صرف اس شاعر یا ادیب کے حالات کو پڑھنا چاہیے بلکہ دوسرے ہم عصر شاعروں ادیبوں کے تراجم میں بھی ان کے حالات ڈھونڈنے چاہئیں

شورش ترجمہ حمزہ علی رند میں لکھتا ہے :

"در صوبہ داری میر محمد قاسم خاں بہادر عالی جاہ بہ قصبہ مونگیر در چھاونی ہیبت قلی خاں حسرت یا بندہ ملاقات شدہ"

شورش کے اس بیان سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حسرت میر قاسم کی سرکار سے وابستہ تھے۔

"۱۱۶۲ھ (۴۹-۱۷۴۸ء) میں ہیبت جنگ شہید کر دیا گیا تھا" (ص ۱۱۱)

لیکن صاحب سیر المتاخرین لکھتے ہیں کہ ہیبت جنگ ۲۳ محرم ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۳ جنوری ۱۷۴۸ء میں شہید کیا گیا۔ صاحب سیر المتاخرین کی بتائی ہوئی تاریخ غلط نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ وہ نہ صرف ایک مورخ تھے بلکہ اپنے دور کی سیاست کے ایک مہرہ بھی تھے۔

ڈاکٹر سعیدی نے حسرت کے مرشد آباد، پورنیہ اور جہانگیر نگر جانے اور قیام کرنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کو یہ خبر نہیں ہے کہ حسرت کی اقامت مونگیر بھی رہی ہے۔

ڈاکٹر سعیدی ص ۱۱۵ پر تحریر کرتی ہیں کہ دیوان حسرت میں حزیں کا ذکر نہیں ہے جس سے نسبت شاگردی کا اظہار ہو۔

ڈاکٹر سعیدی کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ میر محمد باقر کا تخلص حزیں کے ساتھ ساتھ ظہور بھی تھا۔ تذکرہ شورش نسخہ جونپور میں حسرت کا ایک شعر موجود ہے جس میں ظہور کی شاگردی کا اعتراف ہے۔

فخر کرتا ہے ظہور اپنے پہ حسرت بر جا — مل گیا اس کے تئیں ایسا ہی استاد کہ بس

ص ۱۱۶ پر دو جگہ حسرت کے متعلق لکھتی ہیں کہ قیاس یہ ہے کہ وہ تشیع کی طرف مائل تھے۔ دیوان میں یہ

اشعار بھی ملتے ہیں۔

بندہ و آزاد سے حسرت مبرا ہیں یہاں ایک ہے ہم کو مگر مولائے حیدر سے اُمید

درد و غم سے بد دل نہ رہ حسرت ترا والی ہے شاہ دلدل سا

سکندر اور خضر جانیں قدر آب حیات ہمیں ہے خاکِ در بوتراب سے نسبت

حسرت تشیع کی طرف مائل تھے۔ کسی تذکرہ نگار نے اس طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ رہا اشعار کی بات تو ان اشعار کی بنیاد پر حسرت کو مائل بہ تشیع نہیں کہا جا سکتا ہے۔

یہ اردو شاعری کا عام مضمون ہے۔ صوفیائے درگاہ شاہ ارزاں اور صوفیائے پھلواری کے مراثی میں اس طرح کے مضامین بھرے پڑے ہیں لیکن یہ لوگ نہ شیعہ تھے نہ نصیری تھے نہ تفضیلی تھے لہٰذا حسرت کو مائل بہ تشیع سمجھنا غلط ہے۔

جب تک ہے جہاں میں عید کی رسم قدیم قربانی ہو اہل دیں میں باہم تقسیم

قاسم رہے نعمت خدا کا یارب جوں خوان خلیل حافظِ ابراہیم

اس رباعی کے متعلق ڈاکٹر اسما سعیدی لکھتی ہیں :

"رباعی تہنیت عید قاسم نامی کسی شخص کو پیش کی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ قاسم سے مراد عالی جاہ نواب میر محمد قاسم خاں ہوں مگر ان سے وابستگی اور کسی قسم کا تعلق تو فی الحال ثابت نہیں قیاس غالب یہ ہے کہ علی قاسم خاں برادر علی ابراہیم خاں کو پیش کی ہو گی" (ص ۱۱۷)

رباعی سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رباعی حافظ محمد ابراہیم کو پیش کی گئی ہے۔

"شورش" حضور اور حسرت استاد بھائی اور دوست تھے۔" (ص ۱۱۷)

حسرت اور حضور کی دوستی کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے ہاں شورش سے حسرت کے تعلقات بہت اچھے تھے۔

ڈاکٹر اسما سعیدی کو یہ خبر نہیں ہے کہ حسرت کے دوستوں میں حمزہ علی رند بھی تھے مونگیر میں دونوں ساتھ رہتے تھے شورش کی ملاقات حمزہ علی رند سے ہیبت قلی خاں حسرت کی چھاونی میں ہوئی تھی۔

ڈاکٹر سعیدی نے تذکرہ شورش نسخہ جونپور سے حالات حسرت نقل نہیں کیا ہے، جبکہ حسرت کے حالات اس تذکرہ میں قدرے تفصیل سے درج ہیں۔

ڈاکٹر اسما سعیدی ص ۱۲۲ پر تحریر کرتی ہیں "شورش نے اپنے تذکرے کا نام یادگار دوستاں تجویز کیا تھا

ڈاکٹر اسما سعیدی سے دو سو سال قبل ابوالحسن صاحب نے بھی اپنے تذکرہ مسرت افزا میں یہی لکھا ہے کہ شورش نے اپنے تذکرہ کا نام "رموز الشعرا" رکھا ہے۔ شورش اپنے تذکرے کے دیباچہ میں لکھتا ہے :

"تعین را نام لازم است لہٰذا نام ایں تذکرہ رموز الشعرا داشتہ" اور حاشیہ پر لکھتا ہے

"واگر تذکرہ شورش ہم گویند مضائقہ ندارد۔"

ڈاکٹر سعیدی ص۲۲۵ پر قاضی صاحب کے حوالے سے لکھتی ہیں :

"تذکرہ عشقی کا زمانہ تصنیف ۱۲۰۵ھ تا ۱۲۳۰ھ ہے۔"

تذکرہ عشقی میں سب سے آخری تاریخ ۱۲۲۹ھ کی ملتی ہے۔ مرزا جان طپش کے حال میں عشقی تحریر کرتے ہیں۔

"آخر باجل طبعی ازیں دار رحلت فرمودہ"

طپش نے بقول اسپرنگر ۱۲۲۹ھ میں رحلت کی تھی اور تذکرے کے آخر میں یہ عبارت ہے :

"بتاریخ چہارم ماہ رمضان شدہ اتمام ایں ابیات افساں۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ عشقی کی تالیف کا کام ۴ رمضان المبارک ۱۲۲۹ھ کو ختم ہوا۔ لہٰذا تذکرہ عشقی کا زمانۂ تصنیف ۱۲۰۵ھ تا ۱۲۲۹ھ ہے۔

"متعلقین حسرت" مذکورہ عنوان کے تحت ڈاکٹر اسما سعیدی نے حزیںؔ، شورشؔ، حضورؔ، حیرتؔ، ہمدمؔ اور جودتؔ کی حالات زندگی پیش کیا ہے۔

"حزیںؔ کے سلسلے میں سب سے زیادہ معتبر شورشؔ ہیں وہ حزیںؔ کے شاگرد تھے، بقول جناب قاضی عبدالودود جو کچھ شورشؔ نے لکھا ہے، قابل قبول ہے اور جو کچھ اس سے متفادت ہے غلط ہے۔" (ص۱۳۶)

شورشؔ پر اتنا اعتماد کے باوجود ڈاکٹر سعیدی نے تذکرہ شورش نسخہ جونپور دیکھنے کی کوشش نہیں کی، ایک ایسا نسخہ پیش نظر رکھا جس کے متعلق بحوالہ قاضی صاحب خود ہی لکھتی ہیں: "اس موقع پر یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ تذکرہ شورش کے نسخہ آکسفورڈ میں کسی شخص نے تصرف کیا ہے۔"

حزیں اپنے والد کی شہادت کے بعد عظیم آباد سے دہلی آگئے تھے اور خواجہ محمدی خاں کے پاس رہنے لگے تھے ان کے انتقال کے بعد دہلی آنے کا بظاہر بڑا سبب فکر معاش تھی۔" (ص۱۳۶)

فکر معاش کے سبب حزیںؔ دہلی گئے تھے کسی تذکرہ نگار نے اس طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ قیاس غالب ہے والد کی شہادت کے بعد بھی مخالف پارٹی سے دشمنی برقرار رہی ہوگی، اسی وجہ سے حزیں دہلی چلے گئے ہوں یا ان

کے برادر نسبتی خواجہ محمدی خاں نے انھیں دہلی بلالیا ہوگا۔

"زمانہ قیام دہلی میں حزیںؔ نے بقول شورشؔ دو دیوان مرتب کر لیے تھے، دوسرا دیوان انعام اللہ خاں یقینؔ کے جواب میں تھا۔" (صفحہ ۱۳۷)

اس کا کیا ثبوت ہے کہ دوسرا دیوان انعام اللہ خاں یقینؔ کے جواب میں تھا؟ تذکرہ شورش نسخہ جونپور میں دوسرے دیوان کے متعلق بس اتنی اطلاع ہے کہ "دیوان دیگر در دھاکہ درست فرمودہ۔"

اگر ڈاکٹر سعیدی کو اپنے دعوے پر اصرار ہو تو وہ دیوان پیش کریں۔

ڈاکٹر اسما سعیدی کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ حزیںؔ نے مرنے سے قبل اپنا دیوان اور ساقی نامہ حسرتؔ کے حوالے کر دیا تھا تاکہ وہ درست کر دیں۔ شورشؔ لکھتا ہے:

"اکثر بزرگان بعد وفات دیوانِ استاد خود درست نمودہ اند، چنانچہ میر باقر حزیں دیوان وساقی نامہ وغیرہ را حوالہ میر حیات حسرت پیش از انتقال خود باین نیت نمودہ بودند کہ درست نمایند وہر جا کہ غلطی ماندہ باشد آں را رفع سازند لکن کمال شاگرد عین کمال استاد استاد است کہ درست نمودہ۔" (رجوع بہ تذکرہ شورش نسخہ جونپور ترجمہ انعام اللہ خاں یقینؔ)

"حزیں دو تین سال پورنیہ میں رہے۔ یہیں کے زمانہ قیام میں وہ تائب ہوئے اور اس کے بعد انتقال کیا۔" (صفحہ ۱۴۰)

حزیںؔ کون سا گناہ کرتے تھے، جس سے مرنے سے قبل تائب ہو گئے تھے۔ یہ واضح نہ ہو سکا۔ اگر محترمہ کا اشارہ اس بات کی طرف ہے جس کا تذکرہ گردیزی اور ابوالحسن صاحب نے کیا ہے۔ یعنی وہ ایک نوجوان کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے تو تائب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے کیونکہ گردیزی اور ابوالحسن صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نوجوان کے عشق میں حزیںؔ نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

"حزیںؔ کے خاندان کے زیادہ افراد کا حال معلوم نہیں ہو سکا، صرف ایک بہن اور دو فرزندوں کے بارے میں مختصر طور پر معلومات حاصل ہوئی ہیں۔" (صفحہ ۱۴۱)

ڈاکٹر سعیدی نے تذکرہ شورشؔ نسخہ آکسفورڈ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حزیںؔ کی شادی ہمشیرۂ میر قدرت اللہ پسر شاہ شکر اللہ سے ہوئی تھی ...... اگر یہ صحیح ہے تو حزیںؔ کی ایک بہن اور تھیں جن کی شادی خواجہ محمدی خاں سے ہوئی تھی۔ شورشؔ ترجمہ ظہور میں لکھتا ہے:

"میر محمد باقر خلف فخر اللہ خاں ساکن عظیم آباد بعد شہادت خان موصوف تشریف بہ شاہجہاں آباد بُرد نہ بخدمت برادر نسبتی خواجہ محمدی خاں صاحب رسیدہ"

"سید غلام حسین نام عرف میر بھنیا اور شورش تخلص تھا" (ص ۱۵۵)

تذکرہ نگاروں نے شورش کا نام میر غلام حسین لکھا ہے۔ محترمہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ میر ہٹا کر سید لکھیں۔

ڈاکٹر سیدی تذکرہ شورش کے علاوہ ص ۱۵۸ پر مبتلا کے حوالہ سے چار ہزار اشعار پر مشتمل ایک دیوان فہرست نمائش ادارہ تحقیقات اردو کے حوالے سے ایک مثنوی کا ذکر کرتی ہیں۔

ڈاکٹر سیدی کو اس بات کا علم ہونا چاہیئے کہ خود شورش نے اپنے تذکرہ کے دیباچہ میں اپنی مندرجہ ذیل بوں کا ذکر کیا ہے۔

(۱) مثنوی درد و الم (۲) مثنوی باغ و بہار (۳) مثنوی در تعریف علی باغ مشتمل بر مدح مولوی ید (۴) ملفوظات حضرت عشق (۵) ارشاد العارفین (۶) صحیفۃ النجات (۷) احوال بادشاہاں از معز الدین سام بقت جلوس شاہ عالم (۸) منتخب گنج فیاضی۔

ڈاکٹر اسما سیدی نے غلام یحییٰ حضور کا ذکر تفصیلی کیا ہے لیکن انہیں یہ خبر نہیں ہے کہ حضور نے علم طب حاصل کیا تھا اور اس علم میں ان کے استاد میر علی اسمٰعیل تھے۔

ڈاکٹر اسما سیدی نے اپنی تالیف میں حسرت کے ہم عصر شاعروں میں زیادہ ایسے شاعروں کا تذکرہ لیا ہے جن کا انہیں ملتا اور عظیم آباد کے شعری ماحول بنانے میں ان کا ہاتھ نہیں رہا ہے۔ اور ان شعرا کو نظر انداز کر دیا ہے جن کا عظیم آباد شاعری ماحول میں اپنا ایک خاص مقام ہے۔ ان کے دواوین بھی ملتے ہیں حسرت سے تعلقات بھی ثابت، اور اکثر تذکروں ان کا ذکر بھی موجود ہے۔ مثلاً سعد اللہ شاہ، مرزا علی رند، جعفر خاں راغب اور علی بخش دعا وغیرہم۔

متن دیوان :- متن دیوان کے سلسلے میں ابھی مجھے زیادہ نہیں کہنا ہے کیونکہ ابھی میری نظر سے خطی نسخہ پور نہیں گذرا ہے، لیکن ہاں اتنا ضرور عرض کروں گا۔

۱۔ ڈاکٹر سیدی نے نسخہ کا تعارف نہیں کرایا ہے۔

۲۔ ان کے ایڈٹ کردہ دیوان کے علاوہ حسرت کی ایک رباعی اور ۶۲ اشعار اور ملے ہیں جو تذکرہ شورش نسخہ جونپور میں درج ہیں۔ وہ اشعار اور رباعی یہ ہیں۔

عشق کے نور سے روشن ہوا سینہ میرا   یدِ بیضا ہوگیا دل کا نگینہ میرا

محتسب رہتے پر اس قد کے نہیں پر باللہ
زور ہے نام خدا دیکھ یہ مینا میرا

مرنے کے بعد بھی نہ فرو ہو جنوں مرا
جوں خم تہی زمیں سے کرے جوش خوں مرا

بن پڑے ایسی ترے چاہ زنخداں کی ہوا
یوسف آیاں بھول جاوے مصر و کنعاں کی ہوا

تیری گلی میں ہر کوئی روندے ہے خاک میری
انصاف ہے پیارے، یوں پائمال رکھنا؟

نظر آتا ہے اشک گرم سے سیلاب آتش کا
کہیں کیوں کر نہ آنکھوں کو مری گرداب آتش کا

نہ نکلیں کیونکر شعلے آہ کے اے شمع رو تجھ بن
کھلا ہے ان دنوں دل پر ہمارے باب آتش کا

قیامت جیتے ہی جی آ گئی اس کی جدائی میں
نہ سمجھے تھے کہ اس گردوں کا ایسا انقلاب ہوگا

دل ہمارے نے میاں تجھ صاحب شوکت سے مل
عشق میں پیدا بہت سا اعتبار اپنا کیا

نہ پایا جب تلک اس نے سراغ یوسف کا
چراغ دل تھا زلیخا کو داغ یوسف کا

لہو کے گھونٹ نہ کیوں گھونٹوں تجھ بن اے ساقی
برنگ نالہ ہے پر خوں ایاغ دل میرا

غیروں کے ساتھ دیکھ تری گرم جوشیاں
حسرت کا دل تو آج ہوا ہے کباب سا

تھکایا یاں تلک اس عشق نے مجھ ناتواں کے تئیں
گریباں تک بھی چل سکتا نہیں کچھ دست رس اپنا

بجا ہے ان بتوں کے جی میں حسرت میرے مرنے کی
میں کافر ایسے ہی تھا ان کے بت خانے کے کام آتا

ہاتھ اٹھانا صبح کچھ اب حاصل نہیں تدبیر کا
فصل گل نے آ ہلایا سلسلہ زنجیر کا

جھانک دیکھ اس زخم کے منہ کو ٹک اے رشک چمن
کوچہ گلزار ہے رخنہ ترے ہر تیر کا

جس گھڑی تو نے ہم کو پیار کیا
ہم نے سب جبر اختیار کیا

عذر وعدہ خلافیوں کا نہ کر
ہم دوانے ہیں اعتبار کیا

دل سے وہ شوخ جدا آہ پڑا پھرتا ہے
رشک ہے سایہ سے ہمراہ پڑا پھرتا ہے

اٹھ مرے بالیں سے اے مشفق طبیب
دارو ہی کو لے ہو بیٹھے یا نصیب

تنگ سے آگ پہ لوٹے نہ پتنگا کیوں کر
منہ لگے شمع کے گل گیر زباں دان کے لب

بہار آئی دوانے ہو کے رہ جنگل کی لیجے اب
گریباں پھاڑیئے سر پھوڑیئے گھر چھوڑیئے اب

حسرت آتا ہے نظر ساقی کا خط سیاہ
جی کھنچا جاتا ہے دیکھ اس ابر کو سوئے شراب

یار کا قد کہاں کہاں وہ سرو
طوبیٰ طوبیٰ ہے اور درخت درخت

دل ہے سینے میں داغ کا طالب　گھر اندھیرا چراغ کا طالب

رو کر ان آنکھوں نے رسوا کر دیا　کھل گیا بخیہ تو پھر سینا عبث

حسرت کہاں تلک میں کروں ضبط اشک کو　رونے کے بیچ ایک ہے ابر اور مرا مزاج

کہوں تو کیوں نہ کہوں مرتبہ شراب بلند　کہ جس کا جام ہو پھرتا ہے آفتاب بلند

مرا دل اشک سے ہوتا ہے پانی　نہ کر اتنا بھی ہر دم آرسی یاد

عاشقوں کے لباس کی مت پوچھ　خاک ہے اس گلی کی حلہ نور

کیا ڈھونڈھتا ہے ناداں کوئی دل نشیں رہبر　پردا اٹھا کر آ جا گر ہے یقین رہبر

بہار آئی ہوئے از بس چمن سبز　گلستاں بیچ بیٹھا پرہن سبز

مجھے تو جام ارے ساقی آج پیہم دے　بہت دنوں سے میں رکھتا ہوں بیخودی کی ہوس

اگر زمیں یہ بہشت بریں ملے حسرت　نہ جائے تو بھی مرے دل سے اس گلی کی ہوس

کہاں تک سرد مہری کر سکیں گے ماہ رو مجھ سے　ہے بس گرمی یہ میری آہ کی تاثیر کی سوزش

جان تو چاہنے کے لائق ہے　دل نے تجھ سے کیا بجا اخلاص

یہ دل بسمل ترا حسرت نہیں زخموں سے سیر　کس قدر رکھتا ہے مرضی اپنے قاتل کی غرض

مل ہی جاتا ہے گا جلنے کے بہانے شوق سے　دیکھ پروانے کی گستاخی جھجک جاتی ہے شمع

ذبح تو کرتا ہے میرے جی کی خواہش سے مجھے　دیکھ تو قاتل نہ لگ جاوے ترے دامن کو داغ

محتسب حسرت کا دل ناچار ہے کیا کیجیے　دختر رز کا نہیں جی پارسائی کی طرف

پرویز دیکھو عیش کرے، کوہ کن مرے　کیا اور ہی طرح سے پھرا آسمان عشق

حسرت تو اپنا نامۂ اعمال ساتھ دے　جاتا ہے کربلا کو مرا کاروان اشک

ہو تجھ کو مے کشی کا اگر گلستاں میں شوق　غنچہ پیے برنگ گلابی ایاغ گل

بہا دیتے ہیں ہم اس کو ہمیں پایہ بہا دیوے　بھلا اب شرط کر روتے ہیں ایدھر ہم ادھر ساون

رہوں رونے کے ہاتھوں کب تک دلگیر پانی میں　الٰہی کیا بندھے خوں میں میری تصویر پانی میں

مجھے از اطارقت سے بجا میں بات کہہ آتی　کہ کر سکتا نہیں ڈوبا ہوا تقریر پانی میں

رلایا ہجر میں اپنے مجھے یاں تک تو اے ظالم　کہ ڈوبی خانۂ دل کی مری تعمیر پانی میں

ہمارا سلسلہ نالوں کا اس رونے سے دیتا ہے   نہیں کچھ بول سکتی جس طرح زنجیر پانی میں

اے باغ کے بہار دل دردمند کو   تو بھی تو آگ سے نہیں کم اس پسند کو

حسرت حاضر ہوں میں اس جور و جفا کے منہ پر   جس میں ہو اس کی رضا میری رضا بسم اللہ

اس چشمۂ جاری سے ہیں آنکھیں میری روشن   اندھا ہے وہی چاہ جہاں آب نہ ہووے

میرا آتا ہے وہ قاتل سپاہی   مجھے تو سرخ رو کیجیو الٰہی

گھٹا سو سو طرح کے رنگ سے بن بن کر آتی ہے   پر اک ساقی نہیں بھی ہے تو کس کا فر کو بھاتی ہے

زخم دل حلقۂ گرداب ہے رونے سے مرے   آستیں کو چہ سیلاب ہے رونے سے مرے

ناصح عبث ستا مت، ہیں مبتلا کسی کے   یہ دل گیا پھرے ہے پھیرے سے کیا کسی کے

اگر شیریں کی خاطر میں جیا، نہ جیا، برابر ہے   تو سب فرہاد کا یا رو کیا، نہ کیا، برابر ہے

اگر دشمن ہوا یوں ہاتھ مجنوں کا گریباں سے   تو اس کو لیلیٰ ہی سمجھے سیا، نہ سیا، برابر ہے

عجب دھوکے میں میری آرزو ہے   جو آتا ہے اسے جانوں ہوں تو ہے

کون روئے کوئی احوال پریشاں پہ میرے   ابر کرتا ہے کرم دیدہ گریاں پہ میرے

جس کا انتظار آتا ہے   چشم بد دور یار آتا ہے

جھوٹے اقرار یار پر اپنے   کس کے دل کو قرار آتا ہے

رباعی:۔   ناشادی کا اپنی جاں جی سے نہ گیا   جب تک جیئے ہم ملال جی سے نہ گیا

یہ لوح مزار پر ہماری لکھنا   ہم گئے پہ تیرا خیال جی سے نہ گیا

ڈاکٹر اسما سعیدی نے اپنی تالیف کا نام "دیوان حسرت عظیم آبادی" رکھا ہے۔ باب دوم تک مطالعہ کر لینے کے بعد بھی قاری پر یہ راز نہیں کھلتا ہے کہ ڈاکٹر سعیدی نے کس حسرت کے دیوان کو ایڈٹ کیا ہے۔ عظیم آباد میں حسرت تخلص کے کئی شاعر صاحب دیوان گذرے ہیں، جن کا ذکر اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ جن میں شمس العلما مولانا سعید حسرت خاصے شہرت کے حامل ہیں۔

لہٰذا محترمہ کو اپنی تالیف کا نام دیوان ہیبت قلی خاں حسرت رکھنا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر اسما سعیدی

بارا ہندو روڈ دہلی

جواب

آپ کے دو تین گرامی نامے مجھے ملے تھے۔ میں نے ادبی تقاریب میں بھی شریک ہونا بہت کم کر دیا تھا پھر بھی
جب کبھی مجھے پٹنے کے کوئی صاحب ملے میں نے اُن کے آپ سے کہلوا دیا تھا کہ میری والدہ صاحبہ بہت بیمار ہیں مجھے
انکی تیمار داری اور گھر کی تمام ذمہ داریوں کی وجہ سے بالکل فرصت نہیں ملتی، اسی مہینے میں انٹرنیشنل سمینار میں
غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں پٹنے کے صدیق صاحب سے بھی ملاقات ہوئی تھی میں نے موصوف کے مقالے کی
بھی تعریف کی اور آپ سے بھی پھر یہی کہلوا دیا تھا کہ میری والدہ بہت علیل ہیں میرا ذہن بہت پریشان ہے۔
۵ ار دسمبر کو میں نے سمینار میں شرکت نہیں کی ۱۶ ر کو میری والدہ سیدہ ذاکرہ بی بیگم مرحوم بسمل سعیدی طویل علالت
کے بعد رخصت ہوگئیں، غم کا اظہار کیا کروں عیاں راچہ بیاں، چھوٹی بہن جو چھوٹی بہن ہے پروین سعیدی بڑی ہے
مگر بہت پریشان کرتی ہے بہت روتی ہے کہتی ہے امی کے پاس مجھے بھیجوا دو میں انکے بغیر نہیں رہوں گی۔ دو تین گھروں
کے نہایت کمینے بالکل نزدیک کے بسمل صاحب کی علالت کے زمانے سے ہی ہر وقت بدترین ایذائیں پہنچاتے رہتے
ہیں بسمل صاحب کے بعد ہمارا مکان چھین لینے کے لئے اور زیادہ ظلم کئے پیشی کے وقت عدالت میں ہاتھ جوڑ لئے۔
کورٹ سے آکر پھر وہی درندگی بھی اور ناجائز تعمیر کا سلسلہ بھی ہمارے مکان پر اس کا بہت خراب اثر پڑا ہے۔ انہیں
کے ایما اور لالچ کی بنا پر بھی چار سال تین مہینے پہلے تین عورتوں نے دروازے کے باہر مجھ پر حملہ کیا زیور چھیننا چاہتی
تھیں جب والدہ نے آکر دروازہ کھولا تو میں بے ہوش ہونے کے قریب تھی اندر گھس کر والدہ اور بہن کو بے حد زدو
کوب کیا جب اپنے خیال میں وہ والدہ کو بالکل ختم کر چکیں تو پہلے خود پولس تھانے پہنچ گئیں میرے فون کے تار کاٹ
دیئے تھے، لائٹ بند کر دی تھی۔ میں اور پروین تو علاج سے کچھ ٹھیک ہوگئے تھے مگر والدہ صاحبہ ٹھیک نہیں ہوسکیں، بہت
علاج کیا تھا مگر ان کی سر کی اندرونی چوٹ ٹھیک نہیں ہوسکی تھی اب ہم دونوں، میں اور پروین اکیلے ہیں (پولس کیس
ہے لیکن ابھی تک پیشی نہیں ہوئی ہے) ایک سگے بھائی بچپن ہی سے لاہور میں ہیں ڈاکٹر ہیں دوسرے بھائی پروفیسر ہیں
ہر پلنے میں۔ جب فرصت ملتی ہے آجاتے ہیں بہت قریب کے سگے رشتے دار پروفیسر، ڈاکٹر وغیرہ ہیں لیکن دور دور -

شہروں میں ہیں کبھی کبھی آتے ہیں۔

میرے آباؤ اجداد نے میرے والد محترم بسمل سعیدی صاحب مرحوم کے خاندان نے جو علوم وفیوض کے دریا بہائے ہیں اسے علمی و ادبی دنیا بھول جائے تو یہ اس کی بدنصیبی ہے ہماری نہیں ہے بے حد مختصر طور پر عرض کر رہی ہوں کہ بسمل صاحب مرحوم کے پردادا کے والد محترم بہت بڑے عالم باعمل سید مولوی محمد علی صاحب بہار بھی تشریف لے گئے تھے غالباً مہابت جنگ کا زمانہ تھا محمد علی صاحب کی بہت عزت کی گئی بڑا احترام تھا اُن کا (ملاحظہ ہو سیر المتاخرین فارسی نسخہ) جناب قاضی عبدالودود صاحب مرحوم کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں اسی خاندان کی بیٹی ہوں طالبہ علم ہوں جویائے علم تو قاضی صاحب مجھ پر بہت شفقت فرمانے لگے، بہار سے قدیم تعلق کی بنا پر اور قاضی صاحب کے فرمانے پر میں نے حسرت عظیم آبادی پر کام کرنا بخوشی منظور کر لیا پروفیسر سرور صاحب ڈاکٹر مسعود حسین صاحب اور ڈاکٹر خورشید الاسلام صاحب نے بھی موضوع پسند فرمایا، قاضی صاحب، عرشی صاحب اور میرے والد بسمل سعیدی اور یونیورسٹی کے مذکورہ اساتذہ کی رہنمائی سے، ڈاکٹر خورشید الاسلام صاحب یونیورسٹی کی طرف سے میرے سُپروائزر تھے۔ میں نے جس قدر سخت محنت سے کام کیا وہ میری تحقیقی کتاب "دیوان حسرت عظیم آبادی مرتبہ ڈاکٹر اسما سعیدی" سے ظاہر ہے۔ علی گڑھ اور دہلی کی لائبریریوں کے علاوہ میں نے خود سفر کئے رام پور، پٹنے، کلکتے، حیدر آباد کی لائبریریوں میں اوریجنل میٹیریل کی تلاش میں سرگرداں رہی جو کچھ بھی متعلقہ میٹیریل مل سکا اسے حاصل کرنے کی کوشش میں کوئی کمی نہیں کی بے حد محنت کی ہر جگہ سے صدر شعبۂ اردو اور میرے سُپروائزر صاحب کو میری بہت عمدہ رپورٹیں بھیجی گئیں میرے کام اور محنت کی بڑی تعریف کی گئی مسلسل اسفار اور سخت محنت کی وجہ سے بار بار بیمار بھی ہوئی لیکن پرواہ نہیں کی کام کرتی رہی۔ .PH.D کے بعد سے میری صحت اب تک گری ہوئی ہے۔ گری ہوئی صحت کی وجہ سے میں نے کہیں بھی پروفیسر ہونا مناسب نہیں سمجھا ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب مرحوم اردو بورڈ کے چیرمین نے اس کتاب کو اپنے بورڈ میں چھپوانا پسند کیا تھا موصوف کو بھی دیوان حسرت بہت پسند تھی، تمام ممتحنین نے اس کی رپورٹیں بہت عمدہ بھجوائی تھیں کنووکیشن اور ڈگری ملنے کے بعد جب میں رجسٹرار آفس گئی تو آفس کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ستر سال میں کبھی بھی کسی کی اتنی عمدہ رپورٹیں نہیں آئی تھیں۔ پوری یونیورسٹی میں دیوان حسرت کی دھوم تھی شعبۂ اردو کے علاوہ تقریباً ہر شعبے کے صدر نے مجھے مبارکباد دی، شاباشی دی، عزت افزائی فرمائی۔ اس کے چھپنے سے پہلے میرا شعری دیوان "گلہائے فکر"، منسٹری آف ایجوکیشن، ڈپارٹمنٹ آف کلچر کی طرف سے چھپ چکا تھا اس کی تعریف اخبارات و رسائل میں ہو رہی تھی اسا پر تبصرے، مضامین، نظمیں وغیرہ شائع ہو رہی تھیں۔ اسی مدت میں دیوان حسرت عظیم آبادی بھی شائع ہو گیا اعلیٰ پایہ کے تقریباً سب محققین اور ناقدین نے دیوان حسرت کو بہت سراہا ملک کی تمام

یونیورسٹیوں اور کالجوں کی لائبریریوں میں میری دونوں کتابیں گئیں۔ یوپی اردو اکیڈمی نے گلہائے فکر کو اوارڈ سے نوازا بہار اردو اکیڈمی نے دیوان حسرت کو پہلا اوارڈ عطا کیا۔

اس قدر مشہور و مقبول کتاب (دیوان حسرت) جس کو چھپے ہوئے بھی بارہ تیرہ سال ہو گئے اب اگر آپ یا کوئی اسے ذلیل اور بدنام کرنا چاہتے ہیں تو کیجئے آپ کی مرضی پر ہے۔ قاضی صاحب عرشی صاحب نہیں دیگر کئی اعلیٰ پایہ کے بعض محققین ناقدین نہیں مجھے اب فرصت نہیں کہ میں اس کتاب پر پھر طویل وقت صرف کر دوں اسقدر اچھی کتاب لکھنے کے باوجود اس قدر محنت و مشقت کرنے کے باوجود میرے لئے بدلے میں ذلت و توہین عیب جوئی اور عیب بینی ہے۔

●●

ڈاکٹر سید حسین احمد
درگاہ شاہ ارزانی، پٹنہ

ڈاکٹر احمد حسن دانش کا تھیسس

بہار میں اردو مثنوی کا ارتقاء

"بہار میں اردو مثنوی کا ارتقا" ڈاکٹر احمد حسن دانش کا مقالہ تحقیقی ہے جس پر دانش گاہ بہار نے انہیں پی ایچ ڈی کی سند عطا کی ہے اور یہ مقالہ ۱۹۸۹ء میں بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر بہت اچھا کام ہو سکتا تھا۔ یوں بھی ڈاکٹر دانش سے قبل بہار کی اردو مثنویوں پر خاصہ کام ہو چکا ہے خود مولف بہار (ڈاکٹر احمد حسن دانش) اس کے مدعی بھی ہیں۔

"مجھ سے پہلے جتنے بزرگ محققین نے مثنوی پر کام کیا ہے اور اس سلسلے میں ان سے جو نازک سہو ہوئے ہیں اس کتاب میں میں نے ان کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے ۔۔"

اور اس دعوی کی تائید ڈاکٹر طارق جمیل پروفیسر و صدر شعبۂ اردو (پی اجی ویوجی) پورنیہ کالج پورنیہ یوں کرتے ہیں۔

"اردو مثنوی کا ارتقا" ڈاکٹر دانش کا قابل قدر تحقیقی مقالہ ہے جو انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھا ہے اس میں بہار کی مثنویوں سے متعلق زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کیے گئے ہیں ۔۔۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب کہی جا سکتی ہے ڈاکٹر دانش نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف عظیم آباد دبستان کی بلکہ اردو ادب کی بھی نیک خدمت انجام دی ہے۔"

"یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب" اس لیے کہی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اغلاط نامہ بھی ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہوگا۔ لیکن میں صرف اس کتاب کا ایک سرسری جائزہ لوں گا۔ یہاں پر ان مثنویات اور مثنوی نگار شعرا کی نشاندہی نہیں کروں گا جن کو مؤلف بہار نے چھوڑ دیا ہے۔ گرچہ ان مثنویوں کے بغیر بہار میں اردو مثنوی کی تاریخ نامکمل رہ جاتی ہے۔

(۲) مؤلف بہار نے بیشتر اپنے عہد یا اس سے کچھ قبل کے لکھنے والوں کے اقوال پیش کیے ہیں اور اصل مآخذ دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر صدر الدین فضا کی تھیسس حضرت شاہ آیت اللہ جوہری ان کی حیات اور شاعری کو سامنے رکھا ہے۔ یونیورسٹی پروفیسر، صدر شعبۂ اردو، پرنسپل اور اکادمی کا سکریٹری ہونا الگ بات ہے۔ اس کے لیے بقول اکبر الہ آبادی پڑھنے لکھنے پر نہیں کچھ موقوف ۔۔۔ علم اور تحقیق الگ چیز ہے۔ لہٰذا جہاں جہاں ڈاکٹر صدر الدین فضا کی تھیسس سے مؤلف بہار نے

پنی کتاب میں حوالہ دیا ہے وہاں وہاں غلطیاں جگہ پاگئی ہیں۔

(۳) مؤلف بہار ص۱۱ پر رقم طراز ہیں: مرزا (فغاں) بہت ہی ظریف المزاج اور خوش طبع واقع ہوئے تھے اس لیے احمد شاہ بادشاہ کے دربار میں ظریف الملک کوکہ خاں کے شاہی خطاب سے نوازے گئے تذکرہ گلشن ہند میں ان کی خوش طبعی اور خوش اختلاطی کا ذکر ملتا ہے۔ عظیم آباد آئے تو مہاراجہ شتاب رائے نے بڑی قدر دانی کی جس نے انہیں عظیم آباد کی خاک سے دم آخر تک پٹنے رہنے پر مجبور کر دیا۔ پروفیسر صدر الدین فضا نے ان کے مرشد آباد اور مرشد آباد سے ادھر اور پھر ادھر سے عظیم آباد آنے کا ذکر کیا:

(الف) فغاں کو ظریف الملک کا خطاب احمد شاہ کے دربار سے نہیں ملا تھا بلکہ یہ خطاب مہاراجہ شتاب رائے نے دیا تھا۔ تذکرہ شورش نسخہ جونپور میں فغاں کے خطاب کے متعلق صاف صاف درج ہے:

"بخدمت مہاراجہ شتاب رائے دوستی پیدا نمودہ بوسیلہ ظرافت چناں پیش آمدہ کہ اتفاقاً ہم رسانیدہ و خطاب ظریف الملک مصاحب الدولہ یکتا زجنگ یافتہ"

(ب) فغاں کے مرشد آباد جانے کا ذکر قدیم تذکروں میں نہیں ملتا ہے۔ مخزن نکات نسخہ لندن میں بھی مرشد آباد جانے کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں درج ہے کہ نواب غازی الدین خاں وزیر الملک سے رنجش کے باعث بڑی ذلت سے شہر سے نکل کر پٹنہ پہنچے۔ نکات الشعراء، تذکرہ ریختہ گویاں، تذکرہ شورش، تذکرہ مسرت افزا، شعرائے اردو، مجموعہ نغز، عقد ثریا، ریاض الفصحا اور گلشن سخن وغیرہم میں فغاں کے مرشد آباد جانے کا ذکر نہیں ملتا ہے۔

مؤلف بہار ص۲۲ پر تحریر کرتے ہیں:

"اس طرح فغاں کے دو مثنویوں کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں ایک ہجویہ مثنوی کسی بوڑھے شخص کی شادی کی خواہش پر لکھی تھی جس کا عنوان انجمن الاصلاح دیسنہ (پٹنہ) کے دیوان فغاں کے ایک قلمی نسخہ میں میر معصوم لکھا ہوا ہے اس میں کل ۱۱۴ اشعار موجود ہیں"

خدا بخش لائبریری پٹنہ میں دیوان فغاں کا قلمی اور مطبوعہ دونوں نسخہ موجود ہے مولف بہار اگر اسے دیکھ لیتے تو انہیں یہ علم ہو جاتا کہ ان کی دو نہیں بلکہ سات مثنویاں ہیں۔

"دیوان فغاں" مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن (مرحوم) شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان طبع اول ۱۹۵۰ء میں فغاں کی سات مثنویاں موجود ہیں۔

(۱) ہجو حاجی ۱۴ اشعار (۲) ہجو دانیال ۵۴ اشعار (۳) ہجو آخوند صاحب ۲۹ اشعار (۴) ہجو لاغر ۱۰ اشعار

(۵) ہجو میر معصوم ۴۳ اشعار (مولف بہار نے ۱۴۳ اشعار نہ جانے کس نسخہ میں دیکھا) (۶) ہجو شاہ عبدالرحمٰن الہ آبادی ۶۹ اشعار (۷) ہجو برادر ۹ اشعار

(۴) مولف بہار ص۲۹ پر تحریر کرتے ہیں:

"خواجہ امین الدین نام تھا اور امین تخلص کرتے تھے عظیم آباد ان کا وطن تھا۔ صدرالدین فضا نے انہیں متوطن عظیم آباد لیکن کشمیری الاصل لکھا ہے لیکن اس کے لیے کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے۔ ان کے علاوہ کسی نے ان کو کشمیری الاصل نہیں لکھا ہے۔"

تذکرہ نگاروں نے انہیں کشمیری الاصل لکھا ہے اگر مؤلف بہار تذکروں کو نہ دیکھیں تو قصور کس کا ہے؟

تذکرہ شورش نسخہ جونپور میں امین کے متعلق درج ہے۔

"بزرگان ایشاں از کشمیر جنت نظیر تشریف آوردہ در عظیم آباد استقامت ورزندہ۔"

اس کے علاوہ مصنف مسرت افزا نے بھی لکھا ہے ان کا (امین کا) اصلی وطن خطہ جنت نظیر کشمیر تھا۔

(۵) مؤلف بہار ص۳۲ پر لکھتے ہیں، "نام شیخ رکن الدین تھا اور شاہ گھسیٹا کے عرف نام سے مشہور تھے۔"

تذکرہ نگاروں نے شاہ رکن الدین نام عرف مرزا گھسیٹا اور تخلص عشق لکھا ہے۔ مؤلف بہار کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ شاہ بنا کر شیخ اور مرزا بنا کر شاہ لکھیں۔

مؤلف بہار ص۳۴ پر رقم طراز ہیں:

"صاحب آیت اللہ جوہری کا قیاس ہے کہ عشق عظیم آباد ۱۱۰۸ھ میں آئے ہوں گے کیونکہ عظیم آباد میں ان کے تقریباً پچیس سال اقامت گزیں رہنے کا سراغ ملتا ہے اور ۱۲۰۳ھ میں مرے اس طرح قیاس اغلب ہے کہ ۱۱۰۸ھ میں ہی آئے ہوں گے۔"

عشق ۱۱۰۸ھ میں نہیں بلکہ ۱۱۶۹ھ میں عظیم آباد آئے اور یہاں وہ پچیس[۲۵] سال نہیں بلکہ چونتیس[۳۴] سال مقیم رہے (تفصیل کے لیے راقم الحروف کا مضمون "ڈاکٹر اسرار سعیدی کی تصحیح دیوان حسرت عظیم آبادی کا جائزہ" دیکھیے۔)

(۶) مؤلف بہار ص۳۸ پر لکھتے ہیں:

(الف) "ان کا صحیح نام غلام یحییٰ حضور ہے"۔ غلط بالکل غلط ان کا نام شیخ غلام یحییٰ اور حضور تخلص ہے۔

(ب) مؤلف بہار ص۳۸ پر رقم طراز ہیں: — "حضور پٹنہ کے رئیس تھے۔"

مؤلف بہار اس کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟ کسی تذکرے میں ان کے رئیس ہونے کا ذکر نہیں ہے گلزار ابراہیم میں حضور کے متعلق درج ہے۔

"در نیولا بقلیل تجارت معیشت می کند۔"

(ج) مؤلف بہار صـ۳۹ پر لکھتے ہیں:

"(حضور کی) ہجویہ مثنوی میں ۹۸ اشعار اور مثنوی در مدح شاہ ارزاں میں ۴۸ اشعار ہیں مہاجن کی ہجو میں جو مثنوی لکھی گئی ہے اس میں ۲۵ اشعار ہیں۔ تینوں مثنویاں جو ملی ہیں وہ نستعلیق میں تحریر ہیں۔"

مندرجہ بالا عبارت پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مؤلف بہار کلیات حضور کے ذاتی مطالعہ کے مدعی ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مؤلف بہار نے دیوان حضور کا نہ قلمی نسخہ دیکھا ہے اور نہ مطبوعہ۔

دیوان حضور کا قلمی نسخہ خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ میں موجود ہے ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو نے اسے طویل مقدمہ و حواشی کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے جو ۱۹۷۷ میں بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے لبرٹی آرٹ پریس دہلی سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس میں مثنوی کا صحیح نام اور اشعار کی تعداد اس طرح ہے:

(i) مثنوی در تعریف درگاہ شاہ ارزاں تعداد اشعار ۸۳

(ii) مثنوی در ہجو ولایتی " " ۵۰

(iii) مثنوی در ہجو مہاجن " " ۸

مؤلف بہار نے صـ۴۰ پر مثنوی در تعریف درگاہ شاہ ارزاں سے نمونتاً چھ اشعار نقل کیا ہے پانچواں شعر ہے۔

رواں کروں ہوں اس کو سوئے عظیم آباد کہ وہ بھی زور ہے بستی رکھے کریم آباد

مندرجہ بالا شعر دیوان حضور کے قلمی نسخہ مملوکہ خانقاہ عمادیہ میں نہیں ہے اور نہ مطبوعہ دیوان میں ہے۔ مؤلف بہار نے یہ شعر کہاں سے نقل کیا۔ ان کے پیش نظر حضور کے کلیات کا کون سا نسخہ تھا؟ اور وہ کہاں ہے؟

مؤلف بہار صـ۴۲ پر تحریر کرتے ہیں:

(الف) "شاہ کمال علی نام تھا اور کمال تخلص بھی تھا ضلع گیا کا ایک گاؤں مان پوران کا وطن تھا۔ بقول پروفیسر صدر الدین فضا وہ آخری عمر میں اپنی ننہال دیورہ میں رہنے لگے تھے جو بہار شریف کے متصل ہے۔"

دیورہ بہار شریف سے متصل نہیں ہے بلکہ گیا ضلع میں ٹکاری سے قریب ہے۔

(ب) مؤلف بہار نے شاہ کمال علی کمال کی مثنوی کا نام مناقب کا یہ لکھا ہے۔

بغیر دیکھے لکھنے سے یہی سب غلطیاں ہوتی ہیں۔ مناقب کا یہ کسی مثنوی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک رسالہ کا نام ہے جو شاہ محمد ابراہیم صاحب سجادہ نشین خانقاہ کا یہ نے لکھا ہے۔

(۴۸) مؤلف بہار صـ۴۹ پر رقم طراز ہیں:

"تذکرۃ الصالحین میں ان کا نام شاہ سعد اللہ بتایا ہے جو عشق علی کے نام سے مشہور تھے ان کا تخلص شاہ تھا وہ شاہ کریم اللہ ارزانی کے مرید تھے۔"

(الف) مؤلف بہار نے شاہ کے کلیات کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ شاہ کے کلیات کے قلمی نسخہ یا مطبوعہ رباعیات بنام فتاویٰ طریقت کا مطالعہ کرتے تو انہیں شاہ کا اصل نام معلوم ہو جاتا اور ان کے پیر کا نام بھی صحیح لکھتے۔ شاہ ایک رباعی میں اپنا نام تخلص، مولد اور اپنے پیر کا نام اس طرح بتاتے ہیں ؎

پٹنہ ہے میرا مولد و مسکن درگاہ — ہے عشق علی نام و تخلص ہے شاہ
یعنی ہے یہ خاکسار ارزاں شاہی — مرشد کا ہمارے اسم ہے کریم اللہ

(ب) مؤلف بہار صفحہ ۵ پر رقم طراز ہیں:

"شاہ کی جس قلمی مثنوی کا تذکرہ ہے وہ ایک منظوم شجرہ ہے جس میں پیران طریقت حضرت شاہ بسنت ارزاں متوفیٰ ۱۰۳۸ھ کا شجرہ ہے۔"

حضرت شاہ بسنت رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر اکثر تذکروں میں ملتا ہے مؤلف بہار کو ان کا نام کم از کم صحیح لکھنا چاہیے تھا۔ ان کا نام سید شاہ بسنت ہے چونکہ وہ حضرت دیوان شاہ ارزانی قدس اللہ سرہٗ کے سلسلے میں مرید ہیں اس لیے "ارزاں شاہی" نام کے آگے لکھا جاتا ہے۔ اور حضرت سید شاہ بسنت ارزاں شاہی کا انتقال ۱۰۳۸ھ نہیں بلکہ ۱۱۵۸ھ میں ہوا۔

مؤلف بہار صفحہ ۵ پر لکھتے ہیں: "مندرجہ بالا مثنوی کا ایک نسخہ ابوالحسن فرد کا لکھا ہوا خانقاہ مجیبیہ میں ہے۔ اس کی ایک نقل قاضی عبدالودود صاحب کے پاس بھی موجود ہے۔"

مؤلف بہار کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ صرف ایک مثنوی نہیں ہے بلکہ اس میں دو مثنوی اور ایک قصیدہ بھی ہے مؤلف بہار کو یہ خبر نہیں کہ شاہ کے کلیات میں مندرجہ ذیل مثنویاں ملتی ہیں:

(۱) سلسلہ منورہ مرشدان خلافت قادریہ حضرت دیوان شاہ ارزانی — ۹ اشعار
(۲) مثنوی حلیہ جناب خاتم المرسلین —————— ۶۷ اشعار
(۳) مثنوی حلیہ امیر المومنین —————— ۶۳ اشعار
(۴) مثنوی سلسلہ پیران ارزاں شاہی —————— ۴۱ اشعار

(۹) مؤلف بہار صفحہ ۶۲ پر لکھتے ہیں:

راغب کا نام محمد جعفر خاں تھا اور راغب تخلص کرتے تھے۔ نواب لطف اللہ خاں کے بھتیجا تھے ڈاکٹر صدر الدین صاحب
ن کے والد کا نام ہدایت اللہ خاں بتلایا ہے۔ یہ شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے ۱۱۰۴ھ تک دہلی میں رہے۔ اس کے بعد عظیم آباد
آئے اور یہیں غربت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کی پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں اور نہ ہی ان کی وفات کے بارے میں
ا کے ساتھ کچھ کہا جا سکتا ہے۔

اور مؤلف بہار آگے لکھتے ہیں: "جناب صدر الدین فضا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کی موت ۱۱۹۴ھ اور ۱۲۱۵ھ کے
یان واقع ہوئی ہوگی۔"

(الف) راغب نواب لطف اللہ خاں صادق کے بھتیجا نہیں بلکہ پوتا تھے۔

(ب) مؤلف بہار نے لکھا ہے ۱۱۰۴ھ تک دہلی میں رہے غلط، وہ ۱۱۰۴ھ میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے صاحب مسرت
فزا نے لکھا ہے کہ ۱۱۷۰ھ تک دہلی میں قیام تھا۔

(ج) مؤلف بہار۔ نشتر عشق دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے تو انہیں راغب کا سنہ ولادت اور سال وصال دونوں مل جاتا
حب نشتر عشق کے مطابق راغب کی سال پیدائش ۱۱۵۶ھ ہے اور صاحب نتائج الافکار نے ۱۱۵۷ھ لکھا ہے اور راغب
انتقال ۱۲۱۷ھ میں ہوا۔

(۱۰) مؤلف بہار نے لکھا ہے "راغب مرزا محمد فاخر مکیں کے شاگرد تھے۔"

راغب مرزا محمد فاخر مکیں سے فارسی کلام پر اصلاح لیتے تھے اور اردو کلام مرزا محمد رفیع سودا کو دکھاتے تھے۔ تذکرہ
رشس نسخہ آکسفورڈ میں راغب کے ترجمہ میں درج ہے:

"... در نثر و نظم مہارت کلی دارند و در شعر فارسی صاحب دیوان شاگرد مرزا محمد فاخر مکیں و در ریختہ
شاگرد مرزا محمد رفیع سودا ..."

(۱۱) مؤلف بہار ص۸۵-۱۸۴ پر رقم طراز ہیں:

"(راغب کی) پہلی مثنوی "شہر آشوب" ہے جس میں تقریباً سو اشعار ہیں دوسری مثنوی "احوال بزم ہولی"
ہیں۔ ویاہ و شعر ملتے ہیں انھوں نے ایک مثنوی "یوسف زلیخا" لکھ کر اس کا نام بستان ہند رکھا جس میں
دو سو پچاس اشعار ہیں۔ ان کی ایک اور مثنوی "فتح نامہ" ہے جس میں ٹیپو سلطان اور کارنواس کی جنگ
کا تذکرہ ہے یہ مثنوی ۱۵۱۲ اشعار پر مشتمل ہے ۱۲۱۴ھ میں کتابت ہوئی۔ ایک اور مثنوی "سوز عشق" ملی ہے
جس میں ۱۰۳ اشعار ہیں۔ اس مثنوی کا نام صدر الدین فضا نے سوز عشق لکھا ہے انھوں نے ایک اور مثنوی

قریب تین سو اشعار کی لکھی تھی جس کا کوئی عنوان نہیں ہے "

کلیات راغب کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے اگر مؤلف بہار اسے دیکھ لیتے تو ان سے اتنی غلطیاں نہیں ہوتیں۔

راغب کے کلیات میں بارہ مثنویاں ہیں۔

(۱) بیان احوال وبائے مرشد آباد ۱۳۰ اشعار (۲) شہر آشوب ۷۷ اشعار (۳) بیان احوال ہولی ۱۹۷ اشعار

(۴) فتح نامہ (رزمیہ مثنوی) ۱۳۰۶ اشعار (۵) شورش عشق ۔ مؤلف بہار نے اس کا نام سوز عشق لکھا ہے پھر صدر الدین فضا کے حوالے سے شورش عشق تحریر کیا ہے جب کہ دونوں غلط ہے اس کا نام شور عشق ہے۔ اس کے تین قلمی نسخے دستیاب ہیں۔ ایک خدا بخش لائبریری میں ہے دوسرا پروفیسر ذکی الحق مرحوم کی ملک تھا اور تیسرا پنجاب میں ہزار سنگھ کے پاس۔ خدا بخش اور ذکی الحق والے نسخے میں ۲۰۰ اشعار ہیں ہزار سنگھ کے پاس شورش عشق کا جو قلمی نسخہ ہے اس میں ۱۹۹ اشعار ہیں (راقم الحروف نے تینوں نسخوں کو ملا کر اسے ایڈٹ کر دیا ہے جو اردو کی دو مثنویاں کے عنوان سے ۱۹۸۰ء میں شائع بھی ہو چکی ہیں)

(۶) مثنوی مدح آصف الدولہ ۲۸۲ اشعار (۷) بیان احوال کثیر الاختلال خود ۵۰ اشعار (۸) بستان ہند ۵۳ اشعار (۹) ولیم سیلی کی مدح میں ۲۸ اشعار (۱۰) ولیم سیلی کی مدح میں ۱۸ اشعار (۱۱) نواب آصف الدولہ کی شان میں ۲۰۳ اشعار (۱۲) مثنوی کس کی تعریف میں ہے واضح نہیں کیونکہ جس جگہ ممدوح کا نام ہونا چاہئے وہ جگہ خالی ہے لیکن قرینہ غالب ہے کہ یہ مدحیہ مثنوی ہنری ڈنکلس ہی سے متعلق ہے ۔ ۳۴ اشعار

(۱۲) مؤلف بہار ص۵۸ پر تحریر کرتے ہیں:

"ان کی (جوشش کی) وفات کے متعلق سارے تذکرے خاموش ہیں بقول قاضی عبدالودود صاحب وہ ۱۲۱۶ھ تک زندہ تھے۔"

قاضی صاحب نے جس زمانہ میں دیوان جوشش کو ایڈٹ کیا تھا اس وقت تک بہت سے تذکرے اور دواوین دستیاب نہیں تھے لیکن مؤلف بہار کے وقت میں تو تقریباً تذکرے منظر عام پر آگئے ہیں اور دواوین بھی۔ صرف مطالعہ کی ضرورت ہے۔ کلیات ناسخ کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۳۹ھ کتب خانہ محمود آباد میں محفوظ ہے جس میں جوشش کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ اس طرح درج ہے:

تاریخ وفات شیخ محمد روشن جوشش

شیخ ذی دانش محمد روشن آہ عازم ملک عدم شد زیں سرائے

گفت تاریخ مصرع سال وفات　　　　شہر شوال و شب آدینہ ہائے

(تاریخ وفات جوشش کے سلسلہ میں پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کا ایک تفصیلی مضمون معاصر ۱۹۰۳ء نمبر ۳۰ میں شائع ہو چکا ہے)

(۱۳) مؤلف بہار جوشش کے سلسلہ میں ص۵۰ پر لکھتے ہیں: مرشد آباد کا قلمی نسخہ ابھی منظر عام پر نہیں آیا ہے

موصوف کو معلوم ہونا چاہئے کہ پروفیسر کلیم الدین احمد نے اسے ایڈٹ کر دیا ہے اور ۱۹۷۰ء ہی میں بہار اردو اکادمی نے

اسے شائع بھی کر دیا ہے۔

(۱۴) مؤلف بہار ص۶۹ پر تحریر کرتے ہیں۔ "ندوی نے ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا۔"

ندوی کا انتقال کس سن میں ہوا۔ اب تک دریافت شدہ تذکرے خاموش ہیں بقول قاضی عبد الودود صاحب:

"گلشن ہند میں ان لوگوں میں ہیں جو جو راہی عدم ہو چکے اور طپش کی شمس البیان میں یہ زندوں میں شمار

ہوتے ہیں۔ وفات ۱۲۰۸ھ اور ۱۲۱۵ھ کے درمیان ہوئی ہے اس سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔"

(۱۵) مولف بہار ص۷۵ پر رقم طراز ہیں:

"راسخ بقول حمید عظیم آبادی ۱۱۶۳ھ میں پیدا ہوئے لیکن ڈاکٹر ممتاز احمد اور قاضی عبد الودود کے مطابق راسخ

کی پیدائش ۱۱۷۰ھ کے قریب ہوئی۔"

(الف) مؤلف بہار کو اپنی بھی رائے دینی چاہئے تھی کہ وہ کون سا سن صحیح مانتے ہیں۔

(ب) مجھے درگاہ حضرت شاہ ارزانی پٹنہ کے کتب خانہ میں ایک قلمی رسالہ حلت و حرمت ملا ہے جو ابو تراب جعفری پھلواروی

کا لکھا ہے اس کے ایک صفحہ پر راسخ کی ایک غزل بھی درج ہے اور اس کے نیچے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"غزل غلام علی شاہ راسخ مرحوم خلف شیخ محمد فیض مرحوم طریق یافتہ حضرت شاہ کریم اللہ قدس سرہ العزیز

ولادت او در ۱۱۶۹ ہجری و سال رحلت ۱۲۳۸ ہجری سر درویش بود۔" فقیر عماد اللہ عفی عنہ "

اس عبارت کو پڑھنے کے بعد یہ بات تیقن کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ راسخ ۱۱۶۹ھ میں پیدا ہوئے۔

(۱۶) مؤلف بہار ص۹۲ پر صفیر بلگرامی کے متعلق لکھتے ہیں:

"مارہرہ ان کی نانیہال تھی اور بلگرام میں دادیہال تھی جب تین سال کے ہوئے تو دادیہال آئے۔"

لیکن خود صفیر بلگرامی "صفیر بلبل" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "جب میں ایک سال کا ہوا تو وطن اصلی یعنی بلگرام میں آیا۔"

مؤلف بہار آگے تحریر کرتے ہیں:

"پہلے اپنے پھوپھا سید محمد مہدی خبر بلگرامی کو کلام دکھلایا اور بعد میں ناسخ کے ایک شاگرد شیخ امان علی سحر

کی شاگردی اختیار کی۔"

مؤلف بہار اصل ماخذ کی طرف رجوع نہیں ہوتے ہیں صرف سنی سنائی باتیں لکھ دی ہیں یا ایسی کتابیں سامنے رکھی ہیں جو خود ہی معتبر نہیں ہیں۔ مؤلف بہار کو چاہئے تھا کہ صفیر بلگرامی کے حالات لکھنے سے قبل صفیر کا دیوان "صفیر بلبل" دیکھ لیتا صفیر نے اس کے دیباچے میں اپنے متعلق ضروری باتیں درج کر دی ہیں۔

صفیر لکھتے ہیں:

"سید محمد مہدی خیر تخلص کہ میرے جد بزرگوار کے برادر عم زاد تھے نہایت خوش مذاق ملک طبع خداداد تھے میری تربیت میں معروف ہوئے جب ہم شاہد سخن سے مالوف ہوئے۔ لکھنو کی شوق میں پاؤں بڑھایا اپنے کلام کو شیخ امان علی سحر لکھنوی تک پہنچوایا وہ شاگرد رشید مرزا محمد رضا برق کے ہیں۔"

مؤلف بہار ص۵۲ پر رقم طراز ہیں: "ان کا (صفیر کا) سب سے پہلا دیوان ۱۲۷۳ھ میں مرتب ہوا۔"

غلط بالکل غلط ان کا دیوان اول صفیر بلبل ۱۲۷۲ھ میں ترتیب پایا اور ۱۲۸۰ھ میں مطبع حیدری سے طبع ہوا۔

(۱۷) مؤلف بہار ص۵۶ پر شاہ الفت حسین فریاد کے متعلق لکھتے ہیں۔ "آپ تیرہویں صدی کے ایک نامور اور بلند پایہ شاعر تھے" فریاد کے متعلق مندرجہ بالا جملہ لکھنا مولف بہار کی کم علمی کا ثبوت ہے۔ مولف بہار کو معلوم ہونا چاہئے کہ فریاد کی مثنوی دبستان اخلاق فارسی زبان میں ہے۔

(۱۸) مولف بہار نے ص۱۳۵ پر شاہ عطا کریم عطا کا تذکرہ کیا ہے اور بحیثیت مثنوی نگار انہیں پیش کیا ہے۔ لیکن عطا کی مثنوی ان کی نگاہ سے گذری ہے اور نہ مثنوی کے متفرق اشعار۔

(۱۹) مؤلف بہار ص۱۴۰ پر رقم طراز ہیں:

"سید کاظم علی نام جمیل مظہری تخلص متوطن حسن پورہ ضلع سارن بہار ۱۹۰۵ء میں سید خورشید علی حسین کے گھر پیدا ہوئے"

(الف) حسن پورہ ضلع سارن لکھنا غلط ہے بلکہ ضلع سیوان لکھنا چاہئے۔

(ب) جمیل مظہری ستمبر ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔

(۲۰) مؤلف بہار لکھتے ہیں "جمیل مظہری ۱۹۴۲ تا ۱۹۴۵ فلمی صحافت کی۔"

غلط جمیل مظہری ۱۹۴۳ سے ۱۹۴۷ تک فلمی صحافت سے منسلک رہے۔

(۲۱) مؤلف بہار ص۱۴۹ پر تحریر کرتے ہیں:

"امان علی ترقی کی مثنوی کے کچھ اشعار "اعیان وطن" از شعیب پھلواروی میں ملتے ہیں"

مولف بہار گلاو رفارسی زبان میں فرق محسوس ہوتا ہے کہ نہیں۔ یہ "اعیار وطن" میں امان علی ترقی کی جو مثنوی درج ہے وہ فارسی زبان میں ہے۔"

(۲۳) مؤلف بہار نے صوفی منیری کی صرف دو مثنوی "والحمد" اور "کشش عشق" کا ذکر کیا ہے گرچہ ان کی چار مثنویاں اور بھی دستیاب ہیں (۱) روشن عشق (۲) سوز پنہا (۳) نمونہ قیامت (۴) مثنوی جمعہ کے خطبہ میں پڑھنے کی عبارت۔

ان مثنویوں کے علاوہ صوفی منیری نے اور بھی مثنویاں لکھی ہیں لیکن یہ بغیر عنوان کی ہیں۔ یوں تو مولف بہار نے بہت سی مثنویاں اور مثنوی نگار شعرا کو چھوڑ دیا ہے۔ میں یہاں پر چند مثنویوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

(i) میر غلام حسین شورش کی ایک مثنوی خدا بخش لائبریری میں موجود ہے قیاس اغلب ہے کہ اس مثنوی کا نام "درد والم" ہے اس کے علاوہ شورش نے دو اور مثنویاں لکھی ہیں (۱) مثنوی باغ وبہار (۲) مثنوی در تعریف علی باغ مشتمل بر مدح حضرت مولوی محمد وحید وزار حسین خاں۔

(iii) محمد کاکوی کی مثنوی وسیلہ بخشائش المعروف بہ "مناجات" ہے اس میں تقریباً ۵۰ اشعار ہیں اس کا قلمی نسخہ پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن عطاؔ کاکوی کے پاس ہے۔

(iv) اکبر داناپوری کی کئی مثنویاں "جذبات اکبر" اور "ابیغ" میں ملتی ہیں۔

(v) شمس منیری نے ایک ضخیم مثنوی "شکار نامہ" لکھی تھی جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

(vi) علامہ بوم۔ پروفیسر سید حسن کی طنزیہ مثنوی ہے اور مطبوعہ ہے۔

(viii) حدیث سخن۔ یہ مثنوی ڈاکٹر ممتاز احمد پروفیسر و صدر شعبہ اردو کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

(ix) شاعر اور شاعرہ۔ ازولی کاکوی۔ یہ مثنوی مطبوعہ ہے تقریباً ۲۰۰ اشعار ہیں اور ۳۲ صفحات پر مکتبہ ندیم پٹنہ سے پاکٹ سائز پر شائع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر احمد حسن دانش
شعبۂ اردو، پورنیہ کالج پورنیہ

جواب

جواباً عرض ہے کہ آپ مذکورہ تبصرہ بخوشی شائع کرسکتے ہیں۔ یہ قوم کی چیز ہے، قوم تک پہنچنی چاہیئے۔ میں نے جس موضوع پر تحقیق کی تھی اس پر تحقیق کا باب بند نہیں ہوا ہے۔ اس میں اب بھی نئی نئی باتیں سامنے آسکتی ہیں۔ نئے نئے گوشے اجاگر ہوسکتے ہیں۔ ڈاکٹر سید حسین احمد صاحب کا میں شکرگذار ہوں کہ انہوں نے میری تھیسس کی وساطت سے اردو والوں کو بہت ساری پوشیدہ حقیقتوں سے روشناس کرایا جہاں تک میری نگاہ آج سے پندرہ بیس سال قبل نہیں جاسکی تھی۔ تبصرہ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف کا مطالعہ گہرا ہے اور خصوصاً خامیوں پر ان کی گرفت مظبوط ہے۔ اس حد تک مظبوط کہ خوبیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود بھی بہت ساری خامیوں کے مرتکب ہوگئے ہیں۔ ان کا انداز بیان قلمکار کا نہیں بلکہ لٹھ مار کا ہوگیا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ میں نے پہلی تحقیق کی ہے اور حسین صاحب پہلے تبصرہ نگار ہیں۔ تحقیق ہوتی رہی ہیں اور تبصرے ہوتے رہے ہیں۔ خامیوں کی نشاندہی بڑے بڑے فنکاروں کے یہاں اور بڑے بڑے نقادوں اور مبصروں کے ذریعہ ہوتی رہی ہیں اور ترقی یافتہ ادب کے لیے یہ نیک شگون بھی ہے لیکن اسکی ایک روایت اور تہذیب ہوتی ہے جس کا دامن حسین صاحب کے ہاتھ سے چھوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر وہ اپنے قلم کی تہذیب کریں تو ادب کی دنیا میں اونچا مقام پائیں گے۔

بہرحال یہ تبصرہ آپ ضرور شائع کیجئے اور مجھے شکریہ کا موقع عنایت فرمائیے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ میرا جواب بھی ضرور شائع کیا جائے گا۔

●●

ٹر سید حسین احمد
۱۵ شاہ ارزانی، پٹنہ

ڈاکٹر گیان چند جین کا تھیسس

اردو مثنوی شمالی ہند میں

اردو محققین کی فہرست میں فی زمانہ ایک نمایاں نام گیان چند جین کا بھی نظر آتا ہے "اردو مثنوی شمالی ہند میں"
کا مقالہ تحقیق ہے۔ جس پر دانش گاہ آگرہ نے انہیں ۱۹۶۰ء میں ڈی۔ لٹ کی سند سے نوازا ہے۔ موصوف سے قبل اردو
نویات پہ خاصہ کام ہو چکا تھا جس کا اعتراف خود محقق نے بھی اپنے پیش لفظ ص ۹ پر کیا ہے (لیکن یہ فہرست ادھوری ہے)
۱۹۶۹ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے یہ تحقیقی مقالہ ڈیمائی سائز کے ۸۶۲ صفحات پر مشتمل شائع ہوا تھا۔ اس
قالہ کا انتساب ڈاکٹر گیان چند جین نے یوں کیا تھا۔ "احترام و عقیدت کے ساتھ اس صحیفہ اغلاط کو اردو کے عظیم محقق
ضی عبدالودود بار ایٹ لا کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں"۔

یہ مقالہ قاضی صاحب کے انتقال کے چار سال بعد دوبارہ ترمیم و اضافہ کے ساتھ ۱۹۸۷ء میں انجمن ترقی اردو ہند
جانب سے دو جلدوں میں شائع ہوا تو اس نئے ایڈیشن کا انتساب یوں ہو گیا۔ "احترام و عقیدت کے ساتھ اردو کے
عظیم محقق قاضی عبدالودود بار ایٹ لا کے نام"

انتساب میں ترمیم دیکھتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ جین صاحب نے اپنے اس مقالہ سے تمام خامیوں کو دور کر دیا
ہوگا اور اغلاط کی تصحیح کر دی ہوگی لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔

اس مقالہ کا باب اول "اردو مثنوی کا سیاسی اور سماجی پس منظر ہے" باب دوم کا عنوان ہے "صنف مثنوی"
اور باب سوم "اردو مثنوی کا موضوع ہے" ان تینوں ابواب میں بحث و مباحثہ کی کافی گنجائش ہے اور اغلاط کی نشاندہی
ضروری ہے لیکن فی الوقت میں اپنی بات باب چہارم سے شروع کرتا ہوں جس کا عنوان ہے "اردو مثنوی کا ارتقا"
جین صاحب نے شمالی ہند کے ابتدائی مثنوی نگاروں میں بابا فرید شکر گنج، امیر خسرو اور کبیر کا ذکر کرتے ہوئے
ان لوگوں کی مثنوی کو الحاقی بتایا ہے اور ص ۷۵ پر لکھتے ہیں۔

" دراصل شمالی ہند کی پہلی مستند مثنوی افضل کی بکٹ کہانی ہے"، لیکن بقول گیان چند جین ابھی تک یہ مثنوی طبع نہیں ہوئی ہے ملاحظہ فرمایے ص ۳۹۹ جلد دوم لیکن ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور مسعود حسین خاں کا مرتب کردہ "بکٹ کہانی" کا پانچواں ایڈیشن میرے پیش نظر ہے پہلی مرتبہ یہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی۔

فاضل مقالہ نگار میر جعفر زٹلی کے سلسلے میں ص ۱۷۱-۱۷۲ پر تحریر کرتے ہیں۔

" میر جعفر نارنول پنجاب کا باشندہ تھا پنجاب میں اردو میں اس کا سال ولادت ۱۰۶۵ھ درج اور اردو شہ پارے میں ۱۰۶۸ھ انڈیا آفس اردو مخطوطات کی فہرست میں بلوم ہارٹ نے لکھا ہے کہ جعفر اورنگ زیب کے سال جلوس ۶۹-۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۸ء کے کچھ سال بعد پیدا ہوا تھا زیب النساء نے اسے زٹلی لقب دیا"

(الف) جین صاحب نے میر جعفر زٹلی کے پیدائش کے سلسلے میں تین سنین کا ذکر کیا ہے (۱) پنجاب میں اردو کے حوالے سے ۱۰۶۵ء (۲) اردو شہ پارے کے حوالے سے ۱۰۶۸ء (۳) بلوم ہارٹ کے حوالے سے ۶۹-۱۰۶۸ کے کچھ سال بعد لکھا ہے لیکن وہ خود کون سا سن صحیح مانتے ہیں انہیں اپنی بھی رائے دینی چاہیے تھی۔

(ب) یہ بات بالکل غلط ہے کہ زیب النساء نے جعفر کو زٹلی لقب دیا تھا کسی بھی تذکرہ نگار نے یہ نہیں لکھا ہے مجموعہ نغز سال اتمام ۱۲۲۱ھ میں ترجمہ زٹلی میں درج ہے۔

" اما بغیر از زٹل گو اصلا میل نمی کرد و میگفت کہ ہر چند سعی خواہم کرد سعدی شیرازی و فردوسی طوسی نخواہم شد زٹل میگویم تا ممتاز عالم باشد"

اور ایک مجہول الاسم[1] تذکرے میں درج ہے۔

" واحوال لقب ایشان این است روزے این شعر فارسی گفتہ

مارا اگرچہ دیدن دریتیم نیست — نظارہ سوئے دانہ شبنم غنیمت است

پیش شاعران ہم عصر خود خواندہ ہمہ از شک بالاتفاق گفتند کہ زٹل است در جواب گفت اگر زٹل است زٹل خواہم و این شعر بدیہہ فرمود

گر نیچہ از میسر نہ ایدت — ناچار چپر حقہ سک دم غنیمت است"

جین صاحب جعفر زٹلی کے سلسلے میں ص ۲۰۱ پر آگے لکھتے ہیں۔

---

[1] اس تذکرہ کو پروفیسر کلیم الدین احمد نے شورش کے نام سے ایڈٹ کر کے عشقی کے تذکرے کے ساتھ "دو تذکرے" کے نام سے شائع کروا دیا ہے۔

"برلن کے کتب خانے کی فہرست میں اور بیشل بیوگرافی میں بیلی نے لکھا ہے کہ وہ شاہی سکہ کی بیت کا مضحکہ نگاری کے جرم میں فرخ سیر کے حکم سے قتل کر دیا گیا مطبوعہ کلیات میں بھی ایک سرخی ہے "سکہ فرخ سیر کہ میر جعفر را قتل کنانید بود" ہے۔ سکہ کا شعر یوں تھا۔

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر	بادشاہ بحر و بر فرخ سیر

جعفر نے اس طرح کی خرابی کی

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر	بادشاہ پشہ کش فرخ سیر

میں نے کلیات جعفر زٹلی کا جتنا قلمی یا مطبوعہ نسخہ دیکھا ہے سب میں مندرجہ بالا شعر اس طرح ہے ؎

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر	بادشاہ تسمہ کس فرخ سیر

جین صاحب نے اس شعر کے علاوہ نمونے کے طور پر بھی میر جعفر زٹلی کے جو اشعار درج کیے ہیں ان میں بھی جا بجا غلطیاں راہ پا گئی ہیں جو جین صاحب جیسے نامور محقق کے شایانِ شان نہیں مثلاً

جین صاحب نے زٹلی کا شعر یوں درج کیا ہے :	کلیات میں یوں ہے :
سنوا ے طوطی روحانی من	سنوا ے طوطی روحانی من
نہ کر الفت بہ رنگیں پنجرہ تن	مکن الفت بر نگیں پنجرہ تن
بصد غفلت برائے آخر از وے	بصد حسرت بر آئی آخر از وے
بغفلت الفت ایں پنجرہ تا کے	بغفلت الفت ایں پنجرہ تا کے
جو پوچھے بات تجھ کو لا پیارا	جو پوچھے بات تجھ سے لال پیارا
کہ پنجرے بیچ تیں کیا کیا سنوارا	کہ پنجرے بیچ تیں کیا کیا سنوارا
نہ جاگی لال کی لو میں کدھی تو	نہ جانی لال کی بولی کدھی تو
نمیدانم کہ کیا انچھر پڑی تو	نمیدانم کہ کیا انچھر پڑی تو

جین صاحب نے ص ۸۷ پر دردمند کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں ۔

"مرزا جانجاناں کے شاگرد محمد فقیہ دردمند نے مثنوی ساقی نامہ لکھی دکن میں اردو کے مطابق دردمند بیدر (دکن) میں پیدا ہوئے لیکن بعد میں دلّی چلے آئے"۔

"(الف) جین صاحب نے دردمند کا نام صرف محمد فقیہ لکھا ہے ان کا نام محمد فقیہ صاحب لکھنا چاہیے کیونکہ "صاحب"

جزو اسم ہے رجوع تذکرہ گلزار ابراہیم اور گلشن سخن وغیرہ

(ب) فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ "درد مند دکن میں پیدا ہوئے لیکن بعد میں دلّی چلے آئے"

موصوف کو شاید یہ نہیں معلوم کہ درد مند دلّی سے عظیم آباد بھی آئے تھے اور کچھ دنوں یہاں رہنے کے بعد وہ دلّی چلے گئے تھے اور دلّی سے پھر وہ مرشد آباد گئے اور مرشد آباد میں ہی ۱۱۷۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ رجوع تذکرہ شورش، گلشن ہند، مسرت افزا، گلزار ابراہیم اور گلشن سخن وغیرہ۔

جین صاحب راسخ عظیم آبادی کا ذکر کرتے ہوئے ص ۲۰۸-۲۰۹ پر لکھتے ہیں: "راسخ کے سوانح نگار حمید عظیم آبادی کے مطابق راسخ کا زمانہ حیات ۱۱۶۲ھ تا ۱۲۳۸ھ ہے لیکن قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ راسخ ۱۱۷۱ھ کے قریب پیدا ہوئے"

محقق کو دونوں آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی ہے اور وہ اپنی لکھی ہوئی باتوں پر اکثر نظر ثانی کرتا رہتا ہے کیونکہ تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی قاضی صاحب نے راسخ کا سال پیدائش ۱۱۷۱ھ کے قریب آج سے تقریباً تیس سال قبل لکھا تھا لیکن اس کے بعد چند دواوین، تذکرے اور کچھ بیاضیں سامنے آئی ہیں اس کا مطالعہ بھی محققوں کے لیے ضروری ہے۔

مجھے درگاہ حضرت شاہ ارزانی پٹنہ کے کتب خانہ میں ایک قلمی رسالہ "حلت و حرمت" ملا ہے جس کے مصنف ابوتراب جعفری پھلواروی ہیں اس کے ایک صفحہ پر راسخ کی ایک غزل درج ہے اور اس کے نیچے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

"غزل غلام علی شاہ راسخ مرحوم خلف شیخ محمد فیض مرحوم طریق یافتہ شاہ کریم اللہ قدس اللہ سرہ العزیز ولادت او در ۱۱۶۹ ہجری و سال رحلت ۱۲۳۸ ہجری مرد درویش بود"

اور اس کے نیچے فقیر عباد اللہ عفی عنہ لکھا ہوا ہے[1] لہٰذا راسخ کا زمانہ حیات ۱۱۶۲ھ تا ۱۲۳۸ھ لکھنا یا راسخ ۱۱۷۱ھ کے قریب پیدا ہوئے لکھنا صحیح نہیں راسخ کا زمانہ حیات ۱۱۶۹ھ تا ۱۲۳۸ھ ہے

جین صاحب ص ۲۳۰ پر تحریر کرتے ہیں: "دیوان ریختہ کے دیباچے میں رنگین نے اپنا سال ولادت ۱۱۷۰ھ لکھا ہے سال وفات کے بارے میں اسپرنگر، کریم الدین، شیفتہ، نساخ اور حسرت موہانی کے تذکرے ۱۲۵۰ھ پر متفق ہیں"

جین صاحب کی اطلاع کے لیے درج ہے کہ کریم الدین، شیفتہ، نساخ اور حسرت موہانی نے رنگین کا سال وفات ۱۲۵۰ھ نہیں بلکہ ان لوگوں نے ۱۲۵۱ھ لکھا ہے اور رنگین کے سال وفات میں کوئی اختلاف نہیں ہے ان کا انتقا

---

[1] [illegible] صاحب نے اکثر جگہوں پر لکھا ہے کہ فلاں عبارت کو کالعدم سمجھی جائے [2] تفصیل کے لیے دیکھیں راقم کی کتاب [illegible]

جمادی الثانی ۱۱۷۵ھ میں ہوا۔ فاضل مقالہ نگار نے ص ۳۰۴ پر انشا اللہ خاں انشا کا ذکر کیا ہے اور انہیں بغیر کسی حوالے سے متوفی ۱۲۳۲ھ لکھا ہے۔

جین صاحب اگر تھوڑی سی محنت کرتے تو انہیں انشا کا صحیح سال وفات مل جاتا انشا کے شاگرد بسنت سنگھ نشاط نے انشا کے انتقال پر قطعہ تاریخ وفات کہا تھا اور وہ یہ ہے ؎

خبر انتقال میر انشا ... دل غمدیدہ تا نشاط شنفت

سال تاریخ او زجان اجل ... عرفی وقت بود انشا گفت

اور اس سے ۱۲۳۳ برآمد ہوتا ہے اور یہی انشا کے انتقال کا صحیح سن ہے۔

جین صاحب نے ص ۳۰۹ پر بغیر کسی حوالے کے لکھا ہے کہ (نواب محبت خاں محبت) نے ۱۲۲۳ھ میں انتقال کیا۔ غلط نواب محبت خاں محبت کا انتقال ۱۲۲۲ھ میں ہوا ثبوت کے لیے پیش ہے تذکرہ طور کلیم، تذکرہ بزم سخن اور تذکرہ سخن الشعراء۔

فاضل مقالہ نگار جلد دوم ص ۱۰ پر مول چند منشی سے متعلق لکھتے ہیں: ''شمالی ہند میں رزمیہ مثنویوں کا قحط ہے۔ مول چند نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے''

شمالی ہند میں مول چند منشی سے قبل ہی رزمیہ مثنویاں لکھی جانے لگی تھیں ضرورت مطالعہ کی ہے اگر گیان چند جین نہ پڑھیں تو قصور کس کا ہے؟

مول چند منشی متوفی ۱۲۴۸ھ کے شاہنامہ اردو کا تاریخی نام بقول گیان چند جین ''قصہ خسروان عجم'' ہے جس سے ۱۲۲۵ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ مول چند منشی سے قبل محمد جعفر خاں راغب متوفی ۱۲۱۱ھ نے رزمیہ مثنوی ''فتح نامہ'' لکھی ہے اس میں ۱۳۰۶ اشعار ہیں اور اس کا مخطوطہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے جس کا نمبر ۵۸ ہے یہ مثنوی راغب نے ۱۲۱۴ھ سے قبل لکھی تھی۔

جین صاحب جلد دوم ص ۳۴۴ پر لکھتے ہیں: ''غالب نے بھی ایک مختصر مثنوی در صفت انبہ لکھی لیکن اس مختصر سی مثنوی کی وجہ سے انہیں مثنوی نگاروں میں جگہ نہیں دی جا سکتی''

غالب نے درصفت انبہ کے علاوہ دو اور مثنویاں لکھی ہیں ایک مثنوی ۱۱ اشعار کی ہے جس کا کوئی عنوان نہیں ہے اور اس کا پہلا شعر ہے ؎

ایک دن مثل پتنگ کاغذی ... لے کے دل سر رشتہ آزادگی

اور دوسری "قادرنامہ" جس میں ۱۳۲ اشعار ہیں۔ کیا یہ دونوں مثنویاں غالب کی نہیں ہیں؟ جین صاحب اسے کسی اور کی ملک سمجھتے ہیں۔

فاضل مقالہ نگار جلد دوم ص ۴۴۴ پر تحریر کرتے ہیں، "مشہور مرثیہ گو ضمیر نے ایک عشقیہ اور دو مذہبی مثنویاں لکھی ہیں" اگر ضمیر سے جین صاحب کی مراد میر مظفر حسین ضمیر ہیں تو انہوں نے تین نہیں بلکہ چار مثنویاں لکھی ہیں۔ ایک عشقیہ اور تین مذہبی۔ چوتھی مثنوی جہاں تک فاضل مقالہ نگار کی پہنچ نہیں ہو سکی اس کا نام "معجزہ امام حسین" ہے۔ یہ راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانہ میں موجود ہے اور مخطوطہ نمبر ۱۰۱ کے تحت جو نسخہ میر مظفر حسین کی "مثنوی معراج نامہ" کا ہے اس کے ابتدا میں یہ مثنوی بھی شامل ہے اس میں ۱۲۳ اشعار ہیں۔

جین صاحب جلد دوم ص ۲۰۰ پر صفیر بلگرامی کے متعلق لکھتے ہیں، "نساخ کے تذکرے کی تکمیل ۱۲۰۱ھ تک ذی حیات تھے۔"

(الف) نساخ کے تذکرے کی تکمیل ۱۲۰۱ھ لکھنا یقیناً سہو کاتب ہے نساخ کا تذکرہ ۱۲۹۱ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا

(ب) جین صاحب ذرا سی محنت کرتے تو انہیں بلگرامی کا سال وفات مل جاتا کیونکہ صفیر کا سال وفات پردہ خفا میں نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی اختلاف ہے شرط تذکروں اور رسالوں کے مطالعے کا ہے۔

صفیر بلگرامی کا انتقال ۲۲ رمضان المبارک بوقت شب ۱۳۰۷ھ کو عظیم آباد میں ہوا اور نعش آرہ کے محلہ میر گنج میں دفن ہوئی۔

فاضل مقالہ نگار جلد دوم ص ۳۵۵ پر تحریر کرتے ہیں؛ "شاد عظیم آبادی۔ یہ ذیل کے مثنویوں کے مصنف ہیں (۱) "نالۂ شاد" ۱۲۷۸ھ میں شائع ہوئی مختصر عشقیہ مثنوی ہے (۲) ثمرہ زندگی اپنے فرزند سید حسن خاں کے مکتب پر لکھی (۳) نوید ہند بعد میں یہ مادر ہند کے نام سے شائع ہوئی ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر لکھی گئی تھی اس لیے ۱۸۸۷ کی تصنیف ہونی چاہیئے۔ (۴) فغانِ دل کش (۵) راہ حق (۱۵۲ صفحات) (۶) چشمہ کوثر"۔ مندرجہ بالا عبارت پڑھنے کے بعد مجھے غالب کا یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

حیراں ہوں روؤں دل کو کہ پیٹوں جگر کو میں مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

(الف) جین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی لٹ یونیورسٹی پروفیسر اور صدر شعبہ اردو ہونے کے علاوہ اردو و فارسی کے دیو قامت محقق قاضی عبدالودود کے ہمسری کا بھی دعویٰ کرتے ہیں لیکن معاملہ یہ ہے کہ موصوف اردو اور فارسی میں فرق نہیں محسوس کرتے "فغان دل کش" یہ مثنوی اردو زبان میں نہیں بلکہ فارسی زبان میں ہے۔

(ب) راہ حق اور چشمہ کوثر یہ دو مثنویاں نہیں ہیں بلکہ مثنوی راہ حق کا تاریخی نام چشمہ کوثر ہے۔

جین صاحب آگے لکھتے ہیں: "ان مثنویوں میں چشمہ کوثر اہم ہے اس لیے اس کے بارے میں ہی کچھ عرض کیا جاتا ہے یہ ۱۳۰۴ھ میں تصنیف کی گئی"

جین صاحب اگر شاد کی مثنویوں کو پڑھ کر لکھتے تو شاید ان سے اتنی غلطیاں نہیں ہوتیں شاد کی مثنوی "راہ حق" ۱۵۲ صفحات پر مشتمل مطبع سیدی واقع پٹنہ سے شائع ہوئی تھی اس کے ص۱۲۵ پر یہ قطعہ تاریخ انجام" درج ہے جس سے ۱۳۰۴ نہیں بلکہ ۱۳۰۲ برآمد ہوتا ہے۔ قطعہ یہ ہے۔

شکر للہ کہ زخم خانہ   قطرۂ بادۂ اطہر بچکید
سال ترتیب بگو بے سر وصف   کر قلم چشمہ کوثر بچکید

جین صاحب جلد دوم ص۱۸۱ پر مجموعہ نغز کے حوالے سے شاہ عظیم آبادی کو متوفی ۱۱۰۵ھ لکھتے ہیں۔ جین صاحب کے پیش نظر مجموعہ نغز کا کون سا نسخہ تھا جس میں شاہ کو متوفی ۱۱۰۵ھ لکھا ہے۔ اب تک راقم کی نظر سے مجموعہ نغز کا جو بھی قلمی یا مطبوعہ نسخہ گذرا ہے اس میں شاہ کے متعلق بس یہی درج ہے:

"تخلص شاہ۔ سعد اللہ مرحوم است وے مردے بود درویش نہاد در عظیم آباد ہمت خود بر یختہ گوئی بیشتر گماشت وفکر خوب وشعر دل چسپ داشت ایں چار بیت از نتائج طبع اوست"

شاہ کو متوفی ۱۱۰۵ھ لکھنا بالکل غلط ہے اس لیے کہ ۱۲۱۶ھ کی ان کی تصنیف ملتی ہے شاہ نے ۷ رباعیاں تصوف اور آداب طریقت وغیرہ کے موضوع پر لکھا تھا اور اس کا تاریخی نام انہوں نے فتادی طریقت رکھا تھا جیسا کہ ان کے اس رباعی سے ظاہر ہوتا ہے

دل نے کیا جس دم اس رسالہ کو تمام   چاہا قلم سے اسم و تاریخ الہام
ہاتف سے ندا یہ گوش دل میں پہنچی   اے شاہ فتادی طریقت رکھ نام
۱۲۱۶

لفظ "فتادی طریقت" سے ۱۲۱۶ برآمد ہوتا ہے اور مجموعہ نغز جس کا سال اتمام ۱۲۲۱ھ ہے انہیں مرحوم لکھا ہے لہذا شاہ کا زمانہ انتقال ۱۲۱۶ھ تا ۱۲۲۱ھ فی الحال متعین کیا جا سکتا ہے۔

جین صاحب نے اپنے اس مقالہ میں اکثر جگہوں پہ صرف شاعر کا تخلص لکھا ہے اور اس کا نام تحریر نہیں کیا ہے مثلاً ضمیر، عیشی، میتر، میر اور راسخ وغیرہ۔ اور یہ نہیں کہ درمیان میں کہیں پہ ذکر آگیا ہو تو انہوں نے صرف شاعر کا تخلص لکھا ہے بلکہ اس شاعر کی پیدائش موت اور مثنوی پہ بھی روشنی ڈالی ہے لیکن اس شاعر کا نام انہوں نے نہیں لکھا ہے جو ایک ذمہ دار محقق کو زیب نہیں دیتا۔ اور ایسے بھی انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک زمانے میں ایک جگہ پہ ایک ہی تخلص کے کئی شاعر پائے جاتے ہیں، لہذا صرف تخلص دیکھ کر قاری کو بہت ہی الجھن ہوتی ہے کہ یہ کون شاعر ہے؟

فاضل مقالہ نگار نے جلد دوم ص ۳۹۹ سے ص ۴۴۲ تک یعنی ۴۳ صفحات پر اردو مثنویات کی فہرست پیش کی ہے اور اس کے متعلق ص ۳۹۸ پر لکھتے ہیں، "کوشش کی گئی ہے کہ ذیل میں شمالی ہند کی تمام مثنویوں کے نام درج کیے جائیں لیکن چونکہ ہر زمانہ میں کثرت سے اردو مثنویاں لکھی گئیں اس لیے یہ بہت ممکن بلکہ یقینی ہے کہ درجہ سوئم کی بعض مثنویاں اس فہرست میں شامل ہونے سے رہ گئی ہوں۔ مثنوی کے نام سے پہلے "ق" علامت ہے اس بات کی کہ مثنوی ہنوز قلمی یعنی غیر مطبوعہ ہے"

(الف) جین صاحب نے بہت سی ایسی مثنویوں کو قلمی لکھا ہے جو مطبوعہ ہیں اور کچھ ایسی مثنوی کو انھوں نے مطبوعہ لکھا ہے جو ہنوز قلمی ہیں جیسے:

بکٹ کہانی، ساقی نامہ، مثنویات فغاں، مثنویات حضور اور مثنویات شاہ رکن الدین عشق وغیرہ۔

(۱) بکٹ کہانی کے متعلق میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں (۲) دیوان فغاں مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن (مرحوم) شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان طبع اول ۱۹۵۰ میں غزلیات کے علاوہ مثنویات بھی شامل ہیں (۳) مثنویات حضور۔ دیوان حضور کو ڈاکٹر مختار الدین احمد نے طویل مقدمہ و حواشی کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے جو ۱۹۷۷ میں برقی آرٹ پریس دہلی سے شائع بھی ہو چکا ہے اس میں حضور کی تینوں مثنویاں موجود ہیں (۴) ساقی نامہ۔ محمد نقیہ صاحب دردمند کی مثنوی ہے اور اسکو ڈاکٹر محمود الٰہی نے ایڈٹ کر کے شائع کروا دیا ہے (۵) مثنویات شاہ رکن الدین عشق۔ ڈاکٹر قریشہ حسین نے کلیات عشق کو ایڈٹ کیا ہے جس پر دانش گاہ پٹنہ نے انہیں پی ایچ ڈی کی سند سے نوازا ہے۔ اور یہ کلیات ۱۹۷۹ء میں پٹنہ سے شائع ہوا ہے۔

(ب) کچھ ایسی مثنویوں کو جین صاحب نے مطبوعہ لکھا ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں مثلاً مثنویات راغب۔ راغب نے بارہ مثنویاں لکھی ہیں جن میں صرف ایک مثنوی "شورش عشق" کو راقم نے ایڈٹ کر کے حضور کی مثنوی "مثنوی در تعریف درگاہ شاہ ارزاں" کے ساتھ اردو کی "دو مثنویاں" کے نام سے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا ہے باقی مثنویاں ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

(ج) جین صاحب نے فغاں کی صرف دو مثنوی کا ذکر کیا ہے جب کہ ان کی سات مثنویاں مطبوعہ ہیں۔ موصوف مندرجہ ذیل مثنویوں کا اپنی فہرست میں اضافہ کر لیں۔

(۱) در ہجو ٹسکاری (۲) نقل کبوتر باز (۳) نقل افیونی (۴) مثنوی (بلا عنوان) از شیخ محمد روشن جوشش عظیم آبادی مطبوعہ (۵) درد و الم از میر غلام حسین شورش (قلمی) مملوکہ خدا بخش لائبریری پٹنہ (۶) داستان بارہ امام از مصطفیٰ قلی خاں یکرنگ (قلمی) مملوکہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد (۷) روشن عشق (۸) سوز پنہا (۹) نمونہ قیامت (۱۰) جمعہ کے خطبہ میں پڑھنے کے لیے۔ از شاہ فرزند علی صوفی منیری مطبوعہ (۱۱) ساقی نامہ از میر باقر مخلص مرشد آبادی مطبوعہ (۱۲) وسیلہ بخشائش المعروف بہ مناجات۔ از حمد کاکوی۔ تقریباً ۵۰ اشعار (قلمی) مملوکہ عطا کاکوی پٹنہ (۱۳) استکار نامہ از شمشش منیری (قلمی) (۱۴) اشک غم از عضنفر نواب دانش مطبوعہ (۱۵) اعلامہ یوم از پروفیسر سید حسن مطبوعہ (۱۶) حدیث سخن از پروفیسر ممتاز احمد مطبوعہ (۱۷) شاعر اور مشاعرہ از ولی کاکوی ۱۲ اشعار مطبوعہ (۱۸) نشیب و فراز از قیوم خضر مطبوعہ (۱۹) استاد نعیات از ناوک حمزہ پوری مطبوعہ۔

••

ڈاکٹر گیان چند
۹/۲۵ اندرا نگر لکھنؤ

جواب

"اردو مثنوی شمالی ہند میں" کے تبصرے پر مصنف کے مشاہدات۔

طباعت و اشاعت کے معاملے میں یہ مقالہ کافی بدنصیب رہا ہے۔ اسے پہلی بار اشاعت کے لئے ۱۹۶۰ء میں انجمن ترقی اردو ہند کو دیا گیا۔ بہت لیت و لعل کے بعد ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس درمیان میں کئی بار اس میں ترمیم کی گئی چنانچہ اس کے مقدمے پر نومبر ۱۹۶۴ء کی تاریخ پڑی ہے۔ متنِ کتاب چھپنے کے بعد اس کی پروف کاپیاں اشاریہ سازی کے لئے میرے پاس بھیجی گئیں۔ اس میں اغلاطِ کتابت بہت کثرت سے تھیں۔ ان کی وجہ سے میں نے ۱۶ گنجان صفحوں کا غلط نامہ تیار کیا جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں۔

"انتساب میں اس کتاب کو صحیفۂ اغلاط کہا گیا ہے بعض حضرات نے اسے مصنف کا انکسار تو بعض نے تصنع قرار دیا ہوگا۔ غلط نامے کا طول دیکھ کر کسی کو یہ ماننے میں تامل نہ رہے گا کہ کتاب کو صحیفۂ اغلاط کہنا غلط نہ تھا"۔

چونکہ 'صحیفۂ اغلاط' میں اغلاط کا تعلق اغلاطِ کتابت سے تھا اس لئے دوسرے ایڈیشن کے انتساب میں سے یہ فقرہ خارج کر دیا۔ پھر یہ بھی ہے کہ صحیفہ کے ساتھ اغلاط کی ترکیب اجتماعِ ضدین معلوم ہوتی تھی۔ مبصر صاحب کے گمان میں میں نے 'صحیفۂ اغلاط' کو حذف کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ کتاب جملہ اغلاط سے پاک ہے۔ غلط نامے کے قبل کی صراحت سے بات صاف ہو گئی کہ اغلاط کا تعلق اغلاطِ کتابت سے ہے معنوی اغلاط سے نہیں میری ہر تحقیقی تحریر میں اغلاط معنوی ہوتی ہیں اور ہزار ترمیم و تصحیح کے باوجود بعد کے ایڈیشنوں میں بھی رہیں گی۔

میں جموں میں ستمبر ۱۹۷۶ء تک رہا ہوں۔ غالباً ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر خلیق انجم جموں آئے اور مجھے کہا کہ میں دوسرے ایڈیشن کے لئے مقالہ دے دوں۔ میں نے کہا کہ ابھی میں دوسرے کاموں میں مصروف ہوں بعد میں ترمیم کروں گا۔ انھوں نے بہت اصرار کیا۔ میرے پاس مقالے کے پہلے ایڈیشن کی ایک ہی جلد تھی۔ میں نے کہا کہ بہتر ہے پہلے چار ابواب میں مثنویوں کی تحقیق نہیں۔ انھیں ایسے ہی چھاپا جا سکتا ہے۔ خلیق انجم صاحب نے میرے سامنے جلد کو پھاڑ کر ابتدائی چار باب نکال لئے اور ساتھ لے گئے۔ اس طرح یہ چاروں باب بالکل طبع اول کے مطابق ہیں۔

بعد کے ابواب کو میں سرسری طور پر کہیں کہیں بدل کر بھیجتا رہا کیونکہ انجمن کا تقاضا آتا تھا کہ 'قلم کی رفتار تیز کیجئے کاتب لکھ چکا ہے'۔ آخری باب تک آتے آتے کاتب کا قلم لنگ ہو گیا۔ کتابت بند ہو گئی اور مجھے اس کے آگے کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ میں مارچ ۷۹ء کے آخر میں حیدرآباد پہنچ گیا۔ آخری باب سے پہلے کی جملہ مکتوبہ کاپیاں مجھے پروف ریڈنگ کے لئے بھیجی گئیں۔ میں انھیں

حیدر آباد لے آیا۔ وہاں یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا۔ حوالے کی کتابوں کے بغیر کسی طرح کتابت کی تصحیح کی اور انجمن کو واپس کر دی۔

رسالہ شاعر دسمبر ۱۹۷۹ء میں میرے شاگرد ڈاکٹر حنیف احمد نقوی نے اپنے ایک مضمون میں میری کتاب کی غلطیوں کی نشان دہی کی۔ میں ان میں سے بعض سے اتفاق کرتا تھا، بعض سے نہیں۔ میں نے انکی روشنی میں کتابت شدہ کاپیوں میں اصلاح کرانی چاہی۔ انجمن تیار نہ ہوئی۔ مجھے لکھا کہ کاپیوں کی حالت خراب ہے، کاٹ چھانٹ کی گئی تو وہ بالکل پھٹ جائیں گی۔ میرے شدید اصرار پر تجلی کی مثنوی لیلیٰ مجنوں کے بیان میں کچھ اضافہ کیا گیا۔ طبع ثانی کی جلد اول ص ۹۳۔۹۲۔ ۲۹۴ پر دیکھئے کہ کس طرح ٹھونسم ٹھانس کی گئی ہے۔ اصلاح کی گنجائش کے فقدان میں میں نے انجمن کو لکھا کہ اگر متن کتاب میں ترمیم ممکن نہیں ہے تو حنیف احمد نقوی کا پورا مضمون کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر لگا دیا جائے۔ انجمن نے میری یہ تجویز قبول نہ کی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خود میری نظر میں کتاب کے مطالب میں کئی جگہ تصحیح و ترمیم کی ضرورت تھی لیکن وہ ممکن نہ ہو سکی۔

میں آخری باب کی کتابت، نیز پوری کتاب کی طباعت کے تقاضے کرتا رہا لیکن طباعت شروع ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ کاپیاں دھندلا گئیں، بعض پڑھنے کے قابل ہی نہ رہیں۔ میں نے زچ ہو کر لکھا کہ کتابت جیسی بھی ہو سٹی ہوئی، اڑی ہوئی، غلط سلط، کسی طرح چھاپ کر ٹھکانے لگائیے آخر بارہ سال گزرنے پر ۱۹۸۰ء میں طباعت اور اشاعت ہوئی۔ طبع اوّل کے میرے ذاتی نسخے میں ایسی کئی ترمیمات درج ہیں جو طبع دوم میں شامل نہ کی جا سکیں۔ کوئی امید نہیں کہ میری زندگی میں کتاب کا تیسرا ایڈیشن نکلے گا۔ میں فی الوقت اردو محققین کی تاریخ لکھنے میں اس بری طرح پھنسا ہوں کہ مجھے تو اس کی تکمیل کی بھی امید نہیں۔ جب تک اسے نہ لکھ لوں کسی دوسرے کام کو وقت نہیں دے سکتا۔ 'اردو مثنوی' میں مناسب ترمیم کے لئے چھ ماہ اور ایک سال کے درمیان کی مدت چاہئے۔ اس کے خاکے کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ اس میں طویل مثنویوں کے علاوہ نہایت مختصر مثنویوں کو بھی لے لیا گیا ہے۔ یہ چھوٹی مثنویاں مثنوی کی ہیئت میں نظم ہیں اور بس۔ ان سب کو خارج کر دینا چاہئے اور صرف طویل مثنویوں کا جائزہ لینا چاہئے اگر میں تیسرے ایڈیشن کی تیاری کر سکا تو ان مختصر نظموں کو نکال دوں گا جس سے کتاب کا حجم ایک تہائی کم ہو جائے گا، متعدد شاعر نکل جائیں گے۔

موضوع تحقیق مثنویاں ہیں، مثنوی نگار نہیں۔ ان کی سوانح لکھنا مقصود نہیں۔ میں نے ان کے زمانے کا اندازہ کرانے کے لیے اکثر مثنوی نگاروں کی تاریخ وفات لکھی اور ایک خواہ مخواہ کی ذمے داری اپنے سر لے لی۔ ظاہر ہے کہ میں اپنا محدود وقت ہر مثنوی نگار کے سنہ وفات کی تعین کے لئے نہ دے سکتا تھا۔ مجھے جہاں بھی یہ سنہ ملا اسے نقل کر دیا۔ بہتر یہ ہوتا کہ میں مثنوی نگاروں کے دور کی تعین پر اکتفا کرتا۔ مسعود حسن رضوی صاحب نے ایک دفعہ مجھے تحقیقی عمل کا یہ گر بتایا تھا کہ دوران تحقیق میں

جن مسائل پر لکھنا آپ کے لئے لازمی نہ ہو ان پر نہ لکھیے ورنہ ایک مزید ذمے داری اپنے سر لیں گے۔ میں کتاب کی طبع ثانی کے
مقدمے میں یہ صراحت کر دینا چاہتا تھا کہ شعرا کے سنین تحقیق کا نتیجہ نہیں' اس لئے ان کی قطعیت پر اصرار نہیں۔
یہی کیفیت آخر مقالہ میں دی ہوئی مثنویوں کی فہرست کی ہے۔ ان میں سے ہر اندراج کے صحت کی پوری تحقیق نہیں
کی گئی، یہ ممکن ہی نہ تھا جہاں کہیں سے کسی مثنوی کا نام معلوم ہوا ٹانک لیا۔ طبع ثانی کی فہرست میں طبع اول کے مقابلے میں برائے
نام ہی ترمیم ہے۔ آخری باب اور فہرست مثنویات وہ اجزا ہیں جن کے پروف کبھی میری نظر سے نہیں گزرے میں طبع ثانی کے مقدمے
میں واضح کر دیتا لیکن مجھے مقدمہ طبع ثانی لکھنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔

جناب مبصر کے جملہ اعتراضات کی وضاحت ممکن نہیں کیونکہ مجھے بعض اندراجات کے ماخذ نہیں مل رہے۔ اپنی یادداشتوں
کو دیکھتا ہوں تو بعض بیانات کا ماخذ بآسانی دستیاب نہیں۔ مصروفیت اور صحت کی موجودہ کیفیت میں میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ ضخیم
یادداشتوں کا ایک ایک لفظ پڑھ کر کھوج کروں۔ بہرحال مبصر کے اکثر اعتراضات سے متعلق اپنی وضاحت درج کرتا ہوں۔
کتاب کے آخر کی فہرست سے مبصر صاحب کا اس فیصلے پر پہنچنا مناسب ہے کہ میں نے بکٹ کہانی کو قلمی سمجھا ہے۔ کتاب کی
طبع اول کے مقدمے کے وقت (۱۹۶۴ء) یہ صورت حال صحیح تھی۔ ۱۹۶۵ء میں اسے ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور نور الحسن ہاشمی نے
چھاپ دیا۔ میں نے اس پر ریڈیائی تبصرہ کیا جو رسالہ جان نثار امرتسر بابت دسمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا' نیز میرے مجموعے 'ذکر و فکر'
میں شامل ہے۔ خود اردو مثنوی طبع دوم جلد اول ص ۱۶۱ پر بکٹ کہانی طبع اول (۱۹۶۵ء) اور اس کے مقدمہ نگار ڈاکٹر
مسعود حسین خاں کا ذکر موجود ہے۔ فہرست میں بکٹ کہانی کے نام سے پہلے طبع اوّل کی طرح ق کا برقرار رہنا اسی طرح کا سہو کتابت
ہے جیسا جناب مبصر نے اس سے متعلق میرے بیان کا صفحہ نمبر ۱۷۵ لکھا ہے جو در اصل ۱۵۷ ہونا چاہئے۔
میں واضح کر چکا ہوں کہ مثنوی نگاروں کے سنہ ولادت و وفات محض ان کے زمانے کا اندازہ کرانے کے لئے دیئے گئے
ہیں۔ ان کی جانچ میری تحقیق کا مرکزی حصہ نہیں ضمنی ہے۔ میں نے جعفر زٹلی کے سنہ ولادت سے متعلق تین بیانات درج کیے۔ ان پر
بحث کرنا اس لئے ضروری نہ سمجھا کہ وہ میرے موضوع کتاب کے لیے ضمنی حیثیت رکھتے ہیں جعفر زٹلی کے سکے کے شعر کے مصرع
ثانی پر عام اتفاق نہیں۔ ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر نعیم احمد نے دلی سے کلیات جعفر زٹلی مرتب کر کے شائع کی لیکن میں اردو مثنوی کی
طبع ثانی کا مسودہ اس سے بہت پہلے ناشر کو دے چکا تھا۔ ڈاکٹر نعیم کے ایڈیشن سے پہلے کچھ بازاری نسخے ملتے تھے۔ ان میں ایک
بہتر ایڈیشن کلیات میر جعفر زٹلی' مرتبہ مولوی محمد فرحت اللہ بلند شہری' مطبوعہ بجنور ہے۔ اس کے مقدمے پر تاریخ ۱۹۲۵ء
درج ہے۔ اس میں سکے کے شعر کی پیروڈی کا مصرع

ع۔ بادشاہ پٹہ کش فرخ سیر چھپا ہے (ص ۱۱۸)۔ اِروِن کی معروف تاریخ Later Moghuls کو مشہور مورخ جادو ناتھ سرکار نے ترتیب دیا۔ اس میں مصرع کا متن ع بادشاہ دانہ کش فرخ سیر ہے (دتی جنوری ۷۱ء ایڈیشن، ص ۲۹۹)۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے بھی یہی متن لکھا ہے اور کُش کے ک کو نمایاں طور پر مضموم کیا ہے (دتی کا دبستان شاعری طبع دوم لکھنؤ ۱۹۶۵ء ص ۱۱۰)۔ تذکرۂ شورش میں تسمہ کش لکھا ہے۔ خمخانۂ جاوید میں 'طسمہ کش' چھپا ہے لیکن اس میں طہ کے بعد کا حرف اتنا غیر واضح ہے کہ اسے طعمہ کش بھی پڑھ سکتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مترجم متن دانہ کش اور تسمہ کش میں سے کوئی ایک ہے۔ پہلے مصرع کے گندم و موٹھ و مٹر کے پیشِ نظر 'دانہ کش' بہتر معلوم ہوتا ہے۔ تسمہ کش میں ایک صورتِ واقعی سہی لیکن ذلّت کا تمسخر نہیں جو دانہ کُش اور پٹہ کش میں موجود ہے۔ میں نے جعفر کے اشعار کا متن فرحت اللہ کے ایڈیشن کے مطابق لکھا ادھر چند سال پہلے ترقی اردو بیورو کے لیئے تاریخ ادب اردو جلد اول بہ اشتراک ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھی۔ اس میں جعفر پر بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اس میں تمام اشعار ڈاکٹر نعیم احمد کے نسخے سے نقل کیے ہیں۔

درد مند کا نام میں نے محمد فقیہ لکھا ہے۔ مبصر صاحب قاضی عبدالودود کے انداز میں لکھے ہیں "ان کا نام محمد فقیہ صاحب لکھنا چاہیئے کیونکہ صاحب جزوِ اسم ہے۔ رجوع تذکرہ گلزار ابراہیم او رگلشن سخن وغیرہ۔"

گلشن ہند مطبوعہ کے مطابق گلزار ابراہیم میں 'فقیر صاحب' دیا ہے جب کہ گلشن سخن مولفہ مبتلا میں 'محمد فقیہ' ہی ہے 'محمد فقیہ صاحب' نہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں "گلشن ہند از میرزا علی لطف میں نام محمد فقیر لکھا ہے (ص ۱۳۰) جو کتابت کی غلطی ہے۔ بیل نے اورینٹل بائیوگریفکل ڈکشنری میں محمد تقی لکھا ہے اور یہی غلطی قاموس المشاہیر جلد اول ص ۲۳۷ میں بھی ملتی ہے۔ باقی سب معاصر تذکروں مثلاً نکات الشعرا، ریختہ گویاں، مخزن نکات، سروِ آزاد، چمنستانِ شعرا وغیرہ میں محمد فقیہ لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔" (تاریخ ادبِ اردو جلد دوم حصہ اول دہلی ۱۹۸۴ء ص ۲۹۳)

گلشن ہند ص ۱۳۰ پر نام 'محمد فقیر' نہیں 'فقیر صاحب' چھپا ہے۔ جمیل جالبی کے محولہ تذکروں کے علاوہ دوسرے تمام تذکروں مثلاً شورش، عشقی، میر حسن، ریاض الفصحا از مصحفی، تذکرۂ ذکا، تذکرۂ اسپرنگر وغیرہ میں محمد فقیہ ہی ہے۔ یہی درست ہے 'صاحب' کا لاحقہ جزوِ اسم نہیں۔"

راسخ کے سنہ ولادت کے سلسلے میں میں نے قاضی عبدالودود کا خیال درج کیا کہ راسخ ۱۱۷۱ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ مبصر کو کسی مذہبی رسالے میں ایک صفحے پر راسخ کی غزل ملی جس کے نیچے کسی عباد اللہ نے راسخ کا سنہ ولادت ۱۱۶۹ھ لکھا ہے۔ مبصر نے یہ صراحت نہیں کی کہ اس تحریر اور اس کے راوی عباد اللہ کا پایۂ استناد کیا ہے؟ اس کا زمانہ اور اس کی تحریر کا ماخذ کیا ہے؟ جب تک ان کا تشفی بخش جواب نہ ملے کوئی وجہ نہیں کہ ہم آپ کے بیان کو حرفِ آخر تسلیم کرلیں۔

ل جالبی اپنی تاریخ ادب میں لکھتے ہیں۔

"شاد عظیم آبادی نے راسخ کا سال ولادت ۱۱۶۲ھ لکھا ہے (نوائے وطن) ۔ قاضی عبد الودود نے لکھا ہے کہ اض الافکار (مخطوطہ خدا بخش لائبریری پٹنہ) میں عبرتی عظیم آبادی نے وفات کے وقت راسخ کی عمر ساٹھ سال بتائی ہے۔ خ کی وفات ۱۲۳۸ھ میں ہوئی ۔ اس حساب سے ان کا سال ولادت ۱۱۷۸ھ = ۶۰ ـ ۱۲۳۸ متعین ہوتا ہے لیکن امر اللہ آبادی نے لکھا ہے کہ ۱۱۹۲ھ میں جب راسخ سے ان کی ملاقات ہوئی تو وہ نوجوان تھے اور ابھی کچھ بنے نہیں تھے ۔ اگر ۱۱۷۸ھ سال ولادت تسلیم کر لیا جائے تو ۱۱۹۲ھ میں راسخ کی عمر ۱۴ سال ہوتی ہے جو لڑکپن کی عمر تو ہے لیکن نوجوانی کی یں ۔ ۱۱۹۲ھ میں نوجوان راسخ کی عمر ۲۲ سال قیاس کی جائے تو ان کا سال ولادت ۱۱۷۰ھ متعین ہوتا ہے ۔ قاضی بد الودود نے بھی ۱۱۷۱ھ متعین کیا ہے (آزاد بحیثیت محقق ص۲۰ نوائے ادب شمارہ ۱ اپریل ۱۹۵۶ء)

(تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم ص۹۴۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۷۰۔۷۱ھ قرین قیاس ہے ۔ اگر عباد اللہ کا پایۂ روایت اور ماخذ ہو تو ۱۱۶۹ھ درست و سکتا ہے ۔ واضح ہو کہ قدما کے سنہ ولادت کو اس قطعیت سے طے کرنا خلافِ احتیاط ہے جو مبصر صاحب کا مطالبہ ہے ۔ ہاں سنہ وفات اکثر صورتوں میں قطعی طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے۔

رنگین کے سنہ وفات ۱۲۵۰ھ پر اعتراض کر کے اسے ۱۲۵۱ھ بتایا ہے، درست اردو مثنوی طبعِ دوم کی کتابت ی ہوئی ہے ۔ ص۳۷ کو بہ غور نہیں، سطحی طریقے پر بھی دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ عدد ۱۲۵۱ھ لکھا ہے، ۱۲۵۰ھ نہیں۔ پہلے ایڈیشن میں ص۳۶ پر یہ جملہ بالکل اسی طرح ہے اور وہاں سنہ ۱۲۵۱ھ ہی لکھا ہے ۔

میں نے طبع دوم ص۳۶۴ پر انشا کو متوفی ۱۲۳۲ھ لکھا ہے جب کہ طبع اول میں اسی موقع پر ص۳۵۵ پر ۱۲۳۳ھ ا تھا ۔ مبصر صاحب بسنت سنگھ نشاط کے قطعہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں ۔ یہ قطعہ آب حیات میں درج ہے جس سے ۱۲۳۲ھ برآمد تا ہے ۔ میں نے طبع اول میں اسی کی بناء پر ۱۲۳۳ھ لکھا تھا اور یہی درست تھا ۔ طبع دوم میں غالباً قاضی عبد الودود سے اثر ہو کر اسے ۱۲۳۲ھ میں بدل دیا ۔ مصحفی نے انشا کی تاریخ وفات یوں لکھی ہے ۔

تاریخش گفت مصحفی بے کم و کاست ✤ اے وائے کہ مردہ قدر دان شعرا

دوسرے مصرع سے بظاہر ۱۲۳۲ برآمد ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر عابد پشاوری اپنی کتاب انشا اللہ خان انشا (لکھنؤ ا) میں لکھتے ہیں ۔

"قاضی صاحب نہ صرف اسے ۱۲۳۲ھ مانتے ہیں بلکہ اس پر مُصر ہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ اسے ۱۲۳۳ھ پر ترجیح نہ

دی جائے جواب تک نشاط کے قول کے مطابق سال وفات سمجھا جاتا رہا ہے (قاضی عبدالودود: مصحفی و انشا مشمولہ اردو ادب جنوری و اپریل ۱۹۵۱ء) (ص ۲۸۰-۸۱)

عابد لکھتے ہیں کہ شعراء کے آخر میں ہمزہ ہے۔ ہمزہ کے عدد کبھی ایک کبھی دس کبھی کچھ بھی نہیں شمار کرتے ہیں۔ مصحفی کے مصرع میں ایک شمار کرنا ہوگا۔

اب میں نشاط اور عابد پشاوری کے مطابق ۱۲۳۳ھ ہی کو ترجیح دیتا ہوں۔ اعتراض ہے کہ میں نے ص۳۹۰ پر بغیر کسی حوالے کے لکھا ہے کہ (نواب محبت خان محبت) نے ۱۲۳۳ھ میں انتقال کیا۔ صحیح ۱۲۲۲ھ ہے۔

معترض صاحب کو دیکھ لینا چاہیئے تھا کہ طبع دوم میں ایک نامکمل، ناقص الاول جملہ چھپا ہے ——— 'نے ۱۲۲۳ھ میں انتقال کیا'۔ اس سے پہلے کے الفاظ حذف ہیں۔ اس جملے میں سہو کتابت بھی ہے۔ صحیح بیان ملاحظہ ہو طبع اول میں جو یوں ہے۔

"صاحب تذکرہ 'بزم سخن'، 'نساخ' اور حسرت موہانی کے مطابق محبت نے ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں انتقال کیا" طبع اول۔ ص۳۸۱

میں نے طبع دوم کے لیئے محض یہ ترمیم کی تھی کہ عیسوی سنہ نکال دیا تھا کیونکہ ہجری سنہ کے متوازی دو عیسوی سنہ ممکن ہوتے۔ ہجری سنہ میں کوئی ترمیم نہ کی تھی نہ میرے پاس اس کی کوئی وجہ تھی۔ کاٹ چھانٹ کی وجہ سے کاتب نے ہجری سنہ کو بھی غلط پڑھ لیا۔

میں نے لکھا ہے "شمالی ہند میں رزمیہ مثنویوں کا قحط ہے۔ مول چند منشی نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی"۔ مبصر صاحب منشی سے پہلے کی ایک رزمیہ مثنوی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ میں نے منشی کے موضوع کی ندرت پر توجہ دلائی تھی یہ دعویٰ تو نہ کیا تھا کہ شمالی ہند میں منشی نے پہلی رزمیہ مثنوی لکھی۔ مبصر ۲۱۶ شعروں کی ایک مختصر رزمیہ مثنوی کا ذکر کرتے ہیں۔ میں اس سے کہیں قدیم تر ضخیم تر رزمیہ مثنوی کی نشان دہی کرتا ہوں۔ ایک مجہول الاحوال شاعر سید زاہد ثنا نے پانی پت کی تیسری جنگ سے متعلق ۱۱۱۹ شعروں کی مثنوی وقائع ثنا ۷۴-۱۱۷۳ھ میں لکھی۔ ملاحظہ ہو جمیل جالبی کی تاریخ جلد دوم حصہ اول ص ۸۹-۸۱ لیکن راغب اور ثنا کی مثنویوں کی بہ نسبت منشی کی مثنوی زیادہ معروف ہے۔

اعتراض ہے کہ میں نے غالب کی مثنوی در صفت انبہ کے علاوہ ان کی دو مزید مثنویوں "مثنوی پتنگ" اور "قادر نامہ" کا نام نہیں لیا۔ وجہ یہ ہے کہ غالب کے متداول دیوان میں محض ایک ہی مثنوی ہے۔ بقیہ دو مثنویاں نسخہ حمیدیہ میں بھی نہیں۔ نسخہ عرشی کلام غالب کا وہ پہلا مجموعہ ہے جس میں یہ شامل کی گئیں لیکن انھیں جگہ ملی نسخے کے جزو یادگار نالہ میں جس میں بقول مولانا عرشی معتبر اور غیر معتبر دونوں قسم کا کلام شامل ہے۔ اس جزو میں محض دو نہیں بلکہ چار مزید مثنویاں

ہیں۔ اگر مبصر صاحب نے نسخۂ عرشی کی مزید مثنویوں کا ذکر کیا تو وہ دو ہی پر کیوں رُک گئے، چاروں کی گرفت کیوں نہ کی۔ میری کتاب کا نقش اول نسخۂ عرشی کے منظر عام پر آنے سے پہلے تیار ہو چکا تھا۔ یاد نہیں دوسرے ایڈیشن کے وقت ان کا ذکر کیوں نہیں کیا کیوں کہ میں ۱۹۶۹ء میں نسخۂ عرشی پر ایک مستقل مضمون نقوش میں شائع کرا چکا تھا۔ شاید یہ وجہ رہی ہو کہ غالب ان مثنویوں کے باوصف بھی قابل ذکر مثنوی نگار نہیں۔

اعتراض ہے کہ میں نے ضمیر کی چوتھی مثنوی معجزۂ امام حسین کا ذکر نہیں کیا۔ وجہ یہ ہے کہ مجھے اس کے وجود کا علم ہی نہ تھا۔ مجھے ضمیر کی تین مثنویوں کی اطلاع پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے دی تھی۔ وہ بھی چوتھی مثنوی کے بارے میں نہ جانتے تھے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری اپنی کتاب "اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا" میں اس مثنوی کی تفصیل دے کر لکھتے ہیں۔

"میر ضمیر کی یہ مثنوی راقم الحروف کی دریافت ہے۔ اس کا کوئی اور نسخہ غالباً کسی اور کتب خانے میں نہیں ہے" ص۲۹۷

ڈاکٹر اکبر حیدری کی کتاب میں سنہ اشاعت درج نہیں۔ انہیں اس پر ڈگری ۱۹۷۲ء میں ملی۔ میری کتاب کی طبع دوم کا مسودہ ۱۹۷۵ء میں ناشر کو دے دیا گیا تھا۔ معلوم نہیں اس وقت تک ڈاکٹر حیدری کی کتاب شائع ہو چکی تھی کہ نہیں؟ ہو بھی گئی ہو تو مجھے ان کی دریافت کا علم نہ تھا۔

لکھتے ہیں کہ "نساخ کے تذکرے کی تکمیل ۱۲۰۱ھ لکھنا یقیناً سہو کاتب ہے۔ نساخ کا تذکرہ ۱۲۹۱ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔"

یہاں پھر میری کتاب کے طبع ثانی کی کتابت آڑے ہوئی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو ۱۲۰۱ھ دراصل ۱۲۸۱ھ ہے۔ یہی عدد طبع اول ص۵۷۶ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ میں نے کتاب کی اسی طبع دوم جلد دوم ص۲۲۰ پر لکھا ہے۔

"سخن شعرا ۱۲۸۱ھ میں مرتب ہوا۔ میرے سامنے اس کا ۱۲۹۱ھ کا ایڈیشن ہے"۔ سخن شعرا کی تاریخ تکمیل ۱۲۸۱ھ ہے، ۱۲۹۱ھ نہیں۔ سخن شعرا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۸۱ھ نکلتا ہے۔ یوپی اردو اکادمی کا ایڈیشن دیکھئے جو طبع اول کا عکس ہے۔ اس کی تمہید میں "سخن شعرا" کے نیچے ۱۲۸۱ھ لکھا ہے۔ کتاب کے آخر میں متعدد قطعات تاریخ اسی سنہ سے متعلق ہیں۔ کتاب کے تعارف میں ڈاکٹر محمود الٰہی نے واضح کر دیا ہے کہ کتاب کے تاریخی نام سے ۱۲۸۱ھ برآمد ہوتا ہے، اس کی پہلی اشاعت ۱۲۹۱ھ میں ہوئی۔ صفیر بلگرامی کی تاریخ وفات جاننے کی کوشش نہ کرنا میری فروگذاشت ہے۔

شاد کی مثنویوں کے شمار میں کچھ خلفشار ہو گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے ۱۹۵۵ء میں یا شاید ۱۹۵۶ء میں خدا بخش لائبریری میں شاد کی مطبوعہ مثنوی "چشمۂ کوثر" دیکھی۔ اس میں مصنف کے نام کے ساتھ اضافہ ہے "مصنف مثنوی فغان دلکش و مثنوی نوید ہند و مثنوی ثمرۂ زندگی و مثنوی نالۂ شاد"، اس بیان میں صراحت نہیں کہ فغانِ دلکش

فادری کی مثنوی ہے ۔ ان مثنویوں کے علاوہ بقیہ کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ میں نے ان کا ذکر کہاں دیکھا میری یادداشتوں کے مطابق چشمۂ کوثر مطبوعہ پر اس کا متبادل نام راہِ کوثر درج نہ تھا مبصّر صاحب کا یہ کہنا کہ راہِ حق کا تاریخی نام چشمۂ کوثر ہے درست نہیں ۔ چشمۂ کوثر سے محض ۱۰۷۴ھ برآمد ہوتا ہے ۔ میری یادداشتوں میں بھی تاریخ کا شعر درج ہے جس سے میں نے ۱۲۰۴ھ برآمد کیا ہے ۔ معلوم نہیں مبصّر صاحب کیوں اسے غلط اور ۱۲۰۲ھ کو صحیح مانتے ہیں ۔ تاریخ کا شعر ہے ۔

سالِ تربیت بگو بے سرِ وصف ۔۔۔ کز قلم چشمۂ کوثر بچکید

سرِ وصف کے واو کے ۶ عدد کرنے سے ۱۲۰۴ھ برآمد ہوگا ۔ ۲۷+۱۷۰+۳۴۸+۷۲۶+۳۹ = ۱۲۱۰ ،

مجھے اپنی یادداشتوں میں شاہ عظیم آبادی کا ذکر کہیں نہ مل سکا ۔ مجھے اس کی مثنوی کی کوئی اطلاع نہیں ۔ معلوم نہیں میں نے کہاں سے فہرست کے آخری کالم میں مجموعۂ نغز کا حوالہ دیا ۔ یہ حوالہ شاہ کے سنہ وفات کے لئے نہیں بلکہ اس کی مثنوی کے لئے ہے لیکن مجموعۂ نغز میں اس کی مثنوی کا کوئی ذکر نہیں ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کون سی مثنوی لکھی ۔ فی الوقت اس کا نام فہرست سے خارج کر دینا چاہئے ۔

مثنویوں کی فہرست نامکمل بھی ہے اور اس میں اغلاط کا در آنا بھی دور از امکان نہیں ۔ ایسی فہرست کو محض ایک ابتدائی نقشے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ۔ مثنویوں کی جامع و مانع فہرست تیار نہیں کی جا سکتی ۔

مبصّر نے میری کتاب کی ایک فاحش غلطی کی طرف توجہ نہیں کی ۔ جلد اول ص ۱۶۹ پر محبوب عالم شیخ محمد جیون کی چار مثنویوں : محشر نامہ ، درد نامہ ، خواب نامۂ پیغمبر اور دہیر نامۂ بی بی فاطمہ کے نام ہیں ۔ محمود شیرانی کے مضمون " اردو کی شاخ ہریانی زبان میں تالیفات " (اورینٹل کالج میگزین لاہور نومبر ۱۹۳۱ء و فروری ۱۹۳۲ء) سے ذیل کی تصحیحات کا علم ہوا ۔

● محبوب عالم ، محمد جیون سے الگ شخصیت ہے ۔ محمد جیون صاحبِ فرمائش ہے ۔ شاعر کا نام محض شیخ محبوب عالم ہے ● دھیر نامۂ بی بی فاطمہ کا صحیح نام دہیز نامۂ بی بی فاطمہ ہے ۔ یہ اور خواب نامۂ پیغمبر شاہ عبدالحکیم مہی کی تصنیف ہیں ۔

● محبوب عالم نے تین مثنویاں لکھیں : محشر نامہ ، مسائل ہندی ، درد نامہ ۔

اپنی عمر اور قویٰ کے انحطاط کو دیکھتے ہوئے امید نہیں کہ اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن کی نوبت آئے گی ۔ اگر نوبت آئی تو میں اس بار ۰۰ مختصر مثنویوں کو خارج کر دوں گا ، متن میں سے بھی اور آخری فہرست سے بھی ۔

آخر میں ایک اصولی سوال تنقید ہو کہ تحقیق ، کیا محض خامیوں کی نشان دہی تبصرہ کہلا سکتی ہے ؟ کیا توازن کا تقاضا نہیں کہ تصویر کے دونوں رخ پیش کئے جائیں ؟

●●

ڈاکٹر حسین الحق
شعبۂ اردو
مگدھ یونیورسٹی۔ بودھ گیا

ڈاکٹر محمد سمیع الحق کا تھیسس

سخن دہلوی ــــ حیات اور کارنامے

۱۔ اس کتاب کے ص۔ پر ڈاکٹر صاحب انکشاف فرماتے ہیں کہ "سخن صاحب نے حضرت قیام اصدق چشتی قادری سے بیعت کی' آپ کی وفات ۱۳۰۱ھ میں ہوئی' "الفقر فخری" مادۂ تاریخ وفات قرار پایا' پیر بیگھہ میں مزار بنا' آپ کی ایک کتاب "کراماتِ اصدقیہ" چودھری محفوظ عالم صاحب کے گھرانے میں موجود ہے۔"

اس بیان کا آخری حصہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے' ڈاکٹر صاحب نے کتاب 'کرامات اصدقیہ" دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں فرمائی' جب کہ بقول ڈاکٹر صاحب ہی کتاب آرہ میں موجود تھی اور آرہ سے ڈاکٹر صاحب کا قصبہ چکیہ بس اتنی مسافت پر ہے کہ لوگ سائیکل سے آرہ سے چکیہ جاتے ہیں اور چکیہ سے آرہ آتے ہیں' "کرامات اصدقیہ" حضرت شاہ قیام اصدق کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کے ایک مرید و خلیفہ اور سہسرام کے مشہور و معروف بزرگ و عالم اور شاعر جناب مولانا شاہ فرید الدین فرید ثانی سہسرامی کی تصنیف ہے' اس تصنیف میں حضرت فرید ثانی سہسرامی نے حضرت مولانا فخر دہلوی' حضرت محب اللہ شاہ اور حضرت صادق علی شاہ کے حالات کا مختصر اور اجمالی تذکرہ کرتے ہوئے تفصیل کے ساتھ حضرت شاہ قیام اصدق رحمۃ اللہ علیہ کے حالات' فضل و کمال اور کرامات کا تذکرہ کیا ہے اور آخر میں تتمہ کے طور پر حضرت اصدق کے خلفِ اکبر اور سجادہ نشیں آستانہ عالیہ اصدقیہ جناب مولانا شاہ شہود الحق کا تذکرہ بھی موجود ہے اور اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ حضرت مولانا انوار الحق شہودی محلہ شاہ ہارون لا سہسرام میں بھی موجود ہے۔

۲۔ ڈاکٹر صاحب کا دوسرا بیان ملاحظہ ہو۔

" حضرت شاہ .... قیام اصدق .... سات برس کی عمر میں حضرت سید ابوالعباس سعید الدین الملقب بہ صادق علی شاہ مونس اللہ کے مرید ہوئے" (ص ۵۹)

یہاں بھی تحقیق کی کوشش نہیں کی گئی اور صرف دوسروں کے لکھے ہوئے پر اعتبار کر لیا گیا ،
حضرت صادق علی شاہ کا نام نہ تو ابوالعباس تھا، نہ سعیدالدین چلئے ابوالعباس کو کنیت مان لیتے ہیں مگر سعیدالدین
کو تو نام کے خانے میں فٹ کرنا ہوگا اگر مصنف ذرا خدا بخش لائبریری میں قلمی دواوین کا رجسٹر دیکھنے کی
زحمت گوارہ فرماتے تو دِسنہ سکشن میں "دیوان صادق" نام کی ایک کتاب نظر آجاتی جس کا نمبر ۱۷۱ ہے
اِس قلمی دیوان کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں بھی موجود ہے اور اس کا مطبوعہ نسخہ کتب خانہ حضرت
مولانا انوار الحق شہودی (محلہ شاہ ہارون سہسرام) میں بھی موجود ہے اور پروفیسر ایم اے نصر (جامعہ
کلکتہ) کے پاس بھی دستیاب ہے، ان تمام نسخوں میں خود حضرت صادق علی شاہ نے اپنا نام خیرالدین لکھا ہے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ان کا نام سعیدالدین تسلیم کریں ؟

۳۔ موجودہ محققین کی تن آسانی کا ایک اور نمونہ دیکھئے ۔

"جناب باقر .... آرہ میں پیدا ہوئے .... ویسے یہ گھرانہ بہار شریف پٹنہ کے قریب موضع پیر بیگھہ
میں آباد تھا" ـــــ ص۱۳۲

حضرت باقر آرہ میں پیدا نہیں ہوئے بلکہ ان کی پیدائش بھی پیر بیگھہ ہی میں ہوئی، ان کے خاندان
میں یوسف پیر بیگھوی، قیوم اثر (مقیمانِ گیا) اور سرور عثمانی مدیر مفاہیم (مقیم رانچی) موجود ہیں اور وہ لوگ
پیر بیگھہ میں حضرت باقر کی پیدائش کا ثبوت رکھتے ہیں، دوسرا بیان بھی غلط ہے، پیر بیگھہ نہ تو بہار شریف کے
پاس ہے نہ پٹنہ کے قریب، حضرت باقر کا مولد و مدفن پیر بیگھہ گیا ضلع میں گیا پٹنہ لائن کے بیچ، بیلا اسٹیشن کے پاس ہے۔

۴۔ اور اب ایک بہت دلچسپ اور حیرت انگیز صورتِ حال ملاحظہ فرمائی جائے ۔

(الف) "حضرت قیام اصدق ۱۲۷۴ھ میں سب سے پہلے آرہ تشریف لائے تھے اور چودھری وزیر علی
صاحب آپ کے مرید ہوئے تھے، آپ کی بزرگی کی کافی شہرت دوسرے سال ۱۲۷۵ھ میں جب آرہ
تشریف لائے تو مولوی باقر علی باقر نے آپ سے ارادت کے لئے بیعت کیا اور ایک ضیافت
کی جس میں خواجہ فخرالدین حسین سخن بھی شریک ہوئے، اسی مجلس میں سخن صاحب نے بھی حضرت
قیام اصدق چشتی قادری سے بیعت کی۔" (ص۶)

(ب) "ایک قصیدہ اپنے مرشد یعنی حضرت قیام اصدق چشتی کی منقبت میں ہے، یہ قصیدہ سروش سخن میں
موجود تھا، سنِ تصنیف غالباً ۱۲۷۶ھ ہوگا، سخن صاحب مرشد موصوف سے حضرت باقر آروی کی ایما

پر بیعت ہوئے تھے، حضرت قیام اصدق چشتی ۱۲۷۵ھ اور ۱۲۷۶ھ دونوں سال تشریف لائے، یہ تو محقق ہے کہ حضرت باقر خود ۱۲۷۵ھ میں اُن سے بیعت ہوئے۔ (ص ۳۶۳)

(ج) "پہلا قصیدہ ۱۲۷۵ھ کا ہے حضرت قیام اصدق چشتی ایک موقع پر تشریف لائے تھے، باقر آروی نے خصوصی طور پر اہتمام کیا تھا، اس موقع پر باقر نے ایک فارسی قصیدہ اور سخن نے اردو قصیدہ پڑھا تھا، اسی ملاقات میں سخن ان کے ہاتھوں پر بیعت ہوئے تھے، باقر ایک سال پہلے ہی ۱۲۷۴ھ میں ان کے حلقۂ ارادت میں آچکے تھے۔" (ص ۳۵۳)

ع ناطقہ سر بگریباں ہے مگر کیا کہیئے!

بیان "الف" یہ بتاتا ہے کہ باقر آروی ۱۲۷۵ھ میں بیعت ہوئے اور اسی مجلس میں سخن صاحب بھی بیعت ہوئے۔

بیان "ب" یہ بتاتا ہے کہ حضرت باقر کا ۱۲۷۵ھ میں بیعت ہونا تحقیق شدہ امر ہے۔

بیان "ج" یہ بتاتا ہے کہ حضرت باقر کی بیعت ۱۲۷۴ھ میں ہوئی اور اسکے ایک سال بعد جناب سخن بیعت ہوئے

نتیجہ: حضرت باقر کی بیعت کا سن بھی مشکوک ہوگیا اور جناب سخن کا سن بیعت بھی شک کی دلدل میں جا پڑا۔

ایک اور پہلو پر بھی غور فرمایا جائے۔

بیان "ب" یہ بتاتا ہے کہ حضرت قیام اصدق کی منقبت میں (جناب سخن کا) جو قصیدہ ہے وہ ۱۲۷۶ھ کا تصنیف کردہ ہے۔

بیان "ج" یہ بتاتا ہے کہ جناب باقر اور جناب سخن ۱۲۷۵ھ میں بیعت ہوئے اور اس موقع پر دونوں حضرات نے حضرت اصدق کی منقبت میں قصیدے پڑھے۔

یہ بات ملحوظِ خاطر ہے کہ بقول محقق:

"دو قصائد منقبت شیخ میں ہیں، ایک رسمی کہ حمد و نعت کے بعد ہے اور دوسرا بہ "اظہارِ احوال تردد قرین" پہلا قصیدہ تو "سروشِ سخن" میں بھی ہے لیکن دوسرا قصیدہ شاعر کے قیام پورنیہ کے زمانہ کا ہے اور یہ سروشِ سخن کی اشاعت کے کوئی دس بارہ برس بعد کا ہے۔" (ص ۳۵۳)

ان بیانات کی روشنی میں تھوڑا بہت تحقیق کا شوق اور شعور رکھنے والا بھی اس کے سوا کیا نتیجہ نکال سکتا ہے کہ جناب سخن کی بیعت کا سال بھی مشکوک ہے اور تصنیف قصیدہ کا سال بھی متنازعہ فیہ اور شک

کے دھندلکے میں گھرا ہوا ہے۔

یہ کس قسم کی تحقیق کی مثال اور نمونہ ہے جس میں موضوعِ تحقیق سے متعلق افراد تو درکنار خود موضوع کے سلسلے میں متضاد قسم کے بیانات فراٹے سے دیئے گئے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جناب سحرؔ کے سلسلے میں مزید شکوک، دھندلکے اور غلط فہمیاں پھیلانے کی شعوری سعی فرما رہے ہیں۔

ع ہوئے تم دوست جس کے ....

۵۔ اب آیئے تحقیق کی زبان کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ نمونے ملاحظہ کیجئے۔

(الف) یہ قصیدہ "سروشِ سخن" میں موجود تھا اور اس کا سنِ تصنیف غالباً ۱۲۷۶ھ ہوگا" (ص ۲۶۳)

(ب) "یہ سروشِ سخن" کی اشاعت کے کوئی دس بارہ برس بعد کا ہے"۔ (ص ۲۵۳)

یہ بات تو سب پر عیاں ہے کہ تحقیق سچ کی بازیافت کی ایک کوشش ہے اور یہ امکانات نہیں بلکہ موجود کا قائل ہے اور جہاں ممکنات کی بات ہوگی وہاں "ہاں اور نہیں" دونوں ممکن ہے' یہ کیفیت آل احمد سرور کی تنقید میں "اندھے کی لاٹھی" بن کر کبھی کبھی کام دے جاسکتی ہے لیکن تحقیق کے معرکہ کارزار میں "غالباً" اور "ہوگا" سے زیادہ زنگ آلود اور کوئی ہتھیار نہیں اور ڈاکٹر صاحب اسی زنگ آلود ہتھیار سے میدانِ تحقیق میں بنوٹ بھانجتے ہیں اور بہت اطمینان سے لکھ دیتے ہیں کہ یہ "سروشِ سخن" کی اشاعت کے کوئی "دس بارہ برس کے بعد کا ہے" دس اور بارہ برس کے درمیان کیا ایک دو دن یا ایک دو ہفتے یا ایک دو مہینے کا فرق ہے؟ دو سال کی مدت کو اتنے اطمینان سے ڈاکٹر صاحب نے اندازے کی بنوٹ کی نوک پر کھڑا کر دیا ہے جیسے انہیں یہ شک ہو گیا ہو کہ وہ فخر الدین حسین سخنؔ پر تحقیق نہیں کر رہے ہیں بلکہ تذکرے کی کوئی کتاب لکھ رہے ہیں یا پھر انہیں یہ اطمینان ہے کہ کوئی ان کی کتاب پڑھے گا ہی نہیں؟

ع حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

۶۔ اوپر تو موجود اور ممکن کے سلسلے میں کچھ باتیں کی گئیں، اب ذرا تحقیق کی زبان کو جذبات کے طوب سے لت پت ہوتے ہوئے بھی دیکھ لیا جائے۔

صفیرؔ و سخنؔ کے جھگڑے میں ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے صفیرؔ کا ساتھ دیا اور ڈاکٹر سمیع الحق صاحب نے ڈاکٹر ظفر اوگانوی کو رد کیا' یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی اس پر کوئی کسی کی گرفت کر سکتا ہے۔ مگر مقامِ حیرت ہے کہ اس سلسلے میں ظفر اوگانوی کی ایک کوشش کو رد کرتے ہوئے ڈاکٹر سمیع الحق

حب جذبات سے اتنا مغلوب ہو جاتے ہیں کہ "یہ محض آنکھ میں دھول جھونکنے والی بیہودہ کوشش ہے" (ص۱۱۵) جیسا کہ یہ جملہ لکھ دیتے ہیں، تحقیق اگر جذبات سے مملو ہو جائے تو پھر کارِ طفلاں او رکار بزرگاں سب تمام ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پیش لفظ میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ "قاضی عبدالودود صاحب کی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی تو میں جو کچھ بھی کرسکا ہوں وہ نہیں کر پاتا" اور اس کے باوجود لفظ "بیہودہ" کا استعمال کرکے وہ "زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا" کے مصداق بنتے نظر آتے ہیں یہ کیسی رہنمائی تھی؟ (کاش قاضی صاحب زندہ ہوتے!)

۷۔ ص۱۶۰ پر بھی ڈاکٹر صاحب کا ایک بہت دلچسپ بیان موجود ہے۔

"جناب سخن کے آباؤ اجداد میں سے ہر ایک خواہ وہ طوائف کے گھر کا طواف ہی کیوں نہ کرتا ہو لیکن مسندِ ارشاد و خلافت پر فائز ضرور تھا۔" (ص۱۶۰)

بیان کا اور کوئی انداز اس سے زیادہ غلط نہیں ہو سکتا۔

اگر جنابِ سخن کے خاندان میں کوئی طوائفوں کے گھر کا طواف کرتا تھا تو اس کا تذکرہ از روئے تحقیق ضروری تھا اور اگر ڈاکٹر صاحب نے یہ بات جان کر چھپانے کی کوشش کی ہے تو یہ کتمانِ حقیقت ہے اور تحقیق کے منصب سے نیچے آنے کا مطلب ہے اور اگر ایسی کوئی بات مصدق نہیں ہے اور صرف اشہبِ قلم نے اپنی روانی اور زور دکھایا ہے تو یہ تحقیق نہیں تحقیق کا منہ چڑانا ہے۔

۸۔ بات اردو کے موجودہ محققین کی عادتِ تن آسانی و سہل انگاری کے تذکرے سے شروع ہوئی تھی اور اتفاق دیکھئے کہ یہ بات پھر اسی تذکرے پر ختم ہوتی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کا ایک اقتباس (بہ اختصار) دیکھئے۔

"دیوان کے بالکل آخر میں ایک قطعہ ہے، جس کا عنوان ہے "نغمہ سرائی عندلیبِ قلم بہ یادِ احبابِ یارانِ ہمدم بہ مقامِ ہزاری باغ..... دوسرے حصے میں..... وہ اشخاص جو جج منصف تھے یا وکلا تھے۔ منشی عشرت علی..... (ص۲۸۴-۲۸۵)

یہاں بھی سہل انگاری کے نتیجے میں عشرت علی صاحب کو جج، منصف اور وکلا کی صف میں کھڑا کر دیا گیا اور شعراء کی صف سے انہیں نکال پھینکا گیا ورنہ عشرت علی صاحب ڈاکٹر صاحب ہی کے ضلع کے شاعر، سہسرام کے باشندہ اور اس محلہ کے رہنے والے تھے جس محلے میں خود ڈاکٹر صاحب کی رشتہ داری

موجود ہے اور خود عشرت علی عشرت سہسرامی کا دیوان آج سے ۵۰ سال پہلے زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکا اور اس کتاب میں بھی مولفِ کتاب (جناب سید خیرالدین ترمذی المتخلص بہ خیر سہسرامی) نے یہ لکھ دیا ہے کہ خواجہ فخرالدین حسین دہلوی نے عشرت سہسرامی کے بارے میں دو اشعار کہے ہیں۔

"ہوسکتا ہے مذکورہ بالا کوتاہیوں اور خامیوں کے جواز میں کوئی ڈاکٹر صاحب کے پیش لفظ سے یہ اقتباس پیش کرے کہ ـــــ"

"سخن کے متعلق چھان بین کرنے کے لیے مجھے مہلت بہت زیادہ نہیں ملی لیکن خدا کی نوازش شامل رہی جس کی وجہ سے بہت سارے حقائق کے حاصل ہونے میں بہت دشواری نہیں ہوئی، میں اپنے کام سے پورے طور پر مطمئن نہیں ہوں لیکن میرے پاس کوئی اور چارۂ کار نہیں تھا اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ اس کی اشاعت کرادی جائے تاکہ شائقینِ علم وادب تک وہ سارے حقائق پہنچ جائیں جو میری دسترس میں آسکے۔" (پیشِ لفظ - د)

لیکن سوال یہ ہے کہ

(الف) جب سخن کے متعلق بہت چھان بین نہیں ہوسکی

(ب) تحقیق کرنے والا خود اپنے کام سے مطمئن نہیں ہے

تو پھر اس کتاب کو شائع کرانے کی ضرورت کیا تھی؟

خود مصنف کے الفاظ میں" اس کی ضرورت اس لئے تھی تاکہ شائقین علم وادب تک وہ سارے حقائق پہنچ جائیں" لیکن یہ کیسے حقائق ہیں جو خود اپنے ہی کو کاٹتے اور رد کرتے نظر آتے ہیں؟

کیا اردو تحقیق کی رفتار اور سمت کا جائزہ لینے والے ذمہ دار اصحاب اردو تحقیق کے معیار کو سنبھالنے کی کوئی کوشش نہیں کریں گے ـــــ؟؟

●●

ڈاکٹر محمد سمیع الحق
شعبۂ اردو، کراچی کالج کراچی

جواب

مجھے گوش گزار کرنا ہے کہ اکتوبر ۱۹۸۹ء سے میں مسلسل مرض سرطان کی اذیت میں گرفتار رہا اور اس وجہ سے میرے خانوادہ کے لوگ بھی انتہائی بے چین رہے۔ اس درمیان میں ساری چیزیں منتشر ہو گئیں کوئی پیپر اب تلاش کرنے سے نہیں ملتا۔ ہر چند مطالعہ اور جواب تحریر کرنا میرے لیے شاق ہے۔ پھر بھی حسب فرمائش اپنی یادداشت سے کچھ نہ کچھ تحریر کر دیتا۔ آپ اُس تبصرہ کو آئندہ اشاعت کے لیے ملتوی کر سکیں تو عین نوازش ہوگی۔ ایک مضمحل پر احسان بے پایاں ہوگا، لیکن اگر آپ کے ضابطے اس کی اجازت نہیں دیتے تو کم سے کم اپنی طرف سے یہ نوٹ لگا دیں کہ سمیع الحق پر جو کچھ بھی اعتراضات کیے گئے ہیں، ان کا اس نے اقبال کر لیا ہے۔ البتہ یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ جملہ خامیوں کے ساتھ اس کو رہنے دیا جائے تاکہ دنیا جانے کہ خطا و نسیان انسانی کردار کا جزو لاینفک ہے۔

●●

حکیم محمد حسین خاں شفا
کنسلٹنٹ رضا لائبریری رامپور

ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی کا تھیسِس

مولانا محمد علی جوہر کی اردو ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ

زیر بحث مقالہ لکھنؤ یونیورسٹی سے فروری ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کے لیے منظور شدہ ہے جو نظر ثانی و اصلاح کے بعد ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ کام جناب پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی زیر نگرانی انجام پایا ہے اور ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی نے "مولانا محمد علی جوہر کی اردو ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔ چونکہ صدیقی صاحب مولانا جوہر کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس بنا پر ان سے بہتر نہ تو کسی کو وسائل حاصل ہو سکتے تھے اور نہ ان سے بہتر کوئی دوسرا اس کام کو انجام دے سکتا تھا۔

مقالہ اپنے موضوع "اردو ادبی خدمات" سے ہٹا ہوا ہے۔ اس میں ادبی مباحث اور ادب سے متعلق حصّہ باعتبار مواد بہت کم اور ناقص ہے۔ اس سے زیادہ تر مواد سیاست و سوانح سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلا باب مولانا جوہر کے خاندان اور سوانح سے متعلق ہے جو ۱۶۲ صفحات پر مشتمل ہے، دوسرا صحافت سے تعلق رکھتا ہے جو ۱۷ صفحات پر حاوی ہے۔ تیسرا مکتوب نگاری پر ہے جس کے تیس صفحات ہیں، چوتھا شاعری پر ہے۔ اس کے ۳۲ صفحات ہیں۔ چونکہ مقالہ نگار کا تعلق ادبیات سے تھا اور انھوں نے طبع آزمائی زیادہ تر سیاسیات و مذہبیات میں شروع کر دی، خاص طور پر نظریہ خلافت، تاریخ خلافت اور مسئلہ خلافت پر، جس کی وجہ سے مقالہ نہ صرف غیر تحقیقی بلکہ غیر سنجیدہ بھی ہو گیا ہے، اور نقل اقتباس میں صحت، متن معنی و مفہوم کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں بطور نمونہ صرف ایک صفحہ سے چند مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ مقالہ نگار نے صفحہ ۱۴۷ پر رسالہ جامعہ اپریل ۱۹۸۰ء محمد علی جوہر نمبر سے بحوالہ صفحہ ۱۴۶ از نذیر الدین مینائی کی یہ عبارت نقل کی ہے۔ "ابو الکلام آزاد کے فتویٰ ہجرت پر لوگوں نے کابل کی طرف رخ کیا۔" ہم نے جب چیک کیا تو صفحہ مذکورہ پر نذیر الدین مینائی کی اصل عبارت یہ نکلی۔ "اس سیاسی مرض کے لیے ایک اور نسخہ تجویز کیا گیا اور وہ بھی مولانا آزاد ہی کے ذہن زرخیز کی پیداوار تھا جس کی رو سے لوگ ترک وطن پر آمادہ ہو گئے۔" . . . اول تو مولانا آزاد

کے سلسلہ میں نذیر الدین مینائی کا حوالہ بھی تسخہ کی فتوی میں تبدیلی اس طرح اقتباسات میں مقالہ نگار نے اکثر جگہ تحریف لفظی و معنوی کی ہے۔ اس صفحہ پر مذکور ہے۔ "ترکی کے خلیفہ کو معزول کئے جانے کے سلسلہ میں دنیا کے دیگر ممالک بھی مخالفت کر رہے تھے، چنانچہ استنبول نے بھی اس کی مخالفت کی۔ اسی صفحہ پر مزید فرماتے ہیں۔" ۴ مارچ قسطنطنیہ گورشانہ اور استنبول کے نمائندہ نے خلیفہ کے معزول کئے جانے سے اختلاف کیا" سیاسیات و جغرافیہ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ استنبول (قسطنطنیہ) ٹرکی کا شہر ہے۔ الگ کوئی ملک نہ تھا نہ اب ہے۔ دراصل اس قسم کی لغزشیں غیر تحقیقی ذہن، اصول حوالہ جات سے ناواقف اور مشکوک مقامات پر اصل کی طرف رجوع نہ کرنے کے نتیجہ میں سرزد ہوئے ہیں، جو مقالہ میں جگہ جگہ ہیں اور اس کی ذمہ داری اسکالر اور گائیڈ دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ تحقیق کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ موضوع زیر بحث سے متعلق قریب ترین عصری مستند معلومات کو فراہم کیا جائے، براہ راست ماخذ سے رجوع کیا جائے اور محصولہ مواد کو تحقیقی سلیقہ سے کسی اصول و ضابطہ کے تحت ترتیب دیا جائے۔

مذکورہ مقالہ میں ان شرائط کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس مقالہ کے ابتدائی ۵ صفحات مولانا جوہر کے خاندان و اسلاف سے متعلق ہیں جن کا تعلق سترہویں و اٹھارہویں صدی سے علاقہ مراد آباد و امروہہ سے ہے۔ ان کی برادری میں کچھ معروف و مشہور اشخاص ماضی میں بھی گذرے ہیں۔ مفتی سعد اللہ صاحب وغیرہ کا تعلق بھی ان کے خاندان سے تھا۔ مولانا کے دادا کا تذکرہ محمد انوار حسین تسلیم سہوانی نے اپنی کتاب "تاج المداح" مرتبہ ۱۸۷۲ء میں اس طرح کیا ہے:

"... ذکر شیخ علی بخش خاں تحصیلدار... "قوم" شیخ کلاں است۔ صاحب اقبال است۔" (ص ۶۲)

اس برادری اور اس علاقہ کا تذکرہ عبد القادر مراد آبادی، متوفی ۱۸۴۹ء نے اپنے فارسی روزنامچہ "وقائع عبد القادر خانی" میں بھی کیا ہے۔ لیکن فاضل مقالہ نگار نے بنیاد بابائے صحافت اللہ بخش یوسفی کی حالیہ کتاب "یوسف ذی قبائل" اور "تذکرہ کاملان رامپور" مرتبہ ۱۹۲۹ء کو بنایا ہے جو سیاسی کتابیں ہیں اور کچھ امور میں ناقابل اعتبار ہیں۔ جب معلومات کی بنیاد ہی غیر معتبر ماخذ پر ہوگی تو نتائج معلوم؟ دراصل اردو ریسرچ اسکالر کی یہ بہت بڑی خامی ہے کہ وہ اپنی تحقیق کی بنیاد اردو یا انگریزی پر رکھتا ہے، فارسی و عربی سے ناواقفیت کی بنا پر وہ ان ماخذ سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر انجام وہی ہوتا ہے جو اس مقالہ کے باب اوّل کا ہوا۔

تحقیق کے طالب علم کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ کتب خانوں سے وابستہ افراد خوب جانتے ہیں۔ اردو میں نہ تو مکمل تحقیقی نصاب ہے اور نہ استاد کے پاس وقت۔ اس بنا پر اکثر طلبہ کو ترتیب مواد و اصطلاحات تحقیق کے استعمال اور حواشی نگاری وغیرہ میں غلطی ہو جاتی ہے۔ اس عیب سے یہ مقالہ بھی پاک نہیں ہے۔

شاعری کے باب میں جہاں مولانا جوہر کے دستیاب شدہ مجموعوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ وہاں ترتیب نہ تو زمانی ہے اور نہ ابجدی۔ مثلاً "کمی جوہر" مطبوعہ ۱۹۸۳ء نمبر ۶ پر ہے اور دیوانِ جوہر مطبوعہ ۱۹۶۲ء نمبر ۹ پر۔ یہی حال سوانح، امراض اور دیگر عنوانات پر ترتیب مواد کا ہے۔ اکثر جگہ تقدیم و تاخیر ہے۔ تحقیق کا بنیادی مقصد علم کو وسعت دینا ہے نہ کہ حقائق کو دریافت کرنا اور موضوع زیرِ بحث کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لینا ہے۔ اس مقالہ میں اس مقصد کی تکمیل کس حد تک کی گئی ہے۔ یہ قابلِ غور ہے۔ پیش لفظ میں پروفیسر ملک زادہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

"اس مقالہ میں بہت سے ایسے مقامات بھی آئیں گے جو عام طور سے مولانا کے سوانح نگاروں کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔ مثلاً مولانا کا مولد نجیب آباد تھا یا رامپور؟ مولانا ۱۸۹۰ء میں رامپور میں زیرِ تعلیم تھے یا بریلی میں؟ مولانا کے اختیار کا ابتدائی کام ہمدرد تھا یا ہمدرد وغیرہ؟"

ملک زادہ صاحب نے جن امور کو بطورِ مثال پیش کیا ہے۔ وہ مولانا سے واقفیت رکھنے والوں کو بھی معلوم تھے اور علمی حلقہ میں مشہور تھے۔ چنانچہ یہ بحثیں رسالہ جامعہ کی نمبروں، نگار دہلی، قومی جنگ رامپور میں موجود ہیں جن کو بعد میں عبد اللطیف اعظمی صاحب نے اپنی کتاب "مولانا محمد علی جوہر ایک مطالعہ" مطبوعہ ۱۹۸۰ء میں سمیٹ لیا ہے۔ اس سلسلے میں لطیف صاحب کا مضمون "علمی پائے مضامین" میں صفحہ ۱۶۵ دیکھا جا سکتا ہے۔ اول تو ان چند مسائل کی اہمیت ہی کیا ہے اور پھر ان سے "جوہر شناسی" میں کیا اضافہ ہوا اور مجموعی طور پر مقصدِ تحقیق کس حد تک حاصل ہوا؟ ملک زادہ صاحب مزید لکھتے ہیں :

"اس مقالہ کا قیمتی سرمایہ وہ چند صفحات ہیں جو ضمیمہ کے طور پر کتاب کے آخر میں شامل کیے گئے ہیں۔ . . بن ظہیر علی صدیقی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھیں اپنے مقالہ میں شامل کر کے فکر و نظر کے کچھ اور پہلو بھی آنے والے محققین کے لیے کھول دیئے۔"

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ضمیمہ میں اصل موضوع "ادبیاتِ جوہر" سے متعلق کوئی خاص چیز نہیں ہے جو چند عکس شامل ہیں وہ مولانا کی صد سالہ برسی پر شائع ہونے والے رسائل تذکرہ کالان رامپور میں موجود ہیں، بعض غیر اہم چیزوں کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ مولانا کی لڑکی گلنار بیگم کی شادی کا دعوت نامہ کتاب اور اس کے ضمیمہ میں دو جگہ شامل کیا ہے۔ صفحہ ۱۷۵، صفحہ ۸ پر، پھر فارسی اور انگریزی دستاویزات اور تصویروں کا ادبیات سے کیا تعلق۔ مجموعی طور پر ادبیاتِ جوہر" پر جوہر شناسوں کے علم میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا، ادبی مباحث، ادیبوں سے روابط، نثر و غیر مدون کلام کی نشاندہی وغیرہ پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ تنقید کے لیے فنکار کی تخلیقات کے مطالعہ کو جس قدر گیرائی و گہرائی کی ضرورت ہے اس کا فقدان ہے۔ تحقیقی مقالات میں صحتِ متن کے ساتھ فٹ نوٹ و حواشی کی بڑی اہمیت ہے اور اس کے بھی کچھ

آداب ہیں جس کی بجاآوری کا حق ادا نہیں کیا گیا۔ ریسرچ اسکالر کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ممکنہ حد تک کوشش کر کے ذیلی اشخاص کا جب ذکر کرے تو سنہ وفات اور اہم معلومات بھی حواشی میں تحریر کرے خاص طور پر اپنے موضوع سے متعلق اگر مذکورہ شخصیت کے کچھ کارنامے ہوں تو ضرور تحریر کر دے۔

صدیقی صاحب نے جگہ جگہ تذکرہ کاملان کے مؤلف مولانا محمد علی کے چچازاد بھائی احمد علی خاں شوق کا تذکرہ کیا ہے۔ اور صفحہ ۹۴ کے حاشیہ پر نوٹ بھی دیا گیا ہے۔ لیکن نہ تو ان کا سنہ وفات ۲۰ دسمبر ۱۹۳۲ء دیا ہے، اور نہ ان کی ادبی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح صفحہ ۱۰۱ کے حاشیہ پر ڈاکٹر انصاری کا تذکرہ ہے، لیکن سنہ وفات مذکور نہیں ہے اور اشخاص کے سلسلہ میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ صفحہ ۱۰۸ پر حاشیہ بے حد دلچسپ ہے۔ مقالہ نگار لکھتے ہیں

"علی برادران کے چھند واڑہ میں نظربندی کے دوران کی کچھ معلومات بلقیس شبیہ صاحبہ افسانہ نگار (مہندہ پلیس اکولہ مہاراشٹر) نے تحریر کی ہیں۔ . . . بلقیس شبیہ کا افسانوی مجموعہ "خالی سیپ" ۱۹۸۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔"

تحقیقی مقالہ میں اس قسم کے حواشی کا کیا جواز ہے۔ مولانا جوہر پر مقالہ پڑھنے والے کو صرف اتنا کافی تھا کہ یہ بتا دیا جاتا کہ آپ کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟ اس نوٹ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی، بلکہ بے ضرورت بلقیس صاحبہ کا اشتہار معلوم ہوتا ہے جو سوئیر میں ہوتا تو مناسب تھا۔ تحقیق ایک فن ہے اور اس کے کچھ اصطلاحات ہیں چونکہ نہ تو استاد اسکالر کو وقت دیتے ہیں اور نہ علمی رہنمائی کرتے ہیں اس وجہ سے اکثر اسکالر کتابیات واشاریہ وغیرہ میں فرق نہیں کر پاتے چنانچہ اس مقالہ میں بھی کتابیات میں ایسی کتابوں کے نام ملتے ہیں جنھیں مقالہ نگار نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ صرف دوسری کتابوں میں نام آجانے سے کتابیات میں شامل کر لیا گیا ہے اس وجہ سے باقی کتابوں کے مصنفین کے نام بھی تحریر کئے ہیں، لیکن ان کے صرف نام ہیں جیسے: تاریخ امروہہ، نخبۃ التواریخ وغیرہ۔ بہت سے اہم مآخذ جو دستیاب ہیں مقالہ نگار نے ان سے استفادہ نہیں کیا ہے جن میں خاندان جوہر کا گلدستہ "صدیقہ حامدی"، مولانا شوکت علی کا رسالہ "اولڈ بوائے"، علی بخش خاں کے سلسلہ میں "مکاتیب غالب" "تاج المدارج" بی اماں کے سلسلے میں گلدستہ نیرنگ، جوہر کی رامپور میں ملازمت کے سلسلے میں شیخ ضیاالحق کی رامپور میں کلال اور وہ کتابیں جو مولانا کے زیر مطالعہ رہی ہیں، جس پر مولانا کے نوٹس اور رقی البدیہہ اشعار بھی ہیں۔

ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی
رامپور

جواب

حکیم حسین صاحب نے میرے تحقیقی مقالہ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

"مقالہ نگار نے صفحہ ۱۴۷ پر رسالہ جامعہ اپریل ۱۹۷۹ء محمد علی جوہر نمبر سے بحوالہ صفحہ ۱۴۶ نذیر الدین مینائی کی یہ عبارت نقل کی ہے۔ 'ابوالکلام آزاد کے فتویٰ ہجرت پر لوگوں نے کابل کی طرف رخ کیا'

ہم نے جب اس حوالہ کو چیک کیا تو صفحہ مذکور پر نذیر الدین مینائی کی اصل عبارت یہ نکلی "اس سیاسی مرض کے لیے ایک نسخہ تجویز کیا گیا اور وہ بھی مولانا آزاد ہی کے ذہن زرخیز کی پیداوار تھا جس کی رو سے لوگ ترک وطن پر آمادہ ہو گئے۔ اوّل تو مولانا آزاد کے سلسلے میں نذیر الدین مینائی کا حوالہ نسخہ کی فتویٰ میں تبدیلی اس طرح مقالہ نگار نے اکثر جگہ تحریف لفظی و معنوی کی ہے۔"

اصولِ تحقیق میں یہ بات شامل ہے کہ اگر کسی مصنف کی عبارت کو اس مصنف کے الفاظ میں ہی نقل کیا جائے گا تو اصل عبارت واوین (" ") میں نقل کی جاتی ہے اور عبارت کے اختتام پر سہ بنا کر حوالہ کے لیے حواشی میں تفصیل دی جاتی ہے۔ لیکن اگر کسی مفہوم کو اپنے الفاظ میں تحریر کیا جاتا ہے تو عبارت واوین میں تحریر نہیں کی جاتی اور حوالے کے لیے سہ علامت کو لفظ کے اوپر بنایا جاتا ہے۔ حکیم حسین نے میری جس عبارت کی نشاندہی کی ہے وہ واوین میں نہیں ہے بلکہ میرے اپنے الفاظ ہیں اور چونکہ یہ بات نذیر الدین نے اپنے مضمون میں بھی تحریر کی ہے اس لیے حوالے کے لیے علامت کو لفظ کے اوپر بنایا گیا ہے۔ مولانا آزاد نے ہجرت کا فتویٰ دیا تھا یہ بات علمی دنیا کو بھی معلوم ہے اور معاصرین نے بھی تحریر کیا ہے۔

۲۔ حکیم حسین کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "بابائے صحافت اللہ بخش یوسفی کی کتاب 'یوسف زئی قبائل' اور 'تذکرۂ کاملانِ رامپور' کو بنیاد بنایا ہے' جو سیاسی کتب ہیں۔" یہ دونوں کتب سیاسیات سے متعلق کس طرح ہیں؟ اس سے حکیم صاحب کی علمی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بابائے صحافت نے "یوسف زئی قبائل" نام کی کوئی کتاب نہیں لکھی اور نہ میرے مقالہ میں یوسف زئی قبائل" نام کی کسی کتاب کا حوالہ ہے۔ تذکرۂ کاملان رامپور تذکرہ ہے نہ کہ سیاست کی کتاب

۳۔ احمد علی شوق تذکرۂ کاملان رامپور کے مصنف محمد علی کے چچا زاد بھائی ہیں۔ اس لیے انکے خاندان کے بارے میں اس سے زیادہ مستند راوی اور کون ہو سکتا ہے؟ اور اس کے علاوہ دونوں کے مکانات ایک دوسرے سے ملحق تھے' ہر وقت کی آمد و رفت کے علاوہ احمد علی شوق معاصرین میں ہیں۔ اس کے علاوہ بابائے صحافت بھی محمد علی کے ہمراہ رہے ہیں۔ معاصرین میں ہیں اس لیے بابائے صحافت کا بھی حوالہ دیا گیا۔ غیر مستند حوالوں سے پرہیز کیا گیا ہے مثلاً حکیم حسین کا ہی ایک مضمون ہے ان کا دعویٰ ہے کہ کسی بیاض میں ایک مضمون ان کے پاس تحریر کیا ہوا نکلا ہے جو ان کے خاندان کے کسی صاحب کا تھا۔

حکیم حسین کے خاندان میں اس سے قبل کوئی علمی معروف شخصیت مشہور نہیں اس لیے غیر علمی غیر معروف شخصیت کی بیاض اور جس میں صرف ایک مضمون مولانا پر تحریر ہو اور وہ بھی غیر مستند روایات پر مبنی اس پر کس طرح تحقیق کا طالب علم الیقین کر سکتا ہے۔؟ اور بیاض میں صرف ایک مضمون محمد علی پر ہی تحریر تھا۔ بڑی عجیب سی بات ہے۔

۴؎ بنیادی حوالے دینے کے بعد دیگر حوالے دینا ضروری نہیں ہوتے۔ مولانا کے تذکرہ کے سلسلے میں دیگر مصنفین کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ لیکن اگر خطوط غالب میں صرف مولانا کے دادا کا کہیں نام آجائے یا کسی اور مصنف کے وہاں تو بنیادی ماخذ کے بعد ان حوالوں کی چنداں ضرورت نہیں۔

۵؎ میرے مقالہ میں ایک باب مولانا کی حیات سے متعلق بھی ہے اس لیے اس میں مولانا کی سیاسی زندگی کا ضمناً ذکر ہونا ضروری تھا۔ دوسرے مولانا کی شاعری، صحافت اور علمی زندگی تحریک خلافت، ہندوستان کی آزادی اور کانگریس سے اس طرح وابستہ ہے کہ ان کی علمی زندگی کو اس سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

۶؎ حکیم صاحب کی نظر کہیں چوکی ہے۔ ضمیمہ میں جو مواد شامل ہے اس میں کا بیشتر مواد مولانا پر شائع ہونے والے رسائل یا نمبروں میں نہیں۔ مثلاً مولانا کی طالب علمی کے زمانہ میں آکسفورڈ سے بھیجا ہوا اپنے بھائی کے نام "مختار نامہ" اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس سے اس وقت اور ماہ و سال کا اندازہ ہوتا ہے جن ایام میں مولانا آکسفورڈ میں طالب علم تھے یہ مختار نامہ ایک سوئیز میں بھی میں نے شائع کر دیا تھا۔ صرف دو فرمان تذکرۂ کاملانِ رامپور میں شائع ہوئے ہیں لیکن ان کے عکس نہیں میرے مقالہ میں عکس شامل ہیں اس لیے کہ سن کتب اور تذکرہ میں اختلافی سنہ ہے۔[۷] جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بہت سی باتیں علمی حلقہ کو معلوم تھیں علمی حلقہ کو تو ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اپنی معلومات کی بنیاد پر ہی کتب تحریر کرتے ہیں۔ کوئی بات اگر علمی حلقہ کو معلوم ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ اصول تحقیق میں یہ بات شامل ہے کہ اختلافی مسائل پر بحث کی جائے۔ اور تحقیق کے کچھ اصول ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ حکیم صاحب اصول تحقیق پر کچھ کتب پڑھنے کی زحمت فرمائیں گے۔[۸] بلقیس شبیہ کا تذکرہ اور ان کی کتاب کی نشاندہی اس لیے کی گئی ہے کہ راوی کا تعارف قاری کے سامنے آسکے تاکہ اس کی علمی حیثیت کا تعین ہو سکے۔ غیر علمی شخصیتوں کی روایت یا مستند راوی کی روایت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ میری تحقیق مکمل ہو چکی تھی شائع بعد میں ہوئی۔ اور مولانا کی حیات کے مختلف پہلوؤں پر مضامین بھی ۱۹۷۸ء کے قریب آ چکے تھے۔[۹] حکیم صاحب نے تجزیہ کا باب نہیں پڑھا اور ان کی تنقید اعداد و شمار تک محدود رہی اگر وہ اسے پڑھتے تو مولانا کی علمی حیثیت کا انھیں اندازہ ہو سکتا تھا۔

●●

حکیم محمد حسین خاں شفا
کیٹلاگر، رضا لائبریری، رامپور

ڈاکٹر مصطفےٰ حسین نظامی کا تھیسس

تاریخ روہیلکھنڈ ——— گلِ رحمت

ہندوستان کی تفہیم میں علاقائی تاریخ تہذیب ادب زبان اور اقوام کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ کچھ علاقے اور اقوام تو بے حد اہم ہیں جن میں روہیلے اور روہیلکھنڈ بھی شامل ہے اس بارے میں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ:

"مہابھارت کا پانچال، عہد سلطنت کا کٹھیر، دورِ مغلیہ کا روہیلکھنڈ تاریخی سیاسی جغرافیائی اور معاشی اہمیت کا وہ علاقہ ہے جس کے بغور مطالعے کے بغیر ہندوستان کی تاریخ کو نہیں سمجھا جاسکتا" بالخصوص آخری دورِ مغلیہ میں روہیلکھنڈ کا علاقہ ہندوستانی سیاست کے اہم ترین مرکزوں میں تھا۔ آزادی کے بعد اس علاقے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے یہاں روہیلکھنڈ یونیورسٹی کا قیام ہوا۔ اور اس یونیورسٹی نے اپنے علاقے پر خصوصی توجہ دی۔ اور ایک پیپر اپنے نصاب میں تاریخ روہیلکھنڈ کا شامل کیا۔ کچھ اسکالرس کو خصوصی تحقیق اور ریسرچ کا کام سپرد کیا گیا جس کے تحت کچھ لوگوں نے پی۔ایچ۔ڈی کرلی اور کچھ کررہے ہیں۔ چنانچہ حافظ رحمت خاں سے متعلق گل رحمت فارسی مخطوطے کے تقابلی جائزے کا کام بریلی کے ایک استاذ خاندان نیازی کے چشم و چراغ جناب ڈاکٹر مصطفےٰ حسین نظامی کے سپرد کیا گیا تھا جس پر انھوں نے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر نظامی کا یہ مقالہ ۱۹۸۶ء میں ۳۰۴ صفحات پر فخر الدین علی احمد کمیٹی کے تعاون سے شائع ہوا ہے اس کی ابتدا میں سید الطاف علی بریلوی مولف حیات حافظ رحمت خاں کا ایک توصیفی مکتوب ہے اس کے بعد خلیق احمد نظامی صاحب کا دیباچہ پھر مولف کتاب ڈاکٹر مصطفےٰ حسین صاحب کا تمہید کے عنوان سے پیش لفظ اس کے بعد گل رحمت کا اردو ترجمہ اور حواشی۔ ——— روہیلکھنڈ کی تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے کہ گل رحمت ایک متنازعہ کتاب ہے جس کو انگریزوں نے ایک مقصد اور گہری سازش کے تحت مرتب کرایا تھا خیال تھا کہ ڈاکٹر مصطفےٰ حسین صاحب اور ان کے گائڈ اس پر کچھ حقیقت پسندانہ روشنی ڈالیں گے مگر مقالہ کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی اس میں کوئی اختلافی نوٹ نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اسکالر نے اپنی تائید میں ان کتابوں کو پیش کیا ہے جو گل رحمت کے

بعد لکھی گئی ہیں اور اسی سے یا اس کے ترجمہ سے ماخوذ ہیں۔ ڈاکٹر نظامی تمہید میں تحریر فرماتے ہیں "۔ روہیلکھنڈ پر کوئی مستند کتاب نہیں ہے جو داخل نصاب ہو۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے میں نے پچاسوں کتابوں کا مطالعہ کیا کتب خانوں کے چکر لگائے۔ بالآخر رضا لائبریری رامپور میں دو غیر مطبوعہ کتابیں دستیاب ہوئیں ایک گلستانِ رحمت اور دوسری گل رحمت! چونکہ گلِ رحمت میں مکمل طور پر غیر جانبدار روہیلہ تاریخ موجود ہے اور اس میں حسن زبان و بیان کے ساتھ واقعات کی صداقت پر زور رہے مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا ہے اس لیے میں نے مختلف مورخین کی ۱۵۰ اعلیٰ معیاری ہندی انگریزی فارسی کتابوں سے اس کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ اب یہ مقالہ تاریخ روہیلکھنڈ کی ایک مستند کتاب ثابت ہو سکتا ہے جو نصابی ضرورت کو پورا کرے"۔ نظامی صاحب نے اس کا نام بھی تاریخ روہیلکھنڈ رکھا ہے جو غور طلب ہے۔ روہیلوں خاص طور پر داؤد خاں و علی محمد خاں نے اپنے عہدِ عروج میں مغلوں سیدوں مرہٹوں اور انگریزوں سے لوہا لیا تھا۔ کچھ ہی عرصہ میں علی محمد خاں نے اپنے مقبوضات کو ہندوستان کی معیاری و فلاحی مملکت بنا دیا تھا جس کے اپنے پرائے بھی مداح تھے۔ لیکن ان کی سرعت رفتار ترقی سے اس عہد کی سب ہندوستان کی ابھرتی ہوئی قوتیں خائف تھیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب اور اس عہد کے دیگر ترقی یافتہ دانشور روہیلوں کو مغلیہ حکومت کا نعم البدل تسلیم کرنے لگے تھے۔ ۱۷۴۹ء میں علی محمد خاں کا انتقال ہوا۔ انھوں نے اپنا جانشین اپنے زیر سایہ حافظ رحمت خاں کو مقرر کیا۔ انھوں نے اپنی سادہ لوحی اور غیر سیاسی مزاج کی بنا پر روہیلہ حکومت کی مرکزیت کو ختم کر دیا۔ تنخواہ کی تقسیم کے چکر سے بچنے کیلیے سارے ملک کو روہیلہ سرداروں میں تقسیم کر دیا جس کی بنا پر سب سردار آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ اور تقسیم در تقسیم کا عمل شروع ہو گیا۔ بغض و عناد سازش و انتشار کا دور شروع ہو گیا۔ جس کی بنا پر علی محمد خاں کا سلطنت مغلیہ کا جانشینی کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ روہیلوں کی اس آپس کی تفریق سے فائدہ اٹھا کر دیرینہ دشمنوں اور خاص طور پر انگریزوں نے وہ تباہی مچائی جو تاریخ عالم میں خونی عنوان سے لکھی ہوئی ہے انگریزوں کے اس ظلم و زیادتی کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق لکھتے ہیں کہ انگریز ہر ایسے طبقے اور گروہ کو تباہ و برباد کرنے پر تلا ہوا تھا جس میں آزادی و خود مختاری کی ذرا سی بھی خواہش موجود تھی۔ اس سلسلے میں روہیلکھنڈ کے ساٹھ لاکھ بہادر اور غیور روہیلے انگریزوں کی آنکھوں میں کھٹک رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس بہادر قوم پر حملہ کر کے ان کی بستیاں جلا دیں بچے ذبح کر دیے ———— اپنی قوم کے اس ظلم کے خلاف خود لارڈ میکالے اور دوسرے انگریزوں نے آواز بلند کی اور احتجاج کیا۔ انگریزوں نے اپنے چہرے سے اس بدنما داغ کو مٹانے کے لیے بڑی ذہانت سے قلم اور دولت کا سہارا لیا۔ اور خود روہیلوں ہی سے کچھ ایسی کتابیں تصنیف کرائیں جس میں انگریزوں کو بے گناہ

اور رہیلوں کو بے وفا وحشی اور غیر مہذب قرار دیا گیا۔ اور انگریزوں کے مظالم کے لیے وجہ جواز پیدا کی گئی۔ چونکہ حافظ
رحمت خاں کی شہادت کے بعد ان کی اولاد کو ایک لاکھ روپے کی سالانہ پنشن جائداد اور جاگیر اور اعلیٰ عہدے عنایت
کئے گئے اس بنا پر ان لوگوں نے وہ سب کچھ کیا جو انگریز چاہتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے کچھ مصنفین کو ان لوگوں نے روہیلوں
کے خلاف مواد فراہم کیا جس کو انھوں نے اپنی کتابوں میں شامل کیا۔ اور خاص طور پر دو کتابیں خود لکھیں۔ جس کا اعتراف
کرتے ہوئے حیات حافظ رحمت خاں کے مولف سید الطاف علی بریلوی تحریر کرتے ہیں:

"نواب مستجاب خاں بن حافظ رحمت خاں متوفی ۱۸۳۲ نے حافظ رحمت خاں کے حالات میں ایک
کتاب گلستان رحمت لکھی۔ نواب سعادت یار خاں نے مسٹر ایلیٹ کی فرمائش پر اس کی تلخیص ۱۸۳۳ء میں تیار
کی۔ پھر مسٹر ایلیٹ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ جو حیات حافظ رحمت خاں لکھتے وقت میرے پیش نظر تھا۔"

اصل کتاب تو مخطوطہ ہی رہی لیکن اس ترجمہ کی خوب اشاعت ہو گئی۔ انگریزوں نے ان کتابوں کو کیوں لکھوایا؟ اس پر
کچھ زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں یہ بات ان کتابوں کے اندراجات پر ایک نظر ڈال کر ہی سمجھ میں آجاتی ہے۔ مگر افسوس
جائزہ نگار ڈاکٹر مصطفیٰ حسین نظامی صاحب اور ان کے اساتذہ کی اس حقیقت پر نظر نہیں گئی جن کی طرف وہ کوئی
ادنیٰ اشارہ کرتے یا کوئی نوٹ لکھتے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ حسین نے اپنے اس مقالے کا نام تاریخ روہیلکھنڈ رکھا ہے اور
اس کو مکمل تاریخ قرار دیا ہے۔ جبکہ مولف گل رحمت تحریر فرماتے ہیں:

"بندۂ خاکسار محمد سعادت یار نے ۱۸۳۳ء/۱۲۴۹ھ میں اپنے جد بزرگ حافظ رحمت خاں کے حالات
میں محمد مستجاب خاں مرحوم کی کتاب گلستانِ رحمت سے یہ تالیف گل رحمت منتخب کی ہے۔"

ایک ایسی کتاب جس کا مولف خود اسے حافظ رحمت خاں اور ان کی اولاد کا تذکرہ قرار دے
اور جائزہ نگار اس کا نام تاریخ رکھیں۔ کچھ زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا عصری رجحانات کو دیکھتے ہوئے
کسی نجیبی سپہ سالار اور اس کی اولاد کے تذکرے کو اس علاقے کی مکمل تاریخ قرار دیدینا بڑی جرأت کی بات ہے۔
گل رحمت قدیم داستانوی طرز پر خاندان حافظ رحمت خاں کے تعارف ان کے مربی و محسن داؤد خاں و علی محمد خاں
کی توہین و تذلیل اور انگریزوں کی توصیف و تحسین پر مشتمل ہے۔ اس میں انگریزی مظالم کو بالکل نظر انداز کر کے سارے
الزامات اپنی ہی قوم پر ڈال دیے گئے ہیں۔ چونکہ اصل کتاب داستانوی طرز پر لکھی گئی ہے۔ غالباً اس کا اتباع کرتے
ہوئے ڈاکٹر نظامی صاحب نے تمہید و حواشی میں بھی انداز اختیار کیا ہے۔ وہ گل رحمت کی دربار رحمت میں مقبولیت
سے متعلق صفحہ ۱۱ پر حیات حافظ رحمت خاں کے حوالے سے ایک بنگالی کا خواب نقل کرتے ہیں کہ حافظ رحمت خاں

نے اس بنگالی کے ہاتھوں اپنی شہادت کے کافی عرصہ بعد گلاب کا ایک پھول بھیجا جبکہ حیات حافظ رحمت خاں میں یہ واقعہ اس سیاق و سباق میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر نظامی صاحب صفحہ ۹ پر تحریر کرتے ہیں روہیلکھنڈ کی تاریخ کے سب سے زیادہ درخشاں ستارہ حافظ رحمت خاں تھے جنھوں نے ۱۷۰۱ء سے ۱۷۷۴ء تک مختلف جنگوں میں اپنے جوش و ہوش کے کمالات دکھا کر خود کو بے مثل حاکم سپہ سالار غازی سیاست داں اور بہترین انسان ثابت کیا۔ اور اخیر میں ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو شہید وطن شہید قوم اور شہید انسانیت ہونا بھی ثابت کر دیا۔

اس ایک پیراگراف میں جو تاریخی تسامحات ہیں اس سے پوری کتاب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ روہیلہ حکومت کا قیام اور استحکام داؤد خاں و علی محمد خاں کے ہاتھوں ہوا اس بنا پر حافظ رحمت خاں کو سب سے درخشاں ستارہ کہنا غور طلب ہے۔ حافظ رحمت خاں کے خود بیانات اور معاصر تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش ۱۷۰۸ء یا ۱۷۱۰ء کے لگ بھگ قندہار میں ہوئی۔ اور سن بلوغ تک وطن ہی میں رہے۔ اس کے باوجود ۱۷۰۱ء میں روہیلکھنڈ کی جنگوں میں جوش و ہوش کا مظاہرہ کرنا پیدائش سے پہلے یا پیدائش کے فوری بعد، جوش میں تو لکھا جا سکتا ہے ہوش میں نہیں۔ تاریخ کو کشف و کرامات سے الگ ہی رکھنا مناسب ہے۔ حافظ رحمت خاں کی روہیلکھنڈ میں آمد سے متعلق روایت بھی عجیب و غریب ہے۔ بقول نجم الغنی خاں حافظ رحمت خاں نے شروع میں دہلی اور لاہور کے درمیان خوردہ فروشی کی۔ کچھ عرصہ صفدر جنگ کے ملازم رہے۔ خود حافظ رحمت خاں اپنے بیانات کے مطابق کچھ دنوں گھوڑوں کی تجارت بھی کرتے رہے۔ حافظ رحمت خاں کا یہ بھی بیان ہے کہ جب میرے والد اور چچوں نے ہندوستان میں سکونت اختیار کر لی تو کچھ مدت بعد میں بھی ہندوستان آ گیا۔ علی محمد خاں کے لشکر میں حافظ رحمت خاں کا نام نمایاں طور پر ۱۵ اپریل ۱۷۴۱ء کو راجہ ہرنند کے ساتھ جنگ میں آتا ہے۔ ان شواہد کی موجودگی میں ڈاکٹر نظامی صاحب تحریر فرماتے ہیں: "۱۷۲۰ء میں داؤد خاں کے مارے جانے پر علی محمد خاں اس کا وارث مقرر ہوا۔ علی محمد خاں نے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اور بادشاہ دہلی سے اس علاقے کی سند اور نواب کا خطاب حاصل کیا۔ لیکن افغان سردار جو اس کے ملازم تھے اس کا حسب حیثیت احترام نہیں کرتے تھے۔ وہ افغانوں کی بغاوت سے ڈرتا تھا۔ اس لیے اس نے شاہ عالم خاں کے فرزند حافظ رحمت خاں کو بلا کر اپنی حکومت کے معاملات کا مشیر خاص بنایا اور ان کی شجاعت و ذہانت کے توسل سے روہیلکھنڈ کے دوسرے علاقوں کو بھی فتح کر کے اپنی ریاست میں شامل کیا۔ اس طرح علی محمد خاں کے زیر نگیں علاقے کا نام روہیلکھنڈ پڑ گیا۔" علی محمد خاں حافظ رحمت خاں سے عمر میں بڑے تھے۔ روہیلوں نے ان کی صلاحیت کی بنا پر خود انھیں سردار مانا تھا۔ علی محمد خاں کی کوششوں اور صلاحیت کی بنا پر روہیلوں کو اس علاقے میں عروج حاصل ہوا۔ اور ۱۷۴۷ء میں

حافظ رحمت خاں کی آمد سے بہت پہلے انھوں نے دربار دہلی سے روہیلکھنڈ کی باقاعدہ سند، خلعت اور سکّہ کی منظوری بھی حاصل کر لی تھی۔ علی محمد خاں کے فرامین جس پر ۲۷ء کی مہر ہے آج بھی موجود ہیں۔ جبکہ حافظ رحمت خاں کا نام ۴۰ء کے لگ بھگ آتا ہے۔ ان حالات میں نظامی صاحب کا یہ کہنا کہ علی محمد خاں نے حافظ رحمت خاں کو روہیلوں کی بغاوت کے ڈر سے بلایا کس قدر بعید از عقل ہے جس طرح روہیلکھنڈ میں علی محمد خاں کی حکومت کا شہرہ سن کر دوسرے افغان آ رہے تھے اس طرح حافظ رحمت خاں بھی آ گئے۔ یہاں انکی حیثیت سے کہیں زیادہ اعزاز و افتخار ملا۔ چونکہ داؤد خاں اور علی محمد خاں کا سارا وقت تاریخ بنانے میں صرف ہو گیا انھیں تاریخ لکھنے یا لکھوانے کا موقع نہیں ملا۔ ادھر روہیلوں میں دوسری اقوام کے مقابلے میں لکھنے پڑھنے کا رواج بھی کم تھا۔ حافظ رحمت خاں روہیلکھنڈ کی تقسیم اور اپنی جاگیر پر قانع ہو گئے انھوں نے ہتھیار کھول دیے اور کچھ علمی کاموں پر توجہ دی۔ تواریخ حافظ رحمت خانی اور خلاصۃ الانساب ان کی یادگار ہیں۔ حافظ رحمت خاں نے ہمیشہ دیگر روہیلہ سرداروں کا بھی احترام کیا اور علی محمد خاں کو اپنا مربی و محسن سمجھا۔ اپنے لڑکے عنایت خاں کی شادی علی محمد خاں کی لڑکی سے کی۔ لیکن کچھ حالات ایسے پیدا ہوئے کہ ان کا کنٹرول روہیلکھنڈ کے ساتھ ساتھ اپنے گھر پر بھی نہ رہا۔ لڑکے باغی ہو گئے۔ عنایت خاں سے حافظ رحمت خاں کی باقاعدہ جنگ ہوئی۔ یہ بھی روایات ہیں کہ انگریزوں اور شجاع الدولہ کے درمیان حافظ رحمت خاں کی جنگ میں کچھ لڑکے دشمنوں سے ملے ہوئے تھے۔ اس جنگ میں حافظ رحمت خاں کے بارہ لڑکے شریک تھے جو سب عاقل بالغ تھے۔ باپ شہید ہو گئے۔ اور کسی لڑکے کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ جب اس جنگ میں شکست کے بعد نواب فیض اللہ خاں نے چھاپا مار جنگ شروع کی تو اس جنگ میں رحمت خاں کا کوئی بھی لڑکا شریک نہ ہوا۔ جیسے ہی انگریزوں نے ایک لاکھ روپیے کی سالانہ پنشن جائداد اور دیگر مراعات کا اعلان کیا۔ ان لوگوں نے فوری ایسی کتابیں لکھنا اور لکھوانا شروع کر دیں جن میں باپ کے مربی و محسن داؤد خاں کو غلام اور علی محمد خاں کو مجہول النسب قرار دے کر دیگر روہیلہ سرداروں کو ناشائستہ الفاظ سے یاد کیا گیا۔ اس کے برعکس انگریزوں کی تحسین و توصیف کی گئی۔ گل رحمت میں یہی سب چیزیں ہیں جنھیں ڈاکٹر نظامی صاحب نے بغیر کسی تنقید و تبصرہ کے قبول کر لیا ہے گل رحمت کی ابتدا ایک فرضی شجرے سے ہوتی ہے جس میں ستر پشتوں سے اوپر جا کر حافظ رحمت خاں کا شجرہ حضرت آدمؑ سے مل جاتا ہے۔ اس شجرے کے تاریخی اسقام اور روایات کے اظہار کرنے کے بجائے ڈاکٹر نظامی نے توصیفی حواشی لکھے ہیں۔ روہیلوں کا اصل شجرہ چند پشتوں کے بعد شمس سے مل جاتا ہے۔ حافظ رحمت خاں کے اس شجرے کے بعد روہیلوں میں اپنا اپنا نسب نامہ بنانے یا بنوانے کی دوڑ شروع ہو گئی اور ایک ہی قوم و قبیلے کے افراد نے اپنے اپنے اجداد کو الگ الگ کر لیا چنانچہ علی محمد خاں کی اولاد نے اپنا نسب نامہ

حضرت علی کے توسط سے داخل سادات کرلیا۔ ان تاریخی حقائق کی طرف نظامی صاحب نے کہیں بھی اشارہ نہیں کیا شجرے کے بعد حافظ رحمت خاں کے خاندانی حالات شروع ہوتے ہیں جن کا عقل اور نقل سے بہت کم تعلق ہے۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ حافظ رحمت خاں کے والد شاہ عالم خاں اور روہیلہ حکومت کے بانی داؤد خاں دونوں کا تعلق ایک ہی قبیلہ بڑیچ سے تھا۔ شاہ عالم خاں ایک افغان مہاجن تھے جو مختلف افغان تجار کو سرمایہ فراہم کرتے تھے ان سے کچھ رقم لے کر داؤد خاں اور ان کے ساتھی کاروبار کے لیے کٹھیر آئے۔ اور یہاں حالات سازگار دیکھ کر رہ پڑے۔ شاہ عالم خاں ان لوگوں سے اپنا قرض وصول کرنے کٹھیر آئے اور لامعلوم لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ کسی مستند ماخذ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے قتل سے داؤد خاں کا بھی تعلق تھا۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ گلستان رحمت اور گل رحمت میں اس قتل کی ذمہ داری داؤد خاں پر ڈالی گئی اور بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے ڈاکٹر نظامی صاحب نے اس کو قبول کرلیا جس کا اظہار ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے: "داؤد خاں نے چار آدمیوں کو شاہ عالم کے قتل کے لیے آمادہ کیا۔ اور انھوں نے موقع پاکر (۹ ذی الحجہ ۱۱۴۲ھ) کی شب میں ان کی خوابگاہ پر شب خون مارا۔ اور شاہ عالم خاں کو قتل کرکے ان کا سر لے کر فرار ہوگئے۔ شاہ عالم خاں ایک اللہ والے آدمی تھے بغیر سر کے قاتلوں کے پیچھے دوڑے لیکن کچھ دور پر گھوڑے کی رسیوں سے الجھ کر گر پڑے وہیں ان کا مزار ہے" شاہ عالم کی شہادت کے وقت حافظ رحمت خاں تقریباً چار سال کے تھے۔ اس روایت کو صاحب گل رحمت نے ایک کوڑھی کے حوالے سے تحریر کیا ہے جس کو وہ شاہ عالم خاں کے قاتلوں میں شمار کرتے ہیں تعجب ہے ڈاکٹر نظامی نے اس قسم کے فوق الفطرت واقعات اور غیر معقول روایات کو بغیر کسی تردید و تصحیح کے قبول کرلیا ہے۔ کتاب کے ہر باب میں اس قسم کے واقعات کی بھرمار ہے۔ واقعہ شہادت کے ذیل میں صفحہ ۲۴۴ پر لکھتے ہیں: "حافظ الملک نے پیلی بھیت کی محافظت کے سبب میدان میں ڈیرہ لگالیا اس مقام پر ایک اجنبی فقیر نے حافظ الملک کے دروازے پر پہنچ کر دریافت کیا اور کہا ملک کٹھیر کی ریاست کی بشارت ہم نے تمہیں دی تھی اور وہ ظہور میں آئی اب فتح یا شہادت میں سے ایک کو اختیار کرو تاکہ اس کے لیے خدا سے سفارش کروں حافظ الملک نے اس فقیر سے پوچھا۔ اگر فتح چاہوں تو کیا اس کے بعد مجھے شہادت نصیب ہوگی؟ فقیر نے کہا نہیں، حافظ الملک نے کہا میں نے شہادت کو اختیار کیا" ڈاکٹر نظامی نے صفحہ ۲۴۶ پر شہادت کا منظر اس طرح بیان کیا ہے: "حافظ الملک میدان جنگ میں آگے آگے گھوڑے پر سوار تھے تمام ساتھی آپ کی معیت میں تھے۔ اب توپ کے گولے گھوڑے کے آس پاس گرنے لگے۔ اور ایک ایک ہمرکاب خاک پر گر پڑا۔ اس وقت حافظ الملک نے ایک شخص کو اذان دینے کا حکم دیا۔ اور تمام توجہ مالک حقیقی کی طرف لگا کر اپنی شہادت کے منتظر ہوئے کہ اچانک توپ کا گولہ حافظ الملک کے سینہ پر لگا۔ بائیں ہاتھ کی طرف قلب پر ضرب پہنچی ایسی آواز ہوئی گویا پہاڑ گر پڑا۔ گولہ سینے سے ٹکرا کر تین چار گز کے فاصلہ سے زمین پر گر پڑا۔

سوائے صدمہ پہنچانے کے جسم پر اور کچھ کارگر نہ ہوا۔ نہ سینہ پھٹا نہ ہڈی ٹوٹی نہ جلد جلی۔ نہ جسم گھوڑے سے نیچے گرا۔ فقط روح قالب سے آزاد ہوگئی۔ اس صدمۂ ناگہانی سے لگام ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ گھوڑا اعنان کی کی کے سبب سرتابی کر کے حریف کے مقابلے کو روانہ ہوا۔ حافظ الملک باوجود کہ جسم میں روح نہ تھی اس طرح گھوڑے پر قائم رہے اور گھوڑے کی لغزش جانی کر ہاتھ سر پر رکھ دیے۔ یہ حال دیکھ کر ساتھیوں نے دوڑ کر گھوڑے کی لگام پکڑی اور راس عدم کے سوار کو ہاتھوں ہاتھ زین سے زمین پر اتارا۔ یہ دیکھ کر شجاع الدولہ کی فوج نے جرأت کا قدم آگے بڑھایا۔ سلطان خاں بڑیچ نے بے جان جسم سے سر کاٹ لیا۔ کئی دن کے بعد تدفین عمل میں آئی۔ لوگوں نے دیکھا کہ گردن سے خون بہنا بند نہیں تھا (صفحہ ۲۴۹) حافظ رحمت خاں کے ساتھ جنگ میں حضرت حافظ شاہ جمال اللہ صاحب بھی شریک تھے۔ حافظ جمال اللہ صاحب کی سوانح مجمع الکرامات میں امام الدین خاں متوفی ۱۲۵۹ھ نے اس واقعہ کو اپنے طریقے سے نقل کیا ہے۔ ان واقعات کے باوجود ڈاکٹر نظامی صاحب کا دعویٰ ہے کہ میں نے ۱۷۰۷ء سے ۱۷۷۵ء تک روہیلوں کے گرد گھومتی ہوئی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے اور ہر واقعہ کی بھرپور تحقیق کی ہے۔ اس مقالے کا سب سے تاریک پہلو ماخذ و مراجع کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان کے نام مصنف اور صفحات غلط ہیں۔ دعویٰ ہے کہ فارسی ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جب کہ املا کی ایسی غلطیاں موجود ہیں جو عربی یا فارسی سے ترجمہ کرتے وقت ممکن نہیں تھیں مثلاً قیس ہی سے سیر کو سیار اور تفضیح کو تہذیب وغیرہ۔ چند ماخذ ملاحظہ ہوں۔ جگہ جگہ تاریخ آنند رام مخلص کا حوالہ دیا ہے چنانچہ صفحہ ۵۱ اور صفحہ ۴۴ پر مذکور ہے۔ اس بیان کی تصدیق کیلیے ملاحظہ کیجیے تذکرہ آنند رام مخلص صفحہ ۲۳۵ صفحہ ۲۳۴ اور صفحہ ۲۳۶ وغیرہ۔ مخلص کی تصانیف میں اس نام کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ روہیلکھنڈ سے متعلق ان کا ایک سفرنامہ ہے۔ جو رضا لائبریری سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے مخطوطے کے ۲۲ صفحات ہیں اور مطبوعہ کے ۴۴۔ نظامی صاحب نے خدا معلوم یہ حوالہ کہاں سے دیا ہے؟ وہ ایک اور کتاب حدیقۃ الاقالیم مصنف لاعلم تحریر کرتے ہیں۔ جب کہ یہ کتاب حافظ رحمت خاں و علی محمد خاں کے ہم عصر مرتضیٰ حسین اللہ یار عثمانی بلگرامی کی اہم تصنیف ہے۔ ۱۸۷۵ء میں نولکشور سے ۶۹۷ صفحات پر شائع ہو چکی ہے۔ اس کا مصنف بن گڑھ کی لڑائی میں خود شریک تھا اور اس نے علی محمد خاں کا آنکھوں دیکھا حال اور حلیہ تحریر کیا ہے۔ نظامی صاحب نے اس کے صفحات و حوالہ غلط دیا ہے اور ایک جگہ اسے میر عالم کی تصنیف بھی تحریر کر دیا ہے۔ اسی طرح مشہور کتاب جسے ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا ہے تفضیح الغافلین اس کا نام نظامی صاحب نے تہذیب الغافلین تحریر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظامی صاحب نے اپنے اس مقالے میں بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ اگر وہ مزید اوریجنل ماخذ سے استفادہ کر لیتے مہابھارت اور تاریخ میں فرق کرتے تو مناسب تھا۔ بہر حال جس کتاب کو فارسی سے انگریزی میں ترجمہ ہوئے برسوں ہو چکے تو وہ پہلی مرتبہ نظامی صاحب کے ہاتھوں اردو میں منتقل ہو گئی یہ ایک اہم خدمت ہوئی۔

ڈاکٹر ذکیہ جیلانی
مرل منزل کیمپس
سول لائنز - علی گڑھ

ڈاکٹر محمد زماں آزردہ کا تھیسس

مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے

مرزا محمد زماں آزردہ کے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا موضوع "مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے" ہے جو ڈاکٹر شکیل الرحمن صاحب کی نگرانی میں لکھا گیا اور ۱۹۷۸ء میں کشمیر یونیورسٹی نے اسے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے لیے منظور کیا۔ یہ مقالہ پہلی بار ۱۹۸۱ء میں ایک ہزار کی تعداد میں طبع ہوا۔ مقالے کی تیاری میں ڈاکٹر آزردہ نے جن کتابوں سے استفادہ کیا ان کی مجموعی تعداد ۱۲۸ ہے۔ ان میں پندرہ قلمی نسخے بھی شامل ہیں رسائل و اخبارات اس کے علاوہ ہیں۔ کتاب ۵۷۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ابواب کی تعداد سات ہے۔

کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۵ء میں کچھ ترمیم و اضافہ کے ساتھ شایع ہوا جن میں انھوں نے مجلس ماتم کی تفصیلات اور ایک نئے باب "مرزا دبیر اور میر انیس - ایک تقابلی مطالعہ" کا اضافہ کیا ہے۔ اس ایڈیشن کے باب اوّل میں مرزا دبیر کے دور اور ان کے سلسلۂ نسب سے وفات تک کے حالات تفصیل سے درج ہیں، اس کے علاوہ ان کے عادات، اطوار، احباب، علمی استعداد، سفر، اولاد اور ان مجلسوں کی تفصیل جن میں وہ مرثیہ پڑھتے تھے بھی ملتی ہے۔ باب دوم و سوم ان کے شعری کارناموں پر مشتمل ہیں۔ اس میں

ان تمام اصناف کی جن میں دبیر نے طبع آزمائی کی تفصیل ملتی ہے۔ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے نمونے اور نشاندہی سے یہ باب خاص اہمیت کا حامل ہے۔ باب چہارم میں مرزا دبیر کے مرثیوں میں ادبی محاسن کی نشاندہی ملتی ہے اس کے بعد کے چار ابواب مراثی کی تفصیل غیر مطبوعہ مرثیہ، نثری تصانیف اور ان کی ادبی حیثیت، مرزا دبیر و انیس کا تقابلی مطالعہ اور مرزا دبیر کا ادبی مرتبہ پر مشتمل ہیں۔

اس ایڈیشن کے بارے میں ڈاکٹر آزردہ نے لکھا ہے کہ:

"۱۹۸۱ میں شائع ہوتے ہی اہل علم حضرات نے عموماً اور اردو مرثیہ سے دلچسپی رکھنے والوں نے مخصوصاً اس کتاب کی طرف توجہ فرمائی اور راقم السطور کی حوصلہ افزائی کر کے علم کی ترویج کے متمنی ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ چنانچہ یہ کتاب بیشتر یونیورسٹیوں کے نصاب میں حوالے کی کتاب Reference Book کے طور پر شامل کی گئی"۔

ڈاکٹر آزردہ کے اس بیان اور کتاب کے آخر میں شامل اٹھارہ اہل علم حضرات کے تبصروں نے کتاب کی افادیت اور قدر و قیمت متعین کرنے میں بہت مدد کی۔ مگر حیات دبیر جو افضل حسین ثابت کی تصنیف ہے جو ۱۹۱۳ء میں طبع ہوئی ہے، کے مطالعہ کے بعد چند ایسے پہلو سامنے آئے جو توجہ طلب ہیں۔

باب اول میں ڈاکٹر آزردہ نے مرزا دبیر کے سلسلۂ نسب سے وفات تک کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان کا شجرہ جو حیات دبیر میں مرزا محمد ذاکر تک ہی دیا گیا تھا اس کو مرزا گوہر آغا ادیب اور مرزا محمد آغا تک مکمل کر دیا۔ لیکن شجرہ کے علاوہ کتاب میں شاہ عالم بادشاہ کے دو فرمان اور ایک دستاویز بعنوان استشہاد جن سے مرزا دبیر کے اجداد کا عالی نسب اور عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز ہونا ثابت ہوتا ہے کے عکس بھی شامل ہیں، سوان عکسوں میں مہروں، عبارت کے متن، طرز تحریر اور دوسرے نشانات کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ فرمانوں کے عکس حیات دبیر سے لیے گئے ہیں۔ حیات دبیر میں فرمان کی پیشانی پر جو عبارت درج ہے وہ اس طرح ہے:

"نقل فرمان شہنشاہی متذکرہ حیات دبیر صفحہ ۶"۔

ڈاکٹر آزردہ کی کتاب میں شامل عکس میں اوپر کی عبارت کے "نقل فرمان شہنشاہی" کے الفاظ موجود ہیں مگر اس کے بعد کے الفاظ "متذکرہ حیات دبیر صفحہ ۶" کی جگہ ایک نشان بنا دیا گیا ہے جس کی کوئی اور وجہ اور ضرورت مطلق سمجھ میں نہیں آتی سوائے اس کے کہ عبارت کا آخری حصہ ڈاکٹر آزردہ کے لیے ضرر رساں تھا کیونکہ انھوں نے عکس کے واقعی ماخذ یعنی حیات دبیر کا حوالہ نہیں دیا۔ ایسی صورت میں یہ عبارت ان کے اصل ماخذ کو سامنے لے آتی جو وہ نہیں چاہتے تھے۔ دونوں کتابوں سے فرمان کے عکسوں کی نقل پیش ہے تاکہ مقابلہ کیا جاسکے۔

نقل فرمان شاہی
فرمان
۱۱۷۳
شاہ عالم بادشاہ غازی
ابو المظفر جلال الدین

نقل فرمان شہنشاہی مندرجہ تذکرہ حیات دبیر صفحہ ۶

چوں بعرض مقدس و معلیٰ رسید کہ فضیلت و شریعت مآب تقویٰ و صلاح دستگاہ علام محمد ابن ملا محمد رفیع ولد ملا محمد ہاشم شیرازی مناسب جلیلہ سرکار را خیال مآل اُخرے رضینہ برضائے جناب باری عز اسمہ و ما بدولت و اقبال بانتہائے تدین کمال رسانیدہ بکراہ فانی از ترک مناسب متعلقہ و تعلقات حادث از مزید شوق طاعت واجب الوجود اعتکاف ساختہ۔ لہذا الصواب دید قدامت عنایت اللہ تعالیٰ ابن ابوظفر خاں ناظم صوبہ کشمیر جد مادری حزالیہ و شہامت علی خاں خاں استاد شاہزادہ ہائے ہمایوں و ملا محمد ہاشم مرحوم جد پدری شان کہ منشی سرکار ابد قرار بودہ و ہم باثبات حقوق خدمت گذاری ہائے شان برضاجوئی خلاق عالم و کسب ثواب اُخرے کہ خاصہ سلاطین و فرمان روایان پیشین بودہ است
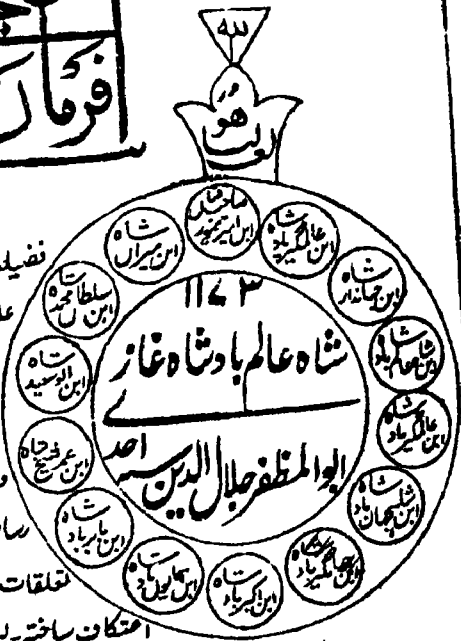
بنظر مراتب صدر چہار لک و ہشتاد و ہشت ہزار یک صد و بیست دام بتعداد چہار ہزار و سہ صد و
سی و یک روپیہ از پرگنہ حویلی دار الخلافت شاہجہان آباد در وجہ مدد معاش متعلقان مشارٌالیہ با فرزندان
بطریق التمغا از نصف خریف پارس ئیل حسب الضمن مقرر باشد۔ باید کہ فرزندان کامگار والا تبار و امرای
عالیمقدار و متصدیان مہمات و جاگیرداران و کروڑیان حال و استقبال وجہ مذکور را نسلاً بعد نسل و بطناً
بعد بطن بتصرف فرزندان و متعلقان مشارٌالیہ بازگذارند و از جمیع وجوہ عوارض مرفوع القلم شمارند
درین باب ہر سال مجدد نہ طلبند۔

سیوم شہر رجب المرجب سنہ ۱۱۷۵ ہجری مطابق سنہ ۳ جلوس والا تحریر یافت۔

۱۱۷۴
شاہ عالم بادشاہ غازی
کمترین بندگان ۳
منیر الامرا

۱۱۶۷ عالمگیر
فدوی بادشاہ غازی
[illegible]
جلال الدین حیدر خاں

برسالہ شرافت و نجابت مرتبت امارت
و ایالت منزلت فرازندہ لوای
شوکت و حشمت طرازندہ بساط
ابہت و عظمت اعتضاد دولت
و فرمانروای اعتماد سلطنت دستور کشای
معرکہ آرای جہانبانی نیر آسمان [illegible]
کامرانی جوہر مرآت تنسیق و فا و روح
شمع یکرنگی و صفا ہمدم دلکشای مجلس
خاص محرم خلوت سرای صدق و اخلاص
کارفرمای سیف و القلم مدار امور عالم زبدۂ فدویان
خواص بلند مکان عمدۂ امرای عظیم الشان دربر
ثاقب مدبر ممالک مدار منیر روشن ضمیر
عالیمقدار لازم الاختصاص والاعزاز واجب الاحترام
والاعتبار رکن السلطنت بادشاہ
سلیمان اقتدار وزیر الممالک جملۃ الملک
مدار المہام اعتماد الدولہ آصف جاہ
برہان الملک ابو المنصور خان صفدر جنگ
شجاع الدولہ جلال الدین حیدر خاں بہادر بہادر جنگ سپہ سالار رستم ہند۔

مطابق جلوس والا
سنہ ۱۱۷۵
شہر [illegible] الحرام

۳ جلوس والا
التاریخ
۲۱ رجب المرجب

نقل فرمان شہنشاه دہلی مذکور حیات دبیر صفحہ ۶

۱۱۷۳
شاه عالم بادشاه غازی
ابو المظفر جلال الدین احمد

درین وقت میمنت اقتران از وقائع مولود
فرزند ملا غلام محمد نواده ملا ہاشم شیرازی بنام نهاد
بمسمی غلام حسین بسمع ہمایوں رسیده حکم جہان مطاع
عالم مطیع بنام خازن خزانہ عامرہ سلطانی
بارشاد ماموری یکصد روپیہ سکہ کمپنی بابتہ مصارف
مرضعہ وغیرہم شرف صدور یافت موده حاسبان
دفتر دیوانی سرکار معلے سوائے ماہانہ ملا
غلام محمد محسوبہ سنین پیشین ماہانہ ہذا بمصارف
مرضعہ ہا وغیرہم غلام حسین مولود حال بخازن خزانہ
خاقانی بمجرائے مجد د مجرا داده قبض مہری غلام حسین بہ دفتر داشتہ باشند۔ درین باب ہر سال
سند مجدد در طلبند +

ہفتم شہر رمضان المبارک سنہ ۱۱۹۰ ہجری مطابق سنہ ۱۸ جلوس والا تحریر یافتہ +

ڈاکٹر آزردہ نے اپنی کتاب میں جو عکس شامل کیے ہیں وہ اتنے دھندلے ہو گئے ہیں کہ اکثر مقامات پر پوری عبارت کو پڑھنا قطعی ناممکن ہو گیا ہے۔ خیال تھا کہ دوسرے ایڈیشن میں یہ صورت نہ ہوگی کیونکہ یہ ایک اہم دستاویز ہے مگر اس میں بھی یہی حال ہے۔ شاید یہ صورت عکس کو چھوٹا کرنے سے پیدا ہوئی کیونکہ ڈاکٹر آزردہ کی کتاب (۲۲×۱۸/۸) سائز میں حیات دبیر (۲۶×۲۰/۸) سے چھوٹی ہے۔ بہرحال فرمان اور استشہاد کے عکس کو اس طرح پیش کرنا جبکہ اصل بہت بہتر صورت میں موجود ہو اس کی اہمیت کو قطعی نظر انداز کرنا ہے۔

○

فرمانوں کے عکس کے علاوہ بھی ڈاکٹر آزردہ کی کتاب میں جابجا ایسے مقامات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جہاں انھوں نے حیات دبیر سے عبارت لی ہے مگر حوالہ دینے سے گریز کیا ہے۔ مثلاً صفحہ ۱۸ پر ملا اہلی کی ایک رباعی ؎

یارب سگ کوئے مقبلی ساز مرا — آئینہ ز عشق منجلی ساز مرا
اقبال جہاں مرا جوئے نیست قبول — مقبول محمد و علی ساز مرا

اور ملا برک کا ایک قطعہ تاریخ جو ملا اہلی کی وفات پر کہا گیا تھا درج ہے:

در میان شعرا و فضلا — پیر با صدق و صفا بود اہلی
رفت با مہر علی از عالم — پیرو آل عبا بود اہلی
سال فوتش ز خرد جستم و گفت — بادشاہ شعرا بود اہلی

یہ رباعی اور قطعہ حیات دبیر کے ص۳ و ص۴ پر دیکھا جاسکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی افراتفری کے زمانے میں مرزا دبیر لکھنؤ کو چھوڑ کر کچھ عرصے کے لیے سیتاپور گئے، مسافرت اور پریشانی کے اس دور میں انھوں نے ایک رباعی کہی جو صاحب حیات دبیر نے اپنی کتاب کے ص۱۰۱ پر دی ہے۔ رباعی مندرجہ ذیل ہے:

شطرنج دو رنگی سے ہیں ششدر بندے — آوارہ ہیں شہر شہر، در در بندے
اے بندہ نواز ہے تعجب کا محل — تو مالک ملک اور بے گھر بندے

ڈاکٹر آزردہ کی کتاب میں رباعی ص۳۶ پر بغیر کسی حوالے کے دیکھی جاسکتی ہے۔

صاحب حیات دبیر نے ص۱۰۱ پر "صدمات اواخر عمر" کا عنوان قائم کر کے ان اموات کی تفصیل لکھی ہے جن سے مرزا دبیر کو انتہائی صدمہ ہوا ہے۔ اس میں سب سے پہلے مرزا دبیر کے نوجوان فرزند محمد ہادی حسین عطارد کا ذکر ہے۔ عبارت اس طرح شروع ہوتی ہے:

"مرنے سے دو سال پہلے مرزا صاحب کو چند صدمہ روحانی بہت سخت پہنچے۔"

ڈاکٹر آزردہ نے بھی اسی عنوان کے تحت عطارد کی وفات کا ذکر اس طرح شروع کیا:

"سفرِ آخرت سے دو سال قبل مرزا دبیر کو بہت سخت روحانی صدمے پہنچے"۔ ص۱۴۶

اس کے بعد آزردہ کا اپنا ایک جملہ ہے جس میں عطارد کی تاریخ وفات دی ہے ۔ (یہ تاریخ بھی حیات دبیر سے لی گئی ہے) اور پھر وہ عبارت ہے جو تمام و کمال حیات دبیر کے ص۱۰۱ پر درج ہے مگر حوالہ نہیں ہے ۔ (شاید اسلیے کہ ایک جملہ خود بھی لکھا ہے) ۔

ڈاکٹر آزردہ	حیات دبیر
اس صدمۂ عظیم کے بعد مرزا دبیر کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ ادھر تو نورِ نظر کے ساتھ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی ادھر رات میں چند گھنٹے سو رہتے تھے وہ سونا بھی نورِ نظر کے داغ کی نذر ہو گیا ۔ رات کو بارہ بجے دوستوں اور شاگردوں کا مجمع برخاست ہوتا تھا ۔ مرزا دبیر دیر رات تک اور وظائف پڑھتے تھے اس کے بعد اگر کچھ کہتے تھے تو لکھ نہیں سکتے تھے ۔	اس صدمۂ عظیم کے بعد مرزا دبیر کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ ادھر نورِ نظر کے ساتھ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی ادھر جو رات میں چند گھنٹے سو رہتے تھے وہ سونا بھی نورِ نظر کے داغ کی نذر ہو گیا ۔ رات کو بارہ بجے دوستوں اور شاگردوں کا مجمع برخاست ہوتا تھا ۔ ———— اس کے بعد اگر کچھ کہتے تھے تو لکھ نہیں سکتے تھے ۔

اس کے بعد کی عبارت بھی ڈاکٹر صاحب نے حیات دبیر ہی سے لی اور اس کو اقتباس کی شکل میں لکھ کر کتاب کا حوالہ اور صفحہ کا نمبر بھی دیا ہے ۔ یعنی عبارت تمام تمام صاحب حیات دبیر کی ہے مگر اس کی حیثیت مختلف کر دی گئی ۔

اسی عنوان کے تحت دوسرے صدمہ کے بارے میں حیات دبیر کے صفحہ ۱۰۶ پر جو عبارت ہے وہ اس طرح ہے:

"دوسرا صدمۂ روحانی حقیقی بڑے بھائی مرزا غلام محمد صاحب نظیر مرحوم کے مرنے کا تھا جو انتیسویں صفر ۱۲۹۱ ہجری کو آخرت کا سفر کر گئے ۔ یہ بڑے بھائی تھے ۔ مگر مرزا صاحب کے تقدس و کمال کے سبب سے مرزا صاحب کا ایسا ادب کرتے جیسے چھوٹے ۔ پہلے یہ میر ضمیر کے شاگرد تھے ۔ پھر انھیں کے حکم سے مرزا صاحب کو اپنا کلام دکھلاتے رہے"۔

یہ عبارت دو تین مقام پر لفظی تبدیلی اور اصلاح کے ساتھ ڈاکٹر آزردہ کی کتاب کے ص۱۴۶ پر اس طرح ملتی ہے:

"دوسرا صدمۂ روحانی حقیقی بڑے بھائی مرزا غلام محمد صاحب نظیر کی وفات کا ہوا جو انتیسویں صفر ۱۲۹۱ھ کو انتقال کر گئے ۔ بڑے بھائی ہو کر بھی یہ مرزا صاحب کے تقدس و کمال کے سبب سے مرزا دبیر کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے ان سے چھوٹے ہوں پہلے یہ ضمیر کے شاگرد تھے بعد میں انھیں کے حکم سے مرزا دبیر کو اپنا کلام دکھاتے رہے"۔

یہاں بھی حیات دبیر کا کوئی حوالہ نہیں ہے ۔

حیات دبیر کے ص۱۲۵ پر غذا کے عنوان کے تحت جو عبارت درج ہے اس کو ڈاکٹر آزردہ کی کتاب کے ص۹۰ پر دیکھا جا سکتا ہے ۔ دونوں کتابوں سے عبارت کا مقابلہ کرنے پر صرف تین چار لفظوں کی تبدیلی ملتی ہے ۔ عبارت ملاحظہ ہو:

حیاتِ دبیرؒ

غذا صرف ایک وقت دن میں نو دس بجے غذا نوش فرماتے تھے۔ رات میں صرف چائے پیتے تھے اور جو احباب اور شاگرد موجود ہوتے تھے ان کو بھی پلاتے تھے۔ آخر عمر میں جب سخت علیل ہوئے اور تپ محرقہ میں سات روز تک بیہوش رہے تو اچھے ہونے پر طبیبوں کی رائے سے دو وقت غذا کردی گئی۔ مگر چند روز کے بعد جو دیکھا تو پھر رات کی غذا ندارد تھی۔ جناب استادی اوجؔ مدظلہ سے پوچھا تو فرمایا کہ نماز شب میں دقت ہوتی تھی۔ اس لیے رات کی غذا ترک کردی۔

ڈاکٹر آزردہ

مرزا دبیر صاحب غذا دن میں صرف ایک وقت نو دس بجے تناول کرتے تھے۔ رات میں صرف چائے پیتے تھے اس وقت جو احباب اور شاگرد موجود ہوتے ان کو بھی پلاتے تھے۔ آخر عمر میں جب سخت علیل ہوئے اور تپ محرقہ میں سات دن تک بیہوش رہے تو صحت یاب ہونے پر طبیبوں کی رائے سے دو وقت کی غذا کردی گئی تھی مگر چند روز کے بعد رات کی غذا بھی ختم ہو گئی۔ مرزا اوجؔ نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا تو مرزا دبیر نے جواب میں فرمایا کہ نماز شب میں دقت ہوتی تھی اس لیے رات کی غذا ترک کردی۔

یہی صورت مرزا دبیرؔ کے عظیم آباد کے آخری سفر کی تفصیلات کے سلسلے میں ملتی ہے۔ دونوں کتابوں کی عبارت ملاحظہ ہو:

حیاتِ دبیر

عظیم آباد کا آخری سفر

میر انیسؔ مرحوم کے مرنے کے بعد مرزا صاحب مرحوم تین مہینے اور ایک دن زندہ رہے۔ مگر برابر علیل رہے۔ سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ رئیسہ عظیم آباد کے اصرار سے محرم ۱۲۹۲ھ میں پٹنہ عظیم آباد تشریف لے گئے۔ مگر عشرہ محرم میں ہر روز مجلس جناب اوجؔ مدظلہ پڑھتے تھے۔ مرزا دبیر مرحوم مجلس میں بیٹھے رہتے تھے کہ علیل تھے۔ کچھ سادات و مومنین دُور دُور کی بستیوں سے اپنی اپنی بستیوں کی عشرہ محرم کی مجلسوں کو چھوڑ کر بعض مرزا صاحب مرحوم کے سننے کو آئے تھے۔ آخر نویں محرم کو بعض مومنین نے مرزا صاحب مرحوم سے افسوس کے لہجے میں عرض کیا کہ ہم حضور کے سننے کو آئے تھے۔ اپنے گھر کی مجلسیں

ڈاکٹر آزردہ

حال انتقال دبیر مرحوم

میر انیسؔ کی وفات کے بعد مرزا دبیر تین مہینے اور ایک دن زندہ رہے۔ مگر برابر علیل رہے۔ سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ رئیسہ عظیم آباد کے اصرار سے محرم ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں پٹنہ عظیم آباد تشریف لے گئے۔ مگر عشرہ محرم میں ہر روز مجلس جناب مرزا اوجؔ... پڑھتے تھے۔ مرزا دبیر مرحوم مجلس میں بیٹھے رہتے تھے کہ علیل تھے۔ کچھ سادات و مومنین دور دور کی بستیوں سے اپنی اپنی بستیوں کی عشرۂ محرم کی محالس کو چھوڑ کر... مرزا صاحب مرحوم کے سننے... آئے تھے آخر نویں محرم کو بعض مومنین نے مرزا دبیرؔ سے افسوس کے لہجے میں عرض کیا کہ ہم حضور کے سننے کو آئے تھے۔ اپنے گھر کی مجلسیں

بھی چھوڑیں اور حضور کو نہ سنا۔ یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ
حضور علیل ہیں۔ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ انشاءاللہ آج
میں پڑھوں گا جتنا پڑھا جائے گا۔ خدا جانے پھر عشرہ محرم
نصیب ہو یا نہ ہو۔ جناب اوج کے بعد مرزا صاحب
منبر پر تشریف لے گئے۔ چند رباعیاں پڑھ کر چند بند بین
پڑھے۔ اللہ اللہ مرزا صاحب مرحوم کا بے تصنع حضور قلب
سے پڑھنا۔ ایسی رقت ہوئی کہ اکثر آدمی بیہوش ہو گئے۔ مرزا
صاحب منبر پر رویا کیے۔ طاقت خود سے اترنے کی نہ تھی۔
بڑی دیر کے بعد جب جوشِ رقت کم ہوا لوگوں نے منبر سے
اتارا۔ بعد سویم ۱۲ محرم ۱۲۹۲ھ کے ایک ایک دو دو روز
راستہ میں بمقام آرہ و حسین گنج مقام کرتے ہوئے لکھنؤ میں
تشریف لائے۔ ورم کبد کی شدت تھی۔ علاج ہوتا رہا۔
مگر مرض الموت کا کیا علاج سے مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا
کی۔ آخر اسی عارضہ ورم کبد میں ۳۰ (تیسویں) ماہ محرم کی رات
میں قریب صبح صادق یہ آفتاب شاعری و مداحی غروب
ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دن میں جنازہ اٹھا۔ دریا پر غسل میت کے
واسطے جنازہ کو لے گئے۔ ہزاروں آدمی جنازہ کے ساتھ
علما و صلحا و شعرا تھے۔ اور اکثر آن مرحوم کی یہ رباعی پڑھتے
ہوئے روتے چلے جاتے تھے:۔

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں
منہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بار گنہ نے پیدل
تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

بھی چھوڑیں اور حضور کو نہ سنا۔ یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ
حضور علیل ہیں۔ مرزا دبیر نے جواب دیا کہ انشاءاللہ آج
میں پڑھوں گا جتنا پڑھا جائے گا۔ خدا جانے پھر عشرہ محرم
نصیب ہو یا نہ ہو۔ جناب اوج کے بعد مرزا صاحب
منبر پر تشریف لے گئے۔ چند رباعیات پڑھ کر چند بند مرثیے
پڑھے۔..................

... ایسی رقت ہوئی کہ اکثر آدمی بیہوش ہو گئے۔ مرزا
دبیر منبر پر رویا کیے۔ طاقت خود سے اترنے کی نہ تھی۔
بڑی دیر کے بعد جب جوشِ رقت کم ہوا لوگوں نے منبر سے
اتارا۔ بعد سوئم ۱۲ محرم ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء کے ایک ایک دو دو روز
راستہ میں... آرہ و حسین گنج میں مقام کرتے ہوئے لکھنؤ
تشریف لائے۔ ورم کبد کی شدت تھی۔ علاج ہوتا رہا۔
مگر مرض الموت کا کیا علاج۔ ....
.. آخر اسی عارضۂ ورم کبد میں تیسویں ماہ محرم کی رات
میں قریب صبح صادق یہ آفتاب شاعری مداحی غروب
ہو گیا... .....

دن میں جنازہ اٹھا۔ دریا پر غسل میت کے
واسطے جنازہ کو لے گئے۔ ہزاروں آدمی جنازہ کے ساتھ
علما و صلحا و شعرا تھے۔ اور اکثر آن مرحوم کی یہ رباعی پڑھتے
ہوئے روتے چلے جاتے تھے:۔

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں
منہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل
تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

جناب سید ابراہیم صاحب طاب اللہ مقامہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور اپنے گھر پر دفن ہوئے جو مقبرہ چھوٹا سا اب تک برقرار ہے۔

مولانا سید ابراہیم .... نے نماز جنازہ پڑھائی ۔۔ اور اپنے گھر پر دفن ہوئے جو مقبرہ ... اس وقت تک برقرار ہے ۔

ڈاکٹر آزردہ کی کتاب کا سب سے زیادہ مرعوب کرنے والا حصہ وہ ہے جہاں انھوں نے مرزا دبیر کی شعری خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ مرعوب کرنے والا اس لیے کہ دبیر کے کلام سے اتنی زیادہ تعداد میں صنعت معنوی و لفظی کی نشاندہی، ان کی جامع تعریف اور ہر ایک کے ذیل میں کئی کئی مثالیں پیش کرنا ادسط درجے کی صلاحیت رکھنے والے کا کام نہیں تھا۔ اس کے لیے علم بیان کے تمام پہلوؤں پر عبور حاصل ہونا ضروری تھا، ساتھ ہی کلام دبیر کے جس تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے وہ بھی محتاج بیان نہیں۔ مگر اسی حصہ میں حیات دبیر سے "استفادہ" بہت واضح صورت میں سامنے آیا ہے ۔

اس باب میں ڈاکٹر آزردہ نے کلام دبیر سے جن صنعتوں کی نشاندہی کی ہے ان کی تعریف اور زیادہ تر مثالیں تقریباً اسی ترتیب کے ساتھ حیات دبیر کے صفحہ ۱۵۹ سے صفحہ ۲۰۵ تک دیکھی جا سکتی ہیں۔ ذیل میں دونوں کتابوں سے ۱۴ صنعتوں کو ایک دوسرے کے مقابل پیش کیا جا رہا ہے تاکہ مقابلے میں آسانی ہو اور واضح ہو سکے کہ حیات دبیر کے ۴۵ صفحات سے تقریباً مکمل استفادہ کرنے کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے کتاب کا حوالہ دینے سے گریز کیا ہے، اور حیات دبیر کی عبارتوں کو اپنا بنا کر پیش کیا ہے ۔

حیات دبیر	ڈاکٹر آزردہ
۱۔ صنعت طباق: اس صنعت کو تقابل، تضاد، مطابقت، تطبیق۔ تکافو بھی کہتے ہیں۔ یہ صنعت قرآن شریف میں بھی موجود ہے تحسبھم ایقاظاً وھم رقودًا الآیہ۔ یعنی ایسی دو چیزیں اسم یا فعل یا حرف میں ایک جگہ جمع کر دیں جو آپس میں مطابق یا متقابل یا متضاد ہوں ۔	۱۔ صنعت طباق: اس صنعت کو تقابل، تضاد، مطابقت، تطبیق، تکافو بھی کہتے ہیں۔ ....یعنی ایسی دو چیزیں اسم یا فعل یا حرف میں ایک جگہ جمع کر دی جائیں جو آپس میں مطابق، متقابل یا متضاد ہوں ۔ ص ۳۹۴
۲۔ عکس: اس صنعت کو تبدیل بھی کہتے ہیں۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ پہلے کلام میں دو لفظ لائیں پھر اُن دونوں کو الٹ پلٹ دیں۔ یعنی دوسرے کو پہلے لے آئیں اور اوّل کو ثانی کر دیں۔ یہ صنعت قرآن شریف کی اس مشہور آیت میں ہے یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی مرزا صاحب اس صنعت میں فرماتے ہیں۔	۲۔ عکس: اس صنعت کو تبدیل بھی کہتے ہیں اس سے مراد وہ صنعت ہے کہ پہلے کلام میں دو لفظ لائیں پھر اُن دونوں کو الٹ پلٹ دیں۔ یعنی دوسرے کو پہلے لے آئیں اور پہلے کو بعد میں۔ . . . . مرزا دبیر نے اس صنعت کا استعمال اس شعر میں کیا ہے:

انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے
دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے

انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے
دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے   ص ۲۱۷

خاص کر تفریق میں جو مثالیں ہیں وہاں بہت خوبصورتی سے بندوں کو آگے پیچھے کر دیا ہے اور بندوں سے پہلے مندرجہ نوٹ کو حاشیوں میں اور زیادہ خوبصورتی سے اپنا لیا ہے ۔

۳۔ **تفریق:** دو امروں میں جو ایک طرح کے ہوں فرق ظاہر کرنے کو صنعت تفریق کہتے ہیں ۔ مرزا صاحب اس صنعت میں کہتے ہیں ۔

(رباعی مناقب میں)

(۱)

رہ جاتا ہوں انگشت بدنداں ہو کر   حیدرؑ کو کہا ابر سخنداں ہو کر
مانا کہ گہر بخش ہے نیساں بھی مگر   وہ دیتا ہے رو رو کے یہ خنداں ہو کر

(۲) صفائے قلب اور آئینہ میں فرق

آئینہ کے آئین پہ میں نے جو کیا غور   منہ پر تو ہے کچھ اور پس پشت ہے کچھ اور
گو چرخ کی گردش سے نہ ہو صاف کبھی دور   پر حاضر و غائب دل روشن کا ہے اک طور

جن آئینوں میں دونوں طرف ایک چمک ہے
وہ ایک ترا دل ہے اور اک مہر فلک ہے

(۳) آئینہ اور روئے انور جناب عباسؑ میں نہایت عمدہ فرق بتاتے ہیں ۔

آئینہ کہاں رخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی   صنعت وہ سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی
واں خاک نے صیقل یہاں قدرت نے جلا کی   طالع نے کس آئینہ کو خوبی یہ عطا کی

ہر آئینہ میں چہرۂ انساں نظر آیا
اُس رُخ میں جمالِ شیرِ مرداں نظر آیا

(۴) یاقوت اور لب حضرت عباسؑ میں تفریق ۔

شیریں رقموں میں تھا اس لب کا جدا ہے   اک نے شکر اور ایک نے یاقوت لکھا ہے
یاقوت کا لکھنا مگر انسب ہے بجا ہے   یاقوت سے بڑھ کر جو لکھوں میں تو مزا ہے

چوسا ہے یہ لب مثل رطب حق کے ولی نے
یاقوت کا بوسہ لیا، کس روز؟ علیؑ نے

۳۔ **تفریق:** کلام میں ایک طرح کے دو امروں میں فرق ظاہر کرنے کو صنعت تفریق کہتے ہیں ۔ چند مثالیں کلام مرزا دبیر سے ملاحظہ ہوں :

(۱)
شیریں رقموں میں رقم اس لب کا جدا ہے   اک نے شکر اور ایک نے یاقوت لکھا ہے
یاقوت کا لکھنا مگر انسب ہے بجا ہے   یاقوت سے بڑھ کر جو لکھوں میں تو مزا ہے

چوسا ہے یہ لب مثل رطب حق کے ولی نے
یاقوت کا بوسہ لیا کس روز علیؑ نے [۱]

(۲)
آئینہ کہاں رخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی   صنعت وہ سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی
واں خاک نے صیقل یہاں قدرت نے جلا کی   طالع نے کس آئینہ کو خوبی یہ عطا کی

ہر آئینہ میں چہرۂ انساں نظر آیا
اس رخ میں جمالِ شیر مرداں نظر آیا [۲]

(۳)
گر آنکھ کو نرگس کہوں ہے عین حقارت   نرگس میں پلکیں ہیں نہ پتلی نہ بصارت [۳]

(۴)
آئینے کے آئین پہ میں نے جو کیا غور   منہ پر تو ہے کچھ اور پس پشت ہے کچھ اور
گو چرخ کی گردش سے نہ ہو صاف کبھی دور   پر حاضر و غائب دل روشن کا ہے اک طور

جن آئینوں میں دونوں طرف ایک چمک ہے
وہ ایک ترا دل ہے اور اک مہر فلک ہے [۴]

رہ جاتا ہوں انگشت بدنداں ہو کر   حیدرؑ کو کہا ابر سخنداں ہو کر
مانا کہ گہر بخش ہے نیساں بھی مگر   وہ دیتا ہے رو رو کے یہ خنداں ہو کر [۵]

---

[۱] یاقوت اور حضرت عباسؑ کے لبوں میں تفریق۔ [۲] آئینہ اور روئے انور حضرت عباسؑ میں تفریق [۳] آنکھ اور نرگس میں تفریق۔ عام طور آنکھ کو نرگس سے تشبیہ دیتے ہیں اور مرزا دبیر آنکھ کو نرگس سے اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ نرگس ہیچ اور پست نظر آتی ہے۔ [۴] آئینہ اور صفائے قلب میں تفریق۔ [۵] اس رباعی میں اور شاعروں کی طرف اشارہ بھی ہے کہ وہ سخنداں ہو کر حیدرؑ کو ابر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مرزا دبیر دونوں میں تفریق اس طرح کرتے ہیں کہ ابر روتا ہے (برسنے کو رونا کہا ہے) اور ان کے ممدوح میں یہ صفت ہے کہ رو دیتے ہیں بلکہ ہنس ہنس کر دیتے ہیں۔

۴۔ **تقسیم**: جمع و تفریق کے بعد تقسیم بھی ایک صنعت ہے اس میں اور لف و نشر میں ایک باریک فرق یہ ہے۔ کہ لف و نشر میں اوّل چند چیزیں بیان کرتے ہیں پھر ان کے منسوبات لاتے ہیں۔ سننے والا خود بخود ہر ایک شے کو منسوب الیہ کی طرف منسوب و تعین کر لیتا ہے۔ اور تقسیم میں کہنے والا چند چیزیں بیان کرتا ہے یا ایک ہی چیز کے چند اجزا بیان کرتا ہے۔ پھر ہر چیز یا ہر جزو کے منسوب کو بطریق تعین بیان کرتا ہے۔ اور اس صنعت کی ایک قسم یہ بھی ہے۔ کہ کسی شے کی تمام قسموں کو ایک جگہ بیان کرتے ہیں۔

اس صنعت کی تقسیم میں مرزا صاحب عزاداران امام حسینؑ کی مدح فرماتے ہیں۔

پابندی ماتم[۱] یہ ہے اس مشغلہ کو فوق سجّادؑ[۲] کے ماتم میں پہنتا ہے کوئی طوق
دُلدُل[۳] کے بنانے کا کسی تیو کو ہے ذوق عباسؑ[۴] کا سقا کوئی بنتا ہے بصد شوق
لیتا ہے کوئی تعزیہ زہراؑ کے خلف کا
تابوت[۵] اٹھاتا ہے کوئی شاہ نجف کا

(اب ان سب کی تقسیم دیکھئے۔ ہر ایک کے ثواب کو اپنے عقیدے کے موافق بیان فرماتے ہیں)۔

تابوت[۵] اٹھانے کا صلہ قبر کی راحت دُلدُل[۳] کے بنانے کی جزا ناقۂ جنّت
سقائی[۴] کے انعام میں کوثر کی حکومت دولت ہے یہ سب تعزیہ داری کی بدولت
عابدؑ[۱] کیلیے طوق پہنتے ہیں سو کیا ہے
وہ طوق نہیں دائرہ حفظِ خدا ہے

جمع و تفریق کو اور کبھی جمع و تفریق و تقسیم کو ساتھ لاتے ہیں۔ اور کبھی جمع و تقسیم کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں یعنی

۴۔ **تقسیم**: صنعت تقسیم لف و نشر کی طرح کی صنعت ہے ـــــــ فرق یہ ہے کہ لف و نشر میں ....

. . سننے یا پڑھنے والا خود بخود ہر ... شے کو منسوب الیہ کی طرف منسوب و تعین کر لیتا ہے اور تقسیم میں شاعر چند چیزیں بیان کرتا ہے یا ایک ہی چیز کے چند اجزا بیان کرتا ہے۔ پھر ہر چیز یا ہر جزو کے منسوب کو بطریق تعین بیان کرتا ہے۔ ... اس صنعت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ کسی شے کی تمام قسموں کو ایک جگہ بیان کیا جاتا ہے۔

صنعتِ تقسیم میں مرزا دبیر نے امام حسینؑ کے عزاداروں کی مدح اس طرح کی ہے۔

پابندی ماتم[۱] یہ ہے اس مشغلہ کو فوق سجّادؑ[۲] کے ماتم میں پہنتا ہے کوئی طوق
دُلدُل[۳] کے بنانے کا کسی تیو کو ہے ذوق عباسؑ[۴] کا سقا کوئی بنتا ہے بصد شوق
لیتا ہے کوئی تعزیہ زہراؑ کے خلف کا
تابوت اٹھاتا ہے کوئی شاہ نجف کا

. . . .

. . . .

تابوت[۵] اٹھانے کا صلہ قبر کی راحت دُلدُل[۳] کے بنانے کی جزا ناقۂ جنّت
سقائی[۴] کے انعام میں کوثر کی حکومت دولت ہے یہ سب تعزیہ داری کی بدولت
عابدؑ[۱] کے لیے طوق پہنتے ہیں سو کیا ہے
وہ طوق نہیں دائرہ حفظِ خدا ہے

جمع و تفریق کو ایک ساتھ اور کبھی جمع و تفریق و تقسیم کو . . . اور کبھی جمع و تقسیم کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں

چند چیزوں کو ایک جگہ جمع کر کے اُن کا فرق بیان کر دیں یا اُن کو
تقسیم کر دیں۔ یا دونوں باتیں کریں۔ مرزا صاحب کہتے ہیں:

(حضرت عباسؑ کی مدح میں)

پیدا ہوں جو ایسے چمنستانِ جہاں لاکھ   افلاک کریں طور زمینیں ہوں عیاں لاکھ
باراں کہر ایک قطرے سے طوفاں ہو عیاں لاکھ   گھر گھر ہوں اگر حسن خضر و یوسف سے جواں لاکھ
نایاب ہوں نزدیک کی اور دور کی شکلیں
سب نور کے رخسار ہوں سب نور کی شکلیں

کیا منہ جو نقابوں سے حسیں منہ کو نکالیں   عیسیٰ قسم انجیل کی بیساختہ کھالیں
توریت کو موسیٰ ید بیضا پہ اٹھالیں   فرقان میں فرق یہ خاصان خدا لیں
انصاف خدا بڑھ کے حکم ہو کر یوں ہی ہے
اتنوں میں کوئی ثانی عباسؑ نہیں ہے

۵۔ صنعت تجرید۔ یہ مبالغہ کی ایک سرسبز شاخ ہے۔
یہ صنعت اس طور پر ہے کہ ایک صاحب صفت شے سے مبالغہ
کے قصد سے اسی شے کی مانند دوسری چیز حاصل کریں۔ اس کی کئی
قسمیں ہیں۔ ایک قسم اس کی یہ بھی ہے کہ شاعر اپنے آپ کو
دوسرا شخص قرار دے کر اپنے نفس سے باتیں کرتا ہے۔ اس سے
کوئی شاعر خالی نہیں ہے۔ کیونکہ فی زمانہ مقطع میں ہر شاعر اسی
طرح خطاب کرتا ہے۔ مرزا صاحب اپنے نفس سے
خطاب کرتے ہیں:

آغاز ترا خاک تھا ہے خاک ہی انجام   دیکھ اپنی بدی خوب بد و نیک سے کیا کام
گر مہر نہیں دل پہ تو نخوت کا نہ لے نام   نازاں نہ ہو دنیا پہ نہ کر شکوۂ ایام
ارشاد کیا طور پہ موسیٰ سے خدا نے
اچھا وہ ہے جو سب سے برا آپ کو جانے
(یعنی اپنے نفس کو)

اور چیزوں کا فرق بیان کیا جاتا ہے یا اُن کی تقسیم کر دی
جاتی ہے یا ان دونوں خصوصیات کو یکجا کیا جاتا ہے۔ مرزا
دبیر حضرت عباسؑ کی مدح میں کہتے ہیں:

پیدا ہوں جو ایسے چمنستانِ جہاں لاکھ   افلاک کریں طور زمینیں ہوں عیاں لاکھ
باراں کہر ایک قطرے سے طوفاں ہو عیاں لاکھ   گھر گھر ہوں اگر حسن خضر و یوسف سے جواں لاکھ
نایاب ہوں نزدیک کی اور دور کی شکلیں
سب نور کے رخسار ہوں سب نور کی شکلیں

کیا منہ جو نقابوں سے حسیں منہ کو نکالیں   عیسیٰ قسم انجیل کی بیساختہ کھالیں
توریت کو موسیٰ ید بیضا پہ اٹھالیں   فرقان میں فرق یہ خاصان خدا لیں
انصاف خدا بڑھ کے حکم ہو کر یوں ہی ہے
اتنوں میں کوئی ثانی عباسؑ نہیں ہے

۵۔ صنعت تجرید: یہ مبالغہ کی ایک سرسبز شاخ ہے۔
یہ صنعت اس طور پر ہے کہ ایک صاحب صفت شے سے مبالغہ
کے قصد سے اسی شے کے مانند دوسری چیز حاصل کریں۔ اس کی کئی
قسمیں ہیں۔ ایک قسم اس کی یہ بھی ہے کہ شاعر اپنے آپ کو
دوسرا شخص قرار دے کر اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ اس سے
کوئی شاعر خالی نہیں...... مقطع میں تو شعرا اکثر اسی
طرح خطاب کرتے ہیں۔ کلام مرزا دبیر سے مندرجہ
ذیل مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

آغاز ترا خاک تھا ہے خاک ہی انجام   دیکھ اپنی بدی خوب بد و نیک سے کیا کام
گر مہر نہیں دل پہ تو نخوت کا نہ لے نام   نازاں نہ ہو دنیا پہ نہ کر شکوۂ ایام
ارشاد کیا طور پہ موسیٰ سے خدا نے
اچھا وہ ہے جو سب سے برا آپ کو جانے [۱]

---

[۱] آپ کو یعنی اپنے نفس کو

۹۔ **ادماج:** یہ بھی ایہام کے قریب قریب ہے۔ بس فرق اتنا ہے۔ کہ ایہام میں ایک لفظ ذو معنین ہوتا ہے۔ اور ادماج میں تمام کلام سے دو سرے معنی نکلتے ہیں۔ اور ادماج عام ہے۔ مدح و ذم اور ہر شے کے بیان کے واسطے آتا ہے۔

مرزا صاحب اس صنعت میں اُس موقع پر فرماتے ہیں۔ کہ جب شمر نے عونؑ و محمدؑ پسران جناب زینبؑ کو دو علم پیش کر کے ملانا چاہا ہے ؎

بہکا انہیں۔ خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں ٭ کہ اُن سے یہ شقی جو تجھے جانتے نہ ہوں

حاشیہ:۔ ایک معنی اس کے یہ ہیں کہ ان کو بہکا جو تجھ کو نہ جانتے ہوں۔ دوسرے معنی یہ نکلے کہ ان کو بہکا جو تجھ کو شقی نہ سمجھتے ہوں۔

۱۰۔ **صنعت تجنیس:** اس کی کئی قسمیں ہیں:

(۱) دو لفظ ایسے لائیں جو صورت میں ایک ہی ہوں۔ مگر معنی مختلف ہوں۔

(۲) دونوں الفاظ کے اجزا میں مشابہت ہو۔

(۳) قریب المخرج الفاظ ہوں۔

(۴) تجنیس قلب کہ ایک لفظ کو الٹیں۔ تو دوسرا لفظ پیدا ہو۔ اس صنعت کی نے بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی۔ کہ پورے مصرع یا فقرہ کو الٹیں۔ اور وہی فقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ یا دوسرا فقرہ یا مصرع پیدا ہو اس کو مقلوب مستوی کہتے ہیں۔

تجنیس کی ایک قسم تجنیس تام ہے جو قرآن شریف کی اس آیت میں ہے۔ یوم تقوم الساعۃ یقسم المجرمون

۹۔ **ادماج:** یہ بھی ایہام کے قریب قریب ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ ایہام میں ایک لفظ ذو معنی ہوتا ہے اور ادماج میں تمام کلام سے دوسرے معنی نکلتے ہیں۔

.. یہ مدح و ذم اور ہر شے کے بیان کے واسطے آتا ہے۔

مرزا دبیر اس موقع پر کہ جب شمر نے حضرت زینبؑ کے فرزندوں عونؑ و محمدؑ ... کو دو علم پیش کر کے اپنے ساتھ ملانا چاہا' اس صنعت میں کہتے ہیں۔

بہکا انہیں خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں ٭ کہ ان سے یہ شقی جو تجھے جانتے نہ ہوں

اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ ان کو بہکا جو تجھ کو نہ جانتے ہوں دوسرے معنی یہ نکلتے ہیں کہ ان سے کہہ جو تجھ کو شقی نہ سمجھے ہوں۔

۱۰۔ صنعت تجنیس۔ اس کی کئی قسمیں ہیں

(۱) ایسے دو ہم صورت لفظ لائے جائیں جو معنی میں مختلف ہوں۔

(۲) دونوں الفاظ کے اجزا میں مشابہت ہو۔

(۳) دونوں الفاظ قریب المخرج ہوں۔

(۴) تجنیس قلب کہ ایک لفظ کو الٹیں ....

. . . .

. ... اور وہی نقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ یا دوسرا نقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ اس کو مقلوب مستوی کہتے ہیں۔

تجنیس کی ایک اور قسم تجنیس تام ہے۔ اس میں ایک ہی لفظ کو دو جگہ دو معنوں میں استعمال کیا

مالبثوا غیر ساعۃ ۔ اس میں ساعۃ کے لفظ اوّل قیامت کے معنی پر دُوسری گھڑی بھر کے معنی پر ہے ۔ اس کی مثالیں مرزا صاحب کے کلام میں بہت ہیں ۔ حسب ذیل پیش کرتا ہوں ۔

(۱) رباعی ذیل میں ایک لفظ "زاری" کو تین جگہ تینوں قافیوں میں لائے ہیں ۔

مومن کو ہر اک لگا سے بے زاری ہے   واجب غم شہ میں گریہ وزاری ہے

حزماتم نورعین زہرا رونا   آنکھیں کہتی ہیں مردم آزاری ہے

(۲) رجز میں حضرت عباسؑ فضیلت جناب امیرؑ کی بیان فرماتے ہیں ۔

جب کہ قبلہ کو ہم نے رخ امید پھرایا   مغرب کی طرف شام کو خورشید پھر آیا

(۳) ذیل کے چاروں مصرعوں میں (قافیہ میں) بار کا لفظ ہر جگہ ایک نئے معنی پر ہے اور پھر تکلف یہ ہے کہ بے تکلف نظم ہے حضرت عباس کی مدح میں ہے ۔

ہوتا ہے جو حاضر یہ بہادر سر دربار   دربار میں دُربار علیؑ ہوتے ہیں ہر بار

عزاز حسینؑ ان پہ تصدق سر اگہر بار   عارض ہیں قمر بار لب لعل گہر بار

یہ والی ۔ اقلیم ولایت کا ولی ہے

تصویر تولّائے حسین ابن علی ہے

تجنیس خطّی بھی اسی کی شاخ ہے ۔ یہ صنعت بھی قرآن شریف کی اس آیت میں ہے ۔ وَھُوَیطعمنی ویسقین واذا مرضت فھو یشفین ۔ اس میں یسقین اور یشفین میں تجنیس خطی ہے ۔ کہ ایک طرح لکھا جاتا ہے ۔ فقط نقطوں کا فرق ہے ۔

۱۰۔ صنعت اشتقاق وشبہ اشتقاق بھی صنعت تجنیس کی گویا سر بولی بہنیں ہیں ۔ اشتقاق یہ کہ دو لفظ ایسے

جاتا ہے ۔ تجنیس تام کی ایک مثال کلام مجید سے بھی دی جاتی ہے وہ اس طرح ہے " ویوم تقوم الساعۃ یقسم المجرمون مالبثوا غیر ساعۃ " ظاہری الفاظ کے معنی یہ ہیں "جس روز قیامت ہوگی گنہگار قسم کھائیں گے کہ نہ ٹھہرے وہ مگر ایک گھڑی ۔

اب کلام مرزا دبیر سے اسکی مثالیں پیش کی جاتی ہیں

(۱)

مومن کو ہر اک لگا سے بے زاری ہے   واجب غم شہ میں گریہ وزاری ہے

جز ماتم نورعین زہرا رونا   آنکھیں کہتی ہیں مردم آزاری ہے

. . . .

(۲)

جب کہ قبلہ کو ہم نے رخ امید پھرایا   مغرب کی طرف شام کو خورشید پھر آیا

. . . .

. . . .

(۳)

ہوتا ہے جو حاضر یہ بہادر سر دربار   دربار میں دُربار علیؑ ہوتے ہیں ہر بار

عزاز حسین ان پہ تصدق سر اگہر بار   عارض ہیں قمر بار لب لعل گہر بار

یہ والی اقلیم ولایت کا ولی ہے

تصویر تولّائے حسینؑ ابن علیؑ ہے

اس بند میں تجنیس خطی ہے ۔ ٹیپ کے دو مصرعوں میں صنعت اشتقاق وشبہ اشتقاق ہے ۔ قرآن شریف میں بھی یہ صنعت پائی جاتی ہے ۔ ھو یطعمنی ویسقین ہ واذا مرضت فھو یشفین اس یسقین اور یشفین میں تجنیس خطی ہے ۔ ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے ۔ صرف نقطوں کا فرق ہے ۔

۱۰۔ اشتقاق وشبہ اشتقاق : یہ بھی صنعت تجنیس کی ہی خوشنما شاخیں ہیں ۔ اشتقاق میں ایک ہی مادہ کے دو لفظ

لائیں۔ جن کا ایک مادہ ہو۔ اور شبہ اشتقاق یہ کہ ایک مادہ تو نہ ہو مگر بظاہر ایک مادہ معلوم ہوتا ہے۔ صنعت شبہ اشتقاق میں یہ آیت قرآن مجید پائی جاتی ہے۔ قال انی لعملکم من القالین۔ اس میں قال اور قالین میں شبہ اشتقاق ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں:

بس اے دبیر طاقت نظم و بیاں ہے طاق ہوش الوداع کہتا ہے اور عقل الفراق

اس میں طاقت و طاق میں صنعت شبہ اشتقاق ہے۔

بند ذیل کے اوّل کے چاروں مصرعوں میں یہ صنعت اور اس کے ساتھ صنعت ذوالقافیتین دیکھئے۔ شمشیر حسینی کی مدح (جہاد امام حسین) کے بیان میں کہتے ہیں

یاں سب کو تھا یقین کہ یہاں تھی وہیں نہ تھی وال اتفاق تھا کہ یہاں تھی یہیں نہ تھی
سر جا تھی اور پوچھو کہاں تھی کہیں نہ تھی لاکھوں کے قتل کر نیکو ہاں تھی نہیں نہ تھی
اس برق ذوالفقار کے جلوے کہاں نہ تھے
واں تھے جہاں زمین نہ تھی آسماں نہ تھے

۱۲۔ **غیر منقوط** بھی اسی لزوم مالایلزم میں سے ہے۔ جس کو صنعت مہملہ اور بے نقط بھی کہتے ہیں۔ اس صنعت میں پورا ایک مرثیہ جناب مرزا مرحوم کا ہے جو غیر منقسم ہے جسکا مطلع ہے۔ ع مہر علم سرور اکرم ہوا طالع

۱۳۔ **سجع**: ایک لفظ کے مقابل جب دوسرے ہم وزن لفظ لائیں تو اس کو سجع کہتے ہیں۔۔ وزن سے۔۔ مراد وزن عروضی ہے۔۔ جس میں حرکات الفاظ کا باہم متفق ہونا ضروری نہیں ہے اور اگر متفق ہوں تو اور خوبی ہے اور جب وہ الفاظ باہم قافیہ بھی ہو سکیں تو اس کو ترصیع کہتے ہیں۔

لائے جاتے ہیں اور شبہ اشتقاق میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک مادّہ نہیں ہوتا البتہ بظاہر ایک مادّہ معلوم ہوتا ہو۔ صنعت شبہ اشتقاق میں قرآن کی یہ آیت ہے: قال انی لعملکم من القالین۔ اس میں "قال" اور "قالین" میں شبہ اشتقاق ہے (ترجمہ۔ کہا کہ میں تمہارے اعمال کے سبب تمہارے دشمنوں یعنی بغض رکھنے والوں میں سے ہوں)۔

لیجئے اب کلام مرزا دبیر سے مثالیں ملاحظہ فرمائیں

بس اے دبیر طاقت نظم و بیاں ہے طاق ہوش الوداع کہتا ہے اور عقل الفراق

(حاشیہ میں) طاقت او طاق میں صنعت شبہ اشتقاق ہے۔

یاں سبکو تھا یقین کہ یہاں تھی وہیں نہ تھی وال اتفاق تھا کہ یہاں تھی یہیں نہ تھی
سر جا تھی اور پوچھو کہاں تھی کہیں نہ تھی لاکھوں کے قتل کر نیکو ہاں تھی نہیں نہ تھی
اس برق ذوالفقار کے جلوے کہاں نہ تھے
واں تھے جہاں زمیں نہ تھی آسماں نہ تھے

(حاشیہ میں) اس میں شبہ اشتقاق کے علاوہ ذوقافیتین کی صنعت بھی ہے۔

۱۲۔ **غیر منقوط** یہ صنعت بھی اسی لزوم مالایلزم میں سے ہے۔ اسے صنعت مہملہ۔۔۔ بھی کہتے ہیں۔ مرزا دبیر کا ایک پورا مرثیہ اسی صنعت میں ہے۔ اس کا مطلع ہے۔

مہر علم سرورِ اکرم ہوا طالع

۱۳۔ **سجع و ترصیع**: ایک لفظ کے مقابل جب دوسرے ہم وزن لفظ لائیں تو اس کو سجع کہتے ہیں۔ وزن سے مراد وزن عروضی ہے۔ جس میں حرکات الفاظ کا باہم متفق ہونا ضروری نہیں ہے اور اگر متفق ہوں تو اور خوبی ہے۔ جب وہ الفاظ باہم قافیہ بھی ہو سکیں تو اس کو ترصیع کہتے ہیں۔

اس کا مرتبہ سجع سے اعلیٰ ہے۔ . . . .

. . . .

. . . . . .

(۱) حضرت علی اکبرؑ کے رجز میں مرزا صاحب کا ایک بند:

ہم قابض اجسام ہیں کفّار کی خاطر
ہم مرہمِ آرام ہیں دیندار کی خاطر
ہم ضربتِ صمصام ہیں اشرار کی خاطر
ہم قوتِ اسلام ہیں ابرار کی خاطر
ہم پردۂ ستاری و غفاریِ رب ہیں
ہم خنجرِ قہاری و جباریِ رب ہیں

(۲) لے ہدیۂ تائیدِ قدیرِ ازلی لے
لے خلعتِ تحسینِ حسین ابنِ علی لے

(۳) صنعتِ ترصیع۔ رجز امام حسینؑ کے موقع پر چار مصرع لکھے ہیں۔

معبود تیز و کل نے کریمانہ رضا دی
اور صاحب دلدل نے بزرگانہ دعا دی
نوح اپنی توکل نے دلیرانہ بڑھا دی
آمد کے تجمل نے نقیبانہ ندا دی

(۴) ترصیع میں یہ ٹیپ ایک باغ کی تعریف میں ہے۔ دیکھئے اس رنگ میں بھی مرثیت کا پہلو موجود ہے۔

ہر غنچہ ہے دفترِ غم شاہ دوسرا کا
ہر لالہ ہے محضرِ گل زخم شہدا کا

۱۴۔ سیاق الاعداد: عددوں کو باترتیب لا

اس کا مرتبہ سجع سے اعلیٰ ہے۔ کلام مرزا دبیر سے سجع و ترصیع کی مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) حضرت علی اکبر کے رجز میں .... ایک بند:

ہم قابض اجسام ہیں کفار کی خاطر
ہم مرہمِ آرام ہیں دیندار کی خاطر
ہم ضربتِ صمصام ہیں اشرار کی خاطر
ہم قوتِ اسلام ہیں ابرار کی خاطر
ہم پردۂ ستاری و غفاریِ رب ہیں
ہم خنجرِ قہاری و جباریِ رب ہیں

(۲) لے ہدیۂ تائیدِ قدیرِ ازلی لے
لے خلعتِ تحسینِ حسین ابنِ علی لے

(۳) صنعتِ ترصیع میں رجز امام حسین کے سلسلے میں چار مصرعے:

معبود حزز کل نے کریمانہ رضا دی
اور صاحب دلدل نے بزرگانہ دعا دی
نوح اپنی توکل نے دلیرانہ بڑھا دی
آمد کے تجمل نے نقیبانہ ندا دی

(۴) باغ کی تعریف میں یہ ٹیپ صنعت ترصیع میں ملاحظہ فرمائیں:

ہر غنچہ ہے دفترِ غم شاہِ دوسرا کا
ہر لالہ ہے محضرِ گل زخمِ شہدا کا

۱۴۔ سیاق الاعداد: کلام میں عددوں کو باترتیب یا

بے ترتیب... نظم کر دینے کو... سیاق الاعداد کہتے ہیں ۔

مدح پنجتن پاکؑ میں کہتے ہیں

....

واجب ہے شش جہت پہ تولّائے پنجتن　　ہیں ہشت خلد بہر احبّائے پنجتن
ساتوں سقر ہیں مسکنِ اعدائے پنجتن　　چرخِ نہم ہے کرسیِ زیبائے پنجتن

ایماں پناہ ہیں یہ شریعت پناہ ہیں
ان کے شرف پہ پانچ نمازیں گواہ ہیں
ہر فرد کو خدا نے دیا خمسۂ حواس　　تا حقِّ پنجتن کے شناسا ہوں حق شناس
ناموں پہ انکے پانچ نمازوں کا ہے اساس　　جنکو کہ ان کا پاس ہے، وہ ہیں خدا کے پاس
پانچ انگلیوں سے ہم نے چنا ایک بات کو
بس پنج تن کے سامنے پھیلاؤ ہات کو

۱۵۔ صنعت تضمین: بعض الفاظ عربی یا بعض کلام عربی و فارسی کو صفائی و خوبصورتی سے لانے کو صنعت تضمین کہتے ہیں۔

....

....

....

حبیب ابن مظاہر کی مدح میں کہتے ہیں

(۱) بنتے ہی یہ قالب سوئے شبیرؑ پکارا
القلب علی بابک لیلاً و نہارا

لشکر امام حسینؑ کی کیفیت صبح عاشورا محرم ۶۰ھ

(۲) پڑھتا تھا کوئی فاعتبروا یا اولی الابصار
اک سمت توکلت علی اللہ کی تکرار
اک جا فسیکفیکھم اللہ کی گفتار
منہ سے کہیں وجّہت الی اللہ کا اظہار

بے ترتیب نظم کر دینے کو سیاق الاعداد کہتے ہیں۔ مثال ملاحظہ فرمائیں۔ پنجتن پاکؑ کی مدح میں مرزا دبیر کہتے ہیں۔

واجب ہے شش جہت پہ تولّائے پنجتن　　ہیں ہشت خلد بہر احبّائے پنجتن
ساتوں سقر ہیں مسکنِ اعدائے پنجتن　　چرخِ نہم ہے کرسیِ زیبائے پنجتن

ایماں پناہ ہیں یہ شریعت پناہ ہیں
ان کے شرف پہ پانچ نمازیں گواہ ہیں
ہر فرد کو خدا نے دیا خمسۂ حواس　　تا حقِّ پنجتن کے شناسا ہوں حق شناس
ناموں پہ انکے پانچ نمازوں کا ہے اساس　　جنکو کہ ان کا پاس ہے وہ ہیں خدا کے پاس
پانچ انگلیوں سے ہم نے چنا ایک بات کو
بس پنجتن کے سامنے پھیلاؤ ہات کو

۱۵۔ تضمین: بعض الفاظ عربی یا بعض کلام عربی و فارسی کو صفائی و خوبصورتی سے لانے کو صنعت تضمین کہتے ہیں۔ مرزا دبیر کو عربی اور فارسی پر قدرت تھی۔ اس لیے ان کے ہاں اس صنعت کے کامیاب نمونے ملتے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) بنتے ہی یہ قالب[1] سوئے شبیرؑ پکارا
القلب علی بابک لیلاً و نہارا

(۲) پڑھتا تھا[2] کوئی فاعتبروا یا اولی الابصار
اک سمت توکلت علی اللہ کی تکرار
اک جا فسیکفیکھم اللہ کی گفتار
منہ سے کہیں وجّہت الی اللہ کا اظہار

---

[1] حبیب ابن مظاہر کی مدح میں
[2] صبح عاشور لشکر امام حسین کی کیفیت

وہ مصحفِ ناطق کی حفاظت میں سدا تھے	وہ مصحفِ ناطق کی حفاظت میں سدا تھے
گر حافظِ قرآں رفقا تھے تو بجا تھے	گر حافظِ قرآں رفقا تھے تو بجا تھے

استفادہ کرنے کا یہی انداز مرزا دبیر کی ایجادات کے بیان کے سلسلے میں اختیار کیا گیا ہے۔ ان ایجادات کو اپنی کتاب میں لکھنے سے قبل ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے۔

"اس موقع پر جو ایجادات ثابت نے مرزا دبیر سے منسوب کی ہیں ان کو یہاں پیش کیا جاتا ہے"

خیال تھا کہ اب اقتباس شروع ہوگا مگر یہاں بھی دبیر کی عبارت کو اپنا بنا کر پیش کر دیا ہے۔ دونوں کتابوں سے ایجادات سے متعلق عبارت ملاحظہ ہو:

حیات دبیر	ڈاکٹر آزردہ
مرثیہ کو حمد و نعت و منقبت سے شروع کیا اور بادشاہ و مجتہدین عصر کی بھی مدح فرمائی یہ مرثیہ بہت مشہور ہے اور دفتر ماتم کی جلد اوّل میں سب سے اوّل چھپا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے سہ طغرا نویسِ کن فیکون ذوالجلال ہے ص۲۶	مرثیہ کو مرزا دبیر نے حمد و نعت و منقبت سے شروع کیا اور بادشاہ و مجتہدین عصر کی بھی مدح فرمائی۔ ــــــــــ دفتر ماتم کی جلد اوّل میں پہلا مرثیہ ایسا ہی ہے اور مطلع ہے یہ طغرا نویسِ کن فیکون ذوالجلال ہے ص۳۴۸

ایجاد نمبر ۲ میں ڈاکٹر صاحب نے ثابت کی عبارت کا کچھ حصہ تو تفصیل میں خود لیا کچھ کو حاشیہ پر ڈال دیا اور چند سطریں اقتباس کی صورت میں پیش کر دیں۔ ملاحظہ ہو:

حیات دبیر ص۲۶۰ - ص۲۶۱	ڈاکٹر آزردہ ص۳۴۹ - ص۳۵۰
چہاردہ معصومین علیہم السلام کے حال میں علیحدہ علیحدہ مرثیے کہے چنانچہ دفتر ماتم کی چودہ جلدوں میں یہ ترتیب مبارک ہے کہ ہر جلد ایک معصومؑ کے حال کے مرثیہ سے شروع ہوئی ہے۔ ان مرثیوں کی تصنیف کی نسبت استاذی حضرت اوج مدظلہ فرماتے تھے کہ نواب نادر مرزا صاحب فیض آبادی نے مرزا صاحب کو فیض آباد میں زمانہ شاہی اودھ میں بلوایا تھا اور	مرزا دبیر نے چہاردہ معصومین علیہم السلام کے حال میں علیحدہ علیحدہ مرثیے کہے چنانچہ دفتر ماتم کی چودہ جلدوں میں یہ ترتیب مبارک ہے کہ ہر جلد ایک معصوم کے حال کے مرثیہ سے شروع ہوئی ہے۔ یہ مرثیے زیادہ مختصر ہیں[1]۔

ــــــ حاشیہ ــــــ

[1] ثابت نے مرزا اوج خلف مرزا دبیر کی روایت سے یہ نقل کیا ہے کہ ان کی ایک نامور شاگرد نواب مرزا نادر مرزا صاحب نے مرزا دبیر سے فرمائش کی تھی کہ چودہ معصوموں کے حال میں مجھے مختصر مرثیے کہہ دیجیے میں ہر

فرمایش کی تھی کہ چودہ معصوموں کے حال میں مجھے مختصر مختصر مرثیے
کہہ دیجئے کہ ہر معصوم کی وفات کے دن میں مجلس کیا کرتا ہوں ۔
پڑھا کروں گا ۔ مرزا صاحب فیض آباد سے جب چلے ہیں تو
ان کے چند نوکر ہمرکاب آئے تھے ۔ مرزا صاحب پالکی میں
آئے تھے ۔ راستے میں یہ تمام مرثیے کہتے آئے تھے ۔ لکھنؤ
آکر جب ان کے تمام ملازم رخصت ہوئے تو وہ تمام مرثیے مرزا
صاحب نے ان کے ہاتھ مرزا صاحب کو بھجوا دیئے ... مرزا
صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ ہر معصوم کے حال میں ایک ایک مرثیہ
طولانی اور کہوں گا چنانچہ امام موسیٰ کاظم کے حال میں ایک
مرثیہ بہت بڑا کہا ... اس کی یہ ٹیپ بہت مشہور و مقبول ہے

حضرت پہ انتہا اسیری گزر گئی   زنداں میں جوانی دبیر کی گزر گئی

ثابت اس بارے میں تحریر کرتے ہیں :

"مرزا صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ ہر معصوم کے حال میں ایک
ایک مرثیہ طولانی اور کہوں گا ۔ چنانچہ امام موسیٰ کاظم کے حال
میں ایک مرثیہ بہت بڑا کہا ... اس کی ایک مشہور ٹیپ ہے

حضرت پہ انتہا اسیری گزر گئی   زنداں میں جوانی دبیر کی گزر گئی"

حاشیہ کا باقی

معصوم کی وفات کے دن مجلس کیا کرتا ہوں پڑھا کروں گا ۔ مرزا دبیر
صاحب جب فیض آباد سے چلے تو ان کے چند نوکر ہمرکاب تھے ۔ مرزا دبیر
پالکی میں آئے تھے راستے میں یہ تمام مرثیے کہتے آئے تھے ۔ لکھنؤ آکر جب
ان کے ملازم رخصت ہو گئے تو ان کے ہاتھ نواب صاحب موصوف
کو بھیج دیئے ۔ (حیات دبیر جلد اوّل ص ۲۶۰-۲۶۱)

ایجاد نمبر ۶ ملاحظہ ہو :

حیات دبیر

مرزا دبیر کے عہد میں ترکوں نے کربلائے معلیٰ
میں قتل عام کیا تھا جس میں بعض علمائے اسلام بھی شہید
ہو گئے تھے ۔ از بسکہ علماء کا قتل بالخصوص اہل علم کے
دلوں پر بہت صدمہ پہنچاتا ہے ۔ اسی عالم غم و رنج میں مرزا
صاحب نے ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے ؎

اے شہر خدا، رومیوں کو زیر و زبر کر   ص ۲۶۲

ڈاکٹر آزردہ

مرزا دبیر کے عہد میں ترکوں نے کربلائے معلیٰ
میں قتل عام کیا تھا ۔ جس میں بعض علمائے کرام اسلام بھی شہید
ہو گئے تھے ۔ از بسکہ علماء کا قتل بالخصوص اہل علم کے
دلوں پر بہت صدمہ پہنچاتا تھا ۔ اسی سے متاثر ہو کر مرزا
دبیر نے ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے ؎

اے شہر خدا، رومیوں کو زیر و زبر کر   ص ۲۵۰

ایجاد نمبر ۸ ملاحظہ ہو :

حیات دبیر

مرثیہ میں طرز بیان کے ہزاروں نئے نئے پہلو
نکالے ۔ چنانچہ دو مرثیوں میں (یکے بعد دیگرے ،

ڈاکٹر آزردہ

مرثیہ میں طرز بیان کے ... نئے نئے پہلو
نکالے ۔ چنانچہ دو مرثیوں میں یکے بعد دیگرے

قیدخانۂ شام میں جناب سکینہؑ کے سو جانے کے لیے
جناب زینبؑ کا کہانی کہنا بیان کیا ہے اور وہ
کہانی خود امام حسینؑ کی ہے۔ ایک مرثیہ کا یہ مطلع ہے ؎
جبکہ زنداں میں نبی زادیوں کو رات ہوئی صـ۲۶۳

قیدخانۂ شام میں جناب سکینہؑ کے سو جانے کے لیے
حضرت زینب کا کہانی کہنا بیان کیا ہے اور وہ
کہانی خود امام حسینؑ کی ہے۔ ایک مرثیہ کا یہ مطلع ہے ؎
جبکہ زنداں میں نبی زادیوں کو رات ہوئی صـ۲۵۱

ایجاد نمبر ۱۰ ملاحظہ ہو:

حیات دبیر

پانی اور آگ کا مناظرہ عجیب عمدہ پیرایہ میں نظم
کیا ہے اور ان دونوں عنصروں کے سبب سے جو ظلم اہل بیت
پر ہوے ان کو بیان کیا ہے۔ اس مرثیہ کا یہ مطلع ہے ؎
آتش سے سبب دشمنی آب کا کیا ہے صـ۲۶۶

ڈاکٹر آزردہ

پانی اور آگ کا مناظرہ۔۔۔ ۔۔۔ عمدہ پیرایہ میں نظم
کیا ہے اور ان دونوں عنصروں کے سبب سے جو ظلم اہل بیت
پر ہوئے ان کو بیان کیا ہے۔ اس مرثیہ کا۔۔۔ مطلع ہے ؎
آتش سے سبب دشمنی آب کا کیا ہے صـ۲۵۱

ایجاد نمبر ۱۱ ملاحظہ ہو:

حیات دبیر

امام حسینؑ کے قتل کے بعد ہی ان مسلمانوں
نے جو دل سے آل محمدؐ کے دوست تھے قاتلان امام
حسینؑ کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ طوفان انتقام
پانچ چھ برس تک اٹھتا رہا۔ جس سے یزید وغیرہ بنی امیہ
کی سلطنت کو بہت صدمہ پہنچا۔ ان بدلہ لینے والوں میں سے
مسیب و سلیمان صرد وغیرہ کئی صحابی مقبول تھے اور بعض
اصحاب علی و حسنینؑ میں سے تھے۔ سب سے زیادہ جن
دلیر جاں باز کو کامیابی ہوئی وہ مختار ابن ابو عبیدہ ثقفی
ہیں۔ جنھوں نے ۶۴ھ کے قریب قریب ایک لشکر فراہم
کر کے ابراہیم ابن مالک اشتر کو سپہ سالار فوج بنا کر تقریباً
تمام قاتلان حسینؑ و اصحاب حسینؑ کو قتل کیا۔ اور خوب

ڈاکٹر آزردہ

امام حسین کی شہادت کے بعد ہی محبان اہل
بیتؑ نے قاتلان امام حسین سے
انتقام لینے کی غرض سے ان کو قتل کرنا
شروع کیا تھا اور پانچ چھ برس تک
یہ طوفان اتنا شدید رہا کہ مخالفین
امام کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ان بدلہ
لینے والوں میں سب سے زیادہ کامیابی جن
دلیر جانباز کو ہوئی وہ تھے مختار بن ابو عبیدہ۔ انہوں
نے ۶۴ھ کے قریب قریب ایک لشکر فراہم
کر کے ابراہیم بن مالک اشتر کو سپہ سالار فوج بنا کر تقریباً
تمام قاتلان حسینؑ ـــــــ کو قتل کیا ـــــ

ہی بدل لیا۔ اس حال میں بھی مرزا صاحب نے ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے ؎

جب تیغ انتقام برہنہ خدا نے کی ص۲۶۶

ایجاد ۱۵ ملاحظہ ہو:

شرع اسلام میں ذبیحہ (عید اضحیٰ) کے واسطے جس قدر شرائط (کتب فقہ میں) ہیں سب کو ایک مقام پر بطور تمہید بیان فرماکر (صاحب ذبح عظیم) امام حسینؑ کی تشنہ دہنی اور مصائب ذبح و قتل کا مقابلہ کیا ہے۔ اس مرثیہ کا مطلع یہ ہے ؎

آہوئے کعبۂ قربانیِ داور ہے حسینؑ

اور زیارت ناحیہ مقدسہ کے اکثر فقروں کا اس مرثیہ میں مطلب بیان کیا ہے ؎

کیا شان روضہ خلف بوترابؑ ہے ص۲۷

اس حال میں بھی مرزا دبیر نے ایک طویل مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے ؎

جب تیغ انتقام برہنہ خدا نے کی ص۲۵۱

شرع اسلام میں ذبیحہ عید الضحیٰ کے واسطے جس قدر شرائط کتب فقہ میں ہیں سب کو ایک جگہ پر بطور تمہید بیان فرماکر صاحب ذبح عظیم امام حسینؑ کی تشنہ دہنی اور مصائب ذبح و قتل کا مقابلہ کیا ہے۔ اس مرثیہ کا مطلع یہ ہے ؎

آہوئے کعبۂ قربانیِ داور ہے حسینؑ

اور زیارت ناحیہ مقدسہ کے اکثر فقروں کا اس مرثیہ میں مطلب بیان کیا ہے ؎

کیا شان روضہ خلف بوترابؑ ہے ص۲۵۲

○

مرزا دبیر کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں بھی چند عنوانات کے تحت ڈاکٹر آزردہ نے حیاتِ دبیر سے پوری عبارات لے لی ہیں۔ مثلاً:

حیاتِ دبیر

علمی استعداد اور استاد ص۲۵-۲۶

... مرزا صاحب مرحوم نے تمام کتب درسیہ عربی و فارسی باقاعدہ پڑھی تھیں۔ جملہ علوم معقول و منقول میں تبحر حاصل تھا۔ ابتدائے شباب میں کتب درسیہ، صرف و نحو و منطق و ادب و حکمت وغیرہ مولوی ضامن صاحب سے اور کتب دینیہ حدیث و تفسیر و اصول حدیث و فقہ وغیرہ مولوی مرزا کاظم علی صاحب سے پڑھی تھی۔

ڈاکٹر آزردہ

علمی استعداد اور استاد ص۶۳-۶۴

مرزا دبیر ـــــ نے تمام کتب درسیہ عربی و فارسی باقاعدہ پڑھی تھیں۔ ـــــ علوم معقول و منقول میں تبحر حاصل تھا۔ ابتدائے شباب میں کتب درسیہ، صرف و نحو و منطق و ادب و حکمت وغیرہ مولوی علام ضامن سے اور کتب دینیہ حدیث و تفسیر و اصول حدیث و فقہ وغیرہ مولوی مرزا کاظم علی لکھنوی سے پڑھی تھیں۔

علاوہ ان کے ملا مہدی صاحب مجتہد مازندرانی اور مولوی
فدا علی صاحب اخباری سے بھی مرزا صاحب نے پڑھا تھا۔
مولوی فدا علی صاحب اخباری کے ایک شاگرد رشید مولوی
گلشن علی صاحب اخباری جون پوری نے ایک مجلس میں مرزا
صاحب سے فخریہ کہا تھا کہ بھائی صاحب ہم آپ ایک
استاد کے شاگرد ہیں اس لیے بھائی بھائی ہیں۔ مرزا صاحب
نے جواب دیا کہ بے شک آپ کا اور میرا فخر ہے کہ
آپ نے اور میں نے ایسے محدث کامل سے پڑھا ہے۔
اور آپ میرے استاد بھائی ہیں۔

حیاتِ دبیر

غیرت اور آن بان ص ۷۹-۸۱

مرزا دبیر نے جب ابتداً قریباً ۱۲۳۰ھ میں
مرثیہ کہنا اور پڑھنا شروع کیا ہے تو اس زمانے میں اکثر
مرثیہ گو شاعر گویا سوز خوانوں کے دست نگر تھے اور ایک
بڑے کامل سوز خواں میر علی صاحب موجود تھے جنکے
در دولت پر بڑے بڑے شاہزادے اور حکام سننے
کو آتے تھے اور وہ کسی کے یہاں نہ جاتے تھے۔ میر علی صاحب
زیادہ تر منشی دلگیر مرحوم کے سلاموں اور مرثیوں پر سوز
رکھتے تھے... اکثر مرثیہ گو اپنے سلام اور مرثیہ میر علی صاحب
کے پاس لے جاتے تھے جس شخص کا سلام سوز رکھ کر میر علی
صاحب ایک مرتبہ پڑھ دیتے تھے تمام لکھنؤ اور دور دور
اس کی شہرت ہو جاتی تھی۔ مرزا دبیر کی شہرت سن کر میر علی
صاحب نے کہلا بھیجا کہ میاں اپنے ایک دو مرثیے میرے

علاوہ ان کے ملا مہدی ـــ مجتہد مازندرانی اور مولوی
فدا علی ـــ اخباری سے بھی مرزا صاحب نے پڑھا تھا۔
مولوی فدا علی ـــ اخباری کے ایک شاگرد ـــ مولوی
گلشن علی ـــ اخباری جون پوری نے ایک مجلس میں مرزا
صاحب سے فخریہ کہا تھا کہ بھائی صاحب ہم آپ ایک
استاد کے شاگرد ہیں اس لیے بھائی بھائی ہیں۔ مرزا صاحب
نے جواب دیا کہ بے شک آپ کا اور میرا فخر ہے کہ
آپ نے اور میں نے ایسے محدث کامل (مولوی فدا
علی اخباری) سے پڑھا ہے۔ اور آپ میرے استاد بھائی ہیں۔

ڈاکٹر آزردہ

غیرت و مروت ص ۸۳-۸۴

مرزا دبیر کے ابتدائی ـــــــ
ـــــــ زمانے میں اکثر
مرثیہ گو شعرا سوز خوانوں کے دست نگر تھے اور ایک
بڑے کامل سوز خواں میر علی صاحب موجود تھے جنکے
در دولت پر بڑے بڑے شاہزادے اور حکام سننے
کو آتے تھے اور وہ کسی کے یہاں نہ جاتے تھے۔ نواب
سعادت علی خان انھیں فخر لکھنؤ سمجھتے تھے۔
میر علی صاحب زیادہ (تر) منشی دلگیر مرحوم کے سلاموں اور
مرثیوں پر سوز رکھتے تھے۔ اس زمانے میں کہا جاتا تھا کہ
میر علی جس مرثیہ گو کے کلام پر سوز رکھیں وہ مستند مرثیہ گو
سمجھا جائیگا۔ مرزا دبیر کی شہرت سن کر میر علی نے ان
سے کلام منگوایا۔ تین مرثیے بھیج دیے گئے۔ ایک روز

پاس بھیج دو۔ مرزا صاحب نے تین مرثیے بھیجے... اتفاق سے
ایک روز درگاہ یا کربلا میں کسی شخص نے ان ہی مرثیوں میں سے
ایک مرثیہ پڑھ دیا... میر علی صاحب کو یہ بات ناگوار ہوئی۔
اپنے کسی بازو یا جوابی کو مرزا صاحب کے پاس بھیجا اور کہلا
بھیجا کہ صاحبزادے میری امام حسین کے تصدق سے وہ شخص
ہے کہ جس مصنف کا مرثیہ پڑھ دے وہ تمام ہندوستان میں
مستند مرثیہ گو مانا جاتا ہے۔ منشی دلگیر اتنے بڑے مشاق مرثیہ گو
ہو کر جو مرثیہ مجھ کو دیتے ہیں وہ تین برس تک بغیر میری اجازت
کے دوسرے کو نہیں دیتے ... کیا تم مستند مرثیہ گو نہیں بننا
چاہتے تو جو مرثیہ مجھ کو دینا وہ تین برس تک دوسرے کو نہ
دینا۔ مرزا صاحب نے یہ پیام سن کر ان بازو یا جوابی کو
جواب دیا کہ... میں ہر طرح تعمیل حکم کو حاضر ہوں مگر یہ جو ارشاد
ہوا کہ مستند مرثیہ گو بننا چاہو تو مجھے مرثیہ دینا وہ تین سال تک
دوسرے کو نہ دینا اس کا جواب ہے کہ

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

میں اگر مستند مرثیہ گو بننا چاہتا ہوں تو امام حسین کی امداد اور
اپنی محنت و طبع خداداد سے اور یہ بات شاید میری مروّت
سے بھی دور ہوگی کہ کوئی ذاکر مجھ سے مرثیہ مانگے اور میں یہ کہہ کر
اس کی دل شکنی کروں کہ میر علی صاحب کا حکم نہیں اس لیے
مرثیہ میں نہیں دے سکتا۔ مجھ سے یہ شرط نہیں نبھ سکتی۔ میں
مجبور ہوں۔

کسی ذاکر نے انھیں میں سے کوئی مرثیہ پڑھا۔ میر علی
صاحب نے یہ سن کر مرزا دبیر کو کہلوایا کہ منشی دلگیر جو
سلام یا مرثیہ میر علی کو دیتے ہیں وہ کسی اور کو تین برس
تک میری اجازت کے بغیر نہیں دیتے میں وہ شخص ہوں
کہ جس کا مرثیہ پڑھوں وہ مستند مرثیہ گو سمجھا جائیگا

____

____

____

____

______________ کیا تم مستند مرثیہ گو نہیں بننا
چاہتے۔ آئندہ ایسا مت کرنا مرزا دبیر
نے اس کے جواب میں یہ پیغام بھیج
دیا کہ میں ہر طرح تعمیل حکم کو حاضر ہوں۔ مگر یہ جو ارشاد
ہوا کہ مستند مرثیہ گو بننا چاہو تو جو مرثیہ مجھے دینا وہ تین سال تک
دوسرے کو نہ دینا اس کا جواب ہے کہ

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

میں اگر مستند مرثیہ گو بننا چاہتا ہوں تو امام حسین کی امداد اور
اپنی محنت و طبع خداداد سے اور یہ بات شاید میری مروّت
سے بھی دور ہوگی کہ کوئی ذاکر مجھ سے مرثیہ مانگے اور میں یہ کہہ کر
اس کی دل شکنی کروں کہ میر علی صاحب کا حکم نہیں اس لیے
مرثیہ نہیں دے سکتا۔ مجھ سے یہ شرط نبھ نہیں سکتی۔ میں
مجبور ہوں۔

یہاں تک صرف 'حیات دبیر' سے لی ہوئی عبارتوں کی تفصیل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسری کتابوں سے مقابلے

کے بعد کچھ اور مواد سامنے آئے ۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے عرض حال میں لکھا ہے کہ

"تحقیق و تنقید میں دلچسپی رکھنے والوں میں ایسے بہت کم ہوں گے جنھیں شمس الضحیٰ، حیات دبیر، اور المیزان کے مطالعے کا موقعہ نہ ملا ہوگا۔" (ص۸ مرزا سلامت علی دبیر از ڈاکٹر آزردہ)

یہی یقین تھا جس کی بنا پر وہ حیات دبیر سے اتنا تفصیلی استفادہ کر سکے۔

اس کے علاوہ ان کو ایک شکایت بھی ہے:

"بعض مسائل کی تحقیق راقم نے پہلے کی تھی جنھیں لائق مصنفین نے کبھی حوالے کے ساتھ اور کبھی بغیر حوالے کے درج کیا۔" (ص۱۰ مرزا سلامت علی دبیر از ڈاکٹر آزردہ)

زیر نظر کتاب میں حیات دبیر سے متعلق ایک بحث ہے۔ افضل حسین ثابت نے مرزا دبیر کے والد مرزا غلام حسین کے حالات میں لکھا ہے کہ:

۱۔ "پریشانی کے عالم میں وارد لکھنؤ ہوتے تھے۔ ضرور مبتلائے عسرت ہوں گے ... باوصف عسرت کے صاحب ثروت تھے۔ عسرت کا اطلاق تو اس وجہ سے ہے کہ بہ نسبت دہلی کے لکھنؤ میں مرزا غلام حسین مسافر گویا مفلس تھے۔" (ص۹ حیات دبیر از افضل حسین ثابت)

۲۔ "مرزا غلام حسین مرحوم نے لکھنؤ میں بزرگوں کے اسباب کو بیچ بیچ کر بسر کی اور شادی کی اور مکانات خریدے اور نواب اودھ یا کسی اور رئیس کی نوکری نہیں کی۔ اور پھر لکھنؤ سے دہلی (شاید اپنی جائداد غیر منقولہ دہلی کی حفاظت یا فروخت کے لیے) چلے گئے ... مرزا غلام حسین کے پاس کافی سرمایہ تھا۔" (ص۱۲ حیات دبیر از افضل حسین ثابت)

اپنے بیان کے ثبوت میں افضل حسین ثابت نے ایک خط سید دلدار علی (مرقومہ چہارم شہر رمضان ۱۲۱۶ھ) اور دوسرا نواب مختار علی خاں برادر زادۂ نعمت خاں عالی کا خط جس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے مگر مہر ۱۲۱۲ھ کندہ ہے پیش کیے ہیں۔ جن سے مرزا غلام حسین کا صاحب زکوٰۃ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر آزردہ کو ثابت کے اس بیان پر اعتراض ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ثابت کے بیان میں تضاد ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص بیک وقت مبتلائے عسرت بھی ہو اور صاحب ثروت بھی۔ مگر انھوں نے اسی صفحہ پر ثابت کے اس جملے پر غور نہیں کیا کہ "عسرت کا اطلاق تو اس وجہ سے ہے کہ بہ نسبت دہلی کے لکھنؤ میں وہ مسافر گویا مفلس تھے"۔ ڈاکٹر صاحب نے مرزا غلام حسین کے حالات کے سلسلے میں جو مواد پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۰۵ھ سے ۱۲۰۷ھ کے درمیان لکھنؤ آئے۔ چونکہ سوتیلی ماں

کے رشتہ داروں نے تمام مال واملاک پر قبضہ کر لیا تھا، اس وجہ سے وہ پریشان تھے مگر والدہ کی وفات کے بعد ان کو وہ سب جائداد مل گئی (صاحب حیات دبیر نے بھی اس کی نشاندہی کی ہے کہ وہ اپنی جائداد غیر منقولہ کی حفاظت یا فروخت کے لیے دہلی گئے تھے) خود ڈاکٹر صاحب بھی لکھتے ہیں:

"مرزا صاحب موصوف اس وقت تک جائداد حاصل کر چکے تھے" ص ۴۶

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ثابت کے بیان کی تردید میں جس مواد کو انھوں نے استعمال کیا ہے اس سے خاطر خواہ نتائج اخذ نہیں کر سکتے اور ان کے بیان سے ثابت کے بیان کی ہی تائید ہو گئی انھوں نے اس سلسلے میں اس کا بھی سہارا لیا ہے جو مرزا غلام حسین نے ۱۲۱۵ھ میں تیار کروایا تھا۔ اس میں مرزا غلام حسین الہٰی نے مالی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں

"مرزا غلام حسین کے زرف مالی حالات ۱۲۱۵ھ میں خراب تھے" ص ۳۹

لیکن اس کے ساتھ ہی ۱۲۱۶ھ میں لکھا ہوا سید دلدار علی کے خط کا جس میں زکوٰۃ کی رقم بھیجنے کا ذکر ہے پیش کر دیا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۰۵ھ یا ۱۲۰۷ھ میں جب وہ لکھنؤ آئے تھے مالی اعتبار سے پریشان رہے ہوں گے مگر اس پر جلد ہی قابو پا لیا اور ۱۲۱۶ھ میں وہ اس لائق ہو گئے کہ اپنے مال پر زکوٰۃ نکال سکیں۔ بلکہ سید دلدار علی کے خط سے چار سال قبل ۱۲۱۲ھ کے لکھے نواب مختار علی خاں رئیس دہلی برادر زادہ نعمت خاں عالی کے خط (جس کا اقتباس ڈاکٹر صاحب نے ص ۳۹ پر دیا ہے جس میں انھوں نے مرزا غلام حسین کی طرف سے بھیجے گئے زکوٰۃ کے ۳۰۷۵ روپیوں کا ذکر کیا ہے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ استشہاد کے لکھے جانے کے وقت وہ مالی اعتبار سے قطعی پریشان نہیں تھے اور استشہاد میں پرانے واقعات کا ذکر ہے۔ اس وقت تک ان کے پاس اتنا روپیہ ہو گیا تھا کہ انھوں نے بغیر دربار سے وابستہ ہوئے یا نوکری کیے اپنا گذارہ کیا اور جائداد بھی خریدی۔ اگر عسرت ہوتی تو نواب آصف الدولہ اس صیغۂ اخوت کی جسے ملا محمد رفیع (مرزا غلام حسین کے دادا) اور برہان الملک نے پڑھا تھا ضرور لاج رکھتے۔

اس بحث کے سلسلے میں ڈاکٹر آزردہ نے نواب ضیاء الدولہ منیر الملک محمد نور اللہ خاں کے دو خط جو مرزا غلام حسین کے نام ہیں پیش کیے ہیں۔ ان دونوں پر جو مہریں ہیں ان کی وجہ سے خطوں کے تحریر کیے جانے کے زمانے کے تعین میں الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ پہلے خط پر ۱۱۹۰ھ کو اس خط کے تحریر کا سنہ مانتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ معلوم نہیں ہوتا کہ متھرا کب اور کس سلسلے میں گئے۔ دہلی سے گئے یا لکھنؤ سے۔ مگر اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مرزا صاحب اس زمانے میں جوان تھے۔ خط پر ۱۱۹۰ھ کی مہر کندہ ہے۔ مرزا صاحب موصوف کا سال

پیدائش بھی یہی ہے۔اس لیے خط ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء کے بعد کا ہونا چاہیے بلکہ لکھنؤ میں ایک دفعہ رہنے کے بعد کیونکہ خط ظاہر کرتا ہے کہ مرزا صاحب موصوف جوان ہو چکے ہوں گے" ص ۴۳، ۴۴

چونکہ خط پر مہر کا سنہ مرزا غلام حسین کا سال پیدائش ہے اس لیے وہ اس کو رد کر کے خط کے لکھے جانے کا ممکن سنہ ۱۲۹۰ھ تجویز کرتے ہیں مگر یہاں ان کے ذہن سے نکل گیا کہ ۱۱۹۰ھ اور ۱۲۹۰ھ میں سو سال کا فرق ہے اور ۱۱۹۰ھ میں پیدا ہونے والا ۱۲۹۰ھ میں جوان تو کیا زندہ بھی نہ ہوگا۔اس کا خیال ان کو نواب نوراللہ خاں کے دوسرے خط جس پر ۱۲۹۰ھ کی مہر لگی ہے کی تشریح کے وقت آیا اور انھوں نے اسے بھی خط کے لکھے جانے کا سنہ سمجھتے ہوئے لکھا:

"اس خط پر بھی غلط سنہ درج ہے۔اس لیے کہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء سے قبل مرزا غلام حسین کا انتقال ہو چکا تھا" ص ۴۵

یہ عبارت لکھتے وقت وہ پھر بھول گئے کہ یہ سنہ خود ان کا تجویز کردہ سنہ ہے۔اسی سلسلے میں آگے لکھتے ہیں:

"اب اگر اسے بجائے ۱۲۹۰ھ کے ۱۱۹۰ھ مان لیا جائے تو وہ بھی ناممکن ہے اس لیے کہ وہ مرزا کا سال پیدائش ہے۔مرزا اظہر علی برلاس اسے ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء قرار دیتے ہیں اور وہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔اس زمانے میں مرزا غلام حسین لکھنؤ آ چکے تھے" ص ۴۶۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۱۲۹۰ھ کو ۱۲۱۹ھ کیوں مان لیا جائے جبکہ مہروں پر سن صاف صاف کندہ ہیں۔مرزا اظہر علی برلاس نے ۱۲۱۹ھ کو کیوں مانا ہے اگر ڈاکٹر آزردہ وجوہ بھی دے دیتے تو مسئلہ کو سمجھنے میں مدد ملتی۔

اصل میں افضل حسین ثابت نے نواب مختار علی خاں کے خط (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) کے زمانۂ تحریر کا تعین کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس میں تاریخ درج نہیں ہے مگر مہر میں ۱۲۱۲ھ کندہ ہے اس لیے (سنہ بارہ سو بارہ) ۱۲۱۲ھ کے قریب قریب زمانے کا یہ خط سمجھنا چاہیے"۔ (حیات دبیر از افضل حسین ثابت ص ۱۰۹)

ڈاکٹر آزردہ نے بھی یہی طریقہ اپنایا اور مہر پر کندہ سنہ کو خط کے تحریر کیے جانے کا سنہ مان لیا حالانکہ مہر پر وہی سنہ کندہ ہوتا ہے جس میں وہ بنوائی جائے چاہے استعمال کبھی بھی ہو۔اس کا ثبوت فرمان اور استشہاد دونوں پر لگی مہروں سے ملتا ہے۔پہلا فرمان شہنشاہ دہلی ۱۱۸۷ھ میں لکھا گیا اور دوسرا فرمان ۱۱۹۰ھ میں مگر دونوں پر ۱۱۷۳ھ کی مہر ہے۔استشہاد پر جو مہریں ہیں ان میں نواب محمد نوراللہ خاں کی مہر ۱۱۹۰ھ کی ہے۔اس کے علاوہ سید فرزند علی کی مہر ۱۲۱۰ھ کی ہے۔مرزا رحمت علی خاں کی ۱۲۱۰ھ، سید دلدار علی ۱۲۱۰ھ، کاظم علی خاں ۱۲۰۹ھ، نواب محمد مسیح اللہ خاں ۱۱۹۹ھ، امجد علی خاں ۱۱۹۰ھ، مختار علی خاں ۱۲۱۲ھ، علی مراد خاں ۱۲۰۹ھ، امین الدین خاں ۱۲۰۹ھ، مرزا محمد باقر ۱۱۹۴ھ اور حسن رضا خاں

صاحب کی مہر ۱۱۸۰ھ کی ہے جبکہ استشہاد کے لکھے جانے کا سنہ ۱۲۱۵ھ ہے۔

"تحریر فی التاریخ ہفتم رجب المرجب ۱۲۱۵ ہجری نبویؐ"۔ (استشہاد از حیات دبیر)

اسی طرح یہ تمام مہریں استشہاد سے لکھے جانے سے بہت پہلے کی ہیں بلکہ حسن رضا خاں صاحب کی مہر تو مرزا غلام حسین کی پیدائش سے بھی پہلے کی ہے۔ اگر وہ مہروں کے ذریعے خط کی تحریر کا زمانہ متعین کرنے کے بجائے اس کے متن سے کچھ نتائج اخذ کرتے تو شاید مرزا غلام حسین کے حالات زیادہ واضح ہو جاتے۔

○

ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے آخر میں اٹھارہ صاحب قلم حضرات کے تبصرے ہیں۔ ان میں سے صرف چند تبصروں کے کچھ حصے پیش ہیں۔

۱۔ پروفیسر شبیہ الحسن لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر محمد زماں آزردہ نے مستند علمی معیاروں کو پیش نظر رکھ کر تحقیقی دنیا کو اپنی بالغ نظری کا ایک تحفہ دیا ہے... ان کا یہ کارنامہ نہ صرف ان کے حسن ذوق، رسائی فکر اور محنت شاقہ کی گواہی دیتا ہے بلکہ مرثیہ کی تحقیقی اور تنقیدی تاریخ میں بالعموم اور مرزا دبیر کے سلسلے میں بالخصوص مستقل اہمیت اور معنویت کا حامل رہے گا۔ یقین ہے کہ ان کی یہ سعی جمیل مرزا دبیر کے متعلق غفلت سے چونکانے کا باعث ہو گی۔"

۲۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے:

"ڈاکٹر محمد زماں آزردہ نے دبیر پر قلم اٹھایا ہے اور اس شان سے کہ تحقیق و تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کا کام دبیریات میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے اور قدر افزائی کا مستحق ہے۔"

۳۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ:

"محمد زماں آزردہ کی یہ کتاب مطالعات دبیر میں انتہائی نمایاں مقام کی مستحق ہے۔ انھوں نے دبیر کے سوانح حیات میں بہت سی نئی باتیں کہی ہیں اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے۔"

۴۔ جناب رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

"مرزا محمد زماں آزردہ نے بڑی ہمت اور جرأت کا ثبوت دیا کہ مرزا دبیر کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنایا۔ اور اس سے زیادہ ہوش مندی کا ثبوت یوں دیا کہ اپنے مقالے کو اس طرح نہیں لکھا جس طرح تحقیقی مقالے عموماً آج کل لکھے جاتے ہیں۔ دل لگا کر اور نظر جما کر ان سب تحریروں کا مطالعہ کیا جو اب تک اس سلسلے میں لکھی جا چکی تھیں۔ اور پھر یہ کوشش کی کہ جو کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس کو جانچا پرکھا جائے اور امکان کی حد تک اس پر اضافے کیے جائیں... یہ عام انداز کا طالب علمانہ بڑا

کا مقالہ نہیں یہ تو ایک مستقل کتاب ہے جو کسی شخص نے اپنے شوق سے لکھی ہے اور اس لیے لکھی ہے کہ مرزا دبیر کے سلسلے میں واقعات اور حقائق کا پتہ لگایا جائے بہت ہی خوش ہوا تھا اس کتاب کو پڑھ کر۔ ہماری دانش گاہوں کے تحقیقی کاموں کے متعلق جو بدظنی اب عام ہوتی جا رہی ہے یہ کتاب اس کو کچھ کم کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔"

۵۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے لکھا ہے:

"مرزا دبیر کے حالات میں افضل حسین ثابت کی کتاب 'حیات دبیر' ابھی تک حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ بعد کے لکھنے والے اس کتاب میں پیش کی جانے والی معلومات پر کوئی خاص اضافہ نہ کر سکے اور زیادہ اسی سے خوشہ چینی کرتے رہے... ادبی حلقوں میں ڈاکٹر زماں آزردہ کی اس کتاب کا گرم جوشی سے خیر مقدم ہوا ہے اور ہونا بھی چاہیے اس لیے کہ یہ کتاب سلسلۂ دبیریات کی اہم ترین کڑیوں میں سے ہے اور اس نے مرزا دبیر کا وہ قرض جو ہم سب پر تھا بڑی حد تک ادا کر دیا ہے"۔

۶۔ جناب کاظم علی خاں صاحب نے لکھا ہے۔

"مجھے امید ہے کہ اپنے ان تمام مثبت پہلوؤں کی بنیاد پر یہ کتاب مطالعۂ دبیر میں مفید و معاون ثابت ہوگی۔ اور ادبی حلقوں میں اس کی جدید اشاعت بھی مقبول ہوگی۔

••

ڈاکٹر محمد زماں آزردہ
شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی

جواب

میرے لیے یہ بات باعث مسرّت ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے میری اس کوشش کو قابل مطالعہ سمجھا اور اس پر خامہ فرسائی بھی فرمائی۔ شرمندہ ہوں کہ مقالہ نگار کا نام اس مسودہ پر درج نہیں جو مجھے بھیجا گیا ہے۔ اس لئے نام لے کے ذکر کرنا ممکن نہیں۔ مقالہ نگار کی صلاحیتوں کی داد دینا ضروری ہے کہ حیات دبیر اور مرزا سلامت علی دبیر کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا ہے۔ البتہ ایک بات کا اندازہ فوراً ہی ہو جاتا ہے کہ مقالہ نگار نے تحقیقی بصیرت کے بدلے اپنے ذہنی رویے سے رہنمائی حاصل کی ہے۔ مرزا سلامت علی دبیر میں درج ایک جملے کو انھوں نے کسی سبب سے غلط سمجھا ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر پہلے نتائج اخذ کیے ہیں، اس کے بعد ان نتائج کی تائید کے لیے "حیات دبیر" اور "مرزا سلامت علی دبیر" سے عبارتیں نقل کر کے اپنے نتائج پیش کیے ہیں۔ اس کوشش میں انھیں پوری کتاب میں ایک بات بھی ایسی نظر نہ آئی جس کو وہ مثبت انداز میں پیش کرتے۔ وہ جملہ جس کے سمجھنے میں سہو ہوا ہے یہ ہے:

"تحقیق و تنقید میں دلچسپی رکھنے والوں میں ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جنھیں شمس الضحیٰ، حیات

دبیر اور المیزان کے مطالعے کا موقعہ نہ ملا ہوگا۔" مرزا سلامت علی دبیر ص ۸۔

اسی جملے پر فاضل مقالہ نگار نے یہ حکم لگایا ہے کہ " یہی یقین تھا جس کی بنا پر وہ "حیات دبیر" سے اتنا تفصیلی استفادہ کر سکے۔" فاضل مقالہ نگار اس جملے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ راقم کی نظر میں لوگوں نے ان کتب کو دیکھا ہی نہیں ہے۔ اس طرح سے ان کی تحقیق یا تشکیک کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے فاضل مقالہ نگار کی نظر سے "شمس الضحیٰ" اور "تنقید آبِ حیات" اب بھی نہیں گذری ہیں۔ راقم کی نیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ "حیات دبیر" کے حوالے کتاب کی ابتدا سے آخر تک تقریباً ہر صفحے پر ملتے ہیں۔ اصل میں اس دور میں مرزا دبیر پر قلم اٹھانے والا کوئی بھی شخص اس کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

فاضل مقالہ نگار نے نقول فرامین شاہی کے سلسلے میں یہ اعتراض فرمایا ہے کہ "حیات دبیر" کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ اور بعض عبارت کو اس لیے حذف کر دیا گیا ہے کہ پڑھنے والوں کو اصل ماخذ کا پتہ نہ چلے۔ مقالہ نگار کی نیت پر یوں براہ راست شک کرنا نہ صرف یہ کہ روحِ تحقیق کے منافی ہے بلکہ خود فاضل مقالہ نگار کی نیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس سلسلے میں مؤدبانہ گذارش یہ ہے کہ ان کی معلومات "حیات دبیر" تک محدود ہیں۔ اگر ان کی نظر سے "شمس الضحیٰ" از مولوی صفدر حسین اور "تنقید آبِ حیات" از سید محمد رضا ظہیر گذری ہوتیں تو انھیں ایسا دھوکا نہ ہوتا۔ یہ فرامین مع استشہاد پہلی بار "شمس الضحیٰ" (۱۲۹۸ھ) میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد تنقید آبِ حیات میں (۱۳۰۳ھ) میں۔ اس کے بعد "حیات دبیر" (۱۹۱۳ء) مرزا دبیر نمبر ماہِ نو پاکستان (ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۵ء) شاعر اعظم (اکبر حیدری) میں برابر چھپے۔ خود صاحب حیات دبیر کا ماخذ شمس الضحیٰ ہے۔ راقم نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ یہ فرامین اس نے خود فراہم کیے ہیں بلکہ "شمس الضحیٰ" اور "تنقید آبِ حیات" کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں فرامین سے پہلے کے صفحات ملاحظہ فرمائے جاتے تو حوالے بڑی آسانی سے سامنے آتے۔ یہ ایک مجبوری تھی کہ حوالہ وہاں دیا گیا ہے۔ جہاں ان فرامین پر بحث ہوئی ہے اور وہیں اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ فرامین کن صفحات پر موجود ہیں ———— یہ اتفاق ہے کہ "شمس الضحیٰ" اور "مرزا سلامت علی دبیر" ایک ہی سائز پر چھپی ہیں۔ البتہ دو عکوس جو "شمس الضحیٰ" میں ناقص ہو گئے تھے مرزا علی اظہر برلاس کے مضمون مشمولہ ماہِ نو دبیر نمبر سے لیے گئے ہیں۔ جن کے حوالے متن میں موجود ہیں۔

ملا الٰہی کی رباعی جو مرزا سلامت علی دبیر کے ص ۱۸ پر درج ہے پر اعتراض یہ ہے کہ اسے حیات دبیر سے لیا گیا ہے اور حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں گذارش ہے کہ یہ رباعی اور قطعہ شمس الضحیٰ میں موجود

ہے اور راقم نے نہ صرف اس کا حوالہ دے دیا ہے بلکہ اس سے اقتباس بھی دیا ہے۔ اگر صاحب حیات دبیر نے اپنی کتاب میں حوالہ دے دیا ہوتا تو فاضل مقالہ نگار کو غلط فہمی نہ ہوتی۔

مرزا دبیر کی جس رباعی کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے ص ۱۳۶ پر بغیر حوالے کے درج ہے۔ سرسری طور پر دیکھا جائے تو ص ۱۳۶ اور ص ۱۳۷ پر حیات دبیر کا حوالہ پورے اقتباس کے ساتھ موجود ہے۔ حالانکہ اگر کلام دبیر کے لیے، جو منظر عام پر آچکا ہے، ثابت کا حوالہ نہ بھی دیا جاتا تو کوئی خرابی نہ تھی۔

صدمات اواخر عمر کے سلسلے میں فاضل مقالہ نگار نے یہ اعتراض فرمایا ہے کہ "حیات دبیر" کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ غالباً فاضل مقالہ نگار اپنے غائر مطالعہ کے باوجود یہ ملاحظہ نہ فرما سکے کہ ان ہی صفحات یعنی ص ۱۴۷۔۱۴۶ دونوں پر حیات دبیر کا حوالہ نمایاں طور پر موجود ہے۔ اُن کی خدمت میں یہ بھی عرض کر دوں کہ انتقال کی یہ تاریخیں "شمس الضحیٰ" میں بھی موجود ہیں۔

"غذا" کے بیان کے سلسلے میں اعتراض بھی بے جا ہے۔ کیونکہ مرزا سلامت علی دبیر میں افضل حسین ثابت اور شاد عظیم آبادی کے بیانات پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر فاضل مقالہ نگار نے محسوس فرمایا کہ حوالہ نہیں دیا گیا ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔

انتقال دبیر کے بارے میں اعتراض بھی بے معنی ہے۔ کیونکہ "مرزا سلامت علی دبیر" میں حیات دبیر، پیمبرانِ سخن، اودھ اخبار، ماہِ نو دبیر نمبر اور دیگر مآخذ کا حوالہ دیدیا گیا ہے۔ لگتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے نہ تو وہ بحث ملاحظہ فرمائی جو حاشیوں میں موجود ہے اور نہ حیات دبیر کے بغیر کوئی اور کتاب دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔

صنائع کی بحث کے سلسلے میں فاضل مقالہ نگار کا اعتراض یہ ہے کہ یہ ساری بحث "حیات دبیر" سے لی گئی ہے اور حوالہ کہیں موجود نہیں ہے۔ فاضل مقالہ نگار کو اس میں بھی سہو ہوا ہے۔ مرزا سلامت علی دبیر میں چونکہ فکر بلیغ، موازنۂ انیس و دبیر، المیزان، دبستانِ دبیر، مقالہ مظفر حسن ملک (جو اس زمانے میں غیر مطبوعہ تھا) اور دیگر مآخذ کے حوالے ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ اس لیے انھوں نے یہ خیال فرمایا کہ یہ سب کا سب "حیات دبیر" سے لے لیا گیا ہے اور بغیر حوالہ کے نقل ہوا ہے۔

ایجادات دبیر کے سلسلے میں کیا جانے والا اعتراض بھی دلچسپ ہے، کیونکہ ان ایجادات کا بیان ہی ثابت کے حوالے سے شروع ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں ایک بات یہ بھی ہوئی کہ راقم نے جو اضافے کیے ہیں۔ وہ بھی حوالہ کی وجہ سے

ثابت کے کھاتے میں چلے جاتے ہیں۔

علمی استعداد اور استاد ـــــ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ ص ۴۶ پر "حیات دبیر" ص ۲۶-۲۷ کا حوالہ موجود ہے

غیرت اور آن بان ـــــ ص ۸۵ پر "حیات دبیر" ص ۸۱-۸۰ کا حوالہ موجود ہے۔

اختتام سے قبل میں فاضل مقالہ نگار کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کو اس لائق سمجھا کہ اس پر وہ اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود بہت زیادہ وقت صرف کر سکے۔ میرا خیال ہے کہ یہ عدیم الفرصتی ہی ہو سکتی ہے کہ انھیں ایک بار نہیں بار بار دھوکا ہوا ہے ـــــ راقم کے بارے میں ان کی رائے کہ "ایک جملہ لکھ سکتے ہیں" یہ سند راقم کی توقع سے بہت زیادہ ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہوتی اگر فاضل مقالہ نگار کی نیت یا عدیم الفرصتی اس بات کے آڑے نہ آتی کہ وہ یہ دیکھ سکتے کہ اس کتاب میں پہلی بار کون کون سی چیزیں سامنے آئی ہیں۔ چاہے وہ مرزا دبیر کا غیر مطبوعہ کلام تھا (غیر مطبوعہ مثنویاں بھی اس میں شامل ہیں)، غیر مطبوعہ نثر تھی یا بعض اور حقائق۔ بہر حال میں ان ناقدین سے معذرت خواہ ہوں، جن کے تبصروں سے بعض اقتباسات کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہیں اور فاضل مقالہ نگار نے ان کی نیت اور مطالعہ کی صلاحیت دونوں پر شک کیا ہے۔

امید ہے آئندہ بھی فاضل مقالہ نگار اپنا مطالعہ جاری رکھیں گے اور پہلے سے کوئی رائے قائم کر کے مطالعہ نہیں فرمائیں گے۔ وہ اس کا بھی خیال رکھیں گے کہ جب ایک موضوع پر کئی کتابیں سامنے ہوتی ہیں تو بیشتر مواد اور واقعات کو دہرانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے مطالعہ میں دیکھا یہ جاتا ہے کہ کس کتاب میں کونسی نئی بات سامنے آتی ہے۔

آخر میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور ان کے معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جو وادی میں خرابی حالات، ڈاک کی ناقص ترسیل وغیرہ کے باوجود مجھے برابر یاد دہانی کراتے رہے کہ میں اس پر کچھ لکھوں۔ اول تو آج کل کے حالات میں فاضل مقالہ نگار کے مقالہ کی نقل ہی مجھ تک بھجوانا آسان نہ تھا۔

●●

ڈاکٹر رضوان احمد خاں
شعبۂ اردو
ایس کے آر کالج بربیگھہ . مونگیر

ڈاکٹر حمیرا خاتون کا تھیسس

دیوان مہدی بخش تسلیم

یہ کتاب ڈاکٹر حمیرا خاتون کے تحقیقی مقالہ "احوال و آثار مہدی بخش تسلیم" کی مطبوعہ شکل ہے۔ اس مقالے پر
[انہ]یں پٹنہ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ اس کی اشاعت بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے
۱۹۸[؟]ء میں ہوئی۔ اس موقع کے لئے اس کتاب کا انتخاب کئی جہتوں سے اہم ہے۔

اول یہ کہ مؤلفہ نے اس کا انتساب "جناب قاضی عبدالودود کے نام" کیا ہے"، جن کی مشفقانہ رہبری
اور مخلصانہ مشوروں نے (انہیں) بڑا سہارا دیا" دوم یہ کہ موصوفہ نے اس موضوع کا انتخاب قاضی صاحب مرحوم
[ہ]ی کے مشورے پر کیا تھا اور اگرچہ دفتری ضابطوں کے تحت اس کام کے نگراں ڈاکٹر سید محمد صدرالدین فضا
[ش]مسی مقرر ہوئے لیکن اصلاً یہ کام قاضی صاحب ہی کی نگرانی و رہنمائی میں انجام پذیر ہوا۔ خود مؤلفہ کے الفاظ ہیں۔

"میں استاذی جناب 'قاضی عبدالودود کی خاص طور پر ممنون ہوں جنہوں نے مجھے ہمیشہ مفید اور قیمتی
مشورے دیے۔ متن کے پڑھنے، مواد کے فراہم کرنے اور دیوان کی ترتیب میں میری بڑی مدد کی۔
ان کی شفقت و ہدایت نے مجھ میں اعتماد پیدا کیا۔" (پیش گفتار۔ ص۹)

[ق]اضی صاحب بھی معترف ہیں کہ:

"ڈاکٹر حمیرا خاتون نے میرے مشورہ پر عمل کرکے تسلیم کا دیوان مرتب کرنے کے لئے منتخب کیا اور اس
کے متعلق مقالہ لکھا اور اس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ ان کا مقالہ اور ان کا مرتب کیا ہوا
[د]یوان ضرور اس قابل ہے کہ شائع کیا جائے۔" (چند رائیں ص۷)

سوم یہ کہ شیخ مہدی بخش تسلیم ایک طویل مدت سے قاضی صاحب کے ذہن میں کلبلا رہے تھے اور کرشن چندر کے کالو بھنگی کی طرح مسلسل یہ تقاضا کئے جا رہے تھے کہ مجھ پر لکھو! تم بیرسٹر ہو کر ادب کی خدمت کر رہے ہو۔ میں وکیل رہ کر ادب کی خدمت کرتا رہا ہوں۔ زمانہ پاسداری و طرفداری کا ہے۔ اور ہمارا تعلق جس سرزمین سے ہے وہاں کی مٹی ذات پرستی کی فصل اگاتی ہے شعر پس اگر تم بھی نہ پوچھو گے مجھے۔ تو بھلا کون مجھے پوچھے گا؟ بات معقول تھی۔ قاضی صاحب نے تسلیم کیا اور رسالہ ندیم گیا کے شمارہ اگست ۱۹۴۱ء میں لکھا کہ:-

"مہدی بخش تسلیم صاحب دیوان شاعر تھے اور ناسخ کی طرز میں کہتے تھے۔ فریاد زندہ ہی تھے کہ تسلیم کا چراغ حیات گل ہو گیا اور اب ان کے جاننے والے بہار میں بھی بہت کم ہیں۔" [۱]

ظاہر ہے کہ اتنی سی بات روح تسلیم کی تسکین کا سامان نہیں فراہم کر سکتی تھی۔ لہٰذا تقاضا جاری رہا اور صدائے عام کے عید نمبر ۱۹۵۳ء میں قاضی صاحب کو پھر لکھنا پڑا کہ:-

"تسلیم، فریاد کے شاگرد تھے.... ان کا قلمی دیوان جو کتب خانہ مشرقیہ، پٹنہ میں ہے میری نظر سے گزرا۔ سرتاسر ناسخ کے رنگ میں ہے۔" [۲]

مقالہ نگار نے چند اشعار بھی "نمونتہً" درج کیے مگر روح تسلیم ہنوز "تشنۂ تسکین" رہی شاید اس لئے کہ ندیم اور صدائے عام دونوں بہار کی سرزمین سے نکلتے تھے۔ چنانچہ تیسری مرتبہ قاضی صاحب نے "نوائے ادب" بمبئی کے شمارہ اپریل ۱۹۵۹ء میں لکھا کہ:-

" فریاد کے شاگرد مہدی بخش تسلیم کا دیوان سرتاسر ناسخ کے رنگ میں ہے اور کتب خانہ خدابخش میں موجود ہے....." [۳]

مگر اب بھی بات وہیں کی وہیں رہی اور روح تسلیم کا تقاضا جاری رہا۔ یہاں تک کہ قاضی صاحب کو پھر ایک مضمون لکھنا پڑا جس میں انہوں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ لکھا کہ:-

"مہدی بخش تسلیم، علی بخش دعا کے بیٹے اور فریاد کے شاگرد تھے۔ خدابخش خاں کے کتب خانہ میں دیوان تسلیم کے دو نسخے اور دیوان دعا کا ایک نسخہ موجود ہے.... تسلیم کی اہمیت یہ ہے کہ پختہ گو شاعر ہیں۔ اگر ان کے دیوان سے ان کا تخلص نکال کر کسی لکھنوی شاعر (پیرو طرز ناسخ) کا تخلص رکھ دیا جائے تو کبھی فرق محسوس نہ ہوگا۔ صوبہ بہار کی ادبی تاریخ میں تسلیم کی اہمیت ہے۔" (قلمی مسودہ

---

[۱] [۲]، [۳] بحوالہ دیوان مہدی بخش تسلیم۔ مرتبہ ڈاکٹر حمیرا خاتون ص ۱۱۔۱۳

بدست قاضی عبدالودود بحوالہ کتاب زیر تبصرہ ص۱۴۱)

مگر ابھی یہ مضمون قلمی مسودہ ہی تھا کہ حمیرا خاتون کو اپنے تحقیقی مقالہ کے لیے موضوع کی تلاش ہوئی شعر روح تسلیم کی تسکین کی صورت نکلی اور ذہن قاضی کی یہ دیرینہ خلش دور ہوئی۔ مگر اس دیرینہ خلش کا سبب صرف وہی نہیں تھا جس کا میں نے ذکر کیا۔ اس کا سبب ایک اور ہے اور دراصل وہی سبب اوّل ہے قاضی صاحب جہاں ایک طرف مہدی بخش تسلیم کو ان کا وہ مقام دلانا چاہتے تھے جس کے وہ مستحق تھے اور انہیں وہ نہ مل سکا تھا، وہیں وہ اس عام غلط فہمی کا ازالہ بھی کرنا چاہتے تھے کہ "یہاں کے لوگوں کے ذوق سلیم نے انہیں ناسخ کی پیروی سے باز رکھا" یا "بہار میں ناسخ کی پیروی نہیں ہوئی" یا یہ کہ "صحتِ ذوق کی وجہ سے اہل بہار نے ناسخ کا بہت کم اثر قبول کیا" زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ نمبر پر "چند رائیں" کے زیر عنوان قاضی صاحب مرحوم کی دو رائیں موجود ہیں۔ ایک کے ساتھ ۲ستمبر ۱۹۷۷ء درج ہے اور دوسری کے ساتھ ۱۴ دسمبر ۱۹۸۰ء دونوں کے ابتدائی چند جملے بالترتیب اس طرح ہیں:۔

"۔۔۔۔ بہار کی اردو شاعری کی تاریخ لکھنے والے فخریہ کہتے ہیں کہ یہاں کے لوگوں کے ذوق سلیم نے انہیں ناسخ کی پیروی سے باز رکھا حالاں کہ دہلی تک کے شعرا ان سے متأثر تھے۔ یہ بات کہ بہار میں ناسخ کی پیروی نہیں ہوئی غلط محض ہے۔۔۔۔"

۔۔۔ تسلیم کا شمار بہار کے بڑے شعرا میں نہیں ہو سکتا، مگر ان کا کلام از ابتدا تا انتہا طرز ناسخ میں ہے اور اس سے (اور) بعض دیگر دواوین اور تذکروں میں متعدد شعرا کے جو اشعار ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی طرح صحیح نہیں کہ صحتِ ذوق کی وجہ سے اہلِ بہار نے ناسخ کا بہت کم اثر قبول کیا۔"

قاضی صاحب کی یہ خواہش تو پوری ہوگئی کہ تسلیم کی شاعرانہ شخصیت اور ان کا دیوان گمنامی کے اندھیرے سے طباعت و اشاعت کی روشنی میں آ گیا مگر حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ اور اسی لئے جہاں ۱۹۷۷ء میں اشاعت کے لئے پُر زور سفارش کرتے ہوئے انہوں نے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی تھی کہ:

ڈاکٹر حمیرا خاتون نے میرے مشورہ پر عمل کر کے تسلیم کا دیوان مرتب کرنے کے لئے منتخب کیا اور اس کے متعلق مقالہ لکھا۔۔۔۔ ان کا مقالہ اور ان کا مرتب کیا ہوا دیوان ضرور اس قابل ہے کہ شائع کیا جائے (چند رائیں ص نمبر)

وہیں ۱۹۸۰ء میں جب اس مقالے اور دیوان کی مطبوعہ شکل کو سامنے رکھ کر ان کی رائے طلب کی گئی تو انہوں نے اس سے اپنی برأت کا اعلان ان الفاظ میں کیا کہ:۔

ڈاکٹر حمیرا خاتون نے ڈاکٹر صدر الدین فضا مرحوم کی نگرانی میں اپنا کام کیا، وہ مجھ سے بھی مشورہ لیا

کرتی تھیں مگر میرے پاس وقت نہیں ہے کہ ان کے مقالۂ امتحان اور مرتبہ دیوان کا لفظ لفظ پڑھوں
اس لیے میں ان کے متعلق اپنی رائے ظاہر نہیں کرسکتا۔ ناظرین خود فیصلہ کریں کہ وہ اپنے فرائض
سے کس طرح عہدہ برآ ہوئی ہیں ....." (چند رائیں۔ ص۷)

لب و لہجہ بتا رہا ہے کہ قاضی صاحب نے اس کام سے جیسی دلچسپی مواد کی فراہمی اور متن کے پڑھنے سے
لے کر دیوان کی ترتیب تک کی ویسی محنت اور دلچسپی کا مظاہرہ حمیرا خاتون کی جانب سے نہیں ہوا جس کے نتیجے
میں یہ کتاب غلطیوں کا پلندہ بن گئی۔ ایسا بھی نہیں کہ ان غلطیوں کی ذمہ داری کاتب کے سر تھوپ کر مقالہ نگار
کو بری الذمہ قرار دیا جاسکے۔ ابو الکلام عزیزی اس کے کاتب ہیں اور یہ بات ہم آپ سبھی جانتے ہیں کہ وہ
اتنے غلط نگار نہیں۔ ۳۶۲ صفحات کی اس کتاب میں آخری ۱۶ (سولہ) صفحات صحت نامہ کے ہیں جن میں تین سو
سے زیادہ غلطیوں کی نشاندہی اور تصحیح کی گئی ہے مگر لطف یہ ہے کہ مزید اتنی ہی یا کچھ کم و بیش غلطیاں رہ گئی ہیں
جن کی نشاندہی اور تصحیح نہیں کی گئی ہے پھر مزید لطف یہ ہے کہ بعض غلطیوں کی تصحیح بجائے خود غلط ہے۔ مثال
کے طور پر صرف دو اشعار ملاحظہ ہوں۔ ص۵۵ پر ناسخ کا یہ شعر درج ہے ؎

شکل نظر نہیں پڑی، آیا نہیں پیام بھی
برسوں ہوئے کہ ایک سی حالت چشم گوش ہے

بہ ظاہر شعر درست ہے۔ فقط مصرعۂ ثانی میں لفظ "چشم گوش" "حرف عطف' و' " کے بغیر درج ہوا ہے۔ مگر صحت نامہ
ص۵ پر اس شعر کی تصحیح یوں ہوئی ہے :۔ غلط حالت چشم گوش۔ صحیح :۔ حالت ہے چشم و گوش۔ اور اس
تصحیح کے بعد مصرعۂ ثانی یوں بنتا ہے :۔ ؏ برسوں ہوئے کہ ایک سی حالت ہے چشم و گوش۔ مصرعہ ناموزوں بھی
ہوا اور غلط بھی۔ اب دوسرا شعر ملاحظہ ہو :۔ ص ۴۷ پر ناسخ ہی کا یہ شعر درج ہوا ہے۔

خدا سے ان بتوں کو بھی یہی نسبت ہے اے زاہد
ضیاء شمسی سے ہو جس طرح نورِ قمر پیدا

صحت نامہ ص۶ پر اس کی تصحیح یوں ہوئی ہے۔ غلط : ضیاء شمسی۔ صحیح : ضیا شمسی بیچ سے صرف ہمزہ ہٹ گیا۔ بات
جہاں تھی وہیں رہی۔ مصرعہ ناموزوں تھا، ناموزوں ہی رہا اور مرتب دیوان تسلیم کو احساس تک نہ ہوا۔
بات اتنی تھی کہ ضیا اور شمسی کے بیچ ہمزہ موجود تھا فقط لفظ شمسی کو "شمس" ہونا تھا۔ تب مصرعہ اس طرح
ہو جاتا کہ ضیاءِ شمس سے ہو جس طرح نورِ قمر پیدا۔ یہ موزوں بھی ہوتا اور صحیح بھی مگر تصحیح کے بعد بھی ایسا نہ ہوسکا۔
اس قبیل کی مثالیں بیسیوں ہیں۔ ۲۱٫۵ × ۱۲٫۵ س م سائز کے ۲۱ سطری مسطر والے ۳۶۲ صفحات کی اس
کتاب کے اوّل ۸ صفحات میں اندرونی سرورق، انتساب، فہرست مندرجات، پیش گفتار اور چند رائیں ہیں۔
بعد کے ۸۴ صفحات تسلیم کی حیات اور شاعری سے متعلق مقدمہ کے طور پر ہیں۔ پھر ۲۴۹ صفحات پر دیوان تسلیم

ہے جو ۱۹۶ اردو غزلوں، ۶ منفرد اشعار، ۴ فارسی غزلوں، ۲ رباعیات فارسی، ایک فارسی قطعہ اور ایک منفرد شعر فارسی پر مشتمل ہے۔ آخر میں ۶ صفحات کتابیات کے اور ۱۲ صفحات صحت نامہ کے ہیں۔ گویا ڈاکٹر حمیرا خاتون کا کارنامہ یہی ۸۴ صفحات ہیں۔ جن میں ابتدائی ۱۸ صفحات تسلیم سے متعلق مختلف تذکروں، کتابوں اور رسالوں سے ماخوذ اقتباسات پر مشتمل ہیں اور آخر کا ایک صفحہ (۸۴) خدا بخش لائبریری میں موجود دیوان تسلیم کے دو قلمی نسخوں سے متعلق تفصیلات کا حامل ہے۔ بقیہ ۶۵ صفحات میں بھی تسلیم، ناسخ اور دیگر شعراء کے جو اشعار مزد ثنا یا نمونتہً درج ہوئے ہیں ان کی تعداد تقریباً ۴ سو ہے۔ ان میں ۶۶ اشعار دو دو سطروں میں اور بقیہ ایک ایک سطر میں لکھے گئے ہیں۔ اس حساب سے محض ۳۵ / ۴۰ صفحات ایسے بنتے ہیں جو ڈاکٹر حمیرا خاتون کی کوششوں کا ماحصل ہیں اور جن پر انھیں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔ اب آئیے ان صفحات پر ذرا تفصیلی نگاہ ڈالی جائے۔"

صا پر "تسلیم تذکروں و دیگر کتابوں اور رسالوں میں" کے زیر عنوان پہلا اقتباس اقبال الدولہ عنایت حسین خاں بہادر مہجور کے "تذکرہ مدائح الشعراء" ص۱۱۲ سے نقل ہوا ہے اور اس طرح ہے:۔

"نام ایں شاعر ماہر برجادۂ سخنوری مستقیم شیخ مہدی بخش تسلیم نام والد ماجدش شیخ علی بخش دعا پیر نود سالہ صاحب تصانیف کثیر کہ در فارسی و ہندی دواوین گفتہ و گوہر دیوان ریختی علاوہ برآں سفتہ از مولدان قصبہ ونیقہ (کذا) جھپرہ واقعہ جانب شرقی است دہم دریں قیام شاعر مذکور نیز صاحب دواین و سخن گوی متین است از والد خودش مشق سخن دارد و درآں مقام بہ پیشہ وکالت حکام بلند نام است۔ چوں در ۱۲۶۲ھ خواجہ عسکری صبا خواہر زادۂ شاعر مذکور در بنارس وارد گشتہ و از راقم ملاقی شدہ۔ ایں ہر دو غزل گذرانیدہ و حقیر مخمس نمودہ داخل ایں تذکرہ شریف ساختہ خودش نیز ذوق ایں فن و شوق سخن دارد غزلش بہ ردیف صاد ترقیم خواہد یافت۔" (مدائح الشعراء صفحہ ۱۱۲ ۱۲۷۰ھ)

یہاں چند نکات قابل غور ہیں۔ اقتباس نقل کرنے کے بعد قوسین میں حوالہ "مدائح الشعراء صفحہ ۱۱۲ ۱۲۷۰ھ" درج ہے۔ جبکہ اقتباس بالا میں ۱۲۶۲ھ میں صبا کا بنارس جانا مذکور ہے۔ اگر تذکرہ ۱۲۷۰ھ میں مکمل ہو گیا تھا اور ۱۲۶۲ھ میں مزید کوئی اندراج اس میں کیا گیا تو اس کی نشاندہی یا وضاحت ضروری تھی مگر نہیں کی گئی۔ کتابیات ص۲۵۴ پر بھی اس نسخے کے سامنے "قلمی کتب خانہ خدا بخش پٹنہ ۱۲۷۰ھ" ہی درج ہے دوم یہ کہ اس اقتباس کی ابتدائی سطر تقریباً لفظ بہ لفظ وہی ہے جو خان بہادر خدا بخش کی کتاب "محبوب الالباب" میں ہے یہ جملہ دیکھئے:

"نام ایں شاعر ماہر برجادۂ سخنوری مستقیم شیخ مہدی بخش تسلیم ونام والد ماجدش شیخ علی بخش المتخلص بہ دعاؔ است ...." (دیوان مہدی بخش تسلیم ص۹)

کس کو کس نے نقل کیا؟ تحقیق اور نشاندہی کی ضرورت تھی۔ سوم یہ کہ مہجور نے "از والد خودش مشق سخن دارد" لکھا ہے۔ "حیات تسلیم" یا استاذ تسلیم" کے زیر عنوان مہجور کے اس فقرے کی تائید یا تردید میں کہیں کچھ مذکور نہیں۔ جہاں شاگردی کا ذکر آیا ہے وہاں صرف فریادؔ مذکور ہے۔ یہ اقتباس اس جہت سے اہمیت کا حامل ہے کہ اصل کتاب کی ابتدا اسی سے ہوئی ہے اور اسے تسلیم کی شخصیت کو منوانے کے لئے شہادت اوّل یا ثبوتِ اوّل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اصولی طور پر یہی سمجھا جائیگا کہ اس کے ہر لفظ سے ناقل کو اتفاق ہے الایہ کہ وہ اپنا اختلاف ظاہر کر دے۔ مگر ڈاکٹر عمیر اخاتون نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔ یا تو انہیں استاذ تسلیم کے تحت یہ بھی لکھنا تھا کہ تسلیم نے اپنے والد شیخ علی بخش دعاؔ سے بھی رشتۂ تلمذ رکھا (جیسا کہ مہجور نے لکھا ہے) یا اس قول کی تردید میں دلیلیں پیش کرنا تھیں۔ چہارم یہ کہ "ایں ہر دو غزل گذرانیدہ و حقیر مخمس نمودہ داخل ایں تذکرہ شریف ساختہ" سے ظاہر ہے کہ صبا کے ہاتھوں مہجور تک تسلیم کی دو غزلیں پہنچیں۔ انہوں نے ان پر مخمس لکھے اور انہیں اس تذکرے میں شامل کیا۔ مؤلفہ نے ایک خمسہ تو نقل کیا ہے مگر دوسرے کا کہیں کوئی ذکر بھی نہیں ہے۔ خمسہ جو نقل ہوا ہے وہ پانچ بندوں پر مشتمل ہے۔ مطلع اس طرح ہے:۔

بوالعجب آہ عاشقانۂ ما طرفہ تر درد جاودانۂ ما
حیف زیں رنج بے کرانۂ ما دیدہ ہا جوشد از فسانۂ ما
سینہ ہا سوزد از ترانۂ ما

دوسرا بند بھی مطلع ہی کا ہے۔ تیسرا بند اس شعر پہ مصرع لگا کر موزوں کیا گیا ہے:۔

دیدہ ہا جائے ما چو مرغ نگاہ مژہ ہا خار آشیانۂ ما

اسی طرح چوتھا اور پانچواں بند ذیل کے شعروں پر مصرعے لگا کر نظم کئے گئے ہیں:۔

دست می شستم از تلاش معاش گریۂ ماست آب و دانۂ ما
ماند بر گردن تجاہلِ تو خونِ فریادِ بیکسانۂ ما

مؤلفہ نے حیات تسلیم" کے زیر عنوان ص۲۵-۲۶ پر تسلیم کی فارسی دانی کا ذکر کرتے ہوئے دو رباعیاتِ فارسی اور دو فارسی غزلوں میں ایک کے تین اور ایک کے چار اشعار نقل کئے ہیں۔

دیوان کے آخر میں جہاں فارسی کلام نقل ہوا ہے، یہ دونوں رباعیاں بھی ہیں اور وہ مکمل غزل بھی جس کے صرف تین اشعار یہاں نقل کیے گئے ہیں۔ مگر وہ غزل جس کے چار اشعار ص۲۶ پر ملتے ہیں اور جسے مہجور نے مخمس کیا تھا۔ اس کا ایک بھی شعر متن میں درج نہیں ہے۔ مخمس کی تفصیل اوپر گزر چکی۔ اس میں غزل کے چار اشعار ہیں۔ ص۲۶ پر جو چار اشعار ہیں ان میں اوّل مطلع ہے، دوسرا وہ شعر ہے جو مخمس میں حسب ترتیب تیسرا ہے نیز تیسرا وہ ہے جو مخمس میں نہیں ہے اور چوتھا مقطع ہے جو وہ بھی مخمس میں نہیں ہے۔ اسی طرح یہ چھ اشعار کی فارسی غزل مکمل ہو جاتی ہے جسے متن میں شامل ہونا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ غزل ملاحظہ ہو:-

دیدہ ہا جوشد از فسانۂ ما — سینہ ہا سوزد از ترانۂ ما

دیدہ ہا جائے ما چو مرغ نگاہ — مژہ ہا خار آشیانۂ ما

دست می شستم از تلاش معاش — گریۂ ماست آب و دانۂ ما

ماند بر گردنِ تجاہلِ .... تو — خونِ فریاد بیکسانۂ ما

دل من جلوہ گاہِ مستیٔ عشق — کعبۂ ما شراب خانۂ ما

طائرِ نکہتِ گل تسلیم — لب بود غنچہ آشیانۂ ما

شعر نمبر ۱، ۳، ۵ اور ۶ ص۲۶ پر درج ہوئے ہیں ان میں حرف روی پر کہیں ہمزۂ اضافت نہیں ہے اور مقطع کے مصرعۂ ثانی پر ہمزۂ اضافت موجود ہے جہاں اس کی ضرورت نہیں۔ تیسرے شعر کا مصرعۂ اوّل "دست شستم از تلاش معاش" ہے جو ناموزوں اور تصحیح طلب ہے مگر صحت نامہ میں اس کا اندراج نہیں ہے۔ دست می شستم میں نے لکھا ہے۔ اس شعر کے مصرعۂ ثانی میں ماست کی جگہ "ما است" ہے مگر اس کی بھی تصحیح نہیں کی گئی ہے۔

صبا کے ہاتھوں مہجور تک تسلیم کی جو دو غزلیں پہنچیں ان میں ایک کا حال تو سطور بالا سے معلوم ہوا، دوسری کا حال کچھ معلوم نہیں۔ نہ ہی مؤلفہ نے یہ بتانے کی ضرورت محسوس کی کہ یہ مخمس انہوں نے کہاں سے نقل کیا اور دوسرا انہیں کیوں دستیاب نہیں ہو سکا؟ تحقیق و تصریح یا کم از کم دو میں سے ایک ضرور تھی۔ مہجور نے دونوں غزلوں کو مخمس کرکے ایک منظوم خط کے ساتھ "سبیل ڈاک" سے تسلیم کو ارسال کیا تھا۔ وہ منظوم رقعہ مؤلفہ نے ص۲ تا ص۵ پر نقل کیا ہے جو ۵۹ ابیات پر مشتمل ہے اور جس کے ۴۴ مصرعے یا تو غلط یا ناموزوں نقل ہوئے ہیں اور ص۵ کے فٹ نوٹ میں یہ اطلاع درج ہے کہ "یہ خط مہجور نے رمضان المبارک

۱۲۷۲ھ میں شان تسلیم میں لکھی تھی"۔ ظاہر ہے کہ تصحیح کی ضرورت یہاں بھی تھی مگر صحت نامہ اس سے متعلق کسی اندراج سے خالی ہے۔ اس منظوم خط میں بھی مہجور نے دو غزلوں اور ان پر مشتمل مخمس کا ذکر کیا ہے۔ یہ بیت دیکھئے: ؎

تو دو غزلوں کا کر فی الفور خمسہ   سبیل ڈاک سے خدمت میں بھیجا

بیاض مہجور سے جو اقتباس ڈاکٹر حمیرا خاتون نے نقل کیا ہے اس میں دو غزلوں کا ذکر ہے اور انہیں مدائح الشعراء میں درج کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ متعلقہ عبارت یوں ہے:-

"ایں ہر دو غزل شاعر سراپا.... متخلص بہ تسلیم بدست آمدہ درج...."

مدائح الشعراء خواہد گردید"

مدائح الشعراء میرے پیش نظر نہیں ہے اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ مہجور نے یہ غزلیں درج کیں یا نہیں مگر مؤلفہ کو اس کی صراحت کرنا چاہیئے تھی۔ پیش گفتار میں تسلیم سے متعلق یہ جملہ ملا ہے کہ:-

"جناب قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ ان کا تعلق اس خاندان سے ہے جس کے ایک رکن خدابخش خاں تھے"

مگر مقالہ میں کہیں اس بات کی وضاحت نہیں ملتی۔ قاضی صاحب نے کہاں لکھا کس طرح کا تعلق ظاہر کیا اور کیا ثبوت فراہم کئے اس کی صراحت کہیں نہیں کی گئی ہے۔ البتہ خان بہادر خدابخش خاں کے حوالے سے جو اقتباس "محبوب الالباب" کا نقل ہوا ہے اس میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ:" صاحب ترجمہ با والد مرحوم ہم درس وہم سبق بود" اس کے علاوہ کسی اور رشتے یا تعلق کی نشاندہی نہیں ملتی۔ یہ ہم درسی اور ہم سبقی" کی نوعیت کیا تھی، اس کی صراحت اسی کتاب کے دوسرے اقتباس سے ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:-" والد مرحوم حقیر شیخ مہدی بخش خلف صاحب ترجمہ ہمدرس بودند و مشق خط نستعلیق از سید واصل علی کہ یکے از خوش نویسان عصر بود ایں ہر دو بزرگوار فرمودہ والد مرحوم وہم شیخ مہدی بخش مغفور خط نستعلیق خوب می نگاشتند" اقتباس اول کے آخری جملہ میں تسلیم کی وفات کا مذکور ان الفاظ میں ہے:- در عشرہ ثامن قرن ثالث عشر بعارضہ اسہال بہ مسکن خود دار پر ملال را گذاشتہ بسوی روضۂ عالی جناب شتافت"۔ حیات تسلیم زیر عنوان ص۲۳ پر بھی عبارت درج کی گئی ہے مگر "قرین قیاس" اور بہ الفاظ دیگر قابل ترجیح عبدالغفور نساخ (بحوالہ تذکرۃ المعاصرین) کی عبارت کو بتایا گیا ہے جس کے مطابق تسلیم کا سال وفات ۱۲۸۵ھ قرار پاتا ہے۔ قاضی صاحب غلط بیانیوں پر بے طرح بگڑ بیٹھتے تھے۔ شاد، غالب اور مولانا آزاد کی روحیں ان کے نام سے کانپتی ہونگی۔ خدابخش خاں

کو کیوں انہوں نے بخش دیا؟ جائے حیرت ہے۔ نساخ کی عبارت کو قابلِ قبول اور خدا بخش خاں کی عبارت کو نا قابلِ قبول قرار دیے جانے کی توجیہہ ضروری تھی۔ اگر یہ بات نا قابلِ قبول ہے تو ہم درسی والا قصہ بھی مشکوک ہو سکتا کہ وہ شنیدہ ہے، دیدہ نہیں۔

ص۸ پر "تذکرۃ المعاصرین" کو "تذکرۃ المحامرین" لکھا گیا ہے اور اسے وسطِ صفحہ پر الگ سے قوسین میں لکھا گیا ہے جس پر فوراً نگاہ پڑتی ہے تاہم اس کی تصحیح صحت نامہ میں نہیں ہے۔ ص۹ پر عزیز الدین بلخی کی "تاریخ شعرا بہار" سے جو اقتباس نقل ہوا ہے اس میں تسلیم کو "عدالت سہا گل پور میں محرر" بتایا گیا ہے مگر "حیات تسلیم" کے زیرِ عنوان عزیز الدین بلخی کے اس بیان کی توضیح یا تنقیح نہیں کی گئی ہے۔ تحقیق میں ایسی ان دیکھی کور وا نہیں کہا جا سکتا۔

ص۱۰،۱۱ پر مہدی بخش تسلیم سے متعلق شاد عظیم آبادی کی کتاب "نوائے وطن" "حیات فریاد" اور "مکتوبات شاد" وغیرہ سے مختلف اقتباسات نقل ہوئے ہیں اور ص۱۵ پر حکیم احمد اللہ ندوی کا بیان نقل کیا گیا ہے کتاب کا حوالہ نہیں ہے۔ ان دونوں بیانات یا اقتباسات میں لفظی مطابقتیں اتنی زیادہ ہیں کہ صاف پتہ چل جاتا ہے کہ آخر الذکر نے شاد کے بیانات کو دہرایا ہے لیکن مؤلفہ نے اس کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ ذیل میں دونوں کے بیانات بالمقابل درج کیے جاتے ہیں جن سے صورتِ حال کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا:

شاد عظیم آبادی	حکیم احمد اللہ ندوی
فریاد کے نامی شاگردوں میں بابو مہدی بخش تسلیم تھے وکالت کرتے تھے۔ آدمی ذی علم تھے۔	بابو مہدی بخش تسلیم تخلص۔۔۔ الفت حسین فریاد کے نامی شاگردوں میں تھے۔۔۔ وکالت کرتے تھے۔ آدمی ذی علم تھے۔
طبیعت میں ناسخ مرحوم کا انداز اثر کر گیا تھا۔ حضرت (فریاد) نے پہلے بہت چاہا کہ راستی پر طبیعت آ جائے اور طبیعت میں سلاست پیدا ہو جائے آخر مجبوراً فرمایا کہ اسی طرز میں مشق و ترقی کرو اور لکھنؤ جا کر ناسخ کے مقابلہ میں اس طرز میں شہرت حاصل کرو۔	ناسخ کا انداز اثر کر گیا تھا۔ فریاد نے بہت چاہا کہ راستی پر طبیعت آئے کہ طبیعت میں سلاست پیدا ہوا آخر مجبوراً فرمایا کہ اسی طرز میں مشق و ترقی کرو اور لکھنؤ جا کر ناسخ کے مقابلہ میں شہرت حاصل کرو۔"
مہدی بخش تسلیم کا دیوان پٹنہ کی پبلک لائبریری میں موجود ہے۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے اور ان کے انتقال کے بعد	جناب تسلیم کا قلمی دیوان پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے۔ تسلیم کے بہت سے شاگرد تھے۔۔۔ تسلیم کے انتقال کے

ان میں سے بہت سے لوگوں نے ہمارے حضرت (فریاد) سے اصلاح لینی شروع کی من جملہ ان کے خواجہ محمد شاہ شہرت بھی تھے۔

بعد ان کے شاگردوں میں سے بہت سے لوگوں نے جناب فریاد سے اصلاح لینی شروع کی جن میں ایک خواجہ محمد شاہ شہرت بھی (کذا)

صلا پر "مکتوبات شاد" سے جو اقتباس نقل ہوا ہے اس کا ایک جملہ یوں ہے :-

لائبریری میں خدا بخش خاں نے تسلیم کا دیوان بصورت مسودہ جس میں شاید ایک سو غزلیں ہوں گی مجھ کو دکھایا"

یہاں "ایک سو" پر ۱ لگا کر مؤلف نے فٹ نوٹ میں یہ اطلاع دی ہے کہ "تسلیم کے دیوان میں ۱۹۵ غزلیں ہیں" حالاں کہ انہوں نے جو دیوان مرتب کیا ہے اس میں آخری غزل کا نمبر ۱۹۶ ہے جس کے بعد فارسی کی بھی دو غزلیں ہیں جو قلمی دیوان سے نقل کی گئی ہیں۔ بقیہ دو فارسی غزلیں تذکرۃ المعاصرین سے نقل ہوئی ہیں۔

انہی صفحات (۱۰۰-۱۰۱) میں شاد کے حوالے سے ایک مطلع جسے تسلیم سے منسوب کیا گیا ہے دو جگہ نقل ہوا ہے۔ وہ یہ ہے :-

یہ داغ سینہ اور یہ چشم گریاں دیکھتے جاؤ چمن کی سیر کر لو ابر و باراں دیکھتے جاؤ

پہلا اقتباس جس میں یہ شعر نقل ہوا ہے "مقالات شاد" غیر مطبوعہ۔ مرتبہ و مملوکہ شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی سے مقتبس ہے :- اس میں دیوان محلہ کے بڑے بابو چھوٹے بابو مہاجن کے مشاعرے" کا یہ دلچسپ واقعہ یا کہیے لطیفہ نقل ہوا ہے کہ تسلیم نے جب یہ مطلع پڑھا تو "ابر و باراں" کو بغیر واو عاطفہ کے پڑھا۔ کسی نے کہا کہ عیب ایطا ہے شور ہو گیا اور گنواروں میں مشہور ہوا کہ مشاعرے میں "اینٹا" چلا تھا۔ اسی اقتباس میں یہ جملے بھی ہیں کہ "تسلیم ذرا خود پسند تھے۔ لوگ ان سے چڑے رہتے تھے"۔ ظاہر ہے کہ ان بیانات سے تسلیم کی شخصیت دبتی ہے۔ اور یہ بیانات شاد کے قلم سے ہیں جن کی بیان بازیاں مشہور رہی ہیں اور قاضی صاحب نے ان کا خوب خوب پوسٹ مارٹم کیا۔ کیا پتہ یہ بھی انہی میں سے ایک ہو۔ تسلیم کو خود پسند اور لوگوں کا ان سے چڑے رہنا کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھا۔ شاد ہی کا بیان یہ بھی ہے کہ "ان کے بہت سے شاگرد تھے"۔ کیا خود پسندی اور لوگوں کے چڑے رہنے کے باوجود یہ ممکن ہے ؟

دوسری جگہ صلا پر حیات فریاد کے حوالے سے یہی مطلع تسلیم کے ایک اور مطلع کے ساتھ اس طرح نقل ہوا ہے۔

"مہدی بخش تسلیم کا دیوان پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے۔ جناب تسلیم کا یہ مطلع ہے :-

یہ داغ سینہ اور یہ چشم گریاں دیکھتے جاؤ چمن کی سیر کر لو ابر و باراں دیکھتے جاؤ

یک اور مطلع بھی مجھے یاد ہے :۔

تا فلک پھیل گیا آب مرے رونے سے　　　کف بنا پنبۂ مہتاب مرے رونے سے

بیان بازی کا یہ کرشمہ ملاحظہ ہو کہ پہلا مطلع "پٹنہ کی پبلک لائبریری میں موجود" دیوان تسلیم کے مذکور کے بعد اس طرح نقل کیا گیا جیسے وہ اسی دیوان سے نقل کیا جا رہا ہے اور گویا اس میں موجود ہی تو ہے جبکہ دوسرا مطلع "مجھے یاد ہے" کے اضافے کے ساتھ نقل ہوا ہے جس سے قاری کے ذہن پر اس کے سوا کوئی دوسرا اثر ہو ہی نہیں سکتا کہ دوسرا مطلع محض یادداشت کی بنا پر لکھا گیا ہے جبکہ اوّل الذکر دیوان تسلیم کے حوالے سے نقل ہوا ہے۔ حالاں کہ حق تو یہ ہے کہ مطلع اوّل دیوان تسلیم میں کہیں ہے ہی نہیں بلکہ دیکھتے جاؤ" کی ردیف میں تسلیم کی کوئی غزل یا شعر پورے دیوان میں نہیں ہے البتہ دوسرا مطلع جو بظاہر یادداشت کی بنا پر درج ہوا ہے دیوان میں موجود ہے اور چودہ اشعار کی پوری غزل کے ساتھ موجود ہے۔ صرف مصرعۂ اوّل میں تھوڑا سا اختلاف ہے کہ شاؔد کا نقل کردہ مصرعہ "تا فلک پھیل گیا آب مرے رونے سے" دیوان میں "ہو گیا سر بفلک آب مرے رونے سے" ہے۔ مرتبۂ دیوان تسلیم کو چاہئے تھا کہ "حیات فریاد" کے حوالے سے اس فرق کو نوٹ کر لیتیں مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ مطلع اول جو ابھی زیر بحث تھا اس کو دیوان کے صفحہ ۲۴۶ پر "فردیات" کے ذیل میں لکھ بھی لیا ہے اور حوالہ "مکتوبات شاد" کا دیا ہے کہ مکتوبات شاد ص ۱۸۶ میں یہ شعر درج ہے۔ مکتوبات شاد میرے پیش نظر نہیں کہ تصدیق کروں۔ خود دیوان مہدی بخش تسلیم کے صفحات نمبر ۱ اور ۱۱ شاہد ہیں کہ مؤلفہ نے یہ مطلع کہاں سے نقل کیا ہے۔ یہ مطلع تسلیم کا ہے بھی یا نہیں اس میں شبہ ہے۔ اس کی تحقیق لازمی تھی اور محاکمہ ضروری مگر ایسا نہیں ہوا۔

ص ۱۵-۱۴ پر معین الدین دردائی کی کتاب "بہار اور اردو شاعری" کے حوالے سے شاؔد کا وہ قطعہ نقل ہوا ہے جس میں تسلیم اور بہار کے اور شعرا کا نام بھی ہے۔ یہاں اس قطعہ کے صرف سات اشعار نقل کیے گئے ہیں اور فٹ نوٹ میں لکھ دیا گیا ہے کہ طوالت کے خیال سے مکمل قطعہ نہیں دیا گیا ہے۔ ساتویں شعر کا مصرعۂ ثانی نامکمل ہے جو اس طرح ہے :۔

ع　　انہیں بھی ضعف پیری ہے .... نقاہت ہے

"پیری ہے" کے بعد چند نقطے ہیں جن پر ۱ لکھ کر فٹ نوٹ میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ "نہیں پڑھا گیا"۔ بتائیے صاحب! ہے کوئی جواب اس تن آسانی کا؟ کہ یہاں سابقہ کسی شکستہ خط نسخ میں لکھے ہوئے قلمی نسخے سے نہیں بلکہ مطبوعہ کتاب سے ہے اور مسئلہ کسی جملے یا فقرے کا نہیں بلکہ شعر اور مصرعے کا ہے جس کا تعلق کسی گمنام یا مبتدی شاعر سے نہیں بلکہ ایک ایسے بڑے شاعر سے ہے جسے وحید العصر کہہ سکتے ہیں اور جس کا کلیات خود مؤلفہ

کی نگاہ میں ہے۔ اگر کلیات نہ بھی ہو تب بھی یہ کوئی بڑا تحقیقی مسئلہ نہ تھا وہ بھی اس کے لیے جس کی قدم بہ قدم رہنمائی کو قاضی صاحب جیسی قاموسی شخصیت موجود و مستعد رہی۔ یہ قطعہ کلیات شاد حصہ دوم مرتبہ کلیم الدین احمد مطبوعہ ۱۹۷۵ء کے ص۴۲۶ تا ص۴۲۸ موجود ہے اور اس میں کل ۳۰ (تیس) اشعار ہیں۔ مذکورہ بالا مصرعہ ص۴۲۷ کی تیسری سطر میں ہے اور اس میں نقطوں کی جگہ "نحافت ہے" درج ہے گویا پورا مصرعہ اس طرح ہے۔ ع "انہیں بھی ضعف پیری ہے نحافت ہے نقاہت ہے" معین الدین دردائی کے حوالے سے نقل کردہ بعض اشعار کے مصرعے کلیات سے مختلف ہیں۔ تحقیق کا تقاضا تھا کہ نشاندہی کی جاتی مگر نہیں کی گئی۔ بہ الفاظ دیگر صحت متن جو تحقیق کی روح ہے اس کا قرار واقعی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے پہلے شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح لکھا گیا ہے۔ ع "فلک کیوں کر نہ روئے اب عظیم آباد کے اوپر" کلیات میں اس طرح ہے:۔ ع "فلک روئے نہ کیوں کر اب عظیم آباد کے اوپر" ایک اور شعر کا مصرعۂ اوّل یوں نقل ہوا ہے:۔ ع "ذبیح خوش کلام اب کون سے گلشن میں جا پہونچا" کلیات میں یہ اس طرح ہے: ع ذبیح خوش بیاں اب کون سے گلشن میں جا پہنچا" جس مصرع میں تسلیم کا ذکر ہے وہ اس طرح نقل ہوا ہے:۔ ع کہاں تسلیم اور مائل کدھر شاگرد ہے اس کا" کلیات میں یوں ہے:۔ ع کہاں تسلیم اور مائل کدھر شاگرد ہیں ان کے" ایک اور شعر مؤلف نے یوں نقل کیا ہے:۔ ع "اندھیرا کیوں نہ ہو برج لحد میں ہے قمر پنہاں" ضیا باقی نہیں ہے اس شہر کی بے نور صحبت ہے" ظاہر ہے کہ مصرعۂ ثانی ناموزوں ہے پھر بھی یہ ناقل کی توجہ مبذول نہ کر سکا۔ ضیاؔ پر تخلص کا نشان بھی ہونا تھا مگر نہیں ہے۔ کلیات میں یہ مصرعہ اس طرح ہے۔ ع ضیاؔ باقی نہیں اس شہر کی بے نور صحبت ہے۔ مگر اس شعر کا مصرعۂ اول کلیات میں یوں ہے۔ ع اندھیرا کیوں نہ ہو برج لحد میں اے قمر پنہاں "اسے قمرؔ" پورے شعر کو مہمل بنا رہا ہے۔ معین الدین دردائی کے حوالے سے نقل کیے گئے مصرعے میں "ہے قمر" درست ہے۔ مرتب کلیات نے یہ قطعہ "سروش ہستی" کے حوالے سے نقل کیا ہے جس میں ان کا عنوان "یاد ماضی" ہے۔ کلیات شادؔ کی اس جلد میں جلد اول و دوم کا غلط نامہ ایک ساتھ شامل کر دیا گیا ہے جو سات صفحات پر مشتمل ہے۔ غلط نامہ میں اس مصرعے سے متعلق کوئی اندراج نہیں ہے اور نہ ہی سروش ہستی پیش نظر ہے جو کہہ سکوں کہ اس میں کس طرح ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ "ہے قمر پنہاں" ہی درست ہے۔ "اے قمر" مہمل ہے۔

ص۱۵ تا ۱۸ حکیم احمد اللہ ندوی کے حوالے سے تسلیم کی غزلوں کے اشعار نقل ہوئے ہیں۔ حکیم احمد اللہ ندوی نے اشعار نقل کرنے سے پہلے یہ جملے لکھے ہیں:۔ "جناب تسلیم کا قلمی دیوان پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے۔ اسی سے تسلیم کے اشعار نقل کرا کے یہاں درج کیے گئے ہیں"۔ یہاں ایک شعر کا مصرعۂ ثانی اس طرح ہے:۔ ع آب گوہر عمر

کے ذوق کو طوفان ہو گیا" اور ایک غزل کے مطلع کا مصرعۂ اول یوں ہے ؎ "جان بخش ہے وہ یار کے چاہ زقن میں آب" یہ دونوں مصرعے بالترتیب دیوان کے صفحہ نمبر۹ اور نمبر۹۳ پر بالکل اسی طرح نقل ہوئے ہیں۔ ان میں خط کشیدہ الفاظ (زورق، زقن) کا املا غلط ہے۔ مرتبۂ دیوانِ مہدی بخش تسلیم نے صفحہ ۹۴ پر "مخطوطات تسلیم" کے زیر عنوان "نسخۂ اول" اور "نسخۂ دوم" کی کیفیت بتاتے ہوئے بالترتیب یہ جملے بھی لکھے ہیں کہ:۔ "املا درست نہیں" "کتابت صحت کے ساتھ نہیں ہے"۔ تاہم ان کا یہ فرض بنتا تھا کہ جہاں املا درست نہیں وہاں فٹ نوٹ میں اس کی نشاندہی اور تصحیح کر دی جاتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا جو اصول ترتیب متن کے منافی ہے اور فن تحقیق کے لئے رسوا کن۔ مندرجہ بالا مصرعوں میں زَردَرَق کو 'ذ' سے اور ذقن کو 'ز' سے لکھا گیا ہے۔ دونوں جگہ یہ الفاظ اسی طرح لکھے گئے ہیں۔ نہ کہیں کوئی فٹ نوٹ اور نہ ہی صحت نامہ میں ان سے متعلق کوئی اندراج۔ حالانکہ مخطوطہ نسخوں میں نسخۂ اوّل کے کاتب نے زورق کو "ز" سے لکھا ہے۔ نسخۂ دوم کے کاتب نے "ذ" سے نیز ذقن دونوں نسخوں میں "ذ" سے ہے جو صحیح ہے[1]۔ ترتیب متن کے سلسلے میں ایسی کوتاہیوں کی مثالیں اس کتاب میں بہت ہیں۔

"مخطوطات تسلیم" کا ذکر ابھی ابھی ہوا ہے۔ دیوان تسلیم کے دونوں نسخوں کو ملا کر ترتیب دینے کے بعد بھی تسلیم کا دیوان ردیف وار مکمل نہیں ہے۔ مگر اس کی نشاندہی کہیں نہیں کی گئی ہے۔ دیوان میں "ز" اور "ص" کی ردیفوں میں کوئی غزل نہیں ہے۔ "گ" کی ردیف میں ایک غزل ہے اس لحاظ سے پ، ٹ، چ وغیرہ کی ردیفوں میں بھی غزلیں ہونی چاہیے تھیں مگر نہیں ہیں اور نہ ہی ان باتوں کا کہیں کوئی مذکور ہے جبکہ ہونا چاہیے تھا۔ قطعیت تحقیق کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور ایسی تفصیلات و تصریحات اس کا عین تقاضا ہیں۔

"حیات تسلیم" کے تحت ص ۱۹ تا ص ۳۱ تیرہ صفحات خامہ فرسائی کی نذر ہوئے ہیں مگر تسلیم سے متعلق معلومات وہیں تک رہتی ہیں جہاں تک صفحات ماقبل میں تذکروں، رسالوں اور کتابوں کے اقتباسات کو پڑھ کر حاصل ہو سکی تھیں۔ ان سے آگے فقط اتنا اضافہ ہوتا ہے کہ:۔ "جناب قاضی عبدالودود کے قیاس کے مطابق زمانۂ پیدائش ۱۲۲۲ھ تا ۱۲۲۸ھ متعین کیا جاسکتا ہے، وہ بھی" اس لیے کہ ان کے استاد جناب الفت حسین فریاد کی پیدائش ۱۲۱۹ھ میں ہوئی تھی"۔ اور "استاد سے شاگرد عام طور پر کم عمر ہوا کرتے ہیں"۔ یہ قیاس آرائی؟ وہ بھی اس عہد سے متعلق جو "پریس کا زمانہ" کہلاتا ہے؟ تسلیم وکالت پیشہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تعلیم اسکولوں اور کالجوں یا کم از کم اسکولوں میں ضرور ہوئی ہوگی۔ ان کے دادا پٹنہ کے "رئیسوں میں سے تھے" (ص ۱۹) اور والد چھپرہ میں

---

[1] نسخۂ اول کا ترقیمہ "زورق کو" اور "ذقن میں" ہے۔ نسخۂ دوم میں ذورق کو" اور "دقنیں" لکھا گیا ہے۔

لگے تھے" (ص ۱۹)۔ ظاہر ہے کہ اوائل انیسویں صدی میں پٹنہ میں آج کی طرح بے شمار تعلیمی ادارے نہیں تھے جن کے رکارڈز کی چھان بین مشکل ہو۔ چھپرہ میں پتہ نہیں اس وقت کوئی اسکول رہا ہوگا بھی یا نہیں مگر امتحان تو کلکتہ ہی یونیورسٹی سے پاس کیا ہوگیا۔ پھر اس کے بعد چھپرہ کی بار لائبریری کے کسی رجسٹر میں کوئی اندراج تو ہوگا جس سے کچھ تو روشنی ملتی، اگر ان مقامات پر کوششوں کے باوجود کچھ حاصل نہ ہوتا تب بھی یہ پتہ چلتا کہ کوشش یوں ہوئی اور نتیجہ یہ نکلا۔ انتہا یہ ہے کہ یہ بھی پتہ نہیں کہ تسلیم نے شادی کی یا مجرد رہے" (ص ۳۰) اولاد کا ذکر تو درکنار رہا۔

ص ۲۶ پر مؤلفہ نے لکھا ہے کہ: "تسلیم کے کلام سے یہ نہیں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیعہ مذہب تھے یا سنی"

آگے لکھتی ہیں کہ: "اسلامی قدروں سے انہیں محبت تھی۔ اہل بیت کو مانتے تھے"؛ پھر اگلے صفحہ پر اپنے اس قول کی تصدیق کے لیے ذیل کے دو شعر نقل کیے ہیں ؎

حسرت ہے سر پہ مرے آل نبیؐ کے غم سے — کیا تعجب ہے جو ساتھ ان کے ہو محشر میرا

عقدے مرے دو ابروئے دل بر سے کھل گئے — قاتل نے ذوالفقار کو مشکل کشا کیا

دوسرا شعر جس مضمون کا حامل ہے اس کی بنا پر کسی تحدید کی گنجائش نہیں۔ کوئی بھی شاعر ایسا کہہ سکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اور شعر نقل کیا جانا چاہیے تھا جو دیوان کے ص ۱۸۱ پر ہے اور یوں ہے: ؎

تسلیم زندہ گر نہ گیا واں تو غم نہیں — پہونچوں گا بعد مرگ نجف میں یہیں سے میں

اس کے علاوہ خود مہدی بخش، والد علی بخش، دادا امام بخش اور بھانجے خواجہ عسکری تھے۔ ان ناموں سے اور اشعار بالا سے اشارہ تو شیعیت ہی کا ملتا ہے مگر جب تک متیقن نہ ہو حتمی طور پر کچھ کہنا تقاضائے تحقیق کے منافی ہوگا۔ کچھ ضروری نہیں کہ ہر شعر میں شاعر کا عقیدہ بھی اٹکا ہوا ہو۔ بہت سی باتیں محض بربنائے روایت اور ماورائے اعتقاد و یقین بھی شعر کے قالب میں ڈھل جاتی ہیں۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے آج سے تو دس برس پہلے نقوش کے کسی شمارے میں 'یقولون مالا یفعلون' کے زیر عنوان عربی، فارسی اور اردو کے ایک ایک شاعر کے کلام سے مثالیں دے کر اس نکتے کی اچھی وضاحت کر دی ہے۔ خود مہدی بخش تسلیم بھی جیسا کہ میں نے عرض کیا، جہاں ان ناموں اور ان اشعار کی روشنی میں شیعہ نظر آتے ہیں وہیں جب حمد باری تعالیٰ کے لیے قلم اٹھاتے ہیں تو خالص موحد، سچے مومن اور وسیع القلب و راسخ العقیدہ سنی نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر حمیرا خاتون نے دیوان تسلیم کے آخر میں جو غزلیں نمبر ۱۹۴/۵، ۱۹۵/۹ اور ۱۹۶/۱۳ کے تحت درج کی ہیں کئی جہتوں سے قابل توجہ ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

غزل ۱۹۴/۵

تو ہے وہ جس نے پھونکی روح مشتِ خاکِ آدم میں — تو ہے وہ جس نے لکھا آب پر انسان کا نقشا

کسی کو تونے طفلی میں زباں سے کر دیا محروم[1] — کسی کو مہد میں قدرت سے تونے کر دیا گویا

کہیں تونے بنایا لطف سے گلزار آتش کو — کہیں ...[2] سے اپنے سحاب آتشیں لایا

کسی کو موج طوفاں سے بچا لایا کنارے پر — کنارے سے کسی کو لے گیا تو جانب دریا

کہیں مہر نبوت دے کے بخشی فقر کی دولت — قیامت کی کہیں انگشتری سے نعمت ...[3]

غزل ۱۹۵/۹

کسی کے واسطے ناقہ[4] نکالا سنگ خاور[5] سے — کسی کے واسطے آہن کو بخشا موم کا رتبا

کسی کا رخ کیا آئینہ مہتاب سے روشن — کسی کی چشم[6] دل کو کر دیا دوری میں نابینا

کہیں شمشیر براں سے ...[7] قرباں کو — کسی کے سر پہ رکھا امتحاں کے واسطے آرا[8]

سلایا تونے ...[9] کسی کو صبح ...[10] — جلایا تونے ...[11] کو باد[12] ام[13] اخری

کسی کو لقمہ ماہی بنایا تونے دریا میں — کسی کی تونے چشم کرم خوردہ کو کیا اچھا

ترا اک قہر ہے مشہور جس کو کہتے ہیں دوزخ — ترا اک لطف ہے معروف جو ہے جنت الماوی

برابر تیری خلقت کے تری توصیف بس کم ہے — برابر تیری حکمت کے تری تعریف ہے ادنیٰ

میں بندہ ہوں میں عاجز ہوں ظالم[14] ہوں میں جاہل ہوں — کرم کر رحم کر احوال پر میرے خدا وندا

زبان تسلیم کی کیا کیا کہے حیرت میں آئی ہے — بیان حمد تیرا لاتعد ہے اور لاتحصیٰ

قطعہ

بچھایا خاک کا پانی پہ کیسا فرش پاکیزہ — ہوا پر خیمۂ افلاک کو کیسا کیا برپا

---

[1] کذا۔ "محروم" کا واو دبتا ہے۔ اصل نسخے میں یہ لفظ[1] ہی نہیں۔ اس کی جگہ جو لفظ ہے وہ میری سمجھ میں کلی نہیں آسکا۔ آخر یہ عقدہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی مدد سے حل ہوا یہاں شاعر نے لفظ "الکن" لکھا ہے جس کا مفہوم ہوا "بہت زیادہ لکنت والا"۔ [2] مؤلف سے "نہیں پڑھا گیا"۔ [3] مؤلف سے یوں ہی پڑھا جاسکا۔ [4] مؤلف سے "نہیں پڑھا جاسکا"۔ "پھٹا ہوا ہے"۔ [5] کذا [6] و [7] مؤلف اس طرح پڑھ سکیں۔ [8] مؤلف سے "نہیں پڑھا گیا"۔ [9] اصل نسخے میں "ارا" ہے [10] مؤلف سے نہیں پڑھا گیا"۔ [11] ایضاً [12] ایضاً [13] کذا۔ [14] کذا۔ یہاں لفظ "میں" کتابت سے رہ گیا ہے۔

بہار[۱] تازگی بخشی اسے گل اور گل رو سے فروغ ثابت و سیار سے بخشا[۲] ... رتبا
تری ہی ذات ہے مجمع فضائل کے کمالوں کی تری ہی شان ہے جو سب میں ہے اور سب سے مستغنیٰ
بشان[۳] شمع ہے تو جلوہ افزا بزم وحدت میں بسان گل ہے تو گلزار کثرت کا چمن آرا
گل[۴] روسے اس کو تازگی بخشی [۵] .... اسے بخشا
کہیں تو ہے حجاب عشق میں شوق دل مجنوں کہیں تو ہے لباس حسن میں رنگ رخ لیلیٰ
عبائے صبح تیرے لطف کے خلعت کی دھجی ہے ردائے ابر تیری[۶] دامن رحمت کا ہے گوشا
تری ہی فکر میں ہیں عارفان مرکز سفلی ترے ہی ذکر میں ہیں کاملان عالم بالا

غزل ۱۹۶/۱۳

زباں قاصر ہے تیری حمد میں اے خالق یکتا تبارک اسمک الاعظم تقدس سالک الاعلیٰ
تری قدرت کرے گی دم میں پنہا ملک ہستی کو تری صنعت نے پل میں ک ناپید اکیا پیدا
سوا اک تری ذات پاک کے ہے کون عالم میں رؤف و قادر و قیوم و مولیٰ و مالک و مولا
نہیں ہے ایک بھی معبود برحق جز ترے کوئی نہیں ہے مثل تیرے ایک بھی بے مثل و بے ہمتا
نہ تجھ کو ہے فنا نہ خواب غفلت نہ فراموشی قدامت ہے تجھے تو نیک بینا نیک ہے دانا
تری ہی ملک ہے جو کچھ زمین و آسماں میں ہے ترا ہی ملک ہے دنیا جسے کہتے ہیں اور عقبیٰ
نہیں ایسا کوئی جو وہ شفاعت خواہ مجرم ہو مگر جب تک نہ تیرا حکم ہو اس پر کرم فرما
تجھی کو علم استقبال ہے احوال عالم میں تجھی کو ہے خبر اس سے زمانے میں جو کچھ گزرا
احاطت ایک شے پر علم سے تیرے نہیں ممکن مگر اتنا کہ تو نے جس قدر جس کے لیے چاہا
لیا ہے تحت میں سب تو نے اوج و بخت[۸] عالم کو دے[۷] مطلق گراں گزرا نہ باران کی حفاظت کا
بلندی[۹] سے ترے رتبے کو ... [۱۰] ہے عالی نہیں تیرے سوا سلطان دارا الملک استغنا

۱۔ اصل نسخے میں یہ مصرع قلم زد کر کے حاشیہ پر عموداً یہ مصرع لکھا ہوا ہے۔ م۔ع۔ بہار گل سے اور گل رو سے اس کو تازگی بخشی۔ ۲۔ مؤلف سے "نہیں پڑھا گیا" مگر اصل نسخے میں یہاں پر "..... بخشا اسے رتبا" ہے جسے قلم زد کر کے "..... جلوہ اسے بخشا" لکھا گیا ہے اور پھر قلم زد کر کے "خ" لکھ دیا گیا ہے جو خارج کی علامت ہے۔ ۳۔ کذا ۴۔ اور یہ شعر دراصل ۱ کی اصلاح شدہ شکل ہے جسے الگ شعر سمجھ لیا گیا ہے ۵۔ کذا۔ اصل نسخے میں تیری ہے۔ ۶۔ مؤلف سے "نہیں پڑھا گیا" ۸۔ مؤلف یوں ہی پڑھ سکیں۔ ۹۔ مؤلف نے یہی پڑھا۔ ۱۰۔ مؤلف سے نہیں پڑھا گیا۔

سرایت سے ترے[1] دیر و حرم لبریز[2] سوزش ہیں — حکایت سے ترے[3] شیخ و برہمن ہیں ہر اک گویا

فغاں اٹھتی[4] ہے تیری یاد میں دل سے نہ[5] موذن کے — جگر ناقوس کا کرتا ہے تیرے شوق میں غوغا

یہ غزلیں زبانِ حال سے صاف کہہ رہی ہیں کہ ان کا موضوع حمد باری تعالیٰ ہے لہٰذا انہیں مناسب ترتیب کے ساتھ یکجا نقل کیا جانا چاہیے تھا۔ آغاز کلام حمد الٰہی سے ہو' اس کا التزام بعد از ظہور اسلام مسلمانوں نے ہر خطۂ ارض میں برقرار رکھا ہے۔ اردو کی روایت بھی یہی رہی ہے۔ یہاں تک کہ غیر مسلم اردو شعرا نے بھی اسے برتا ہے۔ پھر یہ کہ ردیف کے اعتبار سے بھی اس کا اندراج دیوان کے شروع میں ہونا تھا نہ کہ آخر میں۔ اغلب ہے کہ تسلیم نے یہ حمد یا اشعار ترتیب کے وقت' اپنے دیوان کے آغاز میں لکھنے کے لیے قلم بند کیے ہوں گے۔ زیرِ نظر دیوان کا اصل نسخہ ۱۲۷۶ھ میں مکتوب ہوا جب تسلیم کی عمر (قاضی عبدالودود کی قیاس کردہ تاریخ پیدائش کے مطابق) تینتیس ۳۳ یا پینتیس ۳۵ سال کی رہی ہوگی اور جس کے بعد وہ (نساخ کی بتائی ہوئی تاریخ وفات کے بموجب) چوبیس ۲۴ پچیس ۲۵ سال مزید زندہ رہے۔ پتہ نہیں اس طویل عرصے میں کہے گئے اشعار کا کیا حشر ہوا؟ اس کی جانب کوئی اشارہ یا اس کا کوئی ذکر زیر تبصرہ مقالہ میں نہیں ہے اور نہ ہی اس کا پتہ ہے کہ وفات سے پہلے کوئی اور دیوان مرتب ہو سکا تھا یا نہیں۔

ان تین غزلوں میں مطلعے دو ہیں مگر مقطع صرف ایک ہے جو غزل نمبر ۹/۱۵۹ کے آخر میں نقل کیا گیا ہے۔ یہاں ان منتشر اور بے ترتیب اشعار کو نئی ترتیب کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔ بعض اشعار یا مصرعوں کے جو الفاظ مؤلف سے "پڑھے نہیں جا سکے" انہیں بھی اصل نسخے کی مدد سے مکمل کر دیا گیا ہے اور ضروری فٹ نوٹس دے دیے گئے ہیں۔ ترتیبِ نو کے بعد اب یہ حمد ملاحظہ ہو:-

زباں قاصر ہے تیری حمد میں اے خالق یکتا — تبارک اسمک الاعظم تقدس سالک الاعلیٰ

تری قدرت کرے گی دم میں پنہاں ملک ہستی کو — تری صنعت نے پل میں عالم پنہاں کیا پیدا

سوا اک تیری ذات پاک کے ہے کون عالم میں — رؤف و قادر و قیوم و محی و مالک و مولا

نہیں ہے ایک بھی معبود برحق جز ترے کوئی — نہیں ہے مثل تیرے ایک بھی بے مثل و بے ہمتا

نہ تجھ کو ہے فنا[6] نہ خواب غفلت نے[7] فراموشی — قدامت ہے تجھے' تو نیک بینا' نیک ہے[8] دانا

تری ہی ملک ہے جو کچھ زمین و آسماں میں ہے — ترا ہی ملک ہے دنیا جسے کہتے ہیں اور عقبیٰ

---

[1] مؤلف نے یونہی پڑھا۔ [2] کذا۔ [3] مؤلف نے یہی پڑھا۔ [4] مولف یہی پڑھ سکے۔ [5] کذا۔ اصل نسخے میں "نہیں ہے" اور ظاہر ہے کہ اسے ہونا بھی یہی چاہیے۔ [6] و [7] اصل نسخے میں اسی طرح ہے۔

نہیں ایسا کوئی جو وہ شفاعت خواہ مجرم ہو
مگر جب تک نہ تیرا حکم ہو اس پر کرم فرما

تجھی کو علم استقبال ہے احوال عالم میں
تجھی کو ہے خبر اس سے زمانے میں جو کچھ گزرا

احاطت ایک شے پر علم سے تیرے نہیں ممکن
مگر اتنا کہ تو نے جس قدر جس کے لیے چاہا

لیا ہے تحت میں سب تو نے اوج و تحت عالم کو
وے مطلق گراں گزرانہ باران کی حفاظت کا

بلندی ہے تیرے رتبے کو تیری قدر ہے عالی
نہیں تیرے سوا سلطان دارالملک استغنا

سرایت سے تری دیر و حرم لبریز شورش ہیں
حکایت سے تری شیخ و برہمن ہیں ہر اک گویا

فغاں اٹھتی ہے تیری یاد میں دل سے مؤذن کے
جگر ناقوس کا کرتا ہے تیرے شوق میں غوغا

تو ہے وہ جس نے پھونکی روح مشت خاک آدم میں
تو ہے وہ جس نے لکھا آب پر انسان کا نقشا

کسی کو تو نے طفلی میں زبان سے کر دیا الکن[1]
کسی کو مہد میں قدرت سے تو نے کر دیا گویا

کہیں تو نے بنایا ظلمت سے گلزار آتش کو
کہیں تو قہر سے اپنے سحاب آتشیں لایا

کسی کو موج طوفاں سے بچا لایا کنارے پر
کنارے سے کسی کو لے گیا تو جانب دریا

کہیں مہر نبوت دے کے بخشی فقر کی دولت
عنایت کی کہیں انگشتری سے نعمت دنیا[2]

کسی کے واسطے ناقہ نکالا سنگ خارا سے
کسی کے واسطے آہن کو بخشا موم کا رتبا[3]

کسی کا رخ کیا آئینہ مہتاب سے روشن
کسی کی چشم نم کو کر دیا دوری میں نابینا

کہیں شمشیر بُرّاں سے بچایا اپنے قرباں کو
کسی کے سر پہ رکھا امتحاں کے واسطے ارا[4]

سُلایا تو نے راحت سے کسی کو صبح محشر تک
جلایا تو نے حکمت سے کسی کو تا دم اُخریٰ

کسی کو لقمۂ ماہی بنایا تو نے دریا میں
کسی کے تو نے جسم کرم خوردہ کو کیا اچھا[5]

---

[1] الکن، لفظ عربی۔ لکن مادہ ہے بمعنی بہت زیادہ ہکلانے والا بہت زیادہ لکنت والا۔ مؤلف سے نہیں پڑھا جا سکا تو انہوں نے اسے لفظ "محروم" سے بدل دیا تھا جس سے مصرع ناموزوں ہو جاتا ہے نیز مؤلف یا مرتب کو یہ اختیار حاصل ہی کب ہے کہ وہ مصنف کی عبارت میں تحریف کرے، اگر ایسا ہو تو خود تحقیق بھی لایعنی بن کر رہ جائے گی۔ [2] اصل نسخے میں یہ لفظ حاشیہ پر ہے جو پھٹ گیا ہے صرف 'د' کا اوپری حصہ نظر میں آتا ہے اور مصرع کا صحیح مفہوم بھی دراصل اسی لفظ سے بنتا ہے۔ [3] یہ لفظ بھی حاشیہ پر تھا جو اب پھٹ چکا ہے۔ [4] اصل نسخے میں یہ لفظ اسی طرح مکتوب ہے ——

—— [5] اس شعر کی عبارت نہایت گنجلک اور شکستہ ہے۔ نہیں پڑھا جاتا ہے۔ بہت غور کرنے اور سید شاہ اسمٰعیل صاحب کی مدد لینے کے بعد بمشکل یہ صورت بن سکی اور پڑھا جا سکا۔

ترا اک قہر ہے مشہور جس کو کہتے ہیں دوزخ ترا اک لطف ہے معروف جو ہے جنت الماویٰ
چراغ ہر مکاں ہے شمع ہر محفل ہے عالم میں وجود ذرہ سے خورشید روشن تک ترا جلوا

قطعہ

بچھایا خاک کا پانی پہ کیسا فرش پاکیزہ ہوا پر خیمۂ افلاک کو کیسا کیا برپا
بہار گل سے اور گلرو سے اس کو تازگی بخشی فروغ ثابت و سیار سے جلوہ اسے بخشا
تری ہی ذات ہے مجمع فضائل کے کمالوں کی تری ہی شان ہے جو سب میں ہے اور سب سے مستثنیٰ
بسان شمع ہے تو جلوہ افزا بزم وحدت میں بسان گل ہے تو گلزار کثرت کا چمن آرا
کہیں تو ہے حجاب عشق میں شوق دل مجنوں کہیں تو ہے لباس حسن میں رنگ رخ لیلیٰ
عبائے صبح تیرے لطف کے خلعت کی دھجی ہے ردائے ابر تیرے دامن رحمت کا ہے گوشا
تری ہی فکر میں ہیں عارفان مرکز سفلی ترے ہی ذکر میں ہیں کاملان عالم بالا
برابر تیری خلقت کے تری توصیف بس کم ہے برابر تیری حکمت کے تری تعریف ہے ادنیٰ
میں بندہ ہوں میں عاجز ہوں میں ظالم ہوں میں جاہل ہوں کرم کر رحم کر احوال پر میرے خداوندا
زبان تسلیم کی کیا کیا کہے حیرت میں آئی ہے بیان حمد تیرا لاتعد ہے اور لاتحصیٰ

یوان تسلیم کا آغاز جس غزل سے ہوا ہے اس کا مطلع یہ ہے :-

الٰہی باغ عشرت کر دل غمناک سے پیدا گل امید ہو میرے جگر کے چاک سے پیدا

ر آخری غزل جو مندرجہ بالا حمدیہ اشعار والی غزلوں (ع ۱۹۴ تا ع ۱۹۶) سے فوراً پہلے ہے اور جس کا سلسلہ وار نمبر ۱۹۲ ہے اس کا مطلع یہ ہے :-

وصل پھر گل کا ہوا ، اے نسیم سحری فصل کی بدلی ہوا ، اے نسیم سحری

ظاہر ہے کہ ردیف " ی " کے بعد ردیف " الف " کا اندراج نامناسب ہے خصوصاً ایسے میں جب کہ پورا دیوان
ردیف الف تا یائے سلسلہ وار مرتب ہے ۔ دیوان کی پہلی غزل جس کا مطلع اوپر درج کیا گیا اس سے پہلے ہی ان حمدیہ
شعار کا اندراج ہونا تھا کہ روایت و درایت اور اصول ترتیب و تدوین سب اسی کے حق میں ہیں ۔ تسلیم کی لکھی ہوئی
س حمد کا یہ نکتہ خاص طور پر طالب توجہ اور حامل لطافت و بلاغت ہے کہ مطلع و مقطع دونوں کا آغاز لفظ " زبان "
سے ہوتا ہے کہ یہی وہ نعمت عظمیٰ ہے جس کے سبب مخلوقات عالم میں انسان مشرف ہوا اور یہی وہ حصۂ جسم ہے جس پر سب

۔ یہ شعر اصل نسخے میں موجود ہے مگر نقل کرنے میں مولف سے چھوٹ گیا ہے ۔ ۲ پہلے تسلیم نے یہ شعر یوں لکھا تھا :- بہار تازگی بخشی اسے گل اور گل رو سے ۔ فروغ ثابت و سیار سے بخشا
ے زمانہ اصلاح کے لوازمات کی یہ شکل بنی پھر بھی شاعر کو تشفی نہیں ہوئی تو اس شعر کے سامنے اس نے حرف " خ " لکھ دیا جو " خارج " کی علامت ہے ۔ ۳ یہ حصہ اب پھٹ چکا ہے ۔

سے زیادہ حمد الٰہی اور شکر ربانی کا فرض عاید ہوتا ہے۔

اپنے مقالے کے آخر میں ڈاکٹر حمیرا خاتون نے "مخطوطات تسلیم" کے زیر عنوان جو اطلاعات ان مخطوطات سے متعلق دی ہیں ان میں یہ تو لکھا ہے کہ "کہیں" نظر ثانی باقی ست" تحریر ہے، مگر ترتیب متن میں انہوں نے یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے کہ اس ضمن میں کون کون اشعار یا غزلیں آتی ہیں۔ فٹ نوٹ میں ان باتوں کی صراحت، متن کے ساتھ ساتھ ضروری تھی۔

ص ۲۴ پر لکھتی ہیں کہ:۔ "تسلیم کا زمانہ شاگردی فریاد کے پہلے سفر کلکتہ ۱۸۳۸ء سے قبل کا ہے۔" اس سے پتہ چلا کہ فریاد ۱۸۳۸ء میں پہلی مرتبہ کلکتہ گئے۔ آگے ص ۲۷ پر یہ عبارت ہے:۔ "تسلیم کا زمانہ شاگردی فریاد کے پہلے سفر کلکتہ سے قبل کا ہے۔ اس لئے کہ فریاد مرشد آباد ۱۸۳۸ء میں پہلی بار گئے۔"

اب بتائیے کہ ۱۸۳۸ء کو فریاد کے "پہلی بار" کلکتہ جانے کا سنہ تصور کیا جائے یا پہلی بار مرشد آباد جانے کا؟ یا مرشد آباد جانا اور کلکتہ جانا ایک ہی بات ہے (جیسے مضافات گیا میں بعض دیہات کی عورتیں گیا کو صاحبگنج بھی کہتی ہیں اور ان کے نزدیک صاحبگنج جانے کا مطلب گیا جانا ہے کیا یہاں بھی یہی صورت ہے؟) یا پہلے جو لوگ مرشد آباد جاتے تھے وہ کلکتہ بھی ضرور جاتے تھے اس لیے مرشد آباد جانے کا مطلب کلکتہ ہی جانا ہوا یا کبھی کلکتہ ہی کو مرشد آباد بھی کہا جاتا تھا؟ آخر کیا مفہوم لیا جائے اس عبارت کا؟ کوئی صراحت تو ہوتی! پھر یہ کہ یہ بیانات اتنی قطعیت کے ساتھ کس بنیاد پر اور کس حوالے سے دیے گئے اس کا کچھ پتہ ہی نہیں۔ یہ انداز اظہار مزاج تحقیق کے منافی ہے۔ ص ۲۴ کے سامنے والے ص ۲۵ پر "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" سے ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے، اور فٹ نوٹ میں اس کتاب کا حوالہ بھی ہے۔ غرض یہ ہے شاد کی اسی کتاب کے اسی صفحہ پر جس سے یہ اقتباس نقل ہوا ہے چند سطور پہلے شاد نے لکھا ہے کہ ۱۲۷۵ھ میں فریاد چالیس برس بعد کلکتہ سے پٹنہ آئے۔ اس بیان کی روشنی میں فریاد کے کلکتہ جانے کا ۱۲۳۵ھ قرار پاتا ہے اور اس کا تطابق ۱۹-۱۸۱۸ء سے ہوتا ہے۔ اگر اقتباسات بالا کی روشنی میں فریاد کے کلکتہ جانے کا سنہ ۱۸۳۸ء ہی تھا تو اس وقت سنہ ہجری ۱۲۵۴ھ رہا ہوگا تب شاد اس حد تک غلط ہو جاتے ہیں کہ بیس برس کو چالیس برس کہہ رہے ہیں۔ اور بالغرض ان کا یہ بیان غلط ہی ہے تو مقالہ نگار کو اس کی تردید و تغلیط کرنا چاہیے تھی اور اپنے بیان کو حوالے کے ساتھ درج کرنا چاہیے تھا۔

ص ۳۱ پر تسلیم کے بھانجے اور شاگرد خواجہ عسکری صبا کا صرف ایک شعر نمونۂ کلام کے طور پر نقل کیا گیا ہے وہ بھی غلط۔ صحت نامہ میں دوسرے مصرعے کی تصحیح درج ہے مگر پہلا مصرعہ قابل تصحیح نہیں سمجھا گیا۔ شعر یہ ہے:۔

کیا لطافت میں لکھوں بخت نیک کردار کی ۔۔۔ کہوں کیا خوبیاں اس طالع بیدار کی

دوسرا مصرع تصحیح کے بعد "کیا کہوں میں خوبیاں اس طالع بیدار کی" درست تو ہو گیا ہے مگر پہلا مصرعہ جوں کا توں رہا۔ یہی شعر دوبارہ صفحہ نمبر ۷۰ پر درج کیا گیا ہے۔ وہاں بھی یہ شکل ہے۔ یہاں تو ایک مصرعے کی تصحیح بھی کی گئی ہے وہاں دونوں مصرعے سابقہ حالت میں ہیں۔ یہ شعر "مدائح الشعرا" اور "بیاض مہجور" کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔ مصرعۂ اول میں "بخت تنک کردار" ہو گا مگر اسے "بخت نیک کردار" پڑھا اور لکھا گیا۔ ذہن کی ناموزونیت کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ ایسی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ فریاد کے ایک شعر کی اصلاح دیکھیے۔ صفحہ ۲۳۳ پر شعر اس طرح ہے ؎

خالی رہا میرا وطن نامیوں سے کب ۔۔۔ فریاد اب ہے راسخ مرحوم کی جگہ

صحت نامہ میں حرف "میرا" کی "ی" ہٹا کر اسے "مرا وطن" بنا دیا گیا ہے۔ اب مصرعۂ اوّل کی یہ شکل بنتی ہے۔
ع "خالی رہا مرا وطن نامیوں سے کب" لاحاصل تصحیح کی ایسی مثالیں گزشتہ صفحات میں بھی گزر چکی ہیں۔ "میرا وطن" غلط نہ تھا فقط اس کے پہلے "ہے" کا اضافہ ہونا تھا۔ تب شعر یوں ہوتا ہے ؎

خالی رہا ہے میرا وطن نامیوں سے کب ۔۔۔ فریاد اب ہے راسخ مرحوم کی جگہ

صفحہ ۲۳۳ کی پہلی ہی سطر میں فریاد کی تاریخ پیدائش ۱۲۱۹ھ کی بجائے ۱۲۱۹ھ چھپی ہے اور صحت نامہ میں اس کی تصحیح نہیں کی گئی ہے۔ صفحہ ۲۳۴ پر فریاد کی تصنیف "دبستان اخلاق" کو مثنوی لکھا گیا ہے اور سامنے کے صفحہ نمبر ۲۳۵ پر اسی کو "فارسی کلام کا مجموعہ" بتایا گیا ہے۔ تصحیح کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے لہٰذا صحت نامہ میں اس سے متعلق کوئی اندراج نہیں ہے۔

"استاد تسلیم" کے زیر عنوان فریاد سے متعلق تین چار صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے نہ تو ان کے بچپن کے کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں، نہ درس و تدریس کا کوئی سراغ ملتا ہے، نہ بیوی بچوں کا حال معلوم ہوتا اور نہ ہی شغل معاش کا۔ بس لے دے کر یہ کہ بزرگ خاندان سے تھے۔ شعر و شاعری کی فضا میں آنکھیں کھولیں، شاعری کرتے کراتے رہے، اُردو میں بھی، فارسی میں بھی، تسلیم، وحید اور شاد تین نامی شاگرد ہیں، ان کے علاوہ اور ہیں بھی یا نہیں اگر ہیں تو کتنے اور کون؟ "خاصی تعداد" کی تحصیر و تحدید کون کرے؟ پیدا تو ۱۲۱۹ھ میں ہو ہی چکے تھے، انتقال ۱۲۹۰ھ میں ہو گیا۔ وحید نے "شاہ الفت حسین صدر جہاں" مصرعۂ تاریخ کہا اور قصہ ختم ہوا۔ اسی ضمن میں صفحہ ۲۸ پر شاد کی تاریخ ولادت و وفات بالترتیب ۷ جنوری اور ۸ جنوری لکھی گئی ہے حالانکہ کلیات شاد حصۂ اول میں یہ ترتیب برعکس ہے یعنی ولادت ۸ جنوری اور وفات ۷ جنوری اسی صفحہ کے فٹ نوٹ میں یہ اطلاع بھی ہے کہ: "جناب قاضی عبدالودود کی تحقیق کے مطابق صورت الخیال شاد کی تصنیف نہ تھی بلکہ سید علی اعظم کی محنت کا نتیجہ تھی" قاضی صاحب اب موجود نہیں رہے۔ ان

کی اس تحقیق کی تفصیل کیوں کر معلوم ہو؟ حوالہ تو کوئی ہے نہیں۔[282]

ص۵۴ پر تسلیم کا ایک ہی شعر دو جگہ نقل ہوا ہے مگر ایک ہی صفحہ پر ہونے کے باوجود مصرعۂ اول میں اختلاف ہے:۔ ع مجھے وصل کی وہ خبر کرے رخ صاف زیر نظر کرے، دوسری جگہ ہے:۔ ع ... ... زیب نظر کرے دیوان ص۱۸۵ پر "زیب نظر" ہی ہے۔

ص۵۵ پر ایک جملے میں لفظ "ہم آہنگی" کو الف ممدودہ کے بغیر اور ٹوٹی ہ کے اضافہ کے ساتھ "ہمہنگی" لکھا گیا ہے اور صحت نامہ میں اس سے متعلق کوئی اندراج نہیں ہے۔

ص۵۸ کے یہ جملے بھی قابل توجہ ہیں:۔ "سنگلاخ زمینوں، مشکل ردیفوں اور اجنبی قافیوں سے شاعر اپنی قدرت کمال کا مظاہرہ کیا کرتا ہے۔" پھر یہ کہ:۔ "تسلیم نے بھی اکثر سنگلاخ زمینوں اور مشکل بحریں اپنائی ہیں۔" صحت نامہ ان سے متعلق کسی اندراج سے عاری ہے۔ اسی صفحہ پر تسلیم کا ایک شعر اس طرح درج ہوا ہے:۔

طلوع نشہ سے ہے میکدے میں نور سحر　　　چراغ دیدۂ خورشید یاں پیالہ ہوا

دیوان ص۲۷ پر اس شعر کا مصرعۂ اول یوں ہے:۔ ع ہے میکدہ میں سحر حسن روئے ساقی سے، مگر دو میں کسی بھی جگہ فٹ نوٹ میں یا کہیں بھی اس اختلاف کی نہ تو نشاندہی کی گئی ہے اور نہ ہی توجیہہ۔ حالانکہ اصل نسخے میں مصرع اول پہلے یوں تھا: ع طلوع نشہ سے ہے میکدے میں ہے نور سحر۔ پھر اسے قلم زد کر کے یوں بنا دیا گیا ہے:۔ ع ہے میکدہ میں سحر حسن روئے ساقی سے۔ فاضل مقدمہ نگار نے یہ شعر تسلیم کے اشعار میں "تراکیب کی ندرت" ظاہر کرنے کی غرض سے نقل کیا ہے جب کہ اس شعر کو ایسی ہی دوسری مثالوں کے ساتھ تسلیم کی خود اپنے اشعار پر اصلاحوں کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے نقل کیا جانا چاہیے تھا۔ مخطوطہ دیوان میں مصرعے کے مصرعے کاٹ کر بدل دیے گئے ہیں۔ مقدمہ میں ان اصلاحوں کی نشاندہی ضروری تھی۔

ص۶۰ پر ایک جملے میں "سہل ممتنع" کو "سہل متنع" لکھا دیکھ کر مجھے اس بنگالی طالبعلم کی یاد آ گئی جو پٹنہ کالج میں سال اول یا دوم کا طالبعلم تھا اور اقبال ہوسٹل میں مجھ سے اردو سیکھنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ اس کی زبان سے لفظ "دوچشمی ھ" ادا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے "دلچسپی ھ" کہا کرتا تھا۔

"ناسخ اور تسلیم" کے زیر عنوان عظیم آباد کی شعری روایت اور طرز ناسخ کی پیروی کرنے والے عظیم آبادی شعرا قدرے تفصیلی ذکر کیا گیا ہے جسے دراصل ناسخ اور عظیم آباد یا ناسخ اور شعرائے عظیم آباد کا عنوان دے کر الگ سے زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہیے تھا۔ اس صورت میں مقالہ زیادہ باوزن ہوتا۔ نیز اسی عنوان کے تحت جہاں تقابلی مطالعہ کی غرض سے ناسخ اور تسلیم دونوں کے اشعار کا انتخاب درج کیا گیا ہے وہاں دونوں کے اشعار

بالمقابل درج کیے جانے چاہیے تھے۔ تقابلی مطالعے کیلئے یہ صورت زیادہ مناسب ہے مگر اس کا التزام اس مقالے میں نہیں کیا گیا ہے۔

طرز ناسخ کی پیروی کرنے والوں میں شاد عظیم آبادی کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ان سے متعلق صفو۱۸ کی یہ عبارت دیکھیے۔

"اور تو اور ابتدا میں خود شاد ناسخ کے اثر سے بہرہ مند تھے۔ وہ صفیر کے شاگرد ہوں یا نہ ہوں اتنا متیقن ہے کہ وہ صفیر کے ہم مشق رہ کر اس دور کے مشاعروں میں شریک رہتے تھے۔ شاد نے اپنے کلام پر مختلف ادوار میں اصلاحیں کی ہیں اور انہوں نے خارجی مضامین کے اشعار کو اپنے کلام سے خارج کر دیا۔ متداول اور مروج کلام شاد جو ہم تک پہنچا ہے وہ اکثر و بیشتر ایسے اشعار سے خالی ہے جن سے یہ غمازی ہو سکے کہ وہ ناسخ کے رنگ میں بھی کہتے تھے۔ ان کے ابتدائی کلام جو مختلف گلدستوں اور رسالوں میں ملتے ہیں ان میں بہت سارے اشعار ناسخ کے رنگ کے ہیں۔ مثلاً شاد کی ایک مشہور غزل "نایاب ہیں ہم" "شاداب ہیں ہم" کی زمین میں ہے اس میں بعض اشعار ناسخ کے رنگ کے بھی تھے جو بعد میں شاد نے نکال دیے۔ اسی غزل میں ایک شعر تھا جسکا مصرع تھا۔

ع وان چہرے پہ ان کے خط نکلا یاں بھولے ہوئے القاب ہیں ہم

اس طویل اقتباس سے آپ کو بھی اکتاہٹ ہو رہی ہوگی۔ میں بھی اسی احساس کا شکار ہوں مگر کیا کیجیے کہ مجبوری بھی کوئی چیز ہوتی ہے اس اقتباس کو پڑھ کر میرے ذہن کی دہلیز پر یہ مصرع جو شاید سراج اورنگ آبادی کا ہے، زور زور سے دستکیں دے رہا ہے کہ :- ع نہیں اپنے حال کی کچھ خبر تو رہی سو بے خبری رہی۔

اس مصرعے کے آخری لفظوں کو بار بار دہرائیے اور سوچیے کہ یہ جملے مقالہ نگار کے علم و مطالعہ اور تحقیق و تفتیش کا ما حصل ہیں یا محض کہیں سن کر یا دیکھ کر لکھ لیے گئے ہیں؟ یہ بھی سوچیے کہ وہ کون سے گلدستے اور رسالے ہیں جو مرتب کلیات شاد کے علم و مطالعہ میں نہیں آسکے؟ یا مخطوطات کلام شاد میں کون سا نسخہ ایسا رہ گیا ہے جس کے اختلافات کلیات شاد میں نقل ہونے سے رہ گئے؟ بس جو رہی سو بے خبری رہی! کلیات شاد میں مراثی شاد کے سوا سارا کلام یکجا ہے۔ ناسخ کے رنگ کے اشعار اگر شاد نے خارج کر دیے ہیں تو اختلافات کی نشاندہی کے سلسلے میں فٹ نوٹ میں ضرور درج کیے گئے ہوں گے۔ تلاش و جستجو سے انہیں اگر وہ ہیں جمع کیا جا سکتا ہے اور تب کہا جا سکتا ہے کہ شاد نے طرز ناسخ کی پیروی کس حد تک کی یا نہیں کی۔ تخفیف تحقیق ہے افسانہ طرازی نہیں

ب رہا اس غزل کا سوال جو "نایاب ہیں ہم، شاداب ہیں ہم" والی زمین میں ہے اور جس کے بارے میں یہ عرض کیا گیا ہے کہ "اس میں بعض اشعار ناسخ کے رنگ کے بھی تھے جو بعد میں شاد نے نکال دیے"۔ پھر یہ بھی دعویٰ کہ "اسی غزل میں ایک شعر تھا جس کا مصرع تھا" غور کیجیے اس "تھا، تھا، تھا" کی تکرار پر اور دیکھیے اس بے خبری کو کہ کلیات شاد حصہ اول کے ص ۵۶۲ پر "نایاب ہیں ہم، شاداب ہیں ہم" والی زمین کی غزل میں وہ شعر مکمل دونوں مصرعوں کے ساتھ اب بھی موجود ہے جس کا ایک مصرع اس طویل اقتباس کے ساتھ مؤلف دیوان تسلیم نے نقل کیا ہے اور بہ زعم خود شاد کے ایک گم گشتہ مصرعے کا سراغ بتا کر تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے وہ شعر یوں ہے ؂

اے شوق بُرا اس وہم کا ہو مکتوب تمام اپنا نہ ہوا — واں چہرے پہ ان کے خط نکلا یاں بھولے ہوئے القاب ہیں ہم

صرف لفظی رعایتیں ہی نہیں، شاعری بھی ہے۔ طرز ناسخ چیز دوسری ہے، صرف رعایت لفظی کا نام ہی طرز ناسخ نہیں جس کی بنا پر جہاں کہیں اور جس کسی کے بھی کلام میں رعایت لفظی کا سراغ ملے بس طرز ناسخ کی مہر جڑ دی جائے۔ ناسخ نام ہے لفظی شان و شوکت کا، صوت و صدا کی آن بان کا، آہنگ و ادا کے طمطراق کا اور اکثر معنی کے فقدان کا۔ ناسخ نام ہے سیل تند خو کا جوئے سبک رفتار کا نہیں۔ ناسخ نام ہے عرصۂ جنگ کے زور شور کا، بزم سرور کی قلقل مینا کا نہیں۔

تسلیم کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مقالہ نگار نے دوسرے بڑے شعرا کے بعض اشعار کے ساتھ تسلیم کے شعروں کا معنوی یا لفظی ربط یا ان میں باہمی مماثلت ظاہر کرنے کے لیے جا بجا مختلف شعرا کے اشعار نقل کیے ہیں۔ اسی ضمن میں آتش کے بھی بعض اشعار نقل ہوئے ہیں مگر ایک غزل جو تسلیم نے آتش کی زمین میں لکھی اور اس کے مقطع میں فخریہ یہ کہا کہ ؂

آب ہے گو مری افسردہ بیانی تسلیم — آبرو دیوے گی آتش کے قریں تھوڑی سی

اس کا کوئی ذکر اس حوالے سے نہیں کیا گیا ہے جبکہ ایسا کیا جانا چاہیے تھا۔ تسلیم کی یہ غزل دس اشعار کی ہے مگر اس کا مطلع نہیں ہے۔ پہلا شعر اس طرح ہے ؂

خاک اڑاؤں گا کہاں جا کے میں اے جوش جنوں — ہے اگر دشت عدم میں بھی زمیں تھوڑی سی

اغلب ہے کہ تسلیم نے مطلع ضرور کہا ہوگا۔ ممکن ہے کچھ اور اشعار بھی ہوں جو یا تو تلف ہو گئے یا ہنوز پردۂ خفا میں ہیں

[illegible] لکھنے کے [illegible] مطلع کا سراغ بھی مل گیا۔ اس [illegible] ص ۵۰۳ پر قلم زدہ اشعار [illegible] میں کیا گیا ہے۔ اور ایک مطلع نہیں بلکہ دو مطلع ہیں۔ ایک کا مصرعۂ اول یوں ہے [illegible] مجھے مہلت اب اے خنجر کہیں تھوڑی سی [illegible] اور غیب [illegible] ہے [illegible] کہیں "کو" خنجر کہیں پڑھ لیا گیا ہے۔ ویسے مطلع ثانی [illegible] دیوان میں کیا گیا تھا [illegible]

اس زمین میں آتش کی غزل سو اشعار کی ہے جو کلیات آتش مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کے صفحہ ۴۲۳-۴۲۴ پر درج ہے۔ اس کا مطلع اور مقطع یہاں درج کیا جاتا ہے: ؎

آسماں مرکے تو راحت ہو کہیں تھوڑی سی ۔۔۔ پاؤں پھیلانے کو ہاتھ آئے زمیں تھوڑی سی

فکر رنگیں سے لگا اسمیں بھی اک باغ آتش ۔۔۔ رُبعِ مسکوں سے الگ ہے یہ زمیں تھوڑی سی

تسلیم نے اہل لکھنؤ کے تتبع میں "طور کی گردن" اور "حور کی گردن" والی زمین میں بھی غزل کہی ہے۔ دیوان کے صفحہ ۱۷۶ پر یہ غزل درج ہے جو تیرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ تسلیم کی شاعری کے تحت اس زمین میں لکھنوی شعرائی غزلوں سے اسکا موازنہ اور اس پر محاکمہ کیا جانا چاہیے تھا مگر مقالہ نگار نے اس جانب توجہ نہیں دی۔ نمونتہً چند اشعار یہاں پیش ہیں: ؎

آگے ترے خم ہے شجر طور کی گردن ۔۔۔ خورشید کا رخ، مہ کی جبیں، نور کی گردن

شمشیر سحر زنگ سے آلودہ ہے شاید ۔۔۔ کٹتی نہیں ہرگز شب دیجور کی گردن

دیوان کا ورق ہے مرے یا روئے پری ہے ۔۔۔ خامہ ہے مرے ہاتھ میں یا حور کی گردن

آتی ہے انا الحق کی صدا خندۂ گل سے ۔۔۔ غنچہ کی صراحی ہے کہ منصور کی گردن

حق یہ ہے کہ جو حسن ہے ختم اس پہ ہے تسلیم ۔۔۔ کس طرح جھکے اس بت مغرور کی گردن

ترتیب و تدوین میں صحت متن کا کام بنیادی خشت اول کا مقام رکھتا ہے۔ اس کی کجی "تا ثریا می رود دیوار کج" کا عیب پیدا کر دیتی ہے۔ اور یہی عیب دیوان ہدی بخش تسلیم میں در آیا ہے۔ اگر تفصیل پر آؤں تو مزید اتنے ہی اوراق سیاہ کرنے پڑ جائیں گے۔ بس دو باتیں اور۔ ایک تو یہ کہ غزل نمبر ۱۸۵ کی ردیف "بانٹے" درج ہوئی ہے جبکہ اسے یائے معروف کے ساتھ "بانٹی" ہونا چاہیے۔ یہ غزل اکیس اشعار کی ہے اور مطلع سے مقطع تک ردیف غلط ہے مگر صحت نامہ میں اس کی جانب کوئی اشارہ نہیں ہے۔ ایک اور غزل کی ردیف کو خطا کی جگہ خط لکھ دیا گیا ہے مگر صحت نامہ میں اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ مذکورہ غزل نمبر ۱۸۵ کی ردیف کو شاید محسوس نہیں کیا جا سکا کہ غلط ہے۔ غلط ردیف کے ساتھ ہی چند اشعار دیکھئے: ؎

---

۲۴۷ کا بقیہ حاشیہ:

صفحہ پر نقل کیا جانا چاہیے تھا جہاں پوری غزل ہے۔ دوسرا مطلع ڈھیلا ہے تاہم جو کچھ ہے یہی ہے۔ دونوں مطلعے یوں ہیں: ؎

دے مجھے مہلت اب اے خنجر کیں تھوڑی سی ۔۔۔ حسرت دل ابھی یک جا ہے یہیں تھوڑی سی

ہے عبث نشو و نما خود ہے زمیں تھوڑی سی ۔۔۔ نام دہ طول یہاں جائے نگیں تھوڑی سی

۱؎ اصل نسخوں کی کیفیت یہ ہے کہ نسخۂ دوم میں اس غزل کے پندرہ اشعار ہیں اور کاتب نے ردیف "بانٹی" رقم کی ہے صرف چار اشعار میں جو ابتدا

جنوں کی تو نے جب پوشاک اے گل پیرہن بانٹے — قبا چاک جگر کے بہر گلہائے چمن بانٹے

نیا تحفہ ہر اک قاتل نے اک اک عضو کو میرے — لگا مذبح میں مثل گوسپند اپنا بدن بانٹے

برنگ لالہ یاں جز داغ دل پایا نہ کچھ اپنے — متاع زر ہر اک کو تو نے اے چرخ کہن بانٹے

نظر آتا ہے رنگ گل میں عالم حسن یوسف کا — صبا تو نے چمن میں کس کے بوئے پیرہن بانٹے

کہیں ٹوٹا ہے ساغر بزم میں شیشہ کہیں ٹکڑے — نگاہ مست ساقی نے مئے میناشکن بانٹے

ص۱۴۲ پر غزل نمبر ۹۳ ہے جس کا مطلع یوں ہے :-

کیوں نہ روشن بزم میں ہو راز شمع — اشک ہم دم داغ ہے دمساز شمع

اس غزل کا چھٹا شعر یہ ہے :-

کیا عجب گر ہووے فیض عشق سے — خاک پروانے کی قالب ساز شمع

مطبوعہ دیوان میں مصرعۂ ثانی کے لفظ "قالب" پر "۷" ہے جس کے ساتھ فٹ نوٹ میں یہ ہدایت درج ہے کہ "قالب ساز" درست نہیں ہے "قالب پاک" درست ہے۔ اس غفلت بے پناہ کو کیا کہیے کہ جہاں راز اور دمساز قوافی ہوں وہاں قالب ساز کے بجائے قالب پاک کو درست فرمایا جارہا ہے۔ بس! جو رہی سو بے خبری رہی خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے!

●●

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۵ کا۔

صفحہ پر "بانٹے" رقم ہے نسخۂ اول میں اکیس اشعار ہیں اور ردیف شروع سے آخر تک یائے مجہول کے ساتھ "بانٹے" مرقوم ہوئی ہے۔ ۲ اصل نسخے میں "کے" "ہے مگر اسے "کی" پڑھنا چاہیے۔ ۲ اصل نسخے میں اسی طرح ہے مگر اسے "میرے" پڑھنا چاہیے۔ ۴ اصل نسخے میں "اپنے" "ہیں" ہم نے "ہے" ۵ اصل نسخے میں "کے" ہے مگر اسے "کی" پڑھنا چاہیے۔

●●

ڈاکٹر حمیرا خاتون

مہندرو پٹنہ

جواب

اردو ریسرچ کانگریس میں میری تھیسس پر جو علمی پرچے پڑھے گئے ان میں عطاء اللہ پالوی صاحب کے مقالے کا جواب میں نے دیدیا ہے، آپ اسے شائع کر دیں۔ ڈاکٹر رضوان احمد کے مقالہ کا جواب مجھے نہیں دینا ہے۔

●●

جناب عطاء اللہ پالوی
علی نگر پالی جہان آباد

ڈاکٹر حمیرا خاتون کا تھیسس

دیوان مہدی باخش تسلیم

ڈاکٹر حمیرہ خاتون صاحبہ نے اپنے تحقیقی مقالہ میں شیخ مہدی بخش تسلیم کے اپنے یا اُن کے خاندان والوں کے حالات مطلقاً بیان نہیں کیے ہیں۔ بس جس حد تک تذکروں سے انھیں معلوم ہو سکے وہ انھوں نے پیش کیے ہیں۔ مگر میں اس کمی کے لیے ان کو قطعاً معذور گردانتا ہوں۔ اس لیے کہ شیخ مہدی بخش تسلیم کے حالات ڈاکٹر صاحبہ کہاں تک جان سکتی تھیں، جبکہ قاضی عبدالودود صاحب کو بھی ان کے حالات کی خبر نہ تھی جو محقق تھے، جبکہ پروفیسر عسکری صاحب کو بھی اُن کے حالات کی واقفیت نہ تھی جو مورخ ہیں۔ اور جن کا گھر اُسی ضلع میں ہے، اور جبکہ تذکرہ نگاروں کو بھی ان کے حالات کا علم نہ تھا اسی لئے انھوں نے بالعموم شیخ مہدی بخش تسلیم کو عظیم آبادی شاعر قرار دیا ہے۔ ساتخ نے تو اور بھی کمال کیا ہے کہ شیخ مہدی بخش تسلیم کے دادا شیخ امام بخش صاحب کو "رئیس عظیم آباد" لکھ دیا ہے اور ان ہی کی تقلید ڈاکٹر حمیرہ خاتون نے بھی کی ہے البتہ میں متذکرہ تحقیقی مقالے کی ایک اہم غلطی کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں اور اس غلطی کی ذمہ دار ڈاکٹر حمیرہ خاتون نہیں، بلکہ قاضی عبدالودود صاحب ہیں۔

قاضی عبدالودود صاحب ایک محقق کی حیثیت میں، لوگوں کی زبانی باتوں کو بالعموم تسلیم نہیں کرتے تھے، جس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ میں جب اپنی کتاب "تذکرۂ شوق" مرتب کر رہا تھا، تو قاضی صاحب نے میری بڑی مدد کی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ اپنی روش کے خلاف ایک مرتبہ مجھے ساتھ لے کر خدا بخش لائبریری تشریف لائے اور "تذکرۂ معرکۂ سخن" کا قلمی نسخہ نکلوا کر انھوں نے وہ عبارت دکھائی جو اُن کی متعدد بار کی رہنمائی کے باوجود مجھے نہ مل رہی تھی۔ جب کتاب چھپ کے آئی تو میں نے اس کا ایک نسخہ قاضی صاحب کی خدمت میں، بغرض مطالعہ پیش کیا۔ ہفتہ عشرہ کے بعد، جب اس کتاب کے متعلق، ان کی رائے جاننے کے لیے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمانے لگے کہ آپ نے مرزا شوق کا سال ولادت متعین کرنے میں، اودھ اخبار کے جس اشو کا حوالہ دیا ہے۔ اس کی عبارت تو آپ نے نقل ہی نہیں کی ہے میں کیسے آپ کی زبانی بات کو تسلیم کر لوں؟ قاضی صاحب سے بحث کرنا، ایک آفت مول لینا تھا، اس لیے میں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ باقی سب ٹھیک ہے اور آپ کی کتاب اپنے موضوع پر کامیاب ہے۔

اس واقعہ کا ذکر میں نے یہاں یہ دکھانے کے لیے کیا ہے کہ قاضی صاحب عام طور سے لوگوں کو جھوٹا سمجھتے تھے اور اسلیے

زبانی روایتوں کو بلا سند تسلیم نہیں کرتے تھے۔ مگر جس غلطی کی میں نشاندہی کرنے جا رہا ہوں اس میں وہ اپنے جادۂ مستقل سے ہٹ گئے اور ٹھوکر کھا گئے۔

جناب قاضی عبدالودود صاحب نے ڈاکٹر اختر اورینوی کی تصنیف "بہار میں اردو زبان کا ارتقاء ۱۸۵۷ء تک" کی فروگذاشتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ریختی کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

"یہ بات بھی قابلِ بیان تھی کہ بہاری شعرا نے ریختی کہی ہے۔ مہدی عظیم آبادی کے دیوان میں تو ریختی کے اشعار برائے نام ہیں۔ مگر دعاؔ کو (بقول قاسم حسن خاں کتاب دار خدابخش لائبریری و برادر زادہ خدابخش خاں ان کے پردادا) کے کلیات (کتبخانہ خدابخش) میں ان کا دیوان ریختی شامل ہے۔ یہ انشاؔ کے بڑے مداح اور ان سے متاثر تھے۔ دعاؔ کا ایک شعر ہے:

حضرتِ انشاؔ تلک ساری بات ——— رہ گیا ہے اب دعاؔ نام سخن

واضح رہے کہ ان کا کلیات جو کتبخانہ خدابخش میں ہے، ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کا لکھا ہوا ہے۔"

حیرت کی بات یہ ہے کہ شیخ مہدی بخش تسلیم کے سلسلے میں، قاضی صاحب نے نہ صرف تذکرہ نگاروں کی غلط تحریروں پر اعتبار کر کے تسلیم کو مہدی عظیم آبادی لکھا ہے۔ بلکہ قاسم حسن خاں کی غلط زبانی روایت پر اعتماد کر کے مہدی بخش تسلیم کا خدابخش خاں کے خاندان میں سے ہونا مان لیا ہے؟

ڈاکٹر حمیدہ خاتون نے اپنی تصنیف "دیوانِ مہدی بخش تسلیم" میں مہدی بخش تسلیم کو حتمی طور پر خاندان خدابخش کا ایک فرد قرار دے دیا ہے۔ موصوفہ نے نہ صرف اپنی کتاب کے دیباچہ "پیش گفتار" کی ابتدا میں لکھا ہے کہ:

"جناب قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے کہ ان کا تعلق اُس خاندان سے ہے جس کے ایک رکن خدابخش خاں تھے۔" (ماتی کتبخانہ خدابخش پٹنہ)

بلکہ صفحہ ۲۷ میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"خان بہادر خدابخش خاں تو تسلیم کے رشتہ دار بھی تھے، جس کی وضاحت قاضی عبدالودود صاحب نے یوں کی ہے:

" ... مگر دعاؔ (بقول قاسم حسن خاں کتاب دار خدابخش لائبریری و برادر زادہ خدابخش خاں، ان کے پردادا) کے کلیات کتبخانہ خدابخش میں ان کا دیوان ریختی شامل ہے۔ یہ انشاؔ کے بڑے مداح اور ان سے متاثر تھے۔"

قاسم حسن خاں (۱۹ سریرین خدابخش لائبریری) خان بہادر خدابخش خاں کے چھوٹے بھائی جعفر علی خاں عرف ابوالحسن خاں کے بیٹے تھے اور ۱۸۹۱ء سے ۱۹۴۲ء تک خدابخش لائبریری کے "لائبریرین" رہے تھے۔ اس لئے قاضی صاحب نے قاسم حسن خاں کی زبانی روایت پر ہی مہدی بخش تسلیم کا خدابخش خاں کے خاندان میں سے ہونا مان لیا۔ اور قاضی صاحب کی تحریر پر بھروسہ کر کے ڈاکٹر حمیدہ خا[illegible]

نے اپنی تھیسس میں مہدی بخش تسلیم کو خاندان خدا بخش کا ایک فرد قرار دے دیا۔

قاسم صاحب کا یہ بیان کہ مہدی بخش تسلیم، خدا بخش خاں کے رشتہ مند تھے، بالکل غلط ہے۔ یا تو قاسم حسن صاحب نے یہ دیکھ کر کہ مہدی بخش تسلیم اور ان کے والد شیخ علی بخش دعاؔ مشہور شاعر ہیں اور خدا بخش خاندان میں کوئی شاعر نہیں ہوا، انھیں اپنے خاندان کا آدمی ظاہر کیا۔ یا پھر قاسم حسن خاں کو، ان دونوں خاندانوں کے افراد کے لاحقہ "بخش"، چھپرہ کے قیام اور ایک ہمنام مورث "علی بخش" ہونے نے دھوکا دیا ہے۔

مہدی بخش تسلیم کا ذکر، بہت سے تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ مثلاً عبدالغفور نساخ نے "تذکرۃ المعاصرین" میں لکھا:

"تسلیم تخلص، شیخ مہدی بخش مرحوم معروف بہ بابو مہدی بخش وکیل محکمۂ عدالت ضلع سارن عرف چھپرہ، خلف شیخ علی بخش خلف ناظر شیخ امام بخش رئیس قدیم عظیم آباد، شاگرد رشید سید شاہ الفت حسین موسوی قادری عظیم آبادی تخلص بہ فریادؔ است۔ ناظر امام بخش مرحوم معزز و موقّر و از مایہ و دولتِ صوری بہرہ ور بودہ و نبیرہ اش تسلیم، دولت معنوی فنّ سخن را بنور توجہ و تربیت استاد خود فریادؔ، انبوہ انبوہ اندوختہ براکثر اصناف سخن قدرت داشت۔"

یہ اندراج، بجز اس کے کہ تسلیم کے دادا کو "رئیس قدیم عظیم آباد" لکھا ہے، بقیہ سب کچھ درست ہے یعنی خاندانِ تسلیم کا شجرہ یہ ہے:

"ناظر شیخ امام بخش ← شیخ علی بخش دعاؔ ← شیخ مہدی بخش تسلیمؔ"

اور خدا بخش خاں کا شجرہ یوں ہے:

"علی بخش خاں ← محمد بخش خاں ← خدا بخش خاں"

اس سے ظاہر ہوگا کہ مہدی بخش تسلیم کے والد اور خدا بخش خاں کے دادا کا نام ایک ہی یعنی "علی بخش" تھا، مگر یہ دونوں شخصیتیں جدا جدا ہیں اور دونوں کے خاندان کا تعلق ایک دوسرے سے مطلق نہیں ہے۔ خدا بخش خاں کا خاندان "پٹھان" تھا۔ اسی لیے سب کے نام میں "خاں" کا لاحقہ ہے۔ برخلاف ان کے مہدی بخش تسلیم "شیخ" برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی لیے "شیخ" کا سابقہ سب کے ساتھ ہے کسی تذکرہ نگار نے بھی شیخ مہدی بخش تسلیم کا "خاں" کے عنوان سے ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ دونوں خاندان چھپرہ میں تھے، مگر دونوں خاندان کا قیام الگ الگ محلّوں میں تھا۔ خدا بخش خاں کا خاندان دہیاواں محلہ میں رہتا تھا، اور شیخ مہدی بخش تسلیم کے خاندان کے لوگ محلہ نیا بازار میں سکونت پذیر تھے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر خدا بخش خاں اور شیخ مہدی بخش تسلیم کا خاندان ایک ہوتا تو اس کی خبر قاسم حسن خاں خدا بخش خاں کو ہونی چاہیے تھی۔ مہدی بخش تسلیم کا قلمی دیوان، خدا بخش لائبریری میں تھا اور خدا بخش خاں نے اپنی لائبریری کے

نادر مخطوطات کی جو مطبوعہ فہرست "محبوب الالباب" کے نام سے تیار کی تھی، اُس میں موصوف نے شیخ مہدی بخش تسلیم کے قلمی دیوان کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے:

"دیوان تسلیم مسودہ مصنف است۔ شیخ مہدی بخش المتخلص بہ تسلیم ابن شیخ علی بخش المتخلص بہ دعا ست۔ ذکر ایشاں تحت کلیات دعا از حرف کاف می آید۔ صاحب ترجمہ با والد مرحوم ہم درس و ہم سبق بود۔ ذہن رسا، فہم سلیم، طبع حاذق داشت۔

در قصبہ چھپرہ کہ حاکم نشیں ضلع سارن ہست، مشغول شغل وکالت بودہ و اوقات شریف خود، بہ فارغ امانی بسر می برد۔ ..."

پھر مہدی بخش تسلیم کے والد شیخ علی بخش دعا کی "کلیات دعا" کا ذکر دوسری جگہ یوں کیا ہے:

"کلیات دعا، بہ خط نستعلیق پاکیزہ بہ خط شیخ مہدی بخش خلف شیخ علی بخش المتخلص بہ دعا ست۔ در ۱۲۳۶ھ مکتوب شدہ شیخ علی بخش خلف شیخ امام بخش، از اکابر زادہائے چھپرہ، کہ حالا حاکم نشیں ضلع سارن است، بودہ در زبان فارسی و عربی مہارتے خوب داشت۔ گاہ گاہ بہ شعر ہم میل می فرمود بہ عربی و فارسی وار دو اشعار خوب دارد۔ والد مرحوم حقیر و شیخ مہدی بخش صاحب خلف صاحب ترجمہ ہم درس بودند و مشق خط نستعلیق از سید واصل علی کہ یکے از خوش نویسان عصر بود، ایں ہر دو بزرگوار فرمودہ۔ والد مرحوم و ہم شیخ مہدی بخش منصور خط نستعلیق خوب می نگاشتند۔ از عمارات عالیہ صاحب ترجمہ مسجدے و تعزیہ خانہ در چھپرہ ہنوز برجاست۔ شیخ مزبور در ۱۲۰۰ھ از یں جہان فانی رفت بر بست۔"

خدا بخش خاں نے دعا اور تسلیم دونوں کے نام "شیخ" کے لفظ کی تخصیص کے ساتھ لکھے ہیں اور ایک ہی شہر میں قیام ہونے کی وجہ سے اپنے والد محمد بخش خاں اور شیخ مہدی بخش تسلیم کے کلاس فیلو اور خطاطی میں شیخ واصل علی کا شاگرد ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اگر شیخ مہدی بخش تسلیم، خدا بخش خاں کے رشتہ دار ہوتے تو خدا بخش خاں اس کا تذکرہ ضرور کرتے نیز تذکرہ نگاروں نے بھی اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ تسلیم کا خدا بخش خاں کے خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا بجز اس کے کہ دونوں خاندان چھپرہ میں رہتے تھے۔ یا تسلیم اور محمد بخش کلاس فیلو رہے تھے۔

۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پہلے گورنر لارڈ کلائیو مقرر ہو کر ہندوستان تشریف لائے تو انھوں نے چھبیس [۲۶] لاکھ روپے سالانہ خراج کی ادائیگی کی شرط پر شاہ عالم سے ایک معاہدہ کر کے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کر لی تھی اس طور پر ان تینوں صوبوں پر انگریزی کمپنی کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ اُس عہد میں سرکاری لگان کی وصولی کے لئے ہر جگہ ایجنسیاں قائم کی ہوئی تھیں اور

اس ایجنسی کے عملے لگان وصول کرتے تھے۔

ضلع سارن کا انگریز کلکٹر چھپرہ میں رہتا تھا، ایک مرتبہ حاجی پور میں وہ اپنی بیوی کے ساتھ ناؤ میں دریا کی سیر کر رہا تھا کہ کشتی الٹ گئی اور دونوں میاں بیوی ڈوبنے لگے۔ خوش قسمتی سے شیخ امام بخش جو حاجی پور کے ایک مضافاتی گاؤں میناپور کے رہنے والے تھے، اس موقع پر دریا کے کنارے موجود تھے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے تیراک تھے اور نہایت طاقتور۔ انھوں نے یہ منظر دیکھا تو بے دھڑک دریا میں کود گئے اور انھوں نے دونوں کو بچا لیا۔ اس کارگزاری سے انگریز کلکٹر اس قدر متاثر اور خوش ہوا کہ وہ شیخ امام بخش کو ساتھ چھپرہ لے آیا اور اظہار احسان مندی و شکر گزاری میں اس نے سرکاری لگان وصول کرنے والی ضلع سارن کی ساری ایجنسیوں کا ان کو سول ایجنٹ بنا دیا اور انھیں "ناظر" کا خطاب دیا۔ نساخ نے اپنے تذکرہ میں، اسی وجہ سے تسلیم کے دادا کو" ناظر شیخ امام بخش لکھا ہے۔ کلکٹر موصوف نے نہ صرف اس پر اکتفا کیا بلکہ چھپرہ ضلع اور ٹاون کی بارہ آنہ زمینداری کا ان کو مالک بنا دیا۔ پھر انتہائی ممنونیت میں اس نے چمپارن ضلع کے انگریز کلکٹر کو، جو اتفاق سے اس کا دوست تھا، کہہ کر ضلع چمپارن کے علاقہ لوریا کی زمینداری اور تحصیلداری بھی شیخ امام بخش کو تفویض کرا دی۔ اس طور پر شیخ امام بخش ناظر بہت بڑے آدمی ہو گئے۔

کلکٹر مذکور نے ناظر شیخ امام بخش کو مجبور کر کے چھپرہ ہی میں قیام کرنے کو کہا، چنانچہ انھوں نے میناپور کی سکونت ترک کر دی اور چھپرہ کے محلہ نیا بازار میں ایک وسیع قطعۂ ارضی خرید کر اپنا مکان بنایا اور رہنے لگے اور اللہ تعالیٰ کی شکر گذاری میں انھوں نے اپنے حلقہ کے اندر ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۹ء میں ایک بڑی مسجد بنوائی جو نیا بازار کی جامع مسجد کہلاتی ہے۔ اس مسجد پر یہ سنگی کتبہ چسپاں ہے: ؎

چوں کہ ناظر امام بخش سعید کرد ایں خانۂ خدا تیار
گفت سالِ بناش، ہاتفِ غیب اے مصلّی بیا نماز گذار

یہ مسجد اور اس کا کتبہ اب بھی اچھی حالت میں موجود ہے اور اس کی نگرانی مدرسہ وارث العلوم چھپرہ کرتا ہے جو فی الحال اسی حلقہ میں قائم ہے۔

ناظر شیخ امام بخش اور ان کی بیوی کلثوم نے اپنا تنہا وارث شیخ علی بخش کو چھوڑا۔ وہ اپنے عہد کی مروجہ تعلیم سے مزیّن تھے اور شاعر بھی تھے۔ دعا تخلص کرتے تھے۔ ان کا قلمی دیوان خدا بخش لائبریری میں موجود ہے شیخ علی بخش نے اپنے حلقہ کے اندر ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء میں مسجد کے پورب، ایک امام باڑہ بنوایا تھا جس پر یہ کتبہ اب بھی چسپاں ہے: ؎

چوں علی بخش آں حمیدہ خصال ساختہ مسکنِ غمِ حسین
رو خراشیدہ از بکا، دل گفت خانۂ شیونِ امام حسین

امام باڑہ تو ڈھے گیا مگر اس کے شکستہ حال بڑے پھاٹک پر یہ کتبہ یہاں موجود ہے۔

شیخ علی بخش امیر کبیر تھے جس کا زعم بڑا برا ہوتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے انگریز کلکٹر سے لڑ گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلکٹر نے نہ صرف زمینداری اور ایجنسی ان سے چھین لی، بلکہ حکم دیا یا کہ شیخ علی بخش کو گولی مار دی جائے۔ اس خوف سے شیخ علی بخش نے چھپرہ کی سکونت چھوڑ دی اور اپنی چمپارن ضلع کی زمینداری میں چلے گئے، اور پھر کبھی چھپرہ نہ آئے۔

شیخ علی بخش کے بیٹے شیخ مہدی بخش تھے۔ موصوف بھی تعلیم یافتہ تھے۔ اس تلخی سے متاثر ہو کر وہ بھاگلپور چلے گئے اور انھوں نے سول کورٹ میں ملازمت کر لی۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا اور چھپرہ آ کر پریکٹس کرنے لگے۔ شاعری شروع کی تو اپنا تخلص تسلیم رکھا اور پٹنہ کے الفت حسین فریاد سے اصلاح لینے لگے۔ تسلیم مشاق شاعر تھے اور پٹنہ کا کوئی مشاعرہ ناغہ نہ کرتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں عظیم آبادی کہا ہے۔ حالانکہ ان کا گھر چھپرہ تھا۔ وہیں وہ ہمیشہ رہے اور وہیں مرے۔ تسلیم اور ان کے دادا شیخ امام بخش کی قبر تو اسی حلقہ میں ہے جس میں ان کا مکان تھا۔ البتہ ان کے والد شیخ علی بخش چمپارن ضلع میں رہے اور وہیں مرے۔

خدا بخش خاں نے اپنی فہرست کتب میں، مسجد اور امام باڑہ کی تعمیر کو شیخ علی بخش سے منسوب کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ مسجد کو شیخ علی بخش کے والد شیخ امام بخش نے بنوایا تھا۔

بہر حال، ماحصل کلام یہ ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب نے قاسم حسن خاں کی زبانی روایت کو تسلیم کر کے شیخ مہدی بخش تسلیم کو خاندان خدابخش کا فرد مان لیا اور قاضی صاحب کی تحریر پر بھروسہ کر کے ڈاکٹر حمیدہ خاتون نے ایسا ہی ظاہر کیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے یہ دونوں خاندان الگ الگ تھے ایک کا تعلق "پٹھان" برادری سے تھا اور دوسرے کا "شیخ" برادری سے

میں نے اپنے مقالہ کی ابتدا میں عرض کیا ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب زبانی روایتوں کو بالعموم نہیں تسلیم کرتے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگوں کو عام طور سے جھوٹا سمجھتے تھے۔ اور آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ قاضی صاحب کا نظریہ کتنا درست، ان کا انداز درجہ صحیح، ان کا تجربہ کیسا ٹھوس اور ان کی بصیرت کتنی اٹل تھی۔

ڈاکٹر حمیرا خاتون
شعبۂ اردو
پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ

جواب

ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کی طرف سے خدابخش لائبریری میں پہلی اردو ریسرچ کانگریس کا انعقاد ہوا اور مقالات وغیرہ پڑھے گئے۔ اس میں ہماری شرکت نہ ہو سکی، مجھے اس بات کا افسوس ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ میرے تحقیقی کام "دیوان مہدی بخش تسلیم" کے سلسلے میں بھی ایک مقالہ پڑھا گیا۔ جناب عطاء اللہ پالوی نے اسے لکھا تھا اور وہ مقالہ ڈائرکٹر خدابخش لائبریری کے خط کے ساتھ مجھے ۳؍اکتوبر ۱۹۸۷ء کو ملا۔ اس کے لئے میں ڈائرکٹر خدابخش لائبریری کی شکر گذار ہوں۔

جہاں تک میرے تحقیقی مقالہ "دیوان مہدی بخش تسلیم" کے سلسلے میں جناب عطاء اللہ پالوی کے اعتراضات ہیں ان کے لئے کیا کہا جائے۔ اس کتاب کے "پیش گفتار" کے علاوہ "حیات تسلیم" میں بھی اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ تسلیم کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں۔ ان کے بچپن کے حالات ہمارے علم میں نہیں آتے وغیرہ وغیرہ۔ میں جناب عطاء اللہ پالوی کی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے حالات تسلیم پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے چند جملے قابل غور ہیں۔ انہوں نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے کہ "ڈاکٹر حمیرا خاتون شیخ مہدی بخش تسلیم کے حالات کہاں تک جان سکتی تھیں جب کہ قاضی عبدالودود کو ان کے حالات کی خبر نہ تھی جو محقق تھے اور جب کہ پروفیسر حسن عسکری صاحب کو بھی ان کے حالات کی واقفیت نہ تھی جو مورخ ہیں ان کا گھر اسی ضلع میں ہے، اور جب کہ تذکرہ نگاروں کو بھی ان کے حالات کا علم نہ تھا" ظاہر ہے قاضی عبدالودود جیسا محقق جس کی شخصیت نے اردو دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ جس کی تحریروں نے تحقیقی معلومات کا خزانہ دے دیا جس کی نظر نے قلم کی ہر لغزش کو پکڑا اور ہر فکر ہر بے ربطی کا حساب مانگا۔ جس نے دوسروں کی فروگذاشتوں کا ذکر کرنے سے پہلے اپنی تحریر کے ہر لفظ پر توجہ دی۔ جس نے ہر مقالے کو ہر ممکن اعتراض اور ہر چیلنج سے مبرا بنانے کی کوشش کی۔ جس نے اہل قلم کو زیادہ احتیاط، زیادہ محنت اور

زیادہ علمی دیانت داری کی ضرورت کا احساس کرایا اور پروفیسر حسن عسکری جو ایک زبردست مورخ ہیں اس کے علاوہ انہیں تحقیق کا بھی SYMBOL قرار دیا گیا ہے، کبھی تحقیق ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور مخطوطات سے شغف جنوں کی حد تک پہنچ چکا تھا انہوں نے اپنی زندگی تحقیق کے لئے گویا وقف کر دی تھی، ایسی عظیم الشان ہستیاں جو تقاضائے تسلیم کی تفصیل نہ بتا سکیں تو ہماری بساط کیا ہے اس سلسلے میں مضمون نگار کی برتری البتہ ظاہر ہے جو جناب قاضی عبدالودود اور پروفیسر حسن عسکری جیسی جید ہستیوں پر سبقت لے گئی۔

مضمون نگار نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے کہ "قاضی عبدالودود ایک محقق کی حیثیت میں لوگوں کی زبانی باتوں کو بالعموم تسلیم نہیں کرتے تھے جس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے ... قاضی صاحب عام طور سے لوگوں کو جھوٹا سمجھتے تھے، اس لئے زبانی روایت کو بلا سند تسلیم نہیں کرتے تھے۔" مضمون نگار کے جملوں میں شک کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قاضی صاحب عام طور سے لوگوں کی باتوں یا زبانی روایت کو کیوں نہیں تسلیم کرتے تھے، لوگوں کو جھوٹا کیوں سمجھتے تھے؟ ایک محقق ہونے کے ناطے کچھ اصول تو ان کے پیش نظر ہوں گے، اصول تحقیق کے تحت ایک محقق کے سامنے کچھ مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔ عام طور سے لوگ جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن قاضی صاحب سے متعلق اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں "جناب قاضی عبدالودود کے سامنے بنیادی استفہامیہ یہ تھا کہ لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ اور جھوٹ بولتے وقت ان کے مقاصد اور مصلحتیں کیا ہوتی ہیں؟ علمی ادبی تحقیق اس اعتبار سے بے ضرر یا مصلحتوں سے بظاہر بلند کہی جا سکتی ہے۔ مگر درحقیقت ذاتی قابلیت کا سکہ جمانے یا اپنی بات کی حمایت میں یا کسی کی مخالفت میں یا کسی سے بڑھی ہوئی عقیدت میں یا محض ذہنی کاہلی یا عدم احتیاط کی بنا پر ادبی محقق جھوٹ بولتے آئے ہیں۔ قاضی صاحب نے ان سبھی جھوٹے بیانات کا بھانڈا پھوڑ دیا۔"[1]

ڈاکٹر عابد رضا بیدار اپنے ایک اہم مقالہ "دو اہم آہنگ محقق" میں کہتے ہیں "بنیادی اخلاقیات میں یہ سکھایا گیا ہے کہ ہر شخص کی نسبت ایسا گمان رکھو کہ خدا ایک دوسرے کے ساتھ سوءِ ظن کو ناپسند کرتا ہے اور یہ کہ شروع یہاں سے کرو کہ ہر آدمی اچھا ہے۔ تحقیق کی اخلاقیات میں آغاز شک سے ہوتا ہے، یہاں بات حسنِ ظن کے بجائے سوءِ ظن سے شروع ہوتی ہے ... معاملہ سچ کی تلاش کا ہے ... سچ کی تلاش اور اس کا راست اظہار ہی تحقیق کا کل ہدف ہے۔"[2]

تحقیق کے سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زبانی تقریر کے مقابلے میں "تحریر" روایت کی اصل صورت کے تحفظ کا ایک بڑا ذریعہ ہے لیکن یکے بعد دیگرے نقل روایت کی صورت جب الفاظ و عبارات قلم سے گذرتے ہیں تو صاحب تحریر کی ذہنی اور نفسیاتی حالتوں کے باعث جانے ان جانے طریقوں سے ان میں بہت سی تبدیلیاں راہ پا جاتی ہیں، اس سلسلے میں بڑے

---

[1] "ایک قاموسی شخصیت" معاصر، قاضی عبدالودود نمبر [2] "دو اہم آہنگ محقق" ڈاکٹر عابد رضا بیدار۔ غالب نامہ ص ۱۰۱ قاضی عبدالودود نمبر۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی۔

احتیاط کی ضرورت ہے۔ گہری چھان بین، تقابلی مطالعہ اور بالاستیعاب نظر داری۔[1]

خود قاضی صاحب اپنے ایک مضمون "اصول تحقیق" میں فرماتے ہیں "تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے، کوشش کا لفظ ارادتاً مستعمل ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دیکھنا اور دیکھنے کی کوشش ایک نہیں۔ کوشش کامیاب بھی ہوتی ہے اور ناکام بھی۔ کامیابی کبھی جزوی ہوتی ہے کبھی کلی . . . ہر بات یکساں اہمیت نہیں رکھتی ہے لیکن بات اہم ہو یا غیر اہم۔ محقق کو حقِ تحقیق ادا کرنا چاہیئے . . . مزید یہ کہ بے احتیاطی عادت بن گئی تو ان امور میں جو خود لکھنے والے کی نظر میں اہم ہیں اس سے گریز نہیں۔"[2]

یہ صحیح ہے کہ قاضی صاحب مکمل دلائل کے بغیر کسی روایت کو نہ مانتے تھے وہ اکثر آقائے پور داؤد کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے قزوینی کی یادداشتوں کے مجموعہ کا دیباچہ لکھا ہے جس میں رقم طراز ہیں کہ قزوینی نے "مرزبان نامہ" کی ترتیب و تصحیح میں بڑی احتیاط سے کام لیا لیکن ان کا مرتبہ نسخہ جب ایران پہنچا تو ان میں بہت ساری غلطیاں نکل گئیں۔ قزوینی کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے عہد کیا کہ سورۂ اخلاص کی آیت بھی نقل کرنی ہوگی تو دیکھ لوں گا کہ قرآن میں کس طرح ہے۔"

فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ حیرت کی بات یہ ہے کہ شیخ مہدی بخش تسلیم کے سلسلے میں قاضی صاحب نے نہ صرف تذکرہ نگاروں کی غلط تحریروں پر اعتبار کر کے تسلیم کو مہدی عظیم آبادی کہا ہے بلکہ قاسم حسن خاں کی غلط زبانی روایت پر اعتماد کر کے مہدی بخش تسلیم کا خدا بخش خاں کے خاندان سے ہونا مان لیا ہے۔

بہاری شعرا کے سلسلے میں قاضی عبدالودود صاحب کے مقالات پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے لیکن کہیں پر تسلیم کو مہدی عظیم آبادی کہا گیا ہو یہ میری نظر سے نہیں گذرا ہے۔ مہدی علی خاں طباطبائی، مہدی عظیم آبادی متوفی ۱۲۵۱ھ کا دیوان کتب خانہ خدابخش میں موجود ہے۔ قاضی صاحب کا تبصرہ "بہار میں اردو ادب کا ارتقا" رسالہ نوائے ادب میں چھپا تھا اور بعد میں مقالات قاضی عبدالودود جلد اول میں اس کی اشاعت ہوئی۔ اس میں مہدی عظیم آبادی کا ذکر موجود ہے۔" دیوان مہدی بخش تسلیم" میں بھی صفحہ ۲ پر مہدی عظیم آبادی کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کے علاوہ قاضی صاحب ہی کے مشورہ سے ڈاکٹر الماس تسنیم ریڈر شعبہ اردو پٹنہ عظیم آباد کالج نے دیوان مہدی طباطبائی پر تحقیقی کام کیا اور انہیں ڈگری بھی مل گئی۔

مجھے سخت حیرت ہے کہ مضمون نگار کے ذہن میں قاضی صاحب سے متعلق یہ بات کیسے آئی؟ اگر واقعی قاضی صاحب جیسے عظیم محقق نے تسلیم کو مہدی عظیم آبادی قرار دیا ہے تو مضمون نگار کو حوالہ پیش کرنا چاہیئے۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "قاسم صاحب" کا یہ بیان کہ مہدی بخش تسلیم خدابخش کے رشتہ مند تھے، بالکل غلط ہے یا تو قاسم صاحب" نے یہ دیکھ کر مہدی بخش تسلیم اور ان کے والد شیخ علی بخش دعا مشہور شاعر تھے اور خدابخش خاں

---

[1] "اصول تحقیق و ترتیب متن" ص ۲۶۔ ڈاکٹر تنویر علوی [2] "غالب نامہ" ص ۲، ۱۔ قاضی عبدالودود نمبر۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی۔

کے خاندان میں کوئی شاعر نہیں ہوا انھیں اپنے خاندان کا آدمی ظاہر کر دیا یا پھر قاسم حسن خاں کو ان دونوں خاندانوں کے
افراد کے ناموں کے لاحقہ "بخش" چھپرہ کے قیام اور ایک بمقام مورث علی بخش ہونے نے دھوکا دیا۔

اس سلسلے میں مضمون نگار نے دونوں خاندانوں کا جو شجرہ پیش کیا ہے وہ نامکمل ہے ادھورا ہے جناب
قاسم حسن خاں کے جھوٹ کو ثابت کرنے کے لیے صحیح طور سے روشنی نہیں ڈالی جاسکی ہے مضمون نگار کو ثبوت اور سند
کے لیے دونوں خاندانوں کا مکمل نسب نامہ پیش کرنا چاہیے تھا۔

سوال یہ ہے کہ جناب قاسم حسن خاں کو خدا بخش خاں مرحوم کی شہرت میں کیا کمی نظر آئی جو تسلیم اور دعا سے
اس خاندان کا رشتہ جوڑ دیا۔ اگر تسلیم اور دعا مشہور شاعر گذرے تو خدا بخش خاں مرحوم کی ہستی کچھ کم اہم نہ تھی وہ خود بھی شاعر
تھے جمیل ان کا تخلص تھا ان کی اہلیہ محترمہ جمیلہ خدا بخش بھی شاعرہ تھیں ان کے آٹھ دواوین کتب خانہ خدا بخش میں موجود
ہیں اس کے علاوہ مضمون نگار کو اس بات کی سند پیش کرنی چاہیے تھی کہ خاندانِ خدا بخش میں کوئی شاعر نہ تھا۔

رہ گئی یہ بات کہ خدا بخش خاں مرحوم نے اپنی کتاب "محبوب الالباب" میں ان دونوں خاندانوں کے رشتہ
کو کیوں نہیں ظاہر کیا۔ ہو سکتا ہے ان دونوں خاندانوں کے رشتہ بتانے میں کوئی وجہ مانع ہو یا لے پروائی بھی
ہو سکتی ہے جب تک دونوں خاندانوں کا مکمل شجرہ سامنے نہ ہو کچھ کہنا مشکل ہے۔ ایک بات اور۔

"دیوان مہدی بخش تسلیم" کی طباعت ۱۹۸۰ء میں ہوئی اور جناب قاضی عبدالودود کی وفات کی تاریخ
۲۵ جنوری ۱۹۸۴ء ہے اس زمانے میں قاضی صاحب کی صحت کمزور ضرور تھی لیکن ان کا ذہن حاضر رہتا تھا
علمی ادبی باتیں بڑے ذوق و شوق سے کیا کرتے تھے کبھی کسی نئے تحقیقی گوشے کی نشاندہی کرتے کبھی علمی ادبی سلسلے
میں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے تھے اسی عرصہ میں خاندانِ تسلیم کے سلسلے میں قاضی صاحب سے تبادلۂ خیال
ہونا چاہیے تھا ان کی کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی جاسکتی تھی۔ فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے:

"تذکرہ نگاروں نے بھی اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے" حالانکہ اسی مقالہ کی ابتدا میں یہ بات کہی جاچکی ہے کہ
"اور جب کہ تذکرہ نگاروں کو بھی ان کے حالات کا علم نہ تھا" جب تذکرہ نگاروں کو حالات کا علم ہی نہ تھا تو اشارہ کس طرح
کیا جاتا ہے مضمون نگار کی یہ دونوں باتیں سمجھ میں نہ آئیں۔

فاضل مضمون نگار نے اپنے مقالہ میں ایک انگریز کلکٹر کے حاجی پور دریا کی سیر میں کشتی الٹنے کا واقعہ بیان کیا ہے
اور یہ کہ شیخ امام بخش تسلیم کے دادا (م) بہترین تیراک تھے انھوں نے اس انگریز کی اور اس کی بیوی کی جان بچائی اور صلہ میں انھیں ناظر کا عہدہ
دیا گیا اور ضلع سارن کو ساری ایجنٹوں کا انھیں سول ایجنٹ بنا دیا گیا صرف یہی نہیں بلکہ اس کلکٹر نے ضلع چھپرہ اور ٹاؤن
کی بارہ آنہ زمین داری کا شیخ امام بخش کو مالک بنا دیا اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا اور اس طرح

شیخ امام بخش ناطر بہت بڑے آدمی بن گئے۔" فاضل مضمون نگار جو واقعہ بیان کیا ہے وہ کہاں سے اخذ کیا گیا ہے، یہ نہیں بتایا۔ جو تفصیل انہوں نے پیش کی ہے وہ سند اور حوالوں کے ساتھ پیش کرنا ضروری تھا۔

مضمون نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ تسلیم ایک مشاق شاعر تھے اور پٹنہ کا کوئی مشاعرہ ناغہ نہ کرتے تھے۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تسلیم پٹنہ کا کوئی مشاعرہ ناغہ نہ کرتے تھے۔ پٹنہ میں شعر و سخن کی روایت بہت پرانی ہے "تذکرہ شورش" میں شورش نے یہاں کے دور اول کے شعری نشستوں پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ کثرت سے یہاں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ محمد حسین آزاد مصنف آب حیات نے لکھا ہے کہ راجہ رام نرائن موزوں اور مہاراجہ شتاب رائے کے عہد سے ہی مشاعرے یہاں منعقد ہوا کرتے تھے۔ عہد راسخ اور جوشش میں طرحی اور غیر طرحی مشاعروں کے انعقاد کے بارے میں بھی ہمیں تذکروں سے معلومات ملتی ہیں۔ تسلیم کے زمانے میں جرأت ذبیح، شاغل، ضیا، خواجہ سلطان جاں سلطان، خواجہ شہرت، اصغر علی مائل، مہدی عظیم آبادی، نواب جعفر حسن خاں فیض، الفت حسین فریاد یہ سب یکجا ہوئے اور شعر و شاعری کی دھوم مچی رہتی تھی۔ محلہ دھول پورہ، لودی کٹرہ، دیوان محلہ وغیرہ سب مشاعروں کے لئے مشہور تھے ایسی حالت میں پٹنہ سے باہر کے کسی شاعر کا پٹنہ کے ہر مشاعرہ میں شرکت ہونا غیر یقینی ہے۔

مضمون نگار نے شیخ علی بخش دعا کا انگریز کلکٹر سے لڑائی کر لینا، پھر مارے جانے کے خوف سے چھپرہ کی سکونت چھوڑنا اور پھر کبھی چھپرہ نہ آنا، ان باتوں کو حوالوں کے ساتھ پیش کرنا چاہیئے یا خدا بخش خاں کا اپنی فہرست کتب میں مسجد اور امام باڑہ کی تعمیر کو شیخ علی بخش سے منسوب کرنا۔ ان باتوں کے لئے صاف طور پر کمی محسوس ہوتی ہے۔

مضمون نگار نے اپنے مقالہ کے آخر میں لکھا ہے "قاضی عبدالودود صاحب زبانی روایتوں کو بالعموم نہیں تسلیم کرتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عام طور پر لوگوں کو جھوٹا سمجھتے تھے۔ اور آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا کہ قاضی صاحب کا نظریہ کتنا درست، ان کا اندازہ کس درجہ صحیح، ان کا تجربہ کیسا ٹھوس اور ان کی بصیرت کتنی اٹل تھی۔"

قاضی صاحب سے متعلق اس طرح کے طنزیہ جملوں کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے اور اس طرح کی لغزشوں سے قاضی صاحب کی عظمت پر کیا حرف آسکتا ہے۔ اپنے مضمون "اصول تحقیق" میں اپنی کمزوریوں پر انہوں نے خود ہی روشنی ڈالی ہے۔" میں نے 'معیار پٹنہ' جس کا میں خود مدیر تھا، ادارہ معیار کی طرف سے کسی شخص کے اس قول پر اعتراض کیا تھا محمد عابد دل عظیم آبادی برادر محمد روشن جوشش کے باپ جسونت رائے ناگر تھے۔ اس وقت جو امور میرے پیش نظر تھے وہ یہ کہ تذکرۂ میر حسن میں ولدیت کا مطلقاً ذکر نہیں علی ابراہیم خاں خلیل

کہ گلزار ابراہیم میں دونوں بھائیوں کے نام سے لفظ شیخ مرقوم ہے اور ولدیت یا دونوں کے نو مسلم ہونے کی طرف اشارہ بھی نہیں . . . لیکن مجھے شورش و ابوالحسن امراللہ کے تذکروں کی طرف رجوع کئے بغیر قطعی طور پر اس کی تردید نہ کرنی تھی ۔

"میں نے مدیر نقوش کی فرمائش سے نقوش کے آپ بیتی نمبر کے لئے اپنے حالات لکھے تھے اور اپنے بزرگوں کے ذکر میں حافظے پر اعتماد کیا تھا ، مجھ سے ایک فاش غلطی یہ ہوگئی کہ میں نے نسب نامے میں ایک نام ہی چھوڑ دیا ۔"

کیا اس طرح کی لغزشوں سے علمی ادبی دنیا میں قاضی صاحب کی عظمت میں کمی آسکتی ہے ؟

●●

ڈاکٹر ریحان غنی
قومی آواز، پٹنہ

ڈاکٹر رومانہ زریں کا تھیسس

عبدالحق بحیثیت محقق

تھیسس بعنوان "عبدالحق بحیثیت محقق" کی تفصیل اس طرح ہے :

"ایک تعارف" (۱-۲۷)۔ "تحقیق کا مفہوم و نظریہ، تحقیق کیا ہے؟ اصول اور مسائل، تحقیق میں مآخذ کی اہمیت، تحقیق سے تنقید کا رشتہ، تحقیق سے تدوین کا رشتہ۔" (۲۸-۳۷)۔ "قدیم تذکرے، جدید تذکرے، گلشن ہند، آب حیات" (۴۷-۱۰۳)۔ "عبدالحق بحیثیت محقق (الف) تحقیق کا پس منظر (ب) عبدالحق کی تحقیقات۔ دکن کا مغربی ادب اور مولوی عبدالحق۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ، قطب مشتری، نصرتی۔ دکن میں نثری تصنیف کی دریافت معراج العاشقین، سب رس، تاج الحقائق، مولوی صاحب کے مقدمات اور ان کی تدوین و حواشی۔ ذاتی تصانیف: "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ" "مرحوم دہلی کالج۔ چند ہم عصر: عبدالحق کے خطبات، ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا اسلوب بیان" (۱۰۴-۲۲۵)۔ "عبدالحق کی تحقیقی کاوش کا تجزیاتی اور تنقیدی جائزہ" (۲۲۶-۲۵۵) "عبدالحق کے اثرات ان کے ہم عصر اور زمانہ مابعد کے محقق اور ناقدین پر" (۲۵۶-۲۶۴)

فاضل مقالہ نگار نے مولوی عبدالحق کی تاریخ پیدائش میں ماہ کا تضاد بیان کیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے ۲۰، اپریل ۱۸۷۰ء اور دوسری جگہ ۲۰، اگست ۱۸۷۰ء تحریر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ماہ کا تضاد ہر جگہ ملتا ہے۔ اس طرح وہ خود حتمی فیصلہ نہیں کر سکی ہیں کہ صحیح ماہ اپریل ہے یا اگست۔ اس طرح یہ بات تحقیق طلب رہ گئی ہے۔

مقالہ میں مولوی عبدالحق کے والد کے نام میں بھی تضاد کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کے والد کا نام شیخ علی حسن یا شیخ علی حسین تھا، جبکہ نام میں تضاد کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، کیونکہ شیخ احمد حسن مولوی عبدالحق کے بڑے بھائی تھے۔ انھوں نے ۱۹۶۲ء کے سہ ماہی "اردو" میں ایک مضمون قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے اپنے والد کا نام علی حسین تحریر کیا ہے۔ یقیناً انھوں نے اپنے والد کا نام تحریر کرنے میں غلطی نہیں کی ہوگی۔

رومانہ زریں لکھتی ہیں کہ "مولوی عبدالحق کی ابتدائی تعلیم کے متعلق بھی تضاد پایا جاتا ہے۔ جبکہ

حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس بات پر سبکوئی متفق ہے کہ مولوی صاحب ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے مکتب میں پائی اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ کالج میں حاصل کی۔ روہانہ زریں اس بات کو بھی غلط بتاتی ہیں کہ مولوی عبدالحق کی میٹرک تک تعلیم پنجاب میں ہوئی۔ وہ اس سلسلے میں شیخ احمد حسن کے بیان کو بھی غلط بتاتی ہیں، اور کہتی ہیں کہ :

" شیخ احمد حسن جو مولوی عبدالحق کے بھائی تھے، انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی تعلیم میٹرک تک پنجاب میں ہوئی، لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔"

لیکن انھوں نے اپنے مقالہ میں اس بات کی وضاحت نہیں کی ہے کہ یہ بات کیوں صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ صرف یہ کہہ دینا کہ " یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی" تحقیق کی خامی ہے۔ مولوی عبدالحق کے بھائی کے بیان کی تردید کرتے وقت انھیں جامع اور ٹھوس ثبوت پیش کرنا چاہئے تھا۔

فاضل مقالہ نگار نے مولوی عبدالحق کے بارے میں بہت سی باتیں ایسی لکھی ہیں جس میں انھوں نے نہ تو کوئی حوالہ دیا ہے اور نہ راوی کا نام ہی تحریر کیا ہے جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان خود مقالہ نگار کا ہے جبکہ قطعی ایسی بات نہیں ہوسکتی۔ مثلاً وہ لکھتی ہیں :

" مولوی صاحب کا قد میانہ تھا۔ ان کی آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں، جس سے ذہانت ٹپکتی تھیں اور ہر وقت مسکراتی رہتی تھی۔ مولوی صاحب بہت حاضر دماغ تھے۔ ان کی شرارت بچوں کی طرح معصوم ہوا کرتی تھی۔"

(کوئی حوالہ نہیں دیا)

انھوں نے مولوی عبدالحق کا ایک دلچسپ واقعہ بھی تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں :

" حیدرآباد میں مولوی صاحب کے ایک دوست تھے (دوست کا نام درج نہیں ہے) انھوں نے اپنی لڑکی کی جب شادی کی تو کل پچاس افراد کو مدعو کیا، لیکن ان میں مولوی صاحب اور ان کے رفقا نہیں تھے۔ مولوی صاحب نے اس وضع قطع کا ڈھائی سو[۲۵۰] رقعہ چھپوایا اور مع خاندان کے بلوا بھیجا۔ چنانچہ اس دن دولہن کا گھر بھر گیا، اور صاحب خانہ کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑے بڑے ہوٹلوں سے کھانا منگوانا پڑا۔ جب دلہن رخصت ہو گئی تو دلہن کے والد نے اپنے بڑے لڑکے جن کے ذمے رقعہ بٹوانا تھا، اس کی خوب خبر لی۔ وہ لاکھ انکار کرتے رہے لیکن ان کے والد نہیں مانتے۔ بعد میں جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ مولوی صاحب کی حرکت تھی تو وہ بہت ناراض ہوئے اور مولوی صاحب سے خوب اپنا تا باتی ہوئی۔"

مقالہ نگار نے یہاں بھی کوئی حوالہ نہیں دیا ہے اور نہ راوی کا نام ہی درج کیا ہے۔ مولوی عبدالحق سے ایسے طفلانہ فعل کی امید بھی نہیں کی جاسکتی۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو پھر اسے انھیں ثابت کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت پیش کرنا چاہیے تھا۔

"عبدالحق دانشوروں کی نظر میں" کے تحت عبدالماجد دریا آبادی، آل احمد سرور، غلام رسول مہر، رشید احمد صدیقی، کرشن چندر، احتشام حسین، مولانا صلاح الدین، ڈاکٹر ذاکر حسین، سید سلیمان ندوی، عندلیب شادانی، مہاتما گاندھی اور نیاز فتح پوری وغیرہ کے خیالات نقل کیے گئے ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے کہ ان دانشوروں کے خیالات کہاں سے اخذ کیے گئے۔

مقالہ نگار لکھتی ہیں کہ "ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیدرآباد کے پہلے ادبی ڈاکٹر تھے۔" واقعہ یہ ہے کہ زور حیدرآباد کے ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں اردو کے پہلے ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۹ء میں لندن یونیورسٹی سے "ہندوستانی لسانیات اور ہندوستانی صوتیات" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی تھی۔

مقالہ میں جگہ بہ جگہ جملے کی غلطی بھی نظر آتی ہے۔ جن میں سے چند جملے درج ذیل ہیں:-

(۱) ان کا عزیز انجمن غیروں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ (۲) جنون کی ایسی مثال شاید دنیا کے کسی تاریخ میں نہ ملے۔ (۳) فنون لطیفہ کے ہر صنف پر طبع آزمائی کی گئی۔ ص ۱۱۶، (۴) دوسری خامیوں کا اصلاح نئے تذکرے میں ہوا۔ (۵) عوام کی زبان نئی مخلوط زبان اردو تھی اور یہی زبان عوام استعمال کرتی تھی۔ ص ۱۸۸، (۶) ان کے خطبات اور تقاریر دو طرح کے ہوتے تھے۔ ص ۲۰۲، (۷) اس کی خوبیاں باعث تقلید ہوں گی۔ ص ۱۹۷، (۸) پہلی طرح کے خطبوں کو محفوظ نہیں کیا جاسکا۔ ص ۲۰۲، وغیرہ۔

آخر میں رومانہ زرین لکھتی ہیں کہ "مولوی صاحب کے ہم عصروں کے بعد وہ لوگ آتے ہیں جو مولوی صاحب کی رحلت کے بعد ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" لیکن انھوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ کون لوگ ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھیں ایسے لوگوں کا ضمناً ذکر کرنا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر رومانہ زرین
ہمدرد، پٹنہ

جواب

مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ آپ کے ذریعہ بار بار لکھے گئے خط کے جواب میں خاموش رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ دو سال سے میں ڈاکٹر کے صلاح پر بیڈ ریسٹ پر ہوں۔ مجھے اسپونڈ لائٹس (Spondalytis) کی بیماری لاحق ہوگئی ہے، اس لئے ابھی میں کچھ بھی لکھنے پڑھنے سے معذور ہوں۔

ڈاکٹر ریحان غنی
قومی آواز، پٹنہ

ڈاکٹر اعظم الحق داؤدی کا تحقیس

عبدالغفور شہباز بحیثیت نظم نگار

"عبدالغفور شہباز بحیثیت نظم نگار" دو سو صفحات پر مشتمل ہے جس کے ابواب کی تفصیل اس طرح ہے :

"پروفیسر عبدالغفور شہباز کے حالات زندگی" (۶-۲۹) ۔ "عہد شہباز کا سیاسی، سماجی ادبی پس منظر" (۳۰-۴۱) ۔ "بہار میں اردو نظم نگاری عہد شہباز تک" (۴۱-۴۲) ۔ "شہباز کی نظموں میں مغربی اثرات" (۱۴۲-۱۵۵) "شہباز کی نظموں کی خصوصیات" (۱۵۶-۱۷۱) اور "شہباز بحیثیت نظم نگار - ایک جائزہ" (۱۷۲-۲۰۰) ۔

باب اول کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ؎

یہ حوصلے ہمارے نکلنے سے کم نہ ہوں گے (کذا)
جب حوصلے نہ ہوں گے سمجھو کہ ہم نہ ہوں گے

اس باب سے اس شعر کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تحقیق میں بے جا اور غیر ضروری عبارت آرائی تحقیق کو بے جان بنا دیتی ہے۔ مقالہ نگار بیشتر جگہوں پر اس کے شکار نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو اقتباسات ملاحظہ ہوں :

(۱) ۔ "شہباز نے جس وقت اپنے قلم شعر و ادب کو جنبش دی اُس وقت آسمان فکر سے صرف غم کے فرشتے نازل ہو رہے تھے اور شاعری کی دنیا میں مایوسی کے پیغمبر اپنے الہامات عالیہ سے قوم کو سرفراز فرما رہے تھے ۔" (ص ۶)

(۲) ۔ "یہ صاحب شعر و ادب محسوس کرتا ہے کہ جس بلبل خوش نوا کی چہکار نے اردو کی صبح نو کی آمد کا اعلان کیا تھا کم از کم سو برس تو اور اپنے نغموں سے فضائے چمن کو معمور کرتا ۔" (ص ۲۲)

تحقیقی مقالہ میں "غم کے فرشتے نازل ہو رہے تھے اور الہامات عالیہ سے قوم کو سرفراز فرما رہے تھے۔" جیسے جملے داستان کی زینت تو بن سکتے ہیں، معلومات میں اضافہ نہیں کر سکتے۔

مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ شاد عظیم آبادی نے غزل کو "مرثیۂ زندگی" قرار دیا جس کے باطنی محرک غالب مرحوم تھے۔ اس کے بعد شاد کا یہ شعر ؎

اپنی ہستی کو غم و رنج و مصیبت سمجھو　　　موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو

نقل کر کے لکھا ہے کہ عبدالغفور شہباز کی شاعری ان تمام مدرسہ ہائے فکر سے مختلف ہے۔ انھوں نے جو کچھ زندگی سے لیا اس سے زیادہ زندگی کو دے کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ (ص ۸) لیکن فاضل مقالہ نگار خود ہی اس کی تردید آگے چل کر اس طرح کرتے ہیں :

"شہباز کے یہاں ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوراہے پر کھڑے ہیں۔ مروجہ شاعری سے وہ مطمئن نہیں اور نئی شاعری کی داغ بیل ڈالنے کا بھی پورا سلیقہ حاصل نہیں۔ (ص ۱۸)

"راویوں کا بیان ہے کہ شہباز کو کوئی شخص گندے کاغذ پر خط لکھ دیتا تھا تو انھیں حد درجہ اذیت پہنچتی تھی۔" (ص ۱۱)۔ یہاں راویوں کا نام درج کرنا چاہیئے تھا اور حوالہ دینا چاہیئے تھا۔ شہباز نے کلکتہ، بھوپال، پٹنہ اور حیدرآباد میں اپنی زندگی کے ایام گذارے۔ اس کا ذکر ڈاکٹر داؤدی نے کیا ہے لیکن ان مقامات پر وہ کتنی مدت تک رہے، اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس تغافل کی ذمہ داری تذکرہ نگاروں پر ڈال دی ہے۔ (ص ۲۰)

"شہباز کی دوسری اہلیہ محترمہ اشرف النساء زوجہ ثانی کا انتقال پر ملال اسی زمانے میں ہوا" (ص ۲۰) دوسری اہلیہ جب لکھا جا چکا تو زوجہ ثانی لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ فاضل مقالہ نگار نے جب دوسری اہلیہ کے انتقال کا ذکر کیا تھا تو انھیں پہلی اہلیہ کا بھی ذکر کرنا چاہیئے تھا اور دوسری اہلیہ کا انتقال کس زمانے میں ہوا، اس کی وضاحت کرنی چاہیئے تھی۔

ڈاکٹر داؤدی نے اپنے مقالہ میں دو جگہوں پر نئی نسل کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مقالہ کسی بزرگ کا لکھا ہوا ہے جبکہ ڈاکٹر داؤدی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر نئی نسل اور پرانی نسل کا موازنہ ان کی تحقیق کا موضوع ہوتا تو نئی نسل پر تنقید کا جواز تھا۔ لیکن عبدالغفور شہباز کی نظم نگاری کا جائزہ لیتے وقت یہ لکھنا کہ:

"تذکرہ نگاروں نے شہباز کے استاد کا نام بھی نہیں بتایا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آج کل کے برخود غلط نوجوانوں کی طرح بے استاد کے ہوں۔" (صفحہ ۲۲)

اور یہ ــــ "اگر شہباز اس طرح کے دو چار تجربے اور کر جاتے تو موجودہ دور کی نوجوان نسل انہیں اپنا امام تسلیم کرتی جس کو اپنی جنسی تشنگی رفع کرنے کے لیے فحش افسانوں اور ننگی تصویروں کی ضرورت خطائے گندم سے بھی زیادہ ہے۔" (ص ۱۷۰)

خواہ مخواہ مقالہ کو طویل کرتا ہے۔ فاضل مقالہ نگار کو اگر انتہائی تلاش و جستجو کے بعد بھی شہباز کے استاد کا نام معلوم نہیں

ہوسکا تھا تو انھیں صرف یہ لکھ دینا چاہیے تھا کہ شہباز کے استاد کون تھے، اس کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

ڈاکٹر داؤدی نے "عہدِ شہباز کے سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اس عہد کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے لیکن کہیں کہیں غیر ضروری باتیں تفصیل سے لکھ دی ہے۔ مثلاً انگریزوں نے بیشہ کی آزادی کے نام پر ملک میں جو ابتری پھیلائی اس کی وضاحت تاریخ کی روشنی میں کرنے کے بجائے مکالمے کے انداز میں کی ہے۔ (ص ۲۲ - ۲۴) نتیجہ یہ ہے کہ مقالہ کے تحقیقی رنگ پر افسانوی رنگ غالب آگیا ہے جو تحقیق کی خامی ہے۔

"بہار میں اردو نظم نگاری عہدِ شہباز تک" کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے محنت سے کام لیا ہے اور بہار میں اردو نظم نگاری کے آغاز سے لے کر عبدالغفور شہباز تک کے کئی اہم شاعروں کا مختصر تذکرہ بھی کیا ہے۔ اسی باب میں مقالہ نگار نے گیارہویں صدی ہجری کے ملا تحقیق کا دو شعر نقل کیا ہے۔ اور پہلے شعر کا پہلا مصرع "جھگڑا باندھ کر دل موں سجاما" تحریر کیا ہے۔ جبکہ مسلم شعرا بہار جلد میں اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح ہے: "جھگڑا باندھ کر دل موں سماجا"۔

ڈاکٹر داؤدی نے "شہباز کی نظموں میں مغربی اثرات" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شہباز نے انگریزی کی متعدد نظموں کے نہایت سلیس با محاورہ اردو میں ترجمے کیے۔ ابراہیم بن ادہم پر شہباز کی ترجمہ نگاری یوں گلفشاں ہوئی ہے۔" اس کے بعد اس نظم کے سات اشعار نقل کیے گئے ہیں جبکہ اس سے قبل کے باب میں یہ نظم مکمل نقل کی جا چکی ہے۔ (دیکھیے ص ۱۰۰ تا ۱۰۳) اس تکرار کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔

بہرکیف فاضل مقالہ نگار نے ایک اچھی کوشش کی ہے۔ انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے اپنی جو تھیسس یونیورسٹی میں جمع کی تھی اس میں ۴۶۴ صفحات تھے۔ اس تھیسس کو طبع کراتے وقت انھوں نے اپنے تھیسس کے باب چہارم کو جس میں انھوں نے پروفیسر عبدالغفور شہباز کے مطبوعہ اردو کلام کو شامل کیا تھا، باب پنجم کو جس میں پروفیسر عبدالغفور شہباز کا غیر مطبوعہ اردو کلام تھا اور باب ہشتم کو جس میں پروفیسر عبدالغفور شہباز کے معاصرین نظم نگار کا ذکر تھا حذف کر دیا ہے اور مطبوعہ تھیسس کے پہلے باب کا جس شعر سے آغاز کیا گیا ہے اور تحقیق تھیسس میں نہیں ہے۔

••

ڈاکٹر محمد سیادت نقوی
شفاعت پوتہ۔ امروہہ

ڈاکٹر فضل امام کا تھیسس

انیس شخصیت اور فن

۱۹۸۴ء میں فضل امام صاحب نے اپنے اس مقالہ کو مکمل کیا ہے جس پر فاضل مقالہ نگار کو گورکھپور یونیورسٹی سے ڈی۔ لٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔

یہ مقالہ تین سو اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے جسے مصنف نے چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے پہلے باب میں میر انیس سے قبل اردو مرثیہ نگاری کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے جس میں عربی و فارسی مرثیہ نگاری کو اردو مرثیہ کا ماخذ مانتے ہوئے عربی و فارسی مرثیہ نگاری کی مختصر تاریخ و تعریف، اردو مرثیہ نگاری پر اس کے اثرات، ابتدا میں اردو مرثیہ نگاری کا روایتی انداز اور عہد انیس تک اس کے ارتقائی رفتار کا سیر حاصل مطالعہ کیا گیا ہے۔

فضل امام صاحب نے اپنے مقالہ کا آغاز ایک انتہائی مختصر تمہید سے کیا ہے جس کے بعد اپنے موضوع کے حقائق پر روشنی ڈالتے ہوئے عام ناقدین کی طرح اردو مرثیہ کا ماخذ عربی فارسی مراثی ہی کو تسلیم کیا ہے جس میں قدیم اور موجود دونوں قسم کے مراثی آجاتے ہیں جب کہ اردو کے موجودہ مراثی اپنے انداز و آہنگ اور فکری و فنی خصوصیات کے اعتبار سے عربی و فارسی مراثی سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں اس لئے کہ ان خصوصیات و علامات کا وجود جن سے موجودہ اردو مرثیے نے قابل ذکر عظمت پائی ہے نہ عربی مراثی میں کہیں ملتا ہے اور نہ فارسی مراثی میں۔ اس اعتبار سے فاضل مقالہ نگار کو قدیم و جدید مراثی کے مآخذ کی وضاحت میں ایک خط فاصل ضرور کھینچنا چاہیے تھا۔

ابتدائے کلام ہی میں جہاں عربی مراثی کا تذکرہ کیا گیا ہے وہاں فضل امام صاحب کے بیان میں کچھ الجھاؤ سا پیدا ہو گیا ہے جس کے سبب سلسلۂ بیان میں ایک قسم کا تضاد پایا جاتا ہے اس لیے کہ پہلے عربی شاعری کی ابتدا قصیدہ سے بتائی گئی ہے اور آگے بڑھ کر مرثیہ کو اوّلین صنف قرار دیتے ہوئے یعرب ابن قحطان کے منظوم عربی ترجمہ کے اشعار ثبوت میں پیش کیے گئے ہیں ابتدا میں جہاں لفظ "رثا" کے لغوی و اصطلاحی معنی سے بحث کا آغاز کیا گیا ہے اسی میں آگے بڑھ کر مصنف کا یہ جملہ بھی ملتا ہے کہ "قدیم عربی سماج میں رثا قصیدہ کی ہی ایک قسم تھی۔"

جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مصنف نے عربی شاعری کی ابتدا قصیدہ سے مانی ہے جو بہر حال محل نظر ہے۔

آگے بڑھ کر صنف مرثیہ کی اوّلیت پر استدلالی بحث کرتے ہوئے مقالہ نگار نے جناب آدم کے کلمات ماتم

کا تذکرہ کیا ہے جو ان کی زبان سے جناب ہابیل کے قتل پر بے ساختہ وفورِ غم میں نکلے تھے جسے آدم کے مرثیہ سے معنون
کیا گیا ہے جس کے متعلق تمام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ کلمات غم سریانی زبان میں تھے اور یعرب ابن قحطان
جو سریانی اور عربی دونوں زبانوں پر عبور رکھتا تھا اس نے سب سے پہلے ان کلمات غم کا ترجمہ عربی زبان میں نظم
کیا ہے جس سے یہ بات بہر طور ثابت ہو جاتی ہے کہ عربی شاعری کی ابتدا مرثیے ہی سے ہوئی ہے۔ مصنف نے بھی
اپنے استدلال میں یعرب ابن قحطان کے انہیں اشعار کو پیش کیا ہے اس کے علاوہ عرب ناقدین میں سے بھی کسی
ناقد کے بیان سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ عربی شاعروں کا آغاز قصیدے سے ہوا ہے اس لیے کہ دورِ جاہلیت کی
ابتدائی شاعری میں نہ قصیدہ کا بحیثیت صنف وجود تھا اور نہ مرثیہ کا بلکہ حماسہ کے ذیل میں تمام شعرا اپنی فکر کی جولانیاں
دکھاتے تھے چوں کہ عرب بڑے جنگ اور کینہ پرور رہے ہیں جس کی وجہ سے ہر زمانہ میں مختلف قبائل کے درمیان
جنگ و جدل کا بازار مسلسل گرم رہتا تھا ان معرکوں میں اپنے اپنے بہادروں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے شعرا فخریہ اشعار
کہتے تھے جن میں اپنے زندہ بہادروں کی بہادری کی تعریف اور مردہ بہادروں کی بہادری کے افسانے دہرا کر اظہار
تاسف و ملال کیا جاتا جس میں رثائیت کا ہونا بہر طور لازمی شے ہے۔ حقیقتاً قصیدہ اور مرثیے کی تقسیم تو عربی شاعری
میں اس وقت ہوئی ہے جب شعری لٹریچر بکثرت جمع ہو چکا تھا اور اذہان باقاعدہ مختلف موضوعات و مضامین
کو انفرادی حیثیت سے نظم کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگے تھے۔

اس کے بعد ص ۳۲ پر جہاں شمالی ہندوستان میں اردو مرثیے کے آغاز و ارتقا سے بحث کی گئی ہے
اس مقام پر مصنف نے شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز کے سلسلہ میں جو خیال ظاہر کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا
ہے کہ یہاں جنوبی ہند سے تقریباً ساڑھے تین سو برس بعد اردو شاعری کا آغاز ہوا جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت
سے واضح ہوتا ہے:

"شمالی ہند میں اردو کی شعری روایت کا آغاز جنوبی ہند کے مقابلے میں لگ بھگ تین ساڑھے
تین سو سال بعد ہوتا ہے" ص ۳۲

جو بہر حال محل نظر ہے اس لئے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار مولانا محمد حسین آزاد کی تحقیق کا احترام کرتے
ہوئے اب تک ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم مانتے ہیں، جبکہ یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا
آغاز عالمگیر کے زمانہ میں اسماعیل امروہوی کی مثنوی وفات نامہ بی بی فاطمہ سے ہو چکا تھا جسے اسماعیل نے ۱۱۰۵ھ
میں تصنیف کیا ہے اور یہ بات بھی بہر طور مسلم ہے کہ جنوبی ہند کا پہلا اردو شاعر شیخ اشرف بیابانی ہے جس نے ۹۰۹ھ

میں مثنوی تو سر ہار تصنیف کی ہے اس حساب سے شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز جنوبی ہند سے تقریباً دو سو برس بعد ثابت ہوتا ہے نہ کہ تین ساڑھے تین سو برس بعد۔ مصنف سے اس مقام پر تسامح ہو گیا ہے اور غالباً اس کا تجزیہ کرتے وقت اسماعیل امروہوی کی مذکورہ مثنوی پیش نظر نہیں رہی ہے جسے نائب حسین نقوی ۱۹۷۱ء میں شائع کر چکے ہیں۔

انیس کی شخصیت اور حالات زندگی سے متعلق بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے لیکن پھر بھی اس موضوع سے متعلق بعض اہم پہلوؤں میں اب بھی تشنگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ فضل امام صاحب نے کافی حد تک اس تشنگی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جس کے لئے آپ نے بطور خاص یہ التزام برتا ہے کہ انیس کے حالات زندگی کو عام سوانحی انداز سے بجائے بصورت خاکہ پیش کرنے کی کوشش کریں تاکہ انہیں کی زندگی کے تمام جزئیات خاکہ نگاری کے مقتضیات کے پیش نظر اپنے حقائق کی روشنی میں ابھر کر منظر عام پر آجائیں لیکن ان حقائق کی تحقیق و تلاش میں بھی کہیں کہیں مصنف کے احساس ذمہ داری میں کمی معلوم ہونے لگتی ہے۔ مثلاً ایک مقام پر انیس کی اس مشہور مجلس کا ذکر کیا گیا ہے جس میں میر مونس نے پیش خوانی کی تھی جو انتہائی مقبول عوام ہوئی مونس نے کافی دیر مجلس کو محظوظ کیا آخر جب مال مجلس بھی حاصل ہو چکا تو انیس سے پڑھنے کے لیے کہا گیا جس پر انیس نے پس و پیش کیا لیکن جب کافی اصرار کیا گیا تو انیس ممبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ حضرات آپ بھی کسل مند ہو رہے ہیں اور نماز ظہر کا وقت بھی آگیا ہے جسے جناب سید الشہدا نے تلواروں کے سایہ میں ادا کیا تھا لہٰذا پہلے نماز ادا کر لی جائے اس کے بعد جو انیس کو سننا چاہیں وہ تشریف لے آئیں اور کہہ کر ممبر سے اتر آئے مجلس برخاست ہو گئی۔

اس مجلس کی نوعیتِ واقعہ میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن محل واقعہ میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ واقعات انیس کے مصنف نے مجلس کو امام باڑہ قاضی میر یار علی واقع بنارس کی طرف منسوب کیا ہے اور امجد علی اشہری نے نواب ... آباد کے یہاں کی مجلس کے ذیل میں یہ تمام تفصیلات بیان کی ہے۔ چنانچہ مصنف نے امجد علی اشہری کے بیان کو اعتبار سے ساقط گردانتے ہوئے احسن لکھنوی کے بیان کو سند قرار دیا ہے اور انہیں کے حوالہ سے اس واقعہ کو مجلس کے مذکورہ امام باڑہ سے منسوب کیا ہے۔ یہاں اس امر سے بحث نہیں ہے کہ احسن لکھنوی معتبر ثقہ راوی ہیں یا امجد علی اشہری لیکن ایسے اختلافی مقام پر مصنف کا فریضہ یہ ہوتا تھا کہ پہلے تفصیلات کے ساتھ ان دونوں بیانات کو پیش کیا جاتا اس اختلاف کی وضاحت کرتے ہوئے کسی ایک رائے کو اپنانا چاہیئے تھا اختلافات کو نظر انداز کر کے ایسے مقامات سے سرسری طور سے گزر جانا فاضل مقالہ نگار کی شان تحقیق کے منافی ہے۔

آخر میں مصنف نے اس پوری گفتگو کا خلاصہ پیش کیا ہے جسے اس پورے مقالہ کی روح سے تعبیر کیا جا سکتا

ہے لیکن اس خلاصہ کے ابتدائی حصہ میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "جن شعرا نے حصول ثواب اور کمال فن کے پیش نظر مرثیے کہے وہ ترک و قبول اور نئے تجربات سے بھی دوچار ہوئے"۔ اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ حصول ثواب کے لیے نیت درکار ہے اور اس میں کمال فن کا عنصر ضمناً آجائے تو آجائے ورنہ شاعر کی عقیدت و محبت کا جذبہ غالب رہتا ہے کمال فن سے جس کا کوئی تعلق نہیں ہے ——— اس مقالہ میں بعض مقامات پر سلاست بیان اور روانی کلام میں شعری اصطلاح کے مطابق سکتے بھی محسوس ہوتے ہیں مثلاً صفحہ ٦٧ پر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "میر انیس نے اپنی عمر کی اس مدت میں نہ تو کثرت سے شاگرد بنائے اور نہ تو فرمائشوں پر سلام اور سوز خوانی کے مرثیے کہے"۔ یہاں "نہ تو" کا استعمال ایک ہی جملہ میں دو مرتبہ کیا گیا ہے جو ایک معیاری زبان کے لئے بہر حال گراں ہے جس طرح شعر میں سکتہ آجاتا ہے اسی طرح اس لفظ کی تکرار یہاں سکتہ کے مترادف معلوم ہوتی ہے میرے خیال میں دوسری جگہ نہ ہی ہونا چاہیے ۔

یا صفحہ ۹۹ پر اور اس کے بعد متواتر کئی جگہ "زار و نالی" بجائے نالہ و زاری تحریر کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر لکھتے ہیں: "مرثیہ نگاری کو گریہ و ماتم زار و نالی کہ کر طنز کرتے تھے"۔ صفحہ ۱۰۰ پر لکھتے ہیں کہ "مرثیہ کو صرف زار و نالی متصور کرنا نافہمیٔ مرثیہ اور مطالعہ کی کمی کی واضح دلیل ہے"۔ یا اس سے چند سطور پہلے ملاحظہ ہو "اکلیم الدین احمد صاحب مرثیہ نگاری سے اس لئے ناراض ہیں کہ اس میں زار و نالی بہت ہے"۔

یا صفحہ ۱۱۳ پر انیس کا مشہور مصرعہ "ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی" کو "ماہی تو سیخ موج تک بھی کباب تھی" تحریر کیا گیا ہے جو وزن سے بھی بڑھ جاتا ہے اس قسم کی بعض اور غلطیاں بھی مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں جس کا سبب میرے خیال میں کاتب کی کرم فرمائیاں ہی کہی جا سکتی ہیں جس سے کسی قلم کار کو مفر نہیں ہے ورنہ بحیثیت مجموعی اس مقالہ میں اس عظیم ادبی کوتاہی کا ازالہ ہی نہیں کیا گیا ہے جو کافی عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی ؎؎

ڈاکٹر سید فضل امام رضوی
شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی

جواب

فاضل تبصرہ نگار نے بہت عجلت میں تبصرہ نگاری کے فن کو برتا ہے۔

اردو مرثیہ نگاری کے ارتقا و نشو و نما میں بلاشبہ عربی اور فارسی کے ساتھ علاقائی بولیوں اور رجحانوں کے اثرات نمایاں ہیں اب رہا سوال یہ کہ قدیم اور جدید عربی و فارسی مرثیہ نگاری کے درمیان حد فاصل قائم کیا جانا ضروری تھا لیکن یہ مقالہ

پنے حدود میں رہ کر صرف اشارہ ہی کر سکتا تھا اور نہ اس طرح سے تو ایک علاحدہ مقالہ کی ضرورت تھی جو اس مقالہ سے متعلق نہیں ہو پاتا۔

ابتداءً عربی شعریات میں قصیدہ اور مرثیہ کی شکلیں جداگانہ نہیں تھیں بلکہ مشترک تھی جس میں محامد و محاسن نیز مصائب بیان ہوتے تھے۔

فاضل تبصرہ نگار کا یہ بیان بہت دل چسپ ہے کہ ___ "کسی ناقد کے بیان سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ عربی شاعری کا آغاز قصیدہ سے ہوا ہے اس لیے کہ دورِ جاہلیت کی ابتدائی شاعری میں نہ قصیدہ کا بحیثیت صنف وجود تھا اور نہ مرثیہ کا"

یاد رہے کہ شاعری کے ارتقا کے لیے کوئی دن، تاریخ اور سنہ کا تعین نہیں کیا جا سکتا اور نہ تو قصیدہ اور مرثیہ کے لیے کسی تاریخ اور دن کا تعین ممکن ہے۔ ہاں، دورِ جاہلیت کی شاعری اور خاص طور پر قصیدہ کے عروج کو دورِ جاہلیت سے ہی تعبیر کیا جاتا رہے گا۔ کیا "سبعہ معلقات" اچانک وجود میں آ گئے تھے؟

میر انیس کی مجلس کے واقعہ پر اعتراض ہے لیکن نفسِ واقعہ سے نتیجہ بر آمد کیا گیا ہے۔ یہ انیس کی شخصیت سے متعلق ہے سوانح سے نہیں۔ دوسرے یہ کہ احسن لکھنوی کے بیان میں تفصیلات ہیں جس سے یہ واقعہ زیادہ قرینِ مطلب ہے

ایک ہی جملے میں دو بار "نہ تو" کے استعمال پر اعتراض ہے۔ موثر طور پر وضاحت کے لیے یہ استعمال روا رکھا گیا ہے۔

"زار و نالی" پر اعتراض ہے۔ لیکن "زار و نالی" پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ میں نے اپنے الفاظ نقل کیے ہیں ہاں واوین میں یہ الفاظ نہیں رہ پاتے ہیں۔ اس کے لیے حضرت کاتب کی ذمہ داری ہے۔ تبصرہ نگار اگر میری عبارت کو پڑھ لیتے تو اس کا اندازہ ہو جاتا کہ یہ کلیم صاحب کے ہی عطا کردہ الفاظ ہیں

ایک مصرعہ یا کچھ مصرعے ساقط الوزن ہو گئے ہیں ایسا عین ممکن ہے اگر کاتب کے بجائے خود مصنف کتابت کرنے لگے تو بھی اس کا امکان بہر حال رہے گا وہ اس لیے کہ کاتب، کتابت کے وقت رو میں لکھتا چلا جاتا ہے تقطیع نہیں کرتا ہے۔

تحقیق و تنقید میں کوئی بات یا کوئی نقطۂ نظر حرفِ آخر کا درجہ قطعی نہیں رکھتا ہے۔ لہٰذا نقطۂ نظر اور انکشافات کی تائید اور تردید ہر حال دونوں ممکن ہیں۔ میں تبصرہ نگار کا ممنون ہوں کہ موصوف نے میرے مقالہ کو تبصرہ کے لائق قرار دیا اور اپنے حسنِ انتخاب سے کام لیا۔

جناب شافع قدوائی
شعبۂ صحافت کنیڈی ہاؤس
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ڈاکٹر اختر یزداں محسن کا تجسس

نیاز فتح پوری

مروجہ فکری رویوں، مذہبی تصورات، مسلمہ اقدار اور مقبول عام ادبی نظریات کی یکسر نفی نیز حرف اول یا حرف آخر کہنے کی خواہش اصلاً نفسی مکافات (PSYCHOLOGICAL COMPENSATION.) کی ایک صورت ہے اور ادبی تاریخ کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ بعض متعدد ادبا اور شعرا نے اپنی انفرادیت کے نقوش واضح کرنے اور علمیت کے دعوی کو مستحکم کرنے کے لیے یہ حربہ استعمال کیا۔ یہ حکمت عملی اس لحاظ سے کامیاب بھی رہی کہ ان حضرات کو بہت جلد شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی اور اس نوع کے ادبا شہاب ثاقب کی طرح مطلع ادب پر چھا گئے مگر تجلی کی مدت صرف لحظہ بھر ہی رہی۔ مزید براں منفرد زاویۂ نظر اور مسلمات سے برملا انکار کے سبب ان حضرات کے افکار و نظریات نئی نسل کو حد درجہ لائق کشش محسوس ہوئے مگر جب یہی نسل زیادہ باشعور اور خود آگاہ ہوئی تو اسے یہ فکری سرمایہ سطحی، کم کوشش اور بے مایہ نظر آیا۔ اُردو کے سربرآوردہ ادیب نیاز فتح پوری کا شمار بھی مذکورہ ادبا میں ہوتا ہے جنھوں نے ایک طرف تو کورانہ تقلید اور جامد فکری اور ادبی رویوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور دوسری طرف عقلیت کو رد و قبول اور حسن و قبح کی واحد کسوٹی بنانے پر اصرار کیا۔ نیاز فتح پوری کی تعقل پسندی نے ترقی پسند نظریات کو خام مواد فراہم کیا۔ "نگار" کے مضامین نے ایک پوری نسل کو "عقل پسندی" کو "قدر اولین" کے طور پر قبول کرنے کی طرف راغب کیا مگر جلد ہی نگارشات نیاز کا سحر زائل ہو گیا۔

مذہب میں مغربی عقائد کی وکالت، یونانی علم الاصنام اور انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا سے کسب فیض رومانی طرز تحریر اور جمالیات کے حوالے سے ادب کی تفہیم کی کوشش سے نیاز فتح پوری کا ادبی و فکری سرمایہ مرتب بھی ہوتا ہے اور متشکل بھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کی کوششوں کی بدولت مغربی علوم کی طرف مسلمانوں کی توجہ ہونے لگی تھی مگر پھر بھی اب تک مغربی علوم سے کماحقہ واقفیت عام نہیں ہو سکی تھی لہٰذا اس زمانہ میں نیاز کے مولویوں پر اعتراضات اور دین کی عقلی تعبیر نے نوجوانوں کی اکثریت کو مسحور کر لیا اور جلد ہی انھیں نابغہ عصر اور جامع الکمالات کے لقب سے نوازا جانے لگا ان خطابوں نے نیاز کی خود بینی اور تکبر کے داعیوں کو غذا پہنچائی

اور وہ غالب، اقبال، اصغر اور جوش کے شعری اکتسابات کو حرف غلط کی طرح مٹاتے رہے اور ان کی مخالفت کی ہر کوشش کو مولویت" کا دفاع قرار دیا گیا۔ نیاز کو غالب کے فلسفیانہ اشعار" پندنامۂ عطار" معلوم ہوتے تھے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

"غالب کے یہاں نازک خیالی کی کمی نہیں لیکن وہ تغزل سے کبھی کبھی ہٹ جاتا ہے یہاں تک کہ جب وہ فلسفہ طرازی سے کام لیتا ہے تو بالکل چوب خشک ہو جاتا ہے لیکن مومن کا لوچ وہی رہتا ہے زندگی اور موت دونوں کا لازم و ملزوم ہونا غالب نے اس طرح بیان کیا ہے:

قید حیات بند و غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

"بالکل حدیقۂ حکیم سنائی یا پندنامۂ عطار کی چیز معلوم ہوتی ہے۔"

کیا یہی وہ تنقیدی بصیرت اور ژرف نگاہی ہے جسے نیاز فتح پوری "انتقاد عالیہ" سے تعبیر کرتے تھے۔ ان معروضات سے قطع نظر اس امر سے انکار ممکن نہیں ہے کہ نیاز فتح پوری ایک کہنہ مشق انشاپرداز، سخن سنج، کامیاب مترجم اور باکمال صحافی تھے اور یہ مقام مسرت ہے کہ ڈاکٹر اختر یزداں محسن نے اردو ادب کی اس متنازعہ فیہ اور الیبلی شخصیت کے علمی و ادبی اکتسابات کا معروضیت اور تنقیدی دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور عام تحقیقی مقالوں کے برعکس ممدوح کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے سے احتراز کیا ہے نیز نیاز کی انفرادیت اور تخلیقی توانائی کے نقوش واضح کرنے کی بطریق احسن کوشش کی ہے۔

۴۶۴ صفحات پر محیط اور چھ ابواب میں تقسیم اس تحقیقی مقالہ پر مصنفہ کو لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ مصنفہ نے نیاز کی نثری و شعری خدمات کے محاسبہ میں دقت نظر کا ثبوت دیا ہے۔ مثال کے طور پر اختر یزداں محسن نے نیاز فتح پوری کے مضمون نما خطوط کو انشاپردازی کا نمونہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"اس میں شک نہیں کہ نیاز کے محبت نامے اپنی انشاپردازی کے لیے تو ضرور بے مثل ہیں لیکن ان میں بلاغت زیادہ اور زندگی کم ہے ۔ ۔ ۔ ان خطوط میں جذبات کی صداقت نہیں ملتی، ایسا لگتا ہے کہ ان کے خطوط بیک وقت آنسوؤں اور قہقہوں دونوں سے عاری ہیں ۔ ۔ ۔ وہ خطوط میں بحث زیادہ اور بات کم کرتے ہیں، نیاز کو ہنگامہ خیزی میں بڑا لطف آتا ہے۔ اس لیے وہ خطوط میں جان بوجھ کر مباحثہ اور اختلاف رائے کی گنجائش پیدا کرتے ہیں جس سے ادبی اور مذہبی حلقوں میں ہل چل مچ جائے وہ بات کہتے کہتے موضوع کو دوستی کے دائرے سے نکال کر خالص ادبیت کے دائرے میں لے آتے ہیں گو کہ اسکی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مصنفہ نے بجا طور پر نیاز کے خطوط کو تاثر عاری قرار دیا ہے۔

نیاز فتح پوری کے افکار و نظریات میں تضادات کو اساسی اہمیت حاصل ہے یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں

ایک منظم وحدت کا فقدان نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو وہ ادب کو قائم بالذات اکائی یا (MONAD) تصور کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"ادبیات میں اہم ترین اس کی جذباتی قیمت ہے جو تصنیف ہمارے جذبات ابھار سکتی ہے وہ یقیناً ہمارے ادبیات میں داخل ہے خواہ اس کی کوئی اخلاقی قیمت نہ ہو"

مگر دوسری طرف ایسے ادب کی وکالت بھی کرتے ہیں جو اہل دنیا کے لیے گوارا ہو: نقاش ہو یا بت تراش شاعر ہو یا ادیب اس کی تمام فن کاریاں اس کی ذات کے لیے نہیں دوسروں کے لیے ہیں اس لیے اگر اس کی زندگی اور اس کا فن دنیا کے حقائق کو اہل دنیا کے لیے گوارا نہ بنا سکا تو یہ قصور حقیقت کا نہ ہوگا بلکہ فن کار کا ہوگا۔" ایک غزل گو شاعر قدرت کا پیغامبر ہے جو صرف ایثار، قربانی، محبت و ہمدردی کا درس دینے دنیا میں آیا ہے: علی سردار جعفری اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں نیاز فتح پوری کے ان تضادات کی صراحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں "وہ ایک طرف تو وہ (نیاز) معجزوں سے انکار کرتے تھے اور دوسری طرف علم فراست الید پر کچھ نہ کچھ لکھ دیتے تھے۔ ایک طرف عقل پسندی کی تبلیغ کرتے تھے، اور دوسری طرف حدیثوں سے استدلال"۔ نیاز کے ان تضادات کا اصل سبب یہ ہے کہ ان کے فکری تصورات اصلاً رومانی اور خارجی زندگی سے بغایت درجہ دور تھے۔ مزید برآں POWER OF EMPATHY کا بھی فقدان تھا چنانچہ ترقی پسند ادب کی مقبولیت نے نیاز کی رومانیت اور ٹیگوریت کو قصۂ پارینہ بنا دیا اور بقول عزیز احمد "جو شکست انھیں پرانے خدا پرستوں کے ہاتھوں نصیب نہ ہوئی تھی ان نوجوان دہریوں نے دی۔ "خلوت کا وش" "ہستی متالم" کو آہستہ آہستہ قعر گمنامی کی طرف لے گئی اور اردو ادب کو ان کی ٹیگوریت ان کی یونانیت ان کے "نیم علم" سے بچا لیگئی۔

نیاز فتح پوری اپنے زمانے کی عام روش کے برخلاف "عورت" کو صرف حسن مجسم اور منبع نور و نکہت نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ عورت کے وجود کو معاشرہ کے لیے سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے اور وہ عورت کی تعلیم اور ذہنی نشوونما کے حق میں تھے بقول نیاز: "میں آرزومند ہوں کہ تجھے (عورت) بلند دیکھوں، تجھے ارتقا کے اس نقطۂ عروج پر دیکھوں جہاں لوگوں کی تمنائیں بھی مشکل سے پہنچ سکیں"۔ نیاز ایک طرف تو عورت کی سربلندی کے متمنی ہیں مگر دوسری طرف اپنے ناول "شہاب کی سرگزشت" میں تعلیم نسواں کے خلاف انتہائی جذباتی قسم کا ردعمل کا اظہار کرتے ہیں: "نسوانی تعلیم کی زیادتی نے یورپ کو جس قدر بے چین کر رکھا ہے اس کا حال آپ کو بھی معلوم ہے اب ہندستان بھی اسی کے قدم بہ قدم چلنا چاہتا ہے سو اس کا نتیجہ بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے" گویا علامہ نیاز فتح پوری کے نزدیک یورپ کے تمام مسائل کی جڑ تعلیم نسواں ہی ہے۔ خیر اس قسم کے تضادات سے کسی کو مفر نہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جدید ترین لسانی اور ادبی تحریک لاتعمیر (DECONSTRUCTION) کے مبلغ اور مؤید داریدا نے "تضادات" کی بنیاد پر ہی اپنا

لسانی وادبی نظریہ وضع کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہر شاعر اور ادیب اپنی تحریروں میں اپنی کہی ہی باتوں کی تردید کرتا ہوا نظر آتا ہے نیز وہ جتنا زیادہ لکھتا ہے اس سے کہیں زیادہ چھپاتا ہے اور اس خفا کے نشان میں (TEXT) پر موجود ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر اختر یزداں محسن نے نیاز کی ادبی اور صحافتی خدمات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد نیاز کی شاعری کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ مصنف نے نیاز کی علمی و نظری تنقید کی روشنی میں جب ان کی شاعری کا محاکمہ کیا تو انھیں احساس ہوا کہ نیاز وہ ادیب ہیں جن کے نظریات کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچنا دشوار ہے وہ اگر ایک طرف شعر کی جراحی کو اس کا خون سمجھتے ہیں تو دوسری طرف عملی طور پر انتہائی بے درد جراح ہیں وہ جگر کے غنائی حسن کو ٹھکرا کر اس کی شاعری میں حسن و عشق کی حکایتوں کے علاوہ نہ جانے کیا کچھ تلاش کرتے ہیں اور اس کو گھٹیا اور ثانوی درجہ کا شاعر سمجھتے ہیں۔ لیکن خود ان کے اشعار دیکھ کر فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ نیاز دوسرے شعرا کا پوسٹ مارٹم کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں خود ان کا شعر دیکھیے:

لبوں پہ میرے تبسم تھا ان کی آنکھیں نم
اک ایسا لمحہ بھی وقت وداع جاں گزرا

باوجودیکہ مذکورہ بالا شعر نیاز جیسے بلند پایہ ادیب کی تخلیق ہے لیکن اسے رسمی شاعری کے عام سلسلے سے کسی طرح بھی علاحدہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے اوّل درجہ کا شعر ہی قرار دیا جا سکتا ہے ان کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

یہ آج کیسا چراغاں ہے تیرے کوچے میں
ادھر سے کون یہ با چشم خوں چکاں گزرا

چشم خوں چکاں سے کوچے میں چراغاں ہونے کی تشبیہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ غالب نے اسی خیال کو زیادہ اچھے طریقہ سے باندھا ہے: "جو ئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں"

مذکورہ بالا قدرے طویل اقتباس مصنف کی تنقیدی بصیرت پر دال ہے اور ان کا یہ فیصلہ بھی مبنی بر حقیقت نظر آتا ہے کہ "نیاز کے اشعار تمام فنی اور تنقیدی اصولوں پر پورے اترنے کے باوجود صرف شعر برائے شعر کی مصداق ہیں۔"

نیاز فتح پوری کے ایک باکمال صحافی اور کامیاب مترجم ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ نگار نے ایک بے نمود معاشرہ میں "مکالمہ" کی ابتدا کی اور ایک پوری نسل کی ذہنی تربیت کی نیاز نے بعض فرسودہ نظریات اور تصورات کی سطحیت اور بے مائگی کی طرف اہل نظر کو متوجہ کیا اور تغیر پذیر کائنات اور مذہب میں ہم آہنگی کے اصول وضع کرنے کی کوشش کی۔ نیاز نے مابعد الطبیعات کو رد کرنے کے باوجود اسلام کے اصول حرکت یا اجتہاد کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اپنے مذہبی افکار و نظریات میں معتزلی عقائد کو اساسی اہمیت دی۔ معجزوں سے انکار اور جنت و دوزخ کو نفسی کیفیات قرار دینا اصلاً واصل بن عطا کے تصورات کی بازگشت ہے۔ قرآن سے متعلق نیاز کی تاویلات بھی

معتزلی عقائد کا عکس ہیں۔ مصنف نے نیاز کے مذہبی تصورات کو زیادہ لائق اعتنا نہیں سمجھا اور اس باب میں واضح طور پر تشنگی کا احساس ہوتا ہے مصنف کا یہ قول بھی محل نظر ہے کہ نیاز نے مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب الجہاد فی الاسلام کا جواب لکھا" مذکورہ تصنیف کا مولانا دریابادی سے کوئی تعلق نہیں یہ تو سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شہرہ آفاق تصنیف ہے

ڈاکٹر اختر یزداں محسن نے نیاز کی صحافتی خدمات کو بطریق احسن اجاگر کیا ہے اور ان کی یہ رائے صائب نظر آتی ہے کہ نگار کی ترتیب میں نیاز نے نہ صرف افسانوں، غزلوں، نظموں اور تنقیدی مضامین ہی کو جگہ دی بلکہ ان کے رسالے میں تاریخی واقعات، مذہبیات، جنسیات، فلسفیات سے متعلق مضامین بھی چھپتے تھے اور خاص طور سے کچھ مستقل کالم اپنی وسعت مضامین، انداز نگارش، طرز استدلال کی وجہ سے کافی اہمیت کے حامل ہیں یہ مستقل کالم ملاحظات، باب الاستفسار، باب الانتقاد، باب المراسلۃ المناظرہ، معلومات، مکتوبات نیاز، ادرمالہ وما علیہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کالموں میں سب سے زیادہ اہمیت ملاحظات کو حاصل ہے اس عنوان کے تحت نیاز نے دنیا میں رونما ہونے والے تاریخی واقعات، تہذیبی اور تمدنی تبدیلیوں پر اظہار خیال کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی مسائل، سیاسی فلسفہ، اصول سیاست کو بھی اس کالم میں جگہ دی۔

یونانی اساطیر اور آسکر وائلڈ سے شغف نیز ٹیگور سے دلچسپی نے نیاز کی تحریروں کو حد درجہ رومانی بنا دیا تھا نیاز نے اپنی تخلیقی خطابت کے وسیلۂ اظہار کے طور پر جس پیرایۂ اسلوب کو اختیار کیا وہ خطابیہ یا بعض بعض مقامات پر حد درجہ رقت انگیز تھا۔ غالب اور سرسید کے رفقا کی کوششوں کی بدولت اردو نثر ارتقا کی نئی منزلیں کو سر کر رہی تھی مگر نیاز اور ان کے ہم نواؤں نے اس عمل میں رخنہ اندازی کی اور ایک ایسی زبان کو مقبول بنانے کی کاوش کی جو جذباتی، مصنوعی آرائش اور لفاظی سے پُر تھی۔ نیاز نے اپنی ہمہ دانی، قاموسیت اور علمیت کے تاثر کو ابھارنے کی خاطر عربی اور فارسی کے مغلق الفاظ اور غریب تراکیب سے مملو زبان استعمال کی اس سلسلہ میں علی سردار جعفری کا خیال ہے کہ "جو زبان انھوں نے استعمال کی وہ مصنوعی تھی اور عربی و فارسی کے غیر ضروری الفاظ کے بوجھ تلے دبی تھی۔ اس نے اردو نثر میں مشکل پسندی کو فروغ دیا۔ غالب کے بعد حالی اور شبلی نے اردو نثر کو جتنا سہل اور سلیس بنا دیا تھا نیاز نے ان کے بعد اتنا ہی مشکل اور ناقابل فہم بنا دیا" سربرآوردہ نقاد اور ناول نگار عزیز احمد نے بھی کم و بیش ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے "نیاز فتح پوری نے ایک نہایت جذبات پرست قسم کے طرز تحریر کو اردو میں روشناس کرایا۔ نہایت سطحی سستی جذبات پرستی کے ناول شہاب کی سرگزشت، ایک شاعر کا انجام اور اسی طرح کے عنوانوں کے ساتھ وجود میں آئے۔ ان کی زبان مغلق اور غلیظ ان کے موضوع زندگی سے بعید، ان کا نیم علم خطرۂ ادب

نیاز اور ان کے گروہ نے اردو ناولوں کو جس قدر سخت نقصانات پہنچایا اس سے پہلے یا بعد کسی نے نہیں پہنچایا۔"
اردو کے بے مثال نقاد محمد حسن عسکری نے نیاز اور ان کے گروہ کی جذبات پرستی کو حقیقی جذبات سے یکسر عاری قرار دیا تھا۔ عسکری صاحب کا خیال تھا کہ نیاز نے جذبات کے اشگاف اظہار بلکہ نعرہ بازی کے ذریعے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس قبیل کے رومانی ادیبوں کے یہاں اصلاً جذبات ہیں ہی نہیں صرف جذباتیت کا پروپیگنڈہ ہے۔ مصنف نیاز فتح پوری کی شرح اجزائے ترکیبی کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: نیاز فتح پوری کی تحریروں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ رومانیت کے خاص انداز فکر اور جمالیاتی احساس کے اچھوتے زاویوں پر مشتمل ہیں... اپنے انشائی اسلوب کے لحاظ سے اور فکر کے اعتبار سے بھی اگر نیاز کی تمام تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے یہاں ایک جھٹکا دینے والا انداز نظر آتا ہے چاہے وہ من و یزداں ہو یا انتقادیات، ان کی تحریریں خود بھی فکر میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہیں اور قارئین کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

نیاز فتح پوری کثیر التصانیف ادیب تھے۔ انھوں نے مذہب، ادبی تنقید، تراجم اور تخلیقی ادب کے علاوہ بعض معلوماتی کتابیں بھی لکھیں جس میں علم فراست الید، چند گھنٹے حکمائے قدیم کی روحوں کے ساتھ اور ہیولاک ایلیس کی کتاب (PSYCHOLOGY OF SEX) سے ماخوذ کتاب ترغیبات جنسی بھی شامل ہیں۔ آخر الذکر کتاب کے عنوان ہی سے نیاز فتح پوری کے زاویۂ نظر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بحیثیت مجموعی زیر تبصرہ کتاب مواد کی ترتیب و پیش کش، حسن و قبح اور ردّ و قبول کے معروضی معیاروں اور مقدمات کی تدوین اور نتائج کے استخراج کے لحاظ سے ایک قابل قدر تصنیف ہے۔ اردو میں عام طور پر تحقیقی مقالے تحقیق اور تنقید کے اعلیٰ معیار کے اعتبار سے "عبرتناک" اور "باعث رسوائی" ہوتے ہیں مگر زیر نظر مقالہ ایک استثنائی صورت رکھتا ہے۔

●●

ڈاکٹر شاکر خلیق
شعبۂ اردو
سی-ایم-کالج دربھنگہ

ڈاکٹر ظہیر ناشاد کا تحقیس

دربھنگہ میں اردو کی نشوونما

(بیسویں صدی کے آغاز سے ۱۹۷۵ء تک)

کسی بھی زبان کی بقا اس کے فن پاروں کی ترویج و اشاعت سے وابستہ ہے۔ تخلیق کا عمل تو حیات انسانی کے ساتھ ہی وجود میں آیا تھا۔ دنیا کی دیگر زبانوں سے قطع نظر کیا اردو کے تمام تخلیقی سرمائے اب تک ہمارے سامنے آسکے ہیں؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ فن کی تخلیق سے کہیں زیادہ اس کی تحقیق اور تلاش و جستجو کا مسئلہ ہے۔ تخلیق فن سے شخصی و ذاتی واردات و تجربات کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس کی تحقیق و تنقید سے اجتماعی شعور بیدار ہوتا ہے۔ داخلی اور خارجی عوامل و محرکات کے مابین رشتہ کی استواری فن کی جمالیاتی قدروں کا تعین کرتی ہے۔ قدروں کی شکست و ریخت کے اس دور میں جہاں فن پاروں کو اکثر اپنی ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے میزان پر تولا جاتا ہو یہ اقدام نہایت مستحسن ہیں کہ چند احباب فکر و نظر تحقیق و تنقید کے صحت مند رویہ کے حامی نظر آرہے ہیں۔ تنقید کا عمل جراحی کا عمل ضرور ہے مگر کھرے اور کھوٹے کی پہچان اور اس کی نشان دہی کرتے ہوئے اس بات کا خیال ضروری ہے کہ ناقد ذاتیات سے اوپر اٹھ کر کام کرے ورنہ تنقید اور نکتہ چینی میں فرق باقی نہیں رہ جائے گا۔

قبل اس کے کہ میں اپنی بات اور آگے شروع کروں اس صحبت میں اس بات کا اظہار ہی نہیں بلکہ اعتراف

کرتا چلوں کہ ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیق کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کرنے کی جو گھڑ دوڑ چل رہی ہے اس سے زبان و ادب کا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ تحقیقی مقالوں کی خرید و فروخت کرتے وقت اکثر لوگ اس خوبصورتی اور چابکدستی سے کتر بیونت کرتے ہیں کہ حاشیوں پر بھی حوالے درج کرنے تک کی ایمانداری نہیں برتتے۔ بے چارہ خریدار تو اپنی غرض کا اندھا ہوتا ہے۔ اسے صحیح اور غلط کی پہچان کہاں۔ ایسے کاموں کو میں توسیع جہالت اور نسل کشی کے مترادف سمجھتا ہوں۔

یہ ایک Self inculpatory statement ہے۔ روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ۔

اس پلیٹ فارم سے میں دو چیزوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ ایک طرف تو حکومت اپنی اس پالیسی پر نظر ثانی کرے جس کی رو سے یونیورسٹیوں اور کالجوں کی ملازمت اور ترقی کے لئے نام نہاد پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تقریبًا لازم قرار دے دی گئی ہے۔ دوسری طرف اس بات کا انتظام ہو کہ جن تحقیقی مقالوں پر ڈگریاں مل گئی ہوں ان کی اشاعت ضرور ہو جائے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو بازاری قسم کے تحقیقی مقالوں کی سودے بازی ختم ہو جائے گی، دوسرے صحت مند اور ایماندار کام کرنے والوں کی ہمت افزائی ہوگی۔ اہل علم کی یہ مجلس ان کاموں کے دور رس نتائج کو بخوبی محسوس کر سکتی ہے۔

حکومت ملازمت کو ڈگریوں سے الگ رکھنے کی پالیسی ([illegible]) اگر اس صحت مند رویہ کے پیش نظر بنائی ہے تو ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں کیونکہ اردو والوں کے درمیان ایسی بے شمار ہستیاں موجود ہیں جو اس طرح کی نام نہاد ڈگریوں کا احسان اپنے سر نہیں رکھتیں۔

زیر بحث تحقیقی مقالہ میں موصوف نے ابواب کی تقسیم اس طرح کی ہے:۔

<u>باب اول</u> ۔فصل اول: ۔(الف) دربھنگہ کی وجہ تسمیہ۔ (ب) سابق دربھنگہ کا جغرافیائی پس منظر۔ (ج) جدید دربھنگہ کی جغرافیائی اہمیت۔ (د) دربھنگہ کا قدیم سماجی پس منظر۔ (ہ) دربھنگہ کا قدیم ادبی پس منظر۔

فصل دوم: ۔(الف) دربھنگہ میں اردو شاعری کا ابتدائی دور۔ سید مرشد حسن کامل۔ سید محمد صلاح خاموش کلیم منتر ابوری۔ امام شاعر وغیرہ (کل گیارہ شعرا کا تذکرہ) (ب) قدیم دربھنگہ کے نثر نگار: ۔ ملا ابوالحسن۔ ملا شیخ محمد جیون، مولانا فضل علی شاہ۔ (کل دس نثر نگاروں کا تذکرہ) اور اسی میں یہاں کی لائبریریوں، ادبی انجمنوں اور چھاپہ خانوں کا بھی ذکر ہے۔

<u>باب دوم</u>: ۔(الف) قدیم دربھنگہ کے چند ممتاز شعرا، وحید الدین خاں فرد۔ عبدالحی ذبیح۔ وصی الحسن مائل عبدالودود بسمل۔ بدری ناتھ شبنم (سات شعرا کا ذکر)۔ (ب) یاد رفتگاں (کل چوبیس شعراء و ادبا کا تذکرہ جو دربھنگہ میں بغرض ملازمت وغیرہ آئے اور مقیم ہوئے)

باب سوم :۔(الف) دربھنگہ کی عربی، فارسی اور اردو تصانیف کا اجمالی جائزہ (ب) اخبار، رسائل و مخطوطات
باب چہارم :۔(الف) دربھنگہ کے موجودہ شعراء۔ باب پنجم :۔ دربھنگہ کے موجودہ نثر نگار۔
افسانہ نگار۔ ناول نگار۔ ڈرامہ نگار۔ تذکرہ نگار۔ باب ششم :۔ نتائج و کتابیات ۔

باب اول کے فصل اول میں موصوف نے جن تاریخی اور جغرافیائی پس منظر کی نشاندہی کی ہے اس میں مزید وضاحت کی ضرورت ہے ۔ باب اول کے فصل دوم میں جن شعراء کا ذکر کیا گیا ہے اس کی فہرست اور بھی طویل ہے۔ اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے ۔ باب دوم میں قدیم دربھنگہ کے جن شعرا کا انتخاب کیا گیا ہے اور ان کے کلام کا تجزیہ کیا گیا ہے اس کی بنیاد ذاتی پسند پر ہے یعنی چند نمائندہ شعراء نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ اسی باب میں "یاد رفتگاں" کے ذیلی عنوان سے جو فہرست شامل کی گئی ہے اس کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں تھی ۔ باب چہارم میں عہد حاضر کے شعرائے کرام کا تذکرہ اور ان کی شاعرانہ اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس ضمن میں بہت سارے اہم شعراء نظر انداز کر دیے گئے ہیں اور بہت سارے متشاعر اس فہرست میں شامل ہیں ۔ تحقیق کی دنیا میں یہ رویہ ناپسندیدہ قرار دیا جاتا ہے ۔ باب پنجم میں عہد حاضر کے نثر نگاروں کا مختلف اصناف سخن کے عنوان کے تحت تذکرہ کیا گیا ہے ۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ صاحب مقالہ نے اگر تھوڑی سی بھی عرق ریزی سے کام لیا ہوتا تو اس باب میں چند نہایت اہم نام نہ چھوٹنے پاتے ۔ حالانکہ اس مقالہ کے داخل ہونے سے قبل ڈاکٹر نذیر احمد انجم نے راقم الحروف کی نگرانی میں "بہار میں طنز و ظرافت نگاری" پر اپنا تحقیقی مقالہ متھلا یونیورسٹی میں پیش کیا، جس میں عبد الخالق خلیق (۱۹۰۸ء تا ۸ نومبر ۱۹۸۶ء) پر ایک باب لکھا ہے۔ آئیے یہاں پر مرحوم الحاج عبد الخالق کے متعلق قدرے تفصیل سے بحوالہ "تذکرۂ آل تراب" (غیر مطبوعہ رجسٹر سائز میں ۱۹۱ صفحات پر مشتمل) بات کرتا چلوں ۔

مرحوم عبد الخالق خلیق کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں نظر محمد آباد، ضلع دربھنگہ میں ہوئی ۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ان کے آباؤ اجداد فرنگیوں کے ہاتھوں اجاڑے جانے کے بعد مظفر پور ضلع کے ترکی علاقہ شکرہ سے منتقل ہو کر نظر محمد آباد آکر بس گئے۔ ان کا خاندان علمی اور سیاسی سرگرمیوں کا خوبصورت سنگم تھا ۔ ان کے والد ماجد مولوی عبد الحمید حاجی پور کے ایک مشہور و معروف مختار تھے ۔ اسی وجہ سے وہ ۱۹۱۷ء میں نو سال کی عمر میں حاجی پور (صدر مقام موجودہ ویشالی ضلع) کے ہائی اسکول میں درجہ ہفتم میں داخل ہوئے ۔ اس وقت پہلی جنگ عظیم زوروں پر تھی ۔ وہیں سے انہوں نے ۱۹۲۵ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک میں امتیازی حیثیت سے کامیابی حاصل کی ۔

اس وقت کے ہندوستان کے چوٹی کے رہنما جب شمالی بہار کا دورہ کرتے تو انہیں حاجی پور سے ہی گزرنا

پڑتا تھا۔ باہر سے آتے ہوئے تمام مہمان مولوی عبدالمجید مرحوم کے دولتکدہ پر ہی قیام فرماتے۔ ان میں چند اہم نام سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان، مولانا محمد علی، بی اماں، مولانا مظہر الحق، مولانا شفیع داؤدی وغیرہ کے ہیں۔

عبدالخالق خلیق کا پورا ماحول کٹر نشلسٹ تھا۔ اسی لئے تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مرحوم نے برطانوی حکومت کی کوئی بھی ملازمت کبھی قبول نہیں کی۔ اپنی ادبی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تمام عمر درس و تدریس ہی سے وابستہ رہے۔ مختلف اوقات میں وہ جن اداروں سے وابستہ رہے اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

(۱) پریسی ڈنسی مسلم ہائی اسکول، کلکتہ از ۱۹۲۳ء تا ۱۹۳۶ء۔ (۲) حاجی پور ہائی اسکول، ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۵ء (۳) شیفع مسلم ہائی اسکول، دربھنگہ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۸ء (۴) سورج نرائن سنگھ ہائی اسکول، نرپت نگر دربھنگہ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۷۱ء۔

مرحوم کو اردو نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ طبیعت بہت موزوں پائی تھی۔ ایک معلم اخلاق کی حیثیت سے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق ان کا ایک مخصوص نظریہ تھا۔ اپنی تصنیف "تذکرۂ آل تراب" غیر مطبوعہ صفحہ ۹۰-۹۳ پر تفصیل سے اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے۔ طوالت کی وجہ سے صرف نظر کرتا ہوں۔

نمونۂ اشعار:-

جس خدا کو ڈھونڈتا ہے دل کے اندر ہے ترے ـــــ شیخ جی کعبہ کے اندر وہ خدا ملتا نہیں
(تذکرہ ص ۹۱)

سرمایۂ حیات بہت کھو چکے ہو تم ـــــ اشکوں سے اپنے منہ کو بہت دھو چکے ہو تم
بیدار بخت خفتہ، کہ منزل قریب ہے ـــــ ہشیار اب خلیق بہت سو چکے ہو تم
(تذکرہ ص ۹۸)

ہم کسی کے بھی کام آ نہ سکے ـــــ مدعائے حیات پا نہ سکے
جن سے مل کر سکون پا سکتا ـــــ حیف ان کی جناب جا نہ سکے
مقصد زندگی نہیں معلوم ـــــ خود کو خود کا پتہ بتا نہ سکے
آج ان سے خلیق ملنا تھا ـــــ توشہ راہ ساتھ لا نہ سکے
(تذکرہ ص ۱۶۱)

اٹھاؤں سختیِ تکلیف جسم و جاں کب تک ـــــ سنوں فسانۂ غمہائے این و آں کب تک
مری حیات کے دن خود ہی مجھ پہ بھار رہے ہیں ـــــ میں اپنے بوجھ کو رکھوں یہاں وہاں کب تک
(تذکرہ ص ۱۰۷)

ایک نظم بعنوان "عید" اتحاد پٹنہ کے عید نمبر میں ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی:-

عید آئی ہے عید آئی ہے ـــــ یعنی صبح سعید آئی ہے (الخ)
(تذکرہ ص ۹۲)

ایک نظم ۱۹۳۶ء میں اپنے پہلے فرزند کی پیدائش پر لکھی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

جواب : جہاں تک چند نمائندہ شعرائ کو نظر انداز کر دینے کی بات ہے اس سلسلہ میں اگر موصوف دو چار نمائندہ شاعر کا نام گنوا دیتے تو بہتر ہوتا۔ ویسے یہ لفظ "نمائندہ" بھی بہت گمراہ کن اصطلاح ہے جیسے میرے محترم دوست نے بار بار استعمال کیا ہے۔

بہر حال مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ شاعروں کے کلام کا (شاعروں کا نہیں) تجزیہ کرتے وقت میں نے ذاتی پسند سے کام لیا ہے، کیونکہ تحقیقی مقالے میں صرف یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں صاحب مقالہ کو اپنے خیال کے اظہار کی مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اگر میرے دوست اسے عیب سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں۔ میں تو اپنے اس عیب پر نازاں ہوں۔

اسی طرح "یادرفتگاں" کے لئے زیر بحث مقالہ میں اس سے زیادہ موزوں اور کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی تھی، کیونکہ بیرونی شاعروں کا ذکر دربھنگہ کے شاعروں کے درمیان میں کرنے سے تسلسل کے ٹوٹنے اور مقالہ کے حسن کے مجروح ہونے کا پورا احتمال تھا ؂

ہر سخن موقع و ہر نکتہ ' مقامے دارد

<u>چوتھا اعتراض :</u> "باب چہارم میں عہد حاضر کے شعرائے کرام کا تذکرہ اور ان کی شاعرانہ اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ضمن میں "بہت سارے اہم شعرا و نظر انداز کر دیے گئے ہیں اور بہت سارے متشاعر اس فہرست میں شامل ہیں۔ تحقیق کی دنیا میں یہ رویہ ناپسندیدہ قرار دیا جاتا ہے۔"

جواب : یہاں پر یاد دہانی کے طور پر سب سے پہلی بات یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ دربھنگہ میں ۱۹۷۵ء کے بعد جو شعرائ کی ایک نئی پود منظر عام پر آئی ہے۔ اس کا میرے مقالہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بنیادی طور پر کبھی کوئی تحقیق پوری نہیں ہوتی۔ اس لئے ممکن ہے کہ مجھ سے بھی ایک دو قابل ذکر شاعر کا نام چھوٹ گیا ہو۔ میں اس سلسلہ میں اپنی کوئی صفائی پیش کرنا نہیں چاہتا اور نہ کہیں پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ میری تحقیق حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ محترم شاکر صاحب نے بار بار یہ جملہ دہرایا ہے کہ "بہت سارے اہم شعرا کو نظر انداز کر دیا گیا ہے" اس لئے میں ان سے درخواست کروں گا کہ پہلے وہ ان بہت سارے اہم شعرائ جو نظر انداز کر دیے گئے ہیں، اور وہ بہت سارے متشاعر جو اس فہرست میں شامل ہیں۔ اس کی وہ ایک مکمل فہرست اپنے اس مضمون میں شامل کر دیں پھر اس کے بعد ہی میں کوئی جواب دے سکوں گا۔ اگر موصوف نے فہرست پیش نہیں کی تو ان کے اس رویہ کو تحقیق کی

دنیا میں کس نام سے پکارا جائے گا۔ میں اس کا فیصلہ خود ان ہی کے ہاتھوں میں چھوڑتا ہوں سے

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں　　لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

پانچواں اعتراض: باب پنجم میں صاحب مقالہ (یعنی میں) نے اگر تھوڑی سی بھی عرق ریزی سے کام لیا ہوتا تو اس باب میں چند اہم نام نہ چھوٹنے پاتے۔ حالانکہ اس مقالہ کے داخل ہونے کے قبل ڈاکٹر نذیر احمد انجم نے راقم الحروف کی نگرانی میں "بہار میں طنز و مزاح نگاری" پر اپنا مقالہ متھلا یونیورسیٹی میں پیش کیا جس میں عبدالخالق خلیق (۱۹۰۸ء تا ۸ نومبر ۱۹۸۶ء) پر ایک باب لکھا ہے۔ . . . . . .

(نوٹ: اس کے بعد میرے محترم دوست شاکر صاحب نے دو صفحات پر مشتمل ایک مفصل والدنامہ لکھا ہے۔ (میں اس اصطلاح کے لیے معذرت خواہ ہوں۔)

جواب: ڈاکٹر شاکر خلیق کے اس "والدنامہ" کے پڑھنے کے بعد کوئی بھی شخص آسانی کے ساتھ یہ رائے قائم کرسکتا ہے کہ میرے مقالہ پر ان کے اعتراض کرنے کا خاص مقصد کیا ہے؟ عیاں راچہ بیاں بیشک الحاج عبدالخالق صاحب ایک نیک سیرت عالم اور باذوق انسان تھے اس لیے میں آج بھی مرحوم کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتا ہوں لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ دنیائے شعر و ادب میں اپنا کوئی مقام نہیں رکھتے تھے اس لیے میں نے مرحوم کے جیسے اور بھی بہت سے محلہ جاتی قسم کے شاعروں کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا جس نے کبھی کسی ادبی محفل میں بحیثیت شاعر و ادیب کے شرکت نہیں کی ہو۔ جس کا کسی ادبی رسالے میں کبھی کوئی کلام نہیں چھپا ہو، جس کا کسی تذکرے میں کوئی ذکر نہ ہو۔ اور نہ جس کی پکی روشنائی میں کوئی تصنیف ہو۔ میں ذاتی طور پر ایسے لوگوں کو شعرا و ادبا کی صف میں شمار کرنا ایک طرح کا بدترین ادبی جرم سمجھتا ہوں اگر میرے دوست اپنے والد محترم کو دربھنگہ کا نمائندہ شاعر سمجھتے ہیں تو یہ ان کا اپنا ذاتی خیال ہے جس سے دوسروں کا متفق ہونا کوئی ضروری نہیں۔

چونکہ ڈاکٹر موصوف نے ایک خاص جذبات سے مغلوب ہو کر مضمون لکھا ہے، اس لئے وہ راست یعنی کی راہ سے ہٹ گئے ہیں، مثلاً جہاں پر موصوف نے اپنے والد محترم کی شان میں دو طویل صفحات سیاہ کیے ہیں وہیں پر ان کو جانبداری کے الزام سے اپنا دامن بچانے کے لیے دو چار دیگر شعرا و ادبا کے بارے میں بھی ایک آدھ صفحہ لکھنا چاہیئے تھا، مگر افسوس کہ وہ ایسا نہ کرسکے۔

اسی طرح شعروں کے انتخاب میں بھی ان سے چوک ہوگئی ہے کیونکہ یہاں پر اس تحقیقی مقالہ جس

میں موصوف کے شاگرد نے ان کے والد محترم کے نام ایک مفصل باب لکھا ہے، کا بھرم رکھنے کیلئے کم از کم دو چار طنزیہ و مزاحیہ شعر کا حوالہ دینا ضروری تھا۔

اطلاعاً عرض ہے کہ میرے مقالہ میں مولانا ظفر الدین مفتاحی (اگر مولانا مفتی ظفر الدین صاحب دوسرے شخص نہیں ہیں تو) اور ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی صاحب کی ادبی خدمات کے علاوہ ان کی تصنیفات کا بھی خاطر خواہ الفاظ میں ذکر ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو ایک بار پھر مقالہ دیکھنے کی زحمت گوارہ کریں۔

چھٹا اعتراض: "باب ششم نتائج و کتابیات پر مشتمل ہے۔ نتیجہ صرف اپنی ذاتی رائے کی روشنی میں ہے۔ اس کے لئے کوئی مدلل گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ کتابیات میں اس کے اصولوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ مخطوطات و مطبوعات اور جرائد و رسائل کے حوالوں میں ربط و تسلسل اور ترتیب کا خیال نہیں کیا گیا ہے۔

جواب: میں نے مطبوعات اور مخطوطات اور اخبارات و رسائل کا حوالہ مروجہ طریقوں کے مطابق نہایت ربط و تسلسل کے ساتھ باعتبار حروف تہجی دیا ہے، اور ذاتی طور پر اس طریقے کو بہتر سمجھتا ہوں۔ ؏

پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا

مجھے افسوس ہے کہ میرے فاضل دوست نے میرے مقالہ کی آڑ میں "والد نامہ" لکھ کر نہ صرف یہ کہ اپنا بھرم کھو دیا ہے "ادارہ تحقیقات اردو" جیسے باوقار تحقیقی ادارہ کی عظمت و حرمت کو بھی داغدار بنانے کی سازش کی ہے۔

سب سے آخر میں آج کل ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیق کے نام پر جو بے اعتدالیاں ہو رہی ہیں، اور اس سلسلہ میں ڈاکٹر موصوف نے جو تجاویز پیش کی ہیں، میں ان سے اتفاق کرتے ہوئے صرف ایک اور جملہ کا اس میں اضافہ کرنا چاہوں گا۔ وہ یہ کہ "نگراں" بننے کے لیے بھی کچھ معیار وضع کئے جائیں تاکہ کچھ نام نہاد اساتذہ، "نگراں" بن کر جسم ادب میں "احبابی ادب" کے جراثیم کو داخل نہ کر سکیں۔

●●

جناب شمیم منعمی
میتن گھاٹ، پٹنہ ۶

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کا تھیسس

حضرت شاہ اکبر داناپوری — ماحول حیات اور شاعری

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق نے اپنے اس تحقیقی مقالے کو مختصر کرکے بہار اردو اکادمی کے تعاون سے "حضرت شاہ اکبر داناپوری حیات اور شاعری" کے نام سے شائع کیا ہے۔ انہیں اپنے مکمل تحقیقی مقالے پر پٹنہ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا کی ہے، بقول مصنف ان کے لیے اس مقالے کے ممتحین پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اور علامہ جمیل مظہری تھے۔ جنہوں نے اپنی رپورٹ میں ان کی محنت کو کافی سراہا تھا۔ بہرحال انکا غیر مطبوعہ مکمل تحقیقی مقالہ پانچ ابواب میں منقسم ہے، میں انہیں ابواب پر گفتگو کرونگا جن کا تعلق تحقیق سے ہے۔

باب دوم: صوفیائے داناپور اور ان کی خانقاہ: (الف) ایک تفصیلی مطالعہ

(۱) "داناپور شہر پٹنہ سے سات میل مغرب اور منیر شریف سے تقریباً دس میل مشرق سیدھی شاہراہ پر پڑتا ہے" ص ۳۶

حالانکہ مصنف اپنے اسی تحقیقی مقالے کے ص ۱۳۲ پر فرماتے ہیں: "داناپور عظیم آباد (پٹنہ) سے چھ میل جانب مغرب دریائے سون کی ایک شاخ کے کنارے واقع ہے" جبکہ مصنف کے والد قتیل داناپوری اسے دریائے سون کی ایک شاخ کے کنارے واقع نہیں مانتے۔ اپنے فارسی دیوان ساغر کیف کے شروع میں فرماتے ہیں: "ایں شہر قدیم کہ جز و عظیم آباد است در صوبہ بہار ہندوستان بہ فاصلہ شش میل از دار الخلافت عظیم آباد پٹنہ بہ لب دریائے سون واقع است" ص ۲ مصنف نے اس سلسلے میں اپنے صاحب موضوع حضرت اکبر داناپوری کی طرف رجوع نہیں کیا۔ حضرت اکبر اپنی تصنیف "تاریخ عرب" کے ص ۱۶ پر فرماتے ہیں: "داناپور ضلع پٹنہ عظیم آباد میں ایک بہت قدیم بستی سادات رضوی و باقری کی ہے منیر یہاں سے سات کوس مغرب کی طرف ہے اور پٹنہ بھی یہاں سے سات کوس مشرق کی طرف ہے"

(۲) "داناپور کا قدیم ترین محلہ شاہ ٹولی (شاہ صاحبان) کئی سو برس تک محلہ پھلواری کے نام سے مشہور رہا ہے" ص ۴۶

(الف) اسکا کیا ثبوت ہے کہ داناپور کا قدیم ترین محلہ شاہ ٹولی ہے؟ (ب) یہ کئی سو برس کہاں سے شروع ہوکر

کہاں ختم ہوتا ہے؟ (ج) شاہ کبیر صاحب عرفاؔن داناپوری تذکرۃ الکرام کے ص ۸۷۶ پر فرماتے ہیں "آپ کے اجداد فاسد
سے حضرت قاضی سید عبدالفتاح عرف میر سید بڑے تھے کہ نورالدین جہانگیر کے عہد میں پرگنہ پھلواری کے قاضی مقرر ہوئے
تھے اور سکونت داناپور میں محلہ پھلواری میں کہ اب نام سے محلہ شاہ صاحبان کے مشہور رہے اختیار کی" شاہ
عطا حسین فاؔنی داناپوری کیفیت العارفین میں فرماتے ہیں "داناپور کہ سابق معروف محلہ پھلواری بود از دختر قاضی
عبدالفتاح المشتہر میر سید بڑے قدس سرہ کہ قاضی آں پرگنہ و از سیادات رضوی اولاد حضرت امام علی موسیٰ رضا
رضی اللہ عنہ بودند" فاؔنی داناپوری (المتوفی ۱۳۱۱ھ) عرفاؔن داناپوری کے دادا ہیں اور مستند ترین ہیں انہوں نے
محلہ شاہ صاحبان کا نام پھلواری نہیں بتایا ہے بلکہ داناپور کو پھلواری لکھا ہے۔ اور پھلواری کے ساتھ انہوں نے
جو محلہ لکھ دیا ہے تو اس سے محلہ مراد نہیں ہے کیونکہ وہ داناپور کو پھلواری کہہ رہے ہیں اس لیے اس سے پرگنہ مراد ہے،
محلہ شاہ ٹولی بھی پرگنہ پھلواری میں تھا جہاں تک محلہ پھلواری کا سوال ہے تو جس طرح صوبہ بہار میں قصبہ بہار شریف
موجود ہے اسی طرح پرگنہ پھلواری میں محلہ پھلواری بھی موجود تھا۔ لیکن اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا وہ محلہ پھلواری
شاہ ٹولی تھا یا کہ جو آج تک پھلواری کے نام سے مشہور ہے کیوں کہ حکیم شعیب صاحب پھلواروی "اعیان وطن"
میں فرماتے ہیں: "ثقہ روایات اور سابقہ تحریرات سے معلوم ہوا کہ قصبہ متبرکہ پھلواری تقریباً ہزار سال سے
آباد ہے انسانی آبادی سے پہلے اس سرزمین پر راجہ اشوک کا نادر روزگار باغ تھا اور راجہ کی پھلواری سے مشہور تھا۔" ص ۱ "حضرت
شیخ العالمین شاہ نعمت اللہ قادری قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ حضرت مولانا وارث رسول نما بنارسی قدس سرہٗ کی نظر عنایت اس
قصبہ پر بہت زیادہ تھی آپ اس کو ہماری پھلواری اور قصبہ ناجیہ فرماتے تھے" ص ۲ "اثنائے تکمیل میں حضرت
مخدوم (جہاں) نے آپ (منہاج الدین راستی) سے بہت سخت ریاضتیں کرائیں اور برابر کے پہاڑ پر جو ناگرجنی
کے نام سے مشہور ہے چلہ کش رکھا پھر رشد و ہدایت خلق کے لیے اس قصبہ کی طرف روانہ فرمایا بلکہ بروایت
ثقاۃ معتبرین حضرت مخدوم الملک قدس سرہ نے آپ کو ہمراہ لاکر مسند ہدایت پر بٹھایا اور قصبہ کا نام پھلواری
کی مناسبت سے بستانِ نجات رکھا چنانچہ حضرت نصر قدس سرہٗ نے اپنے ایک شعر میں اس قصبہ کو اسی نام سے
یاد فرمایا ہے ؎ درگوشۂ بستاں نجاتیم فتادہ .:. بلبل صفت اے نصر غزلخوانِ مجیبم" ص ۴ حالاں کہ
"اعیانِ وطن" مصنف کی فہرست کتابیات میں شامل ہے پھر بھی پرگنہ پھلواری میں محلہ پھلواری کے دوسرے
دعویدار سے چشم پوشی کیوں برتی گئی ؟ صحیح تحقیقی مزاج کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر دو نظریے سامنے آئیں تو پہلے ان
دونوں کو قاری کے سامنے پیش کر دیا جائے پھر اپنی تحقیق کا اظہار کیا جائے۔

(۳) "بیان یہ کیا جاتا ہے کہ جب سیدنا خواجہ سراج الدین عثمان چشتی ملقب بہ حضرت اخی سراج اوائل آٹھویں صدی ہجری میں اپنے پیر و مرشد جناب حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی زری زر بخش دہلوی کے حکم سے پنڈوہ شریف (بنگال) کے لیے روانہ ہوئے تو راہ میں اکثر مقامات کو اپنے قیام سے شرف بخشا ان ہی متبرک مقامات میں ایک داناپور بھی ہے یہاں سیدنا اخی سراج کا جس قطعۂ زمین پر قیام ہوا تھا اس کے متعلق حضرت نے یہ فرمایا تھا کہ اس زمین سے خوشبوئے چشت آتی ہے یہ پھلواری ہے چنانچہ وہ زمین کئی سو برس تک محلہ پھلواری کے نام سے مشہور رہی" ص ۳۶

(الف) سیر الاولیا میں حضرت نظام الدین اولیا کے حضرت اخی سراج کو دیے گئے ایسے کسی حکم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے (ب) سیر الاولیا کے مطابق "جب لوگوں کو دہلی سے دیوگیر روانہ کیا گیا تو وہ دہلی سے لکھنوتی پہنچے" اور بقول خلیق احمد نظامی "جب محمد تغلق نے مشائخ کو جبراً دیوگیر بھیجنا شروع کیا تو وہ اپنے وطن لکھنوتی کو چلے گئے" (مشائخ چشت ص ۱۹۹) شاید مصنف کو اس کا علم نہیں کہ حضرت اخی سراج نظام الدین اولیا کے وصال کے بعد تین سال تک دہلی میں تھے اور ان کے دہلی چھوڑنے کے پیچھے کوئی وصیت، کوئی حکم یا کوئی اشارہ یا کوئی بشارت کا علم صاحب سیر الاولیا کو نہیں تھا اور تین سال بعد بھی دہلی کو انہوں نے کیوں چھوڑا وجہ اوپر بیان کی جا چکی (ج) کسی بھی تذکرے میں حضرت اخی سراج کے دہلی سے لکھنوتی آنے کے راستے کی تفصیل اور ان مقامات کی نشاندہی موجود نہیں ہے جہاں جہاں حضرت اخی سراج نے دوران سفر قیام کیا ہوگا۔ مصنف نے یہ اچھی ابتدا کی ہے کہ ان کا داناپور میں کسی خاص خطہ ارض پر قیام کرنے کا تذکرہ اپنے والد قتیل داناپوری (م ۱۴۰۵ھ) کے کتابچے سے اپنے تحقیقی مقالے میں یا اطمینان کے ساتھ نقل کر لیا ہے، اگر مصنف کی سنت پر عمل کرتے ہوئے، دہلی اور لکھنوتی کے درمیان ریاضی کی مدد لے کر ایک اوسط رفتار مسافر سے قیام کرایا جائے تو مختلف مقامات کو یہ شرف حاصل ہو جائے گا۔

(۴) "عہد شاہان خلجی میں ۷۰۰ھ سے کچھ قبل جناب حضرت میر سید علی شیر رضوی شہید قدس سرہ جہاد کرتے ہوئے جاجنیر سے مع فوج جرار روانہ ہو کر داخل بہار ہوئے آپ کے ہمراہ مجاہدین میں حضرت غازی میر سید مبارک حسین رضوی ابن حضرت علی شیر اور حضرت سید مکارم رضوی قدس سرہ بھی تھے جو حضرت علی شیر رضوی کے ہم جد اور حضرت سیدنا امام علی موسیٰ رضا الملقب بہ حضرت امام ضامن ثامن علیہ السلام کی اولاد تھے حضرت علی شیر رضوی بہار میں شہید ہو گئے" ص ۳۷

(الف) صاحبان شاہ ٹولی داناپور کے جد اعلیٰ حضرت قاضی عبد الفتاح اور ان کے جد اعلیٰ حضرت سید علی شیر رضوی جاجنیری کے لیے سب سے قدیم، مستند اور واحد ماخذ کنز الانساب مصنفہ

شاہ عطا حسین فانی ہے رحالاں کہ ایک تذکرہ برنسب داناپور حضرت فانی کے چچا شاہ وحید الدین احمد داناپوری (المتوفی ۱۲۸۲ھ) کا تصنیف کردہ بخط مصنف میرے مطالعہ میں رہا ہے لیکن یہ نسخہ مصنف کی نگاہ سے نہیں گذرا اس لیے اسے نظر انداز کیا جاتا ہے) اور کنز الانساب میں ایسا کچھ نہیں ہے کہ حضرت علی شیر جاجنیر سے مع فوج جرار جہاد کرتے ہوئے داخل بہار ہوئے ملاحظہ ہو کنز الانساب کی عبارت "باید دانست کہ میر سید علی شیر جاجنیری ابن میر سید علی اکبر جاجنیری سادات رضوی کہ نسب نامہ ایشان بالا مذکور شد در پشت سیادات رضوی از مقام جاجنیر بحضرت بہار آمدہ در محلہ گھیڑہ اقامت نمودند وقت غزا بر کفار غازی شد آخر بہ کید کفار شدند شہید" ص ۲۱۹ (ب) صاحب کنز الانساب نے علی شیر رضوی کے کسی ہمراہی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ پھر یہ دو نام مبارک حسین رضوی اور سید مکارم رضوی کہاں سے آگئے؟ (ج) "مبارک حسین رضوی ابن حضرت علی شیر" کیا معنی؟ یہ علی شیر وہی ہیں جو جاجنیر سے تشریف لائے یا کوئی دوسرے ہیں؟۔ اس لیے کہ اگر یہ انہیں علی شیر کے بیٹے تھے تو مصنف انہیں اس طرح نہیں لکھتے کہ "آپ کے ہمراہ مجاہدین میں حضرت غازی میر سید مبارک حسین رضوی بن حضرت علی شیر اور حضرت سید مکارم رضوی بھی تھے"

(۵) "حضرت خواجہ سراج الدین عثمان ملقب بہ اخی سراج جب داناپور سے روانہ ہو کر رونق افروز پنڈوہ شریف ہوئے تو وہاں آپ سے جوق در جوق لوگ آآکر مستفیض ہونے لگے حضرت میر سید مبارک حسین رضوی جو ان دنوں انہیں اطراف میں تھے۔ حضرت اخی سراج کی خدمت میں حاضر ہو کر داخل سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ ہوئے اور سلوک کی تکمیل کی مشرف بہ خلافت ہو کر مامور بہ ولایت داناپور ہوئے اور آپ کا حکم پاتے ہی داناپور تشریف لاکر اس سرزمین پر مستقل قیام فرمایا جہاں حضرت اخی سراج نے قیام فرمایا تھا اور جسے پھلواری کہا تھا اب وہی جگہ شاہ ٹولی کے نام سے مشہور و معروف ہے" مٓ

(الف) دہلی سے روانہ ہو کر نہیں بلکہ داناپور سے روانہ ہو کر مصنف کے بیان سے کیفیت قیام پر خاصی روشنی پڑتی ہے گویا کہ حضرت نظام الدین اولیا کے حکم میں پنڈوہ سے قبل داناپور میں قیام بھی شامل تھا۔ (ب) میر سید مبارک حسین رضوی چشتی نظامی کا نام حضرت اخی سراج کے حلقہ مریدین و خلفا میں مجھے کہیں نہیں ملا۔ اور انتہا یہ کہ داناپور کے تذکرہ نگاروں میں حضرت سید شاہ وحید الدین احمد قادری مجیبی (المتوفی ۱۲۷۲ھ) حضرت شاہ محمد قاسم داناپوری (المتوفی ۱۲۸۱ھ) حضرت سید شاہ عطا حسین فانی داناپوری (المتوفی ۱۳۱۱ھ) حضرت شاہ محمد اکبر داناپوری (المتوفی ۱۳۲۷ھ) اور حضرت شاہ محمد کبیر داناپوری کسی کو مبارک حسین رضوی چشتی نظامی کا ذرہ برابر بھی علم

نہیں تھا' اور ان کا اخی سراج سے بیعت ہونا' خلافت پانا اور داناپور بھیجا جانا تو دور کی بات ہے۔ مندرجہ بالا تذکرہ نگاروں کی فہرست میں فانی داناپوری سب سے اہم ہیں ان کی تصنیف کنز الانساب مصنف کے نزدیک کتنی اہم ہے' مصنف خود لکھتے ہیں "کنز الانساب میں خانقاہ داناپور میں شاہ عالم کے تشریف لانے اور طعام وقیام فرمانے کا ذکر بالتفصیل موجود ہے حتیٰ کہ بادشاہ کے سامنے دسترخوان پر کیا کیا پیش کیا گیا اور ان سے متعلق بادشاہ کے تاثرات حرف بہ حرف مذکور ہیں" صفحہ ۲۰ اور ایسے اہم ترین ماخذ کنز الانساب میں "مبارک حسین رضوی چشتی نظامی" بانی خانقاہ داناپور اور جد اعلیٰ ساکنان داناپور کا کوئی ذکر نہیں — مصنف کے والد قتیلؔ داناپوری (م ۱۴۰۵ھ) کو چھوڑ کر تمام تذکرہ نگار کی اطلاع یہی ہے کہ داناپور میں ہمارے جد اعلیٰ قاضی عبدالفتاح ہیں یعنی شاہ ٹولی کے ساکنان کا خاندان عہد مغل شہنشاہ اکبرؔ میں بہو مانڈر پرگنہ مکیر سے آکر داناپور میں آباد ہوا۔

(۶) "چونکہ شاہان مغلیہ دہلی سے برابر بغرض فاتحہ وغیرہ اس محلہ میں حاضر ہوتے اور یہاں کے اولیاء اللہ سے مستفیض ہوتے اس لیے اس محلہ کا نام پھلواری سے بدل کر شاہ ٹولی و محلہ شاہ صاحبان ہوگیا مگر اب یہ صرف شاہ ٹولی کے نام سے مشہور ہے۔ روایت یہ ہے کہ حضرت شاہ عالم بادشاہ نے جب وہ داناپور آئے' اس مخصوص اراضی کو زمینداروں سے خرید کر بذریعہ ابرائے نامہ معرفت شجاع الدولہ حضرت تاج الاولیا مخدوم سید شاہ ولی اللہ قدس سرہ کو نذر دیا اسلیے بہ یادگار حضرت شاہ عالم بادشاہ ہند اس قطعہ زمین کا نام شاہ ٹولی ہوگیا اور یہ زمین زمینداری بار سے سبکدوش ہوکر لاخراج ہوگئی" صفحہ ۲۰

(الف) چوں کہ شاہان مغلیہ دہلی سے برابر بغرض فاتحہ وغیرہ اس محلہ میں حاضر ہوتے" سراسر جھوٹ ہے' کیا مصنف اس کی تفصیل پیش کریں گے کون کون مغل بادشاہ کب کب داناپور کے اس محلہ میں بغرض فاتحہ وغیرہ آئے۔ (ب) شاہ عالم کے علاوہ کوئی دوسرا مغل بادشاہ میری تحقیق کے مطابق شاہ ٹولی نہیں آیا ہے (ج) یہ روایت کس نے بیان کی ہے اور کس نے اسے نقل کیا ہے؟ صاحب کنز الانساب کے یہاں تو ایسی کوئی روایت نہیں۔ (د) بقول مصنف "بہ یادگار شاہ عالم بادشاہ ہند اس قطعہ زمین کا نام شاہ ٹولی ہوگیا" جب کہ مصنف کے صاحب موضوع شاہ اکبرؔ داناپوری تاریخ عرب کے ص ۱۶ پر لکھتے ہیں "اسی داناپور میں ایک محلہ سید واڑے کے نام سے مشہور تھا جب شاہ عالم بادشاہ یہاں آئے اور مصنف تاریخ ہذا کی خانقاہ میں ٹھہرے تو انہوں نے اُس کا نام شاہ زادہ پور کر دیا"

(۷) "شاہ عالم کے علاوہ نواب شجاع الدولہ نوابان میر جعفر علی خاں و میر قاسم علی خاں صوبہ داران بہار و بنگال

کے بھی اس خانقاہ قدیم چشت دانا پور سے بڑے گہرے تعلقات رہے ہیں اور ان دونوں نے ایک عمر خانقاہ دانا پور میں بسر کی اور اسی آستانہ کی وجہ سے بنے اور بگڑے۔ میر جعفر و میر قاسم حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے ساتھ خانقاہ دانا پور میں مخدوم شاہ محمد یٰسین قدس سرہ کے زیر تعلیم رہ چکے ہیں" ص ۴۰

(الف) فقراء و مشائخین سے بادشاہان و امراء و نوابین کے بڑے گہرے تعلقات نہیں ہوا کرتے۔ (ب) نواب جعفر علی خاں نے ایک عمر خانقاہ دانا پور میں بسر کی تھی یہ کس نے لکھا ہے؟ کنز الانساب میں حضرت فانی دانا پوری نے ص ۲۷۱ پر اپنے دادا حضرت سید شاہ غلام حسین دانا پوری (المتوفی ۱۲۵۴ھ) کا بالکل واضح جملہ نقل کیا ہے، فارسی بہت سلیس ہے "ہر دو خسر و داماد چندر روز بصیغۂ طالب علمی بودند تلمیذ جد امجد من" کیا مصنف "چندر روز" کا ترجمہ انشاء اردو میں ایک عمر کرتے ہیں مصنف کو چاہیے تھا کہ کنز الانساب کا باریک بینی سے مطالعہ کرتے تب انہیں معلوم ہوتا کہ انھیں چند دنوں میں نواب جعفر علی خاں پر حضرت شاہ یٰسین دانا پوری کے اخلاق و عادات اور دنیا سے کنارہ کشی نے ایسی چھاپ چھوڑی تھی جو کسی کی خدمت میں ایک عمر صرف کرنے پر بھی مشکل ہی سے نقش ہوا کرتی ہے۔ (ج) میر جعفر و میر قاسم حضرت شاہ یٰسین دانا پوری کی صحبت میں چندر وزہ طالب علمی کے دوران حضرت شاہ ولی اللہ کے ساتھ زیر تعلیم تھے، یہ مصنف نے کہاں سے نقل کیا ہے؟ کنز الانساب میں تو صرف ان دونوں کے چند روز تحصیل علم کرنے کا تذکرہ ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کے ساتھ تحصیل علم کا تذکرہ تو نہیں ہے، اور پھر اس کی کیا سند ہے کہ جس وقت میر جعفر میر قاسم شاہ یٰسین صاحب کی صحبت میں تحصیل علم کرتے تھے اس وقت شاہ ولی اللہ صاحب بھی تحصیل علم کرتے ہوں، ممکن ہے شاہ ولی اللہ صاحب فارغ ہو چکے ہوں یا پھر کمسن ہوں۔

(۸) "میر قاسم کے خسر میر جعفر علی خاں بھی خانقاہ دانا پور اور یہاں کے بزرگوں کے بے حد عقیدتمند تھے اکثر چوبداروں کو بھیج کر حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کو نہایت احترام و شوکت کے ساتھ بلواتے اور بیشتر خود حاضر خانقاہ ہوتے۔ نواب میر جعفر علی خاں حضرت شاہ غلام حسین قدس سرہ کو کہ اس وقت آپ کی عمر شریف صرف دس سال کی تھی بہت چاہتے تھے بہت التجا کر کے اپنے ساتھ بسواری بجرہ از راہ دریا (کنز ص ۲۷۳) مرشد آباد لے گئے، اپنے ہاتھوں سے آپ کی دستار باندھتے اور سر دربار آپ کو زانو پر پیار اور محبت سے بٹھاتے" ص ۴۲

(الف) مصنف نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے، مصنف اپنی اس عبارت کے لیے کنز الانساب کو ماخذ بتاتے ہیں لیکن کنز الانساب میں ص ۲۷۱ پر ایک بار ایک چوبدار کو بھیجنا اور طلب کرنا بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو "بعد بر ہمی تسلط نواب قاسم علی خاں از مرشد آباد خود نواب جعفر علی خاں آمد، بکا

وبدیہ وصولت درعظیم آباد چوبدار فرستادہ، جناب والد ماجد را کر دند طلب (ب) خانقاہ میں بشیر حاضر ہونے کا جہاں تک سوال ہے تو مصنّف کی رقم کردہ اس حاضری میں چند روزہ طالب علمی والی حاضری کی طرف اشارہ نہیں بلکہ مصنّف کا اشارہ حصول عہدہ کے بعد حاضری کی طرف ہے تو کنز الانساب میں ایک بار شاہ ٹولی داناپور میں نواب جعفر علی خاں کے آنے کا تذکرہ ملتا ہے "بعد چند روز نواب جعفر علی خاں عازم مرشد آباد شدند آمدند بہر ملاقات بغریب خانہ دردانا پور۔ دوروز دعوت خوردہ بسواری بجرہ از راہ دریا عازم شدند" ص ۲۷۲، اس واقعہ کے علاوہ اور کہیں پر چوبدار کو بھیج کر بلانے اور نواب کے شاہ ٹولی میں آنے کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے، (ج) اپنے ہاتھوں سے جعفر علی خاں نے صرف ایک روز دستار باندھی تھی ملاحظہ ہو کنز الانساب کی عبارت "یک روز بدست خاص دستار بندی نمودند" ص ۲۷۲

(۹) "ان کے علاوہ نواب شجاع الدولہ، نواب ذکریا خاں بہادر، مہاراجہ مہتاب رائے، لارڈ کلایو، لارڈ وارن ہیسٹنگس، میجر جنرل امرن، کرنل باربو و کرنل ہنگم وغیرہ زعمائے سلطنت کا برابر اس خانقاہ شریف میں آنا سفینوں اور تذکروں سے ثابت ہے" ص ۴۲

(الف) کس کس سفینے اور تذکرے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے؟ مصنّف کی فہرست کتابیات میں تو کسی سفینے کا تذکرہ نہیں ہے اور جتنے تذکروں کو مصنّف نے دیکھنے کا دعوی کیا ہے کسی میں ایسا کچھ نہیں ہے، سوائے مصنّف کے والد قتیل داناپوری (م ۱۴۰۵ھ) کے کتابچوں کو چھوڑ کر اور انہیں بلا ثبوت و ماخذ کے کچھ بھی لکھنا آتا تھا۔ مصنّف کو چاہیے کہ ان تمام لوگوں کا فرداً فرداً خانقاہ داناپور میں آنا ثابت کریں پھر برابر آنا ثابت کریں۔

باب دوم: صوفیائے داناپور اور ان کی خانقاہ: (ب) نمائندہ شخصیتیں

(۱) حضرت مخدوم میر سید عبد الفتاح عرف قاضی سید بڑے رضوی چشتی نظامی داناپوری

(۱۰) نمائندہ شخصیتوں کے عنوان سے مصنّف نے ان سات افراد میں سے کسی کو پیش نہیں کیا ہے جنہیں مصنّف کے والد قتیل داناپوری (م ۱۴۰۵ھ) نے نصف چودھویں صدی ہجری میں پہلی بار آٹھویں صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک داناپور شاہ ٹولی کے سجادگان کہہ کر متعارف کرایا ان سات سجادگان میں سے اول اور بقول قتیل داناپوری جد اعلیٰ کا تذکرہ مصنّف بھی حضرت اخی سراج کا خلیفہ بتاتے ہوئے حضرت میر سید مبارک حسین رضوی چشتی نظامی کا تفصیلی تعارف کرایا ہے وہ ساتوں تصوراتی شخصیتیں یہ ہیں (۱) حضرت میر سید مبارک حسین رضوی چشتی نظامی

داناپوری (المتوفی فی التصوز ۹۰۷ھ) (۳) حضرت میر سید مظہر حسین رضوی چشتی نظامی داناپوری (۳) حضرت میر سید غیاث الدین رضوی چشتی نظامی داناپوری (۴) حضرت میر سید جلال الدین رضوی چشتی نظامی داناپوری (۵) حضرت میر سید جمال الدین رضوی چشتی نظامی داناپوری (۶) حضرت میر سید برہان الدین رضوی چشتی نظامی داناپوری (المتوفی فی التصور ۸۶۰ھ) (۷) حضرت میر سید منہاج الدین رضوی چشتی نظامی داناپوری۔ ان شخصیتوں کو کسی کتاب میں، کسی تذکرے میں، یا کہیں بھی تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بس اتنا سمجھ لیجیے کہ ان ساتوں کو شمار کرتے ہوئے قتیل داناپوری خانقاہ چشتیہ نظامیہ داناپور کے بیسویں سجادہ نشین تھے اور ان کے بعد مصنف اکیسویں سجادہ نشین ہیں۔ ویسے مصنف نے نمائندہ شخصیتوں میں ان حضرات کو شامل نہ کرکے اس حقیقت کا اعتراف تو کرہی لیا ہے کہ یہ حضرات یا ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں کہ انہیں نمائندہ شخصیت کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ بہرحال اب پہلی نمائندہ شخصیت کا جائزہ لیا جائے۔

(۱۱) مصنف نے قاضی عبدالفتاح کو "چشتی نظامی" لکھا ہے، حالاں کہ قاضی عبدالفتاح کا اب تک کسی سلسلۂ طریقت سے وابستہ ہونا ثابت نہیں۔

(۱۲) "حضرت مخدوم قاضی سید بڑے قاضی بڈھے اور شیخ بڈھ کے نام سے بھی مشہور تھے چنانچہ اکثر مشہور تاریخوں میں ان ناموں سے بھی آپ کا تذکرہ موجود ہے" ص ۴۳

(الف) کیفیت العارفین و کنز الانساب میں صرف قاضی بڑے لکھا گیا ہے اور یہی سید عبدالفتاح کی عرفیت ہے اور قاضی بڈھے صاحب تذکرۃ الکرام نے لکھا ہے اور شیخ بڈھ قاضی عبدالفتاح کے نام کے ساتھ مصنف پہلی بار استعمال کر رہے ہیں۔

(ب) طبقات اکبری، منتخب التواریخ، تاریخ فرشتہ اور تاریخ مگدھ وغیرہ میں جس شیخ بڈھ ہم عصر شیر شاہ کا ذکر آیا ہے اس سے قاضی عبدالفتاح ہی مراد ہیں اس کی کیا سند ہے؟ اور بقول مترجم اور حاشیہ نگار تاریخ فرشتہ جناب محمد فدا علی طالب صاحب "شیخ علائی کے قصہ کو سب سے مفصل اور عمدہ طریقے سے ملا عبدالقادر بدایونی نے جو اس زمانہ میں خود بھی انہیں اطراف میں موجود تھا بیان کیا ہے کہ فرشتہ کی روایت میں یہ جز کہ شیخ علائی کو بہار میں شیخ بڑھ کے پاس بلایا گیا کاتب یا مورخ کی غلطی ہے جس نے یہ قصہ طبقات اکبری سے بجنسہٖ نقل کرلیا ہے۔ بہار کے بجائے بیانہ چاہیے اور بڑھ کی بجائے میاں بھووہ جو اس عہد کا مشہور طبیب اور صدر قاضی تھا۔ روایت کی بعض اور جزئیات بھی سقم سے خالی نہیں مگر انہیں غیر اہم سمجھ کر قطع نظر کیا جاتا ہے" (ص ۳۸

واشی تاریخ فرشتہ) میں اس حاشیے سے متفق نہیں ہوں لیکن منتخب التواریخ والے شیخ بڈھ نہ تو قاضی تھے اور نہ قاضی القضاۃ[1]
(۱۳۱)" آپ کی پیدائش ۸۸۹ھ یا ۸۸۰ھ میں ہوئی میر سید عبدالفتاح شہنشاہ ہندوستان سلطان محمد ظہیر الدین بابر
کے ابتدائے عہد سلطنت ۹۳۲ھ میں دار القضا داناپور کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے" ص ۴۴

(الف) قاضی عبدالفتاح کے سن پیدائش کا علم کسی قریب العصر تذکرہ نگار کو نہیں تھا اس لیے مصنف کے والد قتیل داناپوری (م ۱۴۰۵ھ) کا بلا ثبوت کچھ لکھ دینا سند نہیں ہے (ب) ۹۳۲ھ میں دار القضا داناپور کا قاضی مقرر ہونا قتیل داناپوری سے پہلے کس نے لکھا ہے؟ (ج) دار القضا داناپور میں قاضی القضاۃ کیسے مقرر ہوگئے کسی نے بھی قتیل داناپوری سے پہلے انہیں قاضی کے بجائے قاضی القضاۃ نہیں لکھا ہے۔ مصنف کو چاہیے تھا کہ اس سلسلہ میں تحقیق و جستجو فرماتے کہ میرے والد نے قاضی کو قاضی القضاۃ کیسے بنا دیا۔ ہندوستان اسلامی عہد میں مصنفہ مولانا عبدالحیٔ میں قاضی اور قاضی القضاۃ دونوں کی تشریح کی گئی ہے ملاحظہ ہو ص ۶۴ اور ۶۹
طبقہ اولیٰ ــــ قاضی ــــ اس کا کام شریعت کا نفاذ اور مقدمات کا فیصلہ ہوتا ہر پرگنے میں ایک قاضی ہوتا اور مرکز میں ایک قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) جو مرکز میں بادشاہ کے ساتھ رہتا اور اسکا خطاب صدر جہاں ہوتا تھا"
طبقہ ثانی ــــ قاضی ــــ اس کا کام بتایا جا چکا ہے۔ یہ ہر پرگنہ میں مقرر ہوتا تھا اور قاضی القضاۃ دار الحکومت میں صدر الصدور کے ماتحت رہتا تھا" قاضی عبدالفتاح پرگنہ پھلواری کے قاضی مقرر ہوئے تھے اور پرگنہ تو کیا صوبہ کا قاضی بھی قاضی القضاۃ نہیں ہوسکتا تھا (د) قاضی عبدالفتاح کے ابتدائے عہد بابر میں قاضی مقرر ہونے کے لیے مصنف اپنے والد قتیل داناپوری (م ۱۴۰۵ھ) کا مندرجہ ذیل پیراگراف بغیر کسی تنقید کے نقل کرتے ہیں "خاندان کے بعض اہل قلم نے اپنی کتابوں میں شہنشاہ ظہیر الدین بابر کی جگہ سہواً اور محض ہواً شہنشاہ نور الدین جہانگیر لکھ دیا ہے واضح و آگاہ ہونا چاہیے کہ حضرت مخدوم سید عبدالفتاح داناپوری معاصر حقیقی بمدھی تھے حضرت میر سید قطب الدین بکتا (المتوفی ۹۳۵ عہد بابر) کے یعنی حضرت میر قطب الدین نے اپنی موجودگی میں اپنے فرزند حضرت مخدوم صدر جہاں چشتی کی شادی حضرت سید عبدالفتاح داناپوری کی صاحبزادی سے کی تھی اور یہ زمانہ شہنشاہ بابر کا تھا نہ کہ جہانگیر کا"
(الف) خاندان کے مستند ترین تذکرہ نگار فانی داناپوری نے کنز الانساب اور کیفیت العارفین میں اور

---

[1] حضرت حکیم شعیب صاحب پھلواری نے حضرت شیخ بڈھ حقانی بہاری کا تذکرہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ وہی وہ شیخ بڈھ ہیں جن کی جانب منتخب التواریخ میں اشارہ ہے۔

شاہ وحید الدین احمد داناپوری نے اپنے غیر مطبوعہ رسالے میں نور الدین جہاں گیر نہیں بلکہ اکبر کے دور میں قاضی مقرر ہونا لکھا ہے اور یہی سب سے زیادہ مستند ہے (ب) مصنّف کے والد قتیل داناپوری (م ۱۴۰۵ھ) کو شاید اس بات کا ہوش نہ رہا کہ حضرت قطب الدین (سمدھی قاضی عبدالفتاح) کو وہ داؤد شاہ والی حاجی پور (ابن سلیمان کرانی) کا وزیر مانتے ہیں اور جس کا عہد حکومت سال دو سال کے اندر ۹۸۲ھ میں حاجی پور سے سمٹ گیا۔ اور اس کے وزیر حضرت قطب الدین کے لیے انہوں نے جو سن وصال ۹۳۲ھ گڑھا وہ بالکل غلط گڑھا گیا اور اس سن وصال کی بنیاد پر جتنے ہوائی محل انھوں نے بنائے وہ اہل تواریخ کے نزدیک کبھی بھی قبول نہیں کیے جائیں گے (ج) عہد اکبر میں فوت کرنے والے حضرت قطب الدین کا سن وفات کسی قریب العصر مصنّف نے نہیں لکھا تو ۱۴۰۵ھ میں فوت ہونے والے قتیل داناپوری کا بلا ثبوت ۹۳۵ھ لکھ دینا کیوں کر قابل قبول ہوگا۔

(۱۴) بادشاہ اس خاندان کا بڑا معتقد تھا لہٰذا اس کی خواہش و اصرار سے حضرت سید عبدالفتاح چشتی نے عہدۂ قضا کو قبول کر لیا اور تا زندگی اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ آپ نے ایک طویل عمر پائی اور چار پانچ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ داناپور میں دار القضا خانقاہ شاہ ٹولی سے نصف میل سے کچھ کم مشرق کی جانب واقع تھا اسی نسبت سے وہ جگہ آج تک جمال شاہ کے تکیے کے قریب محلّہ قاضی ٹولہ کے نام سے مشہور و موجود ہے۔ حضرت موصوف آستانہ چشتیہ نظامیہ شاہ ٹولی داناپور کے سجادہ نشین اور بڑے زاہد و متورع و عابد و مرتاض تھے۔ سلاطین و امرا آپ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اکبر اعظم کی سلطنت کے ابتدائی زمانہ میں واصل بحق ہوئے اور مقبرہ چشت شاہ ٹولی داناپور میں آسودہ ہوئے، شیر شاہ بادشاہ کو آپ سے ایسی عقیدت ہو گئی تھی کہ اپنے ہاتھوں سے آپ کی جوتیاں سیدھی کرتا" ص ۴۴

(الف) کون بادشاہ بڑا معتقد تھا؟ چونکہ بقول مصنّف ابتدائے عہد بابر میں قاضی مقرر ہوئے اس کے سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ بابر کی خواہش و اصرار پر قاضی عبدالفتاح نے عہدۂ قضا کو قبول کیا ہوگا لیکن کیا مصنّف اس بات کی وضاحت کریں گے کہ بابر کے حدود سلطنت میں پرگنہ پھلواری شامل تھا کہ وہ یہاں کسی کو قاضی مقرر کرتا؟ (ب) سن پیدائش اور سن وصال جب تک مستند حوالے سے موجود نہ ہوں عمر کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے رہی بات بحیثیت قاضی چار پانچ بادشاہوں کے زمانہ دیکھنے کی تو اس بات کو مصنّف ثابت کریں (ج) شاہ ٹولی محلّہ اس لیے شاہ ٹولی کہلاتا آیا کہ وہاں شاہ صاحبان سکونت پذیر ہیں اور قاضی ٹولہ صرف اسی لیے مشہور ہو گیا کہ وہاں قاضی صاحب مقررہ وقت آ کر دار القضا کی عمارت میں عدالت لگاتے تھے؟ کیا مصنّف کے

پاس اس کا کوئی ثبوت ہے کہ قاضی عبدالفتاح اور ان کی اولاد میں جب تک عہدہ قضا رہا قاضی ٹولہ میں سکونت پذیر نہیں تھے، وہاں صرف عدالت کے وقت میں شاہ ٹولی سے جاتے تھے اور ان کی قیام گاہ ہمیشہ شاہ ٹولی رہی۔ (د) انہیں سوائے مصنّف کے والد کے کسی نے بھی خانقاہ چشتیہ نظامیہ کا سجادہ نشیں نہیں لکھا ہے (ہ) ان کی یہ چار صفتیں (زاہد و متورع و عابد و مرتاض) سوائے مصنّف کے والد کے اور کہیں نہیں ملیں۔ تحقیقی مقالے میں اس سے بڑا کوئی جرم نہیں کہ کسی کے لیے بھی کوئی صفت یا عیب بغیر کسی مستند حوالے کے اور اس حوالے کی چھان پھٹک کے لکھ مارا جائے۔ کیا مصنّف کے لیے یہ چاروں صفتیں بغیر کسی حوالے کے لکھنا بہت ضروری تھا؟ ورنہ ان کی سیرت پر کوئی آنچ آ رہی تھی؟ (و) سلاطین و امرا کی وضاحت کرنی تھی جنہیں قاضی صاحب سے عقیدت تھی (ز) شاہ حسین الدین احمد منعمی گیاوی نے کیفیت العارفین کے حاشیہ پر قاضی عبدالفتاح کا سن وصال ۹۹۲ھ لکھا ہے۔ اگر یہ سن وصال صحیح ہے تو مصنّف کا "اکبر اعظم کی سلطنت کے ابتدائی زمانہ میں واصل بحق ہونا" لکھنا بالکل غلط ہے۔ کیوں کہ ۹۶۳ھ میں اکبر کی جانشینی ہوئی اور ۱۰۱۴ھ میں اس کا انتقال ہوا اور ۹۹۲ھ میں قاضی عبدالفتاح فوت ہوئے۔ کیا پھر بھی سلطنت کے ابتدائی زمانہ میں واصل بحق لکھنا درست ہے۔ (ح) شاہ ٹولی داناپور کا خاص قبرستان جسے مصنّف مقبرہ چشت لکھ رہے ہیں وہاں قاضی سید عبدالفتاح کا مدفن سوائے مصنّف کے والد قتیل داناپوری (م ۱۳۰۵ھ) کے کسی نے نہیں لکھا ہے، حضرت شاہ وحید الدین احمد داناپوری (م ۱۲۷۲ھ) اپنی قلمی رسالے میں لکھتے ہیں "قاضی سید ابوالفتح کہ نسلاً بعد نسل بہ منصب قضا سرفراز بودند و ایں بزرگ از دختر شیخ محمد یحییٰ کورچوی کدخدا بودند و لا ولد گشتند و مزار شان در مقبرہ مشرقی داناپور متصل اڈہ ڈاک و نیز مزار پدر و جد و شان ہمانجا است،" قاضی سید ابوالفتح ابن قاضی سید عماد اللہ ابن قاضی عبدالفتاح کے مزار کے ساتھ والد اور دادا دونوں کے مزار کی نشاندہی ہوگئی۔ امکان قوی ہے کہ یہ رسالہ مصنّف یا مصنّف کے والد کی نگاہ سے نہ گذرا ہوگا۔ نہ گذرا ہو۔ لیکن انہوں نے بجائے اظہار لاعلمی کے یہ کیوں کر لکھ دیا کہ ان کا مزار شاہ ٹولی میں ہے کنز الانساب میں شاہ ٹولی کے قبرستان میں مدفون تمام بزرگوں کی باضابطہ تفصیل موجود ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس قبرستان میں پہلے بزرگ حضرت سید جہانگیر ابن حضرت سید اکبر ابن حضرت عماد الدین ابن قاضی عبدالفتاح دفن ہوئے۔ (ط) شیر شاہ کا جوتیاں سیدھی کرنا قاضی بڈھ کے بارے میں ہے اور مصنّف قاضی بڑے داناپوری اور شیخ یا قاضی بڈھ کو ایک ہی شخصیت ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

(۱۵) "قاضی سید بڑے داناپوری صاحب تصانیف بزرگ تھے ان کی ایک تصنیف 'شرح ارشاد قاضی' اس وقت سارے ہندوستان میں مشہور و مقبول تھی" ص۴۵

مصنف نے یہ جملہ تاریخ مگدھ سے نقل کیا ہے۔ فصیح الدین بلخی نے شیخ بڈھ شیر شاہی کے بارے میں یہ عبارت لکھی ہے اور مصنف نے کتنے اطمینان کے ساتھ اپنے تحقیقی مقالے میں شیخ بڈھ کو قاضی سید بڑے داناپوری کر دیا۔ مصنف کے علاوہ کسی نے بھی قاضی عبدالفتاح عرف قاضی بڑے داناپوری کو صاحب تصانیف نہیں لکھا ہے چہ جائیکہ ان کی تصنیف شرح ارشاد قاضی سارے ہندوستان میں مشہور و مقبول تھی۔ کیا مصنف بذات خود اس تصنیف سے واقف ہیں؟ یہ کس فن پر ہے؟ میرے محدود علم کے مطابق اس نام کی کوئی کتاب نہیں ہے پتہ نہیں فصیح الدین بلخی نے کہاں سے نقل کیا ہے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے نحو کے فن میں ایک رسالہ تصنیف کیا تھا جس کا نام "ارشاد" تھا۔ یہ بہت مشہور رسالہ تھا، اس کے نسخے کہیں کہیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اخبار الاخیار میں بھی اس رسالے کی تعریف محدث صاحب نے کی ہے، ممکن ہے شرح ارشاد قاضی اسی رسالے کی شرح ہو واللہ اعلم۔ منتخب التواریخ کا جملہ ہے "وبر ارشاد قاضی شرح معتبر نوشتہ" بلخی نے اس شرح کا تذکرہ منتخب التواریخ سے نقل کیا ہے۔

(۱۶) (۲) حضرت سید قطب الدین مصنف نے انہیں داناپور شاہ ٹولی کی دوسری نمائندہ شخصیت کے طور پر پیش کیا ہے۔ میری تحقیق کے مطابق حضرت سید قطب الدین کالپی میں پیدا ہوئے، حاجی پور اپنے والد کے ساتھ آئے اور بروایت شاہ ٹولی داناپور داؤد شاہ والی حاجی پور کے وزیر رہے، پھر ترک وزارت کے بعد پٹنہ کھجوری گلی میں مقیم رہے۔ ان کے بیٹے کی شادی داناپور میں قاضی عبدالفتاح کی بیٹی سے ہوئی۔ ان کا وصال کھجوری گلی میں ہوا اور حسب وصیت حاجی پور میں دفن ہوئے، لیکن پتہ نہیں کیوں مصنف انہیں داناپور کی نمائندہ شخصیت کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔

(۱۷) "حضرت سید قطب الدین بڑے ذی علم اور بڑے ہی کامل بزرگ تھے آپ سلطان ابراہیم شرقی بادشاہ جونپور (۸۰۴ھ تا ۸۴۲ھ) کے وزیر تھے، اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد عظیم آباد چلے آئے" ص۴۵

(الف) مجھے حضرت قطب الدین کے صاحب علم اور کامل بزرگ ہونے سے انکار نہیں لیکن تحقیقی مقالوں میں ایسے جملوں کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے جو بغیر کسی حوالے یا ماخذ کے لکھ ڈالے جائیں (ب) اپنے دعوے سے کہ حضرت قطب الدین ابراہیم شرقی کے وزیر تھے مصنف آگے جا کر خود انکار کرتے ہیں، "مگر خاندانی روایات اور سفینوں میں لکھا ہے کہ داؤد شاہ یعنی شاہ بادشاہ حاجی پور ضلع مظفر پور کے وزیر حضرت سید قطب الدین قدس سرہ تھے" ص۴۶ (ج) حضرت قطب الدین ترک وزارت کے بعد عظیم آباد پٹنہ میں کھجوری گلی کھو کر کٹرہ چلے آئے تھے، والد کے انتقال اور عظیم آباد

آنے میں کوئی ربط نہیں ہے کہ اسے ساتھ ساتھ بیان کیا جائے مزید تشفی کے لیے ملاحظہ ہو کنز الانساب۔

(۱۸) "حضرت سید قطب الدین کے ایک بھائی پھول شاہ بڑے باکمال عارف باللہ بزرگ گذرے ہیں سیر المتاخرین اور تذکرۃ الکرام میں لکھا ہے کہ سید قطب الدین برادر پھول شاہ ابراہیم شاہ شرقی کے وزراء سے تھے ان کا مزار گوری گلی پٹنہ میں ہے کیفیت العارفین میں حضرت شاہ عطا حسین صاحب نے بھی یہی لکھا ہے" ص ۴۵

(الف) حضرت قطب الدین منجملہ خود تین بھائی تھے (۱) سید قطب الدین (۲) سید علی (۳) سید حامد اور سید قطب الدین کو دو بیٹے اور ایک بیٹی تھیں جو مندرجہ ذیل ہیں (۱) سید صدر جہاں (۲) سید پھول (۳) بی بی انور المعروف بی بی چلدھی یہ تینوں اولاد حضرت سید قطب کو بی بی نعمت بنت سید عبد الحیٰ کالپوی کے بطن سے تھی میں نے جو کچھ اطلاع پیش کی ہے وہ فانی داناپوری اور شاہ وحید الدین صاحب کی متفقہ اطلاع ہے مصنّف کو اس سلسلہ میں اپنی شدید غلط فہمی کو دور کر لینا چاہیے۔ (ب) کیا مصنّف سیر المتاخرین کا صفحہ نمبر پیش کرنے کی زحمت کریں گے جہاں انہیں یہ اطلاع ملی۔ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ انہوں نے سیر المتاخرین کی شکل کبھی نہیں دیکھی ہے اور چوں کہ تاریخ مگدھ میں سیر المتاخرین کا حوالہ ہے اور مصنّف نے وہیں سے نقل کیا ہے اس لیے تاریخ مگدھ کو غائب کر کے خود سیر المتاخرین دیکھنے کے دعوے دار ہو گئے۔ ویسے مجھے اب تک سیر المتاخرین میں یہ جملہ نہیں مل سکا ہے۔ (ج) کیفیت العارفین کا حوالہ بالکل غلط ہے کیفیت العارفین کی اطلاع اس کے بالکل خلاف ہے۔

(۱۹) "حضرت کا انتقال ۲۱ رجب المرجب ۹۳۵ھ کو ہوا خاندانی سفینوں کی رو سے آپ حسب وصیت اپنے والد ماجد کی پائنتی میں حاجی پور میں آسودہ ہیں" ص ۴۵

(الف) شاہ حسین الدین احمد منعمی گیاوی کیفیت العارفین کے حاشیہ پر ص ۱۴۴ میں حضرت قطب الدین کا وصال ۲۱ رجب ۹۶۰ھ لکھتے ہیں۔ دونوں سن وصال کے درمیان پچیس سال کے طویل عرصے کا فرق ہے، یہ دونوں سنین بغیر اپنے ماخذ کا تذکرہ کیے ہوئے بیان کیے گئے ہیں اور مزہ یہ ہے کہ دونوں سن وصال کے پیش کرنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ صاحب وصال داؤد شاہ والی حاجی پور کے وزیر تھے۔ اور داؤد شاہ ابن سلیمان کرانی کی حکومت ۹۸۲ھ میں سال دو سال کے اندر سمٹ گئی اور وہ خود ۹۸۴ھ میں مارا گیا۔ اور اس کے وزیر صاحب بقول مصنّف کے ۹۳۵ھ میں انتقال کر گیے اور بقول شاہ حسین الدین صاحب ۹۶۰ھ میں انتقال کر گئے۔ یا تو یہ دونوں سال وصال غلط ہیں یا پھر یہ غلط ہے کہ وہ داؤد شاہ کے وزیر تھے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ مصنّف اس امر پر راضی نہ ہوں گے کہ وزارت ہاتھ سے جائے تو انہیں اپنے والد کے گڑھے ہوئے سن وصال سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ (ب) مصنّف نے حاجی پور

میں کسی خاص مقام کی نشاندہی نہیں کی ہے کہ کہاں پر حضرت قطب اور ان کے والد کا مزار ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سلسلہ میں کوئی کدوکاوش نہیں کی ہے، ویسے میں نے اس سلسلہ میں کافی تگ و دو کی مجھے شہر حاجی پور میں ان حضرات کا مزار کہیں نہ ملا۔

(۲۰) (۳) حضرت میر سید صدر جہاںؒ مصنف نے حضرت صدر جہاں کو داناپور کی تیسری نمائندہ شخصیت بنا کر پیش کیا ہے حضرت سید صدر جہاں کی شادی حضرت قاضی عبدالفتاح داناپوری کی بیٹی سے ہوئی تھی، کسی بھی تذکرہ سے حضرت سید صدر جہاں کا داناپور میں قیام پذیر ہونا ثابت نہیں اور نہ حضرت صدر جہاں کا مزار داناپور میں ہے تو کیا صرف وہاں صدر جہاں کی شادی ہو جانے سے وہ وہاں یعنی داناپور کی نمائندہ شخصیت ہو گئے؟

(۲۱) "صاحب تذکرۃ الکرام لکھتے ہیں کہ حضرت سید صدر جہاں بھی والی بنگالہ داؤد شاہ کے وزیر تھے اکبر آباد میں مدفون ہیں" ص ۴۶

صاحب تذکرۃ الکرام کے جملے میں مصنّف نے "بھی" کا اضافہ کر کے غلطی کی ہے۔ تذکرۃ الکرام کا جملہ یہ ہے۔ "اور سید قطب الدین کے بیٹے حضرت سید صدر جہاں والی بنگلہ داؤد شاہ کے وزیر تھے"۔

(۲۲) "حضرت سید صدر جہاں ابراہیم شاہ شرقی والی جونپور کے وزیر تھے، ابراہیم شاہ شرقی نے آخر میں حضرت سید صدر جہاں سے بیعت بھی کی تھی، حضرت سید صدر جہاں کا انتقال بھی جونپور ہی میں یکم ذی قعدہ ۹۹۰ھ کو ہوا اور وہیں اپنے مرید ابراہیم شاہ شرقی کے قریب پہلو میں مدفون ہیں نہ کہ اکبر آباد میں جیسا کہ صاحب تذکرۃ الکرام نے ص ۲۷۸ پر لکھ دیا ہے" ص ۴۵

(الف) یہ پورا پیراگراف مصنف کی اپنی گراں قدر تحقیق ہے، خاندان کے تمام بزرگوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ بالکل مختلف اور تازہ ترین تحقیق ہے (ب) حضرت سید صدر جہاں کے والد حضرت قطب الدین کے داؤد شاہ کے وزیر ہونے پر مصنّف کو اتفاق ہے اور حضرت قطب الدین کے بیٹے حضرت سید صدر جہاں (المتوفی ۹۹۰ھ بقول خود) کے بارے میں مصنف نے کیا خوب تحقیق کی کہ وہ ابراہیم شرقی والی جونپور (۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ) کے وزیر تھے۔ دراصل مصنّف نے ابراہیم شرقی کے دور میں علماء کی فہرست میں ایک نام صدر جہاں دیکھ لیا اور سید صدر جہاں بن سید قطب الدین کو وہاں ٹانک دینے میں اپنی ساری صلاحیت صرف کر دی۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ سید صدر جہاں وزیر ابراہیم شاہ شرقی کا انتقال اپنے بادشاہ کے ایک سو اڑتالیس سال بعد ۹۹۰ھ میں ہوا بہت خوب۔ اور اپنے ایک سو اڑتالیس سال بعد فوت کرنے والے بزرگ سید صدر جہاں بن سید قطب سے ابراہیم شاہ شرقی مرید بھی

ہوا تھا۔ اور پیر صاحب اپنے وصال سے ایک سو اڑتالیس سال قبل انتقال کیے ہوئے اپنے مرید کے پہلو میں بھی دفن ہوئے ـــــ ماشاء اللہ۔ اگر مصنّف اپنا ماخذ بھی لکھ جاتے تو شاید یہ سارا تبصرہ اس طرف لوٹ جاتا (ج) ابراہیم شاہ شرقی کسی صدر جہاں کا مرید نہیں تھا۔ صاحب تاریخ جونپور ص ۲۳۷ پر لکھتے ہیں۔ "مقبرہ مخدوم جہانیاں: آپ بخارا کے رہنے والے تھے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں دہلی تشریف لائے۔ بادشاہ نے بڑی عزت افزائی و قدردانی کی۔ ابراہیم شاہ شرقی آپ سے بیعت تھا اور بہت عقیدت رکھتا تھا (بحوالہ غرابت نگار و تجلیات العارفین)" صاحب تاریخ جونپور نے ابراہیم شرقی کی ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے بھی بے پناہ عقیدت کا تذکرہ کیا ہے اور ایک جگہ انہیں بھی ابراہیم شرقی کا پیر و مرشد لکھا ہے ملاحظہ ہو ص ۱۱۸ (د) ابراہیم شاہ شرقی کے پہلو میں کسی صدر جہاں کا مزار نہیں ہے' تاریخ جونپور میں سلاطین شرقیہ کے مزارات کی پوری تفصیل اس طرح ہے" (۳) پختہ قبر قدرے اونچی اور لمبی دکھن کی جانب بائیں قبر سلطان حسین شاہ جس میں کسی بزرگ نے مکہ معظمہ سے اینٹ لاکر نصب کی ہے سلطان ابراہیم شاہ بادشاہ سیوم کی ہے (۴) پختہ قبر جو سلطان ابراہیم شاہ کی قبر کے بائیں جانب ہے زوجہ ابراہیم شاہ کی ہے۔ (۵) پختہ قبر جو لمبی اور زوجہ ابراہیم شاہ کی قبر کے نزدیک بائیں جانب ہے سلطان محمود شرقی بادشاہ چہارم کی ہے" ص ۱۸۴ (ہ) حضرت سید صدر جہاں کا مزار نہ تو اکبر آباد میں ہے اور نہ جونپور میں۔ ان کا مزار یہیں پٹنہ سٹی میں اپنے قبرستان کچوری گلی کھجورکٹرہ میں تھا۔ انشاء اللہ کبھی موقع ہوا تو اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کرکے قدیم تذکروں سے ماخوذ اپنے دعوے کو اہل علم کے آگے رکھوں گا مزید تشفی کیلئے ملاحظہ ہو کنز الانساب۔

(۲۳) ۴ حضرت مخدوم میر سید محمد باصر رضوی قدس سرہٗ۔ مصنّف نے حضرت باصر کو داناپور کی چوتھی نمائندہ شخصیت بنا کر پیش کیا ہے۔ حضرت باصر بھی داناپور کی نمائندہ شخصیت نہیں ہوسکتے' حضرت باصر کی شادی داناپور میں انہے نانیہال میں حضرت سید محامد داناپوری کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ حضرت باصر کی زوجہ اپنے بچوں کے ساتھ داناپور میں ہی رہیں لیکن حضرت باصر نے کبھی بھی مستقل طور پر اپنا آبائی مکان واقع کچوری گلی پٹنہ سٹی چھوڑا نہیں۔ زوجہ نے اپنے شوہر کے روبرو انتقال کیا۔ اور داناپور میں دفن ہوئیں اور حضرت باصر نے اپنے سکونتی مکان کچوری گلی میں انتقال کیا اور یہیں دفن ہوئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ حضرت باصر کے ساتھ ایسی کوئی خاص وجہ ہے کہ انہیں داناپور کی نمائندہ شخصیت سمجھا جائے۔"

(۲۴) "آپ اباً عن جدٍ مرید و خلیفہ و سجادہ نشین اپنے جد امجد حضرت مخدوم میر سید اسمٰعیل چشتی صاحب

صاحب و لایت او دھ، مرزاپور، گشت تشریف ۶ رجب خلیفہ حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی اجمیری قدس سرہ کے تھے" ص۴۶

(الف) اطلاعاً عرض ہے کہ حضرت سید شاہ وحید الدین احمد دانا پوری (المتوفی ۱۲۷۲ھ) نے حضرت باھر کو اپنے خاندان سے باہر سلسلہ قادریہ میں مرید لکھا ہے (ب) میر سید اسمٰعیل کو کنز الانساب میں قادری لکھا گیا ہے، ان کے خواجہ غریب نواز کے خلیفہ ہونے کا علم صاحب کنز الانساب اور شاہ وحید الدین احمد داناپوری کو نہیں تھا۔ مصنف اگر کنز الانساب سے اختلاف رکھتے ہیں تو اپنے مطمح نظر کے لیے انہیں باضابطہ بحث کرنی تھی تب کنز الانساب سے اختلاف کرنا تھا۔

(۲۵) (۵) حضرت مخدوم سید شاہ یٰسین رضوی چشتی نظامی داناپوری قدس سرہ

"علوم ظاہری و باطنی کو بحد کمال حاصل کیا اور سید المجذوبین کے لقب سے مشہور ہوئے ۔۔۔۔ آپ اپنے نانا حضرت مخدوم میر سید محامد چشتی قدس سرہ کے دست حق پرست پر سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ میں بیعت کی ۔۔۔ نعمت باطنی مع اجازت وخلافت و جانشینی حضرت والد ماجد کی بارگاہ سے بھی پائی" ص ۴۶

(الف) علوم ظاہری میں جہاں تک کمال کا تعلق ہے تو حضرت فانی داناپوری (المتوفی ۱۳۱۱ھ) اپنے دادا حضرت سید شاہ غلام حسین داناپوری (المتوفی ۱۲۵۴ھ) کا قول کنز الانساب میں نقل فرماتے ہیں: "ہر چند کہ حضرت طاہر تحصیل چنداں نبود الا بقدر ضرورکہ از آنحضرت بحث و تقریر نمود در تراویح حفاظ را لقمہ میداد ند حالاں کہ ناظرہ خواں بودند" (ب) حضرت یٰسین داناپوری اپنے نانا حضرت محامد داناپوری کے دست گرفتہ مجاز و خلیفہ و جانشین تھے لیکن اس کی کیا سند ہے کہ وہ سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ میں بیعت تھے؟ (ج) کسی قریب العہد مصنف کو اس کا علم نہیں تھا کہ حضرت یٰسین کو نعمت باطنی مع اجازت و خلافت حضرت والد ماجد کی بارہ گاہ سے بھی تھی پہلی بار قتیل داناپوری (م ۱۴۰۵ھ) کو اسکا علم ہوا۔

(۲۶) "اکثر سلاطین و امراے دہلی کو آپ سے نہایت عقیدت تھی معظم شاہ بادشاہ دہلی نے خدمت شریف میں شقہ وزارت ارسال کیا مگر آپ نے قبول نہ فرمایا (تذکرۃ الکرام ص ۶۷۹)" ص ۴۶

(الف) ایسی کسی عقیدت کا علم کسی قریب العہد مصنف کو نہیں، اگر مصنف کو اس کا علم ہے تو کم سے کم ایک سلطان اور ایک امیر کا نام پیش کریں جسے حضرت یٰسین داناپوری کی ذات سے نہایت عقیدت تھی (ب) معظم شاہ بادشاہ دہلی نے حضرت یٰسین داناپوری کی خدمت میں کبھی شقہ وزارت ارسال نہیں کیا معظم شاہ نے شقہ وزارت حضرت یٰسین کے والد حضرت باھر کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور وہ بھی کسی عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ ان خدمات کے صلہ کے طور پر جو حضرت باھر نے معظم کے عہد شہزادگی میں بہ عہدہ منشی و مصاحب بجالائے تھے اور جب حضرت

باصر نے پشت فرمان پر معذرت لکھ بھیجی تو بادشاہ نے عنایت محبت دکھلاتے ہوئے بیٹوں میں سے کسی کو اپنی جگہ بھیجنے کے بارے میں لکھا۔ والد نے اپنے دونوں بیٹے حضرت عبدالقادر و حضرت یٰسین سے ان کی مرضی دریافت کی اور ان دونوں کی جانب سے بھی اثبات میں جواب نہ ملا۔ اگر یقین نہ ہو تو ملاحظہ ہو کنزالانساب ص ۲۵۷

(۲۷) "وفات آپ کی ۲۰ ربیع الثانی ۱۱۲۷ھ کو ہوئی" ص ۴۸

۱۱۲۷ھ شاہ کبیر صاحب اور شاہ اکبر صاحب داناپوری نے با ترتیب تذکرۃ الکرام اور نذر محبوب میں لکھا ہے لیکن ان دونوں سے کہیں زیادہ مستند اور قریب العصر ثانی داناپوری کیفیت العارفین میں فرماتے ہیں: یعنی بسال یکہزار و یکصد و ہفتاد و یک ہجری بتاریخ سی ام ماہ ربیع الثانی رحلت فرمودند"

(۶) حضرت مخدوم میر سید عبدالقادر چشتی داناپوری قدس سرہٗ

(۲۸) "آپ بھی پیشوائے اہل جذب تھے۔ سلوک میں بھی عالی مقام رکھتے تھے عارف زمانہ و شیخ یگانہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بازو میں زور حیدری عطا فرمایا تھا بڑے قوی اور تنومند تھے۔۔۔۔ بادشاہ دہلی نے وزارت پیش کی مگر حضرت نے فرمان شاہی کی پشت پر معذرت لکھ کر واپس کر دیا۔۔۔ اہل ورزش آپ کے مزار شریف کے پائنتی میں ورزش کر لیا کرتے ہیں جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ حریف کے مقابلے میں انہیں سرفراز کرتا ہے" ص ۴۸

(الف) حضرت مخدوم عبدالقادر کو بیعت کس بزرگ سے کس سلسلہ طریقت میں تھی؟ کنزالانساب اور کیفیت العارفین اس سلسلہ میں بالکل خاموش ہے، مصنف کے والد کے پاس بھی اس سلسلہ میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ پھر انہیں چشتی لکھنا کیوں کر درست ہے؟ (ب) پیشوائے اہل جذب ہونا اور سلوک میں عالی مقام رکھنا کس نے لکھا ہے؟ کنزالانساب میں تو صرف اتنا ہے "آنجناب سرمست حال و تنومند بودند۔۔۔ بے شعوری بود مستانہ وار" صفحہ ۲۵۷ صاحب کنزالانساب کے بعد جس کسی نے بھی اس عبارت میں اضافہ کیا وہ لائق تحسین اور قابل قبول نہیں۔ (ج) بازو میں زور حیدری ہونا ایسا بھی کنزالانساب میں نہیں ہے۔ بڑا قوی ہونا بھی صاحب کنزالانساب نے نہیں لکھا ہے اوایل بارہویں صدی ہجری میں فوت ہوئے عبدالقادر کے بارے میں قتیل داناپوری (م ۱۴۰۵ھ) کی فراہم کردہ بلا ثبوت و سند یہ اطلاعات کیسے قبول کر لی جائیں (د) بادشاہ دہلی نے حضرت عبدالقادر کے والد سید باصر کو بذریعہ فرمان وزارت کے لیے طلب کیا تھا اور حضرت باصر نے ہی فرمان کے پشت پر معذرت لکھ کر واپس کر دیا پھر دوبارہ بادشاہ نے حضرت سید باصر والد حضرت عبدالقادر کو اپنے بیٹوں میں سے کسی کو بھیجنے کے لیے لکھا تو والد کے اس سلسلہ میں استفسار پر حضرت عبدالقادر نے زبانی جواب دیا۔" بادشاہ مرا

خور اندن نمی تواند ہستم بسیار خوار رتبہ وزارت ہیچ نیست نزد فقیر خاک" (کنز الانساب ص ۲۵) (۵) اہل شاہ کا مزار کے پائنتی میں ورزش کرنا شاہ قائم صاحب قتیل داناپوری کے وقت میں شروع ہوا ہوگا اور انہیں کی زندگی میں یہ تماشہ ختم بھی ہوگیا ہوگا۔ کیوں کہ کسی داناپوری تذکرہ نگار کے یہاں یہ نادر اطلاع نہیں ہے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ورزش کرنا تو در کنار شاہ ٹولی کے شاہ صاحبان اور ان کی اولاد میں سے شاید پانچ فی صدیہ جانتے ہوں کہ شاہ عبدالقادر کا مزار کہاں پر ہے۔

(۷) حضرت مخدوم سید شاہ ولی اللہ رضوی چشتی نظامی قدس سرہٗ

(۲۹) "تعلیم و تکمیل و اجازت وخلافت والد ماجد سے بھی تھی" ص ۴۸

حضرت شاہ ولی اللہ کو بیعت وخلافت اپنے نانا حضرت شاہ مبارک نوآبادی سے حاصل تھی۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ کا سب سے مستند احوال صاحب کنز الانساب نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے جو کچھ شاہ ولی اللہ کے بڑے بیٹے اور اپنے دادا حضرت سید شاہ غلام حسین داناپوری سے سنا وہ بالکل بعینہٖ نقل کردیا ہے انتہا تو یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے تمام احوال میں ضمیر مصنف کنز الانساب کی طرف نہیں لوٹتی بلکہ شاہ غلام حسین صاحب کی طرف لوٹتی ہے اور ایسے مستند احوال میں کہیں پر یہ اشارہ نہیں ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کو اپنے والد سے بھی تعلیم و تکمیل و اجازت وخلافت تھی۔

(۳۰) "جناب شاہ حسین الدین صاحب گیاوی لکھتے ہیں کہ شاہ عالم بادشاہ کی تشریف آوری کے وقت آپ مرشد آباد میں تھے" ص ۴۸

جناب شاہ حسین الدین صاحب نے اپنی کس تصنیف میں ایسا لکھا ہے؟ کتابیات میں مصنف نے ان کی کسی تصنیف کو دیکھنے کا دعوٰی نہیں کیا ہے۔

(۳۱) "نواب علی خاں والی بنگال نے ایک عمر داناپور کی خانقاہ میں بسر کی اور بہ اصرار تمام حضرت کو مرشد آباد لے گئے جہاں بے شمار طالبان خدا آپ سے فیض یاب ہوئے۔ حضرت سید شاہ غلام حسین قدس سرہ نے حسب وصیت والد ماجد چھ مہینے اور بروایت ایک سال بعد شاہی انتظام میں نعش مبارک بذریعہ بجرۂ دریائی داناپور لائے" ص ۴۹

(الف) نواب جعفر علی خاں غلطی سے صرف علی خاں لکھا گیا ہے اس نے خانقاہ داناپور میں ایک عمر بسر نہیں کی اور نہ کبھی وہ بہ اصرار تمام شاہ ولی اللہ صاحب کو مرشد آباد لے گیا۔ جعفر علی خاں اپنے ساتھ شاہ ولی اللہ صاحب کے صاحبزادے شاہ غلام حسین داناپوری کو بہ اصرار تمام لے گئے تھے جعفر علی خاں کے جانے کے

ایک ماہ بعد شاہ ولی اللہؒ صاحب کو اپنے بیٹے کی مفارقت کھلنے لگی تو وہ مرشد آباد تشریف لے گئے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کنزالانساب ص ۲۷۲ (ب) صاحب کنزالانساب نے حضرت سید شاہ غلام حسین داناپوری کی زبانی نقل کیا ہے "بعد دو سال والد ماجد من در انجا نمودند انتقال نبود مقصود بہر دنیا بہبود حضرت معبود نواب صاحب را پیدا شد کمال حزن و ملال۔ مرزا خان بیگ یکے از مریدان آنحضرت بودند میخواستند در انجا نمائند مزار الا گفتم مرا مراد است کہ نعش برم بوطن و دفن نمایم در جوار جد بزرگوار۔ آخر بصلاح بہر شش ماہ نعش را سپرد کردند مع خدمتگار و اہلکار نواب آمدم داناپور صندوق ساختہ بہر آوردن نعش پاک بسواری کشتی رفتم در انجا رسیدہ از زمین تفویض نعش برآوردہ باحتیاط در صندوق کردہ از آنجا آوردم در جوار جد امجد دفن نمودم" سارے ضمائر متکلم حضرت سید غلام حسین داناپوری کی طرف لوٹ رہے ہیں یہ مستند ترین اطلاع ہے، جس کے ساتھ یہ واقعات گزرے وہ خود بیان کر رہا ہے۔ فارسی بہت سلیس ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے ایسی کوئی وصیت نہیں کی تھی کہ مجھے داناپور لے جا کر دفن کرنا ـــــ اگر ایسی کوئی وصیت ہوتی تو صاحب وصیت کے مرید مرزا خان بیگ اس کے خلاف نہ بولتے اور حضرت شاہ غلام حسین صاحب صاف کہتے کہ والد کی ایسی وصیت ہے اس لئے داناپور لے جا کر دفن کرنا ہے۔ شاہ غلام حسین صاحب کہتے ہیں کہ میں نے چھ مہینے کے لیے نعش کو تفویض زمین کیا ـــــ اس قول کے بعد پھر یہ دوسرا کون ہے جو یہ کہے کہ ایک روایت ایک سال کی بھی آتی ہے۔ ایک سال کا شوشہ پہلی بار مصنف کے والد قتیل داناپوری (م ۱۴۰۵ھ) نے چھوڑا۔ (ج) شاہی انتظام کیا معنی؟ پہلی بات یہ کہ نواب نے نعش جب داناپور لائی جا رہی تھی تو کوئی نظم بھی کیا تھا؟ ایسا کنزالانساب میں نہیں ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر نواب جعفر علی خاں نے کوئی انتظام کیا بھی تھا تو وہ نوابی انتظام کہلا سکتا ہے شاہی انتظام تو نہیں کہا جا سکتا۔

(۸) حضرت مخدوم سیّد شاہ غلام حسین رضوی چشتی نظامیؒ

(۳۴) مصنف سبھی کو چشتی نظامی لکھتے ہوئے اطمینان سے گزر رہے ہیں حضرت شاہ غلام حسین داناپوری حضرت مخدوم منعم پاکؒ کے دست گرفتہ ہیں انہیں چشتی کے بعد منعمی لکھنا تھا جہاں تک میں سمجھتا ہوں حضرت شاہ غلام حسین بھی منعمی لکھنا ہی پسند کرتے۔

(۴۳) "مقام ولادت میں اختلاف ہے مگر صحیح یہ ہے کہ ۱۰ محــرم الحرام ۱۱۶۸ھ کو داناپور میں اپنے آبائی مکان میں تولد ہوئے" ص ۴۹

یہ اختلاف کس نے کیا ہے؟ مصنف کو وضاحت کرنی تھی۔ صاحب کنزالانساب لکھتے ہیں: "بایددانست ولادت آنحضرت بمقام کشن نگر بخانہ جد مادری شد بسال یکہزار و یکصد و شصت وہشت دھم شہر محرم الحرام" ص ۲۶۵ اس سے اختلاف جس کسی نے بھی کیا ہے بالکل غلط کیا ہے' اور مصنف نے اپنا فیصلہ کس بنیاد پر سنایا اس بنیاد کو بھی منظر عام پر لانا تھا۔

(۳۴) "سیر المتاخرین جلد ۲ صفحہ ۳۶۱ اور شاہ عالم نامہ صفحہ ۱۴۳ کے حوالے سے مولوی فصیح الدین بلخی لکھتے ہیں: شاہ عالم تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ۹ فروری ۱۷۶۰ء کو میرن اور میجر کیلاڈ کی فوج سے مقابلہ ہو گیا پہلے ہی حملہ میں میرن جس نے کبھی کوئی معرکہ نہ دیکھا تھا زخمی ہو کر بھاگ چلا تھا لیکن انگریزی توپوں نے شاہی فوج کو پسپا کیا۔ شاہ عالم پلٹ کر پھر بہار آیا اور تین دن یہاں (داناپور) قیام کر کے جنگل کی راہ سے مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا" (ص ۳۲۸ تاریخ مگدھ)" ص ۵۰

(الف) مصنف نے بذات خود سیر المتاخرین اور شاہ عالم نامہ کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے (ب) اگر مصنف بلخی کے ماخذ پر کچھ محنت صرف کرتے تو ممکن تھا کہ شاہ عالم اور اس کے داناپور آنے پر کچھ مفید روشنی پڑتی۔ (ج) مصنف نے بلخی کی عبارت میں "یہاں" کے بعد داناپور کا اضافہ بغیر سمجھے بوجھے کر دیا ہے' چونکہ "یہاں" سے قبل بلخی نے داناپور کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے اس لیے "یہاں" کی ضمیر داناپور کی طرف لوٹنے کا کوئی سوال نہیں اٹھتا ہے (د) "یہاں" سے قبل شاہ عالم کے پلٹ کر بہار آنے کا ذکر موجود ہے اس لیے "یہاں" کی ضمیر بہار کی طرف لوٹ رہی ہے نہ کہ داناپور کی جانب۔

(۳۵) "بادشاہ نے حضور صاحب سجادہ مخدوم شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے بہت کچھ نذر دینا چاہا مگر قبول نہ کیا گیا مجبوراً بادشاہ نے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے بغیر اجازت چند موضع حضرت سیدنا امام ضامن ثامن علیہ السلام کی نیاز کے لیے حضرت شاہ غلام حسین قدس سرہٗ کے نام بذریعہ فرمان شاہی لکھ دیا" ص ۵۱

شاہ عالم نے جو کچھ بھی دیا شاہ ولی اللہ صاحب کے سامنے دیا' صاحب کنزالانساب نے شاہ عالم کی آمد اور تمام واقعات کو اپنے دادا حضرت سید شاہ غلام حسین داناپوری کی زبانی نقل کیا ہے جو ان تمام واقعات کے عینی شاہد اور اہم ترین شخصیت ہیں۔ بادشاہ کے نذرانے کو نہ قبول کرنے کا کوئی تذکرہ کنزالانساب میں نہیں ہے بہت ہی PROPER WAY میں سارا کام ہوا۔ باضابطہ شاہ عالم نے قانون گویوں اور چودھریوں اور وثیقہ نویسوں کو بلا کر سب کے سامنے پرگنہ پھلواری میں زمینوں کا انتخاب کیا اور فرمان لکھا گیا بقول کنزالانساب زمین کی پیمائش پانچ سو اڑتیس بیگھہ تھی۔ کسی طرح کے انکار و قبول یا مجبوری یا اجازت نہ لینے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

(۱۰) حضرت مولانا سید شاہ وحید الدین قادری چشتی داناپوری

(۳۶) " رمضان المبارک ۱۱۹۸ھ میں پیدا ہوئے .... نہایت جید عالم و عارف و محدث و فقیہہ تھے ....
تکمیل قلندریت آستانہ شیخ پر ہوئی ... حضرت مولانا شاہ ابوالحسن فرد پھلواری سے بھی درس ظاہری و فیض باطنی کا اتفاق
ہوا تھا .... تعلیم چشتیت بوجہ کمال حضرت والد ماجد کی جناب میں تھی" ص ۵۲

(الف) نہایت جید عالم و محدث و فقیہہ انہیں اور کس کس نے لکھا ہے، مصنف کو یہ باتیں حوالے کے ساتھ لکھنی تھیں تاکہ کبھی بہاری محدثین و فقہا کا شمار ہو یا ان کا تذکرہ مرتب کیا جائے تو شاہ وحید الدین صاحب کو صرف اس لیے نہیں چھوڑ دیا جائے کہ انہیں مصنف نے غیر محتاطی سے محدث و فقیہہ اور نہایت جید عالم لکھا ہے ۔ (ب) یہ تکمیل قلندریت کیا شئی ہے؟ کیا شاہ وحید الدین صاحب شاہ ظہور الحق صاحب پھلواروی سے سلسلۂ قادریہ کے علاوہ سلسلۂ قلندریہ میں بھی مجاز تھے ؟ (ج) حضرت فرد پھلواروی سے درس ظاہری اور فیض باطنی مصنف نے بلا ثبوت و حوالے کے لکھا ہے کسی ہم عصر یا قریب العصر مصنف نے اس امر کی جانب اشارہ بھی نہیں کیا ہے اور خود شاہ وحید الدین صاحب نے اپنے مصنفہ "رسالہ درنسب داناپور" میں اپنا حال بالتفصیل لکھا ہے اس میں اپنے بیعت اور اساتذہ کا تذکرہ وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے، حضرت شاہ ظہور الحق پھلواروی یعنی اپنے پیر کے اوصاف بیان کیے ہیں لیکن حضرت فرد پھلواروی کا نام کہیں نہیں آیا ہے ۔
(د) شاہ وحید الدین کا سن ولادت ۱۱۹۸ھ مصنف نے غلط لکھا ہے ۔ صاحب کنز الانساب کا لکھا سن ولادت یہ ہے " ولادت ایشاں بسال یکہزار و یکصد و نود و ہفت ہجری در شہر رمضان المبارک بود بروز یکشنبہ" ص ۲۸۰
(ہ) حضرت سید شاہ غلام حسین داناپوری نے بوقت وصال انہیں اپنے سلاسل آبائی (جو حضرت شاہ محمد مقیم نو آبادی سے پہنچے تھے) کی اجازت و خلافت عطا فرمائی تھی ۔ اگر اس کا نام تعلیم چشتیت بوجہ کمال ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں اس لیے کہ انہوں نے اپنے مصنفہ رسالے میں کہیں پر بھی اپنے والد سے اخذ فیضان یا استفادہ باطنی کا تذکرہ نہیں کیا ہے ۔

باب دوم (ج) صوفیا و مشائخین داناپور کی ادبی خدمات ـــــ ایک اجمالی جائزہ

" اب تک جن صوفیا و مشائخین داناپور کا ذکر اوپر گذر چکا ان کا صاحب تصنیف و تالیف ہونا خاندان کے بزرگوں میں مشہور اور سفینوں میں مذکور ہے جیسا کہ قاضی میر عبدالفتاح عرف قاضی سید بڑے یا بڈھ کی ایک وقیع تصنیف "شرح ارشاد قاضی" کا تذکرہ اوپر گذر چکا ۔ صاحب تاریخ مگدھ لکھتے ہیں کہ شیخ بڈھ کی یہ تصنیف سلک

ہندوستان میں بہت مشہور تھی مگر ان بزرگوں کے ملفوظات و فرمودات دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے" ص ۵۵
(الف) قاضی عبدالفتاح کی ضمن میں شرح ارشاد قاضی پر بحث ہو چکی (ب) خاندان کے بزرگوں میں کیا مشہور ہے اور کیا نہیں ہے، اس سے بحث نہیں ہے لیکن شرح ارشاد قاضی کا نام کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ مصنّف نے تاریخ مگدھ میں پہلی بار دیکھا ہے اور شیخ بڈھ کی تصنیف کو قاضی بڑے داناپوری پر کسی طرح چسپاں کر رہے ہیں۔ (ج) اگر خاندان کے بزرگوں میں ان بزرگوں کا صاحبِ تصنیف و تالیف ہونا مشہور ہے جن کا تذکرہ مصنّف کر چکے تو ان حضرات کی تصنیف و تالیف پر کوئی روشنی کیوں نہیں ڈالی؟ (د) حقیقت یہ ہے کہ مصنّف نے اس سلسلے میں قطعی کوئی محنت نہیں کی ہے اور اپنے فہرست کتابیات میں پیش کی گئی کتابوں کو بھی سرسری نگاہ سے زیادہ توجہ دینے کی زحمت گوارہ نہیں کی ہے، مصنّف نے جن حضرات کا ابتک تذکرہ کیا ہے وہ یہ ہیں۔ ۱۔ قاضی عبدالفتاح، ۲۔ حضرت قطب الدین، ۳۔ حضرت صدر جہاں، ۴۔ حضرت ناصر، ۵۔ حضرت یٰسین، ۶۔ حضرت عبدالقادر، ۷۔ حضرت ولی اللہ، ۸۔ حضرت غلام حسین، ۹۔ حضرت شمس الدین، ۱۰۔ حضرت وحید الدین، ۱۱۔ حضرت حکیم مراد علی۔

مندرجہ بالا گیارہ شخصیتیں بقول مصنّف داناپور شاہ ٹولی کی نمائندہ ہیں، جن میں قاضی عبدالفتاح کے بارے میں تاریخ مگدھ سے یہ پتہ چلا کہ ان کی ایک تصنیف شرح ارشاد قاضی تھی اور بقیہ کے بارے میں مصنّف کے پاس یہ اطلاع ہے کہ ان لوگوں کا صاحبِ تصنیف و تالیف ہونا خاندان کے بزرگوں میں مشہور ہے بہرحال اب تک کی تحقیق ان شخصیتوں کے بارے میں یہ ہے۔

۱۔ حضرت قاضی عبدالفتاح: خاندان کے کسی تذکرہ نگار کو ان کے صاحبِ تصنیف و تالیف ہونے کا علم نہیں۔ اب تک کوئی ایسی تحریر سامنے نہیں آئی جس سے قاضی عبدالفتاح کے شعری یا نثری ذوق کا کچھ بھی پتہ چل سکے۔ خاندان کے باہر والے تو شاید قاضی عبدالفتاح کے نام سے بھی واقف نہ ہوں۔

۲ حضرت قطب الدین: انہیں داناپور کی نمائندہ شخصیت کہنا حماقت ہے۔ ان کے صاحبِ تصنیف و تالیف ہونے کا کسی کو علم نہیں۔

۳ حضرت صدر جہاں: انہیں بھی پتہ نہیں کس طرح مصنّف نے داناپور کی نمائندہ شخصیت سمجھا ہے ان کے بھی صاحبِ تصنیف و تالیف ہونے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں۔ حضرت صدر جہاں دورِ اکبری کے بزرگ ہیں، دور ہمایوں میں کسی ایک صدر جہاں کا ذکر ملتا ہے، اولاد حیدر فوق بلگرامی نے بھی

ان کا ذکر کیا ہے۔ خدا بخش لائبریری میں صدر جہاں ہم عصر ہمایوں کی ایک تصنیف رسالہ صیدیہ میری نظر سے گذری ہے، لیکن سرسری نظر میں مجھے اس رسالے کے مصنف کے بارے میں اس رسالے کے اندر کوئی اطلاع نہ مل سکی۔

۴ حضرت سیّد باصر: ان کے تصنیف کردہ رسالے کا تذکرہ صاحب کنز الانساب نے کیا ہے۔ یہ رسالہ فن تیر اندازی پر تھا۔ چوں کہ حضرت باصر کو اس فن میں کمال حاصل تھا، اس لیے یہ رسالہ ان کے ذاتی تجربوں اور صلاحیتوں کا مظہر تھا۔ یہ رسالہ مصنف کنز الانساب کے پاس موجود تھا، مصنف اس سے لاعلم ہیں۔

۵ حضرت یٰسین: حضرت یٰسین مائل بجذب بزرگ تھے۔ تعلیم ظاہری آپ کی کوئی خاص نہ تھی آپ کی کسی تصنیف و تالیف کا علم کسی قریب العصر تذکرہ نگار کو نہیں تھا سوائے ایک بیاض کہ جس سے صاحب کنز الانساب نے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس بیاض کو حضرت شمس الدین حسین اور حضرت مبارک حسین نے بھی اپنے اپنے سفینے میں نقل کیا ہے، لیکن حضرت یٰسین کے کرامات و تصرفات جو بڑی تعداد میں ظہور پذیر ہوئے تھے، ان کے اخلاف میں سے کسی نے مجموعہ کرامات کی شکل میں جمع کر لیے تھے صاحب کیفیت العارفین ص ۱۰۵ پر لکھتے ہیں: "حال کشف و کرامات در کتاب "شرح انساب" کہ از تالیف فرزندان آنجناب است کہ در داناپور عظیم آباد آں نسخہ موجود است در آں بتصریح نگاشتہ است ہر کہ را شوق معائنہ باشد آں کتاب ملاحظہ نماید" اور ص ۱۴۱ پر فرماتے ہیں: "در آں حین کشف و کرامات از حضرت سید المجذوبین بسیار سرزد شدہ کہ در تحفۃ الانساب مذکور است" مصنف داناپور کے علمی و ادبی مرکز پر بحث فرما رہے ہیں اور ان کے پاس بزرگان داناپور کے بارے میں سطحی اطلاعات سے زیادہ کچھ نہیں۔

۶ حضرت عبد القادر: ان کی کسی تصنیف کا علم کسی کو نہیں ہے انکے علمی ذوق پر بھی کوئی روشنی نہیں پڑتی ہے۔

۷ حضرت سید شاہ ولی اللہ: ان کی بھی کسی تصنیف کا علم ان کے بیٹے حضرت سید غلام حسین داناپوری کو نہیں تھا۔

۸ حضرت سید شاہ غلام حسین داناپوری: ان کے صاحب تصنیف و تالیف ہونے کا تا دم تحریر کوئی ثبوت نہیں۔ صاحب کنز الانساب ان کے پوتے، مرید، خلیفہ اور مجاز ہیں صاحب کنز الانساب نے اپنے دادا اور پیر و مرشد کے حالات و واقعات اور فیضان کو بشکل ملفوظ "کلمات الواصلین" کے نام سے جمع کیا تھا۔ میری نظر سے یہ ملفوظ نہیں گذرا ہے، لیکن حضرت فانی داناپوری مصنف کنز الانساب کو بھی حضرت غلام حسین کے صاحب تصنیف و تالیف ہونے کا علم نہیں تھا۔ ان کے شعری ذوق کے بارے میں بھی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ حضرت سید شاہ غلام حسین داناپوری کے مکاتیب میری نگاہ سے گذرے ہیں جو یقینی طور پر ان کی ادبی صلاحیت کے ثبوت ہیں۔

۹ حضرت شمس الدین حسین داناپوری۔ شعری ذوق رکھتے تھے، زبان فارسی میں اپنے نواسہ عطا حسین فانی کی ولادت پر قطعہ کہا تھا جو موجود ہے، یہ قطعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دیگر اعزہ واقربا کے لیے بھی مواقع پر قطعات کہے ہوں گے لیکن جس جس کے لیے قطعات کہے گئے، وہ حضرت فانی کے جیسے قدر دان نہیں سنبھال رکھتے ان کی ایک تصنیف "تالیف الفوائد" چند فارسی اشعار، مکتوبات کا مجموعہ اور دست خاص کی لکھی چند کتابیں خانقاہ منعمیہ قمریہ میتن گھاٹ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

۱۰ حضرت وحید الدین احمد: ادبی ذوق باضابطہ رکھتے تھے، شعری ذوق کا کوئی ثبوت تا ایں دم تحریر نہ ملا۔ ان کی مشہور تصنیف "رسالہ در نسب داناپور" اپنے موضوع پر نادر روزگار ہے، صاحب کنز الانساب نے اس بھرپور استفادہ کیا ہے۔ یہ رسالہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں داناپور کے ضمن میں صوفیائے بہار کا بھی تذکرہ مختصر لیکن جامع ہوا ہے۔ اب تک تحقیق کے مطابق اس کا واحد قلمی نسخہ مصنف کے دست خاص کا نوشتہ خانقاہ منعمیہ قمریہ میتن گھاٹ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۱ حضرت حکیم مراد علی: صاحب تصنیف و تالیف تھے، شعری ذوق بھی تھا مکتوبات کا مجموعہ میری نگاہ سے گذرا ہے، اور اوراد و وظائف اور نسخہ جات و عملیات دست کے خاص کے لکھے ہوئے کتب خانہ خدا بخش میں موجود ہیں۔ میں نے اس سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ایک بیاض اشعار بھی ملتی ہے، ان کے علاوہ چند غزلوں پر مشتمل ایک بیاض خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے کتبخانہ میں ہے جو حضرت حکیم مراد علی کے دست خاص کی نوشتہ ہیں۔" اب جن بزرگان داناپور کا تذکرہ آتا ہے ان کی نثری و شعری خدمات کسی قدر اوراق پارینہ میں محفوظ رہ سکی ہے، نہایت تحقیق و تلاش کے بعد جو کچھ بھی نمونے دستیاب ہوسکے ہیں وہ یکے بعد دیگرے مختصر احوال زندگی کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں" ص ۵۵ تا ۵۶ دیکھتے کیا اب جن بزرگوں کا نمونہ پیش ہو رہا ہے وہ کتنے تلاش و تحقیق کے بعد مصنف کو حاصل ہوا ہے۔

(۱۲) حضرت میر سید شاہ قمر الدین ابوالعلائی داناپوری الملقب بہ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ

(۳۹) " ۱۹ شعبان المعظم ۱۲۵۵ھ کو واصل بحق ہوئے۔۔۔۔ آپ کی مشہور تصنیف جواہر الانوار ہے جس میں اپنی ابتدائی حالت اس طرح لکھی ہے" ص ۵۵

(الف) کنز الانساب اور کیفیت العارفین میں تاریخ وصال ۲۰ شعبان ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ شب بست اور روز بست یکم کو صاحب وصال کا عرس ہوتا ہے (ب) جواہر الانوار کی پوری عبارت کا ترجمہ

مصنف نے تذکرہ الکرام سے نقل کیا ہے اپنی کوئی محنت وکاوش نہیں کی۔ پتہ نہیں جواہر الانوار کا نسخہ مصنف نے
دیکھا بھی ہے یا نہیں۔ (ج) مصنف نے حضرت قمرالدین کی صرف اس تصنیف کا تذکرہ کیا ہے جو طبع تو نہیں ہوئی
لیکن مقبولیت اس کی مطبوعہ کتابوں سے بھی بڑھ گئی ۔ تا دم تحریر مجھے ہندوستان کے مختلف گوشوں میں جواہر الانوار
کے دس قلمی نسخوں کا علم ہے، بہار کی اکثر خانقاہوں میں جواہر الانوار سجادگان کے مطالعہ میں رہی ہے (د) مصنف کو
حضرت قمرالدین کی دیگر تصنیفات کا علم نہیں ہے۔ جواہر الانوار کے علاوہ فایض البرکات (ملفوظ خواجہ سید شاہ ابوالبرکات)
رسالہ مرشدی (ملفوظ حکیم شاہ فرحت اللہ کریم چکی) شرح رباعیات جامی، مجموعہ مکاتیب اور چند فارسی اور اردو غزلیں
آپ کی خانقاہ منعمیہ قمریہ میتن گھاٹ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ فایض البرکات اور رسالہ مرشدی کے نسخے
خانقاہ عمادیہ منگل تالاب، خانقاہ بلخیہ رائے پورہ فتوحہ، خانقاہ منعمیہ ابوالعلائیہ رام ساگر گیا، خانقاہ سجادیہ شاہ ٹولی
داناپور کے کتب خانوں میں بھی موجود ہیں۔

(۱۳) حضرت سید شاہ مبارک حسین نقشبندی ابوالعلائی داناپوری قدس سرہٗ

(۳۹) "مشہور تاریخ گو حضرت یحییٰ عظیم آبادی کو آپ سے بیعت وخلافت تھی۔۔ حضرت یحییٰ نے آپ
کا تخلص خواہش لکھا ہے" ص ۵٦

(الف) یحییٰ عظیم آبادی کو بیعت اپنے والد حضرت خواجہ شاہ وجہ اللہ قمری ابوالعلائی المتخلص بہ فرحت
عظیم آبادی سے تھی اور تعلیم واسترشاد وخلافت حضرت مبارک حسین سے تھی۔ (ب) تعجب ہے حضرت یحییٰ عظیم آبادی
سے مصنف کو خواہش تخلص کا علم ہوا یہ تو بہت مشہور تخلص ہے صاحب کنز الانساب نے اپنی طویل مثنوی (مطبوعہ)
"سر حق" میں بھی ذکر کیا ہے۔ مصنف نے سر حق کو دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے (ج) مصنف نے حضرت مبارک حسین کا صرف
ایک شعر تذکرۃ الکرام سے نقل کیا ہے بس۔ حضرت شاہ مبارک حسین المتخلص بہ خواہش کی تصنیف 'شرح رباعیات
حضرت ابوسعید ابوالخیر اور چند مثنویاں دست خاص کی لکھی ہوئی خانقاہ میتن گھاٹ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔
اس کے علاوہ مجموعہ مکاتیب، دو سفینے اور دست خاص کی نوشتہ نہایت ہی پاکیزہ خط میں مکمل مثنوی مولانا روم
سکندر نامہ، مظہر الآثار، الہامات منعمی، دیوان سرکار غوث پاک وغیرہ بھی کتب خانہ خانقاہ منعمیہ قمریہ میتن گھاٹ میں
موجود ہیں۔ صاحب تذکرۃ الصالحین مولوی حبیب اللہ عمادی نے آپ کے اردو دیوان کا بھی تذکرہ کیا ہے،
لیکن وہ میری نگاہ سے نہیں گذرا۔

(۳۶) حضرت شاہ سید محمد قاسم ابوالعلائی داناپوری قدس سرہٗ

(۴۰) "آپ کی ولادت ۱۲۱۸ھ میں داناپور میں ہوئی .. آپ کے خاندان میں کسی نے انگریزی نوکری آپ سے پہلے نہیں کی" ص۵۹

(الف) حضرت شاہ اکبر داناپوری نے نذر محبوب میں اور نثار اکبرآبادی نے دیباچہ دل میں ۱۲۱۸ھ لکھا ہے لیکن حضرت شاہ عطا حسین فانی داناپوری کنز الانساب میں فرماتے ہیں: "بعمر شصت و پنج سالگی کردند انتقال بسال یکہزار و دوصد ہشتاد و یک ہجری بروز پنجشنبہ" ص۲۸۴ اس لحاظ سے سن ولادت ۱۲۱۶ھ اخذ ہوتا ہے۔ اور حضرت فانی داناپوری کیفیت العارفین میں فرماتے ہیں جس کی کتابت حضرت فانی کے اکبرآباد میں قیام کے دوران خود حضرت شاہ قاسم داناپوری نے فرمائی تھی: "الحال کہ عمر شریف حضرت سید الطریقت بہ چہل و ہشت سال رسیدہ" کیفیت العارفین ۱۲۶۴ھ میں مکمل ہوئی اور مختلف مقامات پر الحال سے ۱۲۶۴ھ مراد ہے۔ اس لحاظ سے بھی سن ولادت حضرت شاہ قاسم ۱۲۱۶ھ برآمد ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اس اختلاف کا کوئی علم نہیں تھا حالاں کہ انہوں نے کنز الانساب اور کیفیت العارفین کو کتابیات میں شامل کیا ہے (ب) آپ کے خاندان سے کیا مراد ہے، حضرت شاہ تراب الحق مودودی ثم داناپوری (والد شاہ قاسم) کا خاندان یا شاہ غلام حسین داناپوری (نانا شاہ قاسم) کا خاندان؟ اگر ننہالی خاندان مراد ہے تو حضرت شاہ قاسم سے پہلے حضرت شاہ وحید الدین احمد داناپوری الہ آباد میں سررشتہ دار اور حضرت شاہ سلطان احمد داناپوری چھپرہ میں ناظر کے عہدہ پر ملازمت میں تھے۔ اور اگر والد کا خاندان مراد ہے تو مجھے تفصیلی حالات نہیں مل سکے ہیں۔

(۴۱) تصنیفات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں: " اعجاز غوثیہ کہ تذکرہ حضرت سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے انوار قمریہ کہ جس میں ارشادات و احوال اپنے حضرت پیر و مرشد اعلیٰ حضرت میر قمر الدین حسین قدس سرہ کے لکھے ہیں اور انشائے فرمان علیم کہ زبان فارسی سلیس میں مرقوم ہے اور چراغ مکتب ہے" ص۵۹

اعجاز غوثیہ اور نجات قاسم تو چھپ چکی ہے، نجات قاسم دو بار چھپ چکی ہے، لیکن مصنف کو انوار قمریہ، انشائے فرمان علیم اور چراغ مکتب کے بارے میں ذاتی جانکاری دینا چاہیے تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تینوں غیر مطبوعہ تصانیف کا مصنف نے صرف نام سنا ہے۔ انوار قمریہ ـــــ حضرت شاہ ظفر داناپوری سجادہ نشین خانقاہ سجادیہ داناپور نے اپنی تصنیف تذکرۃ الابرار میں انوار قمریہ کے اپنے کتب خانہ میں موجود ہونے کے بارے میں لکھا ہے لیکن حضرت شاہ ظفر صاحب کے صاحبزادوں سے مجھے اس سلسلے میں کوئی واضح جواب نہ مل سکا۔ واللہ اعلم یہ تصنیف بزبان فارسی ہے یا اردو کہیں اسکا اقتباس بھی میری نگاہ سے نہیں گذرا۔

انشائے فرمان علیم: اس کا ایک نسخہ خانقاہ منعمیہ ابوالعلائیہ رام ساگر گیا کی ملک ہے مصنف نے اس تصنیف کو

دیکھنے کا دعویٰ نہیں کیا تو پھر یہ کیوں کر لکھا کہ فارسی سلیس میں مرقوم ہے۔ مجھے اس وقت یاد نہیں کہ خانقاہ گیا والا نسخہ بخط مصنف ہے یا اس کی نقل لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ ایسی تحریر اس میں موجود ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ رسالہ حضرت قاسم نے نینی تال میں اپنے قیام کے زمانہ میں تصنیف کیا تھا۔ "چراغ مکتب" : اس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔ نام سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شاید بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے کوئی رسالہ تصنیف کیا ہو۔

(۴۲) مکتوبات حضرت قاسم داناپوری کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اکبر داناپوری کی مختلف تصانیف میں حضرت قاسم کے ایک دو مکتوب دیکھنے میں آئے ہیں۔ کیفیت العارفین کے حاشیہ پر شاہ حسین الدین صاحب نے بھی ایک مکتوب نقل کیا تھا جو حضرت قاسم نے سوہاگی گھاٹ سے حضرت حکیم شاہ مظہر حسین کریم چکی کے وصال پر لکھا تھا۔

(۴۳) مصنف نے حضرت قاسم کے گیارہ اشعار نقل کیے ہیں یہ تمام اشعار حضرت قاسم کی مطبوعہ تصنیف "نجات قاسم" سے ماخوذ ہیں۔ پیش کردہ پہلے پانچ اشعار نجات قاسم میں ابیات کی سرخی سے طبع ہوئے ہیں — یہ دراصل پانچ اشعار پر مشتمل ایک مختصر سی نعت ہے تخلص استعمال نہیں ہوا ہے اور نہ حضرت قاسم نے ابیات کے بعد مولفہ لکھا ہے لہٰذا یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ آیا یہ اشعار حضرت قاسم کے اپنے ہیں یا انہوں نے کہیں سے نقل کیا ہے ؎

الٰہی مجھے عشق احمد کا دے — مرے سر میں سودا محمد کا دے
دکھا دے جمال اپنے محبوب کا — جو شافع ہے میرا بروز جزا
میں واری ہوں ایسے شہنشاہ کے — مثال چکور اپنے اوس ماہ کے
کروں عرض یوں ہاتھ اپنے اٹھا — علیک الصلوٰۃ اے نبی الورا
اگر دعوتم رد کنی ور قبول — من و دست و دامان آل رسول

دوسرے حصے میں پیش کردہ چار اشعار مطبوعہ نجات قاسم میں موجود تیرہ اشعار پر مشتمل منقبت سے ماخوذ ہیں۔ دراصل یہ منقبت ہے جو سیدنا امیر ابوالعلیٰ اکبرآبادی کی شان میں کہی گئی ہے اور اشعار کی سرخی لگائی گئی ہے آخری شعر سے قبل والے شعر میں تخلص قاسم استعمال ہوا ہے اور چوں کہ تمام اشعار ایک ہی ردیف اور قافیہ میں ہیں اس لیے قیاس قوی ہے کہ یہ تمام اشعار بشکل منقبت حضرت قاسم کے ہی ہیں۔ حضرت قاسم کے اشعار مصنف کو لگ بھگ کچھ بھی نہ مل سکے ہیں اور ۱۳ اشعار پر مشتمل ایک منقبت ملی بھی تو مصنف نے اس پوری منقبت سے صرف چار شعر منتخب کیا تعجب ہے ملاحظہ ہو پوری منقبت ؎

پیر میرا ابوالعلا نام پر اس کے ہوں فدا — زبدۂ خیل اتقیا قدوۂ جملہ اولیا

قطب زمین زمان ہے وہ مرشد مرشدان ہے وہ — رہبر کاملان ہے وہ عاشق صادق خدا
اختر برج مصطفیٰ گوہر درج مجتبیٰ — چشم و چراغ مرتضیٰ شمع جمال اصفیا
عکس رُخ نبیؐ کا ہے آئینہ وہ علی کا ہے — والی وہ ہر ولی کا ہے مظہر خاص کبریا
شیر خدا کے دل کا چین فرحت خاطر حسینؑ — زین عباد کا نور عین عارفوں کا وہ مقتدا
سرو چمن عبید کا ثانی وہ ہے جنید کا — رافع ہے مکر و کید کا دافع درد اور بلا
گلبن باغ نقشبند خواجہ معین کا دل پسند — باعث فخر اہل ہند مرجع شاہ اور گدا
راحت جان چشتیاں بیشتر و بہشتیان — ہادی ہر گنشتیاں مرشدنا ابوالعُلا
فیض جو اس کا عام ہے سب کا یہی کلام ہے — میرے امیر الغیاث بارگہ سے ہوں دوتا
اب نہ پھرول میں دربدر اے میرے شاہ نامور — نیم نگہ ادھر بھی کر دیدے ہمارا مدعا
قاسم زار و ناتواں ننگ ابوالعلائیاں — جاوے تو جاوے اب کہاں آقا تو اس کا تو ہوا
تیرے فقیر کی دعا ہے یہی صبح اور مسا — اپنے غلام کا سدا حامی رہے ابوالعُلا

اور تیسرے حصے میں مصنف نے حضرت قاسم کے دو شعر نقل کیے ہیں، جو نجات قاسم میں منظوم شجرۂ نقشبندیہ ابوالعلائیہ کے آخری اشعار ہیں۔ یہ پورا شجرہ بقول حضرت قاسم "محمود شاہ برکاتی ابوالعلائی" کا منظوم کردہ ہے اور حضرت قاسم نے اس شجرہ میں صرف یہ دو شعر اپنے کہے ہوئے شامل کر دیے ہیں ؎

قمر دین غوث و قطب زمان — کیجیے مجھ کو صاحب عرفان
یہ تمہارا غلام قاسم ہے — گو کہ بدکار اور آثم ہے

اعجاز غوثیہ بزبان اردو شاہ قاسم داناپوری کی مشہور تصنیف ہے، اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، کسی کسی اڈیشن میں تو مصنف کا نام بھی نہیں ہے، اس میں کئی منقبت در شان غوث پاک شامل ہیں اکثر کسی نیاز کی منقبتیں ہیں لیکن ص ۴۴ پر ایک حکایت منظوم ہے چوں کہ تخلص استعمال نہیں ہوا ہے اور کوئی واضح اشارہ اور وجہ نہیں ہے اسے حضرت قاسم کے ذریعہ منظوم کیا گیا سمجھا جائے مطلع نقل کرتا ہوں اس کے چودہ اشعار ہیں ؎

اس طرح ہے سفینہ میں لکھا — قصہ غوث پاک کا اے باوفا

(۱۵) حضرت سید شاہ محمد واجد ابوالعلائی داناپوری المتخلص بہ پریشاں[۴۴]

---

(۴۴) "آپ کو اکثر علوم و فنون اور خصوصاً شاعری میں ملکہ حاصل تھا حضرت شاہ عطا حسین فانی اور حضرت سیّد

سید قدس سرہما ابن حضرت شاہ فرید الدین قدس سرہٗ فن شعر میں آپ ہی کے شاگرد تھے" ص ۶۰

(الف) حالاں کہ حضرت شاہ اکبر داناپوری لکھتے ہیں: "گو حضرت سید شاہ محمد واجد قدس سرہ کا سرمایہ علم رسمی بہت زیادہ نہ تھا مگر بیان اور حالت ان کی نہایت سریع الاثر تھی" ص۱۵ تاریخ عرب اور حضرت فانی داناپوری نے بھی کیفیت العارفین میں لکھا ہے "واضح باد سید الشاغلین (شاہ واجد) از تحصیل علم ضروریہ فارغ گشتہ بہرہ وافی در فنون ظاہری برداشتند.... صنعت دست بسیار اند" ص ۲۸۲ لہٰذا مصنّف کو اپنے جملے کی اصلاح کرنی چاہیے اور علوم کے بجائے فنون میں مہارت پر زور دینا چاہیے (ب) حضرت فانی داناپوری مصنّف کنز الانساب و کیفیت العارفین نے اوایل میں ان سے اپنے اشعار پر اصلاح لی تھی خود فرماتے ہیں: "شعرہائے میگویند چنانچہ راقم نیز در اوایل اصلاح شعر از سید الشاغلین (شاہ محمد واجد) گرفتہ بود" ص ۲۸۲ ک ع اور حضرت سید حسین سید داناپوری کو حضرت واجد داناپوری کا شاگرد بلخی نے تاریخ شعرائے بہار جلد اول ص ۱۱۴ پر لکھا ہے، مصنّف کو اس کی وضاحت کرنی تھی کیوں کہ سوائے بلخی کے یہ اطلاع اور کہیں نہیں ہے۔ مصنّف نے حضرت واجد کے پانچ اشعار نقل کیے ہیں تین شعر تذکرۃ الکرام سے اور دو شعر بلخی سے ان اشعار کے علاوہ مصنّف نے پانچ اشعار پر مشتمل ایک ہندی ٹھمری بھی نقل کی ہے یہ ٹھمری انھوں نے کہاں سے نقل کی ہے، اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس ٹھمری کے علاوہ تین غیر مکمل مصرع بھی کسی کرم خوردہ کاغذ سے نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کے بارے میں مصنّف کا دعویٰ ہے کہ دست خاص کا نوشتہ ہے۔ یہ کرم خوردہ کاغذ کہاں ہے اس کی کوئی وضاحت مصنّف نہیں کرتے ہیں۔

(۱۶) حضرت سید شاہ محمد سجاد ابو العلائی داناپوری متخلص ساجد

(۵۴) "تاریخ ولادت ۲۱ رجب المرجب ۱۲۲۱ھ "مظہر عجائب" سے تاریخ ولادت نکلتی ہے .... مزار آپ کا حلقہ خانقاہ شریف داناپور مقبرۂ اجداد میں واقع ہے" ص ۶۲

(الف) مظہر عجائب سے مصنّف تاریخ ولادت نکال کر دکھائیں گے؟ میں نے بہت کوشش کی لیکن اس سے تو سال ولادت اخذ ہوتا ہے (ب) حلقہ خانقاہ شریف داناپور کی مصنّف کو تشریح فرمانی تھی اس لیے کہ ماشاء اللہ شاہ ٹولی داناپور میں کئی خانقاہیں موجود ہیں ویسے مصنّف کے والد کچھ اور ہی فرماتے ہیں "۱۴ ذیقعدہ ۱۲۹۸ھ کو رحلت فرمائی حضرت شاہ شمس الدین حسین قدس سرہ کے حلقہ میں آسودہ ہوئے" (خزینۃ الانوار ص) مصنّف نے حضرت ساجد کے ۱۴ اشعار نقل کیے ہیں، پہلا دو شعر تذکرۃ الکرام سے نقل کیا گیا ہے، اس شعر کو اکبر داناپوری نے بھی اشرف التواریخ حصہ اوّل میں نقل کیا ہے اور بقیہ بارہ اشعار مصنّف نے کہاں سے نقل کیے؟ کوئی وضاحت

نہیں کی بہرحال یہ مصنف کی اپنی محنت ہے جس کے لیے وہ قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے کسی طرح ان اشعار کو پھر زندگی بخشی ویسے انہیں اپنا ماخذ ضرور لکھنا چاہیے تھا۔ مصنف نے اپنے پیش کردہ اشعار میں یہ دو شعر بھی پیش کیے ہیں ؎

جو بیمار عشق جمال علی ہے ۔۔۔ نجف کو وہ دار الشفا جانتا ہے
یہ ساجد تعشق علی ولی کا ۔۔۔ طفیل شہ کربلا جانتا ہے

اس زمین میں حضرت ساجد کی ایک پوری منقبت مجھے حضرت غفور الرحمٰن حمد کا کوی (شاگرد حضرت اکبر داناپوری) کی بیاض سے ملی جسے نقل کرتا ہوں ؎

صفات علی کوئی کیا جانتا ہے ۔۔۔ مری جان یا دل مرا جانتا ہے
غلام علی کو یہ قدرت ہے حاصل ۔۔۔ کہ بندے سے مولا بنا جانتا ہے
ہمارا مرض عشق روئے علی ہے ۔۔۔ مسیحا کب اس کی دوا جانتا ہے
مسیحا نے پایا جو شان علی میں ۔۔۔ غلام اس کا مردہ جلا جانتا ہے
یہ ساجد تعشق علی ولی کا ۔۔۔ طفیل شہ کربلا جانتا ہے

حضرت علی علیہ السلام سے حضرت سجاد ساجد کو عشق تھا اکثر حضرت علی کی شان میں منقبت اور رباعی کہا کرتے تھے۔ ایک منقبت حضرت علی کی شان میں حضرت حمد کی بیاض میں مجھے اور ملی ملاحظہ ہو ؎

خدا کے شان شاہاں علی ہے ۔۔۔ نبی کا جسم ہے اور جاں علی ہے
نہ کیوں ہو گھر مرا مسجود عالم ۔۔۔ ہمارا ان دنوں مہماں علی ہے
مسیحا کی عبث منت اٹھاؤں ۔۔۔ ہمارے درد کا درماں علی ہے
خدا گر مجھ سے پوچھے اسم اپنا ۔۔۔ تو بے شک میں بتاؤں ہاں علی ہے

اور حضرت علی کے فضائل و مناقب میں ایک مدلل کتاب "فضل صفدری" ۱۸۷۷ء میں پھلواری شریف خانقاہ سے متعلق کسی حضرت کی تصنیف شائع ہوئی تھی، اس کا ایک مطبوعہ نسخہ میتن گھاٹ خانقاہ کے کتب خانہ میں میری نگاہ سے گذرا تھا اس میں بھی حضرت شاہ سجاد صاحب داناپوری کے چند اشعار درشان حضرت علی شامل تھے افسوس کہ وہ کتاب فی الحال میرے سامنے نہیں ہے ورنہ وہ اشعار بھی نقل کرتا۔ حضرت شاہ کبیر صاحب عرفان داناپوری اپنی غیر مطبوعہ تصنیف تذکرۃ الکبیر فی اخبار البشیر میں بھی حضرت ساجد کے ذوق شعری کی جانب واضح اشارہ فرماتے ہیں ؎

نیز او شاعر پاکیزہ بود در اردو ۔۔۔ غزل او ز حقائق و معارف مملو

حضرت شاہ غفور الرحمٰن حمد کاکوی جو حضرت ساجد داناپوری کے مرید و خلیفہ اور اکبر داناپوری کے شاگرد تھے "آثار کاکو" میں فرماتے ہیں: "آپ بوقت فرصت کبھی کبھی کچھ اشعار و رباعیاں فارسی اور اردو میں فرمالیتے تھے آپ کا تخلص ساجد تھا اکثر وجدانہ کیفیت میں برسر مجلس کوئی شعر یا مصرعہ زبان مبارک سے نکل پڑتا تھا کہ جس کو عزیزان یاد کر لیتے تھے اور بعد ختم مجلس کے عرض کرتے تھے کہ حضور نے یہ شعر، یہ مصرعہ فرمایا ہے اس میں غزل مرتب کردی جائے تو عزیزوں کی خاطر اور دلداری کے خیال سے فرما دیتے تھے۔ کچھ مسودہ آپ کے کلام کا تھا۔ جس کو کسی عزیز خاص نے ضائع کر دیا۔ حضرت سیدنا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے عرس کی مجلس سماع قائم تھی۔ حضور کو وجد طاری ہوا اسی حالت میں یہ مصرعہ زبان مبارک سے فرمایا ؏

فنائے ذات علی ہوں عجب مقام میں ہوں

بعد کو عزیزوں کے اصرار سے غزل تمام کردی" ص ۵۶ (قلمی) افسوس مجھے یہ غزل اب تک نہ مل سکی ہے۔

(۱۰) حضرت سید شاہ عطا حسین فانی چشتی داناپوری قدس سرہٗ

(۴۶) "۱۲۶۰ھ میں جب کہ آپ کی عمر ۲۹ برس کی تھی آپ اولیا و اقطاب کی درگاہوں پر حاضری کی غرض سے عازم سفر و سیاحت ہوئے اور شاہ آباد، بنارس، قنوج، اکبر آباد، شاہ جہاں آباد، مندسور، جاورہ، مئو بمبئی وغیرہ مقامات کی سیر کی، اور ایک سفرنامہ مرتب کیا جس میں احوال و مشاہدات عجائب و غرائب کا تفصیلی ذکر تھا۔ افسوس وہ کتاب اس خاندان میں محفوظ نہ رہی اس کے کچھ حصے کتابوں میں درج ہیں جس سے ان کی زبان و بیان کا اندازہ ہوتا ہے" ص۶۵

(الف) شاہ حسین الدین احمد منعمی گیاوی حضرت فانی کی تصنیف کیفیت العارفین کے ضمیمہ میں فرماتے ہیں: "کتاب نمبر ۳ احوال و واقعات سفر حج نام دید مغرب تھا اور اس کے تین حصے تھے پہلا حصہ سیر ہند۔ دوسرا زائر عرب۔ تیسرا مراجعت۔ پہلے کا کچھ جزو موجود ہے بقیہ کا پتہ نہیں کوئی صاحب اسی زمانہ میں لے گئے اور واپس نہ ہو سکی" ص ۱۴، ۱۵ (ب) مصنف کو شاید یہ معلوم نہیں کہ صوبہ بہار کے اردو ادب میں یہ سفرنامہ بڑی اہمیت کا حامل ہے سب سے قدیم ترین صرف دو سفرناموں کا بھی نام لیا جائے تو ان میں سے ایک حضرت فانی کا سفرنامہ ہوگا اور بعضوں نے تو اسے صوبہ بہار میں اردو کا اولین سفرنامہ لکھا ہے۔

(۴۷) "آپ اپنے سکونتی مکان واقع محلہ رام ساگر گیا کی ایک کوٹھری میں کہ اب خانقاہ منعمیہ ابوالعلائیہ کے نام سے مشہور ہے آسودہ ہوئے۔" ص۶۶

محلہ رام ساگر گیا کی قیام گاہ حضرت فانی کی پوری اراضی کو سرکاری سڑک دو حصوں میں منقسم کرتی ہے سڑک سے اتر حضرت فانی کا حجرہ خاص تھا اور رشد و ہدایت کے لیے مریدین و مسترشدین کے ایک بڑے حلقے سے ہمیشہ آباد رہتا تھا۔ اس کے علاوہ سڑک سے دکھن زنانہ مکان اور مکان سے پچھم کھلا میدان اور پھر مسجد اور ایک چھوٹی سی خلوت، حضرت فانی اپنے وصال کے بعد اپنے حجرے میں جہاں سے انھوں نے تقریباً انچاس سال فریضۂ رشد و ہدایت انجام دیا تھا، دفن فرمائے گئے اور ان کے حجرے کی وہ عمارت اسی مصرف میں آج تک آتی ہے جسے حضرت فانی کی نسبت اور طریقۂ تعلیم کی وجہ کر خانقاہ منعمی ابوالعلائی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

(۴۸) " اب چند اشعار غزل و مثنوی کے بھی ملاحظہ ہوں ؎

جلوہ حق جو پھر نظر دیکھا — عین در صورت قمر دیکھا
فرحت افزا نہ ہوئے کیوں کر دل — آپ کو جب بچشم تر دیکھا
جب سے دیکھا ہے آپ کو فانی — غیر کو پھر نہ آنکھ بھر دیکھا (کنز الانساب ص[۲۱])

یہ غزل کے پیرایہ میں منقبت ہے، حضرت فانی کا اشارہ اپنے مرشد سید شاہ قمر الدین حسینؒ کی طرف ہے کنز الانساب میں یہ منقبت مکمل طبع ہوئی ہے اور ۹ اشعار پر مشتمل ہے، مصنف نے اس میں سے صرف تین شعر لیے ہیں، حضرت فانی کی اور کوئی دوسری مکمل تخلیق ان کے پاس نہ تھی اور ملی بھی تو بجائے اسے مکمل پیش کرنے کے صرف تین اشعار چن لیے گئے بقیہ اشعار نقل کرتا ہوں ؎

مرتبہ فقر و شان شاہی میں — ایسا کوئی نہیں بشر دیکھا
ان کے در کی ہے گدائے جو — بخشے ان کو سیم و زر دیکھا
جس کے اوپر پڑی نگاہ فیض — اس کو مدہوش و بے خبر دیکھا
ان میں برکات کی ہوں پاتا بو — باعث عشق یہ اثر دیکھا
منعمی اپنے تئیں ہیں کہتے لوگ — اون سا منعم نہ کوئی بشر دیکھا
نہ آئیں گے میری جائے تن — اس کو ہر بار غور کر دیکھا

فانی داناپوری کے اردو دیوان میں یہ منقبت شامل ہے لیکن ہلکے سے فرق اور ایک فاضل شعر کے ساتھ۔ اس منقبت کے اشعار کے بعد مصنف نے فانی داناپوری کی مثنوی "سر عطا" سے چند اشعار کو نقل کیا ہے یہ اشعار شاہ حسین الدین احمد منعمی گیاوی فانی کے پر پوتے اور جانشین نے کیفیت العارفین کے ضمیمے اور تذکرۂ فانی میں اقتبا

اور نمونتاً پیش کیے ہیں وہیں سے مصنّف نے نقل کیا ہے ۔ مصنّف نے فانیؔ داناپوری کی ایک اور مثنوی "سرحق" کے قلمی نسخے کو دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس کے اشعار نمونتاً نہیں پیش کیے ہیں ۔

(۱۸) حضرت سید شاہ محمد وزیر ابوالعلائی داناپوری قدس سرہٗ

مصنّف نے شاہ وزیر صاحب عطاؔ داناپوری کا کلام تذکرہ مسلم شعرائے بہار سے نقل کر دیا ہے اور مزید کوئی اطلاع فراہم نہیں کی ہے ۔

(۱۹) حضرت سید شاہ محمد کبیر ابوالعلائی متخلص بہ عرفاںؔ داناپوری

(۴۹) "آپ نے دو رسالے فقہ اور علم کلام میں لکھے تھے جن کا نام علی الترتیب تاج فقیہہ اور عقائد وجیہہ تھا یہ دونوں رسالے طبع بھی ہو چکے ہیں مگر اب نایاب ہیں" ص ۶۹

مصنف کو ان دونوں رسالوں کا علم کبیر داناپوری کی تصنیف تذکرۃ الکرام سے ہوا ہے، مصنّف نے ان کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے. خانقاہ میتن گھاٹ میں یہ دونوں رسالے موجود ہیں۔ یہ دونوں رسالے منظوم ہیں ملاحظہ ہو چند اشعار عقائد وجیہہ مطبوعہ در مطبع بہار ایرن فیکٹری ۱۳۰۱ھ

بعد حمد خدا و نعت نبی — گوش دل سے سنیں اب اس کو سبھی
کہ ہے اوّل فریضہ عاقل پر — جو کہ پہنچے بلوغ کامل پر
کہ دل اور جان سے قبول کرے — بعد اس کے زبان سے بھی کہے
. . . .
میں نے حسب عقائد حامے — یہ عقاید وجیہہ ہے لکھی
کر کے عرفاںؔ یہاں عقیدہ تمام — بھیج احمد پہ تو درود و سلام

اور تاج فقیہہ یوں شروع ہوتا ہے ۔

لائق حمد ذات باری ہے — جس سے یہ ممکنات ساری ہے
ذات اس کی ہے واحد و یکتا — ہے عدد اور شمار سے بالا
پاک تشبیہہ سے ہے ذات اس کی — صاف تنزیہ سے صفات اس کی

اور یوں اختتام کو پہنچتی ہے

کر کے عرفاںؔ یہاں کتاب تمام — بھیج احمد پہ تو درود و سلام
ہے مکان فقیر داناپور — ہو سدا جس پہ فضل رب غفور
سال تالیف ایں مسائل دیں — گشت زیبا بہار شرع متین

۱۲۹۸ھ

اس رسالے میں حضرت شاہ اکبر داناپوری کا کہا ہوا قطعہ تاریخ در زبان فارسی بھی شامل ہے جو انہوں نے اس رسالے کے طبع پر کہا ہے۔ مصنف نے عرفان داناپوری کا کلام گلدستہ بہار اور نسیم داناپور سے نقل کیا ہے اس کے علاوہ انہیں اور کہیں سے کوئی کلام نہ مل سکا۔

(۲۰) حضرت سید شاہ محمد امین نقشبندی ابوالعلائی متخلص بہ حرماں داناپوری

(۵۰) "آپ فرزندار جمند و مرید خلیفہ و جانشین حضرت سید شاہ محمد واجد نقشبندی ابوالعلائی قدس سرہ کے تھے" صلے

حضرت شاہ عطا حسین فانی نے کنز الانساب میں حضرت امین کو اپنے والد کا صرف مرید لکھا ہے، حضرت اکبر داناپوری نے انہیں اپنے والد سے بیعت و اجازت کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کی جانشینی کے بارے میں تو کچھ نہیں لکھا۔ حضرت شاہ امین حضرت شاہ واجد کے محل ثانی سے تھے اور حضرت واجد کے محل اولیٰ سے بڑے بیٹے حضرت شاہ وزیر عطا داناپوری موجود تھے۔ حضرت شاہ کبیر داناپوری نے اپنی تصانیف میں کہیں بھی اپنے حقیقی دادا شاہ واجد صاحب کی سجادگی کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ حضرت شاہ عطا حسین فانی کیفیت العارفین میں فرماتے ہیں "حالاں کہ عمر شریف بہ سی و نہ سالگی رسیدہ بہ تجارت مشغول اند ظاہراً بمسند رشد نہ نشستند" ہم عصر تذکرہ نگاروں میں سے کسی کو حضرت واجد کی سجادگی کا علم نہیں تھا، مکتوبات حضرت سید شاہ عبدالجلیل داناپوری ابوالعلائی (نواسہ حقیقی حضرت شاہ واجد از محل اولیٰ) میں مجھے ایک تفصیلی مکتوب کے مطالعہ کا موقع ملا جو انہوں نے جناب یوسف صاحب بلخی کو لکھا ہے، اس خط میں انہوں نے حضرت شاہ محمد واجد داناپوری کے قل و فاتحہ کے انتظام کے بارے میں لکھا ہے کہ ہر سال جناب شاہ وزیر علی اور ان کے بعد ان کے بیٹے جناب شاہ کبیر صاحب داناپوری کرتے ہیں۔

(۵۱) "وفات آپ کی ۵ شوال ۱۳۰۳ھ پچاسی سال کی عمر میں وقت عصر ہوئی اور اپنے والد ماجد قدس سرہ کے قریب مقام داناپور دفن ہوئے۔ قبلۂ اہل ولایت کعبۂ اہل شرف تاریخ وفات ہے" صلے

مصنف کو وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ یہ مصرع جس سے سال وفات (تاریخ وفات مصنف نے غلط لکھا ہے) برآمد ہوتا ہے، قتیل داناپوری کا کہا ہوا ہے جو انہوں نے وفات شاہ امین صاحب کے بہت دن بعد کہا ہے شاہ قائم صاحب قتیل داناپوری خزینۃ الانوار میں خود فرماتے ہیں "حضرت سید شاہ محمد امین قدس سرہٗ کی تاریخ وفات سال میں کاتب الحروف نے نظم کی ہے جو درج ذیل ہے۔"

باب دوم (د) دوسرے مراکز مثلاً بہار شریف، منیر شریف، پھلواری شریف وغیرہ کی خانقاہوں سے انکے تعلقات و مراسم

(۵۲) "صوبہ بہار میں خانقاہ داناپور منیر شریف اور بہار شریف کے بعد سب سے قدیم خانقاہ ہے" ص ۲۷

کیا مخدوم پیر جگجوت، آدم صوفی، چرم پوش، بدر الدین بدر عالم زاہدی، علیم الدین گیسو دراز نیتاپوری منہاج الدین راستی، داؤد قریشی قادری، مخدوم سیستانی مخدوم شعیب وغیرہ وغیرہ کی خانقاہیں جو مخدوم جہاں کے صاحب خانقاہ ہونے سے قبل یا اسی دور کی خانقاہیں ہیں باعتبار قدامت داناپور کے بعد شمار میں آتی ہیں؟ بقول مصنف کے والد قتیل داناپوری (م ۱۴۰۵ھ) حضرت میر سید مبارک حسین چشتی نظامی (المتوفی فی العصور ۷۹۰ھ) نے مخدوم جہاں کے وصال سے ۷۳ سال قبل داناپور میں خانقاہ کی تعمیر کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ مخدوم جہاں کے دور میں صوبہ بہار میں اب تک کوئی ایسی شخصیت کسی شیخ کی نہیں ہے جو خاص مخدوم جہاں کی شخصیت سے بے بہرہ ہو سوائے حضرت میر سید مبارک حسین چشتی نظامی (المتوفی فی العصور ۷۹۰ھ) بانی داناپور کے مصنف کا یہ دعوی جملہ اہل علم اور ذوق تحقیق رکھنے والوں اور بالخصوص تمام خانقاہوں کیلئے لمحۂ فکر اور دعوت اظہار حق ہے۔

(۵۳) "بزرگان داناپور کے تعلقات و مراسم ہر دور میں صوبہ بہار کی خانقاہوں سے مربوط و مضبوط رہے ہیں۔ حضرت مخدوم شعیب قدس سرہ جن کو پانچ سو برس کا زمانہ گذرا داناپور کا ذکر اپنے ملفوظات میں یوں فرماتے ہیں:۔

با بزرگان داناپور صحبت داشتم (دل ص ۱)

حضرت شاہ اکبر صاحب لکھتے ہیں: "حضرت مخدوم شعیب قدس سرہ ... اپنی تصنیفات میں تحریر فرماتے ہیں کہ اکثر اعزا و اقربا کی ملاقات کو داناپور جاتا تھا (نذر محبوب ص ۱)" ص ۲۷۔

(الف) مصنف نے اکبر آباد کے رہنے والے حضرت نثار مرید شاہ اکبر داناپوری کا مخدوم شعیب سے منسوب قول بغیر کسی چھان پھٹک کے نقل کر لیا ہے۔ نثار نے جو فارسی عبارت "دل" میں نقل کی ہے اور شاہ اکبر داناپوری نے جو اردو عبارت "نذر محبوب" میں پیش کی ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ شعیب نے الگ الگ دونوں باتیں کہی ہیں، اس لیے کہ شاہ اکبر صاحب کی اردو عبارت نثار کی فارسی عبارت کا ترجمہ نہیں ہو سکتی ہے۔ با بزرگان داناپور صحبت داشتم ——— نثار اکبر آبادی، میں اکثر اعزا و اقربا کی ملاقات کو داناپور جاتا تھا ——— اکبر داناپوری، مخدوم شعیب کا کوئی ملفوظ کہیں نہیں ہے، مکتوبات مخدوم شعیب قسم کی بھی کوئی تحریر نہیں ہے سوائے مناقب الاصفیا کے جو خود مختلف فیہ ہے؛ اور مناقب الاصفیا میں مخدوم شعیب نے داناپور سے متعلق ایسا کچھ نہیں کہا ہے۔ حضرت شاہ عطا حسین فانی منعمی کنز الانساب اور

کیفیت العارفین کو مخدوم شعیب کے داناپور سے متعلق اس جملہ کا کوئی علم نہیں تھا جبکہ داناپور سے متعلق فانی کے مقابلہ
میں کوئی دوسرا جانکار نظر نہیں آتا جس نے داناپور کو تفصیل و استناد کے ساتھ پیش کیا ہو۔ میں مصنف کی طرح ان دونوں
فارسی اعداد دو جملوں کے بارے میں بالکل خوش فہم نہیں ہوں ہاں اگر مصنف ایمانداری کے ساتھ ان جملوں کو
مخدوم شعیب کا قول ثابت کر دیں تو سر آنکھوں پر۔

(۴۵)" باب دوم کے (د) کا عنوان تو کافی لمبا اور جاذب نظر ہے، لیکن مصنف کا مواد کچھ کم ایک صفحے میں سمٹ
گیا ہے میں مصنف کے عنوان کا ہلکا سا جائزہ لیتا ہوں۔

بہار شریف: مخدوم جہاں سے ہر قدیم و جدید خانقاہ کو عقیدت ہے، لیکن کچھ خانقاہیں ایسی ہیں جہاں
مخدوم جہاں کے سلسلہ فردوسیہ کی اجازت نہیں پہنچی ہے۔ ان خانقاہوں سے مخدوم جہاں کا تعلق الفقراء کنفس واحد
کے معنی میں ہے یا پھر مخدوم کی علمی اور روحانی مسلم الثبوت شخصیت کی وجہ کر عقیدت کے معنی میں ہے ـــ اور
وہ خانقاہیں جہاں سلسلہ فردوسیہ کی اجازت ہے وہاں مخدوم جہاں بحیثیت یکے از پیران سلسلہ عقیدت کا مرکز ہیں۔
داناپور میں کون کون سلاسل طریقت کس کس زمانہ میں پہنچے اس کا علم مصنف کو ٹھیک سے نہیں ہے۔ اگر مصنف کے
والد قتیل داناپوری (م ۱۲۰۵ھ) کی تصنیف "اذکار الابرار" کو ہی تھوڑی دیر کے لیے تحقیق سے کنارہ کشی کرتے
ہوئے صبر و ضبط کا دامن تھامے ہوئے پیش کیا جائے تو بقول حضرت قتیل حضرت شاہ عبد المجید نو آبادی کے ذریعہ
پہلی بار حضرت جہانگیر ابن حضرت اکبر ابن حضرت عماد الدین ابن قاضی عبد الفتاح کو سلسلہ فردوسیہ کی اجازت
پہنچی۔ یعنی طریقت کا بھی باضابطہ تعلق گیارہویں صدی ہجری میں داناپور سے بہار شریف کا قائم ہوا۔ بہار شریف
کی خانقاہ مخدوم جہاں سے داناپور کے شاہ غلام حسین داناپوری یا ان کے اجداد کے درمیان کسی شادی بیاہ کا
کوئی علم مجھے آج تک نہ ہو سکا۔ اور بہار شریف کی دیگر خانقاہوں سے داناپور کا کیا تعلق تھا تو مصنف کس کس سنہ
میں ان خانقاہوں سے تعلق پیدا ہوا اس کی وضاحت ذمہ دارانہ انداز میں کریں۔

منیر شریف: منیر شریف میں صرف ایک خانقاہ ہے۔ اس خانقاہ مخدوم یحییٰ منیری (والد مخدوم جہاں
سے داناپور کی خانقاہ (شاہ اکبر صاحب کی خانقاہ سجادیہ مراد نہیں) سے کوئی واسطہ طریقت نہیں۔ داناپور سے اور منیر شریف
خانقاہ سے کسی بھی شادی بیاہ یا واضح رشتہ داری کا بھی مجھے تا ایں دم تحریر کوئی علم نہیں اگر مصنف کو اس کا علم تھا
تو صاف صاف لکھنا تھا۔ شاہ اکبر داناپوری کے خاندان اور خانقاہ سے منیر شریف کا بڑا قریبی تعلق رہا ہے۔ شاہ
صاحب تاج فقیہی شیخ زبیری تھے، اس لحاظ سے منیر شریف کے سجادگان اور شاہ اکبر کے اجداد و اخلاف ہم نسب ہیں

حضرت اکبر کے پردادا کے نانا شاہ سیف اللہ موڑوی مخدوم دولت منیری کے نواسے تھے۔ حضرت اکبر کے چچا اور پیر و مرشد شاہ قاسم حسب وصیت پائیں مخدوم منیری میں دفن ہوئے۔ شاہ محسن صاحب پسر و سجادہ شاہ اکبر کی دوسری شادی منیر شریف خانقاہ میں ہوئی وغیرہ وغیرہ۔

پھلواری شریف: پھلواری شریف کے قدیم بزرگان (جن کی جانب مصنف کی نگاہ نہیں) یعنی حضرت راستی اور ان کے اخلاف یا حضرت عطاء اللہ جعفری اور ان کے اخلاف وغیرہما سے داناپور کے کسی بزرگ کی ملاقات، اخذ فیضان، آمد و رفت، شادی بیاہ، رشتہ داری کا کوئی ثبوت نہیں۔ حضرت پیر مجیب اللہ قادری پھلواروی (المتوفی: ۱۱۹۱ھ) کے پوتے حضرت ظہور الحق پھلواروی سے داناپور کا باضابطہ تعلق پیدا ہوتا ہے یعنی بارہویں صدی ہجری میں۔ داناپور شاہ ٹولی کے شاہ صاحب غلام حسین داناپوری کے صاحب زادے شاہ وحید الدین صاحب اپنی تعلیم ظاہری و باطنی کیلیے پھلواری خانوادۂ مجیبی کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت ظہور الحق پھلواروی نے سلسلہ زاہدیہ مقیمیہ اور نقشبندیہ مجددیہ مقیمیہ میں اجازت حضرت شاہ غلام حسین داناپوری سے حاصل کی تھی۔ حضرت فردؔ نے حضرت شاہ غلام حسین داناپوری کے وصال پر قطعہ تاریخ بھی کہا ہے جو شامل دیوان فردؔ ہے۔

چو بست از خلق ایں پیر عارف　　بیک چشمک مشرف از لقا شد
بتاریخش ندائے آمد از جان　　فنائے عاشقان عین بقا شد

قطعہ

کرد از دنیا چو رحلت ایں ولی　　سال نقلش از کمالش منجلی
یعنی اورا در شمار حی بداں　　قرب حق آرا مگاہ آں ولی

ان تمام چیزوں کے علاوہ پھلواری کی خانقاہ مجیبیہ، فریدیہ، سلیمانیہ سے داناپور کے مشائخ رضوی و باقری سے رابطہ کوئی تعلق طریقت، رشتہ داری یا شادی بیاہ کا مجھے کوئی علم نہیں۔

ب سوم: حضرت شاہ اکبر داناپوری اور ان کا عہد ۱۲۶۰ھ تا ۱۳۲۷ھ

(الف) حضرت شاہ اکبر کے ہم عصر صوفیا مشائخ اور ادبار

وحید الہ آبادی: جوانی جیسی بھی گذری ہو پیری میں عشق مجازی نے حقیقت کی طرف رخ کیا اور وحید افکار و اشغال میں معروف رہنے لگے کہتے ہیں ؎ نظر نہ جائے گی اب اپنی ماسوا کی طرف ؛ خراب ہو کے بہت آئے ہیں خدا کی طرف ''حکے'' مصنف کے پاس حضرت وحید کی جوانی سے متعلق کیسی اطلاعات تھیں اس کی وضاحت کرنی تھی ورف

وحید کے پیش کردہ ایک شعر کی بنیاد پر وحید کی جوانی پر شبہہ کرنا صحیح نہیں۔

(۵۶) علامہ شوق نیموی عظیم آبادی: "آثار السنن حدیث میں شوق کی وہ گراں بہا تصنیف ہے جس نے تمام بلاد اسلامیہ میں ان کی فضیلت کا ڈنکا بجایا جو آج بھی جامعۂ ازہر کے نصاب میں داخل ہے" ص ۱۱۵

مصنف نے یہ ڈنکا بجنے کی آواز کہاں سنی وضاحت کرنی تھی۔ تا ایں دم تحریر مجھے اس کا ثبوت نہیں ملا اور مجھے یقین ہے کہ مصنف نے بھی جامعہ ازہر کے نصاب کا دیدار نہیں کیا ہوگا تو انہیں لکھنا تھا کہ یہ اطلاع مجھے فلاں سے ملی۔

(۵۷) شاہ محمد یحییٰ عظیم آبادی: "آپ کو تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا اور اس فن میں آپ حضرت احمد کبیر صاحب حیرت پھلواری صاحب تاریخ کملا ہر دو جلد کے ہم پلہ سمجھے جاتے تھے ..... فارسی میں بھی آپ کا دیوان مکمل موجود ہے ... دیوان غریب ۱۲۸۴ھ درمدح سیدنا اور محبوب القلوب بر معراج" ص ۱۲۱

(الف) حیرت پھلواری اور یحییٰ عظیم آبادی تاریخ گوئی کے لحاظ سے صوبہ بہار میں بہت اہم ہیں لیکن ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں یہ مصنف نے کہاں سے لکھ دیا؟ کیا مصنف نے دونوں کی فنی جانچ پرکھ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔

(ب) فارسی میں ان کا دیوان بنام "فتوحات شوق" طبع ہو چکا ہے۔ چار پانچ سال قبل خانقاہ منعمیہ ابو العلائیہ رام ساگر گیا کے کتب خانہ میں فتوحات شوق میری نگاہ سے گذرا تھا جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ مکمل دیوان تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل صرف حضرت امیر ابو العلائی کی شان میں کہی گئی منقبتوں کا مجموعہ ہے۔ (ج) معراج النبیؐ کے موضوع پر حضرت یحییٰ کی تصنیف کا صحیح اور مکمل نام مصنف کو معلوم نہیں۔ اس رسالہ کا پورا نام "رسالہ محبوب القلوب فی معراج المحبوب" ہے یہ رسالہ میرے مطالعے میں رہا ہے اس کا ایک قلمی نسخہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں موجود ہے۔

(د) مصنف کو یحییٰ عظیم آبادی کے اردو دیوان کا کوئی علم نہیں، حالاں کہ انھوں نے "مسلم شعرائے بہار" کو دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ حکیم سید احمد اللہ ندوی لکھتے ہیں "حضرت یحییٰ کا قلمی دیوان بلکہ اسے کلیات کہا جا سکتا ہے اب تک محفوظ ہے اور راقم کے پیش نظر رہ چکا ہے سید شریف الدین احمد عرف بچو صاحب عظیم آبادی جو جناب سید شاہ محمد یحییٰ کے نبیرہ ہیں اس کلیات کو بطور خاندانی تبرک کے سینے سے لگائے ہوئے کراچی لے آئے ہیں" (مسلم شعرائے بہار جلد پنجم ص ۲۳۶)

(ہ) حضرت یحییٰ نے عربی میں بھی تصنیفات و تالیفات کا مشکل کام کیا تھا اس سے ان کی عربی، فارسی اور اردو پر قدرت کا ثبوت ملتا ہے زبان عربی و فارسی میں ان کے دو رسالے سورۃ القرآن ـــــ اور شرح عجالۃ النافعۃ میری نگاہ سے گذرے ہیں۔ (و) قاضی محمد اسمٰعیل قدیمی نے اخبار الاولیا میں حضرت یحییٰ کی ایک اور تصنیف کا ذکر کیا ہے جس کا موضوع بقول قدیمی یحییٰ عظیم آبادی کے مرشد مبارک حسین داناپوریؒ کے ارشادات

اور احوال ہیں۔ (ذ) یحییٰ عظیم آبادی نے ہی حسرت عظیم آبادی کے دیوان قسطاس البلاغت کو ترتیب دیا تھا۔
(ح) شاہ یحییٰ عظیم آبادی کے نمونہ کلام کیلئے مصنف کو اردو کلام نہیں مل سکا ہے سوائے ایک قطعہ کے جا انکا انھوں نے ندوی سے استفادہ کیا ہے۔

(۵۸) **جناب سید شاہ اولاد علی صاحب بقا:** "حضرت مخدوم سید شاہ محمد منعم پاک قادری ابوالعلائی عظیم آبادی کے پیران سلسلہ میں ہیں" ص ۱۲۲

(الف) مخدوم کو کسی قریب العصر مصنف نے سید نہیں لکھا ہے اگر مصنف نے اس سلسلہ میں کوئی تحقیق کی ہے تو پہلے اسے پیش کریں پھر "سید" کا اضافہ سر آنکھوں پر۔

(۵۹) (ب) **داناپور کا ادبی مرکز اور عظیم آباد سے تعلقات:** داناپور اور پٹنہ کا کون سا مشاعرہ ہوا جس میں یہاں کے شعرا شریک نہ تھے... عظیم آباد کے پرانے گلدستے اور انتخابات اس بات کی دلیل ہیں کہ تقریباً نصف شعرا ان مشاعروں میں داناپوری ہوا کرتے تھے مثلاً گلدستہ بہار کے چھ شمارے از ماہ مئی ۱۸۸۳ء تا اکتوبر ۱۸۸۳ء، نسیم داناپور ۱۸۷۹ء اور تاج گیا یعنی مشاعرہ درگاہ حضرت شاہ ارزاںؒ پٹنہ ۱۹۲۴ء وغیرہ" ص ۱۴۳، ۱۴۴

(الف) مصنف کی نگاہ میں پٹنہ میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں سے صرف دو مشاعرے گردش کر رہے ہیں۔ درگاہ شاہ ارزاں کا مشاعرہ اور بادشاہ نواب کے ذریعہ منعقد مشاعرہ۔ پٹنہ میں کب کب کون کون مشاعرہ کس کس کے اہتمام سے ہوا اس میں کتنے شعرا کہاں کہاں کے شریک ہوئے مصنف کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔
(ب) مصنف کا دعویٰ ہے کہ عظیم آباد کے پرانے گلدستے اور انتخابات اس بات کی دلیل ہیں کہ تقریباً نصف شعرا ان مشاعروں میں داناپوری ہوا کرتے تھے اور مثال کے طور پر مصنف نے جو کچھ پیش کیا اس کے آئینہ میں مصنف کے دعوے کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ۱۔ گلدستہ بہار: بابت مئی جون ۱۸۸۳ء جلد اول شمارہ ۵، ۶ میں جن اکتیس شعرا کا کلام شامل ہے ان میں صرف دو حضرات داناپوری ہیں اکبر اور عرفاں ۲۔ گلدستہ بہار: بابت جون ۱۸۸۳ء جلد اول نمبر ۷ میں جن انچالیس شعرا کا کلام شامل ہے ان میں صرف دو حضرات داناپوری ہیں عرفان اور انور۔ ۳۔ گلدستہ بہار: بابت جولائی ۱۸۸۳ء جلد اول نمبر ۸ میں جن ینتیس شعرا کا کلام شامل ہے ان میں صرف دو حضرات داناپوری ہیں۔ اکبر، عرفاں ۴۔ گلدستہ بہار: بابت اگست ۱۸۸۳ء جلد اول نمبر ۹ میں جن اکتیس شعرا کا کلام شامل ہے ان میں صرف تین حضرات داناپوری ہیں۔ اکبر، عرفاں اور نصر ۵۔ گلدستہ بہار: بابت ستمبر ۱۸۸۳ء جلد اول نمبر ۱۰ میں جن چھبیس شعرا کا کلام شامل ہے ان میں صرف ایک داناپوری ہیں ــــــ عرفاں ۶۔ گلدستہ بہار: بابت اکتوبر ۱۸۸۳ء جلد اول نمبر ۱۱ میں جن چھبیس شعرا کا کلام شامل ہے ان میں بھی صرف دو حضرات داناپوری ہیں۔ اکبر اور عرفان

۷۔ نسیم دانا پور۔ یہ دانا پور میں منعقدہ طرحی مشاعروں کی روداد ہے ۱۸۷۹ء میں یہ مشاعرے انعقاد پذیر ہوئے تھے۔ اکبر داناپوری کی ہمہ گیر شخصیت نے داناپور میں باضابطہ ادبی فضا قائم کردی تھی، اکبر داناپوری اور ان کے شاگرد رشید نیر داناپوری کے شعر و ادب کے ستھرے ذوق نے اچھے خاصے حلقہ کو شعر و ادب کا دلدادہ بنالیا تھا یہ مشاعرہ اسی ماحول کا رہین منت ہے اور اس کی حیثیت اگر مقامی مشاعرے کی نہیں ہے تو اکبر داناپوری کے تلامذہ کے مشاعرے کا نام دینا برا نہ ہوگا۔ کئی مشاعرے اس سلسلے میں منعقد ہوئے تھے جن میں تین کی روداد نسیم داناپور کے نام سے شائع ہوئی تھی ان شائع شدہ مشاعروں میں سے صرف تیسرا مشاعرہ ایسا ہے جس میں کوئی قابل ذکر غیر داناپوری شخصیت بھی اپنے چند شاگردوں کے ساتھ شامل ہوئی ہے اور وہ ہیں حضرت صفیر بلگرامی۔ اس لیے نسیم داناپور والے مشاعروں میں نصف کیا تقریباً سبھی داناپوری ہیں اور اس مشاعرے میں شریک ہونے والے کسی عام مشاعرے کی وجہ کر نہیں آئے ہیں بلکہ ان کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق شاہ اکبر داناپوری سے ہے، حضرت اکبر کی شخصیت مرکزی ہے وہ ان مشاعروں کی روح ہیں اور انہیں کی وجہ کر اس مشاعرے میں حضرت صفیر بلگرامی بھی شریک ہوئے ہیں۔

۸۔ مشاعرہ درگاہ شاہ ارزاں پٹنہ ۱۹۲۴ء کی روداد تاج گیا میں چھپی تھی مجھے یہ رسالہ نہ مل سکا لیکن میرے بھائی جناب ڈاکٹر شاہ حسین احمد صاحب سے زبانی طور سے مجھے معلوم ہوا کہ اس مشاعرے میں بھی نصف شعرا داناپوری نہیں تھے بلکہ صرف چار شاعر داناپوری تھے۔ کسی روداد مشاعرہ یا گلدستہ میں اگر کسی خاص جگہ یا کسی خاص شاعر کے تلامذہ کی تعداد زیادہ ہے تو اس سے اس جگہ یا اس شاعر کی اہمیت دوسروں پر ثابت نہیں ہوتی ہے کیوں کہ ایسا تو مالک و ناشر گلدستہ کے مزاج و تعلقات اور رابطہ سے ہوتا ہے یا ناظم مشاعرہ کی وجہ کر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے نسیم داناپور میں جتنے عظیم آبادی شعرا شریک ہوئے ہیں اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ اس وقت میں صرف یہی شاعر عظیم آباد میں تھے۔ بلکہ عظیم آباد کے صرف وہی شعرا داناپور کے ان مشاعروں میں شریک ہوئے جن کا تعلق، رابطہ، واسطہ ان حضرات سے تھا جو داناپور میں مشاعرہ منعقد کر رہے تھے اس لیے وہ شامل ہوئے۔ گلدستہ بہار کے ناشروں کے تعلقات و مراسم اکبر داناپوری سے بڑے گہرے ہوں گے یہی وجہ ہے کہ اکبر خود بھی اور اکبر کی وساطت سے ان کے تلامذہ (داناپور سے لے کر اکبرآباد و اجمیر تک) اس گلدستہ میں خوب چھپتے تھے، اکبر کے تلامذہ اور اکبر کے استاد وحید الہ آبادی کے کچھ شاگرد بہار شریف میں بھی تھے یہ بھی ایک وجہ تھی اکبر کے گلدستہ بہار سے قربت کی۔ لیکن مصنف کا یہ مہمل دعوی کہ نصف شعرا داناپوری ہوا کرتے تھے بے معنی سا ہے اور بے بنیاد ہے۔

(۶۰) اس باب کے تحت میں داناپوری شعرائے اردو کے مختصر حالات اور ان کے کلام کا نمونہ پہلی بار پیش کرنے کی

سعادت حاصل کر رہا ہوں" ص ۱۴۴

حضرت سید شاہ محمد قاسم ابوالعلائی داناپوری: ان کے تذکرہ اور پیش کردہ احوال پر گذشتہ صفحات میں بحث ہو چکی ہے یہاں مصنف نے انہیں چیزوں کو پھر دہرایا ہے کلام کا نمونہ وہی ہے حضرت قاسم کے تمام پیش کردہ اشعار نجات قاسم سے ماخوذ ہیں۔ مصنف نے کوئی نئی چیز نہیں پیش کی ہے۔

حضرت سید شاہ محمد واجد صاحب پریشاں داناپوری: مصنف نے وہی ساری باتیں دہرادی ہیں جو گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔

حضرت سید شاہ محمد سجاد صاحب ساؔجد داناپوری: وہی ساری باتیں مصنف یہاں دہرا رہے ہیں جو وہ حضرت ساؔجد کے عنوان سے پہلے کر چکے ہیں۔

(۶۱) "حضرت سید شاہ محمد عطا حسین صاحب فاؔنی داناپوری، حضرت سید شاہ محمد امین صاحب حرماؔں داناپوری، حضرت سید شاہ محمد وزیر صاحب عطاؔ داناپوری ان حضرات کا تذکرہ بھی باب دوم میں بالتفصیل گذر چکا ہے لہٰذا یہاں پر تکرار موقوف کرتا ہوں حضرت فانی، حرماؔں اور عطاؔ کے اشعار کتابوں میں دستیاب ہیں بلاشبہ یہ حضرات شاعر تھے لیکن چوں کہ ان کا کلام وافی نہیں ملتا ہے اس لیے ان پر کوئی خاص تبصرہ کرنا مشکل ہے جو اشعار ملتے ہیں وہ اس وقت کے عامیانہ اور مخصوص صوفیانہ رنگ کے ہیں جن میں کوئی خاص انفرادیت نظر نہیں آتی" ص ۲۷

(الف) شاہ امین صاحب حرماؔں داناپوری مصنف کے اپنے پر دادا ہیں اس لیے ان کے بارے میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہم لوگوں کے لیے مستند ہے، اس لیے کہ حرماؔں سے متعلق کسی اطلاع کے ذریعہ مصنف ہیں یا پھر مصنف کے قریبی رشتہ دار جن تک مصنف سے زیادہ کس کی پہنچ ہو سکتی ہے لیکن مصنف نے ایک ہی لکڑی سے حرماؔں فانی اور عطاؔ کو ہانک دیا ہے یہ مصنف کی خود فریبی ہے مصنف نے اس سلسلہ میں قطعی تلاش و جستجو سے کام نہیں لیا ہے ورنہ انہیں فانی اور عطاؔ کے بارے میں مندرجہ ذیل اہم اطلاعات حاصل ہوتیں۔

فانی داناپوری: فاؔنی داناپوری اپنی تصنیف کنز الانساب کے ص ۱۲۳ پر اپنی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں (واضح رہے کہ کنز الانساب مصنف کی فہرست کتابیات میں شامل ہے) "و چہار مثنوی، سرحق و گنجینۂ اولیاء و فسانہ دل پذیر و سر عطا و یک دیوان فارسی و یک دیوان اردو" مصنف نے ان مثنویات میں سرحق کو دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے اور سر عطا کے اشعار فاؔنی کے احوال میں نقل کیے ہیں۔

مثنوی سرحق: ۱۲۸۴ھ میں نظم ہوئی اور ماہ صفر ۱۲۹۸ھ مطابق جنوری ۱۸۸۲ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے بڑی

تقطیع کے ایک سو اکیاسی صفحات پر طبع ہوئی۔

مثنوی گنجینۂ اولیا: ۱۲۸۸ھ میں نظم کردہ اس مثنوی کا واحد قلمی نسخہ حضرت فانی کے دست خاص کا نوشتہ خانقاہ منعمی ابوالعلائی رام ساگر گیا کے کتب خانہ کی ملک ہے، میں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ فانی نے اپنے پیران سلسلہ کے احوال کو اس مثنوی میں نظم کیا ہے۔

مثنوی فسانۂ دل پذیر: فانی کے دست خاص کی نوشتہ یہ مثنوی گنجینۂ اولیا کے ساتھ ہی مجلد ہے۔ مثنوی میں فانی نے اپنا حال نظم کیا ہے۔

مثنوی سر عطا: فانی کے دست خاص کا نوشتہ نسخہ خانقاہ منعمی ابوالعلائی رام ساگر گیا کے کتب خانہ کی ملک ہے، اس مثنوی کے مختلف مقامات کے اشعار جناب شاہ حسین الدین احمد منعمی صافی گیاوی سجادہ نشین حضرت فانی نے حضرت فانی کے احوال میں نقل کیے ہیں۔

دیوان اردو حضرت فانی: دست خاص کا نوشتہ حضرت فانی کی خانقاہ واقع محلہ رام ساگر گیا کے کتب خانہ کی ملک ہے۔

ایک اہم ترین حقیقت جس کی جانب مصنف کی نگاہ نہیں وہ یہ کہ حضرت فانی داناپوری شاہ ٹولی داناپور کے پہلے صاحب دیوان فارسی اور پہلے صاحب دیوان اردو شاعر ہیں۔ بحیثیت نثار بھی حضرت فانی پہلے کثیر التصانیف بزرگ ہیں فانی کے بعد یہ شرف اکبر داناپوری کو حاصل ہے۔

مصنف نے اپنے عنوان "داناپور کا ادبی مرکز اور عظیم آباد سے تعلقات" کے تحت جو کچھ بھی لکھا ہے اس کا اپنے عنوان سے کوئی تعلق نہیں ہے اور شروع سے آخر تک پڑھ جانے کے بعد یہ تو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ مصنف نے غلطی سے "داناپور کا ادبی مرکز" لکھ دیا ہے دراصل انہیں "داناپور کا شعری مرکز" لکھنا چاہیے کیونکہ اس عنوان کے تحت جتنی شخصیتوں کو انہوں نے پیش کیا ہے، ان کے نثری کارناموں سے اس طرح کنارہ کشی اختیار کی ہے جیسے وہ قاری کیلیے اس کی ہوا لگنا بھی مضر سمجھتے ہیں۔

(۶۲) سید شاہ محمد یحییٰ صاحب یحییٰ داناپوری: "آپ کے چند اشعار خاندان کے بزرگوں کو یاد ہیں۔ انہیں پر اکتفا کرتا ہوں ظاہر ہے چند اشعار پڑھ کر کسی شاعر کے متعلق کوئی رائے قائم کرنی بہت آسان نہیں ذیل میں ان کے چند اشعار دیے جاتے ہیں" ص ۱۳۹

یحییٰ داناپوری کی ایک بیاض جس میں چند غزلیں اکبر داناپوری کے دست خاص کی اصلاح کردہ ہیں کتب خانہ خانقاہ میتن گھاٹ میں میری نگاہ سے گذری ہے، حضرت یحییٰ نے اپنی مختصر سی عمر میں اکبر داناپوری سے بھرپور استفادہ کیا۔ گلدستہ بہار کے نام سے ۱۸۹۶ء میں کسی مشاعرہ کی روداد کو چھپوانے کا اہتمام بھی کیا تھا یہ روداد قلمی خانقاہ میتن گھاٹ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اسی روداد میں یحییٰ داناپوری کا کلام موجود ہے۔

(۶۳) سید شاہ نظیر حسن صاحب نظیر داناپوری: "شاہ نظیر حسن صاحب کا شعری سرمایہ آپ کے پوتے شاہ محمد الیاس صاحب کے پاس محفوظ ہے جو ان دنوں جاپان میں عینک کی تجارت کرتے ہیں" ص ۱۴۷

(الف) شاہ الیاس صاحب کے پاس حضرت نظیر کے شعری سرمایہ موجود ہونے کی اطلاع مصنف کو کس سے ملی؟ مصنف نے یقینی طور پر سوائے نسیم داناپوری کے اور کہیں سے نظیر کے کلام کے لیے تگ و دو نہیں کی ہے۔

(۶۴) سید شاہ محمد رضی صاحب رضی داناپوری: "داناپور میں ۱۲۶۹ھ میں پیدا ہوئے، خاندان کے لوگ آپ کو میاں دادا کے نام سے یاد کرتے ہیں، شاعری کا شوق خاصہ تھا اور اس فن میں حضرت شاہ اکبر داناپوری کے شاگرد تھے، شاعری میں اکثر نعتیں اور غزلیں آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کا دیوان تلف ہو چکا" ص ۱۴۸

(الف) مصنف نے نام محمد رضی غلط لکھا ہے پورا نام رضی الدین حسین تھا، حضرت شاہ مبارک حسین قادری ابو العلائی داناپوری کے چھوٹے بیٹے تھے۔ (ب) یہ سن پیدائش مصنف نے کہاں سے نقل کیا ہے معلوم نہیں — ویسے مصنف کے والد قتیل داناپوری نے رضی داناپوری کو POSTHOMAS CHILD لکھا ہے، حضرت رضی کے والد ۱۲۷۳ھ میں وفات کیے اگر مصنف کا سن صحیح مانا جائے تو ہے، والد کے وصال سے تقریباً پانچ سال قبل پیدا ہوئے۔ دراصل یہ دونوں اطلاعات بے بنیاد اور اختراعی ہیں۔ حضرت رضی داناپوری ۱۲۷۱ھ میں پیدا ہوئے، شاہ یحییٰ صاحب نے قطعہ کہا اور نمونۂ خورشید۔ نور شمس و قمر دگر آمد سے سن ولادت برآمد کیا۔

۱۲۷۱ھ ۱۲۷۱ھ

(۶۵) "۱۹۲۷ء میں خانقاہ قمریہ محلہ میتن گھاٹ پٹنہ میں آپ کا انتقال ہوا اور وہیں آسودہ ہوئے" ص ۱۴۸

مصنف نے سن وصال بالکل غلط لکھا ہے، ۱۹۳۲ء تک کے مکتوبات حضرت رضی خانقاہ میتن گھاٹ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

(۶۶) سید شاہ عزیز الدین حسین صاحب عزیز ابو العلائی داناپوری: "آپ کو بھی شعر گوئی سے شوق تھا اور عزیز تخلص فرماتے تھے آپ کا کلام بھی اب نایاب ہے" ص ۱۴۸

شعر گوئی کا اچھا خاصہ شوق تھا، اکثر و بیشتر نعتیں کہا کرتے تھے، حضرت عزیز کی ایک بیاض کتب خانہ خانقاہ میتن گھاٹ میں موجود ہے۔

حضرت شاہ اکبر داناپوری کی زندگی اور شاگردوں کا حال

(۶۷) حضرت شاہ اکبر داناپوری: حضرت اکبر داناپوری کے سوانح مصنف کے کل چودہ صفحات پر محیط ہیں۔ اکبر داناپوری کے سوانح کو سب سے قبل اکبر کے مرید اور شاگرد نثار اکبرآبادی نے دل اور جذبات اکبر کے شروع میں پیش کیا۔ اور مصنف نے حضرت اکبر پر تحقیقی مقالہ لکھا تو نثار کے پیش کردہ سوانح میں کیا اضافہ اور کیا جدت پیدا کر سکے اسکی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

مَنّادِ اکبر آبادی

"اسم مبارک سید شاہ محمد اکبرؒ ابن سید شاہ محمد سجادؒ ابن سید شاہ تراب الحق ابن قطب الوقت سید شاہ طیب اللہ نقاب پوش موڑوی ابن حضرت سید شاہ امین اللہؒ نوآبادی ابن حضرت سید شاہ منور اللہ نوآبادی قدس اللہ اسرارہم"

"حضرت کے اجداد عالیہ میں سے ایک بزرگ امام تاج فقیہہ مکّی ہیں جن کا سلسلۂ نسب حضرت زبیر ابن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے.... ہمارے حضرت کا سلسلۂ نسب حضرت محمد عبد العزیز قدس سرہٗ سے ہے اس لحاظ سے ہمارے حضرت قریشی ہیں مگر حضرت کی والدہ ماجدہ حضرت میر اشرف علی قادری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں یہ بزرگ قصبہ رہوئی کے سجادہ نشین تھے آپ کا سلسلۂ نسب بہت صحیح طریقے سے حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح آپ کے والد ماجد قدس سرہ کا سلسلہ مادری بھی حضرت سید شاہ غلام حسین داناپوری قدس سرہٗ سے ہے جو باقری و رضوی سید ہے۔

ہمارے حضرت کی ولادت باسعادت ۲۷ شعبان المعظم ۱۲۶۰ھ روز چہار شنبہ بوقت اشراق شہر آگرہ محلہ نئی بستی میں واقع ہوئی ..... اور اس عدالت کا حاکم اعلیٰ عظیم آباد کے افسروں میں سے ایک افسر مقرر کیا گیا اس زمانہ میں حضرت کے عم اقدس و پیر طریقت جناب سید شاہ محمد قاسم علیہ الرحمہ جوان تھے اور علم ظاہری سے فارغ ہو کر مدارج تصوف کے طے کرنے میں معروف

طلحہ رضوی برقؔ

"سید شاہ محمد اکبر نام اکبرؔ تخلص والد ماجد کا اسم گرامی سید شاہ تراب الحق ابن قطب الوقت سید شاہ طیب اللہ نقاب پوش موڑوی ابن حضرت سید شاہ امین اللہ نوآبادی بن حضرت سید شاہ منور اللہ نوآبادیؒ تھا"

"اس طرح آپ کا سلسلہ نسب حضرت محمد عبد العزیز قدس سرہٗ ابن حضرت امام تاج فقیہہ مکّی فاتح منیر تک پہنچتا ہے. حضرت امام تاج فقیہہ کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے براہ راست حضرت زبیر بن عبد المطلب مکّی سے ملتا ہے ۔ اس لحاظ سے حضرت اکبر نسباً قریشی ہیں ۔ مگر آپ کی والدہ ماجدہ حضرت میر اشرف علی قادری رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں تھیں جو قصبہ رہوئی ضلع گیا کے سجادہ نشیں اور ایک عارف کامل بزرگ تھے ۔حضرت میر اشرف علی قادری حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی بغدادیؓ کی اولاد میں تھے ۔اسی طرح حضرت اکبر کے والد ماجد جناب شاہ سجاد صاحب کا سلسلہ مادری سید المجذوبین حضرت سید شاہ محمد یسٰین داناپوری رحمت اللہ علیہ سے ملتا ہے جو باقری و رضوی سید تھے ۔ حضرت اکبر کی پیدائش ۲۷ شعبان المعظم ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۱ ستمبر ۱۸۴۴ء بروز چہار شنبہ بوقت اشراق شہر آگرہ (اکبر آباد) محلہ نئی بستی میں واقع ہوئی ..... اور حضرت اکبر کے عم حقیقی کلاں جناب سید شاہ محمد قاسم صاحبؒ

تھے آپکو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو شوق زیارت مزار پُر انوار
حضرت سیدنا امیر ابوالعلا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیتاب کرکے
اس حاکم کے پاس تک پہنچا دیا آپ نے خاندانی حالت
سے ذکر فرما کے ارادہ ملازمت ظاہر کیا۔ حاکم نہایت اعزاز
پیش آیا اور خاندانی وجاہت کا خیال کرکے اس نے برجستہ یہی
کہا کہ حضرت آپکے جد امجد انگریزی ملازمت کی اجازت
دیں گے آپنے فرمایا کہ ملازمت صرف وہاں تک پہنچنے کا
ایک ذریعہ ہے مقصود اصلی اس آستان کی جاروب کشی ہے،
اس نے فوراً عہدہ مثل خوانی پر پچاس روپیہ کے مشاہرہ
پر اس معذرت کشی کے ساتھ مقرر کر دیا کہ یہ قلیل مشاہرہ
آپ کی حیثیت و قابلیت کے مناسب نہیں مگر میں
مجبور ہوں کہ منظور شدہ تنخواہ ہی یہ ہے۔ الغرض اس
سلسلہ میں آپ اس کے ہمراہ الہ آباد تشریف لے آئے
اور جب تک عدالت عالیہ کے قیام کے سارے
مراتب نہ طے ہوئے الہ آباد ہی میں قیام رہا پھر آگرہ تشریف
لے آئے اور آپکے ساتھ آپکے چھوٹے بھائی سید شاہ محمد
سجاد قدس سرہ بھی آگرہ تشریف لاکر قیام پذیر ہو گئے
یہ ذریعہ حضرت کی پیدائش آگرہ کا تھا۔ حضرت کے عم
اقدس و پیر طریقت نے تاریخ ولادت نظم فرمائی۔ شعر
پڑھیے اور اس تعلق قلبی کو ملاحظہ فرمایئے جو حضرت پیر
طریقت کو ہمارے حضرت کے ساتھ ابتدا ہی سے تھا۔

سرور رعنائے ما اخی سجاد

- - - - - - - - - - - -

عدالت عالیہ آگرہ میں بعہدہ مثل خوانی فائز
تھے۔ پچاس روپیہ ماہانہ کی قلیل تنخواہ پر
وطن سے دور یہ ملازمت دراصل ایک ذریعہ
تھی بارگاہ سیدنا امیر ابوالعلا قدس سرہٗ العزیز
میں حاضری کا۔ اس عدالت عالیہ کا حاکم
اعلیٰ عظیم آباد (پٹنہ) کا تھا جس نے
حضرت شاہ قاسم صاحب کو اس
عہدہ پر بحال کیا۔ جب تک عدالت
عالیہ کے قیام کے سارے مراتب
طے نہ ہوئے حضرت شاہ قاسمؒ
کا قیام اسی افسر اعلیٰ کے ساتھ الہ آباد میں رہا بعدہ
آگرہ تشریف لے آئے آپ کے ساتھ ہی آپ کے
چھوٹے بھائی سید شاہ محمد سجاد قدس سرہٗ بھی جو آپ
کو از حد عزیز تھے مع اہلیہ آگرہ منتقل ہو گئے اور وہاں
آپ عدالت میں منصرم کی ملازمت پر بحال ہو گئے
اس طرح حضرت شاہ محمد اکبر کی پیدائش
اکبر آباد معروف بہ آگرہ میں ہوئی ——
حضرت اکبر کے عم اقدس جو بعد میں آپ کے پیر طریقت و
مرشد معنوی بھی ہوئے۔ آپکی ولادت باسعادت پر بہت
زیادہ خوش ہوئے اور فرطِ مسرت میں حسب ذیل
تاریخ ولادت نظم فرمائی۔

سرور رعنائے ما اخی سجاد

- - - - - - - - - - - -

(۱۱ اشعار)

جب ہمارے حضرت چالیس روز کے ہوئے تو آپ کی
والدہ ماجدہ آپ کو مزار پرانوار حضرت سیدنا امیر ابوالعلا
رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر لے کر حاضر ہوئیں اور کچھ روز تک وہیں
قیام فرمایا۔ پانچویں سال بسم اللہ حضرت سید شاہ محمد قاسم
علیہ الرحمۃ نے ادا فرمائی اور خود ہی تعلیم فرمانا شروع کیا۔
ہم کو جہاں تک معلوم ہو سکا وہ بس یہی ہے کہ تعلیم ظاہری جو کچھ
بھی ہوئی وہ اسی ذات بابرکات سے جس سے تعلیم باطنی ہوئی
وہ نگاہ جس کے اثر کا ظہور آگے چل کر آشکارا ہوا ابتدا
ہی سے اپنا کام کیے جاتی تھی۔ ہمارے حضرت کی ابتدائی
عمر اس بے پروائی اور دنیا سے قطع تعلق کی اس طرح
گذری کہ ہم اس کو تصوف کی اصطلاح میں جذب
سرشار سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہ ہم اچھی طرح سے دریافت نہ کر سکے کہ تحصیل علم ظاہری تکمیل
کو پہنچی یا نہیں مگر تعلیمات و مصنفات سے جہاں تک
اندازہ کیا جا سکتا ہے اس کے کہنے میں تامل نہیں کہ آپ
آسان عربی عبارت اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ قرآن مجید و مشکوٰۃ
میں بڑا تدبر فرماتے رہتے تھے اور بعض اوقات ایسے نکات
بیان فرماتے کہ علماء بھی متحیر رہ جاتے علمی دلچسپی کا یہ عالم
کہ علماء کی بے حد قدر فرماتے اور علمی مضامین و علمی کتابوں
کے مطالعہ سے تادم آخری سیر نہ ہوئے۔

الغرض جب تحصیل علم ظاہری سے کچھ یکسوئی ہوئی تو وہ وقت آیا جس کا
مدت سے انتظار تھا۔ آپ نے عم اقدس علیہ الرحمۃ سے سلسلۂ عالیہ

(۱۱ اشعار)

حضرت اکبر جب چالیس دن کے ہوئے تو
آپ کی والدہ ماجدہ آپ کو لے کر حضرت سیدنا
امیر ابوالعلا قدس سرہ العزیز کے مزار پر
مبارک پر حاضر ہوئیں اور کچھ دنوں وہیں قیام
فرمایا۔ آپ جب پانچ سال کے ہوگئے تو عم اقدس
یعنی حضرت شاہ قاسم صاحبؒ نے بسم اللہ
ادا کروائی اور خود ہی تعلیم و تربیت فرمانا
شروع کیا۔ آپ کی تعلیم ظاہری و باطنی
جو کچھ بھی ہوئی وہ شاہ قاسم صاحب سے
ہوئی اور پندرہ سولہ سال کی عمر تک دنیا سے بے پروائی
اور قطع تعلق کے ساتھ تحصیل علوم
ظاہری و باطنی کرتے رہے۔

خواجہ محمد صدیق حسن لکھتے ہیں کہ "تحصیل علم ظاہری تکمیل کو
پہنچی یا نہیں مگر تعلیمات و مصنفات سے جہاں تک اندازہ
کیا جا سکتا ہے اس کے کہنے میں تامل نہیں کہ آپ آسان
عربی عبارت اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ قرآن شریف و
مشکوٰۃ شریف میں بڑا تدبر فرماتے رہتے تھے اور
بعض اوقات ایسے نکات بیان فرماتے کہ علماء بھی متحیر رہ
جاتے۔ علمی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ علماء کی بے حد قدر فرماتے اور علمی مضامین
و علمی کتابوں کے مطالعہ سے تادم آخر سیر نہ ہوئے"

علم ظاہری کی طرف سے ایک گونہ مطمئن ہونے کے بعد آپ
نے عم اقدس جناب شاہ قاسم صاحب سے

ابو العلائیہ میں بیعت حاصل کی اور اب وہ رنگ نمودار ہو چلا جو مدت سے پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہ رنگ جب متعدی ہو چلا اور جلوہ فروشی کے لیے طالبان دیدار کا طالب ہونے لگا تو ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۸۱ھ وقتِ نماز صبح حضرت سید شاہ محمد قاسم علیہ الرحمۃ آپ کے عم اقدس اور پیر طریقت نے اجازت نامہ تحریری عطا فرما کر تشنہ لبان معرفت کو سیرابی کا ایک ایسا موقع دیا جو ایک مدت تک یاد رہے گا۔

حضرت اقدس علیہ الرحمہ کی شادی حضرت شاہ جمال علی رحمۃ اللہ علیہ کی نواسی صاحبہ سے ہوئی تھی یہ بزرگ حضرت شاہ عبدالمنان قادری دہلوی علیہ الرحمہ کے نواسے اور حضرت شاہ شمس الدین حسین داناپوری علیہ الرحمہ کے فرزند تھے۔

. . . .

. . . .

. . . .

حضرت اقدس کے دو صاحبزادیاں صغر سنی ہی میں انتقال فرما گئی تھیں۔ ایک صاحبزادی حضور کے وصال سے دو سال قبل راہی ملک بقا ہو گئیں یہ صاحبزادی جناب شاہ نظام الدین صاحب سجادہ نشین گیا سے منسوب تھیں تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی یادگار چھوڑے۔ حضرت کی ایک صاحبزادی جناب شاہ محمد نظامی صاحب خلف ارشد جناب شاہ محمد غزالی صاحب کو منسوب اور صاحب اولاد ہیں ایک صاحبزادہ جناب سید شاہ محمد محسن صاحب حضرت قبلہ عالم کے یادگار ہیں۔

اس واقعہ کے کچھ مدت کے بعد جناب سید شاہ محمد سجاد

سلسلۂ ابوالعلائیہ میں بیعت حاصل کی اور ۲۷ رمضان المبارک بروز جمعہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۴ فروری ۱۸۶۵ء کو بوقت نماز صبح پیر طریقت نے اجازت و خلافت تحریری سے سرفراز کیا۔

. . . .

. . . .

. . . .

حضرت اکبر کی شادی جناب شاہ جمال علی رحمۃ اللہ کی نواسی سے ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء میں ہوئی تھی۔ شاہ محمد یحییٰ عظیم آبادی نے قطعہ تاریخ لکھا تھا جو حسب ذیل ہے۔

. . . .

شاہ جمال علی حضرت شاہ عبدالمنان قادری دہلوی کے نواسے اور جناب شمس الدین حسینی نبیرۂ سید المجذوبین حضرت شاہ محمد یٰسین داناپوری کے فرزند تھے۔

حضرت اکبر کی چار صاحبزادیاں تھیں دو صغیر سنی (کذا) ہی میں انتقال فرما گئیں۔ ایک صاحبزادی آپ کے وصال سے دو سال قبل راہی ملک بقا ہو گئیں جو جناب شاہ نظام الدین صاحب سجادہ نشین خانقاہ گیا سے منسوب تھیں۔ حضرت اکبر کی چوتھی صاحبزادی جناب شاہ محمد نظامی صاحب جناب شاہ محمد غزالی صاحب کاکوی سے منسوب ہوئیں۔ شاہ محمد محسن صاحب داناپوری حضرت اکبر کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔

آپ کی شادی کے بعد ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۱۸ء میں آپ کے

قدس سرہ کے وصال کا واقعہ ہے اس واقعہ کے ہوتے ہی سجادگی خاندانی کے لیے دوسرا کون باقی رہ گیا تھا ۱۸ ذیقعدہ ۱۲۹۸ھ میں مشائخ کی ایک جماعت کثیر نے دستار فقر و سجادگی کے لیے پیش کر کے مبارکباد دی اس موقعہ پر حضرت شاہ محمد یحییٰ علیہ الرحمہ نے جو سجادگی کی تاریخیں تحریر فرمائی تھیں وہ درج ذیل ہیں۔

حضرت سید سجاد چو رحلت فرمود

. . . .

رونق افروز سجادہ خاندانی ہونے کے بعد دفعۃً حضور نے سفر حج کا قصد فرمایا ..... یہ واقعہ ۱۳۰۰ھ کا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس باب کو حضور ہی کی تحریر پر تمام کیا جائے جو حضور نے اپنی کتاب اشرف التواریخ میں اس مبارک سفر کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ وہو ہٰذا —— جب یہ فقیر ۱۳۰۰ھ میں آستانہ بوس مکرم ہوا ....

اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے تمہارے دل کی شست و شو آبِ زمزم سے کی (مفصل حال سفر اشرف التواریخ میں تحریر ہے ملاحظہ فرمایئے)

جناب حضرت شاہ محمد یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ نے واپسی سفر کی تاریخ فرمائی ہے شعر پڑھیے اور ملاحظہ فرمائیے ....

تاریخ سفر

تعالیٰ اللہ اے اکبر نیک فال

. . . .

۵ شعر

سفر حج سے واپسی کے بعد حضور کی توجہ تصنیف و تالیف

والد محترم سید شاہ محمد سجاد قدس سرہ کا بھی وصال ہوگیا۔ ان کے بعد ہی خاندان کے بزرگوں نے حضرت اکبر کو ان کے والد کی جگہ پر بحیثیت جانشیں تسلیم کیا۔ اس موقع پر شاہ محمد یحییٰ عظیم آبادی نے تاریخیں تحریر فرمائی تھیں وہ حسب ذیل ہیں۔

حضرت سید سجاد چو رحلت فرمود

. . . .

اپنے والد محترم کے مخصوص سجادہ پر بیٹھنے کے بعد حضرت اکبر کو زیارت حرمین شریف کا خیال آیا اور ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں حج بیت اللہ شریف و زیارت روضۂ انور سے مستفیض ہوئے اپنی کتاب اشرف التواریخ میں اپنے مبارک سفر کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں ——

جب یہ فقیر ۱۳۰۰ میں آستانہ بوس بیت مکرم ہوا ......

اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے تمہارے دل کی شست و شو آبِ زمزم سے کی (اشرف التواریخ بحوالہ جذبات اکبر ص ۱۷)

حضرت اکبر کی سفر حج سے واپسی کی تاریخ بھی شاہ یحییٰ عظیم آبادی نے لکھی ہے

تاریخ سفر

تعالیٰ اللہ اے اکبر نیک فال

. . . .

۵ شعر

سفر سے فراغت کے بعد آپکی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف ہوئی

کی طرف ہوئی تفصیل اس کی درج ذیل ہے خدا کی قدرت ....

پانچویں محرم الحرام ۱۳۲۷ھ کو آگرہ تشریف لے گئے اس وقت تک آپ صحیح و تندرست تھے آخر صفر سے آثار سفر یعنی سلسلۂ علالت شروع ہوا اطبا نے استسقا تجویز کیا..... پانچویں ربیع الثانی کو والا نامہ کے ذریعہ سے صاحبزادہ صاحب جناب سید شاہ محمد محسن سلمہ کو آگرہ میں طلب فرمایا وہ ساتویں کو آگرہ پہنچ گئے اور ان کے اصرار سے حضور اقدس ۱۷ ربیع الثانی کو علالت ہی کی حالت میں داناپور روانہ ہو گئے ....

اوائل رجب سے مرض میں زیادتی کے آثار نمایاں ہوتے گئے اور ضعف اس قدر بڑھ گیا کہ بے استعانت اٹھنا بیٹھنا دشوار ہونے لگا شب و روز میں کم و بیش پچیس تیس مرتبہ استنجے کی ضرورت ہوتی تھی

اگرچہ سفر حج کی واپسی کے بعد سے دن کا کھانا کم کر دیا تھا اور عموماً ناغہ فرما دیا کرتے تھے مگر اس علالت میں اکثر دو دو دن تک رات کو بھی کچھ تناول نہ فرماتے تھے...

دسویں رجب کو یک بیک آگرہ کا قصد فرما دیا گٹھری بندھ گئی اور دوسرا دن روانگی کے لیے مقرر کیا گیا مگر شب کو اس قدر ضعف ہو گیا کہ کروٹ بدلنا مشکل ہو گیا اور بارہ بجے شب تک غشی کی حالت طاری رہی بارہ بجے کے بعد فرمایا کہ میرا خیال آگرہ جانے کا تھا مگر اللہ کی مرضی نہیں گٹھری کھول دو

عصر کے وقت سر مبارک کو جنبش ہوئی اور

اور اسے اپنا محبوب شغل بنا لیا آپ کے قلم سے بیسیوں اہم تصنیفات وجود میں آئیں مثلاً ـــــ (۱) خدا کی قدرت

بالآخر ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء سے آپ کی صحت گرنے لگی پانچویں محرم الحرام ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء کو داناپور سے آگرہ تشریف لے گئے۔ اس وقت طبیعت کچھ اچھی تھی مگر ماہ صفر المظفر کے اخیر سے مرض الموت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اطبا نے استسقا تجویز کیا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی صاحبزادہ شاہ محمد محسن انہیں آگرہ سے داناپور لے آئے۔ اوایل رجب المرجب ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء سے مرض شدید ہوتا گیا اور ضعف اس قدر بڑھ گیا کہ بغیر سہارے کے اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا دن بھر کم و بیش پچیس تیس بار استنجا کی ضرورت ہوتی

اگرچہ سفر حج کی واپسی کے بعد سے دن کا کھانا کم کر دیا تھا اور عموماً ناغہ فرما دیا کرتے تھے مگر اس علالت میں اکثر دو دو دن تک رات کو بھی کچھ تناول نہ فرماتے تھے۔ دس رجب کو اچانک آگرہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا مگر ضعف کی شدت ایسی تھی کہ گھنٹوں حالت غشی میں رہتے۔ آخر ش سفر آگرہ کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

....

....

....

رجب کی چودھویں تاریخ ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء

الا للہ کی آواز سب کے کانوں میں آئی چہرہ مبارک خود بخود
سمت قبلہ ہوگیا اس کے ساتھ ہی روح پاک نے جسم خاکی
سے تعلق کو چھوڑ دیا انا للہ و انا الیہ راجعون ہ
رجب کی چودھویں تاریخ ۱۲۴۲ھ دوشنبہ کا روز عصر و مغرب کے درمیانی وقت تھا۔

دوشنبہ کا روز عصر و مغرب کا درمیانی وقت
تھا کہ سر کو جنبش ہوئی اور اللہ اللہ کا نعرہ لگایا چہرہ مبارک
خود بخود سمت قبلہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی طائر روح
قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ہ

نثار اکبر آبادی اور مصنف دونوں کے جملوں اور سطروں کے مطالعہ کے بعد سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اسے استفادہ کی کون سی قسم قرار دیا جائے۔ بہر حال مصنف نے حضرت نثار کے جملوں کو بغیر حوالے کے نقل کیا ہے اس لیے اس پر تنقید بھی مصنف کو برداشت کرنی پڑے گی اور کہیں کہیں مصنف نے نثار کے جملوں کو سمجھنے میں بھول کی ہے وہ بھی ہدیۂ ناظرین ہے ۔

(۶۸) "مگر آپ (اکبر دانا پوری) کی والدہ ماجدہ حضرت میر اشرف علی قادری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھیں جو قصبہ رہوئی ضلع گیا کے سجادہ نشین اور ایک عارف کامل بزرگ تھے۔ حضرت میر اشرف علی قادریؒ حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی بغدادیؓ کی اولاد میں تھے" ص ۱۵۸

یہ پوری عبارت نثار اکبر آبادی سے کتنے فرق کے ساتھ مصنف نے نقل کی ہے وہ گذشتہ صفحات میں ملاحظہ کیجیے۔

(الف) مصنف نے چوں کہ میر اشرف علی قادری کا نام نثار اکبر آبادی سے سنا اس لیے ان کے بارے میں نثار کی اطلاع پر تشفی کر لیا وہ قصبہ رہوئی میں کس بزرگ یا کس خانقاہ یا تکیہ کے سجادہ نشین تھے مصنف نہیں جانتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جاننا چاہا بھی نہیں ہے۔ (ب) حضرت میر اشرف علی قادری حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی بغدادی کی خاص اولاد میں نہیں تھے مجھے اب تک اس کا پتہ نہیں چل سکا ہے کہ حضرت غوث پاکؒ سے ان کا نسبی تعلق کیا تھا۔ ممکن ہے ان کے اجداد کی شادیات میں سے کوئی شادی کسی قادری النسل بزرگ کے خاندان میں ہوئی ہو اور اس وجہ سے حضرت عبد القادر جیلانی کی نسبی جزئیت بھی پہنچ گئی ہو۔ بہر حال میں نے حضرت میر اشرف علی قادری سے متعلق اہم اطلاعات فراہم کی ہیں ملاحظہ ہو۔ میر اشرف علی سہروردی : میر اشرف علی قصبہ رہوئی کے قدیم باشندہ حضرت سید غلام مخدوم کے بیٹے اور حضرت سید معصوم کے پوتے تھے' حضرت میر اشرف علی کے جداعلیٰ حضرت سید محمد سہروردی تھے اور حضرت سید محمد سہروردی حضرت امام ابو الحسن زید شہید ابن امام زین العابدین کی اولاد تھے ۔ میر اشرف علی کے جداعلیٰ حضرت سید محمد سہروردی کا مزار موضع رہوئی میں موجود ہے' اس خاندان میں آبائی سلسلۂ سہروردیہ رائج تھا اور حضرت میر اشرف علی اپنے خاندان میں مجاز تھے اور سجادہ نشین آبائی تھے۔ حضرت میر اشرف علی دو بھائی تھے۔ بڑے میر اشرف علی اور چھوٹے میر مشرف علی میر اشرف کے ایک بیٹے میر سید امام علی اور چار بیٹیاں۔ پہلی کی شادی خواجہ مودود چشتی کی

اولاد میں حضرت سید شاہ فخر الدین حسین ابن سید شاہ رحمٰن حسین سے ہوئی جن کے دو بیٹے شجاعت حسین اور الفت حسین صاحب اولاد ہوئے۔ میر اشرف علی کی دوسری بیٹی کے بیٹے شاہ ہنگن تھے اور تیسری بیٹی کے بارے میں کوئی اطلاع نہ مل سکی اور چھوٹی بیٹی کی شادی میر محمد عاصم نواسہ حضرت شاہ طیب اللہ نقاب پوش موڑوی سے ہوئی اور میر محمد عاصم کی بیٹی بی بی بصیر النساء عرف براتن سے حضرت شاہ محمد سجاد داناپوری کی شادی ہوئی اور انہی کے بطن سے ایک بیٹا شاہ محمد اکبر داناپوری اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ حضرت میر اشرف علی ساکن موضع رہوئی کا شجرہ نسب ملاحظہ ہو: میر اشرف علی ابن سید غلام مخدوم ابن سید معصوم ابن سید محفوظ ابن سید روح اللہ ابن سید فقیر محمد ابن سید مخدوم عالم ابن سید صدر عالم ابن حضرت سید محمد سہروردی ابن سید احمد دہلوی ابن سید مجتبیٰ دہلوی ابن سید مصطفیٰ نیشوری ابن سید حسن ابن سید یوسف ابن سید حسین طوسی ابن سید احمد ابن عبداللہ طوسی ابن سید اسد اللہ ابن سید علی ابن سید محسن ابن سید رحمۃ اللہ ابن سید حسین زاہد ابن سید اسمٰعیل ابن سید علی ابن سید حسین الفارس ابن سید یحییٰ ثانی ابن سید حسین ابن سید احمد ابن سید یحییٰ شبیہ رسول ابن سید حسین ابن حضرت امام زید شہید ابن امام زین العابدین ابن امام حسین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔ (میں ان اطلاعات کے لیے خانقاہ میتن گھاٹ کے سفائن، مخزن الانساب، کنز الانساب کا احسان مند ہوں۔)

(۶۹) "نسب نامہ جدی حضرت شاہ محمد اکبر داناپوری تذکرۃ الکرام ص ۱۸۱۴ پر اور ص ۳۱۲ و ص ۳۱۳ کے درمیان شجرہ نسب نامہ حسب ذیل درج ہے ملاحظہ ہو" ص ۱۵۸۔

(الف) تذکرۃ الکرام ص ۱۸۱۴ پر مصنف تذکرۃ الکرام کا شجرۂ نسب تا امام تاج فقیہہ موجود ہے (ب) ص ۳۱۲ و ص ۳۱۳ پر یہ نسب نامہ تو دور اس سے متعلق بھی کوئی اطلاع نہیں ہے (ج) مصنف نے تذکرۃ الکرام کا حوالہ دے کر از کعب والدمرۃ تا حضرت اکبر نسب نامہ نقل کیا ہے جبکہ مجھے تذکرۃ الکرام میں تلاش بسیار کے بعد بھی امام تاج فقیہہ سے اوپر کا نسب نامہ نہیں ملا۔ بہرحال مصنف کے پیش کردہ امام تاج فقیہہ سے اوپر کے نسب نامے سے متعلق چند باتیں قابل غور ہیں۔ ۱۔ مصنف نے امام تاج فقیہہ کے دادا امام ابوالفتح کے دادا یعنی امام ابوالقاسم کے والد کا نام "امام ابوالصالح" لکھا ہے جبکہ کنز الانساب میں "امام ابوالصایم" ہے اور مصنف تذکرۃ الکرام کی غیر مطبوعہ تصنیف تذکرۃ الکبیر میں "امام ابی صالم" ہے مصنف نے امام ابوالصالح پتہ نہیں کہاں سے نقل کیا ہے۔ ۲۔ مصنف نے جنھیں امام ابوالصالح لکھا ہے ان کے والد کا نام "امام ابودھر" بتاتے ہیں جبکہ کنز الانساب میں یہ نام "امام ابوالدھر" لکھا ہے۔ مصنف تذکرۃ الکرام کیا۔ داناپوری نے اپنی غیر مطبوعہ تصنیف میں (نسب نامہ میں) یہ لکھا ہی نہیں ہے۔ ۳۔ مصنف حضرت ابومسعود ابن ابودر ابن زبیر بن عبد المطلب کے بیٹے کا نام "امام ابودین" لکھا ہے جبکہ کنز الانساب اور تذکرۃ الکبیر

میں" امام ابوالدین" ہے ۴۔ امام ابوالدین کے بیٹے کا نام مصنف نے "امام ابوسہرہ" لکھا ہے جبکہ کنزالانساب اور تذکرۃ الکبیر میں "امام ابوسرمہ" ہے۔ ۵۔ حضرت علی علیہ السلام کے اکیسویں پشت میں حضرت سید تاج الدین کو صاحب کنزالانساب نے دہلوی لکھا ہے جسے مولف نے کالپی کر ڈالا مصنف کو شاید معلوم نہیں کہ تاج الدین کو کالپی سے کوئی تعلق نہیں۔

(۷) "حضرت اکبر کی پیدائش، ۲ شعبان المعظم ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۱ ستمبر ۱۸۴۴ء بروز چہارشنبہ بوقت اشراق شہر آگرہ محلہ نئی بستی میں واقع ہوئی" ص ۱۵۹

(الف) یہ پوری عبارت نثار اکبرآبادی کی ہے جس میں مصنف نے صرف مطابق تاریخ عیسوی اور سن عیسوی کا اضافہ کیا ہے (ب) مصنف نگار خانہ فقر رستم علی ابوالعلائی نے اشراق کے وقت کی تشریح کردی ہے فرماتے ہیں: "حضرت قبلہ و کعبہ مدظلہ بست و ہفتم شعبان ۱۲۶۰ھ روز چہارشنبہ ۹ بجے صبح کو بمقام اکبرآباد پیدا ہوئے" ص ۲۶ (ج) شہر آگرہ کے محلہ نئی بستی کے کس مکان میں حضرت اکبر کی پیدائش ہوئی حضرت اکبر خود اشرف التواریخ جلد اول میں فرماتے ہیں جس کی مصنف کو خبر نہیں "اور یہی محلہ ہے جس کے ایک مکان میں جو سوداگران کی مسجد کے اطراف واقع ہے میری پیدائش ہوئی یہ مکان مسجد کے حجرۂ شمالی کے سامنے ہے اور گلی اس مکان اور مسجد کے بیچ میں حائل ہے" ص ۶۳۰

(۱۷) حضرت اکبر کے عم حقیقی کلاں جناب سید شاہ محمد قاسم صاحبؒ عدالت عالیہ آگرہ میں بعہدہ مثل خوانی فائز تھے۔ اس عدالت عالیہ کا حاکم اعلیٰ عظیم آباد (پٹنہ) کا تھا جس نے حضرت شاہ قاسمؒ صاحبؒ کو اس عہدہ پر بحال کیا جب تک عدالت عالیہ کے قیام کے سارے مراتب طے نہ ہوئے حضرت شاہ قاسمؒ کا قیام اسی افسر اعلیٰ کے ساتھ الہ آباد میں رہا بعدہٗ آگرہ تشریف لے آئے" ص ۱۵۹

(الف) حضرت اکبر کے عم حقیقی کلاں جناب سید شاہ محمد قاسم صاحب عدالت عالیہ آگرہ میں مثل خوانی کے عہدہ پر فائز نہیں تھے بلکہ جب تک وہ الہ آباد میں رہے (چار سال) مثل خوانی کے عہدہ پر فائز رہے اور جب اکبرآباد میں صدر دیوانی کی کچہری منتقل ہوئی تو حضرت شاہ قاسم مثل خواں سے سررشتہ دار ہوگئے" جلد اول ص ۱۶ تاریخ عرب (ب) اس عدالت عالیہ کا حاکم اعلیٰ عظیم آباد (پٹنہ) کا بالکل نہیں تھا۔ مصنف نے اس سلسلہ میں آنکھ بند کرکے نثار کی عبارت نقل کرلی ہے اور کوئی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی اس حاکم کا نام شاہ اکبر صاحب دانا پوری نے تاریخ عرب جلد اول میں "لمبرٹ صاحب" لکھا ہے ملاحظہ ہو تاریخ عرب ص ۱۶

(۲۷) "آپ کے ساتھ ہی آپ کے چھوٹے بھائی سید شاہ محمد سجاد قدس سرہ بھی جو آپ کو از حد عزیز تھے مع اہلیہ آگرہ منتقل

ہو گئے اور وہاں آپ عدالت میں منصرم کی ملازمت پر بحال ہو گئے اس طرح حضرت شاہ محمد اکبر کی پیدائش اکبرآباد معروف
بہ آگرہ میں ہوئی اسی وجہ سے آپ کا نام محمد اکبر رکھا گیا" ص ۱۵۹

(الف) مصنّف کو اس کا علم نہیں ہے کہ حضرت اکبر کے ایک بڑے بھائی اور تھے اور چونکہ وہ الہ آباد
میں بمقام دائرہ شاہ اجمل پیدا ہوئے تھے اس لیے ان کا نام رکھا گیا تھا۔ محمد اجمل جنھوں نے بارہ سال
کی عمر میں اکبرآباد میں انتقال کیا۔

(۳۷) "خواجہ محمد صدیق حسن لکھتے ہیں کہ "تحصیل علم ظاہری تکمیل کو پہنچی یا نہیں مگر تعلیمات و مصنفات سے جہاں تک
اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس کے کہنے میں تامّل نہیں کہ آپ آسان عربی عبارت اچھی طرح سمجھ لیتے تھے قرآن شریف و مشکوٰۃ شریف میں
تدبر فرماتے رہتے تھے اور بعض اوقات ایسے نکات بیان فرماتے تھے کہ علما بھی متحیر رہ جاتے علمی دلچسپی کا یہ عالم تھا
علما کی بے حد قدر فرماتے اور علمی مضامین و علمی کتابوں کے مطالعہ سے تا دم آخر سیر نہ ہوئے" ص ۱۶۰

یہ عبارت مصنّف نے جذبات اکبر ص ۷ اور ص ۸ سے نقل کی دراصل جذبات اکبر کے شروع میں التماس
کے عنوان سے حضرت اکبر کے صاحب زادے حضرت شاہ محسن صاحب نے عرض حال لکھا ہے اور اس کے بعد حضرت
اکبر داناپوری کے پچیس صفحات پر مشتمل سوانح ہیں۔ سوانح کے اختتام میں صرف فقط لکھا گیا ہے اور اس کے بعد مرتب
یا مصنّف کا نام نہیں ہے۔ جذبات اکبر حضرت اکبر داناپوری کی وفات کے بعد ۱۹۱۵ء میں خواجہ محمد صدیق حسین صاحب
منیجر مطبع آگرہ اخبار کے اہتمام سے اسی مطبع سے طبع ہوا۔ اس لیے مصنف کو یہ یقین ہو گیا کہ شروع میں حضرت اکبر کے
سوانح بھی خواجہ محمد صدیق حسین صاحب ہی نے ترتیب دیے ہیں اور اسی لیے انھوں نے غلط فہمی کا شکار ہو کر مندرجہ بالا
عبارت میں باضابطہ "خواجہ محمد صدیق لکھتے ہیں" اضافہ فرما دیا ہے۔ لیکن شواہد موجود ہیں جن سے یہ بالکل واضح ہو جاتا
ہے کہ یہ سوانح نثار اکبرآبادی نے ترتیب دیے تھے اس لیے حوالجات میں اگر مرتب یا مصنف کے ساتھ عبارت پیش
کرنی ہو تو نثار کا نام دینا چاہیے۔ ۱۔ حضرت اکبر داناپوری کے پوتے اور سجادہ نشین حضرت شاہ محمد ظفر داناپوری نے
ایک رسالہ تذکرۃ الابرار لکھا تھا جو ۱۳۵۹ھ میں طبع بھی ہو گیا ۹۶ صفحات پر مشتمل اس رسالے میں حضرت ظفر اکبر
داناپوری کے سوانح حیات یوں لکھتے ہیں "حضرت مولوی سید نثار علی اکبری الاکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے قبلۂ ارباب
...وت شیخ الطریقت حضرت جدی حاجی سید شاہ محمد اکبر دانشمند داناپوری قدس اللہ سرہٗ العزیز کی سوانح حیات ایسے
...ے اور دلکش الفاظ میں تحریر فرمائی ہے کہ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ وہی خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کر دوں اور
اپنے خیالات اور عبارت آرائیوں سے کنارہ کشی اختیار کروں ملاحظہ فرمایئے اختصار میں جامعیت کی بہار ہے اور

جامعیت کے پردے میں جلوہ گر اختصار ہے" ص ۴۷ اور پھر جذبات اکبر میں شامل سوانح حیات کو نقل کیا ہے یہ ایک بہت اہم ثبوت ہے کہ اس سوانح کے مرتب و مصنف نثار اکبر آبادی ہی ہیں۔ ۲۔ جناب شاہ غفور الرحمن حمد کاکوی کی ذاتی لائبریری میں جذبات اکبر کا نسخہ میری نگاہ سے گذرا یہ نسخہ نثار اکبر آبادی نے حضرت حمد کو بھیجا ہے نثار نے اختتام سوانح کے بعد فقط کے نیچے اپنا واضح دستخط کیا ہے اور حضرت حمد کی نذر کیا ہے۔ ۳۔ ملفوظات حضرت شاہ اکبر داناپوری کے مرتب بھی نثار اکبر آبادی ہی تھے جو "دل" کے خوبصورت نام کے ساتھ طبع ہوا۔ ۴۔ اختتام سوانح کے بعد نثار نے از راہ انکسار فقط کے بعد اپنا دستخط یا اپنا نام نہیں لکھا جو کتابت میں بھی ویسا ہی رہ گیا جس کی خانہ پری نثار نے حمد کاکوی کو مطبوعہ جذبات اکبر بھیجتے وقت کر دی۔

(۴۷) "جسمانی طور پر حضرت شاہ اکبر بڑے قوی وجیہہ و شکیل تھے گورا رنگ دوہرا بدن اور کشادہ سینہ۔ کہا جاتا ہے کہ آپ ایک موٹ پانی بالٹی کی طرح کوئیں سے کھینچ لیا کرتے تھے جسے عام طور پر چرخی کے سہارے دو بیلوں سے کھینچوایا جاتا ہے۔ ورزش آپ کا معمول تھا ایک من کے دو مگدر بیک وقت لگاتار دو سو تین سو ہاتھ لگا لیتے۔ بگھی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر تنہا بیٹھا کرتے تھے غذا کافی تھی مگر کبھی کبھی کئی کئی وقت ناغہ بھی ہو جاتا شرعی پاجامہ نیچا کرتہ، اس پر صدری سر پر چوگوشیہ کلاہ اور پاؤں میں کامدار جوتیاں آپ کی وضع تھی خوبصورت گھنی داڑھی اور ترشے ہوئے لب شخصیت کی بزرگی میں اور بھی اضافہ ہوتا" ص ۱۴۱

(الف) مصنف نے یہ تمام اطلاعات بغیر کسی حوالے یا ماخذ کے پیش کر دی ہیں۔ اگر مصنف کو یہ ساری باتیں کسی سے زبانی معلوم ہوئیں تو اس کا نام پیش کرنا تھا مصنف جب اپنا تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے تو کئی اشخاص ایسے موجود تھے جنھوں نے حضرت اکبر کا دور دیکھا تھا۔ مجھے مصنف کی پیش کردہ اطلاعات میں چند ایک کو چھوڑ کر کوئی اختلاف نہیں لیکن تحقیقی مقالات میں ایسے اقتباس یا اطلاع کا کوئی مقام نہیں جس کا ماخذ یا راوی پوشیدہ رکھا گیا ہو۔ (ب) حضرت شاہ غفور الرحمن حمد کاکوی نے حضرت اکبر کی حیات کے اس پہلو پر بہت خوب روشنی ڈالی ہے یہ مستند ترین اطلاع ہے "او رفن سپہ گری و کشتی اور ہر فن کو خوب جانتے تھے ... طاقت بھی بہت اچھی تھی اسی پیرانہ سالی و علالت کی حالت میں بھی بارہ پنج سیری کی جوڑی مگدر کی ... وغیرہ روزانہ ہلاتے تھے اور کچھ نہ کچھ روزانہ کثرت بھی کر لیتے تھے" ص ۵۹ (قلمی آثار کاکو) (ج) سر پر چوگوشیہ کلاہ پر مجھے اختلاف ہے کیوں کہ "دل" ملفوظات شاہ اکبر داناپوری میں نثار اکبر آبادی حضرت اکبر کے والد حضرت شاہ سجاد داناپوری کے بارے میں لکھتے ہیں: "اور ٹوپی دو پلیا کے سوا کبھی چوگوشیہ ٹوپی نہیں پہنی" ص ۱۴ حضرت اکبر ان بزرگوں میں تھے جنھوں نے اپنے بزرگوں کی روایات اور خاصیتوں کی اپنی ذات میں بڑی نگہداشت فرمائی۔ حضرت اکبر کی ایک قلمی تصویر میں نے دیکھی ہے اس میں دو پلیا ٹوپی ہی زیب سر ہے حضرت اکبر کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے چوگوشیہ کلاہ نہیں پہنتے تھے

میں نے حضرت شاہ ظفرؒ صاحب داناپوری کو دیکھا ہے ہمیشہ دوپلیا ٹوپی پہنتے تھے اور موجودہ سجادہ نشیں حضرت شاہ اکبر جناب شاہ محفوظ اللہ بھی دوپلیا ٹوپی ہی پہنتے ہیں۔ (د) شاہ اکبر داناپوری کی وضع میں انگرکھا یا اچکن بھی ایک اہم جزو تھا اس زمانہ میں اہل علم بغیر اچکن یا انگرکھے کے گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے میں نے تصویر میں حضرت اکبر کو اچکن زیب تن کیے ہوئے دیکھا ہے۔

(۷۵) "حضرت اکبر کی شادی جناب شاہ جمال علی رحمۃ اللہ علیہ کی نواسی سے ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء میں ہوئی تھی ..... شاہ جمال علی حضرت شاہ عبدالمنان قادری دہلوی کے نواسے اور جناب شمس الدین حسین نبیرۂ سید المجذوب بن حضرت شاہ محمد یسین داناپوری کے فرزند تھے" ص ۱۶۲ و ص ۱۶۳

"حضرت آکبر کی اہلیہ کے نانا کا نام شاہ جمال علی نثار اکبر آبادی نے لکھا ہے ان کی ذاتی واقفیت داناپور کے مکمل خاندان سے نہیں کے برابر تھی جو کچھ انہوں نے اپنے پیر ومرشد حضرت اکبر داناپوری سے سنا تھا اسے اپنی یادداشت کی بنیاد پر لکھتے ہیں لیکن مصنف کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ حضرت اکبر کی شادی جناب سید شاہ جمال الدین حسین ابوالعلائی داناپوری کی حقیقی نواسی سے ہوئی تھی حضرت سید شاہ جمال الدین حسین اعلیٰ حضرت سید شاہ قمرالدین حسین کے اپنے چھوٹے بھائی اور حضرت سید شاہ شمس الدین حسین قادری داناپوری کے چھوٹے بیٹے حضرت شاہ ولی اللہ داناپوری کے پوتے اور حضرت سید شاہ عبدالمنان قادری کے نواسے تھے۔ حضرت سید شاہ جمال الدین حسین ابوالعلائی داناپوری کو صرف ایک صاحبزادی تھی اور کوئی دوسری اولاد نہ تھی ان صاحبزادی کی شادی حضرت سید شاہ ولایت حسین منعمی دلاوری قمری سے ہوئی اور حضرت سید شاہ ولایت حسین منعمی کو ان صاحبزادی بی بی غفورالنسا کے بطن سے چھ بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئیں تین بیٹے کم سنی میں فوت کر گئے اور بقیہ تین بیٹے سید کمال الدین حسین، سید ظہورالدین حسین اور سید صغیرالدین حسین تھے؛ دو صرف ایک بیٹی بی بی نعیمہ تھیں جن کی شادی حضرت شاہ اکبر داناپوری سے ہوئی۔ مصنف کو حضرت اکبر داناپوری کے خسر کا نام معلوم نہیں ہے تو اہلیہ کا نام کیا معلوم ہوگا مصنف کی فہرست کتابیات میں اکبر داناپوری کی تصنیف نذر محبوب شامل ہے اگر مصنف نے نذر محبوب کو مطالعہ کا شرف بخشا ہوتا تو حضرت سید شاہ ولایت حسین منعمی خسر حضرت شاہ اکبر پر تفصیلی معلومات حاصل ہوتیں۔ بہرحال حضرت سید شاہ ولایت حسین منعمیؒ کو بیعت وخلافت جناب حضرت صوفی دلاور علی منعمی سے تھی اور تعلیم و استرشاد اعلیٰ حضرت سید شاہ قمرالدین حسین منعمی ابوالعلائی قادری سے بھی تھا۔ حضرت سید شاہ ولایت حسینؒ نے اپنے داماد اکبر داناپوری کو ۲۸ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ کو بعد نماز جمعہ اپنے سلاسل کی اجازت وخلافت بھی عطا فرمائی تھی وہ خلافت نامہ نذر محبوب میں موجود ہے حضرت سید شاہ ولایت حسین منعمیؒ نے حضرت اکبر داناپوری کو اپنا جانشین بھی نامزد کر دیا تھا حضرت اکبر کے خسر موصوف کا انتقال ۲ر جمادی الاول ۱۲۹۲ھ کو ہوا اور حضرت مخدوم منعم پاکؒ کے پائیں حسب وصیت میتن گھاٹ

میں دفن ہوئے حضرت اکبر کی اہلیہ بی بی نعیمہ (احمدی بی بی) نے ۱۳۰۲ھ میں انتقال کیا۔ حضرت اکبر نے پھر دوسری شادی نہیں کی۔ حضرت اکبر نے اپنی تصانیف میں مختلف جگہوں پر اپنی اہلیہ کے تقوی و بزرگی کا تذکرہ کیا ہے مثلاً —— مولد فاطمی صفحہ ۴۲، کسی بھی شخصیت پر سیر حاصل گفتگو تبھی ہوسکتی ہے جب کہ اس شخصیت کا سب سے قریب ترین جز اور پہلو اہلیہ یا شوہر کے حصے پر بھی روشنی ڈالی جائے، حضرت اکبر دانا پوری کی شخصیت میں بھی ان کے استاد پیر والدین اور ماحول کے بعد سب سے بڑا حصہ اہلِ خانہ کا تھا جسے مصنف نے بالکل تشنہ چھوڑ دیا جبکہ نذر محبوب میں بھی حضرت اکبر نے اپنی اہلیہ کا تذکرہ کیا ہے جو مصنف کے کتابیات میں شامل ہے۔

(۷۶) "ادھر شاہ اکبر کی بارات رخصت ہوئی ادھر نصف شب کے قریب ان کے پیر و مرشد اور عم اقدس حضرت شاہ قاسم بھی اس دار فانی سے انتقال فرما گئے۔" صفحہ ۱۶۳

حضرت شاہ قاسم صاحب کا وصال نصف شب کو نہیں ہوا بلکہ جیسا کہ حضرت شاہ اکبر خود اپنی تصنیف نذر محبوب کے ص ۱۲ پر فرماتے ہیں: بعد نماز عصر ۷ ر شوال ۱۲۸۱ھ کو دانا پور میں ہوا۔ بارات جب عقد کے بعد دانا پور واپس آگئی تب حضرت قاسم کا وصال ہوا مصنف نے بالکل غلط لکھا ہے کہ "ادھر شاہ اکبر کی بارات رخصت ہوئی ادھر نصف شب کے قریب ... نثار کی عبارت کو مصنف سمجھ نہیں سکے ہیں نثار کی عبارت یہ ہے: "مگر بارات کی رخصت کی فکر لگی ہوئی تھی اور بار بار دریافت کرتے کہ برات رخصت ہوئی یا نہیں جب برات رخصت ہو کر آئی اور آپ سے عرض کیا گیا کہ برات رخصت ہو گئی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اب ہماری بھی رخصت ہے" برات رخصت ہو کر آئی سے صاف ظاہر ہے کہ برات بعد عقد دانا پور لوٹ آئی لیکن اس کے بعد والے جملے میں غلطی کتابت ہے یعنی "اور آپ سے عرض کیا گیا کہ برات رخصت ہو گئی" "کی جگہ" اور آپ سے عرض کیا گیا کہ برات رخصت ہو کر آ گئی" ہونا چاہیے تھا۔ اور کیا ہونا اور کیا نہیں ہونا چاہیے تھا اس سے بحث نہیں ہے مصنف کے سامنے نذر محبوب موجود تھی خود اکبر کی زبانی ان کی شادی کا حال موجود تھا تو انھیں اتنا شوق کیوں ہو گیا کہ وہ نثار کا جملہ یا اطلاع بغیر نثار کا حوالہ دیے ہوئے نقل کریں۔ نثار نے وقت انتقال حضرت قاسم بھی غلط بتایا ہے جسے مصنف نے شوق سے بغیر حوالے کے نقل کرنے کا شرف حاصل کیا۔

(۷۷) "آپ کی شادی کے بعد ہی ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں آپ کے والد محترم سید شاہ محمد سجاد قدس سرہ کا بھی وصال ہو گیا" صفحہ ۱۶۵

حضرت اکبر دانا پوری کی شادی ۱۲۸۱ھ میں ہوئی اور حضرت اکبر کے والد شاہ سجاد صاحب کا وصال ۱۲۹۸ھ میں ہوا درمیان میں سترہ سال کا طویل عرصہ ہے پھر بھی "شادی کے بعد ہی" لکھنا سمجھ میں نہیں آتا۔ ص ۱۶۶ پر (الف) حرمین کے ساتھ شریف کا استعمال مصنف کو زیب نہیں دیتا شریفین لکھنا تھا (ب) مصنف نے حضرت اکبر کے سفر حج کا

اقتباس جذبات اکبر سے نقل کیا ہے اور جذبات اکبر کے مرتب نے اشرف التواریخ سے نقل کیا ہے مصنف کی فہرست میں اشرف التواریخ شامل ہے اگر مصنف نے اشرف التواریخ کا مطالعہ کیا ہے تو اس کے اقتباس کے لیے جذبات اکبر کی طرف کیوں رجوع کیا۔

(۷۸) مصنف نے جذبات اکبر سے تصنیفات حضرت اکبر کی فہرست نقل کرتے وقت دو تصانیف کو چھوڑ دیا ہے۔(۱) تحفۂ مقبول (۲) تاریخ عرب۔ تصانیف حضرت اکبر پر تفصیلی بحث مصنف کے عنوان "حضرت اکبر داناپوری کی تصانیف نثر پر ایک نظر" کے تحت کروں گا۔

(۷۹) " ... الآخر ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء سے آپ کی صحت گرنے لگی پانچویں محرم الحرام ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء کو داناپور سے آگرہ تشریف لے گئے اس وقت طبیعت کچھ اچھی تھی مگر ماہ صفر المظفر کے اخیر سے مرض الموت کا سلسلہ شروع ہوا" ص ۱۶۹

۱۳۲۶ھ تک حضرت اکبر صحیح و تندرست تھے ۱۳۲۷ھ ماہ صفر کے اخیر سے سلسلۂ علالت شروع ہوا ملاحظہ ہو نثار اکبر آبادی کیا فرماتے ہیں: "پانچویں محرم الحرام ۱۳۲۷ھ کو آگرہ تشریف لے گئے اس وقت تک آپ صحیح و تندرست تھے آخر صفر سے آثار سفر یعنی سلسلۂ علالت شروع ہوا" ص ۲۱ مصنف نے پہلے تو بلا ثبوت و سند ۱۳۲۶ھ سے حضرت اکبر کی صحت گرانا شروع کیا اور پانچویں محرم الحرام ۱۳۲۷ھ کو جب حضرت آگرہ تشریف لے گئے، تو بقول نثار صحیح و تندرست تھے۔ لیکن مصنف نے اچھی خاصی طبیعت کو کچھ اچھا بتا دیا۔

(۸۰) "حسب وصیت اپنے والد ماجد کے پہلو میں حلقۂ آستانہ قدیم چشتیہ نظامیہ داناپور میں تقریباً ۹ بجے شب کے تدفین عمل میں آئی"

(الف) مصنف کے والد قبلہ داناپوری کے نزدیک حضرت اکبر جہاں دفن ہوئے وہ حلقۂ آستانہ قدیم چشتیہ نظامیہ داناپور نہ ہو کر حلقۂ حضرت سید شاہ شمس الدین حسین قادری داناپوری ہے (خزینۃ الانوار) (ب) نثار اکبر آبادی حضرت اکبر کی تدفین کا حال لکھتے ہوئے کہتے ہیں: "بارہ بجے شب کو تدفین سے فرصت ہوئی" (ص ۲۵ جذبات اکبر) مصنف نے ۹ بجے کی اطلاع کہاں سے نقل کی۔

(۸۱) مصنف نے حضرت اکبر کے سوانح کو ختم کر کے حضرت تمد کاکوی کا وہ قطعۂ تاریخ نقل کر دیا ہے جو انھوں نے "جذبات اکبر" کے طبع کے وقت کہا تھا اور جو جذبات اکبر میں چھپا ہوا موجود ہے۔ اس قطعہ کے بجائے مصنف کو چاہیے تھا کہ وہ ان قطعات کو جمع کرنے کی سعی کرتے جو حضرت اکبر داناپوری کے انتقال پر کہے گئے تھے افسوس کہ مصنف نے اس سلسلے میں کوئی کد و کاوش نہیں کی یہاں تفصیل میں جانے کی اجازت نہیں ہے اس لیے حضرت تمد

جنھوں نے کئی قطعات لکھے ہیں ان کے ایک قطعہ پر اکتفا کرتا ہوں ؎

حضرت شاہ محمد اکبر   شد کفن پوش و زیر خاک چو خفت

حمد دل خستہ سال ترحیلش   ہائے فخر بہار اکبر گفت ۱۳۲۷

حضرت حمد کاکوی نے اکبر داناپوری کے انتقال پر کئی قطعات کہے ہیں اور جناب شیخ محمد علی صاحب شمشاد عظیم آبادی شاگرد حضرت شاہ جنت آرام گاہ کا قطعہ بر وصال حضرت اکبر جذبات اکبر میں چھپا ہوا موجود ہے ۱۹ اشعار پر مشتمل اس قطعہ میں مندرجہ ذیل مصرعہ سے سال وفات برآمد ہوتا ہے ؎

خلد کو ہائے گئے شاہ محمد اکبر

حضرت اکبر داناپوری کے صاحب زادے حضرت شاہ محسن داناپوری کا قطعہ جو تربت شاہ اکبر داناپوری کی لوح پر کندہ ہے 'زبان فارسی میں ان کی دستگاہ کا یہ آئینہ ہے ؎

دریغا والد ماجد زفرقم سایہ برچیدند الخ

حضرت اکبر داناپوری رسالوں کتابوں اور تذکروں میں

(۸۲) اس عنوان کے تحت مصنف نے صرف چھ کتابیں پیش کی ہیں جہاں انہیں حضرت اکبر کا تذکرہ مل سکا۔ حالاں کہ خود مصنف کی فہرست کتابیات میں کم از کم سات کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں شاہ اکبر داناپوری کا تذکرہ باضابطہ موجود ہے لیکن مصنف ان سے لاعلم ہیں وہ کتابیں یہ ہیں (۱) کنز الانساب و کیفیت العارفین۔ از حاجی سید شاہ عطا حسین فانی داناپوری (۲) تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب و اسلام۔ شاہ محمد کبیر عرفان داناپوری (۳) تذکرۃ الصالحین۔ از مولوی حسیب اللہ عمادی (۴) خزینۃ الانوار۔ از شاہ محمد قائم قتیل داناپوری (۵) تجلیات الانوار قلمی۔ از حکیم شاہ محمد شعیب صاحب رضوی پھلواری (۶) مقدمہ جذبات اکبر۔ نثار اکبر آبادی (۷) حاشیہ کیفیت العارفین۔ از شاہ حسین الدین احمد منعمی صافی گیاوی۔ جذبات اکبر کے اخیر میں جناب مرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبر آبادی اور مرزا عبدالرحمٰن عرف مرزا زاہد زاہد اکبر آبادی کی تقریظیں چھپی ہوئی موجود ہیں جس میں شاہ اکبر کے کلام پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ افسوس مصنف نے ان تقاریظ کو بھی اس قابل نہیں سمجھا کہ اسے اپنے اس عنوان کے تحت متعارف کرائیں۔

(۸۳) مصنف کے فہرست کتابیات سے باہر بھی میرے علم میں کئی تذکرے اور تصانیف ایسی ہیں جن میں ر داناپوری کا تذکرہ موجود ہے اور جو مصنف کے علم میں نہیں ہیں: (۱) آثار کاکو مصنفہ شاہ غفور الرحمٰن حمد کاکوی

(شاگرد اکبر داناپوری) یہ طبع بھی ہو گئی ہے لیکن طبع میں اصل سے اختصار برتا گیا ہے۔ (۳) دل ملفوظات شاہ اکبر داناپوری مرتبہ نثار اکبر آبادی (۳) نگار خانہ فقر مصنفہ رستم علی ابوالعلائی (۴) الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور معروف بہ تذکرہ صادقہ مصنفہ عبدالرحیم صادقپوری (۵) تذکرہ ابرار مصنفہ شاہ محمد ظفر داناپوری (نبیرہ و سجادہ نشیں اکبر داناپوری) (۶) زندگانی بے نظیر مصنفہ عبدالغفور شہباز (۷) سلسلہ انتخاب کلام شعرائے بہار۔ کلام اکبر داناپوری۔ عطا کاکوی (۸) روزنامہ صداقت ۲۳ / اکتوبر ۱۹۶۲ء کھلی چٹھی از قتیل داناپوری (۹) سفینہ، سہ ماہی، شمارہ ۳ جولائی، ستمبر ۱۹۸۲ء اکبر داناپوری، از عطا کاکوی (۱۰) بزم ابوالعلا مصنفہ۔

شاگردان اکبر

(۸۴) **(۱) جناب شاہ غفور الرحمٰن صاحب حمد کاکوی:** حضرت حمد کا خاندان خود مشائخین کرام کا خاندان تھا مگر آپ کو بیعت حضرت سید شاہ محمد سجاد ابوالعلائی داناپوری سے تھی" ص ۱۷۸

حضرت حمد صرف بیعت ہی نہ تھے بلکہ حضرت سید سجاد صاحب نے انہیں اجازت و خلافت بھی عطا فرمائی تھی۔ حضرت حمد کاکوی اپنی تصنیف آثار کاکو میں فرماتے ہیں: "اور بتاریخ ۷ ربیع الثانی ۱۲۹۷ ہجری بعد نماز مغرب میرے قیام گاہ پر جو خانقاہ تھی آپ تشریف لائے اور طریقہ قادریہ میں میری بیعت لے لی اور اسی وقت از راہ نوازش اجازت و خلافت سے بھی مشرف فرمایا"، ص ۸۵

(۸۵) "حضرت حمد ابتداءً وحضرت وحید کے شاگرد رہے ان کے بعد حضرت اکبر کو ہی اپنا کلام دکھانے لگے اور ان کے شاگردوں کے زمرہ میں آگئے" ص ۱۷۸۔

"سید احمد اللہ ندوی مصنف تذکرہ مسلم شعرائے بہار کی غلط اطلاع نے مصنف کو بھی گمراہ کر دیا۔ پتہ نہیں سید احمد اللہ ندوی کو یہ اطلاع کہاں سے ملی تھی کہ حضرت حمد وحید الہ آبادی کے شاگرد تھے۔ حضرت حمد کاکوی صرف اور صرف اکبر داناپوری کے شاگرد تھے اپنی شاعری سے متعلق حمد خود فرماتے ہیں: "گھر کا ماحول تو شاعرانہ نہ تھا موزونی طبع ودیعت الٰہی ہے اسی موزونی طبع کے باعث شعر و شاعری کی طرف رغبت بڑھی شاعری لاکھ فطری سہی پھر بھی یہ ایک فن ہے اور بغیر کسی استاد کی رہنمائی کے ترقی کرنا مشکل ہے۔ جب پہلے پہل ایک غزل کہی تو فکر ہوئی کہ کسی استاد سے اس پر اصلاح لی جائے۔ نظر انتخاب جناب شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری پر پڑی۔ آپ ہمارے حضرت پیر و مرشد کے فرزند تھے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان سے ایک قلبی تعلق بھی تھا الغرض اپنی غزل بذریعہ ڈاک داناپور روانہ کر دی اب یہ بھی یاد نہیں کہ کوئی تخلص بھی اپنا رکھا تھا یا نہیں۔ حضرت استادی نے میرا تخلص "حمد" تجویز کیا۔ غزل پر اصلاح فرمادی حضرت استادی چونکہ اکثر مختلف مقامات مثلاً الہ آباد، آگرہ، گوالیار، اجمیر شریف وغیرہ پر اقامت پذیر رہتے تھے۔ اصلاح کا سلسلہ برابر ڈاک

ہی کے ذریعہ سے ہوتا رہا اور اسی طرح کل دس بارہ غزلیں حضرت کی اصلاح سے مزین ہوئیں اس کے بعد پھر اس کا موقع نہ ملا۔ جو کچھ کہا۔ اچھا یا برا۔ اپنی ہی طبیعت سے کہا۔ رفتہ رفتہ اردو کے دو دو اوین مرتب ہوگئے" (آثار کاکو صفحہ ۱۸۷۔۱۸۸)
حکیم سید احمد اللہ ندوی صاحب کو حمد کاکوی کے سلسلے میں غلط فہمی ہوگئی ہے، لیکن مصنف کو اس سلسلے میں صرف ندوی صاحب پر تکیہ نہیں کرنا چاہیے تھا پٹنہ میں حمد کے صاحب زادے عطا کاکوی موجود ہیں ان سے استفادہ کرنا چاہیے تھا۔ حمد کے نمونہ کلام وغیرہ کے لیے بھی مصنف نے تذکرہ مسلم شعرائے بہار کے علاوہ کسی اور ذریعہ کی تلاش نہیں کی ہے۔

(۸۶) (۲۱) **مولانا سید نثار علی صاحب نثار اکبر آبادی:** "اکبر آباد (آگرہ) کے قدیم خاندان سادات کے چشم و چراغ تھے۔ اپنے وقت کے مشہور ہفت رقم کاتب تھے۔ شاہ اکبر صاحب کے دیوان دوم جذبات اکبر کی کتابت آپ ہی نے کی تھی" ص ۱۸۰

(الف) نثار اکبر آبادی آگرہ کے قدیم خاندان سادات کے چشم و چراغ نہیں تھے بلکہ مضافات لکھنؤ میں واقع قصبہ نیوتنی کے خاندان سادات کے چشم و چراغ تھے۔ اکبر آباد میں نثار کے والد میر مشتاق علی ابن میر سعادت صاحب وکالت دیوانی و فوجداری کا شغل کرتے تھے (ب) نثار کو ہفت رقم کاتب کس نے لکھا ہے ؟ (ج) شاہ اکبر صاحب کے دیوان دوم جذبات اکبر کی کتابت نثار اکبر آبادی نے نہیں کی تھی بلکہ جذبات اکبر کی کتابت حافظ فیض اللہ بیگ فگار ابو العلائی اکبر آبادی نے کی تھی جذبات اکبر صفحہ ۹۶ پر فگار کا کلام مندرجہ ذیل سرخی کے ساتھ طبع ہوا ہے "قطعہ تاریخ از نتیجہ فکر حافظ فیض اللہ بیگ فگار ابو العلائی الاکبری اکبر آبادی کاتب دیوان شریف"۔

(۸۷) مصنف کو یہ نہیں معلوم ہے کہ نثار اکبر آبادی اثنا عشری عقائد کے پیرو تھے' اپنے والد میر مشتاق علی صاحب کے بارے میں نثار خود لکھتے ہیں:

"جناب والد ماجد اکبر آباد شریف میں وکالت دیوانی و فوجداری وغیرہ کا شغل کرتے تھے نہایت مہذب اور مستعلیق بزرگ تھے مذہب ان کا اثنا عشری تھا مگر متعصب نہ تھے" (دل ص ۲)

نثار اکبر آبادی خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں: "میں نابالغی کے زمانے تک اسی مذہب پر رہا جب مجھ کو شعور ہوا تو میں نے اپنی استعداد کے موافق تحقیقات کی جس کا بیان بہت طول ہے اور یہاں پر مجھے بات کو بڑھانا منظور نہیں ہے" (دل ص ۳) اس کے بعد نثار اپنے ان خیالات و تجربات کا اظہار فرماتے ہیں جن کی وجہ کر انھوں نے اثنا عشری عقائد کو خیر باد کہا، اور اکبر آبادپوری سے بیعت ہوئے جس کا آئینہ نثار کے وہ اشعار ہیں جنہیں مصنف نے بھی نقل کیا ہے ؎

سینہ کوبی بھی ہے نالۂ شب گیر کے ساتھ | چھیڑیے راگ محبت کا مزامیر کے ساتھ
لطف اصحاب بھی ہو الفت شبیر کے ساتھ | لطف قرآں کی تلاوت کا ہے تفسیر کے ساتھ

(۸۸) (۳) **مولوی وزیر خاں فضا اکبر آبادی ثم اجمیری:** "حضرت شاہ اکبر داناپوری کا قیام چونکہ زیادہ تر آگرہ اور اجمیر شریف کے علاقوں میں رہا اس لیے آپ کے مریدوں اور شاگردوں کی کثیر تعداد انہیں اطراف میں زیادہ پائی جاتی ہے" ص۱۸۳

مصنف کو یہ علم کیوں کر ہوا کہ حضرت اکبر کے مریدین و شاگردان کی کثیر تعداد آگرہ اور اجمیر شریف کے علاقوں میں پائی جاتی ہے، مریدین کی فہرست نہ تو میرے پاس ہے اور نہ مصنف کے پاس ہوگی اس لیے مریدین کے سلسلے میں کچھ کہنا غیر تحقیقی ہے لیکن مصنف نے تیس شاگردان حضرت اکبر کا تذکرہ کیا ہے جن میں صرف تین حضرات غیر بہاری ہیں اور وہ یہ ہیں (۱) نثار اکبر آبادی (۲) فضا اکبر آبادی ثم اجمیری (۳) شوق اجمیری، مصنف اگر صحیح بھی کہہ رہے ہیں تو بے بنیاد کہہ رہے ہیں اور اس کا ثبوت فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

(۸۹) (۴) **منشی امیر اللہ ابو العلائی شوق اجمیری:** مصنف کو منشی شوق اجمیری کا احوال کچھ بھی نہ مل سکا ہے لیکن بجائے اظہار واقعی مصنف نے انشاء نگاری سے کام لے کر چند سطریں لکھ ہی ڈالی ہیں۔ شوق کی ایک طرحی غزل نمونۃً پیش کی گئی ہے جس کے بارے میں مصنف فرماتے ہیں۔

"ایک مخصوص مشاعرے کی طرحی غزل نمونۃً درج ذیل ہے"

دراصل یہ غزل گلدستہ بہار جلد اوّل نمبر ۲ کے ص ۲۹ پر طبع ہوئی ہے، مصنف کو اپنے ماخذ کی وضاحت کردینی چاہیے تھی اور اس کی کیا سند ہے کہ اسے کسی مشاعرے میں پڑھا گیا ہو؟ مصنف نے شوق کو اکبر کے عزیز ترین مریدوں میں لکھا ہے۔ یہ مصنف کے اپنے دماغ کی اُپج ہے۔ ان کے عزیز ترین مریدوں میں ہونے کا مصنف کے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ حضرت اکبر نے نذر محبوب میں اجمیر شریف والوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں شوق نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں شوق حضرت سجاد کے مرید ہوں گے۔

(۹۰) (۵) **جنگ بہادر خاں سیف رئیس فرخ آباد:** مصنف نے نمونۃً جو اشعار پیش کیے ہیں وہ سب کے سب نسیم داناپوری سے ماخوذ ہیں چوں کہ مصنف اپنا ماخذ پوشیدہ رکھنا حسن سمجھتے ہیں اس لیے بحالت مجبوری مجھے ماخذ کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری ادا کرنی پڑ رہی ہے۔

(۹۱) (۶) **قیس گیاوی:** "بابو رام پرشاد صاحب وکیل گیا کے مشہور رئیس تھے، اردو شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا۔ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کا بھی کافی ذوق تھا ایک کائستھ گھرانے کے لائق اور ذہین فرد تھے۔ شعری و ادبی ذوق کے تحت آپ نے گیا میں ایک لٹریری کلب بھی قائم کیا جہاں شعر و سخن کی محفلیں برابر منعقد ہوا کرتیں۔ شعر میں آپ قیس تخلص فرماتے تھے اور حضرت شاہ اکبر داناپوری کے شاگرد تھے۔ بابو رام پرشاد قیس گیا کا مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے قیس گیاوی نے گیا ہی میں ۸ ۱۹ء میں

اس دارفانی سے کوچ کیا" ص ۱۸۶

(الف) بابو رام پرساد صاحب وکیل گیا منشی سنجیون لال دیوان (سات آنے) راج ٹکاری کے بیٹے تھے (ب) اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کے بھی کافی ذوق کا علم تلخی کو نہیں تھا اور اگر مختار احمد عاصی نے ایسا لکھا ہے تو تلخی کے مقابلہ میں مختار نے قیس کا جو احوال پیش کیا ہے وہ اس قابل نہیں ہے کہ انہیں تلخی پر فوقیت دیا جائے۔ (ج) لٹریری کلب قیس نے ۱۸۹۸ء میں قائم کیا تھا (د) جہاں شعر و سخن کی محفلیں برابر نہیں بلکہ بقول تلخی ہر مہینہ مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا اور مشاعروں کی غزلوں کا گلدستہ بھی شائع ہوتا تھا۔ ان گلدستوں میں سے ایک گلدستہ تلخی کی نگاہ سے گذرا تھا اور اسی گلدستہ سے انھوں نے قیس کا کلام اخذ کیا ہے، بقول تلخی وہ گلدستہ خدابخش لائبریری میں موجود ہے۔ میں نے اسے ابھی تک تلاش نہیں کیا ہے (ہ) قیس کا مختصر مجموعہ کلام ۱۹۱۳ء میں یادگار قیس کے نام سے حسین بخش شرر گیاوی نے شائع کیا تھا اور شفق عماد پوری نے اس کا دیباچہ لکھا تھا (و) قیس نے ۱۹۰۸ء میں کوئی پچاس سال کی عمر میں بقول تلخی انتقال کیا۔ لیکن بیچارے تلخی کو کیا معلوم تھا کہ ان کے بعد جب تحقیق شعور اور بالیدہ ہوتا جائے گا تو ان کے بتائے "کوئی پچاس سال" کو لوگ سیدھے سیدھے "پچاس سال" لکھیں گے (ز) مصنف کو اس کا علم نہیں ہے کہ قیس نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ تفصیل کے ملاحظہ ہو تلخی۔

(۹۲) قیس سے متعلق حضرت اکبر داناپوری کے اکثر اشعار جذبات اکبر میں شامل ہیں جن کی مصنف کو خبر نہیں۔

(الف) مثلاً گیا شہر میں لٹریری کلب سے متعلق جو ایک قطعہ جذبات اکبر میں بھی شامل ہے۔ حضرت اکبر داناپوری اس ادبی انجمن یا لٹریری کلب کے ایک مشاعرے میں شریک ہوئے تھے۔ چنانچہ اس انجمن اور مشاعرے کا پورا نقشہ اپنے قطعے میں اکبر داناپوری نے کھینچا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:

خزینہ دار ہے اس بزم علمیہ کا قیس	کلام قیس ہے بے شبہہ قیس کی لیلا
صمد کی فکر مقدس بھی اس پہ مائل نعت	اسی کلام کو زیبا ہے با وضو سننا
نیابت اس کو ملی قیس پاک طینت کی	اس انجمن کی انہیں دونوں کے ہے دم سے بقا

۹۳) مست گیاوی: "آپ نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی" ص ۱۸۷

بابو نند کشور لال مست گیاوی نے صرف ایم اے نہیں کیا تھا بلکہ وہ ایم اے بی ایل تھے اور وہ بھی مجلس سید یا لٹریری کلب کے ممبر تھے۔ حضرت شاہ اکبر داناپوری خود فرماتے ہیں ؎

ایک ممبر نند کشور لال ہیں	ہے تخلص مست صاحب حال ہیں
ایم اے بی ایل دیا کینہ سخن	میں انہیں کہتا ہوں اکثر جان من

میرے سچے دوست میرے مبتلا　　بالیقیں ہے مجھ سے ان کا دل ملا

ایک دوسری جگہ حضرت اکبر فرماتے ہیں ؎

عجب مذاق کے رندانہ شعر مست کے ہیں　　کہ جس نے سنا وہ ہمیشہ مست رہا

(۹۴) دوست محمد علم گیاوی: "علم کا تذکرہ مختصراً صرف بلخی نے تاریخ شعرائے بہار میں کیا ہے" ص ۱۸۸

علم کا تذکرہ سید احمد اللہ ندوی نے بھی تذکرہ مسلم شعرائے بہار میں کیا ہے یہ الگ بات ہے کہ مصنف کی مانند ندوی صاحب کی حیثیت بھی علم کے احوال میں بلخی کے ناقل کی ہے۔ کچھ بھی اضافہ نہ کر سکے ہیں۔

(۹۵) سید شاہ نظیر حسن صاحب نظیر دانا پوری: خاندان کے بزرگوں سے تعلیم و تربیت حاصل کی شعر و سخن سے کافی دلچسپی تھی۔ شاہ محمد سجاد صاحب کے صاحبزادے شاہ محمد اکبر صاحب سے فن شعر میں تلمذ حاصل کیا نعتیہ اشعار کہنے کا شوق تھا اس لیے آپ کا بیشتر کلام نعت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی مشتمل ہے۔ میلاد خواں حضرات میلاد شریف کی محفلوں میں آپ کی نعتیں بڑے ترنم سے پڑھتے ہیں....

حضرت شاہ نظیر حسن صاحب ایک نہایت جہاں دیدہ، دور اندیش اور تجربہ کار صوفی بزرگ تھے" ص ۱۴۱

(الف) شاہ نظیر حسن صاحب نظیر دانا پوری کو بیعت اپنے حقیقی ماموں سید شاہ محمد سجاد دانا پوری سے تھی اور اجازت وخلافت بھی انہیں سے حاصل تھی۔ حضرت نظیر کو حضرت فانی سے بھی فیض پہنچا تھا اور خرقہ خلافت عطا ہوا تھا (ب) مصنف نے کو تین غزلوں کے اشعار نقل کیے ہیں جو نسیم دانا پور سے بغیر حوالے کے نقل کیے گئے ہیں۔ لیکن مصنف کا دعویٰ ہے کہ نظیر کا بیشتر کلام نعت ہوتا تھا اگر یہ صحیح بھی ہے تو مصنف اسے ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں (ج) اگر مصنف نے بذات خود میلاد شریف کی محفلوں میں نظیر کی کہی نعتیں سنی تھیں تو انہیں ضرور اپنے تحقیقی مقالے میں نقل کرنا چاہیے تھا ان کو دوام بخشنے کا اس سے اچھا ذریعہ دوسرا نہ ہوتا (د) حضرت شاہ نظیر حسن نظیر دانا پوری کی صفتیں مصنف نے نہایت جہاں دیدہ، دور اندیش اور تجربہ کار لکھی ہیں کسی صوفی کے لیے یہ صفتیں پتہ نہیں کہاں تک مناسب ہوں گی اس کی وضاحت تو مصنف ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر انہیں حوالے کے ساتھ کچھ بھی لکھنے کی عادت ہوتی تو احمد اللہ ندوی کا مندرجہ ذیل جملہ نقل کرتے "آپ (نظیر دانا پوری) عالم جید تھے اپنے گھر میں دینیات کا ایک بڑا مدرسہ حنفیہ نعمانیہ کے نام سے کھول رکھا تھا۔ زندگی بھر لوجہ اللہ اس میں درس دیتے رہے۔ نہایت خلیق و منکسر مزاج تھے" جلد ۵ ص ۸۱ حضرت شاہ عطا حسین فانی دانا پوری جو نظیر کے مرشد بھی تھے اور رشتہ میں دادا بھی کنز الانساب میں فرماتے ہیں: "شاہ نظیر حسن سلمہ جو داست بپایہ ثبات و تعلیم وذی شعور در علم عربیت بے نظیر و عبارت فارسی نیز تحصیل کثیر بسیار در طبیعت دارد صلاحیت" ص ۲۸۹

(۹۶) قاضی سید مظاہر امام مظاہر گیاوی: "آپ کو ذوق سخن بھی تھا اور شرف تلمذ شاہ اکبر صاحب دانا پوری سے تھا" ص ۱۹۰

(الف) حضرت شاہ اکبر داناپوری سے تلمذ کی اطلاع مصنف کو کہاں سے ملی؟ احمد اللہ ندوی صاحب نے قاضی مظاہر گیاوی صاحب کا مستند اور تفصیلی حال جمع کیا ہے۔ انہیں حضرت اکبر سے تلمذ کا علم نہیں ہے۔ مصنف نے اپنی فہرست میں تذکرہ مسلم شعرائے بہار کو بھی دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس سلسلے میں انہوں نے اس کتاب سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ بقول سید احمد اللہ ندوی قاضی سید مظاہر امام منعمی صاحب کو حسرت بیتھوی سے تلمذ تھا۔ (ب) قاضی سید مظاہر امام صاحب صرف مظاہر تخلص نہیں استعمال فرماتے تھے بلکہ ان کا تخلص سید بھی تھا۔ چنانچہ سید احمد اللہ ندوی صاحب نے ان کا یہی تخلص پیش کیا ہے (ج) مصنف اگر قاضی صاحب موصوف کے سلسلے میں ندوی صاحب کی طرف رجوع کرتے تو اچھا خاصہ نمونۂ کلام بھی حاصل ہو سکتا تھا۔

(۹۷) سید شاہ محمد کبیر ابوالعلائی عرفاں داناپوری: (الف) مصنف نے عرفاں کی منظوم تصانیف "عقائد وجیہہ" اور تاج فقیہہ کا صرف نام سنا ہے۔ میں نے ان کا تعارف گذشتہ صفحات میں مع نمونہ اشعار کرا دیا ہے (ب) عرفاں کی ایک ضخیم منظوم تصنیف غیر مطبوعہ "تذکرۃ الکبیر فی اخبار البشر" زبان فارسی میں کتب خانہ خانقاہ منعمیہ قمریہ میتن گھاٹ میں موجود ہے اور مصنف کے دست خاص کا نوشتہ ہے (ج) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مختصر رسالہ بزبان اردو بھی عرفاں داناپوری کی تصنیف بدست عرفاں لکھا ہوا خانقاہ میتن گھاٹ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۹۸) (۱۶) محمد یوسف خاں یوسف داناپوری: "حضرت اکبر کے ممتاز شاگردوں میں یوسف کا رتبہ بلند ہے یوسف صاحب صاحبِ اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ حضرت اکبر کی زندگی میں ہی یوسف کے شاگردوں کی تعداد بڑھ رہی تھی یوسف کے تلامذہ میں محمد نثار الدین نثار داناپوری طبیر الحسن شوکت داناپوری اور عبدالسبحان خاں فضا داناپوری ساکن اردلی بازار مشہور تھے۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت اکبر کے شاگرد رشید جناب نیر داناپوری کی دیکھا دیکھی جناب یوسف نے بھی ایسے کچھ شاگرد تیار کر لیے تھے اور رسالوں میں ان کا تذکرہ بھی موجود ہے مگر یوسف بذات خود کسی استادانہ حیثیت کے حامل نہ تھے۔ ان کا کلام اس بات کا پتہ نہیں دیتا۔ ایسے طور پر وہ غزلیں اور اکثر اچھی غزلیں کہہ لیا کرتے تھے مشق و ریاض نے پرگوئی پیدا کر دی تھی" ص ۱۹۶

یوسف حضرت اکبر کے شاگرد تھے، مصنف کو یہ اطلاع کہاں ملی؟ مصنف نے یوسف کا جو بھی کلام پیش کیا ہے وہ نسیم داناپور سے ماخوذ ہے اور نسیم داناپور میں جتنے شعرا کا کلام شامل ہے ان کے کلام سے قبل سرخی میں احتیاط کے ساتھ "فلاں شاگرد فلاں" ضرور لکھا گیا ہے۔ لیکن یوسف کے نام کے ساتھ شاگرد اکبر داناپوری نہیں لکھا ہے مصنف کو کلام تو نسیم داناپور سے ملا لیکن اکبر سے شاگردی کی اطلاع کس نے دے دی؟

(۹۹) (۱۹) عبدالواحد خاں کوثر داناپوری "جناب کوثر حضرت اکبر داناپوری کے ارشد تلامذہ میں تھے اور حضرت نیر کو

بھی اپنا کلام دکھاتے تھے اور زیادہ ان ہی سے اصلاح لیتے تھے" ص

نسیم دانا پور، بلخی اور احمد اللہ ندوی کے یہاں صرف اکبر دانا پوری کا شاگرد ہونا لکھا ہے مصنف کو یہ اطلاع کہاں سے مل گئی کہ وہ اپنا کلام زیادہ تر نیر دانا پوری کو دکھاتے تھے۔

(۱۰۰) (۲۲) **شیخ نسیم اللہ نسیم دانا پوری:** نسیم دانا پور کے نام سے جن مشاعروں کی روداد طبع ہوئی ان مشاعروں کے میر مشاعرہ نسیم ہی تھے تینوں مشاعروں میں انھوں نے کلام پڑھا تھا ان کے کلام سے قبل کی سرخیوں میں کہیں انہیں شاگرد اکبر دانا پوری نہیں لکھا گیا ہے۔ مصنف کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ اکبر دانا پوری کے شاگرد تھے؟

(۱۰۱) (۲۸) **محمد بشارت الحق نازش:** "سید عزیز الدین بلخی نے اپنی کتاب تاریخ شعرائے بہار میں نازش کو حضرت شاہ محمد اکبر دانا پوری کا شاگرد لکھا ہے ص ۵۴ ا۔ محمد بشارت الحق نام اور نازش تخلص تھا۔ والد کا نام سید نور الحسن دانش تھا۔ دانش تخلص سے پتہ چلتا ہے کہ نازش کے والد بھی شاعر تھے اور نازش نے شاعری کا فن ترکے میں پایا تھا۔ مضافات عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے تھے ۱۲۹۵ھ میں آپ نے انتقال کیا۔ مزید حالات کا علم نہ ہوسکا" ص۲۰۸

(الف) محمد بشارت الحق کا تذکرہ بلخی، لالہ سری رام اور احمد اللہ ندوی تینوں نے کیا ہے (ب) لالہ سری رام نے بشارت الحق کا تخلص دانش لکھا ہے اور بشارت الحق کے والد کا تخلص نازش لکھا ہے جبکہ بلخی اور ندوی نے اس کے برخلاف باپ کا تخلص دانش اور بیٹے یعنی بشارت الحق کا تخلص نازش لکھا ہے چونکہ دونوں بہاری متفق ہیں اس لیے بلخی اور ندوی کا قول ہی صحیح ہے لالہ سری رام کو غلط فہمی ہوگئی۔ اس کا ذکر ضروری تھا (ج) محمد بشارت الحق نازش مولوی نور الحسن دانش کے بیٹے تھے اور سید اولاد علی کاہش گیاوی کے اپنے پوتے تھے۔ (د) آبائی وطن جونپور تھا لیکن گیا میں اقامت اختیار کرلی تھی۔ بقول لالہ سری رام صاحب گنج میں ایک مسجد کے امام تھے اور اسی مسجد میں اپنے اہتمام سے ایک مدرسہ تعلیم دینیات کا قائم کر رکھا تھا جس میں خود درس دیتے تھے۔ (ہ) لالہ سری نے سن انتقال ۱۳۲۹ھ غلط لکھا ہے۔ بلخی اور ندوی کا پیش کردہ سن انتقال درست ہے۔ بقول ندوی طاعون کی وبا میں گرفتار ہوکر ۲ محرم ۱۲۹۵ھ کو انتقال کیا شمشاد لکھنوی نے قطعہ کہا ہے

لائی تاریخ اجل اپنے ساتھ ::: <u>مٹ گیا نام و نشان کاہش</u>

(۱۰۲) (۲۹) **بابو پرنو چندر آمادہ دانا پوری:** نسیم دانا پور میں ۹۵ تا ۱۲ شریک نہیں ہیں۔ ان کو شاہ اکبر دانا پوری کا شاگرد کس کس نے لکھا ہے؟

(۱۰۳) اب میں ان شعرا کا تعارف کرا دینا ضروری سمجھتا ہوں جو حضرت اکبر دانا پوری کے شاگرد تھے ان کا علم مصنف کو نہیں ہے۔

(۱) سید شاہ نورالدین حسین تمنا گیاوی: سید شاہ ظہورالدین حسین منعمی گیاوی کے بیٹے اور سید شاہ ولایت حسین منعمی دائمی قمری کے پوتے تھے۔ حضرت سید شاہ عطا حسین فانی گیاوی کے حقیقی نواسہ تھے ۱۲۸۱ھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت نانا حضرت فانی داناپوری کی نگہداشت میں پائی انگریزی بھی اچھی جانتے تھے، اپنے نانا کے مرید و خلیفہ اور مجاز ہوئے۔ چند سال سرکار انگریزی میں ملازمت بھی کی تھی۔ اکبر داناپوری آپ کے اپنے پھوپا تھے۔ فن شاعری میں انہیں کے شاگرد تھے۔ نذر محبوب میں شاہ اکبر داناپوری نے آپ کا ذکر کیا ہے۔ خمخانۂ جاوید میں تین شعر نمونۃً درج ہیں۔

(۲) لالہ شیو ناتھ سہائے رونق: منشی کشن دیال صاحب کے بیٹے تھے اور بکری برانواں صوبہ بہار کے رہنے والے تھے۔ فارسی میں کافی دستگاہ تھی، اردو میں بھی مشق سخن فرماتے تھے۔ لکھنؤ و بریلی کے رسائل میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا۔ حضرت اکبر داناپوری کے شاگرد تھے (خمخانۂ جاوید ص ۵۵۵) لالہ سری رام نے ان کے ۵ اشعار نمونۃً پیش کیے ہیں یہ اطلاعات اور نمونہ کلام خمخانہ جاوید اور بلخی کے یہاں بغیر کسی فرق کے موجود ہیں۔

(۳) مولوی ارشاد حسین بیتاب کراپی: احمد اللہ ندوی نے آپ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ قصبہ کراپ ضلع اورنگ آباد بہار کے رہنے والے تھے بیتاب کے والد مولوی نجیب اللہ صاحب فارسی زبان کے عالم تھے۔ بیتاب کا رجحان زمانہ تعلیم سے شعر و سخن کی جانب تھا۔ والد کے بعد بیتاب کی بھی فارسی استعداد نہایت معقول تھی اکبر داناپوری کے شاگرد تھے۔ رانچی میں دوران قیام شعر و سخن کی صحبت کو گرم رکھے ہوئے تھے۔ صاحب تصنیف تھے مثنوی جلوۂ عشق مصنفہ بیتاب چھپ کر شائع بھی ہو چکی ہے۔ ندوی نے آپ کے تلامذہ کا بھی ذکر کیا ہے جو یہ ہیں: (۱) بابو احمد علی عیش (۲) منشی برہم دیولال مخمور (۳) مولوی حبیب الرحمٰن حبیب بی اے (۴) منشی اتوھیا پرساد غنیمت بی اے (۵) توحید رانچوی (۶) خلیل رانچوی۔

(۴) سید محمد نظامی کاکوی: سید عبدالشکور صاحب کاکوی کے بیٹے تھے بقول احمد ندوی حنفی مذہب اور قادری مشرب تھے، اگر سید عبدالشکور سے ندوی کی مراد سید عبدالشکور کاکوی ابن حاجی تبارک حسین سے ہے تو نظامی کاکوی حضرت ابراہیم زندہ دل کاکوی کی اولاد میں کہے جا سکتے ہیں ابتدائی کتابیں مولوی محمد یٰسین صاحب سیاح سے پڑھیں اور بقیہ کتابیں حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب فاضل بریلوی سے تمام کیں طب یونانی میں سید وضاحت عالم صاحب کے شاگرد تھے۔ ذوق سخن شباب سے تھا۔ حضرت اکبر داناپوری کے شاگرد تھے۔ کاکو میں دو نظامی تھے ایک سید شاہ نظامی ابن سید شاہ غزالی حضرت اکبر داناپوری کے داماد مرید اور خلیفہ تھے اور دوسرے یہ نظامی ابن عبدالشکور تھے۔ ندوی نے پانچ شعر نمونہ کلام میں بھی دیے ہیں۔

(۵) حافظ محمد ارادۃ الحق کاوش گیاوی: مولوی سید نورالحسن صاحب دانش کے بڑے بیٹے تھے اور سید اولاد علی کاوش

مقیم گیا کے پوتے تھے، آپ کے چھوٹے بھائی محمد بشارت الحق نازش بھی اکبر داناپوری کے شاگرد تھے۔ ندوی نے آپ کا ذکر فرمایا ہے اور نمونہ کلام میں چھ شعر بھی دیے ہیں۔

(۶) محمد احسان الحسن سوزش: لالہ سری رام نے خمخانہ جاوید جلد ۴ میں آپ کا ذکر کیا ہے۔ لالہ جی لکھتے ہیں:

"سوزش محمد احسان الحسن صاحب خلف اصغر حضرت نوارش مرحوم آپ کا وطن آبائی جونپور ہے فن سخن میں حضرت شاہ اکبر داناپوری سے اصلاح لیتے ہیں" (نمونہ کلام ۸ شعر) ص ۱۹۴

آبائی وطن جونپور ہونے کی وجہ کر یہ شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں سوزش بھی کاہش جونپوری ثم گیاوی کی اولاد میں تو نہیں ہیں ویسے کاہش کے دونوں پوتے ارادۃ الحق کاوش اور اشارت الحق دانش یا بقول لالہ جی نازش شاعر تھے اور اکبر داناپوری کے شاگرد تھے، میرا اپنا شبہہ ہے کہ سوزش اشارت الحق دانش کے بیٹے ہوں گے دانش کا تخلص چوں کہ لالہ جی نے نازش لکھا ہے اور یہاں غلطی سے نوارش لکھ گئے ہیں۔

(۷) یحییٰ داناپوری: سید شاہ محمد ظہیر کے بیٹے اور حضرت سید شاہ وزیر عطا داناپوری کے پوتے تھے، بعارضہ طاعون عین جوانی میں ۱۹۰۲ء میں انتقال کیا۔ حضرت اکبر داناپوری سے اپنی مختصر سی عمر میں بھرپور استفادہ کیا۔ شعر و ادب کا خاصہ ذوق تھا۔ حضرت یحییٰ کی قلمی چیزیں خانقاہ مِیتن گھاٹ کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ چند غزلیں حضرت شاہ اکبر داناپوری کے دست خاص کی اصلاح کردہ میری نگاہ سے گذری ہیں۔

(۸) سید شاہ محمد منظور، منظور: سید شاہ نور الدین حسین کے بیٹے، سید شاہ ظہور الدین حسین کے پوتے اور حضرت سید شاہ ولایت حسین دائمی دلاوری منعمی کے پرپوتے تھے، ۱۳۰۵ھ میں گورکھپور میں تولد ہوئے، اس زمانہ میں آپ کے والد حضرت نور انگریزی ملازمت میں گورکھپور میں تھے۔ پیدائش کی خبر جب حضرت سید شاہ عطا حسین فانی داناپوری نے سنی تو فوراً گیا بلالیا اور تا زندگی گیا سے باہر جانے نہ دیا، حضرت فانی نے آپ کا نام محمد مسرور رکھا تھا، بڑی محبت فرماتے تھے، حضرت منظور حضرت فانی کے نواسے حضرت نور کے بڑے صاحبزادے تھے، مکتب خود حضرت فانی نے پڑھایا اور خاص دعاؤں اور نوازشوں سے نوازا۔ ۱۹۰۸ء میں حضرت منظور نے فرسٹ کلاس سے میٹریکولیشن پاس کیا کلکتہ یونیورسٹی سے۔ حضرت اکبر داناپوری کو حضرت منظور بہت عزیز تھے، رشتہ قربت میں دادا تھے، جب بھی گیا تشریف لائے، حضرت منظور کو اپنے ساتھ رکھتے، ایک دفعہ حضرت اکبر داناپوری گیا تشریف لائے اور اسی موقع سے گیا میں کہیں مقابلہ کشتی منعقد ہوا جس میں خانقاہ منعمی ابوالعلائی گیا میں قیام پذیر مشہور غلام پہلوان کا مقابلہ کھڑک سنگھ نامی پہلوان سے ہوا۔ حضرت اکبر داناپوری خود بھی کشتی کے ماہر اور قدر دان تھے، چنانچہ اس مقابلہ میں آپ بھی تشریف

لے گئے۔ حضرت منظور کو ہمیشہ کی طرح ہم رکابی کا شرف حاصل تھا۔ اس مقابلہ میں سچیت سنگھ مات کھا گیا اور غلام پہلوان کو فتح ہوئی۔ حضرت اکبر دانا پوری نے برجستہ چند اشعار کہے اور حضرت منظور کو جو آپ کے آغوش میں بیٹھے تھے پڑھنے کو کہا۔ ہمارے دادا حضرت منظور فرماتے تھے کہ مجھے صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے وہ یہ ہے ؎

سُچیت چیت ہوا دو منٹ سے بھی کم میں ۔۔۔ پڑا آج وہ ششیر کے پیچ و خم میں

حضرت منظور کی ذہانت بچپن سے ضرب المثل تھی اس لیے اپنے بزرگوں کے لیے آپ سامان فخر تھے، حضرت اکبر کی صحبتوں نے شعری ذوق بھی پیدا کر دیا۔ جب تک حضرت اکبر حیات رہے حضرت منظور انہیں سے اصلاح کا شرف حاصل کرتے رہے پھر کسی کو اپنے اشعار دکھانے کی ضرورت نہ سمجھی چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مزے کی چاندنی چھٹکی رہا اک دور عشرت کا ۔۔۔ وہ مہ رو میرے گھر آتا رہا تقدیر چمکا گی

برا ہوا انتظار وعدۂ دیدار کا یارب ۔۔۔ زمانے تک یہ دل تڑپا کیا یہ انکھ پھڑکا کی

گھٹا بیساختہ لوٹی جو کھولا اس نے زلفوں کو ۔۔۔ کسی کے خندۂ دنداں نما پر برق تڑپا کی

تم نے جو کہا ہم سے ہم راست اسے سمجھے ۔۔۔ ہم نے جو کہا تم سے افسانہ بنا ڈالا

منظور نہاں دل میں ہے یاد خدا ہر دم ۔۔۔ گو وضع کو اب ہم نے رندانہ بنا ڈالا

حضرت منظور کو بیعت اپنے والد حضرت شاہ نور الدین حسین سے حاصل تھی اور حضرت شاہ عطا حسین فانی کے تمام سلاسل کی اجازت و خلافت بھی والد ہی سے حاصل تھی۔ حضرت منظور کی شادی اپنے چچا حضرت سید شاہ تقی الدین حسین منعمی قمری سجادہ نشیں خانقاہ قمریہ منعمیہ میتن گھاٹ کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی۔ آپ کی چار صاحبزادیاں اور دو صاحبزادے حیات ہیں۔ جناب حضرت شاہ تقی صاحب نے اپنے وصال سے ۲ سال قبل مشائخ کرام و عزیزان و مریدان کے روبرو حضرت منظور کی خرقہ پوشی فرما دی اور اجازت و خلافت آبائی سے نواز دیا۔ مشائخ نے دستاریں پیش کیں اور اس طرح آپ سے میتن گھاٹ کے سجادہ کو رونق ہوئی ۵ رجب ۱۰۴۰ھ کو حضرت منظور نے وصال فرمایا اور سجادگان خانقاہ کے جوار میں دفن ہوئے، قتیل دانا پوری نے بھی قطعہ کہا ؎

شاہ منظور زیب سجادہ ۔۔۔ رجب اورا مہ وصال آمد

بود مستغرق از شہہ فرہادؒ ۔۔۔ گہ بہ صحو گہے بہ حال آمد

بوالعلائی فیوض گشت عطاؒ ۔۔۔ دولت فقر بے زوال آمد

منعمیت چو نورؒ در قلبش ۔۔۔ از قمرؒ بر رخش جمال آمد

گشت پنجم چو از مہ خواجہؒ حاج غفران پناہ سال آمد
۱ ۰ ۳ ۱ ھ

باب چہارم: شاہ اکبر داناپوری کی نثری تصانیف

(ج) حضرت اکبر داناپوری کی تصانیف پر ایک نظر

(الف) مصنف نے تصانیف حضرت اکبر داناپوری کے لیے کوئی نمایاں کدوکاوش نہیں کی ہے جس کے نتیجہ میں انہیں صرف پانچ تصانیف حضرت اکبر کی مل سکیں۔ خدابخش لائبریری میں اشرف التواریخ جلد ۱-۲ ارادہ، خدا کی قدرت، احکام نماز، چراغ کعبہ، تاریخ عرب جلد ا موجود ہے، لیکن مصنف نے خدابخش لائبریری میں بھی اس کے لیے جستجو نہیں کیا جس کی وجہ سے وہ ان تصانیف سے ذاتی تعارف حاصل نہ کرسکے۔ خانقاہ مِتن گھاٹ کے کتب خانہ میں۔ ارادہ، دل، مولد فاطمی، رسالہ غریب نواز، سیر دہلی، نذر محبوب، خدا کی قدرت، چراغ کعبہ، رسالہ التماس موجود ہے۔ اردو اکادمی کے بہار اردو میوزیم میں بھی حضرت اکبر کی تصانیف موجود ہیں۔ خانقاہ حضرت اکبر داناپوری میں بھی تصانیف حضرت اکبر کا موجود ہونا یقینی ہے میرے بڑے بھائی سید شمیم گوہر صاحبزادہ وجانشیں حضرت سید شاہ عزیز احمد ابوالعلائی الہ آبادی نے مجھے بتایا کہ خانقاہ حلیمیہ ابوالعلائیہ الہ آباد میں بھی حضرت اکبر کی تقریباً تمام تصانیف موجود ہیں۔

خانقاہ منعمیہ ابوالعلائیہ رام ساگر گیا کے کتب خانہ میں بھی اکبر داناپوری کی اکثر تصانیف موجود ہیں۔ بہرحال مصنف نے جن جن تصانیف کا تعارف پیش کیا ہے چند کو چھوڑ کر وہ سب حضرت عطا کاکوی کے تعارفی مضمون نشریہ آل انڈیا ریڈیو، ۷ اکتوبر ۱۹۶۷ء سے نقل کیا گیا ہے۔ کیوں کہ مصنف نے انہیں خود دیکھا بھی نہیں ہے۔ شاہ غفور الرحمن حمد کاکوی نے آثار کاکو میں حضرت اکبر کے تصنیفات کی فہرست پیش کی ہے جس میں تین تصانیف کا نام ایسا ہے جو دوسروں کے یہاں نہیں ملتی ہیں ۱۔ شفاعت امت ۲۔ تذکرہ دیوانوار بیان (غالباً) ۳۔ سیرۃ المومنین (غالباً) حضرت حمد نے شور قیامت کو ۱۳۰۰ھ میں طبع بتایا ہے اور سرمہ بینائی کا دوسرا نام خبر اسرار لکھا ہے گلدستہ بہار مئی ۱۸۸۳ء میں اکبر کا مختصر سا تعارف موجود ہے جس میں یہ جملہ قابلِ غور ہے "آپ کی استعداد عالی آپ کے کتب مصنفہ مثل سرمہ بینائی شور قیامت سے ظاہر ہے" ظاہر ہے ۱۸۸۳ء میں ان دونوں تصانیف نے شہرت حاصل کرلی تھی یہ دونوں کتابیں اکبر داناپوری کی اولین تصانیف میں سے ہیں جذبات اکبر کے دیباچہ میں نثار اکبرآبادی نے لکھا ہے "احکام نماز۔ چہل حدیث، ایک رسالہ اردو گم منظوم اردو شعرا کے ذکر میں بھی ناتمام رہا" ص ۱۲ نثار کی اس اطلاع سے گمراہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ نثار کو یاد نہیں رہا کہ احکام نماز ۱۳۲۰ھ میں مطبع شوکت شاہ جہاں آگرہ سے چھپ گئی ہے اور خود انہوں نے اس کے طبع کا قطعہ کہا

ہے جبکہ جذبات اکبر ۱۳۲۴ھ میں چھپا ہے اس لیے چہل حدیث کے بارے میں بھی ان کی اطلاع پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ سوائے اردو بیگم کے تمام تصنیفات اکبر مکمل تھیں اور شائع ہو چکیں۔

(۴۰۱) "تاریخ عرب کا دوسرا حصہ، چہل حدیث، رسالہ نعم النصیر بیان طریقت میں، شاہزادی اردو بیگم وغیرہ کا صرف پتہ چلتا ہے کہ حضرت اکبر تصانیف سے ہیں آیا یہ شائع بھی ہوئیں یا مخطوط کی شکل میں ضائع ہو گئیں اس کا کچھ علم نہ ہو سکا" ص ۲۵۸

(الف) تاریخ عرب کا دوسرا حصہ: مصنف نے مندرجہ بالا تصانیف کے بارے میں تلاش و جستجو سے قطعی گریز کیا ہے اور حضرت عطا کاکوی کی اطلاع پر اکتفا کر لیا ہے۔ تاریخ عرب کے دوسرے حصے کے بارے میں حضرت اکبر داناپوری اپنی تصنیف رسالہ غریب نواز مطبوعہ ۱۳۲۲ھ میں خود فرماتے ہیں: "دوسرا حصہ تاریخ عرب کا بھی زیر طبع ہے اس میں انبیاء علیہم السلام کے مفصل حالات ہیں تخمیناً ایک ہزار صفحوں سے زیادہ ہوگی" ص ۲ تاریخ عرب کا دوسرا حصہ خانقاہ علیمیہ ابوالعلائیہ الہ آباد میں موجود ہے۔

(ب) چہل حدیث: اس رسالے کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں لیکن یہ اکبر داناپوری کی اولین تصانیف میں سے ایک ہے۔ حضرت حمد کاکوی نے جس ترتیب سے تصنیفات کا نام پیش کیا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

(ج) رسالہ نعم النصیر: اس رسالہ کا دوسرا نام خضر طریقت بھی تھا اس کا اشتہار اشرف التواریخ جلد اول کے خاتمہ میں موجود ہے اور خود حضرت اکبر داناپوری اپنی تصنیف رسالہ خواجہ غریب نواز معروف بہ تاریخ خواجہ میں فرماتے ہیں۔ "نعم النصیر المعروف بہ خضر طریقت ابتدائے سلوک سے انتہا تک جو مرشد مسترشد کو تعلیم کرتا ہے۔ یہ بڑی کتاب ہے"

(د) اردو بیگم: دیگر تذکرہ نگاروں نے صرف اردو بیگم لکھا ہے حضرت حمد کاکوی نے بھی صرف اردو بیگم لکھا ہے لیکن حضرت عطا کاکوی نے شہزادی اردو بیگم لکھا ہے مصنف نے بھی حضرت عطا کی پیروی میں شہزادی اردو بیگم لکھا ہے۔ بہرحال اس رسالہ کا تعارف خود مصنف حضرت اکبر نے مختلف مواقع پر کرایا ہے ملاحظہ ہو۔ حضرت اکبر نے اس رسالہ کا نام شہزادی اردو بیگم رکھا تھا" تذکرہ شعرائے اردو ولی گجراتی سے لے کر اس زمانہ کے شعرا کے اور کلام اس میں ہیں اس کے تین قرن تو ہو گئے ہیں تین قرن اور باقی ہیں" (رسالہ خواجہ غریب نواز ص ۲) رسالہ خواجہ غریب نواز میں ہی دوسری جگہ فرماتے ہیں: "تذکرہ شعرائے اردو جس کا دوسرا نام شہزادی اردو بیگم ہے زیر قلم ہے" ص ۵۴ حضرت اکبر داناپوری اپنی تصنیف تاریخ عرب جلد اول میں فرماتے ہیں: "بالفعل ایک تذکرہ شعرائے اردو کا بھی زیر تصنیف ہے اور وہ نظم ہوگا کئی ہزار اشعار اس کے لکھ چکا ہوں جب سے تاریخ عرب میں ہاتھ لگایا ہے وہ تذکرہ اس کے تکمیل تک ملتوی کر دیا گیا ہے" ص ۱۵ تاریخ عرب ۱۳۱۸ھ کی تصنیف ہے اور ۱۳۲۷ھ میں اکبر داناپوری کا انتقال ہوا اس

لیے کوئی ایسی وجہ نہیں ہے کہ تقریباً آٹھ سال کے درمیان بھی یہ تصنیف تکمیل کو نہ پہنچی ہو۔ حضرت اکبر داناپوری کی یہ تصنیف بڑی گراں مایہ اور بیش قیمت ہوگی کاش وہ کسی علم دوست کے ہاتھ لگی ہوتی مجھے امید قوی ہے کہ یہ تصنیف مطبوعہ ہو یا غیر مطبوعہ ضائع نہیں ہوئی ہوگی۔ آج یا کل یہ نسخہ ضرور منظر عام پر آئے گا۔ حضرت اکبر کی تصانیف کا مارکیٹ بہت اچھا تھا۔ حضرت اکبر کی تصنیف تکمیل کو پہنچتی اور مریدین و معتقدین کے حلقے میں سے کوئی نہ کوئی اسے حاصل کر لیتا اور حضرت اکبر بخوشی اسے کاپی رائٹ عطا کر دیتے۔ اکثر دفع تو مریدین و معتقدین کے سخت اصرار پر ان کی خواہش کے عنوان پر اکبر نے تصنیف و تالیف کا کام کیا اور دیکھتے دیکھتے وہ چھپ کر بازار میں آ گئی۔ جاں نثار مریدوں میں گھرے حضرت شاہ اکبر داناپوری نے اپنی تصانیف سے کبھی بھی مالی فائدہ کا ارادہ نہیں کیا۔

(۱۰۵) **نذر محبوب**: "حضرت شاہ اکبر داناپوری کا اردو رسالہ ہے جو آپ کے اپنے سلسلۂ طریقت کے بزرگان و معاصرین اور عزیزان و مریدان کے مختصر تذکرے پر مشتمل ہے۔ ۲۰×۲۶ کی تقطیع میں بیاسی صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب مطبع اکبری محلہ نئی بستی آگرہ سے شائع ہوئی ہے اس میں اکبر آباد گوالیار، منیر شریف، بہار شریف، پھلواری شریف ضلع گیا اور داناپور و پٹنہ کے ابوالعلائی اور اس سلسلہ سے نسبت رکھنے والوں کا تذکرہ کیا ہے" ص۲۵۳

(الف) تعارف مکمل نہ تھا اس لیے مجبوراً مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دراصل حضرت اکبر داناپوری نے نجات قاسم تصنیف حضرت شاہ قاسم داناپوری کو دوبارہ چھپوانے کا ارادہ کیا تو دوسرے اڈیشن میں ضمیمہ کے طور پر معاصر بزرگوں اور عزیزوں کا تذکرہ بھی شامل کرنا مناسب سمجھا چنانچہ ۸۵ صفحات پر مشتمل یہ ضمیمہ "نجات اکبری" کے نام سے لکھا لیکن سید محبوب علی شاہ بادشاہ دکن کے نام منسوب کر کے اس ضمیمہ کا پورا نام نجات اکبری معروف بہ نذر محبوب رکھا۔ (ب) نجات قاسم مع ضمیمہ نذر محبوب کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدابخش پٹنہ میں موجود ہے اس نسخے کے کاتب حافظ علی ساکن محلہ غازی روضہ ہیں ۲۳ رمضان المبارک ۱۳۱۸ھ کو اس کی نقل مکمل ہوئی ہے۔ نجات قاسم ۴۴ صفحات پر اور نذر محبوب ۸۲ صفحات پر محیط ہے۔ (ج) یہ رسالہ پٹنہ، داناپور، فتوحہ، نوادہ کلاں و خورد، پھلواری، کاکو، اسلام پور، بہار شریف، موڑا تالاب، مدنپور، بھدول، ہلسہ، دربھنگہ، چھپرہ، گیا، مونگیر، بھاگلپور، کلکتہ، ڈھاکہ بنگلہ دیش، غازی پور، فیض آباد، دہلی، الہ آباد، اناو، بلند شہر، گوالیار، اجمیر شریف، حیدر آباد دکن، اکبر آباد وغیرہ کے افراد و عمارات کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ (د) حضرت شاہ اکبر داناپوری کی تین تصانیف ایسی ہیں جس میں حضرت اکبر کے لائق صد ستائش شوق کا علم ہوتا ہے (۱) نذر محبوب (۲) سیر دہلی (۳) رسالہ غریب نواز۔ نذر محبوب میں اجمیر، آگرہ، حیدر آباد وغیرہ کی عمارتوں کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ کتبوں کو بھی حضرت اکبر نے نقل کیا ہے انتہا یہ ہے کہ حیدر آباد کے نظام کے

سکّے کی بھی پوری تفصیل لکھی ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ تصنیف بڑی اہم ہے۔ ہندوستان سے باہر کے لیے تاریخ عرب اور اشرف التواریخ وغیرہ میں بھی عرب کا آنکھوں دیکھا حال بہت دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

(۱۰۶) سیرِ دہلی: "یہ دراصل دہلی کا سفرنامہ ہے۔ ۱۳۱۱ھ میں جب حضرت اکبر دہلی گئے، تو وہاں جن جن مقامات کی زیارت کی اور جن جن لوگوں سے ملے ان کا مفصل تذکرہ ہے۔" صفحہ ۲۵۴

(الف) حضرت اکبر داناپوری دہلی کئی بار جا چکے تھے لیکن جس دفعہ کے سفر کا پورا احوال انہوں نے سیر دہلی کے نام سے تصنیف کیا وہ سفر دراصل ایک شادی کی دعوت پر تھا۔ حضرت اکبر داناپوری مولوی محمد حمید اللہ خاں کی شادی میں شرکت کے لیے دہلی تشریف لے گئے تھے (ب) دہلی کی شادی، رسم و رواج، مدعوئین، مقابر، مساجد، خانقاہیں، مدارس، ادبا، شعرا، نوابین کا دلچسپ تذکرہ ہے (ج) عمارتوں کی پیمائش کتبات وغیرہ کا بڑا سائنٹفک بیان ہے (د) ۱۳۱۱ھ میں سیر دہلی مطبع ریاض ہند آگرہ سے محمد عنایت خاں صاحب کے اہتمام سے چھپ کر شائع ہوئی۔

(۱۰۷) اشرف التواریخ: "جہاں تک حضرت اکبر کی مورخانہ حیثیت اور تاریخ نویسی کا سوال ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا پایہ بحیثیت مورخ بہت اہم نہیں کیوں کہ اشرف التواریخ کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ حضرت اکبر نے اپنی وسعت مطالعہ سے فائدہ اٹھا کر اپنی بیشتر معلومات کو ایک قرینے سے اکٹھا کر دیا ہے اور بس۔ مورخ کے لیے جیسا کہ ہم جانتے ہیں تحقیقی و تنقیدی نگاہ کا ہونا بہت ضروری ہے بغیر تحقیق و استناد کے کوئی مورخ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ حضرت اکبر کے معاصرین میں بھی اکثر مورخین گذرے ہیں اور انہوں نے تاریخی کتب تحریر فرمائی ہے مثلاً مولانا سید علی صاحب بلگرامی نے تمدن عرب کا ترجمہ کیا۔ مولانا شبلی نے الفاروق لکھی مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ لکھی۔ جناب ابو الفضل گورکھپوری نے تاریخ اسلام لکھی لیکن اس صنف میں بھی حضرت اکبر مورخ کی حیثیت سے نمایاں نہیں ہوتے حضرت اکبر نے بیشتر روایتیں نقل کی ہیں اور چونکہ مستند حوالے نہیں ہیں لہٰذا انہیں ضعیف بھی قرار دیا جا سکتا ہے" ص ۲۵۶

(الف) مورخ کی نگاہ کیسی ہونی چاہیے اور تحقیقی مقالہ نگار کو کیسا ہونا چاہیے، اور پی ایچ ڈی یا ڈی لٹ کے لیے کیسی تحقیقی صلاحیت اور احتیاط کی ضرورت ہے وہ تو مصنف کے مقالے کے مطالعہ سے محسوس ہو رہا ہے (ب) حضرت اکبر داناپوری کی اشرف التواریخ تین جلدوں پر مشتمل ہے پہلی جلد ۶۴۰ صفحات پر مشتمل ہے (مصنف نے ۶۶۸ صفحات پر مشتمل ہونا غلط بتایا ہے) اور دوسری جلد ۵۷۷ صفحات پر محیط ہے (مصنف نے ۸۰۰ صفحات پر مشتمل غلط بتایا ہے) تیسری جلد بقول مصنف ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے (مصنف کے بتائے صفحات پر مجھے یقین نہیں) کل ملا کر سترہ سو پینسٹھ صفحات ہوتے ہیں۔ حضرت اکبر داناپوری کی فن تاریخ میں دوسری تصنیف تاریخ عرب المعروف بہ جغرافیہ عرب دو جلدوں پر مشتمل ہے پہلی جلد ۲۰۲ صفحات پر اور دوسری بقول اکبر داناپوری ہزار صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہوگی۔ اس فن تاریخ میں

اکبر داناپوری نے دنیائے ادب کو تین ہزار صفحات سے بھی زیادہ دیے (ج) بحیثیت مؤرخ اکبر داناپوری کا مشہور نہ ہونا یا بحیثیت مؤرخ نمایاں نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ ان کی تاریخ نویسی غیر معیاری ہے۔ اکبر الہ آبادی کی سنجیدہ غزل گوئی ان کی ظریفانہ غزل گوئی کے مقابلہ بالکل غیر معروف اور محتاج تعارف ہے، سرسید کی تحریک کی زندگی اور اس سے وابستہ خدمات کی چمک میں سرسید بحیثیت مصنف آثار الصنادید ماند سے پڑ گئے ہیں، میر شہنشاہ متغزلین ہیں تذکرہ نگار کی حیثیت سے انہیں متعارف کرانے کی ضرورت ہے، درد کی شاعری نے شہرت کے آسمان کو چھو لیا لیکن نثر نگاری؟ میں سمجھتا ہوں کہ جمیل مظہری کی نثر نگاری اور منفرد نثر نگاری باعتبار شہرت ان کی شاعری کے مقابلے میں کوئی مقام نہیں رکھتی ہے۔ ایسے ادیبوں اور شاعروں کی لمبی فہرست ہے جن کی خدمات کے ایک پہلو نے ان کے دوسرے پہلو کو شہرت میں کہیں پیچھے چھوڑ دیا ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان حضرات کی قدرے کم شہرت یافتہ خدمات غیر معیاری ہیں یا فنی جانچ پرکھ پہ پوری نہیں اترتی (د) حضرت اکبر نے اکثر و بیشتر حوالے کے ساتھ روایتیں پیش کی ہیں۔ مصنف نے بغور اشرف التواریخ کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر کے دور میں بحث اور ماخذ کی چھان پھٹک کے بعد کسی روایت کو سامنے کو پیش کرنے کا رواج یا طریقہ شروع نہیں ہوا تھا بڑے عقیدت مندانہ انداز میں قصہ گوئی کا لطف دلاتے ہوئے تاریخیں لکھی جاتی تھیں۔ اگر قلت وقت اور خوف طوالت مانع نہ ہوتا تو میں اکبر داناپوری کی تاریخ نگاری اور مورخانہ حیثیت پر سیر حاصل گفتگو کرتا۔ مصنف کا یہ کہنا بالکل درست نہیں کہ اکبر تحقیقی اور تنقیدی نگاہ نہیں رکھتے تھے۔ تحقیقی اور تنقیدی شعور مصنف کے دور میں جتنا سائنٹفک ہو گیا اکبر داناپوری کے دور میں اتنا نہ تھا۔ ظاہر ہے آج جدید تحقیقی اور تنقیدی شعور سے مالا مال ایک نوجوان اگر احساس ذمہ داری اور ایمانداری کے ساتھ تاریخ اسلام پر اپنی عمر کے بہترین حصے صرف کرے تو شبلی (جنہیں مصنف نے تحقیقی و تنقیدی شعور سے مالا مال کے طور پر پیش کیا ہے) کو بھی کہیں پیچھے چھوڑ جائے گا (ہ) حضرت اکبر کی دوسری تصنیف تاریخ عرب المعروف بہ جغرافیہ عرب پہلی جلد ۲۷۲ صفحات اور دوسری جلد بقول خود اکبر ہزار صفحات پر محیط ہے اشرف التواریخ اور تاریخ عرب کو ملا کر تین ہزار ایکسو صفحات ہوتے ہیں۔ جو ابتک اس بات کے محتاج ہیں کہ کوئی ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگاتا۔

باب پنجم: شاہ اکبر داناپوری کے شعری کارنامے

(الف) ادبی تاریخی پس منظر

(۱۰۸) حصوصاً کانگریس کی تحریک آزادی اور سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک سے انھوں نے قلمی تعاون کیا اور قومی و ملی نظمیں اور پُر اثر مسدسات لکھ لکھ کر اپنے پیغامات دیے" ص ۲۶۵

(الف) کانگریس کی تحریک آزادی سے اکبر داناپوری نے کیسا قلمی تعاون کیا ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

ہے یہ نیشنل کانگریس پھر کوانسی — کسی کے گلے کی نہ بن جائے پھانسی
ہے خواہش اگر نیشنل کانگریس کی — وہ دولت ہے جو پاس بس وہ بھی کھسکی
یہ کمزور بنیاد ہے اس ہوس کی — کہ مہمان ہے وہ برس دو برس کی
اب آخر میں یہ بھی تھا قسمت کا لکھا — کہ پھندا لگے نیشنل کانگریس کا
یہ جس نے نکالی اسی کو تھی زیبا — مسلمانوں کو اس سے مطلب ہی کیا تھا
مگر عقل پر جن کے پردے پڑے ہیں — وہ دو چار ہم میں سے بھی جا پھنسے ہیں
وہ کہتے ہیں ہر چند اس پھل کو میٹھا — مزے میں یہ حنظل سے ہے بڑھ کے کڑوا
یہ ہے دیکھنے ہی کا خوش رنگ میوا — اثر اس کے ہر جز میں ہے سنکھیا کا
کبھی اس کی جانب توجہ نہ کرنا — اسے بھول کر بھی زباں پر نہ دھرنا
ہے سرسبز گو باغ اس کانگریس کا — الگ ہی سے پر دیکھو اس کا تماشا
یہاں دام کا ہر روش پر ہے کھٹکا — جو دانا ہے وہ بچ کر اس سے چلے گا

(ب) سرسید کی مذہبیات سے متعلق خرافات (کذا) کو چھوڑ کر تحریک کے اکبر مداح تھے فرماتے ہیں ؎

زمانے میں یکتا ہے سید ہمارا — یہ ہے آسمان ترقی کا تارا
جو یہ بحث مذہب سے کرتا کنارا — تو مہدی سمجھتا اسے ملک سارا
وہ انساں ہے آخر پیمبر نہیں ہے — خطا کے احاطے سے باہر نہیں ہے

لیکن اکبر نے نیچریت کی اچھی خاصی خبر لی ہے۔

(ب) مصنف کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ چیزوں کی تلاش اور ان پر تحقیقی تبصرہ

(۱۰۹) "حضرت شاہ اکبر داناپوری کا جو کچھ بھی غیر مطبوعہ قلمی سرمایہ رہ گیا تھا وہ اسی ہولناک زلزلے میں ضائع ہوگیا" ص ۲۶۸

غیر مطبوعہ چیزوں کی تلاش کا معاملہ تو ایک سطر میں تمام ہوگیا۔

(۱۱۰) **تجلیات عشق:** "تجلیات عشق کی ایک ہی اشاعت ہوئی اور حضرت اکبر کی حیات ہی میں ہوئی اس کے بعد اس کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ اس دیوان کے ۵۲ صفحات پر حضرت اکبر کا جو کلام شائع ہوا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے اور اسی ترتیب سے ہے۔"

"۱۔ دیباچہ از حضرت مصنف صفحہ ۱ تا ۱۰، ۲۔ قصیدہ بروز عرس حضرت قطب وقت شاہ محمد منعم قدس اللہ سرہ العزیز گفتہ شد کل اشعار ۸۵، ۳۔ قصیدہ در شان سلطان دکن آصف جاہ نظام الملک محبوب علی شاہ خلد اللہ ملکہ،

کل اشعار ۱۴۱' ۴۔قطعہ تاریخ ارشاد فرمودہ حضرت .... سید شاہ محمد غزالی صاحب قادری در زبان فارسی کل اشعار ۲۹'
۵۔قطعہ تاریخ ریختۂ کلک جواہر سلک .... حضرت شوق نیموی در زبان فارسی کل اشعار ۷' ۶۔تاریخ وفات حضرت
وحید الدین محمد وحید الہ آبادی۔ در فارسی کل اشعار ۲۶' ۷۔غزل ردیف وار" ص۲۶

(الف) مصنف کو اپنے تحقیقی مقالے کے لیے کتنی آسانیاں تھیں اس کا اندازہ لگائیے اوّل یہ کہ دونوں دیوان مطبوعہ دوئم یہ کہ ایک ہی ایڈیشن۔ ان لوگوں کی محنت اور کاوش کا اندازہ لگائیے جو پہلے دیوان کی تلاش کرتے ہیں پھر اگر کئی نسخے مل گئے تو سبھوں کا تطابق کمی و بیشی کا پورا ڈاٹا یا اگر مطبوعہ دیوان ہے اور کئی ایڈیشن ہو چکا ہے تو ہر ایڈیشن کے ترمیم و اضافے کی تفصیل۔ لیکن مصنّف کو حضرت اکبر کے مطبوعہ دواوین اور ان کے ایک ہی ایڈیشن نے آسانیاں ہی آسانیاں پیدا کر دیں۔ لیکن مصنف نے اپنی آسانی سے مطلق فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ (ب) بقول مصنف دیباچہ کے بعد تجلیات عشق میں قصیدہ بروز عرس حضرت منعم ۸۵ اشعار پر مشتمل موجود ہے۔ لیکن دیباچہ کے بعد تجلیات عشق میں نہ تو یہ قصیدہ ہے اور نہ کوئی دوسرا قصیدہ ہے فوراً ردیف وار غزلیں شروع ہو گئی ہیں (ج) قصیدہ در شان سلطان دکن بھی تجلیات عشق میں کہیں پر بھی موجود نہیں۔ یہ دونوں قصیدے صرف جذبات اکبر میں شامل ہیں تجلیات عشق میں ان کا نام و نشان نہیں (د) ان دونوں قصیدے کے بعد بقول مصنّف ارشاد فرمودہ حضرت غزالی قطعہ انتیس اشعار پر موجود ہے۔ لیکن اس طرح کا کوئی بھی قطعہ تجلیات عشق تو کیا جذبات اکبر میں بھی موجود نہیں ہے (ہ) قطعہ تاریخ ریختہ کلک جواہر سلک .. حضرت شوق نیموی بھی تجلیات عشق میں موجود نہیں اور نہ ہی جذبات اکبر میں شامل ہے۔ یہ دونوں قطعے مصنف نے کہاں دیکھ لیے ہیں سمجھ میں نہیں آتا۔ (و) تاریخ وفات حضرت وحید الہ آبادی بھی تجلیات عشق میں شامل نہیں ہے یہ قطعہ تاریخ وفات صرف جذبات اکبر میں شامل ہے اور وہ بھی ۲۰ اشعار پر مشتمل ہے اور اس قطعے کے علاوہ حضرت وحید کے وفات پر دو اور قطعے جذبات اکبر میں موجود ہیں (ز) ۱۰ صفحات پر مشتمل دیباچہ کے بعد تجلیات عشق میں ردیف وار غزلیں شروع ہو گئی ہیں اس قسم کا دوسرا قطعہ تجلیات عشق میں غزلوں سے پہلے دیباچہ کے بعد موجود نہیں۔ مصنف کو بہت بڑی غلط فہمی ہو گئی ہے وہ دوبارہ تجلیات عشق کو مطالعہ کا شرف بخشیں مجھے امید ہے انہیں یقین ہو جائے گا۔ تجلیات عشق میں جن جن اصناف سخن پر حضرت اکبر کا کلام موجود ہے وہ یہ ہیں۔ ۱۔غزل' ۲۔مخمس' ۳۔قطعہ' ۴۔رباعی' ۵۔مسدس' ۶۔دو عدد قطعہ تاریخ پورے تجلیات عشق میں حضرت اکبر کے کہے ہوئے صرف دو قطعات تاریخ موجود ہیں اور وہ دونوں بھی تجلیات عشق کے طبع کے قطعات ہیں۔ واضح ہو کہ تجلیات عشق میں حضرت اکبر کی کوئی بھی فارسی تخلیق شامل نہیں ہے

(۱۱۱) **جذباتِ اکبر:** "ابتدا صفحہ ۱ تا ۲۶ حضرت اکبر کے حالات زندگی مرقوم ہیں صفحہ ۲۶ سے مندرجات کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے: (۱) قصیدہ بروز عرس حضرت منعم پاک قدس سرہ۔ یہ قصیدہ بعینہٖ تجلیات عشق میں بھی شامل ہے اس قصیدے کی ترتیب اشعار کی تفصیل یہ ہے ...... (۲) قصیدہ در شان محبوب علی شاہ نظام دکن یہ قصیدہ بھی ہو بہو دیوان اوّل میں شائع شدہ ہے"

یہ دونوں قصائد صرف جذبات اکبر میں شامل ہیں تجلیات عشق میں کوئی بھی قصیدہ شامل نہیں ہے مصنف اپنی غلط فہمی دور کر لیں۔

(۱۱۲) جذبات اکبر کے مندرجات سلسلہ وار بیان کرتے ہوئے ۱۴ میں مثنوی داناپور کا نام مصنف نے لکھا ہے' اور اس کے بعد" ۱۸۹۷ کی آمد" بتاتے ہیں۔

"(۱۴) داناپور (یہ بھی مثنوی ہے) ۱۸۷ اشعار (۱۵) ۱۸۹۷ء کی آمد ۱۹ اشعار"

مصنف نے نہایت بے دلی سے یہ فہرست ترتیب دی ہے ورنہ وہ چودہ اور پندرہ نمبر کی مثنویوں کے درمیان اکتالیس اشعار پر مشتمل ایک مثنوی کو چھوڑ نہیں دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ "داناپور" کے بعد ۱۸۹۷ء کی آمد سے پہلے ۱۴۱ اشعار پر مشتمل ایک بلا عنوان مثنوی بھی جذبات اکبر میں موجود ہے' اس بلا عنوان مثنوی کو مصنف نے مثنوی داناپور میں شامل کر لیا ہے حالاں کہ بلا عنوان مثنوی کو مثنوی داناپور سے کوئی تعلق نہیں ہے بلا عنوان مثنوی کا موضوع "۱۸۹۶ء کی رخصت" ہے مثنوی داناپور اس شعر پر ختم ہوتی ہے ؎

ہوا گو ختم ساقی نامہ اکبر رہے مستی یہی تا روز محشر

اور مشمولہ مثنوی یوں شروع ہوتی ہے:

چھیانوے نے کیا انتقال دنیا سے گیا یہ ہو کے بہت پائمال دنیا سے

(۱۱۳) جذبات اکبر کے اختتام پر دو نقریظیں بھی شامل ہیں جن میں سے صرف ایک کا تذکرہ مصنف نے کیا ہے" (۵۸) تقریظ در نثر اردو و قطعہ تاریخ فارسی از مرزا زاہد اکبر آبادی" جبکہ ایک اور تقریظ فارسی نثر میں اور قطعہ فارسی کے ساتھ لمبی چوڑی جلی سرخی کے تحت شائع ہوئی ہے سرخی ملاحظہ ہو:

"تقریظ و تاریخ از نتیجۂ فکر رسا طبع سلیم شاعر بلند خیال ذکی و فہیم واقف کمال سخندانی ماہر نکات شیوۂ بیانی پردہ کشائے چہرۂ معانی صاحب علم ہمہ دانی رئیس ابن رئیس مصنف رحمۃ اللہ علیہ ظاہر و باطن انیس جناب مرزا خادم حسین صاحب المتخلص بہ رئیس اکبر آبادی سلمہ اللہ تعالیٰ بحق رسولہ و آلہ الامجاد" ص ۸۰

(۱۱۴) جذبات اکبر سے متعلق ایک بہت اہم ترین حقیقت سے مصنف نے گریز کیا ہے یا پھر انہیں اس کی خبر

بھی نہیں ہے۔ حضرت شاہ محسن داناپوری نے جذبات اکبر کے شروع میں التماس کے عنوان سے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ:

"ناظرین یہ دیوان جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے ایسے سفینہ سے نقل کیا گیا ہے جس میں باقاعدہ ترتیب نہ ہونے کے علاوہ جابجا اساتذہ کے اشعار و بعض قطعات بھی لکھے ہوئے ہیں۔ اکثر کے سرنامے تو مصنف کے نام سے مزین ہیں بعض خالی بھی ہیں چنانچہ متفرق اشعار و مختصر قطعات کے اقتباس میں فی الجملہ دقت واقع ہوئی بحالت موجودہ یہی صورت مناسب معلوم ہوئی کہ حضور اقدس رحمۃ اللہ علیہ کا خاص رنگ دیکھ کر اقتباس کر لیا جائے اور اس سے پیشتر حتی الوسع تحقیق و تفتیش کلام منسوبہ کی کر لی جائے چنانچہ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر ترتیب دی گئی ..... ان سب قصوں کے بعد علم ہوا کہ اساتذہ کی ایک فارسی رباعی اور دو شعر کا ایک فارسی قطعہ گذشتہ مشکلات اور عدم واقفیت کی وجہ کر درج دیوان ہو گیا ہے مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ناظرین کی خدمت میں صورت حال عرض کر کے معذرت کر دی جائے رباعی مندرجہ کا پہلا شعر اور قطعہ کا آخری شعر درج ذیل ہے

اے طالب علم ترک تحصیل مکن ۔۔۔ یک روز ز عمر خویش تعطیل مکو

کہ چوں خواجگی در تہ خاک شد ۔۔۔ دیگر بکوشد کہ خس کم جہاں پاک شد

پھر بھی اگر ناظرین کی نظر متفرقات میں کسی ایسے شعر پر پڑے جو ان کے علم میں کسی اور صاحب کمال کی فکر کا نتیجہ ہو تو اس کو گذشتہ غلطی اور مرتب کی نادانستگی پر محمول فرمائیں اور اسکو فراموش نہ فرمائیں کہ یہ دیوان حضور کے وصال کے بعد شائع ہو رہا ہے" ص ۱ تا ۲

مجھے تعجب اور سخت حیرت ہے کہ مصنف نے حضرت اکبر داناپوری پر تقریباً سوا چار سو صفحات پر اپنا تحقیقی مقالہ قلم بند کیا اور انہیں اس اہم ترین پہلو کا علم نہیں ہو سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے جذبات اکبر کو ٹھیک سے مطالعہ بھی نہیں کیا ہے اطلاعاً عرض ہے کہ جذبات اکبر کے ص ۲۴۲ پر اکبر الہ آبادی کا مشہور و معروف قطعہ چھپا ہوا موجود ہے ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں ۔۔۔ اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا ۔۔۔ کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اور حضرت شاہ محسن داناپوری نے بھی ایک فارسی رباعی اور قطعہ کی نشاندہی کی ہے جو غلطی سے شامل جذبات اکبر ہو گیا ہے۔ مصنف کا فرض تھا کہ وہ جذبات اکبر کو بنظر غائر مطالعہ فرماتے اور ایسے تمام کلام کی نشاندہی فرماتے جو حقیقتاً اکبر داناپوری کے نہیں ہیں اور سہواً جذبات اکبر میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف کی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ وہ اس سفینہ کی تلاش کرتے جس سے جذبات اکبر کو ترتیب دیا گیا اور اس سفینے میں ایسے کلام کی نشاندہی کرتے جو دراصل حضرت اکبر کے اپنے ہیں اور شبہہ کی بنیاد پر شامل جذبات اکبر نہیں کئے گئے۔

(۱۱۵) **اکبر داناپوری کا ایک اور دیوان:** مصنف کو اس کا علم نہیں ہے کہ خود حضرت اکبر داناپوری نے اپنے دیوان

تجلیات عشق میں اپنے ایک اور مرتب دیوان کا ذکر کیا ہے جو کھو گیا حضرت اکبر ص ۶ تجلیات عشق میں اپنی غزل کے حاشیے میں فرماتے ہیں[۱]

شعر: سرمہ جو زیب چشم سیہ فام ہو گیا — فتنہ سوار ابلق ایام ہو گیا

[۱] یہ غزل عالم طفلی کی ہے اور میرے استاد مرحوم مولوی وحید الدین احمد صاحب کی اصلاحی ہے لہٰذا مجھے عزیز ہے۔ ایک مرتب دیوان جسمیں اکثر غزلیں استاد مرحوم کی اصلاحی تھیں وہ کھو گیا اب یہی ایک غزل یادگار حضرت استاد باقی ہے۔ محمد اکبر ابوالعلائی"

(۱۱۶) کلام اکبر دانا پوری جو دواوین میں شامل نہیں: مصنف نے اپنچ، گلدستہ بہار اور نسیم دانا پور سے اکبر دانا پوری کے کلام کو پیش کیا ہے جو ترمیم و اضافے کے ساتھ دواوین میں شامل ہے یا نہیں ہے لیکن حضرت اکبر کے ایسے کلام کی جانب کوئی توجہ مصنف نے نہیں کی ہے جو خود حضرت کی تصانیف میں بکھرے پڑے ہیں لیکن دواوین میں شامل نہیں ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں تحقیق و جستجو کی ہے جس کا نتیجہ ہدیۂ ناظرین ہے

غزل

نور نگاہ مصطفیٰ سیدنا ابوالعلا — آئینہ خدانما سیدنا ابوالعلا
جلوہ انی انا سیدنا ابوالعلا — پرتو حسن مرتضیٰ سیدنا ابوالعلا
خال و خط رخ حسن حسن حسین گلبدن — جان مریض را دوا سیدنا ابوالعلا
ما چہ کسم کہ چشم خویش باز کنم بروئے تو — عاشق تست مصطفیٰ سیدنا ابوالعلا
وصف تو از زبان ما صحبت شعلہ با خس است — منقبت تو عجز ما سیدنا ابوالعلا
زینت خاندان چشت رونق نقشبندیان — کرد ترا خدای ما سیدنا ابوالعلا
کاشف سر سرمدی عالم علم من لدن — شاہ قلمرو انا سیدنا ابوالعلا
مرد ز درد ہجر تو زود بہ نزد خود طلب — اکبر جاں نثار سیدنا ابوالعلا

(چراغ کعبہ)

ہے مقدر میں در یار پہ ساجد ہونا — کیا پسند آئے ہمیں عابد و زاہد ہونا
کعبۂ دل جسے سب کہتے ہیں وہ گھر ہے یہی — اس مکاں میں ہے ضرور آپ کو وارد ہونا
او بڑے گھر کے مکین کعبہ کے مالک داتا — ہم فقیروں سے بھی کچھ واحد و شاہد ہونا
مجھے ہوتا ہے گماں شان رسل پر کچھ اور — یاد آتا ہے سکندر کا جو قاصد ہونا

جملہ اعداد میں موجود عدد ایک کا ہے — اسی کثرت سے ہے ثابت ترا واحد ہونا
اپنے کاموں سے ہو فرصت تو ملیں خضر سے ہم — کار بیکار ہے مصروف زوائد ہونا
راہ کو چھوڑ کے گمراہ نہ ہونا اکبرؔ — سخت دشوار مقلد کو ہے موجد ہونا

(تاریخ عرب حصہ ۱)

○

مکان مولد حضرت خیر البشر سرور انبیا سیدنا و مولٰنا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم

جو تاج سر عرش بریں ہے یہ زمیں ہے — اللہ کی رحمت کا نزول اب تو یہیں ہے
پیدا ہوا اللہ کا محبوب اسی گھر میں — اے عاشقو عشاق کی مسجد تو یہیں ہے
پھرتا تھا اسی میں وہ مہ اوج رسالت — سب کحل جواہر ہے یہاں گرد نہیں ہے
دیکھے اسے جو دیدۂ دل سے وہی جانے — حد سے کرے طور اسکو وہ روشن یہ زمیں ہے
حضرت کا اسی ارض مقدس میں گھر اماں — ایسی متبرک کوئی دنیا میں زمیں ہے
حاصل ہوئی کعبہ کو یہ عظمت اسی گھر سے — طیبہ میں اب اس قصر معلی کا مکیں ہے
کیوں کر تن مردہ مرا پھرتا ہے زمیں پر — اکبرؔ مرا قالب ہے یہاں قلب وہیں ہے

○

ہم کو دو عقلیں خدا کیں عطا — ایک اپنی دوسری ہے مستعار
ہے جو اپنی فطرتی نام اس کا ہے — دوسری ہے تجربوں کی یادگار
عقل دوم ہے سفر کی روشنی — یعنی سیر ملک و امصار و دیار
ہے اگر عقل اپنی صاحب تو ہے خیر — فائدے پہنچیں گے ہم کو بے شمار
ہے اگر اپنی ہی دانش میں فتور — پھر ہیں لاشے تجربے گو ہوں ہزار
اکبرؔ اپنی عقل کو صائب تو کہہ — ورنہ ہو گا یاروں کی انکھوں میں خوار

(اشرف التواریخ حصہ ۲)

○

سہرا حضور پرنور آصف جاہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ

رُخِ نوشہ پہ فضل حق سے ہے ایمان کا سہرا — نہ کیوں سرتاج سہروں کا ہو یہ سلطان کا سہرا
حضور اور اس پہ رُخِ پرنور پھر اس پر یہ سہرا ہے — تجلی پر تجلی ہے یہ ہے عرفان کا سہرا

نظر ہوتی ہے خیرہ جب جواہر جگمگاتے ہیں | بنا ہے آفتاب اس خسروی ایوان کا سہرا
شہنشاہ دکن کے روئے روشن پر جگہ پائی | غلاف اب بے تکلف بن گیا قرآن کا سہرا
دکن میں شادیانہ گانے کو حوران خلد آئیں | مبارک ہو الٰہی ہے بڑے ارمان کا سہرا
سر شاہ دکن پر ہے رسول اللہ کا دامن | درود اس پر پڑھیں ہم ہے یہ ایسی شان کا سہرا
مرا تو شاہ نقادِ سخن ہے آپ اے اکبرؔ | کہوں کیا اپنے منہ سے میں یہ ہے کس شان کا سہرا

دیگر

ہے سر پہ باندھنے کو شاہ مہرباں سہرا | خدا کے فضل سے اب ہوگا درخشاں سہرا
ستارے موتی ہیں شاہ دکن کا منہ ہے چاند | بنا ہے آج کی شب رشک آسماں سہرا
ہم آنکھوں میں اس کو چھپا کے رکھیں گے | کہیں چرا نہ لے جائے کہکشاں سہرا
زمیں پہ دھوم ہے اسکی فلک پہ شور اس کا | یہ فیض شاہ سے پہنچا کہاں کہاں سہرا
سر حضور دکن پر ہوئی اسے معراج | لگا کے موتیوں کی پہنچا نردباں سہرا
یہ مثل دامن محبوب بڑھ کے پہنچا ہے | ہے دانا پور کہاں اور ہے کہاں سہرا
یہ نور ہے کہ کسی کو نظر نہیں آتا | نظر کے سامنے ہے اور ہے نہاں سہرا

(یہ سہرا جذبات اکبر میں اسی زمین میں الگ اشعار کے ساتھ شامل ہے اور سیر دہلی میں بھی چھپا ہے۔ سیر دہلی میں موجود سہرے کے ان اشعار کو میں نے نقل نہیں کیا ہے جو جذبات اکبر میں موجود ہیں ۔ (سیر دہلی)

○

منقبت حضرت قبلہ عالم قطب اکرم پیر و دستگیر مولینا سید شاہ محمد قاسم ابو العلائی داناپوری قدس اللہ سرہ[1]

پلا ساقیا بادہ صاف و پاک | کہ میں مست ہو جاؤں روحی فداک
مجھے مدحت پیر لکھنی ہے اب | ہے عالی حسب وہ صحیح النسب
رسول خدا کا وہ فرزند ہے | علی علا کا جگر بند ہے
سیادت کے دریا کا گوہر ہے وہ | شرافت میں ہجوم جوہر ہے وہ

[1] اس منقبت کے ساتھ ساتھ تاریخ عرب میں ایک طویل نظم بھی موجود ہے لیکن اس نظم میں تخلص استعمال نہیں ہوا ہے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ یہ نظم بھی اکبر ہی کی ہے لیکن شواہد کی غیر حاضری میں نقل کرنا مناسب نہیں سمجھتا ہوں۔

وہ باغ ولایت کا سرو سہی — ولی کہتے تھے اس کو ہٰذا الولی
پڑی جب نظر روئے پُر نور پر — صحابہ کے انوار تھے جلوہ گر
سخاوت ائمہ کی ہاتھ آئی تھی — کرامت رسولوں کی سی پائی تھی
وظیفہ میرا آپ کا نام ہے — یہی ورد اب صبح اور شام ہے
شہ قاسم پاک محبوب حق — کہ افلاک از دفترش نہ ورق
رقم شد زآو صاف حسنش قلیل — جمیل، جمیل، جمیل، جمیل
دلم باد خاک رہ آں ولی — بجاہ محمد بحق علی
بچشم جمالش بود جلوہ گر — کہ در چشم من تا خرامد نظر
سرو کار من باد با او مدام — بود در تنم تاکہ جاں را قیام
برم عشق و سودای او در لحد — بماند بخواب من او تا ابد
سرم بر درش باد او در خیال — چو او در خیال است دارم وصال

(تاریخ خوش علا)

رباعی

بے منتظم انتظام کیوں کر ہوگا — جب ہاتھ نہ ہو تو کام کیوں کر ہوگا
بندوں کا ہے اکبر کوئی مالک بھی ضرور — آقا نہ ہو تو غلام کیوں کر ہوگا (ارادہ)

حضور پرنور کی آمد آمد کا شور از فقیر محمد اکبر ابوالعلائی مولف کتاب ہٰذا

آمد آمد ہے رسول اللہ کی — آمد آمد ہے شہ ذی جاہ کی
آمد آمد حق کے پیغمبر کی ہے — آمد آمد شافع محشر کی ہے
آمد آمد مالک کوثر کی ہے — آمد آمد دین کے سرور کی ہے
آتے ہیں دنیا میں ختم المرسلین — ہوگئی روشن ابھی سے یہ زمین
آتے ہیں حضرت شفیع المذنبین — ناامیدی عاصیوں کو اب نہیں
آتے ہیں دنیا میں خالق کے حبیب — ہیں یہ بیمار ان الفت کے طبیب

دن پھرے دنیا کے آتے ہیں حضور ‏ آپ ہی کے نور کا ہے یہ ظہور
آپ ہی کے نور کی یہ شان ہے ‏ آپ ہی کا نور سب کی جان ہے
آپ ہی کا نور مہر و ماہ ہیں ‏ آپ ہیں جو خاص ظل اللہ ہیں
باعث کون و مکان ہیں آپ ہی ‏ حق تو یہ ہے جان جان ہیں آپ ہی
یہ زمین مدت سے تھی مردہ پڑی ‏ آپ کی آمد کو سن کر جی گئی
یہ زمین جیسی کہ تھی اب وہ نہیں ‏ عرش کہتا ہے کہ میں ہو تا زمین
آپ کی آمد ہے بخشش کی خبر ‏ آپ کا ہی کا ہے لقب خیر البشر
ہیں ابھی سے بخششیں حضرت کی عام ‏ تذکرہ اب تو اسی کا ہے تمام
شور ہے عالم میں اب ایثار کا ‏ جو ہے وابستہ ہے اس سرکار کا
ہات خالی اور سب کچھ ہات میں ‏ جان ڈالی آپ نے خیرات میں
سر فلک کا آپ نے اونچا کیا ‏ آپ کا مرکب جب اس پر چڑھ گیا
عرش کو بخشی بزرگی آپ نے ‏ خلد کو بھی تازگی دی آپ نے
نام سے مشہور جس کا سلسبیل ‏ آپ ہی کے فیض کی ہے وہ سبیل
آپ کی تشریف آئی جس گھڑی ‏ بت پرستوں پر بڑی آفت پڑی
بت کدہ تھا کعبہ مسجد ہو گیا ‏ ابر رحمت آکر اس کو دھو گیا
ہاتھ ہر بت کانوں پر دھرنے لگا ‏ یعنی دم توحید کا بھرنے لگا
یہ نجاست سے بتوں کی پاک ہے ‏ کعبہ اب قبلہ تہہ افلاک ہے
شان حق ظاہر ہوئی باطل گیا ‏ ڈھونڈتے والوں کو خالق مل گیا
ہر طرف ہے اللہ اللہ کی پکار ‏ ہے بتوں کا ہر پجاری سوگوار
بت پڑے ہیں اور کافر ہیں کھڑے ‏ کہہ رہے ہیں دل میں یہ کیوں گر پڑے
جوشش زمزم کو ہے یہ غل ہے مچا ‏ مرحبا یا مرحبا یا مرحبا
اللہ اللہ سنگ اسود کی چمک ‏ روشنی پہنچی ہے اس کی عرش تک
اتنا بالیدہ خوشی سے ہے مقام ‏ اس نے کرسی عرش کی لی جا کے تھام

رکن شامی و عراقی کی صفا — بخشتی ہے اور آنکھوں کو جلا
دل میں یہ نقشہ محبت کا جما — مل گیا مردہ سے خوش ہو کر صفا
چل پڑا مزدلفہ کی جانب منا — اور وہ میدان حج سے مل گیا
مل کے سب آتے ہیں کعبہ کی طرف — ہے جہاں اصحاب پیغمبر کی صف
کعبہ کو اب دیکھیے کیا شان ہے — بت کدہ تھا مطلع ایمان ہے
ہے لباس اس کا پیمبر کی عبا — اتنی نیچی اور کیسی خوش نما
کیوں نہ پہنے یہ لباس احترام — ہے اسی کا نام تو بیت الحرام
یہ سیاہی پتلیوں کا نور ہے — گرد اس کے سامنے کافور ہے
مکۂ اقدس ہوا تاج البلاد — اب ہیں آباد اس میں خالق کے عباد
اب یہاں اللہ اکبر کا ہے شور — بھاگا ہر بت اس طرح جس طرح چور
چھوڑ اکبر ہند کو کعبہ کو چل — یہ ہے دار الحرب اب اس سے نکل
پاک ہو کر کعبہ سے بستر اٹھا — پھر مدینہ کا پکڑ لے راستا

(اشرف التواریخ جلد ۲)

○

حضور آئے زمیں پر زمیں ہوئی روشن — عرب کا ملک کا ملک آج ہو گیا گلشن
زمیں کو چوم رہے ہیں فلک کے سیارے — زمیں ہے عرش پر اب انبساط کے مارے
زمین فخر کرے جس قدر وہ زیبا ہے — بلند عرش سے بھی آج اس کا رتبا ہے
تلاش جس کی فلک کو تھی ایک مدت سے — وہ انجمن میں نکل آیا آج خلوت سے
ہوئے سلام کو حاضر فرشتگان خدا — کہ وہ خدا سے نہیں ہے کسی جگہ بھی جدا
سلام آپ کو کرتا ہے آپ کا جبرئیل — سلام کرنے کو حاضر ہوا ہے میکائیل
حضور حاضر خدمت ہوا ہے اسرافیل — سلام لیجیے اس کا بھی یا نبی جلیل
فرشتگان خدا کی کھڑی ہوئی ہے صف — سلام کرتے ہیں وہ آپ دیکھیں ان کی طرف
اب اپنی امت عاصی کا بھی لیں سلام حضور — نگاہ لطف ادھر بھی ہو اے خدا کے نور

امت عاصی کا سلام

السلام اے شفیع روز نشور
السلام اے خدا اے پاک کے نور

یا رسول خدا سلام علیک
یا نبی الوریٰ سلام علیک

آپ پر یا حبیب حق ہو سلام
آپ مالک ہمارے ہم ہیں غلام

ہو گنہگاروں کا سلام قبول
یا نبی آپ ہیں ہمارے رسول

آپ کی شان شانِ رحمت ہے
ہم گنہگاروں پر عنایت ہے

شافع مذنبین سلام علیک
خواجہ راستین سلام علیک

مرحبا مرحبا سلام علیک
یا حبیب خدا سلام علیک

دلبر یار غار تم پہ سلام
ہر گھڑی لاکھ بار تم پہ سلام

ہو عمر کے شفیق تم پہ سلام
یا غنی کے رفیق تم پہ سلام

مرتضیٰ کے برادر پر نور
ہو وظیفہ مرا سلام حضور

اپنے اکبر کے حال پر ہو نگاہ
کھول دو اس پر اب خدا کی راہ

○

آدمی جان جہاں ہے مجھے معلوم ہوا
خاک میں گنج نہاں ہے مجھے معلوم ہوا

میں نے پہچانا اے خاک کے پتلے تجھ کو
لا مکاں تیرا مکاں ہے مجھے معلوم ہوا

ہے شجر دانے میں مخفی تو شجر میں دانہ
یونہیں ترکیب جہاں ہے مجھے معلوم ہوا

کوئی ظاہر نہیں ایسا نہ ہو جس کا باطن
بے نشاں کا یہ نشاں ہے مجھے معلوم ہوا

پیرہن جس کا ہے یہ جسم وہ ہے اور کوئی
یار پردے میں نہاں ہے مجھے معلوم ہوا

اوسی جانب سے سکون و حرکت ہے اپنی
وہی سر رشتہ جاں ہے مجھے معلوم ہوا

شکل انسان میں نہ ڈھونڈو اسے کیوں اے اکبر
معنی صورت میں نہاں ہے مجھے معلوم ہوا

○

معراج شریف

خواب نوشیں میں تھے شاہ انبیا
پر مقدر آپ کا بیدار تھا

آئے جبریل امین لے کر براق | خوبیاں نہیں تھیں جتنی سب میں تھا وہ طاق
دست بستہ عرض کی چومیں زمین | ہو جیے بیدار ختم المرسلین
یا محمد مصطفیٰ بیدار ہو | یا نبی الانبیا بیدار ہو
یا شفیع المذنبین بیدار ہو | رحمۃ للعالمین بیدار ہو
صاحب جود و کرم بیدار ہو | ماحی ظلم و ستم بیدار ہو
صاحب صدیق اکبر جاگیے | آپ پر ہے فضل داور جاگیے
مالک فاروق اعظم جاگیے | رات کم ہے جان عالم جاگیے
حضرت عثمان کے مالک جاگیے | عرش کے منزل کے سالک جاگیے
مرتضیٰ کے مصطفیٰ بیدار ہو | خلق کے مشکلکشا بیدار ہو
آپ کا جبریل ہوں آیا ہوں میں | آب کوثر غسل کو لایا ہوں میں
حلّۂ خلد بریں موجود ہے | دیکھیے یہ خلعت معبود ہے
ہو گئے بیدار شاہ انبیا | آب کوثر غسل کو حاضر کیا
غسل کر کے حلّہ زیب تن کیا | پیک حق نے سامنے توسن کیا
کونسا توسن براقِ بادپا | دونوں عالم جس کا جولانگاہ تھا
طے ہوئی دم بھر میں دوری فلک | اب ہوئے خدمت سے رخصت سب ملک
بیٹھے رفرف پر جناب مصطفیٰ | وہ وہاں سے برق بن کر اوڑ گیا
پہنچے فوراً آپ عرش پاک پر | مرحبا کا شور تھا افلاک پر
حق کو دیکھا آپ نے بھر بے حجاب | کھل گئے علم لدن کے جملہ باب
علم جتنے تھے وہ حاصل ہو گئے | کاملوں کے آپ کامل ہو گئے
مانگا جو کچھ آپ نے سب مل گیا | انتہیٰ اس پر ہوئی رب مل گیا
واہ امت کی بھی قسمت جاگ اٹھی | اوس کو بھی معراج خمسہ مل گئی
تحفہ لائے بہر امت یہ نبیؐ | مومنو کے گھر میں شادی رچ گئی
پہنچا ہر مومن کو خالق کا سلام | مومنو کا گھر ہوا دارالسلام

ہر نمازی کے لیے آیا سلام — میں ترے قربان اے میرے امام
اپنی امت کو نہ بھولا تو کہیں — آفریں صد آفریں صد آفریں

○

جلوہ فرما ہے وہی گنبد خضریٰ دل میں — ساتھ ہر وقت ہے میرے ترا روضہ دل میں
جب تصور میں پہنچتا ہوں میں روضہ کے قریب — لی مع اللہ کا نظر آتا ہے جلوہ دل میں
ہے تو چھوٹا سا یہ گھر طور کا قبلہ ہے مگر — ہم نے جب دیکھا تو روشن ہے ثریا دل میں
سبز رنگت مرے دل کی نظر آتی ہے مجھے — پڑ گیا روضۂ محبوب کا پردا دل میں
ایک ساعت کے لیے آئیں یہاں بھی یہ قدم — فرش آنکھوں کا بچھائے شہ والا دل میں
نظر آتا ہے نہیں اس میں کوئی روزن سا — یا خدا ہو یہ مدینہ ہی کا غرفا دل میں
اپنے اعمال ہیں جیسے وہ تو سب ظاہر ہیں — ہے تو ہے تیری شفاعت کا بھروسہ دل میں
للّٰہ الحمد یہاں بس گئے حضرت اکبر — آنکھیں جب بند ہوئیں آپکو دیکھا دل میں
آنکھوں سے اور وہاں تک جو ہے ایک نور ہی نور — اتر آیا ہے کوئی چاند کا ٹکڑا دل میں
آنکھوں کی راہ سے جاری ہے جو یہ سیل سرشک — جوش زن آپ کی الفت کا ہے دریا دل میں
ہے کوئی پردہ نشیں اس میں ضرور اے اکبر — نظر آتا ہے نہیں نور کا پردا دل میں (تاریخ عرب جلد ا)

اور طویل منظوم کلام بھی شامل دیوان نہیں ہیں لیکن خوف طوالت کی وجہ کر نقل نہیں کر رہا ہوں۔

اکبر داناپوری کے متفرق اشعار بھی میں نے جمع کیے ہیں جو دیوان میں موجود نہیں ہیں لیکن خوف طوالت کی وجہ کر ان سے کنارہ کرتا ہوں۔

(۱۱۸) جن لوگوں پر گذشتہ صفحات پر بحث کر چکا ہوں ان سے متعلق چند اور باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

<u>قاضی بڑے</u>: بہار میں جب قاضی بڑے پر کام کیا جائے تو قاضی بڑے داناپوری شیخ بڈھ یا قاضی بڈھ کے علاوہ ایک اور قاضی بڑے کو جاننا بہت ضروری ہے۔ میرا اشارہ قاضی سید مظاہر امام آنکلوی منعمی کے جد اعلیٰ کی طرف ہے۔ سید احمد اللہ ندوی نے قاضی بڑے کے اجداد قاضی مظاہر کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ قاضی بڑے بھی رضوی تھے۔

<u>سید شاہ محمد سجاد ساجد داناپوری</u>: ساجد کا کچھ کلام میں نے ان کے احوال میں پیش کر دیا ہے ایک رباعی مجھے اور ملی ہے ملاحظہ ہو۔

اوصاف ابو بکر نبی سے پوچھو　　یا حیدر شیر نر علی سے پوچھو
وہ فانی ذاتِ احمدی تھے یا　　اس رمز کو عاشقوں کے جی سے پوچھو (چراغ کعبہ)

شاہ محمد امین حرماں داناپوری: حرماں کا کچھ کلام اور چند ہندی ٹھمریاں خانقاہ منعمیہ قمریہ میتن گھاٹ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

وحید الہ آبادی: وحید الہ آبادی کو شاگرد آتش مصنف نے صرف اس لیے مان لیا ہے کہ اکبر داناپوری نے شاگرد آتش لکھا ہے سید احمد اللہ ندوی نے تذکرہ مسلم شعرائے بہار میں اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ مصنف نے سید احمد اللہ ندوی کے تذکرہ مسلم شعرائے بہار کو صرف اکبر داناپوری کا تذکرہ نقل کرنے کے لیے دیکھا ہے اور بس۔ کچھ اور استفادہ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ندوی صاحب نے وحید پر اچھی گفتگو کی ہے۔ وحید کے دادا کا نام شیخ عبدالقادر بتایا ہے جبکہ مصنف کو صرف والد کا نام شیخ امر اللہ معلوم ہے وحید کا سال ولادت تاریخ شیخ وحید الدین وحید سے برآمد ہوتا ہے۔ بقول ندوی آتش کا انتقال ۱۲۶۲ھ میں ہوا اس لیے آتش کے انتقال کے وقت وحید کی عمر ۱۸ سال کی ہوگی اگر وحید نے اصلاح لی بھی ہو تو ایک دو سال سے زیادہ موقع نہ ملا ہوگا۔ وحید کو اپنے خاندان کے ایک بزرگ بشیر علی متخلص بہ بشیر سے تلمذ تھا۔ ولی الرحمٰن ولی کاکوی نے اس کے ثبوت میں وحید کا مقطع پیش کیا ہے جسے مصنف نے نقل بھی کیا ہے اس لیے ندوی صاحب کی اطلاع بہت حد تک قابل قبول ہے۔ ندوی صاحب نے وحید کے سانحہ انتقال پر بھی خوب روشنی ڈالی ہے اور دیوان و کلام کے بارے میں بھی مستند اطلاعات فراہم کی ہیں۔

عبدالباسط باسط عظیم آبادی: مصنف نے باسط کو شاگرد وحید الہ آبادی لکھا ہے، جبکہ باسط کا سارا احوال مصنف نے گلدستہ بہار نمبر ۸ سے نقل کیا ہے جس میں وحید کے شاگرد ہونے کی اطلاع موجود نہیں ہے۔

اکبر داناپوری: (الف) مصنف نے اکبر داناپوری کے جن نثری تصانیف کو دیکھنے کا دعوی کیا ہے ان میں اشرف التواریخ ہر سہ جلد بھی ہے اور مصنف نے جن تصانیف کو نہیں دیکھنے کا صاف اقرار کیا ہے ان میں "رسالہ التماس" بھی ہے رسالہ التماس اشرف التواریخ جلد اول کے ساتھ طبع ہوا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ ۶۳۰ صفحات پر جلد اول اشرف التواریخ ہے اور صفحہ ۶۳۱ سے رسالہ التماس شروع ہوتا ہے رسالہ التماس کا صفحہ نمبر بھی الگ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف نے رسالہ التماس کو دیکھا ہی نہیں اس سے ان کے اشرف التواریخ کے مطالعہ کی کیفیت پر روشنی پڑتی ہے (ب) اکبر داناپوری نے مولوی سمیع الدین احمد صاحب کی تصنیف رسالہ "اثبات رابطہ" پر حاشیہ لکھا تھا۔ رسالہ اثبات رابطہ مطبع فوٹوگرافیہ محلہ مہدی باغ سے طبع ہوا تھا مطبوعہ رسالہ پر حاشیہ لکھا گیا ہے۔ حضرت اکبر کے دست خاص کا نوشتہ خانقاہ میتن گھاٹ

کے کتب خانہ میں موجود ہے یہ حاشیہ اکبر نے ۷ ربیع الثانی ۱۲۹۵ھ کو لکھا تھا۔ اس حاشیہ سے اکبر دانا پوری کی ایک صفت نمایاں ہوتی ہے اور وہ ہے اکبر کا خوشخط ہونا۔ نہایت ہی پاکیزہ اور پختہ حروف میں یہ حاشیہ موجود ہے۔ (۱)
اکبر دانا پوری کے مکاتیب پر مصنف نے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ اکبر دانا پوری کے چند مکاتیب اپنے عزیزوں کے نا خانقاہ مٹن گھاٹ کے کتب خانہ میں میری نگاہ سے گذرے ہیں۔

نظیر دانا پوری: نظیر دانا پوری کے چند اشعار مجھے اور دستیاب ہوئے ہیں میں انہیں پیش کر رہا ہوں جس سے نظیر کی قدرت کلا کا اندازہ ہو سکے گا ۔

زمین سے قرب او ادنی کو پہنچا آسماں ہو کر میرے دل کا مکیں دم بھر میں آیا لامکاں ہو کر
زمین و آسماں عاجز رہے جس کے تحمل سے اٹھایا میں نے اس بار گراں کو ناتواں ہو کر
نظیر الحمد اللہ کوئے جاناں تک ہم آ پہنچے خدا چاہے تو رہ جائیں گے خاک آسماں تک

میں ان اشعار کے لیے اپنے دادا حضرت سید شاہ محمد اسمٰعیل صاحب ابو العلائی مدظلہ کا شکر گزار ہوں۔

محسن دانا پوری: حضرت محسن دانا پوری کے تلامذہ کا حلقہ کافی بڑا تھا۔ دانا پور کے تقریباً تمام عزیزوں کو حضرت محسن سے ہی تلمذ تھا۔ مصنف نے چند کا نام پیش کیا ہے۔ حضرت محسن کے تلامذہ میں حضرت سید شاہ واعظ الدین حسین دانا پوری سید شاہ محمد الیاس دانا پوری، سید شاہ قیام الدین آسی گیاوی اور حضرت سید شاہ محمد اسمٰعیل المتخلص بہ روح مدظلہ بھی ہیں حضرت سید شاہ اسمٰعیل المتخلص بہ روح کے ۲ شعر نقل کرتا ہوں ۔

مرحلہ اور کوئی سخت ہے آنے والا پھول برسانے لگا برق گرانے والا
گھر تو جل بجھ کے بہر حال ہوا راکھ کا ڈھیر چھوڑیے کوئی بھی ہو آگ لگانے والا

حضرت قیام الدین آسی گیاوی کا تذکرہ سید احمد اللہ ندوی نے کیا ہے۔ حضرت محسن دانا پوری پر میرے بھائی سید تبسم گوہر صاحب الٰہ آبادی نے تحقیقی مقالہ لکھا ہے جس پر مگدھ یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی سند عطا کی ہے۔

اکبر دانا پوری: اکبر دانا پوری نے نواب ولایت حسین خاں نصرتی عرف مہدی نواب رئیس محلہ گذری کی وفات پر بھی ایک قطعہ کہا تھا جو ۴۸ ابیات پر مشتمل ہے۔ احمد اللہ ندوی نے دو بیتیں نقل کی ہیں وہ یہ ہیں ۔

وہ نیک باطن و بے مثل مہدی نواب ابھی ابھی جسے ہم نے لحد میں رکھا ہے
وہ گھر جو شان محل کا کل تھا صدر مقام اسی میں حسرتوں کا آج ڈھیر خیمہ ہے

اکبر دانا پوری کی ایک تصنیف "مولد غریب" پر حضرت شاہ امین احمد ثبات فردوسی بہاری سجادہ نشین مخدوم جہاں؟

نے تقریظ لکھی تھی صاحب "برہان العاشقین" نے اسے نقل کیا ہے دو شعر میں نقل کر دیتا ہوں ؎

زود رقم شاہ محمد اکبرؔ ۔۔۔ صاحب باطن و صاحب ارشاد

در فن نثر بود ہم کامل ۔۔۔ در فن نظم بود ہم اوستاد

اکبرؔ داناپوری کے نعتیہ کلام کا ایک اچھا خاصا حصہ "باغ خیال اکبر عرف دیوان اکبر" کے نام سے طبع ہوا تھا جس میں حضرت اکبرؔ داناپوری کے علاوہ اکبرؔ میرٹھی اور اکبرؔ شاہ جہاں پوری کے بھی نعتیہ کلام ہیں۔ اس کی طباعت ابوالعلائی اسٹیم پریس آگرہ میں ہوئی تھی۔ اس کا مطبوعہ نسخہ خانقاہ منعمیہ قمریہ میتن گھاٹ پٹنہ سٹی میں موجود ہے۔

تلامذہ اکبرؔ داناپوری: حضرت اکبرؔ داناپوری کے تلامذہ میں ایک اہم اضافہ سید بدرالدین احمد بدرؔ عظیم آبادی کی زیر طبع کتاب "حقیقت بھی کہانی بھی" نے کیا ہے۔

حضرت بدرؔ نے زہرہ بائی نام کی ایک طوائف کا ذکر کیا ہے جو آگرہ کی رہنے والی تھی لیکن کمسنی میں ہی وہ اپنی ماں کے ساتھ مہاراج دربھنگہ کے دربار کے ساتھ منسلک ہو گئی۔ فن موسیقی وغیرہ کی ساری تعلیم اس کی یہیں ہوئی۔ پھر پٹنہ میں سکونت اختیار کر لی۔ بقول حضرت بدرؔ "یہ گاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ در و دیوار سے نغمے پھوٹے پڑتے ہیں۔ فضا سے نغموں کی بارش ہو رہی ہے اور محفل میں راگنی دیوی، اپنے جاہ و جلال کے ساتھ براجمان ہے۔"

جیسی شہرت و عظمت فن موسیقی میں زہرا بائی کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسری طوائف کو نصیب نہ ہوئی۔ آخر عمر میں اس نے اپنے پیشے سے توبہ کر لی۔ اسے حضرت شاہ اکبرؔ داناپوری سے بڑی عقیدت تھی۔ انھیں سے مرید بھی ہوئی اور اپنے کلام پر بھی انھیں سے اصلاح لیتی رہی شعر کہنے کا اچھا مذاق تھا۔ اکثر اپنی ہی غزلیں گاتی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے کلام کے یکجا کرنے کی طرف کسی نے توجہ نہ دی چنانچہ صرف چند اشعار لوگوں کو یاد رہ گئے ہیں۔ حضرت بدرؔ نے چار اشعار بھی نقل کیے ہیں ایک شعر پیش خدمت ہے ؎

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے ؛ جھک کے کچھ بات کہی شیشے نے پیمانے سے

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق
شعبۂ فارسی، جین کالج آرہ

جواب

عزیزی شمیم منعمی سلمہ نے میری مطبوعہ کتاب "شاہ اکبر داناپوری۔ حیات اور شاعری" پر اپنی دانست میں ایک تحقیقی و تنقیدی مضمون لکھ کر ماہنامہ مریخ پٹنہ بابت دسمبر ۸۶ء میں شائع کروایا جس کا نمبروار مدلل جواب میں نے مریخ بابت جون ۸۷ء میں دیا۔ اپنے اس مضمون سے ان کی سیری نہ ہوئی تو انھوں نے میری پوری تھیسس (بشکل مسودہ) کا جائزہ ایک سو سات صفحوں میں لے ڈالا۔ علمی موشگافیاں قابلِ تعریف ہیں ولے ؎

ہر سخن جائے و ہر نکتہ مقامے دارد

محقق دوراں قاضی عبدالودود صاحب نے مشہور ادیب و ناقد پروفیسر اختر اورینوی کی ڈی۔ لٹ تھیسس کا قسطوں میں بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیا مگر اختر کی تھیسس کی اشاعت کے بعد۔ اس لیے کہ جب تک کوئی مقالہ مسودے کی صورت میں ہے خواہ وہ داخلِ یونیورسٹی ہی کیوں نہ ہو چکا ہو اس میں ترمیم و حک و اضافہ کی پوری گنجائش اور اجازت باقی رہتی ہے۔ ممتحنین کی ہدایات و رہنمائی کے پیش نظر یونیورسٹی سے اصلاح و اضافہ کے بعد بھی چھاپنے کی اجازت ملتی ہے۔

میرا مقالہ بھی طالب علمانہ نوعیت کا پی ایچ۔ ڈی امتحان پاس کرنے کے لیے لکھا گیا تھا اور امتحانی پرچوں میں ظاہر ہے بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لیے۔ جب مجھے اس کے چھاپنے کی نوبت آئی تو ان حصوں کو جو یقیناً نظرِ ثانی کے متقاضی تھے حذف کر دیا گیا۔ مقالے کے مسودے کو بیجا شوقِ ناوک فگنی کا ہدف بنانا مناسب نہ تھا۔

بہر حال میرے محبّ مکرم ڈاکٹر عابد رضا بیدار صاحب کا حکم ہے کہ عزیزی شمیم سلمہ کی خامہ فرسائی کا مختصر جواب بطور REJOINDER لکھ دوں تو اجمال کو راہ دیتے ہوئے تعمیل حکم میں حسب ذیل گزارشات پیش ہیں۔

شمیم منعمی کی بے محل باتوں کا جو نفس مقالے سے زیادہ متعلق نہیں ہیں اگر اسی تفصیل سے ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے تو صفحات غیر تعمیری طور پر ضائع جائیں گے پھر علمی و تحقیقی مباحث میں زبان و بیان کو لازمی طور پر مؤدب و مہذب ہونا چاہیے بالخصوص ان افراد کے لیے جو خانقاہی متصوفانہ ماحول اور مشائخانہ تربیت کے پروردہ ہوں کہ اس مکتب کا پہلا سبق ہے کہ؎ گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

اب ذیل میں ان خاص خاص باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروں گا عزیزی سلمہ نے جن کی گرفت کی ہے۔

میں نے اپنے مقالے کے بابِ اوّل میں بطور تمہید مختصر ۲۷ صوفیائے بہار کا سرسری تعارف پیش کیا تھا جو متداول کتابوں میں دستیاب ہیں۔ ظاہر ہے یہ میرے مقالے کا اصل موضوع نہیں تھا کہ اس میں دادِ تحقیق دیتا۔ معترض خود

معترف ہیں کہ یہ "خود ایک علیحدہ تحقیق کا موضوع ہے"۔ مگر اس کے بعد پھر یہ لکھنا کہ "میں اس باب کو اس قابل ہی نہیں سمجھتا کہ سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کی کوشش کروں" موصوف کے معاندانہ رویے کی چغلی کھاتا ہے جو کھلے صفحات میں کھل کر سامنے آگیا۔ میرے مقالے کا دوسرا تمہیدی باب ہے "صوفیائے داناپور اور ان کی خانقاہ" مقالے میں اگر یہ باب نہ ہوتا تو شاید شمیم منعمی میری تھیسس کو قابلِ توجہ بھی نہ سمجھتے اس لیے کہ شعری ادب و شعور سے موصوف کی دلچسپی ظاہر ہے۔ خانقاہی سیاست سے اللہ بچائے۔ خانقاہِ داناپور سے متعلق متنازعہ صدسالہ بازیوں کا ساٹھ سالہ تاریخی پس منظر ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بے محل ان باتوں کا ذکر کروں مگر یہ اشارہ لا بدی ہوگیا کہ شمیم منعمی کا طویل اعتراض مضمون اسی پس منظر کی اُپج ہے جس میں نیک نیتی کو ہرگز ہرگز دخل نہیں۔ اگر ضرورت نے مجبور کیا تو یہ اشارہ واضح تصویر بھی بن سکتا ہے۔ سر دست چند اعتراضات کے جواب ملاحظہ ہوں۔

اس باب کے تحت میں نے داناپور کو پٹنہ سے ایک جگہ سات میل مغرب اور دوسری جگہ چھ میل مغرب اور دریائے سون کی ایک شاخ کے کنارے واقع لکھا ہے۔ میرے والد مرحوم حضرت قتیل داناپوری نے اسے "بہ لب دریائے سون واقع است" لکھا ہے۔ حضرت اکبر داناپوری نے پٹنہ کو "داناپور سے سات کوس مشرق" لکھا ہے۔

اب سات کوس کا فاصلہ صحیح ہے یا چھ سات میل صحیح ہے شمیم منعمی کو بتانا تھا تو صرف اس بات پر ہے کہ والد نے سون کے کنارے اور بیٹے نے شاخ سون کے کنارے لکھا ہے۔ اگر کوئی کہے "نیم پر کوا بیٹھا ہے" اور کوئی کہے "نیم کی شاخ پر کوا بیٹھا ہے" تو موصوف ہی بتائیں کون درست ہے اور کون نادرست۔

میں نے شاہ ٹولی کو داناپور کا قدیم ترین محلہ لکھا ہے اور "کئی سو برس" کے الفاظ لکھے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں قدیم ترین کا ثبوت؟ یہ کئی سو برس کس سن سے شروع ہو کر کس سن پر ختم ہوا؟ اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔ دو سو کو بھی کئی سو کہا جائے گا اور دو سو سے زاید سو کو بھی۔ عزیز گرامی پوچھیں حضرت اکبر داناپوری سے کہ انھوں نے کیوں لکھ دیا۔

"حضرت مخدوم شاہ شعیب قدس سرہ جو حضرت جلال منیری قدس سرہٗ کے صاحبزادے اور حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہٗ کے چچا زاد بھائی ہیں اور پانچ سو برس کا زمانہ آپ کو ہوا وہ اپنی تصنیفات میں تحریر فرماتے ہیں کہ میں اکثر داناپور کے اعزہ اور اقربا کی ملاقات کو جاتا تھا۔" (نذر محبوب صفحہ ۲)

جناب شاہ محمد کبیر صاحب مصنف تذکرۃ الکرام رقم فرماتے ہیں:

"اس محلے میں پہلے سے شرفا رہتے تھے۔ کیوں کہ حضرت مخدوم شعیب قدس سرہٗ نے کہ ابن عم و خلیفہ حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد بہاری رضی اللہ عنہ کے تھے تحریر فرمایا ہے کہ میں منیر سے شیخ پورہ جانے میں داناپور میں مقیم ہوا اور عزیزوں کے دیدار سے دل خوش کیا۔" (تذکرۃ الکرام صفحہ ۶۷۸)

جناب شاہ عطا حسین صاحب فانی داناپوری نے بھی اپنی تصنیف لطیف کنز الانساب کے صفحہ ۹۷ پر داناپور میں حضرت مخدوم شعیب کی گوشہ نشینی وچلہ کشی کا ذکر کیا ہے۔

حضرت عرفان نے لکھا ہے: " داناپور میں محلہ پھلواری میں کہ اب نام سے محلہ شاہ صاحبان کے مشہور ہے"۔ حضرت عرفان کے جد امجد حضرت فانی لکھتے ہیں " داناپور کہ سابق محلہ پھلواری بود"

شمیم منعمی کہتے ہیں کہ فانی نے محلہ شاہ صاحبان کا نام پھلواری نہیں بتایا ہے بلکہ داناپور کو پھلواری لکھا ہے اور پرگنہ پھلواری وقصبہ پھلواری کی لاطائل بحث اٹھا کر محلہ شاہ ٹولی کی قدیم عظمت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔ موصوف کو معلوم ہو کہ حضرت فانی نے داناپور لکھ کر محلہ شاہ ٹولی ہی مراد لیا ہے نہ کہ سارا شہر داناپور مع کنٹونمنٹ وغیرہ۔

سیدنا حضرت اخی سراج قدس سرہٗ کے دہلی سے لکھنؤ آنے اور درمیان میں داناپور کے قیام سے انکار کی جرأت تو نہ ہو سکی کہ ان کے بزرگوں نے لکھ دیا ہے مگر دل کے پھپھولے اس استہزا سے توڑتے ہیں کہ:

" دہلی اور لکھنؤ کے درمیان کی ریاضی کی مدد لے کر ایک اوسط رفتار مسافر سے قیام کرایا جائے تو مختلف مقامات کو یہ شرف حاصل ہوگا۔"

افسوس شمیم منعمی شاہ ٹولی سے شرف نسبت رکھ کر بوجوہ اس کی عظمت پر حرف لانا چاہتے ہیں۔ میرے مقالے کا موضوع ہے "شاہ اکبر داناپوری ـــــ حیات اور شاعری" تاریخ اور جغرافیہ یا ریاضی نہیں۔ البتہ تاریخی پس منظر جو کتابوں میں ملے دیئے گئے۔ معترض نے سارا زور اعتراض اصل موضوع سے ہٹ کر تمہیدی وحاشیائی باتوں پر دیا ہے اور خواہ مخواہ "بہ نیت مخصوص" اپنے مضمون کو ناحق طول دیا ہے۔

سید شاہ مبارک حسین رضوی ابن حضرت علی شیر جاجنیری مرید وخلیفہ سیدنا اخی سراج بانی خانقاہ چشتیہ نظامیہ داناپور تھے۔ شمیم منعمی کا اعتراض ہے " مبارک حسین رضوی ابن حضرت علی شیر" کیا معنی؟

میری اور میرے والد مرحوم کی پیدائش (۱۳۱۱ھ) سے بھی قبل سید شاہ محمد کبیر صاحب داناپوری نے تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب واسلام" کے صفحہ ۵۰۳ پر متعلقہ صفحہ ۵۰۲ جو شجرہ نسب درج فرمایا ہے اس میں سید علی شیر جاجنیری کے بعد ان کے صاحب زادے سید مبارک ہی کا نام ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرۂ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

حیرت ہے شمیم سلمہ نے کیسے لکھ دیا کہ شاہ محمد کبیر داناپوری کو مبارک حسین رضوی کا ذرہ برابر بھی علم نہ تھا۔ موصوف یہ پڑھ کر متوازن نہ رہے کہ شاہانِ مغلیہ دہلی سے برابر بغرض فاتحہ اس محلے میں حاضر ہوتے تھے۔ یہ جملہ خود تحقیق کا ایک نیا باب کھولتا ہے جس کی بحث میں پڑنے کا یہ محل نہیں لفظ "شاہانِ مغلیہ" کے لیے وہ راوی ماخذ اور سند چاہتے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ جناب شاہ حسین الدین صاحب گیاوی مرحوم جن کا نام وہ بڑے ادب سے لیتے ہیں اور لینا چاہیے اور ان کی تحریر سنداً پیش کرتے ہیں، کیا ان سے بھی وہ دریافت کریں گے کہ انھوں نے رسالہ "خانقاہ داناپور" میں یہ کہاں سے تحریر فرمایا :

"مقام داناپور ایک ایسا مہبط علم و انوار تھا کہ حصول فیض و برکت کے لیے شاہان دہلی تک یہاں کا رخت سفر باندھتے اور فائز المرام ہوتے تھے۔" (دیباچہ صفحہ الف)

شاہ عالم، شجاع الدولہ، میر جعفر، میر قاسم، لارڈ کلایو کا شاہ ٹولی آنا، رہنا، کھانا پینا، پڑھنا لکھنا اور حاجت براری کیا شاہ ٹولی کی عظمت کا نشان نہیں ؟

ایک اعتراض ہے کہ "کیا مصنف (میں) 'چند روز' کا ترجمہ انشاء اردو میں ایک عمر کرتے ہیں۔" میں کم سواد کیا جواب دوں، وہ روح غالب سے ہی رجوع کرلیں جو صاحب اردوئے معلیٰ تھے مگر انھوں نے بھی بادشاہ ظفر کے اس شعر پر اعتراض نہ کیا۔ "عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن"

کسی کی عمر چند روز بھی ہوتی ہے اور کسی کی چند دہائیاں بھی مگر وہ ایک عمر ہی ہوتی ہے۔ عمر تو وقفہ زماں سے عبارت ہے۔ اتنا بے تکا اعتراض سطحیت کا غماز ہے۔ میں موصوف کی لغتی خوردہ گیری کو صرف نظر کرتا ہوں۔

"صوفیائے داناپور اور ان کی خانقاہ" کے تحت نمائندہ شخصیتوں کے ضمن میں۔ حضرت میر سید مبارک حسین رضوی چشتی نظامی تا حضرت میر سید منہاج الدین رضوی چشتی نظامی کو بیک قلم معترض نے "تصوراتی شخصیتیں" لکھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ حضرت شاہ قتیل داناپوری قدس سرہٗ کی سجادگی (۱۲۴۴ھ) کے بعد معاندین آستانۂ پاک کے ساتھ جو رسالہ بازیاں ہوئی ہیں ان کے طویل اقتباسات درج کروں اور مضمون کو بیجا طول دوں۔ رسالہ "آستانۂ چشتیہ نظامیہ" بجواب "خانقاہ داناپور" "کلمۂ حق" بجواب "تحقیق حق" اور "فیصلۂ اکبر" بجواب "قول فیصل" عبرت کی نگاہ سے مطالعہ کیجیے۔

مصنفین کسی عہد یا سن کا تعین تاریخی واقعات کے پیش نظر جب حتمی طور پر کوئی نوشتہ یا سند نہ ہو تو گمان غالب کو راہ دیتے ہیں۔ بہرحال یہ قیاس اہل علم و بصیرت کا حق ہے۔

قاضی کو قاضی القضات لکھنا میرے ناقص علم میں ویسا ہی ہے جیسے سید کو سید السادات لکھنا۔

شمیم منعمی نے اپنے جذبۂ غیر صالح کی رہنمائی میں قلم اٹھایا ہے لہٰذا وہ تحقیق کی قدروں کو پامال کرتے ہوئے ادب و احترام کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑتے ہیں لکھتے ہیں : "مصنف کے والد قتیل داناپوری (م ۱۴۰۵ھ) کو شاید اس بات کا ہوش نہ رہا کہ حضرت قطب الدین (محمد ھی قاضی عبد الفتاح) کو وہ داؤد شاہ والی حاجی پور (ابن سلیمان کرانی)

کا وزیر مانتے ہیں اور جس کا عہد حکومت سال دو سال کے اندر ۹۸۲ھ میں حاجی پور سے سمٹ گیا اور اس کے وزیر حضرت قطب الدین کے لیے انھوں نے جو سن وصال ۹۲۵ھ گڑھا وہ بالکل غلط گڑھا"

جناب شاہ حسین الدین احمد منعمی بھی تحریر فرماتے ہیں! "سید تقی الدین عرف سید بوڑھے .... مع اہل وعیال و تبرکات خاندانی داؤد شاہ کے پاس حاجی پور تشریف لے آئے۔ داؤد شاہ نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آیا اور بیعت حاصل کر کے .... نیز آپ کے خلف الرشید سید قطب الدین کی لیاقت ظاہر وذاتی وجوہر صفاتی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور منصب وزارت سپرد کی۔ سید تقی الدین عرف سید بوڑھے کا ۲۱ر محرم ۹۹۸ھ میں انتقال ہوا اور وہیں حاجی پور میں متصل جامع مسجد مدفون ہوئے، مزار آپ کا بادشاہ کے پیر کے نام سے ابتک مشہور ہے"

شاہ حسین الدین صاحب نے کیفیت العارفین کے حاشیے پر ص۱۴۱ میں حضرت قطب الدین کا وصال ۲۱ر رجب ۹۶۰ھ لکھا ہے۔ یہ کون سی تحقیقی زبان ہوئی کہ ایک مصنف کے لیے آپ "ہوش نہ رہا" "سن وصال جھوٹ گڑھا" وغیرہ لکھتے ہیں اور ایسی ہی تحریروں کے مصنف کے لیے القاب وآداب روا اور اعتراض ختم۔ اسی سے تحفظات ذھنی عیاں ہیں۔ شمیم منعمی کو حاجی پور میں ان حضرات کا مزار باوجود کدوکاوش کہیں نہ ملا گویا حضرت قتیل کی تحریر سراسر غلط تھی۔ تو رجوع کریں روح شاہ حسین الدین صاحب مرحوم سے انھوں نے تو پتہ بتا دیا ہے۔ اور لفظ "ابتک" کی تحقیق بھی کرلیں۔

جہاں تک سید صدر جہاں کو ابراہیم شاہ شرقی والی جون پور کا وزیر لکھنے کی بات ہے تو یہ سچ ہے کہ یہ صد فی صد غلط ہے۔ میرے ممتحن نے اس کی نشاندہی کردی تھی۔ یہ ارادی غلط تھا جسے یقیناً کسی نام کی یکسانی سے اشتباہ ہوا ہوگا۔ غلط کو غلط تسلیم کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں۔

شمیم منعمی اعتراضاً لکھتے ہیں:

"میر سید اسمٰعیل کے خواجہ غریب نواز کے خلیفہ ہونے کا علم صاحب کنز الانساب اور شاہ وحید الدین احمد اناپوری کو نہیں تھا" چلیے جناب شاہ حسین الدین احمد صاحب کو تو علم کسی مستند ذریعہ سے ہی ہو گیا تھا جو انھوں نے انقاہ دانا پور" میں لکھ دیا۔

شمیم منعمی لکھتے ہیں!

"اہل درزش کا مزار کے پائینتی میں درزش کرنا شاہ قائم صاحب قتیل دانا پوری کے وقت میں شروع ہو گا اور انھیں کی زندگی میں یہ تماشا ختم بھی ہو گیا ہوگا" شمیم جس بزرگ خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اس

تقاضا ادب کا تھا نہ کہ بڑوں کی شان میں طنز و استہزا کا۔ کے آمدی و کے پیر شدی۔ شمیم سلمہ کو چاہیے کہ تیسیح الشیوخ کے دو انہ ازیاد رکھیں ؎

یکے آن کہ در خویش خود بیں مباش دگر آں کہ در غیر بد بیں مباش

اعتراض نمبر ۳ کے تحت وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ شاہ حسین الدین صاحب نے اپنی کس تصنیف میں ایسا لکھا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ کے داناپور تشریف آوری کے وقت شاہ ولی اللہ صاحب مرشد آباد میں تھے۔ گویا میں نے شاہ صاحب پر کوئی اتہام لگا دیا ہو۔ تو دیکھ لیں شاہ صاحب موصوف کا رسالہ "خانقاہ داناپور صفحہ ۴" آپ فرماتے ہیں :

"چنانچہ شاہ عالم ثانی نے اسی سفر میں داناپور پہنچ کر حضرت سید شاہ محمد یٰسینؒ کو دریافت کیا۔ یہاں نہ صرف حضرت موصوف کا انتقال ہو چکا تھا بلکہ حضرت سید شاہ ولی اللہ بھی دوبارہ مرشد آباد تشریف لے جا چکے تھے"

اس ہمہ دانی پر یہ عالم ہے۔ شمیم منعمی نے سلسلہ وار نمبر ۵ کے بعد اپنی بیش قیمت مگر غیر ضروری و بے محل معلومات کا یقیناً ایک دریا بہا دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ میرے مقالے میں انکی کیا ضرورت تھی جو میں سیاہی خرچ کرتا۔

بزرگانِ داناپور میں ایک بیحد اہم و محترم شخصیت کا نام (جنھیں اگلوں نے سید الواصلین جیسے القاب سے یاد کیا ہے) شمیم منعمی یوں لکھتے ہیں : "داناپور شاہ ٹولی کے شاہ صاحب غلام حسین داناپوری"

یہ کون تھے؟ اور شمیم منعمی سے ان کا کیا واسطہ ہے، جاننے والے یہ اندازِ نگارش دیکھ کر یقیناً ملول ہوں گے۔

ادب تاجیست از لطف الٰہی بنہ برسر برو ہر جا کہ خواہی

رقمطراز ہیں : "پھلواری کی خانقاہ مجیبیہ، فریدیہ، سلیمانیہ سے داناپور کے مشائخ رضوی و باقری سے باضابطہ کوئی تعلق طریقت، رشتہ داری یا شادی بیاہ کا مجھے کوئی علم نہیں۔" اس اقرار صالح کے بعد کہ انہیں کوئی علم نہیں کیا لکھا جائے۔

میں نے اپنے مقالہ میں پٹنہ کے دو مشہور تاریخی مشاعروں کا ذکر کیا تھا "پٹنہ کے مشاعرے" تو میرا موضوع تحقیق نہ تھا، پھر شمیم منعمی کا یہ لکھنا کہ "پٹنہ میں کب کب کون کون مشاعرہ کس کس کے اہتمام سے ہوا، اس میں کتنے شعراء کہاں کہاں کے شریک ہوئے" مصنف کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے"۔

"کان میں ہوا لگنا" بھی ایک محاورہ ہے۔ انھیں تو ہوا لگ ہی چکی، لگے ہاتھوں ایک ہی مقالہ اور دیکھ لیتے۔ میرے مقالہ میں ایسے بیشتر موضوعات مل سکتے ہیں جن پر الگ سے تحقیقی مقالے لکھے جا سکتے ہیں۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ موضوع مقالہ سے باہر جا کے ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کر دیتا۔

شمیم سلمہ نے حضرت اکبرؒ کی وضع و قطع کے بارے میں پڑھا اور سنا ہے میرے راوی میرے والد مرحوم اپنی ۱۶ سال کی عمر تک حضرت اکبرؒ کا زمانہ پایا انھیں قریب سے دیکھا اور ان کی خدمت کا شرف بھی حاصل کیا۔

شاہ جمال الدین حسین کا نام "جمال علی" صرف نثار اکبرآبادی ہی نے نہیں خاندان کے بزرگ شاہ محمد کبیر صاحب نے بھی لکھا ہے، دیکھیے تذکرۃ الکرام صفحہ ۴۸۰

تذکرۃ الکرام میں معترض کو اکبر داناپوری کا جدی نسب نامہ صفحہ ۴۸۰ پر تو مل گیا مگر حیرت ہے کہ امام تاج فقیہ سے اوپر کا نسب نامہ اس کتاب میں نہیں ملا۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۸ و ۲۹ کے درمیان بڑے شیٹ پر مطبوعہ نسبی شجرہ نامہ مذکورہ لگا ہوا ہے۔ قیام مکانی کسی کا ضرور نہیں کہ ہمیشہ ایک ہی ہو تبدیلی مکانی کے سبب مختلف نسبت مکانی ہوتی رہتی ہے۔ کسی نے سید جعفر کو خراسانی لکھا کسی نے مدنی کسی نے سید تاج الدین کو دھلوی لکھا کسی نے کانپوری۔ مخدومنا حضرت عبدالمنان قادری دہلی میں رہے تو دہلوی اور عظیم آباد تشریف لے آئے تو عظیم آبادی ہوئے۔

نمبر ۸ کے تحت تتمہ نجات قاسم کی تحریر حق ہے۔ نہ معلوم یہ اشتباہ مجھے کیوں کر ہوا۔

عزیز موصوف شاہ اکبر داناپوریؒ کے لیے میرے لفظ مخصوص سجادہ پر معترض ہیں واضح ہو کہ شاہ اکبر اپنے والد شاہ محمد سجاد قدس سرہ کے مخصوص سجادہ پر ہی متمکن ہوئے۔ اس طرح یہ نئی سجادگی وجود میں آئی' ورنہ شاہ ٹولی داناپور میں تقریباً ۴۷ھ سے جو قدیم سجادہ چشتیہ نظامیہ قائم تھا اس پر حضرت سید شاہ کاظم حسین چشتی نظامی قدس سرہٗ بحیثیت ۱۸ ویں سجادہ نشین جلوہ افروز تھے۔ شاہ محمد یحییٰ ابوالعلائی عظیم آبادی نے کنزالتواریخ میں یوں تحریر فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"قطعہ تاریخ سجادہ نشینی سید محمد اکبر صاحب بجائے پدر بزرگوار خود شاں"۔ (کنزالتواریخ قلمی ورق ۲۵۴ ——— مملوکہ خدابخش لائبریری پٹنہ)

مولوی احمد کبیر حیرت پھلواری اپنی کتاب تاریخ کملا جلد دوم مطبوعہ ۱۳۰۲ھ کے صفحہ ۲۶۷ پر قطعہ تاریخ وفات حضرت شاہ محمد سجاد ابوالعلائی میں لکھتے ہیں:

بچاردہ مہِ ذیقعدہ روز یکشنبہ — اجل رسیدہ قدم بوس شد بحکم قضا
نشست بر سر سجادہ اش بروز سعید — بمجلسے کہ دراو بود مجمع عرفا
خلیفہ و پسرش شاہ اکبر ذی شاں — کہ ہست در دل او فیض نسبت آبا

اب تو مخصوص سجادہ سمجھ میں آگیا ہوگا؟

میرا جملہ "حضرتِ اکبر کو زیارت حرمین شریف کا خیال آیا" ایک سیدھی سی عبارت تھی مگر کج فہمی و غلط اندیشی

کے ساتھ عیب جوئی کی خواہش اعتراض سے واضح ہے کہ:

"حرمین کے ساتھ شریف لکھنا مولف کو (مجھے) زیب نہیں دیتا۔"

یہ لکھ کر گویا وہ کہہ رہے ہوں کہ پی ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کر کے بھی جاہل ہو۔ تبسم سلمہ کو جاننا چاہیے کہ "حرمین شریف" فارسی ترکیب ہے اور بقاعدہ صحیح۔ ڈکٹر پرویز ناتل خانلری اپنی مستند کتاب 'دستور زبانِ فارسی' میں لکھتے ہیں:

"موصوف چہ مفرد باشد چہ جمع صفت آں ہمیشہ مفرد می آید می گوئیم 'مردانِ بزرگ' دریں حال موصوف جمع است وصفت آں مفرد" صفحہ ۱۶ کیسے کیا لکھنا زیب دیتا ہے سمجھا چاہیے اگر شریفین ہی لکھنے پر بضد ہوں تو پھر حرمین الشریفین الف لام عربی کے ساتھ لکھنا ہوگا۔

مقدمہ جذبات اکبر کے صفحہ ۲۰ پر تصنیفات اکبر کی فہرست ہے اور میری تالیف میں بھی تصنیفاتِ اکبر کی فہرست ہے۔ دونوں کو ملاکر دیکھیں ایک دوسرے کی نقل بالکل نہیں۔ میری فہرست لفظ وغیرہ پر ختم ہوتی ہے۔ وغیرہ کے کیا معنیٰ؟

اعتراض نمبر ۸۵ کے تحت لکھتے ہیں کہ حضرت اکبر داناپوری حلقہ آستانۂ قدیم چشتیہ نظامیہ داناپور میں نہ دفن ہوکر حلقۂ سید شاہ شمس الدین قادری داناپوری میں دفن ہوئے۔

گزارش ہے کہ حضرت اکبر داناپوری کے ارشادات معروف بہ 'دل' مرتبہ مولانا نثار علی صاحب کے ص۲۰ کی عبارت ملاحظہ ہو: "مزار فیض انوار آپ (شاہ سجادؒ والد شاہ اکبرؒ) کا مقام داناپور حلقۂ خانقاہ شریف مقبرۂ اجداد میں واقع ہے۔" میں نے حضرت اکبرؒ کے متعلق لکھا تھا کہ اپنے والد کے پہلو میں حلقۂ آستانۂ قدیم میں آسودہ ہوئے۔ حلقۂ خانقاہ شریف خانقاہ، مسجد و مقبرہ و زیارت خانہ پر مشتمل ہے۔ یہی مقبرۂ اجداد مختلف چھوٹے چھوٹے حلقوں میں بٹ گیا ہے اور اجداد کی قبروں سے منسوب ہے مثلاً حلقۂ شاہ شمس الدین قدس سرہ جو شاہ غلام حسین قدس سرہٗ گیارہویں سجادہ نشیں آستانۂ قدیم کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے اور ان کی زندگی میں ہی انتقال فرماکر حلقۂ سجادگان کے باہر آسودہ ہوئے۔ اسی حلقہ کو حضرت ابی و شیخیؒ نے خزینۃ الانوار میں حلقۂ شاہ شمس الدین لکھا ہے کیا غلط لکھا؟ اسی طرح حلقۂ شاہ تراب الحقؒ، حلقۂ شاہ واجد حسینؒ اور حلقۂ شاہ سجادؒ وجود پذیر ہوئے۔

مولوی احمد کبیر حیرت پھلواری کے قطعہ تاریخ وفات شاہ سجادؒ داناپوری کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو!

شد است مرقدِ او خانقاہ داناپور   کہ قطب بود نجنبید او مگر از جا

تاریخ مکمل جلد دوم ص۱۰۸

اس شعر میں خانقاہ سے مراد سماع خانہ تبھی یا حجرہ نہیں، مقبرۂ خانقاہ ہے اب تو حلقۂ خانقاہ یا حلقۂ آستانۂ قدیم

سمجھ میں آیا۔ اپنے مقالے کے سلسلے میں حسب توفیق استطاعت میں نے کوشش کی "کدوکاوش" سے ابھی اور بھی بہ کچھ سامنے آسکتا ہے۔ ایک ہی موضوع پر مختلف دانشگاہوں میں الگ الگ لوگوں کی جداجدا تحقیقات ہیں مثلاً

موضوع	محقق	یونیورسٹی
سید سلیمان ندوی ــــ حیات اور ادبی خدمات	علی وردی خاں، محمد منصور عالم	بہار، مگدھ
سید سلیمان ندوی کی خدمات	جمیلہ بانو	علیگڑھ
قائم چاند پوری	محمد عرفان، سید عبدالحیٔ	آگرہ، بمبئی
محمد حسین آزاد	ڈاکٹر شمیم حنفی، عبدالستار دلوی	الٰہ آباد، بمبئی
مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری	مجاہد حسین رضوی، زمان بیگ آزردہ	گورکھپور، کشمیر
امیر اللہ تسلیم ــــ حیات اور شاعری	سید علی رضا حسینی، محمد یونس	لکھنؤ

چاہیے تو تھا کہ اسی طرح شمیم منعمی بھی "شاہ اکبر داناپوری۔ حیات اور شاعری" کے عنوان سے اپنا یہ مقالہ پٹنہ یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے جمع کردیتے۔ مواد ان کے پاس مجھ سے کم تو نہ تھا، ہاں ذرا صبر و تحمل کے ساتھ ایک دو سال ٹھہرنا ہوتا۔ جن کتابوں سے مواد اخذ کیا، حوالے دیے، انھیں کتابوں سے مجھے بے خبر و لاعلم بتاتے ہیں فواحسرتا۔

اکبر کے ہر شاگرد پر صفحہ دو صفحہ لکھا جاسکتا ہے، میرا کام مختصر تعارف کرانا تھا ان کی CHRONOLOGY پیش کرنا نہیں۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے شعرا کے حالات ایک دوسرے سے مستعار لیے ہیں، نقل کیے ہیں، اس میں سہو و خطا نے بھی راہ پالی ہے۔ ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔

مجھے تسلیم کہ میں نے حضرت اکبر کی نثری تصانیف کے لیے کوئی نمایاں "کدوکاوش" نہیں کی۔ مجھے بار بار نگراں کی تاکید تھی کہ موضوع سے باہر نہ جاؤ اور ذیلی باتوں کو مختصر کرو۔ میرے مقالے کا عنوان تھا "شاہ اکبر داناپوری ــــ حیات اور شاعری" شاہ اکبر داناپوری جلیل القدر اور باعث فخر شخصیت تھے۔ ان کے انتقال کے ساٹھ سال بعد میں نے ان کی حیات اور شعری کارناموں پر اپنی بساط بھر توجہ دی یقیناً جو کچھ لکھ سکا اس سے کہیں زیادہ کے وہ مستحق تھے اور ہیں۔ یہی کیا کم ہے کہ اسی بہانے شمیم منعمی نے اتنا کچھ ڈھونڈ نکالا اور بڑی "کدوکاوش" دکھائی بلکہ پورے مضمون میں دسیوں جگہ "کدوکاوش" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اس کے مضمون میں کد بھی نمایاں ہے اور کاوش بھی۔

ایما و اشارت نہ باندازۂ راز است

ایں رشتہ باریک نہیچی کہ دراز است

ڈاکٹر شوکت حیات
شعبۂ اردو
اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر غفار پاشاہ کا تھیسس

ضلع چتور میں اردو بول چال

اردو ہندستان کی تمام زبانوں میں یہ امتیاز رکھتی کہ اس کی بول چال کا علاقہ کسی ایک ریاست تک محدود نہیں ہے بلکہ ہندستان کی مختلف ریاستوں میں اردو بولنے والے ایک خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ جس طرح دہلی اور لکھنؤ کسی زمانے میں اردو بول چال کے مرکز تھے اسی طرح جنوبی ہند کی مختلف ریاستوں میں متعدد ایسے علاقے ہیں جہاں آج بھی بول چال کی زبان اردو ہے۔ خصوصیت سے ریاست آندھرا پردیش کا تلنگانہ علاقہ جس میں حیدرآباد بھی شامل ہے اردو کا ایک مرکز تسلیم کیا گیا ہے۔ اس مرکز کے علاوہ بھی اسی ریاست کے بعض علاقے ایسے ہیں جہاں بول چال کی زبان اردو ہے اور اب تک ان علاقوں کی اردو پر کوئی کام نہیں کیا گیا تھا جب ۱۹۵۵ء میں ریاست آندھرا کا قیام عمل میں آیا تو ریاست کو تین علاقوں میں تقسیم کیا گیا ایک علاقہ تلنگانہ جہاں عثمانیہ یونیورسٹی ہے، دوسرا آندھرا یونیورسٹی ہے اور تیسرا علاقہ رائل سیما ہے جہاں ۱۹۵۷ء میں شری وینکٹیشورا یونیورسٹی قائم ہوئی ۱۹۵۹ء میں اس یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے عربی، فارسی اور اردو کا شعبہ قائم کیا گیا۔

اس شعبہ نے اپنی تحقیقات کا مرکز اسی علاقے کو قرار دیا۔ اور پہلی بار ضلع چتور میں اردو بول چال کا جائزہ لیا گیا۔ اس سلسلے میں مفرد الفاظ اور افعال کو جمع کیا گیا۔ اور اس سے یہ اندازہ ہوا کہ (۱) اس علاقے میں بول چال کی اردو میں قدیم الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے (۲) یہ معلوم ہوا کہ بہت سے اردو کے الفاظ بول چال کی وجہ سے اپنی اصل شکل سے بدل گئے ہیں (۳) اس جائزے سے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ بہت سے الفاظ جو رائج ہیں وہ معنوں کے لحاظ سے دوسرے معنوں میں استعمال کیے جاتے ہیں (۴) اس علاقے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اردو بولنے والے ایسے خاندان ہیں جن کا تعلق تامل ناڈو سے ہے اور بہت سے خاندان ایسے بھی ہیں جن کا تعلق ریاست کرناٹک سے ہے اس طرح اس علاقے کے اردو بولنے والے تین ایسی غیر آریائی زبانوں کے اثرات رکھتے ہیں جن کا اردو سے

کوئی تعلق نہیں۔ یہ تینوں دراوڑی زبانیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) تامل (۲) تلگو (۳) کنڑی

اس علاقے کی بول چال کی زبان کے جائزے سے یہ اندازہ لگانا بہت آسان ہے کہ ان تینوں دراوڑی زبانو کے الفاظ جس طرح اردو میں آگئے ہیں اور رائج ہوگئے ہیں ان کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے لیکن ان زبانوں کے لہجے نے اردو کے عام مروج الفاظ کو بھی متاثر کیا ہے اور اس علاقے میں بولی جانے والی اردو کے جائزے سے یہ لسانی اور تاریخی حقیقت سامنے آتی ہے کہ الفاظ اپنے استعمال اور مختلف علاقوں میں رائج ہونے کی وجہ سے کس طرح کی تبدیلیاں قبول کرتے ہیں۔ اگر یہ جائزہ زیادہ وسیع پیمانے پر لیا جائے تو اس کے نتائج زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہوں۔ ہم نے یہ جائزہ علاقہ رائل سیما کے صرف ایک ضلع تک محدود رکھا ہے جو ضلع چیتور ہے۔

یہ بات بے حد تعجب اور تشویش کی ہے کہ اب تک مختلف علاقوں میں اردو کے رائج الفاظ کا تفصیلی مطالعہ نہیں کیا گیا البتہ اردو الفاظ شماری کی کئی کوششیں کی گئی ہیں۔ اردو الفاظ کے سلسلے میں یہ بات خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ عام بول چال کے الفاظ ادب میں شامل نہیں ہیں اور ان کا سُراغ لغات سے بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ مختلف پیشوں کے لوگوں سے ملنے سے ان الفاظ کا پتہ چلایا گیا۔

یہ تحقیقی کام پروفیسر رضی الدین احمد کی نگرانی میں جناب سعاریا شاہ صاحب نے ایم فل کی ڈگری کے لیے کیا ہے انہوں نے اپنے مقالے کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے

پہلا باب اس مقالے کی تمہید ہے جس میں ص۱ - ص۴۲ تک ذیل کے مباحث پر مشتمل ہے

(۱) موضوع کا تعین (۲) اردو زبان کی تاریخ (دکنی پس منظر میں) (۳) اردو کی ہندستان گیر حیثیت

تمہید کا دوسرا حصہ ضلع چیتور کی اردو بول چال کی فرہنگ پر مشتمل ہے جس کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے:

(۱) مشترکہ الفاظ یعنی وہ الفاظ جو اردو میں ہر جگہ مشترک ہیں (۲) مشترک الفاظ جو اردو کے مختلف علاقوں میں تلفظ کے فرق کے ساتھ رائج ہیں (۳) مشترکہ الفاظ جن میں معنوں میں فرق پایا جاتا ہے۔

اس مقالے کا دوسرا باب الفاظ شماری پر مشتمل ہے جس کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے:

(۱) مرکب الفاظ (۲) افعال (۳) مختلف اصطلاحات پیشہ وارانہ

یہ پورا مقالہ ۲۱۳ صفحات پر مشتمل ہے اور آخر میں کتابیات شامل ہے۔

اس موضوع پر یہ پہلا اچھوتا مقالہ ہے اسلئے اسکے چند حصوں کے اقتباس دے کر میں مصنف کی محنت اور اسکے کام کی اہمیت کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔

ضلع چتور کی اردو بول چال کی فرہنگ

مشترک الفاظ: یہ وہ الفاظ ہیں جو اردو میں ہر علاقے میں مشترک ہیں۔ مثلاً:

(الف)

آ یعنی آنے کا امر کا صیغۂ واحد

آآ: پالتو پرندوں کو بلانے کی آواز (خصوصاً کبوتر اڑانیوالے یا مرغی پالنے والے)

آب زمزم: زمزم کا پانی

آپا: بڑی بہن

آپ کو مٹا دینا: فنا کرنا

آتے آتے: چلتے چلتے درمیاں میں

آتے جاتے: چلتے پھرتے یا راہ پھرتے

آخری سواری: جنازہ

(ب)

بابا باپ۔ بزرگ

بابن: سلائی مشین کا وہ حصہ جس پر دھاگا لپیٹا جاتا ہے۔

بات چھیڑنا: گفتگو کرنا۔ پوچھنا

باندی: چھوکری

بادام: ایک خشک میوہ

بارہ وفات: ربیع الاوّل کا مہینہ

باس: بو

باسن: برتن

(پ)

پاجامہ: لباس

پاٹ: چکی کا ایک پتھر

پاکھنڈ: برائی کرنے والا۔ بدمعاش

پپوٹا: آنکھ کا غلاف

پٹکا: کمر سے باندھنے کا ڈپٹا

(ت)

تارا: ستارہ

تحصیلدار: محکمہ مال کا ایک افسر جو مال گذاری وصول کرتا ہے

تربوز: ایک پھل

تڑپ: بے قراری

تسبیح: سو دانوں کی مالا

تہمت الزام

(ٹ)

ٹاپو: جزیرہ

ٹاٹا: خدا حافظ

ٹانگڑی: ٹانگ

ٹوکنا روکنا

ٹھگ: لٹیرا۔ چور

(ج)

جاگ: بے خوابی۔ جاگنا

جاگیر: وہ زمین جو بادشاہ یا حکومت کی جانب سے انعام کے طور پر دی جائے

جال: پھندا

جالا: باریک جال جو مکڑی تنتی ہے

جان: روح

جڑنا: جمع ہونا

(چ)

چاردیواری: گھیرا۔ احاطہ

چال: طور طریقہ۔ رویہ

چاندنی: چاند کی روشنی

چراغ: دیا۔ شمع

چکّی: آٹا پیسنے کا آلہ

(ح)

حاجی: حج کرنے والا

حافظ: وہ شخص جسے قرآن شریف حفظ ہو

حیات: زندگی

حیا، شرم
حشر: قیامت

(خ)

خاتون، بیگم
خالی، جو بھرا ہوا نہ ہو
خاندان: گھرانہ۔ کنبہ
خدا، اللہ تعالیٰ
خون، لہو

(د)

داغ۔ نشان۔ دھبہ۔ رنج۔ صدمہ
درد: تکلیف
دانہ، اناج۔ غلہ
درویش، فقیر
دق: ایک بیماری
دلاسا: تسکین۔ تسلی

(د۔ ن)

دن رات: شب و روز
دواخانہ: شفاخانہ
دیر: تاخیر۔ وقفہ۔ عرصہ
دیگچہ: دیگ سے چھوٹا برتن
دیورانی: دیور کی بیوی

(ڈ)

ڈاکو: لٹیرا
ڈرم: ڈھول
ڈیرا: خیمہ۔ عارضی قیام گاہ
ڈول: کنوئیں میں سے پانی نکالنے کا برتن۔
ڈریس، لباس

(ذ)

ذات، نسل
ذرا۔ تھوڑا۔ بہت کم
ذریعہ۔ وسیلہ۔ واسطہ
ذمہ دار، ضامن

(ر)

راستہ: سڑک
راگ، نغمہ۔ لے۔ سُر
رانی: راجا کی بیوی
رب: پالنے والا۔ پروردگار
رخ، طرف۔ سمت

(ز)

زبان: جیبھ
زبردستی، ظلم۔ زیادتی
زن: عورت
زندہ باد، جیتا رہے
زیادہ: بہت

(س)

ساقی: رفیق
سادہ: بغیر لکھا
سادھو: جوگی۔ درویش
سارا: تمام
سورج: آفتاب

(ش)

شاخ: ڈالی
شامل: شریک
شکار: جانوروں کا مارنا
شیشہ: آئینہ

(ص)

صاحب: شریف۔ دوست
صبر: برداشت۔ قناعت
صدق، سچ۔ راستی
صورت: شکل۔ چہرہ

(ض)

ضرور: واجب۔ لازم
ضرورت: طلب۔ حاجت۔ خواہش
ضروری، لازم

(ط)

طوطا: ایک سبز پرندہ
طوفان: آندھی

(ظ)

ظالم: ظلم کرنے والا۔ وحشی
ظلم: ستم۔ زبردستی

(ع)

عداوت: بغض۔ دشمنی
عمر بھر: زندگی بھر
عظیم: بڑا۔ بزرگ
علّت: بیماری۔ روگ
عورت: زن

(غ)

غارت: تباہ۔ برباد
غدّاری: بے وفائی
غفلت: لاپرواہی۔ بھول

(ف)

فاختہ: ایک پرند
فساد: ہنگامہ
فصل: اناج۔ پیداوار

(ق)

قاضی: مسلمان منصف جو شرع کی رو سے فیصلہ کرے
قبر: گور۔ تربت
قتل کرنا: خون کرنا۔ ہلاک کرنا۔

(ک)

کاج: کام
کاغذ: پرچہ۔ رقعہ
کباب: سوکھے گوشت کے ٹکڑے
کپڑا: لباس
کدّو: ایک ترکاری

(گ)

گلاب: ایک پھول
گردش: چکر
گور: قبر
گورا: سفید

(ل)

لڑکا: بچہ۔ بیٹا
لکھا: تقدیر
لکھاپڑھا: تعلیم یافتہ
لیلیٰ: مجنوں کی معشوقہ

(م)

مانگ: سر کے بالوں کی بیچ کی لکیر
ملائی: دودھ یا دہی کے اوپر کی پپڑی
ملک: سلطنت۔ دیس

(ن)

ناتواں: کمزور
ناراض: ناپسند، ناخوش
نوکر: ملازم۔ خدمت گار
نیکی: بھلائی

(و)

وسوسہ: وہم۔ شبہ۔ اندیشہ
وقت: گھڑی۔ ساعت۔ زمانہ
وفات: موت۔ انتقال
وسیلہ: واسطہ۔ سہارا۔ مدد

(ہ)

ہار: شکست
ہریالی: ہری گھاس۔ تازہ گھاس
ہمت: جرأت
ہمیشہ: سدا۔ آئے دن

(ی)

یکّا: اکیلا
یکایک: اچانک
یار: دوست
یاد رکھنا: خیال رکھنا، بھول نہ جانا
یقین: اعتماد۔ اعتبار

مشترکہ الفاظ تلفظ کے فرق کے ساتھ یہ ھیں: جیسے

(آ)

آٹ۔ [آٹھ] چار کا دگنا۔ ایک اور سات

آدا۔ [آدھا] کسی چیز کے دو برابر حصوں میں سے ایک۔ نصف

آرس۔ (عروس) دلہن

(الف)

اپیچ۔ (آپ ہی)۔ آپ خود

اج کل۔ (آج کل)۔ ان دنوں

اڑونگا: (اڑہنگا) ٹیڑھا ترچھا

افیم (افیون)۔ تریاک

الٹھی عقل: (الٹی عقل) بے عقل

انگن (آنگن)

اوتھار۔ (اوتار) دوسرا جنم

اوڑنا بچھانا: (اوڑھنا بچھو...) بستر۔ لحاف۔ بچھانا

(ب)

بچارا (بے چارا)۔ غریب

بچپنا: (بچپن)۔ لڑکپن

بدلام (بدنام) نام خراب ہونا

بڈّی: (بوڑھی) عمر رسیدہ عورت

بوڑی: (باؤلی) کنواں

بھار: (باہر) کھلے میدان میں

بھاناں۔ (بہنیں) بہن کی جمع

بھایاں: (بھائیاں) بھائی کی جمع

بھریا: (بھرا ہوا) پُر

(پ)

پارا: (پہرا) چوکی

پروٹّا: (پراٹھا) گھی میں پکی ہوئی روٹی

پڑدادا۔ (پردادا)۔ باپ کا دادا

پتل (پیتل)۔ ایک دھات

پشانی: (پیشانی) ماتھا۔ جبیں

(ت)

تاجا: (تازہ)۔ پاک۔ صاف

تالوکا: (تعلقہ) ضلع کا ایک علاقہ

تاگا (دھاگا)۔ سوت

تٹّو (ٹٹّو) گدھا چھوٹے قد کا

تجے: (تجھے)۔ تجھکو

تگادا (تقاضہ)۔ تجھکو

تلاخ (طلاق) عورت کا نکاح منسخ ہونا

(ٹ)

ٹانگڑی (ٹانگ) پیر

ٹھوسنا (ٹھوسنا) زبردستی ڈالنا

ٹاکنا (ٹانکنا) سینا

ٹیم (ٹائم) وقت

(ج)

جچّہ (زچہ) وہ عورت جو بچہ جنم

جلم (ظلم) ستم بے رحمی

جلّا (ضلع) صوبے کا ایک حصہ جو کلکٹر کے ماتحت ہوتا ہے

(چ)

چالیسا (چالیسواں)۔ چہلم

چڑیاں (چڑیاں) چڑیا کی جمع

چکّی (چکنا) آٹا پیسنے کا آلہ

(ح)

حالیت (حالت) کیفیت

حلّہ (حیلہ) بہانہ

حامق (احمق) مورکھ بے وقوف

(خ)

خاب (خواب) سپنا۔ خیال

خائشاں (خواہشات) آرزوئیں

خوراخ (خوراک)۔ غذا کھانا

(د)

دا [دادا] بڑا بھائی یا دادا کا مخفف

داگ (داغ)۔ دھبا

دالنا [ڈالنا] گرانا

دندیاڑے (دن دہاڑے)

دنیاں (دنیا) کائنات

(ڈ)

ڈھکلنا [ڈھکیلنا] ٹھیلنا

ڈبا [ڈبا] ڈھکنے والا چھوٹا صندوقچہ

ڈھالی (ڈالی) شاخ ٹہنی

ڈجن (درجن) (۱۲) ایک ہی قسم کے بارہ حصے

(ر)

رُپا (روپا)۔ چاندی

رقا (رقعہ) تحریری کاغذ

ریچھ (ریچھ) ایک وحشی جانور

رکھی روٹی (روکھی روٹی) وہ روٹی جس کے ساتھ کھانے کو کوئی چیز نہ ہو

(ز)

زلدی (جلدی) فوراً

زہار چڑنا (زہر چڑھنا) زہر کا اثر ہونا

(س)

سپئی (سپاہی) فوجی

سرانا (سرہانا) سر کی طرف کا

سسر (خسر) بیوی کا باپ

سکے (سوکھے) خشک چیزیں

سگے (سگے) رشتہ دار

(ش)

شویدی (شواہد) گواہ

شہات [شہد] وہ میٹھا شیرہ جو مکھیاں جمع کرتی ہیں۔

شہار (شہر) بڑی بستی

صبر، صبوری [صبر] برداشت، تحمل

صورئی [صراحی] پانی رکھنے کا لمبی گردن کا برتن

صِفر (صفر) حساب میں وہ نکتہ جو عدد کے بائیں جانب ہوئے سے اسکی قیمت دس گنا بڑھا دیتا ہے۔

(ع/غ)

عشاں [عشاء] رات کی نماز مغرب کے بعد کی نماز

غوشہ [گوشہ] پردہ نشیں

(ف)

فسلی [پسلی] چھاتی کی ہڈی

فیدہ (فائدہ) نفع

(ق)

قبولیا (قبول کیا) منظور کیا

قبوتر (کبوتر) ایک پرندہ

قلا (قلعہ)۔ وہ محفوظ اور سنگین عمارت جس میں بادشاہ یا فوج رہتے ہیں

(ک)

کاگذ (کاغذ)۔ پرچہ۔ رقعہ

کانی (کہانی) قصہ۔ داستان

کرچی (کرسی) کرارا (کڑاین) سخت

(گ)

گاڈنا (گاڑنا) دفن کرنا

گنرنا (گرجنا) بادلوں کا کڑکنا

گردیش (گردش) چکر۔ انقلاب

گلوری (گلہری) چوہے کی مانند ایک جانور

(ل)

لٹھا (لاٹھی) عصا۔ ہاتھ کی لکڑی
لغام [لگام] گھوڑے کے منہ میں کی رسی
لمڈی (لونڈی) باندی

(م)

مچھی (مچھلی) ایک آبی جانور
مدوڑنا (مروڑنا) موڑنا
مٹھی (مٹی) خاک
مگر (مگرمچھ) ایک آبی جانور

(ن)

ناد (مانند) جیسا۔ سرکا
ناتھا (ناتا) رشتہ
نجرانہ (نذرانہ) تحفہ
نزک (نزدیک) قریب
نکو (نہیں) مت

(و)

ویدہ (وعدہ) اقرار
ونسیما (انیسواں) انیسواں حصہ
وہام (وہم) گمان
دوچ (وہی) وہی چیز

(ہ)

ہدار (اُدھار) قرض
ہسی (ہنسی) قہقہہ
ہوندا (اوندھا) چت کا ضد
ہونگوٹھی (انگوٹھی) انگشتری

(ی۔ ے)

یقارت (حقارت) انکار
یکیلا (اکیلا) تنہا
ایچ (یہی) یہ ہی
یکھٹا (اکھٹا) جمع کیا ہوا

مشترک الفاظ (معنوں کے فرق کے ساتھ)

اترا: اترا ہوا [باسی چیز]
بوا: باپ کی بہن پھوپی (غذا)
بھاگ: حصہ۔ ٹکڑا (رونق)
بیل: بے وقوف۔ احمق [گائے کا نر]
خار: کانٹا۔ مرغ کے پاؤں کا کانٹا [دھوکا دینا]

دائم: ہمیشہ۔ مدام۔ [چوسر کے کھیل میں اس کو استعمال کرتے ہیں]
دری موٹے سوتی کپڑے کا فرش [ماولی کے کنارے]
گرفتاری: نظربندی۔ قید (زوال کا وقت)

گنڈ: لُچا۔ بدکار (پتھر)
نیلم: نیلے رنگ کا قیمتی پتھر [ایک آم کا نام]
وگر: اور اگر [بدمزہ]
ہتھکنڈا: ہاتھ کی چالاکی۔ عیاری۔ [موٹا آدمی ہٹا کٹا]

مفرد الفاظ

آترم: جلدی۔ اچھاپن: اعتراض۔ آڑنگا: خواجہ سرا۔ آلی: جورو۔ آرس: دلہن۔ آٹا: کھیل۔ آہار: خوراک۔ اتکٹا: شریر۔ ابی: باپ۔ ارا: خانہ۔ ارتھم: مطلب۔ معنی۔ ارک: تنگ راستہ۔ اسٹم: مرضی۔ اگوڑ: بدنام۔ انٹو: اچھوت۔ اوپندم: معاہدہ، وعدہ۔ اوس: شبنم۔ بٹا: ایک گالی۔ برگل: مرمرے۔ کولا: لومڑی۔ بمبئی۔ خاف۔ بیغترتا: بے عزتی بے حیا۔ پتیارا: اعتماد، بھروسہ۔ بپرم بوک: ناقابل کاشت زمین۔

پیوٹ: شراب۔ **تپّو**: مخلص۔ **جانکم**: ستارہ۔ **جابو**: خط۔ **چبالی**: فچلی۔ **چُمرہ**: نوچنا۔ **چھول**: شوق۔ **چھوکرا**: لڑکا۔ **چیبڑ**: ناک کی غلاظت۔ **داترا**: لمبے دانت والا۔ **دیّم**: شیطان۔ بھوت۔ **ڈھاڑی**: شور و غل۔ **ڈوپّا**: ڈھکن۔ ٹوپی۔ **راتری**: رات۔ **رتی**: ذرّہ۔ **رچّا**: لڑائی۔ **ستّور**: بڑا چھرا۔ **ستونتا**: پرہیزگار۔ **شرمی**: پاجامہ۔ **کاچکوری**: ایک پودا جسکے پتے جسم پر لگنے کھجلی ہوتی ہے۔ **کالک**: سیاہی۔ **کرک**: تیر۔ **کن پٹی**: کان اور ناک کے درمیان کا حصّہ۔ **گاب**: جانوروں کا حمل۔ **گنڈم**: بلا، مصیبت۔ **گینز**: ایک پھول کا نام۔ **گلاٹا**: شور و غل۔ **لاندرم**: قندیل۔ **لاکھم**: فائدہ۔ **لوٹ**: موج۔ **ماترا**: گولی۔ **ماتھا**: چیچک۔ **حچّا**: داغ۔ **منڈی**: سر۔ **مونڈی**: ضدّی۔ **مِڈی مالم**: ضدّی۔ **موتم**: کل۔ **منکھو**: بھکاری۔ **مینڈا**: بکرا۔ **مینڈی**: بکری۔ **مکوپڑی**: نیاز۔ **ناد**: مانند۔ **نائڈو**: ایک ذات۔ **نیر**: سیدھا۔ **وانٹم**: سہارا۔ **واڑکی**: عادت۔ **وارم**: ہفتہ۔ **ونکا**: نالا۔ نہر۔ **ہپّا**: روئی۔ **ہلکا**: کینہ۔ **ہٹکنا**: رُک رُک کر باتیں کرنا۔

مخصوص الفاظ جو اس علاقے میں بولے جاتے ہیں اور انھیں ذیل کے حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے

(۱) مرکب الفاظ (۲) افعال (۳) اعداد (۴) مختلف اصطلاحات پیشہ واران

(۱) مرکب الفاظ

آزدک بازوک: آس پاس
آنےہارا: آنے والا
بچیکانی: بچپا
بھنڈالم: بھید۔ راز
پپیناگھو: سمجوس
پھوٹم پھائی: تتر بتر
ٹھنڈ کالا: ٹھنڈ کا موسم
تھوتھیتھڑ: بدنام ہونا
جوک کاچارا: وہ گھاس جو تر زمین اگتا ہے

چاڑی کھانا: چغلی
چمڑے کی چڑی: چمگاڈر۔ شب رت
چیل سینڈ: کانٹے دار پودا۔
ناگ پھنی
دھوپ کالا: گرمی کا موسم
رانڈ منڈ: بیوہ عورت
سدا کال: ہمیشہ
کرکرانا: کڑکڑانا
کوری نگاہ: چوری چوری دیکھنا
گھلوُرونا: دکھاوے کا رونا

گھات خور: بغض رکھنے والا
لاٹریاں مارنا: بیکار رہنا
لِمڈکے: غلام زادہ (بعض علاقوں میں گالی کے طور پر رائج ہے)
مستی خور: مغرور
وانٹم: موقع

(۲) افعال

آنگ پہ کاٹے آنا: رونگٹے کھڑے ہونا
بچارنا: دریافت کرنا
پسکنا: دبانا

ترڑخنا: سپوٹنا
پھٹرنا: کھڑے ہونا
جھال پڑنا: گرمی کی زیادتی سے
پیشاب میں جلن پیدا ہونا
چھنڈنا: قے کرنا
دکپنا: مارنا۔ کوٹنا
رچاکرنا: لڑائی کرنا
ستونتا ہونا: بظاہر اچھا لگنا
کچکچانا: غصے سے دانت گھسنا
گوڑلگنا: یاپ لگنا
لگانا: چغلی کھانا
مکا مارنا: خوشامد کرنا
نکڑنا: اکڑنا
وٹوٹانا: بکواس کرنا
ہاتھ دینا: دھوکا دینا

(۳) اعداد

۱	ایک	ایک
۲	دو	دو
۳	تین	تین
۴	چار	چار
۵	پانچ	پانچ
۶	چھ	چھے
۷	سات	سات
۸	آٹ	آٹھ
۹	نوں	نو
۱۰	دس	دس
۱۱	گیارا	گیارہ
۱۲	بارا	بارہ
۱۳	تیرا	تیرہ
۱۴	چودا	چودہ
۱۵	پندرا	پندرہ
۱۶	سولا	سولہ
۱۷	سترا	سترہ
۱۸	اٹھارا	اٹھارہ
۱۹	ونیس	اُنیس
۲۰	بیس	بیس
۲۱	بیس پوایک	اکیس
۲۲	بیس پودو	بائیس
۲۳	بیس پوتین	تیئس
۲۴	بیس پوچار	چوبیس
۲۵	بیس پوپانچ	پچیس
۲۶	بیس پوچھ	چھبیس
۲۷	بیس پوسات	ستائیس
۲۸	بیس پوآٹ	اٹھائیس
۲۹	بیس پونو	انتیس
۳۰	تیس	تیس

اعداد کسری

وسم: ایک پاؤ میں چوتھا حصہ
پرکا: ایک پاؤ کا آدھا حصہ
پو: چوتھا حصہ۔ گز کا چوتھا حصہ
آدا: آدھا
اراپرکا: آدھا اور آدھا پاؤ
تین پو: پونا
بام: دو ہاتھ کا لمبا

(۴) مختلف اصطلاحات پیشہ وران
لوہار، سنار اور اسکے متعلق

اٹھائی: کفگر
کمیٹی: سنار کی بھٹی
سنی: ہتوڑی
گھن: بڑا ہتوڑا
مٹے۔ چاندی کی انگوٹھی جو شادی شدہ
عورتیں اپنے پاؤں کی انگلی میں
ڈالتی ہیں۔

مچھیرے کے متعلق

بام مچھی۔ وہ مچھلی جو بالکل لمبی ہوتی ہے
دودھ کھولی، سفید مچھلی
ڈوک کالی اور موٹی مچھلی

گل۔ مچھلیاں پکڑنے کا ایک کانٹا
بالوسیکڑا: وہ مچھلی جنکی آنکھیں
سر پہ ہوتی ہیں۔

بڑھئی اور سیلدار کے متعلق

اُلّی: سوراخ ڈالنے کا ایک اوزار
پُتری: سُتلی۔ سن کی ڈوری
مول مٹّم: ایک ناپ
نیر وائم: ڈھلوان

درزی، دھوبی اور حجام کے متعلق

اڑیم: نائی کا صندوق
جُٹ: لمبے لمبے بال
کرّا: دھبّا۔ داغ
کراف: سر کے بال قینچی سے کترنا
گردا۔ سر کے بالوں کا گول کتروانا

دھوباٹ: دھوبی باٹ
مساکیریو: دھوبی ہاٹ

تیلی، قلعی گر اور نال بن کے متعلق

پاترا: برتن
سولگا: آدھا پاؤ
گراک: گاہک
واڑکی دار: گاہک
اتوک: پیوند

قصاب، حلوائی اور عطار کے متعلق

ستّور۔ بڑ چھرا
قیمہ: کوفتہ
گلگلا: میدہ اور گُڑ سے بنی
ہوئی میٹھائی
روّالڈو: سوجی کا لڈو

جیٹری: ایک گوڑ کی میٹھائی
ران: زانو

کمہار اور سنگ تراش کے متعلق

باسن: برتن
ہنڈا: پتھر (چوڑا اور لمبا)
وڈیارو۔ پتھر کا کام
کُنڈا: کونڈا

اس ضلع کے وہ علاقے جو ریاست
تامل ناڈو کے سرحد پر واقع ہیں ان کا
تلفظ عام اردو سے مختلف ہے معنی
وہی ہیں: مثلاً
سہوکار۔ ساوکار
بہنوی۔ بہنوی
کیوں بھئی ایسے کرے سو۔ کیوں
اس طرح ہے کیا گیا؟

ڈاکٹر غفار پاشا

جواب

میرے لیے یہ بڑے ہی فخر اور مسرت کی بات ہے کہ میرا تحقیقی مقالہ "ضلع چتور میں اردو بول چال کا جائزہ" پر جناب ڈاکٹر شوکت حیات صاحب نے دوسری آل انڈیا ریسرچ کانگرس میں تنقیدی مقالہ پڑھا ہے۔ جناب شوکت حیات کے اس مقالے کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے میرے مقالے کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ہی اس پر تنقید کیا ہے۔ یہ میرا ایم فل کا تحقیقی مقالہ ہے جو ۲۲۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں تقریباً تین ہزار مخصوص الفاظ ہیں جو دوسری اردو کی فرہنگوں میں نہیں ملتے اور صرف اسی ضلع میں بولے جاتے ہیں۔ اس قسم کے مخصوص الفاظ کا جمع کرنا ہی میرے مقالے کا اصل مقصد ہے۔ اس کے علاوہ اس میں مشترک الفاظ جو (چتور اور چتور کے باہر بولے جاتے ہیں) اور وہ مشترک الفاظ (جو تلفظ اور مفہوم کے فرق کے ساتھ یہاں بولے جاتے ہیں) بھی شامل ہیں۔ لیکن جناب شوکت صاحب نے پوری فرہنگ اپنے مقالے میں پیش نہیں کی ہے جس کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

چند باتیں میرے مقالے کے بارے میں:۔ آندھرا پردیش میں صرف ضلع چتور ہی وہ واحد ضلع ہے جس کی سرحدیں ایک طرف تامل ناڈ سے اور دوسری طرف کرناٹک سے جا ملتی ہیں جس کی وجہ سے یہاں تلگو تامل اور کنڑا زبانیں بولنے والے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ تینوں زبانیں دراوڑی زبانیں ہیں۔ اسلئے یہاں بولی جانے والی اردو پر مذکورہ بالا تینوں زبانوں کے گہرے اثرات ہیں۔ اس لحاظ سے یہاں کی بول چال میں بہت سے نئے الفاظ اردو میں ایسا رچ بس گئے ہیں جیسا یہ اردو کے ہی ہوں اور یہ الفاظ دوسرے علاقوں کی اردو میں نہیں ملتے

جب میں نے اپنے محترم رہنما پروفیسر رضی الدین صاحب سے اپنے ایم فل کے موضوع کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے تلگو اور اردو کا موازنہ کچھ اس طرح کا موضوع کہا تھا تو پروفیسر موصوف نے "ضلع چتور میں اردو بول چال کا جائزہ" موضوع کی تجویز کی تھی۔ یہ موضوع میرے لیے کٹھن ہی تھا۔ کیونکہ یہ موضوع ایسا تھا کہ کسی ادبی شخصیت کی خدمات یا کارنامے وغیرہ کسی لائبریری میں بیٹھ کر یا کتابیں پڑھ کر نہیں لکھ سکتے۔ لیکن عام بول چال کا جائزہ لینا اور مقامی اردو بول چال میں مروجہ الفاظ کا اکھٹا کرنا کسی ادبی تخلیق سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ایسا کرتے وقت ہم کو لسانیات اور زبان

سے کما حقہ واقفیت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ ہندستان بھر میں اس طرح کے جائزے بہت کم لیے گئے ہیں۔ اردو زبان وادب میں اب تک اردو کے ذخیرۂ الفاظ پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ میری کم فہمی اور لاعلمی کے سبب ہوسکتا ہے کہ میرے ذخیرۂ الفاظ میں کمی ہوئی ہو۔ لیکن پروفیسر موصوف نے جو میرے رہنما تھے میری ہمت افزائی کی ہر وقت اور ہر گھڑی اس کام میں میری مدد اور میرا تعاون کرتے رہے میری محنت اور میرے محترم رہنما پروفیسر رضی الدین احمد صاحب کے تعاون سے میرا مقالہ تکمیل کو پہنچا

زبان اپنے اپنے خیالات کی ترسیل کا ذریعہ ہے۔ اور اسی عمل سے زبانیں ترقی کرتی ہیں۔ الفاظ کا ذخیرہ بھی بڑھتا ہے۔ نئی ضرورتوں کو پورا کرانے کے لیے نئے الفاظ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ایک ہی زبان کے بولنے والے لوگ جب آپس میں ملتے ہیں اور تبادلہ خیال کرتے ہیں تو زبانیں ترقی کرتی ہیں۔ جب الگ الگ زبانیں بولنے والے لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بے شک الفاظ کا آزادانہ لین دین ہوتا ہے اس طرح ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں راہ پاجاتے ہیں۔ یہ الفاظ جوں کے توں قبول کر لیے جاتے ہیں۔ پھر ذرا سی تبدیلی سے زبان کے سانچے میں ڈھال لیے جاتے ہیں۔ اس طرح ہندستانی زبانوں میں ہر زبان کے الفاظ کے ذخیرے کو چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جیسے (۱) تتسم (۲) تدبھو (۳) دیسی اور (۴) بدیسی۔ تتسم سنسکرت کے وہ الفاظ ہیں جو زبان میں جوں کے توں رائج ہیں۔ تدبھو سنسکرت کے وہ الفاظ ہیں جو ذرا بدلی ہوئی شکل میں مستعمل ہیں۔ دیسی الفاظ وہ ہیں جو اپنے لوگوں کے سہارے سے حاصل کیے گئے ہیں۔ اصل میں یہی مخصوص الفاظ ہوتے ہیں۔ بدیسی الفاظ وہ ہیں جو دوسری زبانوں سے آکر اس زبان کے اندر رواج پاگئے ہیں۔ اسی طرح ضلع چتور کی اردو بول چال میں تت سم، تدبھو، دیسی اور بدیسی الفاظ مل جاتے ہیں۔ چونکہ اردو ایک ہندستان گیر بلکہ عالمگیر زبان ہے اس کا دامن بہت وسیع ہے اسلئے اس زبان کو دوسری زبانوں سے جن سے اسکو واسطہ پڑا ہے بڑی فراخ دلی سے ان کے الفاظ اپنا لیتی ہے۔ ضلع چتور کی عام اردو بول چال میں ایسے محاورے پہیلیاں اور ضرب المثل ملتے ہیں جن میں تلگو، تامل اور کنڑا زبانوں کے الفاظ کثرت سے ہیں جن کا ذکر میں نے اپنے مقالے میں تفصیل سے کیا ہے

میرے ایم فل کے زبانی امتحان کے لیے الہ آباد یونیورسٹی سے محترم ڈاکٹر عقیل صاحب بحیثیت ممتحن (ایکزامنر) تشریف لاتے تھے۔ آپ بھی اس مقالے سے کافی متاثر ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ اس قسم کا کام ہندستان گیر پیمانے پر ہونا چاہیے اور مشورہ دیا کہ اس کو جلد از جلد شائع کیا جائے۔

● ●

جناب ایم۔اے۔ضیا
شعبۂ اردو
آر۔این کالج پنڈول، مدھوبنی

ڈاکٹر منصور عمر کا تھیسس

اختر انصاری: حیات اور ادبی خدمات

یونیورسٹیوں میں تحقیق کا کام آجکل اس لئے ہوتا ہے کہ ٹیچروں کو اس سے مالی فائدہ پہنچنے کی امید رہتی ہے اور اسی سبب تحقیقی مقالے کثیر تعداد میں لکھے جاتے ہیں۔ حالانکہ جنہیں ریسرچ کا aptitude نہیں ہے ان کے لئے تحقیق ایک بوجھل کام معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ تخلیقی ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں اُن کے لئے تھیسس کا لکھنا بالکل ایک کلرکی کرز کے برابر لگتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ خس و خاشاک میں بھی کچھ اچھی چیزیں سامنے آجاتی ہیں۔

جناب ڈاکٹر محمد منصور عالم (منصور عمر) لکچرار شعبۂ اردو و فارسی سی۔ایم۔کالج دربھنگہ نے ایک تحقیقی مقالہ "اختر انصاری حیات اور ادبی خدمات" رانچی یونیورسٹی میں جمع کیا تھا اور انہیں جون ۱۹۹۰ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ اس مقالے کی ضخامت کو دیکھ کر کبھی کبھی وحشت ہونے لگتی ہے کیوں کہ یہ مقالہ اختر انصاری کے تمام تخلیقی پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ حالانکہ اس مقالے کو اختر انصاری کے کسی ایک پہلو پر ہی مرکوز کرنا چاہئے تھا کیونکہ پھیلاؤ کی صورت میں انصاف کرنے کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔

۵۰۲ (پانچ سو دو) صفحات پر پھیلا ہوا یہ مقالہ اختر انصاری کی ذاتی زندگی کو بھی پیش کرتا ہے۔ ان کی شخصیت کو بھی اُبھارتا ہے۔ اُن کی ذہنی نشو و نما کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ اور تمام اصناف سخن اور نثر میں جو بھی کچھ انہوں نے تجربے کیے اُسے سمیٹ کر پیش کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے سات ابواب پر پھیلا ہوا یہ مقالہ اُس لحاظ سے مختصر ہے۔ کیونکہ اختر انصاری کی شاعری اور شاعری میں قطعات، رباعیات، غزل گوئی، نظم نگاری اور مثنوی کا بھی جائزہ نیز افسانہ نگاری، تنقید نگاری، ڈائری، خود نوشت، انشائیہ اور ڈرامہ سب کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ لہٰذا اس طرح کا پھیلا ہوا کام کبھی بھی جامع نہیں ہو سکتا۔ محض ذاتی ملاقات سے کسی شخصیت کے داخلی کیفیات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ انسان جس حد تک ظاہری طور پر نظر آتا ہے باطنی طور پر اس سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے خود سرگزشت حیات کا باب تشنہ ہے اور شخصیت کے صرف چند پہلو ہی مقالہ نگار ابھارنے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ یہ تشنگی جو موجود ہے اس کا اعتراف خود فاضل مقالہ نگار نے بھی کیا ہے۔

اختر انصاری جہاں بہت سارے علوم و فنون کو سمجھتے تھے وہاں ان کا ادبی رویّہ بھی اُسی طرح کا ہے اور کسی

حد تک کوئی واضح فلسفیانہ اساس پر نہ تو ان کی زندگی کی بنیاد قائم ہے اور نہ کسی واضح فلسفیانہ نظریے پر ان کی تخلیقات
زندگی کے ادھیڑ بُن میں اور الجھنوں میں گھرا ہوا شخص کسی ٹھوس بنیاد کو قبول نہیں کر سکتا اور اس کے سامنے آفاقی
سچائیاں بھی بے معنی ہو جاتی ہیں۔

اختر انصاری کی ازدواجی زندگی کا جو نقشہ فاضل مقالہ نگار نے پیش کیا ہے اور اس کے ساتھ ان کے
جینے کے طرز اور سلیقے کو بیان کیا ہے اُس میں کہیں تال میل نظر نہیں آتا۔ جو آدمی ظاہری طور پر صرف سجا اور بنا نظر
آئے اور باطنی طور پر بکھرا، ٹوٹا اور انتشار زدہ ہو ظاہر ہے اُس کے بارے میں یہ رائے قائم کر لینا کہ وہ بہت ہی سلیقہ
مند ہے غلط ہوگا۔ اس لئے کہ جو اپنی ازدواجی زندگی کو سلیقے سے نہیں جی سکتا۔ وہ زندگی کے دوسرے معاملات بھی سلیقے
سے نہیں طے کر سکتا۔ جیسا کہ فاضل مقالہ نگار نے اختر انصاری کا ردِ عمل اپنی تحریک حیات سے متعلق پیش کیا ہے۔ وہ
اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ایک جانب جس بات کو وہ رد کرتے ہیں دوسری جانب اُس کے لئے کوئی راہ نہیں نکالتے
یہ الجھاؤ اس سبب سے کہ اختر انصاری کے یہاں قوت فیصلہ کی کمی ہے، جو شخصیت کا سب سے بھاری عیب تصور کیا جاتا ہے
ظاہری سلیقہ ان کی شخصیت کو پُرکشش نہیں بنا سکتا۔ اس لئے فاضل مقالہ نگار کو دو ٹوک لکھنا چاہئے تھا کہ اختر انصاری
کو قوت فیصلہ تو تھی ہی نہیں اور ان کی قوت ارادی کی کمی کے سبب ہی انکی شخصیت میں الجھاؤ پیدا ہوا۔

محقق موصوف نے شاعری سے متعلق ہمیں یہ بھی بتانے کی کوشش نہیں کی ہے کہ مواد اور فارم کے درمیان
جو رشتے اختر انصاری نے قائم کئے اُس کی بنیاد کیا ہے۔ ہر صنف میں تجربہ کرنا محض اپنی شخصیت کو منوانے کا ایک طریقہ
ہے یا پھر اس شخصیت کا دماغ محشرستان ہے اور وہ ذہنی انتشار تصور سے نغمہ سنج [illegible] کبھی بلند آہنگ
ہونے کی بات کہتا ہے یا پھر سلسلۂ غزل کا شکوہ کرتا ہے غرض [illegible] کوئی بات بالکل صاف صاف
کہنے کی کوشش فاضل مقالہ نگار نے کی ہے بلکہ رسمی طور پر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ بہت کم ایسی شخصیتیں ہیں جو ادب کے تمام اصناف
میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور اُن میں ایک اختر انصاری بھی ہیں۔ انگریزی میں ایک محاورہ ہے Jack of all
trades but master of none ۔ کبھی کبھی ایسا ہی احساس ہوتا ہے کہ اختر انصاری نے بھی تمام ادبی
اصناف میں محض طبع آزمائی کی ہے لیکن محض وہ طبع آزمائی ہے ادب میں کوئی سنگ میل کی حیثیت نہیں رکھتا

فاضل مقالہ نگار نے یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ اختر انصاری دراصل بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں
اور اس میدان میں اُن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں خاص طور پر محقق موصوف نے یہ لکھا ہے کہ اختر انصاری نے Plo
tless افسانہ لکھ کر اردو افسانے میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہاں ملنے لئے اندر

کتنی Potentiality رکھتے ہیں۔ اُن کا ادبی مقام کیا ہے ؟ جہاں تک اس کی تاریخی اہمیت کا سوال ہے تو تذکرہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں پلاٹ لس افسانے کی ابتدا اختر انصاری نے کی کیوں کہ یہ کوئی ایسی بات تو نہیں جس سے دنیا واقف نہ تھی۔ کیوں کہ فرانسیسی اور انگریزی ادب میں پلاٹ لس افسانہ لکھنے کا رواج قبل ہی سے موجود ہے۔ اس کے تتبع میں اگر اختر انصاری نے یہ افسانے لکھے تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ اُن کے لکھنے کے بعد اس کی پیروی میں کتنے پلاٹ لس افسانے لکھے گئے یا جس طرح پلاٹ لس افسانے کی تکنیک فرانسیسی اور انگریزی ادب میں اپنائی گئی کیا اُسی طرح کی تکنیک اختر انصاری نے اپنائی یا اُس میں کوئی ترمیم و اضافہ کیا یا فرانسیسی اور انگریزی ادب کے افسانے کے مقابلے میں یہ رکھے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ بتانے کی زحمت فاضل مقالہ نگار نے نہیں کی ہے۔

تنقید سے متعلق فاضل مقالہ نگار نے بہت ساری جہتیں جو نمایاں طور پر اختر انصاری کے یہاں پائی جاتی ہیں اُس کی نشاندہی کی ہے۔ اُن نمایاں جہتوں میں نظریۂ ادب و تنقید، موضوعات و مباحث اور تنقید غزل کی باتیں کی ہیں۔ لیکن مجھے پھر بھی یہ کہنا ہے کہ تنقید نگاری میں اختر انصاری کا مقام کیا ہے اس کو متعین کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ نہیں بتایا کہ اُن کا کوئی تنقیدی پیمانہ ایسا ہے جو مارکسی، تاثراتی یا پھر کلیم الدین احمد جیسے سائنٹفک تنقید نگار سے جُداگانہ ہے یا اختر انصاری نے کوئی ایسا نیا تنقیدی پیمانہ دیا ہے جو پہلے اردو ادب میں کسی نے نہیں دیا۔ ایسے سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ محض تنقید اور تنقیدی بصیرت کسی تنقید نگار کو تنقید نگار نہیں بناتی بلکہ اُس کی انفرادی فکر کے ساتھ ساتھ نیا تنقیدی نظریہ اور نیا تنقیدی پیمانہ ہی اُس کی شخصیت کو اور ادبی خدمات کو Justify کرتی ہے

میں اپنی بات کو مزید واضح کرنے کے لئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تحقیقی مقالہ پھیلا ہوا ہے لیکن فاضل محقق نے اپنے کو بہت حد تک متوازن رکھنے میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔ پھر بھی یہ ایک بھرپور تحقیقی مقالہ ہے۔ اس میں محقق موصوف نے اختر انصاری کی حیات، خوانگی زندگی، شخصیت کے انفرادی عناصر، دانشورانہ پس منظر، سیاسی، اقتصادی، تہذیبی عناصر جس سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی ہے اُس کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کی شاعری میں رومانیت، فلسفیانہ عناصر اور فنی خوبصورتی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کے عہد کی ادبی دنیا کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ انکے مختلف شعری اصناف کو پیش کیا گیا ہے۔

اُن کے افسانوں میں علامت، حقیقت پسندی اور فلسفے کی آمیزش کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اُن کے ادبی نظریے اُن کے تنقیدی زاویے اور ان کے سماجیاتی اندازِ تنقید کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے ڈرامے، خودنوشت اور ڈائری وغیرہ کو بھی اس تحقیقی مقالے میں شامل کیا گیا ہے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک مقالہ نگار اگر کسی شخصیت کے ہزاروں پہلوؤں پر کام کر رہا ہو تو امکان غالب ہے کہ وہ انصاف نہیں کر سکتا اور یہ خامی بہرصورت اس مقالے میں بھی موجود ہے۔ لیکن اس وسعت کے پیش نظر جس حد تک فاضل محقق نے کام کیا ہے وہ گراں قدر اضافہ ہے۔

تحقیقی بنیادیں قائم کرنے کا جہاں تک سوال ہے وہ دشوار ہے کیوں کہ تحقیق نگار کے سامنے سب سے بڑی دشواری یہ بھی کہ خود اختر انصاری کی زندگی میں اتنے Contradiction تھے کہ ان کی تخلیقی سطح پر بھی ابھر کر سامنے آئے۔ اس لئے فاضل محقق کو لچک دار یا Flexible بنیادیں بنانی پڑیں اور جہاں رومانیت ہے وہیں فلسفہ بھی ہے۔ جہاں علامت ہے وہاں براہِ راست اظہار کا انداز بھی۔ اس لئے کوئی طے شدہ اصول پر یا مخصوص فریم ورک میں اختر انصاری کا جائزہ لینا بہت مشکل تھا اس لئے اس Contradiction اور Flexibility کے لئے مقالہ نگار قابل گرفت نہیں۔

مگر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ فاضل محقق نے بغیر کسی تعصب کے اور Pre occupied idea کے جو سچائیاں سامنے آئیں اُن پر بے لاگ اور ایمانداری کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ شخصیت کی Inner Contradiction کو بلا تامل صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے اور اس مقالے کو پڑھنے سے بھرپور اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق نگار نے پوری جگر کاوی کے ساتھ ہر اس پہلو کو پیش کرنے کا حق ادا کر دیا ہے جس سے اختر انصاری کی شخصیت اور اس کے تخلیقی جوہر سامنے آجائیں ایسا کرنے میں محقق نے ایسے گوشے بھی سامنے لا دیئے ہیں جو خود ایک تحقیق کا موضوع بن سکتے ہیں اور ایک تحقیق سے کئی تحقیق کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس کا احساس اس تحقیقی مقالے کو پڑھنے سے ہوتا ہے بلکہ پڑھنے سے تحقیقی تحریک بھی پیدا ہوتی ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ فاضل محقق نے رائے دی ہے اور جو کچھ پیش کیا ہے اُس میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

فاضل محقق نے ڈائری، خود نوشت، انشائیہ اور ڈرامہ پر بھی اسی طرح کا سرسری جائزہ پیش کیا ہے اور اس سے اتنا تو معلوم ضرور ہوتا ہے کہ اختر انصاری کے یہاں بے پناہ تخلیقی جوہر موجود تھے اور انہوں نے اس جوہر کو مختلف پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے کہ اُن کی یہ زود گوئی اُن کی شخصیت کو مجروح کرنے کے لئے کافی ہو کیوں کہ جب کوئی تخلیق کار صرف لکھتا ہی جاتا ہے۔ اُس میں غور و فکر کی کمی زیادہ ہوتی ہے۔ ادھ کچے، غیر صحت مند اور ناپختہ تخلیقات وجود میں آتی ہیں اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ فکر کا جو پیمانہ ہوتا ہے اُس میں کسی مواد کو کافی دیر تک پکانے اور جمع رکھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اختر انصاری کے یہاں بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہوگا لیکن اس کی نشاندہی ہمارے فاضل مقالہ نگار

نے نہیں کی ہے جس سے ان تخلیقی عیوب کو سمجھنے میں دشواری ہونا لازمی ہے
خود بھی مقالہ نگار نے اختر انصاری کا ادبی مقام طے کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

"اس بحث سے ہم یہ واضح نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اختر صاحب بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور اردو کے ایک بلند پایہ اور صنف اول کے افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو کی ادبی تاریخ میں ان کی جگہ محفوظ ہوگئی ہے۔ ان کی دوسری ادبی حیثیتیں بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی رہیں گی اور ان جہتوں سے ان کی خدمات اور کارناموں کو بھلایا نہ جاسکے گا مجموعی طور پر وہ ایک بزرگ ادبی شخصیت کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے اور کیا عجب ہے کہ اُن کے کارناموں کے روشن نقوش آئندہ زیادہ ابھر کر سامنے آئیں" (اردو ادب میں اختر انصاری کا مقام۔ ص ۵۶۷)

اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ مزید دعوت تحقیق ہی دینا مقصود تھا تو پھر مقالہ نگار نے تمام جہتوں کو کیوں منتخب کیا۔ محض اختر انصاری کی افسانہ نگاری پر کام کیوں نہیں کیا۔ بہرصورت ایسے سوالات اس مقالہ کو پڑھنے سے جابجا ابھرتے ہیں۔ پھر بھی یونیورسٹیوں میں داخل کئے جانے والے مقالوں میں یہ ایک ایسا مقالہ ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار اپنے اندر ریسرچ *aptitude* رکھتا ہے اور اسے تحقیق کی کنہیات سے بھی واقفیت ہے لیکن مقالہ چوں کہ بہت پھیلا ہوا تھا اس لئے بہت ساری دشواریوں اور دقتوں کی وجہ سے مقالہ نگار وہ سب کچھ نہیں کرسکا جو وہ کرسکتا تھا۔ پھر بھی یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ریسرچ کے میدان میں یہ مقالہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

۵۵

ڈاکٹر منصور عمر
شعبۂ اردو و فارسی
سی۔ایم۔کالج دربھنگہ

جواب

میری تھیسس "اختر انصاری حیات اور ادبی خدمات" پر جناب ایم۔اے۔ضیاء نے جو تھی اردو ریسرچ کانگریس کے لیے جو مقالہ لکھا ہے اس کی زیراکس کاپی موصول ہوئی۔ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ اگر کسی شخصیت پر یا اس سے متعلق کوئی تنقیدی مقالہ لکھا جائے تو اس شخصیت یا اس سے متعلق کا خیال کر کے محض اس کی تعریف و توصیف کی جائے۔ اس کی خوبیوں کو گنوایا جائے اور اس کی خامیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کر دیا جائے یا اس سے چشم پوشی کی جائے۔ کیونکہ یہ ادبی دیانتداری کے سراسر منافی ہے۔

زیر نظر مقالہ پڑھنے کے بعد مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ موصوف نے انتہائی غیر جانبداری کے ساتھ اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے مذکورہ تھیسس کا مطالعہ بہ نظر غائر نہیں کیا ہے اور سرسری طور پر نظر ڈالنے کے بعد ایک رائے قائم کر لی ہے اور نتیجے کے طور پر متضاد بیانات دینے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مثلاً :

> " محض ذاتی ملاقات سے کسی شخصیت کے داخلی کیفیات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ انسان جس حد تک ظاہری طور پر نظر آتا ہے۔ باطنی طور پر اس سے مختلف بھی ہو سکتا ہے ۔ اس لیے خود سرگذشت حیات کا باب تشنہ ہے اور شخصیت کے صرف چند پہلو ہی مقالہ نگار ابھارنے میں کامیاب ہو سکا ہے۔" (تیسرا پیراگراف)

> " اختر انصاری کی ازدواجی زندگی کا جو نقشہ فاضل مقالہ نگار نے پیش کیا ہے اور اس کے ساتھ ان کے جینے کے طرز اور سلیقے کو بیان کیا ہے، اس میں کہیں تال میل نظر نہیں آتا۔ جو آدمی ظاہری طور پر صرف سجا اور بنا نظر آئے اور باطنی طور پر بکھرا، ٹوٹا اور انتشار زدہ ہو ظاہر ہے اس کے بارے میں یہ رائے قائم کر لینا کہ وہ بہت ہی سلیقہ مند ہے غلط ہوگا۔ اس لئے کہ جو اپنی ازدواجی زندگی کو سلیقے سے نہیں جی سکتا وہ زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی سلیقے سے نہیں طے کر سکتا۔" (پانچواں پیراگراف)

پہلے اقتباس کا یہ جملہ کہ " انسان کا ظاہر و باطن یکساں نہیں ہوتا " اور دوسرے اقتباس میں یہ کہنا کہ "جس آدمی کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں ہوگی اس کے دوسرے معاملات بھی صحیح نہیں ہوں گے۔" ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ گویا موصوف خود اپنے بیان کی تردید کرتے نظر آتے ہیں۔ رہی بات سرگزشت حیات کی تشنگی کی تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ کسی تحقیقی مقالہ میں اس شخص کی مکمل سوانح حیات نہیں پیش کی جا سکتی کیونکہ اس کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ یہاں شخصیت کے صرف چند اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور اس سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔

موصوف کا یہ کہنا کہ " محض ذاتی ملاقات سے کسی شخصیت کے داخلی کیفیات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔" ایک حد تک درست ہے۔ لیکن میں نے اختر انصاری (مرحوم) سے صرف ملاقات ہی نہیں کی ہے بلکہ علی گڑھ میں مہینوں انکے ساتھ رہنے، انھیں قریب سے دیکھنے، ان سے گفتگو اور تبادلہ خیال کرنے کا بھی موقع ملا ہے۔ نیز ان کے دوستوں، شاگردوں رشتہ داروں اور عزیزوں سے ملاقات کی ہے، ان کی رائے معلوم کی ہے اور ان کے قارئین، ناقدین اور تخلیقات کے مطالعہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اور تب میں کسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ میرے فاضل دوست نے اختر انصاری کے سلسلے میں یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ :

" ہر صنف میں تجربہ کرنا محض اپنی شخصیت کو منوانے کا ایک طریقہ ہے۔ یا پھر اس شخصیت کا دماغ منتشر ہے۔ انگریزی میں ایک محاورہ ہے " JACK OF ALL TRADES BUT MASTER OF NON " کبھی کبھی ایسا ہی احساس ہوتا ہے کہ اختر انصاری نے بھی تمام ادبی اصناف میں محض طبع آزمائی کی ہے لیکن محض وہ طبع آزمائی ہے۔ ادب میں سنگ میل کی حیثیت نہیں رکھتا۔" (چھٹا پیراگراف)

اس ضمن میں عرض ہے کہ اختر انصاری نے نامانوس قسم کا کوئی بھی ادبی تجربہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی اپنی شخصیت کو منوانے کی کوشش کی ہے۔ اگر انھوں نے یہ کیا ہوتا جیسا کہ آج دوسرے ادیب کر رہے ہیں تو وہ آج کے ادیبوں، ناقدوں اور قارئین کے دل و دماغ پر پوری طرح چھائے ہوئے ہوتے۔ پھر یہ کہنا کہ اختر انصاری نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض طبع آزمائی ہے ادب میں کوئی سنگ میل کی حیثیت نہیں رکھتا، سراسر زیادتی ہے۔ اس جملے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوف نے اختر انصاری کو سرے سے پڑھا ہی نہیں ہے اور نہ ہی میری تھیسس کو پڑھنے کی زحمت کی ہے۔ اختر انصاری قطعہ نگاری کے بادشاہ کہلاتے ہیں ہر چند کہ قطعہ نگاری کوئی نئی صنف نہیں ہے تاہم اس کے لیے چار مصرعوں کی ہیئت متعین کرنے کا سہرا اختر انصاری کے سر ہے۔ قطعہ نگاری کو اختر انصاری نے جس بلندی پر پہنچایا ہے۔ وہاں تک اردو کا کوئی دوسرا شاعر نہیں پہنچ سکا ہے چنانچہ ادبی دنیا میں "اختر انصاری قطعات والے" کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ کیا ان کے قطعات سنگ میل کی حیثیت نہیں

رکھتے ۔ میں نے اختر انصاری کے قطعات سے بحث کرتے ہوئے اپنی تھیسس کے ص ۹۹ پر لکھا ہے کہ :

" اختر صاحب کے قطعات ان کی نظموں اور غزلوں کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوئے اور ان کی شاعرانہ شہرت کا ذریعہ بنے۔ انھوں نے قطعے کو پہلی بار ایک باضابطہ صنف شعر کی حیثیت سے روشناس کرایا اور اسے محض امدادی وسیلۂ اظہار کی حیثیت سے استعمال نہیں کیا۔"

اور اسی صفحہ پر اختر انصاری کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ :

" فارسی اور اردو کی شاعری میں رباعی کی طرح قطعے کی صنف بھی ایک امدادی " AUXILIARY " صنف رہی ہے ۔ ۔ ۔ اکثر شعرا اپنی شعری فکر کے مخصوص میدان سے ہٹ کر وقتاً فوقتاً ضرورتاً یا ضمناً یعنی محض چلتے چلاتے یا وہ جو کہتے ہیں کہ منہ کا مزا بدلنے کے لیے رباعی یا قطعہ یا دونوں چیزیں لکھتے رہے ہیں یہ صورت حال قدیم ادوار سے لیکر موجودہ دور تک جوں کی توں قایم رہی ہے ۔"

یا پھر اختر انصاری نے " ایک ادبی ڈائری " لکھ کر جو کارنامہ انجام دیا ہے کیا اس کی نظیر کہیں ملتی ہے ؟ میں نے اپنی تھیسس میں لکھا ہے کہ :

" انھوں نے ڈائری میں جو اہم علمی و ادبی سوالات اٹھائے ہیں اور جن نمایاں تہذیبی اور معاشرتی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس نے ڈائری کو ایک قیمتی ادبی اور تہذیبی دستاویز کی شکل دے دی ہے ۔ ڈائری اپنے علمی وقار اور سنجیدگی کے ساتھ زبان و اسلوب کے حسن اور دلآویزی سے بھی متاثر کرتی ہے۔ اردو میں اپنی نوعیت کی یقیناً یہ پہلی کوشش ہے۔ سجاد ظہیر کی کتاب " روشنائی " جسے ڈائری کے ذیل میں رکھا جاتا ہے، اس کے کئی سال بعد منظر عام پر آئی ہے۔ دونوں میں ادبی اور تنقیدی خیالات کے اظہار کا انداز اور طریقہ بڑی حد تک مماثل ہے۔ ممکن ہے سجاد ظہیر نے " روشنائی " ترتیب دیتے ہوئے اس ڈائری کا تتبع کیا ہو یا اس سے تحریک حاصل کی ہو ۔"

کیا اب بھی اختر انصاری کو " JACK OF ALL TRADES BUT MASTER OF NON " کے خطاب سے نوازا جائے گا ؟

میرے فاضل دوست ایم ۔ اے ۔ ضیاء صاحب تنقید کے متعلق اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

" تنقید نگاری میں اختر انصاری کا مقام کیا ہے اس کو متعین کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ نہیں بتایا کہ ان کا کوئی تنقیدی پیمانہ ایسا ہے جو مارکسی، تاثراتی یا پھر کلیم الدین احمد جیسے سائنٹفک تنقید نگار سے جداگانہ

ہے یا پھر اختر انصاری نے کوئی ایسا تنقیدی پیمانہ دیا ہے جو پہلے اردو ادب میں کسی نے نہیں دیا۔" (آٹھواں پیراگراف)
اور پھر آگے چل کر خود ہی فرماتے ہیں کہ :

" ان کے ادبی نظریے، ان کے تنقیدی زاویے اور ان کے سماجیاتی انداز تنقید کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔" (دسواں پیراگراف)

کیا موصوف کے مذکورہ دونوں بیانات متضاد نہیں ہیں؟ اور ان کے سوال کا جواب خود ان کی تحریر میں موجود نہیں ہے؟ کیا اب بھی مجھے کچھ کہنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اگر ہاں! تو پھر میں یہ عرض کر دوں کہ اختر انصاری ایک نظریہ ساز ناقد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اور ان کی کتاب " افادی ادب " آج بھی نہ صرف ترقی پسند ادیبوں اور ناقدوں کے لیے بلکہ جدید ادیبوں اور ناقدوں کے لیے بھی مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے اپنے تحقیقی مقالہ میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ :

" افادی ادب کا شمار ان کتابوں میں ہوتا ہے جن میں پہلے پہل ترقی پسند ادبی نظریے کو روشناس کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ادب کے فنی اور افادی پہلوؤں سے مفصل اور مدلل بحث کی گئی ہے۔"

اس کے بعد ترقی پسند ادب یا افادی ادب یا مقصدی ادب کے متعلق اختر انصاری نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔ اس ضمن میں ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے۔ اس اقتباس کے چند جملے یہاں بھی نقل کرنا چاہوں گا :

"کامیاب مقصدی ادب وہی ہے جو فن اور مقصد کا بہترین امتزاج پیش کرے۔ یعنی مقصدی ہونے کے باوجود اصول جمالیات کی پیروی کرتے ہوئے فن کے اعلیٰ معیار پر پورا اترے۔ اس میں تخلیقی آرٹ کی تمام کڑی شرطوں کی پابندی کی جائے۔ وہ سچّے ادب کی طرح جذباتی، جمالی اور تخیلی تجربات کا اظہار ہو۔ یعنی خارجی حقیقتوں کی بے جان عکاسی اور عقلی یا فلسفیانہ عقیدوں کی بے روح تشریح و توضیح کی بجائے ان حقیقتوں اور عقیدوں کے جذباتی و وجدانی تصور کو صداقت شعارانہ انداز میں پیش کرے۔ اس کی صداقت علمی یا حسابی صداقت نہیں، فنی و شعری صداقت ہو۔ وہ جذبۂ حسن کو متاثر کرے اور دماغ کے بجائے دل کو مخاطب بنائے۔ اس میں مقصد کو براہ راست پیش کرنے کے بجائے اشارات اور کنایات سے کام لیا گیا ہو اور ایک حسن کارانہ طریقے سے قاری کے ذہن و شعور پر اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو . . . نیز یہ کہ اس میں زبان کی باریکیوں، بیان کی لطافتوں اور ترکیب و اسلوب کی پابندیوں کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔"

اور میں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ :

" اختر صاحب اس نظریۂ تنقید کے اولین معمار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھیں جائیں گے۔"

مگر مشکل یہ ہے کہ ضیاء صاحب یا تو سرسری گذر گئے یا پھر ان کی نظر دھوکا کھا گئی اور انھوں نے اعتراض برائے اعتراض کر ڈالا۔

اختر انصاری کی افسانہ نگاری سے متعلق میں نے جو تحقیق کی ہے اور جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان پر بھی موصوف نے کچھ سوالات اُٹھائے ہیں مثلاً یہ کہ :

" فرانسیسی اور انگریزی ادب میں پلاٹ میں افسانے لکھنے کا رواج قبل ہی سے موجود ہے۔ ۔ ۔ ۔ یا جس طرح پلاٹ لس افسانے کی تکنک فرانسیسی یا انگریزی ادب میں اپنائی گئی کیا اسی طرح کی تکنک اختر انصاری نے اپنائی یا اس میں کوئی ترمیم و اضافہ کیا۔ یا فرانسیسی اور انگریزی ادب کے افسانے کے مقابلے میں یہ رکھے جا سکتے ہیں یا نہیں۔" (ساتواں پیراگراف)

اس ضمن میں عرض ہے کہ فرانسیسی اور انگریزی ادب کا تعلق ہندوستان سے نہیں ہے۔ ہندوستانی میں کتنے فیصد لوگ اس وقت تھے یا آج بھی ہیں جو فرانسیسی اور انگریزی ادب سے واقف تھے یا ہیں۔ پھر یہ کہ فرانسیسی اور انگریزی ادب کے افسانوں سے مقابلہ یا موازنہ میرا موضوع بھی نہیں تھا۔ ہاں اگر میں صرف افسانے پر کام کر رہا ہوتا تو میرا مطالعہ اس نہج پر ہو سکتا تھا۔ میں نے اختصار سے کام لیا ہے تب تو موصوف کو " اس مقالے کی ضخامت کو دیکھ کر کبھی کبھی وحشت ہونے لگتی ہے۔" اور اگر تفصیل سے کام لیتا تو شاید موصوف کو جنون کے دورے پڑنے لگتے۔

موصوف نے اخیر میں ایک اور سوال اٹھایا ہے کہ :

" اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ مزید دعوت تحقیق ہی دینا مقصود تھا تو پھر مقالہ نگار نے تمام جہتوں کو کیوں منتخب کیا۔" (پندرھواں پیراگراف)

یہ سوال اپنی جگہ بجا سہی لیکن شاید موصوف اس بات کو فراموش کر رہے ہیں کہ ادبی تحقیق میں حتمی اور قطعی فیصلے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کم از کم میں تو اس کا قائل نہیں ہوں کیونکہ ادب میں دو اور دو چار کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی محقق اپنی تحقیق کو حرفِ آخر سمجھتا ہے تو اس کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

●●

جناب ضیاء الدین اصلاحی
دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا تھیسس

فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات

اردو میں ریسرچ اور تحقیق کے ادارے بھی قائم ہیں اور بعض ارباب علم و دانش اپنے ذوق و شوق سے بھی تحقیق کی خدمت انجام دے رہے ہیں لیکن اب بہت کچھ اردو میں تحقیق کا بار گراں ان طلبا کے دوش پر آگیا ہے جو پی۔ ایچ ڈی وغیرہ کی سند حاصل کرنے کیلئے باقاعدہ یونیورسٹیوں میں داخلہ لیتے ہیں اور ادبی موضوعات یا شاعروں اور ادیبوں پر تحقیقی مقالے لکھتے ہیں یا نظم و نثر کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ متون کو ایڈٹ کرتے ہیں۔

ان طالب علموں کی تعداد میں اضافہ روز افزوں ہے جو نیک فال، امید افزا علامت اور اردو میں تحقیق کی مقبولیت کا ثبوت ہے، لیکن اس تیزی میں ایک صورت خرابی کی بھی مضمر ہے کیونکہ زیادتی و کثرت کے نتیجہ میں تحقیق کا معیار پست، فروتر اور غیر اطمینان بخش ہونے لگا ہے، اس مرحلہ اور موڑ پر تحقیق کو معتبر و مستند اور باوزن بنانے کیلئے غیر معمولی جد و جہد اور سعی بلیغ نہایت ضروری ہو گئی ہے، اس لحاظ سے یہ اردو کانگریس بہت برمحل اور مناسب ہے، جن لوگوں نے تحقیق کے معیار کو بلند و برتر بنانے کے لئے یہ قدم اٹھایا ہے ان کی تحسین و تبریک ایک خوشگوار ادبی و تحقیقی فریضہ ہے۔

طلبا کی تحقیق کا معیار اگر اس سطح پر نہیں آسکا ہے جو فی الواقع مطلوب یا کسی ترقی یافتہ زبان کے لئے ضروری ہے تو اس کے لئے تمام تر طلبا ہی کو ذمہ دار نہیں قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ ان کے محدود وسائل و ذرائع، ان کی پابندیاں اور رکاوٹیں اور اساتذہ اور مقالوں کے نگراں حضرات کے رویے وغیرہ سب ہی زیر بحث آسکتے ہیں۔ ایک بڑا اور اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ جس طرح ہر کام کے لئے موزوں و مناسب افراد ضروری ہوتے ہیں اسی طرح ریسرچ اور تحقیق کیلئے بھی ہر شخص مناسب و موزوں نہیں ہو سکتا اس کے لیے اہل افراد کا انتخاب اور پھر ان کے ذوق و طبیعت کے مطابق موضوعات کا تعین بھی ضروری ہے، اس لیے موجودہ حالات و مسائل میں کمتر اور ساقط المعیار مقالوں کی زیادتی سے تشویش و اضطراب تو یقینی ہے لیکن زیادہ مایوس ہونے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، اصلی اور بنیادی چیز مناسب حالات

کی فراہمی اور سوانح و مشکلات کا ازالہ ہے۔

موجودہ حالات و مشکلات میں بھی گذشتہ بیس پچیس برسوں کے اندر پی۔ ایچ۔ ڈی کے جو مقالے لکھے گئے ہیں وہ سب کے سب پایۂ اعتبار سے کمتر اور فروتر نہیں ہیں بلکہ ان میں اچھے، بہتر اور قابل فخر بھی ہیں۔ مقالہ نگار ڈاکٹر عبیدہ بیگم غازی پوری ہیں۔ ان کو اس مقالہ پر گورکھپور یونیورسٹی نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے، اور یہ ۱۹۸۳ء میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے چھپا ہے۔

یہ تحقیقی مقالہ کل پانچ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں "فورٹ ولیم کالج" کے اغراض و مقاصد پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کے قیام کی تاریخ اور اس کے آغاز سے اختتام تک کی سرگذشت بیان کی گئی ہے۔ اس کے قیام میں جن لوگوں کی مساعی کا دخل رہا ہے اور جس کی سرپرستی اس کو حاصل رہی ہے ان کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ باب گویا فورٹ ولیم کالج کا پس منظر اور اس عہد و ماحول کی تصویر ہے جس میں اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔

دوسرے باب میں کالج کے ہندوستانی شعبہ سے وابستہ اردو مصنفین کے حالات و سوانح درج ہیں، اس باب میں انھیں لوگوں کے حالات پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے جو کالج کے باقاعدہ ملازم تھے بلکہ ان حضرات کا تذکرہ بھی ہے جنھوں نے کالج کی کونسل سے انعام حاصل کرنے یا اس کے اہم عہدہ داروں کی فرمائش پر کتابیں لکھی تھیں۔

تیسرا باب ان اردو مصنفات کے جائزہ و تعارف پر مشتمل ہے جو کالج کے زیر اہتمام لکھی گئیں۔ اس میں ان کتابوں کے بارے میں بڑی محنت و تحقیق سے ضروری معلومات فراہم کیے گئے ہیں اور ان کے مندرجات و مشمولات کا ناقدانہ و محققانہ جائزہ لیا گیا ہے، جس سے ان کتابوں کی خصوصیات و مباحث مکمل طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ باب خصوصیت سے زیادہ اہم اور کتاب کے بڑے حصے کو محیط ہے اور اس سے مقالہ نگار کی کدو کاوش، تلاش و جستجو، نقد و تبصرہ کی قوت، بحث و تحقیق میں دلچسپی و سلیقہ مندی اور استنباط و استخراج نتائج کی صلاحیت وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

چوتھے باب میں "فورٹ ولیم کالج" کی بدولت اردو نثر میں جو ارتقا ہوا اور سادہ، سلیس اور بول چال کی زبان سے قریب جو اسلوب رائج ہوا، اس کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اس میں اسلوب کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے اور فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیکر مختلف ادیبوں کے اسالیب بیان کی خصوصیات بھی دکھائی گئی ہیں اور آخر میں کالج کے مجموعی اور اصلی اسلوب کو متعین کیا ہے۔

پانچویں باب میں اردو نثر پر فورٹ ولیم کالج کے اثرات دکھائے گئے ہیں۔ اس مقصد سے مقالہ نگار نے کالج کے قیام سے پہلے کی اردو نثر کو بھی موضوع سخن بنایا ہے اور اس کے بعد کے نثری کارناموں کا بھی مختصر جائزہ

لیا ہے تاکہ کالج کی نثر کی تصویر ابھر کر سامنے آجائے اور اس کے اثرات کا خاطر خواہ طور پر اندازہ کیا جا سکے۔ اس باب سے اردو ادب میں فورٹ ولیم کالج کے احسان عظیم کے علاوہ اس کے اسلوب کی اہمیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ بقول مقالہ نگار:

"اردو نثر فورٹ ولیم کالج اور اس کے مصنفین کے احسانات سے چشم پوشی نہیں کر سکتی، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر کالج کا قیام عمل میں نہ آتا تو اردو نثر کو اپنی صحیح نشو و نما کے لئے نہ جانے کتنے برسوں تک انتظار کرنا پڑتا۔" (ص ۶۹۴)

فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کا سرسری اندازہ اس فہرست سے بھی ہوتا ہے جو مقالہ کے آخر میں کالج سے وابستہ مصنفین کے ناموں اور یہاں سے طبع ہونے والی کتابوں کی فن وار دی گئی ہے۔ لائق مقالہ نگار نے ان مصنفین و کتب کا مقالہ میں جہاں ذکر آیا ہے ان کے صفحے بھی دے دیے ہیں تاکہ مراجعت میں سہولت ہو۔

یہ مقالہ کے ابواب و مباحث کا ایک مختصر جائزہ ہے، اس کی قدر و قیمت اور مقالہ نگار کی چھان بین اور تحقیق و دریافت کا خاطر خواہ اور ٹھیک اندازہ تو مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ آخر میں مقالہ کے مآخذ کی فہرست بھی درج ہے۔ اس میں اردو، انگریزی اور ہندی کتابوں کے علاوہ اخبار و رسائل بھی شامل ہیں، ان سب کی مجموعی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے، جو مقالہ اتنی ساری کتابوں کے اوراق کھنگالنے کے بعد لکھا گیا ہو اس کی اہمیت ظاہر ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام میں پر خلوص ادبی خدمت کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں تھا بلکہ یہ انگریزوں کی سیاسی مصلحتوں کے تحت وجود میں آیا تھا، مگر ؎ عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما در آں باشد۔

اس کالج سے اردو زبان و ادب کو گوناگوں فائدے پہنچے، حقیقت تو یہ ہے کہ یہیں سے اردو نثر نے ایسا موڑ لیا جس سے اس میں علمی تحریروں کے لیے راہ ہموار ہو گئی، بقول مصنف:

"انیسویں صدی کے آغاز میں "فورٹ ولیم کالج" کا قیام اردو نثر کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اس کالج نے نہ صرف یہ کہ اردو نثر کی نشو و نما کے بہترین فرائض انجام دیئے بلکہ آئندہ کے لیے ایک ایسی سمت و راہ متعین کی جس کے ذریعہ اردو نثر ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل ہو گئی۔" (دیباچہ ص ۹)

اس بنا پر فورٹ ولیم کالج کے کارنامے اظہر من الشمس اور لازوال ہیں، اس کتاب سے ان کارناموں کا بڑی حد تک مرقع سامنے آجاتا ہے

فورٹ ولیم کالج کی اہمیت اور اردو زبان پر اس کے دور رس اور غیر معمولی اثرات کی بنا پر اردو ادب کی کوئی تاریخ اس کے ذکر سے خالی نہیں ہے، اردو نثر کے ارتقا یا بنگال کی اردو خدمات سے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب میں کالج کے کارنامے زیر بحث آئے ہیں لیکن غالباً ابھی تک اردو میں اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب موجود نہیں تھی اور اب تک اس کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اتنے اہتمام، کاوش اور تلاش و تحقیق سے نہیں لکھا گیا ہے۔ اس مقالہ سے پہلی مرتبہ اس کے تمام ضروری پہلو اور اہم گوشے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مقالہ نگار نے ایک اچھے موضوع کا انتخاب کر کے اس کے ساتھ انصاف کیا ہے اور اس کا حق ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر احرلاری نے بھی زیر نظر مقالہ کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارناموں سے متعلق اردو میں کئی کتابیں لکھی جا چکی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی کتاب بھی ایسی نہیں جس میں تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہو اور جس پر مکمل طور پر اعتماد کیا جا سکے، ڈاکٹر عبیدہ بیگم قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنے تحقیقی مقالہ "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" کے ذریعہ اس کمی کو پورا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔"

یہی رائے پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی بھی ہے۔ فرماتے ہیں:

"موصوفہ نے مقالہ کی تیاری میں واقعی بہت محنت صرف کی ہے۔ کلکتہ جا کر فورٹ ولیم کالج سے متعلق تمام سرکاری کاغذات کو کھنگالا ہے اور حتی الامکان اس کے متعلق کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے، اس موضوع پر اتنی مفصل اور مستند کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔"

سہل انگاری سے تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا مگر اب اکثر محققین اسی کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ انھیں جو کچھ آسانی سے مل جاتا ہے۔ اسی کو نقل و جمع کر دیتے ہیں اور خوب و ناخوب، درست و نادرست میں امتیاز کرنے اور روایت و درایت کے معیار پر پرکھ کر صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی تحقیقات و مقالات میں رطب و یابس اور صحیح و غلط ہر قسم کی چیزیں شامل ہو جاتی ہیں، بنیادی طور پر محقق کا کام یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھے تلاش و تحقیق سے لکھے۔ پہلے لوگوں کا بیان محض نقل کر دینے پر اکتفانہ کرے بلکہ اسکو نقد و امتیاز کے بعد رد و قبول کرے۔ لیکن کسی چیز کو رد کرنے اور غلط قرار دینے کے لئے بڑا سلیقہ اور پوری محنت درکار ہوتی ہے۔ زیر نظر مقالہ میں مصنفہ نے ہر چیز کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور جا بجا پیش رو مصنفین کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جس سے ان کی تحقیق و تنقیدی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بات کو رد کرنے کے لئے جس محنت

وسلیقہ کی ضرورت ہے وہ ان میں موجود ہے۔ ہم اس کی وضاحت کے لئے اس مقالہ سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں لکھتی ہیں

"جاوید نہال نے محمد بخش کو اردو اور فارسی شعبے کا ملازم لکھا ہے[1]، یہ اطلاع درست نہیں، ۱۲ ستمبر ۱۸۰۳ء کی کالج کونسل کی کاروائی میں گل کرسٹ ۹ ستمبر ۱۸۰۳ء کا مراسلہ پیش کیا گیا تھا، اس کے ساتھ ایک فہرست منسلک تھی جس میں ان مصنفین کی تصانیف پر انعام کی سفارش کی گئی تھی جو کالج کے باقاعدہ ملازم نہیں تھے، اس فہرست میں محمد بخش کا "قصہ فیروز شاہ" بھی شامل ہے، اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ محمد بخش کالج کے باضابطہ ملازم نہیں تھے۔" (ص ۲۱۲)

جاوید نہال صاحب کے اور بھی کئی بیان کی اسی طرح مدلل تردید کی ہے، ذیل کی تغلیط بھی خاص نقد وسلیقہ سے کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ :

"حفیظ الدین احمد نے گل کرسٹ کی فرمائش پر عیار دانش کا ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) میں خرد افروز کے نام سے ترجمہ کیا تھا لیکن لکشمی ساگر وارشنے نے خرد افروز کے مترجم کی حیثیت سے تھامس روبک کا نام لکھا ہے[2]۔"

ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اس کو صریحاً غلط بتایا ہے اور لکشمی ساگر کے اشتباہ کی یہ وجہ بھی لکھی ہے :

"البتہ ۱۸۱۵ء میں تھامس روبک نے خرد افروز کو مرتب کیا تھا۔ اس میں اس کا ایک عالمانہ دیباچہ بھی شامل ہے۔" (حاشیہ ص ۲۵۲)

اپنے خیال کی تائید اور لکشمی ساگر صاحب کی رائے کے غلط ہونے کے ثبوت میں دیباچے سے خود حفیظ الدین احمد کا یہ بیان نقل کیا ہے :

"مدرس ہندی مسٹر جان گل کرسٹ صاحب دام دولتہ نے فرمایا کہ ترجمہ عیار دانش کا جو فی الحقیقت دانش کی کسوٹی اور آئین سلطنت کا دستور العمل ہے کر۔ حقیر نے ان کا حکم بجا لا کر ترجمے میں کمر باندھی، خدا کے فضل سے حسن انصرام کو پہنچا اور نام اس کا خرد افروز رکھا۔" (ص ۲۵۲)

تحقیق کا بڑا دار و مدار ماخذ و مراجع پر ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں کئی باتیں مدنظر رکھنا لازمی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ حوالے اصل ماخذ کے دیے جائیں، ثانوی اور ضمنی ماخذ کے حوالے

---

[1] انیسوی صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ [2] بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۰۸

بدرجہ مجبوری دینا چاہیئے، زیر نظر مقالہ میں عموماً براہ راست اصلی ماخذوں کے حوالے دینے کی کوشش کی گئی ہے ڈاکٹر احمر لاری نے بھی اس کی اس خوبی کی اس طرح نشاندہی کی ہے:

"موصوفہ نے ثانوی ماخذ پر اعتبار نہیں کیا ہے اور تلاش و تفحص سے کام لیتے ہوئے اصل ماخذ تک رسائی حاصل کی ہے، اس لئے وہ بہت سے تسامحات کی تصحیح اور بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ میں کامیاب ہوئی ہیں"

ہم اس کے ثبوت میں مقالہ سے ایک طویل مثال پیش کرتے ہیں جس میں ثانوی ماخذ کو نظرانداز کرکے اصل ماخذ پر اعتماد کرکے متعدد غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے:-

"جاوید نہال اور عبدالمنان نے بغیر کسی حوالے کے اکرام علی کو شعبہ عربی و فارسی کا مدرس قرار دیا ہے لیکن کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہ ہو سکی، اکرام علی کے ضمن میں دستیاب شدہ مواد کی روشنی میں یہ علم ہوتا ہے کہ وہ کالج کے شعبہ ہندوستانی سے وابستہ نہیں تھے، نادم سیتاپوری ان کو کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف سے وابستہ قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ مزید لکھتے ہیں۔

"کم عمری کہیئے یا کوئی اور وجہ ہو، یہ صحیح ہے کہ اکرام علی کا عروج ڈاکٹر گل کرائسٹ کے زمانے میں نہ ہو سکا بلکہ انہیں کالج کے شعبہ تالیف و تصنیف میں کام کرنے کا موقع اس وقت ملا جب کالج کی عنان حقیقی اقتدار صحیح معنوں میں ان کے شاگرد رشید کپتان ابراہیم لاکٹ کے ہاتھ میں پہونچی"[1]

اکرام علی کا تعلق براہ راست ابراہیم لاکٹ ہی سے تھا اس لئے جب وہ شعبہ ہندوستانی کے قائم مقام پروفیسر ۱۸۰۹ء میں مقرر ہوئے تب اس مدت میں انھوں نے اکرام علی کو اخوان الصفا کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کام میں ولیم ٹیلر کی رضامندی بھی شامل تھی، یہ ترجمہ ۱۸۱۰ء میں مکمل ہوا (بحوالہ دیباچہ اخوان الصفا ص ۳-۵)

کریم الدین، رام بابو سکسینہ، سید محمد اور مرتب تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند نے لکھا ہے کہ اکرام علی ۱۸۱۴ء میں فورٹ ولیم کالج کے کتب خانہ کے محافظ مقرر ہوئے۔ جاوید نہال اور عبدالمنان نے ۱۸۰۶ء درج کیا ہے، مذکورہ دونوں سنین غلط ہیں، واقعہ یہ ہے کہ وہ اکتوبر ۱۸۱۶ء میں لائبریرین مقرر ہوئے تھے۔ ۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۶ء کی درمیانی مدت میں انھوں نے کیا کیا اس کا علم نہ ہو سکا۔ نادم سیتاپوری تو ان کو ۱۸۱۶ء تک شعبہ تصنیف

---

[1] بحوالہ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۳۵-۱۳۶

[2] بحوالہ ANNALS OF THE COLLAGE OF FORT WILLIAMS APPENDIX NO. III P. 51

و تالیف سے ہی وابستہ قرار دیتے ہیں، اس کے بعد لائبریری کی ملازمت کا ذکر کرتے ہیں۔

نادم سیتاپوری نے اردو کا پہلا اخبار بہ نام اردو اخبار اکرام علی سے منسوب کیا ہے اور اس کا سن اجرا ۱۸۱۰ء[1] بتلایا ہے، حامد حسن قادری نے بھی اس کی تائید کی ہے، اور ہندوستان میں سب زبانوں کے اخبار پر اردو زبان کے اخبار کو اولیت دی ہے[2]۔ یہ اطلاعات درست نہیں ہیں، ۱۷۸۰ء میں ہکّی گزٹ نکل چکا تھا، اس کے علاوہ انگریزی و فارسی کا مشترکہ اخبار کلکتہ گزٹ ۱۷۸۴ء میں نکلا تھا جہاں تک دیسی زبانوں کا سوال ہے تو ۱۸۱۸ء میں سب سے پہلے سماچار درپن جاری ہوا تھا۔ اس سے قبل کسی دیسی زبان کے اخبار کا سراغ نہیں ملتا[3]۔ ملاحظہ ہو ۲۰۱-۲۰۲ عبیدہ بیگم)

ایک جگہ لکھتی ہیں:

"مولوی عبدالحق نے "گلشن ہند" میں شامل ارسطو جاہ کے قصیدے کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی ہے کہ (لطف) ۱۸۰۱ء سے قبل بھی حیدرآباد جا چکے تھے" (گلشن ہند صفحہ ۱۲) لیکن صرف گلشن ہند میں شامل قصائد کو بنیاد بنا کر ہم ۱۸۰۱ء سے قبل لطف کی حیدرآباد آمد تسلیم نہیں کر سکتے، اس کے علاوہ اس بات کی تردید میں "مجموعہ فصاحت" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ مجموعہ فصاحت ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) کا مرتبہ ہے۔ اس میں وہ سارا کلام شامل ہے جو ارسطو جاہ کے متوسل شعرا نے ان کی مدح میں کہا ہے، لیکن اس میں لطف کا کلام شامل نہیں ہے"[4]

ایک جگہ خلیل علی خاں اشک کا ایک بیان انتخاب سلطانیہ کے دیباچہ سے نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ ان کی جائے پیدائش شاہ جہاں آباد (دہلی) تھی، لیکن پرورش اور پرداخت فیض آباد میں ہوئی اور حاشیہ میں دوسروں کے بیان کی اس طرح تردید کرتی ہیں:

"اشک کے بیان سے نادم سیتاپوری کا یہ کہنا باطل ہو جاتا ہے کہ اشک خیرآباد ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم حاصل کی، اس کے علاوہ نادم سیتاپوری نے تراب علی نامی سے رشتہ داری اور ہندوستانی پریس سے تعلق بھی ظاہر کیا ہے[5]۔ اشک کے بیانات سے علامہ تراب علی نامی سے ان کے کسی تعلق کا سراغ نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی پریس کی تاریخ میں اول تو اکرام علی کا نام ہی شامل نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] بحوالہ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی صفحہ ۱۴۱ [2] بحوالہ داستان تاریخ اردو صفحہ ۸۲ [3] بحوالہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ: بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات صفحہ ۶۵ [4] بحوالہ مقدمہ مثنوی لطف صفحہ ۳۰ [5] بحوالہ فورٹ ولیم کالج، اکرام علی صفحہ ۵۸-۲۵۷

دوسرے مہتمم اور منتظم کی حیثیت سے اشک کا ذکر تو اور بھی بعید از فہم ہے۔[1]"

مقالہ نگار نے خود بھی اپنی چھان بین، کاوش اور اہتمام وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"البتہ جو غلط فہمیاں محققین کے یہاں برسوں سے پرورش پاتی رہی ہیں ان کی نشاندہی کی گئی ہے اور مفصل بحث کے ذریعہ ان کی تصحیح کی کوشش کی گئی ہے، اس کے لئے حتی الامکان بنیادی مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے، اگرچہ مطبوعہ کتب کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ لیکن مباحث کے لئے قلمی نسخوں کو فوقیت دی گئی ہے، کالج کی بہت سی تصانیف جو ہندوستان میں شائع نہیں ہوئی ہیں لیکن پاکستان میں شائع ہو چکی ہیں، انھیں بھی پاکستان سے حاصل کیا گیا ہے۔ کچھ تصانیف ایسی بھی تھیں جن کے نسخوں کا پتہ ہندوستان میں نہیں چل سکا۔ لیکن لندن کے کتب خانے کے توسط سے پاکستان میں طبع ہو چکی ہیں، ان کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔[2]"

دوسری بات یہ ہے کہ مآخذ سے استفادہ کا سلیقہ و قرینہ اور اخذ و اقتباس کا ڈھنگ اور صلاحیت ہونی چاہئے۔ مقالہ سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے دوسرے مصنفین کی بے احتیاطی اور سلیقہ کی کمی وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس سے اس بارے میں ان کی خوش سلیقگی اور ڈھنگ کا پتہ چلتا ہے اس لئے اسے نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لکھتی ہیں:

"موجودہ دور میں عتیق صدیقی کی "گل کرسٹ اور اس کا عہد" اور جاوید نہال کی "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" فورٹ ولیم کالج کے ذیل میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" کو ہندو پاک میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے، لیکن یہ کتاب صرف گل کرسٹ کے عہد (فروری ۱۸۰۴ء) تک کی سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے اور وہ بھی تشنہ اور نامکمل، دراصل یہ کتاب کالج کونسل کی کارروائیوں پر مبنی ہے، لیکن اصل مآخذ سے مواد لیتے وقت مولف سے بعض تسامحات بھی ہوئے ہیں جو دوسرے ایڈیشن میں بجنسہ موجود ہیں جاوید نہال صاحب کی دسترس میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور نیشنل لائبریری کے سارے نادر و نایاب مواد اور مخطوطات تھے، لیکن موصوف نے ان سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا اپنی تصنیف میں انھوں نے جس قدر غلط مواد فراہم کیے ہیں اور جتنا غیر تحقیقی انداز اختیار کیا ہے اس کی مثال کم ہی ملے گی۔[3]"

---

[1] عبیدہ بیگم فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص۱۹۱۔ [2] ایضاً [3] ایضاً ص

اس موضوع کی انگریزی اور ہندی کتابوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان میں اخذ و استفادہ کی اچھی صلاحیت ہے اور وہ رطب و یابس میں فرق و امتیاز کے گُر سے واقف ہیں لکشمی ساگر کی کتاب کے متعلق رقمطراز ہیں:

"اس میں کالج کے قیام اور اس کے بعد کی روداد کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ انتہائی مفید اور اہم کتاب ہے، لیکن اس سے کالج کے مصنفین اور ان کی ادبی خدمات کا تنقیدی اور تجزیاتی پہلو سامنے نہیں آتا۔"[1]

تحقیق میں بحث و استدلال، تجزیہ و تحلیل، ترتیب مقدمات، اخذ نتائج، وسیع اور ضروری معلومات کو سمیٹ لینے کی بڑی اہمیت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ اپنی دریافت کو واقعیت و صداقت کے ساتھ قطعی اور غیر مبہم طور پر مناسب انداز میں پیش کیا جائے۔ ان خوبیوں کی وضاحت کے لئے اس تحقیقی مقالے سے بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

نہال چند لاہوری نے گل کرسٹ کی فرمائش پر "قصہ تاج الملوک و گل بکاؤلی" کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا اور "مذہب عشق" نام رکھا۔ اس کی تمہید میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

"شیخ عزت اللہ بنگالی نے یہ قصہ اپنے معشوق نذر محمد کو کسی دن خدمت میں سنایا تھا اور اس کے اصرار پر اس قصے کو فارسی میں لکھنا شروع کیا، لیکن اتفاقاً یکم ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ کو نذر محمد کی موت واقع ہو گئی، اس واقعہ سے دل برداشتہ ہو کر شیخ عزت اللہ نے مسودات چاک کر ڈالنا چاہا، لیکن دوستوں کے سمجھانے پر مان گئے اور نصف قصے کو فارسی کیا اور نصف کو جیوں کا توں رکھا۔"[2]

اس "جیوں کا توں" کی وضاحت تاریخ ادب اردو کے مورخوں نے نہیں کی، لیکن ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کی فارسی مخطوطات کی فہرست میں "گل بکاؤلی"[3] کے ضمن میں صفحہ ۳۱۴ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

" GUL-E-BUKAWOLI: A LOVE STORY OF TAJUL-MULUK AND BUKAWOLI. TRANSLATED FROM HINDUSTANI INTO PERSIAN. CA 1134/ 1722 BY IZZATULLAH BENGALI "

باڈلین لائبریری کا فہرست کتب (ٹرکش، ہندوستانی، پشتو جلد دوم) میں مذہب عشق کے ضمن میں مندرجہ ذیل بیان ملتا ہے:

[1] فہرست ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۳۶ [2] ایضاً ص ۲۳۳ بحوالہ دیباچہ مذہب عشق، قلمی نسخہ، نہال چند لاہوری ورق ۲ [3] مقالہ نگار عبیدہ بیگم نے ۱۱۲۴ھ کو تحقیق نہال چند لاہوری کا سہو بتایا ہے۔ درحقیقت عزت اللہ کا فارسی بیان نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ صحیح ۱۱۳۴ھ ہے۔

"MADHAB-I-ISHQ:- THE HINDUSTANI VERSION OF THE STORY OF PRINCE TAJULMULUK. THE FAIRY BUKAWLI AND HER ROSE WHICH WAS ORIGINALLY WRITTEN IN HINDI TRANSLATED INTO PERSIAN BY SHAIKH IZZATULAH BENGALI. (WHO COMMENCED IT A H 1134=A.D 1722 NOT A H 1124 AS GARCIN DE TASSY WRONGLY STATES)--"

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ عزت اللہ بنگالی نے کسی ہندستانی داستان سے (جو لکھی جا چکی ہے) فارسی میں ترجمہ کیا ہے لیکن ہمیں یہ بات تسلیم کرنے میں تامل ہے کیونکہ ان بیانات میں بہت سی ایسی خلیجیں ہیں جنھیں تحقیق نے ابھی پُر نہیں کیا ہے۔

(الف) اگر عزت اللہ بنگالی نے ہندی یا ہندوستانی کی کسی کتاب سے ترجمہ کیا تھا تو وہ کتاب اب کہاں ہے؟

(ب) اگر عزتِ اللہ بنگالی نے آدھا حصّہ فارسی میں منتقل کیا تھا اور آدھا حصّہ "جوں کا توں رکھا" تو یہ "جوں کا توں" والا نصف ہندی یا ہندوستانی والا حصہ فارسی مخطوطے سے کہاں غائب ہو گیا؟

محققین ادب اردو نے فارسی "گل بکاولی" سے قبل اس قصہ پر مبنی صرف ایک دکنی مثنوی کا پتہ دیا ہے جو ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) میں لکھی گئی تھی لیکن اس مثنوی کی تاریخ تصنیف بھی مشتبہ قرار دی جا چکی ہے۔[۵]

عزت اللہ بنگالی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصّہ عوام میں رائج رہا ہوگا اور زبانی سنا جاتا رہا ہوگا۔ عزت اللہ نے بھی نندر محمد کو یہ قصہ زبانی ہی سنایا اور پھر اس کی فرمائش پر اسے فارسی میں لکھا۔

عزت اللہ بنگالی کی گل بکاؤلی کے دیباچے کا جو ترجمہ نہال چند لاہوری نے کیا ہے اس سے چند غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ نہال چند لکھتے ہیں:

"اس واقعۂ جانکاہ سے اس مصیبت زدہ کے ہوش و حواس کا طائر اڑ گیا چاہا کہ اوراق مسودّا اس افسانے کے بھی پرزے پرزے کر ڈالوں لیکن چند دوستوں نے کہ ایک گونہ پاس خاطر ان کی منظور تھی آکر سمجھایا بیت..... بحکم ضرورت آدھے کو فارسی کیا اور آدھا جوں کا توں رکھا"[۶]

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے آدھا قصہ فارسی میں منتقل کیا اور آدھا جس زبان میں بھی وہ تھا اس میں چھوڑ دیا، لیکن فارسی دیباچہ کی عبارت سے یہ غلط فہمی رفع ہو جاتی ہے، عزت اللہ لکھتے ہیں:

---

۵ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص۲۴۳ بحوالہ اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص۱۲۱ ۶ ایضاً بحوالہ دیباچہ مذہب عشق طبع سوم ورق ۴

"از پس...... ایں مصیبت زدہ ہوش و حواس از سر باختہ اکثر زبان باپس رباعی میکشود رباعی......
خواستم کہ اوراق مسودات ایں افسانہ چوں جامۂ شکیبائی چاک زنم، و سطور صفحات (کذا) فراہم آوردہ
را از آب دیدۂ تر پاک کنم لیکن چوں در نیمبے[1] بعضے احبہ عزیز القدر کہ پاس خاطر آنہا یکی از وجبات اعتقاد
می بود مانع وقت شدند و میگفتند بیت...... بحکم ضرورت نیمی قصہ مکتوبہ را برجا داشتم و نیمی دیگر نیز بقالب
عبارت فارسی نگاشتم......[2]"

اس عبارت سے مفہوم صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ جو حصہ لکھا جا چکا تھا اور اسے عزت اللہ چاک کر دینا چاہتے تھے اسے
تو برقرار رکھا اور بقیہ نصف کو بھی فارسی میں لکھ کر مکمل کر دیا۔"[3]

ایک اور مثال سے مصنفہ کی تحلیل و تجزیہ، صحیح نتیجہ تک پہنچنے اور اسے قطعیت و صراحت کے ساتھ مناسب
انداز میں بے کم و کاست پیش کرنے کی خوبی ملاحظہ ہو:۔

"فورٹ ولیم کالج کے ان چند ادبی کارناموں کے اسالیب کے اس مختصر جائزے کے بعد یہ کہنا دشوار نہیں کہ
اگرچہ کالج کے ذمہ داران کی لسانی پالیسی ہر تصنیف کے سلسلے میں یہی تھی کہ زبان' سادہ' سلیس اور عوام کی بولی سے
نزدیک ہو' پھر بھی یہاں کا سارا ادب اس حکم کی بہترین تابعداری[4] نہیں کرتا۔ یہاں جتنی داستانیں' قصہ 'حکایات اور
کہانیاں تالیف و ترجمہ کی گئیں، ان میں مصنفین سادگی و سلاست اور عام بول چال کی زبان کے استعمال میں زیادہ
کامیاب نظر آتے ہیں لیکن مذہب و اخلاق اور تاریخ سے متعلق دیگر تصانیف اس لحاظ سے کمزور نظر آتی ہیں۔ ان کے اسلوب
میں سادگی' روانی اور بے تکلفی کا عام فقدان ہے۔ اس کے علاوہ بعض مصنفین جن میں فطری صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود
تھی اور جنھیں زبان و بیان پر قدرت بھی حاصل تھی انھوں نے سادگی اور سلاست کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں، ان کے
اسلوب میں خاص و عام کی بولی' روزمرہ کے محاورے اور آسان ہندی الفاظ کے استعمال کی خوبیاں نظر آتی ہیں، لیکن بعض
مصنفین جنھوں نے اپنے مزاج کے خلاف سادہ اور بول چال کی زبان اختیار کرنے کی کوشش کی ہے ان کا اسلوب
عموماً بے جان' بے کیف اور مصنوعی نظر آتا ہے، وہ اپنے عہد کے مروجہ طرز نثر سے بھی دامن نہیں بچا سکے ہیں۔
یوں ایک جانب کالج کے اغراض و مقاصد نے وہاں کے ادیبوں کی تصانیف میں اسلوب کی یک رنگی

---

[1] یہ لفظ مصنفہ نے اسی طرح لکھا ہے' اس کا کوئی مفہوم نہیں بنتا عالباً یہ "در میان" ہوگا (ص) [2] فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۲۳۶ [3] یہ طویل اقتباس عبیدہ بیگم کے تحقیقی مقالہ کے صفحات ۲۳۲-۲۳۶ سے ماخوذ ہے۔ [4] یہ عبیدہ بیگم کی عبارت ہے جو بعینہٖ نقل کی گئی ہے۔ دراصل حکم اور تابعداری کے الفاظ یہاں مناسب و موزوں نہیں معلوم ہوتے، اس عبارت کو یوں لکھتیں تو بہتر ہوتا "پھر بھی یہاں کا سارا ادب اس پالیسی کے مطابق نہیں تھا" یا "اس پالیسی کی مکمل نمائندگی نہیں کرتا۔" (ص)

پیدا کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف ان ادیبوں کی شخصیت کے تنوع نے ان کی تصانیف میں مختلف رنگ و آہنگ بکھیر دیے۔

مستثنیات سے قطع نظر فورٹ ولیم کالج کا نمائندہ اسلوب سادگی اور بے تکلفی، سلاست اور روانی کے وصف سے مملو ہے اور یہ انداز بیان تصانیف کے کسی نہ کسی حصے میں کسی نہ کسی طور سے ضرور نظر آتا ہے، اس لئے بنیادی طور پر اسی کو کالج کا مخصوص اسلوب قرار دیا جا سکتا ہے، یہی صاحبان عالی شان کا مطمح نظر تھا اور یہی مصنفین کا مقصد۔" ص ۶۴-۶۵

فورٹ ولیم کالج کی زبان و اسلوب بیان کے غیر معمولی امر پر بیان کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کو بھی اس موقع پر پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے بھی مذکورہ بالا خصوصیات کا اندازہ ہوگا۔

مقالہ نگار کے تجزیہ و تحلیل کی خوبی کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تیسرے باب میں فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات اور اس کی تصانیف کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے کتابوں پر موضوعات کے لحاظ سے بحث و گفتگو کی ہے۔

علمی و تحقیقی مقالہ میں زبان اور بیان کو سنجیدہ، حشو و زوائد سے پاک، مدلل و مدلل ہونا چاہیے اور رنگینی و عبارت آرائی اور تخیل، مبالغہ و تکلف سے خالی ہونا چاہیے۔ ان چیزوں کی گنجایش شعر و شاعری اور ادبی مضامین میں تو ہو سکتی ہے لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ اس دائرہ میں آ کر اعتدال اور لفظوں کے استعمال میں پوری احتیاط ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ہر بات نپی تلی اقتضائے حال کے مطابق بے کم و کاست ہونی چاہیے، زیر نظر مقالہ پر تکلف طرز بیان اور عبارت آرائی سے خالی ہے اس لئے اس میں جوش مبالغہ، خطابت اور جذباتی انداز نہیں آنے پائے۔ ممکن ہے اس کی وجہ سے کسی کو یہ خیال ہو کہ مقالہ میں زبان و بیان کی سلاست و شگفتگی اور تحریر کی روانی و دلکشی مفقود ہو گی۔ ہم نے اوپر جا بجا مصنفہ کی تحریروں کے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ اس خیال کی تردید کے لئے کافی ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین نے ایک جگہ لکھا ہے:

"اگر ادب میں تحقیق حق گوئی، صحت اظہار، تلاش حقیقت، تنقیدی بصیرت، گہرے ادبی ذوق اور علم میں مفید اضافہ کا نام ہے تو یقیناً ابھی اردو میں اس کے اعلیٰ نمونے شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں، جہاں معلومات اور دریافت کی فراوانی ہے وہاں ادبی ذوق کا فقدان ہے، جہاں جرأت اظہار ہے وہاں احتیاط کم اور مناسب تحقیقی مواد ہلکا ہے، جہاں ذہانت اور حسن بیان ہے، وہاں تنقیدی صلاحیت اور اہم اور غیر اہم میں امتیاز کی کمی ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو تاریخ ادب میں تحقیق کا ورق سادہ ہے اور نہ ایسی مایوسی کا

یہاں دوسری اشاعت کے بارے میں تصریح نہیں کی ہے کہ وہ کس سنہ میں ہوئی تھی۔

۵۔ مقالہ میں وسیع اور پھیلے ہوئے مواد کو سمیٹنے میں بھی بعض جگہ خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

۶۔ عموماً چھان بین اور تحقیق کا خاطر خواہ حق ادا کرنے کے لیے دوسروں کے بیانات بہت تفصیل سے نقل کیے گئے ہیں، اس کی وجہ سے بعض جگہ اختصار کی خوبی جاتی رہی اور کسی حد تک طوالت کا عیب اور الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔

۷۔ شروع میں کتاب کے ابواب کی ایک اجمالی فہرست تو دی گئی ہے، مگر مفصل فہرست نہ ہونے کی وجہ سے قارئین کو مراجعت میں پریشانی ہو گی۔

۸۔ ایک جگہ لکھتی ہیں "اس کے آمرانہ ذہنیت کی نشاندہی ہوتی ہے" (ص۷) ذہنیت کی تانیث کی وجہ سے اس کی آمرانہ ذہنیت لکھنا چاہیئے تھی، ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو، اسی طرح کی ایک غلطی کلیلہ و دمنہ کے عربی مترجم کے نام کے متعلق ص۲۵ کے حاشیہ میں بھی ہے لکھتی ہیں "خرد افروز کے قلمی نسخے میں عبدالمقنع درج ہے (ص۱۰) لیکن عبدالمقفع ہی درست ہے۔" دراصل یہ دونوں ہی درست نہیں ہیں: بلکہ عبداللہ بن المقفع درست ہے اور یہی خود مصنفہ نے اسی صفحہ کے اصل متن میں لکھا بھی ہے

●●

ڈاکٹر عبیدہ بیگم
شعبۂ اردو۔ ایس وی کالج۔ غازی پور

جواب

سب سے پہلے تو میں مخلص و محترم تبصرہ نگار کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ انھوں نے اس تبصرے کے حوالے سے میری انتہائی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ موصوف نے جن کمیوں یا خامیوں کی جانب مخلصانہ رہنمائی فرمائی ہے انھیں انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کروں گی۔

نمبر ۱، ۲، اور تین کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ مقالہ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لکھا گیا ہے لہٰذا اس میں وقت کی پابندی اور مقالے کی ضخامت بھی مانع ہوئی۔ اس کے باوجود یہ کوشش کی گئی ہے کہ مصنفین کے زیادہ سے زیادہ حالات پیش کئے جا سکیں نمبر ۷ کے سلسلے میں عرض کرنا ہے کہ موضوعات و مضامین کی تفصیلی فہرست کتاب کے آخر میں شامل کر دی گئی ہے۔

نمبر ۵ ۔ صفحہ ۷۰ اور ۵۰، ۳۰ میں بھی کتابت کی غلطی موجود ہے۔ افسوس ہے کہ پروف ریڈنگ میں یہ غلطیاں نظر انداز ہو گئیں۔

●●

ڈاکٹر ظہور الدین
شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا تھیسس

اردو تنقید کا ارتقاء

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا یہ مقالہ، جس پر موصوف کو لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۴۲ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل ہوئی، اردو تنقید پر لکھی گئی ان اہم کتابوں میں سے ایک ہے، جن کا مطالعہ اردو میں ایم اے کرنے والے ہر طالب علم کے لیے ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں ۱۹۴۹ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ دوسری بار اسے اردو مرکز، اردو بازار دہلی ۶ نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ یہ تنقیدی جائزہ مقالے کی اسی اشاعتِ ثانی پر مبنی ہے۔

″۱۸ × ۲۲ / ۸ کے سائز پر ۵۰۰ صفحات کو محیط یہ مقالہ ماحصل، کتابیات، اصطلاحات اور اشاریے کے علاوہ نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن کی تفصیل اس طرح ہے:

"(۱) فن تنقید ۲۰ - ۴۲ (۲) تنقید قدیم ۴۸ - ۱۲۶ (۳) عہد تغیر کی تنقید ۱۲۷ - ۲۰۳ (۴) تعیین ۲۰۴ - ۲۲۵ (۵) تحقیق و تنقید ۲۲۶ - ۲۷۴ (۶) مغرب کے اثرات ۱ ۲۷۵ - ۳۲۶ (۷) مغرب کے اثرات ۲ ۳۲۷ - ۴۰۶ (۸) جدید رجحانات ۴۰۰ - ۴۲۷ اور (۹) ادبی تاریخیں اور رسالے ۴۲۸ - ۴۶۴

ابتداً یہ جان لینا ضروری ہے کہ وہ کون سے عناصر ہیں جن کو اردو تنقید کی تاریخ لکھتے وقت نہ صرف ملحوظ رکھنا ضروری ہے، بلکہ جنھیں پوری طرح سمجھے بغیر اردو تنقید کی تاریخ کا حق ادا نہیں ہو سکتا:

اردو تنقید کے مآخذ تین ہیں:

۱۔ عربی اور فارسی کی وہ تنقیدی روایت جو مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئی اور جسے مشرقی تنقید کے نام سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔

۲۔ سنسکرت کے قدیم تنقید جو مقامی اثرات کی وجہ سے اردو تنقید کا حصہ بنی اور جسے ہندوستانی شعریات کہا جاتا ہے

۳۔ یورپی تنقید کی وہ روایت جو انیسویں صدی میں انگریزی ادب کے وسیلے سے اردو میں داخل ہوئی اور جس نے اردو

ادب کے ساتھ ہی ساتھ اردو تنقید کو بھی ایک نیا موڑ دے کر نئے آفاق تک رسائی حاصل کرنے کے قابل بنایا۔

اردو تنقید کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تنقید کی ان تینوں روایتوں کو سامنے رکھا جائے۔ یہی نہیں ان تینوں کے اشتراک سے سامنے آنے والے نتائج پر بھی نظر ہو تاکہ ادب میں وقتاً فوقتاً نمودار ہونے والے رجحانات کی ماہیت اور ان کی نہج کا اندازہ لگانے میں کوئی غلطی سرزد نہ ہو۔

اس ابتدائی وضاحت کے بعد زیر بحث مقالے کی مناسب چھان پھٹک کے لیے بحث کو یہاں دو حصوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ پہلے حصے کا تعلق مقالے کے صرف معلوماتی پہلوؤں سے ہے، جب کہ دوسرے حصے میں مقالے کو تحقیق کے اصولوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

کام چاہے کوئی بھی ہو اسے کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ادبی کام چاہے تحقیقی ہو یا تنقیدی، جب تک اسے مناسب طریقے سے [illegible] جائے وہ اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اسی لئے منطقی ربط، تسلسل اور ارتقا کی نہ صرف تخلیقی کاموں میں ضرورت پڑتی ہے بلکہ تنقیدی اور علمی و ادبی کاموں میں بھی وہ بنیادی تانے بانے کی ترتیب و تشکیل کا کام انجام پاتا ہے۔ موضوع کو پیش کرنے کیلئے راستہ چاہے کوئی بھی اپنایا جائے، اُسے اسی طرح سے پیش کیا جانا چاہیئے، جیسے کسی تخلیقی سانچے میں اُسے اتارا جاتا ہے۔ البتہ یہاں زبان کا استعمال اس طرح سے استعاراتی نہیں ہوتا جس طرح وہ تخلیقی فن پارے میں نظر آتا ہے۔ جس طرح کسی ٹہنی پر پھوٹنے والی کوئی کونپل دھیرے دھیرے مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے پھول کی منزل تک پہنچتی ہے اسی طرح ہر موضوع آہستہ آہستہ اپنے آپ کو کھولتا ہوا دکھائی دینا چاہیے۔ جیسے وہ خود اپنے آپ کو اظہار کے مختلف مرحلوں سے گزار رہا ہو۔ جیسے وہ خود ہم سے اپنا تعارف کروا رہا ہو۔ معلومات کو اگر اس طرح سے پیش نہ کیا جائے تو وہ اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ اسی لیے ہر فن پارے کی ہیئت چاہے وہ تحقیقی ہو یا تخلیقی و تنقیدی معلوماتی اعتبار سے منطقی ربط و تسلسل اور ارتقا کے اصول کے عین مطابق تشکیل پانی چاہیئے۔ تجزیے کا یہ پیمانہ اگرچہ کہ معروضی کم اور موضوعی زیادہ ہے، لیکن اسے یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ان شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے جب ہم زیر بحث مقالے کے ابواب کا جائزہ لیتے ہیں تو پہلی ہی نظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبادت اپنے موضوع کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ غیر ضروری تکرار نے مقالے کی قدر و قیمت کو متاثر کیا ہے۔ مقالے کے ابواب کو اردو تنقید کے آمد کی روشنی میں ترتیب پانا چاہیے تھا اور ان کی تنظیم اس طرح سے ہونی چاہئے تھی کہ اردو تنقید کے آغاز و ارتقا کی پوری تصویر سامنے آجاتی۔ یہی نہیں یہ تصویر معلوماتی ارتقا کے مختلف رنگوں سے تشکیل پاتی تو زیادہ جاذب نظر ہوتی۔

میرا خیال ہے ادب یا تنقید کی تاریخ کی ترتیب ادوار کے بجائے رجحانات کے اعتبار سے کی جانی چاہیے۔ تنقید کی تاریخ کا تو خصوصاً ایسا ہونا زیادہ سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ مثلاً تنقید کی تاریخ کو محض نقادوں کا تذکرہ بنانے کی بجائے کچھ ایسا ہونا چاہیئے کہ

جس سے یہ معلوم ہو کہ کسی زبان میں تنقید فکری یا اسلوبیاتی اعتبار سے کن کن منزلوں سے گزری ہے اور اس میں ادب کی تفہیم کے کون کون سے پیمانے وضع کیے گئے ہیں۔ انھیں رجحانات کی روشنی میں نقادوں کی گروہ بندی کرکے تنقید کے مجموعی ارتقا کے ساتھ ہی ساتھ مختلف رجحانات کے انفرادی ارتقا کو بھی پیش کر دینا چاہیے۔ تنقید کی تاریخ کی ان ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جب ہم زیرِ بحث مقالے کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ ہمیں تنقید کی تاریخ ہونے کے بجائے اردو کے نقادوں کا تذکرہ سا دکھائی دیتا ہے اور یہ بات واضح نہیں ہو پاتی کہ فکری اعتبار سے اردو تنقید کی مجموعی صورتِ حال کیا ہے۔

اردو تنقید کا اگر سرسری طور پر بھی جائزہ لیا جائے تو اُس میں ہمیں چند اہم نشانات ابھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً ۱۸۵۷ء سے پہلے کی ہماری جتنی بھی تنقیدی روایت ہے اُسے ہم ہیئتی تنقید کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی تنقید مغرب کے زیرِ اثر مقصدی یا نظریاتی تنقید کا رنگ اختیار کرتی ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں جمالیاتی تنقید فروغ پاتی ہے۔ اور جمال پرستوں کا گروہ پورے ماحول پر مسلط دکھائی دیتا ہے۔ اس کے فوراً بعد تاثراتی تنقید سامنے آتی ہے۔ ۱۹۲۵ء سے سماجی تنقید پروان چڑھتی ہے جو ۱۹۷۰ء تک پوری ادبی فضا کو متاثر کرتی ہے۔ اسی زمانے میں نفسیاتی تنقید کو بھی فروغ ملتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد یورپ کے جدید تر تنقیدی نظریات اردو ادب پر اپنا سایہ ڈالنا شروع کرتے ہیں، خصوصاً علامت نگاری اسلوبیاتی تنقید اور دوسرے رجحانات ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ اردو تنقید کا خاکہ انھیں نشانات کو ذہن میں رکھ کر ترتیب دیا جانا چاہیے اور اسے محض نقادوں کی کھتونی ہونے کے بجائے فکری اور اسلوبیاتی ارتقا کی تصویر بننا چاہیے۔ (زیرِ بحث مقالہ افسوس ہے کہ ایسا نہیں بن سکا) میرے نزدیک اس مقالے کے پہلے باب میں تنقید کی ماہیت و نوعیت سے بحث کرنا چاہیے تھا جس میں نہ صرف تنقید کی تعریف پیش کرتے ہوئے دنیا کے مختلف بڑے بڑے نقادوں کے خیالات پیش کیے جاتے بلکہ تنقید کے مقاصد اور اس کی مختلف قسموں سے بھی بحث ہوتی دوسرا باب اردو تنقید کے ماخذ سے بحث کرتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ اس باب کو (۱) مشرقی شعریات (۲) ہندوستانی شعریات اور (۳) مغربی اصولِ نقد کے عنوانات سے تین حصوں میں تقسیم کرکے اُن اہم تنقیدی اصولوں سے بحث کی جاتی جن سے اردو تنقید نے استفادہ کیا ہے۔ مشرقی شعریات کے تحت عربی اور فارسی کے اصولِ نقد مختصراً ابن خلدون، ابن جعفر قدامہ، ابن رشد، ابن رشیق اور نظامی عروضی سمرقندی کے حوالے سے پیش کیے جاتے۔ ہندوستانی شعریات میں رسوں، چھندوں اور النکاروں سے متعلق سنسکرت کے قدیم نقادوں کا ذکر ہوتا۔ مغربی اصولِ نقد سے بحث کرتے ہوئے افلاطون، ارسطو، ورڈز ورتھ، آسکر وائلڈ، والٹر پیٹر، مارکس، میلارمے اور ٹی ایس ایلیٹ وغیرہ کے نظریات کا خصوصاً ذکر کیا جاتا تاکہ بعد میں اردو تنقید کو سمجھنے میں مدد ملتی۔

تیسرے باب میں ابتدائی اردو تنقید سے بحث کی جاتی۔ اس میں سب سے پہلے ان تنقیدی خیالات سے بحث ہونی چاہیے تھی جو ہمیں اردو تنقید کی ابتدا ہی سے نظم یا نثر پاروں میں ملتے ہیں۔ اس کے بعد شاعروں میں کیے جانے والے اعتراضات کی تنقیدی

ابتدایت سے بحث ہوتی۔ استادی شاگردی کی روایت کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی اردو تنقید کا ذکر ہوتا۔ تذکروں میں پائی جانے والی تنقید کا جائزہ لیا جاتا اور دبستانوں سے پروان چڑھنے والی تنقیدی بصیرت کو تفصیل سے پیش کیا جاتا۔ مجموعی اعتبار سے اس باب کو آغاز سے ۱۸۵۷ء تک کی اردو تنقید کی روایت اور اس کے ارتقا تک محدود کر دیا جاتا۔

چوتھے باب کا عنوان جدید اردو تنقید رکھا جانا چاہیے تھا۔ اور اس کی ابتدا میں انیسویں صدی کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کے زیر اثر اردو ادب میں نمودار ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر ہوتا۔ اس کے بعد جدید اردو تنقید سے بحث ہوتی اور اردو میں نظریاتی تنقید کے آغاز و ارتقا پر تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی۔

مغرب کے زیر اثر جہاں ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا وہیں ادب اور تنقید میں بھی نئی زندگی دوڑنے لگی۔ اس دور میں اردو تنقید بیک وقت تین سمتوں میں پروان چڑھی۔ ایک طرف نظریاتی فکر کو تقویت پہنچی اور دوسری طرف عملی اور تقابلی تنقید کی روایت کو فروغ ملا۔ چنانچہ اس باب کو تنقید کے نظریاتی، عملی اور تقابلی زمروں میں بانٹ کر بحث کی جاتی۔ نظریاتی تنقید کے تحت حالی، شبلی اور آزاد کے تنقیدی افکار کا تفصیل سے ذکر ہوتا جب کہ عملی اور تقابلی تنقید سے بحث کرتے ہوئے انہی ادیبوں کی تصنیفات سے مدد لے کر ان اصولوں سے بحث ہوتی جن کی روشنی میں مختلف شاعروں کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مقدمۂ شعر و شاعری کے دوسرے حصے میں مختلف اصناف پر حالی کی تنقید، حیاتِ سعدی، حیات جاوید، یادگارِ غالب، شعر العجم، آب حیات اور محاسنِ کلام غالب میں عملی تنقید کے نمونے اور موازنۂ انیس و دبیر میں پائے جانے والے تقابلی تنقید کے عناصر کو زیر نظر رکھ کر بات کی جاتی۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ چوں کہ ان تینوں قسموں کی تنقیدی روایت مسلسل اب تک جاری ہے۔ اس لیے ہر حصے کے آخر میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا۔

پانچویں باب میں جمالیاتی تنقید سے بحث کی جاتی اور جمال پرستوں کے یہاں پائی جانے والی نظریاتی اور اسلوبیاتی خصوصیات کا تفصیل سے ذکر ہوتا۔ خصوصاً یورپ کی جمالیاتی تنقید کی روشنی میں نیاز فتح پوری اور ان کے رفقا کے نظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی انفرادیت کو سامنے لایا جاتا۔ آخر میں محمد حسن عسکری کے جمالیاتی نظریات کو بھی سمیٹا جاتا۔

چھٹے باب میں تاثراتی تنقید کی مغربی روایت کے تحت فراق کے نظریات کا بھرپور جائزہ لیا جاتا۔

ساتویں باب میں سماجی تنقید سے بحث ہوتی اور ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ ابھرنے والے اہم نقادوں کے خیالات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ خصوصاً اردو میں سماجی اور مارکسی تنقید کو فروغ دینے کے لئے سجاد ظہیر، عبدالعلیم، احتشام حسین، ڈاکٹر محمد حسن اور دوسرے نقادوں کی حقیقت نگاری، اشتراکی حقیقت نگاری اور اشتراکی جمالیات کے نظریات کو بھی تفصیل سے پیش کیا جاتا۔

آٹھواں باب نفسیاتی تنقید کے لیے مخصوص ہوتا جس میں ابتداً علم نفسیات کے ارتقا پر روشنی ڈالی جاتی پھر ان نفسیاتی نظریات سے بحث ہوتی جنھوں نے ادب میں تنقید کے ایک نئے دبستان کو جنم دیا ہے۔ اس میں فرائڈ، یونگ اور اڈلر کے خیالات کو خصوصاً پیش کیا جاتا۔ اس کے بعد اردو میں نفسیاتی تنقید کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی جاتی اور میراجی، ریاض احمد، آفتاب احمد دیوندر اسر اور محمود الحسن وغیرہ کے نظریات پیش کیے جاتے۔

نویں باب میں ۱۹۶۰ء کے بعد اردو تنقید میں ابھرنے والے جدید تر نظریات سے بحث ہوتی۔ خصوصاً اسلوبیات کے ارتقا پر روشنی ڈالتے کے بعد اردو میں اس کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مرزا خلیل بیگ کی خدمات کا جائزہ لیا جاتا۔ اس کے علاوہ وجودیت، علامت نگاری، کیوبزم، ڈاڈازم اور سرریلزم کے اثرات بھی تلاش کیے جاتے۔

زیرِ بحث مقالہ نہ صرف ابواب کی مندرجہ بالا تقسیم ہی کی نفی کرتا ہے بلکہ اپنے موضوع کے فکری اور اسلوبیاتی پہلوؤں سے بھی کماحقہ انصاف کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ یہی نہیں، اس مقالے کی ترتیب جن مقاصد کے تحت عمل میں آئی ہے۔ وہ بھی تسلی بخش طریقے سے پورے ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ مثلاً پہلے باب کا عنوان فنِ تنقید (۲۰) ہونے کے باوجود نہ تو اس سے فنِ تنقید کی ماہیت سامنے آتی ہے اور نہ اس کے مقاصد پر روشنی پڑتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ایک ہی باب میں متعدد متضاد عناصر کو جمع کر دیا گیا ہے۔ مثلاً تنقید کی اہمیت (۲۰) ادب اور تنقید (۲۱) تنقید کی اولیت (۲۳) تنقید کی تعریف (۲۸) تنقید کا صحیح مفہوم (۳۱) پیش کر دینے کے بعد تنقید کے تین نظریوں (۳۲) تنقید اور جمالیات (۳۹) سائنٹفک تنقید (۴۶) جمالیاتی تنقید (۴۸) حسن اور افادے کی بحث (۴۹)، مغربی نظریات تنقید (۵۱)، جدید اسکول اور نئے تجربے (۶۵) اور تنقید مشرق (۶۸) کے لیے اس باب میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ جب انھیں موضوعات میں سے اکثر پر آگے بھی بحث ہونا ہے تو پھر انھیں یہاں شامل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مثلاً تنقیدِ مشرق پر دوسرے باب میں (۷۹)، جمالیاتی تنقید پر چھٹے باب میں (۳۲۳) سائنٹفک تنقید پر ساتویں باب میں (۲۴۷) اور حسن اور افادی پہلو پر آٹھویں باب میں (۴۰۹) بحث کی گئی ہے۔ یہاں انھیں شامل کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پہلے باب کے آخری حصے کا عنوان تنقید کا مقصد (۱۷) رکھا گیا ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اتنے اہم موضوع کو صرف ڈیڑھ صفحے میں ٹرخا دیا گیا ہے۔ اسی لیے یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ تنقید کون کون سے مقاصد جلیلہ انجام دے سکتی ہے۔ اسی باب میں صفحہ ۶۸ پر تنقیدِ مشرق کے عنوان سے بحث کی گئی ہے لیکن مشرقی تنقید کے اصولوں سے بحث کرنے کی بجائے عربی تنقید کے محض چند نام گنوا دیئے گئے ہیں۔ پھر یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ مشرقی تنقید کی نوعیت کیا ہے۔ اتنی بات ہم میں سے اکثر کو معلوم ہے کہ عربی اور فارسی کے توسط سے تنقید کی جس روایت نے فروغ پایا۔ اس میں معانی سے زیادہ ہیئت پر زور دیا جاتا تھا لیکن زیرِ بحث عنوان کے تحت درج معلومات سے تو نتائج اس کے بالکل برعکس نکلتے ہیں۔ اس بحث سے حاصل ہونے والے نتائج جو مقالے کے صفحہ ۷۰ پر درج ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

"صرف اتنا جان لینے سے ہمارا کام نکلتا ہے کہ عرب کی تنقید میں معانی و بیان اور اس کی مختلف اصطلاحیں' فصاحت و بلاغت وغیرہ کا ذکر بار بار آتا ہے اور اسی پر ان کی بنیادیں قائم ہیں۔"

دوسرے باب کا عنوان تنقیدِ قدیم (۷۴-۱۲۶) ہے اور اس میں اردو کی ابتدائی تنقید پر روشنی ڈالتے ہوئے فارسی اثرات (۷۴) کے ساتھ ہی ساتھ مشاعرے (۷۵)' منظومات میں تنقیدی خیالات (۸۰) تذکرے (۸۵) ادبی تحریکوں کا ذکر (۱۱۱)' اساتذہ کی اصلاحیں (۱۱۸) اور تقریظ (۱۳۱) وغیرہ عنوانات کے تحت بات کی گئی ہے۔ فارسی تنقید سے متعلق پیش کیے گئے مصنف کے خیالات سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا فارسی میں تنقید کی کوئی روایت تھی ہی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اردو میں ابتدائی تنقید کی روایت کیوں کر پروان چڑھتی۔ پھر عربی تنقید کے وہ اثرات کہ جنھیں فارسی نے اپنے اندر جذب کر کے پروان چڑھایا۔ اُنھیں کس زمرے میں رکھا جائے گا۔ اس حصے سے بھی کہ جس کا عنوان "فارسی کے اثرات" رکھا گیا ہے ان اثرات کی نشاندھی نہیں ہوتی جو اردو کی ابتدائی تنقید پر مرتب ہوئے۔ خصوصاً اس شعری و ادبی مذاق کا ذکر ہونا چاہیئے تھا جس کی تربیت اردو والوں کو عربی اور فارسی تنقید کے توسط سے حاصل ہوئی۔ مشاعروں کی تنقید اور منظومات میں تنقیدی خیالات والے حصے تسلی بخش ہیں۔ تذکروں سے متعلق حصے میں جہاں مختلف تذکروں کے نام گنوائے گئے ہیں (۸۶) وہاں ان کی تالیف کا سنہ بھی اگر درج کیا گیا ہوتا تو مناسب تھا۔ تذکروں کی تقسیم کے سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی جو گروہ بندی اختیار کی گئی ہے وہ مکمل نہیں ہے۔ مثلاً وہ تذکرے جنھیں جنس یا علاقے کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ اُنھیں اُن سات حصّوں میں سے کسی میں بھی رکھا نہیں جا سکتا جن کی گروہ بندی ڈاکٹر سید عبداللہ نے کی ہے۔ تذکروں کی تنقیدی اہمیت اور اردو تنقید کے ارتقا میں ان کے کردار پر البتہ مناسب طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ استادی شاگردی کی روایت سے تنقید کو جو تقویت ملی اُسے بھی موصوف نے خوب نبھایا ہے۔ البتہ یہ کمی ضرور محسوس ہوتی ہے کہ اردو کی ابتدائی تنقید کی ان سبھی روایتوں سے حاصل ہونے والے نتائج کو مجموعی اعتبار سے آخر میں اگر پیش کر دیا جاتا تو قاری کے لیے نہایت ہی مفید ہوتا۔ اس باب کے اس حصّے میں جس میلانِ طبع کو ادبی تحریک کا نام دیا گیا ہے اُسے تحریک کی بجائے رجحان قرار دیا جانا چاہیے۔ کیونکہ کوئی رجحان اس وقت تک تحریک نہیں بنتا جب تک اس کے فروغ کیلئے چند لوگ باقاعدہ تنظیم کی صورت اختیار کر کے کوشش نہیں کرتے۔ ایہام گوئی کے سلسلے میں ایسا کچھ ہرگز نہیں ہوا۔ یہ البتہ ایک رجحان ضرور تھا جسے انفرادی طور پر ہمارے دلی کے شعرائے متقدمین نے پروان چڑھایا۔

ایک اور واضح کمی جو اس باب میں محسوس ہوتی ہے وہ اردو شاعری کے دبستانوں کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والے تنقیدی نظریات کو نظر انداز کرنا ہے۔ دلی کے دبستانِ شاعری اور لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کے تحت فروغ پانے والے تنقیدی نظریات کو بھی شامل کیا جانا چاہیے تھا کیونکہ ان دونوں کی حد بندی بذاتِ خود تنقید کے چند اصولوں کی موجودگی کا پتا دیتی ہے

جسے نظرانداز کیا جانا چاہیے تھا۔

تیسرا باب عہد تغیر کی تنقید سے متعلق ہے (۱۲۷-۲۰۲) جس میں انیسویں صدی کی سیاسی و سماجی تبدیلیوں، غدر کے اثرات اور سرسید کی اصلاحی تحریک سے بحث کرنے کے بعد حالی، آزاد اور شبلی کی تنقیدی خدمات کا تجزیہ کیا گیا ہے لیکن یہاں بھی یکی شدت کے ساتھ کھٹکتی ہے کہ اس علمی و ادبی ماحول پر کما حقہ روشنی نہیں ڈالی گئی جس نے حالی، آزاد اور شبلی کی تربیت عمل میں لاکر انھیں ایک نئے دور کا نقیب بنا دیا۔ خصوصاً وہ کونسی لسانی اور ادبی تبدیلیاں تھیں جنھوں نے حالی کے مزاج اور مذاق شعری تربیت عمل میں لاکر انھیں ایک نئے دور کی بشارت بنایا۔ یہ درست ہے کہ مصنف یہاں کوئی سیاسی و سماجی تاریخ نہیں لکھ رہا ہے لیکن علمی و ادبی تبدیلیوں کی جڑیں چونکہ اپنے دور میں پیوست ہوتی ہیں۔ اس لیے انھیں سمجھنے کے لیے اس پس منظر کا تھوڑا بہت ذکر تو ہونا ہی چاہیے جس نے انھیں ایک مخصوص سمت و رفتار عطا کی۔ حالی کے تنقیدی نظریات کا ذکر کرتے ہوئے اُن مآخذ کا تفصیل سے ذکر کیا جانا چاہیے عقاحبن سے استفادہ کرکے انھوں نے اپنے نظریات مرتب کیے۔ مثلاً صرف اتنا کہہ دینے سے بات نہیں بنتی کہ حالی اور افلاطون کے خیالات میں مماثلت ہے۔ اردو کا ہر طالب علم ضروری نہیں افلاطون کے نظریات سے واقف ہی ہو۔ پھر زیر بحث مقالہ چونکہ تنقید کی تاریخ سے متعلق ہے۔ اس لیے یہاں اُس مماثلت کی تفصیلات درج کرنا بہت ضروری ہیں تاکہ قاری پر ہر بات واضح ہوتی چلی جائے۔

عبادت بریلوی کی اس دلیل سے بھی اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ حالی نے شاعری کا مقصد جذبات کو برانگیختہ کرنا اس لیے قرار دیا کہ اس دور کی زندگی پر جو جمود کی کیفیت طاری تھی وہ اسے توڑنا چاہتے تھے۔ میرا خیال ہے مقدمۂ شعر و شاعری جب لکھا گیا (۱۸۹۳ء) اس وقت ہماری زندگی پر جمود کی کیفیت کی بجائے ایک تذبذب کی کیفیت طاری تھی اور ہم زندگی کے ہر شعبہ میں نئے راستوں کو کھوج نکالنے کی تگ و دو میں مصروف تھے چنانچہ ادبی سطح پر اس تذبذب کو ختم کرنے کے لیے یورپی ادب کے تتبع سے بہتر اور کوئی موثر ہتھیار موجود نہ تھا۔ چنانچہ ہم نے جہاں افلاطون اور ارسطو کے نظریات سے استفادہ کیا وہیں ورڈزورتھ اور کولرج کے خیالات سے بھی خوشہ چینی کی۔ شاعری سے جذبات کو برانگیختہ کرنے والی بات حالی نے ورڈزورتھ اور کولرج ہی سے لی۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ عبادت بار بار اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ حالی نے اپنے نظریات کی ترتیب میں افلاطون سے استفادہ کیا لیکن انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شاعری کو سوسائٹی کے تابع کرنے کی بات انھوں نے کہاں سے مستعار لی۔ انھوں نے افلاطون کے نظریات کا اگر تفصیل سے جائزہ لیا ہوتا تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ بات بھی تو افلاطون کی ہی کہی ہوئی ہے۔ ریاست میں افلاطون اس بات پر بار بار زور دیتا ہے کہ شاعر کو سماجی اور اخلاقی مقاصد کے تحت کام کرنا چاہیے بلکہ وہ شاعروں کو اپنی ریاست سے بے دخل کرنے کے بعد انھیں صرف اسی شرط پر قبول لنے کیلیے تیار رہتا ہے کہ وہ یا تو دیوتاؤں کی حمد و ثنا گائیں یا بزرگوں کی تعریف و توصیف

کرتے ہوئے اپنی زندگیاں بتائیں ۔

مقالے کے اس حصے میں حالی کے نظریات سے بحث کرتے ہوئے جب مصنف شعر کے لیے قافیے اور وزن کی ضرورت کو غیر اہم قرار دیتا ہے تو یہ کہنے کے باوجود کہ یہاں حالی نے ایک دوسرے یورپی نقاد سے استفادہ کیا ہے وہ اس کا نام نہیں لکھتے (۱۵۷) اس نظریے کو بھی حالی، ورڈزورتھ سے ہی مستعار لیتے ہیں۔ ورڈزورتھ لریکل بیلڈز کے دیباچے میں وزن کی اہمیت سے انکار تو نہیں کرتا لیکن وہ اُسے شاعری کی ماہئیت سے خارج ضرور قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ صرف پہلے سے موجود تاثر میں شدت پیدا کرنے کا انجام لاتا ہے۔ یہی خیالات حالی بھی پیش کرتے ہیں ۔

شبلی پر کی گئی بحث (۱۷۱ - ۱۸۸) میں بھی یہ کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ ان کی تنقیدی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے اُن کے تنقیدی فن پاروں سے کچھ مثالیں دے کر بات واضح کی جانی چاہیے تھی۔ عملی اور تقابلی تنقید کے اصولوں کی وضاحت بھی مثالوں سے کی جاتی تو بہتر ہوتا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ شبلی مشرقی تنقید کے علمبردار ہیں لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ کیوں اور کیسے ہم انھیں اس زمرے میں رکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے عبادت کی یہ بات کہ شبلی عملی تنقید میں نقاد سے زیادہ شارح ثابت ہوتے ہیں صحیح ہو لیکن دو چار مثالوں سے اگر مدد لی گئی ہوتی تو بات زیادہ باوزن ہو جاتی۔ محض بیانات درج کر دینے سے تنقید کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس حصے کی ابتدا (۱۷۱ - ۱۷۲) میں شبلی کی تنقیدی تصنیفات سے بحث کرتے ہوئے شعر العجم، موازنۂ انیس و دبیر اور مولانا روم کا تعارف اس طرح سے کراتے ہیں کہ ان کی تنقیدی حیثیت ہی سامنے نہیں آتی۔ ہونا دراصل یہ چاہیے تھا کہ ان تصنیفات کے سرسری تعارف کے بعد ان تنقیدی نظریات کی مثالوں سے وضاحت ہوتی جو ان کتابوں میں ہمیں ملتے ہیں اور جن سے شبلی کی تنقیدی بصیرت کی پہچان ہوتی ہے ۔ ان کتابوں کے تعارف کی بے ہیئتی کا اندازہ تو اس بات سے ہو جاتا ہے کہ مصنف ہمیں یہ بھی بتا نہیں پاتا کہ متذکرہ کتب کب تصنیف کی گئیں ۔ یہی نہیں یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ شبلی کس دور سے متعلق ہیں۔ مصنف کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے تھا کہ ضروری نہیں ان کا قاری اردو زبان و ادب کا طالب علم ہی ہو۔ اس کتاب سے کوئی غیر اردو داں بھی تو استفادے کی سوچ سکتا ہے اُسے یہ کیوں کر معلوم ہوگا کہ کون سا ادیب کس دور سے متعلق ہے۔ یا کون سی کتاب کب تخلیق کی گئی یا اشاعت کی منزلوں سے گزرتی۔ اس مقالے کی ایک خامی یہ بھی ہے کہ اکثر ادیبوں کے ادوار یا اکثر کتابوں کی تخلیق و تصنیف کے سنین سے متعلق معلومات درج نہیں کی گئی ہیں۔

یہی کمی آزاد کے بیان میں بھی دکھائی دیتی ہے ۔ نہ تو کتابوں کا تعارف ٹھیک سے کرایا گیا ہے اور نہ تنقیدی نظریات کی ہی درست طریقے سے وضاحت ہو سکی ہے ۔ مثلاً وہ آزاد کے اس قول سے کہ شعر ایک الہامی چیز ہے اور شاعر ماحول کی نہیں ایک غیبی قوت کی پیداوار ہوتا ہے، یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ آزاد کلیتاً مشرقی ہیں اور اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ابتدا میں کم و بیش

دنیا کے ہر ملک میں ادیبوں اور شاعروں سے متعلق اسی قسم کے نظریات عام تھے۔ کم و بیش ہر ملک میں شاعر کو SEER R یا PROPHET T کا درجہ دیا جاتا تھا۔ کیا وہ یونانیوں کے اس تصور کو بھول گئے کہ شاعر جب شعر کہتا ہے تو وہ شاعری کی دیوی کے زیر اثر ہوتا ہے۔ محض اس وجہ سے تو آزاد کو مشرقی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس سے تھوڑا ہی آگے چل کر وہ خود ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ شعر سے متعلق اپنے خیالات کی ترتیب کے وقت وہ یونانیوں سے متاثر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد مغربی تنقید سے خاصے متاثر تھے اور انہیں اصولوں کی روشنی میں انھوں نے اپنے نظریات بھی متعین کیے۔ وہ یونانیوں سے، خصوصاً افلاطون سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اسی لیے شعر کی ماہیت، شاعری کی تخلیق، اس کے افادی پہلوؤں اور اس کے سماجی رشتوں سے متعلق ان کے نظریات میں ہمیں اسی کی گونج زیادہ سنائی دیتی ہے۔

انھوں نے آزاد کے مشرقی ہونے کا ثبوت اس بات میں بھی تلاش کیا ہے کہ وہ فصاحت، بلاغت، بندش کی چستی، معنی آفرینی، نازک خیالی، تشبیہ و استعارہ وغیرہ اصطلاحیں جنھیں وہ مشرقی قرار دیتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ یہ کتنی بچکانہ دلیل ہے، عبادت شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ یورپی ادب میں، خصوصاً انگریزی ادب میں بھی ایسی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں جو کم و بیش یہی معانی ادا کرتی ہیں۔ مثلاً SIMILI METAPHOR TERSENCRS PERCEPTIVE, ARTIFIC ELOQUEUCT وغیرہ آزاد کی شخصیت سے متعلق عبادت جو مجموعی نتائج اخذ کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ اس لیے اس کا از سر نو تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کی ماہیت کا اندازہ ان کے اس اقتباس سے بخوبی ہو جاتا ہے:

> " آزاد پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو تذکرے کو ادبی تاریخ کا روپ دیا جس میں تنقید کا بھی خیال رکھا ہے اور مختلف شعرا پر قائم کی ہوئی رائیں اگرچہ مختصر ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض جگہ اصولوں کو سامنے نہیں رکھا گیا۔ اگرچہ اس میں اکثر جگہ جذباتیت ملتی ہے لیکن یہ رائیں صحیح ہیں۔ آج تک ان کا اثر ہے۔ آج بھی نقاد قدیم شاعروں کے متعلق رائے قائم کرنے کے سلسلے میں ان سے مدد لیتے ہیں۔" (ص ۔ ۲۰۱)

ڈھیر ساری خامیوں کے باوجود رائے کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

چوتھا باب متبعین سے متعلق ہے جس میں حالی، آزاد اور شبلی کی قائم کی ہوئی شاہراہ پر چلنے والوں میں سے تین اہم نقادوں یعنی وحید الدین سلیم، امداد امام اثر اور مہدی افادی کے تنقیدی نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ کیا ان تینوں کو محض اس وجہ سے ایک ساتھ رکھنا چاہیے کہ یہ متبعین میں شمار ہوتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں میں صرف سلیم حالی سے قریب ہیں۔ دوسرے دو یعنی امداد امام اثر اور مہدی افادی جمالیاتی ہیں۔ اس کا ثبوت اسی مقالے میں دی گئی مثالوں سے مل جاتا ہے۔ اگر عبادت نے ادوار قائم کرنے کی بجائے رجحانات کو بنیاد بنایا ہوتا تو اس طرح کا

خلط مبحث ہرگز نہ ہوتا۔

پانچویں باب کا عنوان تحقیق و تنقید رکھا لیا ہے جبکہ اس کا صحیح عنوان "تحقیقی تنقید" ہونا چاہیے تھا۔ کیوں کہ اس باب میں جن نقادوں کی تنقیدات کا تجزیہ کیا گیا ہے وہ وہی لوگ ہیں جن کے تنقیدی افکار کی عمارت تحقیقی کاوشوں اور دریافتوں کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اس باب کے شروع میں تحقیق و تنقید کے درمیانی رشتے کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، ان کا اس مقالے کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں محقق بھی اپنے کام کا آغاز تنقیدی شعور سے کرتا ہے یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہے اس مقالے کے وسط میں ٹھونسنے کی کوشش نہ کی جانی چاہیے تھی گنجائش اگر تھی تو صرف ان تنقیدی فن پاروں کا تجزیہ کرنے کی کہ جن کی بنیاد تحقیق پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ اسی مناسبت سے اس باب کا عنوان اگر تحقیق و تنقید کی بجائے تحقیقی تنقید ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔

اس باب میں پیش کیے گئے عبادت کے اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ جب تک سکون و طمانیت میسر نہ آئے (۲۲۸) تحقیقی کام نہیں ہو سکتا۔ سکون و اطمینان کی تو سب سے زیادہ ضرورت تخلیقی کاموں میں ہوتی ہے لیکن سکون و طمانیت کا مطلب ماحولیاتی سکون و طمانیت نہیں ہوتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو غدر کے بعد ہی غالب قاطع برہان (۱۸۶۲ء)، محمد حسین آزاد آب حیات (۱۸۸۰ء)، حالی حیات سعدی (۱۸۸۲ء)، مقدمۂ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء)، یادگارِ غالب (۱۸۹۷ء)، حیات جاوید (۱۹۰۱ء) اور شبلی شعر العجم (۱۸۹۹ء - ۱۹۱۲ء) کیسے لکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادیب یا فن کار کو جس سکون و طمانیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا تعلق خارجی ماحول سے ہرگز نہیں ہوتا۔ یہ ایک باطنی کیفیت ہوتی ہے جو جب میسر آ جائے تو انسان تلواروں کے سائے میں بھی کام کر لیتا ہے۔ اردو کی بہترین شاعری اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے دوران وجود میں آئی اور یہی وہ زمانہ ہے جسے ہندوستان کی تاریخ میں پر آشوب دور قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح غدر کے بعد چاروں طرف بحران اور تاراج کی سی کیفیت طاری ہونے کے باوجود بہت سا علمی و ادبی کام ہوا۔

اس باب میں بجائے اس کے کہ اردو تحقیق کے ارتقا سے تنقید میں ابھرنے والے نئے رویوں کی وضاحت کی جاتی۔ عبادت خود کو صرف ادبی تحقیق کے ارتقا تک ہی محدود رکھتے۔ یا وہ ہمیں یہ تو بتاتے ہیں کہ ان تحقیقی کاوشوں سے اردو کی ادبی تاریخ کو کیا فائدہ ہوا لیکن یہ واضح نہیں کرتے کہ تنقید کو ان سرگرمیوں سے کیا بصیرت ملی۔ اسی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ اس باب کیلیے تحقیق کی تاریخ میں تو جگہ ہو سکتی تھی تنقید کی تاریخ میں اس وقت تک جگہ نہیں پیدا ہو سکتی، جب تک یہ واضح نہ ہو کہ اس سے اسے بھی کسی طرح کا کوئی فائدہ ہوا عبادت یہ کام کما حقہ انجام نہیں دے پاتے۔ مثلاً ڈاکٹر عبدالحق کی تنقیدی صلاحیتوں سے بات کرتے ہوئے (۲۲۰، ۲۵) انھیں حالی کا پیرو کار قرار دیتے ہیں۔ اگر ایسا ہی تھا تو ان کا ذکر ایک نئے عنوان کے تحت کرنے کی بجائے متبعین کے ساتھ ہی کیا جاتا۔

یہاں آپ کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوا ہوگا کہ تحقیقی تنقید سے میری مراد کیا ہے یا جب میں یہ کہتا ہوں کہ اس باب میں یہ بتانا چاہیے تھا کہ نئے دور میں تحقیقی سرگرمیوں نے تنقید کو کیا فائدہ پہنچایا تو میں دراصل صاحب مقالہ سے کس طرح کی معلومات درج کرنے کا تقاضا کر رہا ہوں۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ جب تحقیق فروغ پاتی ہے تو ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ہی ساتھ ان کی تخلیقات، ادوار، سیاسی و سماجی حالات کہ جن کی موجودگی میں فن کاروں نے تخلیقی، تصنیفی یا تالیفی مرحلے طے کیے ہوتے ہیں، ان کی نجی زندگی کے اہم واقعات و حادثات وغیرہ سے متعلق نئی نئی معلومات سامنے آتی ہیں۔ نقاد ان معلومات سے استفادہ کرتے ہوئے ادیبوں کی تخلیقات کی سماجی، سوانحی، نفسیاتی اور علمی و ادبی معنویت پر نئے اور بے لاگ زاویۂ نگاہ سے لکھتا ہے اور اس طرح انھیں سمجھنے کے نہ صرف نئے گوشے پیدا ہوتے ہیں بلکہ ان کی اہمیت اور معنویت میں بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔ مثالیں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ غالب کو ایک مدت تک نظرانداز کیا جاتا رہا لیکن حالی نے یادگار غالب (۱۸۹۷ء) میں جب تحقیقی و تنقیدی اسلوب اپنا کر اُسے پیش کیا تو اس کی تصنیف کے بہت سے پہلو جو اس وقت تک پوشیدہ تھے واضح ہو گئے اور وہ ادب کی دنیا کے افق پر ایک تابناک ستارے کی طرح طلوع ہوا۔ یہی حال نظیر کا بھی ہے۔ ایک مدت تک اسے شاعر ہی تسلیم نہ کیا گیا لیکن جب سماجی تقاضوں نے بصیرت کے نئے چراغ روشن کیے تو وہی شاعر ایک نئے روپ میں ہمارے سامنے اُبھر آیا۔ آج وہ بھی نہ صرف ایک نئے دور کا نقیب نظر آتا ہے بلکہ اپنے دور کا ترجمان و مفسر بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ انہی تحقیقی کاوشوں سے پروان چڑھنے والے تنقیدی مزاج کا شاخسانہ ہے کہ ہماری تنقید سیاسی، سماجی، سوانحی، نفسیاتی اور لسانی معنویت سے ہمکنار ہوئی ہے ورنہ اس سے پہلے اس کی کائنات تو محض فصاحت و بلاغت تک ہی محدود تھی۔ کسی تنقیدی کاوش کو اسی وقت تحقیقی تنقید کے زمرے میں رکھنا چاہیے۔ جب اس میں کسی ادیب کے سماج، ماحول، اس کی زندگی کے حالات نفسیاتی کیفیات و رجحانات اور دیگر معروضی و موضوعی حقائق کی روشنی میں اس کی تخلیقات کا تجزیہ کیا گیا ہو۔

زیر نظر باب میں ایسا صرف کہیں کہیں ہی ہوا ہے اور وہ بھی شعوری نہیں غیر شعوری طور پر۔ زیادہ توجہ دوسری تفصیلات پر صرف کی گئی ہے۔ یعنی زیادہ زور انھیں تشریحی اور تاثراتی نقاد ثابت کرنے پر دیا گیا ہے۔

عبادت بریلوی اس پورے مقالے میں ایک عجیب طرح کا اسلوب استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جب کہیں وہ کسی نقاد کی خامیاں بیان کرتے ہیں تو ساتھ ہی ایسے جواز بھی فراہم کرتے چلے جاتے ہیں کہ جن کا مقصد اُن خامیوں کو خوبیوں میں بدلنا ہوتا ہے۔ یہ انداز نہ تو محقق ہی کو راس آتا ہے اور نہ نقاد کو۔ حالی نے جس خلوص و صداقت کو شاعری کے لیے ضروری قرار دیا ہے اس کی اتنی ہی ضرورت تحقیق و تنقید میں بھی ہوتی ہے۔ عبادت بریلوی کے اسی اسلوب کی وجہ سے یہ پتا ہی نہیں چل پاتا کہ کون کتنے پانی میں ہے اور کس کی قدر و قیمت یا معیار و مرتبہ کیا ہے۔ مثلاً حالی کے بعد کا ہر نقاد حالی کا ہی چربہ دکھائی دیتا ہے چنانچہ حالی اور ان کے متبعین کے

درمیان فرق ان کی تنقیدی بصیرت کا نہیں بلکہ محض تاریخی اعتبار سے ان کی اولیت کا رہ جاتا ہے۔ عبادت بریلوی کی تنقیدی بصیرت کے اس اندرونی تضاد کی کچھ جھلکیاں عبدالحق، امداد امام، مہدی وغیرہ کے بارے میں ان کی تنقیدات میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں پنڈت کیفی کے تنقیدی نظریات کو اگرچہ تفصیل سے پیش کیا گیا ہے لیکن تحقیقی تنقید میں ان کی موجودگی اب بھی واضح نہیں ہوتی۔ کیفی کے ان مضامین کا ذکر ہونا چاہیے تھا جن میں انھوں نے اپنے تحقیقی نتائج کی روشنی میں کسی ادیب یا شاعر کے کلام کو پرکھنے کی کوشش کی ہے اسی طرح محمود شیرانی، حبیب الرحمٰن خان شیروانی، سید مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر حامد حسن قادری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی وغیرہ کے نظریات بھی اگرچہ کہ تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن تحقیقی تنقید کے سلسلے میں ان کی خدمات پوری طرح ابھر کر سامنے نہیں آتیں۔

چھٹے باب کا عنوان مغرب کے اثرات (۱) ہے۔ اس کے بعد کے ساتویں باب کا عنوان بھی یہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کے آگے (۲) کا عدد لکھ دیا گیا ہے۔ یعنی یہ دونوں باب مغرب کے اثرات سے بحث کرتے ہیں۔ اس حصے میں (ص ۲۷۰-۳۲۶) مصنف کا مقصد ان رجحانات کی نشاندہی کرنا ہے جو یورپ کے اثرات کے تحت اردو تنقید میں داخل ہوئے۔ عبادت اس سلسلے میں یہاں صرف فطرت نگاری، تقابلی تنقید اور تاثراتی تنقید سے بحث کرتے ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس باب میں تہذیبی، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا ذکر کرنے کے بعد ان ادبی اور تنقیدی تبدیلیوں کا ذکر بھی کیا جاتا جو مغرب کے زیر اثر ہمارے ہاں نمودار ہوئیں تاکہ قاری پر یہ واضح ہو جاتا کہ مغرب نے ہماری تنقید کو کس طرح متاثر کیا۔ اس تفصیل کو درج کرنے کے بعد ان رجحانات کا ذکر کیا جاتا جو ان اثرات کی وجہ سے اردو تنقید میں داخل ہوئے لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کے زیر اثر ہمارے ہاں ایک طرف تو سائنٹیفک اندازِ تنقید پیدا ہوا، اور الفاظ، عروض و قوافی، اندازِ بیان اور طرزِ ادا سے زیادہ معانی و خیال پر توجہ دی جانے لگی اور دوسری طرف نظریاتی تنقید کے فروغ کی وجہ سے نئے نئے رجحانات داخل ہوئے۔ اس سے زیادہ مغربی اثرات کی نشاندہی عبادت نہیں کرپاتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ واضح ہی نہیں ہو پاتا کہ مغرب کے زیر اثر ہمارے یہاں کس طرح کے تنقیدی رویے پیدا ہوئے جنھوں نے نئے تنقیدی رجحانات کے فروغ کے امکانات پیدا کر دیے۔ اردو تنقید پر مغربی اثرات کی وضاحت کرنے کے بعد مختلف نقادوں کے یہاں ان کے نشانات اگر تلاش کیے جاتے تو اس باب کا حق ادا ہو سکتا تھا لیکن عبادت ایسا تسلی بخش طریقے سے نہیں کرتے اور فوراً ہی اردو کے نقادوں کا تجزیہ کرنا شروع کر دیتے ہیں جب کوئی بات اپنے ہی ذہن میں واضح نہ ہو تو اسے دوسروں کے یہاں کیسے کوئی بیان کر سکتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ —— عبدالقادر، حکمت اور عظمت اللہ خاں کی تنقیدوں میں مغربی اثرات وہ کما حقہ تلاش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

اسی باب میں صفحہ ۲۹۳ - ۹۴ پر تنقید کا ایک نیا رجحان کے عنوان سے بات کی گئی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس عنوان کے تحت انھوں نے جو کچھ درج کیا ہے اس سے یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کس رجحان کی بات کر رہے ہیں۔ اس عنوان کے تحت درج گفتگو کے آخر میں جب وہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا ذکر کرتے ہیں تو یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ شاید وہ تاثریت یا جمالیات کی بات کر رہے ہیں۔

عبدالرحمٰن بجنوری کی تنقید سے بحث کرتے ہوئے وہ اسے بیک وقت تاثراتی اور تقابلی تنقید کا علمبردار قرار دیتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تنقید کے یہ دونوں رجحانات ایک ساتھ دکھائی دے ہی نہیں سکتے۔ تاثراتی تنقید غیر عقلی ہوتی ہے جب کہ تقابلی تنقید کا مآخذ و منبع عقل و ادراک ہے۔ کوئی تنقید بیک وقت عقلی و غیر عقلی کیونکر ہو سکتی ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری کو تاثریت کے تحت رکھنے کی بجائے تقابلی تنقید کے زمرے میں رکھا جانا چاہیے تھا۔ ان کی جن آرا کو تاثراتی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ دراصل تاثراتی نہیں بلکہ بڑے غور و خوض کے بعد قائم کی گئی ہیں۔ ان سے ہمیں اس لیے اختلاف نہیں ہے کہ وہ تاثراتی ہیں بلکہ اس لیے کہ ہماری اپنی آرا ان سے میل نہیں کھاتیں۔

مقالے کی موضوعاتی منصوبہ بندی میں اس قدر جھول ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس کی طرف آج تک کیوں توجہ نہیں دی گئی۔ یا مصنف نے خود اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی۔ ان خامیوں کی ایک مثال تو اسی باب میں موجود ہے کہ جس پر بحث ہو رہی ہے۔ سرور کی مرحوم کے ذکر کے فوراً بعد مصنف ایک نئے عنوان سے کہ جس کی اس باب میں گنجائش ہی نہیں ہے، اصولوں سے متعلق بحث کرنا شروع کر دیتے ہیں اور ایک بار پھر بحث کا دھارا حالی اور آزاد کی طرف مڑ جاتا ہے۔ (۳۰۷ - ۳۰۸)۔ اس کے بعد اچانک نقادوں کی جگہ دو کتابوں پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ ان دو کتابوں کے نام روح تنقید (از محی الدین قادری زور) اور نقد الادب (از حامد اللہ افسر) ہیں۔ ان دونوں کتابوں پر تفصیلی تبصرہ کرنے کے بعد بحث کا رخ ایک بار پھر نقادوں کی طرف مڑ جاتا ہے اور اب ڈاکٹر زور کی عملی تنقید سے بحث کی جاتی ہے (۳۱۹ - ۳۲۲)

اس باب میں صفحہ ۳۲۲ سے ایک نئے عنوان کے تحت تاثراتی و جمالیاتی تنقید پر بحث کا آغاز ہوتا ہے لیکن یہ بات یاد رہے کہ اسی باب کے شروع میں صفحہ ۲۹۳ پر وہ تنقید کا ایک نیا رجحان کے تحت پہلے ہی تاثراتی تنقید پر سرسری نظر ڈال چکے ہیں۔ یہی نہیں اس کے بعد وہ اسی نظریے کے تحت عبدالرحمان بجنوری کی تنقید کا جائزہ بھی لے چکے ہیں۔ چنانچہ اب جو یہ بحث پھر شروع ہوتی ہے تو اس کے عنوان سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تاثراتی اور جمالیاتی تنقید کو ایک ہی قبیل کے رجحانات سمجھتے ہیں۔ جو غلط ہے۔ یہ دونوں رجحانات ایک دوسرے سے قریب تو ضرور ہیں لیکن ایک نہیں ہیں۔ یہی نہیں وہ اظہاریت کو بھی انھیں سے جا ملاتے ہیں۔ جو نہایت ہی گمراہ کن بات ہے مثلاً وہ لان جائی نس، والٹر پیٹر، آسکر وائلڈ اور کروچے کو تاثریت سے وابستہ کرتے ہیں (۳۲۵)

جو صحیح نہیں ہے۔ لن جائی نس، والٹر پیٹر اور آسکر وائلڈ جمالیات کے علمبردار ہیں جبکہ کردیے اظہاریت کا نمائندہ ہے۔

اردو کے تاثراتی نقادوں میں حالیؔ اور شبلیؔ کو شمار کرنا بھی صحیح نہیں (۲۲۶) حالیؔ موضوعاتی اعتبار سے کلاسیکی ہیں جب کہ فنی اعتبار سے رومانی۔ اس سلسلے میں موضوع اور ہیئت سے متعلق مقدمے میں درج ان کے خیالات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ شبلیؔ کے یہاں کلاسیکی رومانی اور ہیئتی تنقید کے عناصر گھلے ملے دکھائی دیتے ہیں (شعرالعجم) مہدی افادی اور امداد امام اثرؔ تاثراتی نہیں جمالیاتی ہیں (مضامین)، وہ کسی بھی طرح تاثراتی نقادوں میں شمار نہیں کیے جاسکتے۔ اسی طرح مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کو بھی تاثراتی نہیں جمالیاتی قرار دینا چاہیئے۔ ان اصحاب کے ان پہلوؤں پر اس قدر لکھا جاچکا ہے کہ مثالیں درج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ۱

اس حصے میں کی گئی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبادتؔ نہ تو جمالیات سے واقف ہیں اور نہ تاثریت اور اظہاریت سے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس حصے سے شروع میں ہی پہلے وہ ان رجحانات کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کرتے اور اس کے بعد ان کی پیروی کرنے والوں پر قلم اٹھاتے۔ اس صورت میں شاید اتنی غلطیاں نہ ہوتیں کہ جتنی ہوئی ہیں۔ مقالے کا یہ حصہ نہایت ہی ناتسلی بخش ہے۔

اس حصے میں جتنے بھی نقادوں کو عبادتؔ تاثراتی قرار دیتے ہیں وہ سب کے سب جمالیاتی ہیں لیکن وہ اس طرح سے جمالیاتی نہیں ہیں کہ جس طرح والٹر پیٹر یا آسکر وائلڈ کو جمالیاتی کہا جاتا ہے۔ عبادتؔ کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ لوگ شاعری کے افادی پہلوؤں سے انکار کرتے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ہمارے یہاں جتنے بھی جمالیاتی نقاد ہیں وہ ادب کی جمالیاتی قدروں کو زیادہ اہمیت دینے کے باوجود ادب کی افادی قدروں کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور اُسے سماج کی اصلاح کا وسیلہ بنانا چاہتے ہیں۔

ساتواں باب بھی مغرب کے اثرات سے متعلق ہے (۲۲۷)۔ اس باب کا آغاز بھی تاثراتی تنقید سے ہوتا ہے اور اگرچہ کہ پچھلے باب کے اختتام پر بھی عبادتؔ تاثراتی تنقید ہی سے یہی بحث کر رہے تھے لیکن فراقؔ اور مجنوںؔ کو وہ نیازؔ کے ساتھ رکھنے کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ پچھلے باب کے تاثراتی نقادوں کی تنقید اخذ و ترجمے پر مبنی تھی جب کہ اس باب میں شامل نقادوں کے یہاں زیادہ گہرائی ہے۔ انھوں نے مغرب کے تصورات کو ہضم کرکے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"ان بدلتے ہوئے حالات نے تنقید کے تاثراتی رجحان کے ردِعمل کے لیے بھی زمین تیار کردی، جو کچھ عرصہ بعد ہوا۔ پہلے اسی تاثراتی رجحان میں تھوڑی سی تبدیلی ہوئی، وہ نیازؔ کی تاثراتی تنقید سے قدرے مختلف ہوگیا۔ اس میں غور و فکر کے عناصر آتے گئے۔ تاثرات کا اظہار تو بہر حال اس وقت بھی ہوا۔ لیکن اس میں قدرے گہرائی پیدا ہوگئی۔ مدح و ستائش، عیب جوئی اور نکتہ چینی کا سلسلہ اب بھی جاری رہا۔ لیکن لایعنی جذباتیت

---

۱ اس پہلو پر تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ بیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی کے ادبی رجحانات۔

اور کھوکھلی رومانیت کا رنگ ذرا مدھم پڑ گیا۔ اب تاثراتی نقاد مدح و ستائش اور تعریف و توصیف کا جواز

بھی پیش کرنے لگے۔ ایسے نقادوں میں فراق اور مجنوں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔" (۲۴۹)۔

میرا خیال ہے عبادت کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ نیاز اور اس کے ساتھیوں کے ہاں جو نتائج ہم کو ملتے ہیں وہ ان کا جواز فراہم نہیں کرتے۔ عبادت نے اسی مقالے میں بہت سے ایسے شواہد پیش کئے ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان حضرات کی ہر رائے پُنی تُلی ہوتی ہے۔ وہ اس کا جواز بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ ہم ان کے جواز کو صحیح تسلیم کریں یا نہ کریں۔

نیاز کے بارے میں عبادت کی یہ رائے بھی صحیح نہیں کہ وہ تنقید کرتے وقت عقل و ادراک سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ نگار کے صفحات سے اس کی بیسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

عبادت کا یہ کہنا صحیح ہے کہ مجنوں بعد میں سائنٹیفک تنقید کی طرف بڑھ گئے جس نے انھیں مارکسیت اور ترقی پسندی کی دہلیز تک پہنچایا۔

اس باب میں آگے چل کر صفحہ ۲۵۷ پر ترقی پسند تحریک کا ذکر کرتے ہوئے اس کے آغاز کے بارے میں پوری تفصیلات درج نہیں کی گئی ہیں جنھیں شامل کیا جانا چاہیے تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ادب پر اس کے اثرات کی وضاحت بھی ضروری تھی۔ لیکن موصوف نے اس طرف توجہ نہیں دی اور صرف یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ اس کی بنیاد مارکس اور اشتراکی نظریات پر استوار ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ سبھی نقادوں کے نام گنوائے جانے چاہیے تھے چاہے تفصیل سے صرف چند ہی کا ذکر کیوں نہ کیا جاتا۔

اصولِ تحقیق کے اعتبار سے بھی اس مقالے میں بہت سی فروگزاشتیں موجود ہیں جن میں سے کچھ کو مختصراً یوں پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مقالے میں مواد کی ترتیب و تنظیم نہایت ہی ناتسلی بخش طریقے سے عمل میں آئی ہے جس کی وجہ سے بے جا تکرار نے راہ پا کر مقالے کی قدر و قیمت کو متاثر کیا ہے۔ یہ بات بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہی جا سکتی ہے کہ اس مقالے کا تقریباً تیس فیصد حصّہ مقالے کی مجموعی صورت کو نقصان پہنچائے بغیر آسانی سے قلم زد کیا جا سکتا ہے۔ بعض ابواب تو غیر ضروری ہیں ہی اُن کی ترتیب بھی صحیح نہیں ہے۔ جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

۲۔ کتاب کے اندر موجود حاشیوں میں دیے گئے اکثر حوالے نامکمل ہیں۔ کہیں بھی اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا ایڈیشن یا سالِ اشاعت کیا ہے۔ اور وہ کہاں سے شائع ہوئی ہے۔ کم سے کم کسی کتاب کے اولین حوالے کے موقعے پر یہ تفصیلات ضرور درج کی جانی چاہیے تھیں۔

۳۔ حوالہ درج کرنے کے طریقے میں بھی ایک اسلوب اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ کہیں تو مصنف کا نام پہلے ہے اور اور کتاب کا بعد میں اور کہیں کتاب کا نام پہلے ہے اور مصنف کا بعد میں۔ کہیں تو صرف کتاب ہی کا نام درج ہے۔ اس طرح کی مثالیں مقالے

میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں، خصوصاً مندرجہ ذیل صفحات دیکھے جا سکتے ہیں:۔ ۱۴۹، ۱۵۲، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۵، ۲۸۱، ۳۵۴، ۳۸۰، ۴۰۲، ۴۱۴، ۴۵۲، ۴۶۱۔

۴۔ کہیں مصنف اور کتاب کا نام تو درج ہے صفحے کا نمبر درج نہیں کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔ ۲۴، ۴۴، ۶۵، ۸۸، ۱۰۱، ۱۴۱، ۱۸۶، ۲۱۸، ۲۲۱، ۲۲۳۔

۵۔ کہیں صفحے کا نمبر حوالے کے درمیان میں ناشر کا ذکر کرنے سے پہلے درج کیا گیا ہے جب کہ اُسے آخر میں ہونا چاہیے ملاحظہ ہو:
۱۶۵، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۲۲، ۲۳۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۹۹، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۶، ۳۰۸، ۳۸۱، ۴۴۲۔

۶۔ کہیں بنیادی مآخذ کے بجائے ضمنی مآخذ کا سہارا لے کر بات کی گئی ہے۔ ۱۶۶۔

۔ کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کتاب کی کس جلد سے مدد لی گئی ہے۔ ۱۸۰

۸۔ کہیں حوالہ ہی درج نہیں کیا ہے۔ صرف حوالے کا نمبر حاشیے میں دے دیا گیا ہے لیکن یہ کمی طباعت کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ۲۹۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۲۱، ۴۲۲۔

۹۔ جب مضامین کے مجموعے میں سے کسی ایک مضمون کا حوالہ دینا مطلوب ہو تو حوالے کی ترتیب یوں ہونی چاہیے۔ مضمون نگار۔ مضمون۔ کتاب۔ ایڈیشن یا سال اشاعت۔ ناشر اور پھر آخر میں صفحہ۔ عبارت اس ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھ پائے۔ ملاحظہ ہو۔ ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۷۔

۱۰۔ ۲۹۶-۹۷ پر درج دونوں حوالوں سے یہ پتا نہیں چلتا کہ ترجمہ کس کا ہے۔

۱۱۔ جب کسی رسالے کا حوالہ دیا ہو تو رسالے کے ساتھ اس کے مقام اشاعت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں مقالے میں جتنے بھی رسائل کے حوالے درج کیے گئے ہیں ان میں سے اکثر کا مقام اشاعت غائب ہے ملاحظہ ہو۔ ۴۲، ۴۲۱، ۴۲۷، ۴۲۸۔

۱۲۔ کتابیات بھی ناقص ہے۔ مصنف اور کتاب کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہوتا حالانکہ اس میں ایڈیشن اور ناشر سے متعلق معلومات بھی درج ہونا چاہیے تھیں۔ پھر سب سے بڑی کمی اس میں یہ ہے کہ کتابوں کو بس لکھ دیا گیا ہے، حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب نہیں دیا گیا۔ انگریزی اور اردو کتب کے علاوہ رسائل کی ترتیب میں بھی یہ کمی حاشیہ تہذیب کے ساتھ کھٹکتی ہے۔

۱۳۔ کچھ مضمون کے نام تو درج ہیں لیکن ان کی کتب درج نہیں ہیں۔ یہ خامی بھی ناشر کے سر تھوپی جا سکتی ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات کے بعد اب یہ کہنا بے جا نہیں آتا کہ اس موضوع پر از سر نو کام کرنے کی ضرورت ہے اور یہ مقالہ موجودہ صورت میں کسی بھی طرح اردو تنقید کے طالب علموں کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔

●●

ڈاکٹر عبادت بریلوی
پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

جواب

میری کتاب "اُردو تنقید کا ارتقا" پر جو تبصرہ آپ نے مجھے بھیجا ہے، وہ مجھے پسند نہیں آیا۔ اس میں نہ تو کوئی تحقیق ہے نہ صحیح تنقید!

میں تبصرہ نگار سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن ان کی تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہیں۔ وہ ہر جملے میں یہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس طرح نہیں، اس طرح لکھنا چاہیے تھا۔ ہر شخص اپنے انداز سے لکھتا ہے، اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ اس کو ہدایات دے۔

پھر وہ بغیر سوچے سمجھے بات کرتے ہیں۔ ایک جگہ تو انھوں نے حد کر دی ہے۔ لکھا ہے کہ "نویں باب میں ۱۹۶۰ء کے بعد اردو تنقید میں ابھرنے والے جدید نظریات سے بحث ہوتی۔ خصوصاً اسلوبیات کے ارتقا پر روشنی ڈالنے کے بعد اردو میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مرزا خلیل بیگ کی خدمات کا جائزہ لیا جاتا۔"

جب یہ کتاب شائع ہوئی تو نارنگ صاحب اور خلیل صاحب اسکول میں پڑھتے ہوں گے۔ یہ کتاب ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان لکھی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں مجھے ڈگری ملی۔ ۱۹۴۸ء میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس کو انجمن ترقی اُردو سے شائع کر دیا۔ بڑے بڑے محققوں، نقادوں اور ادیبوں نے اس کی تعریف کی، اور لکھا کہ یہ اردو تنقید کی پہلی مکمل اور مبسوط تاریخ ہے۔ ان میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق پنڈت کیفی، ڈاکٹر زور، مولانا حامد حسن قادری، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر سید احتشام حسین، علامہ نیاز فتحپوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری وغیرہ شامل تھے۔

اس کتاب کے اب تک آٹھ دس اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اور یہ تقریباً تمام یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے میں اس پر نظرِ ثانی نہ کر سکا۔ ناشر اس کو اسی طرح چھاپتے رہے جس طرح پہلی بار چھپی تھی۔ غالباً یہ ان کی مجبوری اور ضرورت تھی۔ تقریباً نصف صدی سے یہ کتاب چھپ رہی ہے۔ اور فروخت ہو رہی ہے۔ اس حقیقت کو بھی تبصرہ نگار کو سامنے رکھنا چاہیے تھا۔ اس تبصرے میں غیر ذمہ دارانہ بیانات کے سوا اور کچھ نہیں۔ پھر اس کا لہجہ اور انداز ایسا ہے جو ایک محقق اور نقاد کو زیب نہیں دیتا۔ حیران ہوں کہ ریسرچ کانگریس نے اس کو اپنے اجلاس میں پڑھنے کی اجازت کیوں دی۔

●●

ڈاکٹر عبدالحق
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

ڈاکٹر حاتم رام پوری کا تھیسس

تصور بشر اور اقبال کا مرد مومن

یہ مضمون ایک جواں مرگ مخلص دوست کی خوش گوار یاد کو خراج عقیدت سمجھا چاہیے گو اس مضمون میں مرحوم کی خامیوں کو پیش کیا گیا ہے تو صرف علمی دیانت داری کے تقاضوں کے تحت ہے، مگر دل میں جذبۂ احترام بدستور باقی ہے۔ کسی دوست کی یاد کو تازہ رکھنے کا یہ مناسب طریقہ ہے کہ اس کے کارناموں کا ذکر ہوتا رہے اور احتساب کے ساتھ۔

یہ مقالہ ۵۶۸ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۴۰ صفحات مختلف نظام فکر میں موجود تصور بشر کے لیے مخصوص کیا گیا ہے جس کی ضرورت نہ تھی۔ مقالہ اس وجہ سے ضخیم اور گراں بار ہو گیا ہے۔ ہمارے مقالوں کا یہ انداز پیش کش کسی قدر ناپسندیدہ ہے۔ ابتدائی حصے تہذیبی اور سیاسی پس منظر کی طوالت سے بوجھل ہو رہے ہیں۔ اس کتاب میں آٹھ ابواب ہیں جن میں دو ابواب برائے نام ہیں، ساتواں باب محاکمے کے لیے وقف ہے جو کل دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے جب کہ دوسرے ابواب پچاس سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں۔ کتابیات کو بھی ایک باب تصور کیا گیا ہے جو مناسب نہیں ہے۔ میری گفتگو دو ابواب کے مندرجات سے ہی متعلق ہے جو فکر اقبال سے براہ راست وابستہ ہیں۔ مقالہ نگار نے مشرق و مغرب کے مختلف عالمی تہذیبوں میں موجود تصور بشر کا جو تذکرہ کیا ہے، وہ بہت سرسری ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ اس مطالعے کے اہل رہے ہوں، مگر میں معذور رہوں۔ ان تصورات سے اقبال کے فکری نظام، رشتہ و پیوند بہت استوار نہیں ہوتے۔ ضرورت تھی کہ اقبال کے اس تصور کے منبع و مآخذ کی نشاندہی کی جاتی تاکہ ایک نئی تحقیق اور نئی بازیافت سے علمی اضافے کی صورت پیدا ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ مرحوم نے بڑی محنت کا ثبوت دیا ہے جب کہ وہ ایک مہلک علالت سے دوچار تھے تحقیقی مقالوں کی ترتیب میں یہ جد و جہد کم دیکھنے میں آئی ہے۔ قدیم یونان سے قدیم ہندوستان اور مسلم دانشوروں کے نقطہ ہائے نظر کا ذکر کیا گیا ہے۔ غالباً اسی پس منظر میں انھوں نے اقبال کے تصورات کو پیرو جکٹ کرنا چاہا ہے۔ ابتدائی تین ابواب میں جو مباحث آئے ہیں، چھٹے باب میں اقبال سے ان کا تقابل کر کے ان

تصورات کا اعادہ کیا گیا ہے۔ یہ تکرار گراں گزرتی ہے۔ اس باب کی موجودگی میں ابتدائی تینوں ابواب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر نگراں استاد نے اپنی پوری توجہ صرف کی ہوتی تو یہ مقالہ بہت بہتر صورت اختیار کرتا۔ مقالہ ترتیب دیتے وقت طلبا کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے مطالعے کے ماحصل کو تمام وکمال شامل کریں۔ مگر اساتذہ کو اس کی توفیق ہونی چاہئے کہ وہ ایک ایک لفظ پر نظر رکھیں اور زوائد سے روکیں۔ ہمارے مزاج میں بسیار گفتاری عام ہے جو مقالوں میں بھی نمایاں ہے۔ اس کی بڑی ضرورت تھی کہ وہ مردِ کامل کے تصورات کا ارتقائی تجزیہ کرتے۔ "بانگ درا" سے "جاوید نامہ" تک کا سفر بہت ہی دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ ان کی ابتدائی نظموں کی عظمت آدم سے یہ خیال شروع ہوتا ہے۔ ذہنی سفر کے ساتھ یہ بھی بتدریج ارتقائی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس تجزیہ میں بعض متعلقات کا ذکر بڑی صراحت سے کیا گیا ہے جو غیر ضروری ہیں۔ ہاں یہ مباحث ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ مگر ان کا ذکر اشاروں میں اختصار کے ساتھ زیادہ بہتر تھا۔ جیسے وطنیت، عورت، جمہوریت کے مفاسد، ارض ملک خداست، خرد، آدم، ابلیس جیسے ذیلی عنوانات کے تحت غیر ضروری صراحت اچھی نہیں لگتی۔ نیابت الٰہی کے عنوان سے دو بار تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ تاریبا تکرار مقالے کی افادیت میں حائل ہے۔ خیال ومباحث کا ہی نہیں حوالوں کا تکرار اور بھی کھٹکتا ہے۔ اگر یہ زائد حصے حذف کر دیے جاتے تو مقالے میں جامعیت پیدا ہو سکتی تھی۔ کچھ اشعار کے حوالوں کی تکرار ملاحظہ ہو۔ مولانا رومی کے یہ اشعار:

دی شیخ، با چراغ ہمی گشت گردِ شہر (ص ۲۹۹، ۵۳۵)

مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست (ص ۴۲ - ۴۲۸)

نہ تو زمیں کے لیئے ہے نہ آسماں کیلئے (ص ۲۷۹، ۴۰۵)

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب الخ . . . (ص ۲۸۹ - ۴۲۹، ۵۲۴)

خیابانوں سے ہے پرہیز لازم ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ (ص ۴)

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے (ص ۴۲۹)

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے (ص ۳۸۳، ۴۲۱، ۴۴)

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے (ص ۴۴۳، ۵۳۶)

اقبالیات سے متعلق تشریحی ادب میں یہ تکرار عام ہے جس سے قاری کی طبیعت پر انقباض پیدا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں تنقید اور حوالوں کا ربط قایم نہیں رہتا۔ نثری عبارت میں مسائل کچھ اور ہیں اور حوالے کے اشعار غیر متعلق ہیں۔ اس مقالے کی ایک بڑی کمزوری اشعار کا کثرت استعمال ہے جو مربوط گفتگو میں حارج ہوتی ہے۔ صفحہ ۴۱۷ ساقی نامے کے اشعار سے بھرا ہے۔ اسی طرح ص ۳۸۲، ۳۸۷، ۴۲۹، ۴۴۰، ۴۴۱ وغیرہ۔ ان حوالوں میں اردو فارسی اشعار دونوں شامل ہیں، مگر ایک جگہ بھی حوالہ نہیں ملتا،

شاید اسے غیر مناسب سمجھا گیا۔ حالاں کہ اقبال کے ضخیم کلام سے حوالہ بہت ضروری ہے۔ متن یا حاشیہ یا تعلیقات میں کہیں نہ کہیں نظموں یا مجموعۂ کلام کا حوالہ دیا جانا تحقیق آداب میں شامل ہے۔ ان سے قطع نظر کتابوں کے حوالے میں بڑی بے احتیاطی برتی گئی ہے۔ کتاب کا نام ہے تو مصنف کا نام غائب ہے۔ کتاب کا حوالہ کسی صفحہ پر ہے تو دوسرے صفحات پر صرف ایضاً سے کام لیا گیا ہے۔ کتابیات کی تیاری میں اکثر اصولوں کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ سنہ اشاعت کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور نہ مقام اشاعت کا ہی حوالہ ہے۔ کئی کتابوں کے نام بغیر مصنف کے لکھے گئے ہیں۔ ایک جگہ صفحہ ۲۸۵ کے حاشیہ پر تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' ترجمہ حسن الدین کا حوالہ ملتا ہے' جب کہ کتابیات میں اقبال کے نام سے اندراج ہے حالاں کہ اس کتاب کے مترجم سید نذیر نیازی ہیں۔

ان حوالوں میں اکثر ضمنی اور ذیلی مآخذ سے کام لیا گیا ہے ان کے اسناد پر غور نہیں کیا گیا ہے۔ دیباچہ اسرار خودی کا حوالہ کئی بار آیا ہے، مگر وہ مضامینِ اقبال کی بجائے یوسف سلیم چشتی کی شرح اسرار خودی " سے ماخوذ ہے، چشتی مرحوم کی حیثیت اقبال کے شارح کی ہے اور بہت معتبر بھی نہیں' وہ نہ تو ناقد اقبال ہیں اور نہ اقبالیات کے اکابرین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح قاضی عدیل عباسی مرحوم کی کتاب کا بھی بار بار حوالہ ملتا ہے۔ ان دو اہم ابواب کی ترتیب میں نقد اقبال سے متعلق کل گیارہ کتابوں کے حوالے ملتے ہیں جن میں صرف پانچ کتابیں ہی حوالے کے لائق ہیں: روح اقبال' اقبال کی تشکیل' شعر اقبال' رومی نطشے اور اقبال' فلسفہ اقبال۔ حوالوں کی یہ بے مائیگی افسوس ناک ہے جب کہ اقبالیات سے متعلق کتابیات کا اتنا وقیع ذخیرہ موجود ہے کہ اردو فارسی کے کسی شاعر پر اتنی توجہ نہیں دی گئی۔ ان کوتاہیوں کی ذمہ داری طلبا سے کہیں زیادہ ان اساتذہ کی ہے جن کے دیرینہ مشاہدات اور تبحر علمی سے توقع کی جاتی ہے کہ تحقیق کے مبادیات سے طلبا کو روشناس کرائیں گے۔

ڈاکٹر معاتم رامپوری مرحوم نے مردِ مومن کے تجزیہ میں اقبال کے اردو اور فارسی اشعار سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے اور بیشتر مباحث سامنے لائے گئے ہیں۔ اس تصور کا سب سے اہم اور فکر انگیز بلکہ کلیدی نکتہ نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس طرف انھوں نے توجہ کیوں نہیں دی جب کہ "جاوید نامہ" کا حوالہ بار بار دیا گیا ہے۔ اقبال کا یہ تصور وسیع تر مفاہیم رکھتا ہے۔ انسان کامل بلند قدروں کا محافظ ہے اور مجموعۂ خیر کثیر بھی ہے۔ اس فکری تصور کی تجسیم تراشی میں ممکنات کی ایک دنیا آباد ہے۔ یہ انسان صرف ایک مسلک ایک تہذیب سے وابستہ نہیں' بلکہ ہر معاشرے میں اس کا وجود ناگزیر ہے تاکہ انفرادی اور اجتماعی خودی سے بھرپور معاشرے کا نظم و نسق اس مرد کامل کی تدبیر و فراست کا مرہون منت ہو سکے اور یہی انسان مختلف عقائد کے انسانوں کی سربراہی کا سزاوار ہوگا۔

اقبال نے "جاوید نامہ" میں "آں سوئے افلاک" پر شاہ ہمدان کی زبان سے اپنے فکری تصورات کی توثیق کی ہے۔ زندہ رود کا سوال ملاحظہ ہو :

مرشد معنیٰ نگاہاں بودۂ — محرم اسرار شاہاں بودۂ
ما فقیر و حکمراں خواہد خراج — چیست اصل اعتبار تخت و تاج

شاہ ھمدان

فاش گویم با تو اے والا مقام — باج را جز با دو کس دادن حرام
یا اولی الامرے کہ منکم شان اوست — آیۂ حق حجت و برہان اوست
یا جواں مردے چو صرصر تند خیز — شہر گیر و خویش باز اندر ستیز
روز کیں کشور کشا از قاہری — روز صلح از شیوہ ہائے دلبری

ان صفات کا حامل صرف مسلمان ہی نہیں ہو سکتا۔ اس بنیادی نکتے کو ذہن میں رکھے تو مرحوم کی پوری تحقیق بازیافت ادھوری رہتی ہے۔ اس اساسی پہلو کو نظر انداز کرنے کا سبب سمجھ میں نہیں آتا اور نہ اس کا کوئی جواز ہے۔

نئی تعبیر کی جستجو میں تخلیقی متن سے گریز تحقیق کی نارسائی ہے۔ اس چشم پوشی سے نہ تو فکر کی صحیح تشریح ممکن ہے اور نہ تحقیق تعبیر کی باز آفرینی ہو سکتی ہے۔ کہیں یہی نارسائی ہمارے تحقیقی مقالوں کی روایت نہ بن جائے۔

●●●

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن
اسسٹنٹ لائبریرین
خدابخش لائبریری، پٹنہ

ڈاکٹر ظفر اوگانوی کا تھیسس

غالب کا عظیم المرتبت شاگرد - صفیر بلگرامی

ڈاکٹر ظفر اگانوی کی کتاب " غالب کا عظیم المرتبت شاگرد۔ صفیر بلگرامی" اس وقت میرے پیش نظر ہے جو ۱۹۷۶ء میں چھپی اور جس پر پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۶۷ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی تھی۔

صفیر بلگرامی پر ضرورت تھی کہ کوئی جامع کتاب لکھی جاتی جس میں تمام متعلقہ مواد سے استفادہ کرکے ان کی شاعرانہ، ناقدانہ اور فنکارانہ عظمت ظاہر کی جاتی۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے اس اہم کام کی طرف توجہ کی اور پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر اور کتابی صورت میں چھپوا کر ایک اہم علمی خدمت انجام دی ہے۔

یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے جن کی تفصیلات اس طرح ہیں -

عہد صفیر، حیات صفیر، تصانیف، ادبی تنازع، جلوۂ خضر ایک جائزہ، صفیر کا تحقیقی شعور، صفیر بحیثیت طنز کار، صفیر بحیثیت شاعر، صفیر بحیثیت ناقد۔ اخیر میں کتابیات ملتی ہے -

یہ کتاب محنت، سلیقہ اور تحقیق سے لکھی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ صفیر بلگرامی کا جو علمی وادبی مقام ہے اسے پورے طور پر واضح کرکے دکھایا جائے۔ پروفیسر احتشام حسین اور سید نجیب اشرف ندوی نے اس کی خاصی تعریف کی ہے -

۱۔ غزلیات صفیر جو صفیر بلبل کے نام سے مشہور ہے اس کے ایک قلمی نسخہ کے بارے میں ڈاکٹر ظفر اگانوی لکھتے ہیں!

"صفیر بلبل کا ایک قلمی نسخہ بھی خدابخش لائبریری میں موجود ہے یہ نسخہ صفیر کا خود نوشتہ ہے انہوں نے بہ ایمائے مولوی محمد بخش والد خدابخش خاں بانی کتب خانہ ۱۲۸۱ھ میں مرتب کیا تھا اس میں ۹۰ صفحے ہیں اور نسخہ مکمل ہے ... چونکہ صفیر بلبل کی اشاعت قلمی نسخے پر درج شدہ تاریخ سے ایک سال کے بعد ہوئی اس لئے مطبوعہ نسخہ میں اضافے ہونا ایک فطری امر تھا۔ قلمی نسخے میں

اشعار کی تعداد مقابلتہً کم ہے اور مخمس برغزل سحر اور خبر رباعیات و پہیلیاں بھی اس میں موجود نہیں ہیں۔ طباعت کے وقت یہ صنفیں بڑھا دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ قلمی اور مطبوعہ نسخے میں مابہ الفرق کوئی خاص بات نہیں ہے۔" (ص ۱۲۱، ۱۲۳)

خدا بخش لائبریری کے قلمی نسخے کی کتابت ۱۲۷۰ھ میں نہیں ہوئی بلکہ ۱۲۷۹ھ میں ہوئی جیسا کہ خاتمہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

۲ قلمی نسخہ کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ وہ ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے، یہ صحیح نہیں۔ صفیر بلبل کا نسخہ ورق اب سے شروع ہو کر ورق ۱۲ الف پر ختم ہو گیا ہے پھر ورق ۱۲ ب سے خمسہ کے اشعار شروع ہو گئے ہیں لیکن اس کے متعلقہ اشعار صرف ورق ۴۰ الف پر پائے جاتے ہیں۔ غالباً اس آخری ورق ۴۰ کو دیکھ کر ڈاکٹر ظفر اگانوی کو دھوکہ ہوا ہے کہ صفیر بلبل ۴۰ ورق تک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۲۲ الف سے غزلیات حشمت کا نسخہ شروع ہو گیا ہے اور ورق ۳۹ ب پر ختم ہوا ہے۔ دونوں نسخوں کے کاتب الگ الگ ہیں اور شان کتابت بھی ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہے جلدی میں دونوں کو ایک نسخہ سمجھ لیا گیا۔

۳ قلمی نسخہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اشعار کی کمی کے علاوہ مابہ الفرق کوئی خاص بات نہیں ہے اس قلمی نسخہ کے بارے میں یہ رائے صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس میں خاصی تعداد میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو خود مطبوعہ نسخہ میں نہیں پائے جاتے اور قلمی نسخہ کی یہ ایسی خوبی ہے جس سے نہ صرف قلمی اور مطبوعہ کے درمیان بنیادی طور پر فرق ظاہر ہو جاتا ہے بلکہ قلمی نسخہ کی افادیت، اہمیت اور قدر و قیمت کافی حد تک بڑھ جاتی ہے اس اجمال کی تفصیل اس طور پر ہے کہ :-

۱ قلمی نسخہ میں کچھ غزلیں ایسی ملتی ہیں جو مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملتیں - یہاں صرف ایک غزل پیش کی جاتی ہے ردیف میم کے تحت مطبوعہ نسخہ میں ۴ غزلیں ہیں جو کل ۱۹ اشعار پر مشتمل ہیں لیکن اس کے برخلاف قلمی نسخہ میں صرف ایک غزل ہے جو ۹ اشعار پر مبنی ہے مگر یہ ایسی غزل ہے جو مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملتی غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں

مشک افشاں شش جہت میں ہے ہوائے بلگرام | کوچہ کاکل مگر ہے کوچہائے بلگرام
خلد کی جانب جو جاتی ہے ہوائے بلگرام | کہتا ہے رضوان بھی جنت ہے فدائے بلگرام

۲ مطبوعہ نسخہ کے آخر میں مخمس اشعار موجود ہیں اور وہ خمسہ برغزل خواجہ وزیر، خمسہ برغزل سحر،

خمسہ برغزل قدؔر بلگرامی اور خمسہ برغزل سید محمد مہدی تبرؔ بلگرامی ہیں اس کے برخلاف قلمی نسخہ میں اگرچہ صرف ایک خمسہ درج ہے جو خمسہ برغزل وزیؔر ہے لیکن یہ ایسا خمسہ ہے جس کے اشعار مطبوعہ نسخہ میں موجود نہیں ہیں۔

نہ ہو بر بادِ شبدیز ہوس سے ہم عناں ہوکر — نہ سر آتنا ادھٹا ہم پائے گرد کارواں ہوکر الخ

۳ کچھ غزلیں ایسی ہیں جن کے بعض اشعار تو قلمی اور مطبوعہ دونوں نسخوں میں پائے جاتے ہیں لیکن بعض اشعار ایسے ہیں جو قلمی نسخہ میں تو موجود ہیں لیکن مطبوعہ نسخہ میں نہیں پائے جاتے مثلاً۔

ردیف 'ی' کے تحت جو ایک غزل ملتی ہے جو ۱۶ اشعار پر مشتمل ہے یہ غزل قلمی نسخہ میں بھی ملتی ہے، لیکن اس میں مندرجہ ذیل تین اشعار ایسے ہیں جو مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملتے، وہ اشعار یہ ہیں۔

خط رُخ پر دل آویزی غضب ہے تیرے کاکل کی — خطِ گلزار کے ہے گرد جدول خطِ سنبل کی

ترے رُخ کے تصور میں گلوں کا ذکر کرتی ہے — یہ اڑتی سی خبر ہے کوچۂ منقار بلبل کی

ترے خالِ ذقن پر صاف جادوگر کا شبہ ہے — ذقن پر تیرے پھبتی ہو رہی ہے چاہ بابل کی

●●

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن
اسسٹنٹ لائبریرین
خدابخش لائبریری، پٹنہ

ڈاکٹر سیّد ظہیر احسن کا تھیسس

میر شیر علی افسوس۔ حیات اور کارنامے

ڈاکٹر سیّد ظہیر احسن صدر شعبۂ اردو ٹی پی ایس کالج نے "میر شیر علی افسوس۔ حیات و کارنامے" کے عنوان سے ۱۹۶۵ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کا کام مکمل کیا۔

یہ مقالہ اتنی ذمہ داری کے ساتھ لکھا گیا تھا کہ بقول مقالہ نگار پروفیسر کلیم الدین احمد نے سارا مسودہ شروع سے آخر تک دیکھا۔ جانچ اور پرکھ کے بعد اپنی تشفی کر کے پٹنہ یونیورسٹی میں داخل کرنے کی ہدایت کی پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جانے کے بعد اس مقالے کی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر ظہیر احسن نے اردو اکیڈمی بہار کے مالی تعاون سے ۱۹۸۴ء میں اس کو چھپوا دیا جو ۳۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر سیّد ظہیر احسن نے نہایت محنت و کاوش کے بعد میر شیر علی افسوس کے حالات و واقعات اس کتاب میں جمع کر دئے ہیں اور ان کے عہد، معاصرین، شاعری اور زبان پر زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کر دینے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن ایسی خامیاں اس کتاب میں نظر آتی ہیں کہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ پروفیسر کلیم الدین احمد جیسی عظیم علمی و ادبی شخصیت نے شروع سے آخر تک اس مقالہ کو دیکھا اور پڑھا ہو صرف چند خامیوں کی نشاندہی کر دینے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

● اس کتاب کی ایک اہم قابل ذکر بات وہ انتساب ہے جو ہر باب اور ہر فصل کے لئے الگ الگ قائم کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں کل سات ابواب اور بارہ فصلیں ہیں تعجب نہ کیجیے اس بات پر کہ ہر باب اور ہر فصل کو کسی نہ کسی شخص کے نام منسوب کیا گیا ہے۔ یہ انتساب ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی، قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد اور علام رُد کے نام تو ہے ہی اس کے علاوہ اپنی ماں، اپنے باپ اسکے علاوہ بیٹے، بیٹیاں، بہنیں، بھائی سب کے نام کسی نہ کسی باب یا فصل کو منسوب کیا گیا ہے۔ اتنا ہی توجہ طلب ہے ان کا ابتدائیہ جہاں "بے نام و بے ارادہ" لکھا نظر آتا ہے یہ بسم اللہ کی جگہ ہے تو بھی اور اسی تحقیق کیلئے تو بھی ان کے انتسابات سے کم دلچسپ نہیں۔ کتاب کی فہرست مضامین

تو تحریر کی گئی ہے لیکن کسی بھی مضمون کا کوئی صفحہ نمبر نہیں دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ایک قاری کو اپنے مطلوبہ مضمون تک پہنچنے میں کافی دشواری ہوتی ہے۔ عنوانات غیر واضح اور مبہم ہیں۔ فصل ۴ کے تحت لکھتے ہیں تاریخیں، فصل ۵ کے تحت لکھتے ہیں فہرستیں، فصل ۶ کے تحت لکھتے ہیں بیاضیں۔ کیا آپ نے سمجھا کہ ان عنوانات سے کیا مراد ہے۔

دراصل تاریخیں سے مراد وہ تاریخی کتابیں ہیں جن میں میر شیر علی افسوس کے حالات ملتے ہیں۔ اسی طرح فہرستوں اور بیاضوں سے مراد وہ فہرستیں اور بیاضیں ہیں جن میں میر شیر علی افسوس کے حالات تحریر کئے گئے ہیں۔

● زبان و بیان کی خامیاں اور غلطیاں خاصی نظر آتی ہیں۔ بعض مقامات کے سلسلے میں یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ کاتب سے غلطی ہو گئی ہے لیکن اس کے علاوہ بہت سے ایسے الفاظ، جملے اور عبارتیں ہیں جن کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی اور نہ اس کا الزام کاتب کے سر ڈالا جاسکتا ہے یہاں صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

مصنف نے ص ۲۹۱ پر میر شیر علی افسوس کے ان الفاظ سے گفتگو کی ہے جنھیں افسوس نے مذکر یا مؤنث استعمال کیا ہے اور ان کی جنسیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس صفحہ پر جنس کا ایک عنوان دے کر بارہ سطروں میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ ——————— پھر اس کے بعد لکھتے ہیں" ذیل میں افسوس کے الفاظ بہ لحاظ حروف تہجی مع شمار مصرع ان کی جنس کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں" لیکن اس ذیل میں جن الفاظ کی فہرست دی گئی ہے ان میں کسی کی کوئی جنس ظاہر نہیں ہوتی کیوں کہ صرف الفاظ سے ان کی جنس معلوم نہیں ہو سکتی جب تک ان کا استعمال نہ دکھایا جائے۔ اور ان کا استعمال نہیں دکھایا گیا ہے۔ جس سے یہ پوری فہرست جو چار صفحات پر مشتمل ہے بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔

● ایک فصل ان مقامات کے لئے قائم کی گئی ہے جن سے میر شیر علی افسوس اور ان کے خاندان کا تعلق تھا۔ یہ مقامات دہلی، الہ آباد، بنارس، لکھنؤ، حیدر آباد، فرخ آباد، فیض آباد، عظیم آباد، مرشد آباد، نارنول اور کلکتہ ہیں، جو اس کتاب کے ڈیڑھ سطریں بیان کر دیے گئے ہیں لیکن ان مقامات کے بیان سے قبل ڈیڑھ صفحات میں صرف مغل حکومت کی تاریخ دہرائی گئی ہے۔ ان مقامات کی اجمالی تاریخ بیان کر کے افسوس اور ان کے خاندان کے تعلقات دکھا دئے جاتے تو اس فصل کی وجہ سمجھ میں آسکتی لیکن ایسا نہ کر کے صرف مغل حکومت کی تاریخ پیش کر دی گئی ہے۔

● خدا بخش لائبریری کے دیوان افسوس قلمی کے خاتمہ پر ایک شعر درج ہے جو بطور معمہ کے ہے اور

اس سے واجد برآمد ہوتا ہے۔ اس سے ڈاکٹر سید ظہیر احسن نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ وہی واجد ہے جو افسوس کا معاصر تھا اور اس نے اس دیوان کی کتابت کی ہے۔ اس بنا پر یہ قدیم ترین نسخہ کہا جائیگا۔ یہ بات خود مصنّف کی زبان میں سنیے' فرماتے ہیں۔

"دیوان افسوس کے خاتمہ پر یہ شعر درج ہے جس سے واجد برآمد ہوتا ہے ؎

اول شش شش دو ئمش یک سوئمش سہ چار چار ہمدر ایں اسم نحیف است ہر کہ باشد ہوشیار

جس سے قیاس ہوتا ہے کہ اس کی کتابت انہوں نے کی ہوگی۔ مگر افسوس سے براہ راست تعلّقات کا پتہ نہیں چلتا (ص ۱۸۲)

خدا بخش لائبریری کا نسخہ جب میں نے دیکھا اور اشعار دیوان اور خاتمہ کے شعر سے مقابلہ کیا تو دونوں میں آسمان و زمین کا فرق نظر آیا۔ یہ شعر خط شکستہ میں لکھا گیا ہے جبکہ دیوان کے اشعار صاف نستعلیق میں تحریر کیے گئے ہیں دونوں کا الگ الگ انداز تحریر ہے۔ پھر کس بنیاد پر کہیں کہ اس دیوان کی کتابت واجد نے کی ہوگی۔ یہ متعین کرنا اور بھی مشکل ہے کہ یہ واجد وہی شخص ہیں جو افسوس کے معاصر تھے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اگر اس شعر سے واجد برآمد ہوتا ہے تو یہ کس طرح متعین کیا جا سکتا ہے کہ خود اسی واجد نے یہ شعر اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی دوسرے شخص نے یہ شعر اپنے ہاتھ سے نقل کر دیا ہو۔

••

ڈاکٹر سید ظہیر احسن
شعبۂ اردو، ٹی پی ایس کالج، دربھنگہ

جواب

فاضل مقالہ نگار (ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن) نے بات اس طرح شروع کی ہے :

"ڈاکٹر سید ظہیر احسن..... نے میر شیر علی افسوس ــــ حیات اور کارنامے کے عنوان سے .... کام مکمل کیا" یہ بیان غلط اور گمراہ کن ہے۔ تھیسس کا عنوان۔

۱۔ "میر شیر علی افسوس ــــ (عہد، حیات، معاصرین، تصانیف، شاعری اور زبان" ہے۔

۲۔ پھر "صرف چند خامیوں کی نشاندہی کر دینے پر اکتفا" کرنے کی بات کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ:

"اس کتاب کی ایک اہم اور قابل ذکر بات وہ انتساب ہے جو ہر باب اور ہر فصل کے لیے الگ الگ قائم کیا گیا ہے . . . . ہر باب اور ہر فصل کو کسی نہ کسی شخص کے نام منسوب کیا گیا ہے .....اپنی ماں۔ اپنے باپ ــ اس کے علاوہ بیٹے، بیٹیاں، بہنیں، بھائی سب کے نام کسی نہ کسی باب یا فصل کو منسوب کیا گیا ہے۔

(الف) نہ میرے کوئی بیٹا ہے اور نہ ہی کوئی باب یا فصل بیٹے کے نام منسوب ہے۔

(ب) فاضل مقالہ نگار کو معلوم ہوگا کہ "بہنیں" جمع ہے "بہن" کی۔ یہ بتایا جاتا کہ کتنی بہنیں ہیں۔ اور کس کس کے نام انتساب کیا گیا ہے۔ پھر میں نے تو اسے طرز نو کی بنا سمجھا تھا۔ یہ میری اپنی جدت تھی۔ اور یہ بھی کہ ان لوگوں کے نام انتساب کوئی اخلاقی جرم یا ادبی پستی یا گناہ بھی تو نہیں تحقیقی کارنامہ LIFE WORK ہوتا ہے۔ زندگی کی سب سے اہم پیش کش۔ برسوں فلک کی گردش کے بعد تحقیق کا سویرا لہراتا ہے، سورج ابھرتا ہے۔ انسان حقوق اور فرائض کی وادیوں ہی میں تو جیتا ہے تحقیق کوئی فسانہ یا مصرعہ طرح نہیں کہ جام صبح اور صراحی شب سے ڈھلتے چلے جائیں۔ تیشہ زنی ہے، انگاروں پر چلنا، سوز دروں زندگی۔ اس کامیابی کے حق دار اپنے بھی ہیں، پرائے بھی۔ یہ کام روز نہیں ہوتا میں نے یہ انتسابات پیش کر کے نئی راہ نکالی۔ روشنی بھی دی ہے اور اخلاقی فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ میں شرمندہ نہیں۔ خوش ہوں۔

(ج) پھر کہا جاتا ہے کہ :

"ابتدائیہ جہاں بے نام و بے ارادہ لکھا نظر آتا ہے۔ یہ بسم اللہ کی جگہ ہے۔"

مجھے کہنا ہے کہ یہ کوئی تفہیم یا تفسیر تو نہیں۔ میں نے جان بوجھ کر ابتدائیہ کو "بے نام و بے ارادہ" کی سرخی عطا کی تھی کہ یہ نیا انداز نظر ہے، طرز نو۔ اس سے ادبی بلندی اور شاعرانہ وقار کی جھلک ملتی ہے۔ مجھے واقعی افسوس ہے کہ اس کی عظمت اور ادبیت کا احساس نہیں کیا جا سکا۔ اسے APPRECIATE کرنے کی بجائے غلطی پر محمول کر لیا گیا۔

۳۔ کہا جاتا ہے کہ:

"کتاب کی فہرست مضامین تو تحریر کی گئی ہے۔ لیکن کسی مضمون کا کوئی صفحہ نمبر نہیں دیا گیا ہے۔"

واقعی یہ تو بڑی حماقت اور MAJOR بھول ہوئی ہے شاید؟

۴۔ عنوانات "غیر واضح اور مبہم" بتائے جاتے ہیں۔ مثلاً

"فصل ۴ کے تحت لکھتے ہیں تاریخیں۔ فصل ۵ کے تحت لکھتے ہیں فہرستیں۔

فصل ۶ کے تحت لکھتے ہیں بیاضیں..... ان عنوانات سے کیا مراد ہے۔ واضح نہیں ہوتا" کیسا عجیب سا مطالبہ ہے کہ "ترتیب و توازن" میں تفصیلات کی تلاش کی جاتی ہے۔ یہاں تو صرف نام ہی دیے جا سکتے تھے۔ تفصیلات کی جگہ تو الگ متعین ہے۔

۵۔ اعتراض کیا گیا ہے کہ:

"صفحہ ۲۹۱ پر میر شیر علی افسوس کے ان الفاظ سے گفتگو کی گئی ہے جنھیں افسوس نے مذکر یا مونث استعمال کیا ہے اور ان کی جنسیت کا پتا چلتا ہے.... لیکن اس ذیل میں جن الفاظ کی فہرست دی گئی ہے ان میں کسی کی کوئی جنس ظاہر نہیں ہوتی۔" اس سلسلہ میں یہ کہنا ہے کہ میں نے صرف الفاظ پیش کیے ہیں اور یہ بات بتا دی ہے کہ "الفاظ بہ لحاظ حروف تہجی مع شمار مصرعہ"۔ استعمال الفاظ اور جنس کے لیے کلیات افسوس کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اسی خیال سے شمار مصرعہ تحریر کیا گیا ہے۔ ورنہ اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مقالہ کو غیر ضروری طور پر طویل اور ضخیم بنانا میرا مقصود نہ تھا۔

۶۔ کہا گیا ہے کہ:

"ایک فصل ان مقامات کے لیے قائم کی گئی ہے جن سے میر شیر علی افسوس اور ان کے خاندان کا تعلق تھا..... جو اس کتاب میں ڈیڑھ سطر میں بیان کر دیے گیے ہیں۔ لیکن ان مقامات کے بیان سے قبل ڈیڑھ صفحات میں صرف مغل حکومت

کی تاریخ دہرائی گئی ہے۔" فاضل مقالہ نگار کا مطالبہ ہے کہ "ان مقامات کی "اجمالی تاریخ" بیان کر کے افسوس اور ان کے خاندان کے تعلقات دکھائے جاتے۔" صرف "اجمالی تاریخ" ہی کیوں؟ جغرافیائی، سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی وغیرہ کیوں نہیں؟

حالانکہ اس فصل ۴ (مقامات) میں یہ بات بتا دی گئی ہے کہ "افسوس اور ان کے خاندان کے بزرگوں کو سیاسی اور معاشی اسباب کی بنا پر مختلف شہر و مقامات سے گزرنا پڑا ہے۔ کہیں کچھ دیر کے لیے سکونت پذیر ہوئے اور کہیں سے صرف گزر گئے۔ کبھی ملازمت اور سرکاری ذمہ داریوں کے سبب اور کبھی کسی اور سبب سے۔ تمام شہر و مقامات کا جغرافیہ اور سیاسی اور سماجی پس منظر پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ یہ طوالت کا سبب ہوگا۔ صرف ان شہروں اور مقامات کے نام تحریر کر دیے جاتے ہیں جن سے افسوس یا ان کے خاندان کا قافلہ گزرا ہے یا سکونت پذیر ہوا ہے۔" پھر یہ کہنا کہ "صرف مغل حکومت کی تاریخ دہرائی گئی ہے .... پیش کر دی گئی ہے۔" ایمانداری کے خلاف بھی ہے اور گمراہ کن بھی۔ البتہ اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

۷۔ فاضل مقالہ نگار نے ایک اور الزام یہ بھی عاید کیا ہے کہ:

"خدا بخش لائبریری میں دیوان افسوس کے قلمی نسخہ کے خاتمہ پر ایک شعر درج ہے جو بطور معمہ کے ہے۔ اور اس سے واجد برآمد ہوتا ہے۔ اس سے ڈاکٹر ظہیر احسن نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ وہی واجد ہے جو افسوس کا معاصر تھا اور اس نے اس دیوان کی کتابت کی ہے۔ اس بنا پر یہ قدیم ترین نسخہ کہا جائے گا۔" پھر اور آگے چل کر کہتے ہیں کہ:

"یہ بات خود مصنف کی زبان میں سنیے ـــــ جس سے قیاس ہوتا ہے کہ اس کی کتابت انھوں نے کی ہوگی۔ مگر افسوس سے براہ راست تعلقات کا پتا نہیں چلتا (ص ۱۸۲)"۔ یہ ہے بت گری اور بت شکنی۔ کہاں "ثابت کرنے کی کوشش" کی گئی ـــ مزید میں نے اپنی تھیسس کے صفحہ ۲۹۹ پر اس امر کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے "فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ اردو میں واجد یکے از منشی تھے۔ ممکن ہے اس دیوان کے کاتب وہی ہوں۔ اگر یہ درست ہے تو پھر یہی نسخہ سب سے قدیم ترین اور افسوس کے عہد کا ہوگا۔ کوئی تاریخ آغاز یا اختتام درج نہیں ہے۔ کیا اس "قیاس" اور "ممکن" کے بعد بھی "ثابت کرنے کی کوشش" کی بات ذہن میں گردش کرتی ہے؟

●●

ڈاکٹر عطا خورشید
خدا بخش لائبریری، پٹنہ ۴

ڈاکٹر محمد طیّب ابدالی کا تھیسس

حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے

"حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے" محمد طیب ابدالی لکچرر شعبہ اردو (موجودہ صدر شعبۂ اردو، پوسٹ گریجویٹ، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا) کے پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے جو اختر اورینوی صاحب کی نگرانی میں اپریل ۱۹۶۷ء میں "حضرت صوفی منیری ——— حیات اور نثری کارنامے" کے عنوان سے پٹنہ یونیورسٹی میں جمع کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۷۷ء میں اس کی اشاعت ہوئی۔ مطبوعہ صورت میں یہ ۲۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

○ "مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی نے بھی شہزادہ مغلیہ کی تعلیم و تربیت میں بڑی جانفشانی کی"۔

اختر اورینوی نے بھی شاہزادہ اعظم و معظم کے اتالیق مقرر کیے جانے کی اطلاع دی ہے۔ لیکن ان لوگوں کی "تربیت میں بڑی جانفشانی" دکھانے سے متعلق وہ کچھ نہیں کہتے ہیں۔ فاضل مقالہ نگار اس سلسلے میں اگر کسی تاریخ سے مدد لیتے تو انھیں یہ بات معلوم ہو جاتی کہ شہزادہ معظم ۱۰۵۲ھ میں پیدا ہوا تھا یعنی وہ بیدل سے ایک سال بڑا تھا اور بیدل اپنی عمر کے دسویں برس میں تعلیم منقطع کر چکے تھے (سفینہ خوش گو) تو پھر وہ کیونکر اتالیق مقرر ہو سکتے تھے؟

○ "حضرت مخدوم یحییٰ منیری اور عظیم آباد میں آپ کے خسر حضرت شہاب الدین پیر جگجوت کی ذات گرامی سے سلسلۂ سہروردیہ کی اشاعت ہوئی۔ مشہور ہے کہ آپ دونوں حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کے مرید و مجاز تھے"۔ ص ۱۳

(۱) حضرت شہاب الدین پیر جگجوت (م ۶۷۰ھ) کے عہد میں عظیم آباد کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ نیز آج ہم جسے عظیم آباد کے نام سے جانتے ہیں اس علاقے سے بھی آپ کو کوئی تعلق نہیں تھا۔ آپ نے "جیٹھلی" میں قیام فرمایا اور وہیں آپ کا مزار بھی ہے۔

(۲) "مشہور ہے" کسی تحقیقی مقالے کیلیے یہ جملہ مناسب نہیں۔ تحقیق میں ہر بات تیقن کے ساتھ کہی جاتی ہے۔

(۳) "حضرت مخدوم یحییٰ منیری" کا شیخ الشیوخ سے مرید ہونے کا ذکر نہایت ہی گمراہ کن ہے کیونکہ آپ کا ہندوستان سے باہر جانے کا نہ کہیں ذکر ہے اور نہ ہی شیخ کی ہندوستان میں آمد کا پتا چلتا ہے۔

حضرت یحییٰ منیری "کو تقی الدین مہسوی کا بھی مرید کہا جاتا ہے لیکن اس سلسلے میں اب تک کوئی حتمی تحقیق نہیں ہو سکی ہے کیونکہ اس سلسلے کا قدیم ترین تذکرہ "مناقب الاصفیا" میں بھی مصنف نے استناد اور تیقن کے ساتھ اس بیعت کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"سماع است کہ شیخ یحییٰ پدر شیخ شرف الدین منیری بر مولانا تقی الدین عربی ساکن خطہ مہسوں صاحب ملتفط احیاء العلوم اعتقاد داشت و شاید ارادت ہم بر مولانای مذکور بودہ باشد۔" (مناقب الاصفیا مصنفہ حضرت مخدوم شیخ شعیب منیری مطبع نور الآفاق، کلکتہ، ۱۳۱۳ھ ص ۱۳۰)

آپ نے بھی "اعتقاد" کا لفظ استعمال کیا ہے اور "ارادت" کے لئے شاید کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح شاہ امین احمد فردوسی بھی اپنی تصنیف "گل فردوس" میں اعتقاد کا ہی لفظ لاتے ہیں "ارادت" کا نہیں ے

داشت در معرفت و زہد و حقائق طلبی اعتقادی بدل تود ز تقی عربی

(گل فردوس۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ ۱۳۱۰ھ ص ۲۳)

○ "عظیم آباد میں حضرت آدم صوفی (کی درگاہ جیو ٹھلی) بھی حضرت فرید الدین گنج شکر کے مرید و خلیفہ تھے" ص ۱۳

(۱) حضرت آدم صوفی کے عہد میں بھی عظیم آباد کا کوئی تصور نہیں تھا اور عظیم آباد کے قائم ہو جانے کے بعد بھی جیو ٹھلی اس میں شامل نہیں تھا۔

(۲) حضرت آدم صوفی کو حضرت بابا کا مرید بتانا بالکل غلط ہے۔ آپ اپنے والد حضرت سید ابراہیم چشتی ابن سید جلال الدین چشتی مشہدی سے بیعت تھے، حضرت بابا سے صرف خلافت حاصل کی تھی۔

○ "قادریہ کو فروغ سید احمد انجھری۔۔۔ سے ہوا" ص ۱۴

آپ کا نام سید احمد نہیں بلکہ سید محمد تھا۔ تشفی کے لیے دیکھیں "مناقب محمدی"، مصنفہ علی شیرازی

ادبی پس منظر (ص ۱۶-۱۷)

"حضرت صوفی کی توجہ نثر نگاری کی طرف اس وجہ کر ہوئی کہ وہ علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو گئے تھے" ص ۱۷

اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ حضرت صوفی علی گڑھ تحریک سے متاثر ہوئے تھے؟ ان کی نثر سے تو اس بات کا پتا نہیں چلتا ہے۔ ان کی تحریریں اسی قدیم طرز کی مقفع مسجع اور رنگین عبارتوں سے مملو ہیں۔

بہار کا ادبی ماحول (ص ۱۸-۲۴)

"صوبہ بہار میں مسلمانوں کی آمد ۵۷۶ھ کے پہلے ہی شروع ہو گئی تھی" ص ۱۸

۵۷۶ھ سے قبل صرف ایک مسلم شخصیت "مومن عارف" کی بہار میں آمد کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے اور انکی شخصیت بھی متنازع فیہ ہے کیونکہ انکے بارے میں کسی قدیم تذکرے میں کوئی ذکر نہیں ملتا ہے کہ یہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کب آئے تھے ؟

" مربوط طریقے پر اردو شاعری یا نثر کے نمونے نویں اور دسویں صدی ہجری کے ابھی تک نہیں ملتے ہیں لیکن تحقیق و تفتیش کا دروازہ کھلا ہوا ہے جس سے بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں البتہ دسویں صدی ہجری کے اواخر یا گیارہویں صدی کے اوائل کی شاعری کا نمونہ مجھے دستیاب ہوا ہے جن کے (جس کے) بارے میں اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ چند اوراق منظوم فقہ کے مجھے اپنے خاندانی کتب خانے سے دستیاب ہوئے ہیں اس پر ۱۱۶۵ھ کی مہر ہے اور اسی مہر پر شرف الدین بڈھانوی کا نام ہے۔ یہ نظم پندرہ صفحات پر مشتمل ہے درمیان اور آخر کے صفحات غائب ہیں... اسکے شاعر کا نام شمس حسن بن یار معلوم ہوتا ہے۔" ص ۱۵-۱۹

کسی نسخے کا مصنف کے خاندانی کتب خانے میں موجود رہنا اس کے بہاری ہونے کی دلیل نہیں۔ جب تک مصنف کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو اس نسخے کو بہاری نہیں کہا جاسکتا ہے۔

○ "دبستان دکن کے دور اولیٰ کے مقابل بہار میں تخلیقی ادب کا کام شروع ہو چکا تھا"۔ ص ۱۹

دبستان دکن کی شاعری کا پہلا دور ۹۰۰ھ میں ختم ہو جاتا ہے (دکن میں اردو مصنفہ نصیر الدین ہاشمی) اور بہار میں اردو کے پہلے شاعر کا نام اب تک تحقیقی طور پر متعین نہیں کیا جاسکا ہے پھر بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بہار میں اردو شاعری کا آغاز بارہویں صدی کے اوائل میں ہو چکا تھا۔ اس لحاظ سے اب مقالہ نگار یہ بتائیں کہ ۹۰۰ھ کے بعد بارہویں صدی کے اوائل کا وقفہ کیا "مقابل" آگیا؟

○ " صوبہ بہار میں گیارہویں صدی ہجری سے اردو ادب کا تسلسل ہمیں ملتا ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (۱۰۵۴ھ تا ۱۱۳۳ھ) کی تقلید شعرائے دلی نے بھی کیا ہے۔" ص ۱۹

بیدل کی اردو شاعری کا بہار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس سلسلے میں تشفی کیلیے دیکھیں "مقالات قاضی عبدالودود" ص ۶

بیدل کے ذکر کے بعد اسی پیراگراف میں بہار کے قدیم اردو شعراء کی ایک فہرست مقالہ نگار نے اختر اورینوی کی تصنیف سے بدون حوالہ نقل کی ہے۔ اب ایک نظر اس فہرست پر بھی۔

(الف) "سید عماد الدین پھلواری (۱۰۶۵ھ تا ۱۱۲۴ھ)" ——— شعرا کی اس فہرست میں اگر انھیں شاعر کی حیثیت سے پیش کیا تھا تو تخلص ضروری تھا۔ پھلواری اس قصبے کا نام ہے جہاں حضرت عماد رہتے تھے۔ وطنی نسبت کے اعتبار سے "پھلواروی" لکھنا چاہیے تھا۔

(ب) علامہ محمد علیم تحقیق (۱۱۰۷ھ تا ۱۱۶۳ھ)" جبکہ اختر اورینوی کی تصنیف میں تحقیق کا سال وفات ۱۱۶۲ھ ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے ایک سال کیوں بڑھا دیا، وضاحت ضروری تھی۔

(ج) غلام نقشبند سجاد، حضرت بی بی ولیہ، لالہ اجاگر چند الفت، مہاراجہ رام نرائن موزوں" — مذکورہ بالا چاروں شعراء کا سنہ ولادت و وفات اختر اورینوی کی تصنیف میں موجود ہے پھر بھی مقالہ نگار نے انھیں انکے سنین سے عاری کر دیا۔

(د) "شاہ آیت اللہ جوہری (۱۱۲۶ھ تا ۱۲۱۰ھ)" — جوہری کے ساتھ ساتھ مذاقی تخلص بھی دینا چاہیے تھا۔

(ہ) "غلام یحییٰ حضور متوفی ۱۲۰۶ھ" — اختر اورینوی نے سنہ وفات کے ساتھ ساتھ سنہ ولادت بھی دیا ہے۔

(و) "اشرف علی فغاں" — اختر اورینوی نے فغاں کا سنہ وفات ۱۱۸۶ھ دیا ہے۔

(ز) "میر محمد باقر حزیں (۱۱۶۵ھ) شاہ رکن الدین عشق (۱۲۰۳ھ) مرزا محمد علی فدوی (۱۲۱۰ھ)" — تینوں شعراء کے ساتھ صرف ایک ایک سنہ دیا ہے۔ لیکن اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ آیا یہ سنہ ولادت ہے یا سنہ وفات؟

میر محمد باقر حزیں کا سال وفات ۱۱۶۵ھ دیا ہے۔ لیکن قاضی عبدالودود اس سنہ کو تیقن کے ساتھ تسلیم نہیں کرتے نیز انھیں بہاری شعراء میں وہ تسلیم نہیں کرتے (مقالات قاضی عبدالودود ص ۶۲)

(ح) مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق، ضیا عظیم آبادی" — اختر اورینوی کی تصنیف میں دونوں کے سنین موجود ہیں۔

○ "شاد عظیم آبادی نے بھی مثنوی کے میلان کو ارتقا پذیر کیا۔ نالۂ شاد (۱۲۷۸ھ) مثنوی چشمۂ کوثر (غیر مطبوعہ) اور ایک قومی مثنوی مادر ہند لکھی ہے" ص ۲۰

"مثنوی چشمۂ کوثر" غیر مطبوعہ نہیں بلکہ یہ مطبع صبح صادق سے شائع ہو چکی ہے۔

○ "شاہ امیر الدین وجد کی بھی تین غیر مطبوعہ مثنویاں موجود ہیں" ص ۲۰

وجد کی تینوں مثنویوں کا نام دینا چاہیے تھا۔

"اسی طرح عبدالغفور شہباز، فضل حق آزاد اور جوشش منیری نے اس صنف میں نئے نئے اضافے کیے" ص ۲۰

گفتگو صنف مثنوی کی چل رہی ہے۔ یہ وضاحت ضروری تھی کہ ان شعراء نے صنف مثنوی میں کیا نئے نئے اضافے کیے۔

اس تحقیقی مقالے میں کچھ باتیں اس طرح پیش کی گئی ہیں کہ قاری کو یہ سمجھنے میں دقت ہوتی ہے کہ اس مضمون میں کیا اپنی طرف سے لکھا ہے اور کیا اس کتاب سے لیا ہے جس کا حوالہ فٹ نوٹ پر دیا ہے۔ مثلاً ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"صوبہ بہار میں اردو شاعری کی طرح اردو نثر نگاری کی ترویج و اشاعت بھی صوفیوں کے زیر اثر ہوئیں (ہوئی) اب تک کی تحقیقات کے مطابق یہاں کی نثر کو دہلی کی نثر پر تقدم حاصل ہے۔ اس لیے کہ

فضل (فضلی) کی کربل کتھا یا دہ مجلس سے پہلے یہاں اردو کے نثری نمونے ملتے ہیں. تحقیق کی روشنی میں سب سے پہلے حضرت عماد الدین قلندر پھلواری (پھلواروی) کا ایک مذہبی مختصر رسالہ ہے جو صراط مستقیم المعروف بہ سیدھا راستہ کے نام سے منسوب ہے۔ یہ رسالہ دس سو اکاسی ۱۰۸۱ ہجری میں تمام ہوا ہے۔ اس میں سات چھوٹی چھوٹی فصلیں ہیں اس کا تعلق دینیات اور مذہب سے ہے زبان قدیم ہے ۵ ص ۲۱

مندرجہ بالا اقتباس میں آخری لفظ "ہے" پر فٹ نوٹ کا علامتی ہندسہ ہے جس سے اس بات کا پتا نہیں چلتا ہے کہ آیا آخری جملہ "زبان قدیم ہے" کے لیے یہ حوالہ ہے یا مکمل اقتباس کے لیے؟ اس کے لیے جب ماخذ (بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا) کی طرف رجوع کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :

(الف) کربل کتھا والی بحث ماخذ میں مقالہ نگار کے پیش کردہ صفحہ پر نہیں ہے۔

(ب) ماخذ میں رسالے کا نام "سیدھا راستہ ہے" "سیدھا راستہ" نہیں۔

(ج) "دس سو اکاسی ۱۰۸۱ ہجری" حرف یا ہندسہ دونوں میں سے کسی ایک کو توسین میں دینا چاہیے۔ "ہجری" کا مخفف "ھ" کافی تھا۔ نیز "سیدھا رستہ" کا سنہ تصنیف ۱۰۸۱ھ ماخذ میں مقالہ نگار کے پیش کردہ صفحہ پر نہیں ہے بلکہ یہ اگلے صفحہ پر ہے۔

(د) "سات چھوٹی چھوٹی فصلیں" بھی ماخذ کے دوسرے صفحہ پر ہے۔

(ہ) رسالہ کا "تعلق دینیات اور مذہب" سے قائم کرنا بالکل غلط ہے۔ ماخذ میں اس کا تعلق صرف دینیات سے ہے مذہب سے نہیں

(و) "زبان قدیم ہے" ماخذ میں اس طرح کا کوئی بیان نہیں ہے۔

حوالے کی مندرجہ بالا غلطیوں کے علاوہ چند باتیں مزید اقتباس بالا کی روشنی میں :

"نثری نمونے" سے مقالہ نگار کی کیا مراد ہے؟ اگر چند جملے اور فقرے مراد ہیں تو فضلی کی کربل کتھا کیوں؟ بابا فرید الدین گنج شکر اور صوفی حمید الدین ناگوری وغیرہ کے جملے وفقرے کیوں نہیں؟ اور اگر کوئی باضابطہ تصنیف مراد ہے تو واحد کا صیغہ "نمونہ" استعمال کرنا چاہیے کیونکہ مقالہ نگار "تحقیق کی روشنی" میں کربل کتھا سے قبل کی صرف ایک تصنیف "صراط مستقیم المعروف بہ سیدھا رستہ" مصنفہ حضرت عماد الدین قلندر پھلواروی ہی پیش کر سکے ہیں اور اسی "تحقیق کی روشنی میں" ہی اس رسالے کو جعلی قرار دیا جا چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو مقالات قاضی عبدالودود ص ۲۱)

○ "حضرت ظہور الحق ظہور (۱۱۸۵ھ تا ۱۲۴۴ھ) کے چار نثری رسالے پائے جاتے ہیں (۱) رسالہ نماز (۲) فضائل رمضان (۳) فیض عام (۴) کسب النبی، یہ سب رسالے ۱۲۰۰ھ سے ۱۲۳۰ھ تک لکھے گئے ص ۲۱

حضرت ظہور کے متعلق لکھتے وقت اختر اورینوی کی تصنیف "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" مقالہ نگار کے پیش نظر ضرور رہی ہوگی کیونکہ ان سے قبل حضرت عماد کا ذکر انھیں کے حوالے سے کیا ہے۔ لیکن حضرت ظہور کے ذکر میں کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ اگر مقالہ نگار اسے اپنی تحقیق ثابت کرنا چاہتے تھے تو ان رسالوں کے سن تصنیف سے متعلق بحث لازمی تھی کیونکہ اختر اورینوی صاحب "رسالہ نماز" اور "فضائل رمضان" کا سنہ تصنیف درخشاں ابدالی کے حوالے سے ۱۲۰۰ھ سے قبل قرار دیتے ہیں اور "فیض عام" اور "کسب النبی" کا سنہ تصنیف بالترتیب مصنف کے دست خاص کے تحریر شدہ نسخوں میں ۱۲۲۸ھ اور ۱۲۲۳ھ درج ہے۔

○ "محمد احسن گیلانی ۱۲۲۶ھ اور شجاع الدین علی متوفی ۱۲۵۷ھ کے بھی رسائل ہیں جو اردو نثر میں ہیں اور مذہبی ہیں۔" ص ۲۱

(۱) محمد احسن گیلانی کے ساتھ ۱۲۲۶ھ کی وضاحت ضروری ہے کہ آیا یہ سنہ ولادت ہے یا سنہ وفات ؟

(۲) شجاع الدین کے وصال کا سن ۱۲۵۷ھ بالکل غلط ہے۔ یہ دراصل ان کے ایک رسالے کا سنہ تصنیف ہے جس کا ذکر اختر اورینوی صاحب نے کیا ہے۔

○ "شاہ عطا حسین منعمی (۱۲۳۱ھ تا ۱۳۱۱ھ) نے بھی ۱۲۶۰ھ میں ہدایت المسافرین تالیف کی۔" ص ۲۱

"ہدایت المسافرین" کا سنہ تصنیف ۱۲۶۰ھ نہیں بلکہ ۱۲۶۴ھ کے بعد ہے۔ کیونکہ شاہ عطا حسین منعمی اپنے اس سفرنامے (ہدایت المسافرین) کے "سبب تالیف کتاب" کے ضمن میں ۱۲-۱۳ پر فرماتے ہیں:

"آغاز سفر اس فقیر حقیر کا بارہ سو ساٹھ ہجری میں ہوا اور بارہ سو چونسٹھ ہجری میں معاودت منزل مقصود کر کے وطن آیا۔ اس کتاب میں اپنی سرگذشت لکھی ہوئی چار برس سات روز سات مہینے کی ہے۔"

یعنی سفر حج کی واپسی (۱۲۶۴ھ) کے بعد آپ نے اس سفرنامے کو ترتیب دیا لہٰذا اس کا سنہ تالیف ۱۲۶۰ھ لکھنا گمراہ کن ہے۔

○ "عالم علی عظیم آبادی نے بوستان خیال کا ملخص ترجمہ زبدۃ النخیال سے موسوم کر کے کیا ہے۔ اس کے مختلف نسخے موجود ہیں۔ کتب خانہ قادریہ (؟) میں ۱۲۵۲ھ کا مخطوطہ ہے۔" ص ۲۱

(الف) "مختلف نسخے" کی وضاحت ضروری تھی کہ اس کے نسخے کہاں کہاں ہیں ؟

(ب) اختر اورینوی نے اس نسخے کو (نسخہ کتب خانہ قادریہ خانقاہ اسلام پور) درخشاں ابدالی کے حوالے سے نامکمل لکھا ہے، مقالہ نگار کے لیے اس کی وضاحت بھی ضروری تھی۔

(ج) "زبدۃ النخیال" کا سال تصنیف ۱۲۵۶ھ ہے (زبدۃ النخیال، نسخہ مطبوعہ ص ۲، ۳) مقالہ نگار کے مطابق خانقاہ قادریہ کا نسخہ "۱۲۵۲ھ کا مخطوطہ ہے"۔ تصنیف ہونے سے چار سال قبل یہ کس طرح نقل ہو گیا ؟

○ "آپ (خواجہ فخر الدین حسن سخن دہلوی) نے سروش سخن ایک طبع زاد داستان یا افسانہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں لکھا ہے" ص ۲۱

(الف) داستان اور افسانہ اردو کی دو الگ الگ صنف ہیں۔ یہ داستان ہے افسانہ نہیں ۔

(ب) "سروش سخن" کا سنہ تصنیف ۱۸۶۰ء تو صحیح ہے لیکن اس کی ہجری مطابقت یعنی ۱۲۸۱ھ غلط ۔

○ "وہ (سروش سخن) ۱۳۰۵ھ میں زیور طبع سے مزین ہوئی ہے"

"سروش سخن" صرف ۱۳۰۵ھ میں ہی شائع نہیں ہوئی بلکہ ۱۳۲۷ھ تک اس کے ۵ ایڈیشن نکل چکے تھے۔ اسی میں ایک ۱۳۰۵ھ کا بھی ایڈیشن ہے جو اس کا چھٹا ایڈیشن ہے ۔

○ "سجاد سنبل" بھی آپ (منشی حسن علی) کی تصنیف ہے ۔ ص ۲۲

"سجاد سنبل" منشی حسن علی کی تصنیف نہیں بلکہ یہ پنڈت کیشورام بھٹ کا تصنیف کردہ ڈراما ہے جو اردو میں ہے۔ لیکن ہندی رسم الخط میں ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا تھا۔

○ "نقش طاؤس، محمد اعظم علی کا ناول ہے" ص ۲۲

(الف) محمد اعظم علی نہیں بلکہ صرف محمد اعظم۔

(ب) "نقش طاؤس" کے مصنف صرف محمد اعظم نہیں بلکہ یہ منشی حسن علی اور محمد اعظم کی مشترکہ کوشش تھی۔

○ "صفیر بلگرامی کا ناول 'جوہر مقالات' ۱۸۸۶ء میں طباعت پذیر ہوا۔ انکا دوسرا ناول 'گلبن موزوں' کے نام سے مشہور ہوا" ص ۲۲

(الف) "جوہر مقالات" ۱۸۸۶ء میں نہیں بلکہ ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا تشفی کے لیے دیکھیں 'دیباچہ جوہر مقالات' ص ۷

(ب) "گلبن موزوں" ناول نہیں بلکہ یہ مختلف موضوعات سے متعلق اشعار کا مجموعہ ہے اور اسے صفیر نے اپنی تصنیفات کی فہرست میں "گلبن موزوں انتخاب اشعار ہر قسم" کا نام دیا ہے (خود نوشت سوانح عمری صفیر بلگرامی ص ۸۷، مطبوعہ رسالہ "اردو" کراچی، جنوری ۱۹۶۶ء)

○ "علی سجاد عظیم آبادی کے دو ناول 'نئی نویلی' اور 'محل خانہ' مشہور ہیں۔ جن میں سے محل خانہ دو حصہ (حصوں) پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ۱۹۰۳ء میں طبع ہوا۔ دوسرا حصہ غیر مطبوعہ ہے۔" ص ۲۲

(الف) "محل خانہ" کا پہلا حصہ ۱۹۰۳ء میں نہیں بلکہ ۱۹۰۲ء میں مفید عام پریس، آگرہ سے شائع ہوا۔

(ب) "محل خانہ" کے دوسرے حصے کے غیر مطبوعہ ہونے کی خبر کے ساتھ ساتھ یہ نسخہ کہاں ہے اس کی اطلاع بھی ضروری تھی کیونکہ مقالہ نگار کے جملے سے اس نسخہ کی موجودگی کا پتا چلتا ہے ۔

ایک پیراگراف میں مصنف نے بہار میں "تنقید نویسی اور تذکرہ نگاری" پر روشنی ڈالی ہے اور

اس ضمن میں دیگر مصنفین کی تنقید اور تذکرے کی کتابوں کا بھی نام دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

○ " صفیر بلگرامی نے "تذکرہ جلوہ خضر" کی تین جلدیں لکھیں۔ "تحقیق اللسانی" "رشحات صفیر" رسالہ چشمۂ کوثر" "تذکرہ مرثیہ گویاں" جیسی مفید اور کار آمد کتابیں لکھیں" ص ۲۲

(الف) صفیر بلگرامی نے "تذکرہ جلوہ خضر" کی تین جلدیں نہیں بلکہ دو ہی جلدیں لکھیں۔ دوسری جلد کی آخری سطر اس طرح ہے : ـــــ "مسئلہ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی۔ ۷ رمضان ۱۳۰۷ھ روز یکشنبہ۔ پٹنہ" صفیر بلگرامی کی تاریخ وصال ۱۲ رمضان ۱۳۰۷ھ ہے یعنی جلد ثانی لکھنے کے دو ہفتے کے بعد ہی آپ کا وصال ہو گیا۔

(ب) "رشحات صفیر" کا موضوع اُردو قواعد ہے نہ کہ تنقید و تذکرہ۔

(ج) اوّل تو صفیر بلگرامی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اپنی تیار کردہ فہرست تصنیفات میں کسی رسالہ چشمۂ کوثر" کا ذکر نہیں کیا ہے ہاں "جام کوثر" نامی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ دونوں ایک ہی ہیں۔ دوم یہ کہ عزیز الدین بلخی نے اپنی تصنیف "تاریخ شعرائے بہار" میں صفیر بلگرامی کی تصنیفات کی جو فہرست پیش کی ہے اس میں رسالہ چشمۂ کوثر" اور "تذکرہ مرثیہ گویاں" دونوں ایک ہی کتاب ہے۔

○ "عبد الغفور شہباز نے "زندگانی بے نظیر" لکھی ہے۔ یہ شہباز کا معرکۃ الآرا علمی کارنامہ ہے... ۱۸۹۲ء میں مرتب ہوا۔ ص ۲۲

"زندگانی بے نظیر" ۱۸۹۲ء میں نہیں بلکہ ۱۸۹۶ء میں ترتیب دیا گیا مصنف نے اس کے دیباچے میں اسکی وضاحت کر دی ہے۔

○ "شاد عظیم آبادی نے "نقش پائیدار" "تاریخ بہار"... شوق نیموی نے... "سرمۂ تحقیق" عبد الغنی استھانوی نے "تنقیح حقوق نسواں" نصیر حسین خیال نے "مغل اور اردو" "داستان اردو" حسن علی نے "تائید حق" شاہ اکبر داناپوری" نے "اشرف التواریخ" تین جلدوں میں "سیر دہلی" جیسی تصانیف لکھیں۔" ص ۲۳

(الف) نقش پائیدار اور "تاریخ بہار" دو علیحدہ کتابیں نہیں ہیں بلکہ شاد نے اپنی تاریخ بہار کی پہلی جلد کو "نقش پائیدار" کے نام سے موسوم کیا۔ اور یہ کتاب نہ تو تنقید ہے اور نہ ہی تذکرہ۔

(ب) شوق نیموی کی "سرمۂ تحقیق" دراصل لسانیات یعنی اُردو قواعد سے متعلق ہے اور یہ جلال لکھنوی کی تصنیف "رد تردید" (جو جلال لکھنوی کے شاگرد اسمٰعیل معاصی کے نام سے شائع ہوئی تھی) کے جواب میں لکھی گئی تھی۔

(ج) عبد الغنی کی "تنقیح حقوق نسواں المعروف بصیانۃ الایمان عن بعض مافی حقوق نسواں" میں تعدد ازدواج کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔

(د) نصیر حسین خیال کی "مغل اور اردو" اور "داستان اُردو" دو علیحدہ تصنیفات نہیں بلکہ خیال "داستان اردو" کے نام سے اُردو کی ایک جامع اور مکمل تاریخ لکھنا چاہتے تھے یا غالباً لکھ چکے تھے" لیکن وہ زیور طبع سے آراستہ

نہیں ہوئی۔ "مغل اور اردو" اسی کتاب کا ایک باب ہے جسے ۱۹۳۳ء میں جمیل مظہری نے کلکتہ سے شائع کرایا۔ اس کے آخر میں "داستان اردو" کے تمام ابواب کی تفصیلات موجود ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں منعقدہ اردو کانفرنس میں خیال نے جو صدارتی خطبہ دیا تھا وہ دراصل اسی "داستان اردو" کا مکمل خلاصہ تھا جو بعد میں "داستان اردو" کے ہی نام سے ۵۰ اصفحات پر مشتمل ادارۂ اشاعت اردو، حیدر آباد (دکن) سے شائع ہوا۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: ملخص "داستان اردو" کا پیش لفظ، چوہدری محمد اقبال گا ہندری)

(۸) حسن علی کی تصنیف "تائید حق" نہ تو تنقید ہے اور نہ ہی تذکرہ بلکہ یہ قادیانیت کا ایک تبلیغی رسالہ ہے۔

(۹) شاہ اکبر داناپوری کی "اشرف التواریخ" دراصل تاریخ اسلام ہے تنقید و تذکرہ نہیں اور اس کا ذکر بھی بیکار ہے کیونکہ یہ صوفی منیری کے وصال (۱۹۰۰ء) کے بعد شائع ہوئی تھی۔

(۱۰) شاہ اکبر داناپوری کی "سیر دہلی" کا موضوع نام ہی سے ظاہر ہے۔ یہ دہلی کا سفر نامہ ہے۔

○ "غدر سے پہلے 'ہرکارہ' اخبار پٹنہ سے شائع ہوا۔" ص ۲۳

غدر سے پہلے پٹنہ سے صرف "ہرکارہ" اخبار نہیں بلکہ "اخبار بہار" بھی جاری ہوا جسکا پہلا شمارہ یکم ستمبر ۱۸۵۶ء میں منظر عام پر آیا اور غدر سے قبل بہار میں ان دو کے علاوہ دو مزید اخباروں کا پتا ملتا ہے۔ آرہ سے "نور الانوار" (۱۸۵۲ء) اور گیا سے "ویکلی رپورٹ" (یکم مئی ۱۸۵۶ء)

○ "یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محمود غزنوی کے عہد میں حضرت مومن عارف تشریف لائے اور بنارس سے آگے بڑھ کر منیر شریف پہنچے۔ اس سلسلے میں ایک قدیم نوشتہ ہمارے خاندان منیر شریف کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کی یہ عبارت قابل غور ہے "مومن عارف شاید محمود غزنوی کی طرف سے خراج وصول کرنے کیلیے آئے ہوں"۔ ص ۲۷

(الف) "قدیم نوشتہ" کا عہد اور مصنف کا نام بھی لکھنا چاہیے تھا۔

(ب) مومن عارف کا محمود غزنوی کے عہد میں منیر شریف آنا تاریخی طور پر بالکل غلط ہے کیونکہ محمود غزنوی کا آخری حملہ ہندستان پر ۴۲۶ھ میں ہوا تھا۔ اگر اس وقت بھی مومن عارف ساتھ آئے ہوں گے اور ان کی عمر ۲۰ یا ۲۵ سال بھی تسلیم کر لی جائے تو امام محمد تاج فقیہ کے حملۂ منیر (۵۷۶ھ) کے وقت ان کی عمر تقریباً پونے دو سو سال ہوتی ہے جو بعید از قیاس ہے۔

○ "بختیار خلجی نے ۵۸۹ھ مطابق ۱۱۹۳ء میں منیر کو مرکز قرار دیکر بہار پر کامیاب تاخت کی تھی۔" ص ۲۸

(الف) حوالہ "طبقات ناصری"، کا لیکن صفحہ ندارد۔

(ب) طبقات ناصری میں "منیر کو مرکز قرار دے کر بہار پر کامیاب تاخت" کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہاں منیر پر بختیار خلجی کا بار بار حملہ کرنے کا ذکر ضرور ہے۔ لیکن کوئی سنہ اس میں موجود نہیں۔

○ "حضرت مخدوم یحییٰ منیری نے بختیار خلجی کو جب وہ منیر پہنچا یہاں کی حکومت سپرد کر دی اور خود رشد و ہدایت میں مشغول ہو گئے" ص ۲۹

بختیار خلجی سے یحییٰ منیری کی ملاقات کی کوئی تاریخی سند نہیں۔ وسیلۂ شرف میں قیاساً لکھا گیا ہے جو ایک تحقیقی مقالے کے لیے مستند نہیں ہو سکتا۔

○ "حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور آپ کی اولاد و اخلاف کے ذریعہ اس خطۂ پاک (منیر) کو ایسی عظمت و شہرت حاصل ہوئی کہ اس کا اندازہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہو جو منیر شریف کے نام سے خالی ہو" ص ۳۰

○ "حضرت صوفی منیری کا خاندان اپنے حسب و نسب اور دینی خدمات کی وجہ سے بالعموم ہندوستان میں اور بالخصوص صوبہ بہار میں ممتاز رہے" ص ۳۱

محولہ بالا جملے تحقیقی مقالے کے جملے نہیں، تحقیق میں اس طرح کا دعوی بلا دلیل کے روا نہیں۔

○ "امام محمد دیباج کے متعلق متعدد تذکروں اور نسب ناموں میں تحریر ہے کہ آپ حضرت امام جعفر صادق کے پانچویں صاحبزادے تھے، یہ خلیفہ منصور کے عہد خلافت میں تھے۔ اولاد امام حسین ہونے کے سبب مقبولیت اور عوام کی توجہ زیادہ ہوئی تو خلیفہ منصور کو اپنی خلافت سے اندیشہ ہوا۔ اس نے ملزم قرار دے کر آپ کو زندہ دیوار میں چنوا دیا تو آپ کے صاحبزادے جعفر نیشاپوری مع اہل و عیال ملک خراسان چلے آئے" ص ۳۱

(الف) مقالہ نگار کو "متعدد تذکروں اور نسب ناموں" کا نام پیش کرنا چاہیے تھا کیوں کہ ——

(ب) تذکرۃ السادات مصنفہ شیخ احمد بن محمود محمدی الاکبر آبادی میں امام محمد دیباج کو حضرت امام جعفر صادق کا دوسرا فرزند، کنز الانساب مصنفہ سید شاہ عطا حسین منعمیؒ میں انھیں چوتھا فرزند، رحمۃ اللعالمین مصنفہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری میں چوتھا فرزند اور نسب نامہ کلاں مصنفہ شاہ ضیاء اللہ میں انھیں تیسرا فرزند بتایا گیا ہے۔

(ج) فاضل مقالہ نگار "دیباج" کے لقب سے مغالطے میں آ گئے، اور دو شخصیات کو ملا کر ایک کر دیا۔ اگر مقالہ نگار موصوف نسب لکھنے کے وقت تاریخ اسلام پر بھی ایک نظر ڈال لیتے تو ان پر یہ تاریخی حقیقت منکشف ہو جاتی کہ حضرت امام جعفر صادق کے صاحبزادے محمد دیباج نے دعوئ خلافت تو کیا تھا اور عوام کی بیعت بھی لی تھی لیکن بعد میں مامون کے حق میں یہ بیعت واپس لے لی تھی اور مامون نے انھیں معاف کر دیا تھا۔ دیوار میں نہیں چنوایا تھا۔

خلیفہ منصور کے خلاف جن محمد دیباج نے خروج کیا تھا اور جنھیں خلیفہ منصور نے شہید کروا دیا تھا وہ عثمان بن عفان کے پرپوتے (محمد دیباج بن عبداللہ بن عمرو بن عثمان بن عفان) محمد دیباج تھے۔ (الانساب، سمعانی، جلد نمبر ۵ ص نمبر ۳۶-۴۳۵، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، دکن، ۱۳۸۵ھ، تاریخ طبری (اردو ترجمہ) حصہ ہفتم مترجم: سید محمد ابراہیم، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۸ء)۔ اگر فاضل مقالہ نگار کے مطابق یہ وہی محمد دیباج ہیں جنھیں خلیفہ منصور نے شہید کروا دیا تھا تو صوفی منیری کا خاندان آل رسول نہیں بلکہ آل عثمان سے ہے۔ اور اگر محمد دیباج سے مراد امام جعفر صادق کے صاحبزادے ہیں تو آپ کے یعنی محمد دیباج بن امام جعفر صادق کے صرف تین صاحبزادے تھے۔ علی، قاسم اور حسین (رحمۃ اللعالمین مصنفہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری، جلد نمبر ۲، ص ۱۵۱، مطبوعہ ۱۹۲۱ء و تذکرۃ السادات مصنفہ شیخ احمد بن محمود محمدی الاکبرآبادی ص ۵۴-۵۳، مطبوعہ ۱۸۸۰ء) جعفر نامی کوئی صاحبزادے نہیں تھے۔

○ "ایک رسالہ ص ۶۱ پر اذکار طریقہ قادریہ وارثیہ بنارسیہ بھی ہے جس کا ایک صفحہ حضرت پیر مجیب اللہ قادری کے دست خاص کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔" ص ۳۲

(الف) "ایک رسالہ صفحہ ۶۱ پر" سے کیا مراد ہے؟

(ب) مقالہ نگار کو حضرت پیر مجیب اللہ قادری کی تحریر کے متعلق تیقن کے ساتھ بات کہنا چاہیے تھی۔ خانقاہ مجیبیہ میں موجود ان کی تحریر سے اپنے رسالے کا موازنہ کر لیتے۔

(ج) "بنارسیہ" صوفیوں کے سلاسل طریقت کی کس شاخ کا نام ہے؟

○ صوفی منیری کے نسب نامہ پدری (ص ۳۳) میں تیسری پشت پر سید غلام مرتضیٰ بن سید جہانگیر بن سید سعد کا نام آتا ہے اور رسالہ "ذکر" (ص ۳۲) کے مصنف یا کاتب کا نام بھی "غلام مرتضیٰ ولد سید صدر جہاں بن سعد اللہ حسینی" مرحوم ہے کیا دونوں دو الگ الگ شخصیتیں ہیں یا ایک ہی ہیں؟ اگر ایک ہی ہیں تو دونوں کی ولدیت میں فرق کیوں ہے؟

مقالہ نگار کی حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ کے تفصیلی حالات پر ایک کتاب بھی شائع ہو چکی ہے لیکن مقالہ نگار موصوف ص ۳۴ پر دو جگہ حضرت مخدوم جہاں کو حضرت یحییٰ منیریؒ کا منجھلا (تیسرا) صاحبزادہ قرار دیتے ہیں جو کہ حیرت انگیز ہے۔

○ "عبدالرحیم خانخاناں بھی منیر آکر مخدوم شاہ دولت منیری کا مرید ہوا۔" ص ۳۱-۳۰

(الف) حوالہ "تزک بابری" کا ہے جو حیرت انگیز ہے۔

(ب) اولاً تو عبدالرحیم خانخاناں کا بہار آنا ثابت کریں پھر منیر آکر شیخ دولت منیری سے ملاقات اور ترتب بیعت ہونا ثابت کریں۔ کیونکہ عبدالرحیم خانخاناں پر سب سے اہم ماخذ عبدالباقی نہاوندی کی تصنیف "مآثر رحیمی" ہے۔

لیکن اس میں شیخ دولت منیریؒ کا ذکر نہیں ہے جبکہ دیگر مشائخ وصوفیا کا ذکر ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ تذکرہ نگار خانخاناں سے تعلقات رکھنے والے علما ومشائخ کا ذکر کرے اور خود اس کے پیر کا ذکر نہ کرے۔

(ج) محمد غوثی شطاری نے تذکرہ گلزار ابرار میں عبدالرحیم خانخاناں سے متاثر ہو کر اس کی تعریف میں علیحدہ ایک باب ہی لکھا ہے۔ لیکن اس میں بھی شیخ دولت منیری کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شیخ دولت منیری کے حالات کے ضمن میں بھی اس نے خانخاناں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

(د) شاید ان کے پیش نظر وسیلۂ شرف مصنفہ صوفی منیری رہی ہوگی۔ لیکن اس میں بھی صرف "خانخاناں" کا لفظ ہے۔ "عبدالرحیم" مقالہ نگار کا اپنا اضافہ ہے۔ "خانخاناں" مغلوں کے دور میں سپہ سالاروں کو دیا جانے والا لقب تھا۔ مغلوں کے عہد میں یہ لقب بیشتر امرا کو دیا گیا۔ جس میں ایک عبدالرحیم بن بیرم خاں بھی تھا۔ فاضل مقالہ نگار نے "خانخاناں" لفظ دیکھ کر اس میں "عبدالرحیم" کا اضافہ کر دیا۔

○ "آپ (صوفی منیری) کی شادی... ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں ہوئی" ص ۳۶

خالد رشید صبا اپنے تحقیقی مقالے "صوفی منیری ــــ حیات اور شاعری" ص ۱۵ پر فرماتے ہیں:

"سنہ شادی کسی کتاب میں درج نہیں۔"

مگر فاضل مقالہ نگار حضرت صوفی کی شادی کا سنہ بھی دیتے ہیں اور اسے مستند ثابت کرنے کے لیے ص ۳۶ پر فرماتے ہیں:

"حضرت صوفی منیری کی شادی کی کچھ تفصیلات اس فرد حساب سے معلوم ہو جاتی ہے جو آپ کی شادی کے موقع پر سلامی اور دوسری رسموں کے سلسلے میں مرتب کی گئی تھیں۔ حسن اتفاق سے وہ ہنوز موجود ہے۔ عقد کی صحیح تاریخ اور وقت کے متعلق اس فرد حساب سے کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔"

(الف) اس فرد حساب سے صحیح تاریخ اور وقت کا تو پتا چلتا ہے (مقالہ نگار کے مذکورہ بالا قول کے مطابق) لیکن سنہ کا نہیں جبکہ مقالہ نگار نے سنہ دیا ہے تاریخ اور وقت نہیں۔

(ب) ان عیسوی و ہجری سنین میں کس سنہ کو صحیح تسلیم کیا جائے؟ کیونکہ ۱۲۶۹ھ کا مکمل عیسوی سال ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۲ء سے ۳ اکتوبر ۱۸۵۳ء تک رہتا ہے۔ ۱۸۵۴ء تو اس میں شامل ہی نہیں۔

اولاد (ص ۳۶ - ۳۷)

○ ص ۳۷ پر اولاد کے ذیل میں محل اولیٰ سے چھوٹے صاحبزادے سید شاہ سید علی کی ولادت کا سنہ ۱۲۹۵ھ اور محل ثانی سے سید شاہ اسداللہ کی ولادت کا سن ۱۲۹۱ھ۔ یعنی محل اولیٰ کی موجودگی میں نکاح ثانی کیا۔ لیکن

خالد رشید صبا اپنے مطبوعہ تحقیقی مقالے کے ص ۱۵ پر فرماتے ہیں:

"صوفی منیری پر دوبارہ حالت جذب کا غلبہ رہا . . جب طبیعت اصلاح پذیر نہ ہوئی تو اطبا نے آپ کو نکاح ثانی کا مشورہ دیا۔

یعنی نکاح ثانی کے مشورے کا مطلب یہ ہے کہ زوجۂ اولیٰ حیات نہیں تھیں۔ جب زوجۂ اولیٰ حیات نہیں تھیں تو زوجۂ ثانیہ کے محل سے ولادت کا سنہ ۱۲۹۱ھ قرار دے کر زوجۂ اولیٰ کے یہاں تیسرے صاحبزادے کا سال ولادت ۱۲۹۵ھ کیسے قرار دیتے ہیں؟ اگر مقالہ نگار کی نظر میں یہ سنہ صحیح تھا تو خالد رشید صبا سے اختلاف بھی ضروری تھا۔

اوصاف و کمالات (ص ۳۸ - ۳۹)

اس میں موضوع کے اعتبار سے بحث نہیں ہے۔ لباس اور تصنیفات کا ذکر ہے جو کہ فاضل ہے

اسفار (ص ۳۹ - ۴۰)

صوفی منیری کی زندگی میں سفر کی کوئی خاص اہمیت نہیں اور جیسا کہ مقالہ نگار نے بھی لکھا ہے کہ "آپ نے کہیں دور کا سفر نہیں کیا" (ص ۳۹) اور نہ ہی آپ کی زندگی پر اسفار کا کوئی اثر پڑا ہے۔ لہٰذا اس عنوان کو قائم کرنا فضول تھا۔

غالب اور صوفی منیری (ص ۴۱ - ۵۱)

صوفی منیری نے ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ (مطابق ۸ مئی ۱۸۶۶ء) کو سلسلۂ تلمذ کے لیے غالب کو ایک خط لکھا تھا۔ غالب نے اس کا جواب بھی دیا تھا۔ مقالہ نگار نے اس خط کو ص ۴۳ - ۴۴ پر پیش بھی کیا ہے اور فٹ نوٹ پر اسکے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ:

"اس خط کو سب سے پہلے سید سلیمان ندوی نے "معارف" اعظم گڈھ" ماہ نومبر ۱۹۲۰ء میں اور منشی مہیش پرشاد نے ہندستانی الہ آباد ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ غلام رسول مہر نے مکاتیب غالب ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو نے علیگڈھ میگزین، غالب نمبر اور احوال غالب میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے "آج کل" دہلی ۱۹۵۴ء کے مکاتیب نمبر میں طبع کرایا اس کے علاوہ بھی متعدد تصنیفات و تالیفات (میں) اس خط کی نقل اہل قلم حضرات نے پیش کی ہیں۔ ص ۴۴

(الف) ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کی مرتب کردہ کتاب "احوال غالب" میں غالب کا مذکورہ خط نہیں ہے۔

(ب) متعدد تصنیفات و تالیفات کا نام دینا چاہیے تھا۔

اب کچھ غالب کے خط کے سلسلے میں:

(الف) سید سلیمان ندوی، منشی مہیش پرشاد، غلام رسول مہر، ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، خواجہ احمد فاروقی

اور خالد رشید صبا کے نقل کردہ مکتوب غالب میں اختلافات نسخ موجود ہیں۔ مقالہ نگار کو ان اختلافات نسخ کو پیش کرنا چاہیے تھا، نیز اگر ان کے پاس غالب کے دست خاص کا نوشتہ وہ مکتوب ہے تو اسکا عکس بھی پیش کرنا چاہیے تھا۔

(ب) خالد رشید صبا کے نقل کردہ مکتوب غالب میں ایک مصرع ہے ؎ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ
لیکن یہ مصرعہ کسی اور نے نقل نہیں کیا ہے۔ یہ مصرع یا تو حذف کر دیا گیا ہے یا خالد رشید صبا کا اپنا اضافہ ہے۔ بہر صورت مقالہ نگار کے لیے اس سلسلے میں وضاحت لازمی ہے۔

(ج) اصل مکتوب کو دیکھنے کا دعویٰ کسی نے بھی نہیں کیا ہے۔ سب سے پہلی بار ۱۹۲۰ء میں یہ سید سلیمان ندوی کے مختصر تعارف کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ لیکن سید صاحب بھی اسے بچشم خود دیکھنے کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ انھیں مولوی حکیم محمد عثمان صاحب ندوی کی معرفت اس خط کی نقل موصول ہوئی تھی۔

(د) یہ مکتوب کس سنہ کا مکتوبہ ہے اس کا کہیں ذکر نہیں مگر خالد رشید صبا اس مکتوب کے ۱۵ پر "۲ نومبر ۱۸۶۳ء" لکھتے ہیں جو ہجری سنہ کے مطابق ۲۰ جمادی الاول ۱۲۸۰ھ ہوتا ہے یعنی صوفی منیری کے خط لکھنے سے تقریباً ڈھائی سال قبل۔ اگر اس سنہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے (کیونکہ کسی نے بھی اس خط کا کوئی سنہ نہیں دیا ہے) تو غالب کا یہ خط الحاقی قرار دیا جائے گا۔

(ھ) مقالہ نگار موصوف اپنی دیگر تالیف "وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت" ص ۴۷ (حاشیہ) پر قیاساً غالب کے خط کا سنہ ۱۲۸۳ھ لکھتے ہیں جو صحیح نہیں کیونکہ اس خط میں وہ اپنی عمر اکہتر سال بتلاتے ہیں، اور ان کی عمر کا اکہترواں سال رجب ۱۲۸۴ھ (اکتوبر ۱۸۶۷ء) سے شروع ہوتا ہے اور اس عمر میں وہ اپنی ضعیفی اور کمزوری کی بنا پر قلم خود خط نہ لکھا کرتے تھے بلکہ دوسروں سے لکھوایا کرتے تھے (دیکھیے اکتوبر ۱۸۶۷ء کے بعد میر غلام بابا خاں اور نواب کلب علی خاں بہادر کے نام لکھے گئے غالب کے خطوط) لیکن اس خط میں اپنی شدید بیماری کا ذکر کرتے ہوئے بھی خود ہی خط لکھا ہے۔ کیا غالب کے لیے اس عمر میں خط کا جواب دینا اور مثنوی پہ اصلاح کرنا ممکن تھا جبکہ سماعت اور بصارت دونوں پہ گرانی ہو نیز "قوتیں ساقط، حواس مختل" ہو چکے ہوں۔

(ز) غالب کے خطوط کے مطالعے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غالب خط کا جواب دینے میں کافی فعال تھے اور فوری جواب دیا کرتے تھے۔ تو پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ کے لکھے ہوئے خط کا جواب وہ رجب ۱۲۸۴ھ یعنی تقریباً ڈیڑھ سال بعد دیتے۔

مندرجہ بالا باتوں کی روشنی میں یہ فیصلہ بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ صوفی منیری کے نام غالب کا یہ خط سراسر جعلی ہے۔

تصنیفات (ص ۵۱ - ۵۲)

(۱) اس عنوان کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ص ۶۰ سے ص ۶۸ تک مقالہ نگار نے "تصنیفات صوفی منیری" کے عنوان سے تمام تصنیفات کا جائزہ لیا ہے۔

(۲) ۹ مطبوعہ تصانیف کا ذکر ہے۔ لیکن سال طباعت صرف تین کا ہے (مثنوی کشش عشق، مثنوی روش عشق اور عروۃ الوثقیٰ) مطبع اور ناشر کا ذکر صرف چار کے ساتھ (بشمول ہر سہ مذکرہ بالا) بقیہ کیساتھ صرف "مطبوعہ" کی اطلاع ہے۔ غیر مطبوعہ میں:

○ "مصطلحات المتصوفین، فارسی میں اصطلاحات صوفیہ میں (پر) ضخیم کتاب ہے۔" ص ۵۲

صرف ضخیم نہیں بلکہ اوراق کی تعداد دینا چاہیے تھا۔

تلامذہ صوفی منیری (ص ۵۲ - ۵۸)

○ "(عامر اسلام پوری نے) اپنے والد حضرت صوفی منیری سے اصلاحیں لیں۔ یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا اس لیے آپ کے کلام کا مختصر نمونہ محفوظ رہ سکا۔" ص ۵۸

اگرچہ خالد رشید صبا "صوفی منیری ــــ "حیات اور شاعری" کے ص ۴۷ پر عامر اسلام پوری کے حالات میں فرماتے ہیں:

"ان (عامر اسلام پوری) کے کلام کے نہ ملنے کے باعث ہم نمونہ کلام پیش کرنے سے قاصر ہیں۔"

لیکن یہ دیکھ کر کافی خوشی محسوس ہوئی کہ عامر اسلام پوری کا کلام جو خالد رشید صبا کو دستیاب نہ ہو سکا تھا مقالہ نگار کی نظر میں تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر مقالہ نگار اس مختصر کلام کو بھی دیگر تلامذہ صوفی کے کلام کی طرح منظر عام پر پیش کر دیتے۔

وفات، قبر، عرس (ص ۵۸ - ۵۹)

○ "آپ (صوفی منیری) کے بغل میں... حضرت جدی شاہ سید علی اور ان کے بغل میں حضرت والد مرشد سید محمد ایوب ابدالی کا مزار مبارک ہے۔" ص ۵۹

پھر مشرقی منیری کے ایک تاریخی قطعہ کے بعد ہی مقالہ نگار لکھتے ہیں:

○ "آپ (صوفی منیری) کا عرس آپ کے چھوٹے صاحبزادے حضرت شاہ سید علی کرتے رہے آپکے بعد اسلام پور میں آپ کے پوتے یعنی راقم الحروف کے والد ماجد حضرت سید محمد ایوب ابدالی... عرس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔" ص ۵۹

سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ مقالہ نگار کے والد سید محمد ایوب ابدالی اپنے انتقال کے بعد صوفی منیری کا عرس کس طرح کرتے ہیں؟ کیونکہ عرس کی اطلاع سے قبل وہ ان کی قبر کا ذکر کر چکے ہیں۔

منطقی اصول اجتماع نقیضین کے تحت دونوں مندرجہ بالا جملے رد ہو جاتے ہیں اس لیے کہ دونقیضوں

کا اجتماع اور ارتفاع دونوں محال ہیں ۔

تصنیفات صوفی منیری (ص ۶۰ - ۶۸)

○ "حضرت صوفی منیری کی ذات مجموعہ کمالات تھی ان کی شخصیت گوناگوں محاسن اور اوصاف کا مجموعہ تھی۔ ایسی جلوۂ صد رنگ شخصیت اور ایسی ہمہ پہلو ذات ان کے عہد و عصر میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے" ص ۶۰

(الف) مذکورہ بالا قول دراصل خاندانی عقیدت کا نتیجہ ہے ۔ یہ خاکہ نگاری کے ضمن میں تو آسکتا ہے، لیکن تحقیقی مقالے کا حصہ نہیں بن سکتا ۔

○ "حضرت صوفی منیری کے خالہ زاد بھائی جوشش منیری نے یہ قطعہ تاریخ لکھی (لکھا) ہے ۔

دل گفت کہ جند اسرا یائے رسول

جوشش منیری نے "مثنوی لوار المحر" کی تاریخ ۱۲۸۱ھ نکالی ہے جبکہ مصنف نے "مرأۃ حقیقت" سے ۱۲۸۰ھ سال تصنیف درج کیا ہے ۔ کسے صحیح تسلیم کیا جائے ؟

مقالہ نگار نے ۴۶ اشعار پر مشتمل "قصیدہ در مدح میرزا غالب" اور ۵ اشعار پر مشتمل ایک قطعۂ تاریخ کو (جسے صوفی منیری نے اپنے ماموں شاہ اعظم علی عرف بیکن منیری کے وصال پر لکھا تھا) دو علیحدہ تصنیف تسلیم کیا ہے ۔ اگر ان دونوں کو ایک مکمل تصنیف کہا جا سکتا ہے تو پھر صوفی منیری کی دیگر تحریریں مثلاً مثنوی خطبہ جمعہ (۷۰ اشعار)، شادی نامہ (۳۱ اشعار) ۔ نامۂ اردو (۱۱ اشعار)، قصیدہ در مدح سلطان عبد الحمید خاں غازی (۱۴ اشعار) قصیدہ در تہنیت جوبلی شصت سالہ ملکہ وکٹوریہ (۲۲ اشعار)، مسدس (۱۵ بند)، نوحہ (۱۵ اشعار)، قصیدہ (۲۳ اشعار) وغیرہ کو علیحدہ علیحدہ مکمل تصنیف کے ضمن میں کیوں نہیں رکھا جا سکتا ہے ؟ انھیں نظموں کے شمار میں کیوں رکھا گیا ؟

مآخذ اور فرق نسخ (ص ۶۹ - ۷۷)

○ "ایں کتاب (راحت روح) نور چشم سید علی سلمہ را عطا کردم" ص ۷۰

اس جملے کی سند ؟ جبکہ نہ تو مقالہ نگار نے اس تحریر کو دیکھا اور نہ ہی یہ تحریر اب موجود ہے ۔

اردو ادب میں تصوف کی روایتیں (ص ۷۸ - ۹۵)

○ "حضرت حمید الدین ناگوری، نظام الدین اولیا، شرف الدین بو علی قلندر اور نصیر الدین چراغ دہلی کا کوئی اردو فقرہ نہیں ملتا" ص ۸۶

(الف) شیخ حمید الدین ناگوری کا ایک فقرہ آپ کے ملفوظ "سرور الصدور" میں ملتا ہے جسے ڈاکٹر مسعود حسین خان

نے اپنی تصنیف "تاریخ زبان اُردو"، طبع دوم، ص ۱۳۰ پر درج کیا ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے: "فرمودہ است کہ بھلو ہوئیں، برومت ہوئیں، سب کو پیارو ہوئیں"۔

(ب) خواجہ نظام الدین اولیا کا کہا ہوا ایک ہندی جملہ حضرت ہاشم حسینی العلوی کے ملفوظ "مقصود المراد" میں ملتا ہے۔ "نظام کرتا آپ کرتار"۔ اس کا حوالہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنی تصنیف "اردو نثر کا آغاز و ارتقا" ص ۱۳ پر پیش کیا ہے اور یہ کتاب مقالہ نگار کی فہرست کتابیات میں موجود ہے۔

(ج) شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی کا ایک ہندی فقرہ اور ایک دوہا، بابائے اردو مولوی عبدالحق نے "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں نقل کیا ہے۔ فقرہ یہ ہے: تو کا کچھ سمجھو دا ہے۔" دوہا سے

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ ہوئے

(د) خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے تین ہندی فقرے ملتے ہیں (۱) "اِرے مولانا یہ بدا ہوی... جو منڈ سا بندی موپا بسری"۔ (۲) تو میرا گسائیں تو میرا کرتار، مجھا اس تاپ تھیں چھڈا... تو کرتا نہیں"۔ (۳) تم اوپر وے تلے"۔ اول الذکر دونوں جملے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے "تاریخ زبان اردو" میں خیر المجالس" ملفوظ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے حوالے سے بالترتیب ص ۱۳۳ اور ص ۱۳۵ پر نقل کیا ہے۔ موخر الذکر فقرہ شمس اللہ قادری نے "اردوئے قدیم" ص ۲۲ پر نقل کیا ہے۔

○ ص ۸۷ کے حاشیہ پر مقالہ نگار نے "سیر الاولیا" کے مصنف کا نام امیر خسرو بتایا ہے۔ یہ امیر خسرو نہیں بلکہ امیر خورد کی تصنیف ہے۔

○ "حامد حسن قادری نے اپنی تصنیف میں اُردو کی پہلی تصنیف حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ" (۶۸۸ھ تا ۸۰۸ھ) کے ایک اُردو رسالہ کو قرار دیا جو ۷۵۸ھ میں تصوف و اخلاق پر لکھا گیا۔ جدید تحقیق کی بنا پر حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالہ "جنونیہ" کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رسالہ بیجاپور کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنی تحقیق کے سلسلہ میں اس کا انکشاف کیا... اس رسالہ "جنونیہ" کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ (۷۵۹ھ) میں تصنیف ہوا ہے۔" ص ۸۸-۸۹

(الف) ڈاکٹر سید وحید اشرف نے اپنی تصنیف "حیات سید اشرف جہانگیر سمنانی" میں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مذکورہ بالا سنہ ولادت و سنہ وصال کو غلط قرار دیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق آپ کی ولادت ۷۰۹ھ اور ۷۱۲ھ کے درمیان ہوئی اور وصال ۸۲۹ھ اور ۸۳۲ھ کے درمیان ہوا۔

(ب) اگر فاضل مقالہ نگار سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا سنہ ولادت ۶۸۸ھ ہی تسلیم کرتے ہیں تو انھیں یہ بھی معلوم

ہونا چاہیے کہ ۲۵ سال کی عمر میں یعنی ۷۱۲ھ میں وہ اپنے تاج و تخت سے دست بردار ہوکر ہندستان تشریف لائے تھے۔ لہٰذا ۷۰۸ھ میں ان کے کسی رسالہ لکھنے کی بات غلط ثابت ہوتی ہے۔

(ج) "جدید تحقیق" کی وضاحت کرنی تھی۔

(د) حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے کوئی رسالہ "جنونیہ" کے نام سے نہیں لکھا ہے۔ جس رسالہ جنونیہ" کا ذکر مقالہ نگار نے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے حوالے سے پیش کیا ہے اس کے مصنف سید اشرف جہانگیر سمنانی نہیں بلکہ "محمد وفا" ہیں اور رفیعہ سلطانہ نے بھی اپنی تصنیف میں اشرف جہانگیر سمنانی نہیں بلکہ "محمد وفا" ہی لکھا ہے۔

(ہ) "کہا جاتا ہے" ایک تحقیقی مقالے کا جملہ نہیں ہو سکتا۔ مقالہ نگار کو اس سلسلے میں بیجاپور کے سرکاری عجائب خانے سے رابطہ قائم کرنا چاہیے تھا۔ بہرکیف! اس کے مزید تین نسخوں کا پتا چلتا ہے۔ اول حیدرآباد یونیورسٹی لائبریری میں (۱" دکنی اردو کے مخطوطات کا مجموعہ"، سید حسن عسکری، معاصر (پٹنہ) حصہ نمبر ۵، ۱۹۵۴ء) دوم خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف کے کتب خانے میں اور سوم خانقاہ منعمیہ گیا کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

(و) حامد حسن قادری کے قول کے مطابق جب اشرف جہانگیر سمنانی نے ۷۰۸ھ میں اخلاق و تصوف پر رسالہ لکھا تو "جدید تحقیق" کی بنا پر" حضرت اشرف جہانگیر سمنانی (محمد وفا) کے "رسالہ جنونیہ" کو جو ۷۰۸ھ کے بعد یعنی ۷۹۵ھ میں لکھا گیا۔ کیونکر "تقدم اور اولیت کا شرف" حاصل ہو سکتا ہے؟

(ز) "رسالہ جنونیہ" کو ہم اردو کی اولین نثر نہیں قرار دے سکتے۔ کیونکہ اس میں اردو مقولوں کی تشریح فارسی زبان میں کی گئی ہے۔ لہٰذا اسے ہم کوئی باقاعدہ اردو نثری تصنیف کا درجہ نہیں دے سکتے۔ دوم یہ کہ اسکے سنہ تصنیف کے سلسلے میں کوئی حتمی تحقیق نہیں ہے کہ آیا یہ واقعی ۷۹۵ھ کی تصنیف ہے یا اس کے بعد کی۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے یہ سنہ بیجاپور کے کیٹلاگ سے لیا ہے اس وضاحت کے ساتھ کہ: "یہ رسالہ ۷۹۵ھ کا مکتوبہ ہے۔ لیکن یہ سنہ متن رسالہ میں کہیں لکھا ہوا نہیں ملا۔ پتہ نہیں مرتب فہرست نے اس سنہ کو کہاں سے اخذ کیا۔"

○ "آپ (خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ) کے صاحب زادے اکبر حسینی (۷۱۲ھ – ۸۲۳ھ) نے نشاط العشق تصنیف حضرت عبدالقادر جیلانی کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔" ص ۹۰

گیسو درازؒ کے صاحبزادے اکبر حسینی نہیں بلکہ پوتے عبداللہ الحسینی نے نشاط العشق کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ "دکن میں اردو" (ص ۴۴) میں نصیر الدین ہاشمی اسے عبداللہ الحسینی ہی سے منسوب کرتے ہیں نیز "اردو شہ پارے" ص ۲۰ پر ڈاکٹر زور بھی اس سے متفق ہیں۔ ("اردو شہ پارے" کتابیات میں شامل ہے)۔

○ "شاہ دارا نے چودہ ورق کا ایک رسالہ "کشف الوجود" لکھا" ص ۹۰

شاہ دارا نہیں بلکہ "شاہ داول"۔ ملاحظہ فرمائیں اپنا ہی ماخذ یعنی "اردو نثر کا آغاز وارتقا" ص ۱۱۶

○ "شاہ میراں جی متوفی (۹۵۲ھ) ایک بڑے صوفی بزرگ تھے" ص ۹۰

شاہ میراں جی (شمس العشاق) کا سال وفات بابائے اُردو مولوی عبدالحق (اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام) ۹۰۲ھ، ڈاکٹر زور (اُردو شہ پارے) ۹۰۷ھ (ڈاکٹر نذیر احمد، علی گڑھ ادب اُردو، میں اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ "اُردو نثر کے آغاز وارتقا" میں ڈاکٹر زور سے متفق ہیں) اور ڈاکٹر حسینی شاہد (سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔ حیات اور کارنامے) ۹۸۱ھ قرار دیتے ہیں۔ اول الذکر اور موخر الذکر کے علاوہ بقیہ تمام کتابیں مقالہ نگار کی کتابیات میں موجود ہیں۔ اگر اختلاف تھا تو اس کی وضاحت بھی ضروری تھی۔

○ "(شاہ میراں جی شمس العشاق کی) نثر میں کئی تصنیف (تصانیف) جن میں گل باس، جل ترنگ، "شرح مرغوب القلوب" رسالہ تصوف مشہور ہیں" ص ۹۰

(الف) شمس اللہ قادری "شرح مرغوب القلوب" کو میراں جی شمس العشاق کا نہیں، بلکہ میراں جی خدا نما کی تصنیف بتاتے ہیں (اُردوئے قدیم طبع سوم ص ۶۹) اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

(ب) میراں جی کی مندرجہ بالا چاروں تصانیف کی فہرست، مقالہ نگار نے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی تصنیف "اُردو نثر کا آغاز وارتقا" ص ۵۳ سے نقل کی ہے۔ لیکن نقل کرنے میں کچھ چھوٹ گیا اور کچھ اضافہ بھی ہو گیا۔ مثلاً ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے رسالہ "جل ترنگ" کے بعد تیسرے نمبر پر رسالہ "سب رس" کا بھی نام دیا ہے۔ (جو وجیہ الدین علوی گجراتی کی تصنیف ہے اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اس سے بحث کی ہے۔) مقالہ نگار نے اسے چھوڑ دیا اور چوتھے نمبر پر "شرح مرغوب القلوب" دیا ہے اور اسے فن کے اعتبار سے "رسالہ تصوف" قرار دیا ہے۔ لیکن مقالہ نگار نے اس "رسالہ تصوف" کو ایک علیحدہ تصنیف سمجھ لیا۔

○ "شاہ علی محمد جیو گام دھنی کی تصنیف بھی پائی جاتی ہے" ص ۹۰

گفتگو اُردو کی نثری تصانیف کی چل رہی ہے۔ مقالہ نگار کو اگر شاہ علی محمد جیو گام دھنی کی کسی نثری تصنیف کا علم ہے تو اسے پیش کریں کیونکہ محققین کو اب تک انکی کسی نثری تصنیف کا پتا نہیں چلا ہے صرف انکے مجموعۂ کلام "جواہر اسرار اللہ" کا ذکر سبھی کرتے ہیں۔

○ "صوبہ بہار میں تو اُردو کی ابتدا صوفیانہ شاعری ہی سے ہوتی ہے چنانچہ عبدالقادر بیدل عظیم آبادی کے اشعار بھی اسی صوفیانہ رنگ میں ہیں" ص ۹۴

(الف) بالکل غلط! فاضل مقالہ نگار صوبہ بہار میں اُردو کی ابتدا اس سے قبل کے صفحوں میں حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد منیریؒ کے فقرے، کچھ مندرے، دوہے وغیرہ سے ثابت کرتے ہیں۔ کیا یہ دوہے، کچھ مندرے، فقرے وغیرہ صوفیانہ شاعری میں شمار کیے جاسکتے ہیں؟

(ب) بیدلؔ کے اردو اشعار اور ان اشعار کی روشنی میں بیدلؔ کو عظیم آبادی ثابت کرنے کے غلط رویے کے سلسلے میں اگر مقالہ نگار قاضی صاحب کے اعتراضات کا جواب دے دیں تو میں بھی بیدلؔ کی اردو شاعری کی روشنی میں بیدلؔ کو عظیم آبادی قرار دے سکتا ہوں۔

○ "عماد الدین پھلواروی مرتب اور مسلک کے اعتبار سے صوفی تھے اس لیے آپ کے اشعار میں بھی اسی خیال کی کارفرمائی ہے۔ غلام نقشبند سجاد خانوادۂ صوفیہ سے تھے۔ ان کے اشعار میں بھی اسی کی عکاسی ہے۔" ص ۹۴

فاضل مقالہ نگار اگر عماد الدین پھلواروی اور غلام نقشبند سجاد کی اردو شاعری سے متعلق قاضی صاحب کے اعتراضات کا جواب دے دیں تو میں بھی اسے تسلیم کرلوں گا۔

○ "شیخ غلام یحییٰ حضور، شاہ کمال علی کمال دیوروی، شاہ احسان اللہ چشتی، شاہ نور الحق تپاں مشہور صوفی شاعر ہیں۔" ص ۹۴

(الف) ۱۹۸۵ء میں مقالہ نگار کی ایک تصنیف "اُردو میں صوفیانہ شاعری" منظر عام پر آئی ہے اس میں مذکورہ بالا چاروں صوفی شعرا میں صرف کمال دیوروی اور نور الحق تپاں کا ذکر ہے بقیہ حضور اور احسان اللہ چشتی کا کوئی تذکرہ نہیں۔

(ب) نور الحق تپاں کے صرف مرثیے ہی مستند مانے جاتے ہیں ان کی غزلوں کو قاضی صاحب جعلی قرار دیتے ہیں۔

○ "شاہ ظہور الحق ظہور بھی ایک ممتاز صوفی شاعر تھے مرثیہ کا بھی ذوق تھا۔"

(الف) پہلے انھیں صوفی شاعر ثابت کریں پھر امتیاز دکھائیں کیونکہ ان کے صرف مرثیے دستیاب ہیں اور مرثیہ کو صوفیانہ شاعری کے ضمن میں نہیں رکھا جاسکتا ہے۔

(ب) "مرثیہ کا بھی ذوق تھا" ـــــ نہیں بلکہ مرثیہ کا ہی ذوق تھا کیوں کہ دیگر اصناف سخن پر ان کی طبع آزمائی کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔

اردو میں قصہ نگاری کا فن (ص ۱۰۰ - ۱۰۳)

○ جب ہم اُردو نثر کے سرمایے (سرمایہ) کا جائزہ لیتے ہیں تو اُردو نثر کے سرمایہ کو تین بڑے حصوں میں بانٹ سکتے ہیں (۱) قصوں کا سرمایہ (۲) مذہبی ادب کا سرمایہ (۳) علمی ادب کا سرمایہ۔ ان تینوں میں سب سے بڑا سرمایہ قصوں کا ہے۔" ص ۱۰۱

فاضل مقالہ نگار کی یہ تحقیق حقائق پر مبنی نہیں۔ کیونکہ اُردو میں مذہبی ادب کا سرمایہ بہت بڑا ہے۔ اب تک تقریباً

۳۱ ہزار کتابوں کا شمار سندھیات کے ذیل میں ہو چکا ہے (تفصیلات کے لیے دیکھیں "قاموس الکتب" جلد اوّل و دوم)
کیا مقالہ نگار اس قدر عظیم سرمایے کے مقابل قصوں کے سرمایے کو رکھ سکتے ہیں؟

رمزی اور ایمائی قصّوں کی روایت (ص ۱۰۴ - ۱۲۰)

"صوبہ بہار میں بھی تمثیلی داستانیں لکھی گئی ہیں جو اپنے عہد میں طبع ہو کر شہرت حاصل کر چکی ہیں۔" ص ۱۱۷
اس ذیل میں مقالہ نگار نے صرف دو کتابوں کا نام دیا ہے "کنز الفوائد" مصنفہ سید احمد عظیم آبادی ثم دہلوی مطبوعہ ۱۸۶۹ء اور دوسری "سلیمان بلقیس" مصنفہ ابراہیم آروی۔

(الف) سید احمد عظیم آباد کے نہیں بلکہ قصبہ بارو ضلع قدیم مونگیر و حال بیگو سرائے کے تھے۔

(ب) "سلیمان بلقیس" کے ذیل میں مقالہ نگار نے یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ کتاب مطبوعہ ہے یا غیر مطبوعہ؟ بہر کیف یہ کتاب مطبوعہ ہے اور مطبع اسٹار آف انڈیا، آرہ سے شائع ہوئی تھی۔ سنہ طباعت درج نہیں۔ مصنف کا پورا نام ابو محمد ابراہیم آروی تھا۔

(ج) فاضل مقالہ نگار اس ذیل میں ایک اور تمثیلی داستان تو بھول ہی گئے۔ "چمنستان سرور ترجمہ بہارستان شور" مترجمہ فخر الدین عرف فرخند علی خنداں سہسرامی مطبوعہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء۔

ادب میں رمزیت اور راحت روح کی رمزی حیثیت (ص ۱۲۱ — ۲۱۱)

فاضل مقالہ نگار کو اس تحقیقی مقالے کا عنوان "حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے" کی بجائے "حضرت صوفی منیری اور ان کی تصنیف راحت روح" رکھنا چاہیے تھا کیونکہ فاضل مقالہ نگار کا خاص موضوع "راحت روح" کا جائزہ ہی ہے۔ صفحہ نمبر ۱۲۱ سے صفحہ نمبر ۲۱۱ تک (کل ۹۱ صفحات جس میں ایک صفحہ یعنی صفحہ نمبر ۲۰ بالکل سادہ ہے) صرف "راحت روح" کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ بقیہ نثری کارناموں کی حیثیت ضمنی ہے یعنی بقیہ تصنیفات کا جائزہ صرف ۱۴ صفحات پر (ص ۲۱۲ - ۲۲۵ تک) پیش کیا گیا ہے اور اس میں بھی زیادہ حصہ اس تعارف پر مشتمل ہے جسے مقالہ نگار "تصنیفات صوفی منیری" کے عنوان کے تحت ص ۶۰ - ۶۸ تک پیش کر چکے ہیں۔

صوفی منیری کے دوسرے نثری کارنامے اور ان کا اسلوب بیان (ص ۲۱۲ - ۲۲۵)

"صوفیائے کرام کے تذکرے اردو میں اٹھارہویں صدی عیسوی تک دستیاب نہیں ہوئے ہیں" ص ۲۱۲
یہ نہایت ہی غیر محققانہ دعویٰ ہے۔ اٹھارہویں صدی تک اردو میں صوفیائے کرام کے سات تذکروں کا پتا چلتا ہے جس میں چار نثری رسالے ہیں: (۱) "محی الدین نامہ" مصنفہ سیف الدین، سنہ تصنیف ۱۱۰۷ھ (۲) رسالہ "مناقب" مصنفہ لا معلوم، سنہ تصنیف ۱۲۰۰ھ (حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے مناقب میں) (۳) "فیض عام قدس"

مصنفہ سید شہاب الدین سنہ تصنیف ۱۱۶۴ھ (سید محمد جونپوری کی سوانح حیات) (۴) "گلزار جنت" مصنفہ معتّلم سنہ تصنیف قبل از ۱۱۰۰ھ (حضرت نظام الدینؒ اور دیگر صوفیائے کرام کے حالات زندگی)۔ (قاموس الکتب" جلد اوّل مطبوعہ ۱۹۶۱ء ص نمبر بالترتیب ص ۲۱۹، ۲۲۲، ۲۲۶، ۲۶۳)

○ "دخمخانہ) فارسی نثر میں ایک مختصر رسالہ ہے جس میں پیمانہ بیمانہ کرکے اخلاق وتصوف کی تعلیم دی گئی ہے ۱۳۰۷ھ کی کتابت، مصنف نے اپنی کلیات میں تحریر کیا ہے۔" ص ۲۲۲

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ صوفی منیری کی تصنیف "خمخانہ" فارسی نثر میں ہے۔ سنہ کتابت ۱۳۰۷ھ ہے اور مصنف کی کلیات میں دیگر نسخوں کے ساتھ یہ نسخہ بھی ہے لیکن تصنیفات صوفی منیریؒ کے ذیل میں ص ۶۸ پر فرماتے ہیں:

"(خمخانہ) فارسی مثنوی میں یہ ایک رسالہ ہے۔ پیمانہ پیمانہ کرکے تصوف کے نکات بتائے ہیں...

یہ رسالہ کلیات صوفی منیری میں ص ۲۸۵ — ۳۲۹ تک تحریر ہے... اس کی کتابت ۱۳۰۶ھ کی ہے۔"

کیا ص ۶۸، اور ص ۲۲۲ کی دونوں کتابیں ایک ہی ہیں یا علیحدہ علیحدہ دو کتابیں ہیں۔ اگر ایک ہی ہیں تو ایک فارسی نثر میں اور دوسری فارسی نظم (مثنوی) میں کس طرح شمار ہو گئی۔ اور اگر دو ہیں تو اس کی وضاحت ضروری تھی۔

حاصل کلام، صوفی کا مقام (ص ۲۲۸)

○ "زبان وبیان کے لحاظ سے وہ دیگر مصنفین ہند سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں اور صوبہ بہار کے مصنفین کی صف میں گویا وہ امام نظر آتے ہیں۔" ص ۲۲۸

یہ نہایت ہی غیر محتاط اور غیر محققانہ جملہ ہے اور نہایت ہی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، اس جملے میں دراصل مقالہ نگار کی خاندانی عقیدت جھلک رہی ہے۔

کتابیات (ص ۲۳۲-۲۳۸)

مقالہ نگار نے کتابیات کی فہرست کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے اول مخطوطات، دوم مطبوعات۔ اور اس میں زبان کی کوئی قید نہیں رکھی ہے۔ لیکن ترتیب ابجدی ہے۔ مخطوطات کی کل تعداد ۶۱، اور مطبوعات کی کل تعداد ۹۵ ہے۔ اور آخر میں دس رسائل کا بھی ذکر ہے جس میں رسالہ "آجکل" اور "معارف" کے دو دو شمارے شامل ہیں۔ اس طرح رسائل کی تعداد ۱۲ ہو گئی اور کل مخطوطات، مطبوعات ورسائل کی تعداد ۱۶۸ ہوتی ہے۔

۲۵۴ صفحات پر مشتمل اس مطبوعہ تحقیقی مقالے میں ۱۹۲ جگہوں پر کل ۶۸ کتابوں کے حوالے پیش کیے گئے ہیں بقیہ ایک سو کتابوں کا کوئی ذکر نہیں۔

"کتابیات" میں شامل تمام کتابوں کا جائزہ لینا تو طوالت کا باعث ہوگا۔ لہٰذا اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے مخطوطات اور مطبوعات سے ابتدائی دس دس کتابوں کا مختصراً جائزہ پیش کرتا ہوں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ فاضل مقالہ نگار نے ان کتابوں سے کتنی مدد لی ہے اور کیا یہ کتابیں ان کے پیش نظر تھیں اور ان سے استفادہ کیا تھا یا صفحات کی تعداد یا مقالے کا وزن بڑھانے کے لیے انھوں نے اس فہرست میں شامل کر لیا ہے:

مخطوطات:

(۱) اجازت نامہ حضرت نجیب الدین فردوسیؒ: حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد منیری کی بیعت لینے کے بعد آپ کے پیر و مرشد حضرت شیخ نجیب الدین فردوسیؒ نے اجازت نامہ (خلافت نامہ) دیا تھا۔ یہ اجازت نامہ رسالے کی صورت میں آج بھی اکثر کتب خانوں میں ملتا ہے۔ مقالہ نگار موصوف نے اپنے اس مقالے میں کہیں بھی نہ تو حضرت مخدوم جہاں کی بیعت کے سلسلے میں کچھ لکھا ہے اور نہ ہی کہیں پر حضرت نجیب الدین فردوسی کا ذکر کیا ہے لہٰذا یہی کہا جا سکتا ہے کہ موصوف نے اس رسالے سے استفادہ نہیں کیا۔

(۲) "اخبار الاخیار" از مولانا عبد الحق محدث دہلوی: اس کا حوالہ کہیں بھی نہیں۔ اور نہ ہی کسی ایسے بزرگ کا تذکرہ پیش کیا ہے۔ جس کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ انھوں نے ان بزرگان کا تذکرہ لکھتے وقت "اخبار الاخیار" سے استفادہ کیا ہو۔

(۳) "اخبار الاصفیا" از عبد الصمد بن افضل: اس کتاب کا بھی حوالہ کہیں پر مذکور نہیں۔

(۴) "اوراد سلوک" از مصطفٰے جلال منیری: اس کتاب کے مقالے میں کہیں بھی ذکر نہیں۔ اس کا موضوع اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ لیکن اس موضوع سے متعلق مقالے میں کوئی بحث نہیں۔ لہٰذا اس کتاب کے ذکر سے بھی صرف تعداد میں اضافہ کرنا مقصود ہے۔

(۵) "پند نامہ" شاہ لطف علی کرسی منیری: اس کتاب کا بھی کہیں پر ذکر نہیں۔ سید شاہ لطف علی کرسی منیری، حضرت صوفی منیری کے حقیقی نانا تھے۔ ان کے متعلق مقالے میں صرف ایک جملہ ص ۴۴ پر ملتا ہے۔

"آپ (حضرت مبارک حسین عرف شاہ دھومن منیری) کے چھوٹے بھائی اور مجاز و خلیفہ حضرت شاہ لطف علی منیری صاحب علم و فضل صوفی بزرگ اور صوفی شاعر تھے۔"

اس کے علاوہ اور کہیں پر کوئی ذکر نہیں۔ یہاں تک کہ ان کی کسی تصنیف کا بھی کوئی ذکر نہیں۔

(۶) "تذکرہ صوفیہ" از برکت علی جونپوری: اس کتاب کا حوالہ مقالے میں کہیں پر مذکور نہیں۔

(۷) "تفسیر زاہدی" از احمد بن الحسن بن احمد سلیمانی: اس کا حوالہ کہیں پر مذکور نہیں۔ نیز مقالے میں تفسیر

کے موضوع پر کوئی بحث نہیں ۔

(۸) "جواہر خمسہ" از محمد غوث گوالیاری: مقالے میں کہیں پر حوالہ نہیں اور نہ ہی اس کتاب سے متعلق کوئی موضوع اس کتاب میں ہے ۔

(۹) "حضرات خمس" از حضرت حسین نوشہ توحید بلخی: کتاب اور مصنف دونوں میں کسی کا نام تک اس مقالے میں مذکور نہیں ۔

(۱۰) "حقیقت بھی کہانی بھی" از بدرالدین بدر عظیم آبادی: حوالہ کہیں پر مذکور نہیں اور اس سے وہ کیا استفادہ کر سکتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا۔

مطبوعات :

(۱) "آب حیات" از محمد حسین آزاد: پورے مقالے میں کہیں پر کوئی حوالہ نہیں ۔

(۲) "آثار شرف" از قاضی سید محمد نور الحسنین: پورے مقالے میں صرف ص ۱۶ پر "آثار شرف" سے متعلق صرف اسی قدر عبارت ملتی ہے :

"ایک مختصر رسالہ "آثار شرف" نامی ۱۲۸۲ھ میں قاضی سید محمد نور الحسن نے فارسی زبان میں لکھا اور طبع کرایا ہے۔ لیکن اس میں بہت مختصر اور غیر مربوط طریقہ پر آپ کے احوال ہیں ۔"

کیا اسے "آثار شرف" سے استفادہ کرنا کہیں گے؟

(۳) "آئین اکبری" از علامہ ابوالفضل علامی: کہیں پر کوئی حوالہ نہیں ۔

(۴) "اجوبہ کاکوی" از مخدوم جہاں شرف الدین احمد یحییٰ منیری: اس موضوع سے متعلق کوئی گفتگو اس مقالے میں نہیں کی گئی ہے، اور نہ ہی کہیں پر حوالہ ہے ۔

(۵) "ادبی اور قومی تذکرے" از کشن پرشاد کول: اس کا بھی کہیں پر ذکر نہیں ۔

(۶) "اذکار الابرار" از شاہ تقی حیدر کاکوروی: اس کتاب کا بھی کہیں حوالہ نہیں ۔

(۷) "اسد اللہ الغابہ فی احوال الصحابہ" از ابن الاثیر جوزی: اس کتاب کا بھی کہیں حوالہ نہیں اور اس کتاب کا نام اسد اللہ الغابہ ۔۔ نہیں بلکہ "اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابۃ" اور مصنف ۔۔۔ جوزی نہیں بلکہ ۔۔ جزری ہیں ۔

(۸) "اشعۃ اللمعات" از عبد الحق محدث دہلوی: پورا مقالہ اس کتاب کے نام سے خالی ہے ۔

(۹) "اصابہ فی تمیز الصحابہ" از ابن حجر عسقلانی: مقالے میں اس کتاب کا نام کہیں پر مذکور نہیں ۔

(۱۰) "بزم صوفیہ" از صباح الدین عبد الرحمٰن: اس کتاب کا نام سوائے "کتابیات" کے اور کہیں بھی مذکور نہیں ۔

ڈاکٹر محمد طیب ابدالی
صدر شعبۂ اردو
مگدھ یونیورسٹی۔ بودھ گیا (بہار)

جواب

مبصر (عطا خورشید) نے یہ تحریر کیا ہے کہ "(الف)۔ مقالہ نگار کو متعدد تذکروں اور نسب ناموں کے نام پیش کرنا چاہیئے تھا" میں نے ص ۱۳ میں تذکرہ اور نسب ناموں کے نہ صرف حوالے دیئے ہیں بلکہ اس کی تحریر بھی ہے ملاحظہ ہو "صبح صادق" مخطوطہ مصنفہ صادق اصفہانی مخطوطہ کتبخانہ مشرقیہ خدابخش خاں پٹنہ۔ "صبح صادق" جلد دوم ص ۶۲۱ میں تحریر ہے۔ " ابوجعفر محمد بن امام جعفر صادق دیباج لقب داشتہ در آنکہ امام را خروج بسیف لازم است باز پدید فق ہوا بودند " قال النصافی کان عاقلا شجاعا متسکا یصوم یوما ویفطر یوما "در تسع وتسعین مآہ خروج کرد . . . بگور سرخ مشہور است۔" ص ۱۳ کے حاشیہ میں "کنز الانساب" مصنفہ کبیر الدین، نسب نامہ۔ مرتبہ حضرت عبدالقادر اسلام پوری "منبع الانساب" تالیف سید معین الحق جھونسوی کے حوالہ جات ہیں۔

(ب)۔ "تذکرہ السادات" . . . امام محمد دیباج کو حضرت امام جعفر صادق کا دوسرا فرزند . . . چوتھا فرزند اور تیسرا فرزند بتایا گیا ہے۔"

مذکورہ عبارت لکھ کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق کے صرف چار صاحبزادے تھے۔ لیکن "منبع الانساب" مصنفہ سید معین الحق جھونسوی ص ۱۵ مخطوطہ کتبخانہ مشرقیہ خدابخش میں یہ تحریر ہے کہ " اسامے فرزندان حضرت امام جعفر صادق:۔ آنجناب را ہفت پسر بودند۔ ابراہیم و موسیٰ الکاظم و اسماعیل و اسحٰق و محمد دیباج و عباس و علی . . . از نسل محمد دیباج در مکہ و مدینہ خلافت گرفت و لقب او مامون بود و نسل او در خراسان و ماوراء النہر باشند" مذکورہ عبارت میں سات صاحبزادے ہیں جن میں پانچویں امام محمد دیباج کا ذکر ہے۔ خود عطا خورشید اس عبارت میں امام محمد دیباج کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

(ج)۔ " فاضل مقالہ نگار دیباج کے لقب سے مغالطے میں آگئے اور دو شخصیات کو ملا کر ایک کر دیا . . . تو صوفی منیری کا خاندان آل رسول نہیں بلکہ آل عثمان ہے۔"

حضرت صوفی منیری کو آلِ عثمانی ثابت کرکے ان کے نسب کو مجروح کیا گیا ہے۔ دیباج کے لقب سے عطا خورشید کو مغالطہ ہوا ہے۔ " صبح صادق " کی اس فارسی عبارت کو وہ نہیں سمجھ سکے ملاحظہ ہو :

" ابوجعفر محمد بن امام جعفر صادق دیباج لقب داشتہ "

اس فارسی عبارت کو اچھی طرح سمجھیں تو انھیں اندازہ ہوگا کہ طیب ابدالی نے مغالطہ کھایا یا عطا خورشید نے۔

" صوفی منیری کے نسب نامہ پدری . . . تو دونوں کی ولدیت میں فرق کیوں ہے۔" (ص ۱۱)

حضرت غلام مرتضیٰ کے والد کی کنیت صدر جہاں ہے اور نام جہانگیر۔ حضرت موصوف نسب ناموں میں کہیں کنیت سے مذکور ہیں تو کہیں نام سے۔ البتہ آپ کے دادا حضرتِ سید سدا حسینیؒ کا نام نامی دونوں ایک ہی ہے اس لیے ولدیت میں فرق کہاں ہوا۔ عطا خورشید نے اپنے تبصرہ کے ص ۱۱ میں تحریر کیا ہے :

" مقالہ نگار کی مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد بن یحیٰ منیریؒ کے تفصیلی حالات پر ایک کتاب بھی شائع ہو چکی ہے، لیکن مقالہ نگار موصوف ص ۴۳ پر دو جگہ حضرت مخدوم جہاں کو حضرت یحیٰ منیری کا منجھلا (تیسرا) صاحبزادہ قرار دیتے ہیں کہ جو حیرت انگیز ہے۔"

افسوس صد افسوس کہ جس کتاب پر تنقید کر رہے ہیں اس میں کاتب کی غلطی سے سنجھلا لکھا گیا تو اس میں (تیسرا) کا اضافہ وہ خود سے کر دیتے ہیں۔ عطا خورشید آگے تحریر کرتے ہیں :

" آپ (صوفی منیری) کی شادی ۱۲۶۹ھ میں ہوئی۔" (ص ۳۶)

عطا خورشید کو معلوم ہونا چاہئے کہ اپنے خاندان کا علم جتنا مجھے ہے اور ہوگا وہ خالد رشید صبا کو نہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی تصنیف کے " گذارش " میں یہ تحریر کیا ہے :

" ڈاکٹر خالد رشید صبا نے صوفی کی اردو شاعری پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کرکے غالبیات میں اضافہ کیا ہے۔ ان کوششوں کے باوجود ابھی تک آپ کے حالات پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی تھی۔" (گذارش (ل) حضرت صوفی منیری . . .)

مذکورہ بالا تحریر میری ہے جس کو عطا خورشید نہ دیکھ سکے۔ میں نے اپنی شکایت کو تہذیب کے انداز میں گذارش میں کر دیا ہے۔

عطا خورشید صاحب ص ۱۲۔ ۱۲ پر تحریر کرتے ہیں :

" یعنی نکاح ثانی کے مشورے کا مطلب یہ ہے کہ زوجہ اولیٰ حیات نہیں تھیں۔ جب زوجہ اولیٰ حیات نہیں تھیں تو زوجۂ ثانیہ کے محل سے ولادت کا سنہ ۱۲۹۱ھ قرار دے کر زوجہ اولیٰ کے یہاں تیسرے صاحبزادے کا سال ولادت ۱۲۹۵ھ کیسے قرار دیتے ہیں۔ اگر مقالہ نگار کی نظر میں یہ سنہ صحیح تھا تو خالد رشید صبا سے اختلاف بھی ضروری تھا۔"

حضرت شاہ سید علیؒ کا میں پوتا ہوں اور حضرت صوفی منیری میرے پر دادا۔ جتنا میں ان کے متعلق جانتا ہوں۔ ڈاکٹر خالد رشید صبا نہیں جان سکتے۔ صوفی منیری کی پہلی شادی حضرت شاہ ولایت علی ہمدانیؒ کی صاحبزادی مسماۃ بی بی قدیرن سے ہوئی جس سے تین صاحبزادے ہوئے۔ بڑے حضرت عبدالقادر سجادہ نشیں خانقاہ اسلام پور۔ منجھلے صاحبزادے حضرت حاجی محمد عمرؒ چھوٹے صاحبزادے حضرت شاہ سید علیؒ۔ ان کا سنہ ولادت ۱۲۹۵ھ ہے۔ زوجہ ثانیہ سے شادی زوجہ اولیٰ کی رضامندی سے ہوئی اور ان کی حین حیات ہی میں ان کے ساتھ اسلام پور میں رہیں جن سے سید اسداللہ پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت ۱۲۹۱ھ اس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہیئے تھا۔

غالبؔ اور صوفی کے تحت لکھا ہے۔

"متعدد تصنیفات اور تالیفات کا نام دینا چاہیئے۔"

کیا عطا خورشید کو مکاتیب غالبؔ۔ مولفہ غلام رسول مہرؔ، نادر تحریریں خلیق انجم وغیرہ تالیفات و تصنیفات میں شامل نہیں۔ پھر اتنی بڑی گرانقدر ہستیوں کے حوالے ہیں۔ اور آسانی سے "صوفی منیری کے نام غالبؔ کا یہ خط سراسر جعلی ہے" ص ۴۰ پر تحریر کر دیا ہے۔ جب کہ تمام مشاہیر ادبا کے حوالے ہیں۔ کیا عطا خورشید کی عالمانہ صلاحیت کے سامنے سب جھوٹے ہیں۔؟

●●

ڈاکٹر علی ابدالی
خانقاہ اسلام پور، مالدہ

ڈاکٹر محمد طیّب ابدالی کا تحقیس

حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے

حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے، ڈاکٹر محمد طیب ابدالی (مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۷۷ء) کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔ کتاب کے ابتدا میں ایک باب "گذارش" کے عنوان سے ہے اس میں لکھتے ہیں: "ہند و پاک کے تمام معیاری رسائل میں صوفی منیری پر تحقیقی مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ غالبیات پر بھی جتنی کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ ان میں صوفی کا تذکرہ موجود ہے" آگے چل کر لکھتے ہیں: "ان کوششوں کے باوجود آپ کے حالات پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے"۔

لیکن انھوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ مقالے کن لوگوں نے لکھے اور وہ شخص کون ہے جس کے سبب ان کا نام متعدد کتابوں میں آرہا ہے؟ یقیناً انھوں نے ان مقالات سے استفادہ کیا ہوگا لیکن حوالہ کہیں نہیں دیا۔ کتاب میں ایک باب ایسا ہونا چاہیے تھا جس میں ان مقالات یا کتابوں کا ذکر ہونا چاہیے تھا اور ضروری اقتباس بھی جس میں صوفی کا ذکر موجود ہے یا جو خاص صوفی منیری پر لکھے گئے۔ جن کتابوں میں صوفی کا نام آیا ہے ان کا ماخذ رخشاں ابدالی کے دو مضامین مطبوعہ معارف اور مخزن کے علاوہ غالب کا خط صوفی کے نام مطبوعہ معارف اور منشی مہیش پرشاد کا مضمون مطبوعہ ہندوستانی الہ آباد ہے۔ جہاں تک صوفی منیری سے متعلق مقالات کا تعلق ہے وہ صرف رخشاں ابدالی نے لکھے جو ہندوستان اور پاکستان کے معیاری رسالوں میں شائع ہوئے۔ حقیقت تو یہ ہے صوفی کی شہرت رخشاں ابدالی کے مقالات ہی کے سبب ہوئی۔ ان کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ "ان کے حالات پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی" رخشاں ابدالی کے مقالات میں ان کے حالات زندگی تفصیل سے لکھے گئے ہیں اور ساری تصنیفات اردو فارسی نظم و نثر کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ مضمون طویل ہو جائے گا ورنہ میں ان کے مقالات سے مثالیں پیش کرتا۔ سیاسی پس منظر کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا زیادہ تر حصہ فصیح الدین بلخی کی کتاب "تاریخ مگدھ" سے ماخوذ ہے لیکن کتاب کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے جب کہ کتابیات کے باب میں "تاریخ مگدھ" موجود ہے۔

ص۳۲ اور ص۳۳ کے درمیان صوفی منیری کا جو پدری نسب نامہ دیا ہے۔ اس میں بی بی حنیفہ زوجہ غلام مرتضیٰ ابدالی کو لطف علی ہمدانی کی بیٹی لکھا ہے اور بی بی لطیفہ زوجہ احمد علی ابدالی کو بھی لطف علی ہمدانی کی بیٹی لکھا ہے۔ ایسا کیوں کر ممکن ہے؟ دراصل بی بی حنیفہ زوجہ غلام مرتضیٰ ابدالی ملا محمد اشرف ہمدانی بن رفیع الدین ہمدانی کی صاحبزادی تھیں جن کے صاحبزادے احمد علی ابدالی تھے۔ ملا محمد اشرف ہمدانی کے صاحبزادے کا نام عظیم اللہ ہمدانی تھا نہ کہ عظیم الدین ہمدانی۔ انہی عظیم اللہ ہمدانی کے صاحبزادے لطف علی ہمدانی تھے۔ جن کی صاحبزادی بی بی لطیفہ تھیں۔ جو احمد علی ابدالی سے بیاہی گئی تھیں جن کے بطن سے صوفی منیری کے والد محمد علی ابدالی ہوئے۔

صفحہ ۳۴ اور صفحہ ۳۵ کے درمیان مادری کرسی نامہ دیا ہے۔ اس میں صوفی منیری کے تین صاحبزادوں کا نام تو دیا ہے اور ایک صاحبزادی کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کا نام نہیں دیا ہے بڑی صاحبزادی کا نام انھوں نے نہیں دیا۔ شاہ عبدالقادر صاحب کے دو صاحبزادوں اور ایک صاحبزادی کا نام نہیں ملتا۔ اسی طرح پر منجھلے صاحبزادے شاہ عمر صاحب کے ایک صاحبزادے اور صاحبزادیوں کا نام نہیں۔ شاہ سید علی صاحب کی صاحبزادیوں کا نام بھی نہیں ملتا۔ شاہ ابوالبرکات۔ رخشاں ابدالی۔ حافظ محمد یحییٰ ابدالی۔ شعیب ابدالی اور شاہ عطاء الرحمٰن کی جملہ اولاد کا نام شجرہ میں نہیں ملتا۔ اپنے بھائیوں کا نام تو دیا ہے لیکن بہنوں کا نام نہیں دیا ہے۔ رہ گیا بھائیوں اور بہنوں کی اولاد کا نام تو وہ بھی نہیں ملتا۔ جبکہ اپنے سارے بیٹوں کا نام مع عرفیت دیا ہے۔

انھوں نے اپنے دادا شاہ سید علی صاحب کی پہلی شادی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ان کی پہلی شادی خود صوفی منیری نے اپنے خالہ زاد بھائی خلیل الدین احمد جوشش منیری کی نواسی (شاہ مقصود نوآبادی کی صاحبزادی) بی بی فاطمہ سے کی تھی جن کے بطن سے ایک صاحبزادی بی بی مریم ہوئیں جن کی شادی شاہ عبدالقادر اسلام پوری کے منجھلے صاحبزادے احمد ابدالی سے ہوئی تھی۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد شاہ سید علی صاحب کی دوسری شادی فتوحہ میں ہوئی۔

صفحہ ۳۸ پر لکھا ہے "شاہ اولاد علی نے اپنا مرید ومجاز وجانشین صوفی منیری کو بنایا" شاہ اولاد علی اپنے ماموں بیکن منیری کے مرید ومجاز ضرور تھے۔ وہ ان کے جانشین کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ جبکہ وہ خود بھی سجادہ نشیں نہ تھے۔ منیر شریف کی سجادگی پر شاہ مومن منیری کے صاحبزادے شاہ قطب الدین منیری جس کی تفصیل وسیلۂ شرف میں موجود ہے۔ شاہ اولاد علی صاحب نہ تو اپنے والد سے مرید تھے اور نہ انہیں آبائی سلاسل کی اجازت ہی ملی تھی۔ رہ گئی آبائی سجادگی تو شاہ اولاد علی کے والد کے دادا شاہ غلام مرتضیٰ ابدالی نے اپنا جانشین اپنے نواسے شاہ ابدال بخش ہمدانی کو بنایا تھا۔ اگر شاہ اولاد علی صاحب کو سجادہ نشین ہی مان لیا جائے تو انھوں نے اپنا جانشین

اپنے نواسی داماد شاہ احتشام الدین حید مشرقی منیری کو بنایا تھا مشرقی منیری کی بیاض میں شاہ اولاد علی کا خلافت نامہ موجود ہے جس کی کتابت صوفی منیری اور مشرقی منیری نے کی ہے۔ یہ خلافت نامہ سنیچر ۲۷ ربیع الاول ۱۳۰۶ھ کو لکھا گیا۔ ملاحظہ ہو۔

"فقیر ابوالبرکات امیر الدین حسین المشتہر بہ سید اولاد علی زاہدی الفردوسی المنیری اصلح اللہ اعمالہٗ وحصل امالہ میگوید کہ لائق تلقین وارشاد اذکار واشغال وسزاوار خلافت دیدم برادر زادہ عزیز برخوردار شاہ ابوالمعالی محمد احتشام الدین منیری را د فقہ اللہ بالخیر وحفظ عن الشر والخیر اجازت وخلافت سلسلۂ چشتیہ وسلسلہ فردوسیہ وسلسلۂ دولتیہ فردوسیہ وسلسلۂ زاہدیہ وقادریہ ونقشبندیہ وشطاریہ ماداریہ وطیفوریہ وسائر خانوادہ ہائے مختلفہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اورا دادم وآنچہ از پیر ومرشد وپیران خود یافتم ہمہ بدو بخشیدم وخلیفہ ومجاز وجانشین خود گردانیدم"

اس خلافت نامہ پر شاہ اولاد علی نے خود اپنے قلم سے لکھا ہے۔ "صحیح فقیر ابولبرکات امیر الدین حسین عرف اولاد علی زاہدی الحسینی غفرلہٗ"۔

شاہ اولاد علی زاہدی نے جو اجازت وخلافت اپنے بھائی صوفی منیری کو دی ہے اس کے الفاظ بھی ملاحظہ کیجیے۔

"بداں مجاز است دیدم برادر عزیز واقف اسرار الٰہی مسمی ابو محمد جلیل الدین حسین المعروف بہ سید فرزند علی برادر حقیقی خود را خلیفہ ومجاز گردانیدم"

ص۵۵ کتابت الاسناد مرتبہ حضرت شاہ ابوالبرکات اسلام پوری اس کی کتابت ڈاکٹر طیب ابدالی کے والد ماجد حضرت شاہ ایوب ابدالی نے ۲۹ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ کو کی۔

اب ذرا شاہ اعظم علی عرف شاہ بیکن منیری کے اسی خلافت نامہ کے الفاظ بھی ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے اپنے بھانجے شاہ اولاد علی کو دی ہے "بداں مجاز است دیدم مسمی ابوالبرکات سید امیر الدین حسین المعروف بہ سید اولاد علی ہمشیرہ زادہ خود را خلیفہ ومجاز گردانیدم" ص۵۲ کتاب الاسناد۔

یہ خلافت نامے مشرقی منیری کی بیاض میں بھی موجود ہیں جن کی کتابت صوفی منیری نے کی ہے صفحہ ۴۴ پر لکھتے ہیں۔

"آپ کے خالہ زاد بھائی جوش منیری بھی شاعر تھے اور آپ عبد الغفور نساخ سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ آپ بھی نساخ سے مشورہ سخن لیتے لیکن آپ نے قبول نہ کیا"

پتہ نہیں یہ انھوں نے کہاں سے لکھ دیا؟ صوفی منیری نے جن وجوہات کے سبب غالب سے اصلاح لینا پسند کیا اسے اس خط میں لکھ دیا ہے جسے انھوں نے اپنے کلام کے ساتھ غالب کے پاس بھیجا تھا۔

تلامذہ صوفی کے ذکر میں ص۱۲۵ تا ص۱۳۴ مشرقی منیری کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے کہ مشرقی کے حالات

کہاں سے لیے گئے ہیں۔ دراصل یہ حالات رخشاں ابدالی کے مضمون "حضرت مشرقی منیری مرحوم" مطبوعہ فطرت ژنجگیر مارچ ۱۹۲۴ء سے لیے گئے ہیں۔ اسی طرح میر عطا بہاری کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بھی رخشاں ابدالی کے مضمون "عطا بہاری" مطبوعہ سہیل خاص نمبر ۱۹۴۰ء سے ماخوذ ہے یہاں بھی انھوں نے حوالہ نہیں دیا ہے۔

ڈاکٹر طیب ابدالی کی کتاب کا نام "حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے" ہے لیکن انھوں نے اس کتاب میں صوفی منیری کی ساری نثری تصانیف کا جائزہ نہیں لیا ہے۔ "راحتِ روح" کا جائزہ کسی قدر تفصیل سے لیا گیا ہے اور اس کا تقابلی مطالعہ چند کتابوں سے کیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ بھی بتایا جاتا کہ صوفی منیری کی اسی کتاب کا ماخذ کیا ہے۔ وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ لیکن دیگر تصانیف کا سرسری ذکر کرنا ہی ضروری سمجھا گیا۔

آخر میں صوفی منیری سے چلنے والے شجرے بھی دیے گئے ہیں۔ صوفی منیری اپنے خسر شاہ ولایت علی ہمدانی کے حلقہ میں بیٹھے تھے اور سلاسل اور اورادو احزاب کی اجازت ان سے پائی تھی۔ لیکن انھوں نے کسی کو بھی اپنے ننہالی سلاسل کے علاوہ دوسرے سلاسل کی اجازت نہیں دی جیسا کہ ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر اسلام پوری نے "انوارِ ولایت" میں لکھا ہے۔ انوارِ ولایت کی اصل عبارت دیکھیے: "جناب نانا صاحب علیہ الرحمۃ نے کچھ دنوں آپ کو اپنے حلقہ میں بھی بٹھایا تھا اور اجازت و خلافت بھی دی تھی لیکن چونکہ آپ کو حضرت مخدوم علیہ الرحمہ سے بہت ہی شغف تھا اس لیے آپ نے روشِ فردوسیہ ہی اختیار کی بلکہ اور لوگوں کو بھی اپنے ننہالی خاندانی شجرے کے کسی دوسرے سلسلے کی اجازت نہیں دی۔" ص۱۲۸ انوارِ ولایت مطبوعہ اخی المطابع پٹنہ

میرے پیشِ نظر صوفی منیری کے دو خلافت نامے ہیں۔ پہلا بڑے صاحبزادے شاہ عبدالقادر اسلام پوری کے نام اور دوسرا منجھلے صاحبزادے شاہ عمر اسلام پوری کے نام۔ ان دونوں خلافت ناموں سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ منیر شریف کے سلاسل کے علاوہ دوسرے سلاسل کی اجازت انھوں نے کسی کو نہیں دی۔ ڈاکٹر طیب ابدالی کا یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ ان کے دادا شاہ سید علی صاحب کو اورادِ فتحیہ کی اجازت صوفی منیری نے دی۔ دراصل شاہ عبدالقادر اسلام پوری نے اپنے چھوٹے بھائیوں کو اپنے نانا کے سلاسل اور اورادو احزاب کی اجازت دی۔

●●

ڈاکٹر محمد طیب ابدالی
صدر شعبۂ اردو
مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا۔

جواب

مجھے خوشی ہے کہ شاہ علی ابدالی (جو میرے چچازاد بھائی، شاگرد اور میرے زیر نگرانی پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ پر انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی ملی ہے) نے میری تحقیقی تصنیف پر محققانہ اور ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور تسامح اور تحریف سے کام لے کر تحقیق کے معیار کو بلند کیا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے بزرگوں پر بھی کچھ ایسے اعتراضات کیے ہیں جو ان کو زیب نہیں دیتے بلکہ اس میں خاندانی اختلافات کی بنا ڈالی ہے اور مجھے جاہل اور تحقیق سے بے بہرہ سمجھتے ہیں ع اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

بہرکیف وہ ٹھنڈے دل سے اپنے اعتراضات کے جوابات پر غور کریں تاکہ آئندہ کسی دوسری تصنیف پر اس قدر غیر دانشمندانہ اقدام نہ کر سکیں۔ مقالہ نگار صٹ پر لکھتے ہیں

"کتاب کی ابتدا میں ایک باب "گذارش" کے عنوان سے ہے۔ اس میں (طیب ابدالی) لکھتے ہیں کہ "ہند و پاک کے تمام معیاری رسائل میں صوفی منیری پر تحقیقی مقالے شائع ہو چکے ہیں غالبیات پر بھی جتنی کتابیں طبع ہو چکی ہیں ان میں صوفی کا تذکرہ موجود ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں "ان کوششوں کے باوجود آپ کے حالات پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔"

لیکن انھوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ مقالے کن لوگوں نے لکھے اور وہ شخص کون ہے جس کے سبب ان کا نام متعدد کتابوں میں آ رہا ہے؟ یقیناً ابدالی نے ان مقالات سے استفادہ کیا ہوگا لیکن حوالہ کہیں نہیں دیا کتاب میں ایک باب ایسا ہونا چاہیے تھا جس میں ان مقالات یا کتابوں کا ذکر ہونا چاہیے تھا اور ضروری اقتباس بھی جس میں صوفی کا ذکر موجود ہے یا جو خاص صوفی منیری پر لکھے گئے۔ جن کتابوں میں صوفی کا نام آیا ہے ان کا ماخذ رخشاں ابدالی کے دو مضامین مطبوعہ معارف اور تحریر کے علاوہ غالب کا خط صوفی کے نام مطبوعہ معارف اور منشی مہیش پرشاد کا مضمون مطبوعہ ہندوستانی الہ آباد ہے جہاں تک صوفی منیری سے متعلق مقالات کا تعلق ہے وہ صرف رخشاں ابدالی نے لکھے جو ہندوستان اور پاکستان کے معیاری رسالوں میں شائع ہوئے۔ حقیقت تو یہ ہے صوفی کی شہرت رخشاں ابدالی کے مقالات ہی کے سبب ہوئی۔ ان کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ "ان کے حالات پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی" رخشاں ابدالی کے مقالات میں ان کے حالات زندگی تفصیل سے لکھے گئے ہیں اور ساری تصنیفات

اردو فارسی نظم و نثر کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ مضمون طویل ہو جائے گا ورنہ میں ان کے مقالات سے مثالیں پیش کرتا۔ سیاسی پس منظر کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا زیادہ تر حصہ فصیح الدین بلخی کی کتاب "تاریخ مگدھ" سے ماخوذ ہے لیکن کتاب کا حوالہ نہیں دیا گیا جبکہ کتابیات کے باب میں "تاریخ مگدھ" کا نام موجود ہے۔" (مقالہ ص۲)

مذکورہ بالا عبارت جناب علی ابدالی صاحب کی ہے جس میں انھوں نے تسامح سے کام لیا ہے یا میری عبارت کو جان بوجھ کر نظر انداز اسی طرح کیا ہے جس طرح لاتقربوا الصلوٰۃ کو بیان کیا جاتا ہے اور انتم سکاریٰ کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میں نے گذارش میں جو کچھ لکھا ہے اس کی عبارت اس طرح ہے۔ ملاحظہ ہو:

" بہار کی ادبی دنیا میں حضرت صوفی منیریؒ محتاج تعارف نہیں۔ ہند و پاک کے تقریباً تمام معیاری رسائل میں صوفی منیریؒ پر تحقیقی مضامین شایع ہو چکے ہیں۔ غالبیات پر بھی جتنی کتابیں طبع ہوئی ہیں۔ اس میں صوفیؒ کا تذکرہ موجود ہے ڈاکٹر خالد رشید صبا نے صوفی کی اردو شاعری پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کر کے غالبیات میں اضافہ کیا ہے۔ ان کوششوں کے باوجود ابھی تک آپ کے حالات پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی تھی۔ بالخصوص آپ کے نثری کارنامے توجہ کے مستحق تھے میں نے پہلی مرتبہ صوفی منیریؒ کے اردو نثری کارنامے کو اپنے تحقیقی کام کا موضوع بنایا اور تحقیق و جستجو کے بعد اسے منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے اور ان پر تفصیلاً ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔" (حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے ص ل)

مذکورہ بالا عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میں نے نام بنام ہند و پاک کے تمام معیاری رسائل کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن ان کی معلومات کا اعتراف کیا ہے۔ بلکہ غالب کے خط کے سلسلے میں چونکہ تفصیل کی ضرورت تھی اس لیے حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے ص۲۳ حاشیہ میں یہ تحریر کر دیا ہے:

" اس خط کو سب سے پہلے سید سلیمان ندوی نے "معارف اعظم گڈھ ماہ نومبر ۱۹۲۰ء میں اور منشی مہیش پرشاد نے ہندوستانی الہ آباد ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔ غلام رسول مہر نے مکاتیب غالب، ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو نے علی گڈھ میگزین غالب نمبر اور احوال غالب میں۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے "آجکل" دہلی ۱۹۵۷ء کے مکاتیب نمبر میں طبع کرایا۔ اس کے علاوہ بھی متعدد تصنیفات و تالیفات میں اس خط کی نقل اہل قلم حضرات نے پیش کی ہیں۔" (حضرت صوفی ص۲۳)

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ علی ابدالی نے اس تصنیف کا مطالعہ نہیں کیا ہے یا اپنی کم فہمی کی وجہ سے وہ لفظ جملے اور عبارت کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔

علی ابدالی کا یہ کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے اور رخشاں ابدالی کی بھی شخصیت کو مجروح کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

" ان کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ " ان کے حالات پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی" رخشاں ابدالی کے مقالات میں

ان کے حالات زندگی تفصیل سے لکھے گئے ہیں اور ساری تصنیفات اردو فارسی نظم ونثر کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔"

یہ حقیقت ہے کہ اس تصنیف سے پہلے حضرت صوفی منیری کے حالات زندگی پر خاطرخواہ روشنی نہیں ملتی ہے جس کا اعتراف خود درخشاں ابدالی صاحب نے بھی اپنے ایک خط میں کیا ہے جو انھوں نے اکتوبر ۱۹۸۷ء میں اس کتاب کے مطالعہ کے بعد کراچی سے مجھے لکھا ہے۔ مزید یہ بھی لکھا ہے کہ عروۃ الوثقیٰ اور راضع الناس کا مجھے علم نہیں اور میں نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھوٹے ابا حضرت شاہ سید علیؒ کے پاس محفوظ تھا اور پردۂ گمنامی میں رہا۔

حضرت صوفی منیریؒ کے حالات زندگی کے ماخذ ان کے چھوٹے صاحبزادے میرے دادا حضرت شاہ سید علیؒ تھے جو سفروحضر میں بھی حضرت صوفی منیری کے ساتھ رہے۔ جب منیر شریف میں رہتے تو انھیں اپنے ساتھ لے جاتے اور جب اسلام پور میں رہتے تو ان ہی کے پاس رہتے۔ اسی لیے حضرت صوفی منیریؒ کے حالات زندگی کا علم میرے والد حضرت سید شاہ ایوب ابدالی کو سب سے زیادہ تھا اور درخشاں ابدالی کے بھی وہی ماخذ تھے۔ پھر میں کیوں نہ اصلی ماخذ سے استفادہ کرتا۔ ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ علی ابدالی کو میرے ماخذ کا بھی علم نہ ہو سکا حالانکہ میں نے گذارش میں اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"حالات صوفی منیری کے علم میں بھی معتدد اضافہ کیا گیا ہے اور ان گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے جو پردۂ گمنامی میں تھے اور توجہ کے مستحق تھے۔ ان کی مستند تحقیق ان کے خاندان میں ان کے پوتوں سے ہوئی اور ان سے بھی ہوئی جنھوں نے حضرت صوفی منیریؒ کی خدمت میں اپنے بچپن کا زمانہ گزارا ہے اور انھیں آپ کے حالات مستند طور پر معلوم تھے۔" (گذارش ص ۱)

علی ابدالی کی کور بینی کا اندازہ کیجیے کہ یہ عبارت ان سے نہ پڑھی گئی۔ اور انھوں نے اپنے والد حضرت ابوالبرکات ابدالی اپنے عم محترم درخشاں ابدالی اور میرے والد محترم حضرت شاہ ایوب ابدالی کو پوتوں کی فہرست سے خارج کر دیا۔ علی ابدالی کو شکایت ہے کہ درخشاں ابدالی کے مضمون ہی سے استفادہ کیا ہے اور ان کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ تو جناب علی ابدالی کی یہ خام خیالی ہے اس لیے کہ جب مجھے اصلی ماخذ سے بلاواسطہ استفادہ کا موقع ملا تو پھر میں بالواسطہ درخشاں ابدالی کے مختصر مقالے سے کیوں استفادہ کرتا اور اور پھر درخشاں ابدالی کا جو ماخذ ہے وہی میرا بھی ماخذ ہے۔ آنجناب کو اتنا بھی اندازہ نہیں ہے کہ مقالے میں کتنے تفصیلی حالات ہوتے ہیں اور اسی موضوع پر کتاب میں کتنے تفصیلی حالات درج ہوتے ہیں موصوف درخشاں ابدالی کا کوئی بھی مقالہ نہیں پیش کر سکتے ہیں جس میں حضرت صوفی منیریؒ کے تفصیلی حالات ہیں۔ بلکہ ان کے کسی مقالے میں بھی ان کے نثری کارناموں کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے پھر علی ابدالی کا یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے کہ درخشاں ابدالی کے مقالات میں ان کے حالات زندگی تفصیل سے لکھے گئے ہیں اور ساری تصنیفات اردو فارسی نظم ونثر کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ حالانکہ صوفی منیری کی تصانیف کے سارے مسودے اس لیے میرے پاس محفوظ ہیں کہ حضرت صوفی منیری نے اپنے چھوٹے صاحبزادے حضرت شاہ سید علی کو عطا کر دیا تھا اور ان سے میرے والد حضرت شاہ ایوب ابدالی

کو ملا اور پھر مجھے وہ مسودے ملے۔ حیرت تو یہ ہے کہ عروۃ الوثقیٰ اور رامح الناس کے نامکمل نسخے کو رخشاں ابدالی صاحب نے دیکھا تک نہیں ہے اس لیے اس تصنیف کے بعد رخشاں ابدالی صاحب نے مجھے خط لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ افسوس ہے کہ ابھی تک عروۃ الوثقیٰ اور رامح الناس کے نثری نمونے میری نظر سے نہیں گذرے

میں نے تاریخ مگدھ سے جو استفادہ کیا ہے تو اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اگر لفظ بہ لفظ عبارت نقل کر دیتا تو حاشیہ میں اس کا حوالہ دے دیتا لیکن افسوس ہے کہ علی ابدالی کو اس کا علم نہیں کہ اگر کسی کتاب سے کچھ استفادہ کیا جاتا ہے تو کتابیات میں اس کا حوالہ ضرور دیا جاتا ہے جو میری تصنیف میں موجود ہے۔

علی ابدالی نے حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے ص ۲۳ تا ۲۴ کے حوالے سے نسب نامہ پدری پر جو اعتراض کیا ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔ ملاحظہ ہو:

"ص۲۲ اور ص۲۳ کے درمیان صوفی منیری کا جو پدری نسب نامہ دیا ہے اس میں بی بی حنیفہ زوجہ غلام مرتضیٰ ابدالی کو لطف علی ہمدانی کی بیٹی لکھا ہے اور بی بی لطیفہ زوجہ احمد علی ابدالی کو بھی لطف علی ہمدانی کی بیٹی لکھا ہے ایسا کیوں کر ممکن ہے؟ دراصل بی بی حنیفہ زوجہ غلام مرتضیٰ ابدالی ملا محمد اشرف ہمدانی بن رفیع الدین ہمدانی کی صاحبزادی تھیں جن کے صاحبزادے احمد علی ابدالی تھے۔ ملا محمد اشرف ہمدانی کے صاحبزادے کا نام عظیم اللہ ہمدانی نہیں عظیم اللہ ہمدانی کے صاحبزادے لطف علی ہمدانی تھے جن کی صاحبزادی بی بی لطیفہ تھیں جو احمد علی ابدالی سے بیاہی گئی تھیں جن کے بطن سے صوفی منیری کے والد محمد علی ابدالی ہوئے۔" (مقالہ شاہ علی ابدالی ص۳)

مذکورہ بالا عبارت علی ابدالی کے مقالہ کی ہے جس میں نسب نامہ کی ہمدانی کا اظہار کیا گیا ہے اور نسب نامہ پدری پر اعتراض کیا گیا ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔

یہ شجرہ نسب میرے والد حضرت سید شاہ ایوب ابدالی نے مرتب کیا ہے اور وہ دراصل علی ابدالی کے دادا حضرت سید شاہ عبدالقادر ابدالی اسلام پوری کے مرتبہ نسب نامہ کی نقل ہے جو صحت پر مبنی ہے۔ اس وقت میرے پاس سب سے قدیم نسب نامہ خاندانی ابدالی وزاہدی از دست خط میں سید غلام مرتضیٰ ابدالی مخطوطہ ۱۲۴۳ھ اور کتاب الانساب مرتبہ حضرت شاہ عبدالقادر ابدالی اسلام پوری موجود ہے۔ میں نے اس مقالے کے بعد پھر اس کا مطالعہ کیا تو وہی بات ہے جو میری تصنیف کے ص۲۲ تا ص۲۳ میں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ علی ابدالی شجرہ نسب کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اگر وہ اسماء الرجال کا مطالعہ کریں تو یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو دادا کا نام ہوتا تھا وہی پوتا کا بھی نام تبرکاً رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح دادی کا نام پوتی کا ہوتا تھا۔ اسی طرح اسماء الرجال میں تابعین اور تبع تابعین کے نام میں بھی مماثلت ہے۔ اسی طرح بزرگوں کے نسب نامہ میں بھی ہے۔ پھر کس طرح اس کو غلط سمجھا جائے۔ خود علی ابدالی کی بڑی بہن کا نام فاطمہ ہے

اور پھر ان کی بیٹی کا نام بھی فاطمہ ہے۔ البتہ عظیم اللہ ہمدانی کو میں نے عظیم الدین ہمدانی لکھا ہے، اس پر ان کو اعتراض ہے۔ حالانکہ نسب نامہ کو غور سے دیکھیں تو ان کی آنکھ سے یہ پردہ اُٹھ سکتا ہے کہ اس خاندان کے تمام بزرگوں کے نام 'دین' اور 'علی' پر زیادہ ہے۔ مثلاً علاء الدین ہمدانی کے بیٹے کا نام شمس الدین اشمس الدین کے بیٹے کا نام بدرالدین اور ان کے بیٹے کا نام صدرالدین ہے۔ اسی طرح رفیع الدین کے پوتے کا نام عظیم الدین ہے نہ کہ عظیم اللہ ہمدانی۔ علی ابدالی نسب نامہ کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں اور مغالطہ سے باز آئیں۔

علی ابدالی نے حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے ص۲۳ اور ص۲۵ کے حوالے سے یہ اعتراض تحریر کیا ہے:

در ص۲۴ اور ص۲۵ کے درمیان مادری کرسی نامہ دیا ہے۔ اس میں صوفی منیری کے تین صاحبزادوں کا نام تو دیا ہے اور ایک صاحبزادی کا بھی ذکر کیا ہے لیکن ان کا نام نہیں دیا ہے۔ بڑی صاحبزادی کا نام انھوں نے نہیں دیا۔ شاہ عبدالقادر صاحب کے دو صاحبزادوں اور ایک صاحبزادی کا نام نہیں ملتا۔ اسی طرح منجھلے صاحبزادے شاہ عمر صاحب کے ایک صاحبزادے اور صاحبزادیوں کا نام نہیں۔ شاہ سید علی صاحب کی صاحبزادیوں کا نام بھی نہیں ملتا۔ شاہ ابوالبرکات، رخشاں ابدالی، حافظ محمد یحییٰ ابدالی، شعیب ابدالی اور شاہ عطاء الرحمٰن کی جملہ اولاد کا نام شجرہ میں نہیں ملتا۔ اپنے بھائیوں کا نام تو دیا ہے لیکن بہنوں کا نام نہیں دیا۔ رہ گیا بھائیوں اور بہنوں کی اولاد کا نام تو وہ بھی نہیں ملتا جبکہ اپنے سارے بیٹوں کا نام معہ عرف دیا ہے" (مقالہ شاہ علی ابدالی ص۳)

مذکورہ بالا عبارت علی ابدالی کے مقالہ کی ہے مجھے افسوس اور حیرت ہے کہ علی ابدالی کورچشی اور ہذیانی کیفیت میں کب سے مبتلا ہو گئے کہ فضول گوئی پر اتر گئے۔ ملاحظہ ہو میری عبارت:

"ص۲۷ آپ کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ بڑی بی بی مجیدن لاولد۔ چھوٹی بی بی امامن جن کی شادی سید لطف الرحمٰن جاجنیری سے ہوئی ان سے سید عطاء الرحمٰن پیدا ہوئے وہ مرید اپنے نانا صوفی منیری سے اور مسترشد اپنے چھوٹے ماموں شاہ سید علی کے اور مجاز اپنے بڑے ماموں شاہ عبدالقادر کے بھی تھے" (حضرت صوفی منیری ص۲۷)

مذکورہ بالا عبارت علی ابدالی نے نہیں دیکھی ہے، افسوس صد افسوس۔

صوفی منیری کے صاحبزادوں کا نام اس لیے دیئے ہیں کہ ان سے خاندان کا چراغ روشن ہے اور ان لوگوں کا تذکرہ نہیں کیا ہے جو لاولد ہیں۔ اور ان کی اولاد میں میں نے بیٹیوں کے نام جان بوجھ کر چھوڑ دیے ہیں، اس لیے کہ وہ اپنے سسرال سے وابستہ ہیں اور ان کے نام کو بھی نظر انداز کر دیا ہے جو لاولد ہیں اور ان سے نسبی تعلق جاری نہیں۔ مجھے صرف صوفی منیری کے بیٹے اور بیٹیوں کا تذکرہ کرنا تھا، لیکن اپنے ذوق کی آبیاری کے لیے میں نے صوفی منیری سے اپنے بچوں تک کا تعلق قائم کیا ہے۔ اس میں چراغ پا ہونے کی کون سی بات ہے۔ اس لیے کہ کسی تحقیقی تصنیف میں نسب نامے پر اتنی بحث نہیں ہوتی۔ "تاریخ مسلم شعرائے بہار" میں

جو خاندانی احوال رخشاں ابدالی نے حضرت شاہ ایوب ابدالی میر اسلام پوری اور حضرت شاہ سید علی کامل اسلام پوری کے سلسلے میں فراہم کیے ہیں۔ کیا اس میں اس کی تفصیل ہے۔ حالانکہ حضرت شاہ ایوب ابدالی کے احوال میں اس کو لکھنا چاہیے لیکن پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ اس سے کوئی نقص نہیں پیدا ہوتا۔ البتہ علی ابدالی نے اس طرح پر لکھ کر خاندانی تنازعہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ ان کا ایک سازشی قدم ہے۔ علی ابدالی نے لکھا ہے کہ "انھوں نے اپنے شاہ سید علی کی پہلی شادی کا ذکر نہیں کیا ہے۔" میں نے اپنے تحقیقی مقالہ مخطوطہ میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے لیکن مطبوعہ میں اس لیے خارج کر دیا کہ میری پھوپھی مریم بی بی مرحومہ لاولد تھیں اور ان سے کوئی نسل نہ چلی اور اسی لیے میں نے اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

شاہ علی ابدالی نے ص۳۸ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "شاہ اولاد علی نے اپنا مرید و مجاز و جانشین صوفی منیری کو بنایا۔"
شاہ اولاد علی اپنے ماموں بکن منیری کے مرید و مجاز فرزند تھے وہ ان کے جانشین کیونکر ہو سکتے ہیں؟ جبکہ وہ خود بھی سجادہ نشین تھے۔ منیر شریف کی سجادگی پر شاہ دھومن منیری کے صاحبزادے شاہ قطب الدین منیری بیٹھے جس کی تفصیل "وسیلۂ شرف" میں موجود ہے۔ شاہ اولاد علی صاحب نہ تو اپنے والد سے مرید تھے اور نہ انھیں آبائی سلاسل کی اجازت ہی ملی تھی۔ رہ گئی آبائی سجادگی تو شاہ اولاد علی کے والد کے دادا شاہ غلام مرتضیٰ ابدالی نے اپنا جانشین اپنے نواسے شاہ ابدالی بخش ہمدانی کو بنایا تھا۔ اگر شاہ اولاد علی صاحب کو سجادہ ہی مان لیا جائے تو انھوں نے اپنا جانشین اپنے نواسی داماد شاہ احتشام الدین حیدر مشرقی منیری کو بنایا تھا۔ مشرقی منیری کی بیاض میں شاہ اولاد علی کا خلافت نامہ موجود ہے جس کی کتابت صوفی منیری اور مشرقی منیری نے کی ہے۔ یہ خلافت نامہ سنیچر ۲۷ ربیع الاول ۱۲۰۶ھ کو لکھا گیا۔ ملاحظہ ہو:

"فقیر ابوالبرکات امیرالدین حسین المشتہر بہ سید اولاد علی زاہدی الفردوسی المنیری اصلح اللہ احوالہ و حصل اٰمالہ میگوید کہ لائق تلقین و ارشاد اذکار و اشغال و سزاوار خلافت دیدم برادر زادہ عزیز برخوردار شاہ ابوالمعالی محمد احتشام الدین منیری را وفقہ اللہ بالخیر و حفظہ عن الشر والخیر اجازت و خلافت سلسلہ چشتیہ و سلسلہ فردوسیہ سلسلہ دولتیہ فردوسیہ و سلسلہ زاہدیہ و قادریہ و سہروردیہ و نقشبندیہ و شطاریہ و مداریہ و طیفوریہ و سائر خانواد ہائے مختلفہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اوراد ادم و آنچہ از پیر و مرشد و پیران خود یافتم ہمہ بر و بخشیدم و خلیفہ و مجاز و جانشین خود گردانیدم۔"

اس خلافت نامہ میں شاہ اولاد علی نے خود اپنے قلم سے لکھا ہے:

"صحیح فقیر ابوالبرکات امیرالدین حسین عرف اولاد علی زاہدی الحسینی غفرلہ۔" (مقالہ شاہ علی ابدالی ص۲)

شاہ اولاد علی زاہدی نے جو اجازت و خلافت اپنے بھائی صوفی منیری کو دی ہے اس کے الفاظ بھی ملاحظہ کیجئے جو انھوں نے اپنے بھانجے

شاہ اولاد علی کو دی۔

"مداں مجاز است دیدم مسمیٰ ابی البرکات سید امیرالدین حسین المعروف بہ سید اولاد علی ہمشیر زادہ خود را
خلیفہ و مجاز گردانیدم۔" (مقالہ شاہ علی ابدالی ص۵)

مذکورہ بالا تحریر شاہ علی ابدالی نے ادارہ تحقیقات اردو کے سیمینار میں پڑھی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسے مضامین کے پڑھنے
کی اجازت کیوں دی جاتی ہے جس میں جا بجا تحریف، دل آزاری اور بزرگوں کی پگڑی اچھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خود غور کیجیے کہ صوفی
منیری اور حضرت شاہ اولاد علی کی شخصیت کو کس طرح علی ابدالی نے مجروح کرنے کی ناز یبا کوشش کی ہے۔ اگرچہ وہ ان کے حقیقی پر دادا سید
علی ابدالی کی مذکورہ بالا تحریک ایک سازش اور بد دیانتی کی حامل ہے۔ اس لیے کہ حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے ص۳۲ اور ص۳۸
پر "خرقہ خلافت" کے عنوان سے واضح طور پر میں نے پیش کیا ہے

خرقہ خلافت | "آپ کے والد ماجد کا جب وصال ہوا تو آپ اور آپ کے بڑے بھائی سید اولاد علی دونوں کمسن تھے اور
ننہیال میں ہی تھے اس لیے خاندانی سلسلہ جو آبائی عن جدٍ چلا آرہا تھا اس کی اجازت و خلافت نہ مل سکی جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ آپ کی
تعلیم و تربیت ننہیال ہی میں ہوئی آپ کے نانا حضرت شاہ لطف علی منیری متخلص بہ کرسی اپنی مسند سجادگی کو اپنے بھتیجے اور مرید
و مجاز حضرت شاہ قطب الدین فردوسی کے حوالے کر کے خود اس منصب سے کنارہ کش ہو کر اپنے صاحبزادے شاہ اعظم علی عرف بیکن
منیری کے ساتھ آبائی اجمالی مکان کی خلوت میں توکلاً علی اللہ بیٹھے رہے اور داد رشد و ہدایت دی۔ پھر اپنے صاحبزادے کی تعلیم و تربیت
باطنی و ظاہری کر کے اپنا مرید و مجاز جانشین بنایا۔ آپ کے بعد شاہ بیکن منیری نے اپنے بھانجے شاہ اولاد علی منیری کو اپنا مرید و مجاز
و جانشین نامزد کیا اور حضرت شاہ اولاد علی نے اپنا مرید و مجاز و جانشین حضرت صوفی منیری کو بنایا۔ اس طرح یہ سلسلہ حضرت صوفی
منیری کے ماموں شاہ بیکن منیری کے توسط سے جاری و ساری ہوا۔ مختصر یہ کہ صوفی منیری کو اجازت و خلافت اپنے اور دیگر سلاسل کی
ننہیالی وساطت سے ملی۔" (حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے ص۳۳)

مذکورہ بالا اقتباس کو کور بینی کی وجہ سے علی ابدالی نے نہیں پڑھا۔ اس میں ان کے آبائی سلاسل کا تذکرہ کر دیا ہے پھر کہاں
سے علی ابدالی نے بے بنیاد بات لکھی ہے اور مجھ سے منسوب کی ہے۔ رہ گئی علی ابدالی کی یہ فتنہ سامانی کہ حضرت شاہ اولاد علی نے
اپنے دس حقیقی بھائی، فرزند علی صوفی منیری کو نظر انداز کر کے اپنے نواسی داماد شاہ احتشام الدین حیدر مشرقی منیری کو اپنا جانشین
مقرر کیا اور اپنے خلافت نامہ میں اس کی صراحت بھی کی ہے۔ مجھے علی ابدالی کی دریدہ دہنی پر حیرت ہے اس لیے کہ خاندان میں نہ ایسی
تحریر ہے اور نہ کسی نے یہ کہا ہے جس طرح انھوں نے اور چیزوں کو اپنی ملکیت سمجھا ہے اسی طرح جعلی خلافت نامہ بھی ترتیب دیا ہے۔ اب
اصلی خلافت نامہ کی نقل مطالعہ فرمائیے اور علی ابدالی کے جعلی کارنامے کی داد دیجیے،

نقل خلافت نامہ حضرت شاہ لطف علیؒ "بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ الذی جاعل فی الارض خلیفۃ والصلوٰۃ علی سیدنا محمد والہ المبعوث تبیع الشریعۃ بعد حمد و صلوٰۃ میگوید فقیر مفتقر الی اللہ محمد مبارک حسین المعروف شاہ دھومن فردوسی المنیری چوں دیدم برادر عزیز القدر صاحب علوم شریعت واقف رموز طریقت و معرفت جامع المعقول والمنقول ہادی فروع و اصول شاہ قمر الدین حسین الملقب شاہ ابوالفرح المعروف شاہ لطف علی منیری مستحق سزاوار خلافت فردوسیہ وسلسلہ دولتیہ فردوسیہ و سلسلہ عالیہ قادریہ و اتقیا و ایمہ چشت اہل بہشت و خاندان عالیہ سہروردیہ و بزرگان نقشبندیہ و سلسلہ پیران شطاریہ و خاندان مداریہ و طیفوریہ بہ سائر خانوادہ ہائے مختلفہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین و نیز بعد اشارت باطنی اجازت دادم ما او را قرأت حرز یمانی و چہل اسم ..... و نیز اجازت مطلقہ دادم تا بندگان خدائے تعالیٰ را ارشاد کند و دست بیعت دہد و خدمت فقرا سعی کند و بر جادۂ شریعت مشغول حق باشد و در عرفان و عشق او کوشد و اگر کسی را مرید گیرد و شجرہ کہ معمور این فقیر است نام خود درج نمودہ بدہد و حضرت قطب الاقطاب شیخ ما رضی اللہ عنہ را افضل اولیا داند۔ خلیفہ و سجادہ نشین خود گردانیدم قربت الی اللہ مفتوح پذیرد و مخرج فقرا در آرد و باب خانقاہ کشادہ دارد۔ آمین آمین برب العالمین حررہ محمد مبارک حسین ابن شاہ محمود فردوسی ہاشمی المکی والمدنی المنیری روز دوشنبہ دوازدہم ماہ شعبان المعظم ۱۲۱۲ھ یکہزار دو صد و بست یک ہجری النبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔"

نقل خلافت نامہ حضرت شاہ اولاد علی "الحمد للہ الذی نور قلوبنا بنور الھدایۃ والعرفان والحمد للہ الذی علمنا من امۃ محمد علیہ السلام والصلوٰۃ والغفران وعلی الہ واصحابہ الذین ھم مقتداء اھل الطریقۃ والایقان۔ فقیر الوالعلوم غلام اشرف الملقب محمد اعظم علی المعروف شاہ بیکس اصلح اللہ اعمالہ و مستغنی اللہ بما یحب و یرضاہ گرفتار نفس امارہ . . کہ بدان مجاز است دیدم مسمیٰ ابی البرکات سید امیر الدین حسین المعروف سید اولاد علی ہمشیر زادۂ خود را خلیفہ و مجاز گردانیدم کہ بر جادۂ شریعت مستقیم بودہ و پیروی پیران طریقت کما حقہ نمودہ پاس انفاس را از دست ندہد . نیز مجاز گردانیدہ آمد و او را گردانیدم تا مجاز مطلق تا خلافت بدہد ہر کرا مستحق و سزاوار بہ بیند و نیز اجازت دادم او را تا بسجادہ و اجرائے مقراض در سرنا بیان . . نیز اجازت دادم تا قبول نذور کند جہت مصالح فوتین حررہ محمد اعظم علی عرف شاہ بیکس منیری فردوسی الھاشمی المنیری غفر اللہ لہ ذنوبہ . . . . . فی التاریخ التسعۃ عشر من شہر رمضان المبارک بعد الف و ثلث ماۃ من عام الھجری النبوی صلعمؐ (نقل السلاسل والاسانید)

نقل خلافت نامہ حضرت فرزند علی صوفی منیری تو بر اہل سخا انعام کردی کہ بر بیچارگان انعام کردند
بہر جا ہر چہ از دولت روان است زدریا ہای جودت وام کردند

"بعد حمد اروشن اصحاب شریعت وطریقت ومبرہن ارباب حقیقت ومعرفت سلمہم اللہ تعالیٰ فی رضائہ باد مقصود آنکہ
ایں عاصی پر معاصی ملتجی جناب باری فقیر ابی البرکات امیر الدین حسین المعروف سید امداد علی زاہدی الفردوسی المنیری اصلح
اللہ اعمالہ ومتعنی اللہ بما یحب ویرضاہ گرفتار نفس امارۃ وآوارہ از انما نیست کہ کسی را مرید گیرد یا خلافت دہد و مجاز گرداند
اما مدبہ بالوراثت معاصی و طورث بکدورت مناہی وملاہی بامید کرم علی الاطلاق بحکم جاہدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون وبحیلہ
ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیہم واز تاثرات برکات واشتغال پیران اصل فردوسیہ وبزرگان شطار
...... چون لائق تلقین ارشاد اذکار واشغال وسزاوار خلافت سلسلہ فردوسیہ ... اجمعین کہ بدان مجاز است دیدم برادر
عزیز واقف اسرار الٰہی مسمیٰ ابو محمد جلیل الدین حسین المعروف بسید فرزند علی برادر حقیقی خود را خلیفہ و مجاز گردانیدم کہ
بر جادۂ شریعت مستقیم بودہ و پیروی پیران طریقت کما حقہ نمودہ پاس انفاس را از دست ندہد فی کلمات القدسیہ ...
وتا ئبان را بقدر استعداد ایشان تلقین فرمائد و ذکر در خلوت خفی و در جلوت جلی کند حسن سیرت واتباع حق وتواضع با حق
بر خود لازم گیرد و بعد اشارت باطنی اجازت دادم ما اوراقرائت حرز یمانی ..... نیز مجاز گرداندہ آمد واو را گردانیدم
ما مجاز مطلق تا خلافت دہد ہر کرا مستحق وسزاوار بہ بیند ونیز اجازت دادم او را تا بسجادہ بنشیند واجرائے معراعق
در سر تائبان نصیحت بایشان بقدر حال ایشاں بانواع عبادات وتزکیہ وتصفیہ. بقدر طاقت ایشاں بفرماید و باب
خانقاہ کشادہ دارد وہر کہ می آید وی رود خدمت او لازم گیرد ونیز اجازت دارم تا قبول نذور کند جہت مصالح خویش
وفقرا صرف کند در باب اکل ونوم وتکلم وصحبت با خلق اعتدال کند وعالی ہمت باشد واگر کسے را دید بگیرد و شجرۂ کہ
معہود ایں فقیر است نام خود درج نمودہ بدہد ونیز اجازت مطلقہ دادم تا بندگان خدا تعالیٰ را ارشاد کند و دست بیعت
دہد و بخدمت فقرا سعی کند و بر جادۂ شریعت مشغول حق باشد و در محبت وعشق عرفان او کوشد و مقصود اصلی جز حق
تعالیٰ ہیچ ہمی نسازد و در خاطر جز حق تعالیٰ ہیچ ہمی وغمی نگزارد و نظر بریں حیلہ ندارد وطمع او را از باطن منقطع گرداند و
سلوک در راہ عشق عرفاں بنوعیکہ از مصنفات حضرات سلسلہ فردوسیہ ..... وحسن خلق وتواضع با خلق وتوکل وہ
قناعت پیشہ سازد و بعدائے تعالیٰ با خلاص وبا خلق با مروت معاملہ نماید و با حق تعالیٰ توجہ تام دارد وقطع ماسویٰ بالکلیہ کند
حررہ فقیر امداد علی زاہدی المنیری فی التاریخ ثانی عشرین من شہر رمضان المبارک سنہ الف ومائتان و اثنا
وستون ھجری النبوی صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین۔"

مذکورہ بالا خلافت نامے کی نقل پیش کرنے کی غرض صرف اس قدر ہے کہ صداقت سامنے آجائے اس لیے کہ انھوں نے جو حضرت

شاہ اولادعلی کو بھکن منیری کا جانشین نہیں تسلیم کیا ہے اور پھر حضرت صوفیؔ منیری کو حضرت شاہ اولادعلی رحمۃ اللہ علیہ کا جانشین نہیں تسلیم کیا بلکہ ان کا جانشین مشرقیؔ منیری کو قرار دیا ہے اور جعلی خلافت نامے پیش کیے ہیں۔ مگر بدیں عقل و دانش ببایدگریست حضرت شاہ اولادعلیؒ چونکہ اپنا جانشین فرزند علی صوفیؔ منیری کو بنایا تھا اس لیے خلافت نامے میں بسجادہ نبشند، باب خانقاہ کشادہ دارد کے جملے استعمال کیے ہیں اور پھر اسی قسم کی تعلیم دی ہے اور اگر اولاد نرینہ تھی تو پھر اپنے برادر حقیقی کو اپنا جانشین بناتے یا اور کسی کو جبکہ مشرقی منیری کو مالیخولیا ہو گیا تھا اور دماغی توازن کھو چکے تھے اور حیرت ہے کہ ان کے خلافت کا زمانہ وہی ہے جب وہ حالت جذب میں تھے۔ ۱۲۰۶ھ میں ان کو اجازت دی اور ۱۲۰۷ھ میں شاہ اولادعلی کا وصال ہو گیا۔ مشرقی منیری حضرت کے نواسی داماد تھے اور صوفی منیری برادر حقیقی اور انھیں خلافت نامہ ۱۲۶۲ھ میں دیا ہے اور اسی لیے حضرت صوفی منیری اپنے پیرو مرشد کے ساتھ ساتھ ہمیشہ رہے اور پیر ہی نے جس طرح مجاہدہ و ریاضت میں اپنے مرید و جانشین کو مشغول رکھا وہ اس کی دلیل ہے کہ ان کے جانشین ہونے والے تھے۔ علی ابدالی نے حضرت مشرقی منیری صوفیؔ منیری کا خلافت نامہ جعلی بنا کر پیش کیا ہے اس لیے کہ اتنا مختصر خلافت نامہ نہیں ہو سکتا پھر اس پر سنیچر ۲۷ ربیع الاول ۱۲۰۶ھ کی تاریخ کیسے لکھی گئی ہے جبکہ بزرگان دین تاریخ اور سنہ عربی یا فارسی میں لکھتے تھے۔ مشرقی منیری نے تو اپنے اشعار میں حضرت صوفی منیری کی عظمت اور مرشد ہونے کا اظہار ایک نظم میں اس طرح کیا ہے۔

؎	شاہ فرزند علی فخر امم	میرے استاد میرے مرشد وعم
	میں نے تعلیم ان ہی سے پائی	ہے ان ہی سے یہ سخن آرائی

علی ابدالی کی یہ ایک فتنہ سامانی ہے۔ تعجب ہے کہ اپنے پردادا حضرت صوفی منیری پر اپنے والد کے ماموں مشرقی منیری کو ترجیح دے رہے ہیں جبکہ صوفی منیری نے مشرقی منیری اور ان کے دادا حضرت شاہ عبدالقادر کی تعلیم و تربیت باطنی کی ہے۔ حضرت صوفیؔ منیری کے نثری کارنامے کے ص۲۱ کے حوالہ سے لکھا ہے :

"آپ کے خالہ زاد بھائی جوشؔ منیری بھی شاعر تھے اور آپ عبدالغفور نساخؔ سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ آپ بھی نساخؔ سے مشورہ سخن لیتے لیکن آپ نے قبول نہ کیا۔" (مقالہ ص۵)

وہ لکھتے ہیں کہ پتہ نہیں یہ انھوں نے کہاں سے لکھ دیا؟ صوفی منیری نے جن وجوہات کے سبب غالبؔ سے اصلاح لینا پسند کیا اسے اس خط میں لکھ دیا ہے جسے انھوں نے اپنے کلام کے ساتھ غالبؔ کے پاس بھیجا تھا۔" (مقالہ شاہ علی ابدالی ص۵)

حقیقت تو یہ ہے کہ اصلاح سخن کے سلسلے میں علی ابدالی کے والد حضرت شاہ ابوالبرکات ابدالیؒ نے یہ بات کہی ہے جس پر اعتماد کر کے میں نے اسے لکھ دیا ہے اور حقیقت پر یہ مبنی بھی ہے اس لیے کہ بڑا بھائی اپنی خواہش کے مطابق اپنے چھوٹے بھائی کو یہی مشورہ دے سکتا ہے اور غالبؔ سے اصلاح سخن کے سلسلے میں اپنی تصنیف کے ص۲۲ پر واضح طور پر لکھ دیا ہے جو علی ابدالی کی

نظر سے اوجھل ہوگیا۔ علی ابدالی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"تلامذہ صوفی کے ذکر میں ص۵۲ تا ص۵۴ مشرقی منیری کا ذکر کیا ہے لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے کہ مشرقی کے حالات کہاں سے لیے گیے ہیں دراصل یہ حالات رخشاں ابدالی کے مضمون حضرت مشرقی منیری مرحوم مطبوعہ فطرت راجگیر مارچ ۱۹۷۴ء سے لیے گیے ہیں، اسی طرح پر عطا بہاری کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بھی رخشاں ابدالی کے مضمون عطا بہاری مطبوعہ سہیل گیا خاص نمبر ۱۹۷۴ء سے ماخوذ ہے۔ یہاں بھی انھوں نے حوالہ نہیں دیا ہے۔"

علی ابدالی کا یہ کہنا کہ میں نے مشرقی منیری یا عطا بہاری پر جو کچھ لکھا ہے وہ رخشاں ابدالی کے مضمون سے ماخوذ ہے بلکہ ایسا نہیں ہے۔ میں نے مشرقی منیری کے حالات کلیات سے نقل کیے ہیں اور بقیہ حالات کا علم مجھے اپنے والد حضرت شاہ ایوب ابدالی اور عم محترم حضرت شاہ ابوالبرکات کے توسط سے ہوا جو خود رخشاں ابدالی کی معلومات کے بھی مآخذ ہیں۔ اگر ان کے مضامین دیکھتا تو اس میں قدرے اضافہ ہوتا۔

علی ابدالی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ڈاکٹر طیب ابدالی کی کتاب کا نام "حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے" ہے، لیکن انھوں نے اس کتاب میں صوفی منیری کی ساری نثری تصانیف کا جائزہ نہیں لیا ہے "راحت روح" کا جائزہ کسی قدر تفصیل سے لیا گیا ہے اور اس کا تقابلی مطالعہ چند کتابوں سے کیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ بھی بتایا جاتا کہ صوفی منیری کی اس کتاب کا مآخذ کیا ہے۔ وسیلہ شرف و ذریعہ دولت کا بھی جائزہ لیا گیا ہے لیکن دیگر تصانیف کا سرسری ذکر کرنا ہی ضروری سمجھا گیا۔" (مقالہ ص۶)

علی ابدالی کی مذکورہ بالا تحریر سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں صوفی منیری کے دیگر نثری تصانیف کا علم ہے جو میری معلومات میں نہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو ان تصانیف کی نشاندہی کرنی چاہیے تھی۔ دعویٰ بغیر دلیل فاتر العقلی کا ثبوت ہے۔ حالانکہ میں دعوے سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ جن تصانیف کی میں نے نشاندہی کی ہے اس سے خاندان کے دوسرے افراد اور رخشاں ابدالی بھی لاعلم تھے اس لیے کہ صوفی منیری نے اپنی تمام تصانیف میرے دادا یعنی اپنے چھوٹے صاحبزادے حضرت شاہ سید علی کو عطا کیے تھے اور بعض تصانیف پر اپنے دست خاص سے تحریر بھی کر دیا ہے کہ "ایں کتاب نورچشم سید علی سلمہ را عطا کردم۔" جب میں نے اپنا تحقیقی کام شروع کیا تو میرے والد حضرت شاہ ایوب ابدالی نے مجھے وہ تمام تصانیف حوالے کیں اور کچھ تصانیف عم محترم حضرت شاہ محمد علی ابدالی منیر شریف کے پاس محفوظ تھیں جو مجھے ملیں العروۃ الوثقیٰ اردو نثر میں ایک نامکمل تصنیف ہے جو ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی سنہ کتابت ۱۳۱۸ھ ہے جو حضرت صوفی منیری کے وصال کا سن ہے۔ میں نے جب اس کی دریافت کی تو خود خاندان کے دوسرے افراد اور رخشاں ابدالی کو بہت حیرت ہوئی اور انھوں نے مجھے کراچی سے خط لکھا کہ ابھی تک مجھے اس کا علم نہیں تھا پھر کس طرح علی ابدالی کا دعویٰ ہے کہ

رخشاں ابدالی کے مقالات میں ان کی ساری تصنیفات اردو و فارسی نظم و نثر کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ راحت روح کے ماٰخذ کا اگر علم علی ابدالی کو ہے تو اسے بھی واضح کر دینا چاہیئے تھا۔ موصوف دعویٰ کرتے ہیں لیکن دلیل کچھ نہیں۔ یہ ان کی ہذیانی کیفیت کی علامت ہے۔ علی ابدالی نے اپنے مقالہ ص۶ پر تحریر کیا ہے کہ:

"آخر میں صوفیؔ منیری سے چلنے والے شجرے بھی دیئے گئے ہیں۔ صوفیؔ منیری اپنے خسر شاہ ولایت علی کے حلقے میں بیٹھے تھے اور سارے سلاسل اور اوراد و احزاب کی اجازت ان سے پائی تھی لیکن انھوں نے کسی کو بھی اپنے نانیہالی سلاسل کے علاوہ دوسرے سلاسل کی اجازت نہیں دی جیسا کہ ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر اسلام پوری نے انوار ولایت میں لکھا ہے۔"

صوفیؔ منیری نے جو اجازت میرے دادا حضرت شاہ سید علی علیہ الرحمۃ کو دی ہے اسی کی نقل میں نے کی ہے اور اس میں منیر شریف اور اسلام پور کے سلاسل ہیں۔ معلوم نہیں اوراد فتحیہ کے سلسلے میں کہاں سے علی ابدالی نے یہ بات پیدا کی ہے۔ ان کو صفحات کا حوالہ دینا تھا۔

پورے مضمون پڑھنے کے بعد اور اس کے جواب کے بعد میں پھر علی ابدالی صاحب کو یہی مشورہ دوں گا کہ اگر انھیں مضمون لکھنے اور پڑھنے کا شوق ہے تو عبارت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ دعویٰ کریں تو دلیل بھی پیش کریں اور اگر انھیں ثقہ طور پر کسی چیز کا علم ہے تو مشورہ دیں لیکن تحریف و تدلیس سے کام نہ لیں، دل آزاری اور دریدہ دہنی سے بچتے رہیں، ورنہ ان کا اس قسم کا غیر مستند، غیر معیاری اور اختلافات پر مشتمل مضمون کوئی اچھا اثر نہیں قائم کر سکتا، بلکہ اس سے سیمینار کا وقار بھی مجروح ہوگا اور مضمون نگار کی کم علمی، کج فہمی اور کم ظرفی کی بھی شہرت ہوگی اور یہ ان کے لیے اور ان کے خاندان کے لیے زیب نہیں دیتا۔

* *

ڈاکٹر علی ابدالی

خانقاہ ...

ڈاکٹر ابو عبیدہ ابدالی کا تھیسس

دیوان حضرت مشرقی منیری

دیوان حضرت مشرقی منیری: "مرتبہ ڈاکٹر ابو عبیدہ ابدالی مطبوعہ پٹنہ اگست ۱۹۸۵ء" یہ کتاب اس مقالہ تحقیقی کی تلخیص ہے جس پر مرتب کو مگدھ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔ یوں تو اصل مقالہ مشرقی منیری کی شعری تخلیقات پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کتاب میں صرف غزلوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ پیش گفتار میں لکھتے ہیں:

"حضرت مشرقی منیری ایک امتیازی ادبی حیثیت کے مالک ہیں۔ لیکن کچھ تو متصوفانہ رودگی کی بنا پر اور کچھ امتداد زمانہ کے سبب وہ عام ادبی دنیا میں اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں" ص۶ آگے چل کر وہ خود ہی اپنی بات کی تردید کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں: "ان کا کلام معتبر رسائل و جرائد کی زینت سمجھا جاتا تھا۔ ہم عصر اساتذہ نے ان کے کلام کی بھرپور ستائش کی ہے۔" ص۶

آگے چل کر وہ ان کے اس مشاعرہ میں شرکت کا بھی ذکر کرتے ہیں جو ۱۹۰۲ء میں بادشاہ منزل پٹنہ میں ہوا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ موصوف کی تحریر میں توازن نہیں ہے پہلے لکھتے ہیں کہ باوجود اچھے شاعر ہونے کے ان کی کوئی شہرت نہ تھی پھر بعد میں لکھتے ہیں کہ ان کا کلام اچھے رسالوں میں شائع بھی ہوتا تھا اور ہم عصر شعراء ان کے کلام کی تعریف بھی کرتے تھے۔ جوان کے بارے میں نہیں جانتا کس بات کو صحیح سمجھے؟ شاید مرتب کے ایسا لکھنے کا مطلب یہ رہا ہو کہ اتنا اچھا شاعر لیکن کسی نے اس کی قدر نہ کی اس سے انھوں نے ان کو گمنامی کے پردے سے نکالنے کے لیے ان پر تھیسس لکھ دی۔ لیکن شاید موصوف کو علم نہیں کہ ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

مشرقی کے چہیتے بھانجے رخشاں ابدالی کے مضامین کے علاوہ حافظ شمس الدین منیری مرحوم ص۸۱ اور احسان داور صاحبان کے مضامین معاصر اور شاعر میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مشرقی منیری کی اچھی خاصی شہرت ہوتی۔ اپنے میں وہ مستقل لکھتے تھے بلکہ بقول ان کے بھانجے رخشاں ابدالی وہ اس کے ادارہ سے بھی منسلک تھے اس کے علاوہ ان کی غزلیں اس وقت کے گلدستوں میں شائع ہوتی تھیں۔ متعدد مشاعروں میں ان کی شرکت کے بھی ثبوت ملتے ہیں۔ موصوف نے صرف ان کی شاعری کا ذکر کیا ہے۔ وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے

اور ان کے مضامین البنچ کے علاوہ دوسرے رسالوں میں بھی شائع ہوتے تھے۔

ص۸ پر لکھتے ہیں: "حضرت مشرقی منیری کا وقیع سرمایۂ سخن دستیاب ہوسکا اور ان کی زندگی کے بعض گمشدہ اوراق بھی سامنے آئے جن کی ترتیب و تدوین اور تجزیہ و تحلیل سے ان کے حالات زندگی پر مشتمل ایک جامع خاکہ تیار کیا جا سکا اور ان کا ایک مستند انتخاب کلام بھی ممکن ہوسکا"

لیکن افسوس ہے کہ اس کتاب میں نہ تو ان کے حالات زندگی ہی صحت کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور نہ ان کی غزلیات کا جامع انتخاب ہی پیش کیا جاسکا۔ آگے چل کر لکھتے ہیں "ان کی غزل گوئی کی جمالیاتی قدروں کے تعین کی کوشش کی ہے اس لیے کہ ان کی تخلیقی شخصیت کا باضابطہ اظہار غزل گوئی میں ہوا ہے" ص۹

لیکن اس کتاب سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی غزل گوئی کا مخصوص انداز کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مشرقی کے مقام کے تعین کا دعویٰ تو بہت کیا ہے لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ انھوں نے مشرقی کا پورا اردو کلام بھی نہیں دیکھا۔

ص۱۹ تا ص۲۶ مشرقی کے خاندانی حالات لکھے گئے ہیں۔ ص۱۹ پر لکھتے ہیں: "بابا فرید گنج شکر کے صاحبزادے حضرت یعقوب باقا کی اولاد میں حضرت نصیر الدین عرف پیارے اسلام کی ترویج و اشاعت کی غرض سے کرجی متصل پٹنہ میں آباد ہوئے۔"

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نصیر الدین عرف پیارے اس خاندان کے پہلے بزرگ ہیں جو بہار آئے لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔ کتاب الانساب مرتبہ شاہ عبدالقادر اسلام پوری میں حضرت امان اللہ بن زین کے بارے میں لکھا ہے۔ "آں حضرت از وطن خود آمدہ در بہار۔ محلہ چستیانہ سکونت پذیرشد" ص۳۴

بالکل یہی بات مولوی کریم الدین بہاری کی کتاب 'مخزن الانساب' سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت امان اللہ کے صاحبزادے حضرت فیض اللہ تک یہ خاندان بہار شریف کے چستیانہ میں آباد رہا۔ حضرت فیض اللہ کے صاحبزادے حضرت نصیر الدین عرف پیارے پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے کرجی میں سکونت اختیار کی۔ انھوں نے حضرت قطب الدین عرف لبادن کے بارے میں کسی قدر لکھا ہے اور ان کی تاریخ وفات بھی دی ہے جو کیفیت العارفین مرتبہ شاہ عطا حسین منعمی سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا ہے اگر وہ چاہتے تو اور بزرگوں کے حالات بھی لکھ سکتے تھے۔ مثلاً حکیم سید احمد اللہ ندوی نے تذکرہ مسلم شعراء بہار حصہ پنجم میں حضرت شاہ امیر الدین وجد کے حالات میں لکھا ہے کہ "آپ نے علوم متعارفہ کی تعلیم مولانا سید عزیز اللہ بن شاہ قطب الدین

عرف بساون کرجوی خلیفہ حضرت منعم پاک قدس سرہ سے پائی ہے۔[۱۲۹]

انہیں شاہ عزیز اللہ کے بارے میں کیفیت العارفین میں تحریر ہے: " در علم فارسی تبحر داشتند بلکہ در آں عصر در نظم و نثر یگانہ روزگار بود ثانی خود نداشتند" ص ۲۲۳

تذکرۃ الکرام حصہ اول مترجمہ سید محمد یعقوب مطبوعہ مطبع مجیبی پھلواری شریف میں پیر مجیب اللہ کے پیران طریقت میں شاہ معز الدین کرجوی کا نام دیا ہے لکھتے ہیں: " حضرت شاہ معز الدین کرجوی قدس سرہ آپ حضرت پیر محمد سلونوی قدس سرہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ سے حضرت تاج العارفین نے قادریہ و چشتیہ نظامیہ و مداریہ طیفوریہ کی اجازت حاصل فرمائی تھی۔" ص ۱۹۴ اگر ڈاکٹر عبدہ کوشش کرتے تو مشرقی میری کے خاندانی حالات اور ان کے بزرگوں پر تفصیلی روشنی ڈال سکتے تھے۔

آیئے اب دیکھیں انھوں نے ننہالی بزرگوں کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ حضرت سید علی حاجیری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " شریعت و طریقت کے تابندہ ستارے تھے۔" ص ۲۱

حضرت سید علی حاجیری کو طریقت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ صوفی نہیں مجاہد تھے۔ اوپر کے بزرگوں میں حضرت زید شہید اور حضرت ابوالفرح واسطی کے حالات مل جاتے ہیں۔ حضرت مولانا قطب الدین دادیک تار بگھوی کے بعد کے بزرگوں کے حالات مل جاتے ہیں لیکن انھوں نے ان بزرگوں کے حالات معلوم کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ حضرت سید محمد احسن اور چند بزرگوں کے حالات تذکرۃ الابرار مولفہ شاہ واجد نوآبادی میں موجود ہیں۔ مخدوم شاہ یحییٰ علی نوآبادی اور ان کے صاحبزادے مولانا اشرف علی عارف نوآبادی کے حالات تذکرۃ الابرار، کیفیت العارفین اور انوار دائمی میں موجود ہیں۔ لیکن مرتب دیوان نے ان بزرگوں کے حالات بھی نہیں لکھے اور نہ ان کی تاریخ ولادت و وفات ہی لکھی۔ عارف نوآبادی کا نمونہ کلام بھی نہیں دیا۔ اسی طرح پر جوش منیری کے نانا حضرت لطف علی منیری کے حالات بھی نہیں لکھے گئے۔"

ص ۲۳ سے ص ۳۰ تک حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ بیشتر حالات رخشاں ابدالی کے مضمون "حضرت شرقی منیری مطبوعہ مہر نیم روز کراچی جنوری ۱۹۶۱ء سے لیے گئے ہیں۔ لیکن اصل مضمون کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ رخشاں ابدالی نے اسی مضمون میں ان کے حالات ان کی تحریروں کی مدد سے لکھے ہیں۔

جوش منیری مونگیر سے پہلے چھپرہ میں ملازم تھے۔ جوش منیری کے نواسے ڈاکٹر سید سلطان احمد نوآبادی اپنے خط مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۶ء میں اپنے خالہ زاد بھائی رخشاں ابدالی کو لکھتے ہیں۔ "پہلے چھپرہ

میں کسی کچہری کے محرر تھے۔ اس کے بعد آپ مونگیر میں سررشتہ دار تھے۔

انھوں نے مشرقی منیری کے والد اور والدہ کا تو ذکر کیا ہے۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کی تاریخ وفات نہیں دی ہے۔ اس کے لیے انہیں دور جانے کی ضرورت نہ تھی خود مشرقی کے قطعات تاریخ میں یہ مل جاتے۔ جوشش منیری کا تفصیلی ذکر ہونا چاہیے تھا اور ان کا نمونہ کلام بھی دینا چاہیے تھا جو آسانی کے ساتھ خمخانہ جاوید، سخن شعرا اور تذکرہ مسلم شعرائے بہار میں مل جاتا۔

انھوں نے "حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے" کے حوالہ سے لکھا ہے (ص۳۵) کہ "مشرقی منیری نے طب کی تعلیم حضرت مولانا محمد رفیق قادری سے حاصل کی"۔ اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ عربی کی تعلیم بھی انھوں نے اپنے خالہ زاد بھائی مولانا محمد فاضل نوآبادی کے ہمراہ حکیم عبدالحمید پریشاں سے حاصل کی۔

ص۳۲ پر مشرقی منیری کی شادی کے متعلق لکھتے ہیں: ان کی شادی قریبی عزیز شاہ نصیر الحق نوآبادی سجادہ نشیں خسروپور نوادہ کی صاحبزادی بی بی سلیمن سے ہوئی تھی۔

یہاں قریبی عزیز کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ شاہ نصیر الحق نوآبادی کی شادی شاہ اولاد علی زاہدی منیری کی اکلوتی صاحبزادی بی بی ولیہ عرف جگن سے ہوئی تھی جن کے بطن سے ایک صاحبزادے شاہ صغیر الحق نوآبادی اور دو صاحبزادیاں بی بی سلیمن اور ظہورن ہوئیں۔ شاہ نصیر الحق نوآبادی مخدوم شاہ یحییٰ علی نوآبادی کے نواسے تھے۔ ان کی والدہ مشرقی منیری کے نانا مولانا اشرف علی عارف نوآبادی کی حقیقی بہن تھیں۔ اس رشتے سے شاہ نصیر الحق نوآبادی مشرقی منیری کے ماموں ہوئے۔ شاہ نصیر الحق نوآبادی خسروپور نوادہ یعنی نوادہ خورد متصل خسروپور کے سجادہ نشیں تھے۔ انھوں نے شاہ نصیر الحق نوآبادی کو حضرت سید علی جاجنیری کی اولاد لکھا ہے جو غلط ہے ان کی والدہ جاجنیری النسب ضرور تھیں ان کا ددیہالی سلسلۂ نسب مخدوم احمد اخوند شیخ نبی احمد نوآبادی کے واسطے سے مخدوم سلیمان لنگر زمین سے ملتا ہے۔ مخدوم احمد نوآبادی نے خسروپور میں سکونت اختیار کی تھی۔ لیکن ان کے صاحبزادے احمد اخوند شیخ نوآبادی نے خسروپور کے متصل نوادہ خورد میں سکونت اختیار کی تھی۔ شاہ نصیر الحق نوآبادی انہیں کی اولاد اور سجادہ نشیں تھے۔

مشرقی منیری سلسلہ فردوسیہ میں نہیں بلکہ اپنے آبائی سلسلہ چشتیہ میں شاہ اولاد علی زاہدی سے مرید تھے جیسا کہ خود ان کے کلام سے ظاہر ہے۔

ص۳۱ پر مشرقی منیری کے کئی طویل سفروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اجمیر اور دہلی کے سفروں کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

رہ گیا مظفر پور تو وہ وہاں مطب کرتے تھے۔ آرہ میں ان کے صاحبزادے رہتے تھے۔ چھپرہ وہ مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے گئے، اور پٹنہ کا سفر بھی مشاعرہ کی شرکت کی غرض سے ہوا۔ اس کے علاوہ پٹنہ کے دیوان محلّہ میں ان کی سسرالی عزیزوں کی رہائش تھی اسلام پور خسروپور اور داناپور اپنے رشتہ داروں سے ملنے جاتے تھے۔ بہار شریف میں بھی ان کے ننہالی رشتہ دار رہتے تھے۔

ص۲۱ پر لکھا ہے کہ "صاحبزادے کی وفات کے کچھ دنوں کے بعد ہی اپنی بیٹی کی بیوگی کا صدمہ اٹھانا پڑا" ان کی صاحبزادی بھائی کی وفات سے پہلے ہی بیوہ ہوچکی تھیں۔ مشرقی نے اپنے بیٹے کی وفات پر متعدد مرثیے لکھے ہیں اگر وہ ان مراثی پر ایک نظر ڈال لیتے تو یہ غلطی نہ کرتے۔

ص۲۰ پر تحریر کرتے ہیں: "مشرقی میری اپنے والد بزرگوار جوشش منیری کے اکلوتے صاحبزادے تھے جن سے یہ خاندان جاری وساری رہا اور ہے۔"

مشرقی کو اس بات کا زیادہ غم تھا کہ ان کے صاحبزادے نے اپنی کوئی نشانی نہیں چھوڑی رہ گئیں ان کی صاحبزادی تو ان کے بھی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جوشش منیری کی نسل آج بھی ان کی منجھلی صاحبزادی بی بی زہرہ اور چھوٹی صاحبزادی بی بی لطیفن کی اولاد کی شکل میں قائم ہے جبکہ مشرقی منیری کی نسل ان کے صاحبزادے کے انتقال کے ساتھ ختم ہوگئی۔ انھوں نے مشرقی منیری کے تلامذہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ص۴۶ سے کلیات کا تعارف شروع ہوتا ہے۔ کلیات فارسی موسوم بضاعت مزجات اور اردو کلیات موسوم بہ معتنمات دونوں ایک ساتھ مجلد ہے۔ فارسی کلیات میں عربی کلام بھی ملتا ہے لیکن انھوں نے ان کی عربی شاعری کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مشرقی منیری نے اپنے سارے کلام کو خود ہی ضائع کردیا تھا لیکن بعد میں چند مخلص احباب کی گزارش پر حافظہ کی بنیاد پر اردو اور فارسی دیوان پھر سے مرتب کیا۔ اس سلسلے میں کچھ نئے اشعار بھی کہنے پڑے۔ ان کے حافظہ میں جو شعر آئے انھیں وہ ایک کاپی پر لکھتے گئے بعد میں غور وفکر کے بعد کلیات مبیضہ تیار ہوا اس کے مسودہ اور مبیضہ کلیات میں کہیں کہیں فرق ہوگیا ہے۔ بعد میں جو اشعار حافظے میں آئے انھیں وہ پرزوں پر لکھتے گئے۔ کلیات کا مسودہ اور پرزے میرے پاس موجود ہیں۔

ڈاکٹر ابوعبیدہ ادالی نے مشرقی منیری پر تحقیقی مقالہ تو لکھ دیا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ مشرقی کا پورا کلام ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ کتاب کے آخر میں جو انتخاب کلام ہے اسے بھی جامع نہیں کہا جاسکتا۔ ان کی بہت سی اچھی غزلیں اس انتخاب میں شامل نہیں اس انتخاب میں دو غزلیں ایسی ہیں بھی ہیں جو مشرقی منیری کی نہیں۔

صـ۹۷ پر جو غزل دی گئی ہے وہ عطا بہاری کی ہے۔ یہ غزل نہ مشرقی کے کلیات میں شامل ہے اور نہ ان اوراقِ پریشاں میں جو میرے پاس ہیں۔ عطاؔ بہاری کے کلیات حصہ دوم صـ۴۹ پر یہ غزل موجود ہے۔ عطاؔ بہاری کے کلیات میں ۱۳ اشعار ہیں جبکہ اس دیوان میں ۷ اشعار دیے گئے ہیں۔ اسی غزل کا مطلع ہے ؎

پر خطر بھاری گھنا جنگل ہے ویرانے کے بعد ‌ ‌ ‌ ملتی ہے الفت کی راہ اس سے گزر جانے کے بعد

اب اس کا مقطع دیکھیے ؎

اب کفِ افسوس ملنے سے عطا ہوتا ہے کیا ‌ ‌ ‌ عمرِ رفتہ پھر نہیں آتی گزر جانے کے بعد

اب محوؔ تخلص والا مقطع بھی دیکھیے ؎

اب کفِ افسوس ملنے سے بھی محوؔ ہوتا ہے کیا ‌ ‌ ‌ عمرِ رفتہ پھر نہیں آتی گزر جانے کے بعد

صـ۱۴۴ پر جو غزل دی گئی ہے وہ بھی عطاؔ بہاری کی ہے۔ یہ غزل بھی نہ تو مشرقی کے کلیات میں شامل ہے اور نہ اوراقِ پریشاں میں لیکن عطاؔ بہاری کے کلیاتِ حصہ دوم میں صـ۶۹ پر درج ہے۔ عطاؔ بہاری کے کلیات میں ۱۲ اشعار ہیں اور اس دیوان میں بھی ۱۲ اشعار ہیں۔ اس کا مطلع ہے

اے بت تو اس سے مدعا کیا ہے ‌ ‌ ‌ یہ خموشی فتنہ زا کیا ہے

اور مقطع ہے۔

اے عطاؔ کچھ زباں سے تو کہو ‌ ‌ ‌ آرزو کیا ہے مدعا کیا ہے

اور اب مطبوعہ دیوان مشرقی کا مقطع دیکھیے ؎

محوؔ کچھ بھی زباں سے تو کہو ‌ ‌ ‌ آرزو کیا ہے مدعا کیا ہے

دونوں غزلیں مشرقی کے منفرد انداز سے مختلف ہیں یہ غزلیں مشرقی کی ہو ہی نہیں سکتیں۔ کتابیات میں کلیات عطا بہاری کا نام دیا گیا ہے حیرت ہے یہ دونوں غزلیں انہی کلیات میں نظر نہ آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتابیات کی فہرست بڑھانے کے لیے کلیاتِ عطاؔ بہاری کا نام دے دیا گیا ہے۔

جس طرح کا کلام اس دیوان میں شامل کیا گیا ہے اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مشرقی کا جو کلام ان کی کلیات مغتنمات اور ان اوراق پریشاں میں موجود ہے جو میرے پاس ہے وہی مستند ہے، اور جو کچھ دوسرے ذرائع سے حاصل ہوا ہے وہ سب مشکوک ہے۔

انھوں نے دعویٰ تو بہت کیا ہے لیکن وہ مشرقی منیری کے مخصوص انداز کا پتہ نہ چلا سکے اور یہ حقیقت ہے کہ وہ ادب میں ان کا مقام متعین کرنے میں بری طرح ناکامیاب رہے ہیں۔ انھوں نے ان کے خاندان، حالات زندگی اور کلام سے متعلق جو مواد اکٹھا کیا ہے وہ تشنہ ہے۔ انھوں نے ان کی فارسی شاعری کا سرے سے جائزہ ہی نہیں لیا اور یہ حقیقت ہے کہ فارسی شاعری کے بغیر مشرقی کے کلام کا جائزہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

جائزۂ کلام کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے ہم اسے ان کے کلام پر تنقید نہیں کہہ سکتے۔ انھوں نے چند شعرا سے موازنہ کی کوشش ضرور کی ہے اس سلسلہ میں ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ اگر مشرقی اور کسی معروف شاعر کے کلام میں کوئی لفظ مشترک ہے چاہے معنیٰ اور مفہوم الگ ہی کیوں نہ ہو وہ اسے اس مخصوص شاعر کے آہنگ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ابو عبیدہ ابدالی
ٹی۔ان۔بی کالج، بھاگلپور

جواب

ڈاکٹر سید شاہ علی ابدالی نے میرے مرتبہ "دیوان حضرت مشرقی منیری" کے تحقیقی اور تنقیدی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے بزعم خود مختلف غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ تحقیقی و تنقیدی دنیا میں بلکہ مجموعی طور پر علمی دنیا میں حرف آخر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ تلاش و تحقیق کا ر جاری ہے آج کے نقطہ نظر کی تکذیب آنے والے کل میں ممکن ہے۔ اس لیے کہ مواد کی دستیابی و حصولیابی سے حقائق و مسائل کی نوعیتیں بدل جاتی ہیں اس لیے اگر ۲۵ جولائی ۱۹۸۵ء کے بعد کسی محقق یا عالم ادب کو کسی نئے معلوماتی سرچشمے سے فیض اٹھانے کا موقع ملا ہو تو یہ جائے حیرت نہیں اس لیے کہ ان کا اس کا جو روشن ہوتا ہے کہ آج جس نقطۂ نظر کی صحت پر اعتبار کر کے کوئی بات کہی گئی ہے ممکن ہے کہ کل ہی کسی معروضی حقیقت کی روشنی میں خود مقالہ نگار اس کی تردید کر دے علمی دنیا میں ہمیشہ سے ایسا ہوتا رہا ہے اور یہ سلسلہ مستقبل میں بھی جاری و ساری رہے گا۔

جہاں تک شاہ علی ابدالی کے تحقیقی اور تنقیدی اعتراضات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے

کہ موصوف نے عالمانہ انداز اختیار کرنے کے بجائے معتصبانہ رویہ اپنایا ہے جس سے ان کے احساسِ کمتری کا اظہار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ شاہ علی ابدالی کا مقالہ مفروضیات، ترتیب، تنظیم اور تسلسل سے محروم اس امر کی مثال ہے ؏ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ

فاضل مقالہ نگار نے "دیوان حضرت مشرقی منیری" کے جن پہلوؤں پر اعتراضات کیا ہے اس کا تعلق مشرقی منیری کی شاعرانہ انفرادیت، شہرت، حالات زندگی، اسلوب بیان اور عربی و فارسی شاعری وغیرہ سے ہے افسوس اس امر پر ہے کہ اپنے اعتراضات کو موصوف ترتیب و سلیقے کے ساتھ پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ کبھی انھوں نے مشرقی منیری کی شاعری سے متعلق کسی پہلو کو نشانۂ اعتراض بنایا ہے کبھی حالات زندگی کے کسی ایک گوشے پر نکتہ چینی کی ہے اور کبھی پھر لوٹ کر مشرقی کی شاعری، اسلوب، شہرت اور حالات زندگی کے کسی پہلو پر معترض ہوئے ہیں۔ انتشار خیال اور تکرار بیاں کے اعتبار سے یہ مقالہ یقیناً ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔

شاہ علی ابدالی اپنے مقالہ کے ص۸ پر راقم الحروف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ڈاکٹر صاحب موصوف نے مشرقی کے مقام کے تعین کا دعویٰ تو بہت کیا ہے لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ انھوں نے مشرقی کا پورا اردو کلام بھی نہیں دیکھا۔"

بعد ازاں فاضل مقالہ نگار نے مشرقی کے حالات زندگی، شاعری، اشعار، رشتہ داران مختلف پہلوؤں پر اعتراض کرنے کے بعد ص۱۲ پر پھر اسی اعتراض کو بہ تکرار ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"ڈاکٹر ابو عبیدہ ابدالی نے مشرقی منیری پر تحقیقی مقالہ تو لکھ دیا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ مشرقی کا پورا کلام ان کی نظر سے نہیں گذرا۔"

بہرکیف میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ مشرقی منیری کا سارا سرمایہ سخن میری نگاہوں سے گذر چکا ہے اور کوئی بھی صاحب ہوش و خرد ایسا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا یہ دعویٰ تو شاہ علی ابدالی کو ہی زیب دیتا ہے۔ یہ ایک واقعاتی صداقت ہے کہ مشرقی منیری نے کسی موقع پر اپنے سرمایۂ سخن کو خود ہی ضایع کر دیا تھا۔ بعد میں مخلص احباب کے اصرار پر انھوں نے از سر نو اپنی یادداشت کے سہارے اپنے کلام کی تدوین کی جس کا اعتراف خود شاہ علی ابدالی نے پیش نظر مقالہ کے ص۱۲ پر کیا ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اس کوشش میں بہت سے پرانے اشعار مشرقی کے ذہن سے محو ہو گئے اور ان کو نئے اشعار کہنے پڑے اس سلسلے میں شاہ علی ابدالی نے بعض بیاضوں کا ذکر کیا ہے جن پر بقول ان کے مشرقی منیری کا کلام درج ہے۔ میں نے اپنی تحقیق کے سلسلہ میں ان سے بھی مواد کی فراہمی کی گذارش کی تھی اور انھوں نے حتی الامکان اس سلسلے میں میری رہنمائی بھی کی تھی جس کے لیے میں نے "دیوان حضرت مشرقی منیری" کے مقدمہ میں ص۳ پر بطور خاص ان کا بھی شکریہ ادا کیا ہے لیکن یہ راز تو اب کھلا کہ انھوں نے مشرقی کے کلام کے ان نمونوں کی مجھے دانستہ ہوا بھی نہ لگنے دی جو مختلف پرزوں پر صرف ان کے پاس محفوظ تھے۔ اسی طرح حالات زندگی کے سلسلے میں بھی میں نے ہر مرحلہ پر ان سے تبادلہ خیال کیا اور ان کے فراہم کردہ

معلومات سے استفادہ کیا اور کامل اعتماد کے ساتھ ان پر اس لیے بھروسہ کیا کہ وہ مشرقی منیری کے قریبی عزیز ہونے کے مدعی رہے ہیں. چنانچہ بعض غزلیں انھوں نے اس تمہید کے ساتھ مجھے عنایت کیں کہ وہ رخشاں ابدالی صاحب کی فرستادہ تھیں اور شاہ علی ابدالی کے لفظوں میں ان غزلوں کا مشرقی منیری کے تحقیقی مقالہ میں شامل نہ ہونا شاعر پر بہت بڑا ظلم ہوگا اب ان کے پیش نظر اعتراضات سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ موصوف کی نیت ابتدا ہی سے خلل پذیر تھی اور انھوں نے اپنے طور پر مجھے گمراہ کرنے کی سعی بھی یقیناً کی ہوگی تاکہ انھیں مجھ پر اعتراض کرنے کا سنہرا موقع ہاتھ آئے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لیے سلیقہ و ہنرمندی کی ضرورت ہے جس سے بفضلہٖ موصوف کی دور کی بھی شناسائی نہیں اس لیے ان کا مقالہ حقائق کی نشاندہی کے بجائے ہذیان گوئی کا ایک پُرفریب مجموعہ اور بددیانتی اور بدنیتی کا شاہکار بن گیا ہے

میرا مقصد مشرقی منیری کے دیوان اور دوسرے ذرائع سے حاصل شدہ کلام کے پیش نظر ان کی اردو غزلیات کا جائزہ پیش کرنا تھا ان کی فارسی و عربی شاعری اور نثر نگاری میرے دائرہ کار سے باہر تھی میں نے پیش گفتار کے تحت یہ صراحت کردی

" کچھ دنوں کے بعد میں نے کلیات مشرقی منیری سے غزلوں کے حصہ کو الگ کیا اور مختلف ذرائع سے حاصل شدہ غزلوں کو یکجا کر کے ان کی غزلوں پر مشتمل ایک مفصل اور مبسوط مقالہ لکھنے کا عزم کیا حضرت مشرقی منیری نے فارسی و اردو کی مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی تھی ابتداً انھوں نے محو تخلص اختیار کرلیا تھا، پھر ساقی یہ معانی لیکن بعد میں مشرقی منیری کی حیثیت سے مشہور ہوئے ان تمام پہلوؤں پر میں نے مقدمہ میں صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور مختلف اصناف پر مشتمل ان کے کلام کا ذکر کرتے ہوئے ان کی غزل گوئی کی جمالیاتی قدروں کے تعین کی کوشش کی ہے اس لیے ان کی تخلیقی شخصیت کا بے ساختہ اظہار صنف غزل میں ہوا ہے ." (دیوان حضرت مشرقی منیری ص۱)

اس صراحت کے بعد ڈاکٹر شاہ علی ابدالی کے مندرجہ ذیل اعتراضات معروضیت سے کس قدر بے تعلق ہیں اس کا اندازہ صاحب نظر کے لیے مشکل نہیں :

(۱) " ... موصوف نے ان کی شاعری کا ذکر کیا ہے . وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے اور ان کے مضامین " الینع " کے علاوہ دوسرے رسالوں میں بھی شایع ہوتے تھے ." (مقالہ شاہ علی ابدالی ص۸) .

(۲) " ... فارسی کلیات میں عربی کلام بھی ملتا ہے، لیکن انھوں نے ان کی عربی شاعری کا ذکر نہیں کیا ہے ." (مقالہ شاہ علی ابدالی ص۱۲) .

(۳) " ... انھوں نے ان کی فارسی شاعری کا سرے سے جائزہ ہی نہیں لیا اور یہ حقیقت ہے کہ فارسی شاعری کے بغیر مشرقی کے کلام کا جائزہ مکمل نہیں ہوسکتا ." (مقالہ شاہ ابدالی ص۱۴) .

جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے میرا مقصد مشرقیؔ منیری کی اردو غزلوں کا تنقیدی جائزہ تھا اس لئے ان کی غزلوں سے قطع نظر ان کے دوسرے اردو کلام ان کی عربی و فارسی شاعری پر تجزیہ و تنقید یا ان کی نثر نگاری کے جائزہ کی یہاں گنجائش نہ تھی اس لیے ان کا مذکورہ بالا اعتراض تو اس روشنی میں بالکل ہی بے موقع و بے محل ہے جو اظہر من الشمس ہے موصوف کے مطابق میں نے ان کی شاعری کا ذکر کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان کی شاعری کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ان کی شاعری کا دائرہ عمل میں ان کا سارا عربی، فارسی اور اردو کلام آتا ہے میں نے صرف ان کی اردو غزل کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر علی ابدالی لفظ "شاعری" کی معنوی وسعت سے بھی بے خبر ہیں مزید یہ کہ ان کے اس جملہ کی تردید اعتراضات نمبر ۲ اور نمبر ۳ سے خود ہی ہو جاتی ہے۔ میں نے موصوف کی عربی و فارسی شاعری کا جائزہ نہیں لیا ہے یہ خود تردید ہی بھی موصوف کی ریرہ خیالی کا مین ثبوت ہے، مزید برآں یہ کہ میں نے ضمناً مشرقیؔ منیری کی نثر نگاری کا ذکر بھی کیا ہے ملاحظہ ہو مندرجہ ذیل سطریں:

"۔۔ رخشاںؔ ابدالی نے مشرقیؔ کے علمی و ادبی مشاغل پر بہت کچھ لکھا ہے ان کے مضامین و مقالات ہند و پاک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں جس میں مشرقیؔ منیری کی شاعری و نثر نگاری پر جائزہ حاصل کی گئی ہے۔" (دیوان حضرت مشرقی منیری ص ۲۸)

اقتباس کے خط کشیدہ پر غور کیجیے تو واضح ہو جائے گا کہ مشرقی منیری کے نثر نگاری سے راقم الحروف بے خبر نہیں تھا۔ شاہ علی ابدالی کا یہ الزام کس ذہنیت کی غمازی کرتا ہے، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں پھر یہ کہ اگر موصوف مشرقی منیری کے نثری مضامین کی نشاندہی کو لازمی سمجھتے تھے تو (البینج کے علاوہ دوسرے رسالوں) لکھنے کے بجائے انھیں کم از کم ایک دو رسائل کا نام بھی لینا چاہیے تھا مگر مشکل یہ ہے کہ خود موصوف کو شاید اس کی واقفیت نہیں۔

شاہ علی ابدالی کا یہ اعتراض کہ میں نے "ان کی (مشرقی منیری) عربی شاعری کا ذکر نہیں کیا ہے۔" (مقالہ شاہ علی ابدالی ص ۱۲) کس قدر بے بنیاد ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے:

(۱) "۔۔۔ فارسی دیوان کی ابتدا قصائد سے ہوتی ہے یہ قصیدے حمد، نعت اور منقبت میں ملتے ہیں ایک قصیدہ عربی زبان میں بھی ہے۔ ایک قصیدہ سلطان عبدالحمید خاں کی مدح میں کہا گیا ہے۔ قصیدہ کے اختتام پر ایک عربی قطعہ بھی ملتا ہے بعد ازاں فارسی قطعات ملتے ہیں ان میں چھوٹے بڑے متعدد قصائد شامل ہیں۔ عربی میں بعض قطعے آگے بھی ملتے ہیں۔" (دیوان حضرت مشرقی منیری ص ۴۶)

(۲) "۔۔۔۔ ان کے کلیات میں ان کی عربی شاعری کے بھی بعض نمونے ملتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ مشرقیؔ منیری نہ صرف فارسی و اردو کی شعری روایت کا پختہ شعور رکھتے تھے بلکہ عربی ادب کی دیرینہ روایتوں سے بھی واقف

تھے۔" (دیوان حضرت مشرقی منیری ص۳)

دونوں اقتباسات کے خط کشیدہ جملوں پر غور فرمایئے اور شاہ علی ابدالی کے اس اعتراض کو پیش نظر رکھیے:

" انھوں نے ان کی عربی شاعری کا ذکر نہیں کیا ہے۔" (مقالہ شاہ علی ابدالی ص۱۲)

شاید موصوف کے لغت میں " ذکر" کے کچھ اور معنی ہوں گے۔

مندرجہ بالا اقتباس سے ان کے تیسرے اعتراض کی بھی بہت حد تک تکذیب ہو جاتی ہے کہ میرے پیش نظر مشرقی منیری کا فارسی کلام نہیں تھا البتہ جیسا کہ میں نے عرض کیا مشرقی کی فارسی شاعری کا تجزیہ میرا موضوع نہ تھا اس لیے کہ مشرقی کی فارسی شاعری ایک الگ مقالہ کی متقاضی ہے۔ اگر شاہ علی ابدالی اس طرف توجہ کرتے تو شاید " کارے کردم " پر تعلّی کے مستحق ہوتے پھر بھی میں نے جا بجا مشرقی منیری کی فارسی شاعری کا ذکر کیا ہے اور فارسی روایت شاعری سے ان کی معتبر واقفیت کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ ثبوت میں مندرجہ بالا اقتباسات کے علاوہ مندرجہ ذیل جملوں کو بھی پیش نظر رکھیے:

مشرقی منیری نے فارسی و اردو دونوں زبانوں میں تخلیقی تجربے کیے ہیں۔ ان کا کلیات فارسی و اردو کی مختلف صنفوں میں ان کے اختراعات فائقہ کا ایک روشن ثبوت ہے۔ قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ اور دوسری مروجہ اصناف میں مشرقی منیری نے انفرادی تخلیقی ذہن و شخصیت کا اظہار کیا ہے۔ کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فارسی اور اردو کی شعری روایت سے معتبر شناسائی رکھتے تھے۔" (دیوان حضرت مشرقی منیری ص۳)

یہی نہیں میں نے مشرقی منیری کے کلیات فارسی کے دیباچہ کا ایک نسبتاً طویل اقتباس بھی پیش کیا ہے اس کے بعد مندرجہ ذیل فارسی شعر کی روشنی میں ان کے باطنی رجحانات و میلانات کی طرف اشارے کیے ہیں۔ ؎

لہی من غریب و من توانم ولایت دہ مرا چند آنکہ خواہم (دیوان حضرت مشرقی منیری ص۶۰-۶۲)

واضح رہے کہ یہ مشرقی منیری کا پہلا فارسی شعر ہے جس کی بنیاد پر میں نے ان کی شاعرانہ شخصیت کے تعین کی کوشش کی ہے اس امر سے یہ روشن ہے کہ مشرقی منیری کی فارسی شاعری پس منظر کے طور پر مشرقی کے اردو غزل کے جائزے میں میرے پیش نظر رہی ہے۔ پیش گفتار میں میں نے عرض کیا ہے:

" حضرت مشرقی منیری ایک امتیازی ادبی حیثیت کے مالک ہیں لیکن کچھ تو متصوفانہ ربودگی کی بنا پر اور کچھ امتداد زمانہ کے سبب وہ عام ادبی دنیا میں اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔" (دیوان حضرت مشرقی منیری ص۷)

شاہ علی ابدالی نے ان جملوں کے پیش نظر راقم الحروف پر اپنے مقالہ ص۵ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:

" آگے چل کر وہ خود ہی اپنی بات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں" ان کا کلام معتبر رسائل و جرائد کی زینت"

جاتا ہے ہمعصر اساتذہ نے ان کے کلام کی بھرپور ستایش کی ہے۔" (دیوان حضرت مشرقی منیری ص۳۱)

بہ ظاہر علی ابدالی کو اپنا اعتراض بڑا منطقی نظر آتا ہے۔ حالانکہ "پیش گفتار" میں میرے کہنے کا مفہوم یہ تھا کہ مشرقی منیری کی ادبی حیثیت مسلمہ ہے۔ ہم عصروں نے بھی ان کی انفرادیت کو تسلیم کیا تھا لیکن صوفیانہ ربودگی کی بنا پر وہ اپنے کلام کی خاطر خواہ ترویج و اشاعت سے بے نیاز رہے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ادبی دنیا نے انھیں تقریباً فراموش کر دیا اس لیے ضرورت اس امر کی تھی کہ ان کی تخلیقی اور شاعرانہ انفرادیت سے ادبی دنیا کو از سر نو روشناس کرایا جائے۔ شاہ علی ابدالی کو اس کی خبر ہوگی کہ غالب جیسا مشہور و مقبول شاعر بھی اپنی وفات کے کچھ ہی دنوں کے اندر فراموشی کے اس مرحلے میں پہنچ گیا تھا جہاں سے گمنامی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ خواجہ الطاف حسین حالی کو "یادگار غالب" لکھنی پڑی کم و بیش مشرقی منیری بھی فراموشی و گمنامی کی اس منزل میں آج بھی ہیں یقیناً اس امر کی ضرورت ہے کہ ان کی شاعرانہ انفرادیت سے ادبی دنیا کو واقف کرایا جائے اور چونکہ ان کی شاعرانہ انفرادیت ان کی غزل گوئی کی رہین منت ہے اس لیے میں نے ان کی اردو غزلوں کو اس مقصد کے لیے منتخب کیا۔ اب اگر شاہ علی ابدالی یہ سمجھتے ہیں کہ میرے متذکرہ بالا اقوال ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں تو اس کے سوا اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ۔ ؎

بدین عقل و دانش بہ باید گریست

اس وضاحت کے بعد میرے مذکورہ بالا اقوال پر ان کے مندرجہ ذیل اعتراضات بے معنویت کی چنداں ضرورت نہیں۔

شاہ علی ابدالی لکھتے ہیں:

"آگے چل کر وہ ان کے اس مشاعرے میں شرکت کا بھی ذکر کرتے ہیں جو ۱۹۰۲ء میں "بادشاہ منزل" پٹنہ میں ہوا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ موصوف کی تحریر میں توازن نہیں ہے۔ پہلے لکھتے ہیں کہ باوجود اچھے شاعر ہونے کے ان کی کوئی شہرت نہ تھی پھر بعد میں لکھتے ہیں کہ ان کا کلام اچھے رسالوں میں شائع بھی ہوتا تھا اور ہم عصر شعرا ان کے کلام کی تعریف بھی کرتے تھے جو ان کے بارے میں نہیں جانتا کس بات کو سچ سمجھے۔ (مقالہ شاہ علی ابدالی ص۸)

یہ اعتراض بدنیتی کا نتیجہ ہے یا کم مایگی تفہیم و آگہی کا اس لیے کہ ادبی دنیا میں ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ ایک شاعر اپنے زمانے میں معراج شہرت پر رہا لیکن آنے والے دنوں میں قعر گمنامی کا شکار ہو گیا۔ مثال کے طور پر ذوق کو اپنے زمانے میں مومن و غالب سے کہیں زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے شاگرد رشید محمد حسین آزاد سے ان کی عظمت کا قصیدہ لکھا لیکن آج غالب و مومن کے مقابلے میں ذوق کی اہمیت سے اہل علم ناواقف ہیں۔

شاہ علی ابدالی کا بہ ظاہر ایک دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ میں مشرقی منیری کے مخصوص انداز کے تعین میں بُری طرح ناکامیاب رہا ہوں۔ موصوف کے مندرجہ ذیل جملے ملاحظہ کیجیے:

(۱) "لیکن اس کتاب سے پتہ نہیں چلتا کہ ان کی غزل گوئی کا مخصوص انداز کیا ہے۔" (مقالہ شاہ علی ابدالی صہ)

(۲) "انھوں نے دعویٰ تو بہت کیا ہے لیکن مشرقی منیری کے مخصوص انداز کا پتہ نہ چلا سکے اور یہ حقیقت ہے کہ وہ ادب میں ان کا مقام متعین کرنے میں بری طرح ناکامیاب رہے ہیں۔" (مقالہ شاہ علی ابدالی صہ۱۲)

میں نے مشرقی منیری کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے صہ۶۵ سے صہ۹۰ تک جو کچھ لکھا ہے اسے شاہ علی ابدالی ایک بار پھر پڑھنے کی زحمت گوارا کریں تو مجھے یقین ہے کہ حقیقت ان پر بھی روشن ہو جائے گی اور اگر انھیں اس میں ناکامیابی ہو تو وہ اسے مکرر سہ کرر پڑھنے کی زحمت اٹھائیں مجھے یقین ہے کہ ان کی دو چار ایسی مخلصانہ کوشش انھیں اپنے مقصد میں یقیناً کامیابی سے ہمکنار کریں گی اور اگر اس کے باوجود گوہر مقصود ان کے ہاتھ نہ آئے تو انھیں دعوئ شعر فہمی ترک کر دینا چاہیے کہ ان کے مرض نافہمی کا واحد علاج یہی ہے۔

بہرکیف مندرجہ ذیل اقتباسات ان کی رہنمائی کے لیے پیش خدمت ہیں۔

(۱) "مشرقی منیری کے منفرد ذوق سخن اور مہذب مزاج فن نے رسمی اور تخلیقی تنزل سے الگ ایک باوقار اسلوب اور آہنگ سخن کی بنیاد رکھی جس میں عشق معشوق اور آوارہ منشوں کی شہرت رانی جذبہ احساس کا اظہار نہیں بلکہ باطنی کوائف اور صحت مند داخلی تجربات کا اظہار ہے۔" (دیوان حضرت مشرقی منیری صہ۶۶-۶۵)

(۲) "مشرقی منیری نے تمام پچھلی شعری روایتوں کو ہم آہنگ کر کے اپنے اسلوب اظہار کی تشکیل و تعمیر کی تھی لیکن ان کے کلام پر سب سے زیادہ اثر دبستان غالب کا ہے جس کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ ان کے مذاق سخن کی تہذیب و تقدیر حضرت صوفی منیری کے سایہ عاطفت میں ہوئی تھی جو تلامذہ غالب میں برگزیدہ عظمت و اہمیت رکھتے تھے اور دبستان غالب کے اہم نمائندہ سمجھے جاتے تھے اور دوسرا سبب خود مشرقی منیری کا رجحان و میلان تھا جو رسمی اور تقلیدی شاعری سے گریزاں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ مشرقی منیری کی متغزلانہ شخصیت عصری غزلیہ روایتوں سے ہم آہنگ تھی اور اسی لیے وہ اپنی غزلوں کو اس معنی میں غزل نہیں سمجھتے تھے لیکن انھوں نے عصری ماحول و مزاج کا تنقیدی جائزہ لیا تھا اور ادبی و فنی کاوشوں کو محض تفنن طبع کے طور پر سامنے نہیں رکھا تھا بلکہ وہ شعر و ادب کو اخلاق، مواعظ، نصائح و پند اور نکات و حکمت کے پر اثر بیان کا ذریعہ سمجھتے تھے اس لیے ان کے کلام میں جذبات پر فکر کو فوقیت حاصل ہے۔" (دیوان حضرت مشرقی منیری صہ)

(۳) "مشرقی منیری نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنے اختراعی ذہن اور تخلیقی شخصیت کا اظہار ۔۔۔ اور اک فن اور شعور سخن کی روشنی میں کیا ہے۔ وہ عصری حسیات و کیفیات سے آشنا تھے اور عربی و فارسی اور

اردو ادب کے گہرے مطالعہ نے انھیں مثبت اور منفی قدروں کے درمیان امتیاز و انتزاع کا شعور بخش دیا تھا، جس کی روشنی میں انھوں نے یقیناً ایک صحت مند روایت فن کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی۔ ریاض حسن خیال رسولپوری کے ساتھ ساتھ سرسید کی علی گڑھ تحریک سے گہری دلچسپی، وابستگی ان کے انقلابی فکر و ذہن کی غمازی کرتی ہے۔ یہی انقلابی طبیعت انھیں غالب سے نسبتاً زیادہ قریب رکھتی ہے۔ متحرک سطح پر لفظوں کا تہ دار، برمحل، موزوں اور بے ساختہ اظہار فن انھوں نے غالب ہی سے سیکھا تھا مگر بعض ذاتی حالات و علل اور بنیادی طور پر منیر شریف کی صوفیانہ فضا قلندرانہ ماحول اور درویشانہ روایت نے ان کو اس وقت فکر و سخن سے بے نیاز کر دیا جب وہ فکر و فن کی پختگی کی منزلوں میں تھے یقیناً اردو کی ادبی دنیا کا ایک بڑا نقصان ہوا مگر جتنا کچھ ان کا کلام ادبی دنیا کے پیش نظر ہے۔ اس سے بھی ان کے منفرد اختراعی ذہن کا ثبوت ملتا ہے حالی اور اقبال کے درمیانی عہد میں جن لوگوں نے اپنی اختراعی طبیعت کا انفرادی مظاہرہ کیا ہے ان میں مشرقی منیری بھی ناقابل فراموش اہمیت رکھتے ہیں۔" (دیوان حضرت مشرقی منیری ص ۹)

مندرجہ بالا اقتباسات میں سے پہلے اور دوسرے اقتباس کا تعلق مشرقی منیری کے مخصوص انداز بیان سے ہے اور آخری اقتباس ان کے ادبی مقام کے تعین سے تعلق رکھتا ہے۔ شاہ علی ابدالی سے ایک بار پھر گذارش ہے کہ وہ ان اقتباسات کو سمجھنے کی سعی فرمائیں۔

مشرقی منیری کی جن دو غزلوں کو شاہ علی ابدالی نے اپنے مقالہ ص ۱۲ اور ص ۱۳ پر عطا بہاری سے موسوم کیا ہے ان کے بارے میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ وہ مشرقی منیری کی نہیں ہیں عطا بہاری کی ہیں، اس لئے کہ مشرقی منیری نے اپنے خاتمہ کلیات پر بڑے افسوس کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ان سے غزلیں لکھوائیں اور اپنے نام سے شائع کرائیں شاہ علی ابدالی کے دعوے کے مطابق مشرقی منیری کا کلیات ان کے پاس موجود ہے وہ اس کی تحقیق کر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ شاہ علی ابدالی کا مندرجہ ذیل دعویٰ بھی دلیل کا محتاج ہے۔

"دونوں غزلیں مشرقی منیری کے منفرد انداز سے مختلف ہیں یہ غزلیں مشرقی منیری کی ہو ہی نہیں سکتیں۔" (مقالہ شاہ علی ابدالی ص ۱۲)

مشرقی منیری کا منفرد انداز کیا ہے اس کی کچھ وضاحت شاہ علی ابدالی کو کرنا چاہیے تھی اس لیے کہ رقم الحروف پر ان کا اعتراض یہ ہے کہ میں نے ان کے مخصوص انداز بیان کی وضاحت نہیں کی اب جبکہ وہ خود مشرقی کے منفرد انداز بیان کا ذکر کرتے ہیں تو ان پر فرض ہے کہ وہ مشرقی اور عطا بہاری کے منفرد اسالیب کی وضاحت کریں۔ دلیل کے بغیر دعویٰ نامناسب ہے۔ اس اعتراض کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ میں نے واضح طور پر یہ بات تحریر کر دی ہے کہ مشرقی کے اردو دیوان میں صرف ایک غزل ایسی ملتی

ہے جس میں محو تخلص استعمال کیا گیا ہے۔ میں نے لکھا ہے :

" کلیات مشرقی منیری میں محو تخلص سے ایک ہی غزل شامل ہے اس تخلص کی کچھ غزلیں دوسرے ذرائع سے دستیاب ہوئی ہیں۔" (دیوان مشرقی منیری ص ۲۹)

ستم ظریفی یہ ہے کہ دوسری غزل جس پر شاہ علی ابدالی معترض ہیں خود انھوں نے ہی مجھے رخشاں ابدالی کے حوالے سے عنایت کی اور آج وہ خود اس پر معترض ہیں ؎ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اس طرح فاضل مقالہ نگار شاہ علی ابدالی نے حضرت مشرقی منیری کے حالات زندگی ان کے بزرگوں کے ذکر، اشعار اور تلامذہ وغیرہ کے سلسلے میں جا بجا اعتراضات کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ انھیں میری پی ایچ ڈی تھیسس کا مطالعہ کرنا چاہیے تھا جس میں تفصیل و صراحت کے ساتھ متعلقہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "دیوان حضرت مشرقی منیری" میں چونکہ ان کی اردو غزلوں کا جائزہ لینا راقم الحروف کے پیش نظر تھا اس لیے میں نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ کی تلخیص کر دی ہے اور صرف ضروری اور ناگزیر امور کا ذکر کیا ہے۔ اس کے باوجود فاضل مقالہ نگار شاہ علی ابدالی کے بعض اعتراض کے جوابات خود اس کتاب میں موجود ہیں اور بعض اعتراضات تو بالکل ہی لایعنی ہیں۔ مثلاً میں نے مشرقی کے خاندانی حالات کے سلسلہ میں ص ۱۹ پر رقم کیا ہے۔

" بابا فرید گنج شکر کے صاحبزادے حضرت یعقوب تا خدا کی اولاد میں حضرت نصیر الدین عرف پیارے اسلام کی ترویج و اشاعت کی غرض سے گرجی متصل پٹنہ میں آباد ہوئے۔" (دیوان حضرت مشرقی منیری ص ۱۹)

جس سے شاہ علی ابدالی نے مندرجہ ذیل نتیجہ اخذ کیا ہے :

" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نصیر الدین عرف پیارے اس خاندان کے پہلے بزرگ ہیں جو بہار آئے لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔" (مقالہ شاہ علی ابدالی ص ۹)

اب اس کو خلل ذہنی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ میں نے گرجی کا ذکر کیا ہے اور انھوں نے اس پر بہار کو قیاس کیا اور یہی نہیں بلکہ یہ تعبیر بھی فاضل مقالہ نگار نے کر لی کہ میں نے صوبہ بہار میں اس خاندان کے پہلے بزرگ کی آمد پر روشنی ڈالی ہے۔ حالانکہ میرے کسی بھی لفظ سے ایسی کوئی بات سامنے نہیں آتی دراصل شاہ علی ابدالی نے مجھ پر خواہ مخواہ اعتراض کرنے کے لیے حقیقت کو توڑ مروڑ کر علمی دنیا کو گمراہ کرنے کی مجرمانہ حرکت کی ہے اور اس کو بہانہ و بنیاد بنا کر ص ۹ پر کتاب الاسباب کے ذکر سے لے کر آخر تک تقریباً یعنی چھبیس ۲۶ سطریں قلمبند کی ہیں جن کا مجھ سے یا مشرقی منیری کے حالات و کوائف سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے لیکن شاہ علی ابدالی کو مجھ پر یہ اعتراض کرنا تھا۔

"اگر ڈاکٹر ابو عبیدہ کوشش کرتے تو مشرقی منیری کے خاندانی حالات اور ان کے بزرگوں پر تفصیلی روشنی ڈال سکتے تھے۔" (مقالہ شاہ علی ابدالی ص۱)

جہاں تک مشرقی منیری کے خاندانی حالات کا تعلق ہے میں نے تمام ضروری معلومات اپنی تھیسس میں اور ان کی متوازن تلخیص "دیوان حضرت مشرقی منیری" میں پیش کر دی ہے البتہ مشرقی منیری کے بزرگوں پر تفصیلی روشنی ڈالنا میرے موضوع سے قطعی خارج تھا اس لیے کہ وہ ایک الگ دفتر کا متقاضی ہے۔ شاہ علی ابدالی کو نہیں معلوم کہ تحقیقی کام کا مزاج و اصول کیا ہے۔ میں نے "دیوان حضرت مشرقی منیری" میں حضرت سید علی جاجمیری کے متعلق لکھا ہے کہ:

"وہ شریعت و طریقت کے تابندہ ستارے تھے۔" (دیوان حضرت مشرقی منیری ص۲)

میرے اس جملے پر شاہ علی ابدالی اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حضرت سید علی جاجمیری کو طریقت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ صوفی نہیں مجاہد تھے۔" (مقالہ شاہ علی ابدالی ص۱)

مذکورہ بالا عبارت سے شاہ علی ابدالی کی کم مائیگی علم و کمزوری ایمان و ایقان کا پتہ چلتا ہے کہ خود ان کو اس کا اندازہ نہیں ہے کہ اس اعتراض سے کتنی نزاکتیں پیدا ہوتی ہیں کیا ان کو نہیں معلوم کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ مجاہد تھے اور صوفی بھی حضرت مودود چشتیؒ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ مجاہد کی حیثیت سے ہندوستان تشریف لائے حالانکہ وہ اپنے وقت کے ایک بڑے درویش اور صوفی تھے جن کو اگر تسلیم نہ کیا جائے تو خواجہ غریب نوازؒ کے اوپر کا سلسلہ مجروح ہو جائے گا اسی طرح حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے پوتے حضرت قطب عالمؒ بھی جو احمد آباد گجرات کے ایک صاحب فیض بزرگ تسلیم کیے جاتے ہیں، بیک وقت صوفی اور مجاہد تھے اور کئی جنگوں میں ان کی شرکت ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ فاضل مقالہ نگار کے اس دعویٰ سے اس کا استنباط ہے کہ صوفی اور مجاہد دونوں ایک فرد واحد نہیں ہو سکتا۔ اس بد دماغی کو کیا کہا جائے کہ یہ اعتراض اسلام کی کتنی بڑی شخصیتوں پر عائد ہوتا ہے۔

شاہ علی ابدالی اپنے مقالہ ص۱ پر حضرت سید علی جاجمیریؒ کے حوالہ سے آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اوپر کے بزرگوں میں حضرت زید شہید اور حضرت ابوالفرح واسطی کے حالات مل جاتے ہیں۔ حضرت مولانا قطب الدین داد بیگ تار گبھوی کے بعد کے بزرگوں کے حالات مل جاتے ہیں، لیکن انھوں نے ان بزرگوں کے حالات معلوم کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔"

فاضل مقالہ نگار کو یہ نہیں معلوم کہ میں مشرقی منیری پر تحقیقی کام کر رہا تھا۔ ان کے تمام بزرگوں پر تحقیقی مقالہ قلمبند کرنا میرا مقصد نہیں تھا۔ میں نے مشرقی کے نانیہالی بزرگوں کا نسب نامہ بتفصیل ص۲۲ پر دیوان حضرت مشرقی منیری میں

"کتاب الانساب" مخطوطہ صفحہ مرتبہ شاہ عبدالقادر اسلامپوری کے حوالہ سے درج کردیا ہے۔ شاہ علی ابدالی کا تقاضہ ہے کہ میں اصل موضوع کو نظر انداز کر کے حضرت مشرقی منیری کے بزرگوں کے حالات و کوائف کی تاریخ منضبط کرتا۔ دراصل انھیں تحقیق اصول و تہذیب سے واقفیت نہیں ہے اسی لیے انھوں نے اس طرح لایعنی باتیں کی ہیں۔ صفحہ ہی پر شاہ علی ابدالی تحریر کرتے ہیں:

"مخدوم شاہ یحییٰ علی نو آبادی اور ان کے صاحبزادے مولانا اشرف علی عارف نو آبادی کے حالات تذکرۃ الابرار کیفیت العارفین اور انوار ولایت میں موجود ہیں لیکن مرتب دیوان نے ان بزرگوں کے حالات بھی نہیں لکھے اور نہ ان کی تاریخ ولادت و وفات ہی لکھی۔ عارف نو آبادی کا نمونہ کلام بھی نہیں دیا اسی طرح جوشش منیری کے نانا حضرت لطف علی منیری کے حالات بھی نہیں لکھے گئے۔"

معلوم نہیں فاضل مقالہ نگار ان بزرگوں کے حالات پر اس قدر زور کیوں دے رہے ہیں جبکہ میں نے حسب ضرورت مشرقی منیری کے علمی و ادبی اہمیت کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ دیوان حضرت مشرقی منیری میں مخدوم شاہ یحییٰ علی نو آبادی اور ان کے صاحبزادے عارف نو آبادی کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"حضرت مخدوم شاہ یحییٰ علی نو آبادی حضرت مخدوم شاہ محسن علی کے جلیل القدر خلیفہ تھے حضرت شاہ یحییٰ علی نو آبادی کے فیوض و برکات بہار شریف، شیخپورہ اور اسلام پور کی خانقاہوں میں ہنوز جاری و ساری ہیں۔ آپ کے صاحبزادے مشرقی منیری کے نانا حضرت اشرف علی المتخلص عارف اردو اور فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ آپ مولانا مخدوم یحییٰ علی نو آبادی کے مرید، خلیفہ اور جانشین تھے۔ علم کے بڑے شائق تھے اور تاحیات مصروف درس تدریس رہے۔ آپ کی تصنیفات میں عقیدۃ المسلمین اور فارسی دیوان راقم الحروف کے خاندانی کتب خانہ قادریہ اسلام پور نالندہ میں آج بھی محفوظ ہیں۔ عبدالحمید پریشان عظیم آبادی طب میں آپ ہی کے شاگرد تھے یہاں یہ بات واضح کردینا چاہتا ہوں کہ حضرت مشرقی منیری کے والد ماجد حضرت شاہ جلیل احمد جوشش منیری اور حضرت مشرقی منیری کے استاد حضرت صوفی منیری دونوں خالہ زاد بھائی تھے اور حضرت شاہ لطف علی المتخلص کرسی کے نواسے، حضرت مشرقی منیری کے نانا حضرت اشرف علی عارف اور ان کے والد حضرت جوشش منیری کے نانا شاہ لطف علی بھی شاعر تھے اور کرسی تخلص فرماتے تھے حضرت کرسی فارسی کے شاعر تھے اور حضرت عارف فارسی اور اردو دونوں کے شاعر تھے۔" (دیوان حضرت مشرقی منیری صفحہ ۲۱-۲۲)

مندرجہ بالا عبارت سے مخدوم شاہ یحییٰ علی نو آبادی اور اشرف علی عارف کی علمی و شاعرانہ شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ فاضل مقالہ نگار کا مذکورہ الزام متعصبانہ تنگ نظری پر مشتمل ہے۔ [illegible] فاضل مقالہ نگار کا فہم و شعور ناقابل اعتماد ہے۔

صفحہ پر آگے چل کر مقالہ نگار تحریر فرماتے ہیں:

"ص ۲۰-۲۲ تک حالات زندگی بیان کیے گیے ہیں بیشتر حالات رخشاں ابدالی کے مضمون حضرت مشرقی منیری مطبوعہ "مہر نیم روز" کراچی جنوری ۱۹۶۱ء سے لیے گیے ہیں لیکن اصل مضمون کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ رخشاں ابدالی نے اس مضمون میں ان کے حالات ان کی تحریروں کی مدد سے لکھے ہیں۔"

فاضل مقالہ نگار نے حالات زندگی کے سلسلہ میں متذکرہ حوالوں کو دانستہ نظر انداز کرکے یہ اعتراض کیا ہے میں نے اس سلسلے میں ص ۲۲ پر تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ اول ص ۲۲۱ اور فارسی کلیات مشرقی منیری مخطوطہ ص ۲۶ کے حوالے دیے ہیں اسی طرح ص ۲۵ پر حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے ص ۵۲ کا حوالہ موجود ہے ص ۲۶ پر فارسی کلیات مشرقی منیری مسمّٰی بہ بضاعت مزجات مخطوطہ ص ۲ اور عظیم آباد کا ایک یادگار مشاعرہ مرتبہ ڈاکٹر یوسف خورشیدی کے حوالے درج ہیں ص ۲۷ پر فارسی کلیات مشرقی منیری مسمّٰی بہ بضاعت مزجات مخطوطہ ص ۳ اور ص ۲۸ پر کلیات اردو مخطوطہ ص ۶۹ کا حوالہ درج ہے ص ۲ پر دیباچہ کلیات اردو حضرت مشرقی منیری مخطوطہ ص ۱۱-۱۲ اور ص ۲۲ پر قصائد مشرقی منیری مخطوطہ ص ۳۲ کے حوالے مرقوم ہیں۔

ص ۱ پر فاضل مقالہ نگار تحریر کرتے ہیں:

"جوشؔ منیری مونگیر سے پہلے چھپرہ میں ملازم تھے جوشؔ منیری کے نواسے ڈاکٹر سید سلطان احمد نوآبادی اپنے خط مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۶ء میں اپنے خالہ زاد بھائی رخشاں ابدالی کو لکھتے ہیں۔ "پہلے چھپرہ میں کسی کچہری کے محرر تھے اس کے بعد آپ مونگیر میں سررشتہ دار تھے۔"

میں نے دیوان حضرت مشرقی منیری ص ۲۲ پر صرف یہ ذکر کیا ہے کہ "جس وقت حضرت جوشؔ منیری مونگیر میں سررشتہ رجسٹری سے وابستہ تھے اس وقت مشرقی منیری کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری حضرت صوفی منیری کے سپرد کی گئی" اب جوشؔ منیری مونگیر سے قبل کہاں کہاں رہے اس کا جائزہ میرے احاطہ تحریر سے تعلق نہیں رکھتا پھر یہ کہ فاضل مقالہ نگار نے جس خط کا حوالہ دیا ہے اس کے علاوہ کسی بھی تذکرے میں جوشؔ منیری کے چھپرہ سے تعلق کا ذکر نہیں ہے۔ خمخانہ جاوید، تذکرہ مسلم شعرائے بہار اور جوشؔ کے استاد مولوی عبدالغفور نساخؔ نے بھی سخن شعرا میں چھپرے کا ذکر نہیں کیا ہے ان تمام تذکروں میں مونگیر ہی کا ذکر ملتا ہے اب ایک ذاتی خط کی بنیاد پر یہ اعتراض کہ چھپرے کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا طفلانہ حسد کے سوا اور کیا ہے جبکہ اس ذکر کا موقع اور محل بھی نہیں۔ فاضل مقالہ نگار ص ۱ کے آخر میں لکھتے ہیں۔

"جوشؔ منیری کا تفصیلی ذکر ہونا چاہیے تھا اور ان کا نمونہ کلام بھی دینا چاہیے تھا جو آسانی کے ساتھ خمخانہ جاوید، سخن شعرا اور تذکرہ مسلم شعرائے بہار میں مل جاتا" [illegible]

میں مشرقی منیری کی غزل گوئی کا جائزہ لے رہا تھا کوئی تذکرہ مرتب نہیں کر رہا تھا پھر بھی میں نے حسب ضرورت ان کا

تعارف اور کلام پیش کیا ہے ملاحظہ ہوں حالات زندگی دیوان حضرت مشرقی منیری کے صفحات ۲۵-۲۲

اسی طرح شاہ علی ابدالی نے ص۱۱ پر رقم کیا ہے :

" انھوں نے (راقم الحروف) حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے کے حوالے سے لکھا ہے (۲۵)۔۔۔

' مشرقی منیری نے طب کی تعلیم حضرت مولانا رفیق قادری سے حاصل کی'۔ اس کا ثبوت نہیں ملتا۔"

فاضل مقالہ نگار کو یہ نہیں معلوم کہ مشرقی اوائل عمر میں عرصے تک اسلام پور میں قیام پذیر رہے چنانچہ انھوں نے ابتدائی تعلیم مولانا رفیق قادری سے بھی حاصل کی جس کی تائید فاضل مقالہ نگار کے والد بزرگوار شاہ ابوالبرکاتؒ اور اس عہد کے عمر رسیدہ بزرگوں نے کی ہے صوفی منیری کے نثری کارنامے کے حوالے سے میں نے یہ رقم کیا ہے کہ :

" مشرقی منیری نے عربی و طب کی ابتدائی تعلیم مولانا رفیق قادری سے حاصل کی۔" (دیوان حضرت صوفی منیری ص۲۵)

فاضل مقالہ نگار نے لفظ " ابتدائی " کو دانستہ حذف کیا ہے تاکہ اعتراض میں زور پیدا ہو۔ اس بدنیتی اور بددیانتی کا کیا جواب ہے

ص۱۱ پر مشرقی منیری کی شادی کے سلسلے میں میرے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں :

" ان کی شادی قریبی عزیز شاہ نصیر الحق نوآبادی سجادہ نشین خسرو پور نزادہ کی صاحبزادی بی بی سلیمن سے ہوئی تھی۔" (دیوان حضرت مشرقی منیری ص۲۲)

۔۔۔ یہاں قریبی عزیز کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔"

پھر وہی لایعنی اعتراض اور غیر متعلق تفصیل کا تقاضا تحقیقی اصول و آداب سے بے خبری فاضل مقالہ نگار کی انفرادیت ہے۔

شاہ نصیر الحق نوآبادی کو میں نے ص۲۲ پر حضرت سید علی حاجیریؒ کی اولاد لکھا ہے جس کو فاضل مقالہ نگار غلط قرار دیتے ہیں لیکن ان کا دوسرا ہی جملہ اپنے دعویٰ کی تردید کر دیتا ہے ملاحظہ ہو ان کی درج ذیل سطریں :

" انھوں نے (ڈاکٹر ابو عبیدہ) شاہ نصیر الحق نوآبادی کو حضرت سید علی حاجیری کی اولاد لکھا ہے۔ جو غلط ہے۔ . . ان کی والدہ حیری النسب ضرور تھیں۔" (مقالہ شاہ علی ابدالی ص۱۱)

ص۱۱ ہی پر یہ بھی لکھتے ہیں :

" مشرقی میری سلسلہ فردوسیہ میں ہیں سلسلہ چشتیہ شاہ اولاد علی زاہدی سے مرید تھے۔ جیسا کہ خود ان کے کلام سے ظاہر ہے۔"

فاضل مقالہ نگار کو دعویٰ کی دلیل کے طور پر متعلقہ کلام پیش کرنا چاہیے۔ فاضل مقالہ نگار ص۱۱ کے آخر میں آگے چل کر رقمطراز ہیں۔

" ص۳۱ پر مشرقی منیری کے کئی طویل سفروں کا ذکر کیا گیا اجمیر اور دہلی کے سفروں کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔"

فاضل مقالہ نگار کے پاس کلیات مشرقی منیری موجود ہے جس سے میں نے ایک غزل مسلسل دیوان حضرت مشرقی منیری کے ص ۱۲۲-۱۲۱ پر نقل کی ہے جس کا ایک شعر مندرجہ ذیل ہے ؎

فریاد کو تم تک آیا ہوں ہاتھوں سے زماں کے نالاں ہوں   ڈھائی ہے میرے سر پر آفت یا غوث الہنا حبیب اللہ

عرض ہے کہ وہ اس پوری غزل کو پڑھنے کی زحمت کریں۔ ص ۱۱ پر فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ :

"شاہ نصیر الحق تو آبادی خسرو پور نوادہ ہے یں نوادہ خورد متصل خسرو پور کے سجادہ نشین تھے ۔"

خسرو پور نوادہ کے بارے میں مقالہ نگار نے جو اعتراض کیا ہے وہ جہالت پر مبنی ہے اس لیے کہ دو سو برس پہلے کی قلمی کتابوں میں نوادہ خورد کے نام سے تحریر ہے لیکن ایک سو برس کے بعد سے یہ خسرو پور نوادہ کے نام سے مشہور و معروف ہے اور اس وقت اگر نوادہ خورد کے نام سے اس کو دریافت کیا جائے تو دن بھر بھٹکنا پڑے گا اور کوئی راستہ بتانے والا بھی نہیں ملے گا ایسی حالت میں اگر میں نے خسرو پور نوادہ لکھ دیا تو کون سا گناہ کیا۔ شاہ علی ابدالی اس کو خسرو پور نوادہ ہی کہتے ہیں اور کوئی ان سے دریافت کرتا ہے تو بے ساختہ ان کی زبان پر یہی نام آتا ہے ۔ ص ۱۲ پر فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں :

"ص ۲۲ پر لکھا ہے (ڈاکٹر ابو عبیدہ نے) کہ "صاحبزادے کی وفات کے کچھ دنوں کے بعد ہی اپنے بیٹی کو بیوگی کا صدمہ اٹھانا پڑا"

بقول ڈاکٹر شاہ علی ابدالی :

"ان کی صاحبزادی بھائی کے وفات سے پہلے ہی بیوہ ہو چکی تھیں. مشرقی نے اپنے بیٹے کی وفات پر متعدد مرثیے لکھے ہیں اگر وہ (ابو عبید ابدالی) ان مراثی پر ایک نظر ڈال لیتے تو یہ غلطی نہ کرتے ۔"

فاضل مقالہ نگار کو اپنے دعویٰ کی دلیل کے طور پر مرثیہ کے اشعار پیش کرنے چاہیئے تھے ۔ یہ بات یقینی ہے کہ کلیات مشرقی میری میں مراثی موجود نہیں ہیں عجب نہیں کہ یہ ان کی تخلیق ذہنی ہو کہ موصوف اس مرض کے خطرناک شکار ہیں ۔ فاضل مقالہ نگار ص ۱۲ پر لکھتے ہیں ۔

"انھوں نے (ڈاکٹر ابو عبیدہ) مشرقی منیری کے تلامذہ کا ذکر نہیں کیا ہے ۔"

پہلی بات تو یہ ہے کہ تلامذہ مشرقی منیری کے ذکر کی کوئی گنجائش دیوان حضرت مشرقی منیری میں نہ تھی اس لیے شاہ علی ابدالی کو میرے تحقیقی مقالہ "مشرقی منیری حیات و شاعری" دیکھنا چاہیے اگر واقعی شاہ علی ابدالی تلامذۂ مشرقی میری کے سلسلے میں مستند معلومات کے خواہاں ہیں تو مجھ سے رجوع فرمائیں، میں ان کی میزبانی کو اپنے لیے باعث مسرت سمجھوں گا کہ میں عمر عزیز کے کچھ اوقات ایسے لوگوں کی صحبت میں بسر کرنا پسند کرتا ہوں جن کی گفتگو مقصد اور غرض سے بے نیاز ہو اور جو میرے لیے سامان تفریح ہو۔

●●

پروفیسر عنوان چشتی
شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر حنیف کیفی کا تھیسس

اردو میں معرّا اور آزاد نظم

"اردو میں معرّا اور آزاد نظم" حنیف کیفی کا تحقیقی مقالہ ہے، جو ۱۰۰۰ صفحات پر محیط ہے۔
مقالہ نگار نے دیباچہ میں حسب ذیل دعوے کیے ہیں:

۱ —— "زیر نظر مقالے میں جہاں جہاں تحقیق کے مواقع آئے ہیں، اس کے اعلیٰ معیار کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اور پوری چھان بین، تلاش و تفحّص کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچا گیا ہے، اور دلائل و شواہد سے اُسے ثابت کیا گیا ہے، کسی بھی بات کو آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کیا گیا۔" (ص ۲۹)

۲ —— "مقالے کے تحقیقی اور تنقیدی دونوں پہلوؤں میں علمی معروضیت کا معیار پیش نظر رکھا گیا ہے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، غیر جانب دارانہ انداز میں استدلال کے ساتھ کہا ہے۔" (ص ۳۰)

۳ —— "مقالے میں شروع سے آخر تک یکساں معیار برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر کے اُسے ایک دستاویزی شکل دینے اور تحقیق و تنقید کے تمام ضروری پہلوؤں کے ذریعہ اُسے ایک مکمل علمی کام اور قابلِ اعتماد حوالے کی کتاب بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔" (ص ۳۰، ۳۱)

مقالہ نگار نے کسی رسمی انکسار کے بغیر اپنی کتاب کو "قابلِ اعتماد حوالے کی کتاب"، "مکمل علمی کام"، "تحقیق و تنقید کی دستاویز" قرار دیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے "پوری چھان بین، تلاش و تفحّص، دلائل و شواہد، علمی معروضیت اور غیر جانبدارانہ انداز" سے کام لیا ہے۔ اور پوری کتاب میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر کے اس میں از اوّل تا آخر یکساں معیار باقی رکھا ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے اپنی کتاب میں "مدح در بیانِ خود" کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس کو بوجوہ نظر انداز

کیا جا سکتا ہے۔ اس مدح درپیانِ خود کے نفسیاتی اور سماجی بہت سے محرکات ہو سکتے ہیں۔ اور یہ سوچ کر خاموشی اختیار کی جا سکتی ہے کہ ہر ماں کو اپنے بچہ سے محبت ہوتی ہے، ہر ماں شدّتِ محبت میں اپنے نحیف بچہ کو رستم دوراں اور بدصورت بچّہ کو رشکِ قمر قرار دیتی ہے، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ پروفیسر گیان چند جینؔ بھی اس "مداحی" میں شریک بلکہ فریق ہیں۔ انھوں نے فلیپ کی رائے میں لکھا ہے :

"پی۔ ایچ۔ ڈی کے بعض مقالے اس معیار کے ہوتے ہیں کہ انھیں "ڈی لٹ" کے لیے گزارا جا سکتا ہے۔ یہ مقالہ بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔"

اس شہادت سے مقالہ نگار کے تمام بلند بانگ اور غیر معمولی دعووں کی تائید ہوتی ہے۔ پروفیسر جینؔ کی نگاہ میں "علمی دستاویز" اور "حوالے کی قابلِ اعتماد کتاب" پر پی۔ ایچ۔ ڈی نہیں بلکہ ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی جانی چاہیئے تھی۔ پروفیسر آلِ احمد سرورؔ نے ذرا دامن بچا کر "مداحی" اور "گواہی" کا یہی انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے فلیپ کی رائے میں لکھا ہے :

"حنیف کیفی کا یہ علمی و ادبی کام اپنے موضوع پر اب تک کا سب سے اچھا کام ہے۔"

موصوف نے بھی اپنی سادہ مگر پُرکار رائے میں ایک طرف اس سے پہلے کے کاموں کو صحیفۂ منسوخ قرار دیا ہے، اور دوسری طرف مقالہ نگار کو "سب سے اچھے علمی و ادبی کام" کی سند عطا کی ہے۔

میں نے مقالہ نگار کے بلند بانگ دعووں کے ہجوم اور گواہوں کے تائیدی اور تحسین آمیز شور کے عالم میں کتاب پر نظر ڈالی۔ خاص طور پر میں نے اُن حصّوں کو توجہ سے پڑھا، جہاں فاضل مقالہ نگار نے اپنی عروض دانی کے جوہر دکھائے ہیں۔ ایسی بحثیں صرف ۲۸ صفحات (ص ۱۹۳ تا ۲۲۸) پر مشتمل ہیں۔ مقالہ نگار کی نظر میں یہ حصّہ اتنا اہم ہے کہ اس کو اوراق (ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۱ء) میں الگ سے بھی شائع کرایا گیا ہے۔ مقالہ نگار اور گواہوں کے دعووں کو پرکھنے کے لیے ذیل میں صرف زیرِ نظر ۲۸ صفحات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے :

"اردو عروض کی بنیاد جس عروض پر ہے۔ اس میں زحافات کا عمل پیچیدہ ہے۔ اور دشوار بھی ہے۔ اور اس کا دائرہ بھی محدود ہے۔ مختلف بحروں کے بے شمار زحافات ہیں۔ لیکن اُن کے استعمال کا دائرہ انتہائی محدود ہے۔" (اوراق ص ۲۴۳، ۲۴۵، کتاب ص ۲۲۵)

اس بیان کے دو اجزا ہیں۔ ایک یہ کہ زحافات کا عمل پیچیدہ، دشوار اور محدود ہے، ان کے استعمال کا دائرہ محدود ہے۔

دوسرے یہ کہ مختلف بحروں کے بے شمار زحافات ہیں۔ یہ دونوں باتیں قطعاً غلط ہیں۔ زحافات کا عمل پیچیدہ دشوار اور محدود نہیں ہے۔ یہ بیان محقق زحافات سے لاعلمی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ زحافات کا عمل (اور استعمال) ارکان کے ساتھ مخصوص ہے۔ جو لوگ اس تخصیص کو جانتے ہیں، ان کے لیے زحافات کا استعمال دشوار، پیچیدہ اور مشکل نہیں ہے۔ بلکہ آسان اور سائنٹفک ہے۔ مقالہ نگار کی یہ بات بھی غلط ہے کہ "بحروں کے زحافات" ہوتے ہیں۔ زحافات کا تعلق ارکان سے ہے جو اجزائے شعر (صدر وابتدا، عروض و ضرب اور حشوین) سے ہے۔ یہ بات بھی قطعاً غلط ہے کہ بے شمار زحافات ہیں۔ افسوس ہے کہ "علمی دستاویز" اور "حوالے کی قابلِ اعتماد کتاب" کے محرر کو یہ بھی معلوم نہیں کہ مفرد اور مرکب دونوں قسم کے زحافات کی تعداد محض چند درجن ہے۔ جنھیں فاضل مقالہ نگار نے "بے شمار" قرار دیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار کا محولہ بالا بیان قطعاً غلط ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زحافات کی تعداد، نام اور ان کے محلِ استعمال (مقامِ ورُود) کو سمجھے بغیر بیانات صادر کرنا علم کے میدان میں کتنا گمراہ کن ہوتا ہے۔

۲۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے:

"ایسا نہیں ہوتا کہ مختلف مصرعوں میں مختلف زحافات کا استعمال کیا جائے۔ رباعی اس کلیے سے مستثنیٰ ہے۔ ۔ ۔ ۔ مختلف مصرعوں میں مختلف زحافات کے استعمال سے اُن کا وزن بھی مختلف ہو جائے گا" (اوراق ص ۵۳، کتاب ص ۲۲۵)

اس بیان کے حسب ذیل اجزا ہیں۔ ایک یہ کہ رباعی کے علاوہ دیگر اوزان و بحور میں مختلف (متعدد) زحافات کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ مختلف مصرعوں پر مختلف زحافات کے استعمال سے ان کا وزن مختلف ہو جاتا ہے۔

یہ باتیں بھی سراسر غلط ہیں۔ واضح رہے کہ زحافات کا عمل مصرعوں پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ارکان پر ہوتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یا تو فاضل مقالہ نگار ارکان اور مصرع کے امتیاز سے آگاہ نہیں، یا عروضی اصطلاح میں زحافات کی تخصیص اور ان کے محلِ استعمال سے واقف نہیں ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے یہ بات غلط تحریر کی ہے کہ رباعی کے علاوہ دیگر بحور میں متعدد (موصوف کی زبان میں مختلف) زحافات کا عمل نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ رباعی کے علاوہ بھی دوسری بحروں کے ارکان پر زحافات کا عمل ہوتا ہے۔ جس سے نئے اوزان حاصل ہوتے ہیں۔ اور ان اوزان کا اجتماع (ایک نظم یا غزل) بھی جائز ہے۔ ثبوت کے طور پر غالب کا یہ مطلع سنیے:

آکہ مری جان کو قرار نہیں ہے   طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

یہ مطلع بحر منسرح مثمن میں ہے۔ اس کا مکمل نام مع وزن درج کیا جاتا ہے :۔

بحرِ منسرح مُثمّن :۔ مطوّی، مطوّی، مطوّی منحور۔ وزن: مفتعِلن فاعِلات مُفتَعِلن فع

اس مطلع کے ایک مصرع کے ارکان پر مختلف زحافات کا عمل کیا جا سکتا ہے، جو عروض کے مسلمات کی روشنی میں صحیح ہے۔ اس عمل سے حسب ذیل نئے اوزان برآمد ہوتے ہیں :۔

	ارکان				ارکان کے نام			
۱۔	مفتعِلن	فاعِلات	مُفتَعِلن	فع	مطوّی	مطوّی	مطوّی	منحور
۲۔	مَفعُولُن	"	"	"	مطوّی مُسکّن	"	"	"
۳۔	مُفتَعِلن	"	مفعُولُن	"	مطوّی	"	مطوّی مُسکّن	"
۴۔	مفعُولن	"	"	"	مطوّی مُسکّن	"	"	"
۵۔	مَفَاعلن	"	مفتعِلن	"	مخبُون	"	مطوّی	"
۶۔	مفتعِلن	"	مفاعِلن	"	مطوّی	"	مخبون	"
۷۔	مفاعِلن	"	مَفاعِلن	"	مخبُون	"	"	"
۸۔	مَفاعِلن	"	مفعُولُن	"	"	"	مطوّی مُسکّن	"
۹۔	مفعُولن	"	مَفَاعلن	"	مطوّی مُسکّن	"	مخبُون	"

اس نقشہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مصرع کے ارکان پر مختلف زحافات کا عمل ہو سکتا ہے۔ اس طرح کے عمل کے لیے عروض کی مُستند کتابوں میں رہنما اصول موجود ہیں۔ ان اوزان کا اجتماع (بیک غزل یا نظم) بھی جائز ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ اگر رکن فع (منحور) کی جگہ رکن فاع (مجدوع) عروض و ضرب میں استعمال کر لیا جائے تو مزید ۹ اور کُل ۱۸ (اٹھارہ) اوزان حاصل ہو سکتے ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ۳۶ (چھتیس) قرار پاتی ہے۔ ان تمام اوزان کا اجتماع کسی ایک غزل یا نظم میں جائز ہے۔ عروض نے اس کی آزادی دی ہے۔ اس لیے فاضل مقالہ نگار کی یہ رائے قطعاً غلط ہے کہ مختلف مصرعوں (ارکان) پر مختلف زحافات کا عمل نہیں ہو سکتا۔

فاضل مقالہ نگار نے اپنے زیرِ بحث بیان میں رباعی کے اوزان کا ذکر کیا ہے جس کو انھوں نے مستثنیات میں شمار کیا ہے۔ لیکن فاضل مقالہ نگار کو رباعی کے اوزان کے سلسلہ میں تحقیقات کا علم نہیں ہے۔ اگر انھیں اس کا علم ہوتا تو رباعی کے چوبیس اوزان کی گردان نہ کرتے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ چار اوزان رباعی کے

سلسلہ میں ذراسی وضاحت کردی جائے۔ رباعی کے چار بنیادی اوزان ہیں۔ باقی اوزان عملِ تخنیق سے حاصل ہوتے ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ۲۴ نہیں ۳۶ ہے۔ یہ بنیادی اوزان حسب ذیل ہیں :-

۱-	مفعولُ	مَفَاعِلُن	مفاعیلُ	فَعَل
	اخرب	مقبوض	مکفوف	مجبوب
۲-	مَفْعُولُ	مَفَاعِلُن	مفاعیلُ	فَعُول
	اخرب	مقبوض	مکفوف	اہتم
۳-	مَفعُولُ	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فَعَل
	اخرب	مقبوض	مکفوف	مجبوب
۴-	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فعُول
	اخرب	مقبوض	مکفوف	اہتم

یہ چار اوزان زحاف، خرب، کف، قبض اور ہتم کے استعمال سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان چاروں اوزان کے مختلف ارکان پر حسب قاعدۂ عروض، عمل تخنیق کرنے سے مزید بیس[۲۰] اوزان یعنی کُل چوبیس[۲۴] اوزان حاصل ہوتے ہیں۔ یہ تمام اوزان بحر ہزج سے ماخوذ ہیں۔ خواجہ حسن قطان خراسانی نے مَفعُولُن کو اخرم قرار دے کر دائرہ اخرب واخرم کا ذکر کیا ہے جس سے اوزانِ رباعی کا مسئلہ خاصا الجھا ہے۔ واضح رہے کہ مزید ۲۰ اوزان رکن دوم میں قبض کا عمل کرنے سے (مفاعلن) حاصل ہوتے ہیں۔ اگر رکن سوم میں بھی مفاعلُن (مقبوض) کا استعمال کیا جائے تو مزید اوزان حاصل ہوسکتے ہیں۔ اوزان پر عملِ تخنیق کرنے سے مزید اوزان حاصل ہوتے ہیں جن کی مجموعی تعداد ۳۶ ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت میں نے اپنی کتاب "عروضی اور فنی مسائل" میں پیش کی ہے۔ اور گذشتہ پندرہ برس میں متعدد بار اس بات کی وضاحت کرچکا ہوں۔ ذیل میں رباعی کے ۳۶ اوزان کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے :-

مفعول سے شروع ہونے والے اوزان

۱-	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلُ	فعل
۲-	"	"	مَفاعیلُن	فع
۳-	"	"	مفاعیلُ	فعول
۴-	"	"	مفاعیلُن	فاع
۵-	"	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فَعَل
۶-	"	مفاعی لن	مفعولُ	"
۷-	"	مفاعیلُ	مفاعی لن	فع
۸-	"	مفاعی لن	مفعولُن	فع

مفعولن سے شروع ہونے والے اوزان

۱-	مفعولُن	فاعِلُن	مفاعیلُ	فَعَل
۲-	"	"	مفاعیلُن	فع
۳-	"	"	مفاعیلُ	فعول
۴-	"	"	مفاعی لن	فاع
۵-	"	مفعولُ	مفاعی لن	فع
۶-	"	"	مفاعیلُ	فَعَل
۷-	"	مفعولُن	مفعولُ	"
۸-	"	مفعولُن	مفعولن	فع

مفعولُ سے شروع ہونے والے اوزان

۹۔	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فعول
۱۰۔	"	مفاعیلن	مفعولُ	"
۱۱۔	"	مفاعیلُ	مفاعیلن	فاع
۱۲۔	"	مفاعی لن	مفعولن	"
۱۳۔	"	مفاعلن	مفاعلن	فَعَل
۱۴۔	"	"	"	فعول
۱۵۔	"	مفاعیلُ	"	فَعَل
۱۶۔	"	"	"	فعول
۱۷۔	"	مفاعی لن	فاعلن	فَعَل
۱۸۔	"	"	"	فعول

مفعولن سے شروع ہونے والے اوزان

۹۔	مفعولن	مفعولُ	مفاعیلُ	فعول
۱۰۔	"	"	مفاعی لن	فاع
۱۱۔	"	مَفعولن	مفعولُ	فعول
۱۲۔	"	"	مفعولن	فاع
۱۳۔	"	فاعِلن	مفاعلن	فَعَل
۱۴۔	"	"	"	فعول
۱۵۔	"	مفعولُ	"	فَعَل
۱۶۔	"	"	"	فعول
۱۷۔	"	مفعولن	فاعلن	فَعَل
۱۸۔	"	"	"	فعول

رباعی کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ:۔

۱۔ رباعی کے تمام اوزان بحر ہزج سے ماخوذ ہیں۔

۲۔ دائرہ اخرب اور دائرہ اخرم کی تقسیم غلط ہے۔ اس سے اوزانِ رباعی کا مسئلہ الجھتا ہے۔

۳۔ رباعی کے اوزان کے مختلف ارکان پر صرف ۸ زحافات (تخنیق، خرب، کف، جب، قبض، ہتم) کا استعمال ہوتا ہے۔

۴۔ رباعی کے چوبیس[۲۴] نہیں چھتیس[۳۶] اوزان ہیں۔

یہ تحقیق گزشتہ پندرہ سال سے اہلِ علم کے سامنے ہے۔ مگر نہیں ہے تو صرف "حوالے کی قابلِ اعتماد کتاب" مرتب کرنے والے مقالہ نگار کے علم میں نہیں ہے۔

۳۔ مقالہ نگار کا خیال ہے:

"اس بحر (بحر ہزج) کی ایک مزاحف شکل کو یعنی مفعولُ، مفاعیلُ، مفاعیلُ، فعولن" (اوراق ص ۱۹، کالم ص ۲)

لیکن مقالہ نگار نے اس بحر کا پورا نام نہیں لکھا۔ اس بحر کا نام ہے۔ بحر ہزج مثمن اخرب، مکفوف مکفوف محذوف۔ مزاحف بحر کا صحیح نام وہی لکھ سکتا ہے، جو زحافات کے نام، تخصیص اور ان کے محلِ استعمال سے واقف ہو۔ اسی ضمن میں

مقالہ نگار نے لکھا ہے:

” پیش کردہ اصول کے تحت اس کے درمیانی ارکان مفاعیل مفاعیل ہی اس طرح گھٹائے بڑھائے جاسکتے ہیں کہ اس کے اجزائے ترکیبی بجنسہٖ ایک ہوں۔ . . . بہ الفاظ دیگر کل رکن ”مفاعیل“ کی تعداد ہی میں کمی و بیشی ہوسکتی ہے۔ اس رکن کے کسی جزو میں حذف و اضافہ نہیں ہوسکتا۔ یعنی مفاعیل بدل کر مفاعیلن، مفعولن اور مفعول وغیرہ نہیں بن سکتا۔“

(اوراق ص ۳، کتاب ص ۲۲۱،۲۲۲)

یہ بیان بھی سراسر غلط ہے۔ یہ التباس بھی مقالہ نگار کو زحافات کی تخصیص اور ان کے صحیح ورود کو نہ جاننے سے ہوا ہے۔ از روئے عروض مفاعیل پر صحیح زحاف کا عمل کرنے سے مفاعی لن، مفعولن اور مفعول ہوسکتا ہے۔ ذیل میں ایک نقشہ پیش کیا جاتا ہے، جس میں ”مفاعیل“ پر زحاف کے اثر سے مفاعی لن اور فعولن حاصل ہوتا ہے۔ اور اس عمل سے جو نئے ارکان حاصل ہوتے ہیں، ایک نظم یا غزل میں ان کا اجتماع عروضی قاعدے کے تحت بالکل درست ہے۔

نمبر				
۱۔	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فعولن
۲۔	مفعولن	مفعولُ	مفاعیلُ	فعولن
۳۔	مفعولن	مفعولن	مفعولُ	فعولن
۴۔	مفعولن	مفعولن	مفعولن	فعلن
۵	مفعولُ	مفاعی لن	مفعولُ	فعولن
۶۔	”	”	مفعولن	فعلن
۷۔	”	مفاعیلُ	مفاعی لن	فعلن
۸۔	”	مفاعی لن	مفعولن	فعلن
۹۔	”	مفاعلن	مفاعیلُ	فعولن
۱۰۔	مفعولن	فاعلن	مفاعیلُ	فعولن
۱۱۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعی لن	فعلن
۱۲۔	مفعولن	فاعلن	مفاعی لن	فعلن
۱۳۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعلن	فعولن

نمبر				
۱۔	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فعولان
۲۔	مفعولن	مفعولُ	مفاعیل	فعولان
۳۔	مفعولن	مفعولن	مفعولُ	فعولان
۴۔	مفعولن	مفعولن	مفعولن	فعلان
۵۔	مفعولُ	مفاعی لن	مفعولُ	فعولان
۶۔	”	”	مفعولن	فعلان
۷۔	”	مفاعیلُ	مفاعی لن	فعلان
۸۔	”	مفاعی لن	مفعولن	فعلان
۹۔	”	مفاعلن	مفاعیلُ	فعولان
۱۰۔	مفعولن	فاعلن	مفاعیلُ	فعولان
۱۱۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعی لن	فعلان
۱۲۔	مفعولن	فاعلن	مفاعی لن	فعلان
۱۳۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعلن	فعولان

۱۴۔ مفعولن فاعلن مفاعلن فعولن
۱۵۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعلن فعولن
۱۶۔ مفعولن مفعولُ مفاعلن فعولن
۱۷۔ مفعولُ مفاعیلن فاعلن فعولن
۱۸۔ مفعولن مفعولن فاعلن فعولن

۱۴۔ مفعولن فاعلن مفاعلن فعولان
۱۵۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعلن فعولان
۱۶۔ مفعولن مفعولُ مفاعلن فعولان
۱۷۔ مفعولُ مفاعلن فاعلن فعولان
۱۸۔ مفعولن مفعولن فاعلن فعولان

یہ شجرہ ثابت کرتا ہے کہ اگر عروض کا صحیح علم حاصل ہو تو زحافات کی مدد سے نئے ارکان اور نئے اوزان حاصل ہو سکتے ہیں، اور عروض کے قاعدے کے تحت ایک نظم یا غزل میں ان کا اجتماع بھی درست ہے۔ لہٰذا مقالہ نگار کی یہ بات قطعاً غلط ہے کہ "رکن کے کسی جزو میں حذف و اضافہ نہیں ہو سکتا یعنی مفاعیل بدل کر مفعولن مفاعیلن اور مفعول وغیرہ نہیں ہو سکتا۔" مقالہ نگار نے عروض کی اصطلاح چھوڑ کر "درمیانی ارکان" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ عروضی اجزائے شعر کے لیے صدر و ابتدا، عروض و ضرب اور حشوین کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً :-

مصرع اولیٰ

صدر	حشو اوّل	حشو دوم	عروض
مصرع اولیٰ کا ابتدائی رکن			مصرع اولیٰ کا آخری رکن

مصرع ثانی

ابتدا	حشو سوم	حشو چہارم	ضرب
مصرع ثانی کا ابتدائی رکن			مصرع ثانی کا آخری رکن

یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ مثمن بحروں میں فی شعر چار حشو، مسدس بحروں میں دو حشو ہوتے ہیں۔ مربع بحروں میں کوئی حشو نہیں ہوتا۔ اس لیے حشوین کے لیے رکن درمیانی کہنا سراسر غلط ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ رکن درمیانی حشو اوّل کیلئے استعمال کیا گیا ہے یا حشو دوم کے لیے۔ اس گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فاضل مقالہ نگار عروض کی اصطلاحوں سے بھی آگاہ نہیں ہے۔

۴۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے :

" دوسری بات یہ ہے کہ بحر کے ابتدائی اور اختتامی ارکان یعنی مفعولُ اور فعولن کو جوں کا توں رہنا چاہیے
ان میں کوئی کمی بیشی ہونی چاہیے اور نہ تبدیلی۔"

(اوراق ص ۲۰، کتاب ص ۲۰۲)

یہاں بھی مقالہ نگار نے عروضی اصطلاحوں سے ناواقفیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ شعر کے دونوں مصرعوں کے ابتدائی ارکان کو صدر و ابتدا اور آخری ارکان کو عروض و ضرب کہتے ہیں۔ زیر بحث بحر میں مفعولُ صدر و ابتدا اور فعولن عروض و ضرب ہے۔ ان ارکان کو ابتدائی اور اختتامی کہنا ایجاد بندہ ہے۔ اس بحر کے صدر و ابتدا اور عروض و ضرب کے ارکان پر زحافات کا عمل ہو سکتا ہے، اور ان کی مدد سے تغیّر واقع ہوتا ہے۔ اور حاصل شدہ اوزان کا اجتماع بھی صحیح ہے۔ یعنی صدر و ابتدا میں مفعولُ یا مفعولُن ہو سکتا ہے۔ عروض و ضرب میں فعولُن فعولان، فعلن یا فعلان آسکتا ہے۔ جیسا کہ نقشہ میں دکھایا گیا ہے۔ اس لیے مقالہ نگار کی یہ رائے قطعاً غلط ہے کہ زیر بحث بحر کے صدر و ابتدا اور عروض و ضرب کو جوں کا توں رہنا چاہیے اور یہ کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ گزشتہ صفحات میں زیر بحث بحر کے سلسلہ میں ۱۸ × ۲ = ۳۶ اوزان کا جو شجرہ پیش کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام اوزان بحر ہزج کے ایک وزن سے حاصل شدہ صورتوں پر عروض و ضرب اور صدر و ابتدا میں تخنیق، تسبیغ اور قصر وغیرہ زحافات کے عمل سے حاصل ہوئے ہیں۔ " فعولان " کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ رکن دو طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی مقصور انداز میں بھی اور محذوف مسبّغ صورت میں بھی۔ عروض نے جو آزادی دی ہے، اس سے ماہرین عروض ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔

۵ - مقالہ نگار نے لکھا ہے :

" مزاحف بحروں میں آخری رکن کو محذوف کے بجائے مقصور اور مقصور کے بجائے محذوف کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ عروض اس کی اجازت دیتا ہے۔"

(اوراق ص ۲۰، کتاب ص ۲۰۲)

یہ بیان بھی درست نہیں ہے۔ عروض کے اصولوں کی روشنی میں عروض و ضرب (جن کو مقالہ نگار نے آخری رکن کہا ہے) میں محض محذوف و مقصور ارکان کا اجتماع ہی جائز نہیں، بلکہ محذوف کے ساتھ محذوف مسبّغ اور اثرم بھی آسکتا ہے۔ مثلاً

۱- مفعولُ مفاعیلُ مفاعیل فعولن (محذوف)
۲- " " " فعولُ (اثرم)
۳- مفعولُ مفاعیلُ مفاعیل فعولان (محذوف مسبّغ)
۴- " " " فعولان (مقصور)

اس لیے مقالہ نگار کی یہ رائے غلط ہے کہ عروض و ضرب میں محض ۲ متبادل (محذوف و مقصور) ہیں۔ یہاں چار متبادل

آسکتے ہیں۔ اور عروض کے مسلمات کی روشنی میں درست ہیں، اوران چاروں اوزان کا اجتماع (ایک غزل یا نظم) جائز ہے۔
یہاں عروض کی ایک اور آزادی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، ایک وزن ہے :۔

فاعلاتن فعِلاتن فعِلاتن فعلن / فعِلن / فعلان / فعِلان

بحرِ رمل مثمن — سالم، مخبون، مخبون، مخبون، مخبون، مخبون، مخبون
محذوف، محذوف، مقصور، مقصور
مُسکن، مسکن

اس وزن کے عروض و ضرب میں چار متبادل (فعْلن، فعِلن، فعلان اور فعِلان) تو آہی سکتے ہیں، لیکن اس کے حشوِ اول میں "فعِلاتن" (مخبون) کی جگہ مفعولن ( ) بھی آسکتا ہے۔ مثال کے طور پر امانت کا شعر پیش کیا جا سکتا ہے :

اس پہ راضی ہو تو قرآن اٹھا لاؤں میں رکھ تو لے مصحف دو ہاتھ قسم کھاؤں میں

فاعلاتن فعِلاتن فعِلاتن فعلن فاعلاتن مفعولن فعلاتن فعلن

اس شعر کی تقطیع سے ظاہر ہوتا ہے کہ امانت نے حشوِ اوّل میں فعِلاتن کی جگہ مفعُولن کا استعمال کیا ہے۔ اور یہ استعمال از روئے عروض سو فیصدی درست ہے۔ اس لیے مقالہ نگار کی اس غلط رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ صدر و ابتدا اور عروض و ضرب نیز حشوین میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی، یہ باتیں عروض سے مقالہ نگار کی عدم واقفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

۶۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے :

" اسی طرح پہلے رکن میں بھی کوئی ایسی ترمیم جو عروض کی رُو سے جائز ہو کی جا سکتی ہے جیسے فاعلاتن، فعِلاتن، فعلن میں پہلے رکن فاعلاتن کو فعِلاتن کیا جا سکتا ہے۔" (اوراق ص۔۲۰، کتاب۔ ص ۲۲)

یہ بیان بھی ادھوری معلومات اور سُنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے۔ اس بیان میں بھی مقالہ نگار نے عروضی اصطلاحوں کی جگہ ایجادِ بندہ قسم کی اصطلاحوں کو برتا ہے۔ یہاں "پہلے رکن" کی جگہ "صدر و ابتدا" کہنا چاہیے تھا۔ اگر صدر و ابتدا میں رکن سالم (فاعلاتن) کی جگہ مخبُون (فاعلاتن) آسکتا ہے تو حشوین میں مخبون (فعِلاتن) کی جگہ سالم رکن (فاعلاتن) کیوں نہیں آسکتا۔؟
عروض کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں تغیرات جائز ہیں۔ اور ایک غزل یا نظم میں ان کا اجتماع بھی درست ہے۔ مثلاً

فاعلاتُن فعِلاتُن فعْلُن — سالم، مخبون، مخبون محذوف مُسکّن
فعِلاتُن فعِلاتُن فعْلن — مخبون، مخبون، مخبون محذوف مُسکّن

اس ثبوت کی روشنی میں یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ فاضل مقالہ نگار عروض کی مبادیات سے بھی واقف نہیں ہیں۔

۷۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے :

"مزاحف بحروں میں حرف درمیان کے حذف و اضافہ اور ابتدائی و اختتامی ارکان میں کسی قسم کی ترمیم نہ کرنے کے اصول کا جواز یہ ہے کہ اس طرح نظم کا آہنگ نہیں بگڑتا۔ بصورت دیگر آہنگ میں فرق آجائے گا۔" (اوراق ص ۲۰ کتاب ص ۲۲)

اس بیان میں بھی حشوین کو ارکان درمیانی اور عروض و ضرب کے ابتدائی و اختتامی ارکان کا استعمال کر کے پرانی غلطی کا اعادہ کیا ہے۔ یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ صدر و ابتدا، حشوین اور عروض و ضرب میں مخصوص زحافات کا عمل کر کے ترمیم کی جا سکتی ہے۔ اور حاصل شدہ ارکان اور اوزان کو ایک نظم یا غزل میں برتا جا سکتا ہے۔ اس لیے فاضل مقالہ نگار کا یہ اصول غلط اور خود ساختہ ہے کہ صدر و ابتدا اور عروض و ضرب کے ارکان پر زحافات کے عمل سے ترمیم نہیں ہو سکتی۔ جب اصول ہی غلط ہے تو اس کے جواز کے غلط ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے۔ اگر عروض کے اصولوں کا اطلاق صحیح انداز سے کیا جائے اور ارکان پر صحیح زحافات کا استعمال کیا جائے تو آہنگ میں فرق آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اس بحر کے نئے اوزان اور آہنگ کے نئے امکانات ضرور سامنے آسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک وزن ہے:

"مفتعلن، مفاعلن، مفتعلن، مفاعلن۔ بحر رجز مثمن، مطوی، مخبون۔"

اس بحر میں ناسخ کا مقطع ملاحظہ کیجیے ؎

حُسن بلائے چشم ہے، نغمہ وبالِ گوش ہے	ناسخ قول ہے بجا حضرت میر و سودا کا
مُفتَعِلُن مفَاعِلُن مفتعلن مَفَاعلن	مفعُولن مفاعلن مفتعِلُن مفاعلن

اس شعر کے صدر میں مُفتَعِلُن کو مفعُولن سے بدلا ہے۔ یہ تبدیلی "ابتدا" میں بھی کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح حسب ذیل شعر ملاحظہ کیجیے ؎

میں ہوں غزل سرا وہاں بلبل زار ہو نہ ہو	یہ چمن میں گل عذار ہو فصلِ بہار ہو نہ ہو
مفتعِلُن مَفَاعلن مفتعِلن مفاعِلُن	مفاعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن

اس شعر کے صدر و ابتدا میں مفتعِلن کی جگہ مفاعلن آیا ہے۔ یہ تبدیلی بھی از روئے قاعدہ درست ہے۔ اس لیے مقالہ نگار کی یہ رائے غلط ہے کہ صدر و ابتدا یا عروض و ضرب میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ جب عروض میں ایسے رہنما اصول موجود ہیں، جن سے عروض کے نئے امکانات تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض امکانات اور آزادیوں پر اساتذۂ فن نے عمل کر کے بھی دکھایا ہے تو پھر اس دور میں اپنے اوپر عروضی آزادیوں کے دروازے بند کرنے کے کیا معنی ہیں؟ شاید یہ اندازِ فکر عروضی معلومات کے فقدان پر منحصر ہے۔

۸۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے :

"اسی وزن مفعولُ، مفاعیلُ، مَفَاعیلُ، فعولن کو پیش کردہ اصُول یعنی درمیانی اکان کی کمی و بیشی کے خلاف مندرجہ ذیل صورتوں میں تبدیلی کر کے اُن کا آہنگ ملاحظہ فرمایئے۔" (اوراق ص ۲۰، کتاب ص ۲۰۲ ۔)

واضح رہے کہ یہاں بھی مقالہ نگار نے صحیح اصطلاح حشوین کو چھوڑ کر "درمیانی ارکان" کی غلط اصطلاح استعمال کی ہے۔ دوسری غلطی وہی، جس کو مقالہ نگار اصول بنا کر پیش کرتا ہے کہ صدر و ابتدا، عروض و ضرب اور حشوین میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس خود ساختہ اور غلط اصول کی رو میں گذشتہ صفحات گواہ ہیں۔ جہاں ثابت کیا گیا ہے کہ مقالہ نگار کو یہ سخت غلط فہمی ہے کہ صدر و ابتدا، عروض و ضرب یا حشوین میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ مقالہ نگار نے دس اوزان کا نقشہ پیش کیا ہے، جو اس طرح ہے ۔

۱۔ مفعولُ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن
۲۔ " مفاعیلن مفعول مفاعی لن
۳۔ " " " فعولن
۴۔ مفعولن " مفاعی لن "
۵۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعول
۶۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعی لن فع
۷۔ مفعولن " مفاعیلُ فعولن
۸۔ مفاعی لن " " "
۹۔ فعولن " مفاعیلن فعولن
۱۰۔ مفاعیلُ " فعولن

یہ ترمیم شدہ اوزان مختلف ارکان میں زحاف کے عمل سے نیز بغیر کسی امتیاز کے کوئی سے بھی ارکان کم یا زیادہ کر دینے کے نتیجہ میں صورت پذیر ہوئے ہیں۔" (اوراق ص ۲۰، کتاب ص ۲۰۳)

مجھے فاضل مقالہ نگار کی عروضی اختراعات پر یہ کہنا ہے کہ یہ خود ساختہ اور ایجاد بندہ اوزان ہیں۔ اور بنیادی وزن مفعولُ، مَفَاعیلُ، مفاعیلُ، فعولن سے ماخوذ نہیں ہیں۔ ان میں سے تین اوزان یعنی پہلا، تیسرا اور نواں تو از روئے عروض قطعاً غلط ہیں۔ مثلاً :

۱۔ مَفعولُ مفعولُ مَفاعیلُ مفاعیلُ فعولن ۔

اخرب اخرب مکفوف مکفوف محذوف

وزن نمبر ایک اس لئے غلط ہے کہ رکن اخرب کبھی حشوین میں نہیں آسکتا ۔

۲۔ فعولن مفاعیلُ مفاعی لن فعولن

محذوف مکفوف سالم محذوف

یہ وزن اس لیے غلط ہے کہ رکن محذوف کبھی صدر و ابتدا میں نہیں آسکتا۔

"۲۔ فعولن مفاعیلُ مفاعی لن فعولن۔"

محذوف — مکفوف — سالم — محذوف

بنیادی طور پر یہ وزن بحرِ ہزج سے تعلق نہیں رکھتا، اس لیے غلط ہے۔ یہ تسامحات شاہد ہیں کہ مقالہ نگار زحافات کی تقسیم، تخصیص اور ان کے صحیح عمل سے واقف نہیں ہے۔

۹۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے:

"پوری نظم کا آہنگ "مفاعی لن" ہے۔ لیکن مندرجہ بالا بند کی آخری سطر میں مفاعی لن کی بجائے "مفاعی" رہ گیا ہے۔"

مقالہ نگار نے جس آخری سطر کے خود ساختہ "مفاعی" پر ختم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہ ہے

محبت کے وہ ہیبتناک لمحے

مفاعی لن — مفاعی لن — "مفاعی"

فعولن کی جگہ "مفاعی" لکھنا عروض سے عدم واقفیت کا اشتہار ہے۔ "مفاعی لن" کی فرع فعولن ہے۔ جو مفاعی لن کی محذوف شکل ہے۔ فعولن عروض و ضرب میں آسکتا ہے۔ اصل وزن اس طرح ہے۔

مفاعی لن مفاعی لن فعولن

اس بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے ہر جگہ عروضی معلومات کے فقدان کا ثبوت دیا ہے۔ میں موصوف سے ذاتی طور پر واقف ہوں، انھیں ماہرِ عروض ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ لیکن مجھے پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر گیان چند جین سے شکوہ ہے جو اتنی غلطیوں پر بھی الفاظ کے لعل و گہر لٹا رہے ہیں۔ میں پروفیسر آل احمد سرور سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اب بھی یہ کام "اپنے موضوع پر سب سے اچھا" کام ہے۔ کیا اچھے کام کے لیے طومارِ اغلاط ہونا ضروری ہے؟ پروفیسر گیان چند جین صاحب سے مودبانہ سوال ہے کہ آپ تو بحرِ عروض کے غواص ہیں، کیا آپ نے اس حصہ کو ملاحظہ نہیں فرمایا؟ آپ تو اس صحیفۂ اغلاط پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی جگہ ڈی لٹ کی ڈگری تفویض فرما رہے ہیں۔ کیا ڈی لٹ کے لیے ایسی ہی "قابلِ اعتماد حوالہ کی کتاب"، "علمی دستاویز" اور "تحقیق کا رنامہ" تصنیف کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی جگہ ڈی لٹ اس فراخ دلی سے عطا کی کہ یہ شعر بھی ماند پڑ گیا ہے

دل مفت میں دان دے رہا ہوں: گاہک کو دکان دے رہا ہوں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ ابتدا میں' میں نے جن ۲۸ صفحات کے تجزیے کا ارادہ کیا تھا' وہ مقالہ کی طوالت کی وجہ سے نہیں کر سکا۔ محض دو ڈھائی صفحات کا تجزیہ حاضر ہے۔ اسی سے باقی صفحات پر پھیلے ہوئے غیر معروضی بیانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر کبھی فرصت ملی تو اُدھر بھی توجہ کر دوں گا۔ سرِ دست اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس مقالہ میں بعض حصّے اچھے بھی ہیں۔ یہ وہ حصّے ہیں' جہاں مقالہ نگار نے غیر معروضی سے کلیتاً دامن بچایا ہے۔ لیکن ان حصّوں کا تجزیہ اور تعین میرے دائرہ کار میں (زیر نظر مقالہ کی حد تک) شامل نہیں ہے۔

••

ڈاکٹر حنیف کیفی

۸۔ ۲۴ ذاکر باغ' اوکھلا روڈ

نئی دہلی۔ ۲۴

جواب

میرے تحقیقی مقالہ "اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم" پر حضرت عنوان چشتی کی خامہ فرسائی تنقیدِ محض کی شرمناک مثال ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں' اردو ریسرچ کانگریس کے انعقاد کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق کی روش و رفتار کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور ان میں پیش کردہ مقالوں کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے معروضیت کے ساتھ ان پر ایسے عمومی تبصرے پیش کیے جائیں' جو ان کے تمام پہلوؤں پر محیط ہوں اور ان مقالوں کے موضوعات کی اہمیت' معنویت اور افادیت' نیز ان کی پیشکش میں مقالہ نگاروں کی کامیابی و ناکامی' خوبیوں اور خامیوں کے تناسب پر دیانتدارانہ روشنی ڈال سکیں تاکہ آئندہ تحقیقی کام کرنیوالوں کی رہنمائی ہو سکے۔ عنوان چشتی صاحب نے میرے مطبوعہ تحقیقی مقالے کا جو "جائزہ" پیش کیا ہے' اور جس انداز سے پیش کیا ہے' وہ رہنمائی کے بجائے گمراہی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ موصوف نے نہ صرف کانگریس کے مقصود کو بلکہ تمام تنقیدی اصولوں اور اخلاقی قدروں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ چھ سو صفحات کی کتاب کے "محض ڈھائی صفحات" کا یہ جائزہ جس میں حقائق کو توڑ مروڑ کر اور سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا گیا ہے' جس ذہنیت کا غماز ہے وہ نہ صرف اس تنقیدی روش اور لب و لہجہ سے ظاہر ہے جو عنوان کی بدعنوانی سے لے کر اختتام کی بے سروسامانی تک اپنایا گیا ہے' بلکہ مجھ خاکسار کے ساتھ تعلق کے اس اظہار سے بھی مترشح ہے جس میں مجھ سے

محض" واقف" ہونے کی بات کہی گئی ہے۔ خدا جانے عنوان صاحب کو اس حقیقت کا اظہار کرنے میں کیوں شرم محسوس ہوئی کہ ہم دونوں ایک ہی شعبے سے متعلق ہیں۔ اور منصبی روابط سے قطع نظر ذاتی تعلقات میں بھی اٹھنے بیٹھنے سے لے کر کھانے پینے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے تک کتنے ہی مراحل و منازل میں ساتھ رہتے ہیں۔

عنوان چشتی صاحب کا پیش کردہ یہ جائزہ نگاہِ طائرانہ کی غلط اندازیوں کا عمدہ نمونہ ہے جس کی پرواز کا یہ عالم ہے کہ جس مقالے پر اظہارِ خیال فرمایا جا رہا ہے اس کا نام، اور اس کے جن صفحات کو تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے ان کی تعداد تک صحیح لکھی جاتی۔ میرے مقالے کا نام انھوں نے 'اردو میں معرّا اور آزاد نظم' لکھا ہے، جب کہ اس کا صحیح اور مکمل نام "اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم (ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک)" ہے۔ جن صفحات سے متعلق موصوف نے اپنی علمیت کا مظاہرہ کیا ہے، خود ان کی نشان دہی اس طرح کی ہے: ص ۱۹۳ تا ۲۲۸۔ صفحات کی تعداد ۲۸ بتائی ہے ایک بچہ بھی بڑی آسانی سے شمار کر کے یہ بتا سکتا ہے کہ صحیح تعداد چھتیس ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی جس رائے کو انھوں نے "فلیپ کی رائے" لکھا ہے، وہ ان کے پیش لفظ سے مقتبس ہے اور اس کی نشاندہی قوسین میں کر دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ پیش لفظ دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی گئی تو اس کا حوالہ کیا دیا جاتا۔ بظاہر یہ باتیں چھوٹی اور معمولی ہوتی ہیں، لیکن ان سے فاضل تنقید نگار کے سرسری اندازِ نظر کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس نگاہ غلط انداز کے تحت جو فیصلے فرمائے جائیں گے ان کی نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چشم بینا کا اعجاز دیکھیے کہ کتاب کے ایک مختصر سے حصے کی ورق گردانی نے دل پر پوری کتاب کی حقیقت روشن کر دی! اس اندازِ نقد اور انوکھی منطق کو بوالعجبی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ "محض دو ڈھائی صفحات" کی مفروضہ غلطیوں کی بنیاد پر پورے چھ سو صفحات کے مردود ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیا جائے اور دو محترم بزرگوں اور صاحب الرائے علمائے ادب پر، جنھوں نے پوری کتاب کو پڑھا اور پرکھ کر اپنی رائے ظاہر کی ہے، دریدہ دہنی کے ساتھ بدنیتی کا الزام عائد کیا جائے! عنوان صاحب کو مقالہ نگار سے شکایت کم اور مقالے کے ان پارکھوں سے زیادہ ہے اور اس کی وجہ وہ نہیں جو وہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں بلکہ "وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر" وہ نہ کر سکے اور جس کی بدولت قابلیت کا یہ سارا طومار باندھا گیا ہے، دراصل یہ ہے کہ ایک حقیر فقیر گوشہ نشین، جو صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور اپنے کام ہی سے پہچانا جاتا ہے، اس کی کتاب کو اپنے موضوع پر سب سے اچھا کام اور ڈی۔ لٹ کی ڈگری کا مستحق کیسے قرار دے دیا گیا اور موصوف کو تمام تعلقاتِ عامہ اور روابطِ خاصہ کے باوجود اور چار دانگ عالم میں بھاگ دوڑ کرنے کے بعد بھی آج تک یہ اعزاز نہیں نصیب ہوا۔ اب اس پر

میں عنوان صاحب سے ہمدردی کے اظہار اور اپنے سلسلے میں خدائے عزوجل کا شکر ادا کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں! عنوان صاحب نے سرور صاحب اور جین صاحب سے جواب طلب کیا ہے۔ یہ دونوں ہمارے ادب کی سربرآوردہ شخصیتیں ہیں۔ یہ حضرات بخوبی جانتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ جواب طلبی کس حد تک قابلِ اعتنا ہے! لیکن میں خود عنوان صاحب سے پوچھتا ہوں کہ وہ کس کس سے شکایت کریں گے اور کس کس سے جواب طلب کریں گے، کیوں کہ "مداحی" کے اس "جرم" میں اور بھی بہت سے لوگ شریک ہیں۔ جن دو رایوں پر انھوں نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہے، ان کے علاوہ پہلے ہی فلیپ پر سرور صاحب کے پیش لفظ کے اقتباس کے نیچے پروفیسر مسعود حسین کی رائے بھی ہے جس میں میری "مداحی" اور "گواہی" اور عنوان صاحب کی برافروختگی اور شکایت کا خاصا سامان موجود ہے، مگر خدا جانے کس مصلحت کے تحت انھوں نے اسکا ذکر مناسب نہ سمجھا! اس رائے کا خاتمہ انھیں کھٹکا تو ضرور ہوگا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک گراں قدر تصنیف ہے۔ یہ نہ صرف اس موضوع پر ایک اضافے کا حکم رکھتی ہے بلکہ عرصے تک اس موضوع پر علمی کام کرنے والے کے لیے ایک اہم حوالے کی کتاب کی حیثیت رکھے گی۔"

مختلف رسائل میں موشوکہ (کذا) وہ متعدد تبصرے بھی عنوان صاحب کی نظر سے ضرور گزرے ہوں گے جن میں کتاب اور اس کے مصنف کے لیے اسی "جرم" کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ جس کا ذمہ دار انھوں نے علم و ادب کی دو برگزیدہ ہستیوں کو ٹھہرایا ہے، ذاتی خطوط سے گریز کرتے ہوئے مطبوعہ تبصروں میں صرف چند کے اقتباسات ذیل میں پیش کر رہا ہوں۔

● جناب شمس الرحمٰن فاروقی: "اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم کے بارے میں تقریباً تمام صحیح معلومات یکجا کر کے حنیف کیفی نے اردو ادب کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے ..... مجموعی طور پر یہ کتاب ایسی ہے کہ جدید ادب کے ہر طالب علم کو اس کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ کیفی صاحب کی نثر بھی اس کتاب میں عام اردو تنقیدی نثر سے بہتر ہے۔" (شب خون، شمارہ ۱۴۴)

● پروفیسر عتیق احمد صدیقی: "مصنف نے جس شرح و بسط کے ساتھ موضوع پر گفتگو کی ہے اور تحقیق سے جو مواد ڈھونڈ نکالا ہے، وہ تصنیفات ماسبق پر اضافے کا حکم رکھتا ہے۔ کیفی صاحب نے اس کتاب میں صرف داد تنقید ہی نہیں دی بلکہ تحقیق و جستجو کا بھی ایک معیار قائم کیا ہے ... مصنف کا یہ دعویٰ کہ وہ موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر کے اسے ایک دستاویزی شکل دینے اور تحقیق و تنقید کے ذریعے اسے ایک مکمل علمی کام اور قابلِ اعتماد حوالے کی کتاب بنانے کی کوشش کی گئی ہے، نہ محض تعلّی ہے اور نہ محض دعوائے بے بنیاد۔" (الفاظ، نومبر دسمبر ۱۹۸۳ء)

● پروفیسر مغنی تبسم: "زیر تبصرہ کتاب (اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم) ایک جامع اور مکمل تصنیف ہے جیسا کہ پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے، اس موضوع پر اب تک سب سے اچھا کام ہے۔ کتاب کے مطالعے کے بعد

قارئین پروفیسر مسعود حسین کی اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ "اس تصنیف سے حنیف کیفی صاحب کے وسیع مطالعے اور علمی گرفت دونوں کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے ..... یہ نہ صرف اس موضوع پر ایک اہم اضافے کا حکم رکھتی ہے بلکہ عرصے تک اس موضوع پر علمی کام کرنے والے کے لیے یہ ایک اہم حوالے کی کتاب کی حیثیت رکھے گی۔" (آہنگ)

● ڈاکٹر خلیق انجم: "اب تک جتنے پی ایچ ڈی کے مقالے شائع ہوئے ہیں ان میں دو تین مقالے ہی اس کتاب کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ پچھلے تین برسوں میں تنقیدی اور تحقیقی موضوعات پر شائع ہونے والی کتابوں میں یہ اعلیٰ ترین کتاب ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم کے تمام تاریخی اور تنقیدی پہلوؤں کا اس طرح مکمل احاطہ کیا گیا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ طویل عرصے تک اس موضوع پر یہ پہلی اور آخری کتاب رہے گی۔" (ہماری زبان، ۸ر جنوری ۱۹۸۴ء)

ظاہر ہے کہ یہ تمام رائیں محض مروتاً نہیں لکھی گئیں۔ یہاں اس بات کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ میں نے اس کتاب میں گیان چند جین صاحب اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے کئی جگہ اختلاف کیا ہے، لیکن ان حضرات کی عالی ظرفی کہ انھوں نے اس اختلاف کو ذاتی وقار کا مسئلہ نہیں بنایا اور کتاب کی قرار واقعی قدر شناسی کی مگر عنوان صاحب کی نظر میں ان سب باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ تو اس بات پر مصر ہیں کہ صرف ان کا فرمایا ہوا مستند سمجھا جائے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میری کتاب، جس کا موضوع "اردو نظم معرا اور آزاد نظم کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" ہے، اسے عنوان صاحب بلا وجہ فن عروض اور اس کے نکات و مسائل کی کتاب باور کرانے پر تلے ہوئے ہیں۔

ع جو چاہے آپ کا "ذہنِ" کرشمہ ساز کرے

اگر میں نے اسے "قابلِ اعتماد حوالے کی کتاب بنانے کی کوشش" کہا ہے تو اس کے موضوع کی رعایت سے عروض کے اطلاقی پہلو سے (نہ کہ فنی پہلو سے) میں نے ضمناً اور حسبِ ضرورت کام لیا ہے۔ اب "اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا" کہ فاضل تنقید نگار ضمن کو اصل اور جزو کو کل سمجھ لیں! جن اصحاب نے کل پر نظر رکھی ہے، انھوں نے میرے ان بیانات کی تائید کی ہے جنھیں عنوان صاحب نے "دروغِ بیانِ خود" کے ذیل میں رکھا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ جو لوگ بھی ذہنی تحفظات و تعصبات سے بالاتر ہو کر اور موضوع کو پیشِ نظر رکھ کر کتاب پڑھیں گے وہ ان اہلِ نظر کی آرا سے اتفاق کریں گے۔ ویسے عنوان صاحب نے میرے بیانات کے سلسلے میں بھی ڈنڈی ماری ہے کیونکہ اگر وہ پوری بات سامنے لے آتے تو ان کا الزام بے بنیاد ثابت ہو جاتا۔ یوں میرے جو جملے انھوں نے نقل کیے ہیں ان سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ میں نے کوئی بلند بانگ دعویٰ کیا ہے۔ "کوشش کی گئی ہے" کے الفاظ کیا ظاہر کرتے ہیں؟ خوب سے خوب تر کی جستجو اور کام کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش میرا شعار رہا ہے۔ اس کی طرف

توجہ مبذول کرانے کو میں معیوب نہیں سمجھتا۔ رہی عنوان صاحب کے "رسمی انکسار" کی بات، تو میں کسی ایسے بے جا انکسار کا قائل نہیں جس کے پردے سے افتخار جھانکتا ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ فخر و مباہات کبھی میرا شیوہ نہیں رہا۔ نہ میں کھوکھلے دعوے کرتا ہوں اور نہ اپنے کسی کام کو شاہ کار سمجھ کر اتراتا ہوں۔ میرے بیانات کو نامکمل صورت میں پیش کر کے عنوان صاحب نے ایک غلط تاثر دینے کی کوشش کی ہے اور بہت ہوشیاری کے ساتھ ان بیانات کے بعد کے ان جملوں کو چھوڑ دیا ہے جن پر کتاب کے دیباچے کا اختتام ہوتا ہے :

"غرض کہ میں نے اپنی صلاحیتوں کی حد تک ہر پہلو سے اس مقالے کو مکمل بنانے کی کوشش کی ہے لیکن اب جبکہ یہ تکمیل پا چکا ہے تو میں اسے صرف 'حرفِ اوّل' سمجھتا ہوں کیوں کہ علم و ادب کی دنیا میں کوئی بھی کام حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ اگر زیرِ نظر مقالے سے اس موضوع پر مزید کام کرنے کی تحریک ہو تو اسی کو میں اپنی محنت کا صلہ سمجھوں گا۔"

کتاب کے موضوع سے بے نیاز ہو کر محض اپنی علمیت کے اظہار کے لیے، عنوان صاحب نے جو غیر ضروری بحث چھیڑی ہے اس میں انھوں نے قدم قدم پر خاکسار کو جاہلِ مطلق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ عیب جوئی کے جوش میں فاضل نکتہ چیں اس حد تک ہوش کھو بیٹھے ہیں کہ دوسروں کی خطا "بھی میرے سر تھوپ" دی ہے۔ جناب کا ارشاد ہے :

"مقالہ نگار نے لکھا ہے۔ 'پوری نظم کا آہنگ "مفاعی لن" ہے لیکن مندرجہ بالا بند کی آخری سطر میں مفاعی لن کے بجائے "مفاعی" رہ گیا ہے۔'" اس قول کی روشنی میں مقالہ نگار کی گرفت فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"مقالہ نگار نے جس آخری سطر کے خود ساختہ 'مفاعی' پر ختم ہونے کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے ؎
محبت کے وہ ہیبت ناک لمحے ؛ مفاعی لن مفاعی لن مفاعی۔ فعولن کی جگہ مفاعی لکھنا عروض سے واقفیت کا اشتہار ہے۔"

مندرجہ بالا جس قول کو خاکسار سے منسوب کیا گیا ہے، وہ عندلیب شادانی کا ہے اور ان کے مضمون "آزاد نظم"، مشمولہ "تحقیقات" سے ماخوذ ہے۔ اس سلسلے میں واوین، حوالے کا نشان ' ے ' اور مکمل حوالہ "عندلیب شادانی: 'تحقیقات' ص ص ۴۶۔۴۷" اتنے واضح اور نمایاں ہیں کہ بغیر عینک کے بھی نظر آتے ہیں (ملاحظہ ہو "اردو میں نظمِ معرا اور آزاد نظم"، ص ۴۔۲۰۴ اور "اوراق" ستمبر/اکتوبر ۱۹۸۱ء ص ۲۱)۔ یہ قول جس بحث سے متعلق ہے اس کا سلسلہ صفحہ ماقبل (کتاب ص ۲۰۳ "اوراق" ص ۲۰) سے ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے :

"اصولاً (آزاد نظم کی) سطروں یا (مصرعوں) کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیے کہ وزن کے لیے جو رکن اختیار کیا گیا ہے وہ ٹوٹنے نہ پائے ورنہ کلام کا سارا آہنگ کہ اسی پر یہ ساری عمارت کھڑی ہے، یکسر فنا ہو جائے گا۔"

(عندلیب شادانی : تحقیقات، ص ۴۶)

اپنی بات کی وضاحت کے لیے عندلیب شادانی نے جو مثالیں پیش کی ہیں ان میں سے دو میں نے اپنے مقالے میں نقل کی ہیں اور اس کی صراحت بھی کر دی ہے۔ جس مصرعے کی بنیاد پر اعتراض وارد کیا گیا ہے وہ دوسری مثال یعنی ضیا فتح آبادی کی نظم "ایام گذشتہ" کے ایک بند کا آخری مصرع ہے۔ اس مصرعے کے فوراً بعد ہی عندلیب شادانی کا منقولہ جملہ ہے جسے عنوان صاحب نے مجھ سے منسوب کیا ہے۔ یہ جملہ بھی اصل صورت میں نہیں بلکہ عنوان صاحب کی "اصلاح" کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اصل جملے میں "مندرجہ کے بجائے "مندرج" اور "مفاعی" رہ گیا ہے" کی جگہ پر صرف 'مفاعی' ہی رہ گیا" لکھا ہوا ہے۔

"دیانتداری" کے اس مظاہرے کے ساتھ ساتھ فاضل جائزہ نگار نے میرے قول پر بھی "عمل تسخیر" آزمایا ہے۔ اعتراض نمبر۳ کے تحت انھوں نے میرا جو قول "پیش کردہ اصول کے تحت ... وغیرہ نہیں بن سکتا" نقل کیا ہے، اس کی آخری سطر اس طرح لکھی ہے: "یعنی مفاعیل بدل کر مفاعیلن، مفعولن اور مفعول وغیرہ نہیں بن سکتا"، جبکہ اصل اس طرح ہے: "یعنی "مفاعیل" بدل کر "مفاعیلن"، "مفاعی" (فعولن)، "فاعیل" (مفعول) وغیرہ نہیں بن سکتا" کتاب ص ۲۰۲، اوراق ۲۰)

یہ تحریف جان بوجھ کر کی گئی ہے تاکہ فاضل نکتہ چیں آگے چل کر ارکان کی فروع سے میری "عدم واقفیت کا اشتہار" پیش کر سکیں، حالانکہ جس جگہ انھوں نے "فروع" لکھا ہے ("مفاعی لن" کی فروع فعولن ہے") وہاں اس لفظ کے واحد "فرع" کا محل تھا۔ مندرجہ بالا جملے کے علاوہ اور مقامات پر بھی حسب ضرورت میں نے رکن کی فرعی شکل لکھ دی ہے۔ جیسے مستفعلن/فعلن، مفاعی/فعولن، فاع/فع (کتاب ص ۲۱۲، اوراق ص ۲۸)۔ جہاں جہاں ضرورت محسوس کی، میں نے بحروں کے نام بھی لکھ دیے ہیں۔ مثلاً ص ۹۹، ص ۲۱۳۔ میری جہالت ثابت کرنے کے لیے عنوان صاحب نے ان باتوں سے دانستہ چشم پوشی اختیار کی ہے۔

جس نکتے کو لے کر عنوان صاحب نے اپنی "علمیت" کی بے جا نمائش کی ہے، اس کا مقالے کے سیاق و سباق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، میں نے ایک خاص ضمن میں، یعنی آزاد نظم کی ہیئت اور تکنیک کے سلسلے میں، حسب ضرورت عروض کے عملی و اطلاقی پہلو کو اپنایا ہے، جبکہ عنوان صاحب نے فن عروض کے اصول و نکات سے نظری و عمومی بحث کی ہے۔ غلط یا صحیح سے قطع نظر، اگر یہ بحث علم عروض کی کسی کتاب پر ہوتی تو برمحل ہوتی۔ بصورت موجودہ یہ بحث بے محل اور دور از کار ہے، اس لیے فاضل جائزہ نگار کی ساری خامہ فرسائی ایک کار فضول اور سعی لاحاصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ زیر بحث ۳۶ صفحات (عنوان صاحب کے حساب سے ۳۸ صفحات) مقالے کے تیسرے باب "فری ورس: ہیئت اور تکنیک" (ص ص ۱۶۵-۲۲۸) کا جزو آخر ہے۔ اس باب کے پہلے حصے کے ۲۶ صفحات

۱۶۷-۱۹۲) میں انگریزی فری ورس کی تعریف اور فنی خصوصیات وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے یعنی زیرِ بحث حصے کا عنوان "اردو آزاد نظم کی ہیئت اور تکنیک" ہے۔ اسے "اوراق" کے لیے ایک علاحدہ اور آزادانہ مضمون کی شکل دینے کے لیے انگریزی فری ورس سے متعلق مباحث کی تلخیص کر دی گئی ہے جو اصل مضمون کی تمہید کے طور پر رسالے کے کچھ اوپر دو صفحات پر محیط ہے۔ یہ صراحت اس لیے کرنا پڑ رہی ہے کہ بحث کو صحیح تناظر میں سمجھا جا سکے۔ انگریزی فری ورس کے بعد اردو آزاد نظم کی ہیئت اور تکنیک سے بحث کا مقصد ایک طرح سے دونوں زبانوں میں آزاد نظم کی ہیئتی خصوصیات کا تقابلی مطالعہ پیش کرنا اور اس طرح انگریزی فری ورس اور اردو آزاد نظم کے افتراق و امتیازات کو واضح کرنا تھا۔ زیرِ بحث حصے کی ابتدا ہی اس طرح ہوتی ہے۔

"جہاں تک اردو کی آزاد نظم کا تعلق ہے تو اس کی بنیاد ہی روایتی عروض پر رکھی گئی ہے۔ مزید برآں فرانسیسی وبرلیبر اور انگریزی فری ورس کے برعکس اردو آزاد نظم نہ تو وزن و بحر سے یکسر بے نیاز ہوتی ہے اور نہ اس کی تشکیل مختلف اوزان و بحور کے امتزاج سے ہوتی ہے۔ اس طرح اردو کی آزاد نظم ان معنوں میں اور اس حد تک آزاد نہیں ہے جن معنوں میں اور جس حد تک اس کے مغربی ماخذ کی آزاد نظم ہے" (کتاب ص ۱۹۲، اوراق ص ۱۵)

میرا یہ کہنا کہ "اردو شاعری (عنوان صاحب نے "شاعری" کی جگہ "عروض" لکھ دیا ہے) کی بنیاد جس عروض پر قائم ہے ... اس میں زحافات کا عمل پیچیدہ اور دشوار بھی ہے اور اس کا دائرہ بھی محدود ہے" اسی تقابلی مطالعے کے تحت انگریزی اور اردو شاعری کے افتراق و امتیازات کو واضح کرنے کی بحث کے ضمن میں ہے جس کا سلسلہ کتاب کے صفحہ ۲۱۸ سے شروع ہو کر باب کے تقریباً آخر تک جاری رہتا ہے۔ اس نسبت سے الگ کر کے دیکھا جائے تو بھی میری بات صحیح ثابت ہوتی ہے۔ خود عنوان صاحب کی تحریر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ جس عروض میں ایک مصرع کے ارکان پر مختلف زحافات" کے عمل سے "چھتیس" "نئے" اوزان برآمد ہوتے" ہوں تو اس عمل کو پیچیدہ اور دشوار کہنا کیا غلط ہے؟ ارشاد عالی ہے کہ "زحافات کا استعمال دشوار، پیچیدہ اور مشکل نہیں ہے بلکہ آسان اور سائنٹفک ہے"۔ مگر کن کے لیے؟ "جو لوگ اس تخصیص کو جانتے ہیں؟" جاننے والوں کی تعداد کتنی ہے؟ اگر یہ علم اتنا ہی آسان ہوتا تو آج تمام شاعر یا بیشتر شاعر اس کے جاننے والے ہوتے جبکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ بجا نوے فی صد سے بھی زیادہ شعرا اپنی موزونیتِ طبع کے باعث عروض کا غیر شعوری طور پر استعمال کرنے کے باوجود اس سے نابلد ہیں۔ پھر ان ہزاروں پڑھے لکھے لوگوں کے لیے کیا کہا جائے جو شاعر نہیں ہیں۔ ایک ریاضی داں اپنے میدان کا ماہر ہوتا ہے اور اس کے لیے اس علم کے نکات و مسائل آسان ہوتے ہیں تو کیا اس سے یہ لازم آتا

ہے کہ وہ میرے اور عنوان صاحب کے لیے بھی آسان ہوں؟ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ زحافات کے عمل کا "دائرہ محدود ہے" تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ سہولتوں اور آزادیوں کی اجازت ہونا الگ بات ہے اور ان کا اطلاق الگ ــــــ اصولاً اگر مختلف زحافات کے عمل سے حاصل شدہ "تمام اوزان کا اجتماع کسی ایک غزل یا نظم میں جائز" بھی ہو تو کیا یہ ممکن ہے کہ کسی ایک غزل یا نظم کے ہر مصرعے میں یا بیشتر مصرعوں میں الگ الگ اوزان ہوں اور اس کا آہنگ متاثر نہ ہو؟ عروضی مہارت کے مظاہرے سے قطع نظر، پوری اردو شاعری کے سرمایے میں سے اس قسم کی کتنی غزلیں یا نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں؟ عنوان صاحب نے بجا فرمایا کہ "عروض نے جو آزادی دی ہے، اس سے ماہرین عروض ہی استفادہ کرسکتے ہیں" یہ الگ بات ہے کہ کتنے ماہرین عروض اچھے شاعر بھی ہیں! پھر میری ساری بحث کا تعلق تو آزاد نظم اور اس کے شاعروں سے ہے اور میرا تخاطب "ماہرین عروض" سے نہیں بلکہ پڑھے لکھے عوام سے ہے۔ عنوان صاحب کے ارشادات سے تو خود میرے معروضات کی تائید ہوتی ہے۔

اب اس سلسلے کی آخری بات رہ جاتی ہے ــــــ آزاد نظم کے مصرعوں میں درمیانی ارکان کا اس طرح گھٹایا بڑھایا جانا کہ ان کے "اجزائے ترکیبی بجنسہٖ ایک ہوں" اور یہ کہ ان درمیانی ارکان کی "تعداد ہی میں کمی بیشی ہوسکتی ہے" ان کے "کسی جزو میں حذف واضافہ نہیں ہوسکتا" ــــــ یہاں بھی عنوان صاحب خلا میں قلابازیاں کھا رہے ہیں نمبر ۳ کے تحت عنوان صاحب نے میرا جو قول نقل کیا ہے (تحریف کرکے ہی سہی) اس کے الفاظ "پیش کردہ اصول کے تحت" اور "اجزائے ترکیبی بجنسہٖ ایک ہوں" کے فقرے کا واوین میں دیا جانا خود اس بات کی شہادت ہے کہ کسی خاص اصول کے حوالے سے ہی بحث کی جارہی ہے۔ اس اصول سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، جس کی طرف میں نے باب کے آخر میں بحث کو سمیٹتے ہوئے خود بھی ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"آزاد نظم کے لیے اس اصول کی تعیین کے باوجود مجھے اس حقیقت کا احساس اور اعتراف ہے کہ اس کے شاعر کو کسی باہری ضابطے یا اصول کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنی مملکت کا مطلق العنان بادشاہ ہوتا ہے اور اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جو اصول چاہے اپنائے۔ بہر حال کوئی رہنما اصول ہونا ضرور چاہیے" (کتاب ص ۲۲۸، اوراق ص ۳۶)۔

لیکن اس بحث کو اسی خاص اصول کی روشنی میں پرکھا اور اس پر محاکمہ کیا جاسکتا ہے۔ اس خاص تناظر سے صرف نظر کرکے جو بھی بحث کی جائے گی وہ بے معنی و بے محل ہوگی ــــــ اور عنوان صاحب نے یہی کیا ہے۔ آزاد نظم کا یہ بنیادی اصول ڈاکٹر منیب الرحمن نے اپنے مضمون "آزاد نظم کی ہیئت" (مطبوعہ علی گڑھ

بُنزین، شمارہ اوّل، ۵۷ ۱۹ء) میں پیش کیا تھا۔ اس رسالے کے صفحات ۱۹۴، ۱۹۵، اور ۱۹۶ سے محولہ مضمون کے ضروری حصّے میں نے اپنے مقالے میں اقتباس کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

"اردو میں نظم آزاد کا ایک ہیئتی PATTERN ہے جس کا عروض سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا دوسرے اسالیب کا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ روایتی اسالیب میں شروع سے آخر تک ایک ہی بحر کی پابندی لازم ہے لیکن نظم آزاد کا PATTERN ایک مخصوص بحر کے ارکان گھٹانے بڑھانے سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ ارکان یا تو بحر کے میانی ارکان رہتے ہیں یا ان کا تعلق بحور سالم سے ہوتا ہے۔ اوّل الذکر صورت میں ضروری ہے کہ میانی ارکان کے اجزاے ترکیبی بجنسہٖ ایک ہوں" (اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم ص ۱۹۸، اوراق، ص ۱۷)

"میانی ارکان کو حذف کرنے کی رسم کوئی من مانی جدت نہیں ہے۔ اس کا جواز ہمیں مستزاد کی شکل میں ملتا ہے۔"

"اردو میں آزاد نظم عروض سے انحراف نہیں ہے۔ اس کا قانون بنیادی طور پر مستزاد سے اخذ کیا گیا ہے ترمیم صرف اتنی ہے کہ مستزاد کے برخلاف اسکے اندر مصرعوں کی ترتیب میں آزادی سے کام لیا جا سکتا ہے۔" (اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم، ص ۱۹۹، اوراق، ص ۱۸)

میں نے آزاد نظم کے اسی اصول (بقول ڈاکٹر منیب الرحمٰن "قانون") کی تائید کرتے ہوئے اس کے "مختلف پہلوؤں اور اس کے اثرات و مضمرات" سے بحث کی ہے" "یعنی اسے اس رُخ سے سمجھنے کی کوشش" کی ہے "کہ اس کے اطلاق کی کیا صورتیں ہوں گی اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے" بحث کی ابتدا ہی میں، میں نے یہ وضاحت کر دی ہے:

"آزاد نظم کا جو قانون یا اصول ڈاکٹر منیب الرحمٰن نے بتایا ہے اس کی رو سے گھٹائے بڑھائے جانے والے ارکان یا تجربے کے میانی ارکان رہتے ہیں یا ان کا تعلق بحور سالم سے ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ یہاں "گھٹانے بڑھانے" کا مطلب ارکان کے اجزا میں تخفیف یا اضافہ نہیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ارکان اپنی مکمل صورت میں کم یا زیادہ کیے جانے چاہییں، جیسا کہ اس فقرے سے ظاہر ہے 'اوّل الذکر صورت میں (یعنی میانی ارکان کے گھٹانے بڑھانے کی صورت میں) ضروری ہے کہ میانی ارکان کے اجزاے ترکیبی بجنسہٖ ایک ہوں'۔" اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم، ص ۲۰۱، اوراق ص ۱۹)۔

اس سے بحث کی نہج اور سمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ساری بحث اسی خاص ضمن میں ہے۔ اس میں، میں نے حسب ضرورت عروض کے اطلاقی پہلو کا سہارا لیا ہے، نیز اپنے معروضات کی تائید میں شعرا کے کلام سے مثالیں اور ناقدین کی رائیں پیش کی ہیں۔ عنوان صاحب نے سیاق و سباق سے ہٹ کر نظری و عمومی بحث چھیڑ دی۔

چہ بوالعجبیست اسی ضمن میں عنوان صاحب نے اجزائے شعر کے ناموں سے میری عدم واقفیت کے مفروضے پر میری جہالت کا اعلان کر دیا۔ عنوان صاحب کی خوشی کی خاطر، کہ وہ بہرحال میرے دوست ہیں، میں اپنی "جہالت" تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن کیا کروں کہ ان کو اس اطلاع سے صدمہ ضرور پہنچے گا کہ بفضلہ میں نہ صرف اجزائے شعر کے ناموں سے واقف ہوں، بلکہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ "ضرب" کو "عجز" بھی کہتے ہیں اور اسی سے صنعت "رد العجز" نکلی ہے، جس کی قسمیں، بہ رعایت اجزائے شعر، رد العجز علی الصدور، رد العجز علی الابتدا، رد العجز علی العروض اور رد العجز علی الحشو ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دوسرے مصرعے کے پہلے رکن کو "ابتدا" کہنے کی بنیاد یہ قیاس ہے کہ شعر کا دوسرا مصرع عموماً پہلے کہا جاتا ہے اور پہلا مصرع بعد میں۔ اس طرح عملاً دوسرا مصرع پہلا ہو جاتا ہے اور پہلا مصرع دوسرا۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اجزائے شعر سے واقف ہونے کے باوجود میں نے مصرعوں کے ارکان کے لیے ان کے مقررہ ناموں کے بجائے درمیانی، ابتدائی اور اختتامی کے الفاظ کیوں استعمال کیے۔ اس کے کئی اسباب ہیں :

(۱) ڈاکٹر منیب الرحمٰن نے آزاد نظم کا "قانون" پیش کرتے وقت "میانی ارکان" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ چونکہ میں نے ساری بحث انھیں کے پیش کردہ اصول کی تائید، تشریح اور توضیح کے لیے کی ہے، اس لیے میں نے بھی انھیں برقرار رکھنا مناسب سمجھا۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ میں نے اپنی تحریر میں "میانی" کے بجائے "درمیانی" کا استعمال کیا ہے۔

(۲) اجزائے شعر کی تخصیص دو مساوی مصرعوں کی بیت پر مبنی ہے اور غزل کی قبیل کی شاعری سے متعلق ہے۔ آزاد نظم جس میں مصرعوں کے غیر مساوی ہونے کے باعث شعر یا بیت کا تصور ممکن ہی نہیں، اس کے مصرعوں کے ارکان کے واسطے اجزائے شعر کے لیے متعین اصطلاحیں استعمال کرنا چہ معنی دارد؟

(۳) سب سے بڑی بات یہ کہ بات کی تفہیم سیدھے سادے اور عام فہم انداز میں ہو سکے تو تحریر کو اصطلاحوں سے غیر ضروری طور پر بوجھل کرنے اور اس طرح قاری کو مرعوب کرنے سے کیا فائدہ؟

ڈاکٹر فیروز احمد
شعبۂ اردو
راجستھان یونیورسٹی جے پور

ڈاکٹر معز ز قیصر کا تھیسس

اعتصام الدولہ مرزا کلب حسین خاں بہادر نادر حیات اور ادبی خدمات

آزاد نے ناسخ کے وسیع حلقۂ تلامذہ میں جن شعراء کا ذکر بطورِ خاص کیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں: خواجہ وزیر، محمد رضا خاں برق، میر اوسط علی رشک، امداد علی بحر، منیر شکوہ آبادی اور مرزا کلب حسین خاں نادر۔ اس فہرست میں نادر کا نام گرچہ سب سے بعد شامل کیا گیا ہے۔ لیکن آزاد کے ہی ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ "افراطِ شوق اور امدِ مضامین اور کثرتِ تصانیف اور پابندیٔ اصول" کے اعتبار سے نادر "سب میں اول" تھے (آبِ حیات ص ۳۵۵)

آزاد کے اس بیان سے نادر کی شاعرانہ شخصیت کا جو خاکہ مرتب ہوتا ہے۔ اس میں تذکروں کی مدد سے اگر مزید رنگ آمیزی کی جائے تو اندازہ ہوگا کہ نادر کو اپنے زمانہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور ان کا شمار ان شعراء کی صف میں کیا گیا جن کے فکر و فن نے لکھنؤ کے رنگِ شاعری کو پایۂ اعتبار بخشا۔ لیکن یہ خاکہ دراصل نادر کی ادبی شخصیت کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو اس سے زیادہ معنی خیز معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کا اندازہ خصوصی طور پر ان تحریروں سے ہوتا ہے جو پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر انصار اللہ نے بالترتیب تذکرہ نادر، تذکرہ ابن طوفان اور تلخیص معلی کے مقدمہ اور حواشی کے طور پر لکھی ہیں۔ یہ تحریریں نادر کے مطالعہ میں نہ صرف اہم ہیں بلکہ ان سے نادر کے تفصیلی مطالعہ کی ضرورت اور اہمیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر معزز قیصر کا مقالہ بعنوان "اعتصام الدولہ مرزا کلب حسین خاں بہادر نادر حیات و ادبی خدمات" غالباً اسی احساس کا مظہر ہے۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا ہے۔ مقالہ میں آٹھ ابواب ہیں۔ ابتدا میں ایک مختصر سا مقدمہ اور آخر میں جملہ ابواب کا خلاصہ "خاتمہ" کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ مقدمہ کے آغاز میں مقالہ نگار نے نادر کے مطالعہ کی اہمیت اور اپنے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اعتصام الدولہ مرزا کلب حسین خاں بہادر نادر (شاگرد ناسخ) انیسویں صدی کے اساتذۂ شعر و ادب میں سے تھے۔ مگر یہ بات افسوس ناک ہے کہ اب تک ان کے شخصی، علمی اور ادبی کارناموں کا اعتراف کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ انہوں نے مجموعی طور پر نظم و نثر میں ایسی علمی و ادبی تحریروں کا ذخیرہ چھوڑا ہے جس کا باضابطہ جائزہ ادبی و تاریخی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔ لہٰذا پہلی بار زیر نظر مقالے میں نادر کے حالاتِ زندگی اور ان کے جملہ شعری و نثری تخلیقات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے متعلق تمام منتشر معلومات کو یکجا کر کے تاریخ ادب اردو میں ان کا صحیح مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔" (مرزا کلب حسین خاں بہادر: حیات و ادبی خدمات)

نادر کے حالات زندگی اور ان کے جملہ شعری و نثری تخلیقات کے مطالعہ کی یہ سعی بظاہر مستحسن ہے لیکن اس کے لیے اس معروضی نقطۂ نظر پر سختی سے کاربند ہونے کی بھی ضرورت ہے جس کا ذکر مقالہ نگار نے مذکورہ بالا اقتباس میں کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ نادر کے تمام علمی و ادبی آثار کی تفہیم کی جانب توجہ کم کی گئی ہے مگر اس سلسلہ میں جو کام ہو چکا ہے اس کی صحت یا عدم صحت کا جواز پیش کیے بغیر یہ فیصلہ صادر کرنا کہ یہ "کوئی سنجیدہ کوشش" نہیں، کسی طرح بھی مناسب اور درست نہیں معلوم ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ زیر نظر کتاب کے مطالعہ میں متعدد ایسے مقامات آئے ہیں جہاں مقالہ نگار کے ادعائی رویے اور انداز فکر کی صحت مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ اس کی مثالیں بہت ہیں۔ لیکن سر دست کتاب کے پہلے باب سے اس کا آغاز کیا جاتا ہے جس کا عنوان "اعتصام الدولہ میرزا کلب حسین خاں بہادر نادر کے سوانحی حالات" ہے۔ اس باب میں نادر کے خاندانی حالات بیان کرتے ہوئے مقالہ نگار نے نادر کے "سال ولادت" کی بابت لکھا ہے:

"نادر نے اپنے سال ولادت کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے تاہم انہوں نے اپنے تحصیلداری کے عہدہ پر فائز ہونے کا سال اواسط جون ۱۸۲۶ء/ ذی قعدہ ۱۲۴۱ھ تحریر کیا ہے۔ اور اس وقت اپنا آغاز شباب بتایا ہے۔" (مقالہ ہذا ص ۲۰) اس کے بعد نادر کی اصل عبارت درج کر کے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ "اس زمانے میں انگریزی ملازمت کے لیے کم از کم عمر ۲۱ سال ضرور مقرر ہوتی ہوگی، اس لحاظ سے نادر کا سالِ پیدائش ۱۸۰۵ء/ ۱۲۲۰ھ قرار پاتا ہے۔" (ایضاً ص ۲۰)۔

نادر کے سالِ ولادت کا مسئلہ متنازعہ فیہ ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اس سلسلہ میں خاموش ہیں۔ البتہ ڈاکٹر انصار اللہ نے تلخیص معلی کے مقدمہ میں اس پہلو پر توجہ کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے نادر کے تذکرہ

شوکت نادری کے زمانۂ تصنیف کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ڈپٹی کلب حسین خاں بہادر کی پہلی تصنیف جہاں تک معلوم ہوسکا ہے شوکت نادری ہے جو الہ آباد کے زمانۂ قیام میں ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء میں مکمل ہوئی۔ اس وقت اگر عمر بیس برس قیاس کیا جائے تو ان کا سال ولادت ۱۲۲۷ھ/۱۲ ۱۸ء کے قریب ہوگا۔" (تلخیص معلی ص ۱۷)

نادر کے سال ولادت کے متعلق یہ دونوں بیانات قیاسی ہیں اور ان میں نہ صرف سات برس کا فرق ہے بلکہ قیاسات کی بنیاد بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اختلاف کی اس صورت میں لازم تھا کہ ڈاکٹر انصار اللہ کی تحقیق کو بھی زیر بحث لایا جاتا، اس سے بیک نظر قارئین کو ضروری معلومات حاصل ہوجاتیں۔

ناسخ سے تلمذ کی بابت مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ: "ناسخ اس زمانے میں بعض سیاسی اسباب کی بنا پر الہ آباد آتے جاتے رہتے تھے۔ جہاں انہوں نے اپنے شاگردوں کا ایک گروہ بھی تیار کر لیا تھا نادر وہاں بہ سلسلۂ ملازمت پہلے سے موجود تھے۔ چنانچہ وہ بھی ناسخ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے لیکن تذکرۂ شوکت نادری (۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء) میں ان کے ناسخ سے تلمذ کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس لیے الیقین ہے کہ وہ اوائل ۱۲۴۸ھ/مئی ۱۸۳۲ء یا اس کے کچھ بعد ناسخ کے شاگرد ہوئے ہوں گے" (الیضاً ص ۲۴-۲۵)

ناسخ سے تلمذ کا یہی سال ڈاکٹر انصار اللہ نے بھی تحریر کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر معز قیصر کے برخلاف انہوں نے اپنی تحقیق کی بنیاد اوسط علی رشک کے اس قطعۂ تاریخ پر رکھی ہے جس سے ناسخ کی لکھنؤ میں آمد کا زمانہ ۱۲۴۸ھ متعین ہوتا ہے۔ ابن طوفان کے حوالہ سے ڈاکٹر انصار اللہ مزید لکھتے ہیں: "ابن طوفان کے قول کے مطابق الہ آباد میں اس موقع پر ناسخ سے نادر کی اصلاح لینے کی مدت ایک برس تھی چنانچہ قیاس غالب ہے کہ ۱۲۴۸ھ کے قریب الہ آباد پہنچنے کے بعد ناسخ کے شاگرد ہوئے اور ان کی واپسی تک ان سے اصلاح سخن لیتے رہے۔" (تلخیص معلی ص ۱۸)

ناسخ سے تلمذ کی بابت ڈاکٹر انصار اللہ کا یہ بیان زیادہ قرین قیاس ہے اور اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ناسخ کا انتقال ۱۸۳۸ء میں ہوا۔ اس اعتبار سے نادر تقریباً ۷ برس تک ناسخ سے اصلاح لیتے رہے۔ اس عرصہ میں استاد اور شاگرد کے مابین تعلقات بقول آزاد "فقط ذوق شعر" تک محدود نہ تھے بلکہ انتہائی قربت میں بدل چکے تھے۔ چنانچہ اس کا اظہار اس رجیہ قصیدہ سے ہوتا ہے جسے ڈاکٹر معز قیصر نے زیر نظر کتاب میں نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ قصیدہ ناسخ کے رحلت کے تقریباً ۱۵ برس بعد کہا گیا ہے۔ لیکن ان کا یہ بیان قطعی غلط ہے کہ نادر نے صرف ایک قصیدہ ناسخ کی مدح میں لکھا تھا۔ یہاں نادر کا ایک اور قصیدہ

درج کیا جاتا ہے جو ناسخ کی حیات میں اور غالباً ان کے الہ آباد کے دوران قیام میں کہا گیا ہے۔ اگرچہ خود نادرؔ اس وقت تک الہٰ آباد سے غازی پور منتقل ہو چکے تھے۔ غازی پور میں نادرؔ کے قیام کا زمانہ ۱۸۳۲ء تا ۱۸۳۷ء ہے اس اعتبار سے قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ یہ قصیدہ ۱۸۳۲ء تا ۱۸۳۷ء کے درمیان کہا گیا ہے۔ قصیدہ ملاحظہ ہو: ؎

فرد ہے انتخاب ہے ناسخ   بیت معنی کا باب ہے ناسخ
مومن پاک بندۂ مقبول   خادم بوتراب ہے ناسخ
اس کا ثانی نہیں زمانہ میں   بخدا لاجواب ہے ناسخ
شعرا میں ہے افضل و اعلیٰ   شیخ عالی جناب ہے ناسخ
ختم اوس پر تمام ہیں اوصاف   خوبیوں کی کتاب ہے ناسخ
از پے فیض یا لئے عالم   کرم بے حساب ہے ناسخ
شہر ہے خلق اور محاسن کا   بیتِ خوبی کا باب ہے ناسخ
کہتے ہیں قدردانِ جود و عطا   کہ کرم کا سحاب ہے ناسخ
علم ایسا کہ کہتے ہیں عالم   کیا فضیلت مآب ہے ناسخ
بہر اوج سپہر شعر و سخن   ماہ ہے، ماہتاب ہے ناسخ
معرکۂ شاعری کا ہوئے جہاں   اوس جگہ فتحیاب ہے ناسخ
صدفِ خلق و بحر عالم میں   دُر ہے معنی تو آب ہے ناسخ
کیوں نہ ہو کامیاب اوسے خلق   بیت بخشش کا باب ہے ناسخ
کیوں نہ ہو فکر مطلع حاضر   بسکہ عالی جناب ہے ناسخ

بسکہ تو آفتاب ہے ناسخ
کون تیرا جواب ہے ناسخ

قول تیرا ہر ایک ہے محکم   رائے عین صواب ہے ناسخ
تو جو آیا بسا الہ آباد   لکھنؤ اب خراب ہے ناسخ
گر گیا ہے تری نظر سے جو   قابل اجتناب ہے ناسخ
ہے وہ مقبول سارے عالم کا   جو ترا باریاب ہے ناسخ

سامنا تیرا کر سکے کوئی کس کو دنیا میں تاب ہے ناسخ
خاک تیرے مقابلہ پر آئے چشم دشمن پر آب ہے ناسخ
تیرا جود و عطا و لطف و کرم بے حد و بے حساب ہے ناسخ
سلک گوہر ہے تیرا ہر مصرع لفظ دُرِّ خوش آب ہے ناسخ
بطفیل و تلمذ و تعلیم اک جہاں کامیاب ہے ناسخ
تیرا دیوان نغز سرتا پا قابل اکتساب ہے ناسخ
تو جو وصف شراب لکھتا ہے دل دشمن کباب ہے ناسخ
ہر سخن تیرا ہے ملوک کلام بس یہ لب لباب ہے ناسخ
از برائے تلامذہ تحقیق مدح تیری ثواب ہے ناسخ
تو جو درگاہ حق میں ہاتھ اوٹھائے ہر دعا مستجاب ہے ناسخ
دور تجھ سے جو ہو گیا نادرؔ دل کو اک اضطراب ہے ناسخ
وصف کیا آگے ہو سکے تحریر خاتمہ میں شتاب ہے ناسخ

مقالہ کے اس باب میں آگے چل کر نادرؔ کے اخلاق، عادات، اطوار اور مذہب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس باب میں اور نہ ہی کتاب کے کسی دوسرے مقام پر ان مغربی اثرات کا ذکر ملتا ہے جو اس زمانہ میں ہندوستانیوں کے ذہنوں کو متاثر کر رہے تھے۔ نادرؔ کے ذیل میں یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ وہ عرصہ دراز تک انگریزوں کے زیر اثر رہے، چنانچہ یہ قیاس بے جا نہیں کہ دوران ملازمت متعدد انگریز حکام کی صحبتوں نے انہیں مغربی تہذیب اور تمدن کی جانب متوجہ کیا ہوگا۔ نادرؔ کے یہاں ذہن و فکر کی سطح پر مغرب کے یہ اثرات اتنے واضح تو نہیں لیکن ذیل میں درج ان کی ایک غزل سے اس کی نفی بھی نہیں ہوتی: ؎

ہوں زبس مبتلائے کلکتہ جلد قسمت دکھائے کلکتہ
سیر جنت کی پھر نہ خواہش کی دیکھی جس نے فضائے کلکتہ
آئینہ گو نہ دیکھیں اہل طلب دیکھ لیں گر صفائے کلکتہ
جب کے آئے نظر وہاں کے حسیں دل و جاں ہے فدائے کلکتہ
وہ ہے دور اور جاں بلب ہوں میں خضر ہو رہنمائے کلکتہ

آرزو ہے امید دلہوزی ر ہے فرماں روائے کلکتہ
مجکو الفت ہے تب سے اے نادرؔ جب سے ہے ابتدائے کلکتہ

زیر نظر کتاب کے دوسرے باب کا عنوان " نادر کی غزل گوئی " ہے۔ اس کے مشمولات کا ذکر کرتے ہوئے مقالہ نگار نے مقدمہ میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ اس باب میں پہلی بار نادرؔ کے تینوں دواوین کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔ یہ دیوان نایاب ہیں اور عام طور سے محققین اور ناقدین کی دسترس سے باہر ہیں۔ اس نے نمونے کے طور پر زیادہ سے زیادہ اشعار پیش کر دیئے گئے ہیں " (مقالہ ہذا ص ۸)۔

نادرؔ کے مختلف دواوین کے نام بالترتیب دیوان نادر، شکرستان نادر اور دیوان سراپا ہیں مقالہ نگار نے ان ہی دواوین سے زیادہ سے زیادہ اشعار پیش کر کے نادرؔ کی غزل گوئی کا جائزہ لینے کی بات کہی ہے یہ بات اصلاً صحیح نہیں ہے۔ مقالہ کے اس باب میں ۹۸ فیصد وہ اشعار درج کئے گئے ہیں جو شکرستان نادر اور دیوان سراپا میں پائے جاتے ہیں۔ باقی اشعار تذکرہ وسراپا سخن سے اخذ کیئے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیوان نادر (اصلاً نادر کے ابتدائی چار دواوین کا جامع انتخاب ہے) مقالہ نگار کے پیش نظر نہیں تھا۔ اس کا ثبوت ان تعارفی جملوں سے فراہم ہو جاتا ہے جو مقالہ نگار نے دیوان نادر کے سلسلہ میں تحریر کئے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

۱؎ " یہ (دیوان نادر) مطبع اسعد الاخبار آگرہ سے ۱۲۷۰ھ/م ۱۸۵۴ء میں چھپ کر شایع ہوا تھا " (مقالہ ہذا ص ۱۲۵)۔ دیوان نادر کی اولین اشاعت ۱۲۷۰ھ میں نہیں بلکہ ۱۲۶۹ھ میں عمل میں آئی تھی جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے " مطبع اسعد الاخبار آگرہ میں منطبع ہوا ۱۲۶۹ھ "۔ ۲؎ مقالہ نگار کے بقول " دیوان نادر میں تعداد صفحات ۳۹۲ ہے " (ایضاً ص ۱۲۵)۔ یہ بیان بھی غلط محض ہے۔ اور اس سے مزید ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے دیوان نادر بذات خود نہیں دیکھا ہے۔ واضح ہو کہ تعداد صفحات ۳۹۲ نہیں بلکہ ۴۰۰ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ صفحہ نمبر ۳۹۳ سے لے کر ۳۹۹ تک نادرؔ کی پانچ غزلیں ہیں۔ گمان غالب ہے کہ یہ غزلیں ترتیب دیوان کے بعد یا پھر دیوان نادر کی طباعت کے زمانہ میں کہی گئی ہیں۔ یہاں ان غزلوں کے مطلع درج کیے جاتے ہیں : ؎

۱۔ آہوں سے کاکل بت بد بہ ذات بڑھ گئی جاڑوں کے دن شروع ہوئے رات بڑھ گئی
۲۔ سر ازبہوں کے ترخنجر بڑاں ہوں گے جب جواں آہ یہ اطفال دبستاں ہوں گے
۳۔ حاضر ہوں میں جو پاؤں میں زنجیر ڈال دے سودائے زلف سر سے خدایا نکال دے
۴۔ مربوط ہوں میں بسکہ تمہارے بیان سے قفل دہن کو کھولو کلید زبان سے

۵۔ تڑپاوں تہ خنجر مجھے ارمان یہی ہے ‏ تو ذبح کرے شوق مری جان یہی ہے

ان غزلوں کے بعد آخر کے تین صفحے تصحیح غلطی کے لئے وقف کئے گئے ہیں ۔ ۳۔ دیوان نادر میں شامل غزلوں کی تعداد کے سلسلہ میں مقالہ نگار نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ اس میں "تقریباً ۵۰۰ غزلیں" موجود ہیں یہ واقعہ یہ ہے کہ یہی خیال دیوان نادر کے مرتب اکرام علی عاجز نے بھی ظاہر کیا ہے ۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :" چار دیوانوں سے ایک دیوان میں نے اپنی طبیعت اور پسند کے موافق انتخاب کیا ۔ قریب پانچ سو غزلیں منتخب ہوئیں ۔ اور اسی طرح سے قصائد اور مخمس اور مسدس اور رباعیات اور قطعات سے بھی انتخاب کیا گیا " (دیوان نادر ص ۳)

زیر بحث دیوان کے مطالعہ سے یہ دونوں بیانات محل نظر معلوم ہوتے ہیں ۔ "تقریباً" یا "قریب" سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ ۴۹۰ یا ۴۹۵ یا پھر ۵۰۰ تا ۵۱۰ کے درمیان غزلیں ہوں گی ، مگر صورت حال ان سے مختلف ہے ۔ دیوان نادر میں کل ۴۰۷ غزلیں ہیں اور اگر ان ۵ غزلوں کو بھی دیوان میں شامل کر لیا جائے جن کے مطلع اوپر درج کئے گئے ہیں تو غزلوں کی مجموعی تعداد ۴۱۲ ہو جاتی ہے اس صورت میں احتیاط کا تقاضا تھا کہ غزلوں کی صحیح تعداد مقالہ میں لکھی جاتی ۔

نادر کی غزل گوئی کے متعلق مقالہ نگار کا یہ محاکمہ درست ہے کہ " اپنے ہم عصروں کی طرح نادر کی شاعری میں بھی کوئی خاص تنوع نہیں ہے ۔ نہ تو اس میں تصوف کی چاشنی ہے اور نہ کوئی فلسفہ ہے اور نہ ہی عشق و زندگی کے لئے کسی نئی بصیرت کا سامان موجود ہے بلکہ ان کے یہاں وہی روایت پسندی ہے جسے لکھنویت سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔" (مقالہ ہذا ص ۱۲۸) ۔ نادر کی روایت پسندی کے ہی ذیل میں ڈاکٹر انصار اللہ صاحب نے عبداللہ خاں خویشگی ، ابن طوفان اور ریاض رنگی کے حوالے سے نادر کی دو غزلیں ، ایک مطلع اور ایک ہی شعر نقل کر کے یہ تاثر دیا ہے کہ یہ کلام نادر کے قیام الہ آباد کے زمانہ کا معلوم ہوتا ہے ۔ انہوں نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ یہ اشعار نادر کی ابتدائی مشق کا نمونہ ہیں ۔ اور ان سے نادر کے ذوق جستجو اور روانی طبع کا اندازہ ہوتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیوان نادر ڈاکٹر انصار اللہ کی نظر سے کبھی نہیں گذرا ۔ ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ جن مختلف حوالوں سے انہوں نے نادر کے ابتدائی زمانے کا کلام نقل کیا ہے وہ سب (بہ استثنائے ایک شعر) دیوان نادر میں موجود ہیں ۔ مزید یہ کہ جن زمینوں میں انہوں نے نادر کے ۱۶ اشعار نقل کئے ہیں انہیں زمینوں میں نادر کے ۴۳ اشعار دیوان نادر میں موجود ہیں ۔ ان کی تفصیل قلم انداز کی جاتی ہے ۔ لیکن اس جانب اشارہ ضروری ہے کہ تذکرہ شوکت نادر کا مرتبہ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام میں نادر کی جو چار غزلیں ملتی ہیں ان میں سے دو غزلیں اور تذکرہ سراپا سخن سے ڈاکٹر معز قیصر نے نادر کی غزلوں

کے جتنے مطلع درج کئے ہیں، ان میں سے بھی دو ہی غزلیں دیوانِ نادرؔ میں موجود ہیں۔ ذیل میں جن غزلوں کے مطلع درج کئے جا رہے ہیں، انہیں تذکرۂ شوکت نادری اور دیوان سراپا میں بھی دیکھا جا سکتا ہے :ے

۱۔ چمکے جو صاعقہ تری برقِ نگاہ کا	خرمن بہ اوج چرخ جلے کیوں نہ ماہ کا[۱]
۲۔ کرتا ہے ترک تاز جو شبدیز یار کا	منظور روندنا ہے ہمارے غبار کا
۳۔ بکھرا کے وہ تب، زلفِ گرہ گیر پس پشت	کرتا ہے دلِ خلق کو تسخیر پس پشت
۴۔ اک رشک پری ہر تھی جو دنیا میں پڑی آنکھ	حوران بہشتی سے بھی اپنی نہ لڑی آنکھ[۲]

اختلاف متن کی ان صورتوں سے قطع نظر بنیادی بات یہ ہے کہ نادرؔ کی غزل گوئی کے مطالعہ میں دیوان نادر کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ اس دیوان میں نادرؔ کے ابتدائی دور کا بیشتر کلام موجود ہے۔ اس لئے نادرؔ کے فکر و فن کے بارے میں تفہیم کی کوئی کوشش اس کے بغیر معتبر نہیں قرار دی جا سکتی۔

مقالہ کا چوتھا باب "نادرؔ کی قصیدہ گوئی" سے متعلق ہے۔ اس باب میں نادرؔ کے قصائد کے مجموعے "ریاض نادریہ" کو پیش نظر رکھتے ہوئے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "نادرؔ نے غزل کے بعد اصناف سخن میں سب سے زیادہ زور طبع قصیدہ پر صرف کیا ہے"۔ (مقالہ ہذا ص ۸۷) اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے ابتداً ریاض نادریہ میں شامل قصائد کے مطلع درج کئے گئے ہیں۔ یہ مطلع تعداد میں ۱۸ ہیں گویا مقالہ نگار کے نزدیک نادرؔ کے قصائد کی مجموعی تعداد ۱۸ ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس خیال کی صحت میں دو وجہ سے اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ (۱) نادرؔ کے قصائد کی مجموعی تعداد ۱۸ نہیں بلکہ ۱۹ ہے (۲) ریاض نادریہ کے علاوہ بھی نادرؔ کے مطبوعہ قصیدے ملتے ہیں۔ ان معروضات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مقالہ کے صفحہ نمبر ۹۱ پر مقالہ نگار نے حضرت امام حسنؓ کی منقبت میں تین قصائد کے مطلع درج کئے ہیں۔ ایک اور قصیدہ کا مطلع اور تعداد شعر یہاں ملاحظہ ہو :ے

---

۱ : تذکرہ شوکت نادری میں مصرع ثانی بہ اختلاف متن اس طرح موجود ہے : ع خرمن فلک پہ سوختہ ہو جائے ماہ کا (راجع تذکرہ شوکت نادری۔ ص ۹۶۔ مرتبہ ڈاکٹر عبدالسلام۔ مطبع نامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء) ۔ ۲ ڈاکٹر معز قیصر نے اس شعر کو یوں نقل کیا ہے :ے

اک رشک پری سے تھی دنیا میں لڑی آنکھ حوران بہشتی پہ بھی اپنی نہ پڑی آنکھ
(رجوع بہ مقالہ ہذا ص ۴۱)

مطلع :- فصیح مجھ سے زیادہ نہیں کوئی شاعر — خطاب شاہ بھی پایا ہے میں نے سبحاں کا

مقالہ کے صفحہ نمبر ۱۷۱ پر ناسخ کی مدح میں ایک قصیدہ کا مطلع درج کیا گیا ہے (تعداد اشعار ۱۰۵)۔ نادر نے استاد کی مدح میں ایک اور قصیدہ کہا ہے جس کی تفصیل ابتدا پیش کی جا چکی ہے۔ مطلع یہ ہے :-

فرد ہے انتخاب ہے ناسخ — بیت معنی کا باب ہے ناسخ

جن قصائد کے مطلع اوپر درج کئے گئے، وہ دیوان نادر میں موجود ہیں۔ نادر کے اس دیوان میں بعض وہ قصیدے بھی موجود ہیں جنہیں بعد ازاں ریاض نادر یہ میں شامل کرلیا گیا۔ ان قصائد کے مطلع یہ ہیں:-

۱۔ کر چکا ہے جب مس پائے پیمبر آسماں — ہمسر عرش معظم ہو نہ کیوں کر آسماں

۲۔ ہے فزوں مریم و حوا سے بھی شان زہرا — ہے خداوند جہاں مرتبہ دان زہرا

۳۔ سننے کے اشتیاق میں ہر خاص و عام ہے — حزن و ملال و درد سے مملو کلام ہے

۴۔ خدا کے فضل سے اب لکھنؤ گلستاں ہے — جو اوس چمن میں ہے گل باغ باغ و خنداں ہے

مقالہ کا پانچواں باب "نادر بحیثیت مرثیہ گو" ہے۔ اس باب میں "نظم نادر" کی روشنی میں عموماً نادر کے مراثی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نظم نادر میں سلام، نوحے، رباعیات اور قطعات بھی شامل ہیں۔ لیکن ان اصناف سخن سے مقالے کے چھٹے باب میں بحث کی گئی ہے۔ نادر کے مراثی سے متعلق مقالہ نگار نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا ماحصل یہ ہے کہ "نادر اگر غزل اور قصیدہ کی طرح مرثیے پر تھوڑی محنت اور صرف کرتے تو یقیناً وہ اپنے زمانے کے ممتاز مرثیہ گویوں میں محسوب ہوتے، بہر حال الٰہ آباد، غازی پور، اٹاوہ اور فتح گڑھ جیسے علاقوں میں اردو مرثیے کو مقبول بنانے اور عوام و خواص تک پہنچانے میں نادر کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔" (مقالہ ہذا ص ۲۲۸)

اس بیان کے پہلے حصے سے قطع نظر دوسرے حصے کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کن بنیادوں پر نادر کے مرثیوں کو ان علاقوں سے منسوب کر دیا گیا جہاں نادر دوران ملازمت قیام پذیر تھے۔ کیا ان مراثی پر سنین درج ہیں ؟ یا نظم نادر کے دیباچہ نگار اکرام علی عاجز نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ نادر کا فلاں مرثیہ فلاں مقام پر لکھا گیا۔ واضح ہو کہ نادر کے مراثی پر نہ سنین درج ہیں اور نہ ہی عاجز نے ایسی کوئی اطلاع دی ہے جس سے مذکورہ سوال کا جواب مل سکے۔ جب تک اس سلسلہ میں کوئی حتمی ثبوت میسر نہ ہو یہ کہنا حق بجانب نہیں ہوگا کہ الٰہ آباد، غازی پور اور اٹاوہ اور فتح گڑھ جیسے علاقوں میں اردو مرثیے

کو مقبول بنانے اور عوام و خواص تک پہنچانے میں نادرؔ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔"

مقالہ کا باب ششم "دیگر اصناف سخن" پر مشتمل ہے۔ اس باب میں نادرؔ کی تضمینوں، رباعیات، سلام، نوحے اور تاریخی قطعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ لیکن اس جانب کہیں اشارہ تک موجود نہیں کہ نادرؔ نے واسوخت بھی کہا ہے۔ ذیل میں نادرؔ کے ایک واسوخت کا پہلا اور آخری بند درج کیا جاتا ہے پورا واسوخت ۱۵ بندوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی بند ملاحظہ ہو:

یاد ایام کہ تم قاتل و خونخوار نہ تھے — یاد ایام کہ تم ظالم و مکار نہ تھے
یاد ایام کہ راحم تھے جفا کار نہ تھے — یاد ایام کہ دلبر تھے دل آزار نہ تھے

یہ ستم گاریاں کب تھیں، یہ جفائیں کب تھیں
چھیڑیں اس طرح کی کب تھیں، یہ ادائیں کب تھیں

آخری بند یہ ہے:

پائمال ستم گردش گردوں نادرؔ — ہوش گم کردہ و سودائی و مجنوں نادرؔ
حسرت آگیں و دل آزردہ و محزوں نادرؔ — والہ و شیفتہ و رفتہ و مفتوں نادرؔ

منفعل عذر گنہ کرنے کو اب آیا ہے
کہہ کے واسوخت سنانے کے لئے آیا ہے

نادرؔ کی رباعیات کے ضمن میں مقالہ نگار کا یہ خیال ہے کہ "نادرؔ کی رباعیاں مختلف النوع موضوعات کے بجائے مذہبی اعتقادات، مدح آئمہ طاہرین اور فضائل و واقعات شہدائے کربلا پر مشتمل ہیں۔ چونکہ یہ مجالس عزا کے لوازم پورے کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھیں۔ اس لئے ان میں سنجیدگی اور متانت کا جلوہ گری پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔" (مقالہ ہذا ص ۲۳۹ ۔ ۲۴۰)

رباعیات نادرؔ کے غالب و حاوی موضوعات کے تعلق سے یہ بیان صحیح ہے۔ لیکن اس سے یہ اشتباہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ نادرؔ نے رباعیات میں مذہبی معتقدات کے علاوہ کسی دوسرے موضوع پر قلم نہیں اٹھایا ہے۔ ذیل میں نادرؔ کی چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔ ان سے مقالہ نگار کے بیان کی صداقت از خود واضح ہو جائے گی:

بیہودہ کسی نے صرف اوقات نہ ہو — جز یاد خدا اور کوئی بات نہ ہو
لازم ہے کہ جاری عمل خیر رہے — تا باعث رنج، یاد مافات نہ ہو

دن رات کو رائیگاں نہ ہونے دینا / اوقات کو رائیگاں نہ ہونے دینا
بے فائدہ گفتگو سے حاصل کیا ہے / اک بات کو رائیگاں نہ ہونے دینا

معشوق جو جنسِ دل لیا کرتے ہیں / داغوں کے درم، عوض دیا کرتے ہیں
کیا کوئی دیت کا ان سے خواہاں ہوئے / سر لے کے سرافراز کیا کرتے ہیں

ہنگامِ سحر جو بام پر آجاؤ / خورشید کو ہے یقین شرما جاؤ
سیدسا نہ مقابلہ کو ماہِ نو ہو / تم ابروئے پرخم کو جو دکھلا جاؤ

زیر نظر کتاب کا ساتواں باب "نادر بحیثیت تذکرہ نگار" ہے۔ اس باب میں نادر کے دو تذکروں یعنی شوکت نادری (قلمی) اور تذکرۂ نادر کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ تذکرۂ نادر کے متعلق اس سے قبل پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے ضروری اور اہم معلومات فراہم کردی تھیں۔ لیکن تذکرہ شوکت نادری[1] کے متعلق مسعود صاحب اور ڈاکٹر انصار اللہ دونوں کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ اس نقطۂ نظر سے شوکت نادری کی دریافت کا سہرا مقالہ نگار کے سر باندھا جا سکتا ہے۔

مقالہ کا آخری باب "نادر بحیثیت نثر نگار" ہے۔ اس باب میں نادر کے مذکورہ بالا تذکروں سمیت سات نثری کتابوں کی فہرست پیش کی گئی ہے۔ اگر تذکروں کو اس باب سے خارج کر دیا جائے تو پھر خلاصۂ قوانین مالی، توصیف زراعات، فضائل الشہدا، سرب لابہ اور تلخیص معلی کی صورت میں پانچ کتابیں زیر بحث آتی ہیں۔ ان میں تلخیص معلی کی علمی حیثیت ہے۔ اور باقی کتابوں کی اہمیت اس وجہ سے برقرار رہے گی کہ ان سے نثر کے بتدریج ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مقالہ کے آخر میں خاتمہ کے عنوان سے جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس کی حیثیت مختلف ابواب کی تلخیص کی ہے۔ اس کے مطالعہ سے نادر کے جملہ کارناموں کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

ع۱: اس تذکرہ کو اردو ترجمہ کی شکل میں ڈاکٹر عبد السلام نے "تذکرہ شوکت نادری" کے نام سے مرتب کرکے ۱۹۸۰ء میں نامی پریس لکھنؤ سے شائع کر دیا ہے۔

معز زقیصر
کشمیری محلہ، لکھنو

جواب

میں ایک پردہ نشیں خاتون ہوں، کالج میں پڑھاتی ہوں اور بیحد گھریلو ذمہ داریاں ہیں۔ اس لیے میرے لیے مختلف شہروں میں جاکر اپنے مقالہ "کلب حسین خاں نادر حیات اور کارنامے" کے لیے مواد فراہم کرنا مشکل تھا۔ اپنے محدود وسائل میں رہتے ہوئے جو کچھ مواد مل سکا اسی کو بنیاد بنا کر میں نے اپنا مقالہ پیش کر دیا ہے۔ اس میں یقیناً تحقیق کی بہت سی خامیاں ہوں گی۔ آپ براہ مہربانی یہ جواب اپنے مجلّہ "معیار و تحقیق" میں چھاپ دیجیے۔ انشاء اللہ اگر کتاب کا دوسرا ایڈیشن نکلا تو تمام خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گی۔

●●

ڈاکٹر قدوس جاوید
شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی

ڈاکٹر واصف احمد کا تھیسس ‖ ڈاکٹر آصفہ واسع کا تھیسس

اور

اختر اورینوی بحیثیت افسانہ و ناول نگار ‖ بہار میں اردو ناول ۱۹۴۷ء تک

ڈی، یہ پر مذاق فقرہ خواہ جس کسی کا
بغیر حوالہ ایک کتاب سے نقل کو سرقہ کہتے ہیں، دس بیس کتابوں سے نقل کو پی ایچ۔
بھی ہو، ان دنوں ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو میں لکھے جا رہے تحقیقی مقالوں پر کسی نہ کسی حد تک ضرور چسپاں ہوتا ہے۔ یہ صحیح
ہے کہ ماضی میں ہماری یونیورسٹیوں میں اہم ترین تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں اور ابھی بھی اکّا دکّا معیاری مقالے سامنے آتے ہی رہتے ہیں۔
لیکن بحیثیت مجموعی ہماری یونیورسٹیوں میں جس طرح دن بہ دن گرتا ہوا تعلیمی معیار تشویش کا باعث ہے اسی طرح اردو میں بھی پی۔ایچ۔
ڈی کی ڈگری کے لیے لکھے جا رہے تحقیقی مقالوں میں جاری تماشہ بازیاں اردو کے اساتذہ، اردو شعبوں اور یونیورسٹیوں کے لئے
شرم کا باعث بھی ہیں۔

اس ضمن میں کسی مخصوص یونیورسٹی کے تحقیقی مقالوں کا رونا رونا مناسب نہیں۔ لیکن چونکہ فی الوقت میرے اس
مقالے کا موضوع ہی پٹنہ یونیورسٹی میں ناول کی تحقیق ہے، اس لئے میری گفتگو موضوع ہی تک محدود رہے گی۔ ویسے بتانے
میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یوں تو ہندوستان کی کسی بھی دوسری یونیورسٹی کی طرح پٹنہ یونیورسٹی میں بھی آزادی کے بعد سے مختلف اصناف
نظریات و رجحانات، مسائل اور تحقیقات پر تحقیقی مقالے لکھے جاتے رہے ہیں اور تقریباً ساتویں دہائی تک بعض اچھے تحقیقی مقالے
پیش بھی کئے گئے مثلاً ڈاکٹر ظفر اوگانوی کا مقالہ "صفیر بلگرامی" ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی کا مقالہ "اردو میں ڈرامانگاری" ڈاکٹر لطف الرحمن
کا مقالہ "راسخ کی غزل گوئی" وغیرہ تحقیقی اصول و معیار کے اعتبار سے بہترین تحقیقی مقالے کہے جا سکتے ہیں۔ علی گڑھ اور دہلی کے ساتھ
ہی پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو بھی یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں کے اکثر و بیشتر طلبا نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی شاعری، افسانہ
نگاری، تحقیق اور تنقید کے باب میں وہ شہرت حاصل کی ہے جو بہتوں کو ایک عمر گذارنے پر بھی نصیب نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں خاص
طور پر شکیل الرحمن، کلام حیدری، منظر شہاب، ظفر اوگانوی، قمر اعظم ہاشمی، لطف الرحمن اور علیم اللہ حالی کے نام قابل ذکر ہیں۔

یونیورسٹیوں میں تحقیق کے معیار میں افسوسناک گراوٹ کے لیے شعبہ اردو کے وہ اساتذہ
ذمہ دار ہیں جن کی نگرانی میں مقالے لکھے جاتے ہیں جو غیر علمی و ادبی ذرائع کی مدد سے ملازمتیں اور پھر پروموشن حاصل کرلینے کے بعد اپنے تدریسی فرائض اسی رسمی اور
میکانکی انداز میں انجام دے رہے ہیں جس رسمی اور میکانکی انداز میں سکریٹریٹ کا کوئی کلرک اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ ایسے ہی اساتذہ

ہو سکتے ہیں:-

۱۔ تحقیق کی تعریف، نوعیت، اصول اور تقاضوں سے لاعلمی۔

۲۔ ادبی روایات و تجربات خصوصاً ہم عصر ادبی نظریات و رجحانات کی جانب سے بے خبری

۳۔ شعر و ادب کے مزاج پر عصری سماجی سیاسی، معاشی کروٹوں کے اثرات سے لاعلمی

۴۔ دورِ حاضر میں رونما ہونے والی صارفین تہذیب CONSUMERS CULTURE نئی اخلاقیات (NEW MORALITY) اور نئی انفرادی، سماجی نفسیات اور شعور سے عدم وابستگی۔

۵۔ تحقیق کے جدید ترین اصولوں اور ذرائع TOOLS سے لاعلمی۔

۶۔ سائنس اور سوشل سائنس کے مقابلے میں شعر و ادب میں تحقیق کے طریقۂ کار METHODOLOGY کے اطلاق کے حدود اور امکانات کی جانب سے بے خبری، اور

۷۔ تحقیق میں تنقید و تبصرہ کے تناسب کے شعور کا فقدان وغیرہ۔

پٹنہ یونیورسٹی میں تحقیق کی نوعیت اور اس کے پست معیار کے اسباب کے اجمالی جائزے[1] کے بعد براہ راست ناول کی تحقیق سے متعلق گفتگو کرنے سے پہلے ایک اور بات کی طرف توجہ مبذول کروانا ضروری سمجھتا ہوں۔ پٹنہ یونیورسٹی کے تحقیقی مقالوں میں تحقیق، تنقید اور تبصرہ کی سب سے مضحکہ خیز صورت حال شخصیات پر لکھے گئے مقالوں میں نظر آتی ہے۔ ایسے تمام مقالوں میں جو محسن دربھنگوی، اور رحمت پھلواروی جیسے شاعروں کی حیات اور کارناموں پر لکھے گئے ہیں، مقالہ نگاروں نے موضوعِ بحث ادیب یا شاعر کو درِ عظیم اور باکمال ہی نہیں بڑی آسانی سے آفاقی ادیب یا شاعر بھی قرار دیا ہے جبکہ واقعتہً فنی اعتبار سے ان کی اہمیت محلّہ جاتی بھی نہیں۔

جہاں تک پٹنہ یونیورسٹی میں ناول سے متعلق لکھے گئے تحقیقی مقالوں کا تعلق ہے۔ ان کی مجموعی تعداد کیا ہے کوشش کے باوجود میں معلوم نہ کر سکا کیونکہ شعبۂ اردو یا یونیورسٹی لائبریری میں اس کا کوئی باضابطہ ریکارڈ نہیں۔ ناول سے متعلق جو مقالے لائبریری میں مطالعہ کے لیے دستیاب ہیں اور جن پر مجھے نظر ڈالنے کا موقع ملا وہ حسب ذیل ہیں

۱۔ بہار میں اردو ناول، ۱۹۴۷ء تک مسز آصفہ واسع، نگراں اختر اورینوی صاحب ۸ ۱۹۷ء۔

۲۔ اردو ناول ۱۸۵۷ء سے ۱۹۶۶ء تک مقالہ نگار ڈاکٹر اسلم آزاد نگراں اختر اورینوی صاحب۔

۳۔ سرشار کے نسوانی کردار۔ مقالہ نگار ثریا جمال منظری، نگراں یوسف خورشیدی صاحب

۴۔ اختر اورینوی کی حیثیت افسانہ نگار و ناول نگار، واصف احمد، نگراں مطیع الرحمٰن صاحب

۵۔ نذیر احمد کے ناولوں میں سماجی قدریں۔ بدرالنسا: نگراں قریشہ حسین صاحبہ۔

---

[1] اجمالی جائزہ پٹنہ کا تفصیلی جائزہ مصدر سے تھوڑا سا الگ ہوا لگا، اس لیے اُسے ضمائم کے آرکائیوز میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

۶۔ فن کردار نگاری اور ڈپٹی نذیر احمد۔ اشرف جہاں۔ نگراں۔ قریشہ حسین صاحبہ۔

۷۔ قرۃ العین حیدر کے نسائی کردار۔ شمیم صادقہ۔ نگراں۔ قریشہ حسین صاحبہ۔

۸۔ اردو ناول میں کردار نگاری۔ ابوالبرکات۔ نگراں۔ ڈاکٹر اسلم آزاد۔

۹۔ اردو ناول کا سماجی پس منظر۔ محمد کمال۔ نگراں۔ ڈاکٹر اسلم آزاد۔

سرشار کے نسوانی کردار (ثریا جمال مظہری)' نذیر احمد کے ناولوں میں سماجی قدریں (بدرالنسا)، فن کردار نگاری اور ڈپٹی نذیر احمد (اشرف جہاں)' اردو ناولوں میں کردار نگاری (ابوالبرکات)' اردو ناول کا سماجی پس منظر (محمد کمال) ایسے موضوعات ہیں جن پر ناول سے تعلق نہ مار عظیم' احسن فاروقی، ڈاکٹر عبدالسلام، علی عباس حسینی' یوسف سرمست، ہارون ایوب کی تصنیفات میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ پٹنہ یونیورسٹی کے ان تمام مقالوں میں زیادہ تر انہیں کتابوں سے بغیر حوالوں کے خوب خوب استفادہ کیا گیا ہے۔ ان مقالوں میں نہ تو تحقیق کے اصولوں اور طریقہ کار کا لحاظ رکھا گیا ہے اور نہ موضوع کے تعلق سے کہیں بھی کوئی ایسی بات کہی گئی ہے جو قابل غور ہو اور جس سے مقالہ نگار یا نگراں کی تحقیقی یا تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہو سکے ان سبھی مقالوں میں ناول کی تعریف و تکنیک، ناول کی ابتدا و ارتقا' ناول کے اہم رجحانات جیسے ابواب قائم کیے گئے ہیں اس کا اندازہ ابوالبرکات کے مقالے" اردو ناول میں کردار نگاری" عرف پریم چند کے ناولوں کا سیاسی' سماجی اور معاشی پس منظر میں قائم کیے گئے ابواب سے لگایا جا سکتا ہے۔

باب اول:۔ اردو ناول کا ارتقا، باب دوم:۔ اردو ناول آزادی کے بعد' باب سوم:۔ اردو ناول کے اہم رجحانات، اور باب چہارم:۔ پریم چند کی روایت، باب پنجم:۔ پریم چند کا تصور حیات، باب ششم:۔ پریم چند کے ناولوں کا سیاسی' سماجی اور معاشی پس منظر، اور باب ہفتم:۔ پریم چند کے ناولوں کی بعض خامیاں

مذکورہ بالا دیگر محققین کے مقالوں کو دیکھنے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ شاید آج ۲۰۰ سے ۵۰۰ تک صفحات پر مشتمل کوئی بھی چیز مقالہ کے نام پر کسی بھی صورت سے داخل دفتر کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی جا سکتی ہے، خواہ پیش کردہ مقالے میں کم علمی کا جس قدر بھی مظاہرہ کیا گیا ہو' حقائق یا FACTS کو جس حد تک بھی توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہو مثال کے طور پر سیدہ واصف احمد کے مقالے" اختر اورینوی بحیثیت افسانہ نگار و ناول نگار" کو ہی لیں۔ واصف احمد نے اپنا مقالہ ۱۹۶۸ء میں اس وقت کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر مطیع الرحمٰن کی نگرانی میں مکمل کیا۔ مقالہ نگار نے مقالہ میں" اختر اورینوی بحیثیت ناول نگار" کے عنوان سے صفحہ ۲۱۱ سے لے کر صفحہ ۲۸۲ تک اختر اورینوی مرحوم کے ناول" حسرت تعمیر" کو ایک شاہکار ناول ثابت کرنے کی کوشش میں الفاظ کا غیر ضروری خرچ جس فیاضی کے ساتھ کیا ہے یہ ایک دلچسپ امر ہے۔ اختر اورینوی کی

ناول نگاری کے بارے میں سید واصف احمد ایم اے اردو، فارسی، انگریزی کی تحقیق کا آغاز ہی ناول کی تخلیق سے متعلق اس بے تُکے انکشاف سے ہوتا ہے:

• معروف اور شہرہ آفاق ناقدین کا خیال ہے کہ ناول کی تخلیق، ڈرامہ اور افسانہ کے مقابلے میں سہل ہے۔" ص ۱۱۱

پتہ نہیں یہ معروف اور شہرہ آفاق ناقدین کون ہیں، مقالہ نگار نے اس کی وضاحت نہیں کی ہے۔ ویسے عالمی پیمانے پر ای ایم فارسٹر، رالف فاکس، اور جارج لوکاچ سے لے کر چینوا ایشے (CHINUA ACHBE) تک اور اردو میں پریم چند، وقار عظیم، احسن فاروقی سے لے کر محمد حسن اور شہزاد منظر تک نے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ناول کو ایک پیچیدہ اور انتہائی ذمہ دارانہ فن اور اس بنا پر ناول کی تخلیق کو ایک مشکل کام قرار دیا ہے۔ واصف احمد کا یہ خیال صحیح ہے کہ حسرت تعمیر ایک ٹوپوگرافیکل ناول ہے جس میں اختر اورینوی نے چھوٹا ناگپور کے آدی باسیوں کی تہذیب و ثقافت کی کامیاب عکاسی کی ہے لیکن ان کا تحقیق کی FINDING کے طور پر یہ کہنا کہ حسرت تعمیر کو دور جدید کے منتخب ناولوں میں نمایاں حیثیت حاصل ہے حسرت تعمیر سے متعلق تحقیقی اعتبار سے ایک غلط JUDGEMENT کو سامنے لاتا ہے۔ سید واصف احمد کے الفاظ اس طرح ہیں:

• آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر) اُداس نسلیں (عبداللہ حسین) خدا کی بستی (شوکت صدیقی) تلاش بہاراں (جمیلہ ہاشمی) اردو کے قابل لحاظ اور قابل قدر ناول ہیں ان ہی موخر الذکر ناولوں میں اختر اورینوی صاحب کے ناول "حسرت تعمیر" کو ایک خاص اور نمایاں حیثیت حاصل ہے" ص ۲۲

ظاہر ہے کہ مقالہ نگار کا یہ دعویٰ غلط اور مضحکہ خیز ہے۔ آگ کا دریا، اداس نسلیں، خدا کی بستی اور تلاش بہاراں اُردو کے شاہکار ناول ہیں۔ اس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان ناولوں سے خصوصاً قرۃ العین حیدر کے آگ کا دریا جیسے بڑے ناول سے حسرت تعمیر کا موازنہ ایسا ہی ہے جیسے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کا موازنہ آفتاب سے کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر اردو ناول کا اتنا بڑا نام ہے اور ان کے ناول موضوع، ہیئت، تکنیک اور رویہ کے اعتبار سے اس قدر مختلف اور منفرد ہیں کہ کسی بھی دوسرے ناول نگار کے کسی بھی ناول سے ان کا موازنہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ویسے جہاں تک "حسرت تعمیر" کی قدر و قیمت کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ہیمت ناول ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر اورینوی میں ناول نگاری کی صلاحیت موجود تھی۔ اور اگر وہ توجہ دیتے تو اس ناول کو قابل ذکر ناول بنا سکتے تھے۔ اپنی علالت اور ان کے سینی ٹوریم کے تعلق سے آدی باسیوں کی تہذیب و ثقافت اور آزادی کے آس پاس کے مسلم دانشوروں، تعلیم یافتہ مسلم گھرانوں، خصوصاً روشن خیال مسلم خواتین کے نفسیاتی، جذباتی، سماجی اور معاشی مسائل کی پیش کش میں اگر اختر اورینوی زیادہ حقیقت پسندی سے کام لیتے اور واقعات اور کرداروں کو زیادہ فنی مہارت کے ساتھ پیش کرتے تو یہ ناول یقیناً ایک اہم ناول ہو سکتا تھا۔ ویسے ناول کا مرکزی کردار

چونکہ خود اختر اورینوی کا ہے اور بعض دیگر کردار مثلاً یونس محبوب، پروفیسر شاہد وغیرہ بھی اختر اورینوی کے فکری کردار ہی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس لئے یہ ناول سوانحی نوعیت کا بھی ہو سکتا تھا۔ ویسے اختر اورینوی نے چھوٹا ناگپور کے غیر آدی باسی سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھوں آدی باسیوں کے استحصال کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ آج اس علاقہ میں آدی باسیوں کی علیحدہ ریاست کے قیام اور غیر آدی باسیوں کے انخلا سے متعلق تحریک کے پیش نظر درست ثابت ہو رہے ہیں۔ سید واصف احمد نے اپنا مقالہ ۱۹۷۸ء میں مکمل کیا تھا، اس وقت تک آدی باسیوں کی جھارکھنڈ ریاست کی تحریک مضبوط اور مستحکم ہو چکی تھی۔ لیکن واصف احمد نے اس کا بھی کوئی ذکر اپنے مقالے میں نہیں کیا ہے۔ اسلئے مجموعی طور پر واصف احمد کے اس مقالے کو بھی تحقیقی اعتبار سے کمزور ہی کہا جائے گا۔

پٹنہ یونیورسٹی کے تمام مقالوں کے مقابلے میں محترمہ آصفہ واسع کا مقالہ "بہار میں اردو ناول نگاری" کئی جہتوں سے قابل قدر کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ مقالہ میں موضوع سے سیر حاصل بحث نہیں کی گئی ہے۔ لیکن بہار میں اردو ناول کی ابتداد ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے مشہور اور گمنام کم و بیش تمام ناول نگاروں کے ناولوں کا ذکر کیا ہے۔

محترمہ آصفہ واسع نے مقالہ کے شروع میں ہی یہ شکایت کی ہے کہ:

" اردو ناول کی تنقیدی تاریخوں اور جائزوں میں شاعروں کی طرح بہار کے ناول نگاروں کا ذکر بھی کم ہی ملتا ہے۔" ص۱۵

مقالہ نگار کی یہ شکایت بجا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ خود شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر اسلم آزاد نے بھی ناول کی صنفی حیثیت، اردو کے اہم ناول نگاروں کا فنی تجزیہ پیش کرتے ہوئے بہار کے ناول نگاروں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ویسے ایک بہار پر ہی کیا موقوف ہمارے محققین اور ناقدین نے بہار کے ساتھ ہی دیگر پسماندہ صوبوں مثلاً جموں وکشمیر، اڑیسہ سے ادیبوں اور شاعروں کو بھی ہمیشہ نظر انداز کیا ہے۔ لیکن اب یہ روش بہر حال بدل رہی ہے کیونکہ تاریخ کی ستم ظریفی کے سبب بہار اور جموں وکشمیر میں ہی اردو زبان و ادب کی حیثیت سب سے زیادہ مستحکم ہے اور مختلف اصناف میں انھیں علاقوں کے اہل قلم پیش پیش ہیں۔

آصفہ واسع نے اپنے مقالہ میں موضوع پر ہر پہلو سے روشنی ڈالنے کے لئے جو ابواب قائم کئے ہیں ان سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ بہار کی ناول نگاری کا تحقیقی جائزہ کن خطوط پر لینا چاہتی ہیں۔ مثلاً باب اول میں مقالہ نگار نے پہلے تو "بہار میں اردو ادب" کے عنوان سے اس صوبہ میں اردو زبان و ادب کے ارتقا کے سماجی و ثقافتی اسباب پر روشنی ڈالی ہے لیکن یہ مقالہ نگار کی اپنی تلاش و جستجو کا نتیجہ نہیں بلکہ انھوں نے اختر اورینوی کے مقالہ

" بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" سے خورشید جبیں کی ہے۔ باب دوم میں بھی " اردو ناول نگاری کا ارتقا"
کے عنوان سے پہلے تو دلّی اور لکھنؤ دبستانوں کے قدیم ناولوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے پھر دبستانِ عظیم آباد میں
ناول نگاری کی روایت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس ضمن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ شاد عظیم آبادی کے ناول ۱
بدعاوا اور صورت الخیال، ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'مراۃ العروس اور بنات النعش سے پہلے کے ناول ہیں۔
مقالہ نگار نے فرزند علی منیری کی داستان " راحت روح " کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ 'راحت روح کو شمالی ہند میں ناول
کے آغاز و ارتقا میں وہی مقام حاصل ہے جو سب رس کو جنوبی ہند میں۔ بہار کے ابتدائی ناولوں کے ذکر میں مقالہ نگار
نے رشیدۃ النسا کے ناول اصلاح النسا، صفیر بلگرامی کے ناول 'جوہر مقالات اور گلبن سوز دل، افضل الدین کے فسانہ
خورشیدی اور علی سجاد عظیم آبادی کے تین تویلی اور محل خانہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن مقالہ نگار نے تحقیق اور جستجو کے بعد
یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی ہے کہ اردو کا پہلا ناول کون ہے۔ اس کا تعلق شمالی ہند سے ہے یا جنوبی ہند سے مقالہ نگار
کو منشی کریم الدین کی تصنیف خط تقدیر کا ذکر ضرور کرنا چاہیے تھا جسے پروفیسر محمود الٰہی نے نذیر احمد سے قبل کا ناول
بلکہ پہلا ناول قرار دیا ہے۔ اسی طرح سب رس اور راحت روح کی مشترکہ خصوصیات کو بھی نمایاں کرنا ضروری تھا۔ دونوں
ہی تمثیلی قصے ہیں جن میں بجا طور پر داستانی عناصر بھی ہیں اور ان میں ناول کے خط و خال بھی مل جاتے ہیں۔

تیسرے حصے میں " دورِ جدید کے ناول نگار " کے عنوان سے پریم چند، سجاد ظہیر، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک
عصمت چغتائی، نسیم حجازی، شوکت صدیقی، جمیلہ ہاشمی، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر اور احسن فاروقی وغیرہ کے ناولوں
کا اختصار کے ساتھ جائزہ پیش کرتے ہوئے یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو میں مختلف النوع موضوعات و رجحانات
پر ناول دستیاب ہیں۔ اس کے بعد مقالہ نگار نے بہار کے کچھ ناول نگاروں اور ان کے ناولوں کو دورِ جدید کے انھیں
ناول نگاروں اور ان کے ناولوں کے سلسلے کی کڑیوں کے طور پر پیش کیا ہے۔ مثلاً جمیل مظہری کا ناول "شکست و فتح"۔
اختر اورینوی کا ناول " حسرت تعمیر " اور رس منظفر پوری، ضیا عظیم آبادی، ذکی انور کے ناولوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن
ظاہر ہے کہ بہار کے یہ سبھی ناول نگار چھوٹے درجے کے ناول نگار ہیں اور ان کے ناول یقیناً اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا شمار
پریم چند، عصمت چغتائی، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر جیسے ناول نگاروں کے ناولوں کے ساتھ کیا جائے۔ یہاں پر ایک اور
اہم پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہوں گا کہ پٹنہ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز بہار کی ادبی شخصیتوں اور ان کی تصنیفات
پر اپنی رائے دیتے ہوئے عموماً جذباتیت اور جانبداری کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے ان کے تحقیقی و تنقیدی مقالوں
میں دوسرے اور تیسرے درجے کے فن کاروں اور فن پاروں کو بھی عموماً اول درجہ کے فن کاروں پر ترجیح دینے کی روش

بھی ملتی ہے۔ اس روش کو ہم ممولے کو شہباز سے لڑانے کی روش کہینگے جس کے نتائج بہر حال منفی ہی برآمد ہوتے ہیں
آصفہ واسع نے بھی اپنے مقالے کے تیسرے باب میں ایسی ہی جذباتیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ باب چہارم میں مقالہ نگار
نے ناول کے فن اور اجزائے ترکیبی سے بحث کی ہے اور تحقیق یا تنقید کے نام پر اہم اور غیر اہم اقتباسات نقل کر دینے کے
سوا اور کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا ہے۔

باب پنجم اس مقالے کا بنیادی اور اہم ترین باب ہے جو ۱۸۷۶ء سے ۱۹۴۷ء تک بہار میں فن ناول نگاری کے
آغاز و ارتقا سے متعلق ہے۔ اس باب میں مقالہ نگار نے غدر ۱۸۵۷ء اور سر سید تحریک کے ہندوستانی معاشرے خصوصاً
مسلم معاشرے پر اثرات کا جائزہ تو لیا ہے لیکن عمومی انداز میں اگر مقالہ نگار نے ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور ۱۸۵۷ء کے غدر
کے دوران انگریزوں کا استحصال اور نو آبادیاتی پالیسیوں اور سازشوں کا اور ہندوستانی عوام کی کس مپرسی کا
اور ان سب کے نتیجے میں ہندوستانی عوام کی سماجی و ثقافتی زندگی کی صورت حال کا گہرائی سے تجزیہ کیا ہوتا تو اچھا ہوتا۔
۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہونے والے جدید کاری (شعر و ادب میں) کے عمل اور معاشرے میں نئے علوم و فنون کے دخول کے
ساتھ ہی نئی اصناف کے عروج اور نئی اقدار اور رجحانات کے ارتقا سے بھی بحث نہیں کی گئی ہے۔ اور اس طرح ۱۸۷۶ء سے
۱۹۴۷ء کے دوران بہار میں ناول نگاری کی رفتار میں دن بہ دن تیزی اور ان ناولوں میں زیادہ سے زیادہ حقیقت
نگاری کیوں کر آتی گئی، مقالہ نگار نے اس جانب توجہ نہیں دی ہے۔ مقالہ کے اس باب میں جن ناول نگاروں اور ناولوں
کا ذکر کیا ہے وہ اس طرح ہیں۔ شاد عظیم آبادی: "بدھاوا" "ولایتی کی آپ بیتی / صورت الخیال" ۱۸۷۶ء۔ محمد اعظم: "نقش طاؤس"
سید افضل الدین: "فسانۂ خورشیدی" (۱۸۸۶) "جوہر مقالات" (۱۸۸۶) "گلبن" "سوز دل"، "رشیدۃ النسا"، "اصلاح النسا" سید علی
سجاد عظیم آبادی: "نئی نویلی"، "محل خانہ"، عرش گیاوی "ثمرہ نافرمانی" بابو رام انوج سہائے: "جادوگرجوگی"۔ آل حسن معصومی
"کشتۂ انفعال معروف بہ عشرت کے آنسو" سید ظفیر الدین شمس گیاوی: "نشتر حیات المعروف بہ شاعر" —— جمیل مظہری:
"شکست و فتح"، اختر اورینوی "کاروان" اور "حسرت تعمیر"، اس کے علاوہ مقالہ نگار نے شائق احمد عثمانی کے چار ناولوں،
"چاند تارا"، "بڑی آپا"، "دوست کی بیوی" اور "بزم آرا" کا ذکر کیا ہے۔ محترمہ آصفہ واسع نے اپنے اس مقالے میں ان ناولوں
کے بارے میں محض ذاتی اور عمومی رائے کا ہی اظہار کیا ہے ناولوں کے موضوعات، کردار، واقعات، ماحول، زبان اور
محاورات کے سلسلے میں تلاش و جستجو اور غور و فکر سے کام نہیں لیا ہے۔ البتہ شاد کے ناول صورت الخیال سے متعلق محققوں کا
اپنی جانب سے جواب دینے کی کوشش ضرور کی ہے۔ محمد اعظم مصنف نقش طاؤس نے یہ الزام لگایا تھا کہ صورت الخیال ان
کا ناول تھا جسے وہ شاد کے پاس اصلاح کے لیے لے گیے تھے لیکن شاد نے اسے اپنے نام سے شائع کروا دیا۔ مقالہ نگار نے کمزور

دلائل سے اس الزام کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح رشیدۃ النسا کے ناول اصلاحُ النسا کی قدر و قیمت پہچاننے
میں بھی مقالہ نگار ناکام رہی ہیں۔ اصلاح النسا، مسلم معاشرہ میں خواتین کی اصلاح اور سماجی بیداری کے اعتبار سے
'مراۃ العروس' سے بڑا ناول ہے۔ ناول نگار نے اس میں جس پختہ سماجی شعور کا مظاہرہ کیا ہے وہ اپنے عہد کے اعتبار
سے باعثِ حیرت ہے۔ رشیدۃ النسا نے اپنے ناول میں انیسویں صدی کے وسط کے آس پاس بہار کے مسلم گھرانوں کے
رسوم و رواج تہذیب و تمدن کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے اور ناول کے کرداروں اور واقعات کی مدد سے توہم
پرستی کے خلاف جدوجہد اور تعلیم نسواں پر زور دیا ہے۔ دراصل اصلاحُ النسا پہلا ناول ہے جس نے عوام میں سماجی
بیداری پیدا کرنے میں محدود پیمانے پر ہی سہی اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی تصنیف ادبی سماجیات میں
رشیدۃ النسا کے ناول پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ محترمہ آصفہ واسع نے اپنے مقالے میں اصلاح النسا کی خوبیوں کو
خامیاں قرار دے کر نظر انداز کر دیا ہے۔ مقالہ میں بعض ٹھیٹھ بہاری الفاظ اور تراکیب کا بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ملواں بمعنی
ملی جلی وغیرہ۔ مقالے میں اختتامیہ کمزور ہے اور کتابیات غیر تشفی بخش ہے۔ ہر چند کہ محترمہ آصفہ واسع نے اپنا یہ مقالہ اختر اورینوی
کی نگرانی میں ۱۹۷۸ء میں مکمل کیا لیکن غالباً یہ زمانہ اختر اورینوی صاحب کی علالت کا ہے اس لیے ممکن ہے موصوف زیادہ
وقت نہ دے سکے ہوں پھر بھی بہار میں اردو ناول نگاری کے موضوع پر لکھا گیا آصفہ واسع کا تحقیقی مقالہ بڑا غنیمت
ہے۔ ورنہ بحیثیت مجموعی پٹنہ یونیورسٹی میں ناول سے متعلق تحقیقی مقالے سطحی درجے کے ہیں۔ اور یقیناً دوسری اصناف
اور موضوعات سے متعلق تحقیق کا معیار بھی اس سے مختلف نہیں۔

دیکھا جائے تو صرف پٹنہ یونیورسٹی میں ہی نہیں ان تمام یونیورسٹیوں میں جہاں صاحبِ نظر اساتذہ کی کمی ہے تحقیق کا معیار اسی طرح سطحی اور
غیر معیاری ہوتا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں یہ نقطۂ نظر بھی ہے کہ ادب میں تحقیق کی نوعیت سائنس اور سوشل سائنس میں تحقیق کی نوعیت سے قدرے مختلف
ہوتی ہے شعر و ادب، سائنس اور سوشل سائنس کی طرح ٹھوس اور جامد نہیں، سیّال اور متحرک شئے ہے۔ اور شعر و ادب میں
حقائق اور کیفیات کا اظہار دو اور دو چار کی طرح ہی نہیں دو اور دو پانچ کی طرح بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے ادب
میں تحقیق کے نتائج اخذ کرنے میں بڑی بیدار مغزی کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ ادب میں تحقیق کے نتائج (JUDGEMENT)
کا اظہار بہر حال دو اور دو چار ہی کی طرح ہوگا۔ تحقیق کے جدید اصولوں کے مطابق، سنہ پیدائش، سنہ تصنیف، جائے
سکونت، مقام اشاعت، اصل نام اور قلمی نام، خاندان اور وراثت، سفر اور ملازمت جیسے معلومات فراہم کرنے کا نام
تحقیق نہیں ہے۔ ادب میں تحقیق سے مراد، ادب پارے میں موجود لیکن خفتہ ادبی پہلوؤں اور تخلیقی امکانات کی نفسیاتی،
تاثراتی، سماجی تناظر میں بازیافت ہے۔ ہر عمدہ تخلیق میں اپنے عہد کا دل ضرور دھڑکتا ہے۔ اور چونکہ ہر بڑی تخلیق کسی

نہ کسی اعتبار سے انسان کی تہذیب نفس کا ہی فریضہ انجام دیتی ہے لہٰذا ہر بڑی تخلیق میں جہاں ماضی کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں وہیں مستقبل کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اور تحقیق چونکہ کسی تخلیق یا تخلیقات کی میکانزم کو اس کی شرح و بسط میں بے نقاب کرنے کا بھی نام ہے اس لئے تحقیقی مقالے میں تخلیق یا تخلیقات کے بارے میں محض اس کے زمانہ تحریر ہی نہیں اس کے ماضی اور مستقبل کے حوالے سے بھی نئے تخلیقی اور تعمیری پہلوؤں کو اجاگر کرنا ضروری ہے۔

دوسری بات یہ کہ ادب میں شعری اور نثری موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھنے کے لیے بھی الگ الگ رویئے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ شاعری اور نثر میں موضوعات تخلیقی رویوں اور زبان کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے شاعری میں روشنی کی جلتی بجھتی کرن ہوتی ہے جس کی وجہ سے دم اظہار شعری صداقتیں (POETIC REALITIES) اور داخلی کیفیات جتنی واضح ہوتی ہیں اس سے کہیں زیادہ پوشیدہ رہ جاتی ہیں جبکہ نثر میں روشنی کا سیلاب ہوتا ہے جس کی وجہ سے خارجی حقائق، تجربات، اشیا اور مظاہر اور داخلی کیفیات پورے آب وتاب سے ایک ایک نوک پلک کے ساتھ واضح ہوکر سامنے آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری میں جہاں اجمال اور ایمائیت ہوتی ہے اور ابہام اس کا حسن قرار پاتا ہے وہیں نثر میں وضاحت ہوتی ہے اور تفصیل و تشریح اس کی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ "شاعری اور نثر کے اس فرق کے پیش نظر شاعری کی تحقیق کے لئے فنی لوازم خصوصاً صرف و صوت، عروض و آہنگ، تشبیہات و استعارات، علائم و تلمیحات اور زبان کے تخلیقی استعمال کی اہمیت اور شاعری کی روایات تجربات اور امکانات کا علم بنیادی ضرورت ہے ہاں اپنے سماجی و سیاسی ثقافتی و معاشی نشیب و فراز کی خاطر خواہ معلومات بھی ازبس ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی تحقیق کے اصول اور طریقہ کار اور تنقیدی بصیرت سے کام لے کر کسی شعری موضوع کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح نثر اور خصوصاً ناول کی تحقیق کے لیے ناول کے تخلیقی عمل اور صنفی اعتبار سے ناول کے (STRUCTURE) اور میکانزم کے پیش نظر، تحقیق کے مروجہ اصول اور طریقہ کار کے ساتھ ہی بعض مخصوص اصول اور طریقہ کار بھی وضع کرنے ہونگے۔

ناول کی تخلیق ایک مشکل اور پیچیدہ عمل ہے۔ اور جب تک ناول نگار اپنے معاشرے کے سماجی و ثقافتی، تہذیبی و اخلاقی رویوں کے ساتھ گہری وابستگی (INVOLVEMENT) نہ رکھتا ہو بڑے ناول کی تخلیق کرہی نہیں سکتا۔ اسی لئے کسی بھی سماج کی، اس کی تمام تر تہذیبی و ثقافتی، معاشی و سیاسی کروٹوں کے ساتھ بازیافت کا ایک معتبر اور قابل احترام وسیلہ ناول بھی ہوتا ہے۔ ناول میں چونکہ محض ٹھوس سماجی حقائق اور مسائل ہی نہیں اس سماج کے خواب اور تخیل، خواہشات اور خدشات بھی تمام تر تاریخی و نفسیاتی تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی و معاشی عروج و زوال کے ساتھ ابھر کر سامنے آتے ہیں اس لیے ناول کے موضوع پر تحقیق کے لئے یہ ضروری ہے کہ ناول کے فنی تقاضوں کے ساتھ ہی

مقالہ نگار کو ناول کے زمانہ تحریر کے تعلق سے اس مخصوص دور میں، ناول میں مذکورہ مخصوص خطہ زمین قوم یا طبقہ سے متعلق مختلف النوع فکری، نفسیاتی تہذیبی اور اخلاقی رویوں اور عروج و زوال کی بھی آگاہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی تہذیب کی روح کو گہرائیوں میں اترے بغیر "آگ کا دریا" (قرۃ العین حیدر) پر تحقیقی مقالہ نہیں لکھا جا سکتا۔ یو پی کے متوسط مسلم گھرانوں کی اجتماعی نفسیات اور خصوصاً مسلم خواتین کی سماجی و تہذیبی حیثیت کو سمجھے بغیر عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" پر تحقیق کرنا ٹیڑھی کھیر ہی ثابت ہوگا۔ اسی طرح تلنگانہ تحریک کی واقفیت کے بغیر جیلانی بانو کے "ایوان غزل" کو اور بنگال کی سیاسی تحریک، اور مختلف طبقوں میں انفرادی، خاندانی وقار برقرار رکھنے کے لیے جاری مصالحت پسندانہ رویوں کو سمجھے بغیر "آخر شب کے ہم سفر" کا تحقیقی مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔ "حسرت تعمیر" کو سمجھنے کے لیے آدی باسی تحریک اور اس کے معاشی اسباب کو سمجھنا ضروری ہے۔ اور لنکا کے نسلی مسائل ETHNIC PROBLEM کو سمجھے بغیر قرۃ العین حیدر کے "سیتا ہرن" پر تحقیق نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ناول کی تحقیق اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ریسرچ اسکالر اور ان کے نگراں بھی ناول نگار ہی کی طرح اپنے سماج کی تہذیبی و ثقافتی معاشی و سیاسی کروٹوں اور فکری و اخلاقی رویوں سے اپنے آپ کو پوری سنجیدگی کے ساتھ وابستہ نہیں کریں گے۔

●●

ڈاکٹر واصف احمد
شعبۂ اردو
کے. ایس ایس کالج
لکھی سرائے. مونگیر

جواب

ہر صنف ادب کا تخلیقی عمل اپنی ادبی، فنی اور ہیئتی اعتبار سے اہم اور ذمہ دارانہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ ناول کی تخلیق پیچیدہ، ذمہ دارانہ اور مشکل امر ہے۔ اسی طرح افسانہ کی تخلیق بھی ایک نہایت ذمہ دارانہ اور مشکل ادبی فن ہے میرا تو خیال ہے کہ افسانہ کا فن ایک مشکل ترین ادبی فن ہے۔ افسانہ کے تخلیقی عمل میں وحدت کا حصول ہی وہ دشوار ترین شرط ہے جس کے باعث بعض قابل لحاظ ناقدین کی رائے ہے کہ مختصر افسانہ کا فن ناول سے کہیں زیادہ مشکل الحصول ہے۔ مختصر افسانہ کا علمبردار ــــــــــــ بھی اسی رائے سے اتفاق رکھتا ہے۔ ایک اعلیٰ مقصد کا افسانہ کے تنگ اور کوتاہ میدان میں عالمانہ اور کامیاب اظہار ناول کے وسیع ترین میدان کے مقابلے میں مشکل ضرور ہے۔

حسرت تعمیر، موضوع و مقصد قدر و قیمت اور فن و معیار کے اعتبار سے ایک قابل قدر اور منتخب ناول ہے۔ آدی باسی بہار کے چھوٹا ناگپور علاقے کا ایک نہایت پست ماندہ طبقہ ہے جس کی تہذیب، ثقافت اور تلخ ترین مسائل حیات کو اپنے ناول "حسرت تعمیر" میں پہلی بار نہایت فنکارانہ اور عالمانہ انداز میں اختصار و جامعیت کے ساتھ تخلیق کار نے قلمبند کیا ہے ایک غنیمت اور ثانوی ناول کا درجہ دینے کا قول فیصل صادر کرنا اظہر من الشمس جیسی حقیقت سے چشم پوشی کرنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر قدوس جاوید نے تہذیبی، سماجی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی مسائل کی بنیاد پر ناول کے صحیح اقدار و معیار اور اوصاف و مقاصد کے احتساب و اکتساب کی گرانباری سے احتراز کیا ہے۔ آگ کا دریا، اداس نسلیں، خدا کی بستی، تلاش بہاراں، حسرت تعمیر نے موضوع و مقاصد اوصاف و اقدار، واقعات و پس منظر کے اعتبار سے اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن ان کے تبصرہ سے جانبداری اور جذبہ و مروت کی غمازی ہوتی ہے جو ایک ثقہ تبصرہ نگار کا صحیح منصب قطعی نہیں ہے۔

حسرت تعمیر" کے متعلق میری رائے اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی۔ تفصیلی بحث کا موقع ہوتا اور وقت کی نزاکت اجازت دیتی تو "بقدر ہمت اوست" قدوس جاوید کے تبصرہ پر انگریزی ادب کے ناقدین ایلڈر السن آر. اس. کرین، رچرڈ میکون، برنارڈ برگ اور ڈبلو آر کیسٹ کی مانند انتقادی نگاہ ضرور ڈالتا۔ اس وقت تو بس میں نیاز فتحپوری کی رائے سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے اکتفا کرتا ہوں۔

" اس کو (یعنی نقاد یا تبصرہ نگار) صرف اپنی رائے پر اعتماد کرنا چاہئے اور سمجھ لینا چاہئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے" (انتقادیات جلد اول صفحہ ۲۲۹ : نیاز فتحپوری)

●●

ڈاکٹر (مسز) آصفہ واسع
یونیورسٹی پروفیسر و صدر شعبۂ اردو
سندر وتی مہیلا کالج، بھاگلپور

جواب

ڈاکٹر قدوس جاوید صاحب کی میں شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے مقالہ "پٹنہ یونیورسٹی میں ناول کی تحقیق" میں میرے تحقیقی مقالہ "بہار میں اردو ناول نگاری ۱۹۴۷ء تک" کو قابل سمجھا اور کہا کہ:

"پٹنہ یونیورسٹی کے تمام مقالوں کے مقابلے میں محترمہ آصفہ واسع کا مقالہ "بہار میں اردو ناول نگاری" کئی جہتوں سے قابل قدر کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ مقالہ میں موضوع سے سیر حاصل بحث نہیں کی گئی ہے لیکن بہار میں اردو ناول کی ابتدا و ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے مشہور اور گمنام کم و بیش تمام ناول نگاروں کے ناولوں کا ذکر کیا ہے۔"

مجھے یہاں سب سے پہلے یہ واضح کرنا ہے کہ میں نے اپنا تحقیقی مقالہ ۱۹۷۸ء میں نہیں (جیسا کہ قدوس صاحب نے لکھا ہے) بلکہ ۱۹۶۵ء میں پی۔ ایچ ڈی۔ کے لیے پٹنہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب کی زیر نگرانی داخل کیا تھا، جو سرورق پر درج ہے۔ معلوم نہیں انھیں یہ غلط فہمی کیوں اور کس طرح ہوئی۔ میرے تحقیقی مقالہ کا ذکر ڈاکٹر وہاب اشرفی صاحب نے اپنی کتاب "شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری" میں کیا ہے، جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ انھوں نے میرے مقالے کا حوالہ بھی پیش کیا ہے۔ شاید قدوس صاحب نے میرا مقالہ محض سرسری طور پر دیکھا ہے۔ میرے مقالے کا موضوع بہار میں اردو ناول ۱۹۴۷ء تک نہیں (ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے) بلکہ "بہار میں اردو ناول نگاری ۱۹۴۷ء تک" ہے۔

قدوس صاحب نے میرے مقالہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ:

"... دعویٰ کیا گیا ہے کہ شاد کے ناول "بدھا وا" اور "صورۃ الخیال"، نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" اور "بناۃ النعش" سے پہلے کے ناول ہیں ... تحقیق اور جستجو کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی ہے کہ اردو کا پہلا ناول کون ہے۔"

اردو کا پہلا ناول اور ناول نگار کون ہے، اس کا تذکرہ مقالہ میں کئی جگہ درج ہے۔ سب سے پہلے صفحہ ۲۹ پر یہ بیان ہے (صفحات کے شمار میں فرق ہو سکتا ہے۔ یہی نسخے کتابت شدہ ہیں۔):

"اب تک کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اردو میں سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد نے ناول لکھے۔"

صفحہ ۳۳: "نذیر احمد اردو ادب کے پہلے ناول نگار کہلانے کے مستحق ہیں۔"

صفحہ ۱۳۹: "شاد عظیم آبادی کا ناول "صورۃ الخیال" ۱۸۷۶ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" اس سے قبل منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ اس لیے ہم "مراۃ العروس" کو اردو کا پہلا ناول اور نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کرتے ہیں۔"

میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ شاد عظیم آبادی کے ناول "بدھاوا" اور "صورۃ الخیال" نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" سے قبل لکھے گئے ہیں۔ صفحہ ۱۴۵ پر میرا یہ بیان ہے:

"نقی احمد ارشاد (شاد عظیم آبادی کے پوتے) نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "صورۃ الخیال" اردو زبان کا پہلا ناول ہے، کیونکہ بہت سے ناقدین نے "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" کو ناول تسلیم نہیں کیا ہے۔ لیکن یہاں اب یہ بحث بیکار ہے کیونکہ اردو کے پہلے ناول نگار اور ناول کا تعین ہو چکا ہے۔ ہاں شاد کے "بدھاوا" اور "پیر علی" کو دیکھنے کے بعد شاید اس فیصلے پر ہمیں نظرِ ثانی کی ضرورت ہو سکتی ہے، لیکن ابتک وہ دونوں ناول شائع نہیں ہو سکے ہیں اور نہ یہ پتہ چل سکا ہے کہ یہ دونوں کس قسم کی کتابیں ہیں۔"

مولوی کریم الدین کی تصنیف "خط تقدیر" کا حاشیہ میں ذکر کر کے میں نے تحقیق کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا، کیونکہ میرے خیال میں "خط تقدیر" ناول نہیں تمثیلی کتاب ہے اور یہ ابتک بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی اپنی کتاب "ادب کا تنقیدی مطالعہ" میں لکھتے ہیں:

"یہ سب رس کے طرز کی ایک تمثیلی کتاب ہے۔ اس میں بہت سے مجرد خیالات کو متشکل کر دیا گیا ہے۔ مثلاً تقدیر کو ملکہ تصور کیا گیا ہے... غرض کہ خط تقدیر ایک تمثیلیہ ہے... ہم اس پر ناول کا اطلاق ہرگز نہیں کر سکتے ہیں۔"

قدوس صاحب کا اعتراض ہے کہ میں رشیدۃ النساء کے ناول "اصلاح النساء" کی قدر و قیمت پہچاننے میں ناکام رہی ہوں... خوبیوں کو خامیاں قرار دیکر نظرانداز کر دیا ہے۔

میں نے قریباً چالیس صفحات میں "اصلاح النساء" کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کی ادبی سماجیات بہت بعد کی تصنیف ہے۔ اس کے اصلاحی اور مقصدی پہلو کی اہمیت میرے مقالہ میں بار بار بیان کی گئی ہے۔ لیکن ناول ایک صنفِ ادب ہے اور اس کی کچھ صنفی خصوصیات ہیں۔ میں نے تمام ناولوں کو فن کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ کردار نگاری، واقعہ طرازی، فضابندی، پلاٹ اور اسلوب کے اعتبار سے ان کا مقام متعین کیا ہے۔ اصلاحی نقطۂ نظر سے "اصلاح النساء" ضرور بڑا ناول ہے، لیکن اس میں فنی خامیاں پائی جاتی ہیں جن کا ذکر لازمی تھا۔ پلاٹ

کے سلسلے میں میرا یہ خیال ہے:

"اصلاح النساء کا پلاٹ جدید ناولوں کی طرح گٹھا ہوا نہیں لیکن "صورۃ الخیال" کی طرح میکانکی بھی نہیں۔ اسکا قصہ تدریجی طور پر آگے بڑھتا جاتا ہے ... اس طرح طوالت میں ہمیں اپنے سماج کا نقشہ ملتا ہے۔ "اصلاح النساء" کی خامیوں کو تسلیم کرتے ہوئے بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔"

رشیدۃ النساء کے فنی کردار نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے میں نے لکھا ہے:

"مصنفہ نے اپنے دور کے معیار کے لحاظ سے اچھی خاصی کردار نگاری کی ہے ... زمانہ اور عہد کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم ان کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ عام طور سے ان کی کردار نگاری پر نذیر احمد کا اثر ہے۔"

قدوس صاحب نے "اصلاح النساء" کو "مراۃ العروس" سے بڑا ناول قرار دیا ہے۔ میں نے اپنے مقالہ میں "اصلاح النساء" کی خصوصیتوں کا ذکر یوں کیا ہے:

"اس میں شروع سے آخر تک اصلاحی اور مقصدی رنگ غالب ہے۔ واقعہ نگاری کا وہ حسن نہیں ملتا جو دورِ جدید کے ناولوں میں پایا جاتا ہے۔ مصنفہ نے کہیں بھی اسے ناول کا نام نہیں دیا ہے۔ ہر جگہ قصہ کہتی ہیں۔ لیکن جن بنیادوں پر "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" کو ناول تسلیم کرتے ہیں انہیں اسباب کے تحت ہم اسے بھی ناول ماننے میں حق بجانب ہیں۔ بلکہ "اصلاح النساء" میں "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" کی بہ نسبت ناولیت زیادہ ہے ... قصہ مختصر ہے جسے پھیلا کر پیش کیا گیا ہے۔ مصنفہ کا مقصد ان رسموں اور جھگڑوں کو دکھانا تھا جو روزانہ ہندوستانی سماج میں ہوتے رہتے ہیں ... واقعات کے انتخاب میں منطقیت سے کام لیا ہے۔ کیونکہ جن رسموں کی برائیوں کو وہ دکھانا چاہتی تھیں ان کے لیے شادی، ولادت اور موت سے بڑھ کر موزوں مواقعے نہیں مل سکتے تھے۔"

"اصلاح النساء" معاشرتی اصلاح کے لیے لکھا گیا تھا۔ فنی خوبیوں کی طرف توجہ دینے کا سوال ہی نہ تھا لیکن ادب کی دنیا میں مقام متعین کرتے وقت فن کا خیال ضروری ہے۔ میں نے مصنفہ کی خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مقامی جانبداری اور جذباتیت سے کام نہیں لیا ہے۔ ہاں! میرا یہ خیال ضرور ہے کہ "بہار میں بہتیرے ایسے فنکار گزرے ہیں جنکا اثر دور دور کے فنکاروں پر کافی دنوں تک پڑتا رہا ہے۔" چنانچہ "روشنک بیگم ایک سرقہ" کے عنوان سے اپنے مقالہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ ناول "روشنک بیگم" مصنفہ مسز ا۔ ظ۔ حسن بہار کے دو ناولوں "فسانہ خورشیدی" اور

"اصلاح النساء" کا آمیزہ ہے۔ دونوں کتابوں سے مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔

دور جدید کی ناول نگاری کا جائزہ قریباً بیس صفحات پر مشتمل ہے اور صرف ایک صفحہ میں بہار کے ناول نگاروں کا تذکرہ اس طرح پیش کیا گیا ہے:

عصر جدید میں بھی یہاں کئی اردو ناول لکھے گئے۔ مثلاً جمیل مظہری کا ناولٹ "شکست و فتح" رومانی ناول نگاری کی تحریک کا نمائندہ ہے۔ ہر چند کہ اس میں رومانیت کے ساتھ فکری اور فلسفیانہ نکات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ عشق اور فرض کی کشمکش کو نہایت دل کش انداز بیان کے ساتھ پلاٹ میں ابھارا گیا ہے۔ تکنیک کی مختلف جہتوں کے اعتبار سے یہ ناولٹ بہت ہی اونچے مقام کا نہ ہو لیکن اسلوب بیان، خیال انگیزی اور معنویت کی حیثیت سے اردو ادب میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

"اختر اورینوی نے "حسرت تعمیر" پیش کیا ہے۔ یہ چھوٹا ناگپور کی زندگی، اس کے مسائل، آویزشوں اور تصادم کے پس منظر میں ابھرتا ہے۔ ناول میں حقیقت پسندانہ میلان غالب ہے، لیکن فضا آفرینی اور کردار نگاری میں رومانیت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔"

"جمیل مظہری اور اختر اورینوی کے ساتھ کچھ اور فنکاروں نے بھی عصر جدید کی ناول نگاری کی ترقی میں حصہ لیا ہے، جن میں شکیل مظفر پوری، ضیا عظیم آبادی، ذکی انور، ظفر الدین شمس وغیرہ کے نام خاص ہیں۔ ان ناول نگاروں کا عام میلان واقعیت کی طرف ہے لیکن بعض ناولوں میں سنسنی خیزی اور جذباتی رومانیت کا سایہ بھی ملتا ہے۔"

قدوس صاحب کا اعتراض ہے کہ میں نے دور جدید کی ناول نگاری کے جائزہ میں پریم چند، عصمت چغتائی، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے ساتھ بہار کے چھوٹے ناول نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے بڑی شخصیتوں کے ساتھ بہار کے معمولی فنکاروں کے نام گنائے ہیں۔ لیکن چونکہ میرا موضوع بہار کی ناول نگاری ہے اس لیے بہار کے سبھی ناول نگاروں کا تذکرہ لازمی تھا لیکن میں نے بہار کے فنکاروں کو اردو ناول کی عظیم شخصیتوں کے مدمقابل کھڑا نہیں کیا ہے۔ تحقیق کی راہ میں موتی اور کنکر دونوں ملتے ہیں میں نے کنکر کو موتی بنا کر پیش نہیں کیا ہے۔ نہ میں نے کسی قسم کی جانبداری سے کام لیا ہے۔

باب پنجم میں سرسید تحریک کے ساتھ اور کئی تحریکوں کا جائزہ اس مقصد سے لیا گیا ہے کہ اردو ناول پر اس کے اثرات واضح ہو سکیں۔ اردو ناول کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا اس لیے ۱۸۵۷ء کی جنگ پلاسی اور اٹھارہویں صدی میں انگریزوں کے ظلم اور ہندوستانی عوام کی کس مپرسی کا تفصیلی جائزہ بے معنی تھا۔ گرچہ میں نے اس باب کی ابتدا اس طرح کی ہے:

"ہم اس دور کا ایک مختصر خاکہ پیش کریں جس میں اردو ناول نے جنم لیا ... اردو ناول کی پیدائش انیسویں

صدی کے نصف آخر میں ہوئی جبکہ انگریزی حکومت اپنے قدم جما چکی تھی۔ انگریزی تہذیب و تمدن کا اثر اٹھارہویں صدی کے نصف آخر سے ہی ہونے لگا تھا۔ جنگ پلاسی کے بعد انگریزی تہذیب و تمدن ہندوستانیوں پر چھاتے جا رہے تھے۔ تدریجی طور پر یہ اثر و نفوذ شدید ہوتا گیا۔۔۔ اسلامی تہذیب و تمدن ساکت و جامد ہوتے جا رہے تھے۔ زندگی کی حرارتیں ختم ہو رہی تھیں۔ عوام پسپا اور بدحال تھے۔"

قدوس صاحب کی رائے ہے کہ میں نے بہار کے ناولوں پر ذاتی اور عمومی رائے پیش کی ہے۔ دراصل جس زمانے میں یہ تحقیقی مقالہ داخل کیا گیا تھا اس وقت بہار کے ناولوں کی طرف ناقدوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب چاہتے تھے کہ بہار کے ادب پر مختلف پہلوؤں سے تحقیق کا کام کیا جائے اور بہار کی ایک مکمل ادبی تاریخ مرتب ہو۔ خود انھوں نے بہار کی زبان پر کام کیا مجھے ناول کا موضوع دیا۔ سید مظفر اقبال نے "بہار کی نثر نگاری ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک" پر تحقیقی مقالہ ان کی نگرانی میں پیش کیا جس میں میرے مقالہ کا ذکر ہے۔ اختر صاحب اس وقت بالکل صحت مند تھے اور ان کا انتقال ۱۹۷۸ء سے قبل ہو چکا تھا۔

جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا میں نے مقامی کتب خانوں سے فائدہ حاصل کیا۔ رام پور، اور کلکتہ کی نیشنل لائبریری سے بھی مدد لی۔ شائق احمد عثمانی، لیڈی انیس امام، ظفیرالدین شمس گیاوی، بلخی صاحب وغیرہ سے رابطہ قائم کیا اور جو کچھ دستیاب ہو سکا مقالے میں شامل کیا۔ جو کتابیں مقالے کی تیاری میں زیر مطالعہ آئیں ان کی فہرست پیش کی۔ خواہ مخواہ "کتابیات" کو زیادہ طول دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی کتاب اس زمانے میں شائع ہوئی ہو اور جس کا تعلق میرے تحقیقی موضوع سے ہو لیکن میری نظر سے نہ گزر سکی۔

میں نے ۱۹۵۹ء میں ایم۔اے۔ کیا تھا اور اس کے بعد ہی تحقیق کا کام شروع کیا۔ اس وقت تحقیق کا کام آج کی طرح عام نہیں ہوا تھا۔ کافی محنت، جرأت اور جاں سوزی کی ضرورت تھی۔ باب پنجم کے قبل جو ابواب ہیں وہ تمہیدی ہیں اس لیے ان کی طرف زیادہ توجہ دینا ضروری نہ تھا۔ میرا مقصد ان ناولوں کو منظر عام پر لانا تھا جنھیں اردو دنیا نہیں جانتی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جو ناول لکھے گئے ان کا صرف تذکرہ کیا گیا ہے۔

اپنے نگراں ڈاکٹر اختر اورینوی کی کتاب "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" سے استفادہ ضرور کیا ہے اور اس کے حوالے بھی پیش کیے گئے ہیں تاکہ مجھ پر سرقہ کا الزام عائد نہ ہو سکے۔ میرے ممتحنین پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر رشید احمد صدیقی تھے۔ تحقیق کی دنیا میں قدامت کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اگر قدوس صاحب میرے مقالہ کو ۱۹۶۵ء کی روشنی میں دیکھتے اور اسے ۱۹۷۸ء کا نہ سمجھتے تو انھیں یہ غلط فہمیاں نہ ہوتیں۔

ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی
شعبۂ اردو
بہار یونیورسٹی مظفر پور

ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی کا تھیسس

ایک تنقیدی مطالعہ

تحقیق نگاری ایک ایسا ذمہ دارانہ علمی شغل ہے جس کے وسیلے سے ماضی کے گم شدہ سرمائے کی بازیافت ہوتی ہے اس کی قدر وقیمت کی دریافت بھی ہوتی ہے اور ادبی روایات کے ارتقائی تسلسل کی تکمیل بھی۔ پھر یہ بھی ہے کہ تحقیقی مقالوں کے ذریعہ معاصر ادبی تخلیقات کی تفہیم وتقویم کر کے انھیں گوشۂ گمنامی میں جانے سے بچالیا جاتا ہے اسی لیے تحقیق کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ قیاسات اور تصورات کی جگہ استناد و استدلال کے شعور سے اس طرح کام لیا جائے کہ زیر تحقیق موضوع کی صحیح تفصیلات خوبیاں اور خامیاں سب سامنے آجائیں۔ محقق کی متجسسانہ قوت کو اس کی ناقدانہ بصیرت ہی سنبھالتی ہے اور راہ دکھلاتی ہے۔ اس کی کمی تحقیق کو مندرجات، اشارات اور حوالہ جات کا پلندہ بنا دیتی ہے جس کی وجہ سے قاری کے لیے استفادے کی راہیں محدود بلکہ مسدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ موجودہ تحقیق ان دونوں عناصر سے کام لے رہی ہے مگر کبھی کبھی سہولت پسندی اور عجلت پسندی کا اظہار بھی ہوتا رہا ہے، اس کا ایک واضح سبب ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ تحقیق نگاری کو کل وقتی طور پر خالصتاً ایک علمی شغل بنانے والے حضرات اب برصغیر میں دو چار ہی ملینگے۔ تحقیق، یونیورسٹیوں کی اعلیٰ تعلیم کے شعبے کی ایک اہم علمی مصروفیت قرار دی گئی ہے۔ اور ہر شعبۂ علم میں تحقیق کی پیش رفت جاری ہے اس کی وجہ سے ملازمتوں کے حصول میں کچھ مراعات بھی مل جاتی ہیں چنانچہ اردو زبان وادب کے سلسلہ میں بھی موجودہ طرز تحقیق اور انداز تنقید کو اس صورت حال نے تقویت پہونچائی ہے اسی کی وجہ سے تحقیق وتنقید کا میلان چند افراد یا شخصیات کے دائرے سے نکل کر وسیع تر حلقے میں آگیا ہے۔ ہندوستان کی ایک سو چالیس یونیورسٹیوں میں بیشتر یونیورسٹیاں ایسی ہیں جہاں اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں موجود ہیں اور تحقیقی مقالے قلمبند کئے جا رہے ہیں۔ گذشتہ پندرہ برسوں کے دوران ملک کی بیشتر ریاستوں میں اردو اکیڈمیوں کی تشکیل عمل میں آچکی ہے ان اکیڈمیوں کے مالی تعاون سے تحقیقی مقالوں کی طباعت بھی آسانی سے ہو جاتی ہے، چونکہ یونیورسٹیوں میں تحقیق کے موضوع کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ایک میعاد مقرر ہوتی ہے اور اس میعاد کو ملحوظ رکھنے میں مقالہ نگار کے فائدے مضمر ہیں۔ اس لیے کبھی کبھی بے احتیاطی اور غیر ذمہ دارانہ عجلت پسندی کی مثالیں بھی سامنے آجاتی ہیں یہ تحقیق کے تقاضے پوری طرح ادا نہیں کرتیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ مقررہ میعاد کو تحقیقی سرگرمیوں میں اتنے شوق وشغف اور انہماک کے ساتھ صرف کیا جائے کہ زیر تحقیق موضوع

کے تمام پہلو مستند انداز میں نمایاں ہو جائیں۔

تحقیقی مقالوں کے تین موضوعاتی دائرے ہیں۔ صنف، شخصیت اور تحریک و میلان۔ کسی ادبی صنف کے آغاز و ارتقا کا کوئی پہلو ہو یا کسی ادبی شخصیت اور اس کی تخلیقات کا موضوع ہو یا کسی تحریک یا میلان سے متعلق کوئی مسئلہ ہو تحقیق نگار اپنے موضوعِ منتخب کے تمام پہلوؤں کو مقررہ معیار و مدت کے اندر مکمل کرنے کی کاوش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی یہ کاوش تخیل و تصور اور قیاس و گمان کے تابع نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے انکشافات اور مطالعاتی نتائج کو تاریخی اور ادبی صداقتوں کے تابع رکھتا ہے۔ اور انھیں دلائل و اسناد سے اس طرح راسخ کرتا ہے کہ تکرارِ بیاں، تضادِ بیان اور طوالتِ بیان کے نقائص پیدا نہ ہوں۔ میں نے اپنے تفصیلی مطالعہ کے لیے یونیورسٹیوں کے تحت لکھے جانے والے تحقیقی اور تنقیدی مقالوں میں سے مقالہ بہ عنوان "ریختی کا تنقیدی مطالعہ" کو پیش نظر رکھا ہے۔ مقالہ نگار ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی ہیں جنھیں ۱۹۶۶ء میں وکرم یونیورسٹی نے پی ایچ۔ڈی کی سند سے نوازا ہے۔ ۱/۱۶ سائز کے چھ سو چھیانوے (۶۹۶) صفحات کا یہ مقالہ ۱۹۷۴ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ ناشر نسیم بکڈپو لکھنؤ ہے، مقالہ بارہ ابواب میں منقسم ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

"پہلا باب ــــ عنوانات، سیاسی و سماجی پس منظر (۱/۲ ۳ص)، نواب سعادت علی خاں برہان الملک (۱/۲ ۱ص)، مرزا مقیم الوالمنصور خاں صفدر جنگ (۱ص)، شجاع الدولہ (۱/۲ ۵ص)، نواب آصف الدولہ (۱/۲ ۲ص)، نواب سعادت علی خاں (۱/۲ ۴ص)، غازی الدین حیدر (۷ص)، نصیر الدین حیدر (۱۰ص)، محمد علی شاہ (۱/۲ ۱ص)، امجد علی شاہ (۲ص)، واجد علی شاہ (۲۰ص)۔

دوسرا باب ــــ لکھنؤ میں اردو شاعری (۲۲ص)،

تیسرا باب ــــ ریختی بحیثیت صنف سخن (۸ص)، ریختی کی انفرادیت (۳ص)، عورت کی ترجمانی (۱ص)، ریختی کا سماجی شعور (۱/۲ ص)، ریختی کی ہمہ گیری (۱ص)، عورت کے جذبات کی ترجمانی (۲ص)، بیاں کی سادگی (۱ص)، عورت کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار (۲ص)، عورت کی زبان بطور سند (۲ص)، طرزِ بیان کی قوت (۱/۲ ۲ص)،

چوتھا باب ــــ ریختی کے موضوعات اور اس کا تجزیہ (۱/۲ ۳ص)، صنفی یا نسوانی موضوعات (۴ص)، نفسانی یا طبعی موضوعات (۱ص)، جنسی موضوعات (۲ص)، ریختی کے سماجی موضوعات کا تجزیہ (۱/۲ ۶ص)، توہماتی موضوع (۱ص)، عاشقانہ اور فلسفیانہ موضوعات (۱ص)، ریختی کے اقتصادی یا معاشی موضوعات کا تجزیہ (۵ص)، ریختی کے اصلاحی موضوعات کا تجزیہ (۱۰ص)،

پانچواں باب ـــــ ریختی میں عورت (۲۵ ص)، چھٹا باب ـــــ ریختی کا جنسی پہلو (۳۰ ص)،

ساتواں باب ـــــ ریختی کا آغاز وارتقا (۳۰ ص)، آٹھواں باب ـــــ ریختی کا آغاز دکن میں (۵۰ ص)،

نواں باب ـــــ ریختی کا ارتقا دلی اور لکھنو میں (۴۴ ص)، دسواں باب ـــــ ریختی غدر کے بعد (۱۰۳ ص)،

گیارھواں باب ـــــ ریختی کی زبان کی خصوصیات (۲۲ ص)، فرہنگ الفاظ ومحاورات بیگمات (۴۲ ص)،

بارھواں باب ـــــ ریختی کا زوال (۱۰ ص)، اردو ادب میں ریختی کا مرتبہ (۴۶ ص)، کتابیات (۷ ص) "

مقالے کے پہلے باب میں ریختی کے ابتدا اور مقبولیت کے محرکات وعوامل کی سمجھ اور نشاندہی کرتے ہوئے مقالہ نگار نے سیاسی اور سماجی پس منظر کی تفصیلات قلمبند کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسے سیاسی اور سماجی پس منظر کی توضیح کے سلسلہ میں تاریخی واقعات کو سامنے رکھنا تھا۔ لیکن تاریخ سے استناد واستدلال کا انداز سہولت پسندانہ ہے۔" نواب سعادت علی خاں برہان الملک" کے بیان میں مقالہ نگار لکھتا ہے: "اٹھارویں صدی عیسوی میں ادھر سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوا، ادھر سلطنت اودھ کی بنیاد پڑی (ص ۶)" یہ تحقیق کا طرز نہیں ہے۔ 'ادھر ادھر' کی جگہ سنین کی وضاحت ضروری تھی کیونکہ سلطنت مغلیہ کا زوال اور سلطنت اودھ کی بنیاد' دونوں ہی واقعات اہمیت رکھتے ہیں، اسی عنوان کے تحت محمد امین سعادت خاں کا تذکرہ درج ذیل جملوں میں ہے۔

ان کا اصلی نام محمد امین تھا۔ ۱۷۰۸ء میں نیشاپور سے ہندوستان آئے۔ تلاش معاش کی فکر تھی ادھر ادھر سرگرداں رہنے کے بعد دلی پہنچے، فرخ سیر کی بادشاہت کا زمانہ تھا، ذی جوہر سپاہی تھے۔ چند دنوں کے بعد دربار میں رسائی ہو گئی، شہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ مل گیا۔ چند ہی روز میں اپنی لیاقت کی بدولت دربار شاہی کے معزز امیروں اور منصب داروں میں شامل ہو گئے پھر صوبہ دار اکبر آباد کی دامادی حاصل کی۔ (ص ۱۵)

اقتباس بالا میں یہ فقرہ "ادھر ادھر سرگرداں رہنے کے بعد دلی پہنچے" تحقیق کے منشا کے مطابق نہیں ہے۔ یہاں ادھر ادھر لکھنے کے بجائے متعلقہ جگہوں کی صراحت ہونی چاہیے تھی۔ جہاں تلاش معاش میں سعادت خاں آئے گئے۔ دلی پہنچنے کے سال کی وضاحت ضروری تھی۔ شہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ ملنے کا واقعہ بھی اہم ہے۔ یہ ٹھیکہ کب ملا اس کی صراحت نہیں ہے۔ "چند دنوں کے بعد اور "چند ہی روز میں" جیسے فقرے غیر مستند ہیں۔ دربار شاہی کے معززین میں شامل ہونے اور اکبر آباد کے صوبہ دار کی دامادی حاصل کرنے کے واقعات کی اہمیت کے پیش نظر یہ لکھنا ضروری تھا کہ یہ واقعات کب رونما ہوئے۔ نواب شجاع الدولہ کے تذکرہ کے دوران مقالہ نگار لکھتا ہے: "نواب شجاع الدولہ ابتداً میں لکھنو میں رہے، لیکن بکسر کی جنگ کے بعد فیض آباد میں رہنے لگے اور اسی کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔" (ص ۱۸)۔ نواب صاحب کا فیض آباد میں سکونت اختیار کرنا اور اسے دارالحکومت بنانا تاریخی طور پر نہایت اہم باتیں ہیں۔ یہ واقعات کب ہوئے؟ اس کا پتہ نہیں چلتا۔ مقالہ میں شجاع الدولہ کو نہایت قابل

قرار دیا گیا ہے مگر وہ کس فن میں قابل تھے یہ نہیں معلوم ہوتا۔ ایک جگہ یہ جملہ بھی ہے۔ "کہا جاتا ہے کہ اگر شجاع الدولہ کچھ روز اور زندہ رہتے تو فیض آباد دوسرا دلی بن جاتا" (ص ۱۹)۔ یہاں "کہا جاتا ہے" کا فقرہ تحقیق کے تقاضے کے بالکل منافی ہے۔ یہ انداز بیان قصے کہانی کا ہے۔ تحقیق کی زبان مشتبہ نہیں ہوتی، متعین مفہوم کی حامل ہوتی ہے۔ عوام میں بے انتہا ناراضگی پھیل گئی تھی (ص ۲) انھوں نے لکھنؤ میں بے شمار عمارتیں تعمیر کیں (ص ۳)، جیسے جملے بھی محل نظر ہیں۔ "بے انتہا" اور "بے شمار" لکھنا پسندیدہ نہیں ہے۔ نواب سعادت علی خاں کا تذکرہ کرتے ہوئے مقالہ نگار رقمطراز ہے:

"ملکی انتظام میں انھوں نے غیر معمولی ہوشیاری اور خوبی دکھائی۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر ان کو آخر عہد تک پورا اطمینان نصیب ہوجاتا تو وہ یقینی گذشتہ بدنظمیوں اور خرابیوں کا ازالہ کرلیتے اور ملک کی ان کے عہد میں کافی اصلاح ہوجاتی۔" (ص ۲۰)

ذاتی تاثر کا یہ بالیقین اظہار تحقیق کے ضابطے کے خلاف ہے، میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ غیر مستند اور غیر مدلل تاثر اور تصور کی متحمل تحقیق نہیں ہوتی۔ "فرمانروایان اودھ" کو "نواب وزیر" کی جگہ کمپنی کے ذریعہ "بادشاہ" کا لقب دیا جانا بھی تاریخی طور پر اہم ہے۔ کمپنی کا یہ حکم کب نافذ ہوا اسکی صراحت مفقود ہے۔

زیر تذکرہ مقالے کے سب سے اہم باب کا عنوان ہے۔ "ریختی بحیثیت صنف سخن" یہاں ریختی بطور صنف سخن موزوں تھا۔ اس میں مقالہ نگار ایک طرف یہ لکھتا ہے:

"غزل اگر اردو شاعری کی آبرو کہی جاسکتی ہے تو ریختی اردو شاعری کی آبرو باختہ صنف سخن ہے اس میں جو فضا ملتی ہے وہ نسوانی ہونے کے ساتھ حد درجہ پست اور سطحی ہے، اس میں لذت پرستی عام ہے۔ چنانچہ دلچسپ ہونے کے باوجود اس میں متانت، وقار، بلندی، پاکیزگی اور لطافت نہیں بلکہ یہ عوام و خواص کے سطحی مذاق اور لذت پرستی و نیز بداخلاقی اور بدکرداری کی نمائندہ نظر آتی ہے۔" ص ۱۰۵

لیکن اس کے فوراً بعد وہ یہ لکھتا ہے:

"ریختی کا ایک اہم اور قابل غور پہلو یہ بھی ہے کہ ابھی تک اردو شاعری میں صرف مرد کے جذبات، احساسات اور تجربات کا ذکر ہوتا تھا، اردو شاعری میں عورت کی حیثیت صرف محبوب کی تھی لیکن خود اس کے جذبات حالات، احساسات اور تجربات کے اظہار کا کوئی وسیلہ نہ تھا، چنانچہ ریختی نے نہ صرف عورتوں کی نمائندگی کی بلکہ ایک خصوصی اضافہ یہ کیا کہ ادنیٰ طبقہ کے خیالات کو اردو شاعری میں جگہ دی۔ اس طرح ریختی عوامی زندگی کا عکاس بنی۔" (ص ۱۰۶)

اگر سماج کے پست اور مبتذل طبقہ کے سوقیانہ خیالات اور پست احساسات ہی، عوامی زندگی کی عکاسی کے لیے کافی ہیں تو خیر کچھ کہنے کی

گنجائش نہیں ہے، لیکن عوامی زندگی کی کوئی معیاری اخلاقیات اور جمالیات ہوتی ہے کہ جس کا تعلق شعر و ادب سے قائم رہتا ہے تو پھر مقالہ نگار کے منقولہ بالا خیالات لائق اعتنا نہیں ہو سکتے۔ ریختی کو ایک صنف سخن ثابت کرتے ہوئے مقالہ نگار نے اس کی خصوصیتوں پر جس زور و شور سے اصرار کیا ہے اس کی وضاحت درج ذیل اقتباسات میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

"(ریختی میں) شاعری کے ایسے نمونے بھی موجود ہیں جن میں نہایت پاکیزہ، اثرانگیز اور فطری جذبات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ عورتوں کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں جو اس کے وجود کی طرح مقدس اور معصوم ہیں۔ بھائی بہن، ماں بیٹی، میاں بیوی اور اسی قسم کے دوسرے رشتوں کی ترجمانی نہایت ہی دلفریب انداز میں کی گئی ہے۔ اگرچہ ریختی کو محض تفریح اور دوسرے ایسے ہی مشاغل کیلئے کیا گیا تھا لیکن اس کا رواج بے کار نہیں گیا۔" (ص ۱۰۷)

مقالہ نگار اپنے اس بیان کی تشریح و تائید یوں کرتا ہے:

"ہماری اردو شاعری کا بیشتر حصہ مضامین کے اعتبار سے غیر فطری ہے۔ اردو میں اکثر مضامین فطرت کے خلاف باندھے گئے ہیں۔ عشق کا اظہار ہم جنسوں سے کیا گیا ہے۔ یہ خصوصیت عام طور پر قدیم شعرا کے یہاں پائی جاتی ہے لیکن جہاں تک ریختی کا سوال ہے وہ اس معاملہ میں فوقیت رکھتی ہے۔ ریختی میں شعرا نے عشق کی حقیقت کو مدنظر رکھا ہے۔ اس میں ہم جنسوں اور غیر جنسی عشق کے فطری پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ ریختی میں شاعر عشق کا اظہار اس طرح کرتا ہے جیسے کہ ایک عورت اپنے شوہر یا اپنی ہم جنس سہیلی کیلئے کرسکتی ہے۔ (ص ۱۱۰)

اس کی مزید توثیق کرتے ہوئے مقالہ نگار لکھتا ہے:

"دنیا کا ہر ادب اپنے سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہے وہ یہ کہ ہماری شاعری میں عورتوں کے جن جذبات کی عکاسی کی گئی ہے وہ عورت کے شریفانہ ماحول سے پرے ہے۔ ریختی کا رنگ بھی غزل کی طرح عاشقانہ ہے اس میں بھی وہ تمام لوازمات موجود ہیں جو درباروں کی عیش پرستی کے لیے درکار تھی۔" (۱۱۱ ص)

اس موخرالمنقول اقتباس کے ابتدائی چند جملوں کا مفہوم بالکل مبہم اور گنجلک ہے بلکہ غیر مربوط بھی ہے۔ جملے یہ ہیں: "دنیا کا ہر ادب اپنے سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں، لیکن حقیقت کچھ اور ہے، وہ یہ کہ ہماری شاعری میں عورتوں کے جن جذبات کی عکاسی کی گئی ہے وہ عورت کے شریفانہ ماحول سے پرے ہے۔" پہلے جملہ کے بموجب مقالہ نگار یہ لکھتا ہے کہ "لیکن حقیقت کچھ اور ہے" تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ کوئی اہم انکشاف کرنے والا ہے مگر اگلے جملوں سے مایوسی ہو جاتی ہے۔ وہ شاعری میں پیش کیے جانے والے عورتوں کے جذبات کی عکاسی کو "شریفانہ ماحول سے پرے" بتلاتا ہے جبکہ وہ شاعری کی دوسری صنفوں سے قطع نظر ریختی

ہی کے سلسلہ میں یہ لکھ چکا ہوتا ہے:

"ریختی نے اردو زبان کو وسیع کیا ہے اور اسے بہت کچھ دیا ہے، شاعری کے ایسے نمونے بھی موجود ہیں جن میں نہایت پاکیزہ اثرانگیز اور فطری جذبات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔" (ص ۱۰۷)

بیان کا یہ تضاد اتنا واضح ہے کہ پتہ نہیں چلتا کہ مقالہ نگار کی قطعی رائے آخر کیا ہے؟ وہ لکھتا ہے کہ "ریختی میں عورتوں کی دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں جو اس کے وجود کی طرح مقدس اور معصوم ہیں۔" (ص ۱۰۳) پھر اس کی وضاحت کرتا ہے کہ اس میں بھائی بہن، ماں بیٹی میاں بیوی اور اسی قسم کے دوسرے رشتوں کی ترجمانی نہایت دلفریب انداز میں کی جاتی ہے۔ (ص ۱۰۷) اس کی صراحت بھی کرتا ہے کہ ریختی میں محض زبان کے سہارے عورت اپنی ذہنی، جسمانی، اقتصادی اور جنسی پہلوؤں کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ (ص ۱۱۵) وہ عورت کو بجائے خود ایک دنیا قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:

"اس کے بھی اپنے مخصوص جذبات ہیں جن کے اظہار کے لیے اردو شاعری میں ریختی کے سوا اور کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ اس میں اس کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ اس میں وہ اسی دنیا کی جیتی جاگتی مخلوق نظر آتی ہے، اس میں رسمی عشق و عاشقی، مفروضہ مضامین اور فرسودہ موضوعات کے بجائے حقیقی معاملات اور واقعات کی ترجمانی ہے جس میں عورت صرف عورت ہی دکھائی دیتی ہے۔" (ص ۱۱۵)

ریختی کی اس تعریف و توصیف اور اس کی وسعت و نیرنگی کی تحسین کے ساتھ ساتھ مقالہ نگار اسے ایک آبرو باختہ صنف سخن بھی قرار دیتا ہے اور لکھتا ہے:

"شاہان اودھ کے ساتھ عوام بھی اس پاکیزہ تصور سے دور تھے یا یوں کہیے کہ لکھنو کے تہذیبی حمام میں سب ننگے تھے جہاں شہدے پن کے سوا کسی دوسری طرف رجحان منعطف نہیں ہوا۔ تمام شاعری عورت سے متعلق ہے جس میں عورتوں کے نجی معاملات کے علاوہ جنسی میلانات بھی شامل ہیں عورتوں کے متعلق وہ باتیں ہیں جنھیں تہذیب کے پردے میں بے حیائی کہا جا سکتا ہے۔ ریختی کا خمیر اسی بے حیائی اور (کذا) خمیر میں اٹھا ہے۔" (ص ۱۲۲)

ایک طرف ریختی کے موضوعات کے تنوع کی صراحت کرتے ہوئے مقالہ نگار یہ لکھتا ہے کہ اس کے موضوعات میں حیرت انگیز تنوع اور ہمہ گیری ہے (ص ۱۱۶) دوسری طرف یہ بھی لکھتا ہے کہ ریختی کے موضوعات درحقیقت مردوں کے عیاشانہ ذوق کا نتیجہ ہیں (ص ۱۲۴)۔ یہ بیان بھی ہے کہ:

"اعلیٰ طبقہ سے لے کر ادنیٰ طبقے کی عورتوں کو جو معاملات پیش آتے ہیں، جو کام وہ کرتی ہیں، جو باتیں وہ کہتی ہیں یا سوچتی ہیں، جو خیالات ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں جو ان کے نسوانی اور فطری تقاضے ہیں یا جو مختلف حیثیتیں

انھیں زندگی میں حاصل ہیں ان سب کا اظہار ریختی میں کیا جاتا ہے۔" (ص ۱۲۸)

لطف یہ ہے کہ آٹھ ہی صفحات کے بعد یہ بیان موجود ہے:

"مگر اس میں (ریختی میں) وہ تمام معاملات نظم کیے گیے ہیں جن کا عورت مرد کے جنسی میلانات سے تعلق ہے۔
ان میلانات کے اظہار میں حیا کا پردہ اٹھا دیا گیا ہے۔ جنس زدہ ماحول میں اس قسم کے مضامین تفریح کا سبب تھے لہٰذا
ریختی گو شعرا نے نہایت بے باکی اور بے حیائی کے ساتھ جنسی موضوعات کو بیان کیا ہے۔ جنس کے مختلف تقاضے، ان
کی کج روی؛ یہی وہ موضوعات ہیں جن کو ریختی میں بار بار بیان کیا گیا ہے۔" (ص ۱۳۷)

اس سے پہلے مقالہ نگار یہ بھی لکھ چکا ہے:

"ریختی کے موضوعات میں حد درجہ سطحیت اور اتھلا پن ہے۔ ریختی میں جس عورت کی تصویر کشی کی
گئی ہے اس میں شریفانہ رنگ کم ہے، وہ ایک بازاری عورت سے زیادہ اور کچھ نظر نہیں آتی۔" (ص ۱۳۱)

اسی پر بھی زور دیا جا چکا ہے کہ ریختی میں عورت کی زندگی، ہر طبقہ کی عورت کی زندگی کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور مقالے میں
یہ بھی لکھا گیا کہ ریختی محض ایک بازاری عورت کی عامیانہ جنسی واردات کی مصوری کرتی ہے، تضاد بیان کی ایک اور مثال
ملاحظہ ہو۔ مقالہ نگار لکھتا ہے:

"ریختی صرف فحش اور عریاں خیالات ہی کی ترجمانی نہیں کرتی ہے جیسا کہ عام خیال ہے بلکہ اس میں اخلاقی
اور اصلاحی مضامین بھی موجود ہیں۔ اصلاحی اور اخلاقی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے ریختی گو شعرا نے کہیں توحید و تصوف
کے رموز بے نقاب کیے ہیں۔ کہیں اخلاقیات پر زور دیا ہے۔ اس طرح ریختی کے دامن میں بے شمار اصلاحی مضامین
لپٹ گئے ہیں۔" (ص ۱۲۵)

پھر چند ہی صفحات کے بعد یہ تحریر ہے:

"اس طرح ریختی کی شاعری دراصل شہوانیات کی شاعری ہے جس میں عورت کا صحیح تصور نا پید ہے
کیونکہ اس میں بہن، بیوی، بیٹی اور ماں کے خدوخال اس قدر مسخ ہیں کہ اس کو سوائے طوائف کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا ہے (ص ۱۳۱)

زیر تذکرہ مقالے کا ایک اور اہم باب ہے" ریختی کا آغاز و ارتقا"۔ یہاں تنقیدی شعور کی بہ نسبت محققانہ درک
و بصیرت سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ مگر یہاں بھی تحقیقی مشاہدے پر تصور غالب ہے۔ اردو کے پہلے ریختی گو شاعر کا تذکرہ کرتے
ہوئے مقالہ نگار لکھتا ہے:

"ہاشمی صاحب کا دیوان اب شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا ہے۔" (ص ۲۲۳) یہ اہم واقعہ کب رونما ہوا، اس کی

صراحت نہیں ہے۔ دیوان ہاشمی کی اشاعت کا سال درج کرنا ضروری تھا۔ شائع ہو کر منظر عام پر آگیا ہے، کی جگہ "پر شائع ہوگیا ہے" یا "منظر عام پر آگیا ہے" کافی تھا۔ منقولہ جملہ کے بعد وہ پھر رقمطراز ہے:

"اب اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہاشمی اردو کا پہلا ریختی گو نہیں ایسی صورت میں ہماری ریختی کی تاریخ رنگین اور انشا سے کئی سو سال پیچھے چلی جاتی ہے۔"

کئی سو سال پیچھے میں بڑی گنجائش ہے۔ یعنی تین چار سو سال سے نو سو سال تک کی گنجائش ہے۔ یہ انداز بیان تحقیق کیلئے نہایت غیر معتبر ہے۔ اس طرح کی کئی اور مثالیں مقالے میں موجود ہیں۔

مقالے کے آخر میں مقالہ نگار نے اپنا یہ تاثر پیش کیا ہے:

"ریختی میں جہاں فحش نگاری ہے وہیں نسوانی جذبات کی صحیح ترجمانی بھی موجود ہے جس کی اردو شاعری میں ایک بڑی کمی تھی۔ ریختی کے موضوعات میں تنوع، وسعت اور نفسیاتی گہرائی ہے۔ اگر موضوعات کے کے اعتبار سے ریختی کی اہمیت کو مدنظر رکھا جائے تو اس کا درجہ اردو شاعری میں بہت اونچا ہو جاتا ہے۔" (ص ۲۹۲)

یہاں جن موضوعات کے پس منظر میں ریختی کے درجہ کو مقالہ نگار بہت اونچا قرار دیتا ہے انھیں موضوعات کے سلسلہ میں وہ یہ بھی لکھتا ہے: "ریختی کے موضوعات درحقیقت مردوں کے عامیانہ ذوق کا نتیجہ ہیں۔ مردوں نے اپنے جذبات کی تسکین کی غرض سے اس قسم کے مضامین وضع کیے ہیں ... اس میں مرد کی لذت اندوزی کے جذبات زیادہ حاوی ہیں۔"

تحقیقی مقالے میں اس طرح کے متضاد نوعیت کے خیالات اور معلومات کی غیر مستند فراہمی اور معتبر تاریخی شواہد کے بغیر واقعات و حالات کی پیش کش، تحقیق کے ضابطوں اور تقاضوں کے منافی ہے۔ تضاد بیانی ہی کی طرح تکرار بیان بھی نامناسب اور معیوب ہے۔ نتیجہ وضع کرنے کے انداز کو مشتبہ نہیں متعین ہونا چاہیے تاکہ عنوان تحریر کے سلسلہ میں کوئی ابہام ہو تو رفع ہو جائے۔ اس اعتبار سے محقق پر ایک بڑی علمی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس کی صحیح اور مکمل ادائیگی اس وقت تک ممکن ہے کہ جب تحقیق و تنقید کی ہم آہنگ دانشوری سے معرکہ لیا جائے اور محنت و ریاضت کے دشوار گذار مرحلوں پر قابو پانے کی سنجیدہ اور محتاط کاوش کی جائے۔ میرا خیال ہے کہ "ریختی کا تنقیدی مطالعہ" کے اس تجزیاتی مطالعہ سے اس علمی ضرورت کی اہمیت بخوبی عیاں ہو چکی ہوگی۔

●●

ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی
صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، املدر

جواب

اس میں شک نہیں کہ اب درس گاہوں میں تحقیق اور تنقیدی مطالعہ کا رجحان بڑھ رہا ہے مگر بیش تر علمی اداروں میں یہ مضا سا نگار نہیں۔ اکثر طلبا ایسے ہیں جنھیں تحقیق و تنقید سے کوئی لگاؤ نہیں یا جن کے مزاج تحقیق و تنقید سے مناسبت نہیں رکھتے مگر وہ اس وادی پرخار میں قدم رنجاں نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارے علمی معیار کا کیا ہوگا۔ وہ ظاہر ہے۔

تحقیق و تنقید وقت گزاری کا شغل نہیں ہے اور نہ یہ کسی نصابی ضرورت کو پڑ کرنے کا وسیلہ ہے۔ اس کے لیے طبعی مناسبت کے ساتھ ذوق و انہماک کی سخت ضرورت ہے۔ آج اردو میں بہت سے ایسے طلبا ہیں جنھوں نے اصول تو بہت پڑھ لیے ہیں مگر ان اصولوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی لیاقت برائے نام ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ اصولوں کی ہواؤں پر اڑتے نظر آتے ہیں اور بے بنیاد دلیلوں کا اس طرح انبار لگاتے ہیں گویا ان ہی کے دم سے زبان ادب کا چراغ روشن ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں تربیت کی اشد ضرورت ہے اور اساتذہ پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ زبان و ادب کا صحیح معیار قائم کرنے میں طلبا کی مدد کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اعلیٰ درجات میں ان ہی طلبا کو داخلہ دیا جائے جو ادبی معیار پر پورے اترتے ہوں اور جنھیں تحقیق و تنقید، قواعدِ زبان و بیان، تلفظ و املا، شعر اور شعری اصناف، ادب اور ادب کے لوازمات سے نحوی واقفیت ہو۔ اس کے بغیر ادبی مطالعہ میں سنجیدگی ناممکن ہے۔ زبان و ادب پر کام کرنے والوں کی حالت یہ ہے کہ شعری اصناف سے ناآشنا ہیں۔ تحقیق و تنقید کو سمجھتے نہیں۔ قواعدِ زبان و بیان سے آگاہ نہیں۔ تلفظ و املا کی مشق نہیں۔ مگر رہنمائی فرما رہے ہیں۔ یہ مزاج زبان و ادب کے لیے گمراہ کن ہے۔

اس کی ایک مثال پیش نظر تحریر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مقالہ نگار نے کتاب "ریختی کا تنقیدی مطالعہ" کو اپنی تحریر کا نشانہ بنایا ہے۔ مقالہ نگار کی فہم و فراست اور حاضر دماغی کا حال یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کے پہلے باب میں ریختی کی ابتدا اور مقبولیت کے محرکات و عوامل کی جستجو کر ڈالی، جبکہ پہلا باب ریختی سے قبل سماجی و سیاسی حالات کا سرسری جائزہ ہے۔ ریختی کی ابتدا، اس کی مقبولیت اور محرکات کے لیے الگ ابواب موجود ہیں۔

جہاں تک سنین اور مقامات کی تفصیل کا سوال ہے ان کا اظہار حسب ضرورت کیا گیا ہے۔ اٹھائے گئے سوالات مثلاً "مغلیہ سلطنت کا زوال کب ہوا" یا "اودھ کی سلطنت کا قیام کب عمل میں آیا" گمراہ کن اور بے بنیاد ہیں۔

مقالہ نگار نے ایک دو مثالیں سعادت علی خاں اور شجاع الدولہ سے متعلق بھی تحریر کر کے الزام تراشی کی صورت نکالی ہے۔ اس سلسلے میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ یہاں شاہانِ اودھ کی تاریخ لکھنا مقصود نہیں۔ ریختی سے متعلق ہی تاریخی شواہد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ہر جگہ مقالہ نگار کی منشا کا احترام ضروری نہیں۔ چند تحقیقی اصول پڑھ لینے سے کام نہیں چلتا۔ یہ جاننا بھی

ضروری ہے کہ ان کا اطلاق کس جگہ منصفانہ ہے۔

مقالہ نگار کی لیاقت اور تحریر کا حال پہلے لکھ چکا ہوں معلوم ہوتا ہے اس کو زبان کے مستند اور غیر مستند ہونے کے اصول بھی خوب یاد ہیں۔ وہ لکھتے ہیں، "چند ہی روز میں" یا چند دنوں کے بعد" جیسے فقرے غیر مستند ہیں" اگر زبان کی سند مقالہ نگار کی زباں دانی پر موقوف ہے تو میں کیا ہر پڑھے لکھے آدمی کو مان لینا چاہیے۔

ایسا لگتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار کی ساری توجہ میری کتاب کے پہلے باب بعنوان "سماجی سیاسی پس منظر" پر ہی مرکوز رہی ہے۔ جس کی اصل نوعیت کا اظہار کیا جا چکا ہے۔ تاہم یہاں مقالہ نگار کے چند طفلانہ اعتراضات نقل کرنا چاہتا ہوں کا تاکہ قاری گمراہ نہ ہوسکے۔

میرے نقاد نے اصول و ضوابط کے اطلاق کی اچھی صورتیں نکالی ہیں مثلاً۔ "ادھر ادھر سرگرداں رہے" تحقیق کے منشائے کے مطابق نہیں" "صوبہ دار کی دامادی کا واقعہ بڑا اہم ہے۔ کب پیش آیا؟" "لکھنا تھا" "یہ واقعہ بڑا اہم ہے"۔ کہا جاتا ہے کہ اگر شجاع الدولہ کچھ روز اور زندہ رہتے تو فیض آباد دوسرا دہلی بن جاتا" کہا جاتا ہے" نقرہ تحقیق کے بالکل منافی ہے "یہ انداز قصے کہانی کا ہے"۔ تحقیق کی زبان مشتبہ نہیں ہوتی"۔ متعین مفہوم کی حامل ہوتی ہے"۔ "انھوں نے لکھنؤ میں بے شمار عمارتیں تعمیر کیں"۔ جیسے جملے بھی محل نظر ہیں۔ "بے انتہا" اور "بے شمار" لکھنا پسندیدہ نہیں۔

اس قسم کے اعتراضات میری نگاہ میں مضحکہ خیز ہیں۔ بارہا اس حقیقت کا انکشاف کیا جا چکا ہے کہ میں شاہانِ اودھ کی تاریخ پر تحقیقی مقالہ نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ ریختی سے متعلق ان عوامل اور محرکات کی تحقیق کر رہا ہوں جن کا تعلق اس دور کی تاریخ سے ہے۔

مقالہ نگار نے کچھ فقرے مثلاً "تاریخ سے استناد و استدلال کا انداز سہولت پسندانہ ہے۔" "تحقیق کے منشائے کے مطابق نہیں"۔ تحقیق کے تقاضے کے بالکل منافی ہے۔ تحقیق کے ضابطوں اور تقاضوں کے منافی ہے"۔ طوطے کی طرح رٹ لیے ہیں۔ مفہوم کی مناسبت یا موقع و محل سے اس کو کوئی سروکار نہیں۔ نمود و نمائش اور قابلیت کا ہیضہ ہو گیا ہے۔ اگر ایماندارانہ اور صحیح انداز تنقید ہو تو وہ قابل قبول ہوتی ہے۔

اس باب کے بعد مقالہ نگار کتاب کے دوسرے باب بہ عنوان "ریختی بحیثیت صنف سخن" کو پیش نظر رکھتا ہے۔ یہ باب تنقیدی نوعیت کا ہے۔ لیکن مقالہ نگار اس کو بھی تحقیق کی میزان سے تولتا ہے۔ نتائج جتنے گمراہ کن ہونگے وہ قاری کے سامنے ہیں۔

میرے ناقد کا جملہ آغاز یہ ہے:

"ریختی بحیثیت صنف سخن کی جگہ ریختی بطور صنف سخن موزوں تھا"

اس سلسلے میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ "بحیثیت" اور "بطور" میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ اور میں اپنی جگہ صحیح ہوں۔

کاش مقالہ نگار تھوڑی سی سمجھداری سے کام لیتے! مگر ان کو عیب جوئی سے فرصت کہاں؟

مقالہ نگار کی فہم و فراست کی کئی مثالیں قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے کی ایک اور کڑی پیش خدمت ہے۔ وہ لکھتا

ہے یہ اگر سماج کے پست اور مبتذل طبقہ کے سوقیانہ خیالات ہی عوامی زندگی کے لیے کافی نہیں تو پھر کچھ کہنے کی گنجائش نہیں لیکن عوامی زندگی کی کوئی معیاری اخلاقیات اور جمالیات ہوتی ہے کہ جس کا تعلق شعر و ادب سے قائم رہتا ہے تو پھر مقالہ نگار کے مقولہ بالا خیالات لائق اعتنا نہیں ہو سکتے۔"

اگر کسی کو ٹیڑھی ترچھی چالیں چلنے کی عادت ہو تو کچھ کہنا فضول ہے تاہم اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ میں نے درج بالا نظریے کا کہیں اظہار نہیں کیا۔ یہ خود ساختہ نظریہ ہے اور میرے ناقد کی لیاقت کا ثبوت ہے۔ اگر وہ ادنیٰ یا پست طبقہ کا مفہوم نہیں سمجھے یا عوام و خواص میں تمیز نہ کر پائے یا ادنیٰ و اعلیٰ طبقوں میں امتیاز نہ کر سکیں یا سماج اور اس کے معاشرے کو نہ سمجھ سکیں تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ دراصل طبقہ کوئی بھی ہو عیوب و محاسن سے خالی نہیں۔

اسی باب سے مفہوم کا تسلسل توڑ کر کچھ اقتباسات نقل کر کے اس حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے۔ مثلاً "ان تمام مثالوں سے میں تحقیقی مقالہ کے اس پہلو کی طرف توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ ریختی کو مقالہ نگار نے ایک خاص صنف سخن کے طور پر اختیار کر کے اپنے مطالعاتی نتائج پیش کئے ہیں۔ مگر یہ نتائج تنازعات اور تضادات سے اس طرح پر ہیں کہ ریختی کا صنفی تصور واضح نہیں ہو سکا۔ تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ موضوع سے متعلق بیانات مستند اور مدلل ہوں۔ ایک جملہ تو کیا ایک لفظ بھی ایسا استعمال کرنا غیر مستحسن ہے جس سے مفہوم مشتبہ ہو جائے۔ تحقیق کی زبان مفہوم کی قطعیت کی طالب ہے اس سے ایک واضح نتیجے تک رسائی ہوتی ہے۔

پہلی بات یہ کہ اس باب کی نوعیت تنقیدی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں مقالہ نگار کو علم ہونا چاہیے کہ تنقید کیا چاہتی ہے۔ تحقیق کہاں تک ساتھ دیتی ہے؟ تحقیق و تنقید کا مابہ الامتیاز کیا ہے؟ صنف کیا ہے؟ اصناف سخن اور شعری ہیئتوں کا تنوع کیا ہے؟ جس عہد کی شاعری پر گفتگو ہے اس عہد کے سماجی اور سیاسی خصوصیات کیا ہیں؟ شاعری کے محرکات کیا ہیں؟ شاعری میں محاسن و نقائص کیا ہیں؟ وغیرہ کے بغیر تنقید نگار اگر شعری ادب یا زبان و ادب کو سمجھتا ہے تو اس کی سعی گمراہ کن ہوگی۔ اسکے برعکس اگر نقاد زبان و ادب میں ڈوب کر کسی ادبی تخلیق کو سمجھنے کی کوشش کرے یعنی وہ خود اس جگہ پہنچے جہاں فنکار کی رسائی ہے اور اسکی باتوں کو کماحقہ سمجھ کر عوام کے سامنے اسطرح پیش کرے کہ اسکے اچھے اور برے پہلو نمایاں ہو جائیں۔ ریختی کیا بلکہ دنیا کی ہر شے میں محاسن و نقائص موجود ہیں۔ تنقید بھی کھوٹے کھرے کی جانچ کرتی ہے۔ نقاد کا فرض ہے کہ وہ بتائے کہ کسی تخلیق میں پیش کردہ خیالات کیا ہیں؟ ان کی نوعیت کیا ہے؟ وہ کس قسم کے ہیں؟ وہ کیوں پیش کیے گئے؟ ان کا مقصد کیا ہے؟ کن حالات نے انہیں پیدا کیا؟ اور وہ کس قدر مفید یا مضر ہیں۔ ان حقائق کی تلاش ہی تنقید ہے۔ پتہ نہیں فاضل مقالہ نگار مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں؟ ممکن ہے اس کی نگاہ تنگ ہو اور عیب جوئی اس کا ہنر ہو۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ مقالہ نگار بغیر سوچے سمجھے

وہی باتیں رٹ رہے ہیں کہ "موضوع سے متعلق باتیں مستند ہوں" "ایک جملہ کیا ایک لفظ بھی ایسا استعمال کرنا غیر مستحسن ہے" "تحقیق کی زبان مفہوم کی قطعیت کی طالب ہے" "اس سے ایک واضح نتیجے تک رسائی ہوتی ہے"۔ اب اس لیاقت کا رونا کہاں تک رویا جائے۔ فاضل مقالہ نگار کے دل و دماغ پر تحقیق کے چند رٹے ہوئے فقروں کا بھوت سوار ہے۔ ان کو یہ تمیز بھی نہیں کہ زیر بحث موضوعات کی نوعیت کیا ہے؟ کہاں تحقیق سے کام لیا جائے۔ کہاں تنقید کی ضرورت ہے؟ جبکہ بنیادی طور پر دونوں مختلف ہیں۔ لہٰذا ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کی کارفرمائی ہو تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔

الغرض تنقید جن موضوعات کو پیش نظر رکھتی ہے یا جن معاملات کا اظہار کرتی ہے اور جو اسلوب اختیار کرتی ہے۔ یہ تمام چیزیں تحقیق سے مختلف ہیں۔ کیوں کہ تنقیدی سطح پر نتائج کا جس طرح تعین ہوتا ہے اس کا ایک بڑا حصہ تعبیری ہوتا ہے۔ اسی لیے ہمیشہ اختلاف رائے کی گنجائش رہتی ہے۔

میرے نقاد کی مسلسل نظر زیر بحث باب پر ہے اور وہ اپنی تحریر کو جاندار بنانے اپنی آراء کو صائب بتانے اور اپنے نظریات کو لادنے کی غرض سے میری کتاب کے باب دوم یعنی "ریختی بہ حیثیت صنف سخن" سے چھوٹے بڑے تقریباً چھ اقتباسات منتخب کرتے ہیں تاکہ وہ ریختی کے مختلف میلانات کو میری تحریر کا تضاد ثابت کر سکے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انکی کوتاہ نظری کا کہاں تک ذکر کروں۔

مقالہ نگار ایک جگہ اور اسی طرح اپنی لیاقت کا اظہار کرتے ہیں مثلاً "میرا خیال ہے کہ ریختی کو ایک صنف ثابت کرنا ہی نامناسب تھا چونکہ مسدس کی ایک ہیئت ہے مثنوی، رباعی قطعہ کی الگ الگ ہیئتیں ہیں۔ غزل کی اپنی ایک ہیئت ہے۔ قصیدہ کی مخصوص ہیئت ہے، نظم میں ہیئتی نیرنگی ہے۔ اس لیے یہ سب اصناف ہیں۔ ریختی کوئی دراصل ایک میلان ہے۔ ہزل گوئی، ہجو نگاری، طنز نگاری، مزاح نگاری اور مدح سرائی کی طرح۔"

فاضل نقاد سے پہلے میں یہی کہوں گا کہ وہ اصناف سخن اور شعری ہیئتوں کا جو تنوع ہے اور ان کی جو ہمہ رنگ صورتیں ہیں ان کا بغور مطالعہ کریں۔ "صنف" اور "میلان" میں فرق جانئے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تفصیل میں جاؤں یا مقالہ نگار کی ہر جا بے جا بات کا جواب لکھوں۔ تاہم اس سلسلے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اردو شاعری میں اقسام شعر کی درجہ بندی یا صنفی شناخت کے لیے کسی منطقی اصول سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ کیوں کہ کچھ اصناف (مثلاً غزل، رباعی) اپنی مخصوص ہیئت کے باعث کچھ (مثلاً مرثیہ، واسوخت، شہر آشوب) اپنے موضوع کی وجہ سے کچھ (مثلاً مثنوی، قصیدہ) ہیئت و موضوع دونوں کے اعتبار سے اور کچھ (مثلاً نظم، گیت) جو نہ ہیئت کے لیے اور نہ موضوع کی وجہ سے بلکہ تہذیبی مزاج کے باعث صنف کا درجہ حاصل کر چکی ہیں کسی صنف سخن کا وجود بھی اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی شعری

روایات ایک رجحان بن کر اپنی ایک مستقل شناخت قائم کرے۔ ریختی میں یہ خوبی ہے کیونکہ ریختی بھی موضوع اور زبان کے اعتبار سے صنفی شناخت قائم کیے ہوئے ہے۔ اس لیے اس کو صنف کا درجہ حاصل ہے۔

لگے ہاتھ کچھ اور طفلانہ اعتراضات دیکھتے جائیے گو کہ ہر طفلانہ بات کا جواب ممکن نہیں۔ بہرحال میرے محقق کا خیال ہے کہ ہاشمی کو پہلا شاعر مان لینے سے اگر تاریخ رنگین و انشا سے کئی سو سال پیچھے چلی جاتی ہے" تو اس کا مطلب کیا ہوا؟ کئی سو سال میں بڑی گنجائش ہے۔ یعنی چار سو سال نو سو سال تک کی گنجائش ہے" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب رنگین و انشا اور ہاشمی کے ادوار کا تعین متعلقہ ابواب میں ہو چکا ہے تو پھر یہاں اس طفلانہ سوال کی کیا نوعیت ہے؟

اسی طرح دورِ حاضر میں شائع شدہ دیوان ہاشمی کے بارے میں اشاعت کا سال دریافت کیا ہے۔ اچھا ہوا کہ مقالہ نگار نے اشاعت کا دن اور صبح و شام کی تحقیق طلب نہیں کی۔ میرے نقاد یا محقق کو اس حقیقت کا علم ہونا چاہیے کہ میری کتاب کا عنوان "ریختی کا تنقیدی مطالعہ" ہے۔ تنقیدی مطالعہ کی نوعیت تحقیقی مطالعہ سے مختلف ہوتی ہے۔ جس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں تحقیقی حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ دراصل تحقیق کا مقصود حقائق کی بازیافت ہے اور حقائق کی بازیافت کے بعد جن موضوعات کا تنقیدی مطالعہ کیا جاتا ہے ان کی نوعیت تحقیق کے اصول و ضوابط سے مختلف ہوتی ہے۔ کیونکہ تنقید کے مقابلہ میں تحقیق کا دائرہ محدود ہوتا ہے تحقیق بنیادی حقائق کا تعین کرتی ہے اور اخذ نتائج میں جہاں سے تنقیدی تعبیرات کا فروغ ہوتا ہے وہیں سے تحقیق کی کارفرمائی ختم ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ ہم تحقیقی نتائج سے ہٹ کر ادبی تنقید کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ ہم بیرونی دنیا سے واپس ہو کر اندرونی دنیا میں داخل ہوئے۔ مثلاً کسی ادبی تخلیق کی تشریح و توضیح اور اس کی قدر و قیمت کے تعین کے مسئلہ کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں ہر قسم کی اطلاع ہو یعنی ادیب کی نجی زندگی اس کے حالات و کوائف سماجی، سیاسی کیفیات، ادبی روایات جیسے امور کی علم و آگہی کے لیے تحقیق سے مدد لینا ضروری ہے۔ جبکہ تنقید کے لیے ان سب سے اہم جو چیز ہے وہ یہ کہ سارا خام مواد کس طرح ایک سانچہ میں ڈھلا یعنی ادبی تخلیق کا اندرونی ڈھانچہ کس قسم کا ہے۔ اس کے مختلف عناصر میں کیا ربط ہے۔ اور زبان و بیان کی کیا نوعیت ہے؟ اور وہ تجربات جو ادبی تخلیق میں سموئے ہوئے ہیں وہ خام ہیں یا پختہ، جاندار ہیں یا بے جان، سطحی ہیں یا غیر سطحی، پیچیدہ ہیں یا پہلو دار، افادی ہیں یا غیر افادی وغیرہ۔

یہی وہ دو بنیادیں ہیں جن پر ریختی کے مطالعہ کا انحصار ہے اور ہر باب کی تقسیم بھی ان ہی بنیادوں پر عمل میں آتی ہے کاش مقالہ نگار تحقیق و تنقید کی باریکیوں کو سمجھتا تو اس کی کم علمی سد راہ نہ ہوتی۔

اگر رباعوادب پر کام کرنا ہے تو بے علمی، بہتان تراشی، بد نیتی اور خفیف الحرکاتی کو ترک کرنا ہوگا۔ ●●

ڈاکٹر محمد کلیم الحق قریشی
شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی

ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار کا تھیسس

اردو نثر کا دبستان دہلی

دانش گاہوں میں غیر معیاری اور اطمینان بخش تحقیق کو یقیناً کسی جانبداری، مصلحت اندیشی اور مجبوری کے تحت پی۔ ایچ۔ ڈی کی سندِ فضیلت کی غلط بخشی کا نتیجہ قرار دینا چاہئے جب تک منصوبہ بند طریقہ سے جامعاتی سطح پر اس کا تدارک نہ ہو اس کے مثبت اور بہتر نتائج کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

دانش گاہوں کے باہر جو تحقیقی کام تصنیف و تالیف، ترتیب، متن و تدوین، مختلف تحقیقی موضوعات پر مضامین اور تحقیقی مضامین اور مقالوں پر تنقید و تبصرہ کی شکل میں ہوئے ہیں۔ وہ دانش گاہوں کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کے لئے آج بھی ایک عمدہ اور قابلِ تقلید نمونہ ہیں جہاں اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے۔ وہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جامعاتی سطح پر تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کا رجحان بھی فروغ پا رہا ہے۔ مگر اس کو روبعمل لانے میں کچھ دشواریاں اور مجبوریاں حائل ہیں۔

اردو کے مایہ ناز محقق قاضی عبدالودود، پروفیسر عندلیب شادانی جناب رشید حسن خاں اور ڈاکٹر گیان چند جین وغیرہ نے تحقیق و معیار تحقیق کے مسائل پر فکر انگیز اور بصیرت افروز مضامین لکھے ہیں اور تحقیق کے نام پر روا رکھی جانے والی کوتاہیوں اور بے قاعدگیوں کی دو ٹوک انداز میں نشاندہی کی ہے۔ ان محققین نے تحقیقی کاموں اور دوسروں کی تحقیقی کاوشوں کا جائزہ لینے میں جس دقتِ نظر، عرق ریزی اور حزم و احتیاط سے کام لیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے باوجود ان محققین سے جو لغزشیں اور تسامحات ہوئی ہیں اس پر انھیں دانش گاہوں کے اساتذہ نے گرفت کی ہے اور ان کے بعض نظریات اور اخذ کردہ نتائج کو تحقیق کی روشنی میں دلائل سے مسترد بھی کیا ہے مگر اس سے ان کی عظمت متاثر نہیں ہوئی دراصل کوئی تحقیقی کام حرفِ آخر اور تنقید سے بالاتر نہیں۔ حزم و احتیاط کے باوجود تحقیق میں غلطیوں کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بقول ڈاکٹر

بیان چند جین: "غلطی تحقیق کرنے والوں کی گھات میں رہتی ہے۔" ان محققین کا تحقیق میں آج بھی وہی بلند مقام ہے۔ ان کی لغزشیں اور کوتاہیاں بھی تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اس قدر وسیع مطالعہ، ادب پر گہری نظر موضوع سے کاحقہ واقفیت و دسترس اور تحقیقی حزم و احتیاط کے باوجود ان سے غلطی یا بھول چوک ہو سکتی ہے تو پیشہ ورانہ مجبوریوں یا محض حصول سند کے لئے لکھے جاتے والے مقالوں کا کیا حال ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

دانش گاہوں کے اساتذہ تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کی مخلصانہ کوشش بھی کرتے ہیں اور غیر معیاری تحقیقی مقالوں کو قبول کرنے اور سند فضیلت عطا کرنے کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ دوسرے اساتذہ کی زیر نگرانی جو غیر معیاری مقالے لکھے جاتے ہیں، ان کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے۔ اس قسم کی تنقید اور غیر معیاری تحقیقی مقالوں کی نشاندہی ادبی تحقیق کی سب سے بڑی خدمت ہے اس کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ دوسروں کی آنکھوں کا تنکا تلاش کرنے والوں کو اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دکھائی دیتا۔ دانش گاہوں میں ایسے اساتذہ کی تعداد یقیناً کم ہو گی جن کے زیر نگرانی ایک دو غیر معیاری تحقیقی مقالے نہ لکھے گئے ہوں، اگر کوئی استاد اس معیار پر پورا اترے (جس کی توقع کم ہے) تو اس شرط کی تکمیل ممکن نہیں کہ اس نے بطور ممتحن کسی غیر معیاری تحقیقی مقالے کو مسترد کیا ہو اساتذہ کی زیر نگرانی غیر معیاری تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں اور وہ ممتحن کی حیثیت سے غیر معیاری مقالوں کو سندِ فضیلت عطا کرنے کی سفارش بھی کرتے ہیں۔

دانش گاہوں کے وہ اساتذہ جو حقیقت و صداقت کا اعتراف کرنے میں مصلحت اندیشی کا شکار نہیں ہیں، اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں مگر وہ اساتذہ جو اس حقیقت کو الزام سمجھ کر جھٹلانے کی خاطر اس کی تردید کرتے ہیں ان کی خدمت میں، میں ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار کا مقالہ "اردو نثر کا دبستان دہلوی" غالب کے ایک شعر میں ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ پیش کروں گا ؎

دیکھو اسے "جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"   میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار کو اس مقالہ پر ۱۹۷۲ء میں شیواجی یونیورسٹی کولہا پور نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی، جسے انھوں نے دسمبر ۱۹۷۵ء میں کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

یہ مقالہ ۶۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ فہرست میں تعارف از ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب، پیش لفظ از مقالہ نگار اور سات باب شامل ہیں۔

پہلا باب :۔ اردو زبان کا آغاز ۔ دوسرا باب :۔ قدیم اردو نثر کا سرسری جائزہ ۔ تیسرا باب :۔ دہلی میں اردو نثر کا آغاز و ارتقاء میر امّن تک ۔ چوتھا باب :۔ غالب اور معاصرین غالب ۔ پانچواں باب :۔ سر سیّد ان کے رفقاء و معاصرین ۔ چھٹا باب :۔ دہلی کے اخبار و رسائل ۔ ساتواں باب :۔ دہلویت ۔

اس کے بعد حوالے و کتابیات ۔ ہر باب کو مقالہ نگار نے کئی عنوانات میں تقسیم کیا ہے ۔

ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار ایم' اے' ال ال بی' پی ایچ ڈی' لیکچرار اردو' آرٹس کالج بیجاپور کا یہ مقالہ از اول تا آخر مختلف کتب کے حوالوں سے گراں بار ہے ۔ مقالہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مقالہ نگار تحقیق کے بنیادی اصول اور آداب تحقیق سے قطعی ناآشنا ہے یا پھر وہ دانستہ اپنے عیوب کی پردہ پوشی کے لئے تحقیق کے آداب و اصول کی خلاف ورزی کرتا ہے مثلاً

ا ۔ مقالہ نگار حوالوں کے لیے صحت کو ملحوظ نہیں رکھتا وہ کتاب کے جس باب اور صفحہ کا حوالہ دیتا ہے، وہ اکثر جگہ درست نہیں ہے ۔

۲ ۔ مقالہ نگار اکثر مصنفین جیسے مولوی عبدالحق' پروفیسر احتشام حسین' ڈاکٹر مسعود حسین خاں' پروفیسر محمود شیرانی' ڈاکٹر شوکت سبزواری' پروفیسر کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر سید عبداللہ وغیرہ "لکھتے ہیں" کہ لکھ کر طویل اقتباسات نقل کرتا ہے مگر اس کا کوئی حوالہ نہیں دیتا ۔

۳ ۔ مقالہ نگار اقتباسات میں لفظی تغیر کو روا رکھتا ہے ۔

۴ ۔ آگے پیچھے کی عبارتیں ایک ساتھ نقل کی جاتی ہیں کسی کتاب کے ایک صفحہ کی چند سطریں دوسرے صفحہ کا ایک پیراگراف اور اس کے بعد کئی صفحے چھوڑ کر عبارت اس طرح نقل کی گئی ہے کہ وہ ایک مسلسل و مربوط تحریر معلوم ہوتی ہے اور اس میں مقالہ نگار کو ایک لفظ کے اضافہ کی ضرورت پیش نہیں آتی ۔

۵ ۔ اکثر مقامات پر مقالہ نگار دوسری کتابوں کی عبارت اس طرح نقل کرتا ہے جیسے وہ اس کی اپنی تحریر ہے اس میں وہ لفظی تغیر' جملوں کی ترتیب میں تبدیلی سے کام لیتا ہے ۔

۶ ۔ مقالہ نگار اردو کے عظیم اور قابل فخر انشا پردازوں کی تحریروں اور آہنگ کو لفظی تغیر' حذف و اضافہ کے ساتھ اپنی ملک یا جاگیر بنانے میں کوئی تامل یا جھجک سے کام نہیں لیتا ۔ اگر یہ ایک قسم کا ادبی سرقہ ہے تو مقالہ نگار کی دیدہ دلیری کے تعلق سے یہی کہا جائے گا کہ ؏ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

(اسے آگے مثالوں سے واضح کیا جائے گا ۔)

مقالہ نگار پہلا باب ' اردو زبان کے آغاز ' کے تاریخی پس منظر کے لیے مستند، معتبر اور ثقہ مصنفین و ماہرین لسانیات کی کتب سے استفادہ کے بجائے نسیم قریشی کی کتاب " اردو ادب کی تاریخ " سے اقتباس نقل کرتا ہے۔ تحقیقی و لسانی نقطہ نظر سے یہ کتاب کیا اہمیت رکھتی ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں، مگر اس کو کیا کیا جائے کہ پہلا حوالہ اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔ تحقیق کی بنیاد کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی گئی ہے۔ یعنی

خشتِ اوّل گر نہد معمار کج — تا ثریا می رود دیوار کج

اس باب کا دوسرا حوالہ پروفیسر احتشام حسین کی کتاب " ہندوستانی لسانیات کا خاکہ " کے ص۴۸-۴۹ سے ماخوذ ہے۔ حوالے کے بعد کی جو عبارت ہے وہ یہ ہے :

" اس مختصر سے عرصہ میں یہ تہذیبی تعلق بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ محمد غوری کے زمانے میں یعنی بارھویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کے تعلقات کی حدیں وسیع ہو گئی تھیں۔" (اردو نثر کا دہلوی دبستان ص۲۰)

قاری یہ دھوکا کھا سکتا ہے کہ پروفیسر احتشام حسین کی کتاب کے حوالے کے بعد کی تحریر مقالہ نگار کی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ مقالہ نگار صرف ایک جملہ چھوڑ کر تحریف کے ساتھ جملے نقل کرتا ہے۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ کی عبارت اس طرح ہے:

" اتنی تھوڑی مدت میں یہ تہذیبی تعلق بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ محمد غوری کے زمانے میں یعنی بارھویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کے تعلقات کی حدیں وسیع ہو گئی تھیں۔"

مقالہ نگار ص۲۴ پر حوالے کے ساتھ "پنجاب میں اردو" کے صفحہ ۵۵ کا ذکر کرتا ہے، مگر محمود شیرانی یہ بیان حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔ مقالہ نگار اس موقعہ پر صرف دو جملے واوین میں نقل کرتا ہے:

" اصل یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اس دن سے پڑنی شروع ہو گئی جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر توطن اختیار کر لیا۔ مسلمانوں کے تعلقات ہندوستان اور اہل ہند کے ساتھ پرتھوی راج کی شکست اور فتح دہلی کے زمانے سے شروع نہیں ہوتے بلکہ ان واقعات سے کئی صدی پیشتر ابتدا پاتے ہیں۔"

جہاں مقالہ نگار عبارت کو واوین میں بند کر کے حوالہ دیتا ہے اس کے بعد کی تحریر "پنجاب میں اردو" کے ص۵۵ سے نقل کردہ ہے۔ اس کا کوئی حوالہ نہیں۔ محمود شیرانی "پنجاب میں اردو" ص۱۲۶ پر جو عبارت لکھتے ہیں، اور آخر میں گریرسن لکھتے ہیں، لکھ کر جو تحریر قلم بند کرتے ہیں، مقالہ نگار اسے حذف کر دیتا ہے اور ص۱۲۶ کی پوری عبارت " اردو نثر کا دبستان دہلوی " کے ص۴۵ و ص۴۹ پر درج کرتا ہے اور اس کے بعد کا طویل اقتباس ص۱۲۵ تا ص۱۲۶ سے اور اس کے بعد کا پیراگراف ص۱۲۹ سے نقل کرتا ہے۔ اس کے لیے مقالہ نگار کی کتاب کے صفحات

۴۸ تا ۵۱ دیکھے جا سکتے ہیں۔

"شمس العلماء مولانا محمد آزاد کا نظریہ" کے عنوان کے تحت "آبِ حیات" کے آغاز کے کلمات:

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔"

اسی طرح چند سطریں نقل کرنے کے بعد مقالہ نگار لکھتا ہے کہ:

"اور مولانا نے اسی سراغ کا پتہ لگانے کے ضمن میں تقریباً ساڑھے تین ہزار سالہ ہندوستان کی لسانی تاریخ بیان کی ہے جسے ہم مختصر بیان کرتے ہیں۔"

اس کے بعد مقالہ نگار آبحیات کی عبارت ص ۲۱ تا ۲۴ کو بعض صفحات اور بعض صفحات کی چند سطریں چھوڑ کر نقل کرتا چلا جاتا ہے۔ (اس کے لیے ملاحظہ ہو مقالہ نگار کی کتاب کے صفحہ ۳۳ تا ۴۲) ۔ مقالہ نگار آبِ حیات کے ص ۲۲ تا ص ۲۴ کی عبارت کو صفحات ۳۵، ۳۶، ۳۷ کی زینت بنا کر آبِ حیات کے صفحات ۲۵، ۲۶ کو چھوڑ دیتا ہے۔ اور ص ۲۷ کے چند جملے نقل کرنے کے بعد ص ۲۸ کی عبارت نقل کرتا ہے۔ اس عبارت میں لفظی تغیر کو جگہ دی گئی ہے اور بعض جملے حذف کر دیے گئے ہیں۔ آبِ حیات کے صفحات ۳۰ و ۳۱ کی عبارت کو مقالہ نگار اپنی کتاب کے صفحات نمبر ۳۹ و ۴۰ پر جگہ دیتا ہے۔ اس کے بعد ص ۴۱ کی عبارت آبِ حیات کے ص ۵۳ و ص ۵۴ سے ماخوذ ہے۔

مقالہ نگار پوری عبارت آبِ حیات کے صفحات ہی سے ترتیب دیتا ہے۔ مگر اتنے طویل اقتباسات کے بعد مقالہ نگار آزاد لکھتے ہیں، لکھ کر آبِ حیات کا ایک پیراگراف نقل کرتا ہے۔ یہ انداز تحریر حد درجہ مغالطہ انگیز ہے کیونکہ قاری کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ کہا گیا ہے وہ گویا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریر نہیں بلکہ مقالہ نگار کی تحریر ہے۔

دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جہاں دیگر مصنفین کے اقتباسات یا ان کی آراء درج کرنے کے بعد مقالہ نگار کو نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے اور اسے اپنی رائے کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ وہاں بھی مقالہ نگار نے آبِ حیات ہی کی عبارت نقل کی ہے، مگر تحریف اور حوالے کے ساتھ۔ مقالہ نگار لکھتا ہے:

"مذکورہ بالا بیان سے ہم بخوبی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زبان میں اگا فارسی کی زبان میں سرسبز ہوا۔ اردو بھاشا میں استعارہ و تشبیہ کا رنگ بھی آیا اور بہت تیزی سے آیا مگر اس کی شدت نے ہمارے قوت بیان کی آنکھوں کو سخت

نقصان پہنچایا اور زبان کی خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بنا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ بھاشا اور
اردو میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا۔" (اردو نثر کا دبستان دہلی ص۴۲)

آبِ حیات کی عبارت یہ ہے :

" بیان مذکورہ بالا سے تمہیں اجمالاً معلوم ہوگیا کہ اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور
بھاشا کی زمین میں اگا فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا ہے، البتہ شکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ
قریب گذر چکا تھا اور ان کے معتقد باقی تھے وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے
اس واسطے گویا اردو بھاشا میں استعارہ اور تشبیہ کا رنگ بھی آیا اور بہت تیزی سے آیا۔ یہ رنگ
اگر اسی قدر آیا کہ جتنا چہرے پر اینٹے کا رنگ یا آنکھوں میں سرمہ۔ مگر افسوس کہ اس کی شدت نے
ہماری قوتِ بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہمات کا
سوانگ بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھاشا اور اردو میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا؟ (آبِ حیات ص۶۲)

ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتاب " داستان زبان اردو" سے اقتباسات نقل کرتا ہے، مگر جہاں
شوکت سبزواری نے گریرسن اور ڈاکٹر چٹرجی کی عبارت نقل کی ہے، مقالہ نگار انھیں حذف کر دیتا ہے۔ بیشتر
صفحات پر ڈاکٹر سبزواری لکھتے ہیں، لکھ کر طویل اقتباس درج کرتا ہے مگر اس کا حوالہ نہیں۔ جہاں حوالے
دیئے گئے ہیں، اس کے بعد دو دو تین صفحات داستانِ زبان اردو سے نقل کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی کتاب مقدمہ تاریخ زبان اردو" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ مگر اکثر جگہ
اس کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ ہر جگہ مقالہ نگار لفظی تغیر سے کام لیتا ہے اور صیغہ ماضی کو صیغہ حال میں بدل دیتا ہے۔
مقالہ نگار ص۹۵ پر رقمطراز ہے :

"جناب محمد ایوب صابر (لیکچرر گورنمنٹ کالج کوہاٹ) اپنے ایک مضمون" لسانیات کا جائزہ" مطبوعہ
پاکستان میں اُردو (مارچ ۱۹۶۵ء) میں لکھتے ہیں :

" 'اردو زبان کا ارتقا' ڈاکٹر شوکت سبزواری کی لسانیات پر پہلی تصنیف ہے جس میں
بقول خود ڈاکٹر صاحب کے اردو زبان کے صرفی، نحوی اور صوتی سرمایہ کا تحقیقی جائزہ لینے کے بعد
اردو کے ماخذ کا کھوج لگایا گیا ہے۔"

اس پر کسی قسم کی رائے زنی نہیں کی گئی گویا مقالہ نگار کو جناب محمد ایوب صابر کی بات سے اتفاق ہے۔

جناب محمد ایوب صابر کا یہ خیال اردو زبان اور لسانیات سے بے خبری اور عدم واقفیت کا کھلا ثبوت ہے مقالہ میں ایسی غلط اور غیر اہم بات کو ہرگز جگہ نہیں دینی چاہیے تھی۔

انشاء اللہ خاں انشا کی "دریائے لطافت"، مولانا محمد حسین آزاد کی "سخندانِ فارس"، پروفیسر وحید الدین سلیم کی "وضع اصطلاحات"، برجموہن دتاتریہ کیفی کی "منشورات" اور "کیفیہ"، "اردو زبان کا ارتقا" سے بہت پہلے کی تصنیفات ہیں۔

زبان کے علوم کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں اس اعتبار سے اگر ان کتابوں کا (PHILOLOGY) میں شمار کیا جائے تو پروفیسر محمود شیرانی، ڈاکٹر قادر محی الدین زور اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی کتابیں علی الترتیب "پنجاب میں اردو"، "ہندوستانی لسانیات" اور "مقدمۂ تاریخ زبان اردو" "اردو زبان کا ارتقا" سے پہلے کی لکھی ہوئی ہیں مقالہ نگار نے جگہ جگہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں اور انھیں جدید محققین کے نام سے یاد کیا ہے۔ اگر ان کتابوں کا پیش لفظ اور حرفِ اول دیکھ لیا جاتا تو جناب محمد ایوب صابر کے دعوے کی تردید ہو جاتی۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"گریرسن کی لسانی تحقیقات اردو زبان کے متعلق حرفِ آخر کا حکم نہیں رکھتیں، پروفیسر شیرانی جیسے بالغ نظر محقق نے یہ فوراً بھانپ لیا۔ شیرانی کو اپنے نقطۂ نظر کے لیے اشارہ خود گریرسن کی تحریروں میں مل گیا ہے جس نے اردو کے "پنجابی پن" پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ اس دور کا اردو میں لسانیاتی تحقیق کا سب سے بڑا کارنامہ پروفیسر شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اردو" (۱۹۲۸ء) ہے جو ترتیب کے اعتبار سے نامکمل سہی تحقیق کے اعتبار سے گرانقدر تصنیف ہے۔ ہندوستانی لسانیات (۱۹۳۲ء) میں ڈاکٹر زور نے بھی اردو پر ہریانی زبان کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔" (پیش لفظ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۹)

ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

"میرا تحقیقی مقالہ "اردو زبان کا ارتقا" ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں اردو زبان کا نشو و نما دکھایا گیا تھا اور اس کے صرفی، نحوی، صوتی سرمائے کا تاریخی جائزہ لینے کے بعد اس کے آغاز اور ماخذ کے متعلق کچھ مختصر اشارے کئے گئے تھے۔ "داستانِ زبانِ اردو" ان مختصر اشارات کی ترجمانی ہے۔"

(پیش لفظ "داستانِ زبانِ اردو" ص ۳)

ڈاکٹر شوکت سبزواری "اردو زبان کا ارتقاء" کے حرفِ اول ص۱۱ پر لکھتے ہیں:

"مولانا شیرانی مرحوم کا اردو داں طبقہ کو شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے غالباً اردو میں سب سے پہلے اردو کے چہرے سے نقاب ہٹا کر اس کے خط و خال کا گہرا حکیمانہ مطالعہ کیا اور پنجابی، شریانی برج بھاشا سے اس کا مقابلہ کر کے اردو داں طبقہ کو تقابلی لسانیات کی ہلکی سی جھلک دکھائی۔"

مقالہ نگار ان کتب کے بیش لفظ دیکھ لیتا تو یہ غلط فہمی رفع ہو جاتی۔ اس سے مقالہ نگار کی لاپرواہی سہل انگاری اور آنکھیں بند کر کے غلط روایات و نظریات کو قبول کرنے کے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کو تحقیق کے کوچہ میں ہرگز قدم نہیں رکھنا چاہیئے۔

مقالہ نگار کی کتاب کا پانچواں باب "سرسید ان کے رفقاء و معاصرین" ہے۔ اس باب کے طویل اقتباسات بغیر حوالے کے ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب "سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء" سے نقل کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب ص ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ کے عنوانات ہیں۔ سرسید احمد خاں، سرسید اور اردو ادب اور سرسید کے تصنیفی رجحانات کا ارتقاء ہے۔ (ملاحظہ ہو اردو نثر کا دبستان دہلوی ص۳۴۹)

ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۱۶ پر لکھتے ہیں:

"مولانا حالی نے سرسید کی تصنیفی زندگی کے تین دور مقرر کئے ہیں۔ پہلا دور شروع سے لے کر ۱۸۵۷ء تک۔ دوسرا دور ۱۸۵۷ء سفر انگلستان ۱۸۶۹ء تک۔ تیسرا دور سفر انگلستان سے وفات ۱۸۹۸ء تک۔"

مقالہ نگار لکھتا ہے:

"سرسید کے پہلے اور ثقہ سوانح نگار مولانا حالی نے اپنی تصنیف حیات جاوید میں سرسید کی ادبی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک۔ (۲) ۱۸۵۷ء سے سفر انگلستان ۱۸۶۹ء تک اور (۳) سفر انگلستان سے وفات ۱۸۹۸ء تک۔" (اردو نثر کا دہلوی دبستان ص۳۴۹)

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"سید صاحب کی تصنیفی زندگی کے اولین دور کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔"

مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"سید صاحب کی تصنیفی زندگی کے پہلے دور کو بھی ڈاکٹر سید عبداللہ نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔"

یہاں مقالہ نگار حوالہ دیتا ہے۔ اس کے بعد ص نمبر ۲۴۹ تا ۲۵۲ کی تحریر ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب صفحہ نمبر ۱ تا ۴ سے ماخوذ ہے اور پہلے دور کی تصانیف من وعن درج ہے اور تصانیف کا دوسرا دور اور تصانیف کے تیسرے دور کا سلسلہ ص ۲۵۲ تا ۲۵۷ جاری رہتا ہے۔ اور اس کا کوئی حوالہ نہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ "تبیین الکلام" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں :

"سرسید کی یہ تصنیف اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے ذریعہ انھوں نے تقابل مذاہب کی منصفانہ اور حق پسندانہ تحریک کو اُبھارا۔ دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں پر معترضانہ نظر ڈالنے کا جو طریقہ رائج تھا۔ اس کو یکسر بدل دیا اور بائبل کی یہ تفسیر لکھ کر بتایا کہ تمام مذہبی کتابیں اصولی لحاظ سے ایک ہی سرچشمہ فیض سے جاری ہیں۔ (سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء ص ۴۲)

مقالہ نگار لکھتا ہے :

" اس کے ذریعے انھوں نے تقابل مذاہب کی منصفانہ اور حق پسندانہ تحریک کی بناء ڈالی دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں پر معترضانہ نظر ڈالنے کے مروجہ طریقہ کو یکسر بدل دیا اور بتایا کہ تمام مذہبی کتابیں اصولی لحاظ سے ایک ہی سرچشمہ فیض سے جاری ہوئی ہیں۔" (اردو نثر کا دبستان دہلی ص ۲۶۳)

پانچویں باب "سرسید اور ان کے رفقاء و معاصرین" ص ۲۴۹ تا ص ۲۶۹ سرسید کے مختلف ادوار کی تصانیف کی فہرست مع تعارف ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب "سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء" سے نقل کردہ ہیں اس کے بعد ص ۲۷۱ تا ۲۸۲ کی عبارت بھی نقل کی گئی ہے۔

مقالہ نگار ص ۲۵۶ و ۲۵۷ کی عبارت کو مولوی عبدالحق کی کتاب "سرسید احمد خاں" سے ماخوذ قرار دیتا ہے، مگر یہ اقتباس ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب ص ۵۹ سے ماخوذ ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

" اس لغت کا جو نمونہ ہمارے پیش نظر ہے اس میں ایک خامی یہ نظر آتی ہے کہ اس میں لفظوں کے اشتقاق اور اصل سے بحث نہیں کی گئی یعنی یہ نہیں بتایا گیا کہ کوئی خاص لفظ کس زبان کا ہے، اور اصل زبان میں اس کی کیا صورت تھی۔" (سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء ص ۵۹)

مقالہ نگار لکھتا ہے :

" اس لغات کے متعلق مولوی صاحب کی یہ رائے ہے کہ اس میں ایک خامی یہ نظر آتی ہے کہ اس میں لفظوں کے اشتقاق اور اصل سے بحث نہیں کی گئی یعنی یہ نہیں بتایا گیا کہ کوئی خاص لفظ کس

کس زبان کا ہے، اور اصل زبان میں اس کی صورت کیا ہے۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ کے اقتباس اور ان کی رائے کو مقالہ نگار مولوی عبدالحق کی کتاب سے ماخوذ قرار دیتا ہے۔ یہ مغالطہ بھی حیرت انگیز ہے۔

مقالہ نگار کے پانچویں باب کے صفحات ص ۳۴۹ تا ص ۳۸۴ ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب کے پہلے باب کے صفحات ۱۵ تا ۶۸ سے ماخوذ ہیں۔

شبلی سے متعلق مقالہ نگار ص ۴۹۹ تا ص ۵۲۵ جو کچھ لکھا ہے وہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب کے صفحات ۱۶۴ تا ۱۸۳، اور ۲۱۰ تا ۲۱۷ سے نقل کردہ ہیں اس کے علاوہ مقالہ نگار اگلے پچھلے صفحات کی عبارت بھی نقل کرتا ہے۔

پانچویں باب میں طویل اقتباسات کے درمیان جو کئی پیراگراف پر مشتمل تحریر ہے وہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب "میرامن سے عبدالحق" کے ص ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۴، ۱۲۱، اور ۱۲۸ سے نقل ہے۔ یہ تحریریں آپ کو مقالہ نگار کی کتاب کے صفحات ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۷۰، ۲۷۱ اور ۲۷۲ پر مل جائیں گی۔ مقالہ نگار طویل اقتباسات اور کئی صفحات ڈاکٹر سید عبداللہ کی دونوں کتابوں "سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء" اور "میرامن سے عبدالحق تک" سے نقل کرتا ہے۔ اور کہیں کہیں مختصر سے جملوں اور پیراگراف کو علیحدہ لکھ کر حوالہ نمبر دیتا ہے۔ یہ انداز زیادہ گمراہ کن ہے۔ گویا اس سے پہلے اور بعد کی جو تحریریں ہیں وہ مقالہ نگار کی ہیں یا ڈاکٹر سید عبداللہ کی نہیں ہیں۔

اسی طرح مقالہ نگار نے "مقدمات عبدالحق" مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ "ادب کا تنقیدی مطالعہ" از ڈاکٹر سلام سندیلوی، داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری، تحقیق و تنقید، ڈاکٹر اختر اورینوی، "مباحث" ڈاکٹر سید عبداللہ، ناول کیا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ از ڈاکٹر احسن فاروقی، دلی کا دبستانِ شاعری از ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ناول کی تنقید و تاریخ از علی عباس حسینی پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار از ڈاکٹر قمر رئیس، ماسٹر رام چندر ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی، "سیر المصنفین" از محمد یحییٰ تنہا، "تاریخ ادب اردو" از ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، اردو کی نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند جین۔

مذکورہ بالا کتب کے حوالے تلاش کرنے میں بڑی دشواری ہے کیونکہ مقالہ نگار صحیح حوالے نہیں

دیتا۔ جیسے حوالہ نمبر ۴ ص ۲۰۴ کی تحریر سیر المصنفین کے ص ۹۴ سے ماخوذ بتاتا ہے مگر آگے پیچھے کے صفحات پر یہ حوالہ نہیں ملتا کیونکہ یہ بیان مولوی شاہ رفیع الدین دہلوی سے متعلق ہے۔ اس لیے یہ حوالہ ص ۱۰۵ پر ملے گا۔

حوالہ نمبر ۴۳ (ص ۲۰۶) سیر المصنفین کے ص ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸ اور ۱۰۹ سے ماخوذ ہے۔ مقالہ نگار صفحات کی عبارت کو ایک پیراگراف کی شکل دیتا ہے۔

حوالہ نمبر ۹۹ ص ۸۳ کے بجائے ص ۲۷، ۲۷ سے نقل ہے۔ مقالہ نگار جلد اول یا دوم کا حوالہ نہیں دیتا۔

اسی طرح دوسرے کتب کے حوالوں کا علم اس وقت نہیں ہو سکتا جب تک آپ بیسیوں صفحات اگلے پچھلے نہ دیکھ لیں کیونکہ مقالہ نگار صحیح حوالے دینے کا پابند نہیں بعض کتب کے حوالے تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ مقالہ نگار اقتباس میں تحریف بھی کرتا ہے، اور کئی جملے اور پیراگراف بغیر حوالے کے نقل کرتا ہے۔ ان ساری کتابوں کی تحریروں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔

مقالہ نگار دوسروں کی کتب کی تحریروں کو اپنی ملک سمجھ کر تصرف میں لانے کا بہت زیادہ قائل معلوم ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی "سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء" کے پہلے باب کے عنوانات اور مقالہ نگار کی کتاب کے پانچویں باب "سرسید ان کے رفقاء و معاصرین" کے عنوانات کی فہرست ملاحظہ ہو:

"ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب کے باب سرسید کے عنوانات ۔ سرسید احمد خاں، سرسید اور اردو ادب، سرسید کے تصنیفی رجحانات کا ارتقاء، تصنیفی زندگی کا پہلا دور، تصانیف کا دوسرا دور، تصانیف کا تیسرا دور، سرسید کے نمایاں افکار و تصورات اس دور کے اہم علمی نظریات، خطبات احمدیہ، تبیین الکلام، تفسیر القرآن، سرسید کی تاریخ سے دلچسپی، آثار الصنادید ۱۸۴۷ء ناکام تصنیفی کوشش، مضمون نگاری، سرسید کا اسلوب۔"

ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار کے عنوانات :

"سرسید احمد خاں، سرسید کے تصنیفی رجحانات کا ارتقاء ناتمام تصنیفی کوشش، سرسید کا اثر اردو ادب پر، خطبات احمدیہ، تبیین الکلام، تفسیر القرآن، سرسید کو تاریخ سے دلچسپی، آثار الصنادید (۱۸۴۷ء)، سیرت و سوانح، سرسید اور ڈرامہ، سرسید اور تنقید، سرسید کی صحیفہ نگاری، مضمون نگاری، سرسید کی نثر، سرسید کا اسلوب۔"

ڈاکٹر احسن فاروقی تحقیق کو کمتر درجہ کی چیز اور اسے مزدور کی طرح اینٹ اور پتھر ڈھونے کا کام سمجھتے ہیں۔

ں سے یقیناً اختلاف اور اسے تحقیق کی اہمیت اور اس کے منصب سے عدم واقفیت سے تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن ڈاکٹر
سن فاروقی کی یہ تعریف اس قسم کے تحقیقی کاموں پر ضرور صادق آتی ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے سہ

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا

یہ مقالہ شروع سے آخر تک حوالوں سے بوجھل ہے۔ ایک حوالہ ختم ہوتا ہے، دوسرا حوالہ شروع ہوتا
ہے۔ آخری باب ۳۰۲ تا ۶۶۱ کے ۱۱۹ حوالے درج ہیں۔ اس باب میں آخر کی صرف ۹ سطریں مقالہ نگار اپنی معلوم
ہوتی ہیں۔ اس تحقیقی مقالہ کا تعارف پروفیسر غلام عمر خاں نے سپرد قلم کیا ہے۔ وہ ص، پر لکھتے ہیں :

"اردو کے ایک محقق اور استاد ہونے کے قطع نظر ڈاکٹر عبدالرحیم کی شخصیت میں میرے
لئے اس اعتبار سے کشش ہے کہ وہ قدیم اردو کے عظیم المرتبت شاعر ملک الشعراء نصرتی کے راست
اخلاف میں سے ہیں۔"

س میں دو باتیں جتنی صحیح ہیں پہلی بات اتنی ہی غلط ہے۔ ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار استاد ہیں اور ملک الشعرا
صرتی کے اخلاف میں سے ہیں لیکن انھیں محقق کہنا تحقیق کی تحقیر کرنا ہے۔ وہ آخر میں لکھتے ہیں۔

"یہ کتاب اردو کے سارے قابل ذکر نثر نگاروں کی ایک مبسوط تاریخ کی حیثیت اختیار کرگئی
ہے۔ اردو کے ایم اے اور تحقیقاتی درجہ کے طلبا اور محققین کیلئے اس تصنیف کی حیثیت حوالے کی ایک ایسی جامع کتاب
کی ہوگئی ہے جس میں کمیاب اور قیمتی مواد بھرا پڑا ہے۔ آجکل جبکہ پی۔ ایچ ڈی کے تحقیقی مقالوں کے کم ارز ہونے
کی شکایت عام ہے۔ جناب عبدالرحیم صاحب نے تلاش وجستجو اور تحقیق و تفحص کا ایک معیار پیش کیا ہے۔" (تعارف ص۱۲)

پروفیسر غلام عمر خاں کی مقالہ کے تعلق سے یہ رائے حیرت ناک بھی ہے اور افسوسناک بھی۔ اس پر کسی قسم
کا تبصرہ کرنے کے بجائے پروفیسر احتشام حسین کی کتاب "تنقید اور عملی تنقید ص ۲۲ کا اقتباس پیش کروں گا :

"وہ نقاد جو ہر ادبی کارنامے پر سر دھنتا ہے ہر ادیب اور شاعر کو پسند کرتا ہے۔ اور کسی نقطۂ
نظر سے تعرض نہیں کرتا بقول آسکر وائلڈ اس کا حال اس نیلام کرنے والے کا سا ہے جو ہر مال کی تعریف
کرتا ہے۔ اپنے سماجی شعور کے ساتھ مخلص ہونے کے لیے نقاد کو ہر ادیب اور شاعر کا تجزیہ کرنا
ہی پڑے گا۔"

۵ ۸

ڈاکٹر کمال الدین
شعبۂ اردو
سی-ایم-کالج، دربھنگہ

ڈاکٹر رضوان الحق صدیقی کا تھیسس

مطالعۂ اقبال تاریخ اسلام کی روشنی میں

متھلا یونیورسٹی ۱۹۷۲ء میں قائم ہوئی۔ یکم ستمبر ۱۹۷۹ء سے اردو میں پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم شروع ہوئی۔ اس سے قبل صرف ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۶ء تک متھلا یونیورسٹی سے نصف درجن سے زیادہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں اور ایک عدد ڈی لٹ کی ڈگری بھی تفویض ہو چکی ہے۔ کوئی بھی مقالہ اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے اس لیے ایک غیر مطبوعہ مقالہ کو ہی زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہ مقالہ جناب ڈاکٹر رضوان الحق صدیقی کا ہے۔ اس کا عنوان ہے "مطالعۂ اقبال تاریخ اسلام کی روشنی میں"۔

یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل :۔ "عصر اقبال تاریخی، سیاسی اور سماجی پس منظر" ص ۱ سے ص ۶۲ تک۔ باب دوئم :۔ "اقبال سوانحی تناظر میں" ص ۶۳ سے ص ۱۳۷ تک۔ باب سوئم :۔ "اقبال کے نظام فکر کی شعوری اور اکتسابی اساس" ص ۱۳۸ سے ص ۱۸۸ تک۔ باب چہارم :۔ بلاد و امصار در کلام اقبال ص ۱۸۹ سے ص ۱۹۹ تک۔ باب پنجم :۔ "کلام اقبال اسلامی تاریخ کے تناظر میں" ص ۲۰۰ سے ۲۱۶ تک۔ اس کے بعد نتیجۂ تحقیق ۸ صفحات پر محتوی ہے اور کتابیات کے صفحات ہیں۔

باب اول میں عصر اقبال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں ۶۲ صفحات خرچ ہوئے ہیں۔ اس میں عصر اقبال کے مختلف رجحانات و میلانات اور تحریکات و تنظیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عصر اقبال کو سمجھنے کے لیے اُس عہد کے تاریخی، سیاسی اور سماجی پس منظر کا جائزہ بڑے ہی عمیق اور بسیط طریقے پر لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سوچتا نند مورتی، ہمایوں کبیر، سر محمد اقبال، اے ان دھائٹ ہیڈ، ورنر ہیزن برگ اور ڈاکٹر تارا چند کی شہرہ آفاق تصانیف سے حوالے دیئے گئے ہیں۔ اس طرح بہت دور کی کوڑیاں جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انگریزی کے لمبے لمبے اقتباسات دئے گئے ہیں جن کے معنی اردو میں پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، کیونکہ بہر حال یہ کام ممتحن اور قاری کا ہے کہ انہیں سمجھے۔

ان اقتباسات کا مقصد لوگوں کو ہراساں کرنا بھی ہے۔ یہ باب اقتباسات کا مجموعہ ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

ص ۲ پر A.N.WHITE HEAD کی کتاب "ADVENTURE OF IDEAS" سے آٹھ سطور۔ K.M.PANIKAR کی تصنیف اور محمد علی جناح کی تقریروں سے ماخوذ اقتباسات، ص ۴ پر ۹ سطور، ص ۶ پر ۱۰ سطور، ص ۷ پر ۹ سطور، ص ۸ پر ۱۵ سطور، ص ۹ پر ۲۰ سطور، اور اردو کے ۵ سطور، پروفیسر سوچتانند مورتی کی تصنیف "INDIAN HISTORY" سے ص ۱۰ پر ۱۰ سطور۔ ص ۱۲ سے ۱۳ تک ۳۰ سطور، ہمایوں کبیر کی کتاب OUR HERITAGE سے ماخوذ ہے۔ اسی کتاب سے ص ۱۴ سے ص ۱۶ تک پھیلا ہوا ایک طویل اقتباس ہے۔ ص ۱۷ سے ص ۱۹ تک ۴۶ سطور کے اقتباسات ہیں۔ ص ۲۰ پر ۱۸ سطور کے۔ ص ۴۴ سے ۴۶ تک ۴۵ سطور کا اقتباس ہے۔ پھر ص ۴۷ سے ۴۸ تک ۴۲ سطور کی سبھاش چندر بوس کی تقریر CROSS ROAD سے لی گئی ہے۔ اور بغیر کسی ابہام و تفہیم کے دوسرا باب شروع کر دیا گیا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکزامینر کی قابلیت کا خیال کر کے ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے یا اس میں اکزامینر کا امتحان شرط تھا یا خود اپنی کم مائیگی۔ انگریزی کے ان طویل اقتباسات کے بجائے انگریزی کے مصنفوں کے ساتھ اردو تاریخوں سے بھی حوالے دئے جا سکتے تھے۔ انگریزی کا اردو ترجمہ دینا چاہئے تھا۔ یا اقتباس کا مفہوم پیش کر کے فٹ نوٹ میں انگریزی عبارت دینی چاہئے تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ مددگار نے مقالہ نگار اور ہدایت کار دونوں کو عجیب و غریب دنیا میں لاکر چھوڑ دیا ہے۔ تاکہ وہ ہمیشہ ان کے محتاج رہیں۔

تحقیقی مقالوں میں اقتباسات ناگزیر ہیں لیکن یہاں جتنے اقتباسات دیئے گئے ہیں وہ بے وقت کی راگنی معلوم ہوتے ہیں۔ انگریزی کے ان لمبے لمبے اقتباسات سے صرف صفحات کی تعداد بڑھائی گئی ہے۔ کوئی مطلب اخذ نہیں کیا گیا ہے۔ دراصل باب اول اپنے موضوع سے بھی کوئی مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ اس میں نامور مورخوں اور وقائع نگاروں کی ذہنی اور فکری نہج کا جائزہ عہد اقبال کے پیش نظر لیا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اس سے تاریخ اسلام پر ایک نئی روشنی پڑتی۔ عصر اقبال اور ان سے قبل بڑے بڑے تاریخ داں گذرے ہیں۔ اگر ان کے خاص رجحانات کی تفہیم ہوتی تو محنت غلط سمت میں لگ کر ضائع نہ ہوتی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف "نقوش اقبال" ص ۶۷ سے ص ۷۸ کے حوالے سے "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" از سر محمد اقبال سے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں جبکہ اصل کتاب تک بہ آسانی رسائی ہو سکتی تھی۔

دوسرا باب "اقبال سوانحی تناظر میں" یہ بھی بے ربط ہے اس میں علامہ اقبال کی پیدائش اور اس

سلسلے میں مختلف تحقیقات۔ ان کے آبا و اجداد اور ذریعۂ معاش وغیرہ کے بارے میں وہی باتیں دہرائی گئی ہیں جو بارہا لکھی گئی ہیں۔ اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، عبدالسلام ندوی، عبدالمجید سالک وغیرہ کی کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں۔ اس میں بھی طویل اقتباسات ہیں، اقبال کے شجرۂ نسب کی مختلف نقلیں ہیں۔ کوئی۔ ایم۔ اے رضوی ہیں جن کی ایک غیر مطبوعہ تھیسس سے ۴۶ سطور کا اقتباس ہے۔ اس تھیسس سے متعدد مقامات پر بلا چوں چرا اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔ بڑی امید بندھی تھی کہ اس باب میں کچھ نئی باتیں سامنے آئیں گی یا کوئی غور طلب موضوع اُبھرے گا لیکن " اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" پورا باب سوانحی واقعات پر مشتمل ہے جو بارہا لکھا جا چکا ہے۔ اگر اس میں یہی تحقیق ہوتی کہ علامہ اقبال نے اپنی زندگی کے کس دور میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا اور تاریخ اسلام کے کس پہلو سے متاثر ہوئے۔ اسکول اور کالج کی تعلیم کے دوران یا اس کے بعد انھوں نے کون کون سی تاریخ اسلام پڑھی اور کن اسلامی سرگرمیوں سے وابستہ رہے تو مقالہ بڑا ہی جاندار اور موضوع سے ہم آہنگ ہوتا۔

تیسرا باب شروع کرنے سے قبل رقمطراز ہیں :

" اس باب میں ہم بانی اسلام، ان کی سیادت، کلام الٰہی اور ان احادیث کا جائزہ لیں گے جن کا ذکر "کلام اقبال" میں اور ان کے خطبات میں آیا ہے۔ بعدہٗ صحابۂ کرام اور صوفیائے عظام کا ذکر ہوگا۔" ص ۱۴۹۔

بات شروع کی گئی ہے کچھ اس طرح کہ امید اپنا دامن بے محابا پھیلا دیتی ہے۔ لیکن اس میں اکبر شاہ نجیب آبادی کی تاریخ اسلام سے نبی کریمؐ کی بعثت کا حال لکھا گیا ہے اور اس کے کیا اثرات پڑے یہ وادیٔ میں ص ۱۴۹ سے ص ۱۵۹ تک قلم بند ہے۔ جب اقتباس ہوتا ہے تو یوں رقمطراز ہیں :

" اس طویل تاریخی اقتباسات کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن اس کا دینا بھی اس لیے ضروری تھا کہ آں حضرت کی ذات گرامی کے ورودِ مسعود کے ساتھ ساتھ عصری ادب کا ایک تہذیبی اور ذہنی پس منظر بھی سامنے آجائے۔ آں حضرت کا شجرۂ نسب ص ۱۵۸ پر دیا جاتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آں حضرت جس خاندان میں پیدا ہوئے، وہ خاندان ابتدا ہی سے چنا ہوا خاندان تھا۔"

حضورؐ کے خاندانی رفعت اور جاہ و جلال سے اقبال متاثر ہیں لیکن کہیں بھی یہ تحقیق یا نشاندہی کرنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ بانی اسلام، ان کی سیادت اور احادیث وغیرہ کلام اقبال میں کس طرح جلوہ گر ہوئیں۔ کہاں کہاں

جلوہ گر ہوئیں اور کن کن علامتی انداز میں پیش ہوئیں۔ اگر کچھ اس طرح بھی روشنی ڈالی جاتی تو بات بن جاتی۔ جیسے یہ شعر:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی تاریخ کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی خیر و شر کی علامت بھی ہے۔ اس طرح حضور کی زندگی سے متعلق بہت سے حقائق کلام اقبال میں ہیں جن کا احاطہ کیا جاسکتا تھا۔ محقق کو اس کا احساس ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگرچہ موضوع تحقیق صرف تاریخ اسلام تک محدود ہے لیکن اقبال کے ذہن کو سمجھنے کے لیے ذیل میں قدیم یونانی اور جدید ہم عصر مغربی مفکرین اور حکما، روسی، چینی مفکرین کی ایک فہرست دینے کی مجبوری ہے۔" ص۔

اس کے بعد ایک طویل فہرست ان مفکروں کی ہے جن کا تعلق نہ تو اسلام سے ہے اور نہ تاریخ اسلام سے۔ اس فہرست کو پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی سمجھ میں بات نہیں آتی سوائے اس کے کہ ممتحن اور قاری دونوں کو مرعوب کیا جائے، اور سپر نالج کا مظاہرہ کیا جائے۔ اس لیے کہ کوئی تیسرا ذہن سر ابھارنے لگتا ہے۔

"علامہ اقبال کے نظام فکر کی شعوری اور اکتسابی اساس" کا باب اچھا ہے۔ اس میں علامہ اقبال کی اکتسابی اور فکری جڑیں، عشق رسول، خلفائے راشدین، اہل بیت، اصحاب رسولؐ، بزرگان دین اور اصفیائے متین کے اثر کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ اقبال نے سب سے بڑا اکتساب روحانی و شعری مولانا جلال الدین رومی سے کیا، لیکن ان کا تذکرہ دوسرے لوگوں کی طرح کر دیا گیا ہے جو بے حد کھٹکتا ہے۔

باب چہارم میں کلام اقبال میں جن بلاد و امصار کا ذکر ہوا ہے۔ ان کا سرسری جائزہ لینے کے بعد ایک ایک فہرست پیش کر دی گئی ہے لیکن ان کا تعلق تاریخ اسلام اور کلام اقبال سے ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں اس پر روشنی ڈالی جاتی کہ کلام اقبال میں بلاد و امصار کا تذکرہ کچھ نئی معنویت بھی رکھتا ہے یا صرف تاریخ اور جغرافیہ کی طرح ہیں۔

اسی باب کے دوسرے حصہ میں جرمنی اور انگلینڈ کے مقامات کا بھی ذکر ہے۔ جیسے وہ اس طرح شروع کرتے ہیں:

"اقبال کے نسلی اور اشتمالی لاشعور کا مطالعہ کرنے کے بعد اور ان کے علمی اکتسابات کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات ضروری ہے کہ یورپ میں ان کے قیام اور ان کے سیاحتوں کی علمی حیثیتوں کو سمجھ

لیا جائے۔" ص ۱۹۲۔

اس کے بعد خود مقالہ نگار اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ساری باتیں موضوع سے الگ ہیں، چنانچہ وہ رقمطراز ہیں

" اقبال نے سیاحت کے دوران بھرپور مطالعہ بھی کیا۔ انھوں نے جدید و قدیم حکماء علما اور مفکرین کے افکار کو ایک مخصوص ذہنی اور تاریخی پس منظر میں سمجھنے اور ان سے مفید نتائج نکالنے کی کوشش کی اس علمی سرمایہ کی کوئی تفصیلی تحقیق بذات خود ایک علمی کارنامہ ہوگا، موجودہ تحقیق کے صفحات کے دامن میں ایسے کسی طویل اور مبسوط تجزیے کی گنجائش نہیں کیوں کہ زیر نظر موضوع تحقیق اقبال کی فکری اساس کو تاریخ اسلام کے پس منظر میں جانچنا ہے۔" ص ۱۸۹۔

اس کے بعد ایک طویل فہرست ان مقامات کی ہے۔ جہاں جہاں اقبال گئے اور ان اشخاص کا نام ہے جن سے وہ ملے لیکن وہ یہ نہیں ظاہر کرتے کہ ان تذکروں کا موضوع سے کیا تعلق ہے؟ اس کے بجائے اگر صرف انھیں شخصیتوں کا ذکر کرتے جن کا تعلق اسلامی تاریخ نویسی سے ہے، اور اقبال کے روابط ذہنی و علمی کی نشاندہی کرتے تو مقالہ بہت وقیع ہوجاتا۔ لیکن یہ کام محنت کا ہے۔

وہ یہ بھی کہیں تذکرہ نہیں کرتے کہ کن جدید و قدیم حکما، علما اور مفکرین کا مطالعہ اقبال نے سیاحت کے دوران کیا۔ سب سے اہم پانچواں باب ہے جو دراصل موضوع تحقیق سے متعلق ہے یا اُسے منظر اور گذشتہ ابواب کو پس منظر کہہ سکتے ہیں۔ تحقیقی مقالوں میں زیب داستان کے لیے بھی کچھ ابواب پیش کئے جاتے ہیں، لیکن اس مقالہ میں یہ ابواب زیبائش و آرائش کا سامان بھی نہ بن سکے ۔

مقالہ میں تمہیدی ابواب کی بھی اپنی ایک حیثیت ہوتی ہے تاکہ اس پس منظر میں اصل موضوع کے تمام ظاہری و معنوی پہلو چمک اُٹھیں اور گوشہ گوشہ منور ہوجائے۔ اور یہ اسی وقت ہوگا جبکہ ابواب کی ترتیب و انضمام و تفہیم منظر یعنی اصل باب کو پیش نظر رکھ کر کی جائے۔ لیکن یہاں عجیب و غریب حال ہے وہ باب جس کا عنوان "کلام اقبال اسلامی تاریخ کے تناظر میں" ہے۔ اس کا آغاز قوموں کے عروج و زوال کی کہانی سے ہوتا ہے۔ طبیعت خوش ہوتی اگر وہ کسی قسم کی کوئی بحث چھیڑتے۔ جس سے کلام اقبال کا تعلق تاریخ سے ہوتا یا تاریخ اسلام کے جن گوشوں سے اقبال متاثر تھے۔ ان کی نشاندہی ہوتی۔ موضوع سے ہٹ کر اردو یا آریائی زبانوں کی نسل کا شجرہ پیش کیا گیا ہے اور آریائی زبانوں سے اس کا تعلق بھی قائم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں غائر مطالعہ ملتا ہے جو بادی النظر میں اچھا معلوم ہوتا ہے اور مددگار کے وسعت مطالعہ کا دھونس بھی پڑتا ہے۔ اس لیے کہ ہر دو متعلقین

مقالہ میں سے کسی کے بس کی بات نہیں کہ اتنی دُور کی کوڑی وہ بھی انگریزی کے توسط سے لاسکے اور اگر دونوں نے محنت کی ہوتی تو مقالہ اس سے اچھا ہوتا۔ اور اتنا غیر متعلق نہیں ہوتا کیونکہ بہر حال ان کا رنگ تعلق ظاہر ہوہی جاتا۔ ص ۲۰۲ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

" جو لوگ انسانی وحدت کے قائل ہیں، ان کے لیے زبانوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کیونکہ انسان جس کی ساخت میں بنیادی وحدت پائی جاتی ہے اس کے اسالیب اظہار کی کثرت میں کسی رشتہ اشتراک کی تلاش کے لیے جواز بھی موجود ہے۔ لیکن کسی ایسی تلاش کے لیے کئی مقالات کی ضرورت ہے۔ اس مقالے میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کے لیے نہ تو صفحات میں گنجائش ہے اور نہ موضوع تحقیق ہی اس بات کا متقاضی ہے کہ اس پر کوئی طویل گفتگو کی جائے۔ لیکن اردو زبان کے ہمہ جہتی عرفان کے لئے ضمناً زبانوں کے شجرہ پر نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس پر لوبی کا دیا ہوا شجرہ پیش خدمت ہے۔" ص ۲۰۲ اور ۲۰۳ ۔

اس کے بعد زبانوں کا ایک بڑا شجرہ ہے۔ اس کے بعد ۵۷ سطور کا انگریزی میں حوالہ ہے جو ص ۲۰۳ سے ص ۲۰۷ تک ایک اچھی خاصی جگہ لے لیتا ہے۔ یہ حوالہ رابرٹ ایٹلر کی کتاب THE NEW BOOK OF KNOWLEDGE سے لیا گیا ہے۔ اس طویل اقتباس میں بھی لسانی رشتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ لسانی جائزہ موضوع تحقیق سے ان مل ہے۔ اگر یہی باب کی تمہید کے طور پر دیگر تاریخوں کے اثرات اسلامی تواریخ پر بتائے جاتے تو موضوع سے کچھ مناسبت ہو جاتی۔ لوبین کی امیر علی جیسے مورخوں کا تذکرہ بھی نہیں ہے۔ خود شبلی کی سیرۃ النبی سے کوئی خاص استفادہ نہیں ملتا ہے۔ اسلم جے راجپوری بھی نہیں ہیں۔ اس طرح بہت سے مورخین اسلام اور دیگر مورخین کی طرف نگاہ نہیں گئی۔ دراصل جو ہاتھ آگیا اُسے ساتھ کرلیا گیا ہے یا ساتھی ایک ہی ہے جسے ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے وہائٹ ہیڈ اپنی تصنیف ADVENTURE OF IDEA سے ۴۲ سطور لے کر پھر حاضر ہو جاتے ہیں۔ (ص ۲۰۸ اور ۲۰۹) اس کے بعد اقبال کا خطبہ THE RECONSTRUCTION IN THE THOUGHT OF ISLAM سے ایک طویل اقتباس ہے۔ اس کے بعد پھر وہائٹ ہیڈ اسکے بعد لکھتے ہیں:

" جہاں تک مطالعۂ تاریخ کا سوال ہے حیات انسانی اور تہذیب بشری اور سماجی نظام کا ارتقا ہمیں کتب تواریخ و سیر کے مطالعے سے ملتا ہے کیونکہ انھیں کتابوں میں گذشتگاں کے اقوال و افکار ضابطۂ تحریر میں لائے ہیں اس صورت میں قوموں کے فکری ارتقا کی واقفیت

کے لیے قوموں کی تاریخ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔" ص ۲۱۸

اس کے لیے بہ طور دلیل ابن خلدون کے مقدمہ سے ایک طویل حوالہ درج ہے، جس میں علم تواریخ کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ علامہ اقبال نے "رموز بے خودی" کے دیباچے میں قومی زندگی کے استحکام کا بیان کرتے ہوئے قومی تاریخ کی حفاظت کرنی ضروری قرار دیا ہے۔ اسے بمنزلہ قوت حافظہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کے فارسی کلام سے حوالے دیئے گئے ہیں۔ اقبال کامل از عبدالسلام ندوی سے ایک طویل حوالہ جس میں تاریخ کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد ص ۲۲۳ سے ۲۲۵ تک یہ بتایا گیا ہے کہ ایک مورخ کو کیا ہونا چاہیے۔ اس کے حوالے کے طور پر پھر ابن خلدون کے اردو ترجمے سے حوالے دیئے گئے ہیں۔

مقالہ نگار کے اس قول سے امید بندھتی ہے کہ اب وہ اصل موضوع کی طرف لوٹ رہے ہیں اور پس منظر کے بعد ہم منظر دیکھ سکیں گے:

"اقبال کا تاریخی اثاثہ وہ ہے جس سے بلا خوف تردید اسلامی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اسلامی تاریخ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔" ص ۲۳۰

اس کے بعد مسدس حالی کے حوالے سے عرب کی تاریخ بیان کی گئی ہے نتیجتاً عصری سیاسی کشاکش کے تناظر میں اقبال کو سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا وہ مسلمانوں کا سیاسی زوال تھا۔ اس کے حوالے میں شکوہ کے نو بند نقل کئے گئے ہیں۔

کس نے آتش کدہ ایران کو ٹھنڈا کیا۔ کس عہد میں یہ واقعہ پیش آیا کہ اللہ اکبر کہتے ہی بت سرنگوں ہو گئے۔ غرضکہ اس قسم کی بے شمار تلمیحات ہیں جنھیں تاریخ اسلام کی روشنی میں جانچا جاتا تو بات بن جاتی یہاں بھی مقالہ نگار انگریزی کے اقتباس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک کتاب SIX LECTURES سے دس[10] صفحات پر محتوی ایک اقتباس ہے، لیکن نہ تو اس کا تجزیہ ملتا ہے اور نہ یہ ملتا ہے کہ کس مورخ اسلام کی کتاب سے ماخوذ ہے اور نہ شان نزول سمجھ میں آتی ہے۔ SIX LECTURES کا کوئی حوالہ نہ فٹ نوٹ میں ہے۔ نہ صفحات کی تعین ہے اور نہ کتابیات میں اس کا تذکرہ ہے کہ یہ کس کی تصنیف ہے۔

خضر راہ، شمع و شاعر، ذوق و شوق وغیرہ نظمیں نقل کر دی گئی ہیں اور ان کا مفہوم بیان کر دیا گیا ہے۔ تاریخ اسلام کی روشنی مفقود ہے۔ حالانکہ ان کی بیشتر نظمیں تاریخ اسلام کے واقعات و حالات سے لبریز ہیں۔ یہ بھی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اقبال کی غزلوں کو بالکل اچھوت گردانا گیا ہے۔ اس طرح سوائے بہات کے کچھ

حاصل نہیں ہوتا۔ صرف ایک نظم "مسجد قرطبہ" کے متعلق مقالہ نگار کی عالمانہ تحقیق کی ایک جھلک پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے کہ کس طرح اس کا تعلق تاریخ اسلام سے قائم کیا گیا ہے۔

"مسجد قرطبہ" اقبال کی ایک ہمہ جہتی نظم ہے۔ یہ نظم جذبے کی ترسیل اور طہارت کے زیریں تلازمات سے بہ تدریج تعلیق چھلانگیں لگاتی ہوئی نقطۂ ارتکاز، عرفان، عشق ذات تک پہونچتی ہے۔ اس میں پانچواں تعلیق یعنی حکیمانہ سطح بھی پوری طرح اُجاگر ہے۔ یعنی یہ نظم اپنے ہر بند میں اپنے پہلے شعر سے ایک داخلی ربط رکھتی ہے جو شعر عصری زمانی اور مکانی تصور کا آئینہ دار ہے۔ اگر اس نظم کے پہلے شعر کی عصری آگہی کے تناظر میں تفسیر کی جائے گی تو زینون یونانی مفکر کے نظریۂ زمان سے لے کر اضافیت کی زمانی و مکانی تصور تک کے مسائل پیش نظر رکھنے ہوں گے" ص ۳۱۰۔

اس طرح کی فلسفیانہ بحثیں اگر نتیجہ خیز ہوتی تو موضوع میں مزیداری آجاتی لیکن اسلامی تاریخ کی تناظر میں کلام اقبال کی پرکھ موضوع سے انحراف کی عجیب و غریب مثال ہے۔ اس کے بعد بھی جو تنقیدی حصّہ ہے اس سے بہتر یوسف سلیم چشتی کی شرح "بالِ جبریل" میں ہے۔

اُندلس کی تاریخ کے پس منظر اور عصری آگہی کے تناظر میں اس نظم کا مطالعہ کیا جا سکتا تھا۔ مسجد قرطبہ کی تاریخ کے تناظر میں اس مسجد کے محراب و مینار اور بنائے پائیدار اور ستون بے شمار کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ پھر اس مسجد کی تعمیر کا دور، توسیع کے ادوار اور عہد خلافت کو بھی تاریخ کے تناظر میں پیش کرنا چاہیئے تھا۔ وہ کون سی خاص باتیں ہیں جس کی وجہ سے اس معجزہ فن کو خونِ جگر کی نمود کہا گیا ہے۔ وہ کون کون سے لوگ تھے جن کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ کہا گیا ہے۔ کیا اقبال کا یہ قول محض جذبات شعری پر مبنی ہے یا یہ حقیقت ہے؟ اسلامی اندلس کی تاریخ کی روشنی میں ایسے دعووں کی پرکھ ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن سوائے مُبہمات کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اگر مقالہ نگار نے محمد عنایت اللہ کا مضمون "قرطبہ کی جامع مسجد"[1] ہی پڑھ لیا ہوتا تو اس نظم کا تعلق تاریخ اسلام سے جوڑ لیتے اور تاریخی تناظر کی بہت حد تک دریافت ہو جاتی، لیکن فلسفہ کی موشگافیوں سے فرصت ہی کہاں ملی (کیونکہ مددگار کو مقالہ کی تیاری سے مطلب تھا۔ اور عجیب و غریب میدانوں میں لے جا کر ہدایت کار مقالہ نگار اور قاریوں کو چھوڑ دینا تھا)۔

اس کے بعد نظم ذوق و شوق کا بھی سطحی تنقیدی جائزہ لے کر اس باب کو اختتام تک پہونچایا گیا ہے۔

---

[1] علی گڑھ میگزین انتخاب نمبر ۲، ۱۹۷۵ء مضمون "قرطبہ کی جامع مسجد" از محمد عنایت اللہ ص ۲۸ سے ۲۹ تک۔

امید بندھی تھی کہ شاید نتیجۂ تحقیق میں ہی کچھ مطالعہ کا ثمرہ ملے لیکن اول تو یہ حصہ بڑا ہی مختصر اور لاغر ہے جو صرف آٹھ صفحات میں ہے اور اس میں بھی اس پر زیادہ افسوس کیا گیا ہے کہ اقبال کو لوگ فلسفی کیوں نہیں مانتے۔ اور ص ۳۲۱ سے ۳۲۳ تک اسی قسم کے لعن وطعن پر زور قلم صرف کرتے ہوئے کہتے ہیں :

" آج بھی کچھ لوگ مدرسوں میں ایسے ملتے ہیں جو اقبال کو مفکر اور فلسفی تسلیم کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کہ عصری تفکر اور عصری فلسفوں سے نابلد ہیں۔ اقبال کے فکر کی بنیادی اساس، ربط داخلی کا عرفان بغیر وہائٹ ہیڈ اور سر جیمس جینس اور جدید قومی طبیعیات کے مطالعہ کے ممکن بھی نہیں۔" ص ۳۲۱ ۔

لیکن خود بھول جاتے ہیں کہ اس کے لئے الگ ایک تحقیقی مقالہ لکھ ڈالیں۔ یہاں کلام اقبال "اسلامی تاریخ کے تناظر" میں پیش کرنا ہے نہ کہ مغربی علم مابعد الطبیعیات کے تناظر میں۔

(اس لئے اکثر شبہ سر نکالتا ہے جو یقین میں بدل جاتا ہے کہ یہ مقالہ ایک ایسے شخص کے ذہن کی پیداوار ہے جو نہ مقالہ نگار کا ہے اور نہ ہدایت کار۔)

اس طرح یہ تھیسس موضوع سے غیر متعلق مضامین کا عجیب و غریب انبار ہے۔ اس سلسلے میں تحریر سے تفویض تک چار صدیقیوں کی تصدیق ہے۔ اگر اس تناظر میں کذب کی کھائی میں ڈال دیا جاؤں تو بھی مجھے کوئی غم نہیں ہوگا۔ میں نے اس مقالہ کو موضوع صرف انکشاف حقائق کے لیے بنایا ہے۔

●●

ڈاکٹر گیان چند
شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی

ڈاکٹر عابد پشاوری کا تھیسس

انشاء اللہ خاں انشاء

ہمارے جو محققین درس گاہوں سے متعلق نہیں رہے اور جن کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لقب نہیں لگ سکا وہ درس گاہوں کی تحقیق پر، نیز ڈاکٹروں اور پروفیسروں پر طنز کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنواتے۔ اس میں ایک نفسیاتی گرہ معلوم ہوتی ہے۔ جو تحقیقی کام ڈگری کے لئے نہیں کیے جاتے وہ سب کے سب کب اعلیٰ معیار کے ہوتے ہیں۔ وہی کیفیت ڈاکٹریٹ کے مقالوں کی ہے۔ ہر نوع میں پست کی تعداد بلند سے زیادہ ہوتی ہے۔ میری نظر سے ایسے ایک دو نہیں متعدد تحقیقی مقالے گزرے ہیں جن کے کئی ابواب قابلِ داد ہوتے ہیں۔ بہتر مقالے عموماً نئے ریسرچ اسکالروں کی تخلیق نہیں ہوتے بلکہ ان اساتذہ کے رشحاتِ قلم ہوتے ہیں جو برسوں ایم اے کی جماعتوں کو پڑھا کر اپنے شعور کو پکا چکے ہیں۔

پی ایچ ڈی کی ڈگری پانے والے دو چار بہترین مقالوں میں ڈاکٹر شیام لال کالڑا عابد پشاوری (حال پروفیسر وصدرِ شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی) کا "انشاء اللہ خاں انشاء" ہے جسے ۱۹۸۵ء میں یوپی اردو اکادمی لکھنؤ نے شائع کیا۔ عابد نے یہ کام ۱۹۶۲ء کے وسط میں دلی یونیورسٹی میں شروع کیا۔ اس وقت عنوان تھا انشاء اللہ خاں انشاء دہلوی حیات شخصیت اور کارنامے۔ وہاں وہ اسے مکمل نہ کر سکے۔ ۱۹۶۷ء میں جموں یونیورسٹی میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ میں نے انہیں سمجھا بجھا کر تجدیدِ تحقیق کے لیے راضی کرلیا۔ میری نگرانی میں مقالے کا رجسٹریشن ہوگیا۔ بقول ان کے، عنوان ٹھہرا "انشاء اللہ خاں انشاء دہلوی۔ حیات، شخصیت اور ہندی نثر میں ان کا حصہ"۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں نے عنوان میں اردو نثر نہ لکھ کر ہندی نثر لکھا ہوگا۔ اس کا کوئی جواز نہیں۔ جب تک میں یونیورسٹی کے کاغذات نہ دیکھ لوں، میں نہیں مان سکتا کہ عنوان میں ہندی کا لفظ تھا۔

بعد میں مقالے کی نوعیت "انشاء حیات اور نثری کارنامے" کی ہوگئی۔ اس پر ۱۹۷۵ء میں ڈگری ملی۔ ممتحن تھے مالک رام صاحب، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور ڈاکٹر محمود الٰہی۔ مالک رام صاحب

نے جموں آکر زبانی امتحان لیا۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے اپنی رپورٹ میں ڈنکے کی چوٹ پر لکھا کہ انھوں نے آج تک ڈاکٹریٹ کا اتنا اچھا مقالہ نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے بھی تقریباً یہی بات کہی۔ ۶۹۰ صفحات کا یہ مقالہ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ عابد انشا پر دو اور کتابیں لکھ چکے ہیں۔ (۱) انشاؔ کے حریف و حلیف' اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد نے ۱۹۷۹ء میں شائع کی۔ اس میں عظیم، مصحفی، فائق اور قتیل سے انشاؔ کے معرکوں کا بیان ہے نیز انشاؔ کے حلیف محمد حسین آزاد کی تحریر کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ کتاب مقالے سے ماخوذ ہے لیکن اس میں معرکوں' بالخصوص مصحفی و انشاؔ کے معرکے کی تفصیل کہیں زیادہ ہے۔ (۲) دوسری کتاب' متعلقاتِ انشاؔ' پر مقالے کی طرح ۱۹۸۵ء سنہ اشاعت دیا ہے لیکن یہ ۱۹۸۶ء میں سامنے آئی۔ اس میں سات مضامین ہیں۔

۱۔ کلامِ انشاؔ کا ایک نادر مخطوطہ۔ ۲۔ خاندانِ انشاؔ کچھ نئی معلومات۔ ۳۔ رانی کیتکی کی کہانی۔ ۴۔ سلکِ گوہر کا دوسرا اور رانی کیتکی کا تیسرا مخطوطہ۔ ۵۔ رانی کیتکی کی کہانی' ایک جائزہ۔ ۶۔ بوالہوس نے ... ۷۔ مرغ نامۂ انشاؔ۔

پانچویں اور چھٹے مضمون میں رانی کیتکی کی کہانی کی دو حالیہ تدوینوں پر تنقید و تنقیص کی ہے۔ خاندانِ انشاؔ کے بارے میں مقالے میں جو کچھ لکھا ہے' مجموعے کے مضمون میں اس پر قدرے اضافہ ہے۔

۱۹۶۲ء میں ریسرچ اسکالر عابد دلّی میں قاضی عبدالودود سے ملے اور ان سے اپنے موضوع کے بارے میں مدد چاہی۔ قاضی صاحب نے جواب دیا۔

"تم انشاؔ پر کیا کام کرو گے! یہ سارا زور میرا ہے۔ میں نے اس پر بیس سال لگائے ہیں۔ میں تم کو کیوں بتاؤں؟"

عابد نے اس موضوع پر ۱۳ سال لگائے۔ انہوں نے جو کچھ برآمد کیا وہ مقالے کی شکل میں موجود ہے۔ قاضی صاحب مرحوم اس مقالے کی شہرت سُن چکے تھے اور اسے دیکھنے کے مشتاق تھے لیکن یہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ مقالے کی قدر و قیمت کا اندازہ کتاب کو دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ ایک مضمون میں اس کے اکتسابات کی سمائی نہیں۔ یہ کچھ عجیب معلوم ہوگا کہ مقالے کا نگراں ہی مقالے پر تبصرہ کرے۔ وہ تعریف کے سوا اور کیا کرے گا لیکن موجودہ تبصرے میں آپ کو یہ صورتِ حال

نہ ملے گی۔ ملاحظہ کیجیے مقالے کا اختتام۔ میں اپنے زیرِ نگرانی ریسرچ اسکالروں کے کام میں اپنی اہلیت (اگر وہ کچھ ہے) شامل کرنے میں یقین نہیں رکھتا انہیں آزادی رائے دیتا ہوں۔ اور اگر میرا کوئی رفیقِ کار لیکچرر مقالہ لکھ رہا ہو تو میں اسے اور بھی چھوٹ دیتا ہوں۔ اس کی پختہ کاری پر اعتماد کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ جموں یونیورسٹی میں نگراں، مقالے کا ممتحن نہیں ہوتا، اس لیے میں اور بھی بری الذمہ ہوں۔ عابد نے اشاعت کے وقت مقالے میں کچھ اضافہ و ترمیم کی ہے۔ میں نے تبصرہ لکھنے کے لیے اسے پڑھا تو ایسا لگا جیسے میں ایک نئی کتاب کو پہلی بار پڑھ رہا ہوں۔ اگر میں تبصرے کو تعارف بنا کر اس کی اہم بحثوں اور دریافتوں ہی کا احاطہ کروں تو یہ مضمون ایک دفتر ہو جائے گا۔ پھر بھی گاگر میں ساگر بھرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

عابد نے مقالے کا مواد جمع کرنے کے لیے کہاں کہاں کی خاک چھانی، کن کن حضرات سے ملے، کن کن کنوؤں میں بانس ڈالے، کن کن ذخیروں کو کھنگالا، اس کی تفصیل مقدمے میں دی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے انشآر کے اخلاف کی تلاش میں غیر معمولی کاوش کی ہے۔ مقدمے میں فارسی و ترکی تصانیفِ نثر کے شمول کا جواز دیا ہے کیوں کہ دریائے لطافت، لطائف السعادت اور ترکی روزنامچے کا اردو زبان، نیز انشا کی شخصیت سے گہرا تعلق ہے۔ لیکن کتاب میں ایک عجیب کمی رہ گئی ہے کہ اس کے شروع میں کسی قسم کی فہرست مضامین نہیں۔ مقدمے کے آخر میں مارچ ۱۹۷۵ء کی تاریخ پڑی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی مقدمہ ہے جو مقالہ داخل کرنے کے وقت لکھا گیا تھا۔ بہتر ہوتا کہ وہ اشاعت کے وقت اسے از سرِ نو لکھ دیتے۔ ویسے اس میں ایک آدھ جگہ تو اضافے ہوئے ہی ہیں مثلاً مقدمے کے صفحہ ۱ پر ساغر مہدی صاحب کے ۱۹۸۰ء میں انتقال کی خبر یا ڈاکٹر اکبر حیدری کے بارے میں یہ شگفتہ جملہ

" موصوف کو ہر نسخہ بخطِ مصنّف لگتا ہے "، ص ۲۳

مقدمے میں اخلاف کی تلاش کے سلسلے میں پُر مغز تحقیقی معلومات آگئی ہیں۔ انہیں مقدمے کے بجائے متنِ کتاب میں انشآر کے خاندان کے سلسلے میں دیا جا سکتا تھا۔ متن کی ابتدا سیاسی اور سماجی پس منظر سے ہوئی ہے۔ پہلے اس کا بہت چلن تھا۔ اب انہیں باتوں کی تکرار کے سبب پس منظر کی قدر گھٹ گئی۔ اب کہا جاتا ہے کہ جب تک بالکل ضروری نہ ہو اسے دینے کی ضرورت نہیں۔

کتاب میں یہ باب مفصّل اور مدلّل ہے۔ چونکہ انشاؔ کا تعلق والیانِ ملک سے رہا ہے اس لیے اس کا کم از کم اتنا حصّہ ضروری تھا جو ان کے والد کے عہد کے والیان مرشد آباد، شاہ عالم، آصف الدولہ، سلیمان شکوہ اور سعادت علی خاں کا احاطہ کرلیتا۔ اگر اس سے زیادہ تفصیل آگئی ہے تو اس کی ذمّے داری مجھ پر ہے کہ اس زمانے تک میں پس منظر کے حذف یا اختصار کا قائل نہ تھا۔ اس کے خلاف آوازیں بعد میں اٹھی ہیں۔

دوسرا باب ان کے آبا و اجداد اور وطن سے متعلق ہے جس میں میر ماشا اللہ کے متعلق مفید و مستند معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ تیسرا ضخیم باب "انشاؔ کے سوانح" صہ ۹۷ سے ۲۸۲ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مصنف نے کیا کیا دادِ تحقیق دی ہے، کتاب میں ملاحظہ کیجیے۔ سنہ ولادت کے بارے میں جملہ پیش رو بیانات کو اصفحات میں پرکھ کر طے کیا کہ انشاؔ ۵۴-۱۷۵۲ء کے درمیانی زمانے میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ وطن کی بحث میں انہوں نے یہ چونکانے والا انکشاف کیا کہ انشاؔ دلی میں صرف دو سال یعنی ۸۱-۱۷۸۰ء میں رہے (صہ ۹۳) ان کی زندگی کا سب سے زیادہ حصّہ لکھنؤ میں گزرا۔ اس کے باوجود انشاؔ نے اہل زبان ہونے کے لیے دہلوی ہونا، بلکہ دلّی کے چند مخصوص محلّوں کا باشندہ ہونا، ضروری قرار دیا ہے۔ تعلیم و تربیت کے ضمن میں ان کی زبان دانی کی بحث ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ انشاؔ نے ایک قصیدے میں ۱۴ زبانیں استعمال کی ہیں اس سے مقالہ نگار متفق نہیں۔ انہوں نے متعلقہ زبانوں اور اشعار کا تجزیہ کرکے ثابت کیا ہے کہ انشاؔ ان زبانوں کے دوچار الفاظ یا محض لہجہ ہی جانتے تھے، زبان سے واقف نہ تھے۔ لکھتے ہیں۔

"وہ اتنی زبانوں پر قادر نہیں جتنی پر قادر ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ کئی بولیوں میں ان کو صرف شُدبُد ہے لیکن وہ ان کے لہجوں کی نقل اتارتے ہیں۔ (صہ ۱۶-۵۱۵)

مقالے میں ذیل کی بحثیں اور دریافتیں اہم ہیں:

۱ الماس علی خاں کے فارسی قصیدے سے حساب لگا کر انشاؔ کے ورودِ لکھنؤ کی تاریخ ۱۲۰۳ھ دریافت کرنا۔ (صہ ۱۳۱)

۲ لطائف السعادت اور مثنوی شکارنامے کے بیانات کی بنا پر طے کرنا کہ انشاؔ ۱۲۱۹-۲۰ھ میں سعادت علی خاں کے متوسل ہوئے۔ (صہ ۱۵۵)

۳ آبِ حیات سے انشا سے متعلق لطیفوں کی تردید ان کے اصل ماخذ کی روشنی میں۔
۴ قاضی عبدالودود کے بیان کی تردید کر کے طے کرنا کہ انشا سعادت علی خاں کے یہاں سنہ ۱۲۲۹ھ میں معزول ہوئے۔
۵ سعادت علی خاں کے کردار کی کمزوریوں کا بیان (ص ۲۱۲ اور اس کے آگے)
۶ انشا کے مجنوں ہونے کی تائید میں تذکرۂ آزردہ کا اقتباس تلاش کرنا (ص ۲۳۴) نیز خود انشا کی فال گیری سے تائید (ص ۲۳۹) مجنوں ہونے کا زمانہ ۲۸ جمادی الاول ۱۲۲۹ھ اور رجب ۱۲۲۹ھ کے بیچ طے کرنا (ص ۲۲۵)
۷ دریافت کرنا کہ انشا کو دوبارہ سودا ہوا تھا۔ (ص ۳۹-۲۳۸)
۸ ازدواج اور اولاد کی تفصیل اور ان کی تاریخ وفات بالخصوص تعالی اللہ خاں کی وفات کے قطعاتِ تاریخ کا تجزیہ (ص ۲۵۲ اور اس کے آس پاس)
۹ مصحفی کا اعتراف دریافت کرنا کہ وہ آخر عمر تک عربی اور دوسرے علوم میں دستگاہ نہ رکھتے تھے۔ (ص ۴۴-۲۴۳)
۱۰ مصحفی کی سیرت کی خامیوں کو شواہد کے ساتھ تفصیل سے گنانا (ص ۲۷۲ اور اس کے آگے)
۱۱ بندرابن راقم کے رائیہ قصیدے کی تاریخ (ص ۶۳-۲۶۲)
۱۲ کئی وجوہ سے رانی کیتکی کی کہانی تاریخ ۱۷۸۸ء کے آس پاس طے کرنا (ص ۴۴۵)
۱۳ دریائے لطافت اور ریختا کی دستور الفصاحت کی اولیت کی بہت مفصل اور باریک بحث۔ مولانا عرشی کے فیصلوں سے مدلل اختلاف۔ (ص ۸۴-۵۷۳)
۱۴ دریائے لطافت، سلکِ گوہر، لطائف السعادت اور ترکی روزنامچے کا تجزیاتی تعارف۔ دریائے لطافت سے اردو حروفِ تہجی کی تفصیل بطورِ خاص قابلِ قدر ہے۔

اب "آبِ حیات" کے بعض غلط بیانات کی تردید پیش کی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے ان میں سے بعض انکشافات قاضی عبدالودود کے مضامین میں ملتے ہوں لیکن کتابی صورت میں عابد ہی کے یہاں آئے ہیں۔ انہوں نے سوانح و شخصیت کے سلسلے میں آبِ حیات کے بیانات کی جس چابک دستی سے تردید کی ہے، ہر بیان کے اصل ماخذ کا سراغ لگا کر آزاد کی عبارت آرائی کا پردہ چاک کیا ہے، اسے دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنے کے سوا چارہ نہیں کہ آبِ حیات

جھوٹ کی پوٹ ہے اور آزاد ایک جعل ساز ہے جس نے شعوری طور پر غلط بیانیاں کی ہیں۔ آب حیات کے اغلاط کا بیان کتاب میں موقع بہ موقع بھی ہے اور آخر کے جزو "انشا آب حیات میں" کے اندر بھی۔ کتاب 'انشا کے حریف و حلیف' میں یہ قدرے اور تفصیل سے ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انشا کے تعلق سے آزاد کا تقریباً ہر جملہ غلط ہے۔ ذیل میں آب حیات کی تردیدات کا شمار کرایا جاتا ہے۔ آزاد اور عابد کے بیانات کا خلاصہ میرے الفاظ میں ہے۔

۱ آزاد: انشا مرشد آباد سے دلی آئے

عابد: دراصل انشا مرشد آباد سے لکھنؤ گئے (صہ ۳۸۶)

۲ آزاد: انشا دلی آئے تو سودا، میر، درد وغیرہ وہاں نہ تھے۔

عابد: انشا ۱۱۹۴ھ میں دلی آئے۔ اس وقت میر اور درد وہاں موجود تھے۔ (صہ ۸۷-۳۸۶)

۳ آزاد: عظیم سے معرکے میں انشا نے یہ غزل پڑھی۔ ع اک طفل دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے

عابد: یہ غزل لکھنؤ میں انشا و مصحفی کے معرکوں کی یادگار ہے۔ مصحفی نے اس کے جواب میں دو غزلہ لکھا تھا جو خود آب حیات میں درج ہے۔ عابد صہ ۳۸۸)

۴ آزاد: غلام قادر روہیلہ شاہ عالم کا نقد بصارت لے گیا تھا۔ انشا جمعرات کو نبی کریم جاتے تو بادشاہ کی جیبوں سے روپیے نکلوا لیتے۔ بادشاہ کہتے کہ 'ہاں ضرور کل ہے' کہ وہاں سے بال بچوں کے لیے کچھ لا سکو۔

عابد: شاہ عالم انشا کے دہلی چھوڑنے کے سات سال بعد اندھے کیے گئے۔ قیام دہلی میں، بلکہ اس کے کئی سال بعد تک انشا کے کوئی بچہ نہ تھا۔ بادشاہ قبا پہنتے تھے جس میں آج کل کی طرح جیبیں نہیں ہوتی تھیں نیز وہ نقد روپیہ لیے نہیں پھرتے تھے۔ (صہ ۲۸-۱۲۵)

۵ آزاد: انشا آصف الدولہ کی سخاوت کا شہرہ لے کر لکھنؤ گئے۔

عابد: انشا اپنے والد کے ساتھ چھٹے سال اسی حاتم ثانی کی سخاوت کے جلوے دیکھنے کے بعد بد دل ہو کر اس کے دربار سے نکلے (صہ ۵۰ سے صہ ۱۸۶)

۶ آزاد: لڑکپن میں انشا گاتے تھے اور ستار خوب بجاتے تھے۔

عابد: اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ غالباً آزاد نے جرأت کی ستار نوازی کو انشا سے منسوب کر دیا ہے[۹۵]

۷ آزاد: لکھنؤ جاتے ہی انشا مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں پہنچ گئے۔

عابد: سلیمان شکوہ انشا کے ورود کے کم از کم دو سال بعد لکھنؤ پہنچے (ص ۳۹)

۸ آزاد: پہلے مرزا سلیمان شکوہ مصحفی سے اصلاح لیتے تھے جب انشا پہنچے تو مصحفی کا مصحف طاق پر رکھ دیا گیا۔

عابد: خود مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں لکھا ہے کہ انشا کی سفارش سے انہیں سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی ہوئی (ص ۱۴۸)

۹ آزاد: انشا تفضل حسین خاں کی سفارش سے سعادت علی خاں کے دربار میں پہنچے

عابد: سعادت علی خاں تفضل حسین خاں سے ناراض تھے۔ ۱۲۱۳ھ میں انہیں کلکتہ بھیج دیا۔ ۱۲۱۵ھ تک ان کا انتقال ہو گیا۔ انشا ۲۰-۱۲۱۹ھ میں سعادت علی خاں کے ملازم ہوئے (۴۷-۱۴۵ نیز ص ۱۵۵)

۱۰ آزاد: انشا نے سعادت علی خاں کی ملازمت میں ہزاروں کو مراتب اعلیٰ تک پہنچایا۔

عابد: ہزاروں تو درکنار دو چار کو بھی نہ پہنچا سکے۔ سعادت علی خاں سخی نہیں، جز رس تھے (ص ۲۵۱)

۱۱ آزاد: انشا سعادت علی خاں کے ساتھ ننگے سر کھانا کھا رہے تھے کہ نواب نے ان کے سر پر ایک دھول رسید کی۔

عابد: تز کی روزنامچے میں کئی جگہ سعادت علی خاں کے کھانا کھانے کا ذکر ہے لیکن انشا نے کبھی ان کے ساتھ نہیں کھایا۔ ان کے کھانے کے وقت یہ کھڑے رہتے تھے۔ آزاد کا ماخذ تذکرہ مخزن الغرائب ہے جس میں لکھا ہے کہ انشا دونوں وقت سعادت علی کے ساتھ شریک طعام ہوتے تھے لیکن یہ تذکرہ ۱۸۰۲ء کی تالیف ہے جب انشا سلیمان شکوہ کے ملازم تھے، سعادت علی خاں تک پہنچے بھی نہ تھے۔ (ص ۶۷-۱۶۶)

۱۲ آزاد: دفتر کے ایک مولوی صاحب نے اجناس کو اجنا لکھا۔ گرفت ہونے پر انہوں نے قاموس و صراح سے تاویل کی

عابد: اہل دفتر تو کجا بڑے پڑھے لکھے قاموس و صراح کی عبارتوں کو صحیح پڑھ بھی نہیں سکتے، سمجھنا تو درکنار آزاد کا ماخذ خوش معرکۂ زیبا ہے جس میں 'اجنا' سے متعلق ایک قطعہ ہے۔ آزاد نے اس قطعے اور انشا کی سات رباعیوں کی بنا پر لطیفہ گڑھا۔ (ص ۷۰-۱۷۱)

۱۳ آزاد: ایک دن سعادت علی خاں کے پاس ریزیڈنٹ جان بیلی آئے ہوئے تھے۔ انشا نواب کے پیچھے کھڑے رومال ہلاتے تھے۔ جان بیلی نے تین بار انشا کی طرف دیکھا اور تینوں بار انشا نے طرح طرح کے منہ بنا کر انہیں چڑایا۔

عابد: ڈاکٹر آمنہ خاتون نے اس پر تبصرہ کیا ہے کہ اس دور میں کسی ہندوستانی کو انگریز سے ایسی چہلیں
کرنا جان کی بازی ہار کر ہی ممکن تھا (ص ۴۲۱)

عابد: لاہور میں ڈاکٹر لائٹنر (LIETNER) نے کالج پرنسپل اور بعد میں ڈائرکٹر تعلیمات کی
حیثیت سے آزاد کو بہت پریشان کیا تھا۔ آزاد نے جان بیلی کا منہ چڑا کر اپنے دکھے دل کی تسکین
کا سامان کر لیا (ص ۲۳-۴۲۲)

۱۴ آزاد: سعادت علی خاں اور جان بیلی میں ہجر اور ہَجر کے تلفظ پر اختلاف تھا۔ انشا نے پہلے ہجر کو صحیح
بتایا لیکن سعادت علی خاں کی تیوری دیکھ کر جامی کا شعر پڑھ کر ہَجر کی تائید میں سند پیش کر دی۔

عابد: سوانحاتِ سلاطینِ اودھ کے مطابق سعادت علی خاں اور جان بیلی میں ہمیشہ جلی کٹی چلتی تھی۔
دوستی اور ہم نشینی کا سوال نہ تھا۔ ہجر اور ہَجر کی بحث دراصل انشا اور قتیل میں ہوئی تھی جس کا ذکر
رقعاتِ قتیل میں بھی ہے اور انشا کے ایک منظوم خط بہ نام قتیل میں بھی۔ اس سے آزاد نے جان بیلی
سے متعلق ہجر کے تلفظ کا سلیقہ وضع کر دیا۔ انشا کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سند کا شعر جامی کا
نہیں، حافظ کا ہے (ص ۷۵-۱۷۱)

۱۵ آزاد: انشا نے سعادت علی خاں کے مصرع 'پگڑی تو نہیں ہے یہ فراسیس کی ٹوپی' پر غزل کہی۔

عابد: سعادت علی خاں نے نثر میں فقرہ کہا تھا 'یہ تو پگڑی نہیں فراسیس کی ٹوپی ہے'۔ سعادت
علی خاں شاعر نہیں تھے۔ انشا نے اسے مصرع بنایا اور بعد میں اس پر غزل کہی۔ ترکی روزنامچے
کی عبارت کو مولانا عرشی بھی غلط سمجھے اور انہوں نے نثری فقرے کو آخر میں سعادت علی خاں
سے منسوب کر دیا (ص ۷۷-۱۷۶)

۱۶ آزاد: لکھنؤ میں میر علی مرثیہ خواں موسیقی میں بھی کامل تھے۔ سعادت علی خاں نے اپنے یہاں
مرثیہ پڑھنے کو طلب کیا تو وہ راضی نہ ہوئے اور لکھنؤ چھوڑ کر جانے کو تیار ہو گئے۔ انشا نے
نواب سے سفارش کر کے ان کے لیے ترقی کا پروانہ اور خلعت بھجوا دیا۔

عابد: میر علی مرثیہ خواں نہیں سوز خواں تھے۔ مرثیہ تحت میں پڑھا جاتا تھا۔ انشا نے عروسِ سلطنت
کے زیوروں کے ذکر میں نواب کے دونوں صاحبزادوں کو کانوں کے جھمکے قرار دیا ہے لیکن
نواب کے 'دو نہیں' پانچ بیٹے تھے۔ خان علامہ تفضل حسین خاں کو گلے کا نولکھا ہار بنایا ہے لیکن

ان کا انتقال تو انشا کی ملازمت سعادت علی خاں سے کئی سال پہلے ہو چکا تھا۔ آزاد کا ماخذ طوطا رام شایاں کی کتاب طلسم ہند ہے جس کے مطابق اس واقعے میں انشا کہیں سے بیچ میں آتے ہی نہیں۔ میر علی سوز خواں کو سعادت علی خاں نے بلایا تو انہوں نے جواب دیا کہ بندہ اپنے گھر کے علاوہ کہیں سوز خوانی نہیں کرتا۔ اس پر نواب نے عذر قبول کر کے دو سو روپیے درماہہ خانہ نشینی مقرر کر دیا (صہ ۹۶-۲۹۳)

۱۷ آزاد: میر تقی یہ سعادت علی خاں کے دربار میں گئے تو انہوں نے اپنا بچوان میر صاحب کو پیش کیا۔

عابد: سعادت علی خاں حقے سے نفرت کرتے تھے۔ میر کا سعادت علی خاں کے دربار میں جانا ثابت نہیں صہ ۳۹۷

۱۸ آزاد: انشا کی مثنوی شیر برنج بچپن کا کلام معلوم ہوتا ہے۔

عابد: اس کے آخر میں کئی تاریخیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تصنیف کے وقت انشا کی عمر ۳۶ برس کے قریب تھی۔ (صہ ۳۹۷)

۱۹ آزاد: مصحفی نے انشا کی ہجو میں کہا ع والله کہ شاعر نہیں تو بھانڈ ہے بھڑوے

عابد: یہ مصرع مصحفی کا نہیں منتظر شاگرد مصحفی کے ایک مخمس کا ہے جس کے آخر میں بھڑوے کے بجائے بیٹی کی گالی ہے (صہ ۱۲۷' نیز انشا کے حریف و حلیف (صہ ۱۱۲)

۲۰ آزاد: مصحفی و انشا کے معرکے کے زمانے میں آصف الدولہ شکار میں تھے۔ واپس آنے پر انہوں نے ہجوئیں سنیں اور انعام بھیجا۔

عابد: آزاد کو یہ معلوم نہیں کہ ان ہجوؤں کے خمیازے میں آصف الدولہ نے انشا کو ملک بدر کر دیا تھا۔ (صہ ۱۴۰' نیز صہ ۳۵۷)

۲۱ آزاد: سعادت علی خاں سیر دریا میں ایک نواڑے میں انشا کی گود میں سر رکھے لیٹے تھے کہ لب دریا ایک حویلی پر تاریخ لکھی دیکھی ع حویلی علی نقی خاں بہادر کی۔ انشا سے کہا اسے رباعی کر دو۔

عابد: اس کا ماخذ طلسم ہند مولفہ طوطا رام شایاں کا بیان ہے جس کے مطابق سعادت علی خاں کی سواری نکل رہی تھی کہ کوٹھی ریزیڈنٹی کے پاس ایک حویلی پر مصرع دیکھا اور مضحکہ کے ساتھ انشا کی طرف متوجہ ہوئے۔ انشا نے بدیہاً عرض کیا . . آزاد نے اسی بیان سے لطیفہ تراش لیا۔ یہ نہیں دیکھا کہ اس کا مصرع رباعی کے وزن میں نہیں (صہ ۱۹۹' نیز ۳۹۹)

۲۲ آزاد: شاہ نصیر لکھنؤ جا کر انشا سے ملے تو انشا نے بتایا کہ وہ سعادت علی خاں سے مل کر

آئے تھے کہ انہیں دوبارہ طلب کر لیا گیا۔

عابد: شاہ نصیر دو بار لکھنؤ گئے۔ پہلی بار کے مشاعرے کی جو غزلیں آزاد نے دی ہیں وہ ۱۲۱۰ھ کی ہیں۔ اس وقت تک انشا سعادت علی خاں کے ملازم نہیں ہوئے تھے۔ بقول آزاد شاہ نصیر کا دوسرا سفر لکھنؤ آتش و ناسخ کے زمانے میں ہوا۔ دراصل یہ ۱۲۲۹ھ میں ہوا تھا اور اس وقت شاہ نصیر انشا سے نہ مل سکے (ص ۴۱۱)

۲۳ آزاد: رقعات قتیل سے معلوم ہوتا ہے کہ انشا ۱۲۲۵ھ میں موقوف ہو کر خانہ نشین ہو گئے تھے۔

عابد: یہ صحیح نہیں قتیل کے ایک رقعے میں ان کی کتاب 'ہفت تماشا' کا ذکر ہے اور لکھا ہے کہ اس وقت تک انشا گھر سے نکلنے کو آزاد تھے۔ 'ہفت تماشا' ۱۲۲۷ھ کی تالیف ہے (ص ۱۹۶)

۲۴ آزاد: قید خانہ نشینی کے زمانے میں نوجوان بیٹا تعالیٰ اللہ خاں مر گیا جس کے سبب سے حواس میں فرق آ گیا۔

عابد: تعالیٰ اللہ خاں ۱۲۱۷ھ میں فوت ہوا۔ قرآن مجید کے ایک نسخے پر انشا نے ۱۲۲۹ھ تک میں فال نکالی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت تک حواس میں فرق نہ آیا تھا (ص ۲۲۵)

۲۵ آزاد: انشا کی قید خانہ نشینی میں رنگین ان سے ملنے گئے اور تربوز لانے کی فرمائش کی۔

عابد: رنگین ۱۲۱۲ھ کے بعد لکھنؤ سے نکلے اور تقریباً تیس برس کے بعد باندہ لوٹے۔ ۱۲۵۱ھ میں وفات پائی۔ اس سارے عرصے میں ان کا لکھنؤ کی طرف رخ کرنا ثابت نہیں (ص ۲۲۴)۔ خود آزاد کو تربوز کا شوق تھا۔ اس لئے انہوں نے اسے لطیفے میں چپکا دیا۔ (ص ۴۰۲)

۲۶ آزاد نے رنگین کی زبانی مشاعرے میں انشا کے غزل پڑھنے تیار بیٹھے ہیں کا واقعہ درج کیا ہے۔

عابد: یہ افسانہ کئی وجہ سے غلط ہے ا۔ رنگین اس زمانے میں لکھنؤ میں آئے ہی نہیں ۲۔ یہ غزل مصحفی کے تذکرۂ ہندی (سنۂ تکمیل ۱۲۰۹ھ) میں موجود ہے لیکن دراصل قیام دہلی ۱۱۹۵ھ سے پہلے کی معلوم ہوتی ہے ۳۔ اس زمانے میں مشاعرے ہمیشہ طرحی ہوتے تھے ۴۔ انشا حقہ تمباکو نہ پیتے تھے (ص ۹۶ - ۲۷۷)

۲۷ آزاد: مجھے بیس برس تک استاد ذوق کے سامنے رات دن حضوری رہی ہے۔

عابد: آزاد ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ذوق کا انتقال ۱۲۷۱ھ میں ہوا۔ اس وقت آزاد

۲۲ سال کے تھے۔ گویا تین سال کی عمر سے ذوق کی خدمت میں حاضر ہوگئے تھے۔ ص۲۲۳ تا ۲۲۴

اب قاضی عبدالودود کے بیانات سے اختلافات پیش کیے جاتے ہیں۔ میں نے ان بیانات کی ذاتی طور پر تحقیق نہیں کی لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب سے تسامح ہوا ہے اور عابد کا موقف درست ہے۔ چند مثالیں۔

۱۔ قتیل کے ایک خط میں ہے کہ ۱۴ جمادی الاوّل بروزِ چہارشنبہ معلوم ہوا کہ انشا دو ماہ سے برطرف ہوگیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خط ۱۴ جمادی الاوّل جمعرات کو لکھا گیا ہے۔ قاضی صاحب جنتری دیکھ کر پاتے ہیں کہ ۱۲۲۴ھ اور ۱۲۲۷ھ کے بیچ صرف ۱۲۲۶ھ کو ۱۴ جمادی الاوّل جمعرات کے دن پڑتی تھی جس کے معنی یہ ہیں کہ انشا ۱۲۲۶ھ میں معزول ہوئے۔ عابد لکھتے ہیں کہ آزاد نے آبِ حیات میں رقعاتِ قتیل کے حوالے سے معزولی کی تاریخ ۱۲۲۵ھ لکھی ہے۔ آزاد کے زیرِ اثر قاضی صاحب نے ۱۲۲۷ھ سے آگے دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ۱۲۲۹ھ کو بھی ۱۴ جمادی الاوّل جمعرات کے دن تھی۔ ۱۲۲۶ھ کے خلاف دو ثبوت ہیں۔

"حویلی علی نقی خاں بہادر کی سے ۱۲۲۷ھ نکلتا ہے۔ اس وقت انشا بالیقین سعادت علی خاں کی ملازمت میں تھے۔ دوسرا ثبوت قاضی صاحب کے شائع کردہ رقعات قتیل میں رقعہ ۲۴ سے ملتا ہے۔ اس میں قتیل اپنی کتاب ہفت تماشا کا ذکر کرکے لکھتے ہیں کہ چند روز میں انشا جب آئیں گے تو دریائے لطافت آپ کو پہنچا دی جائے گی۔ ہفت تماشا ۱۲۲۶ھ تک انشا کی آمد و رفت پر قدغن نہ تھی۔ چونکہ اس کے بعد ۱۲۲۹ھ میں ۱۴ جمادی الاوّل کو جمعرات تھی اس لئے معزولی کا زمانہ اس سے دو ماہ پہلے ہونا چاہیے۔ ص۱۹۶ تا ۲۰۰)

۲۔ قاضی صاحب نے رسالہ شاعر آگرہ جولائی ۱۹۵۰ء میں اپنے مضمون تعالی اللہ خاں خلف انشا میں تعالی اللہ خاں کے کئی قطعات تاریخ وفات دیے۔ انہوں نے کئی تاریخوں سے حساب لگانے میں گڑبڑ کی ہے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے ایک ایک حرف کے عدد دے کر صحیح تاریخیں برآمد کیں اور قاضی صاحب کے سہو کی طرف اشارہ کیا۔ عابد اس پر صاد کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں آمنہ خاتون کی بھی اصلاح کرتے ہیں۔ ان قطعاتِ تاریخ میں بعض سے ۱۲۱۷ھ اور بعض سے ۱۲۱۸ھ نکلتا ہے قاضی صاحب نے شاعر کے مضمون میں ۱۲۱۷ھ کو مرجح قرار دیا لیکن اپنے مضمون مصحفی و انشا مشمولہ اردو ادب جنوری اپریل ۱۹۵۱ء میں پہلے مضمون کا حوالہ دے کر ۱۲۱۸ھ کو صحیح سنہ وفات ٹھہراتے ہیں۔ تفصیلات دیکھیے عابد کے مقالے میں ص۲۴۹ تا ص۲۵۷ پر۔

۳۔ قاضی صاحب کے مطابق مصحفی دوسری بار ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ پہنچے۔ عابد کہتے ہیں کہ مصحفی عقد ثریا کی تکمیل ۱۱۹۹ھ کو دلی کا واقعہ بتاتے ہیں اس لحاظ سے مصحفی ۱۱۹۹ھ کے آخر یا ۱۲۰۰ھ کے اوائل میں لکھنؤ گئے۔

۴ انشا کے شاگرد ایشری سنگھ عرف بسنت سنگھ نشاط نے انشا کی تاریخ وفات کہی۔

سال تاریخ او زبان اجل　　　　عرفی وقت بود انشا گفت

۱۲۳۳ = ۱۲۳۰ + ۳

مصحفی نے رباعی میں تاریخ کہی جس کا دوسرا مصرع ہے

تاریخش گفت مصحفی بے کم و کاست　　　　اے وائے کہ مردہ قدر دان شعرا

قاضی صاحب نے مصحفی کے مصرع سے ۱۲۳۲ھ شمار کر کے اسے انشا کی صحیح تاریخ وفات مانا اور نشاط کی تاریخ کو غلط قرار دیا۔ عابد لکھتے ہیں کہ مصحفی کی رباعی کے تینوں قافیوں کے آخر میں ہمزہ ہے جسے قاضی صاحب نے نظر انداز کر دیا۔ بحر الفصاحت کے مطابق ہمزہ کا ایک عدد لیا جاتا ہے، بعض یہ شکل یا لکھ کر دس محسوب کرتے ہیں، بعض کوئی عدد نہیں لیتے۔ یہاں مصحفی نے ہمزہ کا ایک عدد لیا ہے اور اسی لئے بے کم و کاست کا فقرہ ایزاد کیا ہے۔ نشاط غلط تاریخ کیوں نکالتے۔ تعمیے میں ایک عدد کم کرنا یا بڑھانا چاہتے تو بقول عابد جان اجل کی جگہ "جانِ ابد" کہہ سکتے تھے۔

۵ مصحفی نے اپنے قصیدے ؎ ہے اس زمانے میں کوئی تو ایسا معنوی خام' میں لکھا ہے کہ سودا کے کچھ شاگرد میری ہجو لکھ رہے ہیں۔ قاضی صاحب کی رائے میں یہ اشارہ کلیاتِ سودا کے آخر میں طویل رائیہ قصیدے کی طرف ہے۔ عابد کی رائے میں کسی اور ہجو کی طرف اشارہ ہے (ص ۲۶۳۔ نیز حریف و حلیف ص ۹۰ - ص ۹۳)

۶ کلیاتِ سودا کے آخر میں ایک طویل رائیہ قصیدہ ہے جسے عرشی صاحب بہ رایں راقم کا اور قاضی صاحب احسن کا مانتے ہیں۔ قاضی صاحب نے اس قصیدے کے راقم کی تصنیف نہ ہونے کی جو دلائل دی ہیں ان کی عابد نے شافی تردید کی ہے (ص ۲۵۳ اور اس کے آگے) مثلاً قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ راقم بارھویں صدی کے عشرۂ ہشتم میں مر گیا ہوگا۔ عابد قاسم کے مجموعۂ نغز (۱۲۲۱ھ) سے توجہ دلاتے ہیں کہ اس میں راقم کو زندہ دکھایا ہے۔ (ص ۲۵۴ نیز حریف و حلیف ص ۹۰ - ۹۳)

۷ قاضی صاحب اس قصیدے کا زمانہ ۱۲۱۴ھ تا ۱۲۱۸ھ طے کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ شاہ کمال ۱۲۱۸ھ تک لکھنؤ میں تھے۔ عابد نے تذکرے کے حیدر آبادی مخطوطے کے مقدمے سے توجہ دلائی کہ شاہ کمال ۱۲۱۴ھ میں لکھنؤ چھوڑ چکے تھے اسلئے قصیدے کی آخری حد ۱۲۱۴ھ کے آگے نہیں ہو سکتی۔

۸ قاضی صاحب کے پاس مصحفی کا ایک دیوان تھا۔ اس کے زمانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس میں سید انشا کے جھگڑے بھی ہیں یہ آٹھواں ہوگا کہ سب سے اخیر ہے"

عابد کہتے ہیں:

"اس سے یہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک معارضہ مصحفی کی زندگی کے آخری ایام میں ہوا۔"
معارضہ عہد آصف الدولہ (متوفی ۱۲۱۲ھ) میں ہوا۔ مصحفی ۱۲۴۰ھ میں مرے۔ جس دیوان میں عہد آصف الدولہ کا کلام ہے وہ مصحفی کا آٹھواں دیوان نہیں ہو سکتا۔ وہ دراصل تیسرا دیوان ہے۔" (انشا کے حریف و حلیف ص۱۳۳)

رانی کیتکی کی کہانی کو کسی ثبوت کے بغیر ۱۸۰۳ء کی تصنیف قرار دینے کا فیشن ہے۔ عابد نے توجہ دلائی کہ انشا کی دوسری تصانیف کے برخلاف اس کی ابتدا میں ہی سرپرست کی مدح نہیں۔ انشا ۱۷۸۸ء میں لکھنؤ پہنچے۔ ۱۷۹۰ء میں سلیمان شکوہ کے ملازم ہوئے۔ ۱۷۸۸ء سے ۱۷۹۰ء تک وہ کسی کے ملازم نہ تھے۔ یہی رانی کیتکی کی تصنیف کا زمانہ ہونا چاہیے۔ اس کی تائید ایک دوسرے ذریعے سے ہوتی ہے۔ کہانی کی ابتدا میں وہ اپنے ہونٹوں کو پھول کی پنکھڑیوں جیسے کہتے ہیں۔ ۱۸۰۳ء میں ان کی عمر پچاس سے کم نہ تھی۔ ۱۷۸۸ء کے آس پاس تقریباً ۳۵ ہوگی۔ اس زمانے میں وہ اپنے ہونٹوں کو پنکھڑی مان سکتے ہیں۔ (ص۴۵-۲۴۴)
مجھے ان کی دلیل سے اتفاق ہے۔

عرشی صاحب نے دستور الفصاحت کی تاریخ تکمیل ۱۲۱۳ھ قرار دی تھی اور اس طرح اسے دریائے لطافت پر مقدم قرار دیا تھا۔ عابد نے تفصیلی بحث کے بعد طے کیا کہ دستور الفصاحت ۱۲۲۱ھ تا ۱۲۳۲ھ میں شروع ہوئی اور ۱۲۴۲ھ سے قبل مکمل نہیں ہوئی۔ (ص۹۴-۵۷۳)

اب چند الفاظ میں تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا جاتا ہے۔

۱ شروع میں فہرست مضامین اور آخر میں اشاریہ نہیں۔ ایسی تحقیقی کتاب میں اشاریہ ضروری ہے۔

۲ مختلف صفحوں پر طویل فٹ نوٹ لکھے ہیں جو کئی کئی صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مثلاً معزولی کے اسباب (ص۹۵-۱۸۴) تعالیٰ اللہ خاں کی وفات کی تاریخیں (۵۷-۲۴۹) نثری تصانیف (۲۷-۴۲۴) یہ سب پرمغز بحثیں ہیں۔ ان میں سے بیشتر کو متن میں آنا چاہیے جنہیں متن سے مضبوطی سے منسلک نہ سمجھا جائے انہیں کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر دینا چاہیے۔

۳ لکھتے ہیں:
"اس ضمن میں مصحفی قدرے بدقسمت واقع ہوئے تھے۔ ان کو جتنی شہرت زندگی میں ملی، مرنے کے بعد اس طرح ختم ہو گئی گویا اس نام کا کوئی شخص کبھی تھا ہی نہیں۔" ص۲۲۶ یہ صحیح نہیں کہ مصحفی بحیثیت شاعر مرنے کے ساتھ ختم ہو گئے۔

۴ پوری کتاب پڑھنے سے یہ تأثر ہوتا ہے کہ اس میں انشاؔ کی پُرزور وکالت کی گئی ہے اور ان کے جملہ حریفوں کو سیاہی کے برش سے پوت دیا ہے۔ عابدؔ پیشاوری منتظرؔ کے مصرع

والله کہ شاعر نہیں، تو بھانڈ ہے بھڑوے

نیز گلشن بے خار کے فیصلے "ہیچ صنف سخن، بطریق راسخہ، شعر انگفتہ" سے بہت خفا ہیں لیکن دونوں میں کسی کسی حد تک سچائی ہے۔ عابدؔ نے آب حیات میں انشاؔ کے بہت سے مضحک قول و فعل کی تردید کی ہے لیکن جن کی نہیں کی، شاید عابدؔ ان کو برحق مانتے ہیں۔ یہ بقیہ واقعات انشاؔ میں بھانڈپن کا عنصر ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اصناف سخن غزل ہی کو لیجیے۔ اس میں طاؤس کا جوڑا، تلسی داس جی صاحب، سنت وغیرہ کا ذکر کر کے انہوں نے غزل کو اینٹی غزل کا رنگ دے دیا اور اسے غزل کی سنجیدہ روایات سے الگ کر دیا۔ ایسی تخلیقات ہی کو دیکھ کر شیفتہؔ نے اپنا فیصلہ کیا ہوگا۔

بہرحال عابدؔ پیشاوری کی وکالت بیشتر مدلل ہے۔ اس میں پہلے کے تذکرہ نگاروں نیز جدید محققوں کے بیانات کی اس طرح پردہ دری کی گئی ہے کہ یہ کتاب تحقیقی مقالوں ہی میں نہیں تحقیق کی جملہ کتابوں میں ایک ممتاز مقام کی مستحق ہوتی ہے۔ طنزگری کی مثالوں پر طنز کرنے والوں کے لیے یہ ایک مسکت جواب ہے۔

●●

ڈاکٹر عابد پیشاوری
شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

جواب

میری کتاب میں اکثر کتابت و طباعت کی غلطیاں اور دو ایک جگہ مصنّف کے سامحات راہ پا گئے ہیں۔ ذیل میں ضروری تصحیح کر رہا ہوں، آپ مناسب سمجھیں تو درستی فرمالیں۔ چونکہ تراشے پر صفحات کے نمبر نہیں ہیں اس لیے میں نے نمبر اپنی طرف سے ڈال دیئے ہیں۔

۱۔ مقالے کا عنوان ص ۱۔ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یونیورسٹی کے کاغذات میں "ہندی نثر میں ان کا حصّہ" ہے یا اردو نثر میں۔ میرے خیال میں "ہندی نثر" ہی ہے۔ غالب اپنے دیوان کو ہندی دیوان کہتا ہے۔ مراد اردو سے ہے۔ میں نے بھی ہندی اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

۲۔ قاضی صاحب سے منسوب فقرے میں "یہ سارا زور" چھپ گیا ہے۔ "زور" کی جگہ دوَر چاہیے۔ ۱۹۶۲ء میں قاضی صاحب مرحوم سے میری کوئی ایک گھنٹے کی ملاقات کا یہ محض ایک فقرہ ہے۔ انھوں نے بہت کچھ فرمایا تھا جس کی تفصیل میں جانا اس وقت بے سود ہے۔ دوسری بار میں قاضی صاحب مرحوم سے پٹنے میں اُن کے دولت کدے پر ملا تھا۔ اگلے پیرے کے فقرے اُسی ملاقات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ میں انجمن ترقی اردو کے ایک جلسے میں شرکت کی غرض سے پٹنے گیا تھا۔ اُس زمانے میں آپ سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور کتب خانے میں مرغ نامۂ آتا کا دوسرا اکمل متن میں نے اسی دور میں دریافت کیا تھا۔ اس کی روشنی میں مرغ نامے کو دوبارہ ایڈٹ کرکے مضمون آپ کو بھجوایا تھا جسے آپ نے کتب خانے میں رکھ لیا لیکن شائع کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ اُسی سفر میں کلیم الدین احمد مرحوم سے پہلی بار اور قاضی صاحب سے دوسری بار ملنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ مجھے ان دونوں بزرگوں کی خدمت میں لے جانے والے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تھے۔

۳۔ ص ۲ پر جین صاحب لکھتے ہیں کہ "جموں یونیورسٹی میں نگراں مقالے کا ممتحن نہیں ہوتا" میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن اب معلوم ہوا کہ نگراں بھی مقالے کا ایک ممتحن ہوتا ہے۔ پہلے اس پر اصرار نہیں کیا جاتا تھا لیکن اب نگراں سے بھی رپورٹ مانگی جاتی ہے۔ پہلے نگراں کا سرٹیفکیٹ کافی سمجھا جاتا تھا جو مقالے کے شروع میں لگا دیا جاتا ہے۔

اسی صفحے پر جین صاحب نے کہا ہے کہ کتاب کے شروع میں کوئی فہرست نہیں ہے۔ یہ بات جب کتاب چھپی تو درست تھی۔ جب مضمون لکھا گیا اُس وقت نہیں، کیونکہ اکیڈمی کی غلطی سے شروع کے صفحات گم ہو گئے تھے اس لیے فہرست رہ گئی بعد میں اکیڈمی نے

الگ سے فہرست چھپوا کر کتابوں میں لگا دی۔

مقالے پر مقدمہ اسی وقت لکھا گیا تھا جب مقالہ یونیورسٹی میں داخل کیا گیا۔ البتہ پریس میں بھیجنے کے لیے پورے مقالے کی نقل تیار کی گئی تھی اور نقل کرتے وقت ایک، دو لوگوں کے انتقال کی خبر حاشیے میں درج کر دی گئی تھی۔

۴۔ ص ۴ دوسرا پیرا دوسری سطر "یہ میر ماشاء اللہ خاں"... "یہ" سہوِ کاتب ہے۔

۵۔ ص ۸۔ ۱۷۹ سطر ۴: بحث دراصل انشا اور مرزا جعفر کے مابین تھی قتیل مرزا جعفر کے ساتھ تھے انھوں نے اس میں اس طرح حصّہ لیا تھا کہ خود ان کی حیثیت ایک فریق کی ہو گئی تھی۔ اسی پیرے کے آخر سے پہلی سطر "لطفًا کا سلیقہ وضع کر دیا" غالبًا "لائیفہ" ہوگا۔ ص ۱۵ انھوں نے نثری فقرے کے آخر میں سعادت علی خاں سے منسوب کر دیا: اس فقرے میں کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہیں۔ جین صاحب کا مضمون دیکھ کر تصحیح کروا دیجیے۔ موجودہ صورت میں فقرہ مہمل ہے۔

۶۔ ص ۱۲: سالِ تاریخ اور "زبانِ اجل" "زحانِ اجل" ہے۔ "زبان" چھپ گیا ہے۔ اسی صفحے کے آخر میں ۸ "قاضی صاحب کے پاس" یہ دراصل آزاد کے پاس ہونا چاہیے۔ یہ مصنف کی لغزشِ قلم ہے بلکہ تسامح ہے۔ جین صاحب کے فقروں سے صریحًا قاضی صاحب مرحوم کی طرف اشارہ نکلتا ہے۔ حالانکہ آٹھویں دیوان کی بات آزاد نے کہی ہے اور خود قاضی صاحب نے آزاد کی اس غلطی کی طرف اپنی تحریر میں اشارہ کیا ہے۔

ص ۱۷-۱۶ میں میرے فقرے سے مصحفی کے متعلق جو نتیجہ نکالا گیا ہے اور میری بات کو رد کیا گیا ہے۔ وہ اس ایک فقرے کو سیاق و سباق سے الگ کر کے دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ یہاں اس فقرے سے میرا مفہوم محض اس امر کا اظہار ہے کہ مصحفی کا کلام مدتوں گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا۔ وہ اپنے تذکروں کی بدولت ایک خاص طبقے میں تو جانے پہچانے جاتے تھے لیکن شاعر کی حیثیت سے ان کے نام سے ادب و شعر کا عام قاری واقف نہیں تھا۔ مصحفی کو زندہ کرنے کا کارنامہ مولوی عبدالحق نے ان کے تذکرے شائع کر کے انجام دیا۔ اس کے باوجود اردو ادب کا عام قاری ان کے نام سے واقف نہ ہو سکا۔ اس کی تصدیق کرنا ہو تو ایم۔ اے۔ کے کسی طالب علم سے پوچھ کر دیکھ لیجیے۔ جب تک ان کو تحقیق سے واسطہ نہ پڑے وہ مصحفی کے نام سے واقف نہیں ہوں گے۔ اب البتہ مصحفی کے کلام کا انتخاب نصابی کتابوں میں شامل ہونے لگا ہے۔ اس سے میری بات رد نہیں ہوتی۔ میں نے جہاں انشا اور مصحفی کے معرکے پر بحث کی ہے اس میں جگہ جگہ مصحفی کے بارے میں ایسے فقرے موجود ہیں جو مصحفی کے شاعرانہ مرتبے کا اعتراف ہے۔ مثلاً ص ۲۲۲ پر انشا اور مصحفی دوسرا جملہ ہے "مصحفی بہت پُرگو تھے لیکن اتفاق سے ان کا کلام نظروں سے اوجھل رہا اور ابھی تک ان کا مکمل کلیات شائع نہیں ہوا" یا ص ۲۲۶ کے یہ جملے: "مصحفی اپنے دور کے بڑے استاد تھے۔ جتنے زیادہ شاگرد اُن کو میسر آئے اس دور میں شاید ہی کسی استاد کو میسر آئے ہوں۔ ان کے تلامذہ میں کئی ایسے تھے جو بعد میں نہ صرف استاد کہلائے بلکہ تاریخ ادب میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی قوتِ شاعری

اور استادی کو سب نے تسلیم کیا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے اس ضمن میں مصحفی قدرے بدقسمت واقع ہوئے تھے۔ ان کو جتنی شہرت رسائی
میں ملی مرنے کے بعد اس طرح ختم ہوگئی گویا اس نام کا کوئی شخص کبھی تھا ہی نہیں۔ انشا سے معرکوں کے سبب کچھ خاص لوگ ان سے
واقف تھے اور بس۔ مصحفی نے بہت لکھا ہے ... بہرحال اس قدر پُرگوئی اور قادرالکلامی کے باوجود ان کی وفات کے بعد ان کا کلام
جیسے معدوم ہوگیا۔ اور حق تو یہ ہے کہ اگر مصحفی تذکرے نہ لکھ گئے ہوتے تو آج ان کا نام بھی کوئی نہ جانتا۔ جیسے قائم نے بہت کچھ لکھا
اگرچہ شاعری کے لحاظ سے اس کا کوئی مرتبہ نہیں پھر بھی وہ اپنے تذکرے مجموعۂ نغز کی بدولت زندہ رہ گئے۔ (اس کا یہ مطلب
نہیں لیا جائے کہ مصحفی کا بہ حیثیتِ شاعر کوئی مرتبہ نہیں) اسی طرح مصحفی کثیرالتصانیف ہونے کے باوجود اپنے تذکروں ہی کے
بدولت اب تک زندہ رہے۔ معلوم ہوا کہ محض قادرالکلامی زندگی کی ضمانت نہیں۔ مصحفی صرف قادرالکلام نہیں اچھے شاعر بھی
تھے۔ اس کے باوجود میر، سودا اور غالب کے پائے کے شاعر نہیں تھے ... حق تو یہ ہے کہ مصحفی ساری زندگی اپنے شاعرانہ مرتبے
کو منوانے میں لگے رہے۔ ان کی حیات میں تو ان کو ایک مقام حاصل ہوگیا، لیکن مرنے کے بعد وہ مرتبہ قائم نہ رہ سکا (اسے
قسمت کی ستم ظریفی کہیے)۔ .. مصحفی کے یہاں صاف سادہ اور پُرتاثیر اشعار کی کمی نہیں لیکن وہ اس درجے کے اشعار نہیں جن میں
کیفیتِ دوام ہو۔ درجہ دوم کے شاعروں میں اُن کا شمار ہو سکتا ہے، بلکہ ان میں بھی گنتی کے چند لوگوں میں ان کا نام لیا جا سکتا
ہے۔ (خود انشا کا تعلق اسی گروہ سے ہے) لیکن زمانہ صفِ اوّل کے شعرا کے علاوہ نہ دوسروں کو یاد رکھ پاتا ہے اور نہ
اہمیت ہی دیتا ہے۔ حسرت موہانی اور فراق گورکھپوری کے تمام تر دعووں کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ مصحفی ایسا کوئی
امتیازی رنگ پیدا نہیں کر سکے۔ انفرادیت ہی بقائے دوام کے دربار میں شاعر کو جگہ دلاتی ہے جو مصحفی کے یہاں نہیں ہے۔ دراصل
وہ زندگی بھر اپنی آواز کو پانے اور انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن اس سے زیادہ زور انھوں نے شاگردوں کی تربیت
پر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے شاگرد جو مقام پا گئے مصحفی کو وہ بھی نصیب نہ ہو سکا۔ ہر دور میں وہ ہر تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور تک
گئے لیکن زندگی بھر راہبر کو نہ پہچان سکے ....“ (ص ۲۲۶/۲۲۷)

یہ اور اس طرح کے بے شمار جملے جو اس ساری بحث میں بکھرے ہوئے ہیں شاہد ہیں کہ میرا مطلب وہ نہیں جو جین صاحب
نے مذکورہ عبارت سے نکالا ہے۔ میرا مقصد مصحفی کے مقام و مرتبے کا تعین نہیں تھا بلکہ صرف انشا اور اُن کے معرکے کے اسباب
و علل کو گرفت میں لانا تھا۔ انشاءاللہ جب مصحفی پر قلم اُٹھاؤں گا تو مصحفی کے مرتبے کی تعین میں بھی کوتاہی نہیں کروں گا۔

۷۔ ص ۱۴۱ آخری فقرے میں ”ڈگری“ کی مثالوں پر طنز کرنے والوں کیلئے۔ ”میرا خیال ہے ”ڈگری کے مقالوں“ ہوگا۔

ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن
شعبۂ اردو
ایس۔ ایس۔ سہا کالج ٹکاری گیا

پروفیسر اختر قادری کا تحقیس

آثار اثر

نواب امداد امام اثر کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ اردو ادب کی جو خدمات انہوں نے انجام دی ہیں ان سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ وہ ایک نابغہ تھے۔ ان کے کارنامے اپنی مثال آپ ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ان کی ادبی قدر دانی کا اعتراف جتنا ہونا چاہیے تھا ہوا نہیں۔ بہار کی اردو شاعری کی تاریخ میں اگر کبھی کبھار کسی نے ان کا ذکر کر بھی دیا تو اردو تنقید کی قلم رو سے ان کو بھلا دینے کی ہر ممکن سعی کی گئی۔ اگر کسی تنقیدی تاریخ میں ان کا تذکرہ ہوا بھی تو بہت ہلکا پھلکا، ناکافی، غیر تشفی بخش، ان کے افکار و خیالات سے استفادہ کی زحمت گوارہ نہیں کی گئی۔

اردو میں باضابطہ تنقید کا لالٹین حالی نے جلایا۔ کلیم الدین احمد نے بھی اپنی حد تک حالی کی خدمات کا اعتراف کیا ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کلیم الدین احمد جنہوں نے اردو تنقید کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان کی نظریں بھی نہ جانے کیوں بہارستان سخن پر مرکوز نہ ہو سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ "چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے" اگرچہ اس برقی دور میں اب بلب کے اوپر تاریکی ہوتی ہے۔ بہرکیف معاملہ خواہ کچھ بھی ہو اندھیرا اندھیرا ہوتا ہے۔ اس کا اطلاق اگر ہم امداد امام اثر کے سلسلے میں کریں تو بیجا نہ ہوگا کہ ہم نے حالی کی خدمات کا خوب ڈھنڈورا پیٹا۔ شبلی کی رطب اللسانی میں پیچھے نہیں رہے آزاد کو خوب خوب سراہا لیکن امداد امام اثر کی خدمات کے اعتراف میں ہم نے موئے قلم کو جنبش دینا پسند نہیں کیا۔ عام طور سے ان کی جانب سے بے توجہی برتی گئی۔

پروفیسر سید اختر احمد قادری مرحوم کی کوشش اس لحاظ سے لائق صد تحسین ہے کہ انہوں نے بہار کے اس مایۂ ناز سپوت کی جانب نگاہ اٹھائی، اور ان کی خدمات کے اعتراف کے لئے اپنے قلم کو جنبش دینے کی زحمت گوارا کی۔ آثار اثر جیسا علم و ادب کے سامنے پیش کیا اور اہل نقد و نظر کو دعوت عام دی۔ یہ کتاب مرحوم کا مطبوعہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر بہار یونیورسٹی نے انہیں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔

آثار اثر حرف آغاز کے علاوہ چار ابواب اور قصائد، حرف آخر اور کتابیات پر مشتمل ہے۔ آثار اثر کا سنہ تصنیف کوئی ڈھکی چھپی شے نہیں۔ حرف آغاز کے تحت مصنف رقم طراز ہیں :

"آج سے کوئی پندرہ سال پہلے کی بات ہے کہ میرے بزرگوں اور دوستوں نے مجھے ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کی رائے دی، جب موضوع کی طرف دھیان گیا تو بچپن سے جانے پہچانے بزرگ حالی جناب خاں بہادر شمس العلما نواب سید امداد امام اثر عظیم آبادی پر نظر انتخاب پڑی اور میں نے موصوف کی حیات اور علمی خدمات پر ڈی لٹ کی ڈگری کے لئے تحقیقی مقالہ لکھنے کی جسارت کی۔ "

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ آثار اثر کی تحریک فطری نہیں اور نہ ہی اس کا بنیادی مقصد اثر کی حیات اور علمی خدمات سے لوگوں کو روشناس کرانا تھا بلکہ اس کا مقصد اولین حصول سند تھا۔ دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ چونکہ اور کوئی موضوع نہیں مل سکا اس لئے اس مقصد کے لئے اثر کا انتخاب کیا گیا کہ ان سے بچپن سے کافی آشنا تھے اس لئے فراہمی مواد میں دوڑ دھوپ کی زحمت کی ضرورت کم تھی، بہرکیف ضمنی طور پر ہی سہی اثر کی علمی خدمات کے اعتراف کے لئے کوئی موقع ہاتھ تو لگا۔ یہ اور بات ہے کہ اس جانب بھی توجہ اس وقت مبذول ہوئی جب یاروں اور بزرگوں نے اس سلسلے میں فہمائش و فرمائش کی، اس کے باوجود مجھے کہنے دیجئے کہ اختر قادری نے اثر کی تصویر میں جو رنگ آمیزی کی ہے وہ متاثر کن ہے۔

پہلے باب میں اثر کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اثر کی سیرت و شخصیت و عادات و اطوار وضع قطع، رہن سہن، ان کے نظریات و معتقدات سے کلی آگاہی ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ علم بھی ہوتا ہے کہ علی امام اور حسن امام جیسے بیٹوں کا باپ ہونا دنیاوی لحاظ سے لاکھ قابل فخر ہو مگر دینی لحاظ سے کرب کا باعث تھا۔ اثر انگریزی ادبیات سے مستفید اور نئی روشنی سے زندگی کو منور کرنے کے حامی تو ضرور تھے لیکن خود کو مغربی رنگ میں رنگ دینے کے منافی تھے۔ وہ خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ دونوں نامور بیٹوں کی غیر مذہبی روش سے ناخوش تھے اور ضعیفی میں شادی کا سبب بھی یہی تھا کہ ان کی نسل سے کلمۂ توحید گو پیدا ہوتا رہے۔ یہ سانحہ اثر کی زندگی کا ایک ایسا المیہ ہے جس پر چونک جانا فطری ہے۔ اثر مرحوم کا وہ خط جو اس سلسلے میں شامل کتاب ہے پوری قوم کے لئے ایک لمحہ فکریہ مہیا کرتا ہے۔

حالات زندگی کے تحت ایک نکتہ قابل غور ہے۔ سلسلہ نسب کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ اثر زیدی واسطی سید ہیں، لیکن جب سلسلہ نسب بیان کرتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ ان کی دادی زیدی واسطی سلسلہ نسب کے بزرگوں کی قرابت مند تھیں۔ ظاہر ہے کہ نسبی سلسلہ کا تعلق دادا سے جوڑا جاتا تو زیدی واسطی کہنا مناسب تھا، اس لئے دوسری جگہ دادا کے خاندان کے ایک بزرگ کو حسنی الحسینی لکھا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ان کا سادات

ہونا تو مسلم ہے لیکن زیدی واسطی ہیں یا حسنی حسینی اس کی قطعی صراحت نہیں ملتی ۔

دوسرا باب اثر کی تنقید نگاری سے متعلق ہے۔ اس باب میں اثر کی مایہ ناز تصنیف "کاشف الحقائق" کے حوالے سے اثر کے تنقیدی افکار و نظریات سے بحث کی گئی ہے اور ان مباحث پر تنقیدی نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "کاشف الحقائق" نظری اور عملی تنقید کا نمونہ ہے اور ایسے وقت میں معرض وجود میں آیا ہے جب اس میں بیان کردہ بیشتر نکتوں کی جانب بہتیرے تذکرہ نگار و ناقدین کی توجہ مبذول نہیں ہوئی تھی ۔ اختر قادری نے اثر کے ان نظریات و افکار کا جائزہ لیا ہے، اور انہیں افلاطونی سلسلۂ نقد کا خوشہ چیں کہا ہے، جہاں کہیں ان کے نظریات و عمل میں تضاد نظر آیا ہے اس کی نشاندہی کی ہے بالخصوص مرثیہ اور میر انیس کے شاعرانہ محاسن کے ضمن میں اثر کے غلو کی پردہ دری کی ہے اور مدلل طریقے پر اس دعوی کو رد کیا ہے کہ انیس، بالمیکی اور فردوسی سے زیادہ شاعرانہ محاسن کے حامل تھے۔ جہاں اثر کے نظریات و افکار نے نئے گل بوٹے کھلائے ہیں ان کو سراہنے سے بھی نہیں چوکے ہیں مثال کے طور پر سنسکرت شاعری کی جانب سے ہمارے شعرا کی بے توجہی اور اس بے توجہی کے نتیجے میں پیدا شدہ خسارے کی جانب اثر کی نگاہِ اولین کی داد دیے بغیر نہیں رہے ہیں ۔ کاشف الحقائق میں جو کام کی باتیں ہیں ان کی تحسین اور جو باتیں محض خانہ پری کی ہیں ان پر کڑی تنقیدی نگاہ ڈالی ہے، ان کا یہ مشورہ بہت صحیح اور درست ہے کہ کاشف الحقائق جیسی کتاب سے کماحقہ مستفید ہونے کے لئے رطب و یابس سے پاک کرنا یعنی اس کی ایڈیٹنگ کرنا بہت ضروری ہے اور غالباً ان کے مشورہ کو ہی مدنظر رکھ کر ڈاکٹر وہاب اشرفی نے کاشف الحقائق کی ایڈیٹنگ کی ہے ۔

مصنف کی یہ رائے کہ "اثر نے اپنے نظریۂ شاعری کا واضح تصور پیش کیا ہے ساتھ ہی اردو میں عملی تنقید کی پہلی کوشش اثر کی رہین منت ہے۔" بہت حد تک درست سہی لیکن کتاب کا حصہ کاشف الحقائق پر ایک کمنٹری کی حیثیت رکھتا ہے اور بس ۔ اس حصے کو اور بھی مؤثر بنایا جا سکتا تھا افسوس ہے کہ مصنف اثر کو ایک منفرد نقد نگار کی حیثیت سے پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے ہیں ۔

تیسرے باب میں اثر کی مختلف نثری تحریروں کے حوالے سے اثر کی نثر نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ اس ضمن میں مصنف نے "فسانۂ ہمت" کا تفصیلی تنقیدی جائزہ لیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "فسانۂ ہمت میں ناول کے اجزائے ترکیبی اور فنی تراش خراش کی کمی ہے" "تعمیر ما جرا اس میں عمدہ ہے" "مگر پلاٹ اکہرا اور سادہ ہے" "کردار جامد ہیں اور اسلوب کے لحاظ سے یہ کتاب اپنے عہد کی مروجہ اردو نثر کا نمونہ ہے" مجموعی حیثیت سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کے ناول ہونے میں شک کی گنجائش ہو سکتی ہے اس کے فسانہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں" اور "اردو ادب میں

اسے وہی مقام ملنا چاہیے جو فسانۂ آزاد کو حاصل ہے" اس کا یہ مطلب ہوا کہ فسانہ، ناول، داستان مختصر افسانہ اور ناولٹ کی طرح کی ہی کوئی صنف ہے جب کہ بات ایسی نہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ ناول ہونے میں شک کی گنجائش ہے فسانہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، عجیب سی بات ہے کہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ فسانہ ہمت کے داستان ہونے میں شک کی گنجائش ہے کہ اس کا پلاٹ اکہرا اور سادہ ہے اور کردار جامد ہیں، لیکن اسے ناول کے ابتدائی نقوش میں ایک نقش تصور کیا جا سکتا ہے کہ ان دنوں ناول نگاری کا وہ فنی شعور پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کہ تعمیر ما جرا کی عمدگی، پلاٹ کا اکہرا پن اور سادگی ناول کے اجزائے ترکیبی اور فنی تراش خراش کی کمی اس بات کی غماز ہے کہ فسانہ ہمت کو غیر ترقی یافتہ ناول کی صف میں جگہ دی جائے۔ اس کے علاوہ کتاب الآثار، مرآۃ الحکما، کیمیائے زراعت فوائد دارین، مصباح الظلم، کتاب الجواب معروف، مناظر المصائب وغیرہ کا مختصر تعارفی تجزیہ کیا گیا ہے اور مختلف کتب کے نثری نمونوں کے حوالے سے بہت صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ " اثر مختلف نثری اسالیب پر قدرت رکھتے تھے، موضوع کی مطابقت کے اعتبار سے وہ اپنی نثری تصنیفوں میں ایسا اسلوب اختیار کرتے تھے کہ مفاہیم و معانی کی مکمل ترجمانی ہو سکے۔" اس بات کا امکان ہے کہ اثر کے نثری نمونے آج کی نثری خصوصیات کے حامل نہ ہوں لیکن جن حالات اور ماحول میں اثر کی یہ تحریریں وجود میں آئیں ان کو مد نظر رکھتے ہوئے مصنف بالکل صحیح نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اثر کو صاف سادہ نثر لکھنے میں مہارت حاصل تھی آج بھی ان کی کتابوں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نثر کے ارتقا کی تاریخ ان کی نثری تصنیفوں کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی۔"

چوتھے باب میں اثر کی شاعری کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے اثر کے مختلف مطبوعہ انتخاب کلام اور دیوانوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے نیز دو مطبوعہ دیوانوں کا تقابل کرنے کے بعد یہ نشاندہی کی ہے کہ پہلے اور دوسرے دیوانوں کے متن میں کہاں کہاں اتفاق ہے اور کہاں کہاں اختلاف۔ مصنف نے اس امر کی وضاحت بھی کی ہے کہ اثر کی شاعری کا تجزیہ ان کے دوسرے مطبوعہ دیوان کو مد نظر رکھ کر کیا گیا ہے کہ یہ دیوان اثر نے اپنی زندگی میں اپنے تمام مجموعہ ہائے کلام پر نظر ثانی کرنے کے بعد مرتب کیا تھا۔ اثر نے صرف اردو غزل نگاری کی ہے۔ دو چار قصائد لکھے ہیں لیکن ان کی بھی فنی اہمیت کوئی خاص نہیں بحیثیت غزل نگار۔ اثر نے مختلف اساتذہ سخن کا کامیاب تتبع کیا ہے۔ لیکن یہ پیروی ہی اثر کی انفرادیت نہیں۔ اثر کی غزلوں میں متصوفانہ اور اخلاقی رنگ غالب ہے۔ ان کی شاعری میں میر کی سادگی اور کسک ملتی ہے۔ یہ خصوصیات ماحول سے زیادہ اثر کے مزاج و طبع کی دین تھیں کہ اثر امارت اور ریاست کے باوجود منکسر المزاج، خلیق و خوش خو اور مدنی منش

تھے۔ لیکن ان خصوصیات کی بنا پر انہیں اردو شاعری میں کوئی انفرادی مقام نہیں دیا جا سکتا۔ اختر قادری کے خیال میں آثر کی غزلیہ شاعری کا اہم جوہر ان کے کلام کی سادگی، جوش اور جذبے کی صداقت و اصلیت ہے۔ اثر کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ پیش کرنے کے بعد بہت صحیح نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "اثر کو غزل گوئی کی بنا پر میر و غالب کی صف میں جگہ نہ ملے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اردو غزل گویوں کی فہرست سازی میں ان کا نام شامل نہ کیا جا سکے۔ ان کی اردو شاعری ان کے عہد کے کلاسیکی مزاج کی غماز ہے اور نفاست طبع کی آئینہ دار ہے۔"

مصنف نے آثر کی شاعری، تنقید اور نثر کے سلسلے میں سر راس مسعود، عبادت بریلوی اور احسن مارہروی کی آرا نقل کی ہیں، بہتر یہ ہوتا کہ مختلف کتب میں بکھرے مختلف اقوال و آرا کو اس سلسلے میں یکجا کر دیا جاتا تو آثر پر مزید کام کرنے والوں کو سہولت ہوتی اور کتاب کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہوتا۔

مجموعی حیثیت سے آثر کی جو تصویر مصنف نے بنائی وہ یقیناً لائق ستائش ہے۔ وہ ایک کامیاب نقاد، با کمال نثار، خوش گفتار شاعر تھے۔ توقع ہے کہ آثر کی یہ تصویر اہل نقد و نظر کو اپنی جانب متوجہ کرے گی۔ لیکن اب بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ آثر کی ہر حیثیت کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے ؎

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

●●

ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن
شعبۂ اردو
ایس ایس سنہا کالج
ہنکاری گیا

ڈاکٹر مہتاب انصاری کا تھیسس

جگر مرادآبادی کی غزل گوئی

اردو غزل کی تاریخ میں جگر مرادآبادی ایک مشہور و معروف، مقبول و معتبر نام ہے غالب و مومن کے بعد اردو غزل کو پستی کے غار سے نکالنے اور اسے اعتبار عطا کرنے میں جگر کے دور کا اہم رول ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو غزل کو اعتبار دلانے کی بنیاد شاد نے رکھدی تھی، اقبال نے اس معتبر غزل کو خون جگر دیا تھا؛ حسرت نے اس غزل کی نشاۃ آرائی کی تھی، انہیں بنیادوں پر اصغر، فانی اور جگر نے نہ صرف غزل کی بلند و بالا عمارت تعمیر کی بلکہ اسکی تزئین و آرائش کی تھی۔

جگر نے ایک عرصے تک اردو شاعری کی خدمت کی لیکن ان کی شاعری ابتدا ہی سے موضوع بحث بنی رہی ہے، کسی نے انہیں شہنشاہ تغزل بنا کر ان کے سر پر تاج رکھا تو کسی نے انہیں معمولی اور تیسرے درجے کا شاعر بنایا، کسی نے جگر کی ساری کمائی کو ان کے ترنم کی مرہون منت بنا دیا۔ ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ جگر کی غزل گوئی اور ان کے فکر و فن کا مطالعہ نہیں کیا گیا، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کے فکر و فن کا غیر جانبدارانہ تجزیہ نہیں کیا گیا، انفرادی طور پر بعض حضرات نے اس جانب پیش قدمی ضرور کی ہے، لیکن کوئی ایسی تصنیف ابتک منظر عام پر نہیں آئی جس میں جگر کی شخصیت اور شاعری، دونوں کا معروضی مطالعہ پیش کیا گیا ہو۔ ڈاکٹر مہتاب انصاری نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے، اسی مقصد کے تحت ڈاکٹر مہتاب انصاری نے جگر کی غزل گوئی کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنایا۔

دو سو تیس صفحات میں پھیلی ہوئی اس کتاب میں سات ابواب، حاصل مطالعہ اور کتابیات کے علاوہ ڈاکٹر مہتاب انصاری کا "احوال واقعی" کے تحت، اظہار خیال اور "تقریب" از ڈاکٹر وہاب اشرفی شامل ہے۔ احوال واقعی کے تحت مصنف نے اپنی تصنیف کا جواز ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"میرے سامنے جگر پر جو کچھ لکھا گیا تھا اس کا انبار تھا اس میں خار زیادہ تھے اور خس کم بہر حال تمام متعلقہ نگارشات کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جگر کی شناخت کا کام ہنوز باقی ہے۔ ان کی شاعری کے بعض تناظرات بھی توجہ چاہتے ہیں اور ان کی شاعری کے فنی اور تکنیکی جہتوں کا مطالعہ ہونا چاہیے

اضطراری تاثر اور ذاتی تعصب سے الگ ہو کر اگر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیا جائے تو حقیقی اور اصلی جگر سامنے آسکتا ہے"

مصنف کو اس بات کا احساس ہے کہ جگر فہمی کا یہ کام وسیع ترین پیمانہ پر اس سے پہلے ہو چکا ہے، جس میں ڈاکٹر اسلام کی کوششیں لائق ستائش و تحسین رہی ہیں، لیکن ان کاموں کا بیشتر حصہ بقول مصنف جگر کی سوانح حیات پر مشتمل ہے فن پر مکمل روشنی نہیں پڑتی، اور ڈاکٹر مہتاب انصاری کی کوشش یہی رہی ہے کہ جگر کے فن کو روشن کیا جائے لکھتے ہیں۔

"جگر غزل کے شاعر نہیں لہٰذا میری نگاہ میں اسی پس منظر میں ان کا تنقیدی مطالعہ ہونا چاہئے سو یہ کام میں نے کرنے کی سعی کی ہے جس کا ثمرہ یہ کتاب ہے"

اس کام کے لیے پروفیسر عبدالمغنی کے ایک مضمون "جگر کی شاعری" سے تحریک ملی، لکھتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ اس مضمون کے مطالعہ کے بعد ہی مجھے جگر پر کچھ لکھنے کا حوصلہ ہوا"

اس احوال واقعی کے بعد ڈاکٹر وہاب اشرفی کی تقریب ہے اس عنوان کے تحت ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) جگر اپنے وقت کے انتہائی مقبول شاعر رہے ہیں اور یہ مقبولیت ہی ان کی شاعری کے معیار کو مشکوک بناتی رہی ہے۔ (۲) جگر کی شاعری ان کی زندگی میں بھی نزاعی رہی ہے اور موت کے بعد بھی باعث نزاع ہے۔ (۳) ایک گروہ انہیں عام اور سطحی درجے کا شاعر مانتا ہے اور دوسرا ان کی شاعری کے اختیارات کی نشاندہی کرتا ہے (۴) ڈاکٹر مہتاب انصاری نے تمام تر جذباتیت کو پس پشت ڈال کر صحیح تناظر میں جگر کو پرکھنے کی سعی سعید کی ہے (۵) مہتاب انصاری کا بیان ژولیدگی سے پاک ہے اور یہ کتاب موصوف کے ایک وقیع مقالے کا حصہ ہے۔

آیئے احوال واقعی اور تقریب کی ان بنیادوں پر کتاب پر ایک نظر ڈالی جائے پہلے باب میں جگر مراد آبادی کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے، اس باب میں جگر کے خاندان، ان کے اسلاف، جگر کی تاریخ وجائے پیدائش، تعلیم، ابتدائی شاعری، استاد، کاروبار، جگر کا رومان اور شادی، جگر اور فلمی دنیا، شاعری کا آغاز اور تلمذ، مذہبی عقائد، اعزازات، لباس حلیہ وغیرہ، ترنم، موسیقی و خوش نویسی، شراب نوشی، دوستی، موت، جگر معاصرین مخلصین کی نظر میں" کے عنوانات سے جگر کی زندگی کے مختلف گوشوں پر اجمالی روشنی ڈالی گئی ہے، اس باب میں دو بیانات غور طلب ہیں ایک جگر کا سنہ پیدائش، اور دوسرا جگر کی جائے پیدائش، سنہ پیدائش کے سلسلے میں رقمطراز ہیں "اکثریت ۱۸۹۰ کے حق میں ہے اور راقم بھی اسی سے متعلق ہے"، محض اتنے سے ہی تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مصنف اگر ۱۸۹۰ کو صحیح سنہ پیدائش تسلیم کرتے ہیں تو انہیں محمود علی خاں جامعی کے ۱۸۹۳ کے دعوے کو مدلل طور پر رد کرنا چاہیے

ہے اور یہ ثابت کرنا چاہیے تھا کہ جگر ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔

جائے پیدائش کے سلسلے میں مصنف کوئی حتمی رائے نہیں دیتے لکھتے ہیں "جگر کی جائے پیدائش کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے مرادآباد اور بنارس کے نام لیے جاتے ہیں" مصنف کی نظر میں صحیح کیا ہے مرادآباد یا بنارس یہاں بھی محقق کا حق ادا نہیں ہوتا۔

دوسرے باب میں "جگر مرادآبادی کے تخلیقی ذہن کا پس منظر" پیش کیا گیا ہے، اس باب میں مصنف نے اردو غزل کی ڈھائی سو سالہ تاریخ پر اجمالی روشنی ڈالنے کے بعد اس پس منظر کا مفصل و مکمل تجزیہ کیا ہے جس پس منظر میں جگر نے اردو غزل کو گلے لگایا، مصنف کے خیال میں جگر کے تخلیقی ذہن کی پرورش و پرداخت میں حسرت و اصغر کی وہ روایت کام کر رہی تھی جو شاد عظیم آبادی کے واسطہ سے اردو غزل میں در آئی تھی۔ اس سلسلے میں مصنف نے غزل کے مزاج و آہنگ سے مفصل بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ جگر کا تخلیقی و ذہنی پس منظر دبستان دہلی کی روایتوں کا مرہونِ منت رہا ہے، اگرچہ جگر سے کچھ پہلے لکھنوی خصوصیات شاعری بھی اپنی جڑیں مضبوط کیے ہوئی تھیں لیکن شاد نے دبستان دہلی و لکھنؤ کے امتزاج سے اردو غزل کو خوشنما مزاج و آہنگ دیا تھا، اسی کو حسرت و اصغر نے ماڈل بنایا اور پھر اصغر کے زیر اثر جگر نے اسی روایت کو پروان چڑھایا مصنف کے خیال میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھے بغیر جگر کی شاعری کا کوئی بھی مطالعہ صحیح نہیں ہوگا۔

تیسرے باب میں جگر کی غزل گوئی کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے اور ان خصوصیات کی نشاندہی کی ہے جو جگر کی انفرادیت کی حامل ہیں، اس سلسلے میں مختلف معتدر ناقدین ادب اور جگر کے مختلف مجموعہ ہائے کلام کے اشعار کے حوالے سے اپنے دعوں کو مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے، وہ جگر کی غزل گوئی کی مندرجہ ذیل خصوصیات کی تلاش میں کامیابی کے مراحل سے گزر گئے ہیں۔ (۱) جگر عشق و محبت کے شاعر ہیں ان کی غزلیں عشقیہ شاعری کی بہترین مثال ہیں۔ ان کے عشق کا تصور اعلیٰ و ارفع و پاکیزہ تھا بوالہوسی، ستی لذت پرستی و جذباتیت، اور جنسیت سے ان کا دور دور تک واسطہ نہیں ہے۔ (۲) ان کی غزلوں میں تغزل کی تمام روایات کا احترام ملتا ہے۔ (۳) ان کی غزلوں میں عشق حقیقی کی تجلیاں بھی کوندتی نظر آتی ہیں، بلاشبہ جگر صوفی نہیں تھے لیکن مسائل تصوف پر طبع آزمائی جگر نے کی ہے۔ اس میں حقیقت کی تھوڑا بہت رمق ہے یہ اثر ہے اصغر کی صحبت اور عبدالغنی منگلوری کی ارادت کا۔ یعنی یہ بیان تجرباتی ہے نظریاتی نہیں۔ (۴) جگر نہ تو فلسفی تھے نہ مفکر، اس لیے ان کی شاعری میں کسی مربوط فکر و فلسفہ کی تلاش بے سود ہے لیکن ہر بڑے شاعر کی طرح جگر نے بھی جا بجا بہالنکار کی بجلیاں گرائی ہیں۔ (۵) جگر کی غزلوں میں حب الوطنی کے جذبات کو ابھارنے کی کامیاب کوشش ملتی ہے۔ (۶) جگر کی غزلوں میں رندی و سرمستی، اور سرشاری کی وہی کیفیات ملتی ہیں جو فارسی میں حافظ

سے منسوب ہیں، جگر کی شاعری کا یہ عنصر انہیں شاد سے بہت قریب کر دیتا ہے

چوتھے باب میں جگر کے استعاروں سے بحث کی گئی ہے اور بڑی خوبصورتی سے جگر کے استعاراتی نظام کے رکھ رکھاؤ کی وضاحت کی ہے مختلف اشعار کا تجزیہ کرکے یہ واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ اگرچہ استعارہ سازی ایک مشکل امر ہے اس کے باوجود جگر اس منزل سے بخوبی گزر گئے ہیں۔

پانچویں باب میں جگر مراد آبادی کی شاعری میں پیکر تراشی کی مثالوں کی تلاش کی ہے اس کی وضاحت کیلئے پہلے پیکر کی تعریف کی ہے اور پھر مختلف حوالوں سے پیکر کی وضاحت کرنے کے بعد جگر کے پیکر تراشی کے فن پر روشنی ڈالی ہے اور مختلف اشعار کے حوالے سے مختلف پیکروں کی وضاحت کے بعد بہت درست فیصلہ دیا ہے کہ:

"جگر مراد آبادی کی شاعری میں لمسی پیکروں کی بڑی کمی ہے اور اسی طرح مذوقی پیکر بھی بہت کم ملتے ہیں اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی دراصل جگر کی شاعری میں رنگ و آہنگ کا کیف زیادہ ہے اور یہی کیف ان کی پوری شاعری پر چھایا ہوا ہے۔ جگر آنکھوں سے زیادہ کام لیتے ہیں"

میرے خیال میں جگر کی شاعری میں لمسی پیکروں کی کمی کا سبب یہ ہے کہ ان کا نظریہ عشق پاکیزہ اور ارفع ہے جسکی نشاندہی مصنف نے ان کی خصوصیات کی فہرست سناتے وقت خود کی ہے حیرت ہے کہ انہیں اسکی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، بہرکیف مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ جگر کی شاعری میں استعاراتی نظام کی تلاش اور پیکروں کی دریافت جگر کی شاعری کے مطالعے کو ایک نیا رخ اور نئی سمت دینے کی ایک نادر مثال ہے۔ اور غالباً جیسا کہ مصنف نے دعویٰ کیا ہے ان کی یہ شعوری کوشش سب سے پہلا قدم ہے۔ مصنف سے پہلے جگر کی شاعری کے اس پہلو کو زیر بحث نہیں لایا گیا ہے"

چھٹے باب میں "جگر مراد آبادی اور رسالہ نگار" کے عنوان سے ان تنقیدات کا جائزہ لیا گیا ہے جن کے ذریعہ جگر کی شاعری میں کیڑے نکالنے کی کوشش کی گئی تھی، مصنف نے نیاز فتح پوری اور نگار کے ان ناقد مصنفین کی تنقیدات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مصنف بیان تنقید کا حق ادا کرنے میں ناکام رہے ہیں، ان کے دلائل مدلل اور تشفی بخش نہیں ہیں۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہوجائے گی، نیاز نے جگر کے مندرجہ ذیل شعر پر

ادھر جوش مستی ادھر جوش شوق مصیبت میں بند نقاب آگیا

یہ تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا، پہلے مصرعے میں ادھر ادھر کی ترتیب غلط ہے، دوسرے مصیبت میں آنا خلاف روزمرہ ہے مصیبت میں پڑنا ہونا چاہئے، مصیبت سے بہتر کشش ہوتا مصیبت اس وقت ہوتی جب اس طرف جوش جیسا پایا جاتا،

اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے مصنف نے "میری رائے" کے تحت جو لکھا ہے یہ ہے "ادھر ادھر کی ترکیب غلط نہیں ہے یہ ترکیب کس طرح غلط ہے، بتایا نہیں گیا، مصیبت میں آنا ایک تخلیقی بیان ہے"

جس طرح یہ نہیں بتایا گیا کہ ادھر ادھر کی ترکیب کس طرح غلط ہے اس طرح مصنف نے یہ بھی نہیں بتایا کہ یہ ترکیب کس طرح غلط نہیں ہے، "ترکیب غلط نہیں ہے" لکھ دینا کافی نہیں پھر یہ کہ مصیبت میں آنا تخلیقی بیان کیسے ہوا۔ اس کی توجیہہ وتوضیح بھی ضروری تھی۔

معترض کا اعتراض مدلل ہے کہ یہ اس لیے غلط ہے کہ "روزمرہ کے خلاف ہے" مصنف اگر اسے تخلیقی بیان مانتے ہیں تو انہیں اسکی دلیل دینا چاہئے تھا، اس قسم کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ ہاں اسباب کے اختتام پر جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ درست ہے "غزلوں میں بعض جگہ سقم موجود ہے معنوی جنون کے عیوب کی بھی نشاندہی کی جاسکتی ہے لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ شاعر کو اس کے اچھے اور منتخب کلام کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔"

ساتویں باب میں مذکورہ تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو غزل میں جگر کے مقام ومرتبے کا تعین کرتے ہوئے تحریر کیا ہے "جگر نے کلاسیکی غزلیہ شاعری کی سج دھج قائم رکھی، پھر اس کے بعض نکات کی توسیع کی ان کے یہاں غالب کی گہرائی وگیرائی اور معنوی تہہ داری نہیں ہے لیکن وہ کہیں کہیں غالب کے عمق کو بھرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں، ان کے یہاں میر کا سوز اور علمن نہیں ہے لیکن ان کی سادگی وپرکاری تلاش کی جاسکتی ہے ہاں حافظ کی غزلوں کی سرشاری جگر کا طرہ امتیاز ہے اور شاید ان کی مقبولیت کا بڑا سبب بھی ہے"

حاصل مطالعہ میں ان کا یہ دعوی درست معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جگر کی شاعری کا معتدل مطالعہ پیش کیا ہے اور ساتھ یہ بھی کہ جگر کی شاعری کے استعاراتی نظام اور ان کے پیکروں سے سب سے پہلے انہوں نے بحث کی ہے۔"

حصول سند کی خاطر تحریر کیے جانے والے مقالوں کی کمی تھی، جب سے قابلیت وصلاحیت کی جگہ محض سند کو ترقی کے اگلے زینے تک پہنچنے کے طور پر استعمال کیا جاتے لگا ہے سندی مقالوں کی باڑھ سی آئی ہوئی ہے۔ ان کے معیار بھی کافی گر گئے ہیں، لیکن اس سیلاب میں کچھ ایسی تحریریں بھی نکل آتی ہیں جو لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے میں کامیاب ہو جاتی ہیں مجموعی حیثیت سے ڈاکٹر مہتاب انصاری کی یہ کتاب بھی اس زمرے میں آتی ہے۔ مہتاب انصاری نے اس کتاب میں جگر کا معروضی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کو ان کی محنت کا انعام ملنا چاہئے۔

••

ڈاکٹر محمد حسن
شعبہ اردو
جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کا تحسس

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

تحقیق کا مقصد نئے حقائق کا انکشاف یا پرانے حقائق اور معلومات کی نئی تفسیر اور توجیہ ہے عام طور پر تحقیق کسی سوال کا جواب فراہم کرتی ہے یا کسی مسئلے کے حل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان چاروں شرائط سے عاری تصنیف تحقیقی مطالبے پورا کرنے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ اردو میں تحقیق کا مزاج زیادہ تر SURVEY ORIENTED یا جائزیاتی رہا ہے، .... مسائلی یا تجزیاتی نہیں رہا۔ اسی لئے ہمارے اکثر تحقیقی مقالے معلومات یا دستاویزوں کی کھتونی تو ہیں مگر معلومات سے استخراجِ نتائج تو درکنار اصل مسئلے کا رشتہ بھی نہیں ملاتے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال تحقیقی مقالوں میں سماجی یا تاریخی پس منظر والے ابواب ہوتے ہیں جن کا تعلق بعد کے ابواب سے قائم نہیں کیا جاتا۔

دوسری بڑی کمی سائنسی یا منطقی ربط و ترتیب اور معروضی لہجے کی ہے بعض محققین نے معروضیت سے صرف یہی مراد لی ہے کہ زیرِ بحث موضوع پر کام کرتے وقت اس کے حق میں یا اس کے خلاف کوئی رائے پہلے سے قائم نہ کی جائے اور حقائق جس طرف لے جائیں اسی قسم کے فیصلے یا نتیجے پر پہنچا جائے مگر افسوس ہے کہ معروضیت کی اس تعریف پر خود یہ محققین بھی عمل پیرا نہیں ہوتے اور کسی معاملے کے حق میں یا اس کے خلاف وکیلوں کی سی دلیلیں پیش کرتے وقت انہیں معروضیت کا خیال نہیں آتا۔ گویا تحقیق میں سخن فہمی کم ہے اور بقول غالب طرفداری زیادہ

معرکہ اور معاملہ فقیق کی زبان کا بھی ہے۔

اگر معروضیت کے کوئی معنی ہیں تو تحقیق میں ذاتی یا نجی لب و لہجہ ممنوع ہونا چاہیئے اور صیغہ واحد متکلم اس سے باہر نکالا جانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ بیانات اور نتائج میں بھی مصنف کی رائے تحریک کے جوش و خروش سے۔ بلکہ مدلل اور گزارش احوال واقعی کا انداز قائم رہنا چاہیئے۔

تحقیق کے ضابطوں کی بنیادیات یہ بھی شامل ہے کہ

اول تو زیر بحث موضوع کی تعریف اور احاطۂ بحث متعین کرلیا جائے اسی تعین کی بنا پر عام طور پر معیاری

تحقیقی مقالے کے عنوانات طویل اور کسی قدر غیر شاعرانہ سے ہو جاتے ہیں؛

دوم:۔ زیر بحث موضوع پر سبھی دستیاب ہونے والی معلومات یکجا کرلی جائیں اور اس میں یہ احتیاط برتی جائے کہ اس معلومات کا کوئی اہم حصہ چھوٹنے نہ پائے؛

سوم: حاصل شدہ معلومات کی مناسب توثیق اور تجزیے سے غفلت نہ برتی جائے اور ان شواہد پر پوری چھان بین کے بعد نتیجے اخذ کئے جائیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کے تحقیقی مقالے کا عنوان ہے "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" یہ مقالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کیلئے پیش کیا گیا تھا۔ مقدمے پر اگست ۱۹۵۷ء کی تاریخ ہے جبکہ اس کی اشاعت ۱۹۷۲ء میں ہوئی۔ کتاب کی شکل میں یہ مقالہ انجمن ترقی اردو (ہند) نے علی گڑھ سے شائع کیا۔ اشاعت کے وقت پیش لفظ کے عنوان سے مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس پر ۸ جون ۱۹۷۱ء کی تاریخ درج ہے۔ گویا یہ مقالہ ۱۹۵۷ء میں یا اس سے کچھ قبل پی۔ایچ ڈی کی ڈگری کیلئے یونیورسٹی میں داخل کیا گیا اور تقریباً ۱۴ سال بعد مصنف نے اس کی اشاعت کے وقت پیش لفظ لکھا۔ یہ مدت اس لئے اہم ہے کہ ترقی پسند تحریک اس دور میں نہایت اہم تبدیلیوں سے گزر رہی تھی۔ ممکن ہے مقالے کی شائع شدہ شکل اور یونیورسٹی میں پیش کردہ شکل میں اختلافات ہوں۔ ان کے مقابلہ اور موازنہ کا موقع نہیں مل سکا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اردو کے اکثر تحقیقی مقالوں کی طرح یہ مقالہ بھی FORMULATION FOCUSED نہیں ہے۔ اس لئے اس کے مرکزی FORMULATION کے لب لباب کے بارے میں کوئی سوال پوچھا نہیں جاسکتا نہ یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اس مقالے کی دریافت کیا ہے؟ یہ نئے حقائق کا انکشاف کرنے والا مقالہ نہیں ہے، اور یہ پرانے حقائق کی نئی تفسیر و توجیہہ سے بڑی حد تک خالی ہے البتہ جائزہ یاتی ضرور ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ دستاویزی معلومات یکجا کی جائیں مگر یہ کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی۔

اردو میں تحقیقی مقالوں کا ایک انداز یہ بھی رہا ہے کہ کسی موضوع پر چھان بین اور تحقیق کرنے کے لیے اس موضوع کے بنیادی مباحث کے بجائے اس موضوع سے متعلق چند ابتدائی باتیں کرنے کے بعد اس سے متعلق مختلف شاعروں اور ادیبوں پر الگ الگ نوٹ لکھ دیئے جائیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے شروع کے اردو کے دو تحقیقی مقالوں دلی کا دبستان شاعری اور لکھنؤ کا دبستانِ شاعری کا یہی انداز رہا ہے۔ یہ دراصل تحقیقی مقالے کے ابتدائی منصوبے یا ، ، کی خامی ہے جو اصل مسئلے سے توجہ ہٹا کر شخصیات یا افراد پر مبذول کر دیتی ہے مثلاً

لکھنؤ کے دبستان شاعری میں اس دبستان شاعری پر غالباً کل ۲۰۰-۲۵ صفحات ہیں جبکہ پڑھنے والے کی توقعات یہ ہوتی ہیں کہ وہ اس دبستان شاعری کے موضوعات، اندازِ بیان، تصورِ حیات، زبان و بیان کی خصوصیات اور امتیازات کے بارے میں اسباب و علل اور محرکات کی روشنی میں بنیادی باتیں جان لے۔ مگر عام طرزِ تحقیق یہ ہے کہ ایک باب سماجی اور تاریخی پس منظر کا جس کا تعلق بعد کے ابواب سے نہیں ہوتا، پھر ایک باب میں اس وقت تک ادبی فتوحات کا جس کا تعلق بھی بعد کے ابواب سے برائے نام ہوتا ہے، پھر تیسرا باب اصل موضوع کے بارے میں جو بہت مختصر ہوتا ہے، اور اس کے بعد اس موضوع سے متعلق ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں تذکرے کے انداز کے نوٹ۔ گویا تحقیقی مقالے اکثر اردو تذکروں کے طرز پر مدون ہوتے رہتے ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کے مقالے میں بھی یہی انداز قایم رکھا گیا ہے، مگر ذرا اعتدال سے حصّہ اول ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے تاریخی ارتقا کے لئے وقف ہے۔ یہ ۱۲۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ۱۵ صفحات سیاسی پس منظر کے ہیں باقی میں ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کی بعض دستاویزیں اور تقریریں ہیں، حصّہ دوم میں ترقی پسند ادبی سرمائے کا جائزہ ہے جس میں شاعری پر ۸۷ صفحات ہیں۔ ان ۸۷ صفحات میں صرف ۱۶ صفحات میں مسایل سے بحث کی گئی ہے۔ باقی صفحات میں مندرجہ ذیل شعرا پر الگ الگ تنقیدی نوٹ ہیں:

سید مطلبی فریدآبادی، علی جوادزیدی، سلام مچھلی شہری، مسعود اختر جمال، اختر انصاری، مجاز، جذبی، فراق، فیض، مخدوم، سردار جعفری، کیفی، جاں نثار، ساحر، مجروح، اختر الایمان، احمد ندیم قاسمی، شاد عارفی، پرویز شاہدی، منیب الرحمٰن، عزیز حامد مدنی، ظہیر کاشمیری، قتیل شفائی۔

افسانے پر ۷۳ صفحے لکھے گئے ہیں اس میں صرف ساڑھے سات صفحے انگارے گروپ اور ریریم چند اسکول کے لئے وقف ہیں جس میں چند عام مسایل زیر بحث آگئے ہیں۔ مگر نہ پلاٹ کی تشکیل کا تجزیہ ہے نہ کردار نگاری کی نوعیت کا تجزیہ، نہ اندازِ بیان اور تکنیک کا تجزیہ۔ اس کے بعد حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، اپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی، دیوندر ستیارتھی اور بلونت سنگھ پر نوٹ اور آخر میں ایک تتمہ ہے۔

ناول پر ساڑھے دس صفحات ہیں۔ ڈرامے پر ۶ صفحات، طنز و مزاح پر گیارہ صفحے، تراجم پر ساڑھے سات صفحے، رپورتاژ، ڈائری، مکاتیب اور شخصیت نگاری (یہ شخصیت نگاری کی اصطلاح درست نہیں) ساڑھے چھ صفحے۔ اس طرح سے تخلیقی ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کا جایزہ ختم ہوتا ہے۔

حصہ سوم ترقی پسند تنقید کے لئے وقف ہے اور یہی مقالے کا سب سے اہم حصّہ ہے مگر صورت حال یہاں بھی یہی ہے۔ ادبی تصورات پر ۲۹۰ صفحے سے لے کر ۳۴۳ تک یعنی ۵۳ میں مختلف ترقی پسند نقادوں کے مختلف موضوعات پر اقتباسات نقل کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ترقی پسند تنقید کے پیچ و خم کے عنوان سے ۷۷ صفحات میں سے صرف ۵ صفحات عام مباحث کے لئے وقف ہیں باقی ۷۲ صفحات میں اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، مجنوں، آل احمد سرور، احتشام حسین، ڈاکٹر علیم، اختر انصاری، عزیز احمد، ممتاز حسین اور سردار جعفری پر حسب سابق تنقیدی نوٹ ہیں آخر میں ترقی پسند تنقید کے اثرات پر ۹ صفحات صرف ہوئے ہیں۔ پھر روسی ادب سے مماثلت پر تین صفحے کا نوٹ ہے اور آخر میں پس لفظ کے عنوان سے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ پوری کتاب ایک طریقے کا تذکرہ ہے۔ جس میں ابتدائیہ کے طور پر مباحث کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد الگ الگ مصنفین پر تنقیدی اور خاصے غیر مربوط نوٹ ہیں جن سے اس موضوع کے تحقیقی تقاضے پورے نہیں ہوتے۔

۱ ـــــ پس منظر کے طور پر ۱۹ صفحہ سے ۳۲ صفحہ تک سیاسی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادبی تحریک سیاسی حالات کا نتیجہ تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو ترقی پسند تحریک کے بعد کے ارتقا کے سلسلے میں بھی اس قسم کے پس منظر کی ضرورت تھی جس کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا ہے مثلاً بھیمڑی کانفرنس کے وقت کی سیاسی تبدیلیوں کا ذکر نہیں۔

۲ ـــــ پس منظر میں ۱۹ صفحہ سے ۴۲ صفحہ تک تقریباً تمامتر کانگریس کی سیاست کے لئے وقف ہے حالانکہ اس میں تو پوری عالمی سیاست (مثلاً فاشزم کا عروج وغیرہ) پوری قومی سیاست کے اہم پہلو (کانگریس کے باہر کی سیاست بھی) اور خاص طور پر کمیونسٹ تحریک کے میلانات کا تذکرہ ضروری ہے۔

۳ ـــــ ۱۹۳۲ء میں نوجوان لکھنے والوں کی نئی کہانیوں کے مجموعے "انگارے" کی اشاعت کا ذکر ہے۔ اس میں مروجہ اخلاق اور مذہبی عقاید پر طنز و استہزا کا رنگ بقول مصنف بہت شوخ ہوگیا تھا۔ اس کے خلاف بقول مصنف اس قدر احتجاج کیا گیا کہ حکومت نے اس مجموعے کو ضبط کرلیا۔ اس کا ذکر نہیں ہے کہ کس نے یا کن لوگوں نے احتجاج کیا اور حکومت نے جب انگارے کو ضبط کیا تو وہ سیاسی وجود سے تھا یا مذہبی اور اخلاقی شوخ رنگ کی وجہ سے، اور اس رنگ کا ترقی پسندی سے کیا رشتہ مصنف کے نزدیک تھا۔

۴ ـــــ صفحہ ۲۷ پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور کا متن نقل ہوا ہے۔ یہ منشور رسالہ 'ہنس' کے اکتوبر ۳۵ء

کے شمارے کے حوالے سے دیا گیا ہے لیکن یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ منشور ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ یا انگریزی سے ہندی میں ترجمہ ہوا پھر ہندی سے اردو میں ترجمہ کس کا ہے۔

۵ ـــــ محولہ بالا منشور میں، بعد کے اعلان نامہ (صفحہ ۵۴) یا بعد کے کسی بھی اعلان نامے میں فحاشی، جنس زدگی یا آزاد نظم اور بحور و اوزان وغیرہ میں تجربوں کا کوئی ذکر نہیں ہے جبکہ انہیں تینوں باتوں کی مخالفت کا ذکر صفحہ ۸۷ تا ۹۲ میں ہے" اور مصنف نے ایسے مصنفین کو ترقی پسند تحریک کے شرکا میں شامل نہیں کیا ہے۔ جن کی تحریروں کی وجہ سے اس قسم کی مخالفت ہوئی۔ مثلاً میراجی، ن۔ م۔ راشد اور سعادت حسن منٹو۔ منٹو کو ترقی پسند افسانہ نگاروں میں شامل کیا گیا ہے (۲۱۹) مگر میراجی اور ن۔ م۔ راشد کا ذکر نہیں ہوا ہے۔

۶ ـــــ 'انگارے' اور 'نیا ادب' کی انتھالوجی کی طرح 'نئے زاویے' کی دونوں جلدوں کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ مگر ان کا تذکرہ نہیں ہے۔ تفصیلی تذکرہ ضروری تھا۔ یہ کرشن چندر نے مرتب کی تھیں اور یہ وہ کرشن چندر ہیں جس سے ن۔ م۔ راشد نے اپنی کتاب 'ماورا' کا دیباچہ لکھوایا تھا اور 'مداوا' پیروڈی کی کتاب کا نام ماورا کی پیروڈی ہی کے طور پر رکھا گیا تھا۔

میراجی کو صفحہ ۱۳۵ پر خالص فنی قدروں کا "دلدادہ" کہا گیا ہے۔ اور سید مطلبی کی تھوڑ نگاں والی نظم پر ان کی رائے سند کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ حالانکہ میراجی کی نظم 'سرگوشیاں' اور دیگر نظمیں ہی فحاشی کے سلسلے میں سب سے زیادہ مورد عتاب ہوئی تھیں۔ یہ عتاب ترقی پسندوں پر نازل ہوا تھا۔ یہی صورت راشد کی نظم "دریچے کے قریب" کے بارے میں تھی۔

۷ ـــــ صفحہ ۲۱۹ پر روسی ادب سے مماثلت والا حصّہ غیر متعلق ہے، اور یہ اختر حسین رائے پوری کے ایک مضمون کے ثانوی وسیلے سے، حالانکہ اس دور کے روسی ادب پر انگریزی کتابیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف نے اس سے قبل لندن میں مقیم ادیبوں کے سامراج دشمن تصورات سے تو ترقی پسند تحریک کا رشتہ قایم کیا تھا بلکہ فاسزم دشمن ادیبوں کی جولائی ۱۹۳۵ء والی کانگریس کے اثرات کا بھی صفحہ ۴۴ پر ذکر ہے، مگر کہیں اور کبھی روسی ادب سے اس کا رشتہ نہیں جوڑا گیا۔ اچانک آخر میں یہ مماثلت کہاں سے در آئی۔

۸ ـــــ صفحہ ۲۸۹ سے ۳۴۲ تک مختلف تنقیدی تصورات کا تجزیہ کرنے کے بجائے (حالانکہ حصّہ دوم کا عنوان ہے ترقی پسند تنقید؛ ایک تجزیاتی مطالعہ) صرف مختلف موضوعات پر اختر حسین رائے پوری سے لیکر ممتاز حسین

(بلکہ آل احمد سرور تک جنھیں مصنف نے پوری طرح ترقی پسند نقادوں کی صف میں نہیں رکھا ہے) مختلف نقادوں کے اقتباسات نقل کر دیے گئے ہیں جو کسی تحقیقی مقالے کا حصہ نہیں بن سکتے۔ البتہ ان تصورات پر تجزیاتی بحث ضروری تھی۔

۹ــــ صفحہ ۳۴۵ پر نہ جانے کیسے اور کیوں کر یہ نتیجہ بغیر استدلال نکال لیا گیا ہے کہ "جماعتی سیاست کے اس ناگزیر تعلق کے بعد ترقی پسندی کا ایک اور تصور ابھرتا ہے کہ ادب کو اس جماعت کے نصب العین اور اغراض و مقاصد کا آلہ کار ہونا چاہیے یعنی اس کے منشور اور حکم نامے کے مطابق شعر و ادب کی تصنیف کی جائے۔"

۱۰ــــ صفحہ ۳۷۱ پر مصنف نے سجاد ظہیر کے بارے میں لکھا ہے کہ "ان کے یہاں بڑی لچک کی گنجائش ہے۔ ان کے ذہنی رویے نے ادبی معاملات میں ان تنقیدی کجرویوں اور فکری خامیوں سے بچا لیا جس کے متعدد ترقی پسند نقاد اور ادیب شکار رہے ہیں۔"
آگے کے صفحات میں جن نقادوں کا ذکر ہے ان میں احتشام حسین اور سردار جعفری کے علاوہ خود مصنف نے باقی سبھی کو کسی نہ کسی طریقے سے ان تنقیدی کجرویوں اور فکری خامیوں کے ذمہ دار قرار نہیں دیا ہے جن میں سجاد ظہیر بھی شامل ہیں مثلاً مجنوں، آل احمد سرور، ڈاکٹر عبدالعلیم، اختر انصاری عزیز احمد، اور ممتاز حسین۔

۱۱ــــ وامق اور جعفری کے نزاع کا تنقیدی محاکمہ یا تجزیہ کرنے کے بجائے صفحہ ۴۱۰ پر دونوں کو غلط کہہ کر سرسری فیصلہ دے دیا گیا ہے۔

۱۲ــــ صفحہ ۴۱۲ پر ترقی پسند تنقید کے اثرات سے بحث کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے پہلے منشور میں دو باتوں پر زور دیا گیا تھا، سائنسی عقلیت پسندی کا فروغ اور ترقی پسند تحریکوں کی حمایت۔ مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس منشور کا دائرہ خاصہ وسیع سمجھا گیا۔ ان باتوں کی تنسیخ یا اس دائرے کے تنگ ہونے کا ثبوت کسی بعد کے منشور سے فراہم نہیں کیا گیا ہے۔

۱۳ــــ مصنف نے تنقیدی امور میں مارکسی نظریے کا ذکر بار بار کیا ہے، ممتاز حسین کے سلسلے میں بھی اور آخر میں بھی لیکن وہ مارکسی فکر کی بنیادی اقدار ارتقا اور ارتقا بذریعہ جدلیات کے تصور سے بالکل ناآشنا ہیں اور اسی لئے مارکسی ادبی تنقید میں جو ارتقا اور جو تبدیلیاں زیر بحث دور میں عالمی سطح پر ہو رہی تھیں

اور جن میں کاڈریل سے لے کر کم سے کم لوکاچ اور برگفٹ تک کے کارنامے اہم ہیں اور جنہوں نے مارکسی تنقید کا رخ بدل کر رکھ دیا ہے ان سے مصنف لاعلم ہیں۔

۱۴۔۔۔۔ صفحہ ۱۱۰ پر سردار جعفری کے جذبی کے خلاف رجعت پسندی کے الزام کا ذکر ہے اور صفحہ ۱۱۲ پر۱۱ پر خاص طور پر خواجہ احمد عباس اور جذبی پر احتساب کا ذکر ہے۔ اتفاق سے مصنف خود اس زمانے میں علی گڑھ کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری تھے۔ اور جذبی کے خلاف احتساب میں ہی نہیں بلکہ ان کے انجمن سے اخراج کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ اس کا ذکر اور خود انتقادی ادبی اور تحقیقی دیانت کا تقاضا تھی۔

۱۵۔۔۔۔ صفحہ ۱۱۳ پر سجاد ظہیر کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ جب ان کو اس طرح کا (یعنی بقول مصنف پروپیگنڈے کیلئے لکھا ہوا) ادب بھجوایا گیا تو بقول مصنف انہوں نے یعنی سجاد ظہیر نے "الٹی نصیحت شروع کردی بہت سے اشعار کو وزن سے خارج بتایا۔ بہت سی جگہوں پر تنافر لفظی کی گرفت کی " یہ مصنف کے نزدیک الٹی نصیحت تھی!

۱۶۔۔۔۔ صفحہ ۲۱۰ 'انگارے' کے اقتباسات کا ذکر ہے۔ سجاد ظہیر کے افسانے 'نیند نہیں آتی' کا ذکر ہے مگر اس بات کا ذکر نہیں کہ اس افسانے میں غالباً پہلی بار STREAM کی تکنیک اردو میں برتی گئی۔ اس کے علاوہ طوائف کے خدا کے سامنے پیش ہونے کے بعد کے مکالموں یا جملوں میں جو شوخی اور گستاخی ہے وہ مذہبی مزاج کے لوگوں کو ناگوار گزری۔

۱۷۔۔۔۔ صفحہ ۱۰۱ سے ۱۰۷ تک بھیمڑی کانفرنس کا منشور نقل کیا گیا ہے اس میں اس قسم کے الفاظ یا جملے نہیں ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے جو مصنف نے صفحہ ۴۱۶ پر نکالا ہے:

"۱۹۴۹ء کی بھیمڑی کانفرنس میں پرانے منشور کو بدل کر نیا منشور وضع کیا گیا جس میں ترقی پسند ادیبوں کے لئے جماعتی سیاست کی وفاداری اور اشتراکی جماعت کے پروگراموں میں عملی شرکت لازمی قرار دی گئی اور یہ طے پایا کہ جو ادیب اس کی پابندی نہ کرے گا اسے تحریک سے رجعت پسند کہہ کر الگ کر دیا جائے گا۔"

۱۸۔۔۔۔ روسی ادب سے مماثلت پر ایک الگ نوٹ صفحہ ۴۱۹ سے ۴۲۲ تک شامل ہے مگر سوشلسٹ ریلزم کے اس تصور سے بحث نہیں کی گئی جسے یورپ اور ہندوستان کے بعض ترقی پسند ادیبوں نے

بھی قبول نہیں کیا۔

۱۹ــــ ترقی پسند ادب اور مارکسی ادب خصوصاً ترقی پسند تنقید کے تصورات اور مارکسی تنقید کے تصورات میں کوئی فرق ہے یا نہیں اس سے بحث نہیں کی گئی ہے اور نہ عالمی مارکسی تصورات اور اصول و نظریات میں جو تبدیلیاں مارکس اور اینگلز کے دور سے ۱۹۵۷ء تک آئی ہیں ان سے مصنف با خبر ہیں۔

۲۰ــــ ترقی پسند تحریک کی مخالفت کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر شروع کی ان مخالفتوں تک مصنف نے اس تذکرے کو محدود رکھا ہے جو اسٹیٹمین اخبار کے نوٹ اور راجہ صاحب محمود آباد، ماہر القادری، جعفر علی خاں اثر اور فرقت کاکوروی کی مدادا کی صورت میں سامنے آئیں۔ حلقۂ ارباب ذوق کا محض سرسری تذکرہ ہے۔ حالانکہ ۱۹۷۱ء تک خود مصنف بھی ایسی متعدد سرگرمیوں سے وابستہ تھے جو ترقی پسند تحریک کی مخالفت میں شروع کی گئیں۔ مثلاً جدیدیت کی تحریک کا ترقی پسندی دشمن پہلو اور اس سلسلے کا پہلا اجتماع جو علی گڑھ میں ہوا، اور اس سے قبل ۱۹۵۹ء میں رسالہ 'خیال' ناگپور کے ذریعے ترقی پسند تحریک کی مخالفت کا سلسلہ ان مخالفتوں کا ذکر نہیں ہے۔ یہ تذکرہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ مصنف کا غیر معروضی نقطۂ نظر اس وابستگی سے واضح ہوتا ہے۔

۲۱ــــ مصنف نے ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے ان مخالفتوں کا ذکر ہی نہیں کیا جو سیاسی بنیادوں پر ہوئیں۔ ایک طرف ترقی پسند مصنفین کے لئے سرکاری ملازمتوں اور سرکار اداروں کے دروازے بند کر دیئے گئے اور آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں میں شمولیت پر پابندی لگا دی گئی۔ دوسری طرف تعمیر پسند مصنفین کی تحریک شروع کرنے کی کوشش کی گئی جس کا مقصد حکومت ہند کی "تعمیری" سرگرمیوں کے لئے عوام میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے کے لئے ادب پیدا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ رسالہ 'تحریک' کے ذریعہ جو نظریاتی مخالفت کی گئی اس کا تذکرہ بھی موجود نہیں ہے۔

۲۲ــــ مصنف نے ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک اور اس کی مخالفت اور بعد کو اس پر پابندی لگنے کا ذکر نہیں کیا حالانکہ وہ اکثر ترقی پسند مصنفین پر تنقید کرتے وقت پاکستان کے ترقی پسند مخالف ادیبوں کے اقوال اور اقتباس پیش کرتے ہیں مثلاً کرشن چندر کے سلسلے میں انتظار حسین کا قول (منقولہ صفحہ ۲۱۶) اس مخالفت کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ اس کی نوعیت سیاسی تھی اور ارباب

اقتدار میں ترقی پسندوں کی مخالفت میں پہلے ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے پہل کی۔ جس میں ترقی پسند ادیبوں کی پاکستان سے وفاداری اور کشمیر کے مسئلے پر پاکستانی موقف کی حمایت کا سوال اٹھایا۔ اس کے بعد محمد شاہین اور ممتاز شیریں کے رسالے 'نیا دور' کراچی کے اداریوں اور مضامین میں فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ کے معاملات میں واضح طور پر ایک فرقے کی حمایت کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور ترقی پسندوں کی سیکولر غیر جانبداری کی سخت تنقید کی گئی اور اس کے بعد حسن عسکری نے اسلامی ادب کا تصور ترقی پسند ادب کے تصور کے مقابلے میں پیش کیا اور بعد کو حسن عسکری، انتظار حسین اور سلیم احمد کی سرکردگی میں اور رسالہ "سات رنگ" لاہور کی ادبی قیادت میں ترقی پسندوں کا مخالف محاذ تیار ہوا۔ ان سب معاملات سے مصنف کو ذاتی طور پر واقفیت تھی جس کا ثبوت ان کے متعدد مضامین اور خطوط سے ملتا ہے جو ان رسالوں میں شائع ہوئے مگر ان مخالفتوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

۲۳۔۔۔۔ احتشام حسین پر اعتراض کرتے وقت مصنف نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ فیض، مجاز، جعفری، کیفی اور نمایاں سب ترقی پسند شاعر ہیں اور عوام کیلئے صحتمند ادب پیش کر رہے ہیں۔ مگر ان کی تنقید اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے کہ ان شعرا میں کون سا قد راوّل کا شاعر ہے اور کس کی شاعری کا اوسط درجے سے آگے ہو، جاتی (صفو ۲۷۰، مواد ادب اور ہیئت) ادب کی مصنوعی تفریق کرکے اس سوال کا جواب ان مصنفین پر تنقیدی نوٹ لکھتے وقت خود مصنف نے بھی فراہم نہیں کیا ہے۔ (صفحہ ۴۲۹) اور محض تجربے کو فن کی اساس قرار دے کر اس سوال سے خود بھی چشم پوشی کی ہے اور مختلف ادیبوں اور شاعروں پر جو تنقیدی نوٹ لکھے ہیں ان میں نہ تو احساس، خیال اور فکر کا تجزیہ کیا گیا، نہ نظریہ کس حد تک تجربہ اور مشاہدہ بن سکا ہے اس کی کوئی میزان وضع کی گئی ہے، درتی اور تکنیک کی بحثیں اٹھائی گئی ہیں بلکہ کسی کا ترقی پسند مصنف ہونا یا نہ ہونا بھی خود مصنف نے اپنے طور پر طے کر لیا ہے۔

۲۴۔۔۔۔ تنقید میں ذاتی ہی نہیں کبھی کبھی مقامی اور منصبی مصلحتوں کا دخل بھی نمایاں ہے مثلاً ڈاکٹر عبدالعلیم کے تنقیدی بیانات جو احتشام صاحب کے مقابلے میں کہیں زیادہ انتہا پسندانہ ہیں (یہ بیان کہ "دہی چیز زیادہ حسین ہے جو زیادہ مفید بھی ہو" صفحہ ۳۷۸) سخت تنقید نہیں کی گئی ہے۔ مگر احتشام حسین پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ جبکہ آل احمد سرور کو توازن کی مثال اور رشید احمد صدیقی کی ترقی پسند ادب پر تنقید کی حمایت کی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ یہ مقالہ جائزہ یا تی تقاضوں کو کسی حد تک پورا کرتا ہے مگر ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق قاری کے تقاضوں کو ہرگز پورا نہیں کرتا اور بنیادی مباحث کو یا تو سرے سے اٹھاتا ہی نہیں یا ان سے سرسری گذر جاتا ہے۔

جناب مسرت حسین آزاد
بنگلہ آزاد خاں، رامپور

ڈاکٹر مظفر حنفی کا تحقیقی مقالہ

شاد عارفی ۔ شخصیت اور فن

رامپور کی نئی پرانی ادبی اور علمی شخصیات میں شاد عارفی وہ پہلا شاعر ہے جس پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کی گئی۔
ڈاکٹر مظفر حنفی شاد صاحب کی شخصیت اور کلام سے بے حد متاثر ہیں۔ وہ شاد صاحب کے شاگرد بھی ہیں اور استاد بھی۔ شاگرد اس لحاظ سے کہ کثیر
کلام پر اصلاح لی ہے اور استاد اس لیے کہ وہ اب شاد صاحب کی شخصیت کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں لیکن وہ اپنی اس
کوشش میں مخلص ہیں۔ آج شاد کا ہر چاہنے والا ان کی خدمات کو سراہتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ شاد عارفی کے
کلام کے مختلف گوشوں پر اور خصوصاً ان کے طنزیہ اشعار کی تفسیر میں مظفر صاحب جو کچھ اور جس قدر بھی لکھ چکے ہیں اس پر اضافہ کا امکان اب دور
دور تک نظر نہیں آتا۔ ہاں اگر کبھی موجودہ ادبی اقدار نے کوئی جدید کروٹ لی اور حالات کے مطالبے کچھ سے کچھ ہوئے تب ممکن ہے شاد کے طنز
کی افادیت کو پرکھنے والا کوئی نقاد ڈاکٹر مظفر حنفی کے اس کام پر اضافہ کر سکے۔

شاد عارفی کے سلسلے کی ڈاکٹر حنفی کی دیگر تالیفات مثلاً 'ایک تھا شاعر'، 'نثر و غزل دستہ'، اور 'کلیات شاد' وغیرہ کافی مشہور ہو چکی
ہیں لیکن یہ تحقیقی مقالہ "شاد عارفی شخصیت اور فن" ادبی حلقوں میں کافی غور و فکر کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور تردید میں کئی تفصیلی مضامین
بھی سپرد قلم کیے گئے ہیں۔ جناب شبیر علی خاں شکیب کا طویل مقالہ جو اخبار روزنامہ ناظم رام پور کی کم از کم پندرہ اشاعتوں میں مکمل ہوا تھا بطور
خاص تیار کیا گیا تھا اور ابھی تک اس کے کتابی صورت میں شائع نہ ہونے پر مجھے سخت حیرت ہے۔

بعض غلط فہمیوں کے باوجود بھی مظفر صاحب شاد عارفی کے حالات و واقعات زندگی پر اور کلام پر بھرپور قدرت رکھتے
ہیں جس کے اظہار نے کچھ کو یہ تک کہنے پر مجبور کیا کہ جس طرح غالب کو حالی مل گیا تھا اسی طرح قدرت نے شاد کے لیے مظفر کو پیدا کر دیا۔
اس قول میں بڑی حد تک صداقت ہے۔ مصنف کی شان میں توصیفی کلمات کچھ اور بھی ادا کیے جا سکتے تھے جو قاضی عبدالودود
مرحوم یاد نہ آ گئے ہوتے۔ ساتھ ہی حضرت شاد عارفی مرحوم کا یہ شعر بھی یاد آیا ؎

ہم سے اس قسم کی امید نہ رکھے دنیا :: ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں

ڈاکٹر حنفی نے یہ مقالہ ۱۹۷۴ء میں مکمل کیا اور اس پر ڈاکٹریٹ حاصل کی اور خوش قسمتی سے ۱۹۷۶ء میں مکتبہ جامعہ

نے اسے کتابی صورت میں شائع بھی کر دیا۔

میں نے جب اس کتاب کا تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا تو کئی خاص باتیں غور طلب معلوم ہوئیں۔ پہلی بات یہ کہ ڈاکٹر صاحب شاد عارفی کے حالات زندگی لکھنے میں کئی جگہ بہک گئے ہیں دوسری بات یہ کہ نثر شاد اور نظم شاد دونوں میں کام تشنہ رہ گیا ہے اور تیسری اہم شق یہ کہ بعض مقالات پر مصنف کی وکالت اور طرز فکر سے میں متاثر نہ ہو سکا۔ انھیں تمام معروضات کو مختصر طور پر پیش کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔

کتاب کے صفحہ ۲۸ پر مصنف نے شاد عارفی کی مشہور نظم "آپ کی تعریف" کو ۱۹۴۶ء کی تخلیق ثابت کیا ہے حالانکہ اس میں پیش کیے گئے بعض کیریکٹروں کی موجودگی ہی ۱۹۵۰ء کے بعد کے حالات کا پتہ دیتی ہے۔ اسی طرح کتاب کے صفحہ ۴۲ پر شاد عارفی کے بھائی کا نام سعید اللہ خاں لکھا ہے جبکہ صحیح نام سعید احمد خاں تھا۔

صفحہ ۶۶ پر ادارہ فروغ اردو کے بجائے بزم ارباب ادب غلطی سے لکھ کر فروغ اردو لائبریری کو اس سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ دراصل یہ لائبریری ادارہ فروغ اردو کے زیر اہتمام ہی چلتی تھی۔ شاد صاحب کے انتقال کے بعد اس لائبریری کا نام شاد عارفی پبلک لائبریری کر دیا تھا۔ اردو رسائل کی یہ مخصوص لائبریری آج بھی باقی ہے۔

مظفر صاحب نے فروغ اردو لائبریری سے شاد صاحب کے تعلق کو الجھا کر پیش کیا ہے حالانکہ یہ لائبریری پہلے سے قائم تھی۔ شاد صاحب جو اس وقت ہند و پاک کے بڑے شاعر کی حیثیت سے رسائل پر چھائے ہوئے تھے ارکان ادارہ فروغ اردو سے بہت قریب تھے۔ شاد صاحب کے پاس ان دنوں ادبی رسائل کثرت سے آتے تھے لیکن وہ کچھ عرصہ کے بعد تقسیم ہو کر ادھر ادھر ہو جاتے تھے اور جب کبھی بھی شاد صاحب کو کسی پرانے رسالہ کو دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ پھر نہ مل پاتا تھا۔ شاد صاحب اپنی اس پریشانی کا اکثر اظہار کرتے رہتے تھے ایسی صورت میں ان کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی کہ ادارہ ان کی خط و کتابت کے تمام مصارف برداشت کرے گا اور وہ آئے ہوئے تمام رسائل ادارہ کی لائبریری کو دے دیا کریں گے تاکہ ان سے دوسرے بھی فائدہ اٹھا سکیں اور خود شاد صاحب بھی وقت ضرورت ان سے مستفیض ہوتے رہیں۔ اس سیدھی سی بات کو مظفر صاحب نے عجیب رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

کچھ اسی طرح کا ان کا انداز حامد خاں آف ریگولیٹری اور عابد رضا بیدار کے سلسلے میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مظفر حنفی جیسے نقاد کو اس قدر کچے کانوں کا نہ ہونا چاہیے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حامد خاں کے ایک تحریری بیان سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ بیدار صاحب ایک بڑی رقم جو حامد خاں کی طرف سے شاد صاحب کے واسطے تھی، ہضم کر گئے لیکن اس واقعہ کے پس منظر سے قصداً خود کو بے خبر رکھ کر اس قسم کی بات لکھ دینا ان جیسے نقاد کے واسطے مناسب نہ تھا۔ صحیح بات یہ تھی کہ اس زمانہ میں بیدار صاحب

ند ساتھیوں کے تعاون سے روزنامہ "نیا خواب" نکالتے تھے جو بہت ہی کم عرصہ میں رامپور کی سیاست پر اثر انداز ہو گیا تھا۔ حامد خاں
ود چونکہ ایک سیاسی آدمی تھے اور سیاسیوں کی اخبار والوں پر نظریں لگی ہی رہتی ہیں حامد خاں بھی اس اخبار سے قریب ہو گئے
نفاق سے ضلع پریشد کی چیرمینی کا الکشن سامنے آگیا اور حامد خاں، مسٹر آنند کمار جین (وکیل) کے مقابلہ میں چیرمینی کے امیدوار بن
گئے۔ ایسی صورت میں "نیا خواب" ہی ایک ایسا اخبار تھا جو ان کے کام آسکتا تھا اور ہوا بھی یہی کہ حامد خاں نے ایک لمبی رقم
دینے کے وعدہ پر اخبار کا مکمل تعاون حاصل کر لیا۔ پھر بڑے بڑے اشتہار اور خبریں شائع ہونے لگیں لیکن بدقسمتی سے حامد خاں
صاحب اس انتخابی مقابلے میں ہار گئے۔ ظاہر ہے اس سیاسی معرکے میں ان کی کافی رقم خرچ ہو گئی ہو گی۔ "نیا خواب" کو بھی شروع
میں کچھ رقم دی تھی لیکن اس سے اشتہاروں کے بلوں کی پوری ادائگی بھی نہ ہو پائی تھی بعد میں جب ان سے بقیہ رقم کا مطالبہ
کیا گیا تو انھوں نے یہ رقم دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اصل قصہ یہ تھا جس کو کسی غلط فہمی کی بنا پر یا کسی کی غلط بیانی کو حق بیانی
سمجھ کر مظفر صاحب یہ سارا کچھ لکھنے پر مجبور ہو گئے۔

جہاں تک کلیات شاد کی اشاعت کا مسئلہ تھا وہ بھی حامد خاں صاحب کے بیان سے پیدا ہوا۔ یوم شاد کے موقع پر
بحیثیت صدر جلسہ حامد خاں نے کلیات شائع کرنے کا اعلان کیا تھا اور غالباً اس وقت کے لحاظ سے تین ہزار کی رقم
اس مقصد کے لیے طے کی گئی تھی۔ لیکن اندازہ ہوا کہ کلیات کی اشاعت کا اعلان وقتی واہ واہ کے واسطے کیا گیا تھا جب تخمینہ
سامنے آیا اور ہزاروں کی رقم کا سوال اٹھا تو ارادہ متزلزل ہو گیا اور غالباً پھر بیدار صاحب ہی کے مشورے پر طے کیا گیا کہ
شاد صاحب کو ہر ماہ تیس روپے بطور وظیفہ ادا کیا جاتا رہے گا۔ مجبور شاعر اس پر بھی خوش تھا۔ کئی ماہ یہ رقم شاد تک پہنچی پھر
اچانک بند ہو گئی۔ بیدار صاحب کی طرف سے یہ کہا گیا کہ حامد خاں نے یہ رقم دینا بند کر دی اور حامد خاں کی طرف سے اس
طرح کی بات چلی کہ بیدار صاحب کو جو ایک بڑی رقم دی گئی تھی وہ اسی مقصد کے واسطے تھی اور یہ بڑی رقم وہ ہی تھی
جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اس سے اشتہاروں کے بلوں کی رقم بھی پوری طرح ادا نہ ہو پائی تھی۔ دراصل ادب میں سیاست
داخل ہو گئی تھی اور ایسی صورت میں کوئی دور کا غیر متعلق شخص قریب قریب مظفر حنفی جیسا ہی نتیجہ نکال سکتا ہے۔

مظفر صاحب نے کتاب کے ص۔ ۲۸۰ پر شاگردان شاد کی فہرست میں جگر عارفی کو بھی شامل کیا ہے لیکن مکمل نام نہ ہونے
کی وجہ سے مقامی لوگوں تک کو سمجھنے میں ناکامی ہوئی۔ ان کا نام سید حسن عارفی ہے۔ ص۲۸۱ پر شاد صاحب کے حقیقی بھتیجے کا نام
فدا حسین احمد لکھا گیا ہے جبکہ ان کا صحیح نام فدا احمد خاں قوس ہے۔

سوانح حیات کا حصہ بھی مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیقی نقطہ نظر سے تشنہ ہے۔ شاد صاحب کی تعلیم اور ملازمتوں
پر مظفر صاحب نے بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن مجھے حاصل شدہ ایک ریکارڈ کی روشنی میں کافی فرق نظر آیا۔ میرے پیش نظر کاغذات سے

پتہ چلتا ہے کہ شاد صاحب نے الہ آباد کے DEPT OF PUBLIC STRUCTIONS سے ۱۹۲۵ء میں درجہ منشی پاس کیا تھا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس امتحان کی سند میں ان کا سال پیدائش ۱۹۲۲ء لکھا گیا ہے گویا اصل پیدائش سے پورے ۲۲ سال کم۔ اردو اعلےٰ قابلیت کے امتحان کی ایک سند بھی سامنے آئی جس سے پتہ چلا کہ ۱۹۲۳ء میں الہ آباد کے اسی بورڈ سے یہ امتحان پاس کیا گیا تھا۔ ان دو سندوں کے علاوہ مزید کسی سند کا پتہ نہیں چلتا لیکن شاد عارفی کے ایک ہم عمر اور انگریزی تعلیم کے ساتھی جناب خلیل اللہ خاں مرحوم ساکن محلہ کوتوالان رامپور فرماتے تھے کہ شاد نے اور انھوں نے ہائی اسکول کے واسطے صرف انگریزی مضمون کی تیاری ایک ساتھ کی ہے اور اسی زمانہ میں شاد عارفی نے کورس میں شامل بعض انگریزی نظموں کا بہت خوبصورت ترجمہ کیا تھا، وہ ساری نظمیں نوٹ بک میں محفوظ تھیں جو اب تلف ہو چکی ہیں صرف ایک نظم باقی ہے۔ مرحوم نے وہ نظم مجھے عنایت کر دی جو میرے پاس ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ افادیت کے پیش نظر مکمل نظم نقل کر رہا ہوں:

ہو رہا تھا قطرہ زن عالم میں جب ابر بہار — وہ اٹھا جس کا ازل سے ہے سخن گوئی شعار
اپنے قصبے کے در و دیوار سے ہوتا ہوا — مختصر کرتا چلا جاتا تھا طول رہگزار
آ رہی تھی گوشۂ مشرق سے وہ باد سموم — جس کو کہتے ہیں نسیم عطر بیز و مشکبار
گیہوں کے پودوں پہ کیا کیا کھیلتی تھی لہر عکس — دلفریبی کی تمامت اگ رہی تھی کشت زار
شور ہستی سے الگ ہنگامۂ دنیا سے دور — مثل آئینہ دو زانو ہو گیا یایان کار
اور چھیڑا راگ وہ ساز لب اعجاز سے — جس کے تھے الفاظ غم انگیز لہجہ خوشگوار
تھی ترنم میں کچھ ایسی دلکشی زیر و بم — اڑتے اڑتے رک گئی بادل میں تازوں کی قطار
قوت پرواز پر جس کو ہمیشہ ناز تھا — وہ لوا بھی آ رہا قدموں پہ ہو کر بیقرار
ہو گئی ایسی زخود رفتہ ابابیل فضا — اشتہا ہونے پہ بھی بھولی کھانے کا شکار
سانپ بھی جھاڑی سے سینہ خاک پر گھستا چلا — جس جگہ بیٹھا ہوا تھا شاعر فطرت نگار
صحو منقار کو ستکرا بڑھا کر رہ گیا — اس کی حیرانی نے چھینا اس کے سموں کا شکار
عندلیب خوش نوا کے دل میں یہ آیا خیال — گلشن عالم میں میں نے گیت گائے ہیں ہزار
لیکن اس پایہ کا اس انداز کا اس طرز کا — ایک بھی ممکن نہیں کی جائے کوشش لاکھ بار

کیونکہ اس کی نظم کا مقصد ہے مستقل را ا

فوت ہو جائیں گے جب برسوں کے اعداد و شمار

ڈاکٹر مظفر حنفی نے حالانکہ سخت محنت و کاوش کے بعد بڑی حد تک کلام شاد کا احاطہ کر لیا ہے لیکن رام پور سے دوری نے موصوف کو اس سلسلے کے کئی مسائل میں الجھائے رکھا۔ ان کے اس تحقیقی مقالہ میں کہیں کہیں جو واقعاتی جھول نظر آتے ہیں اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ انھوں نے دور بیٹھ کر مواد جمع کیا اور جو بھی رامپوری ان تک پہنچا اس کے قول کو مستند سمجھ کر محفوظ کر لیا۔ وہ اپنی تمام تر تالیفات میں اور خصوصاً اس تحقیقی مقالہ میں شاد عارفی کے جس قدر مضامین خطوط، نظموں، غزلوں اور قطعوں کی نشاندہی کر پائے ہیں بعض پرانے رسائل و اخبارات کی ورق گردانی کرتے پر اندازہ ہوا کہ ابھی انھیں اس ذخیرہ میں کافی اضافہ کرنا پڑے گا۔ میں اس مختصر مضمون میں تمام دستیاب شدہ چیزوں کی نقل تو پیش نہیں کر سکتا لیکن حوالے ضرور دوں گا۔ اوپر انگریزی نظم کا جو منظوم ترجمہ مکمل طور پر نقل کر دیا گیا ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ پہلی مرتبہ قارئین کے سامنے آئے گی۔

دبدبۂ سکندری کے کچھ فائلوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کسی زمانہ میں شاد عارفی اس اخبار کے بہت قریب رہے ہیں۔ ان کے کافی مضامین اور کلام اس بات کے گواہ ہیں اس اخبار کے اوراق پر شاد صاحب کی جس قدر ایسی نظموں پر میری نظر پڑی ہے کہ جو کلیات شاد میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں اور مظفر صاحب ان کے سلسلے میں اپنی اس کتاب میں کوئی اشارہ بھی نہ کر پائے ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے:۔

(۱) رامپور	دبدبۂ سکندری	۲۵ فروری ۱۹۲۵ء	
(۲) رسِ عمل	"	۴ مارچ ۱۹۲۵ء	
(۳) قطعہ سلور جبلی شاہ برطانیہ	"	جارج نمبر ۱۹۲۵ء	
(۴) قطعات در مدح نواب رضا علی خاں	"	۱۸ نومبر ۱۹۲۵ء	رضا نمبر
(۵) تجلی	"	۵ اکتوبر ۱۹۲۶ء	
(۶) حقیقت	"	۱۶ نومبر ۱۹۲۶ء	سالگرہ نمبر
(۷) نظم فارسی در مدح بشیر حسین زیدی	"		
(۸) حسنِ تعلیل	"	۲۶ اپریل ۱۹۲۷ء	
(۹) کنول	"	۱۷ مئی ۱۹۲۷ء	

۲۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو صبح نو بجے مدرسہ عالیہ رامپور میں سالانہ جلسہ کی ایک تقریب ہوئی جس میں اس دور کے چیف منسٹر مسٹر مسعود الحسن صاحب اور وزیر تعلیم بشیر حسین زیدی بھی شریک ہوئے تھے اس موقع پر شاد عارفی نے فارسی

میں ایک مضمون اور فارسی ہی میں ایک نظم پیش کی تھی جلسہ کی روداد دبدبہ سکندری میں موجود ہے۔ اس جلسہ میں شاد صاحب کی موجودگی اور پروگرام میں شرکت غالباً ایک طالب علم کی حیثیت سے رہی ہوگی کیونکہ ان کی ایک سند سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں منشی کا امتحان پاس کیا تھا۔ (اور مدرسہ عالیہ میں طلب علم کے لیے عمر کی کوئی قید تھی نہیں)

غزلیں جو اس اخبار میں نظر سے گزریں اس طرح ہیں:۔

(۱)	لکھتا ہوں میں غزل نگہ یار دیکھ کر	دبدبہ سکندری	۲۴ جون ۱۹۲۵ء
(۲)	یاد سے اس کی وہی ہم پہ ستم ڈھائے نا	"	۲۸ اکتوبر ۱۹۲۵ء
(۳)	قریب اپنے بلایا تو کچھ کہا بھی نہیں :. عزیز بھی مجھے رکھتا ہے جانتا بھی نہیں	"	۱۶ مارچ ۱۹۲۶ء
(۴)	اتنا تو کھلے دل دیوانہ کسی کا :. پابند بھی ہے جلوۂ جانانہ کسی کا	"	۱۷ اگست ۱۹۲۶ء
(۵)	بشر اپنی عادت سے مجبور ہو کر :. رعونت دکھاتا ہے مشہور ہو کر	"	۲۴ اگست ۱۹۲۶ء
(۶)	جب سے ہم ان پہ مائل ہیں :. دل زخمی نظریں گھائل ہیں	"	۳۱ اگست ۱۹۲۶ء

(۷) دل کا داغوں سے وہ حال :. مفلس لیکن مالا مال

لکھ کر میرا نام اے شاد :. اس نے بھیجا ہے رومال

یہ آخری غزل اتحاد اسلامی کے مارچ ۱۹۲۶ء کے شمارہ میں شائع ہوئی ہے۔

شاد عارفی کے چار قطعے بھی ایسے ملے جو ابھی تک کسی مجموعہ میں شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ مظفر صاحب نے رامپور میں قیام کے دوران اخبار دبدبہ سکندری کا بغور مطالعہ کیا تھا اور بعد میں بھی سلطان اشرف صاحب کے ذریعہ ان تک میٹر پہنچتا رہا پھر کس طرح یہ تمام چیزیں نظر انداز ہوئیں؟ اس بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔

اسی طرح رام پور میں ہفت روزہ اقبال کا فائل مظفر صاحب کے مطالعہ میں آیا اور شاد صاحب کی نظم "خوشامد" جو پہلی مرتبہ اقبال کے ۱۱ جون ۱۹۲۸ء کے شمارے میں پورے صفحہ پر شائع ہوئی تھی، ان کی نظر میں آئی لیکن شاد عارفی کا ایک شعر جو اخبار کی لوح پر علامہ اقبال کے شعر کے نیچے دیا گیا ہے، کسی وجہ سے نگاہ سے اوجھل رہا ورنہ وہ بھی کتاب میں دی گئی متفرق اشعار کی فہرست میں شامل ہوتا۔ شعر اس طرح ہے ؎

جس سے سدھرے گا زمانہ کا نظام   وہ کرے گا آپ کا اقبال کام

شاد اس اخبار میں معاون مدیر تھے اور ان کے نام کے ساتھ شاعر محاکات لکھا جاتا تھا۔ اس اخبار کی پالیسی دبدبہ سکندری سے یقیناً مختلف تھی کہ جس کے صفحات پر شاد صاحب کی تخلیقات ایک عرصہ تک نمایاں طور پر شائع ہوتی رہی تھیں مظفر صاحب نے اس قسم کی بہت سی، تو

کو نظرانداز کیا ہے۔

شاد عارفی کے مضامین زیادہ تر مظفر صاحب نے اپنی کتابوں میں شامل کر لیے ہیں اور اس کتاب میں فہرست دے کر بڑی حد تک بات مکمل کر دی ہے۔ لیکن پھر بھی بعض اچھے مضامین ان کی دسترس سے باہر رہے ہیں۔ جس طرح شاد عارفی نے حکیم مسیحا نظامی کے اخبار اقبال میں بے شمار سیاسی اور سماجی نوعیت کے مضامین لکھے اسی طرح مرزا محمد اسحاق (حکیم مسیحا نظامی) کی ادارت میں شائع ہونے والے "مسیحا" میں بھی شاد صاحب نے کئی اچھے اور طویل مضمون لکھے ہیں۔ ماہنامہ مسیحا کا رسول نمبر موجود ہے جس میں آنحضرت کی سیرت پر شاد صاحب کا ایک مضمون شامل ہے۔ یہ رسالہ نومبر ۱۹۲۶ء سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ دبدبہ سکندری میں بھی افشائے راز، روئداد مشاعرہ بر مکان وفا رام پوری اور تشکر واستدعا، یہ تین مضمون ایسے نظر آئے جو مظفر صاحب کی کتاب میں مضامین کی فہرست میں نہیں ہیں۔ یہ آخری مضمون فارسی میں ہے اور وہی ہے جو شاد صاحب خود مدرسہ عالیہ کے سالانہ جلسہ میں پڑھ چکے ہیں۔

شاد صاحب مقامی اخبار و رسائل میں زندگی بھر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ہیں، لیکن اب ان شماروں کا حاصل کرنا کہ جن میں وہ چھپے تھے کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آج کوئی ایسی لائبریری نہیں کہ جس میں وہ ذخیرہ محفوظ ہو اور شخصی طور پر بھی کوئی ایسا نظر نہیں آتا کہ وہ اس سرمایہ کو سینے سے لگائے بیٹھا ہو۔ ان پرچوں کے مالک اور ان کی اولادیں تک ان سے محروم ہیں۔ چند سال قبل تک کچھ فائل ایک آدھ جگہ موجود تھے بھی تو وہ کسی طرح مخالفین شاد کے ہاتھوں میں پہنچ گئے اور اب ان کا اللہ ہی مالک ہے۔ مظفر صاحب بہت قابل تعریف اور لائق مبارک باد ہیں کہ وہ بر وقت بیدار ہو کر شاد صاحب کے سلسلے میں اس قدر مواد جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے اور قابل رشک اس لیے ہیں کہ بہت آسانی کے ساتھ اوپر اوپر کی ساری ملائی ان کے حصے میں آگئی۔

کتاب کے صفحہ ۲۲۲ پر صراحت ہے کہ شاد کا پہلا خط ۲ مئی ۱۹۵۰ء کا اور آخری ۲۷ جنوری ۱۹۶۴ء کا تحریر کردہ ملتا ہے لیکن شاد عارفی کے اپنے شاگرد رفعت علی خاں مضطر کو لکھے گئے ۱۹۴۲ء کے چھ خط مجھے جذبی عارفی کی معرفت کئی سال قبل ملے ہیں۔ مضطر صاحب ان دنوں مراد آباد میں تھانہ داری کی ٹریننگ میں تھے اور شاد صاحب کے بھتیجے ماسٹر فدا احمد خاں بھی ان کے ساتھ وہیں زیر تعلیم تھے۔ ان خطوط کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاد صاحب ان کے استاد بھی تھے اور دوست بھی۔ کیونکہ کوئی مالی پریشانی ہو، کوئی ایسی ویسی بیماری ہو یا کسی سے عشق چل پڑا ہو ہر مرحلہ میں شاگرد نے استاد ہی کا دامن تھاما ہے۔

رام پور کے ایک ادبی اخبار "جوہر" سے بھی خوب خوب استفادہ کیا گیا لیکن لکھتے وقت اس پندرہ روزہ کو ہفتہ وار لکھ گئے۔ شاد عارفی اس اخبار میں مستقل طور پر "مطالعے" کے عنوان سے ادبی پرچوں پر تبصرہ کرتے تھے جس کی زد سے نہ بڑے سے بڑا کوئی شاعر بچتا تھا اور نہ ہی کوئی نثر نگار۔ اس طرح شاد صاحب دن بدن اپنے مخالفین کی تعداد بڑھا رہے تھے۔ مظفر صاحب

نے ان تبصروں کو کوئی اہمیت نہیں دی اور کوئی معقول تجزیہ بھی نہ کر پائے۔ شاد صاحب کی بیشتر نثر اسی قسم کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے جوابی بھی اسی قسم کے تیز و تند مضامین لکھے اور لوگوں کو اپنے سے دور کیا۔ جوہر کے کالموں میں ہونے والے تبصروں کا دائرہ بہت وسیع تھا اس لیے مخالفین بھی ملک گیر شہرت یافتہ ہی ہوئے۔ ممکن ہے ان ملک گیر شہرت کی مالک شخصیات میں کچھ نام منظر صاحب کے کرم فرماؤں کے بھی ہوں جو اس سرمایہ کو انھیں یوں نظر انداز کرنا پڑا۔

"جوہر" میں شائع ہونے والے شاد صاحب کے یہ تبصرے خاصی اہمیت کے حامل ثابت ہوئے۔ انھیں پڑھ کر ایک طرف فراق جیسا بڑا شاعر اصلاح قبول کرنے پر مجبور ہوا تو دوسری طرف مجروح سلطان پوری جیسے شاعر بھی تھے جو فوراً مقابلہ پر اتر آئے۔ بعض شاعر تو سخت برہم تھے اور ان کے خطوط کی زبان کچھ اس طرح ہوتی تھی کہ: یہ شاد ہیں کون ؟ آخر انھیں میرے کلام پر تنقید کرنے کا حق کیا ہے ؟ وغیرہ وغیرہ۔

جوہر شمارہ ۲ یکم اکتوبر ۱۹۵۹ء کے مطالعے میں شاد صاحب نے فراق کی ایک غزل کے ایک شعر پر اعتراض کیا تو جواب میں فراق صاحب نے خط لکھا اور جوہر کے واسطے ایک غزل بھی ارسال کی۔ فراق کا یہ خط "جوہر" شمارہ ۶ ، ۱۶ نومبر ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ موقع کی مناسبت سے یہاں نقل کیا جا رہا ہے :-

" مکرمی تسلیم ! میرے اس شعر پر ؎

وہ صورتیں الٰہی جو دل میں بس گئی تھیں ۔:۔ اب ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں

شاد عارفی کو جو اعتراض ہے اس سے میں سو فیصد متفق ہوں۔ میں نے مندرجہ بالا شعر غزل سے باہر کیا اور اس کی جگہ مندرجہ ذیل شعر غزل میں شامل کر لیا۔

میں دیکھتا ہوں ان کو کھلتا نہیں یہ پھر بھی ۔:۔ کیوں ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں

مشہور انگریزی شاعر کیٹس نے اپنی محبوبہ کو لکھا تھا۔ "میں تمھیں ہمیشہ دیکھتا ہوں اور ہمیشہ غائب ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں"

I SEE YOU ETERNALLY, ETERNALLY VANISHING

مندرجہ ذیل غزل "جوہر" کے لیے بھیج رہا ہوں۔ خیر طلب فراق "

لیکن جب مجروح کی غزل پر تنقید کی گئی تو ایک طویل خط مجروح نے ادارہ جوہر کو لکھا جس میں شاد صاحب کو اصل موضوع سے ہٹ کر خوب خوب برا بھلا لکھا گیا تھا وہ خط بھی جوہر کے آخری شمارہ بابت ۱۵ مارچ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے اور بھی کئی اہم باتیں ان تبصروں کی دین ہیں۔ اس دور کو شاد صاحب کی ادبی زندگی میں ہمیشہ ایک اہم مقام حاصل رہے گا۔ کیونکہ وہ بڑے تجربے کے بعد اس میدان میں پھر سے داخل ہوئے تھے۔ میرے خیال میں منظر صاحب کو "جوہر" کے ساتھ

شاد کے اس تعلق کو بھرپور اہمیت دینا چاہیے تھی۔

شاد صاحب کی ملازمتوں کی تفصیل بھی اس کتاب میں موجود ہے لیکن وہ بہت مختصر اور غیر واضح ہے۔ میرے سامنے جو ریکارڈ ہے اس سے تفصیلی خاکہ کچھ اس طرح تیار ہوتا ہے۔

(۱) رضا شوگر فیکٹری رام پور میں ۶۱ - ۱۹۶۰ء کے سیزن میں پانچ ماہ اکاونٹ کلرک رہے۔

(۲) ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۲ء تک صولت پبلک لائبریری رامپور میں لائبریرین کے عہدہ پر رہے مظفر صاحب نے اسسٹنٹ لائبریرین لکھا ہے لیکن اس زمانہ کے معتمد لائبریری جناب محمد احمد خاں نے شاد عارفی کو جو سرٹیفکٹ جاری کیا ہے اس میں لائبریرین ہی لکھا گیا ہے۔

(۳) ۱۱ مارچ ۱۹۴۳ء سے ۱۳ مارچ ۱۹۴۴ء تک مینر دمکا ، فیکٹری میں ملازم رہے۔

(۴) ۲۲ اگست ۱۹۴۵ء کو میونسپلٹی میں تین ماہ کے واسطے ان کا تقرر ٹیکس کلرک کی جگہ پر ہوا۔

(۵) ۱۸ ستمبر ۱۹۴۵ء کو چیف منسٹر ریاست رامپور کے حکم کے بموجب پچاس روپیہ ماہوار پر اسٹیٹ پریس میں بحیثیت پروف ریڈر ان کا تقرر ہوا جہاں ان کی یہ ملازمت یکم مئی ۱۹۴۸ء کو مستقل کر دی گئی۔ غالباً ان کی یہ پہلی سرکاری ملازمت تھی۔ لیکن ۲۷ جون ۱۹۴۹ء کو ایک حکم کے مطابق ان کا تبادلہ فائنانس ڈیپارٹمنٹ میں بجٹ اکاؤنٹ کلرک کی جگہ پر کر دیا گیا۔ جہاں وہ ایک سال ہی کام کر پائے تھے کہ اسٹیٹ مرج ہو گئی اور چارج لینے والے پہلے ضلع کلکٹر مسٹر جوزامی کے یکم مارچ ۱۹۵۰ء کے ایک حکم کے مطابق کئی دیگر ملازمین کی طرح شاد عارفی بھی ۲۶۰ روپے بطور معاوضہ دے کر نوکری سے الگ کر دیے گئے جس کے بعد وہ اپنے حق کی بحالی کے لیے آخری وقت تک حکومت سے خط و کتابت کرتے رہے۔

مظفر صاحب کی اس کتاب میں واقعات کی حد تک مجھے کچھ اس قسم کی خامیاں نظر آئیں جو مختصراً تحریر کر دی گئیں۔ میں نے ان کے اس نظریے سے بحث نہیں کی ہے جو انھوں نے شاد کے فن کے تجزیہ میں اختیار کیا ہے۔ یہ ایک طویل بحث ہے جس کی اس مضمون میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مجموعی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب حنفی کی محنت اور عرق ریزی کی ایک اچھی مثال ہے۔ بڑے دل سے یہ کام کیا گیا ہے اور مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی عذر نہیں کہ مظفر حنفی صاحب شاد صاحب کے سلسلے میں یہ سب کچھ نہ کرتے تو یہ بڑا اور منفرد خصوصیات کا حامل شاعر یوں ہی دبا پڑا رہتا۔ شاد صاحب کے دو ہی تھی کئی باصلاحیت شاگرد ہیں لیکن وہ اپنے ذاتی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں اور نتیجہ بات یہ ہے کہ ان کے پاس مظفر حنفی جیسا نہ تو جذبہ ہے اور نہ ہی صلاحیت۔

ڈاکٹر مظفر حنفی
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جواب

اردو کی ادبی دنیا بخوبی واقف ہے کہ میں نے جب بھی شاد عارفی کے سلسلے میں کوئی تعمیری کام کیا، بہت سے لوگ جن میں رام پوری احباب پیش پیش تھے، تخریبی اعتراضات کے ساتھ سامنے آئے۔ ان میں اکبر علی خاں عرشی زادہ، پروفیسر نجم الدین نقوی، شبیر علی خاں شکیب، لبشارت فروغ جیسے مقامی اصحاب بھی تھے اور ظ۔ انصاری، عادل منصوری، ابو سلمان شاہجہانپوری وغیرہ بیرونی لوگ بھی۔ یہ مباحث "تحریک" اور "ہماری زبان" (دہلی) "محفل" اور "نقوش" (لاہور) "ماہ نو" (کراچی) "اجالا" (کلکتہ) جیسے ادبی رسائل میں بھی چھڑے اور رامپور کے مقامی اخبارات "ناظم"، "رامپور رپورٹر"، "اطہر ویکلی"، "یکجہتی" وغیرہ میں بھی شائع ہوئے۔ بدر تسلیمی صاحب نے تو باقاعدہ ہجویہ قصائد کا مجموعہ چیلنج کے ساتھ "نگارستانِ حیرت" کے نام سے شائع کیا۔ شاید "معرکۂ چکبست و شرر" کے بعد یہ سب سے بڑی ادبی معرکہ آرائی تھی جو درجنوں رسائل کے ہزاروں صفحات پر کئی سال تک چلتی رہی ہے۔ اس معرکہ آرائی میں دو چار مخاطبین صحیح کو تو میں نے جوابات دیے، بقیہ کے جواب الجواب جو لوگ رامپور میں دے رہے تھے ان میں شاد عارفی لائبریری کے اراکین پیش پیش تھے جن کا مسرت حسین آزاد صاحب سے چولی دامن کا رشتہ ہے۔ افسوس کہ آگے چل کر میں نے مسرت صاحب کو بھی ناراض کر لیا۔ دراصل وہ چند برس قبل صولت لائبریری (رامپور) کے عہدے دار (غالباً سکریٹری) منتخب ہوئے اور انھوں نے اس لائبریری میں شاد عارفی پر ایک پرچہ پڑھنے کے اس خاکسار کو آمادہ کر لیا لیکن عین وقت پر یہ اطلاع ملی کہ اس جلسے کی جگہ لائبریری میں ان تاریخوں میں عرشی صاحب پر کوئی تقریب ہوگی۔ بعد میں جب صولت لائبریری نے مجھے پھر شاد عارفی سے متعلق جلسے میں طلب کیا تو میں نے معذرت کر لی۔ مسرت حسین آزاد صاحب نے دہلی آکر غریب خانے پر مجھ سے گفتگو کی تو ان سے بھی عرض کر دیا کہ شاد عارفی کے سلسلے میں "جھوٹن" خواہ وہ عرشی صاحب قبلہ ہی کی کیوں نہ ہو، مجھ سے ہضم نہ ہوگی۔ چنانچہ مسرت حسین آزاد صاحب کا رویہ ہی بدل گیا اور وہ (مجھ سے ناراض ہونے کا حق تو رکھتے ہیں) شاد عارفی جیسے اپنے کرم فرما سے بھی خفا ہو گئے۔ بایں ہمہ مسرت خاں صاحب کو مخالفین شاد میں شامل نہیں سمجھتا۔ ان کی خفگی کو اپنے کی محبت کے طور پر قبول کرتا ہوں اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موصوف نے "ودودی تحقیق" کی اصطلاح کو جن معنوں میں استعمال کیا ہے وہ مناسب نہیں ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب مرحوم بے لاگ تحقیق کے علم بردار تھے توصیفی یا تنقیصی تحقیق کے نہیں،

جبکہ مسرت صاحب نے فرض کر رکھا ہے کہ "وردو دی تحقیق" کے دائرے میں صرف مذمت اور تنقیص ہی شامل ہے مسرت صاحب نے یہ تنقیص بھی بہت روا روی میں اور بچکانہ انداز میں کی ہے، جگہ جگہ مقالے پر ایسے اعتراضات کیے گئے ہیں جو سراسر فرضی ہیں مثلاً کتاب کے ص ۲۸ کے حوالے سے لکھا ہے کہ مظفر حنفی کے بقول "شاد کی نظم" "آپ کی تعریف" ۱۹۲۶ء کی تخلیق ہے حالانکہ یہ قول امیر الدین راہی کے ایک مضمون کا اقتباس ہے جس کا حوالہ اسی صفحے پر موجود ہے۔

سوانحی باب کی کچھ باتوں سے اختلاف کرتے ہوئے موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر رامپور پہنچ کر کام کرتا تو مقالے میں خامیاں نہ ہوتیں۔ کیا مسرت صاحب بھول گئے کہ میں نہ صرف رامپور حاضر ہوا تھا بلکہ انھیں کے کمرے میں کئی دن مقیم رہ کر کام کیا تھا۔ شاد عارفی کے سلسلے میں جس طرح مخالفین شاد نے روڑے اٹکائے ان کے نام نہاد ہمدردوں کا عدم تعاون اور بیاضیں دبا کر بیٹھ جانے کا عمل اس سے بھی زیادہ مضر ثابت ہوا تھا۔ اس معاملے کی تفصیلات ڈاکٹر محبوب راہی کے مقالے "ڈاکٹر مظفر حنفی: حیات شخصیت اور کارنامے" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

مسرت صاحب نے شاد مرحوم کی جن نئی غزلوں اور نظموں کی نشاندہی کا سہرا اپنے سر لیا ہے اگر وہ میرے مقالے کے ص نمبر ۵۲، ۵۳ اور اس میں شامل غیر مطبوعہ تخلیقات کا اشاریہ ملاحظہ فرما لیتے تو شاید اس غلط بیانی سے بچا جا سکتا تھا۔ انھیں اپنے اس پرچے میں یہ بھی واضح کرنا چاہیے کہ شاد مرحوم کی بیاضیں اب کس کے پاس ہیں اور ان کو شائع کرنے میں کیا تکلف ہے؟

اور یہ کہ شاد عارفی پر کام کی تو شروعات ہوئی ہے۔ کیا یہ کم ہے کہ اس جامد سمندر میں لہریں اٹھانے کا فریضہ اس خاکسار نے ادا کیا ہے۔ اگر میرے کام میں کچھ خامیاں لوگوں کو نظر آتی ہیں تو اب وہ بھی کچھ "صحیح کام" کر دکھائیں ان شاء اللہ میں ان کی ہر ممکن معاونت کروں گا۔

●●

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں
شعبۂ اردو
آر۔ این کالج، حاجی پور

ڈاکٹر ثوبان فاروقی کا تھیسس

شفق عمادپوری حیات اور کارنامے

میں نے ڈاکٹر ثوبان فاروقی کی تھیسس "شفق عمادپوری: حیات اور کارنامے" کو مطالعہ و تبصرہ کے لئے
منتخب کیا ہے جس پر بہار یونیورسٹی نے گذشتہ سال انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ یہ مقالہ بہار کے ایک
غیر معروف شاعر شاگرد امیر مینائی سید حسن مرتضیٰ رضوی شفق عمادپوری کی سوانح حیات اور ان کی شعری و نثری خدمات
سے متعلق ہے۔ سات ابواب پر مشتمل یہ مقالہ ۲۴۰ صفحات پر محیط ہے۔ ابواب کی فہرست اس طرح ہے: باب اول
عہد و ماحول، باب دوم سوانح حیات، باب سوم شاعری، باب چہارم نثر، باب پنجم تلامذہ، باب ششم حرف آخر
اور باب ہفتم کتابیات۔ آخر میں دو ضمیمے ہیں۔ ضمیمہ اول میں شفق کی دو فارسی غزلیں نقل کی گئی ہیں، اور ضمیمہ دوم میں خواجہ حسن
نظامی کے نام علامہ اقبال کا ایک مختصر مکتوب نقل کیا گیا ہے جس میں شفق کا ذکر ہے۔

شفق کی وفات ۷۴ سال کی عمر میں ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ ان کی وفات کو صرف تینتالیس چوالیس سال کا عرصہ گزرا
ہے لیکن ان کی ادبی گمنامی کا یہ عالم ہے کہ ان کے جاننے والے خال خال ہی ملیں گے۔ شفق اپنے زمانے میں امیر مینائی
کی یادگار کی حیثیت سے ملک کے طول و عرض میں جانے جاتے تھے اور ان کا کلام اس عہد کے موقر رسائل و جرائد کی
زینت ہوتا تھا۔ ان کی شرکت مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ ان کے ہم عصر اور بزرگ تر معاصرین بھی
ان کے کمال سخن گوئی کے معترف تھے۔ لیکن ان کا مرتب کردہ دیوان شائع نہ ہو سکا اور نہ ان کے کلام کا کوئی منتخب
مجموعہ ہی منظر عام پر آسکا۔ ڈاکٹر فاروقی نے لکھا ہے:

"میرے نزدیک شفق کی اس افسوسناک گمنامی کی ایک بڑی وجہ ان کے دواوین کی عدم موجودگی ہے۔
ایسے بھی دنیائے ادب کا ایک سانحہ کہیے کہ دواوین مرتب ہونے کے باوجود زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکے اور
بالآخر دست برد زمانہ کا شکار ہو گئے۔ یوں دواوین کی موجودگی سے ان کے شعری کردار کا جو مخصوص پہلو
ابھر کر سامنے آسکتا تھا، ضائع ہو گیا۔"

فاضل محقق نے شفق کے منتشر کلام کو مختلف ذرائع سے حاصل کیا ہے۔ شفق کا کلام انھیں مختلف گلدستوں، تذکروں

و رسائل سے ملا ہے۔ اور انہی دستیاب کلام کی روشنی میں انہوں نے شفق کی شاعرانہ حیثیت اور فنکارانہ اسلوب سے بحث کی ہے اور ان کا مقام متعین کیا ہے۔ شفق کی عروض دانی، قواعد نویسی، نثر نگاری اور تنقیدی شعور کے بارے میں لکھتے ہوئے شفق کی دستیاب بارہ نثری تصانیف فاضل محقق کے پیش نظر رہی ہیں جن میں سے بیشتر انہوں نے تاج پریس گیا کے مالک زین العابدین فرزند بسمل سنسہاروی سے حاصل کی تھیں۔ بقیہ نثری تصانیف شفق کے رشتہ دار حیدر بیتھوی، ڈاکٹر پروفیسر سید محمد حسنین اور شمس گیاوی سے حاصل کیں۔

شفق کے حالاتِ زندگی پر لکھی گئی واحد کتاب "ریاض شفق" مصنفہ ذبیح کرائی (شاگرد شفق) سے فاضل محقق نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ شفق کے تلامذہ کے بارے میں اور خود شفق کے بارے میں بعض تفصیلات کے لئے فاضل محقق نے خمخانہ جاوید، لالہ سری رام، تذکرہ مسلم شعرائے بہار، حکیم احمد اللہ ندوی، تذکرہ شعرائے گیا، مختار احمد عاصی، تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ اور اوراق گم گشتہ، رحیم بخش شاہین سے بھی استفادہ کیا ہے۔

شفق کی سوانح حیات کے سلسلے میں فاضل محقق نے "ریاض شفق" مصنفہ ذبیح کرائی کو بنیاد ضرور بنایا ہے لیکن وہ آنکھ بند کر کے ذبیح کرائی کے جملہ بیانات اور فراہم کردہ اطلاعات کو نہیں مانتے۔ مثال کے طور پر محمد اسمٰعیل ذبیح کرائی نے اس کتاب میں شفق کے صرف دو دواوین کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر فاروقی نے ان کے بیان پر تکیہ کرنے کے بجائے کلام شفق داخلی شہادت کی بنیاد پر یہ تحقیق پیش کی ہے کہ شفق نے دو نہیں تین دیوان مرتب کیے تھے اور ثبوت میں شفق کا یہ شعر نقل کیا ہے :

غزل کے بہم ساز و ساماں کیے   سپرد قلم تین دیواں کیے

ذبیح کرائی نے "ریاض شفق" میں شفق کے صرف چار تلامذہ کی نشاندہی کی ہے: اشرف، ظفر، اسر، برکا بری اور فائق سوگانوی۔ لیکن ڈاکٹر فاروقی نے مزید کتب اور ماخذ کے سہارے شفق کے کل گیارہ شاگردوں کا ذکر کیا ہے، ان کے مختصر حالات لکھے ہیں اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔

"ریاض شفق" ۱۹۱۴ میں لکھی گئی تھی، شفق کا انتقال ۱۹۴۴ میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ "ریاض شفق" میں ۱۹۱۴ کے بعد کے حالات نہیں لکھے گئے ہیں۔ فاضل محقق نے "ارمغانِ دہلی" (۱۹۲۱) تصنیف شفق عمادپوری سے شفق کی شدید علالت اور حکیم کبریا خاں دہلوی سے ان کا رجوع کرنا اور دہلی کے سفر کا حال لکھا ہے۔ شفق کے حالات، اخلاق و عادات اور ان کی زندگی کے بعض واقعات شمس گیاوی (شاگرد شفق) حیدر بیتھوی (شفق کے قرابت مند) کی زبانی محقق کو معلوم ہوئیں جنھیں حوالے کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ شفق گلدستے کی شکل میں ایک رسالہ "نسیم سحر" نکالتے تھے۔ غالباً محقق

نے لکھا ہے کہ اس رسالے کے شمارہ اول کا سرورق جناب پروفیسر عطا کاکوی کے پاس محفوظ ہے جسے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

اس تحقیقی مقالے کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر فاروقی نے لکھا ہے۔

" زیر نظر مقالے کا بنیادی مقصد انہی دستیاب تحریروں کی روشنی میں ان کی ادبی حیثیت کا تعین ہے تاکہ دواوین کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کی تلافی ہو سکے ۔" (حرف اوّل)

انصاف کی بات یہ ہے کہ فاضل محقق نے شفق کی شعری و نثری تحریروں کو جمع کرنے میں بڑی محنت و کاوش کی ہے ۔ ساتھ ہی ان کی روشنی میں شفق کے ادبی مرتبے کا تعین بھی کیا ہے ۔ فاضل محقق نے شفق کے حاصل شدہ کلام اور دستیاب نثری تصنیفات و تالیفات کو جمع کر کے صرف ان کا تعارف پیش کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اردو کی ادبی روایات کے پس منظر میں شفق کی شعری خصوصیات اور ادبی حیثیت سے مفصل و سیر حاصل بحث کی ہے اور ان کے خیالات و نظریات کا موازنہ و مقابلہ دیگر شعراء و ادبا کی تحریروں سے کیا ہے ۔ اس سے محقق کے تبحر علمی، وسعتِ مطالعہ، ادبی سوجھ بوجھ اور تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

شاعری کے باب میں فاضل مقالہ نگار نے شفق کی غزل گوئی، قصیدہ سرائی، مثنوی نگاری، رباعی گوئی اور نظم نگاری کا جائزہ و مطالعہ الگ الگ پیش کیا ہے ۔ شفق کی شاعری پر لکھتے ہوئے محقق میں ایک اچھے ناقد کی صفت ابھر آئی ہے ۔ تحقیقی کام کے سلسلے میں عموماً یہ معاملہ یا خطرہ پیش آتا ہے کہ محقق تلاش و جستجو کے بعد جس چیز کو دریافت کرتا ہے اسے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے ۔ اس معاملے میں بیشتر حضرات کی تنقیدی بصیرت ماند پڑ جاتی ہے۔ کلیم الدین احمد نے اس سلسلے میں لکھا ہے :

" محقق کی راہ میں ایک خطرناک مقام آتا ہے ۔ اگر وہ ہوشیاری سے کام نہیں لیتا تو اس مقام میں پھنس جاتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ محقق کامل محنت و جستجو، دماغ سوزی، صرفِ وقت کے بعد کسی چیز کی تحقیق کرتا ہے یا کسی گم شدہ تصنیف کا سراغ لگاتا ہے اپنی کامیابی سے خوش ہوتا ہے اور ایسا خوش ہوتا ہے کہ وقتی طور پر صحیح معیارِ تنقید کو بھول جاتا ہے ۔" (ص ۱۲۴)

" تنقید کی عدم موجودگی میں تحقیق غیر مفید ہوتی ہے اور تنقید بعض اوقات تحقیق کی کمی کی وجہ سے لغزش کر جاتی ہے ۔ اصل یہ ہے کہ تحقیق تنقید کی محدود و مخصوص صورت ہے ۔ اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو تحقیق مفید ہو سکتی ہے لیکن عموماً تحقیق کو ایک علاحدہ فن یا علم خیال کیا جاتا ہے اور اس کو تنقید سے

بھی اونچی جگہ دی جاتی ہے اور لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ تحقیق کو تنقید سے الگ کر دیا جائے تو اس کی حالت اس گم کردہ راہ کی ہوگی جو کسی صحرا میں بھٹکتا پھرے اور جس کو اس کی خبر نہ ہو کہ وہ بھٹک رہا ہے۔" (اردو تنقید پر ایک نظر، ص ۱۲۶، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ)

زیر تبصرہ مقالے میں ڈاکٹر ثوبان فاروقی شفق کی شاعرانہ خوبیوں اور ادبی مرتبے کا اعتراف کرنے کے باوجود ان کی شاعری میں انفرادی لب و لہجہ کی کمی محسوس کرتے ہیں اور ان کے ادبی مقام کے تعین میں زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملاتے بلکہ شفق کے کلام کا معروضی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ کوئی دوسرا محقق جو اعلیٰ و ادنیٰ شاعری میں فرق نہیں کر سکتا وہ لکھتا کہ شفق بہت بڑے شاعر تھے اور حسرت و جگر، فانی و اصغر سے ان کا مرتبہ ہرگز کم نہ تھا۔ ڈاکٹر فاروقی کی تنقیدی بصیرت انہیں ایسی لغزشوں سے بچاتی ہے۔ شفق کے شاعرانہ مرتبے کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"غور سے دیکھا جائے تو شفق کا کلام بڑی حد تک صوری و معنوی عیوب شاعری سے محفوظ ہے۔ یہ ایسی شاعری ہے جس کے بارے میں رشید احمد صدیقی کا وہ قول صادق آتا ہے جو انہوں نے اساتذہ قسم کے شعرا کے متعلق کہی ہے، یعنی: ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں کوئی عیب نہیں ہوتا لیکن ان کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان کے یہاں کوئی خوبی بھی نہیں ہوتی۔" (ص ۱۱۱)

"یہ حقیقت ہے کہ شفق اپنے معاصرین مثلاً حسرت، فانی، یگانہ، اصغر اور جگر کی طرح اپنا انفرادی رنگ قائم نہیں کر سکے۔" (ص ۱۲۲)

ڈاکٹر فاروقی نے بڑی محنت و جستجو تلاش و تفحص سے شفق کا کلام اکٹھا کیا ہے اور ان کی نثری تصانیف فراہم کی ہیں۔ ان کی سوانح حیات اور تلامذہ کے متعلق متعدد کتب سے اپنے کام کی چیزیں نکالی ہیں لیکن وہ شفق کی تعریف و توصیف میں مبالغہ سے کام نہیں لیتے وہ ان کے کلام کا تجزیہ کر کے ان کی اہم خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں حرف آخر میں شفق کے ادبی مرتبے اور شعری خصوصیات کو بڑے جامع الفاظ میں ڈاکٹر فاروقی نے بیان کیا ہے:

"شفق نے ہر صنف سخن کو برتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ سلسلۂ مصحفی کی آخری یادگار امیر مینائی سے رشتہ تلمذ ہونے کی وجہ سے ان کی ساری وفاداریاں کلاسیکی گروہ کے شعرا کے ساتھ وابستہ ہیں۔ وہ حالی کے ادبی تصورات سے متفق نہیں ہیں لیکن وہ تقلید بے جا کی بھی طرف داری نہیں کرتے۔ غزل میں ان کی تقلیدی روش کا قدم قدم پر احساس ہوتا ہے لیکن ابتذال و رکاکت سے وہ کوسوں دور ہیں۔ غزل میں ان کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ انہوں نے جذبۂ عشق کو اپنی وضع داری کے تابع کیا۔ اسلامی عقیدے کی

پختگی نے ان کے جذباتِ عشقیہ کو اس طرح کی تادیب کی ہے کہ وہ ہنگامِ تخلیق بھی اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ اردو کی دنیائے شاعری میں خواجہ میر درد کے بعد تنہا شفق کی ذات ہے جس کے خارجی معتقدات اور تخلیقی شخصیت میں کوئی بُعد نظر نہیں آتا۔ اور بلاشبہ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی قدر افزائی ضروری ہے ان کے تمام شعری کارناموں کو ان کے نجی عقائد کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔" (ص ۳۱۷)

بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ادبی شخصیات و مسائل پر تحقیقی کام کرنے کے لئے صرف سنین و تواریخ اور حقائق و شواہد جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ انھیں تلاش اور اکٹھا کرنے کے بعد ترتیب وار رکھ دیا جائے تو تحقیق کا حق ادا ہو جائے گا۔ یہ بات ہمیشہ اور کلی طور پر صحیح نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ چیزیں بے حد ضروری ہیں اور ان کی جانب سے غفلت و بے توجہی تحقیق کو پایۂ اعتبار سے ساقط کر دیتی ہے لیکن انہی کو تحقیق کا خلاصہ سمجھ لینا درست نہیں۔ ادبی مسائل و موضوعات اور شخصیات پر تحقیق کے لئے ضروری ہے کہ محقق میں لٹریری ذہن بھی ہو۔ وہ ادب کی ماہیت اس کے ارتقا و رفتار اور مختلف رجحانات سے بخوبی واقف ہو۔ ادب کے مسائل و مباحث اور اصول و مبادیات سے گہری دلچسپی و آگہی رکھتا ہو۔ اگر وہ نثر پر کام کر رہا ہے تو تمام اہم اور صاحبِ طرز ادیبوں کی معروف تحریروں کو پڑھ چکا ہو، اور اگر کسی شاعر یا شاعری پر کام کر رہا ہو تو ادب کے شعری سرمایے پر اس کی نظر ہو۔ وہ شاعری کو نہ صرف سمجھتا ہو بلکہ اس کے فنی رموز اور جمالیاتی حسن سے متاثر و محظوظ ہونے کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔ شاعر اور شاعری پر صرف ایسے لوگوں کو تحقیق کی اجازت ہونی چاہیئے جو کم از کم وزن و بحر کی تمیز رکھتے ہوں، شعر کو صحیح پڑھ سکتے ہوں اور صحیح لکھ سکتے ہوں۔ ناموزوں اور موزوں شعر میں فرق کر سکتے ہوں اور وزن سے اترے ہوئے شعر کو فوراً اور بہ یک نظر پہچان لینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

زیرِ تبصرہ تحقیقی مقالے میں یہ دیکھ کر اطمینان اور خوشی ہوتی ہے کہ محقق شعر کو سمجھتا ہی نہیں، اس کی فنی خوبیوں کوتاہیوں سے بھی بخوبی واقف ہے۔ اس مقالے میں فاضل محقق نے جس طرح ادبی مسائل اور شفق کی شاعری کی خصوصیات پر لکھا ہے اس سے اس کی علمی پختگی، ادبی شعور اور ستھرے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ مقالے کا اسلوب عالمانہ ہے اور اس کی زبان معیاری ادبی زبان ہے جس میں روانی بھی ہے اور سہولت بھی۔ چند صفحات ہی پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ محقق کو نثر لکھنے کا سلیقہ ہے۔

جی چاہتا ہے کہ فاضل محقق شفق کے جملہ کلام کو جو انھیں دستیاب ہو سکا، مقالے کے آخر میں پورا پورا حوالے کے ساتھ نقل کر دیتے۔ اس لئے کہ شفق کے کلام کا کوئی مجموعہ یا ان کا دیوان مطبوعہ صورت میں

موجود نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ انہوں نے شفق کی شاعری پر لکھتے ہوئے ان کے کلام سے بکثرت مثالیں دی ہیں جن سے ان کی شاعری کے خط و خال واضح ہو جاتے ہیں۔ لیکن مقالے کی افادیت و اہمیت بڑھ جاتی اگر حاصل شدہ کلام کو مکمل طور پر جمع کر دیا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقالے کی Synopsis ہی اس کام میں مانع ہوئی ہو۔

ہماری یونیورسٹیوں میں اس معیار کا تحقیقی مقالہ روز روز نہیں لکھا جاتا۔ اردو اکیڈمی، خدا بخش لائبریری، انجمن ترقی اردو اور ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کو چاہیئے کہ وہ ملک کے طول و عرض میں ہونے والے معیاری تحقیقی کارناموں کو شائع کر کے ادبی دنیا کو ان سے متعارف کرائے۔ یہ بڑا کام ہوگا۔ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ملازمت حاصل کرنے اور ترقی کے ہتھے کرنے کی خاطر پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ لٹ کے مقالے لکھے یا معاوضہ دے کر لکھوائے جاتے ہیں۔ ان مقالوں میں تحقیق کی تلاش بیکار ہے۔ ان مقالوں کی حیثیت تو محض بوجھی ہے۔ خس و خاشاک کے ڈھیر میں اچھے اور معیاری مقالوں اور تحقیقی کاوشوں کو ڈھونڈ نکالنا ایک کام ہے جو کرنے کا ہے۔ بقیہ مقالوں کو چھوڑ دیا جائے۔ ان کا ذکر فضول ہے اور ان کے اندر تحقیقی معیار، علمی قدر و قیمت کی تلاش عبث ہے۔ تحقیق کے ساتھ اصل حادثہ یا المیہ بقول غالب یہ ہوا ہے :

بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

ڈاکٹر ثوبان فاروقی
شعبۂ اردو
آر۔ این۔ کالج، حاجی پور

جواب

میری تحقیق سے دو حوالے پیش کیے گئے ہیں : "غور سے دیکھا جائے تو شفق کا کلام بڑی حد تک صوری و معنوی عیوب شاعری سے محفوظ ہے۔ یہ ایسی شاعری ہے جس کے بارے میں رشید احمد صدیقی کا وہ قول صادق آتا ہے جو انہوں نے اساتذہ قسم کے شعرا کے متعلق کہا ہے یعنی ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں کوئی عیب نہیں ہوتا لیکن ان کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان کے یہاں کوئی خوبی بھی نہیں ہوتی۔" (ص: ۱۱۱) "یہ حقیقت ہے کہ شفق اپنے معاصرین مثلاً حسرت، فانی، یگانہ، اصغر اور جگر کی طرح اپنا انفرادی رنگ قائم نہیں کر سکے۔" (ص: ۱۲۲)

ان حوالوں کی روشنی میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا بیان درست معلوم ہوتا ہے لیکن اس بیان سے جہاں میرے معروضی

طریقۂ تنقید کا توصیفی پہلو ابھرتا ہے وہیں اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کہ شفق کا شعری کردار انفرادیت سے یکسر محروم ہے حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ بس اسی مسئلے کی صراحت مقصود ہے۔ واضح رہے کہ اس صراحت کا مقصد ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے تبصرے کی تردید نہیں، توضیح ہے، بلکہ اسے زیرِ نظر تبصرے کا ضمیمہ سمجھنا چاہئے۔

یہ صحیح ہے کہ شفق ایسے منفرد لب و لہجے کے حامل نہیں ہیں جسے دوسروں سے پہچانا جاسکے یا جو ان کی غزل گوئی کی شناخت بن سکے، لیکن ان کے کلام میں بعض ایسی امتیازی خصوصیات ہیں جن سے ان کا انفرادی رنگ بھی متعین ہوتا ہے۔ زیرِ بحث تحقیق کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں: "شفق کی عاشقیہ شاعری کا بڑا حصہ حقیقی جذبے کی حرارت اور تخلیقی وجدان کے لمس سے عاری ہے۔ لیکن محض اسی بات کو بنیاد بنا کر ان کی ساری غزلیہ شاعری کو رد کر دینا بڑی بے انصافی ہوگی، کیوں کہ انہوں نے جب کبھی تقلیدی انداز کے برخلاف اپنی آواز کی جہت متعین کرنے کی کوشش کی ہے، وہ اپنی انفرادی شان نمایاں کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہی حال ان اشعار کا بھی ہے جن میں شفق نے اپنی آواز ابھارنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ جہاں شفق کی شخصیت شعر کے پیکر میں نمودار ہوئی ہے، وہ شعر ایسا قابل ضرور ہو گیا ہے کہ ہم اسے اساتذہ کے کلام کے بالمقابل رکھ سکیں" (ص ۱۰۷، ۱۰۸) "شفق کے کلام میں ایسے اشعار کی موجودگی سے کم از کم اتنا ضرور ہوا ہے کہ ہم اپنی گفتگو کے دائرے کو مزید بڑھا سکیں، کیونکہ ان کے پُرخلوص تجربات میں رمزیت، جذبے کا گداز، لب و لہجہ کی تازگی اور بعض دیگر شعری خصوصیات کے لطیف امتزاج سے وہ باتیں ضرور پیدا ہو گئی ہیں جو کسی شاعر کی انفرادیت کے تعین میں مد ثابت ہوتی ہیں۔" (ص ۱۰۹)

حسن و عشق یوں تو اردو غزل کا محبوب موضوع رہا ہے، لازماً شفق نے بھی اسے برتا ہے، لیکن شفق کے عشق کی ایک قابلِ لحاظ خصوصیت وہ ہے جو نہ تو اساتذہ کے یہاں نظر آتی ہے اور نہ ان کے ہم عصروں کے یہاں۔ شفق کے رویۂ عشق کی نوعیت ملاحظہ ہو جو ان کا اپنا مخصوص رنگ ہے۔ "شفق کے عشق میں جنون زدگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ ان کا عشق نہایت شائستہ و سنجیدہ ہے۔ ممکن ہے آدابِ عشق میں متانت و سنجیدگی کو مستحسن نظروں سے نہ دیکھا جائے کیونکہ عشق دیوانگی اور شوریدہ سری کا متقاضی ہوتا ہے۔ یوں بھی عشق جنون ہی کی ایک شکل ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عشق کی ایک منزل وہ ہوتی ہے جہاں عاشق پر عشق کا یہ مقدس راز کھلتا ہے کہ پیشۂ عاشقی صبر طلب ہے، چنانچہ اپنی تمنائے بے تاب کو خونِ جگر کا باعث بنانے سے زیادہ اس کی تادیب و تہذیب پر توجہ دی جائے۔ شفق کے کلام میں جذبۂ عشق کی نادر المثال تہذیب نظر آتی ہے۔ عشق کے ہر مقام پر ان کا انتہائی مہذب جذبہ انہیں اعتدال و توازن کے دائرے میں محصور رکھتا ہے۔ ان کا عشق ہیجان انگیز نہیں، سکون افزا ہے۔ شعلہ بار نہیں، شبنم افشاں ہے۔ ہنگامہ خیز نہیں، سکوت پرور ہے۔ ان کا عشق چاہے وہ الوہی یا ارضی ایک کیفیتِ خاص کا حامل ہے جسے ہم

ایک بے حد متوازن اور نارمل شخصیت کے عشق سے تعبیر کر سکتے ہیں... شفق کی غزلیہ شاعری کا ایک بڑا حصہ عشق کی اسی فضا کا حامل ہے۔" (ص: ۱۱۱۔۱۱۲)

اسی ضمن میں شفق اور حسرت کے رویۂ عشق کا موازنہ بھی دلچسپ ہے:"... حسرت کی اہمیت ان کی اسی شاعری سے وابستہ ہے جس میں انہوں نے زمین پر ننگے پاؤں چلنے کی بات کی ہے۔ لیکن شفق کا عشق ایک ایسی فضا کا پروردہ ہے جہاں نہ جسم کا گزر ہے اور نہ جس میں جنسی جذبات کا عمل دخل ہے۔ انہوں نے اپنے معیار عشق کی ایک حد مقرر کر رکھی ہے جس سے متجاوز ہونا انہیں گوارا نہیں۔ عشق کے جس اونچے سنگھاسن کو انہوں نے اپنا مستقر بنایا ہے وہاں سے اترنا بھی انہیں مرغوب نہیں۔ مختصر یہ کہ ان کا عشق ٹیڑھے میڑھے خطوط پر نہیں، ایک خط مستقیم پر گامزن ہے اسی لیے ان کے عشق میں وہ کیفیت نہیں ملتی جو حسرت کی شاعری کا خاصہ ہے۔ شفق کے عشق میں ایک نوع کی یکسانیت ہے، ایک ٹھہراؤ کا عالم ہے۔ بلندی، شائستگی، متانت اور ملکوتیت۔ یہ شفق کے عشق کی مختلف خصوصیات ہیں اور انہیں خصوصیات سے ان کے عشق کی انفرادیت متعین ہوتی ہے۔" (ص: ۱۱۴۔۱۱۵)

بالآخر شفق کی غزل گوئی کے بھرپور تجزیے کے بعد ایسے نکات برآمد ہوتے ہیں جو شفق کی غزل گوئی کی خصوصیات واضح کرتے ہیں۔ تصور عشق کی پاکیزگی، ایک مثالی حسن کی جستجو، واردات عشق کا مہذب و شائستہ اظہار، از خود رفتگی کے عالم میں بھی وضع داری اور احتیاط کا بھرم، غم و الم سے تلذذ، ذوق ایذا طلبی، حیات بعد الموت پر یقین کامل، موت کی حیات آفریں توجیہہ۔ شفق کی غزلوں کے یہ ایسے عناصر ترکیبی ہیں جو ان کی انفرادیت متعین کرتے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے دیکھئے تو شفق کے کلام سے زندگی کا ایک مثبت رویہ ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ رجائی انداز نظر اردو غزل کی روایت میں ایک ما بہ الامتیاز وصف ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔" (ص: ۱۱۸)

مزید صراحت کی خاطر آخر میں اس حوالے کا اعادہ کرنا چاہوں گا جسے تبصرہ نگار نے بھی پیش کیا ہے، تحقیق زیر بحث کی مکمل عبارت یہ ہے:" یہ حقیقت ہے کہ شفق اپنے معاصرین مثلاً حسرت، فانی، یگانہ، اصغر اور جگر کی طرح اپنا کوئی انفرادی رنگ قائم نہیں کر سکے، تاہم ان کے کلام کا اردو کی کلاسیکی شاعری کے تمام تر مثبت اوصاف سے مزین ہونا بجائے خود ایک وقیع کارنامہ ہے جس کی قدر افزائی ضروری ہے۔" (ص: ۱۲۲)

اس توضیح کے بعد میرا خیال ہے شفق کی انفرادیت کے سلسلے میں وہ باتیں بھی سامنے آ گئی ہوں گی جو تبصرے میں نہیں آ سکی ہیں۔

●●

ڈاکٹر نجم الدین انصاری
شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی
وارانسی

ڈاکٹر سید حمید شطاری کا تھیسس

قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر سید حمید شطاری، شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کے ریٹائرڈ ریڈر ہیں "قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ تک" کے موضوع پر موصوف کا مقالہ تحقیقی برائے پی، ایچ، ڈی، کتابی صورت میں ایچ، ای، ایچ، دی نظامس اردو ٹرسٹ، حمایت نگر، حیدرآباد کی اعانت سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان حیدرآباد سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔

بلاشبہ مقالہ نگار نے اپنے تحقیقی مقالہ کے لئے ایک بہت ہی اہم موضوع کا انتخاب کیا تھا اور ایک ایسے کام کا بیڑا اٹھایا تھا جو بہت ہی مشکل اور حوصلہ شکن تھا۔ اس موضوع پر کام کرنے والے کے لئے صرف ذولسانین ہی ہونا کافی نہیں تھا بلکہ اس کے لئے کم از کم تین زبانوں (عربی، فارسی اور اردو) کا اچھا علم و مطالعہ اور ستھرا ہوا ذوق ہونا بھی ضروری تھا۔ اس مقالہ کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار ان تینوں زبانوں سے بخوبی واقف ہیں عربی صرف و نحو اور لغت وغیرہ کے ساتھ ساتھ متن قرآن کی تلاوت اور معروف و متداول عربی و تفاسیر کے علم و مطالعہ کی سعادت سے بھی بہرہ مند ہیں۔ ایسے ذی علم، باصلاحیت اور صاحب استعداد محقق کے قلم سے جو مقالہ کتابی صورت میں منظر عام پر آیا ہے، اسے ظاہری و معنوی محاسن سے آراستہ و پیراستہ ہونا چاہیئے تھا اور مقالہ نگار کی تنقیدی بصیرت، علمی وقار و متانت کا آئینہ دار ہونا چاہیئے تھا اور فی الجملہ اس مقالہ کو اس موضوع پر ایک اہم اور وقیع اضافہ کی حیثیت کا حامل ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس مقالہ کے بغور اور بالاستیعاب مطالعہ سے ہماری یہ توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ مزید برآں موصوف نے زیر بحث مقالہ میں صرف ۱۹۱۴ تک کے اردو تراجم و تفاسیر کے مطالعہ تک ہی خود کو محدود رکھا ہے اور اس تحدید زمانہ کی توجیہہ یہ بیان کی ہے کہ:

"زیر نظر تحقیقی کام کو ۱۹۱۴ پر اس لئے ختم کیا گیا ہے کہ اس کے بعد اردو نثر کے آہنگ و اسلوب میں ایسا کوئی تغیر نہیں آیا جس سے قرآن کے ترجمے کی زبان اور اسلوب بیان میں کوئی نمایاں تبدیلی ہو سکتی۔ ویسے ۱۹۱۴ سے ۱۹۱۴ تک جتنے تراجم و تفاسیر قلم بند ہوئے، ان سے کہیں زیادہ عہد حاضر تک ہوئے اور ہوتے جا رہے

ہیں۔ یہ تراجم خوب سے خوب تر کی تلاش کا نتیجہ ہیں، ورنہ بیسویں صدی کے آغاز میں علمی زبان اور علمی اسلوب بیان کا جو معیار قائم ہو چکا تھا، کم و بیش وہی معیار آج تک قائم ہے۔[1]

موصوف کی توجیہہ متعدد وجوہ سے محل نظر ہے۔

اول یہ کہ کسی بھی زندہ اور ترقی پذیر زبان کا آہنگ و اسلوب حتیٰ کہ اس کا معیار بھی اپنی حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے کوئی جامد شئی نہیں ہے جس پر مرور ایام اور دوسرے مختلف النوع اسباب و موثرات سے کسی طرح کا کوئی تغیر و تبدل نہ ہو۔ جدت و ندرت اور اقتضائے وقت و حالات کا لحاظ فطرت انسانی کا خاصہ ہے اور شاہراہ ترقی میں حرکت و عمل کی شاہ کلید بھی ہے۔ اسی کا نتیجہ وہ تنوع ہے جو اردو زبان کی تمام اصناف نظم و نثر اور فی الجملہ اس کے تمام علمی، تحقیقی اور تنقیدی سرمایہ میں صاف اور واضح طور پر نظر آتا ہے۔ دوسرے موصوف کا یہ قول کہ زمانۂ حاضر تک جو تراجم و تفاسیر قلم بند ہوئے ہیں وہ اپنی کثرت تعداد کے باوجود، خوب سے خوب تر کی تلاش کا نتیجہ ہیں، مدیر سطور کی رائے میں صورت حال کی صحیح تعبیر نہیں ہے کیونکہ دور حاضر میں عوام و خواص بالخصوص جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں شریعت اسلامی کے اولین اور مستند ترین ماخذ یعنی قرآن و حدیث سے براہ راست اخذ و استفادہ کا صحت مند میلان و رجحان پہلے کے مقابلے میں اب بہت بڑھ گیا ہے۔ دوسرے قرآن مجید کے اردو مترجمین و مفسرین جو ابتداءً خارجی دباؤ اور داخلی تناؤ کی وجہ سے اس وادی پرخطر میں قدم رکھنے سے خوف اور جھجکاہٹ محسوس کرتے تھے وہ اب بالکل ختم ہو گئی ہے۔ تیسرے عوام و خواص اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے اس میلان و رجحان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض تجارتی منافع کے پیش نظر بعض ناشرین کتب مستند و غیر مستند تراجم و تفاسیر کثیر تعداد میں چھاپ کر وسیع پیمانہ پر پھیلانے لگے تھے۔ چوتھے عہد حاضر میں زمان و مکاں کے فاصلے بہت گھٹ گئے ہیں۔ ذرائع ابلاغ و ترسیل اور وسائل نشر و اشاعت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ حرکت و عمل میں جوش اور فکر و شعور میں بالیدگی پیدا ہوئی ہے۔ پانچویں فہم و مطالعہ کا یہ ذوق و شوق اب صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں رہ گیا ہے بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی، مختلف اغراض و مقاصد کے تحت قرآن کے فہم و مطالعہ کا اہتمام و التزام کرنے لگے ہیں۔ معاملات زیست سے تعلق رکھنے والے مسائل میں آیات قرآنی سے استدلال کرنے کا مذاق پیدا ہو چکا ہے۔ چھٹے عصری علوم، عصری تقاضے، عصری حالات اور عصری معاملات و مسائل وغیرہ سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے لئے فکر و شعور کے ہر منبع سے کسب فیض کرنے کے رجحان میں بڑی وسعت اور لچک پیدا ہوئی ہے۔

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک، ص ۶

مذکورہ صدر اسباب و محرکات کے پیش نظر دورِ حاضر کے ممتاز علما، مفکرین، محققین اور ادیبوں نے بڑے ہمہ گیر ذوق کے ساتھ اردو زبان میں قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر لکھنے اور وسیع پیمانے پر اسے روشناس خلق کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور ایسے ترجمے اور تفسیریں لکھی ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے کسی نہ کسی اہم ضرورت کی تکمیل کرتی ہیں۔ یہ ترجمے اور تفسیریں اپنی کمیت و کیفیت کے لحاظ سے بھی اہم ہیں، زبان و بیان، طریقہ بحث و استدلال وغیرہ کی حیثیت سے بھی ممتاز و منفرد ہیں، ان کا پایۂ علم و تحقیق بھی بہت بلند ہے۔ تفسیر نگاری اور ترجمہ نگاری کی فنی خصوصیات سے بھی حامل ہیں، ان خدمات کو نہایت وسیع پیمانے پر شہرت و مقبولیت بھی حاصل ہوئی ہے، ان کا دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے اور اس کے دور رس اثرات و نتائج بھی مرتب ہو رہے ہیں۔

ہمیں اجمالی طور پر یہ تو معلوم ہے کہ اردو زبان میں قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر کے آغاز و ارتقا کی تاریخ ربط و تسلسل کے ساتھ تقریباً چار صدیوں پر محیط ہے۔ اور یہ شاندار روایت مائل بہ ارتقا ہے۔ اردو زبان نے نہایت کم عرصے میں قرآن مجید کے جزئی اور مکمل منثور و منظوم مطبوعہ و غیر مطبوعہ تراجم و تفاسیر کا جو ذخیرہ فراہم کیا ہے، ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد ۱۰۰۰ سے بھی متجاوز ہے۔ یہ تعداد دنیا کی تمام ترقی یافتہ اور ترقی پذیر زبانوں کے تراجم و تفاسیر کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ فارسی زبان بھی اس پہلو سے اردو کے مقابلہ میں فرو مایہ ہے۔

اردو تراجم و تفاسیر کا جو ذخیرہ ہند و پاک کے نجی، عوامی اور سرکاری کتب خانوں، علمی و تحقیقی اداروں اور مختلف مراکز میں جزئی یا مکمل منظوم یا منثور، مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخوں کی صورت میں موجود و محفوظ ہیں، ان تک رسائی حاصل کرنا، ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا، مترجمین و مفسرین کے ذاتی، گروہی، مذہبی و مسلکی تعصبات، رجحانات و میلانات کا غیر جانب داری کے ساتھ پتہ لگانا، ان کے مخصوص افکار و خیالات اور اغراض و مقاصد کا جائزہ لینا، ان کی زبان و بیان اور طریقۂ بحث و استدلال کا تجزیہ و تحلیل کرنا، اردو تراجم و تفاسیر کی عہد بعہد ترقی کے پس منظر میں ان کی لسانی، علمی، ادبی اور فنی قدر و قیمت کا تعین کرنا، ان کے محاسن و معائب کو جانچنا اور پرکھنا نہ صرف مذہبی و دینی حیثیت سے ضروری ہے، بلکہ لسانی و ادبی حیثیت سے بھی ناگزیر ہے۔ ادھر اردو تراجم و تفاسیر کا لسانی و ادبی حیثیت سے جائزہ لینے اور متقدمین و معاصرین کے تراجم و تفاسیر سے ان کا موازنہ و مقابلہ کرنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ اخبارات و رسائل میں اس طرح کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اردو تراجم و تفاسیر کے پورے ذخیرہ کو علم و تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں وہ کوئی ایسی خدمت انجام نہ دے سکے جو پورے طور پر قابل اطمینان اور لائق استناد ہو۔

ہمیں شطاری صاحب کا ممنون و مشکور ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اپنے اس مقالہ کے ذریعہ علم و تحقیق کی سطح پر اس موضوع کو قابل توجہ بنایا۔ گو ان کی یہ کوشش بھی بہت محدود ہے، اور شمالی و جنوبی ہند کی مساعی کے حصار میں محصور ہے، تاہم ان کی اس خدمت سے ہم میں یہ احساس و شعور ضرور پیدا ہوا ہے اور ہونا چاہیئے کہ ہم زبان اردو کے اس اہم ذخیرہ کو بقدر حوصلہ و ظرف مطالعہ و تحقیق کا موضوع بنائیں جو قرآن مجید کو براہ راست سمجھنے اور سمجھانے کے جذبہ سے منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ اور جو اپنی اہمیت و عظمت کے لحاظ سے نہ صرف کتب خانۂ اسلامی میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں بلکہ اردو زبان و ادبیات کا بھی سرمایۂ فخر و ناز ہیں۔ ذیل کے سطور میں شطاری صاحب کے اسی مقالے کے موضوع و مباحث کے تعلق سے چند ضروری امور کی وضاحت مقصود ہے۔

اس مقالہ میں سب سے پہلے مسعود حسین خاں وزیٹنگ پروفیسر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر کا تین صفحات پر مشتمل "حرفے چند" کے عنوان سے ایک مختصر مقدمہ ہے جس میں مقالہ نگار کا تعارف، ان کی علمی و عملی استعداد و صلاحیت اور اپنے مجوزہ موضوع سے ان کی ذہنی و فکری مناسبت کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ان کے اس کام کی نوعیت و کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اور اس اصل غرض و غایت کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جو اس کام کی اصل محرک ہے۔ موصوف لکھتے ہیں۔

> "۱۹۶۲ء میں جب میرا اس یونیورسٹی میں پروفیسر و صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے انتخاب ہوا تو چند اساتذہ جو اس وقت مرکزی شعبہ میں کام کر رہے تھے ان میں شطاری صاحب بھی تھے۔ عمر، وقت، صلہ و ستائش سے بے نیاز وہ اس وقت پی ایچ ڈی کے مذکورہ بالا مقالے کی تیاری میں مصروف تھے۔ جب مجھے ان کے موضوع اور ان کی عربی صلاحیت کا علم ہوا تو بے حد جی للچایا کہ شطاری صاحب اپنے اس کام کو زیادہ تیزی سے کر ڈالیں تو اچھا ہے۔ مجھے خاص طور پر دلچسپی اس مواد سے تھی جو دکنی میں قرآن کریم کے تراجم و تفاسیر سے تعلق رکھتا ہے۔ اور بے طرح دکن کے کتب خانوں میں بکھرا پڑا ہے۔"[۱]

"حرفے چند" کے بعد ۲۰ صفحات پر مشتمل مقالہ نگار کے قلم سے ایک مفصل و مبسوط دیباچہ ہے جس میں انتخاب موضوع کی وجہ اور مقالے کے طریقہ تقسیم ابواب کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ ان افراد و اشخاص اور اداروں کا شکریہ بھی ادا کیا ہے جنہوں نے اس مقالے کی ابتدائی تیاری سے لے کر طبع و اشاعت کے مراحل تک ان کا تعاون اور ان کی توصلہ افزائی کی ہے۔ ان امور، مسائل اور مشکلات کا بھی بطور خاص ذکر کیا ہے جن سے وہ دوچار ہوئے ہیں۔ اپنے

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر، ص ۱۱، ۱۲

طریقۂ مطالعہ و تحقیق اور منہج بحث و استدلال کی بھی وضاحت کی ہے۔ موصوف کے دیباچہ کا یہ اقتباس قابل توجہ ہے:

"ویسے مجھے تلاوت قرآن کے سلسلے میں الفاظ کے معنوی پہلوؤں اور جملوں کی نحوی تراکیب سمجھنے کا شوق رہا ہے۔ لیکن اس کام کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد مختلف تراجم و تفاسیر سے تحقیقی نقطۂ نظر کے ساتھ رجوع کرنا پڑا۔ مختلف تراجم میں ایک ہی لفظ کے مختلف اردو ترجموں اور اقتضائے متن سے ان تراجم کے کمزور یا درست ربط پر غور و فکر کرنا پڑا۔ تاکہ یہ اندازہ ہو کہ مترجمین کا عجز کس حد تک ان کے عہد کی زبان و بیان کے عجز کا نتیجہ ہے اور کس حد تک مناسب و موزوں لفظ کے تفحص میں کوتاہی اس کی ذمہ دار ہے۔"[1]

"حرفے چند" اور دیباچے کے بعد ۴ صفحات پر مشتمل فہرست ابواب ہے، اس کے بعد اصل کتاب صفحہ ۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۵۵۰ پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ اخیر میں تین صفحات پر مشتمل کتابیات کی فہرست ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے باب اول میں قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر کا خاکہ پیش کیا ہے اور اجمالی طور پر قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر کی اہمیت، افادیت، غرض و غایت اور اس کے آغاز و ارتقا کی تاریخ بیان کی ہے۔ عربی اور دنیا کی مختلف زبانوں میں، اس سلسلے میں جو خدمات انجام دی گئی ہیں، ان پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ترجمہ و تفسیر کے اصولوں، اقسام اور مشکلات سے بھی بحث کی ہے۔ اس باب کے مواد اور مباحث میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو مقالہ نگار کی ژرف نگاہی، دقت نظر اور وسعت مطالعہ کا نتیجہ قرار دی جا سکے۔ حالانکہ یہ باب پورے مقالے کے لئے تمہید کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے اسے بہت ہی جامع و مانع اور پرکشش ہونا چاہئے تھا۔

باب دوم ۱۱۱۵ھ مطابق ۱۷۰۳-۴ء میں قدیم دکنی اردو تراجم و تفاسیر کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ۴ نثر میں ہیں اور ایک منظوم اور یہ پانچوں ترجمے اور تفسیریں جزئی ہیں۔ اس عہد کے تراجم و تفاسیر کے تعارف و تنقید سے پہلے مقالہ نگار نے سرزمین دکن کے مذہبی رجحانات کا جائزہ لیا ہے اور ان اسباب و محرکات کی نشان دہی کی ہے جو یہاں شمالی ہند کے مقابلہ میں زبان اردو کے زیادہ فروغ پانے کا باعث ہوئے اور یہ زبان بول چال کے مرحلے سے نکل کر تصنیف و تالیف، کتب و رسائل کے مراحل میں داخل ہو گئی۔ اس سلسلہ میں باشندگان سرزمین دکن نے حضرات صوفیہ و مشائخ کے جذبۂ اخلاص و ایثار، طریقۂ تعلیم و تربیت اور ان کی دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں کی کس طرح اور کس حد تک پذیرائی کی اور صوفیائے کرام نے بھی کس ہمت و استقلال، وسیع القلبی اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا، اپنے عہد کے افراد و معاشرہ کے فکر و عمل کی اصلاح و تربیت کی نازک ذمہ داریاں کس طرح انجام دی ہیں، مسلم فرماں رواؤں کی

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ص ۴، ۵

دلچسپیوں اور مساعی کا دائرہ کار کیا تھا، اور صوفیائے کرام کی فکر و توجہ کی سمت و رفتار کیا تھی۔ اس ذیل میں شطاری صاحب نے یہ معنی خیز جملہ لکھا ہے ۔

" سلاطین واراکین دولت سلطنت کی بقا و استحکام کی فکر میں لگے رہے، اور اولیا اللہ اپنی خانقاہوں میں بیٹھے ایمان و عرفان کی شمعیں جلاتے رہے "[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں جب کہ اردو شمالی ہند میں بول چال کی زبان سے زیادہ کوئی اہمیت حاصل نہ کر سکی تھی، دکن میں نظم و نثر کا سرمایہ فراہم کرنے لگی تھی۔ دکن کے صوفیا، شعرا اور علما نہایت ہمہ گیر ذوق کے ساتھ چمنستان اردو کی آبیاری کرنے لگے تھے۔ اس ذیل میں صوفیائے کرام کی خدمات کو ہر لحاظ سے اولیت و اولویت کا درجہ حاصل ہے۔ اس عہد کے تمام سرمایۂ نظم و نثر میں مذہبیات کے رنگ کا غلبہ ہے، اس رنگ میں تصوف و معرفت کا رنگ سب سے چوکھا ہے۔ شطاری صاحب کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ :۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے مقابلے میں دین کے شرعی پہلو پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ چنانچہ تصوف کے مقابلے میں تفسیر، حدیث، فقہ پر کام کم ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ صوفیا نے تصوف کو اپنا موضوع مقدم بنا لیا تھا اور عوام کو سمجھانے کیلئے عوامی زبان میں تصوف ہی کے موضوعات پر لکھتے تھے "[2]

شطاری صاحب نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ فقہ میں جو رسائل دستیاب ہوئے ہیں، ان کا سلسلہ بارہویں صدی ہجری سے ملتا ہے، البتہ قرآن کا ترجمہ کرنے اور تھوڑی بہت تفسیری وضاحتیں قلم بند کرنے کا رجحان دسویں صدی ہجری ہی سے شروع ہو چکا تھا "[3]

باب سوم ۱۷۴۳ء تا ۱۷۸۹-۹۰ء میں شمالی ہند کے ۲، دکن کے ۲ اور ایک منظوم تراجم و تفاسیر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ پس منظر میں سیاسی حالات اور شمالی ہند اور دکنی کے لسانی و ادبی مذاق و رجحانات کے مابہ الامتیاز پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں ۔

" اورنگ آباد کے مغلوں کے دارالحکومت بننے کے بعد سے دکنی زبان پر شمالی ہند کے محاورے کا جو اثر پڑنا شروع ہوا تھا، وہ امتداد زمانہ کے ساتھ بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ آصف جاہ ثانی کے عہد میں دکن کی علمی و ادبی زبان دکنی باقی نہیں رہی بلکہ اس کی جگہ شمالی ہند کی زبان کا چلن ہو گیا۔ پہلے دکن کی اس لسانی شکست کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ زبان کے معاملے میں اہل دہلی کے مقلد ہو گئے، ایک ایک لفظ اور ایک ایک محاورے کے لئے دہلی

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ص ۴۰ [2] ایضاً ص ۴۱ [3] ایضاً ص ۴۱

سے سند لینا پڑتی تھی اور اس دور میں شمالی ہند سے جو شعرا دکن آتے رہے، دہلی میں ان کا مقام جو کچھ بھی ہو دکن میں استاد الاساتذہ بن گئے۔ اگرچہ زبان کی اس محتاجی اور مجبوری کے باوجود دکن میں شعر و سخن کا غلغلہ بڑھتا ہی رہا، لیکن لسانی برتری کی وجہ سے دہلی کا ایک معمولی شاعر بھی دکن کے بڑے سے بڑے شاعر کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ جو زبون حالی دہلی کے فارسی گو شعرا کی ایرانی شعرا کے مقابلہ میں تھی کم و بیش وہی صورت حال دکن میں پیدا ہوئی تھی"[1]

باب چہارم ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۱-۲۲ء تا ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷-۵۸ء میں شمالی ہند کے ۷، دکن کے ۱۰ اور ۳ منظوم اردو تراجم و تفاسیر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب کے پس منظر میں یورپی اقوام کی سرزمین ہند میں آمد اور یہاں کی سیاسی زندگی میں ان کے اثر و نفوذ، اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں ان کی نمایاں خدمات، ان کے مخصوص اغراض و مقاصد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس عہد میں اردو زبان و ادبیات کی مجموعی رفتار ترقی کے پہلو بہ پہلو قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کی لسانی و ادبی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس بات کی خصوصیت کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کی شاندار روایت کو مقبول خاص و عام بنانے میں اس عہد کی بڑی اہمیت ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نامور صاحبزادوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے ترجموں کے منصۂ شہود پر آنے کا یہی زمانہ ہے۔ اور اردو زبان کے یہ وہ مقبول عام تراجم ہیں جنہیں قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کی تاریخ ارتقا میں سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔ شطاری صاحب کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ:

"اگرچہ شمالی ہند میں اولیت شاہ مراد اللہ سنبھلی کے ترجمہ کو حاصل ہے، لیکن قرآن مجید کے ترجموں اور تفسیروں کا میلان انھیں دو شاہ صاحبان کے تراجم کا مرہون منت ہے"[2]

باب پنجم ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷-۵۸ء تا ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں شمالی ہند کی مساعی ذیل میں ۲، دکن کی مساعی کے ذیل میں ۲ اور ۲ منظوم تراجم و تفاسیر کا لسانی، ادبی اور علمی و فنی حیثیت سے جائزہ لیا گیا ہے۔ پس منظر میں ہندوستان کی سیاسی زندگی میں انگریزوں کے مکمل تسلط سے جو صورت حال پیدا ہوئی اور اس کے نتیجہ میں یہاں کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، ذہنی و فکری اور علمی و ادبی زندگی میں جو حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کرتے ہوئے اس بات کا بطور خاص ذکر کیا ہے کہ یہ دور اردو نظم و نثر کی ترقی میں انقلاب آفریں ثابت ہوا۔ ان خصوصی حالات میں اردو زبان کو ملک گیر حیثیت حاصل ہوئی اور اس کے ادبیات کے سرمایہ میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اس سلسلے میں سرسید اور ان کے رفقا کی خدمات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں:-

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ص ۸۱ [2] ایضاً ص ۱۲۶

"اگرچہ ادبی انقلاب کا مقصد اردو نظم و نثر کو نئی زبان، نئے اسالیب، نئے موضوعات اور بالخصوص نئے طرز فکر سے روشناس کرنا تھا۔ اس کے باوجود اہل قلم کی توجہ مذہبی موضوعات سے نہیں ہٹی۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ اس دور میں مذہبی موضوعات پر معقول، مدلل، مربوط اور واضح انداز میں لکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی طرف اہل قلم کی یہ توجہ بھی انگریزی اقتدار کا نتیجہ تھی۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد مسلمانوں کو اپنے مذہب کے تحفظ کی زیادہ فکر دامن گیر ہوئی۔ عیسائی مشنریوں کی فتنہ پردازیوں نے انھیں اور بھی چوکنا کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد تاریخ، سیرت، کلام، حدیث اور ترجمہ و تفسیر پر جس قدر کام ہوا ہے شاید اس سے پہلے کسی دور میں اتنا نہیں ہوا۔ ادبی انقلاب کے بعد اردو نثر میں جو سادگی اور برجستگی آئی اس سے سب سے زیادہ فائدہ قرآن کے ترجمے کے کام کو پہنچا۔ اسی وجہ سے اس دور میں اور اس دور کے بعد یکے بعد دیگرے اچھا ترجمہ کیا جاتا رہا۔"[1]

اس طرح شطاری صاحب نے باب دوم سے لے کر باب پنجم تک قرآن مجید کے جزئی، مکمل، منظوم و منثور اور مطبوعہ و غیر مطبوعہ چالیس اردو تراجم و تفاسیر کی لسانی و ادبی حیثیت سے رفتار ترقی کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ شمال و جنوب کی مساعی کو علیحدہ علیحدہ موضوع بحث بنایا ہے، زبان و بیان، فکر و فن اور علم و ادب کے لحاظ سے بحیثیت مجموعی شمالی ہند کی مساعی کو دکن کی مساعی کے مقابلہ میں بہتر قرار دیا ہے اور اس بات کا اعتراف و اظہار کیا ہے کہ اگرچہ سرزمین دکن کو قرآن کے تراجم و تفاسیر کی روایت کو پروان چڑھانے میں اولیت کا شرف حاصل ہے، تاہم شمالی ہند میں اردو زبان کی دوسری اصناف نظم و نثر کی طرح اس روایت کو بھی بے پناہ وسعت اور قدر و منزلت حاصل ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ شاندار روایت بھی جس کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا سرزمین دکن کے سر ہے، شمال و جنوب کے حصار سے نکل کر علمی و فنی حیثیت سے اپنا ایک مستقل اور منفرد مقام بنانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن سے لے کر مولانا وحید الدین خاں کے تذکیر القرآن تک اس سلسلہ میں جو خدمات انجام دی گئی ہیں، وہ نہ صرف اردو زبان و ادبیات کے لئے سرمایۂ فخر و ناز ہیں، بلکہ غیر اردو داں طبقوں اور حلقوں میں بھی ان کو وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ مقالہ نگار نے اس سلسلہ میں سہل پسندی سے کام لیا اور اپنے پسندیدہ موضوع کی وسعتوں کو اپنی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کی گرفت میں لانے سے پہلو بچا گئے، اور جس قدر مواد انھیں گھر بیٹھے میسر آگیا بس اسی پر اکتفا کر لیا۔ ذیل میں زیر بحث مقالہ سے ایک اقتباس بطور نمونہ پیش ہے

اذصبوا بقیمی ھذا فالقوہ علی وجہ ابی یات بصیرا و اتونی باھلکم اجمعین۔

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفسیر کا تنقیدی مطالعہ ص ۱۴۴

ترجمہ:۔ یوسف نے کہا کہ جاؤ میری پیرہنی انے (اور) باپ کے منہ پر چھوڑو تو دیکھتے ہو دیں گے۔ انے پیچھے سکلا (تمام) اپس کے کٹم کو لیو آنے (اور) میرے نزدیک آنو (لاؤ)۔" قال رب السجن احب الی الخ

یہاں ترجمے میں فعل ماضی "کہا" استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ ماقبل آیت میں قال کا ترجمہ "کہیا" کیا گیا ہے۔ فعل کے ماضی مطلق میں الف سے پہلے یا کا اضافہ جیسے کہیا، سنیا فعل ماضی مطلق کی قدیم شکل ہے۔ جو گیارہویں صدی عیسوی کے اواخر سے رفتہ رفتہ ترک کی جانے لگی۔ لیکن گیارہویں صدی یا اس سے قبل کی تحریروں میں ماضی مطلق کی یہ قدیم شکل کبھی کبھی بغیر یا کے بھی مستعمل رہی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے اس قدیم ترجمے میں بھی کہیا کے ساتھ کہا کی شکل بھی موجود ہے۔ اس کو کاتب کا تصرف نہیں سمجھنا چاہیئے۔ جیسا کہ دکنی مخطوطات کے بعض مرتبین نے ماضی مطلق بغیر یا کو کاتب کی تصحیح متصور کر لیا ہے۔ اگر یہ کاتب کا تصرف ہوتا تو وہ دونوں مقامات پر لکھ دیتا

"قمیصی ھذا" "میری یہ پیرہنی" کی جگہ صرف "میری پیرہنی" ترجمہ کر دیا ہے۔ یوں تو میری پیرہنی میں نسبت کی وجہ سے خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے تسامح ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد حضرت یوسف کا کوئی ایک پیراہن ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں قرآن کا مقصود اصلی ضمیر اشارہ قریب "ہذا" سے یوسف علیہ السلام کے پیراہنوں میں سے ایک خاص پیراہن ہے۔ اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیراہن ہے۔ جیسے وہ آگ میں ڈالے جاتے وقت زیب تن کئے ہوئے تھے۔ اور حضرت یوسف جب کنویں میں تھے تو یہ ان کے گلے میں۔ تفسیر جلالین میں لکھا ہے۔

"وھو قمیص ابراھیم الذی لبسہ حین القی فی النار کان فی عنقہ فی الجب وھو من الجنۃ امرہ جبریل بارسالہ۔"

"فالقوہ علی وجہ ابی" "کا ترجمہ" انے باپ کے منہ پر چھوڑو" کیا گیا ہے۔ "فالقو" کا صحیح اور موزوں ترجمہ "ڈالو" ہے اور یہ لفظ قدیم زمانے سے مستعمل ہے۔ لیکن دکنی مترجم کے ذہن میں نہیں آیا۔ دوسرے یہ کہ "القوہ" کی ضمیر منفصل کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ اور یہ ضمیر "قمیصی ہذا" "میرا یہ کرتا" کی طرف راجع ہے۔ اس کے علاوہ ترجمے میں "ابی" کی یائے متکلم کا بھی خیال نہ رکھا "میرے باپ" کی بجائے صرف لفظ باپ لکھ دیا ہے۔ اس طرح اب ترجمہ یہ ہوگا "اور میرے اس قمیص کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو۔"

"یات بصیرا" کے ترجمے میں اختلاف ہے۔ بعض نے "یات" کے معنی "بصیر" لئے ہیں۔ ایسی صورت میں ترجمہ ہوگا "میرا یہ کرتا میرے والد کے چہرے پر ڈال دو تو وہ دیکھنے والے ہو جائیں گے۔" یعنی بصارت آ جائے گی۔

چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد نے بھی یہاں ذرا سا ترجمہ کیا ہے۔

"تم میرا یہ کرتا لے جاؤ اور اس کو والد صاحب کے منہ پر ڈال دو، وہ دیکھنے لگیں گے۔"

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے بھی اسی ڈھب کا ترجمہ کیا ہے ۔

"میرے اس پیراہن کو لے جاؤ اور اس کو میرے والد کے چہرے پر ڈال دو ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔"

مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی "ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی" ترجمہ کیا ہے اور دکنی مترجم نے بھی اس مفہوم کا ترجمہ کیا ہے۔

"لے جاؤ میری پیرہنی انے باپ کے منہ پر چھوڑ دو تو دیکھتے ہو دیں گے۔"

مقالہ نگار کی ناقص رائے میں "یات بصیرا" میں فعل "یاتی" کا فاعل حضرت یوسف کے والد ہیں، اور "بصیرا" فاعل کی حالت بتا رہا ہے۔ اس طرح یہ اسم حالیہ ہوگا۔ اور اس جزو آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔

"اس (کرتہ) کو میرے والد کے چہرے پر ڈال دو وہ (آنکھوں) سے دیکھتے ہوئے (میرے پاس) چلے آئیں گے۔ اور اپنے (باقی گھر والوں کو (بھی) سب کو میرے پاس لے آؤ۔"

چنانچہ شاہ عبدالقادر اور شیخ الہند مولانا محمود حسن نے بھی "یات بصیرا" کا ترجمہ اسم حالیہ کے مفہوم کے ساتھ کیا ہے "کہ چلا آوے آنکھوں سے دیکھتا۔" (شاہ عبدالقادرؒ) "کہ چلا آئے آنکھوں سے دیکھتا ہو۔" (مولانا محمود حسن) شاہ رفیع الدینؒ نے بھی اس کو اسم حالیہ سمجھا ہے۔ لیکن ترجمہ فعل معطوف کے ساتھ کیا ہے۔ ترجمہ ہے "آوے گا بینا ہو کر۔"

"واتونی باھلکم اجمعین کے ترجمے۔ اتے پیچھے سگلے اپس کے کُٹم لوگ لیُوا نے میرے نزدیک آنو" کے ترجمے میں لفظ پیچھے زائد اور غیر ضروری ہے۔ "اور اپنے گھر والوں کو سب کو میرے پاس لے آؤ" ترجمہ کرنے کے بجائے دکنی مترجم نے لیُوا اور آنو دو فعل دو علیحدہ جملوں میں استعمال کئے ہیں اور ان جملوں کو حرف عطف انے (اور) سے ملا دیا ہے۔ غالباً اس وقت جملوں کی بندش اس طرح بھی ہوا کرتی تھی۔ لیکن مندرجہ بالا سطور میں "اذھبوا بقمیصی ھذا" کے ترجمے میں ایسی ترکیب نہیں ہے یعنی پچھلی ترکیب کے مطابق "لیُو میری یہ پیرہنی اور جاؤ" ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن یہاں تو دکنی مترجم نے جملہ مفرد بنادیا ہے "لے جاؤ میری پیرہنی" گیارہویں صدی کے ختم تک جملوں کی نحوی ترکیب منظم و مرتب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے جس طرح بن پڑتا مفہوم ادا کر دیا جاتا تھا۔"

مندرجہ بالا اقتباس زیر بحث کتاب کے اس حصے سے اخذ کیا گیا ہے، جس میں مقالہ نگار نے برائی گجراتی اردو کے سورہ یوسف کے ترجمہ و تفسیر پر مشتمل اول و آخر ناقص نسخے کا تعارف کرایا ہے۔ اس سلسلہ کی دوسری ضروری تفصیلات کے ساتھ ساتھ ترجمہ و تفسیر کے اقتباسات بھی نقل کئے ہیں۔ ان اقتباسات پر لسانی،

(۱) قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ص ۵۲ تا ۵۵

علمی اور فنی حیثیت سے بحث کی۔ زبان کی قدامت کا لحاظ کرتے ہوئے ترجمہ کے محاسن و معائب کو بھی پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ترجمہ کی خامیوں اور کوتاہیوں کی بھی بلا جھجک نشاندہی کی گئی ہے۔ غلطیوں کی تصحیح کا بھی التزام کیا ہے، ان کوششوں میں وہ کہیں تو کامیاب ہیں، لیکن کہیں ناکام۔ مثلاً "یات بصیرا" کے سلسلے میں انہوں نے جو طویل بحث کی ہے، وہ کسی بھی لحاظ سے تشفی بخش نہیں ہے۔ قرآن مجید نے صرف ان دو کلمات میں اقتضائے حال کے مطابق جس مفہوم کو ادا کیا ہے، اس تک نہ تو شطاری صاحب کا ذہن پہنچ سکا اور نہ ان مترجمین کا جن کے ترجمے موصوف نے نقل کیے ہیں۔ البتہ محمد رسول کی رائے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ترجمہ صحت سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔

"جاؤ، میرا یہ قمیص لے جاؤ اور میرے والد کے منہ پر ڈال دو، ان کی بینائی پلٹ آئے گی، اور اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ۔"

●●

ڈاکٹر نذیر ملک
شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

ڈاکٹر محمد یوسف بخاری کا تھیسس

کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ

"کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ" ڈاکٹر محمد یوسف بخاری کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ یہ مقالہ ستمبر ۱۹۹۲ء میں مرکزی اردو بورڈ لاہور سے کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد یوسف بخاری اس وقت شعبۂ کشمیری پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ ہیں اور کشمیری ان کی مادری زبان ہے۔ کتاب کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:

"کشمیری زبان سے میرا دلی لگاؤ اور اس کے ادب سے میری والہانہ محبت قدرتی ہے کہ میں کشمیر میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا۔ سرزمین کشمیر سے آجانے کے بعد بھی میرے تخیل کی وادیوں میں اس خطے سے وابستگی کی شمع فروزاں رہی۔ جب میں اس قابل ہوا کہ علم و ادب کے میدان میں کوئی تخلیقی کام کر سکوں تو میں نے سب سے پہلے کشمیری زبان و ادب کے فروغ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔" (دیباچہ کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ ص ۹)

اردو مقالہ نگار کی ثانوی اور اکتسابی زبان ہے اور اردو میں ایم۔ اے کر چکے ہیں۔ اس طرح اردو اور کشمیری دونوں زبانوں کی ساخت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے ان زبانوں کے تقابلی مطالعے کو اپنا تحقیقی موضوع بنایا ہے۔ راقم الحروف نے اس تحقیقی مقالے کا لسانیاتی اور صوتیاتی اصولوں کے پیش نظر جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

لسانیات نسبتاً ایک جدید اور کم سن علم ہے۔ پچھلی نصف صدی سے اس علم میں اتنی گہرائی اور وسعت پیدا ہو گئی ہے کہ دوسرے علوم کے ماہرین بھی اس کے اصولوں سے استفادہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ لسانیات کے تعلق سے نئے نئے علمی شعبے سامنے آگئے ہیں۔ لسانیات میں زبان کی ساخت کا سائنسی اور معروضی طور پر تجزیہ کیا جاتا ہے۔ یہ زبان کا ایک بہت ہی پیچیدہ اور تہ دار نظام ہوتا ہے اور اس نظام کے زیر سطح بھی بہت ہی چھوٹے چھوٹے ذیلی پیچیدہ نظام ہوتے ہیں، شاید اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ

LANGUAGE IS A SYSTEM OF SYSTEMS لیکن ہر زبان کا ساختیاتی نظام دوسری زبان کے ساختیاتی نظام سے مختلف ہوتا ہے فرض کریں اگر دو زبانیں ایک ہی خاندانِ السنہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ دونوں میں ایک ہی طرح کی آوازیں استعمال ہوتی ہیں لیکن دونوں زبانوں کے صوتیاتی نظاموں میں پھر بھی نمایاں فرق ہوگا۔ اردو اور کشمیری دو مختلف خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہیں لیکن دونوں زبانوں پر سنسکرت، عربی، فارسی اور انگریزی کے نمایاں اثرات ملتے ہیں۔ دونوں زبانیں فارسی کے زیر اثر اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی رہیں۔ دونوں نے فارسی سے اور فارسی کے توسط سے عربی کے الفاظ اپنے ساختیاتی اصولوں کے مطابق اپنا لیے لیکن یہ اثر محض لفظیات کی حد تک محدود رہا۔ فارسی نے ان زبانوں کے بنیادی ڈھانچوں میں کوئی تبدیلی نہیں لائی۔ اردو پھر بھی ایک جدید ہند آریائی زبان رہی اور کشمیری ایک دردی زبان۔ (کشمیری زبانوں کے کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے یہ سوال اب بھی جواب طلب ہے ماہرین لسانیات نے اس کو داردی DARDIE زبان کہا ہے جب کہ محمد یوسف بخاری نے اس خیال سے اختلاف کیا ہے) ڈاکٹر محمد یوسف بخاری کا مقالہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ انھوں نے پہلی بار لسانیات کے اصولوں کی روشنی میں ان زبانوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور ان کے اشتراکی اور تضاداتی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

مقالے کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں کشمیری اور اردو زبانوں کے تمام لسانیاتی سطحوں مثلاً صوتیات یا فونیمیات، مارفیمیات، تشکیلیات اور معنیات پر تفصیلی بحث ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مقالہ نگار نے ان تمام سطحوں کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے لیکن چوں کہ موضوع بہت وسیع ہے اس لیے دونوں زبانوں کی مختلف سطحوں پر جو مختلف ساختیاتی پیچیدگیاں ہیں ان کو وضاحت کے ساتھ سامنے نہیں لا سکے ہیں اس طرح یہ مطالعہ اور خاص کر صوتیات اور صرف و نحو کے ابواب تشنہ ہیں مقالہ نگار نے ان زبانوں کے اشتراکی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا ہے اور تضاداتی پہلوؤں کی طرف یا تو محض اشارے کیے ہیں یا انھیں یکسر نظر انداز کیا ہے۔ دو زبانوں کے تقابلی مطالعے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے اشتراکی اور تضاداتی دونوں پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے تاکہ ان زبانوں کی ساختیاتی پیچیدگیاں سامنے آسکیں۔ اور پھر اس مطالعے کی روشنی میں ان زبانوں کی موثر تعلیم اور تعلیم کو یقینی بنایا جا سکے اس لیے کہ ثانوی یا خارجی زبانوں کی تعلیم میں جو سب سے بڑی دشواری ہوتی ہیں وہ مادری زبان کی ساخت کی باعث ہوتی ہیں۔

عموماً یہ ہوتا ہے کہ خارجی یا ثانوی زبان سیکھتے ہوئے وہی ساختیاتی اصول دقت کا باعث بنتے ہیں جو مادری زبان کے ساختیاتی اصولوں سے مختلف ہوتے ہیں ایسے ساختیاتی پہلوؤں کو تضاداتی پہلو کہتے ہیں۔ ایک طالب علم ثانوی یا خارجی زبان سیکھتے ہوئے اس زبان کے مخصوص ساختیاتی اصولوں کو جو اس کے لیے اجنبی ہوتے ہیں مادری زبان کے اصولوں کے پیش نظر سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گرامر ٹرانسلیشن میتھڈ آف ٹیچنگ اب بے کار ثابت ہو چکا ہے۔ اطلاقی لسانیات میں تدریس زبان کے تعلق سے ایک الگ شعبہ قائم ہوا ہے جس کو تضاداتی لسانیات CONTRASTIVE LINGUISTICS کہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں تضاداتی لسانیات سے خارجی اور ثانوی زبانوں کی تدریس میں خاطر خواہ استفادہ کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد یوسف بخاری نے

ٹقابلی مطالعے کیلئے صرف ایک یا دو لسانیاتی سطحوں کا انتخاب کیا ہوتا تو ان کا مطالعہ زیادہ جامع اور مکمل ہوتا۔ تمام لسانیاتی سطحوں اور تاریخی مطالعہ
بی کتاب کا موضوع بنا کر وہ دونوں زبانوں کے ساختیاتی اصولوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے ہیں۔

مقالے کا پہلا باب "کشمیر کے ابتدائی لوگ اور ان کی زبان" ہے اس میں مقالہ نگار نے آریوں کے وطن اور
ں کی ہند میں آمد سے متعلق نظریات، سنسکرت کی عظمت، سنسکرت اور کشمیری زبان کا تعلق، گریرسن، ہارنل، جان بیمز، چرجی،
اٹر زور اور ڈاکٹر کے پی شاستری کے نظریات گروہ بندی، کشمیری زبان کا ماخذ، کشمیری ادب اور مختصر جائزہ، کشمیری زبان
ر اردو کے لسانی تعلقات، اردو اور کشمیری زبان کے جغرافیائی تعلقات، تہذیبی تعلقات، عربی زبان کے اثرات کشمیری
بان پر، فارسی زبان کے اثرات کشمیری زبان پر، انگریزی زبان کا اثر کشمیری زبان پر، اردو زبان کا اثر کشمیری زبان پر
میری زبان کا اثر اردو زبان پر۔۔۔ جیسے ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں۔ تحقیقی لحاظ سے یہ باب بہت اہم ہے اور کئی باتیں
سامنے آگئی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں ان تمام عنوانات کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی اور نہ اس باب میں
یادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت تھی۔ اس لیے کہ مقالے کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان دو زبانوں کے توضیحی مطالعے
DESCRIPTIVE STUDY تک محدود ہوگا ہاں اگر ان زبانوں کے خاندان اور لسانی تعلقات کے بارے میں مختصراً کچھ باتیں
ائی جاتیں تو زیادہ ٹھیک تھا اس لیے کہ توضیحی مطالعے میں کسی ایک زبان یا زبانوں کی موجودہ صورتحال پر غور کیا جاتا
ہے۔ ان کی عہد بہ عہد تاریخ کیا ہے۔ ان میں صوتی اور معنوی اعتبار سے کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں تاریخی لسانیات کا موضوع
ہے، توضیحی لسانیات کا نہیں۔ اس باب میں مقالہ نگار نے کشمیری زبان کے ماخذ اور ارتقا پر بات تو کی ہے، لیکن اردو
بان کے ماخذ اور اس کی ابتدا سے متعلق جو مختلف نظریات ہیں ان کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔ اس وجہ سے یہ باب یک طرفہ ہو گیا ہے۔ مقالہ
نگار نے کشمیری زبان کی ابتدا سے متعلق مستند ماہرین لسانیات کی تحقیقی کاوشوں کا بھرپور جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور اپنے
در پر یہ رائے قائم کی ہے:

"بہرحال جس دیش کو آج تک دردستان کہا گیا ہے۔ وہ کوئی دیش نہیں نہ ہی دردی زبان
پر کشمیری زبان کی اساس قائم کی جا سکتی ہے۔ وہ بروشکی زبان ہے جس کے بارے میں خود
گریرسن لکھتے ہیں:

The country in which pisachi settled was apparently originally inhabited by the ancestors of the present speakers of Brusaski, whom they expelled or observed. Only on this theory can I explain the linguistic phenomena which they present themselves."

اسس طویل بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کشمیری زبان کے ماخذ ہیں بر دشسکی زبان سے ملے ہیں جو قدیم ناگ لوگ بولتے تھے۔ یہ قدیم ہندوستانی زبانوں میں سے ایک زبان تھی، جو آگے ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد کشمیریوں کی زبان بن گئی۔ جس زبان کا نام کسی وقت سرد گوجر دیش بھاشا پڑا اور آج کوشر کے نام سے موسوم ہے۔" (ص نمبر ۶۳ اور ۶۴)

کشمیری زبان یا کسی زبان کے ماخذ اور اس کے تدریجی ارتقا پر اس وقت تک کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے جب تک نہ اس کے قدیم ترین مخطوطات دستیاب ہو جائیں۔ کشمیری زبان کے قدیم ترین مخطوطات جو کہ دستیاب نہیں ہیں اس لیے اس کے ماخذ اور ارتقا پر معروضی طور پر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان کی ارتقا سے متعلق مختلف متضاد خیالات سامنے آئے ہیں جن کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں ہے۔ محمد یوسف بخاری صاحب نے ایک اور نظریہ پیش کیا ہے اور یہ بھی سائنسی قواعد پر مبنی نہیں ہے۔ کشمیری زبان کی ابتدا اور اس کا تدریجی ارتقا اپنے طور پر ایک وسیع موضوع ہے جس پر الگ طور ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ توضیحی مطالعہ کی کتاب میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ لکھنا سراسر ناانصافی ہے۔

مقالے کا دوسرا باب "حروف و حرکات کا اشتراک و اختلاف" ہے۔ اس میں اردو اور کشمیری کے حروف تہجی کے بارے میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے، لیکن کشمیری کے حروف تہجی میں انھوں نے مسموع ہکار (منفوس ASPIRATED آوازوں کے حروف کو بھی شامل کیا ہے۔ جب کہ کشمیری رسم خط میں ان کا کہیں استعمال نہیں ہوتا ہے۔

مقالے کا تیسرا باب "صوتیاتی اشتراک اور اختلاف" ہے۔ یہ مقالے کا ایک اہم باب ہے جس میں مقالہ نگار نے اردو اور کشمیری کی مشترکہ اور غیر مشترکہ صوتیوں PHONEMES کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس باب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ مختلف ماہرین صوتیات اور لسانیات کا حوالہ دے کر فونیم یا صوتیہ کو سائنٹفک انداز میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور فونیم کے حدود متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن بعد میں عملی طور پر ان اصولوں سے یکسر انحراف کیا گیا ہے۔ مثلاً کشمیری مصمتی صوتیوں کا جو چارٹ پیش کیا گیا ہے اس میں مسموع ہکار (منفوس ASPIRATED) بندشی آوازوں کو بھی دکھایا گیا ہے جب کہ کشمیری صوتیات میں یہ سرے سے مفقود ہیں اور نہ تحریر میں ان کا استعمال ملتا ہے۔ کشمیری ہندوستان کی جدید ہند آریائی زبانوں سے اس لیے بھی الگ اور منفرد ہے کہ اس میں ان آوازوں "بھ، دھ، جھ، گھ، ڈھ، لھ، نھ" کا پورا سیٹ غائب ہے اور نہ کشمیری اپنی مادری زبان کی صوتیات کے پیش نظر اردو زبان بولتے ہوئے ان آوازوں کو ادا کر سکتے ہیں سوائے ان افراد کے جو اب شعوری طور پر ان آوازوں کی ادائیگی سے واقف ہیں اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ لاشعوری طور پر اپنی مادری زبان کی گرفت کی وجہ سے وہ بھی بعض اوقات ان آوازوں میں ہکاریت (منفوسیت ASPIRATION) کو گرا دیتے ہیں، اور بھارت کو بارت، دھوبی کو دوبی، جھیل کو جیل، ڈھول کو ڈول اور گھوڑا کو گوڑا بولتے ہوئے

نظر آئیں گے اس سلسلے میں کشمیری اردو کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ایسے الفاظ جن میں مسموع ہکار مصمتہ اور غیر مسموع ہکار مصمتہ دونوں استعمال ہوتے ہیں، ان الفاظ کو ادا کرتے ہوئے کشمیری مسموع ہکار مصمتے میں ہکاریت کو گرا دیتے ہیں اور اس کو غیر ہکار مصمتہ میں شامل کرتے ہیں مثلاً گھما کے بجائے گٹھا، بھکاری کے بجائے بکھاری، بھشو کے بجائے بشھو بولتے ہیں۔ مفوس یا ہکار لھ، مھ اور نھ کے سلسلے میں جو مثالیں انھوں نے پیش کی ہیں وہ سراسر غلط ہیں، مثلاً کالھ معنی سز مُہ معنی ابرو کے اور کنھ معنی دھان کا دانہ جو چاول میں رہتا ہے جب کہ یہ کلہ، بمہ اور کنہ ہے۔ ان میں کہیں بھی ہکاریت کا استعمال نہیں ملتا کشمیری مصمتوں کے سلسلے میں یہ بھی لکھتے ہیں:

"جہاں تک صوتیوں کا تعلق ہے۔ وہ جو اردو میں ہیں وہی کشمیری میں ہیں" (ص نمبر ۱۷۲)

یہ بیان سراسر گمراہ کن ہے۔ دونوں زبانوں کے صوتیاتی نظام نہ صرف مختلف ہیں بلکہ دونوں زبانوں کے صوتیے ایک دوسرے سے (سوائے چند) مختلف ہیں۔

فاضل مقالہ نگار نے خ، غ (اس سلسلے میں خل یعنی کھلے اور غلہ یعنی گھونٹ در الفاظ دیے ہیں۔ یہ الفاظ دراصل کھلو اور گلو ہے۔ ان میں خ اور غ کا کہیں استعمال نہیں ہے۔ ص نمبر ۱۸۰) کو بھی کشمیری میں صوتیوں کا درجہ دیا ہے جب کہ کوئی کشمیری ان کی ادائگی پر قادر نہیں ہے۔ کوئی کشمیری (سوائے ان کے جو اب شعوری طور پر ان آوازوں کی صحیح ادائگی سے واقف ہیں)، خار، خدا، غالب اور غذا بولتا ہوا نظر نہیں آئے گا۔ مقالہ نگار نے اسی طرح ذ، ظ، ض، ع، ث، ص اور ح کو بھی اردو میں صوتیوں کا درجہ دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"یہ حروف جس طرح اردو کے صوتیے ہیں اسی طرح کشمیری زبان کے بھی ہیں۔ یہ درست ہے کہ کشمیری لوگ ماسوائے ان علما کے جو عربی سے واقف ہیں ان حروف کا تلفظ پیش نہیں کر سکتے۔ ا، ت، س، ز اور ہ کا ہی تلفظ کر سکتے ہیں اور باقی حروف صوتیوں میں شمار نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کشمیری ق اور ک، ا اور ع، س اور ص، ظ اور ز میں فرق کر ہی نہیں سکتے۔ اسی طرح وہ گ اور غ میں بھی تمیز نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہم کشمیری زبان میں غ کو تسلیم نہیں کر سکتے کیوں کہ کوئی کشمیری مرزا غالب کو غالب نہیں کہے گا بلکہ گالب ہی تلفظ کرے گا۔ بس اسی طرح وہ خ اور کھ، پ اور پھ، ب اور بھ، ت اور تھ، ج اور جھ، چ اور چھ، د اور دھ، ڈ اور ڈھ میں بھی فرق نہیں رکھتا۔" (ص نمبر ۱۸۴)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"اردو میں ا اور ع کی آواز، ت اور ط کی آواز، س، ث اور ص کی آواز، ح اور ہ کی آواز،

ذ، ز، ض اور ظ کی آواز ایک سی ہے۔ عربی والوں کے نزدیک ان آوازوں میں فرق ہو تو ہو، اردو والے اکثر ان میں فرق نہیں کرتے، ایک ہی طرح بولتے ہیں۔ اس لیے ان آوازوں کی ترجمانی کے لیے ہر گروہ سے صرف ایک ایک حرف ہی لے لینا کافی ہوگا۔" (ص نمبر ۱۸۳)

اس باب کا مطالعہ کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ بخاری صاحب فونیم کے بنیادی تصور کو مکمل طور پر ذہن نشین کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے بیانات میں ہر جگہ تضاد نظر آتا ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اردو صوتیات میں ان آوازوں کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں ہے لیکن صوتیہ یا فونیم کے بنیادی تصور کو ذہن نشین نہ کرنے کی بنا پر ان آوازوں کو جو اردو میں محض رسم خط تک موجود ہیں صوتیوں کی حیثیت دیتے ہیں اور اس سلسلے میں مندرجہ ذیل مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عربی کے مندرجہ ذیل حروف جو اردو ادب میں دخیل الفاظ کے طور پر عموماً مستعمل ہیں امتیاز کا باعث بنتے ہیں۔ الفاظ کے بہت سے جوڑوں میں ان حروف کی وجہ سے فرق کیا گیا ہے۔

ذ ـ ض	ذم ـ مذمت،	ضم ـ ملانا	
ز ـ ظ	منزل ـ ذلیل کرنے والا،	مظل ـ سایہ فگن	
ذ ـ ز	ذاخر ـ ذخیرہ کرنے والا،	زاخر ـ جوش زن	
ض ـ ظ	مضل ـ گمراہ کرنے والا،	مظل ـ سایہ فگن	
ض ـ ز	مضل ـ	منزل ـ	
ظ ـ ز	ظاہر ـ	زاہر ـ	
ع ـ ا	علم ـ جھنڈا	الم ـ غم	
ث ـ ص	ثواب ـ	صواب ـ	
ث ـ س	ثانی ـ	سانی ـ بھیگی ہوئی کھل اور چارے کی آمیزش	
ص ـ س	اصرار ـ	اسرار ـ راز	
ہ ـ ح	ہال ـ	حال ـ " (ص نمبر ۱۸۷)	

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ معنیاتی اعتبار سے ان جوڑوں میں فرق ہے لیکن ان جوڑوں میں صوتیاتی اعتبار سے اردو بولنے والے کوئی فرق نہیں کرتے ہیں۔ اس بنا پر اردو میں ان الفاظ کو ہم صوت الفاظ HOMOPHONES کہا جا سکتا ہے۔ عربی میں یہ منفرد

آوازیں ہیں اور ان کا الگ الگ تلفظ ہے۔ اردو میں یہ الفاظ عربی سے آئے ہیں لیکن اپنی انفرادی آوازیں لے کر نہیں آئے ہیں۔ بلکہ محض حروف کی حد تک موجود ہیں۔ رسم خط زبان نہیں ہے۔ رسم خط زبان کو محض تحریری گرفت میں لانے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ لسانیاتی اعتبار سے زبان محض تکلم ہے اور تکلمی اعتبار سے مندرجہ بالا اقلی جوڑوں MINIMAL PARIS میں اردو والے کوئی فرق نہیں کرتے ہیں۔ مقالہ نگار خود بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

"کسی زبان کے لسانیاتی مسئلہ پر بحث کرتے وقت اس زبان کے رسم الخط کو نہ دیکھا جائے بلکہ اس کی آوازوں کو دھیان میں رکھا جائے" (ص نمبر ۱۶۱)

لیکن اس کے باوجود مقالہ نگار نے ان الفاظ کی تحریری صورت کو سامنے رکھ کر ان میں شامل آوازوں کو (جو محض حروف ہیں ، اردو کے صوتیوں میں شمار کیا ہے۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ مقالہ نگار نے خ ، غ ، ف ، ژ ، اور مسموع ہکار بندشی آوازوں کو کشمیری صوتیوں میں شامل کیا ہے۔ اس سلسلے میں بھی متضاد خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ کشمیری میں غیر مسموع ہکار بندشی آوازوں کا پورا سیٹ موجود ہے مثلاً پھ ، تھ ، ٹھ ، چھ اور کھ لیکن مسموع ہکار آوازیں کشمیری میں سرے سے مفقود ہیں، اس لیے ان آوازوں کا تلفظ ممکن نہیں ہے لیکن نہ معلوم مقالہ نگار کس بنا پر یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں :

"پس اسی طرح وہ 'خ' اور 'کھ' پ اور پھ ، ب اور بھ ، ت اور تھ ، ج اور جھ ، چ اور چھ ، د اور دھ ، ڈ اور ڈھ میں فرق نہیں کر سکتے ہیں" (ص نمبر ۱۸۴)

اسی طرح ژ بھی کشمیری صوتیات میں نہیں ہے جبکہ مقالہ نگار نے اس کو بھی کشمیری صوتیوں میں شامل کیا ہے۔ جہاں تک ف کا تعلق ہے یہ صرف سری نگر کی کشمیری میں استعمال کی جاتی ہے۔ سوپور ، بارہ مولہ ، انت ناگ ، پلوامہ وغیرہ علاقوں میں اس کا استعمال نہیں ملتا ہے وہاں اس کو پھ کے تلفظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کو کشمیری صوتیوں میں شمار کیا جائے یا نہیں۔ ماہرین صوتیات اور لسانیات کسی زبان کے صوتیوں کے تعین کے سلسلے میں اقلی جوڑوں MINIMAL PARIS کی تکنیک کا استعمال کرتے ہیں۔ مقالہ نگار نے خود اس تکنیک کا استعمال کیا ہے اور اس بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے لیکن کشمیری میں ف اور پھ کا اقلی جوڑا دستیاب نہیں ہے جو صوتی اور معنیاتی اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ ہو۔ اس لیے اس تکنیک کے پیش نظر ف کو کشمیری مصمتی فونیم نہیں گردانا جا سکتا ہے بلکہ 'پھ' کا ذیلی فونیم تصور کیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ کشمیر کی تین آوازوں تر ، ترھ اور ں کا ذکر کیا ہے۔ تر اور ترھ کشمیری کی دو منفرد آوازیں ہیں جو ہند آریائی زبانوں میں صرف مراٹھی میں ملتی ہیں۔ تر اور ترھ دو فریکیٹ آوازیں ہیں جو کشمیری صوتیات کا ایک ناقابل تنسیخ حصہ ہیں لیکن جہاں تک ں کا تعلق ہے۔ کشمیری میں یہ الگ سے کوئی آواز نہیں ہے۔ یہ بات دراصل گریرسن نے LINGUISTIC SURVEY OF INDIA میں کشمیری صوتیات کے تعلق سے کہی تھی

اور مقالہ نگار نے اپنے طور پر تحقیق کیے بغیر گریرسن کی بات کو من و عن پیش کیا ہے اور اس کو درست تسلیم کیا ہے۔ دراصل کشمیری میں ایک فوق قطعاتی فونیم SUPER A SEGMENTAL PHONAME ہے یہ تالویت PALATALIZATION صوتی خصوصیت اردو میں صوتیہ کا درجہ نہیں رکھتی ہے کشمیری کے تمام مصمتے سوائے تالوی بندشی 'چ' اور 'ج' 'تالوی صفیری' 'ش' اور تالوی نیم مصوتہ 'ی' کے ساتھ اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ نی میں دراصل تالویت کا استعمال ہے اور اس کی ترکیب سے بنتے ہوئے الفاظ کی کشمیری میں بڑی تعداد ہے۔ اس طرح تالویت کشمیری کی ایک ممیز صوتی خصوصیت ہے۔ چند مثالیں اس طرح ہیں:

"باکھ ——— رونے کی آواز　　　بیاکھ ——— دوسرا۔

نول ——— چوہے کے مانند کا۔　　　نیول ——— نیلا۔

وتھ ——— راستہ۔　　　ویتھ ——— وتستا۔

رتھ ——— خون۔　　　ریتھ ——— مہینہ۔ وغیرہ"

کشمیری صوتیات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کشمیری میں تمام غیر مسموع بندشی آوازیں جب لفظ کے آخر میں آتی ہیں تو وہ ہکاریت کے ساتھ استعمال ہوتی ہیں مثلاً اردو کے مندرجہ الفاظ بھی اسی طرح ادا کیے جاتے ہیں:

"ملک ——— ملکھ، سلطنت ——— سلطنتھ، بات ——— باتھ"

مقالہ نگار نے اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔

مقالے کے اس باب میں جس اہم پہلو کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے۔ وہ ان زبانوں کی رکنی ساخت SYLLABIC STRUCTURE کا تجزیہ ہے۔ کسی بھی زبان کا صوتیاتی مطالعہ اس وقت تک نامکمل ہوگا جب تک نہ اس زبان کی رکنی ساخت کو سامنے لایا جائے۔ دراصل ہر زبان آوازوں کا ایک باقاعدہ نظام ہوتا ہے۔ اور ان آوازوں کی مخصوص ترتیب سے ایک زبان کے الفاظ اور مارفیموں کی تشکیل ہوتی ہے۔ زبان بولتے ہوئے ہم جملوں میں بات کرتے ہیں اور یہ جملے الفاظ کی مخصوص ترتیب سے تشکیل پاتے ہیں۔ الفاظ بولتے ہوئے ہم آوازوں کو الگ الگ ادا نہیں کرتے ہیں بلکہ ایک پورا لفظ بولتے ہیں اور ہر لفظ ایک یا ایک سے زائد صوتی ارکان پر مشتمل ہوتا ہے ہر صوتی رکن ایک صدری حرکت CHEST PULSE سے ادا ہوتا ہے ایک لفظ میں جتنی صدری حرکتیں ہوں گی اتنے ہی اس میں صوتی ارکان ہوں گے۔ اردو اور کشمیری الفاظ کے رکنی ساختوں میں اشتراک بھی ہے اور اختلاف بھی۔ ان دو زبانوں کے رکنی ساخت کی مثالیں پیش خدمت ہیں:

اردو

آ　　　آ　　　ع　　　ا ء ا　　　vv

راج	va:j	cvc	عمر	Umr	vcc
ذکر، حُسن	zikr husn	cvcc	پیاس، پیار	pya:s pya:r	vcc

اردو میں لفظ کے شروع میں مصمتی خوشے CONSONANT CLUSTER نہیں ملتے ہیں۔ صرف ایسے الفاظ جو انگریزی سے مستعار ہیں مثلاً پلیٹ PLATE بلیڈ BLADE وغیرہ۔ ان کے علاوہ پیاس، پیار، کیا جیسے الفاظ میں [cc ــ] شروع میں ہے۔ لیکن ان میں بھی y نیم مصوتہ ہے مصمتہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو بولنے والے ایسے انگریزی الفاظ جن کے شروع میں مصمتی خوشے آتے ہیں صحیح طور پر ادا نہیں کر پاتے ہیں مثلاً SCHOOL, STATION, SMALL وغیرہ کو اسمال، اسٹیشن، اسکول بولتے ہیں یعنی وہ ابتدائی مصمتی خوشے کو زائد الف سے توڑ دیتے ہیں۔ کشمیری میں ابتدائی مصمتی خوشوں کی فراوانی ہے، لیکن کشمیری میں st- والے مصمتی خوشے نہیں ملتے ہیں۔ کشمیری زبان کی رکنی ساخت اس طرح ہے۔

کشمیری

ہاں	a.	v	کدو	al	vc
اور	ti	cv	دروازہ	bar	cvc
چولھے سے آگ نکالنے والی چیز، مٹی کے برتن بنانے والا کمہار	kra·l			kr,ots	ccvc

کشمیری میں لفظ کے شروع میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، مصمتی خوشے ملتے ہیں مثلاً KRIOTS, PHRET وغیرہ، لیکن لفظ کے بیچ میں یا اخیر میں مصمتی خوشے نہیں ملتے ہیں جب کہ اردو میں ایسے الفاظ کی ایک بڑی تعداد KRIKH ہے۔ مثلاً: "حسن Husn عشق ISHq

حسن	Husn	عشق	ISHq
عمر	Umr	فکر	Fikr
لفظ	Lafz	وغیرہ"	

یہی وجہ ہے کہ اردو بولتے ہوئے کشمیری ان الفاظ میں مصمتی خوشے کو توڑ دیتے ہیں اور اس طرح کے الفاظ اس طرح بولتے ہیں

حُسُن	Husun	عَشَق	ASHAQ
عُمَر	Umar	فِکِر	Fikir
لَفَظ	Lafaz		

اردو اور کشمیری رسمی ساخت میں نمایاں فرق ہے ان کی طرف مقالہ نگار نے کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر موصوف نے تشدید GEMINATION کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ اردو میں تشدید ایک صوتی خصوصیت ہے۔ مثلاً سچّا، بچّا،

کپاّ، بلاّ وغیرہ لیکن کشمیری میں تشدید کا استعمال نہیں ہے۔

مصوتوں VOWELS کے بارے میں لکھتے ہیں،

" اردو اور کشمیری زبان کے مصوت صوتوں VOWELS PHONEMES میں کوئی خاص فرق نہیں ہے تقریباً جو مصوتے اردو میں ہیں وہی مصوتے کشمیری زبان میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اردو ایک وسیع زبان ہے۔ اس میں ہر زبان کے لفظ کا صحیح تلفظ پیش کرنے کے لیے ہر قسم کے مصوتوں کی گنجائش موجود ہے اسی طرح کشمیری زبان جس کی خصوصیت اس کا نہایت پیچیدہ اور لطیف نظام حروفِ علت ہے۔ اس میں ایسے باریک مصوتے موجود ہیں جن کے وجود کو صرف بولنے والا ہی محسوس کر سکتا ہے۔ سننے والے کو وہ سنائی ہی نہیں دیتے اگر سنائی بھی دیتے ہیں تو سخت کوشش اور توجہ کے بعد۔ اس کے علاوہ اس کی صوتی شکلیں ایسی پر اسرار ہیں کہ ان کو صوتی علامات میں قلم بند کرنا اور ان کی حقیقت کو سمجھنا ایک ماہر صوتیات کے لیے بھی نہایت مشکل ہے۔" (ص نمبر ۱۸۷ اور ۱۸۸)

مقالہ نگار نے کشمیری صوتوں کی پیچیدگی کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن وہ کون سے مصوتے ہیں ان کی صوتیاتی تعریف کیا ہے اور اردو سے وہ کس قدر الگ ہیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ اردو میں صرف دس مصوتے صوتیے کا درجہ رکھتے ہیں جبکہ کشمیری میں سولہ مصوتے صوتیے کا درجہ رکھتے ہیں۔ مصوتوں کی طرح مصوتوں کی نشاندہی بھی کی جاتی تو کئی باتیں سامنے آ سکتی تھیں۔ مقالہ نگار نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ کشمیری اور اردو میں مصوتوں میں کافی تضاد ملتا ہے اور اکثر یہی دقتوں کا باعث بنتے ہیں۔

مقالے کا چوتھا باب صوتی اور معنوی تبدیلیاں ہیں۔ اس میں مقالہ نگار نے دونوں زبانوں سے صوتی اور معنوی تغیر کی مثالیں پیش کی ہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے انھوں نے بعض غلط مثالیں بھی پیش کی ہیں مثلاً مسیات کے تعلق سے انھوں نے پھُف کا لفظ لیا ہے۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ دونوں زبانوں میں ملتا ہے۔ اردو میں اس کے معنی پھونک مارنا اور کشمیری میں پھوپھی کے معنی میں ہے۔ لیکن دو الگ الگ الفاظ میں جو صوتیاتی اعتبار سے الگ ہیں اور معنیاتی اعتبار سے بھی۔ کشمیری میں یہ پھُف نہیں بلکہ پوپھ ہے جو ایک خالص دیسی لفظ ہے۔ اسی طرح نمک کشمیری میں نکھ ہے اور نمک کشمیری میں پھک ہے۔ اسی طرح کئی غلط مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

پانچواں باب "تشکیلات صرفی و نحوی، مماثلتیں اور اختلافات" بھی مقالے کا ایک اہم باب ہے۔ لیکن اس باب میں مقالہ نگار نے تفصیل سے کام نہیں لیا ہے صرف اشتراکی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور تضاداتی پہلوؤں کو یکسر

نظر انداز کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"کشمیری زبان اور اردو زبان کی صرف و نحو کے اشتراک بالکل عیاں ہیں۔ کشمیری زبان اپنی صرف و نحو میں بالکل اردو زبان کے قریب ہے۔

دونوں کے اسمأ کے طریقے افعال کے طریقے ایک جیسے ہیں۔ دونوں میں اسماء افعال کے خاتمہ میں الف آتا ہے دونوں میں جمع بنانے کے اصول کم از کم ایک جیسے نہیں تو بالکل مختلف بھی نہیں۔ جہاں تک دونوں زبانوں کی تذکیر و تانیث کا تعلق ہے جب اسمأ ایک جیسے ہوں تو لازماً تذکیر و تانیث میں یکسانیت بھی ضروری ہے۔ پس دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد افعال مرکب و توابع میں متحد ہیں۔" (ص نمبر ۲۴۵)

جہاں تک ان زبانوں کا تعلق ہے ان میں اشتراک سے زیادہ اختلاف ہے۔ مقالہ نگار نے چن چن کر اشتراکی پہلوؤں کو سامنے لایا ہے اور تضاد داتی پہلوؤں کی طرف دیکھا بھی نہیں ہے۔ مثلاً دونوں زبانوں کے جملوں کی ساخت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی یہ اختلاف موجود ہے۔ سامنے کی مثال لیجئے۔ اردو کا ایک جملہ ہے۔ "حمید نے کتاب پڑھی"۔ اس میں فعل جملے کے آخر میں آتا ہے جب کہ کشمیری میں یہ جملہ اس طرح بولا جائے گا۔ "حمیدن پر کتاب۔ حمید نے پڑھی کتاب"۔ اس میں فعل اسم فاعل کے فوراً بعد آتا ہے مصنف نے ان زبانوں کے لفظی ترتیب WORD ORDER کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے جبکہ دونوں زبانوں کے گرامر میں ایسے اختلاف قدم پر ملتے ہیں اور یہی خصوصیات کشمیری کو دوسری ہند آریائی زبانوں سے الگ کر دیتی ہیں۔ مصنف نے صرف اشتراکی پہلوؤں پر توجہ دی ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر ڈاکٹر محمد یوسف بخاری کا مقالہ "اردو اور کشمیری زبان کا تقابلی مطالعہ" کئی حیثیتوں سے ایک اہم مقالہ ہے۔ یہ ان زبانوں کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں پہلی کوشش ہے اور اردو اور کشمیری لسانیات میں ایک اہم اضافہ ہے کیوں کہ اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں لسانیاتی تحقیق کے تعلق سے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

● ●

ڈاکٹر نسیم اختر
اردو سیکشن
ایس ڈی سی او (ایسٹ)
سیتامڑھی

ڈاکٹر مظفر بلخی کا تھیسس

فصیح الدین بلخی حیات اور کارنامے

"فصیح الدین بلخی حیات اور کارنامے" ڈاکٹر مظفر بلخی ام اے فارسی و اردو ریڈر و صدر شعبہ اردو جے ایس کالج ڈالٹن گنج (رانچی یونیورسٹی) کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر دانش گاہ رانچی نے انہیں پی ایچ ڈی کی سند دی ہے اور جو بقول مولف "ترمیم و تنسیخ کے بعد شائع" کیا گیا ہے۔ اسکی اشاعت ۱۹۸۸ء میں بہار اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے ہوئی ہے۔ کتاب کی تعداد ایک ہزار بتائی گئی ہے، قیمت ایک سو روپے، طباعت دی آزاد پریس سبزی باغ پٹنہ ۴ میں ہوئی ہے یہ ڈیمائی سائز کے ۳۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بارہ ابواب ہیں۔ "پیش لفظ" "عرض حال" اور "فہرست کتابیات" ان کے علاوہ ہیں۔

"فصیح الدین بلخی حیات اور کارنامے" کا پیش لفظ "ڈاکٹر سید محمد حسنین کا ۲۲ دسمبر ۱۹۸۸ء کا رقم کردہ ہے۔ پنے ساڑھے چار صفحے کے "پیش لفظ" میں مصنف نے ادبی تحقیقات کی تمہید پر دو صفحے سے زیادہ لیے ہیں بقیہ میں بلخی سے متعلق اپنے ان آٹھ سالہ پرانے خیالات کو دا وین میں نقل کر دیا ہے جو موصوف نے "نمود ہستی" کے لیے ۱۹۸۰ء میں لکھا تھا یعنی جس وقت فصیح الدین بلخی کے حیات و کارنامے سے متعلق مختلف گوشے اور مواد ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے اور جب ایک محقق نے ایک طویل پس منظر کے ساتھ ان پر تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر کے اس پر انکی رائے جاننی چاہی تو ہی ڈاکٹر سید محمد حسنین کے پاس بلخی کے حیات و کارنامے سے متعلق از سر نو کہنے کو کچھ نہ تھا۔

اس "پیش لفظ" کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ انہوں نے زیر بحث کتاب اور اس کے مصنف کی تحقیقی کاوش کے بارے میں ساڑھے چار صفحے کی تحریر میں صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا:

"ڈاکٹر سید مظفر بلخی کا یہ تخصیصی مقالہ کا نا اور لے دوڑے کی مثال نہیں اس سعی میں انکی استعداد تحقیق کے اور استعانت تنقید بھی ملتی ہے یہ بڑی بات ہے۔ یہ کام انہوں نے نہایت محنت اور سلیقہ مندانہ کیا، انجام کا حسن کارانہ ہوا۔" (ص ۷)

میرا خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر محسنین نے اس مقالے کو پڑھ کر اپنا خیال ظاہر کیا ہوتا تو شاید وہ بھی میری طرح اس نتیجے پر پہنچتے کہ ڈاکٹر سید مظفر بلخی کا یہ مقالہ کاتنے سے پہلے دوڑ جانے کی مثال ہے لیکن انہیں یہ خیال دامن گیر ہا کہ:

"یہ پیش لفظ دو حقائق سے تعلق رکھتا ہے اولاً اس کے مصنف میرے عزیز ہیں اور شاگرد بھی۔ دوم، میں نے اپنے مقالۂ تحقیقی کی تکمیل (۱۹۵۲) میں جن دو چار باکمالوں کے علم و فضل سے استفادہ کیا تھا۔ ان میں فصیح الدین بلخی پہلا نام تھا۔" (ص : ۷)

ظاہر ہے جب معاملہ قرابت داری کے ساتھ GIVE AND TAKE کا ہو تو پھر میزانِ عدل میں عدم توازن کوئی غیر متوقع امر نہیں۔

ڈاکٹر سید محمد حسنین اپنے "پیش لفظ" میں ایک تحقیقی سروے رپورٹ درج کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

"کسی شخصیت (مرحوم / زندہ) پر ریسرچ سب سے آسان ہے" (ص : ۷)

لہٰذا ان کا مشورہ ہے: "شخصیات پر کام کرانے میں سخت گیری کی ضرورت ہے": (ص : ۷)

موصوف کو اس آسانی کا اندازہ اسی وقت ہو گیا ہوگا جب انہوں نے خود مرزا فدوی پر اپنا تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کیا ہوگا۔ غالباً اسی شدت احساس نے انہیں اپنے ہی خیالات کی تردید پر بھی مجبور کیا جو ان فقروں سے ظاہر ہوتا ہے۔

"کسی شخصیت پر کام کرنا بہت آسان ہے مگر اس شخصیت کے وجود و نمود کے خدوخال یا فہم و فکر کے نقش و نگار کو صبح صادق بنا دینا، عملِ دشوار ہے۔ اس سعی میں کامرانی اسی وقت ممکن ہے جب موضوع اور تحقیق دونوں کے ساتھ اندازِ عمل منصفانہ اور دیانت دارانہ ہو": (ص : ۷)

دراصل یہی بات درست بھی ہے اور اس کے ساتھ مزید یہ اضافہ ہونا چاہئے کہ شخصیت کے انتخاب میں ہمیشہ ادب میں اس کے کارنامے اور معیار پر نظر رکھنی چاہئے اور یہی "عمل منصفانہ اور دیانت دارانہ" کسی کتاب کے پیش لفظ لکھتے وقت بھی ملحوظ رہے۔

اس پیش لفظ میں (جو پیش لفظ کم اور رہنمائے تحقیق زیادہ ہے) تصنیفی، صنفی، علاقائی، لسانیاتی اور نظریاتی مقالے کے مدمقابل لفظ "شخصیتی مقالے" کو پانچ جگہ لکھا گیا ہے۔ نہ معلوم "شخصیتی مقالے" کے بجائے "شخصی یا شخصیاتی مقالے" کے استعمال میں انہیں کیا قباحت تھی۔ اسطرح موصوف نے FIELDWORK کا ترجمہ "جہدارضی" کیا ہے جو توجہ طلب ہے۔

بہرحال۔ اب اصل موضوع کی طرف آنا چاہوں گا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس مقالے کے بارہ

ابواب ہیں۔باب اول، دوم اور چہارم تمہیدی کہے جاسکتے ہیں۔باب سوم کا تعلق فصیح الدین بلخی کے سوانح حیات سے ہے۔
اگر محقق نے حسن ترتیب سے کام لیا ہوتا تو باب سوم میں ہی متذکرہ تینوں باب کو الف، ب اور ج، میں تقسیم کرکے
شامل کیا جاسکتا تھا اس طرح بارہ ابواب کی طوالت بھی گراں بار نہ ہوتی۔

ضرورت تو تھی کہ اس مقالے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی جاتی مگر یہاں چند کی نشاندہی مقصود ہے۔ مولف
"عرض حال" میں لکھتے ہیں۔

"ہر معاملے میں حقائق کی چھان بین کی گئی ہے" (ص: ۱۱)

کتاب کے مطالعے سے اسکی نفی ہوتی ہے۔ انہیں اس دعوے کی بجائے یہ اعتراف کرنا چاہئے تھا کہ حقائق کی چھان
بین کی کوشش کی گئی ہیں۔ اس طرح وہ مدعی ہیں:

"حصہ چہارم میں بہار میں اردو نثر کے ارتقا سے مختصراً بحث کی گئی ہے اور فصیح الدین بلخی مرحوم کے عہد
تک کے تمام بہاری نثاروں کی تخلیقات کا مختصراً تعارف کرایا گیا ہے" (عرض حال صلا)

(الف) یہ عبارت غیر ذمہ دارانہ بیان پر مشتمل ہے۔ کیونکہ محقق نے صرف چند ہی سطروں میں بہار میں اردو نثر کے ارتقا کے
سلسلے میں لکھا ہے "بحث" تو دور کی رہی۔

(ب) جہاں تک بلخی کے عہد تک تمام بہاری نثاروں کی تخلیقات کے "مختصراً تعارف" کا ذکر ہے وہ بھی بے بنیاد ہے۔
تمام نثاروں کی تخلیقات کا مختصراً تعارف تو دور ان تمام میں بھی بعض اہم ترین کے نام تک نہیں گنائے گئے ہیں مثلاً نصیر الدین
خاں، ریاست علی ندوی، ارشد کاکوی، مولانا شائق احمد عثمانی، عطا اللہ پالوی، ڈاکٹر ندر امام، ڈاکٹر مختار الدین احمد، صباح الدین
عبدالرحمٰن، عبدالقوی دسنوی، غلام سرور، جمیل مظہری، پروفیسر ذکی الحق، پروفیسر سید حسن، بہاؤالدین احمد، شرف عظیم آبادی،
غیاث احمد گدی، ذکی انور، شکیلہ اختر، نقی احمد ارشاد، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، بہزاد فاطمی، کلام حیدری وغیرہ وغیرہ (یہ نام
جس طرح ذہن میں آتے گئے لکھ دیے گئے ہیں)

صلا-۲۲ مولف "فصیح الدین بلخی..." نے ناول اور ناولٹ نگاری کے سلسلے میں جہاں ضمیر الدین عرش گیاوی
کے ثمرہ نافرمانی "اسلم عظیم آبادی کے ناولٹ" فسانہ شیریں "اختر اورینوی کے" حسرت تعمیر "اور سہیل عظیم آبادی کے" بے جڑ
کے پودے "کا ذکر کیا ہے وہیں سید حنیف فائز کے ناولٹ" رفیق وانیس "سید آل حسن معصومی کے" کشتہ
الفغاں المعروف بہ عبرت کے دو آنسو" سید آل حسن عثمانی (دوسرے نام سے لکھے گئے) کے ناول "چاند تارہ" بڑی آپا
دوست کی بیوی" امداد امام اثر کے فسانہ ہمت" اور جمیل مظہری کے مشہور ناولٹ "فرض کی قربان گاہ پر معروف بہ

شکست و فتح" کا ذکر ضروری نہیں سمجھا جبکہ شین مظفر پوری کے پانچ ناول (ناولٹ سمیت) فرحت، ہزار راتیں، چاند کا داغ، "تین لڑکیاں ایک کہانی" اور کھوٹا سکہ" فصیح الدین بلخی کی حیات میں ہی منظر عام پر آچکے تھے۔ خود مجھے مولف کے والد پروفیسر ناظم بلخی نے ذکی انور کے ناولوں کی ایک ایسی فہرست عنایت کی ہے جس کے مطابق ذکی انور کے ۲۳ میں سے ۱۴ ناول بلخی کی زندگی میں شائع ہوئے لیکن اسکی بھی کوئی نشاندہی اس مقالے میں نہیں کی گئی ہے۔

مولف فصیح الدین... کی تحریر اکثر مغالطے اور شک و شبہات پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً ص ۵۰ کا مطالعہ کریں "بلخی صاحب کے اکثر مقالات ملک کے مشہور رسالوں میں شائع ہوئے چنانچہ موصوف کا ایک مقالہ رسالہ نگار لکھنؤ میں شائع ہوا، اس ضمن میں ان کی اکثر خط و کتابت علامہ نیاز فتح پوری سے بھی ہوتی تھی"

اس اقتباس کے دو پہلو ہیں۔

(الف) احتیاط کا تقاضہ تھا کہ بلخی صاحب کے اکثر مقالات ملک کے مشہور رسالوں کے بجائے بہار کے مشہور رسالوں میں لکھنا چاہئے تھا کیونکہ ان کے مضامین "معاصر" مصور، صنم، صبح نو، صدائے عام، انسان، اشارہ، تہذیب، سہیل اور کونسل (بہار) میں شائع ہوتے تھے۔

(ب) یہ درست ہے کہ ایک مقالہ نگار میں شائع ہوا۔ بقول مولف "موصوف کا ایک مقالہ رسالہ نگار لکھنؤ میں بھی شائع ہوا اس ضمن میں ان کی اکثر خط و کتابت علامہ نیاز فتح پوری سے بھی ہوتی تھی" یعنی صرف ایک مقالے کی اشاعت کیلئے فصیح الدین بلخی کو نیاز سے اکثر خط و کتابت کرنی پڑی۔ انہوں نے نیاز کو کتنے خط لکھے اس کا علم نہیں البتہ بلخی کے نام نیاز کے صرف ایک خط کا پتہ چلتا ہے جس کا متن یہ ہے

دفتر نگار
اپریل ۱۹۵۳ء

محترمی تسلیم

مقالہ مل گیا۔ شکریہ   والسلام، نیاز

ان تمام امور سے قطع نظر میرے نزدیک اس مقالۂ علمیہ کے چار پہلو قابل ذکر ہیں۔

۱ - مشتبہ حقائق   ۲ - مواد کی فراہمی

۳ - زبان و بیان   ۴ - نتیجے کا فقدان

(۱) مشتبہ حقائق - چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

ص ۱۷ "موصوف (عبدالقادر بیدل عظیم آبادی) ۱۰۵۴ھ میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے، مدت تک شاہ محمد اعظم خلف اورنگ زیب کے دربار سے وابستہ رہے پھر دکن کی سیر کو نکلے بعدہٗ دہلی چلے آئے جہاں ۱۱۳۳ھ میں بیدل

کا انتقال ہوا"۔ یعنی بیدل اپنی پیدائش سے ۳۰ سال قبل رحلت کر چکے تھے۔

ص ۷۱۲ (الف) سید عماد الدین پھلواروی نہیں بلکہ خواجہ عماد الدین ہونا چاہیے تھا۔ عماد الدین کو خود خانقاہ مجیبیہ اور خانقاہ عمادیہ کے لوگوں نے "سید" نہیں لکھا بلکہ "خواجہ" لکھا (رجوع بہ اعیان وطن اور نقوش صحیح)

(ب) اعیان وطن اور نقوش صحیح کے مطابق خواجہ عماد الدین کی پیدائش ۱۰۶۵ھ ہے جبکہ مولف "صحیح الدین" نے ۱۰۶۹ھ لکھا ہے۔

(ج) خواجہ عماد الدین کا اردو شعر الحاقی ہے۔ (رجوع مقالات قاضی عبدالودود)

(د) علامہ شبنم سجاد کا سال وفات مولف نے ۱۱۷۲ھ لکھا ہے، ۱۱۷۳ھ ہے اور تاباں کے مندرجہ ذیل مصرع سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

ع   ہائے یوسف طلعت محبوب رب العالمین

۱۱۷۳ھ

(ز) شاہ نور الحق تپاں سال وفات مولف نے ۱۲۴۲ھ لکھا ہے جبکہ ۱۲۴۳ھ ہونا چاہیے تھا۔

(ط) ضیاء الدین دہلوی کا نام ضیاء الدین حسین ہونا چاہیے۔ ۷۲۹ شاد عظیم آبادی نے کئی مثنویاں لکھیں۔ تاریخ شاد ۱۳۰۸ھ مثنوی چشمۂ کوثر غیر مطبوعہ"

شاید انہیں خبر نہیں کہ تاریخ شاد کا دوسرا نام چشمۂ کوثر ہے اور ۱۳۰۲ھ میں مطبع سیدی پٹنہ سے شائع ہو چکی ہے۔ ۷۳۲ اردو شعرا کا تو پہلا تذکرہ لکھا گیا ہے وہ عظیم آباد میں تذکرہ شورش اور تذکرہ مسرت افزا اس کی روشن دلیل ہے۔

(الف) مولف کو معلوم ہونا چاہیے کہ تذکرہ "مسرت افزا" اردو کا پہلا تذکرہ نہیں۔

(ب) تذکرے کا مولف ابوالحسن نہ بہاری تھا نہ بہار میں لکھا گیا۔

ص ۷۴۳ ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی داغ دہلوی کے براہ راست شاگرد تھے۔ مبارک عظیم آبادی بذریعہ مراسلت داغ کے شاگرد ہوئے۔ انہوں نے کبھی انہیں دیکھا تک نہیں تھا جب داغ پٹنہ آئے اس وقت بھی وہ وہاں موجود نہ تھے۔ مبارک خود لکھتے ہیں

"اس وقت میرا عنفوان شباب تھا اور سن کے تفاوت کے سبب میں خود اس انجمن میں شریک نہ تھا جس میں شعرائے عظیم آباد پروانہ وار داغ کے گرد جمع ہوتے تھے۔ (نگار لکھنؤ سالنامہ ۱۹۵۳ داغ نمبر ص ۸۵)

ص ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۶۱، ۷۶۶ اور ص ۷۶۹ پر کاشف الحقائق کو تذکرہ لکھا ہے مگر ص ۷۶۱ پر مولف لکھتے ہیں:

"آثر کی تصنیف کاشف الحقائق اردو تنقید میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔"

دراصل مولف نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا ہے جہاں سے جو حوالہ ملا بلا تصدیق اسے نقل کر دیا ہے۔ کاشف الحقائق تذکرہ ہے تنقید ہے۔ صفحہ ۱۶۰ "اکبر داناپوری مرحوم نے نثر میں کئی کتابیں لکھیں، ان کتابوں کی فہرست ۲۰ ہے۔"

(۱) اشرف التواریخ ۳ جلد مکمل (۲) خدا کی قدرت (۳) چہل حدیث (۴) رسالہ الماس (۵) دل (۶) ارادہ (۷) ادراک (۸) مولد غریب (۹) سرمہ بینائی (۱۰) مولد فاطمی (۱۱) چراغ کعبہ۔

(الف) مولف کو چاہیے تھا کہ اشرف التواریخ چار جلدوں کے نام بتاتے۔ میری معلومات کے مطابق یہ تین جلدوں میں ہے۔ حصہ اول اسرار نبوت ؐ حصہ دوم عہد رسالت ؐ اور حصہ سوم عہد خلافت۔

(ب) اکبر داناپوری کی تمام کتابوں کی تعداد یقین کے ساتھ بتانا فی الحال میرے لیے ناممکن ہے تاہم مولف "فصیح الدین بلخی ... " نے جو نام بتائے ہیں ان کے علاوہ چند مزید یہ ہیں تحفۂ مقبول، اخبار العشق شور قیامت، رسالہ غریب نواز، احکام نماز، نکات اکبر، جذبات اکبر، سیر دہلی (مشکوک) صفحہ ۱۵۷ فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں۔

"نجات قاسم مولفہ شاہ محمد قائم داناپوری مطبوعہ ۱۸۵۷ء"

جبکہ شاہ قائم داناپوری کی پیدائش ۱۳۱۱ھ بتائی جاتی ہے جو ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء ہونی چاہیے۔ صفحہ ۲۶۹ مولف نے حکیم ناصر علی غیاث پوری کی صرف ایک کتاب "عناصر استشہادتین" کا ذکر کیا ہے جبکہ وہ سیکڑوں کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں۔ صفحہ ۲۶۹ "شجرۃ الیقین فی جنت النعیم فسبح باسم ربک العظیم مولفہ شاہ رضا حسین مطبوعہ ۱۸۸۳ء کتاب کا تاریخی نام ہے۔"

یہ نام تاریخی نہیں ہے شجرۃ الیقین فی جنت النعیم کا عدد ۱۷۲۷ ہوتا ہے اور فسبح باسم ربک العظیم کا ۱۵۴۲۔ یہ ۱۲۹۲ھ کی تصنیف ہے۔ شاہ رضا حسین شجرۃ الیقین کے صفحہ ۱۱ پر لکھتے ہیں: "تاریخ یکم ماہ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ ترتیب پایا۔"

۲۔ مواد کی فراہمی: - بلاشبہ مقالہ نگار نے اس سلسلے میں بڑی محنت اور جانفشانی کی ہے۔ فصیح الدین بلخی کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق تمام گوشوں کو یکجا کر دیا ہے۔ پس منظر کے طور پر بلخی خاندان کی علمی و ادبی خدمات کا مفصل جائزہ لیا ہے مگر بحیثیت مجموعی پورے مقالے میں مواد کی فراہمی میں بڑی بے اعتدالی سے کام لیا ہے یہی وجہ ہے کہ تمام ضروری اور غیر ضروری باتیں بلا وجہ تفصیل اور تکرار کے ساتھ شامل ہو گئی ہیں اور محقق کی مثال اس کسان کی سی ہو کر رہ گئی ہے جس نے بڑی محنت سے دھان کے پودے اگائے مگر جب انہیں کاٹ کر گھر کی کوٹھی میں لایا تو اس کے

ساتھ خس و خاشاک اور کھیت کی مٹی بھی بھر لایا۔

مقالہ نگار نے فصیح الدین بلخی کے تمام تر پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے چکر میں جو بھی جہاں سے ملا لے لیا ہے۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی میں جہاں آٹھ سال کے بچے بیلی کاپٹر اور کاریں چلا رہے ہیں محقق کے اس انکشاف سے بلخی کے حیات کا کون سا گوشہ روشن ہوتا ہے کہ:

"مرحوم لگ بھگ دس سال کے ہوں گے۔ مرحوم سائیکل سیکھنے کے خواہش مند تھے۔ سائیکل کا انتظام ہو گیا مرحوم نے پیڈل پر پاؤں رکھ کر مشق شروع کر دی اور بہت جلد سائیکل چڑھنا سیکھ لیا" (ص: ۱۲۲)

مولف نے فصیح الدین بلخی کو اپنے موضوع کی حیثیت سے سامنے نہیں رکھا ہے بلکہ خونی رشتہ ہر جگہ آڑے آ گیا ہے اسی لیے قلم عقیدت مندانہ چلتا گیا پوری کتاب میں انہوں نے فصیح الدین، فصیح یا بلخی یا ضمیر سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ہر جگہ وہ فصیح الدین بلخی مرحوم یا بلخی صاحب مرحوم لکھا ہے جو تحقیق کی زبان نہیں مثلاً ص۱۱۱ پر ۲ جگہ مرحوم ص۵۴ کے فٹ نوٹ اور ص۵۵ پر ۱۵ جگہ بلخی صاحب یا بلخی صاحب مرحوم ص۲۴۱ پر ۱۲ مرتبہ بلخی صاحب مرحوم لکھا ہے۔

۳۔ زبان و بیان ۔۔۔ اس مقالے کا سب سے کمزور پہلو زبان و بیان ہے اور میرے خیال میں ایک اوسط اخباری مضمون کی زبان سے بھی زیادہ غیر معیاری ہے۔ اس کا شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ہو جس میں زبان و بیان کی ناہمواری عجز بیانی، بے اعتدالی اور تکرار لفظی کی مثال نہ ملتی ہو۔ محقق تحقیق کے اسلوب سے یکسر نابلد ہیں۔ بطور نمونہ خط کشیدہ لفظوں پر بطور خاص توجہ فرمائیں:

ص۱۹ "عظیم آباد کی شاعری نے داخلی رنگ گہرا قبول کیا ہے، داخلی شاعری سے مراد شاعر کے اندرونی جذبات اور کیفیات اور واردات قلبی کی تشریح ہے۔ چنانچہ میر کا سوز و گداز اور درد کا کیف و درد بھی داخلی شاعری کا نمونہ ہے۔ چنانچہ شعرائے دہلی نے ذوق، غالب اور مومن کے زیادہ تر داخلی پہلو کو برتا ہے، چنانچہ راز بلخی نے اساتذہ دہلی کے کلام سے عظیم آباد کے اساتذہ کا موازنہ پیش کیا ہے۔"

ص۱۳۵ "نصیر الدین بیرسٹر، شریف صاحب بیرسٹر اور عبد الجلیل مجسٹریٹ ۔۔ ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے ۔۔۔ پروفیسر سید حسن عسکری سے بھی ان کے گہرے تعلقات تھے ۔۔۔ انجم مانپوری سے بھی انکی گہری دوستی تھی ۔۔ بسمل سنہاروی سے بھی انکی گہری یاری تھی۔ سر یدکا بری سے بھی انکی گہری دوستی تھی۔ بلخی صاحب مرحوم سے گہری دوستی تھی جان قمر گیاوی مرحوم سے بھی تھی ۔۔۔ سید محمد یوسف وکیل بھی ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ شرف الدین خلیل اور لکھنؤ کے آرزو لکھنوی سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ حیدر آباد کے عبد الرحیم صاحب سے بھی ان کا گہرا ربط تھا۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی ایک پی ایچ ڈی کے مقالے کے ممتحن تھے۔ ایک پیراگراف میں چار جگہ لفظ "سرچشمہ" دیکھ کر بیچارے چلا اٹھے اور اس صفحے کے حاشیے پر بطور ریمارک لکھ دیا کہ "سرچشموں کی فراوانی ہے"۔ کاش آج موصوف ہوتے تو دیکھتے کہ وہ "سرچشمے" اب کس قدر "گہرائیوں" میں ڈوب گئے ہیں۔

اس طرح اگر فاضل مقالہ نگار کو یہ لکھنا ہے کہ فصیح الدین بلخی کا انتخاب ملٹری سروس کے لیے ہوا تو وہ معاملے کو بڑے پیچ و خم اور ڈرامائی انداز میں کہتے ہیں۔

ص۱۱۶ " بلخی صاحب مرحوم نے ملٹری اسکول کڑکی میں معلمی کے لیے درخواست دی۔ موصوف کو انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ مرحوم تشریف لے گئے اور منتخب کیے گئے۔"

اگر مولف کا مدعا صرف یہ ہے کہ بلخی اپنے انگریز شاگردوں کی زبان دانی کے قصے لوگوں کو سناتے تھے تو اسے وہ کسطرح لکھیں گے۔ ملاحظہ کیجئے :۔

ص۱۱۶ " مرحوم اسی اسکول میں انگریز فوجیوں کو فارسی واردو کی تعلیم دیتے رہے۔ اپنے انگریز طالب علموں کے قصے بلخی صاحب مرحوم گھر والوں کو سناتے تھے۔ خصوصی طور پر ان لوگوں کی فارسی دانی اور اردو دانی کے قصے خود بھی لطف لے کر سناتے تھے۔ اپنے ذہین گورے چٹے والے انگریز طالبعلموں کے بھی قصے سناتے تھے۔"

ایک نمونہ اور دیکھ لیں۔

ص۳۳۱ " بلخی صاحب مرحوم کا آخری ریڈیائی مضمون امداد امام اثر کی شخصیت اور انکی ادبی خدمت سے متعلق ہے۔ یہ مضمون ۱۷ جولائی ۱۹۶۱ء کو نشر ہوا گویا یہ مضمون بلخی صاحب کا آخری ریڈیائی مضمون تھا۔"

۴۔ نتیجے کا فقدان :۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس مقالے کے بارہ یعنی کل ایک درجن ابواب ہیں جس کی تقسیم یوں ہے

• باب اول ۔ عظیم آباد کا ادبی پس منظر • باب دوم ۔ عصرِ فصیح الدین بلخی • باب سوم ۔ سوانح حیات • باب چہارم ۔ بہار میں اردو نثر نگاری (فصیح الدین بلخی کے عہد تک) • باب پنجم ۔ فصیح الدین بلخی بحیثیت مورخ • باب ششم ۔ فصیح الدین بلخی بہ حیثیت محقق • باب ھفتم ۔ فصیح الدین بلخی بہ حیثیت تذکرہ نگار • باب ھشتم ۔ فصیح الدین بلخی بہ حیثیت ناقد • باب نہم ۔ فصیح الدین بلخی بہ حیثیت مضمون نگار • باب دھم ۔ فصیح الدین بلخی بہ حیثیت شاعر • باب یازدھم ۔ فصیح الدین بلخی کی غیر مطبوعہ تصنیفات کا جائزہ • باب دوازدھم ۔ فصیح الدین بلخی کا نثری اسلوب ۔

(اگر مولف نے فنکاری سے کام نہ لیا ہوتا تو اتنے ہی باب اور ہو جاتے۔ مگر انہی میں چند اور اہم گوشوں کو خوبصورتی کے

ساتھ سمیٹ لیا ہے۔ قارئین کی معلومات میں مزید یہ اضافہ ہوتا ہے کہ بلخی ایک ماہر نجوم، جیوتش، بیت باز، معمہ باز، پہیلی کے ماہر تھے سائیکل چلانے کے علاوہ ایک مشاق پہلوان، شکاری اور تیراک بھی تھے۔

"فصیح الدین بلخی حیات اور کارنامے" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ محقق نے اپنی تحقیق کا کوئی نتیجہ نکالا ہے اور نہ ان کا ادبی مقام ہی متعین کیا ہے۔ وہ مورخ، محقق، تذکرہ نگار، ناقد، مضمون نگار اور شاعر ہوتے ہوئے بھی آخر انکی علمیت کا سب سے روشن پہلو کیا ہے، اور ایسے ہی محقق نے اپنی تحقیق کا موضوع کیوں بنایا اس لیے کہ وہ ان کے دادا تھے یا دنیائے ادب کے سامنے یہ بتانے کے لیے کہ حیثیت مورخ وہ کن بلندیوں پر فائز ہیں بطور محقق کس نہج پر ہیں۔ ناقد اور تذکرہ نگار میں انکی کون سی جگہ ہے۔ شاعر ہیں تو کس پائے کے وغیرہ وغیرہ۔

دراصل مقالہ نگار نے صرف معلومات کی حصولیابی تک ہی مقالے کو محدود رکھا ہے نتائج کو عملی شکل میں دیکھنے کی کوشش تو دور اس ضرورت کا احساس تک نہ ہوا۔ جب ایک درجن باب قائم ہی کیے جا چکے تھے تو آخر ایک اور یعنی تیرہویں باب کے اضافے میں کون سا فرق پڑ جاتا۔ اس حصے میں کم از کم کوئی نتیجہ تو برآمد ہوتا ممکن ہے مقالہ نگار کی توہم پرستی نے نہیں تیرہویں باب قائم کرنے سے روک رکھا۔

آخر میں یہ عرض کرتا چلوں کہ بقول مولف اس تحقیقی مقالہ کے نگراں ڈاکٹر احمد سجاد یونیورسٹی پروفیسر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی اور ممتحن ڈاکٹر محمد سلیمان سابق صدر شعبہ اردو بہار یونیورسٹی اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی سیفیہ کالج بھوپال تھے۔ مولف نے حق تحقیق کہاں تک ادا کیا یہ تو سامنے ہے البتہ حق پدری یوں ادا کیا کہ دادا پر لکھا اس کتاب کو والد کے نام انتساب کیا ہے۔ اپنے بزرگوں کو یاد رکھنا اور ان کے نام روشن کرنا بھی ایک بڑی بات ہے۔

آخری بات، صاحبان بہار میں ادبی تحقیقات کی صورت حال پر قاضی عبدالودود نے بہت کچھ اور بہت درست لکھا ہے۔ انھوں نے نامور پروفیسر حضرات کی تحقیقات کا جو جائزہ لیا ہے وہ دنیائے ادب کے سامنے موجود ہے۔ ڈاکٹر مظفر بلخی کی کتاب "فصیح الدین ..." اس لحاظ سے قابل ستائش ہے کہ ایک ادیب کی حیات پردۂ خفا میں تھی اور ان کے کل کارنامے بکھرے تھے۔ ظاہر ہے کہ صاحب مقالہ نے حتی الامکان تحصیل کی سعی کی لیکن عمر کے تقاضے اور ضرورت مندی نے انہیں مجبور کر دیا کہ اسے جلد سے جلد منظر عام پر لایا جائے اگر کتاب کی اشاعت میں عجلت سے کام نہ لیا جاتا اور اس پر اچھی طرح نظر ثانی و ثالث کی جاتی تو جو کمزوریاں راہ پا گئی ہیں از خود دور ہو جاتیں لیکن موجودہ عہد کے تعلیمی نظام اور نظریات نے شاید نہیں اس کا موقع نہ دیا۔ مولف کا یہ نقش اول ہے لہٰذا ناکامل کی توقع عبث ہے۔ آئندہ صاحب کتاب سے اسکو اور ایسی دوسری تصانیف کو اعلیٰ سے اعلیٰ بنانے کی امید ضروری رکھنی چاہیے۔

●●

ڈاکٹر مظفر بلخی
شعبہ اردو
بی۔ این۔ کالج
ڈالٹن گنج

جواب

آپ کا ارسال کردہ خط موصول ہوا حالانکہ اس کے قبل میں نے ایک خط تحریر کیا تھا ہو سکتا ہے کہ ڈاک کی نذر ہو گیا ہو۔ لہذا اس خط کو بذریعہ رجسٹری ارسال کر رہا ہوں۔

محترمی ڈاکٹر نسیم اختر نے میری کتاب "فصیح الدین بلخی حیات اور کارنامے" پر جو تبصرہ کیا ہے موصوف کے خیالات کس قدر حق بجانب ہیں اس کا فیصلہ ناظرین پر ہے۔ مستقبل میں ایسے تبصروں پر احتراز ہونا چاہئے ورنہ علم تحقیق کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔

میں آپ کو حتمی طور پر اجازت دیتا ہوں کہ آپ اپنے رسالہ میں موصوف کا تبصرہ ضرور شائع کریں اس ضمن میں مجھے کچھ عذر نہیں ہے۔

جناب نقی احمد ارشاد
کنکڑ باغ پٹنہ

ڈاکٹر وہاب اشرفی کا تھیسس

شاد عظیم آبادی کی نثر نگاری

اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب ڈاکٹر وہاب اشرفی نے بڑی لگن، جانفشانی دیدہ ریزی اور تجسس کے بعد "شاد عظیم آبادی" کی نثر نگاری پر یہ مقالہ مرتب کیا ہے، جس پر موصوف کو پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ملی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ زمانہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں میرا قیام مظفر پور میں تھا اور اس۔ ڈی۔او کے فرائض منصبی ادا کر رہا تھا۔ وہ بھی سیاسی تلوار ہر وقت سر پر جھولتی رہتی تھی۔ ٹھیک اسی زمانہ میں مرحوم پروفیسر اختر قادری ایک نوجوان کو ملانے لائے اور انھوں نے فرمایا کہ یہ "شاد کی نثر نگاری" پر تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ ڈی تحریر کر رہے ہیں۔ یہ تھا میرا پہلا تعارف ڈاکٹر وہاب اشرفی سے۔ چند سوالوں کے بعد معلوم ہوا کہ یہ شاد یا ان کے کارناموں سے قطعی نابلد ہیں۔ اپنی تھیسس مکمل کرانے کیلئے جو انھوں نے خاکہ تیار کیا تھا، وہ بالکل غلط تھا۔ لہٰذا میں نے شاد کی نثر نگاری کے سلسلے میں جتنے اصناف فن تھے سب کا خاکہ الگ الگ زبانی ان کو بتادیا، یعنی ۱۔ ناول نگاری ۲۔ تذکرہ نگاری ۳۔ سوانح نگاری ۴۔ تاریخ نگاری وغیرہ، اور اختر قادری کی منظوری کے بعد میرا بتایا ہوا خاکہ رہ گیا چنانچہ جب جب موقع ملتا رہا۔ میں نے ان کو مختصر مختصر نوٹ مع حوالوں اور شاد کی تصنیفوں کے ناموں کے ساتھ لکھوا دیا مزید تحقیق کے لیے میں نے شاد کی کل کتابیں، مطبوعہ و غیر مطبوعہ جو میرے پاس تھیں ان کے حوالے کر دیں۔

میری حالت یہ کہ آج یہاں کل وہاں، منتریوں اور سیاست دانوں کی ناز برداریوں اور سرکاری کاموں کے ہجوم سے فرصت کہاں نصیب ہوتی تھی۔ میرے ایسے سرکاری ملازموں کیلئے اقبالؔ مرحوم کا یہ مسخ شدہ کلام ہی مناسب حال تھا۔

خودی کو پست کر اتنا کہ ہر ہر بات پر پہلے — ترا آقا یہ خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

کبھی اس کی ابتدائے عمر سے عادت نہیں رہی۔ خاندان میں کسی نے ملازمت نہیں کی تھی، لہٰذا وہاب صاحب ممدوح کو میں نے جناب سید شاہ عطاء الرحمٰن صاحب وغیرہ سے مشورہ کرنے کے لیے کہا پھر کبھی کبھی وہ مجھ سے دریافت طلب

بات پوچھ لیتے تھے۔

خیر، جو کچھ ہو، موصوف نے اس کتاب میں شاد کی نثر نگاری کے تمام موضوعات کا احاطہ کر لیا ہے جو اس کے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ پھر بھی ان کے بعض بیانات سے مجھے شدید اختلاف ہے۔ اور میرا ذاتی خیال ہے کہ بہ سبب نا تجربہ کاری اور عدم واقفیت، موصوف نے اپنی کہی نہیں، بلکہ دوسروں کی غلط بیانی کو اس کتاب میں جگہ دے دی ہے۔ وجہ یہ کہ شاد کے کل تصانیف مضامین بالخصوص نظموں کا حصہ اُن کے پیش نظر نہ تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باوجود کثرتِ مطالعہ وہ شاد سے پوری طرح واقف نہ ہو سکے۔ جو دوسرے نے بتا دیا، وہی لکھ دیا۔

موصوف نے ابتدا "شاد کی ناول نگاری" سے کی ہے۔ لہٰذا راقم الحروف اپنا ناچیز تبصرہ اسی باب سے شروع کرتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف میری تحریر پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے اور اگر اس تحریر کو قابل اعتنا سمجھیں گے تو اشاعتِ ثانی کے وقت اپنی کتاب میں اصلاح فرما دیں گے یا حقیر کے بیان کو شامل کر دیں گے۔

میں وہاب صاحب کا بے حد مداح ہوں کہ انھوں نے اس ناچیز کو لائقِ اعتنا سمجھا ورنہ بعض حضرات ایسے ہیں کہ اہل قلم ہوتے ہوئے بھی میرے مضامین میں سے مواد لے کر اپنے نام سے بغیر حوالے کے نقل کر دیتے ہیں۔ کہیں میرا یا میری کتابوں کا حوالہ نہیں دیتے، بہر کیف

۱۔ **شاد کی ناول نگاری:۔** شاد کا پہلا ناول "صورت الخیال" ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد دو حصے ۸۔۹ سال کے عرصہ میں شائع ہوئے۔ اس زمانہ میں شاد کی مخالفت میں اخبار "الپنچ" نکلتا تھا، اور جا و بے جا نکتہ چینیاں کرتا تھا۔ چنانچہ "صورت الخیال" کا جب دوسرا حصہ "ہیئۃ المقال" شائع ہوا تو اخبار "الپنچ" نے اپنے شمارہ ۲۳ سال اوّل مورخہ ۷، استمبر ۱۸۸۵ء میں یہ تبصرہ چھاپا:

> "حیدر آباد کے دو، چار شخصوں نے "صورت الخیال" کے صلے میں ان کو تمغہ بھیجا تھا اور جو کچھ تعریف ہوئی تھی، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ نتیجہ طبع زاد محمد اعظم تھا۔ اور "ہیئۃ المقال" کو کسی نے پوچھا تک نہیں، بلکہ اس کتاب کو نہایت ناپسند کیا۔"

شاد جیسا کہ کہانی مطبوعہ ۱۹۶۱ء میں کہتے ہیں کہ ان کے احباب کی طرف سے اشتہار چھپا کہ اگر "صورت الخیال" محمد اعظم کی تصنیف ہے تو یہ کتاب ہنوز ناتمام ہے، محمد اعظم اس کے دوسرے اور تیسرے حصّہ کو شائع کرا دیں اور یہ اگر ممکن نہ ہو تو آگے کا قصّہ بیان کر دیں، مگر محمد اعظم خاموش ہو رہے۔

"صورت الخیال" کے پہلے "سجاد سنبل" ڈرامہ بقول وہاب "ترقی نثر نگاری ص ۸۲" مولفہ حسن علی تھا۔

جو ۱۸۵۶ء میں ہندی رسم الخط میں کیشورام کے نام سے ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا" صحیح سال کیا ہے۔ عبارت گنجلک ہے۔ ناول "نقش طاؤس" مولفہ حسن علی و محمد اعظم ۱۸۸۱ء میں چھپا۔

یہاں تک کہ زمانہ ۱۹۳۱ء میں شاگرد شاد صاحب شاہ عطاء الرحمٰن صاحب مدظلہ ام۔ اے اردو کے امتحان میں شریک ہوئے۔ موصوف "مطالعہ شاد" ص۱۴۵ پر تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ مضمون ۱۹۳۱ء کا لکھا ہوا ہے جو راقم نے امتحان کے موقع پر ۴ گھنٹے میں امتحان کے کمرہ میں فی البدیہہ لکھا تھا، پرچہ استاد مکرم ڈاکٹر محمد عظیم پی۔ ایچ۔ ڈی مرحوم و مغفور کے پاس محفوظ تھا وہی اس پرچہ کے ممتحن تھے۔"

الغرض یہ مضمون "صدائے عام" پٹنہ عید نمبر ۱۹۵۲ء میں پہلی بار چھپا اور دوبارہ "مطالعہ شاد" ستمبر ۱۹۶۶ء میں۔

"صورت الخیال" کے بارے میں موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"اس زمانے میں ولایتی بیگم کا قصہ تین حصوں میں شائع ہوا، جس کی نسبت مشہور ہے کہ یہ قصہ اعظم علی خاں کا لکھا ہوا تھا، جسے شاد نے غصب کر کے اپنے نام سے چھپوا دیا ہے۔ اب بھی چشم دید گواہ موجود ہیں، جنھوں نے یہ قصہ منشی اعظم علی کے پاس دیکھا تھا۔"

بقول عطاء الرحمٰن صاحب، یہ مضمون "نگار" پاکستان نے بھی شائع کیا اور "صدائے عام" عید نمبر ۱۹۶۲ء میں پھر دوبارہ شائع ہوا۔

<u>تبصرہ مضمون نگار:۔</u> جناب عطاء الرحمٰن صاحب میرے بزرگ ہیں اور ان کا ادب مجھ پر واجب ہے مگر جب دیانت اور انصاف کا سوال ہے تو میں ان کے سامنے چند سوال پیش کرنے کی جراٗت کرتا ہوں۔ امید ہے کہ ممدوح میری خطا کو معاف فرمائیں گے۔

۱۔ "صورت الخیال" ۱۸۷۶ء میں چھپی۔ جناب عطاء الرحمٰن صاحب کا تبصرہ ۱۹۳۱ء کا ہے۔ گویا ۵۶ سال کا وقفہ۔ تب اگر کوئی چشم دید گواہ ۱۸۷۶ء میں ۲۰ سال کا بھی ہوگا تو ۱۹۳۱ء میں وہ ۷۶ سال سے کم کا نہ رہا ہوگا۔ معلوم نہیں وہ کون کون سے پیر فرتوت تھے جنھوں نے ۷۶ سال کی عمر میں شاد کی چوری کا انکشاف اُن کے شاگرد رشید کی خدمت میں کیا تھا۔ جناب عطاء الرحمٰن صاحب نے کسی جگہ آج تک میری دانست میں ان چشم دید گواہوں کا نام نہیں تحریر فرمایا ہے۔

۲۔ "البنیخ" نے تو ۱۸۸۵ء میں "صورت الخیال" کے مصنف کا نام محمد اعظم بتایا تھا جن کے نام کی رٹ

بعض مخالفان شاد کرتے تھے۔ تا زمانہ ۱۹۶۱ء جب شاد کی کہانی شائع ہوئی۔ عطاء الرحمٰن صاحب نے کسی جگہ اپنے مضمون میں بنکم چند' اندھیرا ناول یا منشی حسن علی کا نام نہیں لیا ہے۔ حالانکہ بقول اُن کے، آپ کا مضمون تین بار تا زمانہ ۱۹۶۳ء شائع ہوا۔ ان کا دوسرا مضمون مطبوعہ نگار ۱۹۶۷ء کا ہے، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

۳۔ جب شاد نے اپنی سوانح حیات مطبوعہ ۱۹۶۱ء میں "اندھیرا" ناول اور منشی حسن علی کے ترجمے کا ذکر کر دیا۔ تو ہوا دوسرے رُخ کی بہنے لگی۔ اور جناب پروفیسر سید حسن صاحب نے ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا "۔ بہار کا گم نام مصنف مولوی حسن علی" مطبوعہ "اشارہ" مئی ۱۹۶۲ء موصوف تحریر فرماتے ہیں:

" صورت الخیال کے واقعات پٹنہ (کوآ کھوہ) صاحب گنج، بیتا، ندواں اور راج محل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہ بات معنی خیز ہے کہ کوآ کھوہ کا نام "نقشِ طاؤس" اور "صورت الخیال" میں اور راج محل کا نام "سجاد سنبل" اور "صورت الخیال" میں مشترک ہیں۔ راج محل بھاگلپور سے نزدیک ہے اور اس لحاظ سے مولوی حسن علی مرحوم سے اس کا جو تعلق ہو سکتا ہے، وہ ظاہر ہے صورت الخیال کا صاحب گنج ہے جو کہ بھاگل پور سے قریب ہے، نہ کہ گیا... شاد نے اپنی اصلاح سے صاحب گنج کو اس طرح پیش کیا کہ وہ "گیا" معلوم ہوتا ہے۔

تبصرہ مضمون نگار: ۱۔ "شاد کی کہانی" کی اشاعت ۱۹۶۱ء کے پہلے منشی حسن علی مرحوم کے متعلق کسی اہل قلم نے دریافت کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی کہ یہ کون بزرگ تھے، کن کن کتابوں کے مصنف تھے۔ جب شاد کی کہانی" چھپی اور شاد نے تحریر کیا کہ منشی حسن علی مرحوم کے "اندھیرا" ناول کو پڑھ کر سنانے اور ترغیب دینے پر انھوں نے "صورت الخیال" تصنیف کی تھی، تو ہمارے زمانہ کے چند اہل قلم محمد اعظم کے علاوہ منشی حسن علی مرحوم کو بھی اس ناول کے مصنفین میں شامل کرنے لگے۔ اس کے پہلے زمانہ ۱۸۷۶ء سے لغایت مئی ۱۹۶۲ء کسی نے بھول کر بھی منشی حسن علی کو یاد نہیں فرمایا۔ حالانکہ نقش طاؤس ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔

۲۔ رہا قصبہ صاحب گنج، تو اس سے مقصود کون صاحب گنج ہے۔ وہ جو راج محل کے جنوب ریلوے لائن پر اور گنگا کے تٹ پر ہے کہ "گیا" جو پٹنہ کے جنوب میں ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف اس معمولی سی بات پر غور نہ فرما سکے کہ ولایتی بیگم ناول کی ہیروئن، نواب زادی تھی۔ دولت مند زمیندار کی بیٹی اور اس کا شوہر کرم حسین خاں بھی گیا کے زمیندار گھرانے کا ایک فرد تھا۔ جس نے اُس زمانے کے رواج کے مطابق ناچ گانے، رنگ رلیوں میں اپنی دولت برباد کی تھی۔ یہ زمانہ ۱۸۵۷ء کی بات ہے، جب ۱۸۴۹ء سے لغایت ۱۸۵۷ء تک کلکتہ اور راج محل کے درمیان جاری ہوئی تھی۔

تب زمانہ ۱۸۵۷ء میں ایک نواب زادے سے بیاہی جاتی یا اس صاحب گنج نزد راج محل میں جہاں انگریزنیل کے کاشتکاروں کے شاگرد پیشہ خانساماں، باورچی، آب دار، حجام، حلال خور رہتے تھے۔ زمانہ ۱۸۵۷ء کے بہار میں مسلمان شرفا کا مسکن پٹنہ عظیم آباد، گیا، مظفر پور، آرہ، دربھنگہ، شہسرام، سیوان، چھپرہ تھا۔ اور قصبوں میں پھلواری شریف، منیر شریف، بہار شریف، مونگیر، داؤدنگر اور جہان آباد، گیا اور سارن کی بستیاں۔

صاحب گنج نزد راج محل، میں کسی زمانے میں بھی شرفا نہیں رہتے تھے۔ اس قصبہ کا نام "قدرجانہ" تھا۔ بعد دیوانی ۱۷۶۵ء جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا بہار و بنگال پر تسلط ہوا تو انگریزنیل کے تاجروں اور کاشت کاروں نے آمد و رفت کی سہولت کے باعث اس قصبہ کو آباد کیا۔ اور قدرجاناں کے بعد اس کا نام صاحب گنج پڑ گیا۔ پروفیسر صاحب موصوف کو لازم تھا کہ اپنا مضمون سپرد قلم کرنے سے پہلے سنتھال پرگنہ یا بھاگلپور کے قدیم و جدید گزیٹر کو پڑھ لیتے۔ اگر ۱۸۸۵ء کے سنتھال پرگنہ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر کارسٹیر کی کتاب "ہارمازویلیج" اُن کے دست رس سے باہر تھی)۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۴۹ء سے تا زمانہ ۱۸۵۷ء راج محل تک ریل تھی۔

۳۔ ولایتی بیگم بعد رخصتی اپنے سسرال کو جاتی ہے۔ راستہ میں ڈاکو اغوا کرتے ہیں۔ اُس کی زبان سے ایک جملہ سنیے۔ "ڈاکوؤں نے ایک شبانہ روز میں کا بر سٹہ ہزاری باغ کے قریب پہونچا دیا۔" ہزاری باغ، گیا کے جنوب ہے، نہ کہ راج محل یا صاحب گنج کے نزدیک۔ تب شاد نے کیوں اور کس وجہ سے صاحب گنج نزد راج محل کو بدل کر گیا کر دیا۔ جبکہ وہاں اس زمانہ میں کوئی شریف زادی نہیں بیاہی جا سکتی تھی۔

۴۔ رہا راج محل۔ تو اس کو بھاگلپور کی قربت سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ بلکہ زمانہ ۱۸۵۷ء میں ریل لائن صرف راج محل تک آئی تھی۔ شاد حیات المقال میں لکھتے ہیں: "اُس زمانہ میں ریل کلکتہ سے راج محل تک تھی۔" شاد کی تحریر کی تائید بھاگلپور اور سنتھال پرگنہ گزیٹر سے بھی ہوتی ہے۔ اس زمانہ تک لوگوں نے ریل گاڑی کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے شاد نے بالقصد ولایتی بیگم سے ریل کا سفر کرایا ہے، جبکہ "اندھیرا" ناول میں "اندھیرا" کشتی سے کلکتہ تک کا سفر کرتی ہے۔ شاد راج محل سے بذریعہ ریل گاڑی ولایتی بیگم کا سفر کلکتہ تک کا پیش کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں ریل کے ڈبوں میں پاخانہ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے ولایتی بیگم کا ریل کے سفر میں اسٹیشن پر چھوٹ جانا دکھاتے ہیں۔ یہ بات حکومت کو متوجہ کرنے کے لیے کہی گئی تھی اور ریل گاڑی، انجن، وغیرہ پر عام لوگوں کی آگاہی کے لیے ۲ صفحات صرف کیے گئے ہیں۔ اس کو منشی حسن علی بھاگلپوری کی راج محل سے قربت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بلکہ اس زمانہ کی نئی روزگار سواری کو دکھانا تھا۔

شادؔ ہی نے نہیں بلکہ اس زمانہ میں جب واجد علی شاہ کلکتہ میں مقیم تھے، تو جناب وزیر صاحب خلف اکبر مفتی میر عباس نے بھی کلکتہ کا سفر کچھ ریل اور کچھ گھوڑ سگاڑیوں سے کیا تھا۔ چنانچہ "بستان المکاتیب" میں وہ اپنے ریل کے سفر کا تجربہ بیان کرتے ہیں۔ یہ کتاب کتب خانہ خدا بخش خاں میں ہے۔ ایسی ایسی بہت سی تحریریں ہر زبان میں ملیں گی :

"بہ سواری مرکب دخانی کہ آں را ریل می گویند، عجب سواری ساختہ اند۔ بے جانوراں بہ کشش دُود دَ راہِ دو ماہہ بہ چند ساعت انگریزی اخر شد و اجر تش نہایت کم۔"[2]

۵۔ کوّا کھوہ، اس کا نام "قیواں شکوہ" ہے، جو "عظیم الشان" کے زمانہ میں آباد کیا گیا تھا۔ اور قلعہ سے نزدیک ہونے کے سبب یہاں اس زمانہ کے امرا کا مسکن تھا۔ یہاں تک کہ جب ۱۸۸۴ء میں ولفرڈ نسو آن بلنٹ مشہور جرنلسٹ، مسٹر گلیڈاسٹون وزیر اعظم انگلینڈ کے ایما سے لارڈ رپن وائسرے ۱۸۸۰ء تا ۱۸۸۴ء مسلمانوں کے حالات کو جانچنے اور مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کے لیے پٹنہ میں وارد ہوا۔ اور قاضی رضا حسین مرحوم کا مہمان ہوا تو اس نے اپنے سفر نامہ مطبوعہ ۱۹۰۹ء میں لکھا ہے کہ اس وقت تک عہد مغلیہ کے قدیم خانوادے پٹنہ میں موجود تھے[1] اس کتاب کا نام اور کتب خانہ خدا بخش خاں میں موجود ہے۔ پروفیسر صاحب دیکھ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں قاضی رضا حسین، نواب بہادر ولایت علی خاں اور نور الہدیٰ مرحوم بانی نوری مسجد کا نام موجود ہے۔

شادؔ نے قدیم خاندانوں کو زندہ رکھنے کے لیے، بعض جیتے جاگتے افراد کا نام اس ناول کے تینوں حصوں میں پیش کیا۔ مرزا کاظم حسین خلف میرزا فصیح لکھنؤ کے علاوہ مصطفٰے بیگم مرحومہ (حکیم وقت) کا بھی ذکر ہے۔ ۱۸۴۹ء میں شادؔ کے دادا کی بڑی بہن بدر النسا بیگم نے سفر حج کیا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں جب شادؔ نے مع اپنی حقیقی بھانجی مادر نواب بہادر ولایت علی خاں سفر حج کیا تھا۔ "اندھیرا" میں اس کے شوہر اور اندھیرا سے جان پہچان گاؤں کے اندر میں ہوتی ہے۔ اور شادؔ نے ایام حج میں ولایتی اور اس کے شوہر سے ملاقات کرائی ہے۔ اس زمانہ کے حج کی جو تفصیل انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنی وہی ناول کے تیسرے حصہ میں ولایتی بیگم کے ساتھ منسوب کر دی۔ چونکہ ولایتی بیگم کا تعلق قیواں شکوہ کے قدیم گھرانوں سے تھا، لہٰذا قیواں شکوہ کا نام آیا ہے۔ یہ محلہ شادؔ کے کوچہ لنگر سے متصل ہے، اور حاجی گنج کا ایک حصہ ہے۔ محمد اعظم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام پور کے رہنے والے تھے اور لودی کٹرہ میں مقیم تھے۔ تب انھوں نے "قیواں شکوہ" کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے "کوا کھوہ" کا نام لکھا ہوگا جو پٹنہ کے

---

[1]

[2] مظفر پور کے میرزا نذیر حسین ان کے رشتہ دار تھے۔

گنوار کہتے تھے۔ کوئی تعلیم یافتہ شخص " قیوان شکوہ " کو گوا کھو نہیں لکھتا ہے۔ اس کو بطور حربہ شاد کے خلاف کیونکر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر سید حسن صاحب مدظلہ کے مذکورہ مضمون کا جواب میں نے ان کی اجازت سے ۱۹۶۲ء میں لکھا تھا جو سہیل عظیم آبادی مرحوم کے رسالہ " راوی " میں شائع ہوا۔ موصوف تحریر فرماتے ہیں:

" منشی اعظم علی نے کئی ناول کو مختصر سی لکھ کر شائع کرائے۔ ان میں ایک " نقش طاؤس " بھی ہے اس کی زبان اور قصہ کا پلاٹ دونوں سپاٹ ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ " صورت الخیال " کے مصنف دراصل وہی تھے۔ ناول کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ " نقش طاؤس " کا مصنف " صورت الخیال " کا مصنف نہیں ہو سکتا۔ زبان وبیان کے لحاظ سے بھی اور پلاٹ کے لحاظ سے بھی۔ پلاٹ تو بنگلہ ناول کا ہے۔ مگر شاد نے اس پر آب و رنگ دے کر اور داستان کو بڑھا کر ایک نئی شکل دے دی ہے۔ ایک بات ضرور کھٹکتی ہے کہ اندرونی شہادت کی بنا پر اس کا تعلق منشی اعظم علی اور حسن علی سے ہے (منشی اعظم علی اور حسن علی دونوں مل جل کر لکھتے تھے)۔ اس لیے کہ اس میں موضع مہوری کا ضمناً ذکر آ گیا ہے جو قصبہ اسلام پور (نالندہ) کے قریب واقع ہے اور جس کا تعلق شاد سے بالکل نہ تھا بلکہ اعظم علی کے خاندان والوں کا تھا۔"

تبصرہ مضمون نگار، سید حسن صاحب اور وہاب اشرفی نے نقش طاؤس کو حسن علی اور محمد اعظم کی مشترکہ تصنیف بتایا ہے اور سجاد سنبل ڈرامہ کو صرف حسن علی کی تصنیف۔ نہیں معلوم جناب عطاء الرحمٰن صاحب کی مراد کون ناول سے کیا ہے۔ اسی طرح " اندرونی شہادت " کو وہ واضح نہیں کرتے۔ کیا اس مشترک ناول کے علاوہ بھی محمد اعظم کا کوئی ناول ہے۔ ۱۹۲۱ء میں عطاء الرحمٰن صاحب نے بھول کر بھی منشی حسن علی یا بنگلہ ناول کو یاد نہیں کیا۔ تب بعد اشاعت " شاد کی کہانی " ۱۹۶۱ء انھوں نے بھی سید حسن صاحب کی طرح محمد اعظم کے علاوہ منشی حسن علی کو کتاب کا مصنف ٹھہرایا۔

اگر محمد اعظم اور منشی حسن علی دونوں مل جل کر لکھتے تھے تو یہ بات جناب عطاء الرحمٰن صاحب ۱۹۲۱ء میں لیسنے بھول گئے جب بقول اُن کے ۷۶ سال کے بڈھے بڈھے چشم دید گواہ زندہ تھے۔ اور طباعت " صورت الخیال " کے ۹۲ سال کے بعد ستمبر ۱۹۶۷ء میں فرماتے ہیں کہ دونوں مل جل کر لکھتے تھے۔ جب شاد نے ۱۹۶۱ء میں منشی حسن علی کا نام لیا۔

وہاب اشرفی صاحب کے پیش نظر وہ یہ کل مضامین تھے جو اشاعت " شاد کی کہانی " کے سلسلے میں شائع

ہوئے تھے۔ لہٰذا انھوں نے درمیانی راستہ نکال کر تحریر فرمایا:

شادؔ کی نثر نگاری ص۸۰: "ہوری کا تعلق منشی اعظم کے خاندان والوں سے تھا۔ اسی لیے اغلب ہے کہ منشی اعظم نے بستی کا نام لیا ہوگا۔ حالانکہ بذات خود کوئی ایسی دلیل نہیں، جسے شادؔ کے خلاف استعمال کیا جائے"

ص۸۴ "ناول کے دوسرے اور تیسرے حصّہ کے بارے میں کوئی جھگڑا ہے ہی نہیں۔ یہ تو مسلّم ہے کہ یہ دونوں حصّے خود شادؔ نے لکھے"

گھوم پھر کے وہی "الیخ" کی بات۔ توپ کے گولے کی آواز اب سنائی نہیں دیتی مگر تھوڑا بہت دھواں فضا میں تحلیل ہوتا نظر آتا ہے۔ اگر شادؔ اپنی کہانی میں منشی حسن علی مدرس نارمل اسکول کا ذکر نہ کرتے تو شاید "صورت الخیال" کا واحد مصنّف محمد اعظم کو ثابت کیا جاتا۔

ان تینوں اہلِ قلم کا اقرار ہے کہ صرف منشی حسن علی، بنگلہ زبان جانتے تھے۔ اور محمد اعظم کی اردو بھی نہایت خراب تھی۔ وہاب اشرفی نے محمد اعظم کی اردو کا نمونہ بھی اپنی تالیف ص۸۲ پر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو "اے بی بی، احمد میاں کہتی ہیں کہ تمرا یہ طرح سے رہنا اچھا نہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم اور تم دونوں ایکے محلہ کے رہنے والے ہیں" ص۸۳ "موبیتی کی زبان اغلاط سے پُر ہے"

اگر ان تینوں حاجوں کا کوئی ہم خیال ہو تو نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے۔ (۱) مصنف "اندھیرا" بنگلہ رائے بہادر بنکم چند۔ (۲) مترجم در زبان اردو، منشی حسن علی بھاگلپوری۔ (۳) مؤلف و مصنف، شادؔ عظیم آبادی، جنھوں نے پلاٹ میں تبدیلی کر کے ناول کو نئی شکل دے دی جو تین جلدوں میں چھپا۔ تب محمد اعظم کی کیا حیثیت رہتی ہے۔ وہ بنگلہ زبان سے ناواقف، اردو جیسی لکھیں، وہ ان کی تحریر سے ظاہر۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ منشی حسن علی بنگالی نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں بنگلہ ناول کا ترجمہ محمد اعظم کو لکھوا دیا۔ اور وہ اصلاحِ زبان کے لیے شادؔ کے پاس لے گئے جو بقول جناب شاہ عطاالرحمٰن صاحب، شادؔ غصب کر بیٹھے۔ تب بھی محمد اعظم کی کیا حیثیت رہتی ہے۔ نہ وہ کتاب کے مصنف نہ مولف، نہ مترجم۔ کسی کتاب کے ترجمہ کا کاتب، وہ بھی جب کہ وہ خود ترجمہ نہیں کر سکتا ہے، اس کتاب کا نہ تو مصنف، نہ مولف، نہ مترجم ہو سکتا ہے۔ تب بات وہی رہتی ہے جس کا اعتراف خود شادؔ نے کیا ہے۔

"بدھاوا": شادؔ کا دوسرا ناول ہے۔ شادؔ کی نثر نگاری ملاحظہ ہو، ص۱۱۴ "نقی احمد ارشادؔ کے پاس شادؔ کا ایک اور ناول افیونی کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ[۱]... کتاب دلچسپ ہے مگر مسودہ کے بعض اوراق سڑ گئے ہیں اور کتاب

---

[۱] لکھنو نسیم بکڈپو نے شائع کر دیا۔

کے بعض حصے غائب ہیں۔" قاضی عبدالودود صاحب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔ ص۹۰ " قاضی عبدالودود صاحب نے مجھے بتایا کہ ۲۰ یا ۲۲ صفحات پر مشتمل "بدھاوا" انھوں نے دیکھا تھا۔" پھر وہاب صاحب خامہ فرسائی کرتے ہیں: "راقم الحروف کا خیال ہے کہ بدھاوا خود نقی احمد صاحب کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ شاد کی تحریر میں اس کا کوئی خاکہ ہوگا۔ جس کی بنیاد پر اور "رادھا رانی" دیکھ کر "بدھاوا" تیار کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شاد نے اس ناول کا تذکرہ اپنی آپ بیتی میں نہیں کیا ہے۔ شاد کی نثر نگاری ص۹۵۔"

تبصرہ مضمون نگار: وہاب صاحب کا دھیان ان کی تحریر ص۲۶۷ " شاد کی گم شدہ کتابیں" کی طرف رجوع کرنا چاہوں گا۔" شاد کی ایسی نثری تصنیفوں کا بھی جہاں تہاں ذکر ملتا ہے جو قطعی نایاب ہیں۔ ان میں بعض کتاب کا تو خود شاد نے اپنی کہانی میں کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے۔" نقی احمد ارشاد نے "یادگار شاد" میں جو شاد کی کتابوں کی فہرست دی ہے، اس میں "بدھاوا" کا ذکر موجود ہے۔

وہاب صاحب کو اگر اُس وقت موقع نہ ملا، تو کسی دن کتب خانہ خدا بخش خاں میں جا کر "شاد کی تصانیف" کا مخطوطہ ملاحظہ فرمائیں۔ اس کا نمبر ACC 411/HL 274 ہے۔ شاد نے "بدھاوا" کا ذکر تفصیل سے اس مخطوطہ میں کیا ہے، جو خود اُن کے حروف میں ہے۔ "بدھاوا" کی وجہ تصنیف یہ فرماتے ہیں کہ ان کے ایک عزیز سید علی میر کی شادی تھی۔ اس زمانے کی رسم کے مطابق ان کو مانجھا اور بدھاوا کرنا تھا۔ مگر وہ اس طرح کے رسوم میں روپے کو ضائع کرنا ناجائز سمجھتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے زن و شو کے حقوق کو دکھاتے ہوئے یہ کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کی پانچ سو جلدیں چھپی تھیں۔ انھوں نے قصہ کو چار ابواب میں تقسیم کیا تھا۔ مجھ کو جو سڑا گلا نسخہ ملا، وہ چار ابواب کے بدلے آٹھ ابواب میں تقسیم ہو گیا۔ ملاحظہ ہو میری تحریر مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۶۲ء ضلع سنتھال پرگنہ عرض مرتب "بدھاوا": " شاد کے بوسیدہ اور مالیدہ اوراق سے میں نے صرف ناول کا حصہ اس کتاب سے الگ کر لیا ہے۔" میں اس زمانے میں سنتھالی اور بنگلہ زبانیں سیکھ رہا تھا اور دونوں زبانوں کے چھوٹے چھوٹے قصے پڑھا کرتا تھا۔ چونکہ "بدھاوا" کا پلاٹ "رادھا رانی" کے پلاٹ سے ملتا جلتا تھا۔ میں نے اس کا ذکر مطبوعہ "بدھاوا" کے تعارف میں کر دیا تھا۔ الزام تراشی سے پہلے جناب وہاب اشرفی صاحب کو کتب خانہ خدا بخش میں شاد کی تحریر کو دیکھ لینا تھا۔ انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ مجھ کو تحریف سے کیا ملتا۔ نہ میں ریسرچ اسکالر تھا اور نہ اس تحریف سے کسی مالی منافع کی امید تھی۔ اور نہ کسی ڈگری کی ہوس تھی۔

سنئے صاحب! مشہور ڈرامہ نویس شیکسپیئر کے ڈراموں کے متعلق عرصہ دراز تک کہا گیا کہ اس کے ڈراموں کا

مصنف لارڈ بیکن ہے۔ جب لارڈ بیکن کے متعلق سوال اٹھا کہ وہ شاعر نہ تھا، تب یہ سہرا مارلو کے سر چڑھایا گیا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ مارلو جوانی میں مرگیا تو ملکہ الیزابتھ کو مصنف بتایا گیا۔ وہی حالت شاد کے ساتھ ہے۔

رہا سرقہ کا الزام، تو خود شیکسپیر کا کون سا ڈرامہ اوریجنل ہے۔ اس زمانہ میں ناول نگاری کی ابتدا تھی اور شاد بنگلہ زبان کے ذریعہ اردو میں ناول نگاری کے متحرک تھے۔ ان کی ابتدائی کوششوں کو، داد تحسین کیا دیتے، اُن کے ہم وطن معائب ہی کے جویا ہوئے۔ صرف منفی پہلو تلاش کرتے ہیں، جائے عبرت ہے۔

۲۔ شاد کی سوانح نگاری:۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی نے "شاد کی کہانی" اور "حیاتِ فریاد" پر تبصرہ فرمایا ہے۔ "شاد کی کہانی" پر جو جا و بے جا اعتراضات جناب قاضی عبدالودود صاحب نے کئے تھے، ان کا جواب کچھ تو "شاد کا عہد و فن" حصہ اوّل میں دے چکا ہوں، اور باقی تفصیل سے حصہ دوم میں درج ہے جو زیر اشاعت ہے۔ لہٰذا اس مضمون میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ صرف حیاتِ فریاد کے متعلق جو ڈاکٹر وہاب اشرفی کا خیال ہے، اس پر تبصرہ کروں گا۔

۱۔ "حیاتِ فریاد" پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف ص۱۷۷ حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"واضح رہے کہ دیباچہ "تاریخ نادری" کی نثر میں فریاد نے اپنے کو مولوی قادری لکھا تھا۔ شاد نے قادری کو تشیع کے منافی سمجھ کر خارج کر دیا۔"

۲۔ "شاد کی نثر نگاری" ص۱۶۵ میں تحریر فرماتے ہیں: "شاد نے کمال یہ کیا کہ بغیر اس امر کا اظہار کئے ہوئے کہ کچھ اشعار خارج کئے گئے ہیں، درمیان سے وہ اشعار جو خلفائے ثلاثہ کی تعریف میں تھے نکال دیئے گئے ہیں۔ فریاد سنی گھرانے میں پیدا ہوئے اور زمانے تک سنی رہے۔ مرشدآباد سے تعلق ہونے کے بعد تشیع اختیار کیا۔" بہ حوالہ حیاتِ فریاد ص۲۹۲۔ " دو یکے مثنوی ہا بہ نعمت سراید۔"

تبصرہ مضمون نگار: میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ دونوں سوال خود وہاب صاحب کا اٹھایا ہوا نہیں ہے۔ وہ اُس وقت شاد یا اُن کی تصنیفوں سے بہت کم واقف تھے۔ وہاب صاحب کے پس پردہ کوئی اور شخص رہا ہوگا بہرکیف، اس کا دو جواب ہے۔ ۱۔ تحقیق کا یہ تقاضا تھا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف دریافت کر لیتے کہ "حیات فریاد" کی تصنیف کے وقت، شاد کے پیش نظر "تاریخ نادری" کا کوئی مطبوعہ نسخہ تھا یا نہیں کیوں کہ حیات فریاد کی تصنیف کے وقت شاد نے جتنے خطوط ہمایوں مرزا خلف فریاد کو لکھتے تھے وہ مطبوعہ ہیں اور اُن میں کسی جگہ تاریخ نادری کا ذکر نہیں ہے۔ تاریخ نادری کا ذکر دیباچہ فریاد نے لکھا تھا اور احمد کبیر امتن مدرسہ عالیہ کلکتہ نے تاریخ نادری کے

ساتھ شائع کرایا تھا، وہ حیات فریاد کے آخری صفحات ص ۲۴۱ تا ص ۲۴۶ میں ہے۔

شاد کمتوبات ص ۲۳۱ مکتوب مورخہ ۱۲ جولائی ۱۹۲۵ء ہمایوں مرزا کو لکھتے ہیں "حضرت کی بجز مثنوی "دبستان اخلاق" ہمارے ہاتھ میں کوئی چیز نہیں ہے کہ حضرت جیسے تھے ویسا حضرت کا اصنافِ کلام میں دکھا سکوں۔ یہ کہنا کہ کلام تلف ہو گیا نہایت صحیح ہے مگر اس کی طرف کون اعتنا کرتا ہے"۔ اس خط کا حوالہ وہاب اشرفی "شاد کی نثر نگاری ص ۱۴۹ میں دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر وہاب اشرفی "نثر نگاری" ص ۱۴۱ پر شاد کے دو خطوط کا حوالہ دے کر تحریر فرماتے ہیں:

"مکتوبات شاد عظیم آبادی سے یہ بھی ظاہر ہے کہ شاد حیاتِ فریاد کا مسودہ لکھ کر بھیجتے جاتے تھے اور ہمایوں مرزا کو حک و اضافہ کی اجازت تھی ایسے میں جو اس کتاب میں مواد پیش ہوا خصوصاً زندگی سے متعلق، اس کی ذمہ داری ایک حد تک ہمایوں مرزا پر بھی عائد ہوتی ہے۔"

حیاتِ فریاد ص ۲۴۱ تا ص ۲۴۶ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر میں فریاد کی فارسی نثر کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ یعنی فریاد کا دیباچہ تاریخ نادری جو بہ حسب فرمائش حافظ احمد کبیر ابن مدرسہ عالیہ لکھا گیا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاد نے بالقصد قادری کے اسم نسبتی کو حذف کر دیا تھا یا نہیں۔ دیباچہ "تاریخ نادری" بہ حوالہ حیاتِ فریاد ص ۲۴۵ اس طور سے ہے۔ " اما بعد، فقیر، الفتِ تحریر سید الفت حسین موسوی عظیم آبادی متخلص بہ فریاد" غالباً اس سطر میں بعد موسوی لفظ "قادری" ہو گا۔ میرے پاس "تاریخ قادری" نہیں ہے۔ اگر شاد نے بالقصد حذف کر دیا ہے تو وہ بے شک مجرم ہیں۔ مگر حالات اس کے برعکس ہیں۔ اول: فریاد کا سال رحلت ۱۸۸۱ء ہے اور اس کے چار برس بعد شاد کی کتاب "نوائے وطن" شائع ہوئی یعنی ۱۸۸۴ء میں۔ اس کے ص ۹۹ میں شاد، فریاد کے مذہب کے متعلق لکھتے ہیں[1]

" شاہ صاحب شروع سے صوفی مذہب تھے۔ کوئی فعل سنیوں کی طرح کرتے تھے، کبھی شیعوں کی لز پر، مگر اخیر عمر میں اظہار تشیع کر کے بہ حسب وصیت اسی مذہب پر مدفون ہوئے۔"

تب اس صورت میں کہ "تاریخ نادری" مطبوعہ تھی۔ کیا شاد اس کو محسوس نہیں کرتے تھے کہ اگر میں قادری کے اسم نسبتی کو حذف کر دوں گا، تو تاریخ نادری کے مطبوعہ نسخے ہیں، دوسرے حضرات دیکھ سکتے ہیں۔ فریاد اگر سنی تھے، تو ان کو شیعہ بنانے کا حاصل وہ بھی ان کی موت کے ۴۶ سال بعد، اور خود شاد نوائے وطن میں فریاد کے مذہب کے بارے میں لکھ چکے تھے۔ فریاد کے عقائد مذہبی کے متعلق "حیات فریاد" ص ۱۵۲ کی عبارت ہے: "اس قسم کی تعلیم شیخ المتاخرین حضرت شیخ علی حزیں نے بھی پائی تھی۔ ہمارے استاد حضرت عتیق الرحمٰن فرماتے تھے کہ ہمارے بزرگوں

---

[1] وحید شاگرد فریاد سے غم استاد بے اندازہ فریاد ۱۸۸۱ء۔

میں بھی اسی قسم کا تصوف تھا، اور اسی کو صحیح جانتے تھے اور میں بھی اسی کو صحیح جانتا ہوں۔ راقم کے دادا بھائی خاندان کے تقریباً کل اراکین کا یہی طریقہ رہا اور ہمارے استاد عتیق الرحمٰن بھی اسی قسم کے شیعہ صوفی تھے۔"

محی الدین قادری زور مقدمہ مکتوبات ص۱ پر فرماتے ہیں۔ "دس نومبر ۱۹۲۹ء کو انھوں نے اس کام کو ختم کیا اور ۱۸ دسمبر ۱۹۲۹ء کو اس کے بارے میں آخری خط لکھا اور ۷ جنوری ۱۹۲۷ء میں انتقال کر گئے۔" گویا موت سے کچھ کم دو ماہ پہلے "حیات فریاد" تمام ہوئی۔ اس کتاب کے کاتب صرف شاد ہی نہ تھے، وہ تقریباً نابینا ہو گئے تھے اسہال کبدی میں مبتلا تھے۔ لکھنے میں حروف پر حروف چڑھ جاتے تھے۔ یہ سب "حیات فریاد" کے عرض حال اور "ڈاکونامہ" مطبوعہ کلیات شاد جلد دوم میں درج ہے۔ شاد نے اپنے لکھے ہوئے اجزا کو صاف کرنے، نقل کرنے یا حوالے کی کتابوں کے اقتباسات کو نقل کرنے کے لیے ایک کاتب محمد منظور شرف بہاری کو ۲۰ روپیہ ماہانہ پر ملازم رکھا تھا۔ یہ بہار شریف کے رہنے والے اور سنی تھے اور مولوی امیر حسن نون گولہ کے توسط سے مقرر کیے گئے تھے۔ چنانچہ شاد مکتوب مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۲۶ء (ص۲۶۴) ہمایوں مرزا کو لکھتے ہیں: "میں نے ایک کاتب کو اس لیے رکھا تھا کہ دن کو میرے مسودات یعنی حیات ابد (حیات فریاد) کو صاف کرے اور رات کو میں بکتا جاؤں وہ لکھتا جائے۔ دونوں کام اس سے نہ ہو سکے۔ نہایت جاہل اور کام چور نکلا۔ کجا میری محنت آٹھ گھنٹے دس گھنٹے۔ وہ بھی دھوپ میں ٹٹول ٹٹول کر کتابوں کو دیکھ دیکھ کر کجا وہ جوان دو گھنٹے بھی محنت نہ کر سکا۔" شاد نے بہ حالت مجبوری، مطبوعہ کتابوں کے اقتباسات اُن کے حوالے کیے۔ وہ بھی جب موتیا بند کے علاوہ اسہال کبدی میں مبتلا ہو گئے۔

اگر تاریخ نادری کا مطبوعہ نسخہ شاد کے پاس ہوتا تو منظور شرف بہاری جو سنی تھے لفظ "قادری" کو ہرگز حذف نہ کرتے۔

وہاب اشرفی صاحب مکتوبات شاد پر تفصیل سے تبصرہ فرماتے ہیں، مگر حیاتِ فریاد پر تبصرہ فرماتے وقت اس بات کو قطعی فراموش کر دیتے ہیں کہ کاتب کتاب کون تھا۔ حالانکہ منظور شرف بہاری کا ذکر مکتوبات میں کئی جگہ آیا ہے۔ ملاحظہ ہو ص۲۴: "تجربہ ہونے پر معلوم ہوا کہ یہ حضرت حیات ابد کی سی کتاب کو صاف کرنے کے قابل نہیں۔ نہایت کم سواد بدا ملا ہیں۔" منظور شرف بہاری کے علاوہ علی حیدر رشید ابھی کاتب تھے۔ (مکتوبات ص۱۹۸) دوسرے کاتب (مکتوبات ص۲۰۴) اس سے دو نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ یا تو ہمایوں مرزا یا کسی اور شخص نے کلکتہ مدرسہ عالیہ سے "تاریخ نادری" کے دیباچہ کی نقل شاد کو بھیجی تھی۔ جس کو آخیر میں بطور نمونہ منظور شرف بہاری نے حیاتِ فریاد کے مسودہ میں نقل کر دیا ہوگا۔ کیونکہ نومبر دسمبر ۱۹۲۶ء میں ان کی بینائی بالکل ختم ہو گئی تھی۔ ڈاکونامہ

کا مسودہ انھوں نے زبانی بتا بتا کر امداد اور بہاں کو لکھوایا تھا۔ اگر اس مسودہ میں لفظ "قادری" ہوتا تو منظور شرف بہاری ضرور نقل کرتے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں شاد نے حیات فریاد کا مسودہ بذریعہ رجسٹری ہمایوں میرزا کے پاس بھیج دیا تھا۔ ممکن ہے ہمایوں مرزا نے "قادری" کے لفظ کو حذف کر دیا ہو۔

دوم، جس وقت تاریخ نادری کلکتہ میں چھپی اور فریاد نے اس کا دیباچہ فارسی میں لکھا۔ تو اس وقت ان کا سلسلہ تصوف "قادری" تھا۔ بقول ڈاکٹر وہاب اشرفی مرشد آباد سے تعلق کے بعد فریاد شیعہ ہو گئے تھے تب شیعہ ہونے کے بعد وہ "قادری" کیونکر رہتے جب کہ تصوف سے اُن کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ خواہ قادری ہو، فردوسی ہو، نظامی ہو، چشتی ہو، شیعہ ہونے کے بعد، وہ اپنے صوفی سلسلہ سے خارج ہو جاتا ہے۔ شاد پر منحصر نہیں ہے۔ اگر بجائے شاد خود ڈاکٹر وہاب اشرفی، سوانح فریاد لکھتے تو فریاد کے نام کے بعد لفظ "قادری" کو خارج کر دیتے یا اگر لفظ "قادری" کو رہنے دیتے تو کچھ اور تاویل کرتے۔ تب شاد نے کون سی غلطی کی اگر بالفرض انھوں نے "تاریخ نادری سے دیباچہ کو نقل کیا تھا۔ مولفؔ شاد، حک و اضافہ ہمایوں مرزا کا اور کاتب منظور شرف بہاری وغیرہ۔ تب صرف شاد کیوں پکڑے جاتے ہیں۔ واہ! تب ایسی حالت میں بغیر حالات کو صحیح طور سے جانچے ہوئے۔ شاد کے خلاف مذہبی تعصب کا الزام لگا دینا وہ بھی دوسرے کی غلط بینی کے سبب، وہاب اشرفی کے سے نقاد کے لیے بالکل زیبا نہیں ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے حیات فریاد پر کڑی نکتہ چینی کی ہے، مگر انھوں نے اپنی کسی تحریر میں شاد کے خلاف ایسا غلط الزام نہیں لگایا ہے، کیونکہ وہ شاد کے ہم صحبت رہ چکے تھے۔ اور شاد کے ذاتی عقائد سے واقف تھے۔

۲۔ رہا دوسرا الزام، نثر نگاری ص ۱۷۶۔ تو جواب ملاحظہ ہو: "۲ فریاد کی مثنوی سے

"در یکے مثنوی ہا بہ نعمت سراید"

مجھ کو معلوم نہیں کہ اس مثنوی میں کل کتنے اشعار تھے۔ "حیات فریاد" ص ۲۹۳-۲۹۴ میں شاد نے اس کے ۲۶ منتخب شعار پیش کیے ہیں۔ وہاب صاحب کا الزام ہے کہ اس مثنوی میں نو ایسے بھی اشعار تھے جو خلفائے ثلاثہ کی تعریف میں تھے۔ اور بہ سبب تشیع شاد نے ان کو بالقصد خارج کر دیا۔ کسی کو مطعون کرنا نہایت آسان ہے مگر حالات کا جانچنا نہایت دشوار۔ وہاب صاحب نے "تاریخ نادری کے دیباچہ کا حوالہ دیا ہے۔ مگر خود فریاد نے دیباچہ لکھتے وقت وہاب صاحب کے پیش کردہ نو اشعار کو دیباچہ میں درج نہیں کیا تھا۔ جبکہ اس وقت وہ سنی تھے۔ دیباچہ میں انھوں نے اسی مثنوی کے صرف تین اشعار درج کیے تھے سہ شہ خورشید چتر انجم سپاہی ــ الخ اور دو بیت، بس۔ تب شاد پر

تتمہ شاد کی کہانی ص ۲۷۲ مسلم عظیم آبادی۔

کس بات کا الزام؟

شادؔ کے پاس اگر مثنوی ہوتی اور وہ بالقصد اِن اشعار کو حذف کر دیتے، تب وہاب صاحب کا اعتراض درست ہوتا۔ شادؔ نے خود لکھا تھا جیسا کہ عرض ہوا کہ اُن کے پاس فریادؔ کی بجز" دلبستانِ اخلاق "کوئی اور کتاب نہ تھی۔

مطبوعہ "حیاتِ فریادؔ"، ۳۵۵ صفحوں کی ہے۔ نہ جانے مسودہ کی حالت میں اس کے کتنے صفحے تھے۔ مختصر کرنے پر بھی صرف مثنویوں پر تبصرہ ۸۴ صفحات میں ہے۔ ص۲۷۸ تا ص۳۲۳۔ فریادؔ کی ۱۲ مثنویاں فارسی میں تھیں، اور شادؔ کو جس جس بحر میں مثنوی لکھی گئی تھی، سب کو پیش کرنا تھا اور ان کا موازنہ دوسرے فارسی گو شعرا کے کلام سے کرنا تھا۔ مثلاً ۱۔ مثنوی در بحر رمل کہ بر سبک شیخ نظامی ارشاد کردہ ۲۔ مثنوی بطرز شاہ ناصر علی ہندی ۳۔ مثنوی جس کے ارکان مربع تھے۔ ۴۔ مثنوی بطرز نل و دمن فیضی ۵۔ مثنوی دبستانِ اخلاق بطرز سعدی۔

فریادؔ کے حقیقی بھانجے ہادی علی خاں تھے اور ہادی علی خاں کے صاحب زادے احمد علی خاں مرحوم نے "حیاتِ فریادؔ" کی تقریظ لکھی ہے۔ "حیاتِ فریادؔ" ص۳۵۵ پر لکھتے ہیں: "حضرت (شادؔ) کا سن شریف ۸۲ سال کا تھا۔ یہ وہ زمانہ اور وہ عمر ہے کہ دوسروں سے اس وقت ہلا نہیں جاتا۔ مگر حیاتِ فریاد جیسی کتاب کا مرتب و مدون کرنا، وقائع کا جمع کرنا، تاریخ و سنین کا لحاظ رکھنا، حضرت فریادؔ کے خصوصاً ایسے کلام کو جو اساتذہ سابق کے ہم قالب و ہم ذہن ہیں، اپنی یاد سے جمع کرنا، اور ان پر تبصرہ کرنا، پھر ترتیب کی خوش اسلوبی، یہ باتیں ایسی ہیں کہ بڑے بڑے باکمال جن کی معلومات وسیع... اگر ایسی کتاب تالیف کریں تو گھٹنے زمین پر ٹیک دیں۔"

تب وہ تو اشعار اگر چھوٹ گئے تو شادؔ نے کون سا گناہ کیا۔ اس سے یہ کیسے ثابت ہوگا کہ پوری مثنوی شادؔ کے پیش نظر تھی، اور انھوں نے بالقصد ۹ اشعار کو حذف کر دیا۔ کیا شادؔ اس بات کو نہ جانتے تھے کہ یہ مثنوی مطبوعہ ہے۔ دوسرے حضرات بھی پڑھ سکتے ہیں۔ تب بالقصد حذف کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ یوں اگر کوئی اپنی لاعلمی سے شادؔ کو مطعون کرے تو یہ قصور اس کا نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس شخص کا جو ایسی تحریر کے پس پردہ ہو۔ شادؔ لوگوں سے فریادؔ کے اشعار کی نقلیں مانگ کر اپنی تالیف کو مرتب کرتے تھے۔ اگر کسی نے کم اشعار بھیجے تو شادؔ کا کیا قصور تھا؟

شادؔ نے اپنی آخری تصنیف "حیاتِ فریادؔ" میں اپنے مذہب کو واضح کر دیا ہے کہ جناب فریادؔ کی طرح وہ صوفی شیعہ تھے۔ اپنے عقیدہ کا سلسلہ شیخ علی حزیںؔ بنارس سے ملایا ہے اور شاعری کا سلسلہ حضرت خواجہ میر دردؔ سے۔ مکتوبات شادؔ ص۱۴۶ کی عبارت ہے: "مجھ کو فخر ہے کہ میرا سلسلہ خواجہ صاحب تک ہے۔"

مذہب شیعہ اور تصوف: اس عنوان سے شادؔ کا طویل مقالہ "حیات فریادؔ" میں ص۱۲۳ سے ص۱۴۴ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی مقالہ بہ تغیر الفاظ فکرِ بلیغ جلد دوم میں حالات مرزا فصیحؔ کے ساتھ بھی تھا جس کو میں نے پیمبرِ سخن" مطبوعہ لاہور ۴، ۱۹۷۶ء میں بہ سبب طوالت و سہولت نقل حذف کر دیا تھا، مگر میں نے اس کو "فکر بلیغ" جلد دوم مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ میں رہنے دیا ہے، وہاب صاحب دیکھ سکتے ہیں۔ اس مقالہ کے متعلق وہاب صاحب "نثر نگاری" ص۱۶۳ پر قلم فرسائی کرتے ہیں: "شادؔ نے اس باب میں مذہب شیعہ اور تصوف کی ایک ضمنی سُرخی کے تحت تصوف کی اہمیت پر اکیس ۲۱ صفحات پر مشتمل ایک مقالہ لکھا ہے۔ مختلف قسم کے حوالے براہین اور دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ مذہبِ شیعہ میں بھی تصوف ابتدا سے جاری ہے، اور یہ اس عقیدہ کے کسی طرح بھی منافی نہیں ہے۔ دراصل اس طویل مقدمہ کا پس منظر یہ ہے کہ فریادؔ سے تصوف کے رشتہ کو شیعیت کے خلاف تصور نہ کیا جائے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ شادؔ کو اس بات پر اصرار ہے کہ ان کا سلسلہ تلمذ دردؔ تک جاتا ہے۔"

تبصرۂ مضمون نگار: وہاب صاحب کیا خوب اس مقالہ کے مفہوم کو سمجھے۔ ان کی سمجھ اور دانست قابل داد ہے۔ میں نے فکر بلیغ جلد دوم کا قلمی نسخہ جو حروفِ شادؔ میں تھا، وہاب صاحب کے حوالے کر دیا تھا جس کا انھوں نے اعتراف "نثر نگاری" ص۱۲۳ میں بہ ایں الفاظ کیا ہے: "میرے سامنے شادؔ کے دستِ خاص کا ضخیم مسودہ موجود ہے۔" اس کے بعد بھی غلط اعتراض کر بیٹھے۔ "حیات فریادؔ" میں اس مقالہ کو پڑھ کر یہ سمجھے کہ اس مقالہ کا مطلب ہے کہ فریادؔ سے تصوف کے رشتہ کو شیعیت کے خلاف تصور نہ کیا جائے۔ مگر یہی مقالہ میرزا فصیحؔ لکھنؤ کے حال کے ساتھ فکر بلیغ میں موجود تھا۔ اور میرزا فصیحؔ مقلد و شاگردِ مولوی سید دلدار علی غفراں مآب بانیٔ تشکیل جدید مذہب اثنا عشری لکھنؤ تھے۔ زمانہ ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۱ء جنھوں نے اپنی تصنیف "شہاب ثاقب" میں صوفیہ کو بہ عقیدۂ وحدتِ وجود کو کفر اور چادر کشی کو حرام ٹھہرایا تھا (بہ حوالہ مضمون سید محمد باقر شمس لکھنوی، رسالہ نگار پاکستان شمارہ اگست ۱۹۶۷ء) اور مولوی دلدار علی کے صاحبزادے سید العلماء میرن صاحب کے شاگرد مفتی میر عباس صاحب (زمانہ میر انیس) نے اپنی مثنوی میں نظم فرمایا تھا۔ (بہ حوالہ شعر العجم شبلی نعمانی حصہ پنجم) ؎

این کلامِ صوفیانِ شوم نیست　　　مثنویِ مولوی رومِ نیست

اسی مقالہ میں شادؔ مولوی دلدار علی مرحوم کے متعلق کیا لکھتے ہیں، ملاحظہ ہو "حیاتِ فریادؔ" ص۱۵۱۔ "جس زمانہ میں جناب غفراں مآب مولانا سید دلدار علی مغفور تحصیل علوم دینی کے لئے عراق تشریف لے گئے تھے، تو علمائے باطن میں سے ایک بھی عراق و ایران میں نہ تھا۔ . . . حضرت غفراں مآب جو سبق وہاں سے پڑھ آئے تھے۔ یہاں کے شیعوں نے

طوطوں، میناؤں کی طرح رٹنے شروع کر دیئے پھر میر انیس مرحوم کے اس مصرعہ کو "جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے" خلاف شریعت کیوں نہ سمجھا جاتا۔"

تب اس مقالہ کا تعلق صرف فریاد سے کیوں کر ہو سکتا ہے۔ جو سنی تھے، پھر صوفی اثنا عشری ہوئے۔ جب کہ فکر بلیغ جلد دوم میں یہی مقالہ میرزا فصیح کے حال میں درج ہے۔ مشکل یہ ہے کہ وہابی صاحب خود تصوف کی ماہیت اور حقیقت سے واقف نہیں ہیں اور لگے شاد پر غلط اعتراض کرنے۔

وہابیت شرفی پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ عام طور سے لوگ، تصوف اس کو سمجھتے ہیں جو خانقاہ کے کسی صوفی گھرانے سے وابستہ ہو۔ اس کا احساس کر کے میں نے نہایت مختصر طور سے "شاد کا عہد اور فن" حصہ اول ص۲۱۲ تا ص۲۱۸ میں شاد کے تصوف سے صد ہے۔ میر عباس شستری فرماتے ہیں سہ " ایں کلام صوفیان شوم۔ الخ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا جو مولانا شبلی کا تھا مگر عمر فروخ ڈکتور پروفیسر ادبیات عربی و فلسفہ بیروت یونیورسٹی کی کتاب " التصوف فی الاسلام " کے پڑھنے کے بعد میرا خیال بالکل بدل گیا۔ ان کے خیالات، شاد کے خیال کی تائید کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں ایک مضمون زمانہ ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ کے کسی پرچہ میں ایک شیعہ عالم کا چھپا تھا۔ نام سہو کر رہا ہوں، جس میں انھوں نے تصوف پر اظہار خیال کیا تھا، اس مضمون کے اقتباسات مولانا جابر مرحوم باشندہ موضع چندن پٹی ضلع دربھنگہ سے پرچہ کو مانگ کے نوٹ کر لیے تھے۔ افسوس کہ مضمون نگار کا نام میرے نقل کردہ پرچے سے کشاکش سفر کی وجہ سے پھٹ گیا۔ ان کا قول درج ہے

"امام جعفر صادق علیہ السلام صوفی کی تعریف میں فرماتے ہیں: "جو باطنِ رسول پر زندگی بسر کرے وہ صوفی ہے۔"

ایک ایراد یہ بھی ہے کہ مصادر تصوف غیر اسلامی ہیں۔ مسیحی یونانیوں اور ہندوؤں کے تصوف پر اسلامی تصوف کی بنیاد ہے۔ گویا اس نظریہ سے امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے اس کی نفی مطلوب ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ محققین کو اس کا اعتراف ہے کہ مصادر تصوف اسلامی خالص اسلامی ہیں"۔ پھر تحریر فرماتے ہیں: " البتہ علی ابن ابی طالب کو اس تصوف سے کوئی لگاؤ نہیں جو صوفیانِ شوم کے لباس میں دنیا میں ظاہر ہوا، اور در اصل جس کی تاسیس بحیثیت ایک ادارہ، اہل بیت رسولؐ کی مخالفت میں اموی و عباسی حکومتوں کے زیر سایہ ہوئی اور جن کے دغل و فریب کا مرقع ابن جوزیؒ نے "تلبیس ابلیس" میں پیش کیا۔"

مضمون نگار: ابن جوزی علمائے اہل سنت میں تھے۔ یہی خیال علامہ نیاز فتحپوری نے نگار معلومات نمبر جنوری، فروری ۱۹۵۸ء ص۳ میں بہ عنوان "مولوی طبقہ" ظاہر کیا ہے۔ مولوی طبقہ کے متعلق علامہ نیاز فتحپوری

تحریر کرتے ہیں: " اس جماعت کا رقص خاص چیز ہے اور اہل مغرب اسے " رقاص جماعت " کے نام سے موسوم
ہیں . . . جلال الدین رومی نے اس کو زیادہ اہمیت دی اور اس کا سبب " مناقب العارفین " میں یہ بیان
ہے کہ ایشائے کوچک کے لوگ لہو و لعب کے زیادہ شائق تھے ۔ اس لئے ان کو متوجہ کرنے کے لئے جلال الدین رومی
رقص و سرود کو زیادہ اہمیت دی . . . جب سلطان سلیم اوّل نے قونیہ (ترکی کے شہر) پر حملہ کیا تو اس نے شیخ
الاسلام کے فتوے کے مطابق مولوی خانہ (مولویہ جماعت کی خانقاہ) کو مسمار کر دیا۔"

علامہ اقبال نے صوفیہ کی خوب خوب دھجّی اڑائی ۔ چنانچہ پروفیسر سلیم چشتی شرح ارمغان حجاز مطبوعہ ۱۹
ص۲۲۹ میں اقبال کی نظم ۱۹۱ کی شرح میں لکھتے ہیں " بنوامیہ اور بنو عباس نے اس صحیح علم کو دنیا سے مٹاد
اور اس کی جگہ غیر قرآنی تصورات (جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) علمائے سو کے ذریعہ اور تلوار کے زور
اور دولت کے لالچ سے مسلمانوں میں رائج کر دیئے۔

خود شاد نے اس مقالہ " مذہب شیعہ اور تصوف " پر جو تبصرہ مکتوبات ص۱۸۵ پر کیا ہے ۔ اس پر
وہاب صاحب کی نظر نہیں پڑی اور اگر نظر پڑی تو اس کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہے ۔ شاد لکھتے ہیں: "تقیہ
کی بحث قابل دید ہے ۔ پھر تصوف کی بحث خاص کر شیعوں کو نہایت مفید ہے اور ہدایت نامہ ہے ۔ سنّیوں کے
لیے الگ دستور العمل ۔"

شاد نے اقبال کی طرح صوفی و ملّا کی دھجیاں نہیں اڑائیں ۔ مگر معرفت الٰہی اور اسلامی تصوف کو جیسا
قرآن اور اسلام میں ہے بہ استعات اپنے کلام میں نہایت موثر طریقے سے پیش کیا ہے ۔ اس لیے ان کی غزلیں مقبول
ہوئیں، جبکہ اقبال نے بجائے صحیح طور سے الٰہیات و معرفت الٰہی کو پیش کرنے ، اپنی طرف سے اور نطشے اور برناڈ شا
کے خیالات سے متاثر ہو کر ان کے " فوق البشر " super man کو بہ شکل " مرد کامل " پیش کیا ہے ۔ اور ملٹن کی نظم
" فردوس گم شدہ " سے متاثر ہو کر ابلیس والی نظمیں لکھی ہیں، جن کا کوئی تعلق اسلامی خیالات سے نہیں ہے ۔ شاد کی استعارہ
کی شاعری ہے، اور ایک ایک شعر کے مختلف معنی ہوتے ہیں ۔ جن صاحبوں کی نظر مولانا مناظر احسن گیلانی کے مضمون
" شاد متکلم اسلام " پر پڑی ہوگی ، وہ میرے خیالات کی تائید فرمائیں گے ۔ حد ہے کہ خود جمیل مظہری مرحوم نے
شاد کے بعض اشعار کے مفہوم کو سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے ، جس پر میں نے تبصرہ " شاد کا عہد و فن " حصّہ دوم
میں کر دیا ہے ۔

مولوی دلدار علی مرحوم نے تو چادر کشی کو حرام قرار دیا مگر ۱۹۲۲ء میں شاہ اقبال مرحوم لودی کٹرہ کے

مشاعرہ کی طرح غزل میں شاد یہ شعر پڑھتے' جو اس وقت بھی زبان زد عوام و خواص ہے۔ سہ

پردہ پوشانِ وطن تم سے تو یہ بھی نہ ہوا　　　ایک چادر کو ترستی رہی تربت میری

اور جب ۷ جنوری ۱۹۲۷ء کو ان کی رحلت ہوئی تو حسب وصیت مولانا حافظ عبدالغنی مرحوم مصنف "گوہر مقبول" پیش امام مسجد مدرسہ نے ۸ جنوری کو اُن کی نماز جنازہ بطریق حنفی پڑھائی۔ یہ کل باتیں میں نے "یادگار شاد" اور مقدمہ "بادہ عرفان" میں لکھدی ہیں جو و　　با شرفی دیکھ چکے تھے۔ یہی نہیں بعد رحلت شاد، قل و فاتحہ خوانی سالوں سال بطریقہ حنفی اُن کے مزار مبارک پر ہوتا رہا۔ اگر باوجود ان باتوں کے کوئی شخص الزام تراشی پر آمادہ ہو، تو اس کو کون روک سکتا ہے۔

۳۔ شاد کی تذکرہ نگاری: اسی سلسلے میں وہاب صاحب اپنی کتاب صفحہ ۲۳ پر "فکر بلیغ جلد دوم" میں شاد کی اس روایت کو مجہول بتاتے ہیں جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ مرنے کے دو دن پہلے جب میر انیس کی ملاقات کو میرزا ہادی حسین گئے، تو میر انیس نے کہا، "ہائے دادا جان کے اس شعر کا جواب نہ ہو سکا۔ اور وہ شعر یہ تھا سہ

فقیرانہ آئے صدا کر چلے　　　میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

شاد نے صرف "دادا جان" استعمال کیا ہے۔ میر حسن کا نام نہیں آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مطلع میر تقی میر کا ہے، جو زبان زد عوام و خواص ہے۔ شاد اتنے نابلد نہ تھے کہ میر حسن اور میر تقی میر کے کلام میں فرق نہ کرتے۔ میر حسن اور میر تقی دونوں آپس میں دوست تھے۔ میر خلیق، پدر انیس، میر تقی میر کا نہایت ادب کرتے تھے اور چچا کہہ کر مخاطب کرتے تھے چنانچہ میر انیس بہ تقلید پدر میر تقی میر کو دادا جان کہتے تھے اور میر انیس کو میر تقی میر کا بہت سا کلام یاد تھا۔ چنانچہ مؤلف "یادگار انیس" امیر احمد علوی صفحہ ۱۰۱ پر لکھتے ہیں: "جناب عشق میر صاحب کے ایک ہم عصر شاعر اور رشتہ دار تھے اتفاق سے کچھ بے لطفی ہو گئی۔ ایک روز جناب عشق کا ذکر آیا۔ میر صاحب برافروختہ ہو رہے تھے۔ فرمایا عشق کو خوب جانتا ہوں۔ ان کو پہلے ایک بات نکالنا اور پھر رونا دھونا خوب آتا ہے سہ

عشق ہے تازہ کار، تازہ خیال　　　ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

کہیں آنسو کی یہ روایت ہے　　　کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے

یہ اشعار میر تقی میر کے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع کے لئے کہے گئے تھے۔" شاد کی بس اتنی غلطی تھی کہ مطلع کے پہلو میں ان کو میر تقی میر لکھ دینا تھا۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ ان کے بعد ایسے ایسے نقادانِ فن پیدا ہوں گے۔

لہ شاد کی نثر نگاری صفحہ ۴۲۔

۲۔ میر ضمیر۔ نثر نگاری ص۲۴۲ پر وہاب صاحب تحریر فرماتے ہیں: "یہاں بھی شاد سے سہو ہوا ہے میر ضمیر کو ان کی طرف سے کوئی تعلق ساداتِ بارہہ سے نہ تھا" ان کا سلسلہ خواجہ باسط سے تھا۔"

مضمون نگار: ڈاکٹر صاحب اپنی "نثر نگاری" میں کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیتے ہیں۔ نہ جانے کس نے ان کو یہ غلط بات بتادی۔ زیدی سادات کی دو شاخیں ہیں۔ ایک تو زیدی اور دوسرے "زیدالواسطی" جو عیلیے مؤتم الاشبال کی اولاد میں ہیں۔ سادات بارہہ کے مورث اعلیٰ سید ابوالفرح واسطی بعہد سلطان محمود غزنوی وارد ہندوستان ہوئے تھے۔ شاد کی دادی اور پردادی کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ سید مظفر حسین ضمیر ساداتِ بارہہ سے نہ تھے۔ ان کا اصل وطن پنگوڑ ضلع گوڑگاؤں تھا جو علاقائی اعتبار سے ساداتِ بارہہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اس قصبہ کے سادات زیدی تھے۔ مگر سادات بارہہ کے مورثِ اعلیٰ سید ابوالفرح واسطی سے کوئی نسبی رشتہ نہیں رکھتے تھے۔

۲

خواجہ باسط خلف خواجہ جعفر خلف خواجہ قاسم (آگرہ) تھے۔ اور ان کا کوئی تعلق سادات بارہہ سے نہ تھا خواجہ قاسم کی دختر سے شاد کے جد اعلیٰ سید دانشمند منسوب تھے۔ (بہ حوالہ بیمبران سخن نوٹ صفدر حسین ص۵۴ اور تذکرۃ الاسلاف مؤلفہ شاد)۔ شاد سے صرف اتنی غلطی ہوئی تھی کہ میر ضمیر کو انھوں نے سادات بارہہ میں شمار کیا تھا، جبکہ وہ صرف زیدی تھے۔

۳۔ سید علی اکبر خاں۔ نثر نگاری ص۱۵۹۔ یہ شاد کے اجداد میں نہ تھے، بلکہ بزرگوں میں۔ ملاحظہ ہو "شاد کا عہد و فن" نسب نامہ ص۱۹۔

۴۔ شاد کی مکتوب نگاری: "نثر نگاری" کے اس حصّہ کی بھی وہی حالت ہے اور قاضی عبدالودود کے غلط اعتراضوں کا جا بجا حوالہ دیا گیا ہے۔ قاضی صاحب کے اعتراضوں کا جواب کچھ تو "شاد کا عہد اور فن" میں دیا گیا ہے اور باقی حصّہ دوم میں جو زیر طباعت ہے۔

اب ملاحظہ فرمائیے۔ شاد کی نثر نگاری ص۲۱۸ "مثلاً مکتوب یادگار شاد . . . انھیں زیر بحث لانا اس مضمون کو فقط طول دینا ہے۔" ان دو سطروں کے علاوہ وہاب صاحب نے کسی جگہ مکتوب شاد مطبوعہ "یادگار شاد" کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ درانحالیکہ یہ خط شاد کے دینی عقائد کے معاملہ میں اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ور ان کی دینی رواداری کا آئینہ دار ہے۔ اس خط کا پہلے تعارف کرتا چلوں جو مختصراً "یادگار شاد" میں موجود ہے۔ ں مضمون میں تفصیل سے عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

زمانہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں جناب تمنا عمادی پھلواری شریف اور ارکانِ امارتِ شرعیہ سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ مولوی تمنا نے ایک طویل قطعہ نظم کر کے شائع کرایا تھا جس میں ارکانِ امارت شرعیہ کی شان میں گستاخی تھی۔ شاد کے شاگردوں میں ان کے عزیز نذیر حسین شائق نون گولہ اور معین الدین قیسی، پھلواری شریف کے مرید تھے۔ ان دونوں کو مولوی تمنا کی بے ادبی بری لگی اور قیس نے جوابی منظوم رسالہ شائع کیا۔ جواب اور جواب الجواب منظوم پرچے شائع ہوئے۔ سب پرچوں کے نام تو یاد نہ رہے، دو پرچے جو راقم کے گھر کے پریس میں چھپے تھے، اُن کی سرخی تھی "اپنے منہ میاں مٹھو" اور "میاں مٹھو کی ٹیں ٹیں" اس زمانہ میں قیس مرحوم، شاد کے پریس کے نگراں تھے اور وہی بہ سلسلۂ اشاعت کلامِ شاد قاضی عبدالودود صاحب کے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔ (کلیات شاد، جلد دوم قاضی عبدالودود صـ۷۰۲) اشعار کے قوافی تھے، ارماں، امکاں وغیرہ اور ردیف امارت۔

جب قیس مرحوم نے جناب تمنا کی اچھی طرح سے خبر لی تو تمنا صاحب گھبرائے، اور ان کو شک ہوا کہ قیس شاد سے اشعار کہلواتا ہے۔ چنانچہ ایک جوابی پرچہ میں انھوں نے شاد کو بھی لپیٹ لیا اور شاد کو بدنام کرنے کیلئے شاد کے مشہور شعر

جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا — ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا

کے مضمون کا ایک جعلی شعر نور الحق تپاں کے نام سے نظم کیا اور شائع کیا اور شاد پر سرقہ کا الزام وارد کیا کہ شاد نے نور الحق تپاں کے شعر کا سرقہ کیا ہے۔ وہ جعلی شعر تھا ؎

ہوش والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا — بیٹھا منہ پھیر کے ہنستا ہے دیوانہ تیرا

جناب عطاء الرحمٰن صاحب نے جو واقعہ مطالعۂ شاد صـ۲۷ میں لکھا ہے غلط ہے۔ شاد اس زمانہ میں اپنے دیوان اور نقش پائیدار وغیرہ تصنیفوں میں الجھے ہوئے تھے۔ ان کو اس معاملہ کی خبر نہ تھی اور نہ انھوں نے کسی منظوم پرچہ کو دیکھا۔ یہ منظوم پرچے یا تو صادق حسین نہال کے گھر پر لکھے جاتے تھے یا نون گولے میں، یہاں تک کہ شاگردوں میں سے کسی نے شاد کو اطلاع دے دی کہ میاں قیس کے باعث آپ کی رسوائی ہو رہی ہے۔ چنانچہ آپ نے قیس صاحب سے پوچھا تو پورا حال کھلا[1]

"شاد کا عہد و فن" حصہ اول صـ۹۹ پر لکھ چکا ہوں کہ شاد کے خسر میر سنگی جان مرحوم پھلواری شریف کے تھے اور ان کے چچا سید علی اعظم حنفیؒ مذہب پھلواری شریف ہی میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی حاجی گنج میں بھائی اور بھتیجے کے یہاں مقیم ہوتے تھے۔

---

[1] بہ حوالہ گلشن شاد، شاد کی نثر نگاری۔ صـ۲۲

میر سنگی جاں مرحوم اور مغل پورہ کے مولانا سید حسرت سے یارانہ تھا۔ چنانچہ بعد وفات میر سنگی جاں مرحوم حسرت نے ان کی تاریخ رحلت نظم کی ہے ؎

حسرت چو طلب کردم، ایں واقعہ تاریخ
دل گفت زدود آہ، سنگ آمد وسختا آمد "۱۲۷۸ھ"

اس وقت تک شاد کے بعض سسرالی عزیز بقید حیات تھے جو پھلواری شریف میں رہتے تھے اور تقریبات و مشاعرہ کے موقع پر نوید پاکر شاد منزل میں آتے تھے۔ جیسا کہ کلیات میر عنایت حسین امداد" میں درج ہے۔

شاد نے حسب عادت قیس کے معاملے میں الجھنا پسند نہ کیا، اور ایک خط پھلواری شریف کے کسی بزرگ کے نام لکھا۔ اس خط کا مسودہ مجھے زمانہ ۱۹۵۲ء میں جب میں مراثی شاد جلد اول شائع کرا رہا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی نقل "یادگار شاد" میں دے دی۔ ملاحظہ ہو، مکتوب شاد مطبوعہ "یادگار شاد" :

> " پھر ایک نظم سنائی (یعنی قیس نے) جو مولوی تمنا صاحب کی تھی۔ ہر چند مجھ کو امارت سے کچھ بحث نہیں ہے، مگر پھلواری شریف کے بزرگوں کا مجھ پر احسان ہے۔ میری نانی کے باپ علامہ ابراہیم خاں کی پگڑی وہیں بندھی اور مشہور آفاق ہوئے۔ راقم اگرچہ اپنی کم سعادتی سے بہت کچھ محروم رہا، مگر جس اخیر زمانہ میں حضرت مولانا و استادنا جناب مولوی سید علی اعظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے علاج نقرس کے لیے پھلواری شریف سے اس محلہ میں متفرق زمانہ میں تین برس تک مقیم رہے، حضرت ممدوح راقم کے خسر صاحب کے بہت قریب کے بھائی (چچا) تھے۔ نہایت شفقت سے راقم کو درس دینے لگے ... اور حضرت کا خیال تھا کہ پھلواری شریف میں دستار بندی کا جلسہ کروں گا، مگر یہ حسرت رہ گئی دفعتہً اچھے ہو کر یکسر مرض ہوا اور راقم کو اپنے ہمراہ لے کر پھلواری شریف چلے گئے۔"

... شیخ رحم علی مرحوم راقم کو اپنے ہمراہ پھلواری شریف لے جایا کرتے تھے۔ اکثر عرس و محرم میں دو دو دن قیام رہتا تھا ... ان بزرگوں کی محبت، شفقت، تہذیب و آداب و اشغال علمیہ ... کو کیونکر بھول سکتا ہوں علی الخصوص مولانا شاہ سلیمان صاحب دام ظلہٗ اور مولانا و مخدومنا جناب شاہ بدرالدین صاحب رحمہا اللہ علیہ کا میں بیحد ممنون ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ اس نظم کے اشعار اگر وہ مولوی تمنا صاحب کے ہیں، تو بے موقع ضرور ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے کسی اور مفہوم سے کہے ہوں اور شرح کہنا بھول گئے ہوں، مجھ کو پسند نہ آئے۔ لیکن قیس صاحب نے جب اس کے جواب والی نظم پڑھی، تو شعر سن کر میں نے پوچھا کہ آپ کس نقطۂ نظر سے پڑھ رہے ہیں۔

٭ تاریخ نادری کے مولف میرزا مہدی خلف میرزا غلام حسین خلف اسمٰعیل قلی خاں فوجدار مونگیر، شاد کی نانی کے باپ مرزا ابراہیم کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے۔

آپ تو جانتے ہیں کہ میں اپنے بارے میں جواب نہیں دیتا، چہ جائیکہ اس قسم کی نظموں پر نظرثانی کروں . . . وہ طول ہو کر چلے گئے۔"

یہ تھا شاد کا مذہب، اس لیے بالقصد "نثر نگاری" میں اس خط کا اقتباس پیش نہ کیا گیا، کیونکہ ایک دو جگہ اُن کو متعصب شیعہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا۔

زمانہ گذرتا گیا۔ میں بچہ سے جوان ہوا، اور اپنے خاندان کا پہلا ایم۔ اے ہوا۔ ملازمت میں داخل ہو کر کس کو فرصت تھی کہ اس لاحاصل کام میں پڑتا۔ جب سب طرف سے مایوسی ہوئی تو اپنے حلال کے پیسے سے جہاں تک ہو سکا، میں نے شاد کی تصانیف کو تلف ہونے سے بچا لیا۔ یہاں تک کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میں نے مقالات قاضی عبدالودود کو مول لیا، اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مقالات میں قاضی عبدالودود صاحب نے ص۲۳ میں شاد کی طرف سے جواب دیا ہے۔

قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں: "پہلا شعر دراصل شاد عظیم آبادی کا ہے سہ جب اہل ہوش ۔ الخ . . . لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ جناب تمنا نے جو مثنوی تپاں کے نام سے لکھی ہے، وہ اُن کی ہو ہی نہیں سکتی، اگر مثنوی جعلی ہے تو غزلیں بھی جعلی ہو سکتی ہیں۔"

مسلمانوں کے درمیان اسباب نفاق: وہابی تحریک ۱۸۲۴ء میں شروع ہوئی اور زمانہ ۱۸۵۰ء لغایت ۱۸۸۰ء یہ بام عروج پر تھی۔ تمام تاریخیں شاہد ہیں۔ چنانچہ وہابی تحریک کے زور کو توڑنے کیلئے انگریزوں نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ تو عرض کیا جا چکا کہ مولوی دلدار علی مرحوم نے ۱۷۸۱ء میں شیعہ عقائد کی تشکیل جدید لکھنؤ میں کی تھی اس زمانہ میں آمد و رفت کے وسائل نہایت محدود تھے۔ ریل جاری نہیں ہوئی تھی، اور بہت کم اخبار محدود تعداد میں نکلتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۱۱ء میں جب آقا احمد بہبہانی پٹنہ بذریعہ کشتی تشریف لائے تو انھوں نے اپنے سفرنامہ "مراۃ الاحوال" میں پٹنہ کے متعلق لکھا ہے کہ یہاں شیعہ و سنی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ سفرنامہ کتب خانہ خدا بخش خاں میں موجود ہے۔ زمانہ ۱۷۸۱ء لغایت ۱۸۸۷ء شیعہ سنی دونوں فرقوں میں آپس میں شادی بیاہ ہوتا تھا۔ مرنا جینا، نماز، جمعہ و جماعت دونوں کا ایک ساتھ ہوتا تھا۔ مولوی دلدار علی مرحوم کی تحریک کا اثر پٹنہ میں ۱۸۵۹ء کے بعد پڑنے لگا۔ جب میرزا دبیر اور میر انیس دونوں ایک ساتھ بذریعہ اسٹیمر پٹنہ میں وارد ہوئے۔

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد انگریزوں کے اشتعال سے الہ آباد میں ۱۸۸۷ء میں واقعہ خلیفہ بلافصل رونما ہوا۔

(بہ حوالہ تاریخ العلماء۔ احوال آغا صاحب ابن زین العابدین صاحب الہ آبادی ص۲۷ مولفہ محمد حسین نوگانوی)۔

اور یہ معاملہ الہ آباد کے انگریز ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں ۱۸۹۰ء تک چلتا رہا۔ اس زمانہ کے انگریز پرست اخباروں نے اس واقعہ کو رنگ دے دے کر چھاپا۔ ۲۰ دسمبر ۱۸۹۰ء کو جج لیٹ صاحب نے اپنے مقدمہ کا فیصلہ سنایا اور اذان میں خلیفۂ بلا فصل کی عام اجازت دے دی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ریل کی سواری کے جاری ہونے سے تمام خبر پھیل گئی اور شیعہ سنّی دو فرقوں میں بٹ گئے۔ شادؔ نے اسی زمانہ میں ایک رباعی کہہ کر اکبر الہ آبادی کو بھیجی تھی جو کلیاتِ شادؔ جلد دوم میں شائع ہو گئی ہے

ناحق پھیلا رہے ہیں جھگڑے مہمل | غیرت نہ رہی دیں میں کیوں ہو نہ خلل
بے فصل خلیفہ، پیمبرؐ تھا کون | یہ مسئلہ اور کریں نصاریٰ[۱] فیصل

۱۸۸۴ء میں جیسا کہ عرض کیا گیا انگریز صحافی ولفرڈ سوان بلنٹ پٹنہ آیا تھا اور اس نے نواب بہادر کی کوٹھی میں ایک مسلم یونیورسٹی کے قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس میٹنگ میں قاضی رضا حسین مرحوم، نورالہدیٰ مرحوم وغیرہ شریک تھے جن کا ذکر بلنٹ نے کیا ہے۔ اس میٹنگ کا اثر شمس العلماء مولوی محمد حسن مرحوم (احمد مرحوم کے بھانجے) پر بہت ہوا، اور انھوں نے دو وایڈیشن کر کے ۱۸۸۴ء میں محمڈن اسکول کو جاری کیا۔

اس کے متعلق شادؔ اردوئے معلّٰی دسمبر ۱۹۰۵ء میں کیا لکھتے ہیں ملاحظہ ہو: "اس شہر میں حضرات وہابیوں کا ایک مشہور خاندان ہے۔ پہلے تو اس خاندان میں بہت علماء اور ذی اثر لوگ تھے، مگر اب گنتی کے لوگ رہ گئے ہیں، مولوی احمد اللہ مرحوم کے جزیرۂ انڈمن میں بھیج دیئے جانے پر اس خاندان پر یہ سخت مصیبت پڑی۔ مولوی صاحب ممدوح کے حقیقی بھانجے محمد حسن صاحب مرحوم عجب عالی خیال ہوشیار بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے ہم مذہب اور دیگر فرقۂ اسلام کے امراء کو سمجھا بجھا کر چاہا کہ ان کے لیے عربی و فارسی تعلیم کا ایک کالج قائم کریں، اور وہی زمین، جہاں ان حضرات کے مکان تھے، اور گورنمنٹ نے ان کو ضبط کر رکھا تھا، گورنمنٹ سے مانگ کر وہاں کالج بنائیں۔ ہر چند کہ کالج تو نہ بن سکا، مگر ایک اسکول انٹرنس کی تعلیم کا چندہ سے کھولا گیا۔" جب یہ اسکول قائم ہوا تو حسب اسکیم مذہبی تعلیم کا بھی کلاس کھولا گیا۔ شیعہ، سنّی، وہابی سب کی تعلیم کے لیے علماء رکھے گئے۔ مولوی صاحب نے سید مہدی نواب (سال رحلت ۱۸۸۷ء خلف اکبر فرزند علی خاں برادر بزرگ نواب بہادر) سے کہا کہ ایک کتاب مذہب شیعہ کی تعلیم کے لیے عربی زبان میں ایسی تصنیف کرا دیجئے کہ جس میں اعتقادات و اصول و فروع سے بحثیں ہوں ساتھ اس کے چند ایسے قیود رکھے جن کا سرانجام مشکل تھا۔"

---

[۱] نصاریٰ سے اشارہ انگریز جج مسٹر لیٹ کی طرف ہے۔

الغرض جب ایک سال تک ایسی کتاب نہ لکھی گئی تو ناچار مولوی صاحب نے مجھ سے کہا . . . میں نے وعدہ کر لیا کہ "انشاء اللہ پنج شنبہ تک جس کو تین دن باقی تھے ایسی کتاب تصنیف کر دوں گا۔"

الغرض شاد نے "رسالۂ یومیہ" بزبان عربی سو صفحہ کا تصنیف کیا اور مسودہ مولوی صاحب کے سامنے پڑھ کر سنایا۔ شاد تحریر کرتے ہیں: "مولوی صاحب نے کتاب کو فقط پسند ہی نہیں کیا بلکہ دیر تک حیرت زدہ ہو کر میرا منہ دیکھا کئے۔"

یہ تھا شاد کا اعتقاد۔ صراحت کی چنداں ضرورت نہ تھی مگر جیسا عرض کر چکا ہوں کہ اگر وہاب اشرفی اس مضمون کو پڑھ لیتے تو غلط خامہ فرسائی سے باز رہتے۔

رسالۂ یومیہ زمانہ دراز تک محمڈن اسکول میں پڑھایا جاتا رہا اور شمس العلماء مرحوم، شاد کے خیالات کے تاعمر معترف رہے۔ یہی نہیں اسی وہابی خانوادے سے دو شاد کے شاگرد ہوئے۔

۱۔ مولانا عبد الحق مجنوں، مصنف مثنوی: زمانہ ۱۸۶۵ء تا زمانہ ۱۸۸۰ء ان حضرات کیلئے نہایت سخت تھا۔ بعد گرفتاری حاجی احمد اللہ صاحب، ان لوگوں کے مکانات زمین دوز کر دیے گئے تھے۔ حاجی صاحب ممدوح کے دوست مولانا واعظ الحق تھے جو ۱۸۶۵ء میں گرفتار کئے گئے تھے اور حاجی احمد اللہ مرحوم کے ساتھ نظر بند کئے گئے تھے۔ ان کے صاحب زادے مولانا عبد الحق تخلص مجنوں، شاد کے شاگرد ہوئے (بہ حوالہ تذکرہ بلخی صـ ۹۹) اور تاحیات شاد کے شاگرد رہے۔

۲۔ پروفیسر محمد مسلم مرحوم: ان کے والد محمد یوشع کے چچا شمس العلماء محمد حسن مرحوم تھے۔ یہ ۱۹۰۸ء میں شاد کے شاگرد ہوئے تھے۔ ان کا تعارف میرے ایسا کم سواد کیا کرا سکتا ہے جبکہ خود شاد ان کے مکتوبات میں مداح ہیں۔ "شاد کی کہانی" ۱۹۶۱ء میں ان کی کاوش سے شائع ہوئی۔

ان دو بزرگوں کے علاوہ لودی کٹرہ کے مشہور رئیس شاہ کمال مغفور کے خاندان کے پانچ افراد شاد کے شاگرد تھے، جن کا مختصر نسب نامہ درج ہے۔ —

شاہ تیم موضع کاکو
- شاہ تبارک حسین
  - شاہ مبارک
    - شاہ جلالی
      - شاہ اقبال
    - دختر
      - شاہ جھبو بسمل، شاگرد شاد
    - شاہ کمال
      - شاہ رفیع وکیل
  - شاہ لال
    - شاہ خلیل وفا شاگرد شاد
- شاہ امداد
  - شاہ مبین کاکو
    - شاہ غفور الرحمٰن
      - شاہ ولی الرحمٰن، شاگرد شاد
      - شاہ منظور، شاگرد شاد
      - شاہ عطاء الرحمٰن، شاگرد شاد
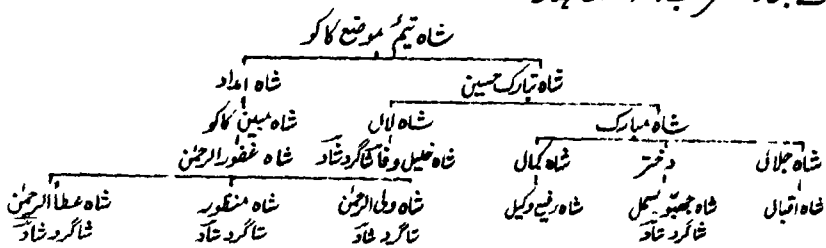
ان بزرگوں میں شاہ کمالؔ شاگردِ وحید الہ آبادی تھے۔ باقی پانچ شاہ محبوب تمل، شاہ خلیل وفاؔ اور شاہ عطاء الرحمٰن تینوں بھائی شادؔ کے شاگرد ہوئے۔ "مکتوباتِ شاد میں شاہ اقبالؔ، شاہ کمالؔ، شاہ خلیل وفاؔ کا نام بہ عنوان احسن آیا ہے۔ شاہ کمال کا نام شادؔ کی کہانی میں بھی ہے۔ ان کے علاوہ کمہار کے مولانا عزیز الحق یعنی پروفیسر فضل الحق کے چھوٹے دادا کے شادؔ مکتوبات میں مداح ہیں۔

کیا اتنے حضرات نے بے سوچے سمجھے شادؔ کی شاگردی اختیار کی تھی جبکہ اس زمانہ میں احقرؔ بہاری، شوقؔ نیموی مقیم شاہ کی املی، منشی باقرؔ میتن گھاٹ اور رفضلِ حق آزادؔ بقیدِ حیات تھے۔ حمید عظیم آبادی مرحوم ڈاکٹر مبارک کے شاگرد تھے۔ مگر انھوں نے ڈاکٹر مبارک کو چھوڑ کر شادؔ کی شاگردی اختیار کی۔

"شادؔ کی نثر نگاری" میں وہاب صاحب اس پسِ منظر کو بالکل فراموش کر گئے۔

ہمایوں میرزا کا نسب مادری :

وہاب صاحب "شادؔ کی نثر نگاری" ص ۱۶۲ پر فرماتے ہیں: "ہمایوں میرزا نے اپنی آپ بیتی "میری کہانی میری زبانی" میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ نواب عفت آرا بیگم کے بطن سے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی والدہ وہ مغلانی ہیں جو فریادؔ کی منکوحہ عورت تھیں۔ ہمایوں میرزا نے ان مغلانی کا ذکر بطور کھلائی یا انا اپنی آپ بیتی میں کیا ہے۔ شادؔ نے جہاں ہمایوں میرزا کا ذکر کیا ہے، وہاں اس امر کی پردہ پوشی کی ہے؟"

تبصرہ مضمون نگار :

نثر نگاری میں شادؔ کی نثر پر تبصرہ کرنا تھا، کسی کے نسب سے کیا مطلب تھا۔ یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے۔ شادؔ نے جو اپنے نجی مکتوبات یعنی پرائیوٹ (PRIVATE) خطوط میں میرزا داغؔ کے متعلق لکھا تھا۔ اس پر وہاب صاحب نہایت برہم ہوئے۔ حالانکہ یہ خطوط اشاعت کے لئے نہ تھے۔ ملاحظہ ہو شادؔ کی نثر نگاری ص ۲۱۴۔ "مکتوبات میں کچھ ایسی باتیں بھی درج ہیں، جنھیں کوئی بھی مستحسن نہیں کہہ سکتا۔ داغؔ کے معاملہ میں ان کا رویہ انتہائی افسوسناک معلوم ہوتا ہے۔"

شادؔ نے ایک لفظ بھی داغؔ کے متعلق غلط نہیں لکھا ہے۔ شادؔ سے زیادہ دوسرے اہل قلم نے داغؔ کے نسب کے متعلق تحریر کیا ہے۔ شادؔ نے کوئی گڑھی ہوئی بات اپنی طرف سے نہیں لکھی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا عرشی مرحوم رامپور کا مضمون "کچھ داغؔ کے متعلق" ماہانہ "خاور" ڈھاکہ میں شائع ہوا تھا۔ افسوس کہ وہ رسالہ مل نہیں رہا ہے۔ جہاں تک یاد آتا ہے کہ مولانا عرشی مرحوم نے لکھا تھا کہ داغؔ کی خالہ کے روابط نواب رامپور سے تھے، ان نواب صاحب کا نام بھی بھول رہا ہوں۔ بہر کیف مولانا عرشی کے علاوہ دوسرے اہل قلم میں سید عابد علی مرحوم رسالہ صحیفہ لاہور جون، جولائی، اگست ۱۹۶۱ء میں تحریر فرماتے ہیں:

"داغ کے یہاں مطالب و بیان کی بلندی تو کہاں ملے گی، لیکن اسے ترنّم اور نغمے کی کیفیات کا جتنا گہرا شعور ہے، اس کا مقام بلند ہے۔ اس کا پورا خاندان کم و بیش نغمہ طرازوں کا خاندان تھا۔ ماں، بہن، خالہ سبھی گلا کی سنگیت کی آشنا تھیں۔ صاحب بہارستانِ ناز نے بڑی شوخ باتیں اس سلسلے میں لکھی ہیں۔"

تذکرۂ سخن شعرا کی عبارت ہے: "نواب میرزا داغ دہلوی ولد چھوٹی بیگم، شاگرد محمد ابراہیم ذوق، ملازم نواب رامپور۔ راقم نے اس کو دیکھا تھا . . . واضح رہے کہ یہ چھوٹی بیگم خوش باش، خوش رو عورت ہے، جس نے کئی نکاح کیے۔" شاد نے تو اتحاد کے متعلق کچھ مکتوب میں لکھا بھی نہیں ہے۔ جتنا اور لوگوں نے لکھا ہے پھر بھی وہ ڈاکٹر وہاب اشرفی کی نگاہ میں معتوب ہیں۔

مگر ہمایوں میرزا سے متعلق جو بغیر کسی حوالے کے ڈاکٹر صاحب موصوف نے انکشاف کیا ہے وہ بقول اُن کے نہایت مستحسن ہے۔ حالاں کہ ان کا انکشاف نہایت غلط اور بے بنیاد ہے۔

ملاحظہ ہو حیاتِ فریاد ص۲ حاشیہ "فالِ قرآں کے رو سے سید ہمایوں مرزا صاحب کا نام سید عاشق حسین ہے مگر ان کی والدہ محترمہ نے اپنے خاندان (مراد مرشد آباد) کے ناموں کی مناسبت سے سید ہمایوں مرزا رکھا اور شہرت

حیات فریاد ص۱۱۸ "بیگم صاحبہ کے انتقال کی وجہ سے حضرت بہت دل شکستہ و رنجیدہ رہنے لگے تھے۔ حضرت کے دگلے دوست جن سے بے حد ربط و اتحاد تھا وہ بھی یکے بعد دیگرے پہلے ہی مر چکے تھے، اپنے فرزند دلبند سید ہمایوں میرزا صاحب کی آئندہ زندگی کی یکساں حالت کو سوچ الگ سوہان روح تھا کہ ماں نے یوں رحلت کی اور کلکتہ میں ایک مقدمہ کے بل میں معاش الگ مختصر ہو گئی۔"

وہاب صاحب کی تحریر ص۱۶۳ میں ہے: "جب عفت آرا بیگم کو اپنے ہمراہ لے کر دار عظیم آباد ہوئے تو عفت آرا بیگم کے بڑے صاحب زادے نے فریاد پر مقدمہ دائر کر دیا۔ اس مقدمہ نے فریاد کو مالی طور سے نقصان پہونچایا۔ دوران مقدمہ ہی عفت آرا بیگم نے انتقال کیا۔"

شاد کے مطابق عفت آرا کا انتقال کلکتہ میں ہوا اور انھوں نے کمسن بچہ ہمایوں میرزا چھوڑا، اور وہاب صاحب بغیر کسی حوالے کے عفت آرا بیگم کا انتقال پٹنہ میں دکھاتے ہیں، اور ہمایوں میرزا کو مغلانی کا بیٹا بناتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا انھوں نے حیات فریاد کو پڑھا نہیں تھا۔ خود شاد کا قول ص۱۶۲ نثر نگاری میں درج کرتے ہیں:

وہاب صاحب عرض حال میں غیر جانب داری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کیا یہی ان کی غیر جانب داری ہے کہ بغیر کسی تحریری ثبوت کے نہ صرف شاد بلکہ ان کے ساتھ غریب ہمایوں میرزا کو بھی غلط بات کہہ کر بے سبب بلاوجہ مطعون کرتے ہیں۔ اپنی تحریر نثر نگاری ص۱۶۲ میں دیکھیں، مراجعت فریاد ۱۸۷۳ء

شادؔ نے جو داغؔ کے متعلق صحیح بات تحریر کی وہ قابلِ تحسین نہیں ٹھہرے مگر وہاب صاحب نے جو کچھ ہمایوں مرزا کے متعلق لکھا، غالباً ان کی نگاہ میں قابلِ صد تحسین و آفریں ہے۔ شادؔ نے داغؔ کے متعلق جو کچھ لکھا، اس کا ثبوت فراہم کر دیا گیا۔ کیا وہاب صاحب، ہمایوں میرزا کے متعلق کوئی ثبوت فراہم کر سکتے ہیں؟ اگر وہ کوئی ثبوت نہیں رکھتے تو اپنی کتاب میں ترمیم کریں۔

وہاب صاحب کی تالیف ۲۹۶ صفحات کی ہے۔ اگر ایک دو یا دس غلطی ہوتی تو مقالہ میں تنقیدات کی جاتی۔ کوئی جوابی کتاب پانچسو صفحات کی تحریر ہو تب ہی ان کی غلطیوں کا جواب ہو سکتا ہے۔

میں نے اس مختصر سے مضمون میں جو کچھ لکھا ہے، تمام کتابوں کا حوالہ دے دیا ہے۔ جو باتیں میرے ذہن میں ہیں ان کو حوالہ نہ رہنے کی وجہ سے نہیں لکھا ہے۔

میرا مقصد تنقیص نہیں ہے، بلکہ جو میں صحیح سمجھتا ہوں، وہی پیش کر رہا ہوں۔ ماننے یا نہ ماننے کا اختیار مؤلف کتاب کو ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب ہمارے نقاد اور اہلِ قلم شادؔ کو سمجھنے لگے ہیں۔ خود وہاب اشرفی صاحب نے جا بجا ان کی تعریفیں کی ہیں۔ اور ڈاکٹر لطف الرحمٰن صاحب تو شادؔ کو غالبؔ و اقبالؔ کی درمیانی کڑی سمجھتے ہیں۔ (شادؔ عظیم آبادی نمبر زبان و ادب پٹنہ) مظہر امام صاحب ادیب و شاعر، شادؔ کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ (زبان و ادب جنوری ۱۹۷۹ء)۔ رسالہ فنون لاہور نے موجودہ غزل کا موجد شادؔ عظیم آبادی کو قرار دیا ہے۔ رہے اغلاط، تو شادؔ بھی انسان تھے فرشتہ نہ تھے۔ بعض جگہ وہاب صاحب نے صحیح لکھا ہے اور بعض اغلاط پر ان کی نظر نہیں پڑی۔

اس مقالہ میں زیادہ طوالت کی گنجائش نہیں۔ بطورِ مثال، شادؔ نے حیاتِ فریادؔ میں میرزا مہدی مؤلف نادری کو اپنی نانی کا دادا لکھ دیا ہے۔ حالانکہ وہ شادؔ کی نانی کے چچا تھے۔ انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ میرزا مہدی نادر کے ہم عہد تھے، اور فریادؔ شادؔ کے استاد تھے تب میرزا مہدیؔ ان کی نانی کے پردادا کیسے ہوتے۔ ایسے اور بھی اغلاط ہیں جو بے مقصد ہیں اور ان کو بھول کہا جا سکتا ہے۔ ایسے اغلاط کو بطورِ نمونہ "سہو دماغی" پیش کیا جا سکتا ہے نہ مؤلف یا مصنف کے خلاف۔

پروفیسر وہاب اشرفی

صدر شعبہ اردو،
رانچی یونیورسٹی، رانچی

جواب

جناب نقی احمد ارشاد کا مضمون "شاد کی نثر نگاری مصنفہ، ڈاکٹر وہاب اشرفی پر ایک نظر" میری نگاہ سے گذرا۔ میں موصوف کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میری کتاب پر توجہ فرمائی اور اپنے تاثرات رقم کیے۔ موصوف لکھتے ہیں :۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب ڈاکٹر وہاب اشرفی نے بڑی لگن، جاں فشانی، دیدہ ریزی اور تجسس کے بعد شاد عظیم آبادی کی نثر پر یہ مقالہ مرتب کیا ہے۔ جن (کذا) پر موصوف کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے"۔

اس اعتراف کے بعد شاید بہت زیادہ گنجائش نہ تھی کہ جناب نقی احمد ارشاد میری اس کتاب کے عیوب اور نقائص ڈھونڈنے کے درپے ہوتے اور اس تلاش و جستجو میں اپنے خیالات کو بغیر کسی دلیل اور حوالے کے سپرد قلم فرماتے۔ واضح ہو کہ میری متعلقہ کتاب کے سلسلے میں قاضی عبدالودود مرحوم کی رائے سامنے آچکی ہے۔ بلکہ وہ رائے متعلقہ کتاب کا ایک حصہ بھی ہے۔ ملاحظہ ہو قاضی عبدالودود صاحب کیا لکھتے ہیں :۔

"اردو نثر کے ارتقا میں شاد عظیم آبادی کا حصہ" ڈاکٹر سید عبدالوہاب اشرفی کا مقالہ امتحانیہ ہے، جس پر انھیں پی۔ ایچ ڈی کی سند ملی ہے : "عرض حال" میں ان کا دعویٰ ہے،

"میں نے تمام معاملات کو منطقی طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور کہیں بھی کسی قسم کی طرف داری یا چشم پوشی کو راہ نہیں دی ہے، جو باتیں دلیل و برہان کے پس منظر میں حقیقی نظر آئیں، ان کے اظہار میں ہچک محسوس نہیں کی"۔

میں نے اس مقالے کو ابتدا سے انتہا تک غائر نظر سے دیکھا ہے، اور مجھے اس میں کوئی ایسی بات جو مقالہ نگار کے دعوے کے مصدق نہ ہو، نہیں ملی۔۔۔۔ یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ لوگ عام طور پر محنت سے جی چراتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالوہاب اشرفی اس گروہ میں شامل نہیں اور یہ بات بھی داد طلب ہے"۔

جناب قاضی عبدالودود کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے میں اپنی مثال آپ تھے، رعایت، پاسداری، دلدہی، حوصلہ افزائی، مروت، خواہ مخواہ کی تعریف وغیرہ سے انھیں دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ اپنی رائیوں کے اظہار میں جتنے وہ محتاط تھے اردو کا شاید کوئی دوسرا محقق اتنا کھرا نہیں اترتا۔ مجھے واقعتاً مسرت ہوئی تھی اور

ہے کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی تھی اور میں نے تحقیق کا حق ادا کیا تھا۔

یہ سچ ہے کہ جب میں نے شاد عظیم آبادی کی نثر نگاری پر تحقیقی کام سرانجام دینے کا ارادہ کیا تھا تو مجھے اس موضوع کی پیچیدگیوں کا علم نہ تھا لیکن میں اپنی انتھک محنت اور تحقیقی شغف سے بعض نتائج پر پہنچا اور یہ نتائج بھی کسی کے کہنے سننے سے قائم نہیں کیے بلکہ اپنے مطالعے کی روشنی میں ہی بعض اہم فیصلے کیے۔ بالکل غیر جانبدارانہ طور پر بغیر کسی تعصب کے۔ اس ضمن میں میں نے کتاب کی پہلی اشاعت کے دیباچے میں یہ لکھا بھی کہ:۔

"اس مقالے کی تیاری کے ابتدائی مرحلے میں میں متعدد بار نبیرۂ شاد جناب نقی احمد ارشاد سے ملا۔ موصوف نے ازراہِ خلوص خاصا تعاون کیا۔ نہ صرف ارشاد صاحب نے شاد عظیم آبادی کی مطبوعہ تصنیفات حوالے کیں بلکہ غیر مطبوعہ نگارشات کے مطالعے کے مواقع بھی فراہم کیے۔ بعض مباحث کے ضمن میں اپنی رائیں نقل کروائیں۔ میں واقعی ان کا بہت ممنون ہوں۔ افسوس اس کا ہے کہ اپنے مطالعے کی روشنی میں موصوف کے نقطۂ نظر کو قبول کرنا میرے لیے کسی طرح بھی ممکن نہ ہو سکا۔ اسی دوران دو بار جناب قاضی عبدالودود سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ شاد کے بارے میں ان کی رائے معلوم ہوئی۔ میں نے مقدور بھر یہ کوشش کی کہ میں متنازعہ امور کے سلسلے میں غیر جانبدارانہ طور پر کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔"

مجھے صرف عرض یہ کرنا ہے کہ جناب نقی احمد ارشاد کی خواہش یہ تھی کہ شاد عظیم آبادی کے سلسلے میں بعض متنازعہ فیہ امور کو موصوف کے جذباتی اور غیر علمی انداز سے دیکھوں۔ ظاہر ہے میں ایسا کر نہیں سکتا تھا چنانچہ ان کی تکلیف کی وجہ موجود ہے لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ اے روشنِ طبع تو برمن بلا شدی

بہر طور اب اُن اعتراضات کی طرف آیئے جو موصوف نے ابھارے ہیں۔ میں ان تمام باتوں سے صرف نظر کرونگا جو جناب شاہ عطاءالرحمٰن کاکوی اور جناب سید حسن کے سلسلے میں ہیں۔ میرے خیال میں عطا صاحب خود متعلقہ باتوں کا جواب دے دیں گے اس لیے مجھے اس میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں میرے حوالے سے جو امور سامنے لائے گئے ہیں ان کا جواب حاضر ہے۔

ایک بحث چلی آتی ہے کہ ناول صورۃ الخیال کا حقیقی مصنف کون ہے۔ خود شاد نے اس ناول کے بارے میں مختلف مواقع پر مختلف باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً "اس نئی طرز کی داستان میں نہ کسی طلسم کے باندھنے اور توڑنے کا حال ہے نہ جنوں اور دیو پری کا ڈھکوسلہ ہے۔ اپنی ہی ڈیڑھ انچ کی مسجد ہے اور اپنی ہی دل کی گھڑت ہے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ناول شاد نے بلا شرکت غیرے لکھا ہے۔ لیکن دوسری جگہ انھوں نے یوں اظہار فرمایا۔

"مولوی حسن علی مرحوم مسلم کمشنری بھاگلپور ایک زمانے میں برسوں تک روزانہ سید صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کے ترغیب دینے اور اسلوب بتانے پر اور "اندرا" نام کے بنگلہ کے ناول سنانے پر سید صاحب نے ۱۸۷۶ء میں ایک ناول لکھا (سید صاحب سے مراد خود شاد عظیم آبادی ہیں انھوں نے اپنی آپ بیتی خود لکھ کر اپنے شاگرد مسلم عظیم آبادی کے حوالے کر دی تھی کہ وہ اسے اپنے نام سے شائع کروائیں لیکن مسلم صاحب نے ازراہِ حق پرستی شاد کی کہانی شاد کی زبانی کے نام سے شائع کر دی)"۔ واضح ہوا کہ شاد پہلے تو اسے طبع زاد بتا کر پورا کریڈٹ خود لینا چاہتے تھے لیکن جب ہنگامہ شروع ہوا تو انھوں نے مولوی حسن علی اور بنگلہ ناول اندرا کا نام لینا ناگزیر سمجھا۔ میں نے واضح طور پر لکھا تھا کہ شاد کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صورۃ الخیال طبع زاد نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق "اندرا" سے ہے نیز یہ کہ اس ناول کی تصنیف میں کسی نہج سے مولوی حسن علی کی شرکت رہی ہے جس کا خود شاد کو اعتراف ہے۔ میں نے بہت تفصیل سے منشی محمد اعظم متوطن مہوری (اسلام پور) کے قریب ایک قصبہ کے بارے میں تفصیلات رقم کی ہیں اور شاد سے انکی قربت ثابت کی ہے پھر تمام حقائق کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ:-

راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا کہ "صورۃ الخیال" کا پہلا مسودہ منشی محمد اعظم اور مولوی حسن علی نے تیار کیا اور شاد سے اس کی اصلاح کی درخواست کی، شاد نے صرف اصلاح زبان پر بس نہیں کی، بلکہ اس میں ترمیم و تنسیخ بھی کی۔ اور اب وہ جس طرح ہمارے سامنے ہے وہ تین اشخاص کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے مصنفین شاد کے علاوہ حسن علی اور محمد اعظم ہیں۔

محمد اعظم شاد کے نام سے اس کی اشاعت پر خاموش نہ رہ سکے، لیکن حسن علی نے ہنگامہ برپا کرنا غیر ضروری سمجھا اس کی وجہ ان کا مذہبی مزاج تھا۔ وہ مذہب کی طرف دل و جان سے راغب ہو چکے تھے۔ ایسے میں ایک قصہ کی کتاب کے لیے ہنگامہ کھڑا کرنا ان کی طبیعت کے منافی تھا لیکن شاد خود ان کی کارگذاری کو فراموش نہ کر سکے اور اپنی آپ بیتی میں "صورۃ الخیال" کی تصنیف میں پس پردہ ان کا ہاتھ ثابت کیا شاد محمد اعظم کا نام اسلئے بھی نہ لے سکے کہ شاد کے خلاف ہنگامہ انہیں کا اٹھایا ہوا نظر آیا۔ ایسے میں ان کا نام لینا انہوں نے اعتراف جرم اور اپنی ہتک عزتی پر محمول کیا ہوگا!!"

اب باقی احمد لشاد صاحب کا یہ بیان کہ شاد سے وابستہ حضرات مثلاً مرزا فصیح یا مرزا محمد کاظم کا ذکر ناول میں موجود ہے میں نے یہ لکھا تھا کہ یہ دلیل بے معنی ہے اسلئے کہ ان کا تذکرہ صورۃ الخیال میں نہیں ہے بلکہ صورۃ الخیال کی آخری جلد حلیۃ الکمال میں ہے۔ ناول کے دوسرے اور تیسرے حصے یعنی ہیئۃ المقال اور حلیۃ الکمال کے بارے میں کوئی جھگڑا

سے ہی نہیں۔ یہ تو مسلّم ہے کہ دونوں حصے شادؔ نے خود لکھے ہیں۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ صورۃ الخیال کا پہلا حصہ فنی طور پر اسکے دوسرے حصے سے بہتر ہے۔ آخری دو حصوں میں ناصحانہ انداز زیادہ کھل کر سامنے آگیا ہے۔ اس کی وجہ غرض یہ ہے کہ یہ دو حصے ناول کو محض بڑھانے کے لئے پیش کیے گئے ہیں۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے علی عباس حسینی نے بھی لکھا تھا کہ:۔

"کرم حسین پر اب یہ راز کھلتا ہے کہ یہ تو وہی گمشدہ ولایتی ہے۔ جو ان کی منکوحہ ہے۔ ہم بھی خوش ہوئے کہ چلو اب دونوں ملے مگر مصنف کا جی نہیں بھرا"

میں نے اس پر یہ نوٹ لگایا تھا کہ دراصل ناول تو وہیں ختم ہوگیا ہے (یعنی پہلے حصّہ پر) ولایتی پر اب جو مصیبتیں آتی ہیں وہ شادؔ کی لائی ہوئی ہیں۔ اس طرح نئے حادثات تخلیق کیے جاتے ہیں جو مصنوعی بھی ہیں اور پیچیدہ بھی جن میں جاسوسی ناولوں کا سا تیور ہے اور یہ سب کچھ اسلئے کیا گیا کہ اس ناول کو بلا شرکت غیرے اپنی طبع زاد تصنیف ثابت کیا جاسکے۔

ناول "بدھاوا" کے سلسلے میں جناب نقی احمد ارشاد لکھتے ہیں "پھر وہاب صاحب خامہ فرسائی کرتے ہیں:۔

"راقم الحروف کا خیال ہے کہ "بدھاوا" خود نقی احمد صاحب کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ شادؔ کی تحریر میں اس کا کوئی خاکہ ہوگا جس کی بنیاد پر اور "رادھارانی" دیکھ کر "بدھاوا" تیار کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شادؔ نے اس ناول کا تذکرہ اپنی آپ بیتی میں نہیں کیا ہے۔ شاد کی نثر نگاری ص ۹۵"

قصّہ یہ ہے کہ جناب نقی احمد ارشاد پورے سیاق و سباق میں نکات کو برتنے کے عادی نہیں لہذا خلط مبحث سے کام چلانا چاہتے ہیں۔ میں نے کیا کچھ لکھا ہے اسکی تفصیل ملاحظہ ہو۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس پر آج بھی قائم ہوں:۔

"شادؔ کا ایک دوسرا ناول "بدھاوا" ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کا ایک مختصر ترین ایڈیشن بہت پہلے شائع ہوا تھا لیکن اب اس کے نسخے نایاب ہیں۔ نقی احمد ارشاد صاحب نے اس کا ایک نیا ایڈیشن نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ سے نکالا ہے۔ عرض مرتب میں انھوں نے لکھا ہے:۔

"بدھاوا کا اصل نسخہ سید مجتبیٰ حسین خاں مرحوم کے پاس تھا۔ راقم نے اسکو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر افسوس ان مرحوم کا انتقال ہوگیا اور پھر کتاب نہ مل سکی.... بہر کیف شادؔ کے بوسیدہ اور مالیدہ اوراق سے میں نے صرف ناول کا حصّہ اس کتاب سے الگ کرلیا ہے۔ نصائح کے ابواب مختلف ناول کے ساتھ "صورتِ حال" میں شائع ہوچکے ہیں،

اس لیے اب یہ خود ایک مستقل ناول ہے.....“

اس عرض مرتب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ”بدھاوا“ دراصل ”صورتحال“ کا ایک حصّہ ہے۔ صورتحال پر مفصل بحث آگے آئے گی۔ یہاں اتنی بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ”بدھاوا“ کا تعلق ”صورتحال“ سے نہیں ہے۔

نقی احمد صاحب نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ جن اوراق سے انھوں نے ”بدھاوا“ کا حصّہ نکالا ہے، وہ بوسیدہ اور مالیدہ تھے۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ جس طرح ناول چھپا ہے مکمل نظر آتا ہے۔ جو ۱۳۳ صفحات پر مشتمل یہ ناول شروع سے آخر تک مربوط ہے۔ اس لیے موجودہ صورتحال میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کہاں کہاں نقی احمد ارشاد صاحب نے تصحیح یا ترمیم کی ہے، یا اپنی جانب سے اس کی گم شدہ کڑیاں ملائی ہیں۔ ایسی حالت میں ”بدھاوا“ کی موجودہ صورت انتہائی مشکوک ہے۔“

میرے خیال میں اس سے زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔

شاؔد کی سوانح نگاری کے ذیل میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جنکی تفہیم کے لیے میری کتاب ”شاد عظیم آبادی اور انکی نثر نگاری“ کا ”چوتھا باب“ شاد بحیثیت سوانح نگار“ زیر مطالعہ لانا چاہیئے۔ حیات فریاد پر اور شاؔد کی کہانی پر جتنے اعتراضات جناب قاضی عبدالودود صاحب نے کیے ہیں۔ ان کے رد میں نقی احمد ارشاؔد کی تمام تاویلات کار عبث ہیں۔ دراصل شاؔد نے فریاؔد سے متعلق اکثر باتیں غلط لکھی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض ایسی کتابوں کے حوالے دیے ہیں جنکا سرے سے وجود ہی نہیں اور اگر ہیں بھی تو انمیں وہ باتیں نہیں جو شاؔد لکھتے ہیں۔ ان سب امور کے متعلق نقی احمد ارشاد خاموش رہے۔ گویا وہ سارے اعتراضات تسلیم کرتے ہیں۔ میں نے لکھا تھا کہ تاریخ نادری کی نثر میں فریاؔد نے اپنے کو قادری لکھا تھا۔ شاد نے قادری کو تشیع کے منافی سمجھ کر خارج کر دیا۔ اس لیے کہ فریادیوں تو سنّی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے لیکن مرشدآباد سے تعلق ہونے کے بعد تشیع اختیار کر لیا تھا۔

نقی احمد ارشاد لکھتے ہیں کہ۔ یہ دونوں سوال خود وہاب صاحب کا اٹھایا ہوا نہیں ہے......... وہاب صاحب کے پس پردہ کوئی اور شخص رہا ہوگا“ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ مہمل بات اور کیا ہوگی۔ میرے پس پردہ کون شخص تھا اور کیوں تھا؟

بہر طور نقی صاحب کی یہ دلیل ہے کہ حذف کرنے والے شاؔد نہیں تھے بلکہ کاتب منصور شرقی بہاری یا علی حیدر سیدا ہوں گے۔ حیرت ہے کہ یہ بات کیسے مانی جاسکتی ہے۔ کاتب کیوں لفظ قادری کو الگ کر دیتا؟ ایسے اعتراض کا جواب دینا بھی فضول معلوم ہوتا ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ حیات فریاؔد میں شاؔد نے چھبّیس[۲۶] منتخب اشعار پیش کیے ہیں، اس مثنوی میں

تو ایسے اشعار تھے جو خلفائے ثلاثہ کی تعریف میں تھے اور یہ سبب تشیع شاد نے ان کو بالقصد خارج کر دیا۔ نقی احمد ارشاد لکھتے ہیں کہ شاد کے پاس بہ جز دبستانِ اخلاق کے اور کوئی کتاب نہ تھی اور پوری مثنوی شاد کے پیش نظر نہ تھی۔ ظاہر ہے یہ تاویل بھی بالکل غیر منطقی اور حیرت زا ہے۔

شاد کی تذکرہ نگاری کے ذیل میں ایک معروف شعر

فقیرانہ آئے صدا کر چلے　　　میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

کے بارے میں شاد نے میر انیس کے حوالے سے لکھا کہ انھوں نے کہا کہ ہائے دادا جان کے اس شعر کا جواب نہیں۔ ظاہر ہے شاد سے غلطی ہوئی تھی۔ میر انیس کے دادا جان سے اس شعر کا کوئی تعلق نہیں۔ اب نقی احمد ارشاد صاحب کا یہ کہنا کہ انیس میر تقی میر کو دادا جان کہتے تھے تو یہ ان کی دریافت ہے کوئی محقق اور نقاد اسے مان نہیں سکتا۔

میں نے لکھا تھا کہ شاد سے سہو ہوا ہے، میر ضمیر کا کوئی تعلق سادات بارہہ سے نہ تھا۔ ان کا سلسلہ خواجہ باسط سے تھا۔ معلوم نہیں کیوں اس سلسلے میں بھی جناب نقی احمد ارشاد نے کچھ لکھنا ضروری سمجھا۔ حالانکہ آخر میں وہ خود لکھتے ہیں کہ شاد سے صرف اتنی غلطی ہوئی کہ میر ضمیر کو انھوں نے سادات بارہہ میں شمار کیا تھا جبکہ وہ صرف زیدی تھے۔

شاد کی مکتوب نگاری کے ذیل میں نقی احمد ارشاد لکھتے ہیں کہ وہاب اشرفی کے اس حصے کی بھی وہی حالت ہے اور قاضی عبدالودود کے غلط اعتراضوں کا جا بجا حوالہ دیا گیا ہے۔ مزید وہ لکھتے ہیں کہ قاضی صاحب کے اعتراضوں کا جواب کچھ تو شاد کا عہد اور فن میں دیا گیا ہے اور باقی حصہ دوم میں جو زیر کتابت ہے۔ اس پوری بحث میں قاضی عبدالودود صاحب کا بار بار ذکر آیا ہے۔ کسی بھی نکتے کا کوئی منطقی جواب نہیں۔ محض جذبات کو راہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ چونکہ زیادہ تر باتوں کا تعلق قاضی عبدالودود صاحب سے ہے اس لیے میں ان امور سے صرف نظر کرتا ہوں۔ پھر بھی ایک بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ نہ معلوم کیوں اپنی کتاب "یادگار شاد" کو نقی احمد ارشاد نے بازار میں لانا مناسب نہیں جانا۔ میں نے مشکل سے ایک کاپی کسی طرح ان کے گھر سے حاصل کر لی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کتاب کے سلسلے میں جناب نقی احمد ارشاد نے RE-THINKING کی اور سرے سے اسے بازار میں لانا مناسب ہی نہیں تصور کیا۔

نقی احمد ارشاد نے شاد عظیم آبادی کے کتنے ہی معروف شاگردوں کے نام گنوائے ہیں۔ بعضوں کا نسب نامہ بھی درج کیا ہے۔ یہ سب اس لیے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ شاد مذہب کے معاملے میں وسیع القلب تھے۔ یہی وجہ تھی سنی فرقے کے بہت سارے افراد ان کے حلقۂ تلمذ میں تھے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ شاد عظیم آبادی اپنے وقت کے کم از کم بہار میں سب سے بڑے شاعر تھے (اور آج بھی بڑے ہیں) ایسے میں ان کے حلقے میں مختلف اعتقادات کے لوگوں کا آجانا غیر فطری نہیں۔

نقی صاحب لکھتے ہیں کہ شاد کی نثر نگاری میں وہاب صاحب اس پس منظر کو بالکل فراموش کر گئے حالانکہ اس پس منظر کو سامنے لانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں شاد عظیم آبادی کی شاعری پر تو تحقیق کر نہیں رہا تھا کہ ان تمام معاملات کو سامنے لاتا۔ یہ خلط مبحث ہے جس سے صرف صفحات کا زیاں ہوا ہے۔

جناب ہمایوں مرزا کے نسب مادری کے ذیل میں میں نے لکھا تھا کہ "حقیقت یہ ہے کہ انکی والدہ وہ مغلانی ہیں جو فریاد کی منکوحہ عورت تھیں" ہمایوں مرزا نے بطور کھلائی یا انّا اپنی بیتی میں ان کا ذکر کیا ہے۔ شاد نے جہاں ہمایوں مرزا کا ذکر کیا ہے۔ وہاں اس امر کی پردہ پوشی کی ہے۔ مزید یہ کہ جب عفت آرا بیگم کو فریاد اپنے ہمراہ لیکر وارد عظیم آباد ہوئے تو عفت آرا بیگم کے بڑے صاحبزادے نے فریاد پر مقدمہ دائر کر دیا۔ فریاد کو مالی طور سے نقصان پہنچایا۔" اب نقی صاحب لکھتے ہیں کہ "وہاب صاحب بغیر کسی حوالے کے عفت آرا بیگم کا انتقال پٹنہ میں دکھاتے ہیں۔ اور ہمایوں مرزا کو مغلانی کا بیٹا بتلاتے ہیں سبحان اللہ، کیا انھوں نے حیات فریاد کو پڑھا نہیں تھا؟ وہاب صاحب عرض حال میں غیر جانبداری کا دعویٰ کرتے ہیں کیا یہی ان کی غیر جانبداری ہے کہ بغیر کسی تحریری ثبوت کے نہ صرف شاد بلکہ انکے ساتھ غریب ہمایوں مرزا کو بھی غلط بات کہہ کے بے سبب بلاوجہ مطعون کرتے ہیں۔"

اس باب میں میری معروضات یہ ہیں :—

"میں نے اپنی کتاب میں یہ لکھا تھا:۔" شاد فریاد کے حالات مراجعت بہ عظیم آباد کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ 1873ء میں ان کی اہلیہ نواب عفت آرا بیگم نے انتقال کیا۔ انکے انتقال سے بہت دل شکستہ ہوئے مثنوی ناصر علی سرہندی کے تتبع میں "مثنوی درد دل" لکھی جو معدوم ہو گئی، فریاد کے اگلے دوست بھی مر چکے تھے، نیز ان کی معاش کلکتہ میں ایک مقدمہ کے ذیل میں مختصر ہو گئی تھی۔ اسلیے 1874ء میں ہمایوں مرزا کو لیکر عظیم آباد واپس آ گئے۔

جس مقدمہ میں فریاد ماخوذ تھے شاد نے اس کی تفصیل نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فریاد کا اعلےٰ کردار جو 'حیات فریاد' میں پیش ہوا ہے، اس سے بری طرح مجروح ہوتا ہے۔ جہاں تک راقم الحروف کو معلوم ہے، فریاد نے اپنی عمر کے آخری دنوں میں عفت آرا بیگم مرشد آبادی سے عقد کیا تھا۔ جن کے پہلے سے کئی اولادیں تھیں۔ جب فریاد عفت آرا بیگم کو اپنے ہمراہ لے کر وارد عظیم آباد ہوئے تو عفت آرا بیگم کے بڑے صاحبزادے نے فریاد پر مقدمہ دائر کر دیا۔ اسی مقدمہ نے فریاد کو مالی طور پر سخت نقصان پہنچایا۔ دوران مقدمہ ہی عفت آرا بیگم نے انتقال کیا۔ فریاد سے عقد کے وقت ہی ان کا سن کافی تھا۔ ان سے ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ہمایوں مرزا نے اپنی آپ بیتی، "میری کہانی میری زبانی" میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ نواب عفت آرا بیگم کے بطن سے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی والدہ وہ مغلانی ہیں جو فریاد کی منکوحہ عورت تھیں۔ ہمایوں

مرزانے ان مغلانی کا ذکر بطور کھلائی یا اناّ اپنی آپ بیتی میں کیا ہے۔

شاد نے جہاں ہمایوں مرزا کا ذکر کیا ہے وہاں اس کی پردہ پوشی کی ہے۔ نیز اس کی وضاحت نہیں کی کہ عفت آرا بیگم کو فریاد سے کوئی اولاد تھی یا نہیں"

ہمایوں مرزا کی حقیقی اولاد کے بارے میں پٹنہ اور نواح کے پرانے لوگ خوب واقف ہیں۔ اسکی تصدیق جناب قاضی عبدالودود نے بھی کی تھی کہ ہمایوں مرزا عفت آرا بیگم کے بطن سے نہیں تھے بلکہ مغلانی کی اولاد تھے، آج بھی پٹنہ سٹی کے بعض اصحاب اسکی شہادت دیتے ہیں نام گنوانے کی ضرورت نہیں۔ خلط مبحث کے طور پر وہ داغ کے سلسلے میں شاد پر میری نکتہ چینی پر تبصرہ کرتے ہیں لیکن آپ ملاحظہ فرمایئے کہ شاد بعض اموَر کے بارے میں کیا لکھتے ہیں۔

۱۔ "داغ کے یہاں مخش مضامین، رنڈی بازی اور فسق و فجور کے سوا اور کیا ہے، استعداد علمی ظاہر، دنائت طبع و کثافت نسب، و بدی اخلاق عیاں مگر حیدر آباد بھی کیا جگہ ہے:

۲۔ "اکبر الٰہ آبادی کے شاید دو سو خطوط سے کم نہیں ہیں ہر دفعہ جب ان پر اعتراض ہوئے اور جواب نہ چلا! مجھ سے رجوع کیا۔ میں نے برابر جواب دیئے میرے عاشق ہو گئے"

۳۔ "اقبال و عبدالقادر کے مجبور کرنے سے حسرت موہانی کے اعتراضات ان کے لیے لکھ دیئے"

۴۔ "شاد نے اقبال کے لیے فارسی کے لکچر لکھ دیئے تھے جن کی وجہ سے کیمبرج کی ایرانی سوسائٹی میں وہ عظمت سے دیکھے گئے ان لکچروں کو مسٹر براؤن اور ایرانیوں نے پسند کیا"

خود ستائی کی ایسی باتیں مجموعۂ مکاتیب میں بہت ہیں۔ میں نے لکھا تھا کہ ان میں بعض امور حقیقی بھی ہو سکتے ہیں لیکن اکبر، عبدالقادر اور اقبال کے بارے میں جو انکشافات ہوئے ہیں انہیں بغیر ثبوت کے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے یہ سب تحقیقی بیانات ہیں میں نے کسی پر کیچڑ نہیں اچھالی ہے۔ ہمایوں مرزا کا مادری سلسلہ ایسا نہ تھا کہ شاد اس کی تفصیل پیش کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ شاد نے اس پہلو پر کوئی روشنی ہی نہیں ڈالی ہے۔ اور شاید اپنے ممدوح کے لیے اس سے بہتر کوئی صورت ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

شاد نے تصوّف کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا پس منظر بس اتنا ہے کہ وہ اپنا سلسلۂ تلمذ فریاد کے حوالے سے درد تک لے جا سکیں۔ اب رہا یہ سوال کہ شیعوں کے یہاں تصوف کی کیا اہمیت ہے؟ اس پر لکھنے کی بڑی گنجائش ہے جس کی تفصیل میں رجوع کرنا فعل عبث سمجھتا ہوں۔

میں نے شاد کی ناول نگاری، سوانح نگاری، تذکرہ نگاری، مکتوب نگاری اور تاریخ نویسی کے باب میں بہت سارے ایسے گوشے روشن کیے ہیں جن سے شاد کی غلط بیانیاں ابھر جاتی ہیں۔ان پر کچھ لکھنا جناب نقی ارشاد نے ضروری نہیں جانا۔کیا وہ ان تمام اعتراضات کو مان چکے ہیں جن کے بارے میں ایک لفظ بھی لکھنا انہوں نے پسند نہ کیا؟ افسوس یہ ہے کہ جناب نقی احمد ارشاد مجھے شاد کے سلسلے میں دفاعی وکیل تصور کرتے تھے اور میں محض ایک محقق تھا، ان کے نقطۂ نظر سے تحقیق نہیں کر سکتا تھا۔مجھے اس کا احساس ہے کہ جناب نقی احمد ارشاد اپنے دفاعی بیانات سے شاد عظیم آبادی کو مزید مجروح کر رہے ہیں۔ شاد عظیم آبادی اردو کے اہم ترین شاعروں میں ایک تھے۔جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے موصوف کی شاعری اہم تر ثابت ہوتی جاتی ہے لیکن ان کی شخصی اور ذاتی کمزوریاں تھیں جن کی پردہ پوشی نہیں کی جا سکتی۔اگر نقی احمد ارشاد حقائق کو جھٹلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو یہ اور بات ہے۔

●●

پروفیسر عطاءالرحمٰن عطا کاکوی
سلطان گنج، پٹنہ-۶

جناب نقی احمد ارشاد کا مقالہ: چند وضاحتیں

شاد کی شہرت بحیثیت شاد اردو ادب میں مسلم ہے، مگر اسی کے ساتھ شاد کی طبیعت بڑی آخذ واقع ہوئی تھی۔ نذیر احمد نے مراۃ العروس لکھی تو گورنمنٹ نے انعام دیا۔ شاد کی طبیعت بذات خاص قصہ گوئی کی طرف مائل تھی۔ وہ معمولی واقعات کو بھی افسانوی رنگ میں پیش کرنے کے عادی تھے۔ اپنا سلسلہ شاعری خواجہ درد سے ملانے کے لیے ایسی ایسی بے بنیاد باتیں پیش کی ہیں جو ناقابل قبول ہیں۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھی تو شاد کو بھی شوق پیدا ہوا، اور ایک کتاب "فکر بلیغ" مرتب کی۔ منشی ذکاء اللہ نے کئی جلدوں میں "تاریخ ہند" لکھی تو شاد نے بھی گورنمنٹ سے انعام پانے کی خاطر "تاریخ بہار" لکھنے کی کوشش کی، اور اس کا ایک قدیم حصہ شائع ہوا۔ پھر زمانہ دراز کے بعد تین حصوں میں ناقص طور پر اس تاریخ کو مرتب کر کے لکھنا شروع کیا اور گورنمنٹ سے پیسے حاصل کیے۔ منشی اعظم علی پٹنہ ہی کے رہنے والے تھے، اگرچہ وہ زیادہ صاحب علم نہ تھے۔ مولوی حسن علی ان کے قلمی معاون تھے۔ حسن علی بنگلہ زبان جانتے تھے۔ منشی اعظم علی اور شاد دونوں بنگلہ زبان سے نابلد تھے۔ "سجاد و سنبل" میری نظر سے نہیں گذری۔ "نقش طاؤس" میں نے دیکھی ہے۔ ولایتی بیگم کا پلاٹ بنگلہ زبان میں ہے۔ منشی حسن علی کی وساطت سے یہ قصہ منشی اعظم علی تک پہنچا۔ وہ زبان و بیان پر اتنی قدرت نہ رکھتے تھے۔ ہم وطن ادیب ہونے کے ناطے وہ مسودہ شاد کو دکھلانے لاتے۔ شاد کا خود بیان ہے کہ اس میں زبان اور بیان میں دلکشی نہ تھی، اس لیے میں نے مسودہ کو واپس کر دیا۔ میرا صرف گمان ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ شاد اس میں رنگ آمیزی کر کے ایک حد تک نئی شکل میں مرتب کر کے اپنے نام سے شائع کرایا۔ آتا ہے کہ معارف (اعظم گڈھ) کے کسی پرچے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے ضمنی طور پر اس واقعے پر روشنی ڈالی ہے۔ ان جیسے عالم اور ادیب کی بات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ شاد نے بیسیوں کتابیں لکھی ہیں، کسی پر سرقے کا الزام نہ آیا۔ لے دے کر یہی کتاب "صورۃ الخیال" پر بڑی لے دے ہوئی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پہلا حصہ "صورۃ الخیال" شاد کی اصلاح سے ہو کر شائع ہوا اور اس کے دونوں حصے "ہیئۃ المقال" "حلیۃ الکمال" "مخصوص خانہ پری کیلئے کمال کر دیے گئے۔

جناب شاد نے خود اپنی آپ بیتی بنام "شاد کی کہانی، شاد کی زبانی" میں جو اس کتاب کے قصیدے پر تحریر کیا ہے، وہ خود مثال ست، گواہ چست کے مصداق ہے، اور قصہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود
شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی

ڈاکٹر زہرہ یاسمین کا تھیسس

منیر شکوہ آبادی - سوانح حیات و کلام

یہ مقالہ خوبیوں سے خالی نہیں ہے لیکن اس میں جا بجا تحقیق کے اصول اور طریق کار کی خلاف ورزی بھی ہوئی ہے۔ ہمارا جائزہ انہیں خلاف ورزیوں تک محدود رہے گا تاکہ اس حیلے سے تحقیق کے بعض مسائل سامنے آجائیں۔ (چونکہ بحث صرف تحقیق کے مسائل سے ہے اس لیے مقالہ نگار کے نام کا اظہار ضروری نہیں سمجھا گیا۔)*

'منیر شکوہ آبادی، سوانح حیات و کلام پر تبصرہ" مطبوعہ کتاب کی صورت میں ہے۔ مقالہ نگار کو اس پر لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند مل چکی ہے۔

بظاہر کتابی صورت میں اصل مقالے کی کچھ تلخیص کر دی گئی ہے اس لئے کہ کتاب میں بعض اہم معلومات کے ماخذ نہیں بتائے گئے ہیں (مثلاً منیر کے والد کے بارے میں تفصیلات، منیر کی شکل و شمائل وغیرہ) اس کی وجہ سے کتاب کی استنادی حیثیت جا بجا مجروح ہوئی ہے۔ اس بنیادی کمزوری کے علاوہ کتاب میں تحقیق کے نقطۂ نظر سے متعدد باتیں محل نظر ہیں مثلاً:

۱۔ منیر کی ولادت کی تاریخ اور سال کے تعین کے سلسلے میں ان کی مثنوی "معراج المضامین" کے دو شعر نقل کیے گئے ہیں جن میں وہ اپنی تاریخ پیدائش ۹ ذالحجہ بتاتے ہیں۔ سال کے تعین کے لیے منیر کے دیوان "منتخب العالم" کا جو ۱۲۶۴ھ میں مرتب ہوا، یہ فقرہ نقل کیا ہے:

> "سمند عمرم تا حال سی و سہ مرحلہ از مراحل زندگی طے کردہ۔"

اور ان دونوں بیانوں کو ملا کر یہ نتیجہ نکالا ہے۔

> "منیر شکوہ آبادی ۹ ذی الحجہ ۱۲۲۹ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۸۱۴ء کو پیدا ہوئے اور اس سلسلے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں رہتی۔" ص ۱۶

لیکن گنجائش باقی ہے۔ اس سلسلے میں فیصلہ کرنے سے پہلے دو باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ ... ۱۲۶۴ھ ... میں ان کی تحریر کے وقت اس کی عمر ... سے تجاوز کر چکی تھی

لیکن چھتیس برس سے کم یعنی پینتیس اور چھتیس کے درمیان تھی۔ دوسرے یہ کہ ذی الحجہ ہجری (قمری) سنہ کا آخری مہینہ ہے جس کی نویں تاریخ ہو جانے کے بعد سال کے صرف بیس اکیس دن باقی رہ جاتے ہیں۔ اگر منیر کا سال ولادت ۱۲۲۸ھ ہوتا تو ۱۲۶۴ھ کے آخری مہینے ذی الحجہ میں چھتیس سال کے ہو جانے سے قبل تک وہ لکھ سکتے تھے کہ میری عمر پینتیس سال کی ہو چکی ہے۔ لیکن اگر ان کا سنہ ولادت ۱۲۲۹ھ ہوتا تو ۹ ذی الحجہ ۱۲۶۴ھ کے بعد ہی وہ لکھ سکتے تھے کہ میرا سمند عمر زندگی کے پینتیس مرحلے طے کر چکا ہے۔ یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ منیر نے منتخب العالم کی مذکورہ عبارت ۱۲۶۴ھ کی کس تاریخ کو یا کس مہینے میں لکھی۔ اس لئے کہ اگر مذکورہ عبارت ۱۲۶۴ھ میں نویں ذی الحجہ کو یا اس کے بعد یعنی سال کے آخری بیس اکیس دنوں میں لکھی گئی ہے تو منیر کا سن ولادت ۱۲۲۹ھ تھا لیکن اگر یہ عبارت ۹ ذی الحجہ ۱۲۶۴ھ سے قبل کی کسی تاریخ کو یعنی سال کے پہلے گیارہ مہینوں کے اندر لکھی گئی ہے تو ان کا سال ولادت ۱۲۲۸ھ ماننا ہوگا۔ محض ۱۲۶۴ھ میں سے ۳۵ منہا کر کے ۱۲۲۹ نکال لینا اس سلسلے میں صحیح طریق کار نہ ہوگا۔

۲۔ منیر کے بیٹے سید ابو محمد بدر کے ذکر میں لکھا ہے: "مسدس تہنیت جشن بے نظیر میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے جس سے ان کے حالات زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔" ص ۲۵

اس کے بعد نثر کی ایک عبارت درج کی ہے۔ مذکورہ مسدس میر یار علی جان صاحب کی تصنیف ہے اور ظاہر ہے کہ نظم میں ہے۔ اس میں بدر یا منیر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ نثر کی منقولہ عبارت دراصل اس مسدس کے مرتب محمد علی خاں اثر رامپوری کے فاضلانہ مقدمے کے ایک حاشیے کی ہے۔

منیر کی تاریخ وفات کے سلسلے میں بھی یہی غلطی کی گئی ہے: "مسدس بے نظیر نے اخبار دبدبۂ سکندری کے حوالے سے بھی ۸ رمضان مطابق ۱۳ اگست لکھی ہے۔" ص ۹۵

۳۔ منیر کے علم و فضل کے متعلق لکھا ہے: "منیر ان سب علوم سے پوری طرح باخبر تھے جو اہلِ علم و فضل کے لیے مایۂ ناز کہے جا سکتے ہیں۔" ص ۲۷

یہ بہت بڑا دعویٰ ہے اور منیر یقیناً اس کے مصداق نہیں تھے ایسا دعویٰ بو علی سینا وغیرہ کے بارے میں بھی کرنا مشکل ہے۔

۴۔ "منیر ہر استاد کی عزت کرتے تھے اور ہر ایک کی اصلاح کو اپنی اپنی جگہ ماننے کی کوشش کرتے تھے۔ رشک اور ناسخ کے شاگرد ہوتے ہوئے بھی مرزا دبیر کی بھی اصلاح کو وہ مفید سمجھتے تھے۔ غزل میں ناسخ اور رشک کی اصلاح کو مانتے مگر مثنوی اور مرثیے میں مرزا دبیر کی پیروی کرتے تھے۔" ص ۳۷

اس کا سبب یہ تھا کہ منیر مرزا دبیر کے کبھی شاگرد تھے۔ اس زمانے میں بالعموم جو شاعر غزل اور مرثیہ دونوں کہتا تھا وہ

غزل میں غزل گو اور مرثیے میں مرثیہ گو شاعر کی شاگردی اختیار کرتا تھا۔ منیر بھی غزل میں ناسخ و رشک کے اور مرثیے میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے اور اپنے ان اساتذہ کی اصلاحوں کو مانتے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ وہ ہر استاد کی اصلاح کو قبول کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

۵۔ انتزاعِ سلطنتِ اودھ کے سلسلے میں مقالہ نگار کا کہنا ہے: "اردو کی تباہی، لکھنؤ کی بربادی، واجد علی شاہ کی نامرادی اور باشندگان مملکت (زن و مرد) کی زبوں حالی کا مرقع کئی شاعروں نے کھینچا ہے، مثلاً میر انیس نے "فریاد" اور قلق نے شہر آشوب لکھ کر دلی جذبات کا اظہار کیا ہے"۔ ص ۴۵

"فریاد" کے عنوان سے میر انیس نے کوئی نظم نہیں لکھی ہے، البتہ مسدس ترجیع بند کی صورت میں ان کی ایک منقبت ملتی ہے جس میں ترجیع کا ایک مصرع یہ ہے: "یا امیر المومنین فریاد ہے"

اگر مقالہ نگار کی مراد اس منقبت سے ہے تو اس میں انتزاعِ سلطنت وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ انیس نے صرف اپنی ذہنی پریشانی، افسردگی اور زمانے کی دشمنی کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ بریں قوی گمان یہ ہے کہ یہ انتزاع سے بہت پہلے انیس کی نوعمری کا کلام ہے۔

۶۔ باب دوم "تصانیفِ منیر شکوہ آبادی" اس جملے سے شروع ہوتا ہے: "منیر نے اپنی زندگی میں تقریباً پچاس ساٹھ ہزار اشعار ضرور کہے مگر کلام کا بیشتر حصہ تلف ہو گیا، تاہم جو کلام ہم تک پہنچا ہے ان کی مجموعی تعداد ۳۷ ہزار (اشعار) سے کم نہیں"۔ ص ۹۷

اس بیان کی روشنی میں یہ سمجھنا چاہیے کہ منیر کے قریب سینتیس ہزار شعر محفوظ ہیں اور تیرہ ہزار سے تیئیس ہزار تک شعر تلف ہو گئے۔ اس صورت میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کے کلام کا "بیشتر حصہ" باقی رہ گیا نہ کہ تلف ہو گیا۔

۷۔ صفحہ ۹۷ پر منیر کے دستیاب شعروں کی تعداد قریب سینتیس ہزار معین کرنے کے بعد صفحہ ۱۰۹ پر یہ جملہ ہے:

"منیر کے دواوین میں لاکھوں کی تعداد میں اشعار ملتے ہیں"۔ مبالغہ اور تناقص بیان ظاہر ہے۔

۸۔ منیر کے چھتیس شاگردوں کے نام لکھے گئے ہیں (ص ۱۰۷-۱۱۶)۔ ان میں سے صرف ایک شاگرد (نواب واجد علی خاں رضوان) کے نام کے ساتھ "مرحوم" لکھا ہے جس سے بقیہ پینتیس شاگردوں کے بہ قید حیات ہونے کا مفہوم نکل سکتا ہے۔ "مرحوم" کا لفظ یا تو سب کے ساتھ ہونا چاہیے تھا یا بہتر تھا کہ کسی کے بھی ساتھ نہ ہوتا۔

۹۔ واجد علی شاہ کے عہد کے ذکر میں لکھا ہے: "اس زمانے میں جو شان و شوکت لکھنؤ میں تھی ہندوستان بھر میں کہیں نظر نہ آتی تھی، جیسا کہ خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں . . ."۔ ص ۱۲۹

لیکن خواجہ حسن نظامی کا جو اقتباس دیا گیا ہے اس میں لکھنؤ کی شان وشوکت کا کوئی مذکور نہیں بلکہ صرف یہ بتایا گیا ہے کہ جب واجد علی شاہ نے اپنی فوج کو مرتب کرنا شروع کیا تو انگریزوں نے انہیں اس سے روک دیا جس کے بعد بادشاہ امور سلطنت سے غافل ہو کر عیش وعشرت میں پڑ گئے۔

۱۰۔ عہد شاہی کی عیش پسندی کے ذکر میں لکھا ہے: "اس زمانے کی مشہور عمارتیں مثلاً رومی دروازہ، دل کشا، دل آرام باغ، لال بارہ دری لکھنؤ کی عیش پسندی کا ثبوت ہیں۔" ص ۱۲۹

لکھنؤ کی عیش پسندی کے ثبوتوں میں رومی دروازے کو شامل نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ اس کی تعمیر کے ساتھ عیاشی کا کوئی مقصد وابستہ نہیں تھا۔ یہ آصفی امام باڑے کے سلسلے کی عمارت ہے اور اسے آصف الدولہ کی مذہبی عقید ےمندی کا ثبوت البتہ کہا جا سکتا ہے۔

۱۱۔ "آتش جیسے صوفی بزرگ کے قلم سے اس طرح کے شعر نکلنے لگے ...." ص ۱۳۱

آتش کو صوفی بزرگوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ شعر میں تصوف کے مضمون نظم کر دینا اور بات ہے اور تصوف کی عرفانی راہ کا سالک ہونا اور بات ہے۔ ●●

---

* تبصرہ نگار نے تھیسس نگار کا نام نہیں لکھا یہ ان کی شرافت تھی، لیکن مسئلہ کوئی ذاتی عناد کا تو نہیں ہے، علم میں اضافہ کی بات ہے اس لیے ہمارے خیال میں نام کے اظہار میں کوئی حرج نہیں اور اس لیے ہم نے ہر جگہ کی مانند، یہاں بھی عنوان میں تھیسس نگار کا نام دے دیا ہے۔ (مدیر)

ڈاکٹر نیر مسعود
شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد حسن کا تھیسس

لکھنؤ کی ادبی و لسانی خدمات

یہ مقالہ خوبیوں سے خالی نہیں ہے لیکن اس میں جا بجا تحقیق کے اصول اور طریق کار کی خلاف ورزی بھی ہوئی ہے۔ ہمارا جائزہ انہیں خلاف ورزیوں تک محدود رہے گا تاکہ اس حیلے سے تحقیق کے بعض مسائل سامنے آجائیں۔ (چونکہ بحث صرف تحقیق کے مسائل سے ہے اسلئے مقالہ نگار کے نام کا اظہار ضروری نہیں سمجھا گیا۔*)

اس غیر مطبوعہ تھیسس کا عنوان ہے "لکھنؤ کی ادبی و لسانی خدمات" یہ مقالہ لکھنؤ یونیورسٹی میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے لکھا گیا تھا۔

۱۔ پہلے باب میں لکھنؤ (اور مختصراً دہلی) کی تاریخ اور تہذیب کا جائزہ لیا گیا ہے لیکن کسی تاریخی بیانات کے ماخذوں کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔

۲۔ اس باب میں کئی بیان غیر ذمہ داری کے ساتھ دیے گئے ہیں، مثلاً:

"یہ دہلی کا وہ زمانہ تھا کہ سید برادران نے بادشاہ گر کا مرتبہ حاصل کر رکھا تھا۔ روز نئے نئے بادشاہ بنائے جاتے تھے اور جو کوئی ذرا بھی سید برادران کی مرضی کے خلاف اپنی خواہش اور طاقت سے کام کرنا چاہتا تھا قتل کرا دیا جاتا تھا۔" ص۹

اس بیان سے دھوکا ہوتا ہے کہ سید برادران نے بہت بڑی تعداد میں بادشاہوں کو تخت نشین اور قتل کرایا۔ یہ بڑا مبالغہ ہے۔ سید برادران نے صرف ایک بادشاہ فرخ سیر کو قتل کرایا۔ دو بادشاہ رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ بیماری کی حالت میں تخت نشین کیے گئے اور کوئی تین تین مہینے کی حکومت کرکے طبعی موت مر گئے۔ چوتھے بادشاہ محمد شاہ کے زمانے میں خود سید برادران کا زوال ہو گیا۔

۳۔ کئی جگہ غیر منطقی انداز میں نتائج اخذ کیے گئے ہیں، مثلاً:

"اورنگ زیب کے عہد میں ملا نظام الدین سہالوی نے جب اپنے قصبے کے فسادات سے

تنگ آ کر لکھنؤ میں قیام کا ارادہ کیا تو عطیہ سرکار کے طور پر دو چار مقامات انہیں دے دیے گئے جو اپنے گرد و پیش کے بہت سے مکانات کے ساتھ آج بھی فرنگی محل کے نام سے مشہور ہیں یہی ملا نظام الدین سہالوی ہیں جن کا نصاب تعلیم درس نظامیہ کے نام سے مدت دراز سے ہندوستان میں ہی نہیں ممالک اسلامیہ کے مدارس میں رائج ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کتنی کتنی دور کے طلبا لکھنؤ میں جمع رہتے ہوں گے ص۸

اس بات سے کہ ملا نظام الدین کا نصاب تعلیم ممالک اسلامیہ میں رائج ہے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں کہ اورنگ زیب کے عہد میں لکھنؤ میں دور دور کے طالب علم جمع رہتے ہوں گے۔

۴۔ تاریخی شخصیتوں کے نام درج کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے مثلاً برہان الملک کو سعادت خاں کے بجائے سعادت علی خاں لکھا ہے ص ۹

۵۔ "محمد شاہ کے زمانے میں دہلی ایک نئے تمدنی تجربے سے گذر رہی تھی۔ زوال و تباہی کے منڈلاتے ہوئے سایوں میں رقص و سرود کی محفلیں، ادب و شعر کے چرچے، آرام و آسائش کے سامان سبھی ایک مخصوص سلیقے کے ساتھ پروان چڑھ رہے تھے۔" ص ۱۰

سیاسی زوال کے دور میں عیش و عشرت کی فراوانی کو "نیا تمدنی تجربہ" نہیں کہا جا سکتا۔ بہت سی سلطنتوں کا زوال عیش و آسائش سے پیوست رہا ہے، دہلی میں بھی یہ کوئی نئی صورت حال نہیں تھی۔

۶۔ ایک اور غیر محتاط بیان:

"اس میں بھی شک نہیں کہ وہ (بہو بیگم) دہلی سے آنے والے ہر شخص کی خاطر مدارت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتی تھیں۔" ص ۱۲

بہو بیگم کے وقت میں معلوم نہیں کتنے اور کس کس قسم کے لوگ دہلی سے ادھر آئے۔ بہو بیگم کا ان میں سے ہر شخص کی خاطر مدارات کرنا اور اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا محتاج ثبوت ہی نہیں خلاف قیاس بھی ہے۔ "اس میں بھی شک نہیں" لکھ کر اس ناقابل یقین بیان کی صحت پر اصرار کرنا مزید بے احتیاطی ہے۔ علاوہ بریں اس عہد کی تحریروں کے مطالعے سے بہت سے ایسے دہلوی نوواردوں کا سراغ مل سکتا ہے جن کا بہو بیگم سے کوئی سروکار نہ تھا۔

۷۔ شاہ فصیح افصح کے حالات میں میر حسن نے لکھا ہے کہ وہ مرزا بیدل کے شاگرد تھے اور "بزرگانش از مردم طائفان اند کہ طرف توران زمین است۔ عمرش قریب صد سال رسیدہ است۔ بہ کمال درویشی

در لکھنؤ تکیہ ساختہ و زانو بہ توکل دادہ بسر می برد و دیوانِ فارسی دارد "

مقالہ نگار میر حسن کا اقتباس نقل کر کے یہ خیال ظاہر کرتے ہیں:

"توران کی طرف سے آنے اور مرزا بیدلؔ کے شاگرد ہونے کی وجہ سے شاہ آفصح جیسے خلوت نشین بزرگ نے لکھنؤ میں شاعری شروع کر دی ہوگی" ص ۱۶

اس ایک جملے میں کئی باتیں محلِ نظر ہیں، مثلاً یہ کہ:

۱۔ افصح توران کی طرف سے آئے تھے: میر حسن نے یہ نہیں لکھا ہے بلکہ صرف یہ بتایا ہے کہ ان کے بزرگ توران کے تھے۔

۲۔ افصح نے لکھنؤ میں شاعری شروع کر دی ہوگی: یہ قیاس آرائی بھی مناسب نہیں۔ میر حسن ان کی عمر سو سال کے قریب اور ان کو صاحب دیوان بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ مرزا بیدلؔ کی شاگردی کے زمانے میں بھی شاعری کر رہے ہوں گے اور بیدلؔ کی شاگردی اختیار کرنے کا زمانہ افصح کے قیام لکھنؤ سے پہلے کا ہوگا۔

۳۔ افصح نے توران کی طرف سے آنے کی وجہ سے لکھنؤ میں شاعری شروع کی ہوگی: یہ قیاسی توجیہ قابلِ قبول نہیں۔ توران کی طرف سے آنا شاعری شروع کرنے کا سبب کیوں کر بن سکتا ہے۔

۴۔ مرزا بیدلؔ کے شاگرد ہونے کی وجہ سے افصح نے لکھنؤ میں شاعری شروع کی ہوگی: یہ توجیہ بھی مندرجہ بالا توجیہ کی طرح ناقابلِ قبول ہے۔ افصح کا لکھنؤ میں یا کہیں بھی اور کسی بھی زمانے میں شاعری شروع کرنا بیدلؔ کی شاگردی کے ساتھ مشروط نہیں کیا جا سکتا، بلکہ زیادہ امکان اس کا ہے کہ وہ شاعری شروع کرنے کے بعد بیدلؔ کے شاگرد ہوئے ہوں۔

۵۔ افصح خلوت نشین بزرگ تھے: یہ قیاس بھی بے محل ہے۔ میر حسن کا جو اقتباس مقالہ نگار نے درج کیا ہے اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ افصح درویش اور متوکل آدمی، اور چلنے پھرنے سے تقریباً معذور تھے۔ ان میں کسی بھی بات سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ تنہائی کی زندگی بسر کرتے تھے اور لوگوں سے ملتے جلتے نہیں تھے۔

۸۔ لکھنؤ میں اردو شاعری کے پہلے دور پر بحث کرتے ہوئے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"نثر کی طرف بھی ذہن متوجہ ہوئے، چنانچہ سوداؔ کا دیباچہ جو اب نایاب ہے اسی دور میں لکھا گیا۔" ص ۲۱

سبیل ہدایت کا دیباچہ جو سوداؔ نے اردو میں لکھا ہے کبھی نایاب نہیں تھا۔ کلیاتِ سوداؔ کے متعدد مخطوطوں کے علاوہ مطبوعہ ایڈیشن میں بھی یہ دیباچہ ملتا ہے اور دوسرے مصنفوں کی تحریروں میں بھی بہ کثرت نقل ہوا ہے۔

۹۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ دیباچہ سبیل ہدایت دہلی میں لکھا گیا تھا یا لکھنؤ میں؟

۱۰۔ "نوطرزِ مرصّع سے متاثر ہو کر دوسرے قصے اور کتابیں بھی لکھی گئیں لیکن وہ مقبول نہیں ہوئیں اور اب

نایاب ہیں۔ ان کتابوں میں میر امن کی باغ و بہار تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔" ص ۳۵

اس بیان سے باغ و بہار بھی ان کتابوں میں شامل ہو گئی "جو اب نایاب ہیں"۔

۱۱۔ رجب علی بیگ سرور نے "انشائے سرور" میں اپنے دور کی انشا پردازی کے اصول اور نمونے پیش کیے ہیں۔ ص ۳۹

"انشائے سرور" فن انشا پردازی پر کوئی کتاب نہیں بلکہ سرور کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

۱۲۔ عبدالحلیم شرر نے ایک جگہ محمد بخش مہجور کی "نورتن" کو "فسانۂ عجائب" کے بعد کی تصنیف قرار دیا ہے۔ مقالہ نگار نے شرر کا یہ بیان اس طرح حوالے میں پیش کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی شرر کے مؤید ہیں۔ دراصل "نورتن" "فسانۂ عجائب" سے پہلے کی تصنیف ہے۔

۱۳۔ غزل میں واردات عشق اور معاملہ بندی کے مضامین کے سلسلے میں مقالہ نگار کا کہنا ہے:

"ان واردات کی حقیقی اور سچی تصویریں لکھنؤ نے پہلی مرتبہ پیش کیں"۔ ص ۹۸

یہ دعویٰ درست نہیں۔ دہلی میں میر، درد، غالب، مومن وغیرہ کے یہاں بھی اس طرح کی شاعری کی مثالیں ملتی ہیں۔

۱۴۔ "سودا کے مرثیوں کی تعداد اکیانوے بتائی جاتی ہے... یہ تحقیق کرنا مشکل ہے کہ ان میں سے کتنے خود سودا کے کہے ہوئے ہیں۔ ..... ان سے قبل غزل نما، مثنوی نما اور چومصرع مرثیوں کا رواج تھا۔ سودا نے ان تین سہل شکلوں کے علاوہ منفرد، مستزاد، منفرد مثلث، مثلث مستزاد، مربع، مربع مستزاد، مخمس، ترکیب بند، ترجیع بند، مسدس، مسدس ترکیب بند کی لاتعداد شکلوں میں مرثیے کو رواج دیا"۔ ص ۱۰۱

جب یہ معلوم نہیں کہ سودا سے منسوب مرثیوں میں کتنے واقعی سودا کے ہیں تو یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان مرثیوں میں جو مختلف ہیئتیں نظر آتی ہیں وہ سب سودا ہی کی رائج کی ہوئی ہیں۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سودا نے اکیانوے مرثیے کہے اور بفرض محال ان میں سے ہر مرثیہ ایک الگ ہیئت میں ہے اور ہر ہیئت مرثیے میں مروج ہو گئی تو بھی سودا کی رائج کی ہوئی ہیئتوں کی تعداد اکیانوے سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اس لیے مقالہ نگار کا یہ کہنا کہ سودا نے "لاتعداد شکلوں میں مرثیے کو رواج دیا" تحقیق ناط بیانی کے بہت منافی ہے۔

۱۵۔ مرثیہ گوئی میں انیس و دبیر کے دور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس دور کے فوراً بعد ہی انیس کے بھائی میر انس اور میر مونس نے گویا انیس کی روایات کو قائم رکھا"۔ ص ۱۲۰

انیس اور میر مونس دونوں کی وفات ایک سال کے اندر ہو گئی، لہٰذا مونس کو دور انیس کے بعد کا مرثیہ گو قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۱۶۔ "مرزا اوج دبیر کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور حقیقتاً انھوں نے اپنے استاد کا نام روشن رکھا"۔ ص ۱۲۳

مرزا اوج، مرزا دبیر کے بیٹے بھی تھے، شاگرد بھی۔ بیٹا ہونے کا ذکر نہ کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی اس لئے کہ بات شعری روایت کی ہو رہی ہے، لیکن چونکہ اس سے پہلے انس اور مونس کو میر انس کا بھائی بتایا جا چکا ہے اس لیے یہاں پر یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اوج اور دبیر میں شاگردی اور استادی کے سوا کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا۔

۱۷۔ مثنوی سحر البیان پر بحث کرتے ہوئے مقالہ نگار فضائل علی خاں بے قید کی مثنوی کے متعلق مصنف بہار بے خزاں اور میر حسن کی رائیں نقل کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ بے قید کی مثنوی سے میر حسن نے کچھ اثر لیا ہوگا۔۔۔ لیکن اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ میر حسن کی مثنوی کو اس کا چربہ قرار دیا جائے۔ میر حسن کی مثنوی کا قصہ یقیناً اچھوتا اور نیا نہیں ہے۔ لیکن ندرت بیان سے جو پہلو پیدا کیے گئے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہیں اور اس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ پھر خارجی تفصیلات اور جزئیات نگاری خالصتاً اودھ کا عطیہ ہے اور اس میں بے قید یا کوئی اور دوسرا شاعر حصہ نہیں بٹا سکتا۔" ص ۱۲۷

بے قید کی مثنوی مقالہ نگار نے دیکھی نہیں ہے۔ اس صورت میں اس کی اور سحر البیان کی مماثلت یا مغائرت کے بارے میں انہیں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔

۱۸۔ مقالے کے آخر میں "کتابیات" کے نام سے ماخذوں کی فہرست دی ہے۔ اس میں زیادہ تر صرف مصنف اور کتاب کا نام دے دیا ہے، ایڈیشن کی تفصیل نہیں دی۔ اس کی بھی صراحت نہیں کی ہے کہ کون ماخذ کتاب کی صورت میں ہے اور کون صرف مضمون ہے۔ متعدد کتابوں اور مصنفوں کے ناموں میں غلطیاں ہیں، مثلاً

۱۔ سلیمن کی کتاب کا نام یوں لکھا ہے: "JOURNEYS THROUGH OUDH"

اصل نام یہ ہے "A JOURNEY THROUGH THE KINGDOM OF OUDH IN 1849-50"

۲۔۳۔ اسپرنگر SPRENGER کو "SPRINGLER" اور اس کی فہرست کا نام "OUDH CATALOGUE" لکھا ہے۔ فہرست کا نام ہے: "A CATALOGUE OF THE ARABIC, PERSIAN AND HINDUSTANY MANUSCRIPTS OF THE LIBRARIES OF THE KING OF OUDH"

۴۔۵۔۶ ۔ ۴۵ پر اندراج ہے "سید محمد زائر: سوانح سلاطین اودھ" اور ۵۲ پر "کمال حیدر: قیصر التواریخ" جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ دو مختلف مصنفوں کی دو مختلف کتابوں کے اندراج ہیں۔ دراصل یہ ایک مصنف کی ایک کتاب ہے۔ مقالہ نگار نے دونوں جگہ مصنف کا نام اور ایک جگہ کتاب کا نام غلط

لکھا ہے۔ مصنف کا نام سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی اور عرفیت سید محمد میر زا ئر ہے۔ ان کی مشہور تاریخ اودھ دو جلدوں میں ہے، پہلی جلد کا نام "سوانحاتِ سلاطینِ اودھ" اور دوسری کا "قیصر التواریخ" ہے۔ دونوں جلدوں کا مجموعی نام "تواریخِ اودھ" ہے۔

۷۔ منشی نول کشور کی تاریخ کا نام "نوادر العصر" دیا ہے۔ صحیح نام تواریخ نادر العصر ہے۔

۸۔ "قدرت اللہ شوق: تذکرہ" تذکرے کا نام "تکملۃ الشعرا" ہے۔

۹۔ "قائم چاندپوری: تذکرہ" تذکرے کا نام "مخزنِ نکات" ہے۔

۱۰، ۱۱۔ حمید اورنگ آبادی کو "حامد اورنگ آبادی" اور اس کے تذکرے "گلشنِ گفتار" کا نام "گلستانِ گفتار" لکھا ہے۔

۱۲۔ "اشہر: حیاتِ انیس" مصنف کا نام غلط ہے، صحیح امجد علی اشہری ہے۔

۱۳، ۱۴۔ "اشہر: حیاتِ رشید" مصنف کا نام سید آغا اشہر اور کتاب کا نام "حضرت رشید" ہے۔

۱۵، ۱۲۶ "نظامی پریس: شاہکار انیس"، ۱۲۷ "نظامی پریس: مراثی انیس" ان اندراجوں سے خیال ہوتا ہے کہ دونوں کتابیں ایک ہی مطبع نے چھاپی ہیں، درحالیکہ ۱۲۶ نظامی پریس لکھنؤ نے اور ۱۲۷ نظامی پریس بدایوں نے چھاپی ہے۔

۱۶۔ دوسرے ماخذوں کے برخلاف مذکورۂ بالا دونوں کتابوں کے ساتھ مصنف یا مرتب کی جگہ پر صرف مطبع کا نام دیا گیا ہے حالانکہ دونوں کتابوں کی ترتیب و تدوین میں خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ "شاہکار انیس" پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے اور "مراثی انیس" تین جلدوں میں نظم طباطبائی نے مرتب کی ہے۔

۱۷۔ "فرح بخش: تاریخِ فرح بخش" تاریخِ فرح بخش کے مصنف کا نام فرح بخش نہیں محمد فیض بخش ہے۔

**

---

* تبصرہ نگار نے تھیسس نگار کا نام نہیں لکھا ہے، ان کی تعارفات تھی لیکن مسئلہ کوئی ذاتی عناد کا تو ہے نہیں علم میں اضافہ کی بات ہے اس لئے ہمارے خیال میں ناموں کے اظہار میں کوئی حرج نہیں اور اس لئے ہم نے ہر جگہ کی مناسبت سے نہی عنوان میں تھیسس نگار کا نام دے دیا ہے۔ (مدیر)

ڈاکٹر محمد حسن
شعبۂ اردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی

جواب

اردو ریسرچ کانگریس کے لیے ڈاکٹر نیر مسعود نے میرے تحقیقی مقالے "لکھنؤ کی ادبی و لسانی خدمات" پر جو مضمون لکھا ہے اس کے بارے میں جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ مختصراً یہ ہے۔

۱۔ ڈاکٹر مسعود لکھتے ہیں کہ "... کچھ بیان غیر ذمہ داری کے ساتھ دیے گئے ہیں مثلاً "یہ دہلی کا وہ زمانہ تھا کہ سید برادران نے بادشاہ گر کا مرتبہ حاصل کر رکھا تھا روز نئے نئے بادشاہ ملائے جاتے تھے اور جو کوئی ذرا بھی سید برادران کی مرضی کے خلاف اپنی خواہش اور طاقت سے کام کرنا چاہتا تھا قتل کرا دیا جاتا تھا۔ ص ۹ اس بیان سے دھوکا ہوتا ہے کہ سید برادران نے بہت بڑی تعداد میں بادشاہوں کو تخت نشین اور قتل کرایا"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سید برادران بادشاہوں کو قتل کراتے تھے "بادشاہ گر" سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ بادشاہ بنانے کی مہم میں ان کا دخل رہتا تھا۔ اسی طرح "جو کوئی ذرا بھی" سے صرف بادشاہوں کی سرتابی مراد نہیں ہے امیروں اور امیر زادوں اور اہلِ دربار کی سرتابی بھی مراد ہے (دیکھیے جادو ناتھ سرکار)۔

۲۔ ڈاکٹر مسعود لکھتے ہیں کہ: "... کئی جگہ غیر منطقی انداز میں نتائج اخذ کیے گئے ہیں مثلاً "اورنگ زیب کے عہد میں ملا نظام الدین سہالوی نے جب اپنے قصبے کے فسادات سے تنگ آ کر لکھنؤ میں قیام کا ارادہ کیا تو عطیۂ سرکار کے طور پر دو چار مقامات انھیں دے دیے گئے جو اپنے گرد و پیش کے بہت سے مکانات کے ساتھ آج بھی فرنگی محل کے نام سے مشہور ہیں یہی ملا نظام الدین سہالوی ہیں جن کا نصاب تعلیم درس نظامیہ کے نام سے مدت دراز سے ہندوستان میں ہی نہیں ممالک اسلامیہ کے مدارس میں رائج ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کتنی کتنی دور کے طلبا لکھنؤ میں جمع رہتے ہوں گے۔" اس بات سے کہ ملا نظام الدین کا نصاب تعلیم ممالک اسلامیہ میں رائج ہے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں کہ اورنگ زیب کے عہد میں لکھنؤ میں دور دور کے طالب علم جمع رہتے ہوں گے"۔ یہ نتیجہ ایسا غیر منطقی نہیں ہے کیوں کہ رائج ہونا اس زمانے میں جب کہ چھاپے خانے کا رواج عام نہ تھا اکثر فارغ التحصیل طلبا اور اساتذہ ہی کے ذریعہ ہوتا تھا۔

۳۔ ڈاکٹر مسعود کا یہ کہنا کہ "... تاریخی شخصیتوں کے نام درج کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے مثلاً برہان الملک کو سعادت خان کے بجائے سعادت علی خاں لکھا ہے" (ص ۹) ممکن ہے سہو قلم ہو۔

۴۔ "محمد شاہ کے زمانے میں دہلی ایک تمدنی تجربے سے گزر رہی تھی۔ زوال و تباہی کے منڈلاتے ہوئے سایوں میں رقص و سرود کی محفلیں، ادب و شعر کے چرچے، آرام و آسائش کے سامان بھی ایک مخصوص سلیقے کے ساتھ پروان چڑھ رہے تھے" (ص ۱) میرے

اس بیان پر اعتراض ہے کہ: "سیاسی زوال کے دور میں عیش و عشرت کی فراوانی کو 'نیا تمدنی تجربہ' نہیں کہا جاسکتا۔ بہت سی سلطنتوں کا زوال عیش و آسائش سے پیوست رہا ہے۔ دہلی میں بھی یہ کوئی نئی صورت حال نہیں تھی۔"

دراصل: معترض بات کو سمجھے نہیں۔ عیش و عشرت کی فراوانی کہ کر فنون لطیفہ میں نئے تمدنی امتزاج کو مثلاً مصوری میں راجپوت طرز، موسیقی میں بنگلہ وغیرہ اور ایران کے ساتھ ہندوستانی عناصر کا ابھرنا، معاشرت میں نئی شائستگی ہی کا نتیجہ ہے جسے دہلوی تمدن کہا جاتا ہے تقریباً تمام تر محمد شاہی دور کا عطیہ ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی نقد میر میں آخری مضمون اور عبدالحلیم شرر کا گزشتہ لکھنؤ۔

۵۔ "اس میں بھی شک نہیں کہ وہ (بہو بیگم) دہلی سے آنے والے ہر شخص کی خاطر مدارت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتی تھیں" (ص ۱۴) میرے اس بیان پر اعتراض ہے کہ: "بہو بیگم کے وقت میں معلوم نہیں کتنے اور کس کس قسم کے لوگ دہلی سے اودھ آئے۔ بہو بیگم کا ان میں سے ہر شخص کی خاطر کرنا اور اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا محتاج ثبوت ہی نہیں خلاف قیاس بھی ہے۔ 'اس میں بھی شک نہیں' لکھ کر اس ناقابل یقین بیان کی صحت پر اصرار کرنا مزید بے احتیاطی ہے۔ علاوہ بریں اس عہد کی تحریروں کے مطالعے سے بہت سے ایسے دہلوی نو واردوں کا سراغ مل سکتا ہے جن کا بہو بیگم سے کوئی سروکار نہ تھا۔" سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ ہر شخص سے مراد ادبی شخصیتیں ہیں اور یہ خیال کرنا کہ کس کس قسم کے لوگ آئے ہوں گے ایسے دور میں جب سفر کی اتنی آسانیاں نہ تھیں، درست نہیں۔ اور ایسے نو واردوں کا سراغ لگانا بھی مشکل ہے جن کا بہو بیگم سے کوئی سروکار نہ تھا۔

۶۔ "توران کی طرف سے آنے اور مرزا بیدل کے شاگرد ہونے کی وجہ سے شاہ افصح جیسے خلوت نشیں بزرگ نے لکھنؤ میں شاعری شروع کردی ہوگی۔" (ص ۱۶) میرے اس بیان پر اعتراض ہے کہ: "افصح نے توران کی طرف سے آنے کی وجہ سے لکھنؤ میں شاعری شروع کی ہوگی قیاسی تو ہے ہی قابل قبول نہیں۔ توران کی طرف سے آنا شاعری شروع کرنے کا سبب کیوں کر بن سکتا ہے؟"

معترض نے ایرانی اور تورانی بحث کو نظر انداز کر دیا ہے جو کہ اس دور میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے زیادہ تر ایرانی [illegible] نے فارسی میں شاعری اختیار کی، اور یہ روایت قائم کی جب کہ تورانی جماعت — (جو خود سیاست وقت پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی) ریختہ گوئی کی طرف زیادہ مائل تھی۔

۷۔ [illegible] اعتراض یہ ہے کہ: "افصح نے لکھنؤ میں شاعری شروع کی ہوگی یہ قیاس آرائی بھی مناسب نہیں۔ میر حسن ان کی عمر سال [illegible] مناسب نہیں ظاہر ہے کہ وہ مرزا بیدل کے شاگرد ہی کے زمانے میں بھی شاعری کر رہے ہوں گے۔ [illegible] افصح کے قیام لکھنؤ سے پہلے کا ہوگا۔"

[illegible] شاعروں میں لکھے یہ کہاں مطلب نکلتا ہے کہ افصح لکھنؤ آنے

۱۲۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں کہ: "غزل میں واردات عشق اور معاملہ بندی کے مضامین کے سلسلے میں مقالہ نگار کا کہنا ہے "ان واردات کی صحیح اور سچی تصویریں لکھنؤ نے پہلی مرتبہ پیش کیں" (ص ۹۸) یہ دعویٰ درست نہیں۔ دہلی میں میر، درد، غالب، مومن وغیرہ کے یہاں بھی اس طرح کی شاعری کی مثالیں ملتی ہیں"۔ یہ جملہ اس بحث سے لیا گیا ہے جس میں لکھنؤ کی عشقیہ شاعری کی جسمانیت پر بحث کی گئی ہے۔ جسم کا یہ تذکرہ لکھنؤ کے دبستان شاعری پر خصوصیت سمجھا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ مثالیں ملنا اور بات ہے اور خصوصیت بن جانا دوسری بات ہے۔

۱۳۔ "سودا کے مرثیوں کی تعداد اکیانوے بتائی جاتی ہے۔ یہ تحقیق کرنا مشکل ہے کہ ان میں سے کتنے خود سودا کے کہے ہوئے ہیں۔ ان سے قبل غزل نما، مثنوی نما اور چومصرع مرثیوں کا رواج تھا۔ سودا نے ان تین سہل شکلوں کے علاوہ منفرد، مستزاد، معشر، مثلث مستزاد، مربع، مربع مستزاد، مخمس، ترکیب بند، ترجیع بند، مسدس، مسدس ترکیب بند کی لاتعداد شکلوں میں مرثیے کو رواج دیا" (ص ۱۰۵)۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں: "جب یہ معلوم نہیں کہ سودا سے منسوب مرثیوں میں کتنے واقعی سودا کے ہیں تو یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان مرثیوں میں جو مختلف ہیئتیں نظر آتی ہیں وہ سب سودا ہی کی رائج کی ہوئی ہیں۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سودا نے اکیانوے مرثیے کہے اور بہ فرض محال ان میں سے ہر مرثیہ ایک الگ ہیئت میں ہے، اور ہر ہیئت مرثیے میں مروج ہو گئی تو بھی سودا کی رائج کی ہوئی ہیئتوں کی تعداد اکیانوے سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اس لیے مقالہ نگار کا یہ کہنا کہ سودا نے "لاتعداد شکلوں میں مرثیے کو رواج دیا" تحقیقی محتاط بیانی کے بہت منافی ہے۔" یہ بھی بال کی کھال نکالنے والی بات ہے۔ لاتعداد سے مراد یہ ہے کہ شکلیں بہت سی ہیں، یہ مراد نہیں ہے کہ ان شکلوں کا شمار ہی ممکن نہیں ہے۔

۱۴۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں کہ: "مرثیہ گوئی میں انیس و دبیر کے دور کا ذکر کرتے ہوئے مقالہ نگار لکھتے ہیں: "اس دور کے فوراً بعد ہی انیس کے بھائی میر انس اور میر مونس نے گویا انیس کی روایت کو قائم رکھا" (ص ۱۲۰) میر انیس اور میر مونس دونوں کی وفات ایک سال کے اندر ہو گئی، لہٰذا مونس کو دور انیس کے بعد کا مرثیہ گو قرار نہیں دیا جا سکتا۔" وہ تو اس لیے دیا جائے گا کہ انھوں نے انیس ہی سے کسب نور کیا اور اسی روایت کو آگے بڑھایا۔ تاریخ وفات سے اس میں استدلال غلط ہے۔

۱۵۔ "میر اوج دبیر کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور حقیقتاً انھوں نے اپنے استاد کا نام روشن رکھا" (ص ۱۲۳) میرے اس بیان پر اعتراض ہے کہ "میر اوج دبیر کے بیٹے بھی تھے، شاگرد بھی۔ بیٹا ہونے کا ذکر نہ کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی اس لیے کہ یہ شاعری روایت کی بات ہی ہے لیکن چونکہ اس سے پہلے انس اور مونس کو میر انیس کا بھائی بتایا جا چکا ہے اس لیے یہاں پر یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اوج اور دبیر میں شاگردی اور استادی کے سوا کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا۔" یہ رشتہ داری کا تذکرہ غیر ضروری ہے۔ اس کا تذکرہ لازمی نہیں۔

۱۶۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں کہ "مثنوی سحر البیان پر بحث کرتے ہوئے مقالہ نگار دھائی علی خاں بے قید کی مثنوی کے متعلق مصنف بہار بے خزاں، دو حسن کی رائیں نقل کرتے ہیں اور لکھتے ہیں: "اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ بے قید کی مثنوی سے میر حسن نے کچھ اثر لیا ہوگا۔"

لیکن اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ میر حسن کی مثنوی کو اس کا چربہ قرار دیا جائے۔ میر حسن کی مثنوی کا قصہ یقیناً ایجی اور نیا نہیں ہے۔ لیکن ندرت بیان سے جو پہلو پیدا کیے گئے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے اور اس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ پھر خارجی تفصیلات اور جزئیات نگاری خالصتاً اودھ کا عطیہ ہے اور اس میں نے قید یا کوئی اور دوسرا شاعر حصہ نہیں بٹا سکتا۔" (ص ۷، ۱۲) نے قید کی مثنوی مقالہ نگار نے دیکھی نہیں ہے۔ اس صورت میں اس کی اور سحر البیان کی مماثلت یا مغائرت کے بارے میں انھیں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ "یہ فیصلہ مصنف بہار بے خزاں کا ہے۔

۱۷۔ ڈاکٹر میر مسعود کا یہ کہنا درست ہے کہ: "مقالے کے آخر میں 'کتابیات' کے نام سے ماخذوں کی فہرست دی ہے۔ اس میں زیادہ تر صرف مصنف اور کتاب کا نام دے دیا ہے، ایڈیشن کی تفصیل نہیں دی۔ اس کی بھی صراحت نہیں کی ہے کہ کون ماخذ کتاب کی صورت میں ہے اور کون صرف مضمون ہے۔ یہ غلطیاں تسلیم ہیں، پورے تحقیقی مقالے کی چار کاپیاں ۴۸ - ۱۹۴۷ء کے روح فرسا فرقہ وارانہ فسادات اور تقسیم ملک کے حالات میں اپنے ہاتھ سے لکھی گئی ہیں۔ یہ جواز نہیں ہے مگر سبب ضرور ہے۔ جہاں تک کتابوں اور مصنفوں کے ناموں میں غلطیوں کا سوال ہے تو یہ غلطیاں بھی ممکن ہے ہوں۔ اصل مقالہ پیش نظر نہیں ہے۔

●●

عمومی جائزے

ڈاکٹر ہارون ایوب

شعبۂ اردو
پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ

اردو ناول پر لکھے جانے والے تحقیقی مقالے

ناول آج کی مقبول صنف ادب ہے۔ یہ بڑے ہی شوق اور دلچسپی سے ہماری سوسائٹی کے ہر طبقہ میں پڑھی جاتی ہے۔ ناول کے قاری کے لئے یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو یا زبان وادب کے مطالعے سے اسے خاص لگاؤ ہو۔

ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ناول شائع ہوتے ہیں، جن کا اصل مقصد تفریح طبع ہوتا ہے، لیکن ان میں سے چند ناول ایسے نکل آتے ہیں، جن کو ہم ادبی ناولوں کے دائرے میں شامل کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ فنی نقطہ نظر سے دوسرے ناولوں سے خاصے مختلف ہوتے ہیں، جو زندگی کی سچی اور حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔

اردو ادب میں ناول نگاری کی صنف مغربی ادب کے اثر سے آئی ہے۔ اس صنف کو ہندوستانی ذہنوں نے جس تیز رفتاری سے قبول کیا یا اس صنف سے مطابقت پیدا کی، وہ اپنے آپ میں خود ایک مثال ہے یعنی بہت ہی قلیل عرصے میں قابل اعتراف ناولوں اور ناول نگاروں کی بڑی تعداد عالم وجود میں آگئی جس میں زندگی کی ہو بہو تصویر پیش کی گئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ زندگی کی تشریح بھی۔

ناول نگاری کا عروج پریم چند اور مرزا رسوا سے شروع ہوتا ہے۔ مرزا رسوا نے صرف ایک ناول امراؤ جان ادا ایسا پیش کیا، جو توجہ کا مرکز بن سکا۔ لیکن پریم چند نے حقیقت نگاری سے کام لے کر ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا، جو اس وقت کے سیاسی و سماجی مسائل بھی تھے اس لئے ان کے ناول بہت مقبول ہوئے جس میں ان کی تیکنک اور انداز بیان کو بہت بڑا دخل حاصل ہے۔

جس طرح پریم چند اردو ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی طرح ان پر لکھا جانے والا پہلا تحقیقی مقالہ (پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ" از جناب ڈاکٹر قمر رئیس) دوسرے مقالہ نگاروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔ یہ ایک مکمل اور جامع مقالہ ہے۔ اس میں پریم چند کی ناول نگاری کا جائزہ کچھ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ پریم چند کی ناول نگاری کا ایک ایک پہلو کھل کر سامنے آجاتا ہے، اور قاری کو ان کے مقاصد کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی ہے۔

اردو ناول نگاری پر دوسرا اور مستند کام ڈاکٹر یوسف سرمست کا مقالہ ہے، جو انہوں نے "بیسویں صدی میں اردو ناول نگاری" کے عنوان سے لکھا۔ اس مقالے میں ۲۰ ویں صدی کے ابتدائی ۵۰ سالوں میں لکھے گئے ناولوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، خاص طور پر ان ناولوں کو اس مقالے میں زیر بحث لایا گیا ہے جو انگریزی ناول کی تیکنک پر پورے اترتے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف سرمست نے یہ مقالہ لکھ کر صحیح معنوں میں تحقیق کا حق ادا کر دیا، اور ایسے کئی ناول نگاروں اور ان کی ناولوں کو زیر بحث لایا گیا، جو زمانے کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے جن کا ذکر ہمارے نقادوں نے اپنے تنقیدی مضامین میں بھی نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر یوسف سرمست کے مقالے سے پہلے کوئی مستند کام تو اردو ناول نگاری پر نہیں ہوا تھا، چونکہ جو تنقیدی سرمایہ اردو ناول نگاری پر موجود تھا، وہ صرف چند تنقیدی مضامین تھے، جو ہمارے مختلف نقادوں نے لکھے تھے۔ یہ چیدہ چیدہ مضامین نذیر احمد، شرر، سرشار اور پریم چند سے آگے کی بات نہ کہہ سکے اور بہت سے ایسے ناولوں اور ناول نگاروں کو چھوڑ دئے، جو واقعی اہم تھے اور جس کے نتیجے میں اہل علم اور بعد کے آنے والے احباب ان کارناموں سے بے خبر ہو گئے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست اپنے مقالے کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:

> "بیسویں صدی میں اردو ناول کے ارتقاء پر اب تک کوئی اہم تنقیدی اور تحقیقی کام نہیں ہوا ہے، حالانکہ یہی اردو ناول کے شباب کا زمانہ ہے اور اسی عہد میں ناول عالمی ادب کی تحریکات سے متاثر ہوا ہے اور اس نے فکر و فن کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ اس لئے اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو ناول نے بیسویں صدی کے ابتدائی پانچ دہوں میں جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں، ان کا مکمل طور پر تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا جائے۔"

اس مقالے میں تقریباً نصف صدی کے اہم ناولوں کو سمیٹ لیا گیا ہے، شاید ہی کوئی ایسا ناول ہوگا جو چھوٹ گیا ہو، کیونکہ ڈاکٹر یوسف سرمست نے بہت جانفشانی سے اس مقالے کو ترتیب دیا ہے اور اس کی قدر و قیمت سے اس لئے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ اردو ناول نگاری کی تحقیق او تنقید کی ہمیں نئی راہیں دکھاتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف سرمست کے بعد خاکسار نے ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان ہے "اردو ناول پریم چند کے بعد"۔ ابتدا کے ۵ سالوں کو چھوڑ کر، جہاں ڈاکٹر یوسف سرمست نے اپنا کام ختم کیا ہے، وہاں سے میں نے اپنے مقالے کا آغاز کیا ہے۔ ابتدائی ۱۵ سال یعنی ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۰ء کے درمیان جو ناول لکھے گئے ہیں وہ میرے مقالے اور ڈاکٹر یوسف سرمست کے مقالے میں ضرور مشترک ہیں۔ مثلاً لندن کی ایک رات، گریز، ایسی بلندی ایسی پستی، شکست،

میری حالیہ، جن پر ہم دونوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے غور و فکر کے بعد خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میں کوئی نئی بات تو نہ کہہ سکا ہوں اور نہ ہی دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے ڈاکٹر یوسف سرمست صاحب سے آگے جانے کی کوشش کی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر ۱۹۷۰ء تک کے ناولوں کو اپنے دائرے میں لے کر ان کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ کوئی اہم ناول چھوٹ نہ جائے۔ میں نے اپنے مقالے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی ہندوستان اور پاکستان میں لکھے جانے والے ناولوں کو الگ الگ ابواب میں رکھا ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ کون سا ناول کہاں کے حالات اور ماحول میں لکھا گیا ہے۔

میں نے جن ہندوستانی ناولوں کا ذکر کیا ہے، وہ ہیں۔ میرے بھی صنم خانے، سفینۂ غم دل، آگ کا دریا، ایک چادر میلی سی، رات چکور اور چاند، شب گزیدہ، پہلا اور آخری خط، دارا شکوہ، صلاح الدین ایوبی اور لہو کے پھول۔ پاکستانی ناولوں میں خدا کی بستی، علی پور کا ایلی، تلاش بہاراں، اداس نسلیں، آبلہ پا، آنگن اور خون جگر ہونے تک۔

میرے اس مقالے کے منظر عام پر آنے کے تقریباً ۳ سال کے بعد جناب ڈاکٹر اسلم آزاد صاحب کا مقالہ "اردو ناول آزادی کے بعد" منظر عام پر آیا۔ آپ نے الگ الگ ناولوں پر زور دینے کے بجائے، ناول نگاروں کو اہمیت دی، اور ان کے تمام ناولوں کو لے کر عناصر ترکیبی کے نقطۂ نظر سے پرکھا۔

بلاشبہ انداز تو بہت نفیس ہے لیکن آپ نے کسی نئے ناول یا ناول نگار کو اپنے مقالے میں شامل نہیں کیا ہے بلکہ بلونت سنگھ، حیات اللہ انصاری اور فضل احمد کریم فضلی جیسے اہم ناول نگاروں کو چھوڑ دیا ہے، جن کا ذکر تفصیل سے میں اپنے مقالے میں کر چکا تھا۔ ڈاکٹر گیان چند جین ڈاکٹر اسلم آزاد کے مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"آزادی سے پہلے کے ۱۱ برسوں کو چھوڑ کر ہارون ایوب اور اسلم آزاد کا موضوع مشترک ہے۔ ہارون ایوب کی کتاب میں ۱۹۷۰ء تک کے ناولوں پر تفصیلی تبصرہ ہے، اس کے بعد کچھ ناولوں کا سرسری ذکر ہے، ضمیمے کے طور پر انہوں نے جیلانی بانو کے ناول "ایوان غزل" (۱۹۷۶ء) تک پر اظہار خیال کیا ہے۔ ہارون ایوب کی کتاب جون ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔ اسلم آزاد نے اپنی کتاب کا پیش لفظ اگست ۱۹۸۱ء میں لکھا، اس وقت تک ہارون ایوب کی کتاب کو بازار میں آئے تین سال گزر چکے تھے۔ کاش اسلم آزاد اس کتاب کی تقلید میں اپنے مقالے کو بھی حال تک لے آتے تو اس کی افادیت مزید بڑھ جاتی۔"

یہاں اس اقتباس کو پیش کرنے سے میرا مقصد قطعی اسلم آزاد صاحب کے مقالے پر تنقید کرنا نہیں ہے بلکہ ادبا ناقدین کے مقالوں کی روشنی میں، جن کا ذکر مختصراً اوپر کر چکا ہوں، اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ یہ طریقہ کچھ زیادہ

مناسب نہیں کہ کہی ہوئی بات کو پھر کہا جائے ۔ ہمیں ہر وقت کچھ نیا کہنے کی کوشش کرنا چاہیئے ۔ آگے بڑھنا ہمارے ریسرچ اسکالرز کا مقصد ہونا چاہیئے تاکہ وہ نئی سے نئی چیز تلاش کر کے لائیں اور بتائیں کہ ہمارے ادب میں یہ نیا لکھا جا رہا ہے، یا کوئی بات اگر چھوٹ گئی ہے تو اس کی طرف اشارہ کریں ۔

کسی نئے ناول پر قلم اٹھانے اور بات کہنے کی جسارت کی کمی کا بہت احساس ہو رہا ہے ، نہ تو اردو میں ناولوں کی کمی ہے اور نہ ہی تنقید نگاروں کی ۔ لیکن عجیب چیز ہے کہ سب ایک دوسرے کی طرف منہ دیکھتے نظر آتے ہیں ، کوئی اس کی مخالفت میں بات کہہ دیتا ہے تو باقی سب بھی مخالفت کرنے لگتے ہیں ، اگر حمایت میں بات کہی گئی ہے تب تو مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اسی وجہ سے ہر مقالے میں پریم چند ، کرشن چندر ، اور چند اہم ناول نگاروں اور ان کے اہم ناولوں کا ذکر بار بار مل جاتا ہے ، جس سے اب اکتاہٹ ہونے لگی ہے ۔

اس لئے ضروری ہے کہ ہم اب اس بنے بنائے جال سے آزاد ہو کر کچھ اپنے طور پر سوچیں اور کہیں جس طرح ایک ناول نگار سوچتا ہے اور لکھتا ہے بلا کسی جھجھک کے اپنی ناول کو منظرِ عام پر لے آتا ہے ، ٹھیک اسی طرح ہمارے ریسرچ اسکالرس کو سامنے آنا ہوگا ۔ تب تو مقالوں میں تبدیلی آئے گی ورنہ بات جہاں سے چلی تھی وہیں رہ جائے گی ۔ اور یہ سب اس وقت ممکن ہوگا جب اساتذہ اس سلسلے میں سخت اقدامات اٹھائیں گے ۔

میں طلبا اور اساتذہ سے استدعا کرتا ہوں کہ اردو ناول کی عمر اور موضوعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ، ڈاکٹر قمر رئیس کے مقالے کے انداز پر الگ الگ ناول نگاروں پر کام کرنے اور کرانے کو ترجیح دیں تاکہ اس ناول نگار کی تمام ناولوں کا مکمل طور پر جائزہ لیا جا سکے ، اس انداز پر اب تک جو بھی مقالے لکھے جا چکے ہیں وہ سب کے سب خاصے اہم ہیں اور ان کی قدر و قیمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے ۔ مثلاً اشفاق احمد صاحب کے مقالے "نذیر احمد کے ناول" یا "پریم چند کے ناولوں میں طبقاتی کشمکش" از احمد ندیم یا "شرر بحیثیت ناول نگار" از ڈاکٹر علی احمد ناظمی وغیرہ وغیرہ ۔

جن تین مقالوں کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ، ان کے مطالعے کے بعد یہ احساس بھی شدید ہوتا ہے کہ جیسے اب اردو ناول پر کچھ کہنے کو نہیں بچا ہے ۔۔۔ اب اگر کام ہو سکتا ہے تو ۱۹۷۰ء کے بعد کے ناول پر ۔۔۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ ان پچھلے ۱۱ سالوں میں خاصے اچھے اور اہم ناول لکھے گئے ہیں ، جن پر ایک مقالہ لکھا جا سکتا ہے ۔ مثلاً خواجہ احمد عباس کے ناول "انقلاب" ، خدیجہ مستور کا "زمین" ، انتظار حسین کا "بستی" اور تذکرہ قرۃ العین حیدر کا آخری شب کے ہمسفر اور کارِ جہاں دراز ہے ۔ ڈاکٹر قاضی عبدالستار کا غالب ، غلام الثقلین نقوی

کا "میرا گاؤں" اور نثار عزیز بٹ کا "کاروانِ وجود" وغیرہ وغیرہ۔

اب جب کہ ادارۂ تحقیقاتِ اردو کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ تو اس کے ذریعہ کچھ ایسا کام ہونا چاہیے کہ ہمیں بیک وقت پتہ چل جائے کہ کس موضوع پر کام ہو چکا ہے یا کام ہو رہا ہے۔ تب ہی ہم اپنے طالب علم کو روک سکیں گے اسی فقدان کی وجہ سے کئی کئی یونیورسٹیز میں ایک ہی موضوع پر طالب علم کام کر رہے ہیں جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو ناول کی عمر بہت کم ہے لیکن موضوعات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بس ذرا سی توجہ کی کمی ہے۔ اور اسی وجہ سے کوئی بہت معقول کام ابھی تک اردو ناول نگاری پر سامنے نہیں آیا ہے۔ سوائے ڈاکٹر یوسف سرمست اور ڈاکٹر قمر رئیس کے مقالوں کے۔ اور ابھی بہت سے ناول ایسے ہیں جن پر کام ہو سکتا ہے لیکن وہ لاپروائی کی وجہ سے اہلِ علم کی نظروں سے دور ہیں۔

••

جناب فرخ جلالی

شعبۂ تاریخ
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

سودا کے کلام پر تحقیق
(ایک جائزہ)

سودا پر دو سو برس سے توجہ دی جا رہی ہے اردو میں ادبی تحقیق کا رواج مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ انجمن ترقی اردو سے ہوا۔ شبلی کے بعد بابائے اردو عبدالحق نے اردو میں ادبی تحقیق اور جستجو کے کام کو آگے بڑھایا سودا پر پہلا تحقیقی مقالہ شیخ چاند نے ان کی نگرانی میں لکھا۔ برطانوی حکومت کی تعلیمی پالیسی ریسرچ کے خلاف تھی۔ اسی لئے ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ریسرچ اور وہ بھی ادبی تحقیق کا کام دیر سے شروع ہوا۔ لندن یونیورسٹی کے ایک شعبہ نے ادبی تحقیق کے کام میں دلچسپی لی۔

آزادی کے بعد اردو شعبوں میں تحقیق کے کام میں کچھ تیزی آئی۔ مگر شروع کے دور میں جو اساتذہ اس منصب تک پہنچے ان میں سے زیادہ تر ملازمت میں قدامت کے باعث مسند صدارت تک پہونچے۔ انہوں نے خود یا تو تحقیقی کام کیا ہی نہیں تھا یا اگر کیا بھی ہو تو چھپوانا کچھ حالات اور معیارات کے تحت مناسب نہیں خیال کیا۔ نام لینے کی ضرورت نہیں عام رجحان تھا اثر اب بھی باقی ہے۔ اس رجحان سے ایک نقصان یہ ہوا کہ اردو میں ادبی تحقیق کو ملامت اور مزاح کا ہدف بننا پڑا۔

شمالی ہند میں اردو کا ادبی رواج عام اٹھارویں صدی سے ہوا۔ جب بعض نگراں حضرات اس دور پر تحقیقی کاموں کے لیے وقت نہیں دے پا رہے تھے اس میں کچھ انتظامی مشکلات بھی تھیں۔ اس لیے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ادبیات پر کم توجہ ہوتی جا رہی ہے۔

سودا کی خوش نصیبی یہ ہے کہ ان پر ہر زمانہ میں توجہ کی گئی۔ انگریزوں نے اردو کے اعلیٰ معیار کی ضمانت سودا فہمی کو قرار دیا۔ برطانوی دور میں سودا کے سو سے زائد دیوان اور کلیات نقل کئے گئے اس مقالہ میں سودا کے کلام میں الحاق اور اغلاط کا ایک انبار جمع ہو گیا۔ قاضی عبدالودود کے علاوہ

یونیورسٹیوں میں شیخ چاند پروفیسر عتیق صدیقی ڈاکٹر خلیق انجم نے بہت وسیع اور وقیع کام سودا پر کیے۔
جب بحث اور جستجو بڑھ جاتی ہے تو تحقیق میں بہت سی راہیں کھل جاتی ہیں۔ سودا کو بنیادی طور پر قصیدہ کا شاعر مان لیا گیا۔ نصابی ضرورت کے لحاظ سے یہ بات ایک حد تک ٹھیک تھی لیکن ادبی تحقیق کی رو سے غلط تھی۔ میر جو قدیم تذکرہ نویس ہیں اور سودا کے غیر معمولی معترف ہیں۔ وہ سودا کی قادر الکلامی کے ذیل میں سودا کی قصیدہ گوئی کا ذکر کرتے ہیں۔ میر نے نکات الشعراء میں سودا کے سو اشعار کا انتخاب دیا ہے۔ ۹۷ اشعار غزل کے ہیں ایک رباعی ہے اور قصیدہ کے طرز کا ایک شعر دیا ہے۔ مختلف اندازوں کا اگر اوسط سامنے رکھیں تو ۱۱۶۴ھ میں سودا کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہے یعنی جن اشعار کی بدولت سودا ملک الشعراء کے منصب کے اہل قرار دیے جا رہے تھے۔ یعنی زبان ریختہ میں ان کی مقبولیت کی بنیاد غزل پر تھی۔ مختلف اصناف میں قادر الکلامی دلیل کمال مانی گئی تھی۔
مختلف ادوار میں سودا کے قصائد پر توجہ کی گئی۔ اور ان کی غزل پر توجہ کم سے کم دی گئی۔
شیخ چاند نے جب اپنا تحقیقی مقالہ ڈاکٹر عبدالحق کی نگرانی میں لکھا تو انہوں نے نواب صدر یار جنگ کے مشہور کتاب خانہ سے استفادہ کیا اور وہاں ایک نسخہ دیوان سودا کا ملا جس پر ان کی رائے ہے کہ یہ ۱۱۷۴ ہجری میں تحریر کیا گیا تھا۔ تب سے سودا کے کلیات میں اسی نسخہ حبیب کو ایک خاص حیثیت حاصل ہو گئی۔ بعد کو ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب "شیخ محمد رفیع سودا" طبع ۱۹۶۶ء میں اس نسخہ کا اشاریہ بھی دیدیا۔ جب ڈاکٹر عتیق صدیقی صاحب نے قصائد سودا پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا تب بھی نسخہ حبیب کی قدامت مسلم رہی۔ اور اب طے ہو گیا کہ معلوم اور مکشوف نسخوں میں نسخہ حبیب سب سے قدیم ہے۔ آجکل یہ نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ اس دیوان سودا میں جو ترقیمہ یا امضا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ یہ نسخہ ۱۱۷۴ء میں لکھا گیا۔ لیکن اس نسخہ پر ایک شبہ تو پروفیسر عتیق صدیقی نے یہ کیا۔ "کمال صعوبت و پریشانی (ترقیمہ میں کمال پریشانی ہے) میں لکھے جانے کے باوجود کاتب نے خوش نویسی کے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ قصائد اور غزلیات کی ابتدا میں سنہرے اور نیلے رنگ سے بہت خوبصورت لوح بنائی گئی ہے۔" قصائد سودا مرتبہ ڈاکٹر عتیق صدیقی (ص۱۰۴، ۱۰۵)
یہ بھی لکھا ہے کہ "محمد شاہ کی مدح کا قصیدہ" سے اشتہار تجھ سے مراے فلک جناب "اس میں شامل نہیں ہے۔ (قصائد سودا ص۵)"

جناب خلیق انجم نے فرمایا کہ "کلیات سودا کے اب تک جتنے قدیم نسخے ملتے ہیں ان میں سب سے قدیم نسخہ یہی ہے ۔" (مرزا محمد رفیع سودا از خلیق انجم ص ۴۴۵)

مزید تحریر فرمایا کہ ترقیمے کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ صادق مرزا (صادق علی مرزا) نے حافظ نظارت خاں کی فرمائش پر اس نسخہ کی کتابت اس وقت کی جب دہلی میں شاہ درانی کے حملے ہو رہے تھے ۔ ۱۷ ربیع الثانی ۱۱۷۴ھ کو اس کی کتابت مکمل ہوئی ۔"

یہ نسخہ خاصے بڑے سائز یعنی فولس کیپ (فلس کیپ) سائز سے ذرا بڑا ہے یعنی ۱۲ x ۸ انچ میں ہے ماوا زیادہ لگنے کے سبب سے کاغذ دبیز ہوگیا ہے مسطر ۱۲ سطر کا ہے ۔ ترقیمہ یا امضا کی مجوزہ تاریخ ۱۱۷۴ کے علاوہ پہلی تاریخ جو اس میں ملتی ہے وہ یہ !

"امروز بتاریخ نوزدہم شعبان روز یکشنبہ ۱۲۹۸ھ ہزار و دو صد نود و ہشت ہجری از رحیم بخش حلوائی کتاب مسطور یعنی دیوان سودا بقیمت مبلغ سہ روپیہ خرید شد ۔" یعنی ۱۲۴ برس تک کسی نے اس پر توجہ نہیں کی ۔ حلوائی نے رحم کر کے بچا لیا ہاں پہلی لوح پر ایک اور ملکیت کا دعویٰ موجود ہے الملک .... سید صابر عفی عنہ لیکن تاریخ نہیں ۔

نواب صدر یار جنگ جن کا نام نامی محمد حبیب الرحمن خاں تھا ان کی تحریر بھی ملاحظہ کیجئے ۔

ہدیہ سید احسن شاہ رئیس سردھنہ تحصیل داراترولی ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ دستخط محمد حبیب الرحمن خاں

سید احسن شاہ کے مورث انیسویں صدی میں افغانستان سے آئے حکومت نے ان کی پنشن مقرر کر دی اور سردھنہ ضلع میرٹھ میں ان کا قیام ہوا کچھ نے سرکاری ملازمتیں اختیار کیں سید احسن شاہ کے تین صاحبزادگان علیگڑھ میں رہتے ہیں سید احسن شاہ کا ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں انتقال ہوگیا انہوں نے علاوہ اثاثہ کے قلمی کتابیں بھی چھوڑیں جس کو ایک صاحب مدت ہوئی خرید کر لے گئے صاحبزادگان کی عمر اس وقت کم تھی ۔ قیاس ہے کہ یہ دیوان سید احسن شاہ کے والد نے خریدا تھا ۔

ترقیمہ کی عبارت مشہور رہے مگر نقل کی جاتی ہے "فقیر بحاصل بدحاصل ہماحصل گنہگار سیہ کار صادق علی میرزا معدوم الاحوال پریشاں خاطر و شکستہ روزگار بموجب فرمائش خان مہربان سراپا لطف احسان حافظ نظارت خاں سلمہ الرحمن بحکانہ (کذا) نواب ناظر مرحوم روز افزوں خاں انچہ کہ از دیوان مرزا رفیع السودا کہ نزد خود داشت درعین ہنگامہ شاہ درانی و مرہٹہ کفرہ و فجرہ کہ ہر روز نش روز مصیبت

و ہر شبش صعوبت بود وازکمال پریشانی کہ اسباب کتاب درست نداشت از بحواسی فرو تاً بطریق مسودہ باستعجال بجہت یادگاری بتاریخ ہفتدہم شہر ربیع الثانی مطابق سنہ ہجری یکہزار و یکصد ہفتاد و چار دربلدہ شاہجہاں آباد در حویلی برہان الملک مغفور انزوا اختیار کرد وقت سہ پہر اختتام تحریر نمود“

”یہ کہ خواند دعا طمع دارم زانکہ من بندہ گنہ کارم“

کتابت اس دیوان کی بہت خوشنما سائز شاندار سمجھ میں نہیں آتا کہ کمال پریشانی ایسی کتاب کی تحریر کیسے مکمل ہوئی۔ مصادر کے زمانوں پر نظر ڈالیے تو ماضی کی بات معلوم ہوتی ہے جب مرہٹوں اور شاہ درانی یعنی احمد شاہ درانی کا معرکہ گرم ہوا تو وہ دیوان سودا جو ”مسودہ“ کے طریق پر تھا جس پر سنہ تحریر ۱۷ ربیع الثانی ۱۱۷۴ھ تحریر تھا نقل کر لیا گیا اب نقل کرانے والے میں نظارت خاں خاص تھے۔ اب سوال اٹھتا ہے کہ کیا جب مرہٹے دہلی میں آ گئے تھے اور شاہ درانی بھی قریب تھا تب دیوان لکھا گیا۔ ۱۹ صفر ۱۱۷۴ھ کو نئے بادشاہ شاہ جہاں ثانی کو معزول کیا گیا شہزادہ جواں بخت بن شاہ عالم کو قائم مقام اپنے والد کا مقرر کیا مرہٹوں نے شجاع الدولہ کو وزیر مشہور کیا۔

۶ جمادی الآخر ۱۱۷۴ھ کو پانی پت کی خونیں جنگ ہوئی اس سلسلہ میں ہجری سال کے مہینوں کی ترتیب یاد رکھیے۔ ۱ محرم، ۲ صفر ۳ ربیع الاول ۴ ربیع الثانی ۵ جمادی الاول ۶ جمادی الثانی ۷ رجب ۸ شعبان ۹ رمضان ۱۰ شوال ۱۱ ذیقعدہ ۱۲ ذی الحجہ پانی پت کی جنگ اس کتاب کی تحریر کے باون دن کے بعد ہوئی۔ برہان الملک کا انتقال ۱۰ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۹ء کو ہو چکا تھا۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ ایسے زمانہ پر آشوب میں شاہ درانی اور مرہٹہ نعرہ کے الفاظ وہ دہلی والے استعمال جو نادر شاہ کا عذاب سہہ چکے تھے اور یہ شاہ درانی نادر شاہ کے حلیفوں میں رہ چکا تھا۔ اور مرہٹے دہلی میں موجود ہیں پانی پت کی جنگ نہیں ہوئی تھی اور یہ بے جا الفاظ اور تراکیب استعمال کی جا سکتی ہیں۔ اگر کی حویلی کا معاملہ معلوم کریں تو اچھا ہے۔

برہان الملک کا نام میر محمد امین تھا سعادت خاں کا لقب ملا تھا باپ کا نام میر محمد نصیر تھا۔ برہان الملک کے ایک بھائی تھے میر محمد باقر سیادت خاں متوفی ۱۱۴۴ھ سیادت خاں کا ایک لڑکا تھا جس کا نام نثار محمد شیر جنگ تھا تاریخ کی عام کتابوں میں برہان الملک کے ایک بیٹے کا ذکر کیا گیا ہے مگر تاریخ محمدی اور حارثی مرتبہ امتیاز علی عرشی سے معلوم ہوتا ہے کہ تین بیٹے تھے پانچ بیٹیوں کا ذکر تاریخ اودھ

کی کتابوں میں آیا ہے۔ لڑکوں کے نام یہ ہیں

۱ نیاز محمد خاں وفات ۱۱۳۴ھ

۲ شہاب الدین حیدر خاں ۱۱۵۰ھ

۳ ایک بیٹے کی وفات ۱۱۶۰ھ میں ہوئی جسکو قابل جانشینی نہیں قرار دیا جاسکتا تھا۔

برہان الملک کی وفات کے بعد وراثت اور جانشینی کا جھگڑا شروع ہوا برہان الملک اودھ کے صوبہ دار تھے بھتیجے شیر جنگ نے دعوی اودھ کی صوبہ داری کا کیا۔ نادر شاہ موجود تھے حالات صفدر جنگ جو بھانجا اور داماد تھا کے حق میں موافق ہو گئے۔ صفدر جنگ اودھ کے صوبہ دار ہو گئے تاریخ اودھ مصنفہ نجم الغنی خاں برہان الملک کے بعد کے رشتہ داروں میں ایک امیر اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کے عہد میں تھے نام ان کا مبارز الدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں حسام جنگ تھے نامی تخلص تھا میر کے شاگرد تھے پہلے لکھنؤ میں رہے پھر دہلی آگئے' ان کے والد کا نام سراج الدولہ غیاث محمد خاں نیشاپوری تھا قیامت تخلص کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ لکھنؤ میں ان کو ریاست کا خیال ہوگا ممکن یہی ہے کہ یہ برہان الملک کے بھائی سیادت خاں کے اخلاف میں ہوں حسام الدین حیدر خاں نامی کا انتقال ۱۸۴۲ء میں ہوا ان کے دو بیٹے تھے ایک کا تعلق بہادر شاہ کے دربار سے تھا وہ ذوالفقار الدین حیدر ناظر حسین مرزا کے نام سے مشہور تھے اس خاندان کے غالب سے بہت تعلقات تھے غالب کا ایک دیوان انہوں نے جمع کیا تھا ان کو نظارت خاں بہادر کا خطاب ملا تھا۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کے والد اکبر شاہ ثانی کے پاس ذاتی جائداد بہت بڑی تھی یہ حسین مرزا ناظر خاصہ" بھی تھے۔ اور شاید قیام اسی حویلی برہان الملک میں تھا۔ اسی دیوان کے آخر کے اوراق میں تقریباً اسی سیاہ قلم سے غالب کے دو شعر بھی لکھے ہیں شاعر کا نام کوثر لکھا ہے سب جانتے ہیں کہ دہلی میں غالب آخر تک مرزا نوشہ کے نام سے مشہور رہے کتابوں میں اس نام سے ان کے اشعار منتخب کئے جاتے تھے۔ غالب کے شعر یہ ہیں ؎

مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت ——— میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

ضعف میں طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے ——— بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

ان معروضات سے شبہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ سودا کا ایک قدیم دیوان جو اسباب ثابت

کے درست نہ ہونے کے سبب مطالعہ کے قابل نہ تھا دوبارہ خوبصورت لکھایا گیا دیوان کا کیمیاوی تجزیہ اس وقت ممکن نہیں موٹا ما واچڑھا ہوا ہے۔ میرے خیال میں کاغذ یا تو انگریزی ساخت کا ہے یا اس طرز کا ہندوستانی کاغذ ہے۔ اس دیوان کی سطریں بارہ ہیں جو قدیم کتابوں میں بہت کم پائی جاتی ہیں ائمہ کے نام سُرخ روشنائی سے خصوصیت سے لکھے گئے ہیں۔ اور ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ شاہ عالم اکبر شاہ اور بہادر شاہ کے دربار اور متعلقین دربار عماد الملک کا نام اچھی طرح عزت سے نہیں لیتے تھے۔ عماد الملک کی شان کے قصیدہ میں بس یہ لکھا ہے" قصیدہ سالگرہ عماد الملک ہے" یا توصیف عماد الملک" تحریر ہے عماد الملک نے شاہ عالم کے والد عالمگیر ثانی کو قتل کرایا تھا ۱۱۷۴ میں پانی پت کی جنگ سے پہلے عماد الملک کا نام اس طرح نہیں لکھا جا سکتا تھا عماد الملک اور برہان الملک کے ذاتی تعلقات خاندانی بہت اچھے تھے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ ناظر حسین مرزا کا کتاب خانہ ۱۸۵۷ میں لٹ گیا یوسف مرزا ان کے بھانجے تھے غالب کو بھی اس کتاب خانہ کے لٹنے کا غم تھا۔ شاید یہ دیوان انہی نظارت خاں[1] ناظر حسین مرزا کے لئے لکھا گیا ۱۱۷۴ میں لکھا جانا قطعی مشکوک اور بے اصل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب کوئی قدیم دیوان سودا کہیں ہے۔ مولانا آزاد لائبریری کے ذخیرہ سبحان اللہ میں ایک دیوان سودا ہے اس پر اردو ادب کے محققین کی نظر پڑ کر اُچٹ گئی ہے۔ ابواللیث صدیقی کی تحقیقی نظر نے اس دیوان سودا کو ۱۹۴۳ء میں دیکھا تھا۔ جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے۔ دیوان سودا کا یہ قلمی نسخہ اردو شاعروں کے مشہور تذکرہ نویس لچھمی نرائن شفیق کے کتاب خانہ میں تھا۔ نسخہ پر کئی جگہ لچھمی نرائن کی مہر بھی ثبت ہے۔ جس میں نام کے علاوہ ۱۱۷۶ھ تحریر ہے[2]"

پروفیسر ابواللیث صاحب نے شفیق کی عمر کا اندازہ نہیں کیا اس کی تصحیح امتیاز علی خاں عرشی مرحوم نے کر دی انہوں نے ۱۱۷۶ھ پڑھا جس کی تائید خلیق انجم صاحب نے بھی کی ہے۔ اصل میں مہر میں "لچھمی نارائن ۱۱۷۶" کھدا ہوا ہے تخلص شفیق مہر میں نہیں ہے میرے خیال میں یہی نسخہ یا اس کی نقل میر

---

[1] یہ بیان ... کا نتساب بھی نظارت خاں ہنا غلام رسول مہر نے خطوط غالب میں ان کا پورا نام ضیاء الدولہ جلیل الملک فتح الامرا احمد حسین نظارت خاں بہادر مستقیم جنگ لکھا ہے۔ [illegible] غالب مرتب غلام رسول مہر ص ۳۹
[2] رسالہ ... علی گڑھ ... [illegible]

کے سامنے بھی رہی تھی اور لچھمی نرائن کے پاس جب یہ دیوان پہونچا تو لچھمی نرائن نے غلام حسین آفق کے دیوان کے ساتھ مجلد کرالیا۔ یہ دیوان جو بہت سفر کرچکا تھا اس پر نئی جلد بندی کے دوران کاغذ کی پتلی سی چپتی بھی لگائی گئی۔ اور اب نئی جلد سازی کے بعد مالک کتاب نے اسی چپتی پر حاشیہ میں "لچھمی نرائن ۱۱۹۶" کی مستطیل مہر لگائی۔ دیوان آفق ۱۱۸۳ھ کا مکتوبہ ہے یعنی نئی جلد بندی ۱۱۸۳ھ کے بعد ہوئی۔ میری رائے میں سودا کے دیوان کا یہ قدیم ترین نسخہ ہے۔ جسکو سودا پر مستقل تحقیق کرنے والوں نے قابلِ لحاظ قرار نہیں دیا۔ سودا کے مطبوعہ دیوانوں کی پوری جستجو نہیں ہوسکی شیخ چاند نے سودا کے ایک مطبوعہ دیوان کا ذکر کیا جس کو انہوں نے شاید دیکھا نہیں تھا شیخ چاند لکھتے ہیں۔

۱۸۶۰ میں آگرہ میں قصائد کا انتخاب چھپا تھا" اس دیوان کی اطلاع خلیق انجم صاحب اور پروفیسر عتیق صدیقی نے بھی نہیں دی ہے۔ اس کتاب کا نام یہ ہے "انتخاب کلیات" قصائد وغیرہ۔ مرزا رفیع سودا کا جس کی شرح نصیر خاں نے باعانت جناب ڈاکٹر۔ ڈبلو اینڈرسن ایل ایل ڈی پرنسپل آگرہ کالج کے لکھے مطبع معدن فیض آگرہ میں طبع ہوا ۱۸۶۱ء۔

قصائد کا انتخاب نہیں ہے کلیات کا انتخاب ہے جس میں قصائد غزلیں نوحے وغیرہ شامل تھے یہ کلام سودا کی پہلی شرح معلوم ہوتی ہے۔ ۴۱۲ صفحات پر محیط ہے۔

●●

اردو تحقیق ہند و پاکستان میں

یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق کی رفتار
ایک جائزہ

ڈاکٹر کلیم الحق قریشی
شعبۂ اردو
حیدرآباد یونیورسٹی

(۱)

تنقید میں تحقیق کی ضرورت ہو یا نہ ہو لیکن تحقیق کے لیے تنقید ازبس ضروری ہے۔ تمام معیاری تحقیقی کارناموں کا تعلق تنقیدی شعور و بصیرت سے ہے

یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دانش گاہوں سے باہر جو تحقیقی کارنامے انجام دیے گئے ہیں اس کا خوشگوار اور مثبت اثر جامعات کے تحقیقی کاموں پر بھی پڑا ہے۔

اکثر اہلِ علم اور دانشور جامعات میں لکھے جانے والے تحقیقی مقالوں کو غیر معیاری تصور کرتے ہیں اس کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں اور ان کا تدارک بھی ممکن ہے۔

تحقیق میں موضوع کے انتخاب کی جو اہمیت ہے اس سے ریسرچ اسکالر کو پوری طرح باخبر رہنا چاہیے ایسے موضوعات جو ادب اور تحقیق کے لیے اہم اور ضروری ہوں انہیں کا انتخاب مناسب ہے ورنہ غیر اہم موضوعات پر تحقیقی کاموں کی کوئی اہمیت نہیں ہوا کرتی۔ بعض تحقیقی مقالے ایسی شخصیتوں پر لکھے گئے ہیں جن کی کوئی نمایاں ادبی خدمات بھی نہیں ہیں ان کی کچھ علاقائی اہمیت اس طرح ہوتی ہے کہ کوئی بااثر یا اونچی سیاسی شخصیت کے خاندان سے ان کا تعلق ہوتا ہے محض ایسے لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یا سہل پسندی کی بنا پر اس قسم کے موضوعات پر مقالے لکھنا اور لکھوانا ادب اور تحقیق کے ساتھ ایک ستم ظریفی متصور ہوگی۔ ہاں ان لوگوں پر ضرور کام ہونا چاہیے جو زمانہ کی ناقدری کا شکار اور ناموافق حالات اور غمِ روزگار کی وجہ سے گوشۂ گمنامی میں رہے ہوں مگر جن کی ادبی اور علمی خدمات ناقابلِ نظر انداز ہوں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ کوئی تحقیقی مقالہ ہر طرح سے مکمل اور حرفِ آخر نہیں ہو سکتا۔ کچھ پہلو ضرور تشنہ رہ جاتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک پہلو کو بہت زیادہ اجاگر کیا جاتا ہے اور دوسرے پہلو پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ اس میں مقالہ نگار کے ذوق، رجحان اور پسند کا بھی دخل ہوتا ہے ایسے مقالہ نگار موضوع سے پوری طرح انصاف

نہیں کرسکتے۔ جب کسی استاد کی نظر سے ایسے مقالے گذریں اور وہ یہ سمجھے کہ مزید تحقیق سے کچھ نئے گوشے سامنے آسکتے ہیں تو اس موضوع پر دوبارہ ضرور کام کیا جانا چاہیے مگر یہ مقالہ پہلے سے زیادہ مکمل اور وقیع ہو یعنی اس میں کچھ اضافے ضرور ہوں۔

موضوع تحقیق نیا اور اچھوتا ہو تو یہ صحیح ہے کہ مواد کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے لیکن اس سے ریسرچ اسکالر کی تحقیق سے دلچسپی قوتِ مشاہدہ اور تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ باصلاحیت ریسرچ اسکالر کی صحیح تربیت و رہنمائی سے ادب اور تحقیق کی رفتار میں ترقی کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں اور اس کے مفید اور بہتر نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں۔

ریسرچ اسکالر کا مطالعہ بہت زیادہ عمیق اور معلومات وسیع ہونے چاہئیں۔ اپنے موضوع کے تعلق سے تمام درکار معلومات کے بغیر مفید اور معلومات آفریں مقالہ کی تیاری ممکن نہیں یہی وجہ ہے کہ بیشتر مقالے ایک فارمولے کے تحت لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں بالخصوص "شخصیت، حیات اور کارنامے یا ادبی خدمات" پر جتنے بھی مقالے لکھے گئے ہیں ان میں بہت کم مقالات معیاری اور فارمولا قسم کے ٹائپ سے مختلف ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار جب کسی شخصیت پر کام کرنا چاہتے ہیں تو اپنے کام میں رہنمائی کے لیے ایسے ہی موضوع پر لکھے ہوئے کسی مقالہ کو منتخب کرلیتے ہیں۔ بعض مقالوں کے ابواب کی ترتیب میں بھی وہی یکسانیت پائی جاتی ہے گویا تحقیق کا سب سے آسان اور سستا نسخہ شخصیت، حیات اور کارنامے ہے۔ شخصیتوں پر کام کرنے والے ریسرچ اسکالرز میں تقلیدی روایات سے انحراف کی جرأت بھی ہونی چاہیے۔ اگر نگراں کار اس امر کا خیال رکھے تو تحقیقی مقالوں کی نقل و یکسانیت کا یہ سلسلہ ختم ہوسکتا ہے۔

(۲)

برصغیر کی یونیورسٹیوں میں تحقیق شدہ اور زیر تحقیق مقالوں کی فہرست کی ترتیب کا کام بھی ہر اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے اسے اردو والوں کی بے حسی اور بے تعلقی ہی کا نام دیا جانا چاہیے کہ ایک یونیورسٹی میں کن موضوعات پر تحقیقی کام ہو رہا ہے، اس سے دوسری یونیورسٹیوں کے پروفیسر لاعلم ہیں جس کی وجہ سے مختلف یونیورسٹیوں میں ایک ہی موضوع پر کام ہو رہا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی یونیورسٹی میں ایک موضوع پر کام ہو رہا ہو تو دوسری یونیورسٹی میں اس موضوع پر کام نہ کیا جائے۔ کوئی بھی مقالہ یا تحقیقی کام حرفِ آخر نہیں ہوتا اس میں جو

کمی یا خامی ہوتی ہے اس کی روشنی میں دوسرے تحقیقی کام کرنے والوں کو نئے گوشے تلاش کرنے اور قابل قدر اقدام کے ساتھ ساتھ مقالوں میں جگہ پانے والی غلط روایات وحکایات کی تردید وتدارک کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں ایک مقالہ نگار اپنے وسائل کی حد تک اپنی صلاحیتوں کے مطابق ایک مقالہ تیار کرتا ہے مگر ایک اور مقالہ نگار جو زیادہ علمی استعداد کا حامل ہو اور جس کے وسائل بھی زیادہ ہوں وہ زیادہ مستند مواد فراہم کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور اس کا تحقیقی کام زیادہ وقیع اور معتبر سمجھا جاتا ہے۔

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں جتنے بھی تحقیقی مقالے لکھے گئے اور ان پر جو ڈگریاں دی گئی ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر بہت کم مقالے زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئے ہیں۔ شائع شدہ بیشتر مقالے تو وہ ہیں جنہیں مقالہ نگاروں کی شخصی دلچسپی کا نتیجہ قرار دیا جانا چاہیے۔ یہاں معیار پیش نظر نہیں رکھا گیا بلکہ یہ جذبہ کارفرما ہے کہ اس طرح مقالہ نگار کو کم از کم ایک کتاب کا مصنف ہونے کا اعزاز حاصل رہے۔ غیر معیاری تحقیقی مقالوں پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بالعموم پروفیسروں یا نگراں کاروں سے شخصی وفاداریوں کا صلہ یا انعام ہی کہلائے گی۔ غلط بخشی کا یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی اکثر یونیورسٹیوں کا یہی حال ہے ہر جگہ تحقیق سے فطری مناسبت نہ رکھنے والوں کو دانش گاہوں سے دور رکھنے کے بجائے انہیں یونیورسٹیوں میں باوقار مقام حاصل ہوتا جارہا ہے۔ اس طرح ذہین باصلاحیت تحقیق سے لگاؤ اور فطری مناسبت رکھنے والے دانش گاہوں میں داخلوں سے محروم رکھے جاتے ہیں۔ اسے ایک قسم کی علمی بددیانتی اور تحقیق سے ناانصافی ہی تصور کیا جانا چاہیے لطف کی بات تو یہ ہے کہ جو پروفیسر اس قسم کی بددیانتی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور تحقیق کے لیے موزوں امیدواروں کے انتخاب میں کسی قسم کے دباؤ اور سفارش کو قبول نہ کرنے کی پُرزور تائید وحمایت کرتے ہیں وہ بھی عملاً اسی روش عام کے پابند ہوتے ہیں۔

یہ شکایت بھی عام ہے کہ جن اصحاب کو ڈگریاں دی گئیں وہ یونیورسٹیوں میں لیکچرر، ریڈر یا پروفیسر کی حیثیت سے کارگذار ہیں اور وہ تحقیق کو کمتر درجہ کا کام سمجھتے ہیں۔ تحقیق پر ان کی کتابیں تو دور کی بات ہے مضامین تک دیکھنے میں نہیں آتے ظاہر ہے ایسے افراد تحقیق کی راہ میں سنگ گراں کی حیثیت رکھتے ہیں ان سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے زیر نگرانی کام کرنے والے اصحاب کی صحیح رہنمائی کرسکیں گے۔ بس ایک بنے بنائے فارمولے کے تحت مقالہ ترتیب دیا جاتا ہے اور نگراں کار اس کو سند قبولیت بخشتا ہے اور دوسری یونیورسٹی سے بلایا جانے والا ممتحن آنکھیں بند کرکے اس پر صاد کردیتا ہے۔

تمام یونیورسٹیوں میں اب تک جو کچھ بھی تحقیقی کام ہوا ہے اگر ذی علم اصحاب، دانشوروں اور محققین کے ذریعے غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ سوائے چند اور بہت کم مقالوں کے باقی تمام مقالے ایسے ہوں گے جو "تحقیق" کی عبرتناک مثال ہوں گے انہیں مقالوں کو دیکھ کر کہا گیا ہے کہ تحقیقی مقالوں کو ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بیشتر نگران کار خود یہ نہیں جانتے کہ تحقیقی کام کیسا ہونا چاہیے اور کیسا نہیں ہونا چاہیے۔ معیار اس سے آگے کی منزل ہے۔

مختلف یونیورسٹیوں میں جو تحقیقی کام ہو رہا ہے اس سے دیگر یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور متعلق اصحاب کا باخبر رہنا ضروری ہے اس سے موضوعات کی تکرار اور ایک ہی موضوع پر مختلف یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام کو روکنے میں مدد ملے گی اور اگر ایک ہی موضوع پر مختلف جگہ کام ہو رہا ہے تو اس میں یکسانیت نہ ہوگی۔ یہ تحقیقی مقالے ایک دوسرے سے مختلف ہوں یعنی ایک پر دوسرے کی نقل کا گمان نہ ہو یا کسی موضوع پر کام ہو چکا ہو اور ایک مقالہ نگار یا ریسرچ اسکالر کو اس موضوع سے خاص دلچسپی ہو اور وہ اس موضوع پر کام کرنا چاہتا ہو یا نگراں کار کام کروانا چاہتا ہو تو پھر نقشِ ثانی کو نقشِ اول سے بہتر اور مکمل ہونے کی ضمانت حاصل ہونی چاہیے ورنہ تحقیق کے مقاصد اور تقاضوں کی تکمیل نہ ہو سکے گی اس طرح تحقیقی صلاحیتیں اور توانائیاں ضائع ہوتی رہیں گی۔ اردو ادب، شاعری، تذکرہ نگاری، تحریکیں، شخصیتیں، طنز و مزاح، جرائد و رسائل، افسانہ و ناول، مخطوطات، قدیم قلمی نسخے، اصلی نسخے اور بعد کے نسخوں میں فرق اور اس میں حذف و اضافہ، تقابلی مطالعہ، تنقید و تجزیہ، مختلف علاقوں میں اردو زبان و املا کا فرق اور تبدیلیاں اور ان پر علاقائی زبان و ادب کا اثر، ادبی معرکوں اور موازنوں میں جانبدارانہ رجحانات، مختلف ادوار میں اصنافِ سخن میں نئے تجربے وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن پر کچھ کام ہونے کے باوجود ابھی بہت کچھ کام ہونا باقی ہے۔ نئے نئے موضوعات پر اس طرح مفید اور قابلِ رشک تحقیقی کام کی ضرورت ہے جسے اربابِ علم و بصیرت اور اہلِ نقد و نظر کی تائید و توثیق حاصل ہونی چاہیے۔

(۳)

یونیورسٹیوں کی جانب سے پہلی بار پی ایچ۔ ڈی اسناد کا اجرا: اب تک کی معلومات کی روشنی میں ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانی جامعات میں الہ آباد یونیورسٹی کو پہلی بار پی ایچ۔ ڈی کی سند تفویض کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ڈاکٹر سید رفیق حسین کو ۱۹۴۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی کی جانب سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ لیکن یہاں اس سے اختلاف کی گنجائش بھی ہے اس لیے کہ ۱۹۴۲ء سے قبل یعنی ۱۹۳۹ء میں پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے پہلی بار

ڈاکٹر محمد صادق کو ان کے مقالے "محمد حسین آزاد، احوال و آثار" پر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی تھی۔ یہ مقالہ انگریزی میں لکھا گیا تھا عنوان تھا "MD. HUSAIN AZAD - HIS LIFE WORKS AND INFLUENCES"
بعد میں اس مقالے کو اردو میں منتقل کیا گیا اور ۷۶ ۱۹ء میں یہ مقالہ زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ گیا۔

چونکہ اس وقت تک ڈی۔لٹ کی تعیم عمل میں نہیں آئی تھی اس لئے پہلی بار پی ایچ ڈی کی ڈگری دینے کا سہرا پنجاب یونیورسٹی کے سر ہے اس اعتبار سے الہ آباد یونیورسٹی کو دوسرا مقام حاصل ہونا چاہیے۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا مقام بھی دوسرا ہے اس یونیورسٹی سے بھی پہلی بار ۱۹۴۲ء میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی پہلے ریسرچ اسکالر ہیں جنھوں نے یہ سند حاصل کی ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے بھی علیگڑھ ہی سے ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء میں پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی یہ گویا چوتھا مقالہ ہوا۔

پی ایچ ڈی کی پہلی سند دینے والی یونیورسٹیوں میں لکھنؤ یونیورسٹی چوتھے نمبر پر ہے یعنی ۱۹۴۵ء میں پہلی بار ڈاکٹر جگت نرائن ہیکروال کو ان کے مقالے "پریم چند، حیات اور تخلیقات" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کو پی ایچ۔ڈی کی سند کے اجرا کے سلسلے میں پانچواں مقام حاصل ہے ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر حفیظ قتیل کو ان کے مقالے "اردو غزل کا ارتقاء" پر یونیورسٹی کی جانب سے پہلی بار پی ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی۔ ان کا یہ مقالہ انگریزی میں لکھا گیا ہے آزادی سے قبل عثمانیہ یونیورسٹی کے تحقیقی مقالے انگلینڈ بھیجے جاتے تھے اور وہاں سے مقالوں کو مستند قرار دینے کے بعد پی ایچ۔ڈی کی ڈگری دی جاتی تھی اس لیے یہ مقالہ انگریزی میں لکھا گیا تھا۔

اتفاق کی بات ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے پہلے تحقیقی مقالے صنفِ غزل پر لکھے گئے ہیں اور ان کا عنوان بھی مفہوم کے اعتبار سے ایک ہی ہے۔ اور جامعات میں موضوع کے تکرار کی یہ پہلی مثال ہے۔

بمبئی یونیورسٹی کو چھٹا مقام حاصل ہے ۱۹۴۸ء ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی کو ان کے مقالے "سخنورانِ گجرات" پر پہلی بار یونیورسٹی کی جانب سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی ہے۔

دہلی یونیورسٹی کا ساتواں مقام ہے جہاں سے پہلی بار ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کو ۱۹۵۲ء میں ان کے مقالے "اردو میں مکتوب نگاری کا ارتقاء" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔

آٹھواں مقام بہار یونیورسٹی اور آگرہ یونیورسٹی کا ہے ان یونیورسٹیوں سے پہلی بار علی الترتیب ڈاکٹر محمد حسنین کو ان کے مقالے "فدوی عظیم آبادی، حیات اور شاعری" پر اور ڈاکٹر سید لطیف حسین کو ان کے مقالے "پنڈت رتن ناتھ سرشار اور اردو ادب" پر ۱۹۵۷ء میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگریاں دی گئیں۔

پٹنہ یونیورسٹی سے پہلی بار ڈاکٹر اختر احمد اورینوی کو ۱۹۵۰ء میں "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" پر ڈی لٹ کی ڈگری دی گئی۔

(۴)

تخصیات پر مقالے تقریباً تمام یونیورسٹیوں میں شخصیات پر کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے کس یونیورسٹی میں شخصیت پر کتنے مقالے لکھے گئے ہیں ذیل کی جدول سے اس کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے: پٹنہ یونیورسٹی ۲۹، لکھنؤ یونیورسٹی ۲۸، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ۲۷، بہار یونیورسٹی ۲۰، ناگپور یونیورسٹی ۱۵، الٰہ آباد یونیورسٹی ۱۴، دہلی یونیورسٹی ۱۴، عثمانیہ یونیورسٹی ۱۳، گورکھپور یونیورسٹی ۱۳، مگدھ یونیورسٹی ۱۳، بمبئی یونیورسٹی ۱۱، کشمیر یونیورسٹی ۹۔

ان کے علاوہ دوسری یونیورسٹیوں میں کہیں پانچ، چار، تین، دو اور بعض یونیورسٹیوں میں صرف ایک ہی شخصیت پر کام کیا گیا ہے۔ استاذ محترم پروفیسر گیان چند جین نے ایم۔ فل کے فرسٹ سمسٹر کے بعد ریسرچ اسکالرز کو موضوعات تجویز کرنے اور نگران کار کے ناموں کو قطعیت دینے کے لیے ایک میٹنگ طلب کی تھی اس میٹنگ میں دو ریسرچ اسکالروں نے ڈاکٹر حفیظ قتیل اور شاذ تمکنت پر کام کرنے کی بات کی تو پروفیسر گیان چند جین نے پر لطف انداز بیان اختیار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان دونوں حضرات کی موت کی وجہ سے یہ موضوعات دیے جا رہے ہیں ہمیں ان دو حضرات کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ پروفیسر گیان چند جین تحقیق کے اصول سے اتفاق کرتے ہیں اور اس کی بڑی حد تک پابندی بھی کرتے ہیں کہ زندہ لوگوں پر تحقیقی کام ہرگز نہ کیا جائے کیوں کہ کسی کی زندگی میں کیا جانے والا کام نامکمل ہوتا ہے اور کئی گوشے نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں موت بہت سی حقیقتوں کو بے نقاب کرتی ہے اور مروت یا کسی قسم کا دباؤ تحقیق کی راہ میں مانع نہیں ہوتا۔ پروفیسر گیان چند جین تحقیق کے جس اصول کی روشنی میں یہ بات کہہ رہے تھے اس وقت شاید انہیں یہ یاد نہیں رہا کہ خود ان پر دو جگہ یعنی عثمانیہ یونیورسٹی اور بنارس یونیورسٹی میں تحقیقی کام ہو رہا ہے اور ان ریسرچ اسکالرز کو انہوں نے بہت سا مواد اور معلومات بھی فراہم کی تھیں۔ اس بات کو کلیہ کے طور پر تسلیم کر لینا چاہیے کہ زندہ لوگوں پر کوئی تحقیقی کام کسی یونیورسٹی میں نہ ہو ایسی صورت میں تحقیق کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا اس کی بہتر مثال فراق گورکھپوری کی ہے ان کی زندگی میں جن جن نقادوں اور ادیبوں نے ان کے فنی محاسن اور شاعرانہ عظمت کے دعوے کیے تھے ان کی موت کے فوری بعد ان کی شخصی کمزوریوں اور معائب پر مضامین لکھے "فراق، شاعر اور شخص" مرتبہ نسیم حنفی میں شامل بعض مضامین اس کا بہترین ثبوت ہیں مگر اس کا کیا کیا جائے کہ بیشتر یونیورسٹیوں میں زندہ مصنفین، محققین اور شعرا پر تحقیقی کام ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں، کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی، فراق گورکھپوری،

جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض جب وہ حیات تھے ان پر تحقیقی کام ہو چکا ہے زندہ مصنفین میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد (بہار یونیورسٹی) پروفیسر آل احمد سرور (مگدھ یونیورسٹی، میرٹھ یونیورسٹی) علی سردار جعفری (بمبئی یونیورسٹی) عصمت چغتائی (میرٹھ یونیورسٹی، ایس وی یونیورسٹی، جموں یونیورسٹی) علی عباس حسینی (جموں یونیورسٹی) صالحہ عابد حسین (ناگپور یونیورسٹی) ٹھاکر پونچھی (جموں یونیورسٹی) اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (عثمانیہ یونیورسٹی) پر تحقیقی کام کرنے والے ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔

تحقیق کے ایک مسلمہ اصول سے یونیورسٹیوں کا یہ انحراف کسی دباؤ یا کمزوری کا ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔

کسی مشہور مصنف یا معروف شخصیت و شاعر کی موت کے دو چار سال کے وقفہ کے بعد اس پر تحقیقی کام کے لیے توجہ دینی چاہیے۔ استاذ محترم پروفیسر مغنی تبسم فرماتے ہیں کہ جب وہ پروفیسر مسعود حسین خاں کی زیر نگرانی فانی بدایونی پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے تو انہوں نے ہدایت کی تھی کہ فانی بدایونی کے دوست احباب، ملنے جلنے والے اور عزیز و اقارب سے جو مختلف مقامات پر رہتے تھے مل کر ان کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کریں کیوں کہ کسی مصنف یا شخصیت کی موت کے بعد بہت زیادہ تاخیر اس لیے مناسب نہیں کہ مصنف یا شخصیت کے دوست احباب، قریبی ربط رکھنے والے بھی اس دار فانی سے کوچ کر جاتے ہیں اور تحقیق کرنے والا اس طرح معلومات کے قیمتی ذرائع سے محروم رہ جاتا ہے۔

تحقیق کے معلم اول سے بے اعتنائی: ہندوستانی یونیورسٹیوں میں شخصیتوں پر لکھے گئے تحقیقی مقالوں کی فہرست میں معمولی درجہ کے لوگوں کے حالات زندگی اور ان کی ادبی خدمات شامل ہیں مگر اس وقت مجھے بڑی حیرت ہوئی جب کسی یونیورسٹی کی فہرست میں مجھے حافظ محمود خاں شیرانی کا نام دکھائی نہیں دیا تحقیقی نقطۂ نظر سے ان کی شخصیت اور ان کے تحقیقی کارناموں کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تحقیق میں حافظ شیرانی بہت اونچا اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔

یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ کی یہ حیرت انگیز غفلت بڑی معنی خیز اور سوچے سمجھے منصوبہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ خود پاکستان میں بھی تحقیق کے اس معلم اول پر پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹر مظہر محمود خاں شیرانی نے کام کیا ہے ورنہ پنجاب کو اردو کا مولد ثابت کرنے والے حافظ محمود خاں شیرانی پر تحقیقی کام نہ کیا ہوتا تو پاکستانی جامعات کی بھی یہ "دانستہ غفلت" ناقابل معافی تھی۔ ڈاکٹر مظہر محمود خاں شیرانی کا کام کوئی فرض کفایہ نہیں ہے کہ دوسری جامعات اب بھی اس طرف توجہ نہ دیں۔ حافظ محمود خاں شیرانی کے تحقیقی کارناموں کے مختلف پہلوؤں

پر کئی مقالے لکھے جاسکتے ہیں۔

(۵)

ایک ملاقات میں جناب مالک رام نے یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی مطالعہ سے عدم دلچسپی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ اساتذہ کسی طرح یونیورسٹیوں میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں یہی ان کا منتہائے مقصود ہوتا ہے اس لیے اس کے بعد مطالعہ سے غافل اور تازہ تحقیق سے بے خبر رہتے ہیں یہ شکایت اس قدر عام ہے کہ گنتی کے چند لیکچرروں اور پروفیسروں کو چھوڑ کر سب پر صادق آتی ہے۔ موقع دیکھتے ہوئے فوراً میں نے سوالنامہ پیش کر دیا:

"ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق کی رفتار و معیار سے کیا آپ مطمئن ہیں اور اگر نہیں تو آپ کے نزدیک اس کی کیا وجوہات ہیں؟ اور اس کے لیے آپ کیا مفید تجاویز پیش کرتے ہیں"

بہت دیر تک خاموش رہے اس کے بعد نہایت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق پر کوئی ٹھوس کام ہو ہی نہیں رہا ہے اور یونیورسٹیوں میں تحقیق کے نام پر جو کچھ بھی ہورہا ہے اسے تحقیق کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ جناب مالک رام نے فرمایا کہ اچھا آپ ہی بتائیے کے گذشتہ دس سال کے دوران میں کون سا قابلِ قدر تحقیقی کام ہوا کسی ایک مقالے کا نام لیجیے۔ میں نے ڈاکٹر حسینی شاہد کے شاہ امین الدین اعلیٰ پر لکھے گئے تحقیقی مقالہ کا ذکر کیا تو فرمایا کہ وہ کوئی پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں خاموش رہا تو جناب مالک رام نے فرمایا کہ گذشتہ دس برسوں میں کوئی خاص تحقیقی کام ہوا ہی نہیں ہے اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں جس انداز سے تحقیقی کام ہورہا ہے اور تحقیقی کاموں کے لیے جس قسم کے ریسرچ اسکالروں کا انتخاب کیا جارہا ہے وہ نہایت مایوس کن ہے۔ ان حالات میں اردو کے ریسرچ اسکالروں اور یونیورسٹیوں میں ہونے والے تحقیقی کاموں سے کوئی توقع رکھنا عبث ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور صدور شعبہ جاتِ اردو کے درمیان ایک خاص قسم کا ربط؛ (under- standing) اور سمجھوتا ہے یہ پروفیسر اپنی نگرانی میں کام کرواتے ہیں اور امتحان کے لیے دوسری یونیورسٹی یا دوسری ریاستوں کی کسی یونیورسٹی کے پروفیسر کو بلوالیا جاتا ہے جو ان ریسرچ اسکالروں کے تحقیقی کاموں کو قابلِ قبول قرار دیتے ہیں اور انہیں بآسانی ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی جاتی ہیں اور یہی ڈگریاں یونیورسٹیوں میں ملازمت کا واحد اور بہترین ذریعہ ثابت ہوتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد جناب مالک رام نے بڑے خاص انداز میں

فرمایا اچھا یہ بتائیے اب تک کسی یونیورسٹی میں کسی مقالہ نگار کا مقالہ مسترد بھی ہوا ہے ۔ یہ بات سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسا اب تک کہیں بھی نہیں ہوا ایک پروفیسر دوسرے پروفیسر کے امیدوار کو ناکام نہیں کرتا وہ ناکام کر بھی نہیں سکتا اگر وہ کسی پروفیسر کے امیدوار کو کامیاب نہ کرے تو پھر اس کے امیدوار یا زیر نگرانی کام کرنے والے ریسرچ اسکالر اور اس کے تحقیقی مقالے کا کیا ہوگا؟ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی یونیورسٹی میں کوئی مقالہ مسترد نہیں کیا گیا۔ کیا یہ سارے مقالہ نگار واقعی اس قابل ہیں یا تھے کہ انہیں یہ ڈگریاں دی جاتیں۔ مجھے جناب مالک رام کی صاف گوئی اور حقیقت بیانی نے بے حد متاثر کیا۔ معمولی اور غیر معیاری مقالوں پر جو ڈگریاں دی جاتی ہیں انہیں استناد کا درجہ کیسے حاصل ہو؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس پر ارباب علم و دانش اور مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور ملک گیر اساس پر ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ جو مقالے غیر معیاری ہوں انہیں بغیر کسی تامل اور مروّت کے مسترد کیا جاسکے ورنہ غیر معیاری مقالے اور کم عیار اصحاب مطلوب معیار اور تحقیق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوں گے ۔ اردو ادب کی تین ممتاز اور نامور شخصیتوں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر محمد حسن سے کون واقف نہیں ان کی تمام کتابیں اور مضامین تک ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے ہیں یا زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آتے ہیں مگر ان تینوں کے پی ایچ ڈی کے مقالوں کو آج تک اشاعت کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اگر ان کے یہ مقالے شائع کر دیے جائیں تو ان کی ادبی ساکھ اور مقام کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقالے شائع نہیں کیے جاسکے ۔ میں نے استاذِ محترم ڈاکٹر گیان چند جین سے ایک دفعہ اس کا ذکر کیا تو فرمایا کہ یہ اصحاب اپنے ان مقالوں کو موجودہ پوزیشن کے شایان شان نہیں سمجھتے ہوں گے یا پھر ان میں مناسب ترمیم و اضافہ کے لیے ان کے پاس وقت نہ ہو۔ ان جیسے اصحاب کے مقالوں کا جب یہ عالم ہو تو عام مقالہ نگاروں کی "تحقیقی کاوش" کے معیار کا اندازہ لگانا کوئی دشوار امر نہیں ہے ۔

میں نے جب جناب مالک رام سے خواہش کی کہ وہ میرے سوالنامے پر ان خیالات کو ضبط تحریر میں لے آئیں تو کہنے لگے کہ یہ وہ تلخ حقیقتیں ہیں جن سے انکار ممکن نہیں مگر یونیورسٹیوں کے بیشتر اساتذہ ایسے ہیں جو اسے ہرگز تسلیم نہیں کریں گے ۔

(۶)

جناب مالک رام سے ملاقات کے ایک سال بعد یعنی مارچ ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر جمیل جالبی پاکستان سے حیدرآباد تشریف لائے تو ڈاکٹر گیان چند جین نے ڈاکٹر جمیل جالبی سے میرا تعارف کروایا میں

نے انہیں اپنے تحقیقی مقالے کے موضوع سے واقف کرواتے ہوئے ان سے میرے سوالنامہ کا اطمینان بخش جواب دینے کی خواہش کی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے فرمایا کہ میرے خیال میں یونیورسٹیوں میں تحقیق کے غیر معیاری ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ایسے افراد جو تحقیق سے لگاؤ نہیں رکھتے وہ یونیورسٹیوں کا رُخ کرنے لگے ہیں۔ وہ اس پیشہ کو روزگار کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اس لیے تحقیق کی رفتار غیر اطمینان بخش ہے۔ میں نے ان کی بات سے ایک اور نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ ایسے افراد جو تحقیق کے اہل نہیں ہوتے انہیں یونیورسٹیوں میں کیسے داخلہ مل جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری آپ کس پر عائد کریں گے؟ یونیورسٹیوں میں تحقیق کے غیر معیاری ہونے کی وجہ کیا یہ نہیں ہو سکتی کہ یونیورسٹیوں کے ارباب مجاز و مقتدر اپنے عزیزوں کو اور ذی اثر اور متعلقہ اصحاب کے سفارشی امیدواروں کو اہل امیدواروں پر ترجیح دیتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ غیر معیاری تحقیق کی شکل میں سامنے آتا ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ایک اہم وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مختلف مقامات پر جو مقالات پڑھے ان میں ایک خاص بات میں نے نوٹ کی کہ جو محققین کے انھوں نے نام گنوائے تھے ان میں جناب مالک رام کا کہیں ذکر نہیں تھا میں نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے ادیبوں اور نقادوں کے نزدیک محققین کی وہ فہرست نامکمل ہے جس میں ان کا نام شامل نہ ہو۔ آپ کے پاس یہ نام قابل ذکر نہیں سمجھا گیا اس کی کیا وجہ ہے؟ ڈاکٹر جمیل جالبی نے قدرے تامل کے بعد جواب دیا کہ ان کے نزدیک محققین کے مختلف (CATEGORIES) ہیں اور وہ ان زمروں میں انہیں شمار نہیں کرتے۔

-●●

خدابخش لائبریری کی چند اہم مطبوعات

		قیمت
• ہندوستانی مسلمان عصری دستاویزات کے آئینہ میں (علی گڑھ تحریک ۸۵ - ۱۹۸۰ء)		۷۵/ روپے
• ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل	جناب سید حامد	۳۰/ روپے
• مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں	پروفیسر رشید احمد صدیقی، مرتبہ مہر الہی	۲۰/ روپے
• رقعات رشید صدیقی	" " مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں	۳۰/ روپے
• کانٹے (کشمیری انشائیے)	ڈاکٹر محمد زماں آزردہ	۱۵/ روپے
• اورنگ زیب (ایک نیا زاویۂ نظر)	ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد	۱۵/ روپے
• قومی یکجہتی کی روایت	مسٹر بی۔ این۔ پانڈے	۱۵/ روپے
• مقدمۂ طلسم ہوشربا	————	۴۰/ روپے
• طلسم ہوشربا (نو جلدیں)	————	۸۰۰/ روپے
• نوبت رائے نظر کے ماہنامہ "ادیب" الٰہ آباد (۱۳-۱۹۱۰ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ		۵۰/ روپے
• پیارے لال شاکر کے ماہنامہ "العصر" لکھنؤ (۱۷-۱۹۱۲ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ		۴۵/ روپے
• برج نرائن چکبست کے ماہنامہ "صبح امید" لکھنؤ (۲۱-۱۹۱۸ء) کے مضامین کا انتخاب		۵۰/ روپے
• قاضی عبدالودود کے ماہنامہ "معیار" کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ۔		۵۰/ روپے
• مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ "پیغام" کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ۔		۷۵/ روپے
• خوشتر گرامی کے ماہنامہ "زبان" (۲۹-۱۹۲۸ء) کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ		۵۰/ روپے
• جدید غزل گو نیاز فتحپوری کے ۱۹۴۰ء کے نگار کا ری پرنٹ، آٹوگراف اور تصاویر کے اضافہ کے ساتھ۔		۱۲۵/ روپے
• داستان میری (سوانح اور اہم معاصرین کا تذکرہ)	ڈاکٹر اقبال حسین	۲۰/ روپے
• تذکرۂ کاملان رامپور	مولفہ حافظ احمد علی خاں شوق، تصحیح و اضافہ شاء اللہ خاں و حکیم محمد حسین خاں شفا۔	۵۰/ روپے

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

ہندستانی جامعات میں اردو تحقیق

جاوید اشرف
خدابخش لائبریری، پٹنہ

اصناف ادب، خاکہ سوانح نگاری، دکنی ادب اردو نثر، داستان، ناول، افسانہ، ڈراما، طنز و مزاح، سفرنامہ، صحافت، تنقید، تدوین و ترتیب، لسانیات، کتابیات، اشاریے فرہنگ، تقابلی مطالعے، علاقائی ادب، علوم، قرآنیات، تاریخ جدوجہد آزادی، ادارے۔

اس فہرست میں جن جامعات کا احاطہ کیا جاسکا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

آگرہ، آندھرا، آسکل، الہ آباد، امراوتی، اناملائی، اودھ، اودے پور، بمبئی، بنارس، بنگلور، بہار، بھاگلپور، بھوپال، پٹنہ، پنجاب، پونا، تروپتی، جامعہ ملیہ، جبلپور، جموں، جواہر لال نہرو حیدر آباد، درگاوتی، دہلی، راجستھان، رانچی، روہلکھنڈ، ساگر، سیواسدن کالج برہانپور، شیواجی، عثمانیہ، علیگڑھ، کشمیر، کرناٹک، کلکتہ، گلبرگہ، گوہاٹی، لکھنؤ، متھلا، مدراس، مگدھ، مرہٹواڑہ، میرٹھ، میسور، ناگپور، وکرم۔

فہرست کے ماخذ حسب ذیل ہیں:

آج کل اگست ۱۹۶۷، اخبار اردو نومبر ۱۹۸۵، بائیوگرافی آف ڈوکٹورل ڈسرٹیشن، ہیومینیٹیز، کتاب نما جولائی ۱۹۷۸، ہماری زبان جولائی ۱۹۷۹، ۱۵، ۲۲ مئی ۱۹۷۹، ۱۹۷۹جون ۱۹۷۹، ستمبر ۱۹۷۹، ستمبر، دسمبر ۱۹۸۵، اور ۸۸-۱۹۸۹ کے متعدد شمارے، یونیورسٹی نیوز ۸۸-۱۹۸۹ کے شمارے، قومی آواز پٹنہ اور دیگر اخبارات۔

ان کے علاوہ مختلف دانش گاہوں اور اداروں کے ذمہ داروں کے ہم ممنون ہیں جنہوں نے معلومات فراہم کرنے میں ہماری بھرپور معاونت فرمائی۔ خصوصاً ہم جناب کلیم الحق قریشی صاحب (حیدر آباد) کے بھی شکر گزار ہیں کہ ان کی فہرست سے بھی ہمیں کچھ استفادہ کا موقع ملا (ہماری فہرست سے موصوف نے جو کچھ استفادہ کیا اس کا شکریہ وہ اپنے یہاں ادا کریں گے)

ہماری تیار کردہ فہرست کے مطابق سیرت کے موضوع پر اب تک صرف تین مقالے لکھے گئے، غالبیات میں ۱۲، اقبالیات میں ۳۴، آزادیات میں ۹، شخصیات (عمومی) میں ۵۰۴، نظم ۱۳، شاعری ۶۷، غزل ۱۹، مثنوی ۲۴، مرثیہ ۲۷، اردو ادب (عمومی) ۴۶، اصناف ادب ۳۲، خاکہ ۱۰، دکنی ادب ۲۵ نثر ۲۴، داستان ۱۵، ناول ۱۰۹، افسانہ ۴۷، ڈرامہ ۱۴، طنز و مزاح ۱۳، سفرنامہ ۴، صحافت ۲۳ تنقید ۲۷، تدوین و ترتیب ۵۶، لسانیات ۲۶، کتابیات فرہنگ و اشارات ۶، تقابلی مطالعے ۱۸ علاقائی ادب ۶۱، علوم ۱۳، جدوجہد آزادی ۷، ادارے ۸، ان تمام لکھے گئے مقالات کی مجموعی تعداد ۱۲۴۷ ہے۔

فہرست میں جابجا ستارے (*) جو نظر آتے ہیں وہ مطبوعہ مقالوں کی علامت ہیں جنکی مجموعی تعداد ۱۲۷ ہے جو

یقیناً اعداد شمار کی رو سے ایک تہائی کو بھی نہیں پہنچتی، حالانکہ تحقیق کے معیار و اعتبار بڑھانے اور غلط بخشی و سہل انگاری سے بچنے بچانے کے لیے علمی انکشافات اور کامیاب تحقیقی مقالات کی اشاعت کا اہتمام لازمی ہونا چاہئے، اس سلسلے میں متعلقہ یونیورسٹی، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، اکادمیاں اور دوسرے علمی، ادبی تحقیقی ادارے کوئی ایسا طریقہ کار وضع کر سکتے ہیں کہ وہ تحقیقی مقالات جو معیاری اور معلوماتی ہوں محض یونیورسٹی لائبریری یا یونیورسٹی کے دفتر میں مہر بند نہ رہیں بلکہ وہ منظر عام پر آسکیں اور جو معیاری نہ ہوں ان کے ضروری اقتباسات سامنے آجائیں۔

خدا بخش لائبریری نے ریسرچ کانگرس کے موقع پر اعلان کیا ہے کہ جو کامیاب مقالے اب تک چھپ نہ سکے ہوں ضروری ایڈیٹنگ کے بعد لائبریری، شائع کر سکتی ہے۔ اس سلسلے میں آگرہ یونیورسٹی سے مولانا آزاد پر ہندی میں اچھے کمار اگروال کی تھیسس بعنوان: "مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندستانی قومی تحریک" لائبریری شائع کر چکی ہے اور کچھ دوسرے مقالے بھی زیر اشاعت ہیں۔ اگر اسی طرح کچھ دوسرے ادارے بھی محققین کی حوصلہ افزائی کریں اور اپنی اپنی بساط بھر مقالوں کی اشاعت کا بیڑہ اٹھالیں تو نئی نئی تحقیقات سے دنیائے اردو ادب روشناس ہو سکے گی نیز تحقیق کا معیار و اعتبار بھی بلند ہوگا۔

تحقیق کے سلسلے میں دو چند تلخ حقائق اور دو چند اہم امور کی نشاندہی بھی ضروری ہے تاکہ تحقیق کے ساتھ ہو رہی بددیانتی، بے مروتی اور فریب دہی کا پردہ فاش ہو سکے۔ مثلاً کیے ہوئے کام پر کام کرنا، زندوں پر کام کرنا، محلہ پڑوس کے غیر اہم ادیبوں شاعروں پر کام کرنا، ٹھیکے پر کام کرنا اور کروانا تحقیق کے ساتھ ایک کھلا مذاق اور کھلی بد باطنی ہے۔

کیے ہوئے کام پر لفظی ہیر پھیر کا کام بھی ان دنوں خوب ہو رہا ہے جس کے ان گنت شواہد آئے دن دیکھنے سننے کو ملتے ہیں، اس طرح کے کام پر قدغن لگانے کی ضرورت ہے۔

ٹھیکے پر تحقیق کا کام بھی زور شور سے چل رہا ہے، بعض ذہین و فطین لوگوں نے تو باقاعدہ یہ تجارتی پیشہ ہی اختیار کر رکھا ہے حتی کہ بعض جامعات کے پروفیسر حضرات بھی اس حمام میں نہاتے دھوتے نظر آتے ہیں اگر اسی طرح تحقیق کی اشرفی سرِ عام بٹتی رہی تو اردو تحقیق محض کرائے کی تحقیق بن کر رہ جائے گی۔

اتنا ہی نہیں مختلف جامعات کے لکچرر، پروفیسر حضرات خود اپنے اوپر بھی اپنے طلبہ سے کام کروانے لگے ہیں حتی کہ خود انہی کی نگرانی میں ان پر کیے گئے کام کی مثال بھی ملتی ہے۔ جگہ جگہ عنوان بدل بدل کر یا ایک ہی عنوان سے ایک ہی شخصیت یا ایک ہی موضوع پر کام کرنے کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں وہ اپنی جگہ ہیں، ایک دوسری یونیورسٹی کے متعلقہ پروفیسروں میں بھی اپنے اپنے اوپر تبادلے میں کام کروانے کا تال میل ہوتا ہے مثال کے طور پر بہار ہی کی کسی یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر اپنی نگرانی میں گورکھپور کے ایک غیر ممتاز پروفیسر پر کام کروا رہے ہیں اسی تبادلے میں بہار

کے اسی ممتاز پروفیسر پر گورکھپور سے وہی پروفیسر اپنی نگرانی میں کسی ریسرچ اسکالر سے کام کروا رہے ہیں، اسے کہتے ہیں "من تراحاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" یہ وہ تلخ حقائق ہیں جو مختلف جامعات کے زندہ ادیبوں شاعروں اور پروفیسروں کی ہوسِ ناموری یا خوفِ گمنامی بھی اس قسم کی تحقیق کو بڑھاوا دے رہی ہے یہ غلط بخشی تحقیق کے ساتھ ایک شغل نہیں تو اور کیا ہے ؟

سابقہ تحقیق کی معلومات بھی ایک اہم علمی ضرورت ہے ہندستانی جامعات میں اردو تحقیق کے اس اشاریے کی اشاعت سے کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ نئے محققین کو بیک وقت پورے ہندستان میں اب تک کیے گئے اردو ریسرچ کا صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ کن کن موضوعات پر تحقیق ہو چکی، کون کون گوشے تحقیق کو رہ گئے، عدم آگہی کے سبب کتنی جگہ ایک ہی موضوع پر تحقیق کی تکرار ہو گئی۔ یکساں موضوع یا مشابہ موضوع پر تحقیق کرنا بھی اپنی توانائیوں کو ضائع کرنا ہے۔ ہماری یہ فہرست گو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۹۰ء تک کی گئی تحقیق کا احاطہ کرتی ہے لیکن عین ممکن ہے بہت سارے عنوانات شامل ہونے سے رہ گئے ہوں، کچھ فروگزاشتیں بھی ہوئی ہوں اس سلسلے میں مختلف حلقوں سے اضافے اصلاح یا مسامحات کی نشاندہی ہوئی تو دوسرے ایڈیشن میں ہم شکریہ کے ساتھ اس کمی، خامی کا ازالہ کر سکیں گے ۔

••

ترتیب

سیرت نگاری

(۱) اردو شاعری میں سیرت کی روایت (شگفتہ پروین) کشمیر (۲) اردو میں سیرت النبی کا ادب (سید اسد اللہ کامل) کشمیر ۶۸ء * (۳) اردو میں سیرت نبوی (قاضی زین العابدین) ناگپور

غالبیات

(۴) اردو نثر کی ترقی میں غالب کا حصہ (محمد مرتضیٰ ہاشمی) رانچی ۱۹۸۰ء (۵) دیوان غالب سے متعلق قلمی نسخوں کا تنقیدی مطالعہ (سید فرحت حسین) دہلی (۶) غالب ابتدائی دور (خورشید الاسلام) علی گڑھ ۵۴ء (۷) غالب، ان کی شاعری اور فن (محمد مظہر عالم) پٹنہ ۸۰ء (۸) غالب کی اردو شاعری میں پیکر تراشی (سید حسن امام) مگدھ ۷۷ء (۹) غالب کی اردو اور فارسی شاعری کا تقابلی مطالعہ اور ماخذ کی تحقیق (عبد اللہ شیدا) کشمیر ۷۲ء (۱۰) غالب کی تنقید کا مطالعہ (رحمن کور) کشمیر ۸۰ء (۱۱) غالب کی شاعری کا فکری آہنگ (سید اقبال احمد) مگدھ ۸۵ء (۱۲) غالب کے اردو خطوط کا تنقیدی مطالعہ (زاہد شمیم) کشمیر ۷۳ء (۱۳) غالب کے خطوط میں عصری حسیت (ابا حسین بیگم) ۸۰ء پٹنہ "داخل" (۱۴) کلام غالب کا فنی مطالعہ (فریدہ بیگم) علی گڑھ ۷۹ء (۱۵) ناقدین غالب (عبد الغنی فاروقی) ترویج

اقبالیات

(۱۶) اردو ادبی تنقید میں اقبال شناسی کا مطالعہ (نذیر احمد بٹ) کشمیر (۱۷) اقبال اور اردو غزل (احمد [illegible]) [illegible] (۱۸) اقبال اور تصوف (محمد محسن اختر) بھاگلپور ۹۸ء (۱۹) اقبال بحیثیت غزل گو (منظور عالم نعمانی) بہار ۸۰ء (۲۰) اقبال شناسی کی تفہیم و تحسین (عبد القدوس) متھلا ۸۰ء (۲۱) اقبال کا تصور [illegible] عثمانیہ ۷۶ء (۲۲) اقبالیات کا تنقیدی جائزہ (عبد الحق صدیقی) گورکھپور ۷۵ء (۲۳) ڈاکٹر محمد اقبال کا معاشی فلسفہ [illegible] تنقیدی مطالعہ (عبد العلیم ہلال) بھاگلپور ۸۴ء (۲۴) اقبال کا فلسفہ خودی اور اس کا مقصد (آصف [illegible]) [illegible] آباد ۷۸ء (۲۵) اقبال کا فن (تشبیہات، استعارات اور علامات کی روشنی میں) (عبید الرحمن ہاشمی) علی گڑھ ۸۵ء (۲۶) اقبال کی اردو نظموں کا فنی و فکری جائزہ (محمد عبد الحفیظ) مدراس

● اقبال کی شاعری میں امیجری (توقیر احمد خاں) دہلی ۸۵ء* ● اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی (قاضی محمد شعیب) رانچی ۸۰ء (داخل) ● اقبال کی شاعری میں تلمیحات (اکبر حسین قریشی) علی گڑھ ۸۵ء * ● اقبال کی شاعری میں خودی کا تصور (اشتیاق احمد) مگدھ ۸۴ء ● اقبال کی شاعری میں شخصیات (سید شرافت علی ندوی) بھوپال ۸۱ء ● اقبال کی شاعرانہ فنکاری (انیس فاطمہ فاروقی) پٹنہ ● اقبال کے فکری سرچشمے (آفاق) اودھ ● تصور فوق البشر اور اقبال کا مرد مومن (ایم حاتم رامپوری) بہار ۷۰ء ● تنقید اقبال کا تنقیدی جائزہ (عبدالحق صدیقی) گورکھپور ۷۵ء ● شعر اقبال کا سیاسی اور تہذیبی مطالعہ (مسز فردوس جہاں) دہلی ۸۰ء ● مطالعہ اقبال تاریخ اسلام کی روشنی میں (رضوان احمد صدیقی) متعلا ● مغربی تہذیب اقبال اور اکبر کی نظر میں (شیخ ناصرہ بیگم) تروپتی ● منظر شاعری بہ تخصیص علامہ اقبال (محمد فیاض ظفر) متعلا

اضافے:-

● اقبال اور آرو بندو (چمن لال رینہ) کشمیر ۱۹۸۱ء ● اقبال کا معاشی نظریہ (عارف حسین رضوی) متعلا ۸۹ء شعبہ حاشیات ● اقبال کی شاعری میں منظر نگاری (کوثر) بہار ۹۰ء ● اقبال کی شاعری میں ہندوستانی تصور (فہمیدہ بیگم) کلکتہ ۸۹ء

آزادیات

● مولانا ابوالکلام آزاد اور ادبی خدمات (محمد علی انور) متعلا ● ابوالکلام آزاد خیالات اور فن (ملک زادہ منظور احمد) گورکھپور ۶۷ء * ● ابوالکلام آزاد شخصیت اور فن (منتظر عباس) پنجاب ۸۱ء ● اردو ادب میں مولانا آزاد کا کارنامہ اور مرتبہ (شرافت حسین میرزا) دہلی ۶۶ء

دیگر

● مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندوستانی قومی تحریک (راجے کمار اگروال) شعبہ سیاسیات آگرہ ۷۰ء* ● مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی افکار (نصرت بانو روحی) وکرم شعبہ سیاسیات

شخصیات:

● آتش لکھنوی کی شاعری (شعیب راہی) پٹنہ ۷۳ء* ● تلامذہ آتش اور اردو شاعری کی ترقی میں ان کا حصہ (عبدالسلام فاروقی) لکھنو ۷۷ء ● آرزو لکھنوی حیات اور کارنامے (سید مجاہد حسین) بمبئی ۷۱ء ● محمد حسین آزاد حیات اور کارنامے (عبدالستار اسمٰعیل دلوی) بمبئی ۶۲ء ● محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ (شمیم حنفی) الہ آباد ۶۷ء ● نواب سید محمد آزاد بحیثیت طنز نگار (مشتاق احمد) کلکتہ ● آسی

غازیپوری صوفی شاعری کی حیثیت سے (کاظم ہاشمی) پٹنہ ۷۸ء ٥٦ آل احمد سرور شخصیت اور کارنامے (ریحانہ خاں) میرٹھ ۷۹، ٥٧ آل احمد سرور کی تنقید نگاری (غنی حیدر زکریا) گدھ ۸۴ء ٥٨ آیت اللہ جوہری حیات اور شاعری (صدرالدین فضا) پٹنہ ۶۱ء ڈی لٹ ٥٩ سید احتشام حسین حیات اور کارنامے (اقبال احمد ریاض) بہار ۷۹ء ٦٠ سید احتشام حسین حیات، شخصیت اور کارنامے (فدا مصطفےٰ) ناگپور ٦١ احتشام حسین کی تنقیدیں (محمد شمیم) گدھ ٦٢ احسان حسن خاں اور ان کی شعری خدمات (عبدالقادر احقر) بہار ۸۱ء ٦٣ اختر انصاری شخصیت اور کارنامے (منصور عمر) رانچی ۹۰ء ٦٤ اختر قادری حیات اور خدمات (اسداللہ) گدھ ۸۶ء ٦٥ اختر احمد اورینوی حیات اور کارنامے (طاہر حسین) بہار ۸۷ء ٦٦ اختر اورینوی افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے (واصف احمد) پٹنہ (دیکھئے افسانہ) ٦٧ اختر اورینوی بحیثیت کہانی کار (سراج الدین) گدھ ۸۵ء ٦٨ اختر الایمان حیات اور شاعری (رخوت النساء بیگم) دنکٹیشور ٦٩ اختر شیرانی اور جدید اردو ادب (یونس حسنی) وکرم ۶۶ء ٧٠ اختر شیرانی کی رومانی شاعری (قمر جہاں) رانچی ۸۶* ٧١ ارشد تلامذہ شاد عظیم آبادی (ابو منور گیلانی) بہار ۸۵ء ٧٢ اسد علی تمنا حیات اور کارنامے (مہر جہاں) عثمانیہ ۷۹ء ٧٣ اسداللہ وجہی حیات اور ادبی کارنامے (شیو پرشاد جاوید دشسرٹ) جامعہ ملیہ ٧٤ اسمٰعیل میرٹھی حیات اور خدمات (خلیل الرحمٰن سیفی) دہلی ۷۰ء ٧٥ اسیر اور ان کا عہد (ریاض الحسن صدیقی) لکھنؤ ۷۶* ٧٦ اصغر گونڈوی حیات اور شاعری (سردار احمد) میرٹھ ۷۹، ٧٧ اصغر گونڈوی حیات اور شاعری (سمیع اللہ) ناگپور ٧٨ اعجاز حسین، حیات اور کارنامے (سید علی حیدر رضوی) الہ آباد ۷۹، ٧٩ اکبر الہ آبادی ایک سماجی و سیاسی مطالعہ (فصیح ظفر) گدھ ۷۲، ٨٠ اکبر بحیثیت شاعر (انوار عالم) پٹنہ ۸۹ء ٨١ اکبر بحیثیت طنزیہ مزاحیہ شاعر (سید علی رضا حسینی) لکھنؤ ۵۹ء (دیکھئے طنز و مزاح) ٨٢ اکبر الہ آبادی حیات اور شاعری (قمر جہاں) بنارس ۸۰ء ٨٣ اکبر الہ آبادی حیات اور کارنامے (عقیلہ نذیر احمد خاں) بمبئی ۵۶ء ٨٤ اکبر الہ آبادی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ (صغریٰ مہدی) جامعہ ملیہ ۷۶ء ٨٥ اکبر الہ آبادی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ (شاہدہ خانم) علی گڑھ ٨٦ اکبر الہ آبادی کے سیاسی افکار و خیالات (عزیز الرحمٰن) پٹنہ ۷۹، ٨٧ اکبر دانا پوری حیات اور شاعری (طلحہ رضوی برق) پٹنہ ۸۰* ٨٨ الیاس اسلام پوری حیات اور ادبی خدمات (محمد اشتیاق) گدھ ٨٩ مولوی امام بخش صہبائی حیات، شخصیت اور شاعری (خواجہ محمد حامد) ناگپور ۸۲ء ٩٠ مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور اردو تحقیق (صابر حسین) روہیلکھنڈ ٩١ امجد حیدرآبادی (محمد جمال شریف)

علی گڑھ ۵۶ء (۹۲) امجد حیدر آبادی حیات اور کارنامے (عثمان علی) عثمانیہ (۹۳) امجد نجمی، حیات اور کارنامے (مسیح اللہ) رانچی ۸۰ء (۹۴) امداد امام اثر حیات اور کارنامے (سید شاہ اختر حسین قادری) بہار ۴۸ ڈی لٹ* (۹۵) اردو ادب میں امیر مینائی کا حصہ (ابو محمد ابو القاسم) آگرہ ۶۴ء (۹۶) امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی حمد و نعت کا تقابلی مطالعہ (رضا نقوی) الہ آباد ۷۷ء (۹۷) حضرت امیرالدین وجد کی زندگی اور ان کی اردو شاعری (ملک محمد مصطفی) مگدھ ۷۷ء (۹۸) دکنی ادب میں شاہ امین الدین اعلی اور ان کے معتقدین کی خدمات (حسینی شاہد) عثمانیہ ۶۷ء (۹۹) امین گجراتی اور ان کی مثنوی یوسف زلیخا (عبدالحمید فاروقی) بمبئی ۸۴ء (۱۰۰) بہار میں مزاح نگاری اور انجم مانپوری (انیس الرحمن) مگدھ ۷۵ء "طنز و مزاح" (۱۰۱) انشاء اللہ خان انشا دہلوی حیات و شخصیت اور نثر میں ان کا حصہ (شام لال کالڑا) جموں ۶۷ء (۱۰۲) انیس اور فردوسی تقابلی مطالعہ (سید فدا حسین) لکھنو ۷۳ء "مرثیہ" (۱۰۳) انیس کی زبان (وقار حسن) علی گڑھ ۶۳ء (۱۰۴) میر انیس کی رزمیہ شاعری (اکبر حیدری) لکھنؤ ۵۹ء (۱۰۵) مولوی باقر آغا کی عربی فارسی اور اردو خدمات (ذاکرہ غوث) مدراس "ام لٹ" (۱۰۶) میر باقر مخلص مرشدآبادی، زندگی، شاعری اور ان کے دیوان کے مخطوطات کا تنقیدی مطالعہ (عبدالرؤف) کلکتہ ۷۶ء ڈی لٹ (۱۰۷) بدرالدین اوگھٹ شاہ وارثی (اکبرالدین خان وارثی) مگدھ ۸۴ء (۱۰۸) برج موہن دتاتریہ کیفی کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ (ظہور الحسن) علی گڑھ (۱۰۹) بشیر کرنولی حیات اور ادبی خدمات (خلیل اللہ قاسمی) گلبرگہ (۱۱۰) بہادر شاہ ظفر حیات و تصانیف (سید احمد رضوی) الہ آباد ۶۷ء (۱۱۱) قائد ملت بہادر یار جنگ حیات اور ادبی خدمات (زاہد عرفان) گلبرگہ (۱۱۲) بہاالدین کلیم حیات اور شاعری (ظفر اللہ پالوی) مگدھ ۸۹ء (۱۱۳) بیدی اور اس کا فن (شمس الحق عثمانی) جامعہ ملیہ "دیکھئے افسانہ" (۱۱۴) بیدی بحیثیت افسانہ نگار (نثار مصطفی) پٹنہ ۸۶ "دیکھئے افسانہ" (۱۱۵) بینی نرائن جہاں کے ادبی کارنامے (سلمی پروین) کلکتہ ۷۹ء (۱۱۶) پریم چند حیات اور تخلیقات (جگت نرائن ہیکروال) لکھنؤ ۷۵ء "دیکھئے ناول" (۱۱۷) پریم چند کی زندگی اور ناولوں پر گاندھیائی اثرات (احمد حسین) الہ آباد ڈی لٹ "دیکھئے ناول" (۱۱۸) پریم چند کا سیاسی شعور (نسیمہ بامزئی) کشمیر ——

(۱۱۹) پنڈت میلارام وفا حیات و خدمات ————

(تیرتھ رام شرما) جموں (۱۲۰) تخلص بھوپالی حیات اور ادبی خدمات (صفیہ ودود) بھوپال* (۱۲۱) مرزا محمد تقی ہوس لکھنوی (آغا حیدر حسن عابدی) ناگپور (۱۲۲) ٹھاکر پونچھی حیات اور کارنامے (شریف ملک)

جموں ● ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے علمی کاموں کا تنقیدی مطالعہ (صدیق الرحمٰن قدوائی) دہلی ● جاں نثار اختر حیات اور فن (کشور جہاں) جبلپور ۷۵ء ● جرأت حیات اور شاعری (مجیب الرحمٰن قریشی) دہلی ● مثنویاتِ جرأت (محمد یونس) پٹنہ ۷۹ء ● محمد جعفر خاں راغب اور ان کی ادبی خدمات (سید کاظم حسین) پٹنہ ۷۵ء (ڈی لٹ) ● میر جعفر زٹلی حیات اور خدمات (سمیع اللہ) ناگپور ۷۹ء ● جعفر علی حسرت حیات اور شاعری (ام حبیب اختر قریشی) لکھنؤ ۷۰ء ● جگر مرادآبادی حیات اور شاعری (مہتاب احمد انصاری) رانچی ۸۶ء ● جگر مرادآبادی حیات اور شاعری (محمد اسلام) لکھنؤ ۷۶ء ● پروفیسر جگن ناتھ آزاد حیات اور خدمات (ایس ایم رضوان اللہ) بہار ۸۵ء ● جگن ناتھ آزاد کی شاعری اور ان کا فن (نجم الہدیٰ شیخ) بمبئی ۸۸ء ● جلیل مانک پوری حیات اور فن (عبدالخالق انصاری) بمبئی ۷۷ء ● جمیل مظہری بحیثیت مثنوی نگار (انیس فاطمہ) پٹنہ ● جمیل مظہری حیات اور شاعری (فضیل احمد) مگدھ ۸۴ء ● جمیل مظہری کا فن (سلیم اشرف) بہار ۷۹ء ● جوش ملیح آبادی بحیثیت شاعر (بدرالدین عالم) پٹنہ ● جوش کی شاعری کا سماجی اور سیاسی مطالعہ (مظہر حسین) مگدھ ۸۴ء ● جوش ملیح آبادی کی نثر نگاری (اظہر الحسن) بہار ۸۶ء ● جوش ملیح آبادی کے اسالیب نثر کا تنقیدی مطالعہ (سکھ چین سنگھ) جموں ۸۸ء ● مولانا محمد علی جوہر حیات و خدمات (حمیدہ ریاض) ناگپور ۷۹ء ● مولانا محمد علی جوہر حیات و کارنامے (نسیمہ بانو) بہار ● مولانا محمد علی جوہر سیاسی فکر و عمل (سید شبیر علی) بمبئی ۸۲ء ● چکبست عہد، حیات اور کارنامے (کاشی ناتھ پنڈتا) کشمیر ۷۶ء ● پنڈت برج نرائن چکبست کی قومی شاعری (خورشید انور) بہار ۷۹ء ● مہاراجہ چندو لال شاداں حیات اور کارنامے (ثمینہ شوکت) عثمانیہ ۷۶ء ● مولانا حالی اور میتھلی شرن گپتا۔ مسدس حالی اور بھارت بھارتی کے خصوصی حوالوں کے ساتھ تقابلی مطالعہ (ایس غلام رسول) اناملائی ۸۶ء "دیکھیے تقابلی مطالعہ" ● حالی بحیثیت سوانح نگار (آر۔ آر مسعے) الہ آباد ۷۲ء ● حالی بحیثیت شاعر (شجاعت علی سندیلوی) لکھنؤ ۷۰ء ● حالی کا سیاسی شعور (معین احسن جذبی) علی گڑھ ۵۷ء ● اردو کے اصلاحی ادب میں حالی کا حصہ (رضیہ بیگم) ناگپور ● حالی کی سیاسی شاعری اور عصری آگہی (سید شاہ سکندر) تروپتی ● حامد اللہ افسر میرٹھی (مقصود حسین) میرٹھ ۸۴ء ● حسرت عظیم آبادی حیات اور شاعری (اسماء سعیدی) علی گڑھ ۷۸ء ● حسرت موہانی حیات اور خدمات (نورالعین لاری) گورکھپور ۷۰ء ● حسرت موہانی نظم و نثر (افسر قریشی) علی گڑھ ● حفیظ عظیم آبادی حیات اور شاعری (سید سمیع احمد) پٹنہ ۸۴ء ●

حیات اللہ انصاری حیات اور خدمات (جلال اصغر فریدی) بہار ۹۰ء* ● خلیل الرحمن اعظمی حیات
اور شاعری (اسلام عشرت) پٹنہ ۹۰ء ● خلیل الرحمن اعظمی حیات اور شخصیت (ابن غضنفر عباس) علی گڑھ [illegible]
● جلیل مانک پوری حیات اور شاعری (ذکی احمد کاکوروی) لکھنؤ ۸۷ء ● خوشی محمد ناظر اور کشمیر میں
اردو شاعری کا ارتقا (انوار احمد خاں) دہلی ۸۰ء ● خواجہ احمد عباس اور کلیشور کا تنقیدی و تقابلی مطالعہ (نذیر احمد
و نکلیشور (تقابلی مطالعہ) ● خواجہ احمد عباس حیات اور ادبی خدمات (ضیاء الدین) جموں ● خواجہ احمد
فاروقی حیات اور کارنامے (شمونہ وحید) عثمانیہ ۹۶ء ● خواجہ حسن نظامی حیات اور ادبی خدمات (امام مرتضیٰ
نقوی) علی گڑھ ● خواجہ حسن نظامی حیات و تصانیف (انیس الرحمن) روہیلکھنڈ (بقول عنوان چشتی)
———————— ● خواجہ غلام السیدین حیات
اور تصانیف (فرحت حسین) جامعہ ملیہ ۸۲ء ● خواجہ میر درد حیات اور کارنامے (انجم حسن) دہلی
● اردو ادب میں داغ کا حصہ (ایم۔ اے زیدی) راجستھان ● داغ کے اہم تلامذہ (اسعد بدایونی)
علی گڑھ ام فل ٭ ● مرزا دبیر اور ان کے مرثیے کا فن (نفیس فاطمہ) بہار ۸۳ء تریشیہ* ● مرزا سلامت
علی دبیر حیات اور کارنامے (زماں آزردہ) کشمیر ۸۰ء "مرثیہ" ● دبیر کی مرثیہ نگاری (شبنم صدیقی) [illegible]
● دیا شنکر نسیم حیات اور کارنامے (انس احمد) بہار ۷۵ء ● مولوی ذکاء اللہ حیات اور خدمات
(رفعت جمال) آگرہ ۸۷ء ● ذکاء اللہ دہلوی کی ادبی خدمات (حسن آرا شاہین) علی گڑھ ● ذکی انور
اور ان کی ناول نگاری (شبیر احمد) رانچی ۸۶ء ● ذوق حیات اور خدمات (تنویر احمد علوی) علی گڑھ ۱۹۰
● راسخ عظیم آبادی بحیثیت غزل گو (لطف الرحمن شمسی) پٹنہ "دیکھئے غزل" ● راسخ بحیثیت مثنوی
نگار (ممتاز احمد) پٹنہ ۷۵ء "دیکھئے مثنوی" ● راسخ کی مثنوی نگاری (انصار اللہ) گورکھپور ۷۶ء ●
راسخ کے تلامذہ فرحت اور محسن (مطیع الرحمن) پٹنہ ● مولانا راشد الخیری حیات اور کارنامے
(ماجدہ خاتون صدیقی) ساگر ۸۸ء ● رجب علی بیگ سرور حیات اور تصانیف (امین اندرابی)
کشمیر ● رشید احمد رشید حیات اور ادبی خدمات (حنیف سیف ہاشمی) گلبرگہ ۹۰ء ● رشید احمد صدیقی
(رونق جہاں زیدی) علی گڑھ ● رشید احمد صدیقی حیات اور فن (سلیمان خاں) عثمانیہ ●
ڈاکٹر رشید جہاں حیات و خدمات (شاہدہ بانو) الہ آباد ● رضا نقوی واہی شخصیت اور شاعری
(عقیل اشرف) رانچی ۸۴ء ● شاہ رفیع الدین دہلوی کی اردو خدمات (ابی داؤد خاں) تروپتی

(۱۹۳) رنجور عظیم آبادی حیات اور فن (ثریا جبیں) پٹنہ ،،ء * (۱۹۴) ریاست علی ندوی حیات اور کارنامے (محمد علقمہ) متھلا ۸۷ء (۱۹۵) ریاض حسن خاں خیال کے دیوان کی ترتیب و تدوین (فاروق احمد صدیقی) بہار ،، ———— (۱۹۶) ریاض خیرآبادی حیات اور کارنامے (خلیل الرحمٰن خاں) گورکھپور * (۱۹۷) سجاد حیدر یلدرم شخصیت اور فن (سلمیٰ بلگرامی) عثمانیہ (۱۹۸) سجاد ظہیر حیات اور کارنامے (عبدالقیوم ابدالی) رانچی ۸۴ء (۱۹۹) ادب لطیف میں سجاد حیدر یلدرم کا مرتبہ (دردانہ علوی) علی گڑھ (۲۰۰) سردار جعفری حیات اور شاعری (داؤد کشمیری) بمبئی ۸۴ء (۲۰۱) سرسید اور صحافت (اصغر عباس) علی گڑھ (۲۰۲) اردو ادب میں سرسید احمد خاں کی خدمات (قدسیہ خاتون) الٰہ آباد ۷۳ء (۲۰۳) سرسید کے تعلیمی نظریات کا تفصیلی جائزہ (فرزانہ بیگم) بنگلور (۲۰۴) سرسید احمد خاں کے سماجی تصورات ( ) عثمانیہ ۶۱ء (۲۰۵) رتن ناتھ سرشار اور ان کی تصانیف کا مطالعہ (وشنو گوپال) الٰہ آباد ۵۵ء (۲۰۶) سرشار بحیثیت ناول نگار (اسرار نقوی) لکھنؤ ۷۳ء دیکھئے ناول (۲۰۷) سرشار کے نسوانی کردار (ثریا جمال مظہری) پٹنہ ۷۶ء (۲۰۸) مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد اور اردو ادب میں ان کی خدمات (حبیب النساء بیگم) عثمانیہ ۶۶ء (۲۰۹) سرور جہاں آبادی حیات اور شاعری (افضل امام رضوی) پٹنہ ۷۰ء (۲۱۰) سرور جہاں آبادی حیات اور شاعری (حکم چند نیر) بنارس "ڈی لٹ" ۶۵ء (۲۱۰ الف) پروفیسر سروری حیات اور کارنامے (میمونہ بانو) عثمانیہ ۸۲ء (۲۱۱) سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری (اشرف الدین) مگدھ ۸۶ء (۲۱۲) نواب سعادت علی خاں پیغمبر پوری حیات و خدمات (عبدالمنان طرزی) متھلا ۸۱ء (۲۱۳) سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے (برج پریمی) کشمیر * (۲۱۴) سعادت یار خاں رنگین، حیات اور شاعری (حسن آرزو) مگدھ ،، "ڈی لٹ" * (۲۱۵) سلام سندیلوی حیات اور خدمات (سید حسین احمد) متھلا ۸۶ء (۲۱۶) سودا (شیخ چاند) عثمانیہ ۴۲ء * (۲۱۷) سہیل عظیم آبادی اور ان کا فن (شبیر احمد) بھاگلپور ،، (۲۱۸) سہیل عظیم آبادی حیات و کارنامے (اعجاز رسول) پٹنہ ۸۹ء (۲۱۹) سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری (حبیب الحق) پٹنہ (۲۲۰) سہیل عظیم آبادی کے افسانوں میں ادبی اور تہذیبی روایت (قیصر جمال) بہار ۸۴ء (۲۲۱) سید سلیمان ندوی بحیثیت مکتوب نگاری (ارشد اسلم) پٹنہ (۲۲۲) سید سلیمان ندوی حیات اور ادبی کارنامے (سید محمد ہاشم) علی گڑھ (۲۲۳) سید سلیمان ندوی حیات و خدمات (علی وردی خاں) بہار ۵۷ء (۲۲۴) سید سلیمان ندوی کی ادبی خدمات (انعام صدیقی) گورکھپور ۷۰ء

● سید محمد حیات اور ادبی خدمات (عبدالجلیل تنویر) گلبرگہ ● سیدہ جعفر حیات اور ادبی خدمات
(التقدیس کوثر) گلبرگہ ● سیماب اور دبستان سیماب (افتخار احمد) پونا ۷۳ء ● سیماب اکبر آبادی
کی نظم نگاری (اردینہ ثانی) ناگپور ۶۹ء "دیکھئے نظم" ● شاد عارفی شخصیت اور فن (مظفر حنفی) بھوپال ۷۴ء
● شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری (عبدالوہاب اشرفی) بہار "دیکھئے نثر" ● شاد عظیم آبادی
بحیثیت شاعر (سید آل احمد) پٹنہ ● شاد عظیم آبادی بحیثیت مرثیہ نگار (رضوان احمد خاں) مگدھ ۸۵ء دیکھئے مرثیہ
● شاد عظیم آبادی حیات اور کارنامے (تحسین عباسی) بنارس ہندو یونیورسٹی ۸۰ء ● شاد عظیم آبادی
کا فن اور اردو غزل (آل احمد انجم فاطمی) مگدھ ۸۷ء ● شاد عظیم آبادی کے تین اہم شاگرد (عین الہدیٰ)
مگدھ ۸۵ء ● بہار کی شاعری میں شاد کے ہند و تلامذہ کا حصہ (وصی احمد) بہار ۸۸ء ● حضرت سید
شاہ ایوب ابدالی منیر (احسان اللہ) مگدھ ۸۳ء ● شاہ کمال علی دیوی حیات اور کارنامے (شاہ حسن
عثمانی) رانچی ۸۴ء ● شاہ محمد حیدا حسینی شاپوری حیات اور شاعری (رابعہ بیگم) گلبرگہ ● شاہ مبر
اور ان کے خاندان کی اردو خدمات (شاہ عالم خاں) عثمانیہ ۷۹ء ● مولانا شبلی نعمانی (آفتاب احمد
صدیقی) علی گڑھ ۴۸ء ● شبلی نعمانی بحیثیت سوانح نگار (قیصر النبی) مگدھ ۸۸ء ● شبلی نعمانی سوانح
نگار اور مورخ کی حیثیت سے (جمیل اختر) متصلا سوانح ● شبلی کی سیرت نگاری (ارشد جمال) ناگپور
● علامہ شبلی کی نثری خدمات (محمد نصیر) بہار "نثر" ۸۰ ● شبلی کے تنقیدی نظریات (غضنفر علی) علی گڑھ
"تنقید" ● شرر بحیثیت ناول نگار (علی فاطمی) الہ آباد ۷۹ء ● شرر حیات و تعارف (شریف احمد)
دہلی "ناول" ● شرر کی ناول نگاری (عبدالقادر خطیب) ناگپور "ناول" ● شرقی منیری حیات
اور شاعری (ابو عبیدہ ابدالی) مگدھ ۸۱ء ● شفق عماد پوری بحیثیت غزل گو (سلیمان بلخی) مگدھ ۸۸ء "غزل"
● شفق عماد پوری حیات اور کارنامے (ثوبان فاروقی) بہار ۸۶ء ● منیر شکوہ آبادی سوانح حیات اور کلام
(زہرہ یاسمین) لکھنؤ ۶۵ء ● منیر شکوہ آبادی حیات اور خدمات (قمر جہاں) گورکھپور ● شکیلہ
اختر حیات اور شاعری (فریدہ حسن) مگدھ ۸۴ء ● میر شمس الدین فیض کی ادبی خدمات (اللیق خدیجہ)
عثمانیہ ● شمیم کرہانی حیات، شخصیت اور شاعری (خواجہ علی انجم) ناگپور ۷۵ء ● شوق قدوائی
حیات اور کارنامے (مریم حامدی) کشمیر ● شوق نیموی حیات اور خدمات (ریاض احمد سہیل) پٹنہ ۸۷ء
● شوکت سبزواری حیات اور ادبی خدمات (کے بشیر احمد) ونکٹیشور ۸۶ء (۲۶۰ الف) شہباز عظیم آبادی

حیات اور خدمات (اختر الحسن) بہار ۶۷ء ● میر شیر علی افسوس عہد حیات اور شاعری (ظہیر احسن)
پٹنہ ۶۶ * ● شین مظفر پوری بحیثیت افسانہ نگار (حسن رضا) رانچی ۷۸ء ● شیفتہ تک اردو شعرا
کے تذکرے (حنیف نقوی) وکرم ۶۸ء ● صالحہ عابد حسین حیات شخصیت اور کارنامے (جاوید احمد
سعیدی) ناگپور ۸۱ء ● شاہ صدر الدین کی حیات اور اردو خدمات (محمد ہاشم علی) میسور ۷۴ء ●
صفدر مرزا پوری حیات اور ادبی اکتسابات (نجمہ عسکری) لکھنؤ ۸۸ء ● صفیر بلگرامی بحیثیت شاعر اور ناقد
(ظفر اوگانوی) پٹنہ ۷۶ء * ● صفی لکھنوی حیات اور کارنامے (مرزا محمد مصطفیٰ فطرت) لکھنؤ ۸۷ء * ●
صوفی منیری کی شاعری (خالد رشید صبا) پٹنہ ۶۶ء ● صوفی منیری بحیثیت نثر نگار (طیب ابدالی)
پٹنہ ۶۸ء * دیکھئے نثر" ● طباطبائی حیات اور کارناموں کا تنقیدی مطالعہ (اشرف رفیع) عثمانیہ ۷۰ء
● ظہور الحق پھلواروی حیات اور خدمات (محمد قاسم احسن وارثی) پٹنہ ● عارف شاہ قادری حیات
اور اردو خدمات (جمیلہ بیگم منیرہ) میسور ● عبد الباری ساقی حیات اور خدمات (توفیق احمد خاں) گڈھ ۸۵ء
● حکیم سید عبد الحیٔ ہاتف حیات اور شاعری (رفعت سجاد) رانچی ۷۶ء ● عبد الحق بحیثیت تنقید نگار
(حبیب الرحمٰن) بہار ۸۸ء ● مولوی عبد الحق حیات اور کارنامے (انجم انور) میرٹھ ۹۰ء ● عبد الحق
تنقید نگار کی حیثیت سے (مشتاق احمد) پٹنہ ۷۵ء ● عبد الحق محقق کی حیثیت سے (رومانہ زریں) پٹنہ ●
مولوی عبد الحق کی ادبی ولسانی خدمات (شہاب الدین) علی گڑھ "ڈی لٹ" ● جنوبی ہند میں اردو کی نشرو
اشاعت میں ڈاکٹر عبد الحق کے کارنامے (اقبال احمد) تروپتی ● احوال وافکار و آثار شاہ عبد الحکیم حاکم لاہوری
(ارشد اللہ) بھاگلپور ۸۷ء ● عبد الحلیم شرر بحیثیت شاعر (مناظر عاشق ہرگانوی) بھاگلپور ● حکیم عبد الحمید
شیدا سہسرامی حیات اور خدمات (فصیح الزماں) مگدھ ۸۴ء ● عبد الرحمٰن بجنوری حیات اور ادبی کارنامے
(محمد زاہد) علی گڑھ ● قاضی عبد الغفار حیات اور کارنامے (ایس ایم علی کاظمی) علی گڑھ ۸۰ء ● عبد الغفور
شہباز حیات اور کارنامے (اختر الحسن) بہار ۶۷ء * ● عبد الغفور شہباز نظم نویس کی حیثیت سے
(اعظم الحق داؤدی) پٹنہ * ● مرزا عبد القادر بیدل (امانت بخش) پونا ● عبد الماجد اختر حیات اور
کارنامے (منظہر الحق) بہار ۸۸ء ● قاری عبد المجید مظفر پوری حیات اور کارنامے (ظفر العلام ظفر)
متھلا ۸۸ء ● عبد المنان بیدل حیات اور خدمات (شہناز بیگم) پٹنہ ● عرفان اسلام پوری حیات
اور شاعری (اختر احمد رضوی) مگدھ ۸۷ء ● عزیز احمد اور ان کی ناول نگاری (شمیم افزا قمر) بھاگلپور "ڈی لٹ"

عشرت گیاوی حیات اور شاعری (سیدشاہد اقبال) گیا ۸۸ء ۲۹۶ شاہ رکن الدین عشق عظیم آبادی
(قریشہ حسین) پٹنہ ۷۴ء* ۲۹۷ عصمت چغتائی (ایڈلن روحی) جموں ۲۹۸ عصمت چغتائی، ان کے مختصر
افسانوں کا تنقیدی جائزہ (عشرت سلطانہ) رانچی* ۲۹۹ عصمت چغتائی بحیثیت فکشن نگار (یوسف خاں)
میرٹھ "افسانہ" ۳۰۰ عصمت چغتائی فکر وفن اور نسوانی کردار (رحمن ثاقب) ونکٹیشور ۸۵ء ۳۰۱
عصمت چغتائی کی ناول نگاری (نوشت آزاد) بھاگلپور ۸۹ء "ناول" ۳۰۲ عطا بہاری حیات اور شاعری
(علی ابدالی) گیا ۸۴ء ۳۰۳ عطا کلیانوی حیات اور ادبی خدمات (اکرام الدین باگ) گلبرگہ ۳۰۴ عظیم بیگ
چغتائی حیات اور کارنامے (ریحانہ یاسمین) بہار ۸۲ء ۳۰۵ عظیم عظیم آبادی، عصر حیات اور شاعری
(محفوظ الحسن) گیا* ۳۰۶ میر علی اوسط رشک حیات اور خدمات (انصار اللہ نظر) گورکھپور ۷۰ء ۳۰۷
محمد علی طیب حیات اور کارنامے (عبدالحی) دہلی ۸۰ء ۳۰۸ علی عباس حسینی حیات اور کارنامے (تہمینہ اختر)
جموں ۷۹ء "افسانہ"* ۳۰۹ غلام عمر خاں کے تحقیقی وتنقیدی کارنامے (شیخ محمد انور) تروپتی ۳۱۰ حضرت غمگین
دہلوی (جمیل اختر نظمی) جبلپور ۷۵ء ۳۱۱ غواصی حیات اور شاعری (اس آر میتم بیکر) پونا ۳۱۲
غواصی کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ (صبغۃ اللہ) بنگلور "دکنی ادب" ۳۱۳ غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری
(جمشید قمر) رانچی ۹۰، دیکھیے افسانہ" ۳۱۴ فانی بدایونی حیات، شخصیت اور شاعری کا تنقیدی مطالعہ (مغنی تبسم)
عثمانیہ ۳۱۵ فانی گورکھپوری (کلیم الدین شمسی) گیا ۸۶ء ۳۱۶ فخر الدین سخن دہلوی حیات اور شاعری (سید
سمیع الحق) رانچی"* ۳۱۷ حکیم سید فخر الدین حیات، کارنامے اور ان کے تذکرہ ریختہ گویان ہند کی تنقیدی تدوین
(ہارون رشید) لکھنؤ ۷۹ء* ۳۱۸ فدوی عظیم آبادی (سید محمد حسنین) بہار ۶۷ء* ۳۱۹ مرزا فرحت اللہ بیگ
کی نثر کا تجزیاتی مطالعہ (عبدالحی صدیقی) علی گڑھ ۸۷ء "دیکھیے نثر"* ۳۲۰ فراق شخصیت اور شاعری (ایچ۔
الف کرمدی) شیواجی ۸۰ء ۳۲۱ فراق کی غزل گوئی کے اہم رجحانات (رفعت سلطانہ) عثمانیہ ۸۱ "دیکھیے غزل"
۳۲۲ فراق گورکھپوری کی شاعری میں ہندوستانی عناصر (سکینہ فاضل) کشمیر ۳۲۳ فضل حق آزاد عظیم آبادی
(روحی حسن) پٹنہ ۶۵ء* ۳۲۴ فصیح الدین بلخی حیات اور کارنامے (سید مظفر بلخی) رانچی ۸۴ء* ۳۲۵ فرحت کاکوروی
عصر، حیات اور ادبی خدمات (سید اقبال واجد) گیا ۸۴ء ۳۲۶ فیض احمد فیض حیات، شخصیات،
شاعری (عبدالرشید اختر) ناگپور ۸۸ء ۳۲۷ فیض احمد فیض کی شاعری میں تشبیہ واستعارہ (تنویر جہاں)
بہار ۷۷ء ۳۲۸ فیض حیات اور کارنامے (نصرت چودھری) کشمیر ۳۲۹ قاضی عبدالودود کی تحقیق کا

تنقیدی جائزہ (شمیمہ کمال) بہار ۸۶ء ● قاضی عبدالودود حیات اور اردو تحقیق کو ان کی دین (قمر سلطانہ) عثمانیہ ● قائم چاندپوری حیات اور فن (عبدالحی رضا) بمبئی ۷۵ء ● قائم چاندپوری حیات اور خدمات (محمد عرفان) آگرہ ۷۰ء ● قرۃ العین حیدر حیات اور کارنامے (اختر سلطانہ) حیدرآباد ۸۶ء ● اردو ناول کی روایت اور قرۃ العین حیدر (زاہد الور خاں) بھاگلپور ۸۸ء "ناول" ● قلندر بخش جرأت کا تنقیدی مطالعہ (مجیب الرحمن قریشی) دہلی ● قلی قطب شاہ کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب (شاہ شکیل احمد) پٹنہ ۷۱ء ● قوس حمزہ پوری حیات اور کارنامے (اشرف علی) مگدھ ۸۷ء ● اردو افسانہ نگاری میں کارل مارکس کے اثرات (ذاکرہ تبسم) پٹنہ ۸۸ء "دیکھئے افسانہ" ● کبیر کا فن اور شخصیت (سجاد رضوی) میرٹھ ● کالی داس گپتا رضا شاعری اور کارنامے (راہی قریشی) کرناٹک ● کرامت علی کرامت کا فکر و فن (عزیز الرحمن) رانچی ۸۸ء ● کرشن چندر حیات و تصانیف (احمد حسن) الہ آباد ۷۳ء ● کرشن چندر حیات اور کارنامے (بیگم احساس) حیدرآباد ۸۵ء ● کرشن چندر فکر و فن (محمد شبیر) مدراس ● مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی حیات اور خدمات (حبیب النساء) عثمانیہ ۷۶ء ● لطیف الدین احمد حیات اور کارنامے (اقبال زرگر) جموں ۸۰ء ● لطیف الدین احمد کی ادبی خدمات (ایوب تاباں) علی گڑھ ● مانوس سہسرامی حیات اور شاعری (خالد سجاد) رانچی ۸۶ء ● مبارز الدین رفعت حیات اور ادبی خدمات (حشمت علی) گلبرگہ ● مبارک اور حامد عظیم آبادی بہار میں داغ دہلوی کے پیروکار (نشاط اختر) پٹنہ ● مجاز حیات اور کارنامے (معزہ عثمانی) الہ آباد* ● مجنوں گورکھپوری حیات اور کارنامے (زرینہ عقیل احمد) الہ آباد ڈی لٹ" ● پروفیسر محمد مجیب حیات اور اردو خدمات (صادقہ ذکی) پٹنہ ۸۰ء ● محسن دانا پوری حیات اور شاعری (شمیم گوہر) مگدھ ۸۵ء ● محسن دربھنگوی حیات اور شاعری (عبدالقیوم) متھلا ۸۴ء ● محسن کاکوروی اور امیر مینائی کی حمد و نعت نگاری ایک تقابلی مطالعہ (رضا رضوی) الہ آباد ۷۷ء ● محمد علی جوہر حیات اور کارنامے (نسیمہ بانو) بہار ۸۸ء ● محمود بحری من لگن کے خصوصی حوالے کے ساتھ (خلیل اللہ) میسور ۷۹ء ● محوی صدیقی حیات اور کارنامے (منیر المحوی) بھوپال ● ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، زندگی، شخصیت اور کارنامے (رقیہ قرایں) ناگپور ● مخدوم محی الدین شخصیت اور شاعری (مصلح الدین شاذ تمکنت) عثمانیہ ۸۲ء ● مخدوم محی الدین کی جدید اردو شاعری میں خدمات (مناظر الحق) مگدھ ۸۸ء ● مخدوم محی الدین حیات

اور کارنامے (عطاء الرحمن) بہار ۸۰ء * (۳۶۴) مخلص مرشد آبادی حیات و خدمات مع دیوان کی ترتیب (عبد الرؤف)
کلکتہ (ڈی لٹ) (۳۶۵) مرزا رسوا حیات اور کارنامے (میمونہ بیگم) علی گڑھ (۳۶۶) مرزا ہادی رسوا حیات
اور ناول نویسی (آدم غلام حسین شیخ) بمبئی "ناول" (۳۶۷) مرزا مسرت یار خاں شرف حیات اور شاعری
(ضمیر احمد خاں) درگا دتی ۸۸ء (۳۶۸) مرزا مسیح فطرت مسولی حیات و خدمات (مطیع احمد) بہار ۷۶ء
(۳۶۹) سید مسعود حسن رضوی ادیب (نسیم آرا) جامعہ ملیہ ۸۶ء (۳۷۰) مصحفی بحیثیت شاعر (تنزیل احمد) ردیکیفنہ ۸۸ء
(۳۷۱) مصحفی زندگی اور فن (نور الحسن نقوی) دہلی ۶۸ء (۳۷۲) منظر حنفی کی حیات، شخصیت اور کارنامے (محبوب راہی)
ناگپور ۸۴ء * (۳۷۳) میرزا مظہر جانجاناں، ان کا عہد اور ان کی شاعری (تبارک علی) آگرہ ۷۹ء (۳۷۴)
میرزا مظہر جانجاناں حیات اور کارنامے (خلیق انجم) دہلی ۷۹ء (۳۷۵) معین احسن جذبی حیات اور کارنامے (عارف
حسین) بھاگلپور ۸۰ء (۳۷۶) ملا رموزی حیات اور فن (عزیزہ انصاری) جبلپور ۷۵ء (۳۷۷) مناظر احسن گیلانی،
حیات اور ادبی خدمات (قاسم احسن وارثی) مگدھ ۸۱ء (۳۷۸) مولانا محمد علی مونگیری کی اردو خدمات (عتیق الرحمن)
بھاگلپور (۳۷۹) مومن حیات اور شاعری (ظہیر احمد صدیقی) دہلی ۶۲ء (۳۸۰) منور لکھنوی حیات اور خدمات
ایک تنقیدی مطالعہ (راج سنگھ) جموں (۳۸۱) مہجور شمسی حیات اور شاعری (اقبال وارث) رانچی ۸۰ء
(۳۸۲) میر امن دہلوی اور ان کی نثری خدمات (عبد المنان) کلکتہ ۷۹ء (۳۸۳) میر امن حیات اور تالیفات (نفیس
جہاں بیگم) دہلی ۸۵ء * (۳۸۴) میر ایک مطالعہ (سید نواب حسین) الہ آباد ۵۰ء (۳۸۵) ناقدین میر (شوکت حیات)
رانکیشور (۳۸۶) میر حسن حیات اور خدمات (فضل الحق) گورکھپور ۶۳ء، دہلی (۳۸۷) میر حسن دہلوی کی غزلیں مع تعارف
(ذکی الحق) پٹنہ ۷۰ء، "ڈی لٹ" (۳۸۸) میر خلیق بحیثیت مرثیہ گو (سید علی زیدی) پٹنہ (۳۸۹) میر ضمیر لکھنوی حیات
اور کارنامے (انور جہاں) لکھنو (۳۹۰) میر عثمان علی خاں حیات اور ادبی کارنامے (شہناز بیگم) حیدر آباد ۸۶ء
(۳۹۱) میر عشق اور ان کے خاندان کے مرثیہ نگار (جعفر رضا) الہ آباد ۶۶ء (مرثیہ) (۳۹۲) میر کا غم (صفیہ حیرت)
میسور ۷۵ء (۳۹۳) میر محفوظ علی بدایونی حیات اور کارنامے (محمد اسلم) میرٹھ ۸۱ء (۳۹۴) میر محفوظ علی بدایونی کے
ادبی کارنامے (رکن الدین رعنا) علی گڑھ ۸۲ء * (۳۹۵) میرزا محمد علی فدوی عصر، حیات اور شاعری (سید محمد حسین)
بہار ۸۵ء * (۳۹۶) میکش اکبر آبادی حیات اور خدمات (حبیب الرحمن نیازی) راجستھان ۸۹ء (۳۹۷) ن۔م۔
راشد، ان کا فن اور شاعری (اسرار حیدری) بہار ۸۱ء (۳۹۸) ناسخ اسکول کے چند مشاہیر شعرا (رضا حیدر مخدومی)
لکھنؤ ۶۲ء (۳۹۹) ناسخ کے شاگرد دبیر لکھنوی (حمیدہ خاتون) پٹنہ ۶۶ء (۴۰۰) ناسخ کا تنقیدی مطالعہ (شبیہ الحسن

نونہروی) لکھنؤ ۷۷ء (۲۰۱) ناوک حمزہ پوری حیات اور ادبی خدمات (حفیظ الرحمن خاں) مگدھ ۸۸ء (۲۰۲)
نصیر الدین نصیر حیات اور خدمات (ناصر رضا خاں جلالی) پٹنہ (۲۰۳) میر نظام الدین ممنون دہلوی اور ان کا
دیوان (منشاء الرحمن) ناگپور ۸۰ء (دیکھئے تدوین و ترتیب) (۲۰۴) نذیر احمد ایک مترجم قرآن (منور حسین خاں)
مگدھ ۸۴ء (۲۰۵) نذیر احمد حیات اور کارنامے (اشفاق احمد صدیقی) گورکھپور ۷۱ء (دیکھئے ناول) (۲۰۶) نذیر احمد
کی کردار نگاری (اشرف جہاں) پٹنہ ۸۰ء (دیکھئے ناول) (۲۰۷) نذیر احمد ناول نگار کی حیثیت سے (اعجاز علی ارشد)
پٹنہ (دیکھئے ناول) (۲۰۸) نسیم انہونوی حیات اور کارنامے (عبدالجبار) رانچی ۸۷ء (۲۰۹) نظیر اور ورڈزورتھ کا
تقابلی مطالعہ بحیثیت شاعر فطرت (عظمت اللہ) مدراس ۸۶ء (۲۱۰) نظیر اکبرآبادی حیات اور شاعری
(ضمیر احمد خاں) بمبئی ۶۳ء (۲۱۱) کلام نظیر کا تنقیدی مطالعہ (طلعت حسین نقوی) علی گڑھ (۲۱۲) نظیر کا درجہ
اردو شاعری میں (رضی الدین احمد) علی گڑھ ۵۷ء (۲۱۳) نظیر اکبرآبادی کی خدمات بحیثیت نظم گو (جمیلہ محمود جان)
بہار ۷۸ء (۲۱۴) نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں ہندوستانی فضا (ظفر علی) ناگپور (۲۱۵) نواب بہادر
یار جنگ کی زندگی اور ان کی ادبی خدمات (زاہد حسین تماپوری) گلبرگہ ۸۸ء (۲۱۶) نوح ناروی حیات
اور شاعری (ظفر الاسلام ظفر) بمبئی (۲۱۷) نیاز فتحپوری حیات، شخصیت اور کارنامے (نظیر رشیدی)
ناگپور ۷۸ء (۲۱۸) نیاز فتحپوری کا حصہ اردو افسانے کی ارتقا میں (درخشاں نجم) بھاگلپور (۲۱۹) نیاز فتحپوری
کی تحریروں کا تنقیدی مطالعہ (کیواس ذکریا) علی گڑھ ۷۳ء (۲۲۰) واجد علی شاہ کی ادبی خدمات (کوکب قدر
سجاد علی مرزا) علی گڑھ ۷۰ء (۲۲۱) سید وجاہت حسین عندلیب شادانی حیات و کارنامے (کلثوم ابوالبشر) بمبئی
(۲۲۲) وحید الدین سلیم (مظفر عباس نقوی) علی گڑھ ۶۳ء (۲۲۳) وفا حسین آبادی حیات اور شاعری (الیاس
انصاری) رانچی ۸۶ء (۲۲۴) شاہ محمد ہاشم بہاری بحیثیت شاعر (ذیشان فاطمی) پٹنہ ۷۷ء (۲۲۵) یاس
آروی حیات اور کارنامے (خواجہ صفیر الزماں) مگدھ ۸۸ء (۲۲۶) یاس بہاری حیات اور شاعری (انیس
صدری) پٹنہ ۸۸ء (۲۲۷) یگانہ چنگیزی حیات اور کارنامے (عبدالرشید) پٹنہ

اضافے

(۲۲۸) آسی غازیپوری حیات و
خدمات اور تدوین کلام (الطیب ابدالی) پٹنہ ڈی لٹ ۹۲ء (۲۲۹) اجتبیٰ رضوی کی حیات اور شاعری (اظہار احمد) بہار
(۲۳۰) احمد جمال پاشا بحیثیت مزاح نگار (ظفر اللہ) پٹنہ ۹۰ء (۲۳۱) اختر اورینوی کی تنقید نگاری (عامر صدیقی) بہار
(۲۳۲) امداد علی بحر حیات اور شاعری (ابوالحسن) بہار ۸۶ء (۲۳۳) انیس کے مرثیوں میں شاعرانہ آرٹ (زاہرہ قدوس)
پٹنہ (۲۳۴) عبدالمنان بیدل حیات اور خدمات (مسز شہناز) پٹنہ (۲۳۵) اردو شاعری کی ترقی میں پروین شاہدی

حیات اللہ انصاری کا حصہ (نشاط بانو) رانچی ۸۹ء ● حسرت موہانی اور اردو کے معلی (ریحان غنی) پٹنہ ● اردو ظرافت اور رشید احمد صدیقی (قطب الدین اشرف) رانچی ۸۷ء ● حیات اور کارنامے (رحمان حمیدی) رانچی ۸۷ء ● سرسید کے سیاسی افکار (فوق کریمی) علی گڑھ ● سجاد ظہیر کے ادبی خدمات (تنویر احمد نور) بہار ۸۹ء ● سید سلیمان ندوی کی سوانح نگاری (ظفیر الدین انصاری) بہار ● ——————— ● علامہ شبلی بحیثیت مورخ اسلام (غلام غازی خاں) بہار ۸۸ء ● سید محمد حسن شفا گوالیاری حیات اور شاعری (امان اللہ خاں) متھلا ۸۹ء ● شوق نیموی حیات اور شاعری (ابراہیم آہ) پٹنہ ● صابر شاہ آبادی حیات و ادبی خدمات (شمیمہ رفیق جہاں) گلبرگہ ۸۹ء ایم فل ● عبدالماجد دریابادی حیات اور خدمات (عتیق الرحمن خاں) پٹنہ ۸۸ء ● محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے (اکبر علی بیگ) حیدرآباد * ● شاہ رکن الدین عشق حیات اور شاعری (قریشہ خاتون) پٹنہ ۸۷ء ● عصمت چغتائی بحیثیت ناول نگار (فرزانہ اسلم) پٹنہ ● عصمت چغتائی کی ناول نگاری (نوشاد عالم آزاد) بھاگلپور ۸۹ء ٢٥١ سید شاہ علی فانی گورکھپوری حیات و خدمات (منصور حسن) بہار ● فراق گورکھپوری بحیثیت اردو تنقید نگار (پرویز احمد) بھاگلپور ۸۹ء ● مولوی کریم الدین حیات اور کارنامے (شان احمد صدیقی) رانچی ۸۰ء * ● کلیم الدین احمد بحیثیت تنقید نگار (عامر مصطفی صدیقی) رانچی ۸۸ء ٢٥٥ کلیم عاجز حیات اور شاعری (انیس الحق) پٹنہ ● اردو غزل کے ارتقا میں کلیم عاجز کا حصہ (نعیم الدین) رانچی ۸۹ء ● مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ (حسن امام اعظم) متھلا ۸۹ء ٢٥٨ نذیر احمد بحیثیت اخلاقی ناول نگار (محمد علی امام) بھاگلپور ۸۸ء ٢٥٩ نظیر کی شاعری میں فطرت اور تہذیب کے عناصر (محمد سلیمان) بہار "ڈی لٹ" ٢٦٠ حکیم عبدالحی ہاتف حیات اور شاعری (رفعت سجاد) رانچی ۸۷ء ٢٦١ طالب بنارسی حیات اور کارنامے (راجیش مشرا) بنارس ٢٦٢ قاضی عبدالودود شخصیت اور کارنامے (اختر انجم بیگ) گورکھپور ۸۹ء ٢٦٣ یوسف ناظم حیات، شخصیت اور فن (عباس مجتہد) بمبئی ۸۹ء "ڈی فل" ● مولانا ظفر علی خاں بحیثیت شاعر (قاضی شکیل الدین) سیوان کالج رہا پور ۱۹۹۰ء

مزید:-

● آل احمد سرور کی تنقید نگاری (غنی حیدر زکریا) رانچی ۸۲ء ● پریم چند اور شرت چند ایک تقابلی مطالعہ (عبداللہ) رانچی ۸۸ء ● جیلانی بانو کی افسانہ نگاری (عذرا پروین) رانچی ۸۷ء ● ڈاکٹر محمد حسن پاشا اور کارنامے (غلام غوث) رانچی ۸۷ء ● خلیل الرحمن اعظمی فن اور شخصیت (سید سراج

الاسلام) رانچی ۹۰ء خواجہ احمد عباس کی ناول نگاری (محمد ممتاز انصاری) رانچی ۸۸ء سرور کا بری حیات اور شاعری (نشاط عابدین) پٹنہ ۹۰ء شفیع تمنائی پھلواروی حیات وخدمات (قمر ریحانی) مگدھ ۸۹ء شکیلہ اختر حیات اور کارنامے (محمد مجاہد) رانچی ۸۳ء فراق کی رباعیوں کا تنقیدی جائزہ (ریحانہ امام) رانچی ۸۸ء فیض کی شاعری میں پیکر تراشی (طلعت جہاں) رانچی ۸۷ء مانوس سہسرامی کی شاعری (خالد سجاد) رانچی ۸۸ء (٢٠٦) مائل خیرآبادی کی نثری خدمات (محمد توحید) رانچی ۸۹ء

اردو شاعری :

آزادی کے بعد اردو شاعری میں جدید رجحانات اور تکنیک (شمیم انور) کلکتہ ۷۷ء اٹھارہویں صدی تک اردو میں صوفیانہ شاعری (شکیل احمد صدیقی) لکھنؤ ۷۴ء اردو اور ہندی کی رومانی شاعری کا تنقیدی مطالعہ (فریاد آزر) جامعہ ملیہ ۸۸ء اردو رباعیات (عبدالسلام) لکھنؤ ء (دیکھیے اصناف) اردو شاعری اور تصوف (حمید اللہ خاں آذر) ناگپور ۶۷ء اردو شاعری اور تصوف تاریخی وتنقیدی جائزہ (عبدالقادر فاروقی) شیواجی ۸۴ء اردو شاعری بالخصوص مرثیہ میں رزمیہ عناصر کا تجزیہ (نثار حسین زیدی) الہ آباد اردو شاعری پر تصوف کا اثر (مرزا صفدر علی بیگ) عثمانیہ ۶۶ء اردو شاعری پر تصوف کے اثرات ولی تا اقبال (حافظ محمد شمیم) مگدھ اردو شاعری پر مذہب کا اثر (سید اعجاز حسین) الہ آباد ۴۶ء* دہلی لٹ اردو شاعری پر ہندی شاعری کا اثر (مقبول علی فاروقی) آندھرا اردو شاعری تحریکیں اور رجحانات (حمیدہ بانو) وکرم ۷۷ء (٢٨٩) اردو شاعری دو عالمی جنگوں کے درمیان (ظل حسنین) الہ آباد ۵۸ء (٢٩٠) اردو شاعری کے رجحانات ۱۸۸۰-۱۹۴۷ء (علیم اللہ حالی) مگدھ ۷۷ء (٢٩١) اردو شاعری میں اشتراکی رجحانات بیسویں صدی میں (اشفاق حسین) الہ آباد ۷۶ء (٢٩٢) اردو شاعری میں تعلیمی تصورات (خلیل احمد مجاہد) گلبرگہ اردو شاعری میں تعلیمی تصورات، اکبر، حالی اور اقبال کے یہاں (بی زینت النسا) ونکٹیشور اردو شاعری میں تلمیحات (صاحب علی صدیقی) لکھنؤ ۶۵ء (٢٩٥) اردو شاعری میں رمزیت (عنوان چشتی) دہلی (٢٩٦) اردو شاعری میں سیاسی شعور ۱۸۵۷ء - ۱۹۴۷ء (احتشام الدین فاروقی) وکرم ۶۷ء (٢٩٧) اردو شاعری میں عوامی زندگی (پروین فاطمہ) مدراس (٢٩٨) اردو شاعری میں فطرت نگاری (حامد حسن بلگرامی) الہ آباد ۴۸ء (٢٩٩) اردو شاعری میں قنوطیت (قاضی عبدالستار) علی گڑھ ۵۸ء * (٥٠٠) اردو شاعری میں قومی یکجہتی (عبدالاحد) ونکٹیشور (٥٠١) اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت (رام آسرا راز) بنارس ۷۱ء (٥٠٢) اردو شاعری میں قومیت کا تصور (مغیث الدین فریدی) دہلی ۶۱ء (٥٠٣)

اردو شاعری میں کمیونسٹ رجحانات (اشفاق حسین) الہ آباد ۷۰ء ⓹٠٤ اردو شاعری میں معشوق کا تصور (روشن آرا) رانچی ۸۶ء ⓹٠٥ اردو شاعری میں منظر نگاری (عبدالسلام سندیلوی) لکھنؤ "ڈی لٹ" ۶۴ء ⓹٠٦ اردو شاعری میں نعت گوئی (سید محمد رفیع الدین) ناگپور ۵۶ء * ⓹٠٧ اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر (گوپی چند نارنگ) دہلی ⓹٠٨ اردو قصیدہ آغاز و ارتقا (ذاکر حسین فاروقی) ناگپور ۵۷ء (دیکھئے اصناف) ⓹٠٩ اردو قصائد نگاری پر فارسی قصائد کے اثرات (مطیع الرحمن) گدھ ۸۰ء (دیکھئے اصناف) ⓹١٠ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ (محمود الٰہی) علی گڑھ ۵۸ء (دیکھئے اصناف) ⓹١١ اردو کی اخلاقی شاعری (حنیف ناسخ) ناگپور ۷۶ء ⓹١٢ اردو کی تحریکی شاعری (مظہر مہدی) رانچی ۸۵ء ⓹١٣ اردو کی رومانی شاعری کا تنقیدی جائزہ ۱۹۰۰ء تا ۱۹۵۰ء (محمد عارف) دہلی ۸۸ء ⓹١٤ اردو گیتوں کا تنقیدی جائزہ (قیصر جہاں بیگم) علی گڑھ ۶۹ء * (دیکھئے اصناف) ⓹١٥ اردو میں جدید شاعری کا ارتقا (عبدالمغیث صدیقی) ناگپور ۸۰ء ⓹١٦ اردو میں سلام نگاری (حید نقوی رضوی) جبلپور (دیکھئے اصناف) ⓹١٧ اردو میں صوفیانہ شاعری اٹھارہویں صدی تک (شکیل احمد صدیقی) لکھنؤ ۷۶ء "ڈی لٹ" ⓹١٨ اردو میں عشقیہ شاعری (سید محمد حسن) بمبئی ۶۲ء * ⓹١٩ اردو میں گیتوں کا سرمایہ (شیو پرشاد وشیشٹ) دہلی ⓹٢٠ اعظم گڑھ اور اردو شاعری (حبیب اللہ) بنارس ۸۸ء ⓹٢١ انیسویں صدی کے ہندوستانی خیالات کی روشنی میں غالب کی اردو شاعری کا مطالعہ (نشاط ہادی) الہ آباد ⓹٢٢ بہار کی شاعری میں شاد کے ہندو تلامذہ کا حصہ (وصی احمد) بہار ۸۸ء ⓹٢٣ بہار میں اردو شاعری کا ارتقا ۱۸۵۸ء–۱۹۱۴ء (کلیم احمد عاجز) پٹنہ ⓹٢٤ بیسویں صدی کی اردو شاعری پر مغربی رجحانات کا اثر (ظہور الدین) جموں ۷۲ء ⓹٢٥ بیسویں صدی کی اردو شاعری پر مغربی سیاسی اور ادبی تصورات کا اثر (ظل حسنین) الہ آباد (ڈی لٹ) ⓹٢٦ بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی فلسفیانہ اساس (شمیم حنفی) علی گڑھ ۷۵ء "ڈی لٹ" ⓹٢٧ جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ ۱۸۵۷–۱۹۲۱ء (عالیہ عسکری) لکھنؤ ۶۳ء ⓹٢٨ جدید اردو شاعری میں میر کی روایت (شفیعہ پروین) کشمیر

⓹٢٩ دہلی کا دبستان شاعری (نور الحسن ہاشمی) علی گڑھ ۴۳ء * ⓹٣٠ ریختی کی ابتدا، ارتقا اور زوال (آفتاب احمد) گدھ ۸۰ء ⓹٣١ شمالی ہند کی اردو شاعری میں ایہام گوئی (حسن احمد نظامی) علی گڑھ ⓹٣٢ صوفیانہ عشقیہ شاعری کا مطالعہ (ایس۔ اے حسین) بہار ۶۱ء ⓹٣٣ غالب کی اردو شاعری میں پیکر تراشی (سید حسن امام) گدھ ۸۸ء (غالبیات) ⓹٣٤ غالب کی شاعری کا فکری آہنگ (سید اقبال احمد) گدھ ۸۵ء (غالبیات) ⓹٣٥ لکھنؤ کا

دبستان شاعری (ابواللیث صدیقی) علی گڑھ * (۵۳۶) مروجہ اصناف سخن پر جدید اردو شاعری کا اثر (عبدالباقی) جبلپور ۷۵ء (۵۳۷) مسدس حالی اور اردو کی قومی و ملی شاعری پر اس کے اثرات (ضیا الدین صابر) مگدھ ۸۴ء (۵۳۸) ہندوستان کی قومی یکجہتی میں اردو شاعری کا حصہ (سجاد حسین رضوی) الٰہ آباد ۷۴ء (۵۳۹) موجودہ عہد میں ۷۵ء تک قصیدہ نگاری (کمال الدین) پٹنہ ۷۵ء *

اضافے :—

(۵۴۰) اردو شاعری کی ترقی میں پرویز شاہدی کا حصہ (نشاط بانو) رانچی ۸۹ء (۵۴۱) اردو شاعری میں احتجاجی شعور (مظاہر الحق) بہار ۸۰ء (۵۴۲) اردو شاعری میں جدید رجحانات (انور حسین) بہار ۷۷ء (۵۴۳) اردو کی انقلابی شاعری (انور علی) بہار ۸۴ء (۵۴۴) بہار کی اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کا اثر (شمس الضحیٰ شمس جالوی) بہار ۸۰ء (۵۴۵) بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری (شاہ ارشاد عثمانی) رانچی

مزید اضافے :

(۵۴۶) اردو میں تحریکی شاعری (مظفر مہدی) ۸۱ء

نظم

(۵۴۷) آزاد نظم کا آغاز و ارتقا (قمر علی) بھاگلپور (۵۴۸) آزادی کے بعد اردو نظم میں مختلف رجحانات (یوسف تقی) کلکتہ ۸۰ء (۵۴۹) اردو میں آزاد نظم (محمد احمد) لکھنؤ (۵۵۰) اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا (روشن اختر کاظمی) راجستھان (۵۵۱) اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم - تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (حنیف قریشی) جامعہ ملیہ * (۵۵۲) اردو نظم کا مطالعہ ۳۶ء تا حال (عقیل احمد صدیقی) علی گڑھ (۵۵۳) اردو نظم میں وجودیت (محمد شفیع حسن) بہار ۸۷ء (۵۵۴) جدیدیت اور اردو نظم (عتیق اللہ تابش) مرہٹواڑہ ۸۵ء (۵۵۵) جدید اردو نظم پر یورپی اثرات (حبیب اللہ خان کشمیری) کشمیر ۷۶ء * (۵۵۶) جدید نظم ہیئت اور روایت (رفعت جہاں) راجستھان ۸۲ء (۵۵۷) بہار میں جدید نظم کا ارتقا (طلحہ احمد ولی مظفرپوری) بہار ۸۸ء (۵۵۸) نظیر اکبرآبادی کی خدمات بحیثیت نظم گو (جمیلہ محمد جان) بہار ۸۰ء (دیکھئے شخصیات)

اضافے :—

(۵۵۹) اردو نظم میں علامت نگاری ۷۵ء تک (غلام مصطفیٰ صدیقی) بھاگلپور ۸۸ء

غزل و غزل نگار

(۵۶۰) اردو غزل آزادی کے بعد (بشیر بدر) علی گڑھ ۷۳ء (۵۶۱) اردو غزل اور اس کی نشو و نما ۱۹۱۳ء تک (رفیق حسین) الٰہ آباد ۴۲ء (۵۶۲) اردو غزل اور شاد عظیم آبادی کا فن (سید آل احمد انجم فاطمی) مگدھ ۸۴ء

۵۶۲ اردو غزل کا ارتقا (عبدالحفیظ قتیل) عثمانیہ ۵۲ء ۵۶۳ اردو غزل کا ارتقائی سفر (طاہرہ بانو) ناگپور ۵۶۴
اردو غزل کی تنقید (شاہدہ بیگم) علیگڑھ ۱۹۹۰۔ ۵۶۵ اردو غزل کے اثرات کشمیری
غزل پر (محی الدین بچھ) کشمیر ۵۶۶ اردو غزل کے پچاس سال ۱۸۷۰-۱۹۲۰ (عبدالاحد خاں خلیل) لکھنؤ ۹۰ء ۵۶۷
اردو غزل کے فروغ میں جگر مرادآبادی کا حصہ (مہتاب انصاری) رانچی ۸۷ *

اردو غزل میں فکری عناصر میر سے داغ تک (یوسف خورشیدی) پٹنہ (ڈی لٹ) ۵۶۸ ــــــــــ *
۵۶۹ اقبال احمد بحیثیت غزل گو (منظور عالم نعمانی) بہار ۸۰ء ۵۷۰ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو غزل کے نئے
رجحانات (عبدالستار) دنکیشور ۵۷۱ بہار میں نئی غزل (ایم۔ اے نظام) بھاگلپور ۵۷۲ شفق عماد پوری
بحیثیت غزل گو (سلیمان بلخی) نگدھ ۸۹ ۵۷۳ میر حسن کی غزل نگاری (ذکی الحق) پٹنہ (ڈی لٹ)"
اضافے:۔

۵۷۴ اردو غزل کے ارتقا میں کلیم عاجز کا حصہ (نعیم الدین) رانچی ۸۹ء ۵۷۵ اسالیب غزل (انظر
کاظمی) رانچی ۸۸ء ۵۷۶ راسخ کی غزل گوئی (لطف الرحمن) پٹنہ

مثنوی

۵۷۷ سوزش عشق اردو کی ایک نایاب مثنوی (کاظم حسین) پٹنہ (ڈی لٹ) ۵۷۸ اردو کی نمائندہ مثنویوں میں
فوق الفطرت عناصر اور ان کی اہمیت (نصرت بانو) کشمیر ۷۶ء ۵۷۹ اردو مثنوی کا ارتقا دبستان گولکنڈہ میں
(شہزادی بیگم) ونکیشور ۵۸۰ اردو مثنوی میں اخلاقی عناصر (ملکہ خورشید سلطانہ) مدراس ۵۸۱ اردو مثنویوں میں
استحصال جنس (محبوب اعلیٰ قریشی) نگدھ ۸۵ء ۵۸۲ بہار میں اردو مثنوی نگاری کا ارتقا (سہیل اختر) متصلا ۸۰ء ۵۸۳
بیجاپور کی اردو مثنویاں (شیخ محمد قیوم صادق) بمبئی ۷۰ء ۵۸۴ جنوبی ہند کی صوفیانہ مثنویاں (امۃ النور زمانی بیگم)
بنگلور ۵۸۵ راسخ بحیثیت مثنوی نگار (امتیاز احمد) پٹنہ ۷۵ء " ۵۸۶ راسخ بحیثیت مثنوی نگار
(محمد انصار اللہ) گورکھپور ۷۲ء ۵۸۷ ریاست میسور میں مثنوی کا ارتقا (فہمیدہ بیگم) میسور ۵۸۸ شمالی ہند
کی اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی اردو مثنوی کی فرہنگ (ضیا الدین انصاری) علی گڑھ (فرہنگ) ۵۸۹
شمالی ہند کی مثنویوں میں فضا آفرینی کا فن (سیدہ بیگم) پٹنہ ۵۹۰ شمالی ہند کی مشہور مثنویوں میں نسائی کردار
(عالم آرا) پٹنہ ۵۹۱ شمالی ہندوستان میں اردو مثنوی (گیان چند جین) آگرہ ۶۰ء ۵۹۲ شمالی
ہندوستان میں اردو مثنوی کا ارتقا (۱۷۵۰-۱۹۵۰) (سید عقیل رضوی) الہ آباد ۵۵ء ۵۹۳ عشق کی مثنوی

"بنیادرپن" کا تنقیدی مطالعہ (سید حفیظ الدین) عثمانیہ ۸۰ء (۵۹۵) لکھنو اسکول کی مثنویاں (سید سلیمان حسین) لکھنو ۷۴ء (۵۹۶) مثنوی 'نل دمن' از جگوت رائے راحت کا تنقیدی مطالعہ (محمد رئیس) بہار ۸۲ء (۵۹۷) مثنویات جرأت (محمد یونس) پٹنہ ۶۹ء

اضافے :-

(۵۹۷) اردو مثنویوں میں کردار نگاری (نجم الہدیٰ) بہار ۷۳ء (۵۹۸) بہار میں اردو مثنوی کا ارتقاء (محمد قمر الزماں) پٹنہ (۵۹۹) بہار میں اردو مثنوی نگاری کا ارتقاء (احمد حسین دانش) بہار ۸۴ء

مرثیہ

(۶۰۰) اردو شاعری بالخصوص مرثیہ میں رزمیہ عناصر کا تجزیہ (نثار حسین زیدی) الہ آباد (۶۰۱) اردو مرثیہ اور خاندان دبیر (سیدہ بیگم) پٹنہ ۷۷ء (۶۰۲) اردو مرثیہ انیس کے بعد، ۱۸۷۵ء ــ ۱۹۷۰ء (افضل امام) پٹنہ ۷۸ء (۶۰۳) اردو مرثیے میں نسوانی کردار (ابن حسن عابدی شہباز) اودھ ۸۸ء (۶۰۴) اردو میں مرثیہ نگاری کا ارتقاء (اکبر حیدری) لکھنو ۷۳ء (ڈی لٹ) (۶۰۵) انیس اور فردوسی۔ تقابلی مطالعہ (فدا حسین) لکھنو ۶۳ء (دیکھئے تقابلی مطالعہ) (۶۰۶) انیس سے جوش تک اردو مرثیے کا ارتقاء ۱۸۵۰ء ـ ۱۸۵۷ء (ثریا جمال مظہری) بہار ۸۱ء (ڈی لٹ) (۶۰۷) میر انیس کی رزمیہ شاعری (اکبر حیدری) لکھنو ۵۹ء (۶۰۸) انیس کی زبان (وقار حسن) علی گڑھ ۶۳ء (دیکھئے شخصیات) (۶۰۹) مراثی انیس کی شاعرانہ فنکاری (زہرہ افضل) پٹنہ (۶۱۰) بہار میں اردو مرثیہ نگاری (سید حسن گوپال پوری) بہار ۸۸ء

(۶۱۱) بیجاپور گولکنڈہ میں اردو مرثیے کا ارتقاء سترھویں صدی تک (چراغ علی) عثمانیہ ۶۶ء (۶۱۲) جمیل مظہری بحیثیت مرثیہ نگار (نفیس فاطمہ) پٹنہ (دیکھئے شخصیات) (۶۱۳) دلبستان دبیر (ذاکر حسین فاروقی) بمبئی ۶۳ء

(۶۱۴) دلبستان عشق کی مرثیہ گوئی (جعفر رضا) الہ آباد ۶۷ء

(۶۱۵) مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے (زماں آزردہ) کشمیر ۷۸ء (۶۱۶) دبیر کی مرثیہ نگاری (شبیر احمد صدیقی) علی گڑھ ۷۱ء (۶۱۷) دکن میں مرثیہ اور عزاداری (رشیدہ موسوی) عثمانیہ ۶۳ء (دیکھئے دکنیات) (۶۱۸) مراثی شاد کا فکری پہلو (اظہار احمد) متھلا ۸۳ء (۶۱۹) مرثیہ بعد انیس بہار میں ۱۸۷۵ء ــ ۱۹۷۰ء (افضل حسن) پٹنہ (۶۲۰) میر خلیق بحیثیت مرثیہ گو (سید علی زیدی) پٹنہ (۶۲۱) لکھنو میں مرثیہ انیس تک (مسیح الزماں) الہ آباد ۶۷ء (ڈی لٹ)*

اضافے۔

(۶۲۲) اردو مرثیہ میں بہاریہ اور ساقی نامہ (شہناز نالف) پٹنہ داخل (۶۲۳) انیس کے مرثیوں میں شاعرانہ آرٹ (زاہرہ قدوس) پٹنہ (۶۲۴) بہار میں اردو مرثیہ آزادی کے بعد (شہناز بیگم) پٹنہ داخل

اردو ادب (عمومی)

اضافے :-

(٦٥٧) اردو پہیلیوں میں سماجی اور ثقافتی اثرات (انور عمادی) رانچی ۸۶ء * (٦٥٨) اردو میں احادیث نبوی کے تراجم و تشریحات (عاصم اعظمی) پٹنہ ۸۶ء (٦٥٩) اردو میں تکنیکی اور پیشہ وارانہ تعلیم کا تحقیقاتی جائزہ (زتادر حسین) بمبئی ۸۹ء (٦٦٠) تحریک آزادی ہند کا تاریخی و سماجیاتی مطالعہ اردو نثر کی روشنی میں (ضیاء الرحمن صدیقی) جامعہ ملیہ ۸۹ء (٦٦١) جدید اردو ادب پر وجودیت کے اثرات (خورشید عالم) بہار ۸۷ء (٦٦٢) دبستان عظیم آباد کے ادبی گلدستے (عفت وہاب) پٹنہ "داخل" (٦٦٣) ودربھ میں مسلمانوں کے شخصی ناموں کا سماجی اور لسانی مطالعہ (شیخ عبدالمنان عبدالستار) ناگپور ۸۹ء

مزید اضافے :

(٦٦٤) اردو میں مشاعرہ (راحت قریشی) بھوپال ۹۰ء (٦٦٥) مولانا سہیل کے مضامین کا تنقیدی جائزہ (اے رحیم انصاری) رانچی ۸۸ء

اصناف ادب

(٦٦٦) اردو ادب میں انشائیہ کا ارتقا (سیدہ جعفر) عثمانیہ ۵۹ء (٦٦٧) اردو ادب میں پیروڈی (عبدالرحیم نشتر) ناگپور (٦٦٨) اردو ادب میں تمثیل نگاری (عنایت اللہ منظر اعظمی) جموں * (٦٦٩) اردو بارہ ماسہ اور اس کا تحقیقی جائزہ (محمد عثمان) پٹنہ (٦٧٠) اردو پہیلیوں میں سماجی اور ثقافتی اثرات (انور عمادی) رانچی ۸۶ء *

(٦٧١) اردو خطوط نگاری میں پروفیسر عبدالغفور شاہ آبادی کا حصہ (صابر حسن) بہار ۸۲ء (٦٧٢) اردو قصیدہ آغاز و ارتقا (ذاکر حسین فاروقی) ناگپور ۷۵ء (٦٧٣) اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ (محمود الٰہی) علی گڑھ ۵۸ء *

(٦٧٤) موجودہ عہد میں ۷۵ء تک قصیدہ نگاری (کمال الدین) پٹنہ ۷۵ء * (٦٧٥) اردو قطعات نگاری (مس عابدہ فریدی) راجستھان (٦٧٦) اردو کی آپ بیتیوں اور شخصی یادداشتوں کا جائزہ (رام دتا چرک) جموں (٦٧٧) اردو گیتوں کا تنقیدی جائزہ (قیصر جہاں) علی گڑھ * (٦٧٨) اردو میں ادب الاطفال کا آغاز و ارتقا (طالب دانش کھم) ناگپور (٦٧٩) اردو میں بچوں کا ادب (خوشحال زیدی) جامعہ ملیہ (٦٨٠) بچوں کا ادب (سعدیہ مشہدی) رانچی ۸۶ء

(٦٨١) اردو رباعیات (عبدالسلام) لکھنؤ ۵۷ء (٦٨٢) اردو میں رباعیات کا ارتقا (امین چندر شرما) ناگپور

(٦٨٣) اردو میں رپورتاژ نگاری کا فن اور ارتقا (زبیر گوہر) بہار ۸۱ء (٦٨٤) اردو میں سلام نگاری (سید نقی رضوی) جبلپور ۸۲ء (٦٨٥) اردو میں شہر آشوب (سعد اللہ خاں) ناگپور (٦٨٦) اردو میں شہر آشوب (نعیم احمد)

دہلی ۶۶ء ● اردو میں مکاتیب نگاری کا ارتقا (خواجہ احمد فاروقی) دہلی ۵۳ء ● اردو میں مکتوب نگاری کا ارتقا (رشیدہ خاتون) بنارس ۸۰ء ● اردو میں منظر نگاری (غلام رسول کمرانی) گورکھپور ● اردو میں میلاد نامے (قاضی سید شہاب الدین) ناگپور ● اردو میں واسوخت نگاری (زین العابدین) پٹنہ، (دیکھئے شاعری) ● ریختی، ابتداء ارتقا اور زوال (آفتاب احمد) مگدھ (دیکھئے شاعری) ● عہد آصفجاہی میں اردو نعتیہ شاعری (اطہر النساء بیگم) گلبرگہ (دیکھئے شاعری) ● قصائد سودا: تدوین و تنقید (عتیق احمد صدیقی) علی گڑھ *

اضافے :۔

● بہار میں اردو نعت گوئی (محمد نسیم) متصلا ۸۸ء ● روپ کی رباعیات (شہباز رعنا) رانچی ۸۸ء

خاکہ نگاری و سوانح نگاری

● اردو میں خاکہ نگاری کا ارتقا (محمد اسد اللہ دوانی) جموں ● اردو میں خاکہ نگاری کا فن (صابرہ سعید) عثمانیہ ۸۴ء * ● اردو سوانح نگاری کا ارتقا (سید شاہ علی) لکھنؤ ● اردو میں خود نوشت سوانح نگاری (وہاج الدین علوی) جامعہ ملیہ ● بہار میں اردو سوانح نگاری کا آغاز و ارتقا (عبد الواسع) بہار ۷۹ء ● حالی بحیثیت سوانح نگار (آر آر مسے) الہ آباد ۷۰ء (دیکھئے شخصیات) ● شبلی کی سوانح نگاری (ارشد جمال) ناگپور (دیکھئے شخصیات)

اضافے :۔

● اردو ادب میں سوانح نگاری (قاضی عبد الہادی) رانچی ۸۹ء ● اردو میں خود نوشت سوانح نگاری (شیریں جمال) پٹنہ ۸۹ء ● بہار میں اردو سوانح نگاری کا آغاز و ارتقا (عبد الواسع) بہار ۷۹ء *

دکنی ادب

● ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کی دکھنی ہندی کتابوں نورس اور ابراہیم نامہ کا تنقیدی جائزہ (ادوشا گنپت راؤ اتھاپے) پونا ● دکن کا نثری ادب (وید پرکاش شرما) آگرہ ۶۹ء (دیکھئے نثر) ● دکن کا نثری دبستان (فرزانہ بیگم) عثمانیہ ۸۳ء (دیکھئے نثر) ● دکن کی نوشتہ اردو مثنویوں کا سماجی، تہذیبی اور سیاسی پس منظر ایک تنقیدی مطالعہ (گھوڑو بھائی اسماعیل صاحب اوٹے) شیواجی ۷۷ء ● دکن میں اردو شاعری کا ارتقا ولی سے قبل (رجال شریف) علی گڑھ ۷۰ء ● دکن میں اردو مرثیہ کا ارتقا (رشید النساء بیگم) عثمانیہ ۷۶ء ● دکھنی ادب

بر فارسی ادب کا اثر (شریف النسا) عثمانیہ ● دکنی ادب میں تہذیب اور سماج (سید مسعود سراج) میسور
● دکنی ادب میں شاہ امین الدین اعلیٰ اور ان کے معتقدین کی خدمات (حسینی شاہد) عثمانیہ، ۶۷ء ●
دکنی اردو پر دوسری ہندوستانی زبان و ادب کا اثر (ادد میش رانی) حیدرآباد ۸۸ء ● دکنی اردو قصائد کی
مکمل توضیحی فرہنگ (خورشید النور) علی گڑھ ۸۰ء ● دکنی اردو کا آغاز و ارتقا (مہرالنسا) عثمانیہ ۶۸ء ● دکنی اردو
کا توضیحی مطالعہ (عبد الغفار شکیل) علی گڑھ ۶۹ء ● دکنی اردو کی ابتدا و ارتقا دکنی اردو قواعد کا تجزیاتی مطالعہ
( ) عثمانیہ ۶۶ء ● دکنی تحقیق کا ارتقا اور اس کا تنقیدی جائزہ (عبد الکریم تاپوری) میسور ●
دکنی غزل کا تنقیدی مطالعہ (صبغۃ اللہ) بنگلور ● دکنی غزل کی نشو و نما (محمد علی اثر) عثمانیہ ۸۱ء
● دکھنی کی ابتدائی نثر (راج کیشور پانڈے) عثمانیہ ● دکھنی کی شکلیات (شری رام شرما) آگرہ ●
سترہویں صدی تک بیجاپور اور گولکنڈہ میں اردو مرثیے کا ارتقا (محمد چراغ علی) عثمانیہ ● قلی قطب شاہ
کی شاعری میں ہندوستانی تمدن (شاہ شکیل احمد) پٹنہ ۸۱ء ● غواصی حیات اور شاعری کا مطالعہ (ایس آر تیم پکریا)
پونا ● غواصی کا تنقیدی مطالعہ (فاطمہ بیگم) عثمانیہ ● میسور میں بولی جانے والی دکنی اردو کا وضاحتی
تجزیہ (عبد الغفار شکیل) علی گڑھ

اضافے :-

● دکن کے رنگین صوفی شعرا کا تنقیدی مطالعہ (شرف الدین پیرزادہ) سیوا سدن کالج برہان پور ۸۹ء

نثر

● اردو کے نثری اسلوب کا تنقیدی مطالعہ (امیر اللہ خاں شاہین) دہلی ● اردو میں مرصع نثر کی روایت
(امتیاز احمد خاں) پٹنہ ۸۰ء ● اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے قبل (رفیعہ سلطان) عثمانیہ ۵۵ء ● اردو نثر کا
ارتقا (۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء) طیبہ بیگم، دہلی ● اردو نثر کا ارتقا شمالی ہند میں تحقیقی و تنقیدی جائزہ (شہناز انجم)
جامعہ ملیہ * ● اردو نثر کا ارتقا انیسویں صدی میں (۱۸۰۰ء - ۱۸۵۷ء) عابدہ بیگم، دہلی ۷۹ء ●
اردو نثر کا دبستان دہلی (جاگیردار عبد الرحیم قادری) شیواجی ۷۸ء ● اردو نثر کا اسلوب محمد حسین آزاد سے
ابوالکلام آزاد تک (عبد الخالق) پٹنہ ۷۸ء ● اردو نثر کی ترقی میں غالب کا حصہ (مرتضیٰ ہاشمی) رانچی ۸۴ء
(غالبیات) ● اردو نثر کے ارتقا میں بہار کا حصہ (غلام محمد مرتضیٰ) مگدھ (ڈی لٹ) ● اردو نثر کے ارتقا
میں شاد عظیم آبادی کا حصہ (عبد الوہاب اشرفی) بہار ۶۷ء * ● اردو نثر میں ادب لطیف (عبد الودود) ۷۳ء
● اردو نثر میں غیر صحافتی سیاسیاتی ادب کا مطالعہ (میر محبوب حسین) حیدرآباد ۸۵ء ● انیسویں صدی

دلی کی زندگی اور تہذیب اردو نثر کی روشنی میں (رفیع رؤف) عثمانیہ ۸۸ء ● بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۵ء تا ۱۹۱۴ء (مظفر اقبال) پٹنہ ۷۰ (ڈی لٹ)* ● بیسویں صدی میں اردو اسلوب نثر کا تنقیدی مطالعہ (طارق سعید) علی گڑھ ● تامل ناڈو میں اردو نثر کا ارتقا (صفی اللہ) مدراس (دیکھئے علاقائی ادب) ● دکن کا نثری دبستان (فرزانہ بیگم) عثمانیہ ۷۳ء (دیکھئے دکنی ادب) ● رومانی نثر اور مہدی افادی (فیروز احمد) گورکھپور (دیکھئے شخصیات) ● شمالی ہند میں اردو نثر کا ارتقا ۱۸۵۷ء کے آغاز کے ساتھ (بدر الدین خاں انجم عرفانی) گورکھپور ● جوش ملیح آبادی کی نثر نگاری (محمد اسرائیل) بہار ۸۶ء ● علامہ شبلی کی نثری خدمات (محمد نصیر) بہار ● صوفی منیری بحیثیت نثر نگار (طیب ابدالی) پٹنہ ۷۸ء

اضافے :-

● بہار میں اردو نثر کا ارتقا (عبد الرحمن) متھلا ۸۸ء

داستان

● اردو داستان گوئی شمالی ہندوستان میں (گیان چند جین) الہ آباد ۴۹ء ● اردو داستانوں کا تنقیدی مطالعہ (زینت جہاں) علی گڑھ ● اردو داستانوں میں ویلن کا تصور (شفیق احمد) مگدھ ● اردو ناول پر داستانی اثرات (امر ناتھ کول) کشمیر (دیکھئے ناول) ● بوستان خیال (مترجمہ خواجہ امان دہلوی) کا تنقیدی مطالعہ (فہمیدہ خاتون) علی گڑھ ● داستان کا فن (اطہر پرویز) علی گڑھ ● داستان امیر حمزہ کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ (سجاد حسین رضوی) الہ آباد (ڈی لٹ) ● داستان امیر حمزہ میں فوق الفطری عناصر (زرینہ بٹ) کشمیر ● داستانی روایت اور اردو ناول (امر ناتھ بٹ) کشمیر ● دہلی میں داستان گوئی (شفاعت محمد) دہلی ● طلسم ہوشربا کا تنقیدی مطالعہ (راہی معصوم رضا) علی گڑھ ۶۴ء *
● فورٹ ولیم کالج کی داستانوں کا تنقیدی مطالعہ (ثناء اللہ بٹ) کشمیر ● فورٹ ولیم کالج کی داستانوں کا تہذیبی مطالعہ (عفت زریں) دہلی ● لکھنؤ میں داستان گوئی کا ارتقا (باجرہ ولی) لکھنؤ

ناول نگاری

● آزادی کے بعد اردو میں خواتین مصنفین کی ناول نگاری (قاضی آرشا مین) ناگپور ۸۰ء ● آزادی کے بعد اردو ناولوں کا سماجی پس منظر (الیس کمال) پٹنہ ● آزادی کے بعد اردو ناولوں میں رجحانات (تہذیب ہاشمی) بہار ۸۴ء ● اردو ادب میں سماجی ناول کا آغاز و ارتقا (برکت رام سونی) پونا ۷۲ ● اردو کی اہم ناول نگار خواتین (تسلیم فرزانہ) علی گڑھ ۸۶ء ● اردو کے نفسیاتی ناول کے فروغ میں ممتاز مفتی کا حصہ (محمد حسیب)

رانچی ۱۹۸۶ء (۷۷۶) اردو میں تاریخی ناول نگاری آغاز و ارتقا (ثناء اللہ) امراوتی ۱۹۸۸ء (۷۷۷) اردو ناولٹ کا تحقیقی و
تنقیدی مطالعہ (سید وضاحت حسین) گورکھپور ۱۹۸۸ء (۷۷۸) اردو ناولٹ نگاری کا فن اور ارتقا (سید مہدی احمد فصوی)
بہار ۱۹۸۹ء (۷۷۹) اردو ناول ۱۹۴۷ء کے بعد (مقبول حسین پاشا) ونکٹیشور (۷۸۰) اردو ناول ۱۹۳۶ء کے بعد (افشار احمد)
گورکھپور (۷۸۱) اردو ناول ۱۹۴۷ء کے بعد (سید شاہ یحییٰ ابدالی) بھاگلپور (۷۸۲) اردو ناول آزادی کے بعد راجندر سنگھ
بیدی، بلونت سنگھ، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، رامانند ساگر اور اشک کے خصوصی حوالے کے ساتھ (موہن سنگھ)
پنجاب ۱۹۷۹ء (۷۸۳) اردو ناول ۱۹۴۷ تا ۱۹۷۷ (اسلم آزاد) پٹنہ ۱۹۸۷ء (۷۸۴) اردو ناول پریم چند سے قبل ۱۸۵۷ء – ۱۹۱۴
(عظیم الشان صدیقی) دہلی (۷۸۵) اردو ناول پریم چند کے بعد (ہارون ایوب) علی گڑھ ۱۹۸۷ء * (۷۸۶)
اردو ناول کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۴۷ تا ۱۹۸۲ء (عتیق الرحمٰن قاسمی) علی گڑھ (۷۸۷) اردو ناول کی روایت اور
قرۃ العین حیدر (زاہد الور خاں) بھاگلپور ۱۹۸۸ء (۷۸۸) اردو ناول کے سماجی محرکات (سید محمد عقیل رضوی) الہ آباد ڈی لٹ
(۷۸۹) اردو ناول میں خواتین کا حصہ (محی الدین انصاری ناز) بہار ۱۹۷۹ء (۷۹۰) اردو ناول میں عورت کا تصور از نذیر احمد
پریم چند (فہمیدہ کبیر) علی گڑھ ۱۹۷۱ء (۷۹۱) اردو ناول میں کردار نگاری (ابوالبرکات) پٹنہ (۷۹۲) اردو ناول میں کردار
نگاری کا فن (رضیہ بیگم) پٹنہ (۷۹۳) اردو میں نسوانی کردار (فاطمہ مومن) بمبئی ۱۹۷۹ء (۷۹۴) اردو ناولوں کا سماجی پس منظر
(برکت رام سونی) پونا ۱۹۶۲ء (۷۹۵) اردو ناولوں کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی اور سماجی مطالعہ (رضیہ بانو) الہ آباد
(۷۹۶) اردو ناولوں میں ۱۹۴۷ء تک سماجی مسائل کی پیشکش (ایمن انصاری) گورکھپور ۱۹۷۶ء (۷۹۷) اردو ناولوں
میں خاندانی زندگی ۱۸۶۹ – ۱۹۷۰ء (فخر الکریم صدیقی) الہ آباد * (۷۹۸) اردو ناولوں میں ترقی پسندی (حیات
پاشا) مدراس (۷۹۹) اردو ناولوں میں تعلیمی تصورات (سید وحید کوثر) تروپتی ۱۹۸۶ء * (۸۰۰) اردو ناولوں
میں کردار نگاری (شاہدہ پال) کشمیر ۱۹۸۰ء (۸۰۱) اردو ناولوں میں ہندوستانی زندگی کا عکس (محمد غیاث الدین) بہار ۱۹۸۲ء
(۸۰۲) اردو ناولوں میں ہندوستانی سماج (سید سجاد حسین) مدراس (۸۰۳) بہار میں اردو ناول نگاری کا آغاز و ارتقا
بہار ۱۹۷۲ء (۸۰۴) بیسویں صدی میں اردو ناول کا ابتدائی پانچ دہوں میں ارتقا (یوسف شریف الدین) عثمانیہ ۱۹۸۰
(۸۰۵) پریم چند اور ان کے اردو افسانے ایک نفسیاتی مطالعہ (محمد اعظم ابراہیم بنگی) شیواجی ۱۹۷۵ء (۸۰۶) پریم چند
حیات اور تخلیقات (حکمت نرائن بیکروال) لکھنؤ ۱۹۴۹ء (۸۰۷) پریم چند کے ناول کا تنقیدی مطالعہ (مصاحب علی قریشی)
علی گڑھ ۱۹۵۹ء * (۸۰۸) پریم چند کا سیاسی شعور (نسیمہ پامری) کشمیر (۸۰۹) پریم چند کی افسانہ نگاری (ارشکیل رحمانیہ)
(ڈی لٹ) ۱۹۶۲ء (۸۱۰) پریم چند کی زندگی اور ناولوں میں گاندھیائی اثرات (احمد حسین) الہ آباد (ڈی لٹ) (۸۱۱) پریم چند

کے اسلوب کے ارتقا کا اختیاتی مطالعہ، بازارِ حسن، گوشۂ عافیت اور گئودان کی روشنی میں (احمد حسن فاضل) جواہر لال نہرو
۸۶ء ——— ۸۱۲ پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں پر گاندھیائی
اثرات (قاضی سعید الظفر عباسی) الہ آباد ۸۰ء ۸۱۳ پریم چند کے ناولوں میں زندہ جاوید کردار (ہمایوں رشید)
مگدھ ۸۶ء ۸۱۴ پریم چند کے ناولوں میں عورتوں کا کردار (شمیم نکہت) لکھنؤ ۶۳ء ۸۱۵ پریم چند کے نمائندہ
کردار۔ ناول کی روشنی میں (عبدالستار) پٹنہ ۸۸ء ۸۱۶ جدید اردو ناول میں سماجی نظریات کا تنقیدی جائزہ (زرینہ
عقیل احمد) الہ آباد ۷۴ء ۸۱۷ خاتون ناول نگاری اور ان کی ادبی خدمات (نسیمہ بانو) الہ آباد ۷۷ء ۸۱۸
رتن ناتھ سرشار اور اردو ادب (سید لطیف حسین) آگرہ ۷۵ء ۸۱۹ رتن ناتھ سرشار اور ان کی تصانیف کا
مطالعہ (روشن گوپال) الہ آباد ۵۵ء ۸۲۰ سرشار بحیثیت ناول نگار (احرار نقوی) لکھنؤ ۶۳ء ۸۲۱ رتن
ناتھ سرشار کی ناولوں میں کردار نگاری (محمد ابو شاہد) بہار ۸۵ء ۸۲۲ سرشار کے نسوانی کردار (ثریا جمال مظہری)
پٹنہ ۷۶ء ۸۲۳ مرزا ہادی رسوا، حیات اور ادبی کارنامے (میمونہ بیگم) علی گڑھ * ۸۲۴ مرزا رسوا حیات
اور ناول نویسی (آدم غلام شیخ) بمبئی ۷۲ء ۸۲۵ مرزا رسوا کے ناولوں کا سماجیاتی مطالعہ (عمران احمد) جامعہ ملیہ
۸۲۶ شرر بحیثیت ناول نگار (علی فاطمی) الہ آباد ۷۹ء * ۸۲۷ شرر حیات و تعارف (شریف احمد) دہلی
۸۲۸ شرر کی ناول نگاری (عبدالقادر خطیب) ناگپور ۸۲۹ شرر کے تاریخی ناولوں کا مقام اردو ادب میں
(اقبال احمد) بنگلور ۸۳۰ عزیز احمد اور ان کی ناول نگاری (شمیم افزا قمر) بھاگلپور "ڈی لٹ" ۸۳۱ عزیز احمد
کے ناولوں کے نسوانی کردار (کوثر دلشاد) پٹنہ ۸۳۲ فسانۂ آزاد میں لکھنوی تہذیب کے عناصر (طلعت سلطانہ)
علی گڑھ ۸۳۳ قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے نسوانی کردار (شمیم صادقہ) پٹنہ ۸۳۴ کرشن چندر کی ناولوں
کے نسوانی کردار (مہ جبیں) میسور ۸۳۵ کرشن چندر کے ناولوں کی تہذیبی فضا (خورشید احمد) جواہر لال نہرو ۸۸ء
۸۳۶ مسلمان خواتین کی تعلیم کی ارتقا میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ (سیمیں ثمر) بھاگلپور ۸۳۷ نذیر احمد حیات
اور کارنامے (اشفاق احمد صدیقی) گورکھپور ۷۱ء ۸۳۸ نذیر احمد کی کردار نگاری (اشرف جہاں) پٹنہ ۷۸ء
۸۳۹ نذیر احمد ناول نگار کی حیثیت سے (اعجاز علی ارشد) پٹنہ * ۸۴۰ نذیر احمد کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ (اشفاق
احمد) علی گڑھ ۷۳ء ۸۴۱ نذیر احمد کے ناولوں کی سماجی اہمیت (بدر النساء) پٹنہ *

اضافے:۔

۸۴۲ آزادی کے بعد اردو ناول کی ترقی میں خواتین ناول نگار کا حصہ (شمیم احمد) بہار ۸۳ء

● اردو کے تاریخی ناول ایک جائزہ (محمد شاکر) بہار ۸۹ء ● اردو کے علاقائی ناول (عشرت بانو) پٹنہ ● پریم چند کے بعد اردو ناولوں میں کردار نگاری کا فن (سلیم اللہ) بہار ۸۹ء ● عصمت چغتائی بحیثیت ناول نگار (فرزانہ اسلم) پٹنہ ● عصمت چغتائی کی ناول نگاری (نوشاد عالم آزاد) بھاگلپور ۸۹ء ● کرشن چندر کی ناول نگاری (اشفاق احمد خاں) پٹنہ "داخل" ● نذیر احمد بحیثیت اخلاقی ناول نگار (محمد علی امام) بھاگلپور ۸۸ء

مزید اضافے :-

● اردو ناول میں تعلیمی مسائل (غلام ربانی) رانچی ۸۸ء ● اردو ناولوں میں شعور کی رو (افزانہ جعفری) رانچی ۸۳ء ● خواجہ احمد عباس کی ناول نگاری (محمد ممتاز انصاری) رانچی ۸۸ء ● ڈپٹی نذیر احمد کے نسواں کردار (شاہدہ بیگم) رانچی ۸۹ء ● ممتاز مفتی کی ناول نگاری (محمد حبیب) رانچی ۸۷ء

افسانہ و افسانہ نگاری

● اختر اورینوی افسانہ نگار و ناول نگار کی حیثیت سے (سید واصف احمد) پٹنہ (دیکھئے شخصیات)

● اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل (صغیر افراہیم) علی گڑھ ● اردو افسانہ کا ارتقاء ۱۹۳۶ تا حال (نسیم آرا) الہ آباد ● اردو افسانے کی ارتقا میں خواتین کا حصہ (محمد سعد اللہ) امراوتی ۸۸ء ● اردو افسانہ ۴۷ء کے بعد (احمد قدوس جاوید) پٹنہ ۸۶ء ● اردو افسانہ کے ارتقا میں خواتین کا حصہ (بشیر النسا) ناگپور ۸۴ء ● اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ ۷۰-۱۹۴۷ء (مہناز انور) جواہر لال نہرو * ● اردو افسانے میں انسانی نفسیات کے عناصر (فرحت جہاں آرا بیگم) بہار ۸۳ء ● اردو افسانے میں ترقی پسند مصنفین کا حصہ (ریاض احمد) مگدھ ● اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی تصویر کشی (شکیل احمد) گورکھپور ۸۳ء ● اردو افسانے میں علامت نگاری (مجید مضمر) کشمیر ● اردو افسانہ میں عورت کا تصور (صالحہ بیگم) جامعہ ملیہ ● اردو افسانے میں کردار نگاری کا فن (امیمہ خاتون) بہار ۸۹ء ● اردو افسانہ میں عوامی زندگی (اجمل اجملی) الہ آباد ۷۶ء ● اردو افسانہ میں وجودیت (جمیل اختر) رانچی ۸۷ء ● اردو افسانہ نگاری میں کارل مارکس کے اثرات (ذاکرہ تبسم) پٹنہ ۸۸ء ● اردو فکشن (مسعود عالم) علی گڑھ ۸۰ء ● اردو فکشن کی ادبی تنقید کا جائزہ (اختر نجیب) جواہر لال نہرو ۸۸ء ● اردو کی خواتین افسانہ نگار (جہاں آرا بیگم) میسور ● اردو مختصر افسانہ فنی اور تکنیکی مطالعہ (نکہت ریحانہ خاں) دہلی ۸۷ء * ● اردو میں افسانوی ادب کی تنقید کا جائزہ (ارتضیٰ کریم) دہلی ۸۸ء ● اردو میں خاتون افسانہ نگاروں کا تقابلی و تجزیاتی مطالعہ ۱۹۳۶-۱۹۵۰ء (الیس ایس حسین) رانچی ۸۸ء

• افسانوی ادب میں اشاریت (آر محمود خاں) ونکٹیشور، تروپتی • بہار کے اردو افسانوں کا اسلوبی مطالعہ (معشوق ربانی) گدھ ۸۶ء • بہار میں اردو فکشن ایک تنقیدی جائزہ (احمد حسین آزاد) گدھ ۸۴ء • بہار میں افسانہ نگاری کی نشو ونما اور ترقی (عبدالحفیظ) گدھ ۷۴ء • بیدی اور اس کا فن (شمس الحق عثمانی) جامعہ ملیہ (دیکھئے شخصیات) • بیدی بحیثیت افسانہ نگار (نثار مصطفی) پٹنہ ۷۸ء (دیکھئے شخصیات) • راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں عورتوں کے تصور (معین الدین) متھلا ۸۸ء • پریم چند اور ان کے اردو افسانے ایک نفسیاتی مطالعہ (محمد اعظم ابراہیم بنگی) شیواجی ۷۵ء (دیکھئے شخصیات) • پریم چند کی افسانہ نگاری (شکیل الرحمٰن) پٹنہ ڈی لٹ ۶۲ء • پریم چند کے افسانوں کا سماجیاتی مطالعہ (عبدالوحید) گورکھپور ۸۶ء • ترقی پسند افسانہ ۳۶ء تا ۱۹۵۷ء (میر علی سید صادق علی) مرہٹواڑہ ۸۰ء • ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ (نسیمہ بیگم) اتکل ۷۹ء • ترقی پسند تحریک اور اردو کی افسانوی روایت (سید علی عباس) بہار ۷۳ء • جدید اردو افسانہ نگاری (فردوس فاطمہ) پٹنہ ۵۵ء ڈی لٹ • ۸۹۱ جدید ہندی اور اردو افسانہ (اوم پرکاش کپور) دہلی ۷۹ء • چھوٹا ناگپور میں اردو افسانوں کا آغاز و ارتقا (شمیم الدین) رانچی ۸۲ء • خواتین افسانہ نگار (سعیدہ اختر) آلہ آباد ۷۸ء • سعادت حسن منٹو - حیات اور کارنامے (برج کشن ایما) کشمیر ۸۰ء * شخصیات • سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری (اشرف الدین) گدھ ۸۶ء (شخصیات) • سہیل عظیم آبادی اور ان کا فن (شبیر احمد) بھاگلپور (شخصیات) • سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری (حبیب الحق) پٹنہ (شخصیات) • علی عباس حسینی حیات اور کارنامے (تہمینہ اختر) جموں (شخصیات) • علامت نگاری کا تصور نئے اردو افسانوں کے خصوصی مطالعہ کے ساتھ (حسین الحق) گدھ ۸۴ء • کرشن چندر، اس کی حیات اور تصانیف (احمد حسن) الہ آباد ۶۳ء • کرشن چندر اور یشپال کی کہانیوں کا تقابلی مطالعہ (رشید آثار) بمبئی ۸۶ء • کرشن چندر حیات اور کارنامے (محمد بیگ احساس) حیدرآباد ۸۵ء • ۹۰۳ کرشن چندر فکر و فن (محمد شبیر) مدراس • کرشن چندر کی افسانہ نگاری (شفیق احمد اعظمی) گورکھپور ۸۷ء • ۹۰۵ کرشن چندر کی ناولوں اور افسانوں میں عصری حسیت (اوپکا منوہر پریم چند) آندھرا ۸۱ء • کرشن چندر کے افسانوی ادب میں حقیقت نگاری (محمد نیاز) دہلی • مختصر افسانے کا ارتقا پریم چند تا حال (جمال آرا نظامی) علی گڑھ ۸۲ء • مغربی بنگال میں اردو افسانہ (ایم۔ اے۔ نصر) کلکتہ ۷۹ء • نیاز فتحپوری حیات شخصیت اور کارنامے (نظر رشیدی) ناگپور • نیاز فتحپوری کا حصہ اردو افسانے کی ارتقا میں (درخشاں انجم) بھاگلپور

اضافے:۔

(۹۱۱) آزادی کے بعد اردو مختصر افسانوں میں جدید رجحانات (محمود عالم انصاری) بہار ۸۹ء (۹۱۲) اردو افسانے پر تقسیم ہند کے اثرات (مظفر سعید) پٹنہ "داخل" (۹۱۳) اردو افسانہ روایت اور امکانات (محمد سلیمان) بہار ۸۸ء (۹۱۴) اردو افسانے میں سماجی و ثقافتی پس منظر (عزیز فاطمہ) لکھنؤ ۸۳ء * (۹۱۵) بہار میں اردو افسانہ ۱۹۶۰ء کے بعد (مہر نگار) بھاگلپور ۸۹ء

(۹۱۶) پریم چند کے افسانوں میں عورت (اختر کمال بانو) بہار ۸۲ء (۹۱۷) پریم چند کے بعد اردو افسانہ (محمد حامد) بہار ۸۱ء

(۹۱۸) ترقی پسند افسانے میں عورت کا تصور (خورشید زہرا عابدی) جامعہ ملیہ * (۹۱۹) ترقی پسند تحریک اور بہار کی افسانوی روایت (سید علی عباس) بہار (۹۲۰) جدید اردو افسانے میں وجودیت کے اثرات (جمیل اختر) رانچی ۸۶ء (۹۲۱) شین مظفر پوری بحیثیت افسانہ نگار (حسن رضا) رانچی ۸۴ء (۹۲۲) ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۱ء تک اردو مختصر کہانیوں کا سماجیاتی مطالعہ (عائشہ سلطانہ) دہلی ۸۹ء

مزید اضافے:

(۹۲۳) اردو افسانوں میں آدیباسی زندگی (پرویز اختر) رانچی ۸۴ء (۹۲۴) بہار کی خواتین افسانہ نگار (انوری بیگم) رانچی ۸۰ء (۹۲۵) جیلانی بانو کی افسانہ نگاری (عذرا پروین) رانچی ۸۰ء (۹۲۶) منٹو کے افسانوں کے نسوانی کردار کے رویوں کا نفسیاتی مطالعہ (مسرت رحمٰن) رانچی ۸۶ء

ڈرامہ

(۹۲۷) آغا حشر کاشمیری اور اردو ڈرامہ میں ان کی خدمات (طاہرہ عبداللہ) کشمیر ۰۵ء (دیکھیے شخصیات) آغا حشر کی ڈرامہ نگاری (مظفر شہادت) پٹنہ (ڈی لٹ) (۹۲۸) آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ (محمد شفیع) ساگر ۷۷ء * (۹۲۹) آغا حشر کے ڈراموں میں نسوانی کردار (مسعودہ صفدر امام) رانچی ۸۶ء *

(۹۳۰) اردو تھیٹر (عبدالعلیم نامی) بمبئی ۵۳ء * (۹۳۱) اردو ڈرامہ آغا حشر کے بعد (قمر اعظم ہاشمی) پٹنہ ۷۲ء * (۹۳۲) اردو ڈرامے پر شیکسپیر کا اثر (بی۔ٹی۔ عبدالحمید) مدراس (۹۳۳) اردو ڈرامہ میں آغا حشر کا حصہ (انجم آرا بیگم) علی گڑھ ۷۰ء * (۹۳۴) اردو ڈرامہ میں تجزیہ اور روایت (عطیہ نشاط خاں) الہ آباد ۷۲ء (۹۳۵) اردو ڈرامے میں حقیقت پسندانہ میلان (کوثر دلشاد) پٹنہ (۹۳۶) اندر سبھا کی روایت (ارشاد حسین) جواہر لال نہرو

(۹۳۷) ڈرامے کا فن اور تکنیک اور اردو کے چند اہم ڈرامے (شکیل احمد خاں) مگدھ ۸۰ء (۹۳۸) ریڈیو ڈرامے کا فن (اخلاق حسین شہر) وکرم (۹۳۹) سید آغا حسن امانت، حیات اور ادبی خدمات (اخلاق حسین عارف) لکھنؤ ۸۶ء (دیکھیے شخصیات)

مزید (۹۴۰) اردو ڈراما کے ارتقا میں بہار کا حصہ (قاسم) بھاگلپور ۱۹۹۰ء (۹۴۰/۱) اسٹیج کا فن (مسعود جامعی) رانچی ۸۰ء

طنز و مزاح

(۹۴۱) اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد (۱۹۴۷ - ۱۹۷۵) اس۔ جے صدیق (عثمانیہ) ۸۰ء (۹۴۲) اردو ادب میں مزاحیہ کردار (عبدالرشید خورشید احمد انصاری) گجرات ۷۷ء (۹۴۳) اردو ظرافت نگاری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات (ابوالبرکات) بہار ۸۸ء (۹۴۴) اردو میں طنز و مزاح (خواجہ عبدالغفور) بمبئی ۸۳ء (۹۴۵) اردو میں طنز و مزاح اور اس میں رشید احمد صدیقی کا حصہ (اقبال اختر) پٹنہ ۷۸ء * (۹۴۶) اردو ناول میں طنز و مزاح (شمع افروز زیدی) جامعہ ملیہ (۹۴۷) اکبر بحیثیت طنزیہ، مزاحیہ شاعر (سید علی رضا حسینی) لکھنؤ ۵۹ء (دیکھئے شخصیات) (۹۴۸) انیسویں صدی کی اردو نثر میں سماجی طنز (سوہن لال کول) کشمیر (دیکھئے نثر) (۹۴۹) بہار میں طنز و ظرافت نگاری (نذیر احمد انجم) متصلا (۹۵۰) بہار میں مزاح نگاری اور انجم مانپوری (انیس الرحمن) مگدھ ۸۵ء (دیکھئے شخصیات) (۹۵۱) نواب سید محمد آزاد بحیثیت طنز نگار (مشتاق احمد) کلکتہ (دیکھئے شخصیات)

اضافے :-

(۹۵۲) احمد جمال پاشا بحیثیت مزاح نگار (محمد ظفر اللہ) پٹنہ ۹۰ء (۹۵۳) اردو ظرافت اور رشید احمد صدیقی (قطب الدین اشرف) بہار ۸۸ء

سفرنامہ

(۹۵۴) اردو سفرنامے (قطب النساء بیگم ہاشمی) ناگپور ۵۹ء (۹۵۵) اردو سفرنامے (سیدہ عشرت النساء بیگم) عثمانیہ ۸۳ء (۹۵۶) انیسویں صدی کے اردو سفرنامے (قدسیہ قریشی) دہلی ۷۹ء * (۹۵۷) سفرنامہ اور اردو سفرنامے ۱۹۰۱ - ۱۹۷۵ (برکت علی) پٹنہ

صحافت

(۹۵۸) اخبار سیاست کی ادبی خدمات (حمید الدین قادری) گلبرگہ (۹۵۹) اردو ادب کے ارتقا میں زمانہ کانپور کا حصہ (شفیع احمد عثمانی) لکھنؤ ۸۷ء (۹۶۰) اردو صحافت (نادر علی خاں) علی گڑھ * (۹۶۱) اردو صحافت آزادی کے بعد (رضوان احمد خاں) پٹنہ (۹۶۲) اردوئے معلی کی ادبی خدمات (سید ریحان غنی) پٹنہ (۹۶۳) ۱۹۰۰ء کے بعد حیدرآبادی اردو صحافت (النور الدین) حیدرآباد ۸۹ء (۹۶۴) اودھ پنچ کی ادبی خدمات (عبدالرزاق فاروقی) ڈنگیشور (۹۶۵) الپنچ کی ادبی خدمات (محمد عمر ابدالی) پٹنہ (۹۶۶) بہار میں اردو صحافت (ولی اللہ صدیقی) بہار ۸۴ء (۹۶۷) تامل ناڈو میں اردو صحافت (سید صفی اللہ) مدراس (ایم لٹ) (۹۶۸) حیدرآباد کے ادبی رسائل و جرائد (النور الدین) حیدرآباد ۸۹ء (۹۶۹)

سرسید اور صحافت (اصغر عباس) علی گڑھ * ● علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور اردو صحافت کا تنقیدی جائزہ (اصغر عباس) علی گڑھ ۱۷ء ● رسالہ ندیم کی ادبی خدمات (عظیم الحق جنیدی) پٹنہ ● ماہنامہ نگار کے پچیس سال (طارق عظمی) گڈھ ۸۰ء ● ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو صحافت کا رول (زیڈ ایچ وسیم) روہیلکھنڈ ۸۸ء

اضافے :-

● آج کل کے ادبی خدمات (شمویل احمد) پٹنہ "داخل" ● اشاریہ آج کل (جمیل اختر) جواہر لال نہرو ۸۸ء ام فل * ● بہار میں اردو صحافت (جاوید حیات) پٹنہ ۸۷ء .

تنقید

● اردو تنقید حالی کے بعد (سید نواب کریم) پٹنہ (ڈی لٹ) ۷۱ء ● اردو تنقید کا ارتقا (عبادت بریلوی) لکھنؤ ۷۴ء ● اردو تنقید کا مارکسی دبستان (نسیم شہنوی) بھوپال ۹۸۰ اردو کی ادبی تنقید اور جدید ذہن (محمد علی) متھلا ۹۸۱ اردو تنقید کی نشو و نما میں سید احتشام حسین کا حصہ (نسیم اختر) گڈھ ۸۶ء ۹۸۲ اردو تنقید کے ارتقا میں خلیل الرحمن اعظمی کا حصہ (عفت آرا شمسی) گڈھ ۸۴ء ● اردو تنقید کے تصورات (محبوب عالم) جواہر لال نہرو ● اردو شعرا کا تنقیدی شعور (ممتاز احمد) پٹنہ ۷۰ (ڈی لٹ) ۹۰۵ اردو میں جدید تنقید کے اصول (شارب ردولوی) لکھنؤ ۶۷ء ● اردو میں نفسیاتی تنقید (محمود الحسن رضوی) لکھنؤ ۷۲ء ● انیسویں صدی میں اردو تنقید کے رجحانات (اخلاق خاں محمد شہریار) علی گڑھ ● بہار میں اردو تنقید کا ارتقا (رضیہ بانو) پٹنہ ● بہار میں اردو تنقید کا ارتقا (غلام محمد مرتضیٰ) گڈھ ۸۸ء ● بیسویں صدی میں اردو تنقید کا ارتقا (نوشابہ سردار) الہ آباد ۸۰ء ● تنقید میں جدید رجحانات بہار کے حوالے سے (شاداب رضی) بھاگلپور ۸۹ء (ڈی لٹ) ● ریختی کا تنقیدی مطالعہ (خلیل احمد صدیقی) دکرم ۶۶ء ● عربی اور فارسی تنقید کے اثرات اردو تنقید پر (ابوالکلام قاسمی) علی گڑھ ● کلیم الدین احمد کے تنقیدی نظریات (آفتاب احمد) پٹنہ ● گارساں دتاسی کی ہندوی و ہندوستانی ادب کی تاریخ کا تنقیدی مطالعہ (رابرٹ اردو اں) دہلی ۸۷ء ● یونانی شعریات کا اثر اردو تنقید پر (شبنم اطہر) اودھ

اضافے :-

● اردو تنقید کا ارتقا ۱۹۶۰ء کے بعد (نبی شہباز) کلکتہ ۸۹ء ۹۹۸ اردو میں اشتراکی تنقید (ام اے غنی) بہار ● کلیم الدین احمد کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ (وارث الرحمٰن) پٹنہ *

مزید :-

● آل احمد سرور کی تنقید نگاری (رضی حیدر زکریا) رانچی ۸۲ء ● اردو میں مارکسی تنقید کا ارتقا (اسلم پرویز) رانچی ۸۹ء ● خلیل الرحمن اعظمی کی تنقید نگاری (عفت آرا شمسی) رانچی ۸۴ء

تدوین و ترتیب

(۱۰۰۳) تدوین دریائے لطافت (آمنہ خاتون) علی گڑھ ۷۵ء * (۱۰۰۴) تذکرہ طبقات الشعرا کی تنقید و ترتیب (آصفہ خلیل) دہلی (۱۰۰۵) تنقیدی تدوین فسانۂ عجائب (سلیمان حسین) لکھنؤ ۷۳ء، (ڈی لٹ) (۱۰۰۶) توسر طرز تدوین و تحشیہ (زینت ساجدہ) عثمانیہ ۷۱ء (۱۰۰۷) حکیم سید فخرالدین حیات و کارنامے اور ان کے تذکرہ ریختہ گویان ہند کی تنقیدی تدوین (ہارون رشید) لکھنؤ ۶۹ء * (۱۰۰۸) خوش معرکۂ زیبا ترتیب و تدوین (سید محمد شمیم احمد) لکھنؤ ۷۱ء * (۱۰۰۹) داستان ہفت سیاح کی تنقیدی تدوین (مہیندر ناتھ پروانہ) جموں (۱۰۱۰) دیپک نہنگ عشق کی مثنوی کی تنقیدی تدوین (حفیظ الدین) حیدرآباد (۱۰۱۱) تدوین دیوان آبرو (ریاض الحسن قاسمی) علی گڑھ (۱۰۱۲) دیوان اثر کی تدوین و ترتیب (افضل حق کامل قریشی) دہلی ۷۶ء (۱۰۱۳) دیوان احسن اللہ خاں بیان: ترتیب و تدوین مع مقدمہ فرہنگ و حواشی (شمیم فاطمہ) علی گڑھ ۸۴ء (۱۰۱۴) دیوان احسن اللہ خاں بیان کی تنقیدی تدوین (مہری بیگم مطلب) عثمانیہ ۷۷ء (۱۰۱۵) تدوین دیوان باقر آگاہ (حبیب النسا بیگم) تروپتی ۸۸ء (۱۰۱۶) تدوین دیوان حسرت عظیم آبادی (اسا سعیدی) علی گڑھ * (۱۰۱۷) دیوان حفیظ دہلوی کی تدوین مع مقدمہ حواشی و فرہنگ (صابرہ بیگم) علی گڑھ ۸۱ء (۱۰۱۸) تدوین دیوان ذکا نلوری (عبدالوہاب تسلیم) تروپتی (۱۰۱۹) تدوین دیوان زادہ مع مقدمہ (سراج الحق قریشی) علی گڑھ (۱۰۲۰) دیوان سلطان کی تنقید (رفیعہ صدیق) عثمانیہ ۷۷ء (۱۰۲۱) دیوان شاہ حاتم کی تدوین مع تعارف (سراج الآفاق قریشی) علی گڑھ ۷۵ء (۱۰۲۲) تدوین دیوان شاہ محمد ایمان (الہ آبادی مخطوطہ) جبلپور ۷۵ء (۱۰۲۳) تدوین و ترتیب دیوان عبدالوہاب یکرو (شمیم احمد) بہار ۷۲ء (ڈی لٹ) * (۱۰۲۴) دیوان غالب کے قلمی نسخوں کا تنقیدی مطالعہ (فرحت حسین) دہلی (دیکھئے غالبیات) (۱۰۲۵) دیوان غواصی کی تنقیدی تدوین اور ان کی شاعری کی قدر و قیمت (عطیہ سلطانہ) عثمانیہ ۸۸ء (۱۰۲۶) تدوین دیوان محمد تقی ہوس (سید باقر علی زیدی) علی گڑھ (۱۰۲۷) دیوان ممنون کی تدوین (افسر افسر) دہلی (۱۰۲۸) دیوان مہدی علی خاں کی تدوین مع تعارف و نوٹ (طاہر صدیقی) علی گڑھ ۷۰ء (۱۰۲۹) دیوان میر (دوم، سوم) ترتیب و تدوین مقدمہ، حواشی و فرہنگ (کامنی بیگم) علی گڑھ ۷۷ء (۱۰۳۰) دیوان ناسخ اول کی غزلیات (اظہار الحسن قریشی) علی گڑھ (۱۰۳۱) دیوان یقین کی تدوین مع مقدمہ (فرحت فاطمہ) دہلی (۱۰۳۲) سب رس کی تنقیدی تدوین (حمیدہ جلیلی) عثمانیہ ۷۵ء (۱۰۳۳) عیار الشعرا کی تدوین (نور الحسن نقوی) علی گڑھ "ڈی لٹ" * (۱۰۳۴) قصائد سودا تدوین و تنقید (عتیق احمد صدیقی) علی گڑھ ۷۳ء * "دیکھئے اصناف" (۱۰۳۵) کتاب نورس

(نذیر احمد) لکھنؤ، ۵، (ڈی لٹ) ۱۰۳۶ کلاسیکی اردو ادب کا مطالعہ مع تنقیدی تدوین مقدمہ شاہ مثنوی بہرام گور بانو ہوش اور دیوان مجموعہ (نور السعید اختر) ناگپور ۱۰۳۷ کلیات آتش ترتیب و مقدمہ و فرہنگ ر آگرہ

۱۰۳۸ ترتیب و تدوین کلیات پرویز شاہدی (محمد عباس) بھاگلپور ۸۹ء ۱۰۳۹ کلیات خواجہ سلطان جان تدوین وتحقیق (طیب صدیقی) ستھلا (ڈی لٹ) ۱۰۴۰ کلیات ذوق (تدوین) (تنویر احمد علوی) علی گڑھ (ڈی لٹ)

* ۱۰۴۱ کلیات طالب علی خاں عیش ترتیب و تدوین (فاخرہ منصور) علی گڑھ ۰، ۱۰۴۲ کلیات ولی (نور الحسن ہاشمی) لکھنؤ (ڈی لٹ) ۱۰۴۳ مثنوی نل ودمن از جگوت رائے راحت کا تنقیدی مطالعہ (محمد یٰسین) بہار

۱۰۴۴ مثنوی نہ سپہر درپن کی تنقیدی تدوین (یوسف النسا) عثمانیہ ۱۰۴۵ مثنوی یوسف و زلیخا ترتیب و تنقید مصنفہ امین گجراتی (عبد الحمید فاروقی) بمبئی ۸۰ء ۱۰۴۶ مرزا مغل فاضل کی زاد آخرت کی تنقیدی تدوین (صاحب الحسن) لکھنؤ ۷، (ڈی لٹ) ۱۰۴۷ میاں خوب محمد چشتی، مثنوی خوب رنگ (علی نقوی جعفری) بمبئی ۹۱ء ۱۰۴۸ میر باقر مخلص مرشد آبادی، ان کی زندگی شاعری اور ان کے دیوان کے مخطوطات کا تنقیدی مطالعہ (عبد الرؤف) کلکتہ ۷۶ء

۱۰۴۹ میر کے چوتھے پانچویں اور چھٹے دیوان کی تدوین مع مقدمہ (سید محمد امین) علی گڑھ ۱۰۵۰ میر نظام الدین ممنون دہلوی اور ان کا دیوان (منشا الرحمٰن خاں) ناگپور ۷۱ء ۱۰۵۱ وجد کی مثنوی مخزن عشق کی تنقیدی تدوین (محمود قادری) عثمانیہ ۸۰ء ۱۰۵۲ وجہی کی تاج الحقائق ترتیب و تنقید (نور السعید اختر) بمبئی ۶۹ء

اضافے:۔

۱۰۵۳ دیوان دانش ترتیب و تدوین (خواجہ محمد حسیب) بہار ۸۱ء ۱۰۵۴ دیوان ریاض حسن خاں خیال کی ترتیب و تدوین (فاروق احمد صدیقی) بہار ۸۰ء ۱۰۵۵ ترتیب و تدوین دیوان رضیہ خاتون جمیلہ خدا بخش (اسرائیل رضا) پٹنہ ۸۲ء ۱۰۵۶ واقف دہلوی، احوال، تدوین، دیوان و تنقید کلام (شکیب ایاز) پٹنہ ۸۵ء ۱۰۵۷ تذکرہ شعرا انتخاب یادگار از امیر مینائی کی تنقید کا تدوین، تعارف اور اہم نوٹس (مہر جبیں) روہیلکھنڈ ۱۹۹۰ء

لسانیات

۱۰۵۸ اٹھارہویں صدی میں شمالی ہند کی ادبی زبان کا لسانی جائزہ (جیلانی بیگم) عثمانیہ ۸۳ء ۱۰۵۹ اردو اور برج بھاشا کی قواعد کا تقابلی مطالعہ (رشید الحسن) عثمانیہ ۶۸ء ۱۰۶۰ اردو اور پنجابی کا لسانی رشتہ (کالا سنگھ بیدی) دہلی ۶۰ء ۱۰۶۱ اردو پر فارسی کے اثرات (اعلام مصطفیٰ خاں) ناگپور ۵۹ء ۱۰۶۲ اردو رسم خط ابتدا و ارتقا (نذیر ملک) کشمیر ۱۰۶۳ اردو زبان کی بین الاقوامی حیثیت (نعیم اللہ خاں) آگرہ ۸۷ء

(۱۰۶۴) اردو زبان کا آغاز اور ارتقا (مسعود حسین خاں) علی گڑھ ۵۴ء (۱۰۶۵) اردو زبان کا ارتقا جدید ہندوستان میں (معین زیدی) دہلی (۱۰۶۶) اردو زبان وادب کے ارتقا میں جدید سائنس کا حصہ (شاہد رضا) میرٹھ ۵۰ء (۱۰۶۷) اردو قواعد کی تدوین کے اصول (منیر اقبال) علی گڑھ (ڈی لٹ) (۱۰۶۸) اردو قواعد نویسی کی تاریخ (منیر اقبال) علی گڑھ ۶۸ء (۱۰۶۹) اردو کی صوتی اور صوتیاتی ساخت (اسلم رضوی) علی گڑھ ۶۸ء (۱۰۷۰) اردو لغت نگاری کا تنقیدی جائزہ (مسعود ہاشمی) جامعہ ملیہ (۱۰۷۱) اردو لغت نویسی (ایم ۔ ایچ رضوی) کشمیر ۷۴ء

(۱۰۷۲) اردو میں انگریزی کے دخیل (مستعار) الفاظ (وقار احمد جعفری) دہلی (۱۰۷۳) اردو میں ضرب الامثال اور کہاوتیں سماجی اور لسانی پس منظر میں (یونس اگاسکر) بمبئی ۸۶ء * (۱۰۷۴) اردو میں عربی الفاظ (مجتبیٰ حسن) علی گڑھ ۵۹ء (۱۰۷۵) اردو میں فارسی کے مستعار الفاظ (آئی اے ۔ بی شیخ) مرہٹواڑہ ۸۴ء (۱۰۷۶) اردو میں وضع اصطلاحات : اصول و تاریخ (ابوالفیض سحر) جامعہ ملیہ (۱۰۷۷) ریاستوں کی تقسیم (تنظیم جدید) کے بعد اردو ذریعہ تفہیم (رشید ارشد) حیدرآباد (۱۰۷۸) شمالی ہندوستان کی اردو کی تاریخی قواعد ۱۷۰۰ تا ۱۸۱۰ء (خلیل احمد بیگ) علی گڑھ (۱۰۷۹) عربی کا اثر اردو زبان وادب پر (شفیع بخش) بمبئی ۸۴ء (۱۰۸۰) میواتی کا آغاز و ارتقا (مہادیر پرساد شرما) راجستھان (۱۰۸۱) میواتی کا بیانیہ تجزیہ (ڈی ۔ آر ۔ بھاردواج) پونا ۷۵ء

(۱۰۸۲) ہندوستان کی لسانی ریاست میں اردو کا ارتقا ۱۹۵۶ء سے (عبدالرحمن قریشی) حیدرآباد ۸۸ء (۱۰۸۳) ہندی میں مستعمل گھریلو زندگی سے متعلق کشمیری الفاظ (چجے کشوری شعرپوری) آگرہ ۷۵ء

کتابیات، اشاریئے، فرہنگ

(۱۰۸۴) اٹھارہویں صدی میں اردو شاعری کی فرہنگ (ذکاء الدین شایاں) علی گڑھ ۵۰ء (۱۰۸۵) اردو ناول کی توضیحی کتابیات ۱۸۹۷ء ۔ ۱۹۴۷ء (فاطمہ اعجاز) دہلی * (۱۰۸۶) دکنی اردو قصائد کی مکمل اور توضیحی فرہنگ (رشید النور) علی گڑھ (دیکھئے دکنی ادب) (۱۰۸۷) شمالی ہند کے اردو قصائد کی فرہنگ مع مقدمہ (امام ہانی اشرف) علی گڑھ * (۱۰۸۸) طلسم ہوشربا کی فرہنگ مع تنقیدی مقدمہ (نکہت سلطانہ) علی گڑھ (ام ۔ فل)

(۱۰۸۹) فرہنگ کلیات میر مع مقدمہ (فرید احمد برکاتی) راجستھان *

تقابلی مطالعے

(۱۰۹۰) اردو اور کشمیری شاعری میں رومانی رجحانات (محبوبہ پنڈت) کشمیر (۱۰۹۱) اردو اور انگریزی کی فطری شاعری کا تقابلی مطالعہ (حنیف قریشی) دہلی (۱۰۹۲) اردو اور برج بھاشا قواعد کا تقابلی مطالعہ (رشید الحسن)

عثمانیہ ۶۸ء (١٠٩٣) اردو اور ہندی ادب کے اہم رجحانات کا تقابلی مطالعہ (سمیع اللہ اشرفی) علی گڑھ (١٠٩٤) اردو اور ہندی افسانہ کا تقابلی مطالعہ ۱۹۶۰ء کے بعد (طارق چھتاری) علی گڑھ ۸۶ء (١٠٩٥) اردو اور ہندی عروض کا تقابلی مطالعہ (کنول کرشن بالی) علی گڑھ (١٠٩٦) اردو اور ہندی کی رومانی شاعری کا تنقیدی مطالعہ (فرہاد علی) جامعہ ملیہ (١٠٩٧) ترقی پسند اردو و ہندی ادب کا تقابلی مطالعہ (اصغر وجاہت) علی گڑھ (١٠٩٨) تنقیدی تصورات کا تقابلی مطالعہ (غلام مہر آجر) جواہر لال نہرو (١٠٩٩) جدید ہندی اور اردو ادب کی اہم مشترک خصوصیات کا تنقیدی مطالعہ ۱۸۵۷ء-۱۹۵۶ء (جعفر رضا) الہ آباد (١١٠٠) جدید ہندی اور اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ (رخسانہ محمد میاں شیخ) شیواجی ۷۷ء (١١٠١) مولانا حالی اور میتھلی شرن گپتا ـ مسدس حالی اور بھرت بھارتی کے خصوصی حوالوں کے ساتھ تقابلی مطالعہ (اس غلام رسول) انا ملائی (١١٠٢) غالب کی اردو اور فارسی شاعری کا تقابلی مطالعہ اور ذرائع کی تحقیقات (عبد اللہ شیدا) کشمیر ۷۶ء (١١٠٣) فردوسی اور انیس ـ ایک تقابلی مطالعہ (سید فدا حسین) لکھنؤ ۶۳ء (دیکھئے شخصیات) * (١١٠٤) کرشن چندر اور یشپال کی کہانیوں کا تقابلی مطالعہ (رشید آثار) بمبئی ۸۶ء (دیکھئے شخصیات) (١١٠٥) نظیر اور ورڈزورتھ کا تقابلی مطالعہ بحیثیت شاعر فطرت (اس عظمت اللہ) مدراس (دیکھئے شخصیات) (١١٠٦) ہندی اور اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ (مہتاب علی) پٹنہ

اضافے:

(١١٠٧) اردو گجراتی اور ہندی غزلوں کا تجزیہ (سبھاش بھدوریا) گجرات ۱۹۹۰ء (١١٠٨) پریم چند اور شرت چند ایک تقابلی مطالعہ (عبد اللہ) رانچی ۸۴ء۔

مختلف خطوں میں اردو ادب

(١١٠٩) اردو ان تامل ناڈو (سعید حسرت سہروردی) مدراس (١١١٠) اردو زبان و ادب کی ترقی میں لکھنؤ کا حصہ (محمد حسن) لکھنؤ ۵۲ء (١١١١) اردو فارسی ادب میں برہان پور کا حصہ (شیخ فریدالدین خاں) ناگپور (١١١٢) اردو کا گوجری زبان و ادب پر اثر (کرم دین چوہڑا) جموں ۹۷ء (١١١٣) اڑیسہ میں اردو ادب (حفیظ اللہ نولپوری) جواہر لال نہرو ۸۴ء (١١١٤) انیسویں صدی تک خاندیش میں اردو شاعری کا ارتقا (اے آر خاں) پونا (١١١٥) انیسویں صدی میں مغربی بنگال میں اردو زبان و ادب کا ارتقا (جاوید نہال) کلکتہ ۷۳ء * (١١١٦) اودھ میں اردو ادب (محمد حسن) لکھنؤ ۵۰ء (١١١٧) اودھ میں اردو ادب کا تہذیبی و سماجی پس منظر (سعادت علی صدیقی) دہلی (١١١٨) اورنگ آباد میں اردو ادب کا آغاز و ارتقا (خالدہ یوسف) عثمانیہ ۵۹ء (١١١٩) ایلچ پور کے بعض قدیم شعرا کی حیات اور کارنامے (سعیدہ وسیم دردانہ باسط) ناگپور ۷۷ء (١١٢٠) بمبئی اردو ـــ لسانیاتی [illegible] عمل کا مطالعہ (عبدالستار دلوی) بمبئی ۶۵ء

۱۱۲۱ بمبئی شہر میں اردو ۱۹۴۷ تک (میمونہ عبدالستار دلوی) بمبئی ۱۹۶۱ء ۱۱۲۲ بنگال میں اردو افسانہ نگاری (ایم۔ اے نصرا
کلکتہ (افسانہ) ۱۱۲۳ بہار کی شاعری میں شاد کے چند تلامذہ کا حصہ (وصی احمد) بہار ۸۸ء (شاعری) ۱۱۲۴
بہار کے تلامذہ ناسخ (حمیدہ خاتون) پٹنہ ۷۷ء ۱۱۲۵ بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقاء ۱۸۵۷ تک (اختر اورینوی)
پٹنہ ۸۵ء (ڈی لٹ) ۱۱۲۶ بہار میں اردو شاعری کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء (کلیم احمد عاجز) پٹنہ ۷۶ء (شاعری) ۱۱۲۷
بہار میں تذکرہ نگاری (منصور عالم) مگدھ ۷۷ء ۱۱۲۸ بہار میں جدید نظم نگاری (ولی احمد ولی) بہار ۸۸ء (نظم) ۱۱۲۹
ریاست بھوپال اور مشاہیر (ارجمند بانو) بھوپال ۱۱۳۰ بھوپال کا حصہ اردو ادب کی ترقی میں (سلیم حامد رضوی)
آگرہ ۵۹ء ۱۱۳۱ بھوپال میں اردو انضمام کے بعد (محمد نعمان) بھوپال ۷۷ء ۱۱۳۲ ریاست بھوپال میں اطباء کی علمی و
ادبی خدمات (اختر مسعود صدیقی) بھوپال ۱۱۳۳ دبستان بیجاپور کا سماجی اور ثقافتی پس منظر (عبدالرحیم) عثمانیہ
۱۱۳۴ پنجاب میں اردو شاعری کا ارتقاء (امرت لال عشرت) بنارس ۷۲ء ۱۱۳۵ تامل ناڈو میں اردو ادب ۱۸۵۷ء
کے بعد (عبدالغفار شاکر) مدراس ۱۱۳۶ تامل ناڈو میں اردو زبان وادب کا ارتقاء (مظہر قلندر) مدراس (ام لٹ)
۱۱۳۷ تامل ناڈو میں اردو شاعری ۱۸۰۰ء سے ۱۹۵۰ء تک (بدرالنسا) مدراس ۱۱۳۸ تامل ناڈو میں اردو نثر کا
ارتقاء (قمر الزماں) پٹنہ (نثر) ۱۱۳۹ ٹونک میں شعری وادبی روایت (مس فیروز) راجستھان ۱۱۴۰ جموں خطے میں
اردو زبان وادب کا ارتقاء (ظہور الدین) جموں "ڈی لٹ" * ۱۱۴۱ چھوٹا ناگپور میں اردو زباں وادب
کا ارتقاء (صدیق مجیبی) رانچی ۸۲ء ۱۱۴۲ حیدرآباد دکن کے ادبی اور علمی اردو رسائل کا مطالعہ ۴۸ء تک (انوار الدین)
حیدرآباد ۱۱۴۳ حیدرآباد میں اردو کی ترقی تعلیمی اور سرکاری اور سرکاری زبان کی حیثیت سے (مصطفیٰ کمال) عثمانیہ
۱۱۴۴ خاندیش میں انیسویں صدی تک اردو شاعری کا ارتقاء (اے آر خاں) پونا (شاعری) ۱۱۴۵ دربھنگہ میں
اردو شاعری کا ارتقاء (مظہر ناشاد) متھلا ۸۶ء ۱۱۴۶ راجستھان کے اردو شعراء (صبیح الدین افغانی) مگدھ (ڈی لٹ)
۱۱۴۷ راجستھان میں اردو (غوث شریف عارف) راجستھان ۱۱۴۸ راجستھان میں اردو ادب کی تاریخ
(ثاقب حسن رضوی) اودے پور

۱۱۴۹ کرناٹک میں اردو ادب کا ارتقاء (خالد سعید) گلبرگہ ۱۱۵۰ کشمیر میں اردو شاعری کا ارتقاء (
خوش محمد ناظر (انوار احمد خاں) دہلی ۱۱۵۱ کشمیری ادب پر ترقی پسند تحریک کا اثر (شعل سلطان پوری) کشمیر
۱۱۵۲ گجرات کے اردو شعراء (ظہیر الدین مدنی) بمبئی ۸۹ء ۱۱۵۳ گذشتہ صدی میں راجستھان میں اردو کے فروغ میں
غیر مسلموں کا حصہ (ابوالفیض عثمانی) راجستھان ۱۱۵۴ گلبرگہ میں اردو زبان وادب کا ارتقاء اور مسائل کا تجزیہ

آزادی ہند کے بعد (فہیم الدین) گلبرگہ (۱۱۵۵) لکھنو کے اردو ادب کا ثقافتی اور معاشرتی پس منظر (عبدالباری شیم سبحانی) لکھنو (۱۱۵۶) مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما (افضل الدین) عثمانیہ ۸۰ء (۱۱۵۷) میسور میں اردو کا نشو و نما (حبیب النسا بیگم) دہلی ۵۹ء (۱۱۵۸) ناگپور ضلع میں اردو (شرف الدین) ناگپور ۸۰ء (۱۱۵۹) ودربھ میں اردو شاعری کا آغاز وارتقا (اسماعیل شاہ) ناگپور (۱۱۵۹/۱) اردو ادب کی تاریخ ہماچل پردیش کا حصہ (اتم چاند) پنجاب ۹۱ء

اضافے :-

(۱۱۶۰) بہار کا اردو ادب ۴۷ء کے بعد (نسیم اختر) پٹنہ ۸۰ء (۱۱۶۱) بہار میں اردو تحقیق (زاہدہ بانو) پٹنہ "داخل" (۱۱۶۲) بہار میں اردو نعت گوئی (محمد نسیم) متصلا ۸۰ء (۱۱۶۳) دبستان عظیم آباد کے ادبی گلدستے (عفت وہاب) پٹنہ "داخل" (۱۱۶۴) عظیم آباد میں اردو (ایس ایم معزالدین) پٹنہ ۹۰ء

<u>مزید :-</u>

(۱۱۶۵) اردو کی ترقی میں بنارس کا حصہ (ریاض الحق خاں) بنارس ۹۰ء (۱۱۶۶) بہار کی اردو صحافت میں گیا کا حصہ (نعیم شاہد) مگدھ ۹۰ء (دیکھئے صحافت) (۱۱۶۷) بہار کی خواتین افسانہ نگار (انوری بیگم) رانچی ۸۷ء (۱۱۶۸) سرونج کی ادبی خدمات (شان احمد) بھوپال ۹۰ء

<u>علوم :-</u> (۱۱۶۹) اردو شاعری میں سیرت کی روایت (شیفتہ پروین) کشمیر (دیکھئے شاعری) (۱۱۷۰) اردو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے (ایم. اے رشید) حیدرآباد ۸۶ء (۱۱۷۱) اردو طباعت کی تاریخ (عتیق فیضی) جواہر لال نہرو (۱۱۷۲) اردو میں احادیث نبوی کے تراجم وتشریحات (عاصم اعظمی) پٹنہ ۸۷ء (۱۱۷۳) اردو میں سیرت النبی کا ادب (سید اسداللہ کاملی) کشمیر ۸۹ء (۱۱۷۴) اردو میں شیعی ادب (رفیعہ شبنم عابدی) بمبئی (۱۱۷۵) اردو میں غیر صحافتی سیاسی ادب (سید محبوب حسین) حیدرآباد (۱۱۷۶) اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ (محمد عزیز) علی گڑھ (۱۱۷۷) جدید اردو ادب پر وجودیت کا اثر (خورشید عالم) بہار ۸۸ء (۱۱۷۸) جدیدیت کی فلسفیانہ اساس (شمیم حنفی) علی گڑھ (ڈی لٹ) (۱۱۷۹) وہابی تحریک کا اردو پر اثر (محمد رشید اللہ) دہلی (۱۱۸۰) ہندوستانی اساطیر اور اس کے نشانات اردو میں (گرو ناتھ دیوکر) بمبئی ۹۷ء (۱۱۸۱) یونیورسٹی درجات کے اردو نصابات کا تنقیدی مطالعہ (محمد صابرین) جامعہ ملیہ

<u>جدوجہد آزادی</u>

(۱۱۸۲) آزادی کی جدوجہد میں اردو کا حصہ (مہرالنساء رحمن) الہ آباد ۵۷ء (۱۱۸۳) انیسویں صدی میں اردو کا زندانی ادب (سعادت علی صدیقی) لکھنو ۷۴ء (۱۱۸۴) جدوجہد آزادی میں اردو شعرا کا حصہ (مقصود احمد انصاری) بہار ۸۰ء (۱۱۸۵) جیل خانوں میں اردو ادب کی تخلیق (ولی الرحمن صدیقی) ناگپور (۱۱۸۶) زنداں میں تخلیق (عبدالوحید خاں) جبلپور ۸۰ء (۱۱۸۷) ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا

حصہ (درخشاں تاجور) گورکھپور ۸۰ء (۱۱۸۸) ہندستان کی جدوجہد آزادی (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۲۱) میں اردو شاعری کا حصہ علیا بانو عسکری (لکھنؤ) ۶۳ء

مزید :-

(۱۱۸۹) تحریک آزادی ہند کا تاریخی وسماجیاتی مطالعہ اردو نثر کی روشنی میں (ضیا الدین صدیقی) جامعہ ۸۹ء

ادارے :-

(۱۱۹۰) آرہ ایک قدیم مرکز اردو ادب (نظام الدین رضوی) مگدھ ۸۷ء (۱۱۹۱) اردو کے تصنیفی اور تالیفی ادارے (دیویندر گپتا) جموں (۱۱۹۲) ادارہ شبلی اتر پردیش میں تعلیم کی ترقی کا مطالعہ مسلمانوں کے خصوصی حوالے کے ساتھ (رئیس احمد افضل) جامعہ ملیہ ۷۷ء (۱۱۹۳) دارالترجمہ عثمانیہ کی ادبی خدمات (عنایت حسین) مرٹھواڑہ (۱۱۹۴) دارالترجمہ عثمانیہ کی ادبی خدمات (محمد مجیب الاسلام) دہلی ۹۰ء * (۱۱۹۵) دارالمصنفین کی ادبی خدمات (شہاب الدین) علی گڑھ (۱۱۹۶) قدیم دلی کالج کا اردو زبان وادب میں حصہ (سید نیاز احمد) دہلی

اضافے :

(۱۱۹۷) دارالعلوم دیوبند کی اردو صحافتی خدمات (نواز دیوبندی) میرٹھ ۱۹۹۰ء (دیکھئے صحافت)

••

ضمیمہ

شخصیات

۱۱۹۸ آل احمد سرور کا نظریہ تنقید اور اسلوب (خورشید انور) پٹنہ ۱۹۹۰ء ۱۱۹۹ اثر اور ان کا عہد (ریاض الحسن) لکھنؤ ۶۷ء ۱۲۰۰ احمد جمال پاشا شخصیت اور کارنامے (ظفراللہ) پٹنہ ۱۹۸۹ء ۱۲۰۱ حضرت مولانا احمد رضا خاں حیات اور شاعری (ظہیرو بیگم) درگاوتی، ۱۹۹۰ء ۱۲۰۲ اختر الایمان فن اور شخصیت (خواجہ نسیم اختر) کلکتہ ۱۹۹۰ء ۱۲۰۳ اسلام بخش سبائی، شخص، شاعر اور شارح (محمد حامد) ناگپور ۶۸ء ۱۲۰۴ بیخود بدایونی حیات اور ادبی خدمات (اسعد بدایونی) علیگڑھ ۱۹۹۰ء ۱۲۰۵ چکبست حیات اور خدمات (افضل احمد) لکھنو ۱۹۵۸ء ۱۲۰۶ محمد حسین آزاد احوال و آثار (محمد صادق) پنجاب ۱۹۳۹ء* ——— ۱۲۰۷ خلیل الرحمٰن اعظمی حیات و خدمات (علیا کوثر) راجستھان ۱۹۹۰ء ۱۲۰۸ رجب علی بیگ سرور (سید مسعود رضوی) الہ آباد ۱۹۶۵ء ۱۲۰۹ میر اوسط علی رشک، حیات و خدمات (انصاراللہ) گورکھپور ۶۷ء ۱۲۱۰ سید سلیمان ندوی حیات اور کارنامے (شیخ عبداللہ) بمبئی ۱۹۹۰ء ۱۲۱۱ شکیل الرحمٰن کی آرکی ٹائپی تنقید کا تنقیدی مطالعہ (فیروزی بیگم) رانچی ۱۹۹۰ء ۱۲۱۲ بہادر شاہ ظفر اور ان کی شاعری (محمد اسلم) دہلی ۶۶ء ۱۲۱۳ عصمت چغتائی حیات و خدمات (محمد اشرف) گورکھپور ۱۹۹۰ء ۱۲۱۴ فانی کی شاعری میں حزنیہ عناصر (معراج الحسن) روہیلکھنڈ ۱۹۹۰ء ۱۲۱۵ فراق گورکھپوری حیات اور کارنامے (تبسم فاطمہ) بنارس ۱۹۹۰ء ۱۲۱۶ کلیم الدین احمد بحیثیت سوانح نگار (محمد کلام خاں) پٹنہ ۱۹۹۰ء ۱۲۱۷ کیفی اعظمی فکر و فن (شکیلہ رفعت علی) گورکھپور ۱۹۹۰ء ۱۲۱۸ پروفیسر محمد مجیب بحیثیت خاکہ نگار (سید زیب النسا بیگم) ونکٹیشور ۱۹۹۰ء ۱۲۱۹ مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ (امام اعظم) متھلا ۱۹۹۰ء۔ مزید ـ ۱۲۲۰ حالی کا ذہنی ارتقا، فارسی پر اردو کا اثر (غلام مصطفیٰ خاں) ناگپور ۱۹۹۰ء ۱۲۲۱ خواجہ حسن نظامی حیات و خدمات (محیط خاں) ناگپور ۱۹۹۰ء ۱۲۲۲ عارف الدین خاں عزیز اور ان کے کارنامے (سعیدہ بہار الدین) حیدرآباد ۱۹۹۰ء ۱۲۲۳ اردو تنقید کے ارتقا میں عبادت بریلوی کا حصہ (شبانہ امیر) عثمانیہ ۱۹۹۰ء ۱۲۲۴ مہندر ناتھ بحیثیت ناول نگار (برج بھوشن) پنجاب، ۱۹۹۰ء

اقبالیات

۱۲۲۵ اقبال پر مغربی اثر (تارا چرن رستوگی) گوہاٹی ۱۹۶۸ء ۱۲۲۶ فکر اقبال اور ہم عصر فکری میلانات (شجاع الدین) علیگڑھ ۱۹۹۰ء

شاعری

۱۲۲۷ اردو کی نعتیہ شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (شاہدہ پروین) کانپور ۱۹۹۰ء ۱۲۲۸ اردو گجراتی اور ہندی غزلوں کا تجزیہ (سبھاش بھدوریا) گجرات ۱۹۹۰ء (دیکھیے تقابلی مطالعہ) ۱۲۲۹ ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری (یعقوب یاور کوٹی)

بھوپال ۱۹۹۰ء (۱۲۳۰) جنوبی ہند کی متصوفانہ مثنویاں (مہ نور زمانی بیگم) ۱۹۹۰ء مثنوی (۱۲۳۱) ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری (یاسمین نکہت) بھاگلپور (۱۲۳۲) دبستان گولکنڈہ کی شاعری میں ہندستانی عناصر (سید عبدالستار) گورکھپور ۱۹۹۰ء (۱۲۳۳) ریختی کا تنقیدی مطالعہ (کے اے صدیقی) وکرم ۶۶ ۱۹ء

افسانہ

(۱۲۳۴) شمالی ہندستان میں اردو فکشن ۱۸۷۰ء تک (گیان چند جین) الہ آباد ۴۸ ۱۹ء (۱۲۳۵) اردو افسانوں میں گاؤں کی عکاسی (خورشید عالم) گورکھپور ۱۹۹۰ء (۱۲۳۶) اردو افسانے میں حیات۔ اسلوب کا تجربہ (خورشید احمد) علیگڑھ ۱۹۹ء

ناول

(۱۲۳۷) اردو ادب میں تاریخی ناول (اقبال احمد) منگلور ۱۹۹۰ء (۱۲۳۸) اردو کی خاتون ناول نگار (سیمہ) بنارس ۱۹۹ء (۱۲۳۹) اردو ناول ۱۹۶۰ء کے بعد (شاہد جمیل) بھاگلپور ۱۹۹۰ء (۱۲۴۰) ہندستانی و پاکستانی ناول کے موضوعات اور رجحانات کا تقابلی مطالعہ (خالد اشرف) دہلی ۱۹۹ء

صحافت

(۱۲۴۱) انیسویں صدی میں اردو رسائل۔ ایک تجزیاتی مطالعہ (شعائر اللہ خاں) مگدھ داخل ۱۹۹ء (۱۲۴۲) بہار کی اردو صحافت میں گیا کا حصہ (نعیم شاہد) مگدھ ۱۹۹ء (دیکھیے علاقائی ادب) (۱۲۴۳) دارالعلوم دیوبند کی اردو صحافتی خدمات (نواز دیوبندی) میرٹھ ۱۹۹۰ء (دیکھیے ادارے)

تدوین ترتیب

(۱۲۴۴) مثنوی خوب ترنگ از میاں خوب محمد چشتی۔ تنقیدی تدوین (علیم محمد تدیر حسن جعفری) بمبئی ۵۹ء۔

(۱۲۴۵) مثنوی مرآۃ الحشر از عراقی بجنوری۔ تنقید تدوین (کوکب النسا بیگم) عثمانیہ ۱۹۹۰ء۔

اردو ادب (عمومی)

(۱۲۴۶) اردو میں انشائیہ نگاری کا ارتقا (سید ناصر حسین نقوی) الہ آباد ۵۸ ۱۹ء (۱۲۴۷) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک (کے آر اعظمی) علیگڈھ ۱۹۵۸ء (۱۲۴۸) جدید اردو تنقید کے اصول (سید مصیب عباس) لکھنو ۶۶ ۱۹ء (۱۲۴۹) جدید اردو کی خصوصیات اور رویے (موہن سنگھ) کلکتہ ۳۱ ۱۹ء (۱۲۵۰) شعرائے اردو کے تذکرے، تنقیدی تحقیقی مطالعہ میرے شیفتہ تک (سید حسن احمد نقوی) وکرم ۶۸ء (۱۲۵۱) قرآن شریف کے اردو تراجم اور تفاسیر ۱۹۱۴ء تک (سید حمید شطاری) عثمانیہ ۱۹۸ مزید ــ (۱۲۵۲) اردو میں آپ بیتی نگاری: تحقیقی و تنقیدی جائزہ (خواجہ محیب احمد قاضی) امراوتی ۱۹۹۰ء (۱۲۵۳) اردو ہندی فقروں کا تبدیلیاتی تجزیہ (محمد شکور اللہ خاں) علیگڑھ ۱۹۷ء (۱۲۵۴) راجستھان میں مختلف زبانوں کی تصانیف کے اردو تراجم (عزیز اللہ شروانی) (۱۲۵۵) ریڈیو اور ٹیلیویژن کی زبان (کمال احمد) جواہر لال نہرو ۱۹۹۰ء

اشاریہ مقالہ نگاراں

●●

پاکستان میں اردو تحقیق
ڈاکٹر سید معین الرحمٰن لاہور
ڈاکٹر معین الدین عقیل کراچی

پاکستان میں اردو تحقیق : اشاریہ

پیش نظر اشاریہ دو مصنفوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ رحمٰن کے معیّن کی اور دین کے معیّن کی۔ ہم نے محض اسے ایک باقاعدہ اشاریہ کی شکل دے دی ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل (=عقیل) کی کتاب "پاکستان میں اردو تحقیق" دراصل ایک مقالہ تھا جو سہ ماہی جریدے "اردو" شمارہ ۲، ۱۹۸۵ء میں چھپا تھا۔ بعد میں یہ کتابی شکل میں انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہو گیا۔ حرف آغاز میں ڈاکٹر عقیل نے اس کتاب کی نوعیت کے متعلق وضاحت کی ہے کہ یہ جائزہ ادبی و لسانی تحقیق تک محدود ہے۔ اس جائزے میں علمی اور مذہبی تحقیق کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن (=رحمٰن) کا مضمون "پاکستانی جامعات میں اردو تحقیق کے چالیس سال (۱۹۴۷-۱۹۸۷ء)" ہمیں آف پرنٹ کی شکل میں ملا جس پر رسالے کا نام دستیاب نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر عقیل کی کتاب اور ڈاکٹر رحمٰن کے مضمون کا علیحدہ علیحدہ موضوع وار اشاریہ تیار کر دیا گیا ہے۔ دونوں اشاریوں کا مقابلہ کرنے کے ساتھ جو اندراجات دونوں میں مشترک پائے گئے ان کے ساتھ رحمٰن/عقیل کا لفظ بڑھا دیا گیا ہے۔ یہ مشترک اندراجات صرف طبع شدہ مقالات (تھیسس) کے ہیں۔ ڈاکٹر رحمٰن کے مضمون میں غیر مطبوعہ تھیسس کی اچھی خاصی تعداد ہے۔

اس فہرست میں نشان زدہ (●) مطبوعہ کتابیں ہیں جو ضروری نہیں کہ تھیسس ہوں، ہیں بھی، نہیں بھی ہیں۔ اور بقیہ یا تو غیر مطبوعہ تھیسس ہیں یا مختلف رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین۔

— ادارہ

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لاہور

پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے چالیس سال ۱۹۴۷ء-۱۹۸۷ء

رفتار اور معیار

سابق مشرقی پاکستان میں ڈھاکا یونیورسٹی کا شعبۂ اردو بہت ممتاز تھا۔ موجودہ پاکستان میں اب اسے نظر انداز کر کے ساتِ یونیورسٹیوں کے اُردو شعبوں میں تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ اب تک چار اسکالروں نے پاکستانی یونیورسٹیوں سے ڈی لٹ کا اعلیٰ ترین علمی اعزاز حاصل کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر سید قمقام حسین جعفری نے کراچی یونیورسٹی، کراچی سے اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے سندھ یونیورسٹی، جامشورو (حیدر آباد) سے یہ اسنادِ فضیلت پائیں۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۷ء تک کے ان چالیس برسوں میں پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں سے ایک سو پچاس سے زیادہ اہلِ علم نے پی ایچ، ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ ان میں ۲۵ سے زیادہ خواتین بھی شامل ہیں۔ اس حدِّ زمانی میں کراچی، سندھ اور بلوچستان کی جامعات سے تین خواتین نے اُردو میں ایم فل کی اسناد بھی حاصل کیں۔

سب سے زیادہ تحقیقی کام پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ہوا جہاں ستّر اسکالروں کو اردو میں پی ایچ، ڈی کی اسناد تفویض ہو چکیں۔ تحقیقی کام کی جو آسانیاں اور قدیم و باثروت کتب خانوں کی جیسی سہولتیں لاہور میں میسر ہیں اس کے پیشِ نظر تحقیقی کام کی یہ رفتار اور زیادہ بہتر اور اطمینان بخش ہو سکتی تھی اگر ماضی میں مجاز رویے مثبت ہوتے اور نو آموز واردانِ تحقیق کی حوصلہ شکنی نہ کی جاتی۔

پنجاب یونیورسٹی لاہور سے تحقیقی کام کی اجازت حاصل کر لینا اب جیسا سہل ہے، پہلے ایسا کبھی نہیں رہا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ (وفات لاہور ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء) قیامِ پاکستان سے ۱۹۶۴ء تک یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے صدر اور اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔ ۱۹۶۴ء تک کے سترہ برسوں میں کُل بارہ اصحاب کو پی ایچ، ڈی سے سرخرو ہونا نصیب ہوا ــــ یہ سارا کام قدرِ اوّل کا ہوتا تو اس تھوڑے کو بہت جان کر فخر کیا جا سکتا تھا لیکن ان بارہ مقالات میں سے ایک تہائی کی تو آج تک چھپنے ہی کی نوبت نہیں آ پائی ــــ جو چھپے ہیں ان میں ایسے بھی ہیں جو یونیورسٹی، اسکالروں یا نگرانِ کار اصحاب، غرض کسی کے لیے بھی وجہ فخر نہیں۔

۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۲ء تک کے اگلے سترہ برسوں میں (جب پروفیسر سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر وحید

قریشی شعبۂ اردو کے صدر اور اورینٹل کالج کے پرنسپل رہے) اکتیس ریسرچ اسکالروں کو پی ایچ ڈی کی اسناد تفویض ہوئیں، بچاس کے قریب موضوعات کا رجسٹریشن ہو چکا اور اہلِ علم منظور شدہ موضوعات پر دادِ تحقیق دینے میں مصروف ہیں۔

شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے دوسرے انتظامی اور سربراہی دور میں تحقیقی کام کی اجازت حاصل کر لینا جیسا آسان اور ارزاں بنا دیا گیا، وہ پہلے دور کی نارَوا اور بے جواز حوصلہ شکنی کا ایک طرح سے گویا ردِّ عمل تھا ــــ امید ہے کہ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے تیسرے (موجودہ) دور میں جب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں، اعتدال کی صورت پیدا ہو سکے گی۔ یعنی طالبانِ صادق رجسٹریشن سے محروم نہیں رکھے جا سکیں گے اور تحقیق سے مزاجی مناسبت نہ رکھنے والوں کو اس وادی سے دور رکھا جا سکے گا۔

کراچی میں تحقیقی وسائل کی کمی ہے اور نہ ذی استعداد اصحاب کا قحط ــــ اس عقب میں پچھلے تیس پینتیس برس میں کراچی یونیورسٹی سے جتنے اسکالروں نے ڈاکٹریٹ کی منزل کو پایا وہ تعداد کچھ قابلِ رشک نہیں۔

سندھ یونیورسٹی، جامشورو نے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کی نگرانی میں تحقیقی کام کی جو رفتار اور روایت قائم کی وہ قابلِ تحسین ہے۔ بعض صورتوں میں کام کے معیار کے بارے میں شاید دو رائیں ہوں لیکن اس عدمِ اعتدال سے کون سی یونیورسٹی ہے جو بچی ہوگی! کراچی یونیورسٹی سے ایسے اصحاب کو (اور ایسے کاموں پر) تحقیقی ڈگریاں دی گئی ہیں جو سرے سے تحقیق ہی پر یقین نہیں رکھتے اور اسے غیر مفید یا کم مفید شغل سمجھتے ہیں! پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں ایک طرف ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے تحقیقی کام کو ایک معیار اور مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ تحقیقی کام کو کیسا ہونا چاہیے، دوسری طرف پنجاب یونیورسٹی ہی کے بعض بے ڈول یا کج مج 'انتقادی' یا غیر منضبط اور بے رس مدرسانہ مقالات کو اس امر کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ تحقیقی کام کو کیسا نہ ہونا چاہیے!!

قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ڈھاکا یونیورسٹی (سابق مشرقی پاکستان) سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد (جامشورو) کراچی یونیورسٹی، پشاور یونیورسٹی، بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور اور جامعہ بلوچستان کوئٹہ کے اردو شعبوں میں جو تحقیقی کام ہوا یا ہو رہا ہے، اگلے صفحات میں اس کی ضروری تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔ ان تفصیلات کے ہر طرح جامع ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کوائف میں ترمیم و تصحیح یا اضافے کی ہر آواز میرے لیے مسرت کا باعث ہوگی۔

پچھلے چالیس برسوں میں پاکستانی یونیورسٹی کے اردو شعبوں میں جو تحقیقی کام پایۂ تکمیل کو پہنچا (یا موضوعِ زیرِ بحث ہیں) اس کا جائزہ یا تجزیہ ایک ہمہ گیر مہلت کا متقاضی ہے، اس کا موقع نہیں، اس میں مقاماتِ آہ و فغاں بھی بہت ہیں۔

بایں ہمہ ایک دو عمومی اُمور کی طرف اشارہ کر دینا چاہوں گا۔

پہلی بات ایک ہی موضوع پر کام کی تکرار ہے۔ جہاں تحقیق کے لیے اردو شعر و ادب کی کتنی ہی وادیاں قدم قدم کی آبلہ پائی منتظر ہوں، وہاں کم و بیش ایک، یا ایک ہی سے موضوع کو تحقیق کے لیے منتخب کرنا منظور کر الینا (ریسرچ اسکالر کے پیشِ نظر کوئی آسان راستہ نہیں ہے تو) گویا توانائیوں کو ضائع کرنا ہے۔

اردو میں سیرت النبی کے موضوع پر سندھ یونیورسٹی میں بھی کام ہوا (۱۹۷۹ء)، پنجاب یونیورسٹی نے بھی اسی موضوع پر ڈگری دی (۱۹۸۲ء) جب کہ "اردو میں سیرت نبوی کا ادب" ہی کے موضوع پر ڈاکٹر اسداللہ کامل ۱۹۶۸ء میں شعبۂ اُردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر سے پروفیسر عبدالقادر سروری کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ پا چکے ہیں۔[1] اردو شاعری کے سیاسی، سماجی اور تاریخی پس منظر پر پنجاب یونیورسٹی میں بھی کام ہوا، سندھ یونیورسٹی میں بھی، ڈھاکا میں بھی اور کراچی یونیورسٹی میں بھی۔[2]

وسائل اور افرادی قوت کی قلت کے مدِنظر حتی الامکان مختلف یونیورسٹیوں میں ایک ہی موضوع پر یا بڑی حد تک ملتے جلتے موضوعات پر (کسی استثنائی استحقاق کے بغیر) کام کرنے کے رجحان کو روکنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کوئی طریق کار وضع کر سکتا ہے۔

ایک دوسری تکلیف دہ حقیقت یہ ہے کہ ان چالیس برسوں میں پاکستانی جامعات سے جتنے تحقیقی مقالات پر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض ہوئی ہیں، میری نظر اور دسترس کی حد تک ان میں سے بمشکل ایک تہائی کو طباعت کی روشنی میسر آتی ہے۔ تحقیق کا مقصد اگر انکشافِ حقائق یا حقائق کی نئی تعبیر و تشکیل یا تشریح ہے، تو پھر ان تحقیقی مقالات کا جو اس معیار پر پورا اترے شائع نہ ہونا اور محض یونیورسٹی لائبریری میں یا یونیورسٹی کے دفتر میں سربند رہنا، کیا صریح و سنگین ظلم نہیں؟

تحقیقی مقالات کی اشاعت کا لازمی اہتمام متعلقہ یونیورسٹی اور یونیورسٹی گرانٹس کمشن دونوں کا مشترکہ دردِ سر ہونا چاہیے۔ پھر کامیاب مقالہ نگاروں کے مقالات اور علمی انکشافات نہ صرف یہ ضرور شائع ہوں بلکہ جن فاضل ممتحنوں نے مقالے پر ڈگری عطا کیے جانے کی سفارش کی ہو، ان کے اسما بھی التزاماً مقالے پر ثبت، اور ہو سکے تو ان کی رپورٹس بھی مقالے کے آغاز میں درج ہوں۔ اس سے تحقیقی کام کا معیار اور اعتبار بڑھے گا اور غلط بخشی یا سہل انگاری کا اگر کوئی راستہ ہے تو وہ بند ہو گا۔

---

[1] ہماری زبان، دہلی، یکم جون ۱۹۷۹ء ص ۴ [2] یہ موضوع پاکستان سے باہر بھی خوب پامال ہوا یا طرح طرح سے زیرِ مشق رہا: (الف) اردو ادب پر سماجی اور اقتصادی حالات کا اثر، ڈاکٹر ذکیہ انجم (دہلی) (ب) دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر، ڈاکٹر محمد حسن (دہلی) (ج) اودھ میں اردو شاعری کے ارتقا میں حکومت کا اثر، ڈاکٹر زہرہ یاسمین (لکھنؤ) (د) اردو شعرا کا سیاسی اور سماجی شعور، طلعت رضوی (پٹنہ) (ہ) اردو نظم میں سیاسی شعور، ڈاکٹر احتشام الدین فاروقی (اجین) (و) اُردو شاعری کا سماجی پس منظر، ڈاکٹر اعجاز حسین (الہ آباد)

○

سیرت

اردو میں سیرت کا سرمایہ : ڈاکٹر عبدالجبار خاں، نگراں: ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۷۹ء

• اردو نثر میں سیرت رسول: ڈاکٹر انور محمود خالد، مطبوعہ: لاہور ۱۹۸۹ء

تذکرہ اولیا

اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ: ڈاکٹر عبدالستار خاں وفا راشدی، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی، سندھ یونیورسٹی ۱۹۸۲ء

تذکرہ صوفیاء

ملتان کی تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ: ڈاکٹر روبینہ ترین، نگراں: ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

تذکرہ علماء

اردو کی ترقی میں علمائے کرام کا حصہ: ڈاکٹر محمد ایوب قادری، نگراں: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، کراچی یونیورسٹی ۱۹۸۰ء

سید سلیمان ندوی اور ان کی علمی، ادبی اور دینی خدمات: ڈاکٹر اختر علی، نگراں: ڈاکٹر عبیداللہ خاں، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۴ء

شمس العلما مولوی ممتاز علی کی شخصیت اور علمی خدمات: ڈاکٹر نازنین اختر، نگراں: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، " ۱۹۸۹ء

تذکرہ ادباء

ابن انشا: احوال و آثار، ڈاکٹر ریاض احمد ریاض، نگراں: سید معین الرحمٰن، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

○ اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی جائزہ: ڈاکٹر رضیہ نور محمد، مطبوعہ لاہور ۱۹۸۵ء

سید امتیاز علی تاج: زندگی اور فن، ڈاکٹر محمد سلیم ملک، نگراں: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی یونیورسٹی ۱۹۸۷ء

پریم چند کا عہد اور فن: ڈاکٹر عبداللہ خاں، نگراں: پروفیسر سید وقار عظیم، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۲ء

• حالی کی اردو نثر نگاری: ڈاکٹر عبدالقیوم (عقیل)، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء

حامد حسن قادری: احوال و آثار، ڈاکٹر نور محمد مسرور اکبرآبادی، نگراں: ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۸ء

پروفیسر حمید خاں: احوال و آثار: ڈاکٹر محمد احسان الحق، نگراں: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی یونیورسٹی ۱۹۸۲ء

خطبات گارساں دتاسی، حواشی و تعلیقات: ڈاکٹر سید سلطان محمود حسنین، نگراں: ڈاکٹر سید یحییٰ احمد ہاشمی، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۵ء

ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری زور: حیات و ادبی کارنامے: ڈاکٹر سلطان زماں نزہت اکرام، نگراں: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۲ء

سر عبدالقادر کی حیات اور ادبی خدمات: ڈاکٹر سید مظفر حسین، نگراں: ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، کراچی یونیورسٹی ۱۹۸۷ء

سندھ کے اردو نثر نگار: ڈاکٹر منہاج الدین، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۳ء

شوکت تھانوی: ڈاکٹر سید مرتضیٰ زیدی، نگراں: ڈاکٹر وحید قریشی پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم: حیات و فن: ڈاکٹر نثار احمد قریشی، نگراں: ڈاکٹر وحید قریشی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

عابد علی عابد: شخصیت اور خدمات: ڈاکٹر عبدالروف شیخ، نگراں: ڈاکٹر سلیم اختر، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ۸۶ء

عبدالماجد دریابادی: احوال و آثار: ڈاکٹر منظور اختر تحسین (فراقی)، نگراں: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء۔

لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات: ڈاکٹر افضل میراں گوہر نوشاہی، نگراں: ڈاکٹر وحید قریشی، پنجاب یونیورسٹی ۸۳ء

حافظ محمود شیرانی: حیات اور تصانیف: ڈاکٹر مظہر محمود خاں شیرانی، نگراں ڈاکٹر وحید قریشی پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۷ء

• محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف: ڈاکٹر اسلم فرخی (عقیل) مطبوعہ کراچی ۱۹۶۵ء

سید مسعود حسن رضوی ادیب: ڈاکٹر طاہر تونسوی، نگراں: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۳ء

مولانا غلام رسول مہر: حیات اور کارنامے: ڈاکٹر شفیق احمد، نگراں غلام حسین ذوالفقار پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۵ء

محمد احسن فاروقی: حیات اور فن: ڈاکٹر ملازم حسین اختر، نگراں ڈاکٹر عبید اللہ خاں پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

نیاز فتح پوری: احوال و آثار۔ ڈاکٹر عقیلہ شاہین، نگراں: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

• ظفر علی خاں: احوال و آثار ڈاکٹر نظیر حسین زیدی مطبوعہ لاہور ۱۹۸۶ء

ابوالکلام آزاد

ابوالکلام آزاد: شخصیت اور فن: ڈاکٹر محمد عباس، نگراں: ڈاکٹر وحید قریشی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

سر سید احمد خاں

• سر سید احمد اور ان کے رفقائے کار کی علمی خدمات: ڈاکٹر امت الحمید کوثر مطبوعہ کراچی ۱۹۸۴ء

سر سید اور حالی کا نظریۂ فطرت: ڈاکٹر ظفر حسن، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۶ء

تذکرہ ۱۸۶۰ء

اردو شعرا کی فارسی اور اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ: ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی نگراں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۴ء۔

اصغر گونڈوی: آثار و افکار، ڈاکٹر اقبال احمد خاں نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۴ء

* اکبر الہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (عقیل) مطبوعہ لاہور ۱۹۸۰ء

* امیر مینائی اور ان کے تلامذہ: ڈاکٹر کریم الدین (عقیل) مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء

شاگردان میر انیس: ڈاکٹر سید قمقام حسین جعفری، ڈی لٹ کراچی یونیورسٹی ۱۹۸۳ء

جگر مراد آبادی: آثار و افکار: ڈاکٹر احمد رفاعی نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں۔ سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۰ء

جنگ آزادی کے اردو شعراء: ڈاکٹر شاہ محمد محمود الرحمٰن، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں سندھ یونیورسٹی ۱۹۸۱ء

حالی کے بعد اردو غزل: ڈاکٹر وقار احمد رضوی، نگراں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کراچی یونیورسٹی۔

جعفر علی حسرت: حیات اور تصانیف: ڈاکٹر ایس اے علوی، نگراں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کراچی یونیورسٹی ۱۹۷۸ء

* جعفر علی حسرت: ڈاکٹر شبیر احمد علوی، مطبوعہ لاہور ۱۹۸۵ء

* اردو مرثیے میں مرزا دبیر کا مقام: ڈاکٹر مظفر حسین ملک، مطبوعہ ۱۹۷۶ء (عقیل)

● سعادت یار خاں رنگین: حیات و کلام: ڈاکٹر صابر علی خاں مطبوعہ کراچی ۱۹۵۶ء (عقیل)

میر سوز: آثار و افکار: ڈاکٹر سردار احمد خاں، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۱ء

شبلی کا ذہنی ارتقاء: ڈاکٹر سید یحییٰ احمد ہاشمی، نگراں: غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۶۶ء

دبستان شبلی کی علمی و ادبی خدمات: ڈاکٹر شاہ محمد نعیم ندوی، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۱ء

شورش کاشمیری: احوال و آثار: ڈاکٹر سردار علی، نگراں، ڈاکٹر عبید اللہ خاں، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۸ء

نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر علی صفدر جعفری، نگراں: ڈاکٹر

سید سجاد باقر رضوی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

* ظفر علی خاں: بحیثیت: ڈاکٹر نظیر حسین زیدی مطبوعہ کراچی ۱۹۷۹ء (مزید دیکھئے صحافت، تذکرہ ادباء)

عزیز لکھنوی: ڈاکٹر نعیم نقوی، نگراں: ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کراچی یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

قائم چاندپوری: ترتیب کلام مع مقدمہ: ڈاکٹر محمد معیز الدین، نگراں: ڈاکٹر عندلیب شادانی ڈھاکہ یونیورسٹی ۱۹۶۴ء
غلام ہمدانی مصحفی: ڈاکٹر محمد صالحین تبسم کاشمیری، نگراں: ڈاکٹر عبادت بریلوی پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۳ء
ممنون: حیات اور شاعری: ڈاکٹر صدیفہ ارمان، نگراں: ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، کراچی یونیورسٹی ۱۹۷۵ء
مومن خاں مومن دہلوی: ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، نگراں: سید وقار عظیم، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۲ء
ناسخ اور ان کے تلامذہ: ڈاکٹر حسین بانو، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۶۸ء
* عبد الغفور نساخ: حیات و تصانیف: ڈاکٹر محمد صدر الحق مطبوعہ کراچی ۱۹۷۹ء (عقیل)
شاہ نصیر دہلوی: ڈاکٹر عبد الرزاق عظیم، نگراں: ڈاکٹر وحید قریشی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۲ء
کلام ولی کا فنی و لسانی جائزہ: ڈاکٹر نیفصان دانش، نگراں: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۳ء

غالبیات

شارحین دیوان غالب (اردو شرح کا تقابلی مطالعہ) ڈاکٹر محمد ایوب، نگراں: ڈاکٹر وحید قریشی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء
غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ: ڈاکٹر سید معین الرحمن، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۲ء

اقبالیات

* اقبالیات: تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء (عقیل)
* اسلامی تصوف اور اقبال: ڈاکٹر ابو سعید نور الدین، مطبوعہ کراچی ۱۹۵۹ء
فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ: ڈاکٹر محمد صدیق جاوید، نگراں: ڈاکٹر عبادت بریلوی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۷ء

تذکرہ و تذکرہ نگاری

* اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء ڈی۔ لٹ

داستان

اُردو داستان پر قرآن کے اثرات: ڈاکٹر حسن محمد خاں، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۱ء
اردو داستانوں کا علامتی مطالعہ: ڈاکٹر سہیل احمد خاں، نگراں: ڈاکٹر عبادت بریلوی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۹ء
* اردو کی منظوم داستانیں: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء

* اردو کی نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر سید محمود نقوی (سہیل بخاری) مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۸۷ء

اُردو کی نثری داستانوں میں طنز و مزاح اور ان کے محرکات کا جائزہ: ڈاکٹر محمدی بخش سلطانہ، نگراں: ڈاکٹر سید وقار عظیم، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۸ء

داستان امیر حمزہ کا تہذیبی مطالعہ: ڈاکٹر نسیم سلطانہ، نگراں: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی یونیورسٹی ۱۹۷۴ء

دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء: ڈاکٹر محمد آغا سہیل، نگراں: ڈاکٹر عبیداللہ خاں، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۹ء

دکن کی منظوم داستانیں: ڈاکٹر محمد اقبال جاوید، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۴ء

ناول و ناول نگار

اردو میں تاریخی ناول نگاری: ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، نگراں: ڈاکٹر عبیداللہ خاں، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۷ء

* اردو ناول: بیسویں صدی میں: ڈاکٹر عبدالسلام، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۳ء (عقیل)

اُردو ناول: نذیر احمد سے مرزا رسوا تک: ڈاکٹر ناصر احمد خاں (پرویز پروازی)، نگراں: ڈاکٹر سید وقار عظیم، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۸ء

پاکستان میں اردو ناول: ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۰ء

ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری: ڈاکٹر منیرالدین عرشی، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۲ء

* رسوا کی ناول نگاری: ڈاکٹر سید مظہر حسن فتحپوری، مطبوعہ راولپنڈی ۱۹۷۰ء (عقیل)

* شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ: ڈاکٹر اورنگ زیب ممتاز منگلوری، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ء (عقیل)

عزیز احمد: زندگی اور کارنامے: ڈاکٹر اعجاز حنیف، نگراں: ڈاکٹر وحید قریشی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۰ء

* مولوی نذیر احمد: احوال و آثار: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء (عقیل)

افسانہ و افسانہ نگار

اردو افسانے کا ارتقاء: ڈاکٹر آغا مسعود رضا خاکی، نگراں: ڈاکٹر وقار عظیم، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۸ء

اردو افسانے کا ارتقاء: ڈاکٹر انوار احمد، نگراں: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی

اردو افسانے کا نفسیاتی مطالعہ: ڈاکٹر غلام حسین اظہر، نگراں: غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۵ء

اُردو افسانے کے نئے رجحانات: ڈاکٹر فردوس نور قاضی، زیر طبع لاہور

اردو افسانے میں علامت نگاری: ڈاکٹر اعجاز حسین راہی/ اعجاز راہی، نگراں: ڈاکٹر نجم الاسلام سندھ یونیورسٹی ۱۹۸۰ء

اردو افسانے میں قومی عناصر: ڈاکٹر ابو خالد صدیقی، نگراں: ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کراچی یونیورسٹی۔

سعادت حسن منٹو: ڈاکٹر علی ثنا شاکر بخاری، نگراں: ڈاکٹر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

ڈرامہ

اردو ڈرامہ نگاری: خصوصی مطالعہ حکیم احمد شجاع: ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف، نگراں: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا بہاء الدین زکریا یونیورسٹی۔

* ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر: ڈاکٹر محمد اسلم قریشی مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء (عقیل)

* آغا حشر کاشمیری: حیات اور کارنامے: ڈاکٹر شمیم ملک مطبوعہ لاہور ۱۹۸۶ء

سفرنامہ

اردو سفرنامے: تحقیقی و تنقیدی جائزہ: ڈاکٹر منظور الٰہی ممتاز، نگراں: ڈاکٹر عبید اللہ خاں، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۱ء

انشائیہ

اردو میں انشائی ادب کا ارتقاء (قدیم انشاء سے جدید انشاء تک)، ڈاکٹر محمد بشیر سیفی، نگراں: ڈاکٹر وحید قریشی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

طنز و مزاح

* اردو ادب میں طنز و مزاح: ڈاکٹر وزیر آغا مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء، ۱۹۶۶ء، ۱۹۷۷ء۔ (عقیل)

صحافت

ادبیات اردو کے ارتقاء میں رسائل کا کردار: ڈاکٹر روشن آرا راؤ، نگراں: ڈاکٹر وحید قریشی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۱ء

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں صحافت کا حصہ: ڈاکٹر حفیرہ حامد علی خاں، نگراں: ڈاکٹر عبید اللہ خاں، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۷ء

سندھ میں اردو کی ادبی صحافت: ڈاکٹر امین فاروقی نگراں: ڈاکٹر نجم الاسلام، سندھ یونیورسٹی ۱۹۸۷ء

* مولانا ظفر علی خاں: بحیثیت صحافی: ڈاکٹر نظیر حسین زیدی مطبوعہ کراچی

مخزن: ایک تحریک: خالدہ افضال قادری، نگراں: ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، کراچی یونیورسٹی ۱۹۷۱ء۔ ایم۔ فل

اصناف شاعری

اردو غزل کی تہذیبی وفکری بنیادیں: ڈاکٹر اسعد اللہ حکیم، نگراں: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۴ء

اُردو کی منظوم تمثیلیں: ڈاکٹر اشفاق احمد بخاری، نگراں: ڈاکٹر سید یحییٰ احمد ہاشمی، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۹ء

اُردو مرثیے کا ارتقاء: ڈاکٹر پروین اختر، نگراں: ڈاکٹر عبادت بریلوی پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

اردو میں شخصی، مذہبی اور قومی مرثیہ نگاری؛ تاریخ وتنقید۔ ڈاکٹر ارشاد احمد ارشد، نگراں: ڈاکٹر سید عبد اللہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۰ء

اردو میں شہر آشوب: ڈاکٹر سید قمقام حسین جعفری، نگراں: عبدالقیوم، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۷۰ء

* اُردو میں گیت: ڈاکٹر بسم اللہ نیاز احمد، مطبوعہ کراچی ۱۹۸۷ء

اُردو میں منقبت نگاری: ڈاکٹر احسن زیدی، نگراں: ڈاکٹر وزیر آغا، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

اسلامی کلچر اردو مرثیے میں: ڈاکٹر رضیہ سلطانہ، نگراں: عبیداللہ خاں، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۴ء

* مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ کدم راؤ پدم راؤ (مصنفہ فخر دین نظامی)؛ ترتیب وتدوین۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مطبوعہ کراچی ۱۹۷۳ء ڈی۔لٹ (عقیل)

* اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک: ڈاکٹر ملک حسن اختر مطبوعہ لاہور ۱۹۸۶ء

طنز ومزاح کی روایت کلاسیکی اردو شاعری میں: ڈاکٹر سید سجاد باقر رضوی، نگراں: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، کراچی یونیورسٹی۔

تنقید

* اردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان: ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ لاہور ۱۹۸۶ء

اردو نثر

اردو میں انگریزی سے نثری تراجم: ڈاکٹر حامد حسین، نگراں: ڈاکٹر سید سجاد باقر رضوی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

دبستان دہلی کی نثر: ڈاکٹر نجم الاسلام، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۶۹ء

اردو نثر پر تصوف کے اثرات: ڈاکٹر رفعت سلطانہ، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۵ء

تنقید: شاعری

اردو شاعری کا ارتقاء (۱۷۳۹-۱۸۰۳ء): ڈاکٹر ناہید کوثر، نگراں: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

(پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۱ء)

اردو شاعری کا دینی پس منظر : ڈاکٹر ثریا صدیقی، نگران : ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان سندھ یونیورسٹی ۱۹۸۱ء
اردو شاعری کا تاریخی اور سیاسی پس منظر : ڈاکٹر خالد رشید، نگران : ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، سندھ یونیورسٹی ۱۹۶۳ء

* اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر : (۱۷۰۷ء - ۱۸۵۷ء) ڈاکٹر ابوالخیر کشفی مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء (عقیل)
* اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر : ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء (عقیل)

اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر : ڈاکٹر اے۔ ڈی نسیم، نگران : ڈاکٹر سید عبداللہ، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۵۹ء
اُردو شاعری کا معاشرتی پس منظر : ڈاکٹر تاج الدین صدیقی، نگران : سید یحیٰ احمد ہاشمی، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۴ء
اردو شاعری کی ساخت اور ترقی۔ ۱۸ ویں صدی میں : ڈاکٹر سمیر عبدالحمید ابراہیم نگران : ڈاکٹر عبادت بریلوی
پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۸ء
اُردو نظم کا ارتقاء : جعفر زٹلی کے بعد : ڈاکٹر فضل حق خورشید، نگران : ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۶ء
۱۹۴۷ء کے بعد اردو شاعری میں قومی شعور کی نمود : ڈاکٹر نکہت سراج، نگران : ڈاکٹر ابوالخیر کشفی
کراچی یونیورسٹی ۱۹۸۵ء
THE SOCIAL ANALYSIS OF URDU POETRY DURING AND AFTER 1857 : ڈاکٹر محمد حنیف فوق، نگران : ڈاکٹر عندلیب شادانی
ڈھاکہ یونیورسٹی ۱۹۶۴ء

تاریخ اردو ادب

اردو ادب میں عیسائیوں کی خدمات : ڈاکٹر رخشندہ گل، نگران : ڈاکٹر وحید قریشی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۱ء
پنجاب میں اردو ادب کا ارتقاء : ڈاکٹر ممتاز اختر مرزا، نگران : ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۲ء

* تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ : ڈاکٹر معین الدین عقیل، کراچی ۱۹۷۶ء مطبوعہ (عقیل)
* سندھ میں اردو کا ارتقاء : ڈاکٹر شاہدہ بیگم مطبوعہ کراچی ۱۹۸۰ء (عقیل)
* تاریخ اردو ادب (جلد اوّل، دوم سوم) : ڈاکٹر جمیل جالبی مطبوعہ ۱۹۷۵ء ۱۹۸۲ء (عقیل)
* لکھنؤ کی تہذیبی میراث : ڈاکٹر سید صفدر حسین مطبوعہ

زبان وقواعد

اردو کے صرفی ونحوی تغیرات : ڈاکٹر نسیم آراسعید (سعدیہ نسیم) نگراں: ڈاکٹر نجم الاسلام سندھ یونیورسٹی ۱۹۸۷ء
علم عروض اور اردو شاعری: ڈاکٹر محمد اسلم ضیا" نگراں: ڈاکٹر عبادت بریلوی پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

لسانیات

اردو اور پشتو کے لسانی روابط : ڈاکٹر عبدالستار جوہر پراچہ نگراں : ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی پشاور یونیورسٹی ۱۹۸۱ء
اُردو اور راجستھانی بولیاں : ڈاکٹر عزیز انصاری نگراں ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۹ء
* اردو زبان کا ارتقاء : ڈاکٹر شوکت سبزواری مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۵۶ء (عقیل)
اردو سندھی کا تقابلی مطالعہ : ڈاکٹر عبدالواحد خٹک، نگراں : سید سخی احمد ہاشمی، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۸ء
* اردو سندھی کے لسانی روابط : ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء (عقیل)
اردو کا تحقیقی جائزہ : فیصل حق خورشید، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۰ء (ایم فل)
اردو لغت : ڈاکٹر ریاض الحق طاہر، نگراں: ڈاکٹر وحید قریشی پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۲ء
اردو لغت کا ارتقاء : ڈاکٹر سید انور علی نگراں : ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۶ء
براہوی اردو کا تقابلی مطالعہ : ڈاکٹر عبدالرحمن، نگراں: ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۹ء
سندھی، پشتو، اُردو کے لسانی روابط : ڈاکٹر خالد خاں خٹک، نگراں : ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں سندھ یونیورسٹی ۱۹۸۷ء
* کشمیری اور اُردو زبان کا تقابلی مطالعہ : ڈاکٹر محمد یوسف بخاری مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء
گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندی وہندستانی فرانسیسی سے ترجمہ، مقدمہ وحواشی:
ڈاکٹر مس سکستان لبلیان نذرو، نگراں: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۱ء
ہندکو اُردو کا تقابلی مطالعہ : احمد سعید پراچہ نگراں : ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۵ء (ایم فل)

اردو تحریک

* اردو ادب کی تحریکیں : ڈاکٹر محمد انوار الدین (انور سدید) مطبوعہ کراچی ۱۹۸۵ء
اردو رسم الخط اور ٹائپ : ڈاکٹر طارق عزیز نگراں وحید قریشی پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۶ء
* ترقی پسند تنقید کا ارتقاء اور احتشام حسین : ڈاکٹر شمیم بیگم
مطبوعہ ۔ سندھ ۱۹۸۷ء

بچوں کا ادب

* اردو میں بچوں کا ادب : ڈاکٹر اسد علی ادیب مطبوعہ ملتان ۱۹۷۲ء (عقیل)

فارسی ادب

* فارسی شاعری کا اثر اردو شاعری پر : ڈاکٹر عبدالحق مطبوعہ ڈھاکہ

ادارے

* انجمن پنجاب: تاریخ و خدمات : ڈاکٹر صفیہ بانو ترمذی مطبوعہ کراچی ۱۹۷۸ء (عقیل)

فورٹ ولیم کالج کی اردو خدمات : تحقیق کی مزید روشنی میں : عبدالخالق بلوچ، جامعہ بلوچستان (ایم۔ فل)

قرآنیات

اردو شاعری میں قرآن وحدیث کے اثرات : ڈاکٹر شاکر علیمی، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۴ء

اردو میں قرآنی محاورات : ڈاکٹر شمیم نکہت، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۳ء

اردو میں قرآنی تلمیحات : ڈاکٹر کشور سلطانہ، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۳ء

اردو میں قرآنی تراجم اور تفاسیر : ڈاکٹر مسعود احمد، نگراں: " " ۱۹۷۰ء

احادیث

اردو میں احادیث نبوی کے ترجمے اور تعلیقات : ڈاکٹر حبیب الثقلین، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۳ء

فقہ

اردو میں فقہی کتب کا تحقیقی جائزہ : ڈاکٹر ارشاد الحق قدوسی، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۸ء

تعلیمات

برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظام تعلیم کا حصہ : ڈاکٹر فقیر محمد انجم رحمانی، نگراں: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۱ء

●●

ڈاکٹر معین الدین عقیل
کراچی

پاکستان میں اردو تحقیق

تذکرہ ادباء

* مولوی محمد حسین آزاد کے حالات اور ان کے کام (بزبان انگریزی): ڈاکٹر محمد صادق، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۳۹ء لاہور ۱۹۷۴ء
* محمد حسین آزاد: احوال و آثار: ڈاکٹر محمد صادق لاہور ۱۹۷۶ء
* محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف: ڈاکٹر اسلم فرخی، کراچی ۱۹۶۵ء (رحمٰن)

آزاد اور ان کے والد: محمد اکرام چغتائی "راوی" محمد حسین آزاد نمبر ۱۹۸۳ء

حیاتِ آزاد پر مولوی محمد خلیل الرحمٰن کا ایک نادر خط: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن "راوی" محمد حسین آزاد نمبر ۱۹۸۳ء

* آب حیات کی تنقید میں: ڈاکٹر محمد صادق لاہور ۱۹۷۳ء
* آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین: ڈاکٹر محمد صادق لاہور ۱۹۷۳ء

آزاد کی درسی کتابیں: حسن اختر "راوی" محمد حسین آزاد نمبر ۱۹۸۳ء

* مکاتیب آزاد: مرتضیٰ حسین فاضل ۱۹۶۶ء
* نیرنگِ خیال: محمد حسین آزاد: ڈاکٹر محمد صادق ۱۹۶۶ء

نیرنگِ خیال: ایک جائزہ: تحسین سروری "صحیفہ" اکتوبر ۱۹۷۱ء

نیرنگ خیال: تحقیقی جائزہ: غلام حسین "صحیفہ" اپریل ۱۹۷۱ء

* نوابی دربار: نواب سید محمد آزاد: ممتاز منگلوری ۱۹۶۶ء
* خیالات آزاد (نواب سید محمد آزاد): "
* مقالات آزاد (۲ جلدیں): آغا محمد باقر ۱۹۷۸ء
* سوانح مولانا احسن نانوتوی: ڈاکٹر محمد ایوب قادری کراچی ۱۹۶۶ء
* حیات سعدی (حالی) اسمٰعیل پانی پتی ۱۹۶۸ء
* کلیات نثر حالی (۲ جلدیں) " "
* مقدمہ شعر و شاعری: (حالی) ڈاکٹر وحید قریشی لاہور ۱۹۵۳ء

حالی پر کتابیات کی ترتیب : ملک احمد نواز "صحیفہ" جنوری و اپریل ۱۹۷۲ء

* حالی کی اُردو نثر نگاری : عبدالقیوم، لاہور ۱۹۶۴ء (رحمٰن)
* حالی کا ذہنی ارتقاء : غلام مصطفےٰ خاں، لاہور ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۶ء
* مکارم الاخلاق : مولوی ذکاء اللہ دہلوی : احمد رضا، ۱۹۶۷
* محاسن الاخلاق : " " " "
* موازنۂ انیس و دبیر (شبلی) ڈاکٹر عابد علی عابد ۱۹۶۴ء
* سوانح مولانا روم : " ۱۹۶۱ء
* ذکر شبلی : ابن زبیری لاہور ۱۹۵۳ء
* یادگار شبلی : شیخ محمد اکرام " ۱۹۷۰ء
* شبلی مکاتیب کی روشنی میں : معین الدین احمد انصاری۔ کراچی ۱۹۶۷ء
* کتاب نامہ شبلی : اختر راہی لاہور ۱۹۸۱ء
* مقالات یوم شبلی : عبید اللہ خاں، لاہور ۱۹۶۱ء
* شبلی نامہ : شیخ محمد اکرام
* شبلی کی حیات معاشقہ ایک نفسیاتی مطالعہ : ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور ۱۹۵۰ء
* شبلی کی زندگی کا رنگین پہلو : محمد امین زبیری
* شبلی کی رنگین زندگی : جمیل نقوی، لاہور
* مولانا ظفر علی خاں : اشرف عطاء
* ظفر علی خاں ادیب و شاعر : غلام حسین ذوالفقار، لاہور ۱۹۶۷ء
* مولانا فیض احمد بدایونی اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء : ڈاکٹر محمد ایوب قادری، کراچی ۱۹۵۷ء

مولوی موید الدین دہلوی : مسلم ضیائی، "اُردو نامہ" جون ۱۹۶۹ء

مولوی نذیر احمد دہلوی : احوال و آثار : افتخار احمد صدیقی، لاہور ۱۹۷۱ء

سجاد حیدر یلدرم : ڈاکٹر سید معین الرحمن، فنون غالب نمبر ۱۹۶۹ء

مولانا آزاد (ابوالکلام)

مولانا آزاد اور فرجاد مرحوم : ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ اردو ادب۔ علی گڑھ شمارہ نمبر ۱ ۱۹۷۰ء

* امام الہند : 〃 کراچی ۱۹۶۳ء

* ارمغانِ آزاد : 〃 کراچی ۱۹۷۲ء

مولانا ابوالکلام آزاد کا غیر مطبوعہ کلام : 〃 اُردو اکتوبر ۱۹۶۶ء

سرسید احمد خاں

* آثار الصنادید۔ سرسید، ڈاکٹر ایس معین الحق، کراچی ۱۹۶۶ء

سرسید اور وہابی تحریک : ڈاکٹر محمد ایوب قادری، برگ گل سرسید نمبر ۶۸-۱۹۶۴ء (مجلہ اردو کالج)

سرسید اور ابوالکلام آزاد : ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری 〃 〃

سرسید کے تاریخی خطوط کی اہمیت : ثروت یاسین 〃 〃

سرسید کی مصلحانہ مراسلت : خواجہ تہور حسین 〃 〃

سرسید اور مقدمہ شعر و شاعری : غلام مصطفیٰ خاں 〃 〃

تہذیب الاخلاق : ڈاکٹر سید عبداللہ 〃 〃

* سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ : ڈاکٹر سید عبداللہ۔ لاہور ۱۹۶۰ء

* سرسید کا علمی کارنامہ : احمد میاں اختر جوناگڑھی۔ کراچی ۱۹۶۴ء

* سرسید احمد خاں : مولوی عبدالحق، کراچی ۱۹۵۹ء

* تصنیفات سرسید از ۲۲ جلدوں میں مرتبہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب۔

اردو غزل اور سرسید : ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں۔ مشمولہ "حالی کا ذہنی ارتقاء" لاہور ۱۹۵۶ء و ۱۹۶۶ء

تذکرۂ شعراء

شاہ مبارک آبرو : کلب علی خاں فائق، اورینٹل کالج میگزین۔ مئی، اگست ۱۹۶۰ء

شاہ مبارک آبرو : محمد زکریا مائل "اردو نامہ" اپریل ۱۹۶۱ء

واجد علی شاہ اختر : مرزا علی اظہر برلاس "اردو" ۱، ۲ - ۱۹۶۸ء (قسط وار)

* واجد علی شاہ اور ان کا عہد : رئیس احمد جعفری، لاہور ۱۹۵۸ء

* واجد علی شاہ : مسعود حسن رضوی

اظفر گورگانوی اور ان کا ریختہ کلام : سید علی عباس "اورینٹل کالج میگزین" فروری ۱۹۶۳ء
اظفر گورگانوی : محوی صدیقی "اردو" دہلی اپریل ۱۹۴۰ء
شیر علی افسوس : سید نقی احمد "ساقی" جولائی ۱۹۶۳ء
* اکبر الہ آبادی : تحقیقی و تنقیدی مطالعہ : خواجہ محمد زکریا' لاہور ۱۹۸۰ء (رحمن)
قزلباش خاں امید : مشفق خواجہ "اردو" اپریل ۱۹۷۷ء
* امیر مینائی اور ان کے تلامذہ : کریم الدین احمد' لاہور' ۱۹۸۲ء (رحمن)
تحقیقات امیر مینائی : خطوط کی روشنی میں : کرنی منہاس "نقوش" جنوری ۱۹۶۲ء
دربار رامپور اور امیر مینائی : " "صحیفہ" اپریل ۱۹۶۱ء
نواب امیر خاں انجام : کلب علی خاں فائق "اورینٹل کالج میگزین" نومبر ۱۹۶۰ء
میر انیس کے حالات زندگی : ایک تحقیقی مطالعہ : ضمیر اختر نقوی "ماہ نو" انیس نمبر ۱۹۷۲ء
* آثار انیس : سید مقام حسین جعفری' کراچی ۱۹۷۷ء
* شاگردان انیس : " " ۱۹۷۹ء
فیضان انیس : افسر امروہوی "اردو" انیس نمبر ۱۹۷۲ء
خواجہ احسن اللہ خاں بیان : مشفق خواجہ' "غالب" کراچی' جنوری ۱۹۷۶ء
رؤف احمد خاں پرتو مدراسی : شاگرد داغ : سخاوت مرزا "اردو ادب" شمارہ ۱ ۱۹۶۲ء
خوشوقت سنگھ پروانہ : مشفق خواجہ "غالب" کراچی جنوری ۱۹۷۵ء
عبدالحئی تاباں : کلب علی خاں فائق "صحیفہ" اکتوبر ۱۹۶۳ء
عبدالحئی تاباں : غلام مصطفیٰ خاں "اردو" اپریل ۱۹۵۴ء
کلام ثاقب : مشفق خواجہ مجلہ تحقیق لاہور جلد ۲ شمارہ ۳'۴' جلد ۳ شمارہ ۳ جلد ۴ شمارہ ۱
"اورینٹل کالج میگزین" شمارہ ۲۲۶
جرأت : کلب علی خاں فائق "صحیفہ" جنوری ۱۹۶۲ء

* جرأت کا عہد اور عشقیہ شاعری: ابواللیث صدیقی۔ کراچی، ۱۹۵۲ء
* جگر مرادآبادی: احوال و آثار: احمر رفاعی۔ کراچی، ۱۹۷۹ء
جگر کے استاد: محمد اسلام۔ "اردو نامہ" جنوری ۱۹۷۰ء
جگر کے شاگرد: " " " ۱۹۷۱ء
منشی غلام حسین جوہر بیدری: سخاوت مرزا۔ "اورینٹل کالج میگزین" نومبر ۱۹۶۴ء
ماہ لقا بائی چندا (اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ): الف۔ د۔ نسیم۔ "اورینٹل کالج میگزین" فروری ۱۹۶۰ء
* شاہ حاتم حالات و کلام: غلام حسین ذوالفقار۔ لاہور ۱۹۶۴ء
جعفر علی حسرت: کلب علی خاں فائق "صحیفہ" جولائی ۱۹۶۷ء
خواجہ حسن شاگرد جعفر علی حسرت: کلب علی خاں فائق "صحیفہ" جولائی ۱۹۶۷ء
* شاہ حسین حقیقت اور ان کا خاندان: مشرف احمد۔ کراچی ۱۹۷۷ء
خروشی معاصر ولی: سخاوت مرزا۔ مجلہ اردو۔ جنوری ۱۹۶۰ء
* امیر خسرو حیات اور شاعری: ممتاز حسین۔ کراچی۔ ۱۹۷۵ء
* امیر خسرو: صباح الدین عبدالرحمٰن۔ اسلام آباد۔ ۱۹۷۹ء
امیر خسرو: افسر امروہوی۔ "اردو" خسرو نمبر ۱۹۷۵ء
* مطالعہ داغ: سید محمد علی زیدی
مکتوبات و ہاب مشاہیر متعلقہ مرزا دبیر لکھنوی: سخاوت مرزا "اردو نامہ" جنوری ۱۹۷۵ء
مرزا دبیر کے کچھ خاندانی حالات: مرزا علی اظہر برلاس: "ماہ نو" دبیر نمبر ۱۹۷۵ء
مرزا دبیر کی زندگی: ضمیر اختر نقوی " " "
فہرست شعرائے سلسلہ دبیر: افسر امروہوی "اردو" اپریل ۱۹۷۶ء
نقش و نگار ضمیر در آئینہ کمالات دبیر " جولائی ۱۹۷۵ء
* دبیر سوانح اور شاعری: مظفر حسین ملک۔ لاہور ۱۹۷۶ء (رحمٰن)
خواجہ میر درد کا خاندان: الف۔ د۔ نسیم۔ "اورینٹل کالج میگزین" فروری ۱۹۵۸ء
بلاجی ترمبک نایک ذرہ: سخاوت مرزا۔ "اردو نامہ" مئی ۱۹۷۱ء

* رنگین، حیات اور خدمت : صابر علی خاں کراچی ۱۹۵۶ء (رحمٰن)
محمد زین العابدین خاں المتخلص بہ دیوان نایلطی : سخاوت مرزا "اورینٹل کالج میگزین" فروری ۱۹۵۹ء
رندہ کے اردو شاعر : پیر حسام الدین راشدی "اردو" اکتوبر ۱۹۵۱ء
میر غلام مصطفیٰ اسیحٰن اورنگ آبادی : سخاوت مرزا۔ "اردو نامہ" جولائی ۱۹۶۸ء
سخن دہلوی : فرحت شاہجہاں پوری۔ "صحیفہ" مارچ ۱۹۵۹ء
سراج اور پروانہ : تحسین سروری۔ "اردو" اپریل ۱۹۵۱ء
شیخ سعدی ہندی : " "اردو نامہ" " ۱۹۶۲ء
حیات سودا : کلب علی خاں فائق "صحیفہ" جنوری۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء
سودا کا پنجابی کلام : نادم سیتاپوری "افکار" کراچی ۱۹۶۴ء
سید محمود آزاد اور شمس کلکتوی : صدر الحق۔ مشمولہ "انکشاف" کراچی ۱۹۸۱ء
غلام رسول شوق : عبدالرزاق۔ غالب کراچی اکتوبر ۱۹۷۰ء
* بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد : رئیس احمد جعفری۔ لاہور ۱۹۵۲ء
* بہادر شاہ ظفر فن اور شخصیت : خواجہ تہور حسین کراچی ۱۹۶۵ء
* حیات ظفر : مفتی انتظام اللہ شہابی۔ کراچی
* مولانا ظفر علی خاں بحیثیت شاعر : نظیر حسین زیدی۔ کراچی ۱۹۸۰ء
عارف الدین خاں عاجز : تحسین سروری۔ "اردو نامہ" جون ۱۹۷۵ء
سید شاہ عبدالقادر کرنولی : سخاوت مرزا۔ مجلہ اردو جولائی ۱۹۵۹ء
ولی محمد عقلان : " "اردو نامہ" اپریل ۱۹۷۲ء
غمگین شاہ جہاں آبادی : محمد مسعود احمد۔ "اردو" جنوری ۱۹۶۰ء
غمگین شاہ جہاں آبادی اور غالب : محمد مسعود احمد۔ "اردو" اکتوبر ۱۹۶۹ء
غمگین حالات و تصنیفات : " "نوائے ادب" بمبئی اپریل ۱۹۶۳ء
غواصی : سخاوت مرزا۔ مجلہ اردو۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء
ثناء اللہ فراق : مشفق خواجہ۔ غالب کراچی اپریل ۱۹۷۵ء

اشرف علی خاں فغاں: سید نقی احمد ارشاد "صحیفہ" جولائی ۱۹۶۶ء

فگار دہلوی حیات و کلام: گوہر نوشاہی۔ " اکتوبر ۱۹۶۸ء

* فگار دہلوی حالات و انتخاب کلام: محمد اکرام چغتائی۔ لاہور ۱۹۶۸ء

قائم چاندپوری: اقتدا حسن۔ "اورینٹل کالج میگزین" فروری ۱۹۶۵ء (بزبان انگریزی)

شاہ راجو قتال گولکنڈی: سخاوت مرزا۔ "اورینٹل کالج میگزین" نومبر ۱۹۶۳ء

شاہ قدرت اللہ قدرت: مشفق خواجہ۔ مجلہ تحقیق جلد نمبر ا شمارہ نمبر ا

آدینہ بیگ کامل کے حالات اور کلام: محمد اکرام چغتائی۔ "اردو" اپریل ۱۹۶۹ء

شاہ کمال کڑا مانک پوری: سخاوت مرزا۔ "اردو نامہ" اپریل ۱۹۶۵ء

مرزا حیدر علی گرم: " "اردو" جولائی ۱۹۵۵ء

میر مہدی مجروح: فرحت شاہجہاں پوری۔ "صحیفہ" اگست ۱۹۵۹ء

شیخ محمود چشتی کی نظم و نثر: سخاوت مرزا۔ "اردو نامہ" جنوری ۱۹۶۲ء

مرمت خاں مرمت: نادم سیتاپوری۔ "نقوش" نومبر ۱۹۶۴ء

کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں؟: سخاوت مرزا "مجلہ اردو" جنوری ۱۹۵۹ء

* مصحفی اور ان کا کلام: ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ لاہور

* مصحفی حیات اور کلام: انسر صدیقی امروہوی۔ کراچی ۱۹۷۵ء

* تلامذۂ مصحفی: " " ۱۹۷۹ء

تلامذۂ مصحفی: تبسم کاشمیری۔ "اورینٹل کالج میگزین" فروری، اگست ۱۹۷۸ء

کلام نواب الٰہی بخش خاں معروف: ڈاکٹر قادری۔ "نقوش" شمارہ نمبر ۱۱۶

فضل علی ممتاز: مشفق خواجہ۔ غالب کراچی/ جولائی ۱۹۷۵ء

ممنون: صدیقۃ الرماں "اردو" ۱۹۸۰ء

ممنون: کلب علی خاں فائق۔ "صحیفہ" جنوری ۱۹۶۷ء

* مومن حیات اور شاعری: کلب علی خاں فائق۔ لاہور ۱۹۶۱ء

* مومن: ڈاکٹر عبادت بریلوی

حیاتِ میر: کلب علی خاں فائق۔ "دلی کالج میگزین" میر نمبر
* میر و سودا کا دور: ثنار الحق صدیقی۔ کراچی۔ ۱۹۶۵ء
* نقد میر: سید عبداللہ۔
* تلامذۂ میر: امداد صابری۔ پاکستان
تلامذۂ میر: فاضل زیدی۔ "دلی کالج میگزین" میر نمبر
میر ایک نقاد: کلب علی خاں فائق۔ "صحیفہ" دسمبر ۱۹۵۸ء
میر کے ادبی معرکے: " " ستمبر ۱۹۵۷ء
میراں جی شمس العشاق کی تاریخ وصال: سخاوت مرزا۔ "اُردو نامہ" جنوری ۱۹۶۸ء
* میر حسن اور ان کا زمانہ: ڈاکٹر وحید قریشی لاہور ۱۹۵۹ء
* میر حسن اور خاندان کے دوسرے شعراء: محمود فاروقی لاہور ۱۹۵۶ء
ناسخ کی صحیح عمر: کلب علی خاں فائق "صحیفہ" مارچ ۱۹۵۸ء
ناسخ سوانح اور شاعری: احمد رضا۔ "صحیفہ" اکتوبر ۱۹۶۴ء
* ناسخ حیات و تصانیف: ڈاکٹر محمد صدر الحق۔ کراچی۔ ۱۹۷۹ء (رحمٰن)
شاہ نصیر کا سفر: عبدالرزاق۔ "اردو" اکتوبر ۱۹۷۶ء
شاہ نصیر اور ذوق کی معرکہ آرائی: عبدالرزاق۔ "اُردو" اپریل ۱۹۷۸ء
شاہ نصیر: فرحت شاہجہاں پوری۔ "صحیفہ" نومبر ۱۹۵۹ء
نظام رامپوری اور داغ دہلوی: شاہجہاں پوری "صحیفہ" اکتوبر ۱۹۶۳ء
* نظیر اکبر آبادی۔ ان کا عہد اور شاعری: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ کراچی ۱۹۵۸ء
* نظیر اکبر آبادی: محمود اکبر آبادی۔
واله موسوی: سخاوت مرزا۔ "اُردو نامہ" ستمبر ۱۹۷۱ء
ولی دکنی نہیں گجراتی تھا: ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں۔ ساقی کراچی ۱۹۵۴ء
ولی گجراتی اور شاہ سعد اللہ گلشن: محمد اکرام چغتائی۔ "اردو نامہ" مارچ ۱۹۶۶ء
ولی کا سنہ وفات: ڈاکٹر جمیل جالبی۔ "اورینٹل کالج میگزین" صد سالہ نمبر ۱۹۷۲ء

ولی کا سنہ وفات : یحییٰ تنہا۔ "اردو" اپریل ۱۹۵۱ء

ولی دکنی : مولوی عبدالحق۔ " جنوری ۱۹۲۴ء

راے گلاب چند ہمدم حیدرآبادی : سخاوت مرزا۔ "صحیفہ" اکتوبر ۱۹۶۸ء

غالبیات

* غالب : غلام رسول مہر

* غالب نامہ : شیخ محمد اکرام

* غالب کون ہے : سید قدرت نقوی۔ ملتان ۱۹۶۸ء

غالب بحیثیت محقق : قاضی عبدالودود

غالب کے اجداد : مسلم ضیائی۔ "ماہ نو" کراچی فروری ۱۹۶۸ء

غالب کا زائچہ اور تاریخ ولادت : مسلم ضیائی "اردونامہ" جنوری ۱۹۶۶ء

غالب وحسرت کے کچھ سن وسال : خالد حسن قادری " مارچ ۱۹۷۲ء

غالب کی تاریخ ولادت : سید نثار لطفی "ماہ نو" کراچی مارچ ۱۹۶۷ء

غالب کی تاریخ ولادت : سید صمد حسین رضوی۔ "اردو غالب نمبر" جنوری ۱۹۶۹ء

غالب کا سفر کلکتہ : اسمٰعیل پانی پتی۔ "نقوش غالب نمبر" فروری ۱۹۶۹ء

* غالب اور انقلاب ستاون : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ لاہور ۱۹۷۴ء

غالب کی ایک قدیم سوانح عمری : نادم سیتاپوری۔ "ادبی دنیا" مارچ ۱۹۶۷ء

غالب کی وفات : مرتضیٰ حسین فاضل۔ "نقوش غالب نمبر" فروری ۱۹۶۹ء

غالب کے بارے میں ایک قدیم تحریر : غلام حسین ذوالفقار۔ "اردو غالب نمبر" ۱۹۶۹ء

غالب کے بعد ان پر پہلا مضمون : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ "نقوش غالب نمبر" فروری ۱۹۶۹ء

غالب کے اولین تعارف نگار۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ "اردو غالب نمبر" جنوری ۱۹۶۹ء

غالب : مرتضیٰ حسین فاضل۔ صحیفہ غالب نمبر ۱۹۶۹ء

غالب کے خطوط : افراد خاندان کے نام : نادم سیتاپوری۔ مشمولہ "خیال غالب" کراچی ۱۹۷۰ء

* غالب اور عصر غالب : ڈاکٹر محمد ایوب قادری کراچی ۱۹۸۲ء

غالب : مرآۃ الاشباہ اور حکیم احسن اللہ : ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ۔ "اردو غالب نمبر" جنوری ۱۹۶۹ء
* غالب اور صغیر بلگرامی : مشفق خواجہ ۔ کراچی ۱۹۸۱ء
غالب اور صغیر بلگرامی : " "صحیفہ" جولائی اکتوبر ۱۹۶۹ء
غالب اور تلامذہ غالب : " "اردو" غالب نمبر جنوری ۱۹۶۹ء
غالب اور تفتہ : سید مرتضیٰ حسین ۔ "اردو" غالب نمبر جنوری ۱۹۶۹ء
غالب کے سفارش نامے : مسلم ضیائی ۔ " " اپریل "
غالب اور روہیلکھنڈ ڈاکٹر محمد ایوب قادری ۔ مشمولہ "غالب اور عصر غالب"
غالب اور ابوالکلام آزاد : ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری ۔ "اردو نامہ" جون ۱۹۶۹ء
* غالب کی نادر تحریریں : ڈاکٹر خلیق انجم "بھارت" ۱۹۶۱ء
* غالب کا منسوخ دیوان : مسلم ضیائی کراچی ۱۹۶۹ء
غالب اور حالی کے تعلقات : شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی ۔ "صحیفہ" جنوری ۱۹۷۲ء
غالب اور حسرت کے کچھ سن وسال : ڈاکٹر خالد حسن قادری ۔ "اردو نامہ" مارچ ۱۹۷۳ء
غالب کے خطوط : تاریخیں اور ترتیب : ڈاکٹر سید قدرت نقوی ۔ "ماہ نو" فروری ۶۸ء و ۱۹۶۹ء
غالب اور مجروح کے مکاتیب : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ۔ "اردو" جنوری ۱۹۶۹ء
غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط : محمد مسعود احمد ۔ "اردو نامہ" اکتوبر ۱۹۶۴ء
* مجموعہ فارسی کلام (غالب) : مجلس یادگار غالب، لاہور
* غالب کا فارسی کلام (تین جلدوں میں) : مرتضیٰ حسین فاضل ۔ لاہور ۱۹۶۷ء
دیوان غالب (بخط مصنف) : سید قدرت نقوی ۔ "اردو نامہ" جولائی ۱۹۷۰ء
دیوان غالب (") : ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۔ غالب کراچی اکتوبر ۱۹۷۶ء
دیوان غالب (") : مسلم ضیائی "اردو نامہ" جنوری ۱۹۷۱ء
دیوان غالب (") : سید قدرت نقوی ۔ "اردو نامہ اپریل ۱۹۷۰ء
* مجموعہ نثر غالب : مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷ء
* نادرات غالب : آفاق حسین

خطوط غالب : غلام رسول مہر۔ لاہور ۱۹۵۱ء

کلام غالب : ڈاکٹر وحید قریشی۔ "نقوش غالب نمبر" حصّہ اوّل ۱۹۶۹ء

کلام غالب : سید قدرت نقوی "صحیفہ غالب نمبر" اپریل ۱۹۷۲ء

* دیوان غالب : غلام رسول مہر۔ لاہور ۱۹۶۷ء

* دیوان غالب : حامد علی خاں۔

بوستانِ خرد (شرح کلام غالب) مرزا رفیق بیگ۔ "اُردو" جولائی ۱۹۲۲ء

بوستانِ خرد (" ") اسلامک کلچر حیدر آباد اکتوبر ۱۹۴۸ء

بوستانِ خرد : ایک جائزہ : ڈاکٹر اسلم فرخی۔ "ہم قلم" کراچی دسمبر ۱۹۶۱ء

بوستانِ خرد (شرح کلام غالب) ڈاکٹر عبدالغنی "اُردو غالب نمبر" جنوری ۱۹۶۹ء

* ذکر غالب : مالک رام

* مکاتیب غمگین و غالب : خلیفہ سید ہدایت النبی۔

خطوط غمگین و غالب (فارسی) : سید وزیر الحسن عابدی و ڈاکٹر سید عبداللہ۔ "اورینٹل کالج میگزین" فروری ۱۹۶۴ء

* اشاریہ غالب : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ "مجلس یادگار غالب" پاکستان ۱۹۶۹ء

* اشاریہ غالب نما : ابن حسن قیصر کراچی ۱۹۶۹ء

جہانِ غالب : قاضی عبدالودود

تذکرہ عمدۂ منتخبہ : مسلم ضیائی "ماہ نو" فروری ۱۹۶۷ء

حیاتِ غالب از مرزا اوج لکھنوی : ایک تعارف : نادم سیتاپوری "ماہ نو" مارچ ۱۹۶۴ء

حیاتِ غالب : غلام رسول مہر "ماہ نو" جولائی ۱۹۶۴ء

مرزا غالب اور میر تقی میر : غلام رسول مہر "ماہ نو" فروری ۱۹۴۹ء

روئداد مقدمہ مرزا غالب : مولوی عبدالحق۔ "افکار" کراچی فروری ۱۹۶۶ء

آشتی نامہ (غالب) : مسلم ضیائی "نقوش" غالب نمبر ۱۹۷۱ء

* گل رعنا : سید قدرت نقوی

جنگِ آزادی کی کہانی (مکاتیب غالب میں) : غلام رسول مہر "ماہ نو" ۱۹۵۳ء

اہل علم پر ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں کیا گزری؟ : محمد اسمٰعیل پانی پتی "نقوش" جون ۱۹۵۷ء
* خیابانِ غالب : نادم سیتاپوری - کراچی ۱۹۷۰ء
آبِ حیات (غالب کے حالات) : آغا محمد باقر "صحیفہ" غالب نمبر جنوری ۱۹۶۹ء
یادگارِ غالب : ایک تحقیقی مطالعہ : ڈاکٹر وحید قریشی "سویرا" لاہور شمارہ نمبر ۲۲
راقم اور غالب : تحسین سروری "ہم قلم" کراچی اکتوبر ۱۹۶۱ء
مفتی محمد عباس اور غالب : تحسین سروری "ماہِ نو" فروری ۱۹۶۷ء
تذکرہ ریاض الفردوس میں غالب اور معاصرینِ غالب : تحسین سروری "اردو نامہ" جولائی ۱۹۶۲ء
منشی نبی بخش حقیر اور غالب : مفتی انتظام اللہ شہابی "قومی زبان" جولائی ۱۹۵۵ء
میاں فوجدار محمد خاں کے حالات اور نسخۂ حمیدیہ : نادم سیتاپوری "ماہِ نو" اپریل ۱۹۶۷ء
* حکیم احسن اللہ خاں کی ۱۸۵۷ء کے متعلق یادداشتیں : ایس معین الحق کراچی ۱۹۵۸ء
* بزمِ غالب : سید رؤف عروج کراچی ۱۹۶۹ء
* دودِ چراغِ محفل : سید حسام الدین راشدی کراچی ۱۹۶۹ء
سخن در سخن (تلامذۂ غالب) مشفق خواجہ "اُردو" غالب نمبر اپریل ۱۹۶۹ء
تلامذۂ غالب : تحسین سروری "صحیفہ" جولائی ۱۹۷۰ء
تلامذۂ غالب : ڈاکٹر وحید قریشی "ماہِ نو" مارچ ۱۹۶۵ء
کچھ غالب کے متعلق : ڈاکٹر محمد ایوب قادری "اردو" غالب نمبر اپریل ۱۹۶۹ء
رفعت شروانی کی خود نوشت تحریریں (شاگردِ غالب) : نادم سیتاپوری نقوش غالب نمبر ۳ ۱۹۷۱ء
منشی حبیب اللہ ذکا (شاگردِ غالب) : افسر امروہوی "صحیفہ" جولائی ۱۹۷۱ء
عطا مارہروی (شاگردِ غالب) میناز بیری "قومی زبان" جولائی ۱۹۶۶ء
میر افضل علی دہلوی عرف میراں صاحب (شاگردِ غالب) : محمد اسمٰعیل پانی پتی "نقوش" غالب نمبر فروری ۱۹۶۹ء
تلامذۂ غالب : ڈاکٹر خلیق انجم "صحیفہ" جولائی ۱۹۶۹ء
سخن دہلوی اور غالب : رفعت القاسمی "صحیفہ" اپریل ۱۹۷۳ء
دو آہنگ از غالب : نجم الاسلام "نقوش" اپریل ۱۹۶۶ء

* عودِ ہندی : مرتضیٰ حسین فاضل لاہور ۱۹۶۲ء
* اُردوئے معلیٰ : " " ۱۹۶۹ء
* باغ دو در از غالب : وزیرالحسن عابدی لاہور ۱۹۷۰ء
* کلامِ غالب : مجلس یادگارِ غالب، جامعہ پنجاب
گلِ رعنا : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن "نقوش" غالب نمبر اکتوبر ۱۹۶۹ء
* گلِ رعنا : وزیرالحسن عابدی لاہور ۱۹۶۹ء
گلِ رعنا : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن "تحقیق غالب" کراچی ۱۹۸۱ء
* گلِ رعنا : اسداللہ خاں غالب "انجمن ترقی اردو" کراچی ۱۹۷۵ء
* ہنگامۂ دل آشوب از غالب : سید قدرت نقوی کراچی ۱۹۶۹ء
خطوطِ غالب کے ادوار : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن "تحقیق غالب" لاہور ۱۹۸۰ء
میخانۂ آرزو سرانجام (غالب) : مسلم ضیائی "اُردو" جنوری ۱۹۶۸ء
غالب کی فارسی مثنوی "ابر گہر بار" : "تحسین سروری" اردو جنوری ۱۹۶۶ء

اقبالیات

اقبال اور حیدرآباد دکن : سید عبدالواحد۔ مجلّہ اقبال لاہور اپریل ۱۹۶۱ء
* اقبال اور حیدرآباد دکن : نظیر حیدری۔ کراچی ۱۹۶۱ء
* اقبال اور کشمیر : صابر آفاقی لاہور ۱۹۸۲ء
اقبال اور کشمیر : عبداللہ قریشی۔ مجلّہ اقبال اکتوبر ۱۹۵۶ء
* اقبال اور بھوپال : صہبا لکھنوی کراچی ۱۹۷۳ء
اقبال کے قیامِ یورپ : کسریٰ منہاس۔ "نقوش" اقبال نمبر دسمبر ۱۹۷۷ء
* اقبال درونِ خانہ : خالد نظیر صوفی۔ لاہور ۱۹۷۱ء
* اقبال کے حضور : سید نذیر نیازی۔ لاہور ۱۹۷۱ء
* اقبال کی پہلی بیوی : سید حامد جلالی۔ کراچی ۱۹۶۷ء
اقبال کی پہلی جماعت کا نتیجہ : سلطان محمود حسین۔ "اقبال ریویو" لاہور جولائی ۱۹۸۳ء

اقبال کا گوشوارۂ آمدنی : صفدر محمود "صحیفہ" اکتوبر ۱۹۷۳ء
* اقبال کی صحبت میں : عبداللہ چغتائی لاہور ۱۹۷۷ء
اقبال اور اورینٹل کالج میگزین : غلام حسین ذوالفقار جرنل ریسرچ سوسائٹی پاکستان
لاہور جولائی ۱۹۷۷ء
اقبال یورپ میں : چند مغالطے : صدیق جاوید "صحیفہ" جولائی ۱۹۷۷ء
* اقبال اور بزم اقبال : حیدر آباد دکن : عبدالرؤف عروج کراچی ۱۹۷۸
* اقبال کا سیاسی کارنامہ : محمد احمد خاں لاہور ۱۹۷۷ء
* اقبال اور قائد اعظم : احمد سعید لاہور ۱۹۷۷ء
* اقبال اور پنجاب کونسل : حنیف شاہد لاہور ۱۹۷۷ء
اقبال بحیثیت بیرسٹر : رحیم بخش شاہین ۔ "اقبال" ۱۹۷۷ء
* انجمن حمایت اسلام اور اقبال : حنیف شاہد لاہور ۱۹۷۶ء
اقبال کے اجداد کا سلسلۂ عالیہ : محمد باقر "صحیفہ" اقبال نمبر اکتوبر ۱۹۷۳ء
* اقبال : شخصیت اور فکر وفن : مشفق خواجہ کراچی ۱۹۷۹ء
* اقبال اور فارسی شعراء : محمد ریاض لاہور ۱۹۷۷ء
* اقبال کے محبوب صوفیہ : اعجاز الحق قدوسی لاہور ۱۹۷۶ء
* اقبال اور علمائے ہند و پاک : 〃 〃 ۱۹۷۷ء
* اقبال نامہ : شیخ عنایت اللہ لاہور ۱۹۵۱ء
* انوار اقبال (مکاتیب اقبال) بشیر احمد ڈار کراچی ۱۹۶۷ء
* دانائے راز : سید نذیر نیازی لاہور ۱۹۷۹ء
* زندہ رود : حیات اقبال کا تشکیلی دور : ڈاکٹر جاوید اقبال لاہور ۱۹۷۹ء
* زندہ رود : حیات اقبال کا وسطی دور : 〃 〃 ۱۹۸۱ء
* یاد اقبال : صابر کلوروی لاہور ۱۹۷۶ء
* ذکر اقبال : عبدالمجید سالک 〃 ۱۹۵۵ء

* روزگارِ فقیر: جلد اوّل۔دوم: فقیر سید وحید الدین، لاہور ۱۹۵۱ء، ۱۹۶۴ء
علامہ اقبال کی تعلیمی زندگی کے بعض تفصیلات: ڈاکٹر وحید قریشی مشمولہ کلاسکی ادب کا مطالعہ
علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج: " " "
علامہ اقبال کا سفر دہلی ۱۹۰۵ء: ڈاکٹر محمد ایوب قادری۔"اقبال ریویو" جولائی ۱۹۶۶ء
تیسری گول میز کانفرنس اور اقبال کا سفر: رحیم بخش شاہین "اقبال ریویو" جولائی ۱۹۷۷ء
داستانی از دکن آوردہ ام: محمد عبداللہ قریشی "صحیفہ" جولائی ۱۹۷۷ء
علامہ اقبال کے سفر کی روداد اور خطبات: محمد مختار حق "نقوش" اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء
* سفرنامہ اقبال: محمد حمزہ فاروقی۔کراچی ۱۹۷۵ء
* مفکر پاکستان اور حیدر آباد دکن: حسام الدین خاں غوری۔ کراچی ۱۹۸۱ء
مجلس کشمیری مسلمان، لاہور: افضل حق قریشی "اقبال ریویو" جنوری ۱۹۸۳ء
شیخ نور محمد (اقبال کے والد): رحیم بخش شاہین "صحیفہ" جولائی ۱۹۷۷ء
* میر حسن حالات و آثار: (اقبال کے استاد) سلمان محمود حسین لاہور ۱۹۸۱ء
* تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ لاہور ۱۹۸۲ء (رحمٰن)
* کتابیات اقبال: " " "
تصانیف اقبال: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اقبال نمبر "نقوش" دسمبر ۱۹۷۷ء
* معاصرین: اقبال کی نظر میں: محمد عبداللہ قریشی لاہور ۱۹۷۷ء
* مکاتیب اقبال بنام خاں محمد نیاز الدین: محمد عبداللہ قریشی لاہور ۱۹۵۴ء
* مکتوبات اقبال: بنام سید نذیر نیازی: " کراچی ۱۹۵۷ء
* مکاتیب اقبال: بنام گرامی: " لاہور ۱۹۶۹ء
* خطوط اقبال: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
* روح مکاتیب اقبال: محمد عبداللہ قریشی لاہور ۱۹۷۸ء
* مقالات اقبال: عبدالواحد معینی لاہور ۱۹۶۳ء
* گفتار اقبال: محمد رفیق افضل " ۱۹۶۹ء

تذکرہ

تذکرہ مرقع شعراء : کلب علی خاں فائق ۔ مشمولہ نذرِ زیدی، دہلی ۱۹۸۰ء

تذکرہ مرقع شعراء : اکبر علی خاں ۔ "صحیفہ" جولائی ۱۹۷۲ء

ایک گم شدہ تذکرہ : سید امجد الطاف ۔ "فنون" مئی ۱۹۶۵ء

طبقات الشعراء ہند : غلام حسین ذوالفقار "صحیفہ" جولائی ۱۹۶۷ء

* تذکرہ سرور یا عمدۂ منتخبہ : خواجہ احمد فاروقی

گلشن گفتار : تحسین سروری صحیفہ اکتوبر ۱۹۶۸ء

تذکرہ معشوق چہل سالہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی "اردو ادب" علیگڑھ شمارہ نمبر ۱ ۱۹۶۷ء

نکات الشعراء کا تحقیقی مطالعہ : ڈاکٹر جمیل جالبی ۔ مشمولہ "نذرِ حمید" دہلی ۱۹۸۱ء

اُردو کے قدیم تذکرے : ایک تقابلی مطالعہ : حبیب اللہ خاں غضنفر "اردو" جنوری ۱۹۵۳ء

* اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری : ڈاکٹر فرمان فتح پوری لاہور ۱۹۷۲ء

تذکرہ بے جگر ۔ خیراتی لعل جگر : " "نقوش" جولائی ۱۹۷۳ء

اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری : سخاوت مرزا "اردو" جنوری ۱۹۵۸ء

* ارمغان گوکل پرشاد : ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۔ کراچی ۱۹۷۵ء

* شعرائے متقدمین و متاخرین : (محمد حسین خاں) مرتضیٰ حسین فاضل لاہور ۱۹۶۸ء

* ریاض الفردوس : محمد حسین خاں

* گلشن ہمیشہ بہار : ابو نصر اللہ خاں خویشگی / مرتب ڈاکٹر اسلم فرخی کراچی ۱۹۶۷ء

* گلستان سخن : قادر بخش صابر : خلیل الرحمن داؤدی ۱۹۶۶ء

* بہارستان ناز : حکیم فصیح الدین رنج : خلیل الرحمن داؤدی ۱۹۶۵ء

* گلشن بے خار : کلب علی خاں فائق ۱۹۷۳ء

* مخزن نکات : قائم چاندپوری : ڈاکٹر اقتدار حسن ۱۹۶۶ء

ریاض حسنی یا تذکرہ فتوت (خواجہ عنایت اللہ فتوت) پروفیسر شفقت رضوی ۔ "اردو نامہ" اپریل ۱۹۶۴ء

فرمان سلیمانی ۔ سید حسن لطافت : مشفق خواجہ ۔ مشمولہ "نذرِ حمید" دہلی ۱۹۸۱ء

* کاروانِ رفتہ : ڈاکٹر محمد ایوب قادری کراچی ۱۹۸۳ء
* بہارِ سخن : محمد شرف الدین یکتا جودھپوری حیدرآباد ۱۹۶۳ء
* تذکرہ عروس الاذکار (نصیر الدین نقش) : افسر امروہوی کراچی ۱۹۷۵ء
" " " ڈاکٹر عبادت بریلوی "اردو" جنوری ۱۹۵۸ء
* تذکرہ مسلم شعرائے بہار (چھ جلدیں) : حکیم سید احمد علی ندوی کراچی ۱۹۶۶ء - ۱۹۶۹ء
تذکرہ شعراء برہانپور ۔ افتخار احمد خلیل برہانپوری "اردو" اکتوبر ۱۹۳۱ء
* خوش معرکہ زیبا (سعادت خاں ناصر) شمیم انہونوی لکھنو ۱۹۷۱ء
* " " (جلد اوّل - دوم) مشفق خواجہ لاہور ۱۹۷۰ء
* سخنورانِ قصبہ کٹرا : کراچی ۱۹۷۸ء
* سخنورانِ کاکوروی : حکیم نثار احمد علوی کراچی ۱۹۷۹ء
* مدائح الشعراء (نواب عنایت حسین خاں مہجور بنارسی) : افسر امروہوی کراچی ۱۹۷۶ء
* گلشنِ ہند (حیدر بخش حیدری) : ڈاکٹر عبادت بریلوی کراچی ۱۹۶۸ء
* " " ڈاکٹر مختار الدین احمد دہلی ۱۹۶۷ء
شعرائے برہانپور : افسر امروہوی "اردو" اپریل ۷۸ء - جنوری ۸۰ء قسط وار

داستان و قصص

* اردو کی منظوم داستانیں : ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی ۱۹۷۱ء (رحمٰن)
اردو داستان : ایک نفسیاتی جائزہ : غلام حسین اظہر "اردو" جولائی ۱۹۷۶ء
* اردو کی قدیم منظوم داستانیں : خلیل الرحمٰن داؤدی ۱۹۶۷ء
* باغ و بہار : میر امن : ممتاز منگلوری
* داستان سے افسانے تک : ڈاکٹر وقار عظیم لاہور ۱۹۶۰ء
طلسم ہوشربا میں مافوق الفطرت عناصر : اظہر صدیقی "اردو" اپریل ۱۹۷۷ء
* ہماری داستانیں : پروفیسر وقار عظیم لاہور

ناول

اردو کا پہلا ناول : ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ "نگار" کراچی اگست ۱۹۶۷ء

* اردو ناول نگاری : ڈاکٹر سہیل بخاری لاہور ۱۹۶۰ء
* اردو ناول بیسویں صدی میں : ڈاکٹر عبدالسلام کراچی ۱۹۷۳ء (رحمٰن)
* رجب علی بیگ سرور : نیر مسعود رضوی
* فردوس بریں۔ عبدالحلیم شرر : پروفیسر وقار عظیم ۱۹۶۷ء
* فردوس بریں : " ممتاز منگلوری لاہوری ۱۹۶۷ء
* ملک العزیز ورجینا : عبدالحلیم شرر : ممتاز منگلوری ۱۹۶۶ء
* مولوی نذیر احمد دہلوی : احوال و آثار : ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لاہور ۱۹۷۱ء (رحمٰن)
* رسوا کی ناول نگاری : ڈاکٹر ظہیر فتح پوری۔ راولپنڈی ۱۹۷۰ء (رحمٰن)

نذیر احمد : ایک جائزہ : ڈاکٹر صادق "ماہ نو" کراچی مئی ۱۹۵۱ء

* ابن الوقت : ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ لاہور ۱۹۶۴ء

شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ : ممتاز منگلوری لاہور ۱۹۷۸ء (رحمٰن)

چنچل نار : ڈاکٹر احراز نقوی "نقوش" نومبر ۱۹۶۴ء

توبۃ النصوح اور اس کا ماخذ : ڈاکٹر صادق "ماہ نو" دسمبر ۱۹۵۴ء

توبۃ النصوح : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن "صحیفہ" اپریل ۱۹۷۰ء

اردو کا پہلا ناول : "اصلاح النساء" : پروفیسر وقار عظیم "صحیفہ" اپریل ۱۹۶۸ء

مراۃ النساء : ایک جائزہ : ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی "اورینٹل کالج میگزین" ستمبر ۱۹۷۱ء

* خط تقدیر : مولوی کریم الدین لاہور ۱۸۶۳ء
* موعظہ حسنہ : مولوی نذیر احمد : ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ۱۹۶۲ء
* فسانۂ مبتلا : " " ۱۹۶۳ء
* توبۃ النصوح " " ۱۹۶۴ء
* ثانی اثنین : عبدالحلیم شرر : ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کراچی

ڈرامہ

اردو میں منظوم ڈرامائی افسانوں کا آغاز و ارتقاء: ڈاکٹر فرمان فتح پوری مشمولہ "تحقیق و تنقید" کراچی ۱۹۷۰ء

* اندر سبھا: ممتاز منگلوری

حافظ محمد عبداللہ فتح پوری: ڈاکٹر فرمان فتح پوری "نگار" مئی ۱۹۶۲ء

نسرواں جی: مہرواں جی خاں صاحب آرام: سید امتیاز علی تاج "صحیفہ" جولائی ۱۹۶۷ء

* آغا حشر اور ان کے ڈرامے: پروفیسر وقار عظیم لاہور ۱۹۵۴ء

* ڈرامے کی ابتدا اور تنقید: عشرت رحمانی لاہور ۱۹۵۷ء

* ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر: ڈاکٹر اسلم قریشی لاہور ۱۹۷۱ء (رحمن)

افسانہ

* خیالستان: سجاد حیدر یلدرم: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

* مختصر افسانے کا فنی تجزیہ: ڈاکٹر فردوس فاطمہ

سوانح

* اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء: الطاف فاطمہ کراچی ۱۹۶۱ء

* سوانح نگاری: سید شاہ علی کراچی ۱۹۶۱ء

سفرنامہ

* سیر دکن از عبدالغفار خاں: ایک تعارف: کراچی ۱۹۸۲ء

* عجائب فرنگ: از یوسف خاں کمبل پوش: دہلی ۱۸۴۷ء/لکھنؤ ۱۸۷۳ء/لاہور ۱۹۸۳ء

سفرنامہ نمبر رسالہ "الزبیر" بہاولپور

* سفرنامہ لندن از نواب کریم خاں: ڈاکٹر عبادت بریلوی

* سیاحت نامہ " " " لاہور ۱۹۸۲ء

طنز و مزاح

* اردو ادب میں طنز و مزاح: ڈاکٹر وزیر آغا۔ لاہور ۱۹۵۸ء

(رحمن)

مکاتیب

* تاریخ ممتاز (واجد علی شاہ اختر کے خطوط): محمد باقر لاہور ۱۹۵۲ء

صحافت

ریاض سخن اور "پیام یار" (رسالہ): ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ "اُردو" اپریل ۱۹۸۰ء
اردو صحافت کا پہلا محقق: ڈاکٹر احراز نقوی "تہذیب الاخلاق" لاہور دسمبر ۱۹۶۵ء
معارف: رحمت فرخ آبادی "ماہ نو" مارچ ۱۹۶۷ء
تصویر سخن: لطف اللہ بدوی "ماہ نو" مارچ ۱۹۶۶ء
مظہر العلوم: سمیع اللہ قریشی "صحیفہ" اپریل ۱۹۷۰ء
تذکرہ نما: نادم سیتاپوری "اردو نامہ" ستمبر ۱۹۶۳ء
* کاروانِ صحافت: ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کراچی ۱۹۶۴ء
اخبار ہمدرد کا اشاریہ: ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری مشمولہ کتاب "مولانا محمد علی جوہر اور ان کی صحافت"
* مولانا محمد علی جوہر اور ان کی صحافت: ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کراچی ۱۹۸۳ء
* پاکستان کے منتخبہ ادبی اردو رسائل کا تاریخی و تنقیدی و ادبی جائزہ: شمشیر خاں کراچی ۱۹۷۰ء

ترتیب متون: نظم

دیوان بلوان سنگھ راجہ: سخاوت مرزا "اُردو" جنوری ۱۹۵۰ء
* دیوان تاباں: " کراچی ۱۹۷۵ء
* دیوان تراب: ڈاکٹر سلطانہ بخش کراچی ۱۹۸۲ء
* دیوان جہاں دار شاہ: ڈاکٹر وحید قریشی
دیوان جہاں نما: عندلیب شادانی مشمولہ "تحقیق کی روشنی میں" لاہور ۱۹۶۳ء
حنا لکھنوی کا نایاب دیوان: سخاوت مرزا "صحیفہ" اکتوبر ۱۹۶۷ء
* دیوان حیدری: ڈاکٹر عبادت بریلوی لاہور ۱۹۶۷ء
تبصرہ دیوان حیدری: سید معین الدین شاہ "اردو نامہ" جنوری ۱۹۶۰ء
* گلزار خلیل (دیوان میر دوست علی خلیل): فرحانہ حسن حیدرآباد

* دیوان دل : ظفر الحسن کراچی ۱۹۷۴ء

دیوان شیخ محمد جان شاد لکھنوی پیر و میر : سخاوت مرزا "صحیفہ" جنوری ۱۹۷۱ء

دیوان قصائد (مصحفی) : تبسم کاشمیری "صحیفہ" جنوری ۱۹۷۰ء

دیوان مبتلا : ڈاکٹر عبادت بریلوی - "اورینٹل کالج میگزین" اگست ۱۹۶۷ء

دیوان مبتلا : ڈاکٹر نعیم احمد - "تحریر" شمارہ نمبر ا دہلی ۱۹۷۱ء

دیوان مراد شاہ : غلام دستگیر نامی "اردو" دہلی جولائی ۱۹۴۶ء

* دیوان میر مہدی مجروح : ریاض احمد چودھری ۱۹۷۶ء

دیوان مصحفی : ڈاکٹر معین الدین عقیل "اردو" اپریل ۱۹۷۸ء

* دیوان مرزا مظہر : سخاوت مرزا کراچی ۱۹۷۵ء

دیوان ولی : ڈاکٹر معین الدین عقیل - "غالب" کراچی جنوری ۱۹۷۶ء

دیوان ولی کے قلمی نسخے : محمد اکرام چغتائی "اردو نامہ" جولائی ۱۹۶۸ء

دیوان ولی کے قلمی نسخے : " "اردو" جولائی اکتوبر ۱۹۶۶ء

دیوان ولی کے قلمی نسخے : احمد میاں اختر جوناگڑھی - مجلہ اردو' جولائی ۱۹۵۵ء

* دیوان یقین : سخاوت مرزا کراچی ۱۹۷۵ء

* دیوان اظفری : مدراس یونیورسٹی ۱۹۳۷ء

* دیوان شاد لکھنوی : شیخ حامد حسین لاہور ۱۹۷۰ء

کلیات میر کا تنقیدی مطالعہ : کلب علی خاں فائق "صحیفہ" جولائی ۱۹۶۲ء

* کلیات میر : " مجلس ترقی ادب

* کلیات میر : ڈاکٹر عبادت بریلوی

* کلیات سودا : ڈاکٹر شمس الدین صدیقی مجلس ترقی ادب

تصانیف سودا کی تدوین اور اشاعت : ایک تحقیقی جائزہ : ڈاکٹر شمس الدین صدیقی "اورینٹل کالج میگزین" جشن صد سالہ نمبر ۱۹۷۴ء

* کلیات شاہ نصیر : ڈاکٹر تنویر احمد علوی : پاکستان

کلیات شاہ نصیر : ایک تنقیدی جائزہ : عبدالرزاق قومی زبان کراچی ۱۹۷۲ء

* کلیات ذوق : ڈاکٹر تنویر احمد علوی پاکستان

ذوق کا فارسی کلام : آغا محمد باقر "ادبی دنیا" لاہور دور پنجم شمارہ دہم

کلام ولی : قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی "اردو" جولائی ۱۹۵۵ء

کلام ولی : ڈاکٹر علی جعفری "نوائے ادب" بمبئی جولائی ۱۹۵۲ء

کلام ولی : محمد اکرام چغتائی "اردو" جنوری ۱۹۶۷ء

واجد علی شاہ کی نادر تصنیف "بنی" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "نقوش" جوبلی نمبر

نوادر داغ : فاضل زیدی "اردو نامہ" اپریل ۱۹۷۰ء تا اپریل ۱۹۷۴ء

نوائے دبیر : مرتضیٰ حسین فاضل "ماہ نو" دسمبر ۱۹۷۵ء

* کلیات ولی : ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی طبع سوم کراچی ۱۹۵۴ء

ارمغان دل (دل عظیم آبادی) : ظفر الحسن "مہر نیمروز" کراچی اپریل ۱۹۷۱ء

* ایجاد رنگین : از سعادت یار خاں رنگین :

* چار باغ : " "

* رسالہ نادری : " "

* مجالس رنگین : " "

* اخبار رنگین : " "

امیر مینائی کی نظمیں : کریم الدین احمد "اردو" جنوری ۱۹۵۸ء

ایک رقاصہ کا عروج و زوال از نظیر اکبر آبادی : مولوی عبدالحق "اردو" جنوری ۱۹۵۸ء

ولی کا غیر مطبوعہ کلام : ڈاکٹر معین الدین عقیل "اردو" اپریل ۱۹۷۶ء

انتخاب کلام میر حسن : ڈاکٹر عبادت بریلوی "فنون" اکتوبر ۱۹۶۳ء

کلام انعام اللہ خاں یقین : محمد اکرام چغتائی "اردو" جولائی ۱۹۶۸ء

* غزلیات میر حسن : مرزا علی حسن لکھنؤ ۱۹۴۴ء

* کلیات قائم چاندپوری : ڈاکٹر اقتدا حسن (جلد اول-دوم) ۱۹۶۵ء

* کلیات انشا : خلیل الرحمٰن داؤدی ۱۹۶۹ء

کلیات میر : کلب علی خاں فائق ۱۹۷۶ء
* کلیات مومن : " ۱۹۶۴ء
* کلیات شیفتہ : " ۱۹۶۵ء
* کلیات سالک : " ۱۹۶۶ء
* کلیات نظام : " ۱۹۶۵ء
* کلیات نسیم : " ۱۹۶۵ء
* کلیات قلق : " ۱۹۶۶ء
* کلیات سودا : ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ۱۹۷۶ء
* کلیات آتش : مرتضیٰ حسین فاضل ۱۹۷۱ء
* کلیات جرأت : ڈاکٹر اقتدا احسن ۱۹۷۲ء
* کلیات نظم حالی : ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ۱۹۶۸ء
* جذبات نادر (نادر کاکوروی) : ممتاز حسین کراچی ۶۱ ۱۹ء
* غلام بھیک نیرنگ کا مجموعہ کلام : ڈاکٹر معین الدین عقیل کراچی ۱۹۸۳ء
* نغمۂ فردوس (مجموعہ کلام خوشی محمد ناظر) : ڈاکٹر عبدالحمید لاہور ۱۹۷۱ء
مجموعہ کلام اردو (یوسف علی خاں) : ڈاکٹر محمد باقر
بیاض مرزا جان طپش : ڈاکٹر نجم الاسلام "نقوش" شمارہ نمبر ۱۰۸

<u>اصناف شاعری</u> : مثنوی

مہ جبیں وملا : سخاوت مرزا "اردو ادب" ۱۹۶۱ء
* کام روپ وکلا : گارساں دتاسی (بزبان فرانسیسی)
دریائے عشق کا ایک ماخذ : غلام مصطفیٰ خاں "اردو" اپریل ۱۹۵۱ء
گلزار نسیم اور اس کے ماخذ قضیہ : ڈاکٹر فرمان فتح پوری "صحیفہ" جولائی ۱۹۶۸ء
باغ و بہار : خورشید علی حیدر آبادی "مخزن" نومبر، دسمبر ۱۹۰۸ء
گلزار نسیم : افسر امروہوی "نیا دور" کراچی شمارہ نمبر ۵ ۵۵ ـــ ۵۶

* کربل کتھا: ڈاکٹر مختارالدین آرزو و ملک رام ۱۹۶۵ء
گر بہ نامہ : ڈاکٹر نجم الاسلام "صحیفہ" اپریل ۱۹۶۸ء
گر بہ نامہ کا مصنف: ڈاکٹر نجم الاسلام "صحیفہ" اپریل ۱۹۷۱ء
جنگ نامہ: ایک جائزہ : شریف الحسن "اردو نامہ" اکتوبر ۱۹۶۳ء
* رسالہ محمود خوش دہاں بیجاپوری : خواجہ حمید الدین شاہد کراچی ۱۹۶۹ء
دیباچہ گلزار عشق (محمد باقر آگاہ) ڈاکٹر جمیل جالبی "صحیفہ" جنوری ۱۹۷۳ء
گلزار دانش: ایک تعارف : ڈاکٹر عبادت بریلوی "اورینٹل کالج میگزین"
شمارہ نمبر ۱۸۸-۱۸۹-۱۹۴-۱۹۵-
* مختصر کہانیاں (حیدری) : ڈاکٹر عبادت بریلوی کراچی ۱۹۶۴ء
* ہفت گلشن : (مظہر علی خاں ولا): ڈاکٹر عبادت بریلوی کراچی ۱۹۶۴ء
* مادھونل کام کندلا : " " "
* چار گلشن : (بینی نرائن جہاں) : " " ۱۹۶۷ء
* رسالہ کائنات (خلیل علی خاں رشک) " " ۱۹۵۶ء
* گلزار چین " " " " " ۱۹۶۶ء
* اخبار رنگین : (سعادت یار خاں رنگین): ڈاکٹر معین الحق " ۱۹۶۲ء
مثنوی بہارستان عشق از مسرور: سخاوت مرزا "اردو" جنوری ۱۹۶۶ء
مثنوی جامع الحقائق از سید احمد قادری الحسینی سبز پوش : سخاوت مرزا "اردو نامہ" جنوری ۱۹۷۰ء
من موہن از عین الحق آزاد حیدر آبادی: سخاوت مرزا "اردو نامہ" جون ۱۹۶۷ء
ریاض الحسنین از عشرت بریلوی "
جنگ روپ : نول سنگھ : " "اردو نامہ" اپریل ۱۹۷۰ء
سراپا سوز : قاضی محمد صادق اختر بنگالی ثم لکھنوی: "اردو نامہ" جولائی ۱۹۷۳ء
چھند چھنداں : خوب محمد چشتی : ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی "اورینٹل کالج میگزین" بمبئی ۱۹۵۲ء
یوسف زلیخا : شیخ احمد دکنی : ڈاکٹر محمد جاوید اقبال۔ "اردو نامہ" جولائی ۱۹۷۴ء

خوب ترنگ : خوب محمد چشتی : ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "اردو" جولائی ۱۹۵۲ء

* راحت جاں : میر محمد باقر آگاہ : ڈاکٹر عبادت بریلوی

راحت جاں : " " "ماہ نو" جولائی، اگست ۱۹۶۳ء

احسن القصص (یوسف زلیخا) : از ہاشمی بیجاپوری : ڈاکٹر محمد باقر

زہرہ و بہرام : بھگونت رائے راحت : ڈاکٹر محمد باقر

قصہ دلآرام : غوث ابن عظیم "

قصہ مہتاب شاہ و شہزادۂ صف شکن : از میر صادق علی : ڈاکٹر محمد باقر

مراد المحبتین : پیر مراد شاہ لاہوری : ڈاکٹر محمد باقر "اردو" ۱۹۴۴ء

مجموعہ بارہ قصہ : ڈاکٹر محمد باقر

قصہ عشق افزا : از فراسو "

* مثنویات میر حسن : (جلد اوّل) ڈاکٹر وحید قریشی

مثنویات میر حسن : ڈاکٹر وحید قریشی مشمولہ "نذر رحمان" ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لاہور ۱۹۶۶ء

سحر البیان : میر حسن : ڈاکٹر معین الدین عقیل "اردو" جنوری ۱۹۷۴ء

* من سمجھاون : ڈاکٹر سیدہ جعفر

* سنگھاسن بتیسی : فقیر : افسر امروہوی کراچی ۱۹۸۴ء

مثنوی "در معنوی" خواجہ غیاث اللہ فتوت : پروفیسر شفقت رضوی "اردو نامہ" اپریل ۱۹۷۴ء

ارشاد نامہ : سخاوت مرزا "اردو ادب" علی گڑھ شمارہ نمبر ۴ ۱۹۶۱ء

خالق باری : افسر امروہوی "اردو" خسرو نمبر ۱۹۷۵ء

مثل خالق باری : افسر امروہوی "اردو" قسط اوّل جولائی ۱۹۸۳ء قسط دوم اکتوبر ۱۹۸۳ء

* خاور نامہ : رستمی بیجاپوری : نصیر الدین ہاشمی کراچی ۱۹۶۸ء

تتمہ پھولبن : شیخ چاند حسین "اردو" (قسط اوّل) اپریل ۱۹۶۸ء قسط دوم) جولائی ۱۹۶۸ء

* پھولبن : " کراچی ۱۹۵۵ء

* من لگن قاضی محمود بحری : سخاوت مرزا کراچی ۱۹۵۵ء

* نصرتی کی مثنوی "گلشن عشق" مولوی عبدالحق کراچی ۱۹۵۲ء
* مثنوی کدم راؤ پدم راؤ : ڈاکٹر جمیل جالبی کراچی ۱۹۷۳ء (رحمٰن)
تعارف مثنوی کدم راؤ پدم راؤ : نصیرالدین ہاشمی "معارف" اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۳۲ء
* مثنوی کدم راؤ پدم راؤ فخرالدین نظامی)
امیر مینائی کی ایک عاشقانہ مثنوی : کریم الدین احمد "اردو" جولائی ۱۹۶۲ء
* نوسرہار: شاہ شرف الدین اشرف بیابانی: افسر امروہوی کراچی ۱۹۸۲ء
فقہ ہندی : عبداللہ امین : ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں - "اردو" اکتوبر ۱۹۵۹ء
* رمزالعشق : سید غلام قادر شاہ
* خواب وخیال : میر اثر
* چرخی نامہ : سید غلام قادر شاہ : گوہر نوشاہی لاہور ۱۹۷۲ء
* عاقبت بخیر : سید ساجد علی فنائی : افسر امروہوی کراچی ۱۹۸۱ء
بزم عشرت : ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار "صحیفہ" لاہور جولائی ۱۹۷۳ء
* جنگ نامہ آصف الدولہ نواب رامپور از خلیفہ محمد معظم عباسی : ڈاکٹر محمد ایوب قادری کراچی ۱۹۸۰ء
* تسکوہ فرنگ : آغا جو شرف : ڈاکٹر عبادت بریلوی لاہور ۱۹۷۳ء
خانہ میر حسن : میر حسن : " "افکار" کراچی جولائی ۱۹۶۴ء
خوان نعمت : " " "ماہ نو" کراچی اکتوبر ۱۹۶۴ء
* مثنویات میر حسن : ڈاکٹر وحید قریشی (جلد اول) ۱۹۶۶ء
* بہار دانش : مرزا جان طپش : خلیل الرحمٰن داؤدی ۱۹۶۳ء
بشمول قصہ لعل وگہر : " مشمولہ اردو کی قدیم منظوم داستانیں ۱۹۶۷ء
قصہ نازنین وخان والاشان جعفر خاں : خلیل الرحمٰن داؤدی مشمولہ اردو کی قدیم منظوم داستانیں ۱۹۶۷ء
قصہ قاضی اور چور کا : " " " "
قصہ چوہے اور بلی کا : " " " "
قصہ لڑائی بیر الالم کا : " " " "

قصۂ جمجمہ بادشاہ : خلیل الرحمٰن داؤدی مشمولہ "اردو کی قدیم منظوم داستانیں" ۱۹۶۷ء
قصۂ زیتون و محمد حنیف : " " "
قصۂ تنبولی کی عورت کا : " " "
قصۂ تمیم انصاری کا : " " "
وفات نامہ حضرت خاتون : " " "
قصۂ کالی اور گوری کا : " " "

* مہتاب داغ : سید سبط حسن ۱۹۶۲ء
* ہشت عدل اور واسوخت از محمود بیگ راحت : گوہر نوشاہی ۱۹۷۱ء
نو بہار : مرزا ہادی رسوا : عشرت رحمانی "اردو نامہ" جولائی ۱۹۶۱ء
امید و بیم : " " " " ۱۹۶۲ء

مرثیہ

متین برہان پوری کے مرثیے : ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں "اردو" اپریل ۱۹۵۲ء
* بیاض مراثی : افسر امروہوی کراچی ۱۹۷۵ء
* منتخب مراثی انیس : مرتضیٰ حسین فاضل ۱۹۷۳ء

دیگر اصناف شاعری

* مسدس رنگین : تحسین سروری کراچی ۱۹۵۲ء
ترانہ ۔ دوبیتی، رباعی : عندلیب شادانی مشمولہ تحقیقات ۔ بریلی
میر کا ایک قصیدہ : کلب علی خاں فائق "اردو" جنوری ۱۹۶۸ء
رباعی کیوں کر : ڈاکٹر فرمان فتح پوری "صحیفہ" ستمبر ۱۹۵۸ء
ریختی : عندلیب شادانی مشمولہ "تحقیق کی روشنی میں" لاہور ۱۹۶۳ء
ریختی : سید صفدر حسین "صحیفہ" اپریل ۱۹۶۱ء
نعت گوئی : افسر امروہوی "ماہ نو" جولائی ۱۹۶۳ء
اردو میں شہر آشوب : ڈاکٹر قمقام حسین جعفری "اردو" ۷۷-۱۹۷۶ء

مخمس در احوال شاہجہاں آباد از جعفر علی حسرت: مولوی عبدالحق "اردو" اکتوبر ۱۹۵۷ء

اُردو کے قدیم مناقب: سخاوت مرزا "اردو" جولائی ۱۹۵۸ء

شاعری: تاریخ و تنقید

* اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر: ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کراچی ۱۹۷۵ء (رحمٰن)
* اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر: ڈاکٹر محمد حسن
* اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لاہور ۱۹۶۶ء (رحمٰن)
* کلاسکی ادب کا تحقیقی مطالعہ: ڈاکٹر وحید قریشی لاہور ۱۹۶۵ء
* شمالی ہند میں اُردو مثنوی کا ارتقاء: ڈاکٹر سید محمد عقیل

اردو کی قدیم مذہبی مثنویاں: الف ۔ د ۔ نسیم "ادبی دنیا" دور ہفتم شمارہ ہفتم

اردو مرثیہ کے پانچ سو سال: عبدالروف عروج "نیا راہی" کراچی خاص نمبر ۱۹۶۱ء

قدیم اُردو میں مرثیہ نگاری: خواجہ حمید الدین شاہد "ماہ نو" اپریل ۱۹۶۸ء

* اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقا: ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی ۱۹۶۴ء
* اردو میں قطعہ نگاری: ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا لاہور ۱۹۷۷ء
* فارسی شاعری کا اثر اردو شاعری پر: ڈاکٹر عبدالحق ڈھاکہ ۱۹۵۷ء

اردو نثر: تاریخ

شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقاء میں علمائے کرام کا حصہ: ڈاکٹر محمد ایوب قادری۔

کراچی یونیورسٹی (شائع نہیں ہوا ہے)

اردو نثر کے دہلوی دبستان: ڈاکٹر عبدالرحیم جاگیردار

مشرقی بنگال میں اُردو نثر: محمد صدرالحق مشمولہ "انکشاف" کراچی ۱۹۸۱ء

قدیم اردو

دیباچہ تفسیر مرادیہ: ڈاکٹر نجم الاسلام "نقوش" شمارہ نمبر ۱۰۵

جنگ نامہ جنگی خاں: سخاوت مرزا "اردو نامہ" جولائی ۱۹۶۴ء

انوار العاشقین: سید حسین علی شاہ قادری: سخاوت مرزا "اردو نامہ" جولائی ۱۹۷۲ء

خوان یغما دکھنی : سخاوت مرزا "اردو" جنوری و اپریل ۱۹۵۳ء

ملفوظات شیخ وجیہ الدین گجراتی : ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں "معارف" اعظم گڑھ جون ۱۹۵۰ء

اُردوے قدیم کے متعلق چند تصریحات : ڈاکٹر محمد باقر "اورینٹل کالج میگزین" فروری ۱۹۴۱ء

* گنج شریف : حاجی سید محمد نوشہ گنج بخش قادری

اُردو کی ایک قلمی بیاض : ڈاکٹر جمیل جالبی "اردو" اپریل ۱۹۵۴ء

رباعیات نصرتی : افسر امروہوی "اردو" جنوری ۱۹۶۶ء

قدیم دکنی شعراء کے چند نایاب مرثیے : ڈاکٹر جمیل جالبی "اردو" جون ۱۹۶۹ء

مثنوی : "برہ بھبھوکا" : افسر امروہوی "صحیفہ" اکتوبر ۱۹۷۲ء

* اردو کی دو قدیم مثنویاں : نائب حسین نقوی لاہور ۱۹۷۰ء

شمالی ہند کی سب سے قدیم مثنوی : مولوی عبدالحق "اردو" اپریل ۱۹۵۱ء

مثنوی "معجزہ انار" سید نجیب اشرف ندوی "اردو" جنوری ۱۹۵۴ء

مائل دہلوی کا ایک اہم تاریخی قطعہ : محمد اکرام چغتائی "فنون" لاہور دسمبر ۱۹۶۶ء

* سرور سلطانی : رجب علی بیگ سرور : آغا سہیل ۱۹۷۲ء

* نتائج المعانی : محمود بیگ راحت : گوہر نوشاہی ۱۹۶۵ء

* اخوان الصفا : شیخ اکرام علی : ڈاکٹر احراز نقوی ۱۹۶۶ء

* جوہر اخلاق : جیمز فرانسس کارکرن : ڈاکٹر محمد باقر ۱۹۶۳ء

* قصّۂ اگر گل : سعادت خاں ناصر : خلیل الرحمٰن داؤدی ۱۹۶۷ء

* نورتن : محمد بخش مہجور : " ۱۹۶۲ء

* سروش سخن : فخر الدین حسین سخن : " ۱۹۶۳ء

* نقلیات : گل کرسٹ : ڈاکٹر عبادت بریلوی لاہور ۱۹۶۹ء

* نقلیات : گل گرسٹ : پروفیسر وقار عظیم ۱۹۶۶ء

* بیتال پچیسی : مظہر علی خاں ولا : گوہر نوشاہی ۱۹۶۵ء

* خرد افروز : حفیظ الدین احمد : ڈاکٹر عابد علی عابد ۱۹۶۳ء

* سکنتلا : کاظم علی جواں : ڈاکٹر محمد اسلم قریشی ۱۹۶۳ء
* باغ اردو : شیر علی افسوس : ڈاکٹر اسلم قریشی ۱۹۶۵ء
* آرائش محفل : حیدری : کلب علی خاں فائق ۱۹۶۵ء
* توتا کہانی : " : ڈاکٹر اسلم قریشی ۱۹۶۵ء
* اخلاق ہندی : میر بہادر علی حسینی : ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۶۳ء
* اردوئے قدیم : دکن اور پنجاب میں : ڈاکٹر محمد باقر لاہور ۱۹۷۲ء
* مثنوی کدم راؤ پدم : ڈاکٹر جمیل جالبی

نسخۂ مفرح الضحک : ڈاکٹر نجم الاسلام نقوش شمارہ نمبر ۱۰۵

قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض : سخاوت مرزا "مجلّہ اردو" اپریل ۱۹۵۴ء

* کربل کتھا : ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۱۹۶۱ء

تاج الحقائق : سخاوت مرزا "النور" حیدرآباد شمارہ نمبر۶ جلد نمبر۲ ۱۳۴۳ء

من سمجھاون : تنقیدی و تحقیقی جائزہ : سخاوت مرزا "اردو ادب" شمارہ نمبر۱ ۱۹۶۷ء

* من سمجھاون : شاہ تراب چشتی : سیدہ جعفر

کام روپ و کلا : ایک جائزہ : ضمیر نیازی "نیادور" کراچی شمارہ ۶۹-۰۰

خاورنامہ : خواجہ حمید الدین شاہد "صحیفہ" اکتوبر ۱۹۶۲ء

خاورنامہ : رستمی بیجاپوری ایک تعارف : سخاوت مرزا "اردو نامہ" دسمبر ۱۹۷۵ء

لوری نامہ دائم : " " مارچ ۱۹۶۲ء

* دستور العشاق : گرین شیلڈز : برلن، ۱۹۲۶ء

سب رس کے ماخذ اور مماثلات : عزیز احمد "اردو" جنوری اپریل ۱۹۵۰ء

صراط المستقیم : سخاوت مرزا "اورینٹل کالج میگزین" نومبر ۱۹۶۰ء

* تاج الحقائق : (وجہی) نورالسعید اختر

سب رس میراں جی شمس العشاق یا تاج الحقائق وجہی : سخاوت مرزا "اردو نامہ" جنوری ۱۹۷۱ء

* نوطرز مرصع : میر عطا حسین تحسین

دیباچہ گلزار عشق : محمد باقر آگاہ "صحیفہ" جنوری ۱۹۷۳ء

برہنوں کے نمونے : سخاوت مرزا "اردونامہ" جولائی ۱۹۷۰ء

* دیوان حسن شوقی : ڈاکٹر جمیل جالبی۔

* دیوان نصرتی :

* پھولبن (ابن نشاطی) : دیوان سنگھ چوہان، پونا ۱۹۶۶ء (ہندی میں)

* " " پروفیسر عبدالقادر سروری مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات ۱۹۳۷ء

* " " شیخ چاند ابن حسین کراچی ۱۹۵۵ء

* " " اکبرالدین صدیقی دہلی ۱۹۷۸ء

* مثنوی نل دمن : (احمد سرادی) ڈاکٹر سید عبداللہ کراچی ۱۹۷۸ء

" " " "اورینٹل کالج میگزین" نومبر ۱۹۴۱ء

تحقیق

دستاویزی تحقیق : ڈاکٹر تبسم کاشمیری "اورینٹل کالج میگزین" شمارہ ۲۲۴

دستاویزی طریق تحقیق : سید جمیل احمد رضوی مجلہ تحقیق لاہور شمارہ نمبر ا جلد نمبر ۵ ۱۹۸۳ء

* حوالہ جاتی خدمات : نسیم فاطمہ کراچی ۱۹۷۸ء

ادبی تحقیق کے بنیادی اصول : ڈاکٹر جمیل جالبی اکادمی لکھنؤ مارچ ۱۹۸۳ء

ادبی تحقیق کے بنیادی اصول : ڈاکٹر عبادت بریلوی "افکار" کراچی جنوری ۱۹۵۸ء

* یورپ میں تحقیقی مطالعے : ڈاکٹر آغا افتخار حسین لاہور ۱۹۶۷ء

تحقیق اور اس کا طریقہ کار : ڈاکٹر عندلیب شادانی "صحیفہ" لاہور جولائی ۱۹۶۵ء

فن تحقیق : ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں "نقوش" لاہور جنوری ۱۹۶۶ء

اردو ادب اور تحقیق : سید مظفر علی "نقوش" لاہور ۱۹۶۱ء

تحقیق و تنقید کے مقامات کا اتصال : ڈاکٹر سید عبداللہ "اردونامہ" کراچی اپریل ۱۹۶۰ء

تحقیق و تنقید : " "نیا دور" کراچی شمارہ ۵-۶، ۱۹۵۶ء

خواجہ میر درد کے کلام میں تصوف کی تلاش : الف۔ د۔ نسیم اورینٹل کالج میگزین" مئی ۱۹۵۹ء

* کلاسکی ادب کا تحقیقی مطالعہ : ڈاکٹر وحید قریشی

پاکستان میں اردو تحقیق، جائزہ مسائل اور تجاویز: ڈاکٹر معین الدین عقیل "اخبار اردو" کراچی، اپریل ۱۹۸۳ء

تاریخ اردو ادب

* اردو ادب کی تاریخ: (انگریزی زبان میں) محمد صادق لندن ۱۹۶۴ء
* ادبیات سرحد اردو ادب: (جلد سوم) فارغ بخاری پشاور ۱۹۵۵ء

جزائر انڈمان نکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات: ڈاکٹر محمد ایوب قادری "اردو" جنوری ۱۹۶۸ء

عدن میں اردو: رحمت اللہ ذوق "اردو" جنوری ۱۹۵۵ء

* بلوچستان میں اردو: انعام الحق کوثر لاہور ۱۹۶۸ء
* تاریخ ادب: ڈاکٹر عبدالقیوم کراچی ۱۹۶۱ء
* سندھ میں اردو کا ارتقاء: ڈاکٹر شاہدہ بیگم کراچی ۱۹۸۰ء (رحمن)
* سندھ میں اردو شاعری: ڈاکٹر نبی بخش بلوچ حیدر آباد ۱۹۷۰ء

بنگال میں اردو کا طلوع: محمد صدر الحق مشمولہ "انکشاف" کراچی ۱۹۸۱ء

* سہلٹ میں اردو: عبدالجلیل بسمل کراچی ۱۹۸۱ء

پنجاب میں اردو: مزید تحقیق: محمد اکرام چغتائی "فنون" مئی ۱۹۶۹ء

* دکن میں اردو: نصیر الدین ہاشمی
* پنجاب میں اردو: محمود شیرانی
* بیسویں صدی کا اردو ادب: (انگریزی زبان میں) محمد صادق کراچی ۱۹۸۳ء
* تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و بھارت: (انیس 19 جلدوں میں) شعبہ تاریخ ادبیات، جامعہ پنجاب
* تاریخ ادب اردو (دو جلدیں) ڈاکٹر جمیل جالبی لاہور ۱۹۷۵ء-۱۹۸۲ء (رحمن)
* مشرقی بنگال میں اردو: اقبال عظیم ڈھاکہ ۱۹۵۴ء
* تحریک آزادی میں اردو کا حصہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل کراچی ۱۹۷۶ء (رحمن)

میراں تالپور کے عہد میں اردو کی ترقی: پروفیسر معین الدین دردائی "اردو نامہ" قسط وار جولائی اکتوبر ۱۹۸۳ء اپریل جولائی ۱۹۷۴ء

* یورپ میں اردو کے مراکز: سلطان محمود حسین لاہور ۱۹۸۴ء
* یورپ میں اردو: ڈاکٹر آغا افتخار حسین لاہور ۱۹۶۸ء

لسانیات

* اردو زبان کا ارتقاء: ڈاکٹر شوکت سبزواری ڈھاکہ ۱۹۵۶ء (رحمٰن)
* اردو لسانیات: 〃 〃 کراچی ۱۹۶۶ء

لفظ اردو کی تاریخ: ڈاکٹر محمد صابر "اردو نامہ" اپریل ۱۹۶۲ء

اردو میں ترکی اور منگولی الفاظ: ڈاکٹر محمد صابر "اردو نامہ" جولائی ۱۹۶۳ء

اردو زبان کے ترکی عناصر: "صحیفہ" جولائی ۱۹۷۲ء

* اردو اور بنگالی کے مشترک الفاظ: ڈاکٹر محمد شہید اللہ ۱۹۵۹ء

اردو ہندستانی، ہندی یا ہیتہ ہندوئی: ڈاکٹر محمد باقر "اردو" جنوری ۱۹۶۸ء

اردو کے مختلف نام: پروفیسر سید شبیر علی کاظمی "اردو" اکتوبر ۱۹۶۶ء

اردو ہندی اور ہندستانی: ڈاکٹر شوکت سبزواری "اردو" اکتوبر ۱۹۶۷ء

* اردو زبان کا ارتقاء: ڈاکٹر شوکت سبزواری

* A HISTORY OF URDU LITERATURE GRAHAM BELLEY 1923 LONDON

* اردو سندھی کے لسانی روابط: ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی لاہور ۱۹۷۰ء (رحمٰن)

اردو زبان اور اس کے مختلف نام: محمود شیرانی "اورینٹل کالج میگزین" مئی ۱۹۲۹ء

اردو زبان کے آغاز وارتقاء کے مختلف نظریے: حبیب اللہ غضنفر مشمولہ "تاریخ اردو ادب" (جلد اوّل) مرتبہ عبد القیوم کراچی ۱۹۶۱ء

اردو زبان کا اصلی مولد سندھ: پیر حسام الدین راشدی "اردو" کراچی اپریل ۱۹۵۱ء

اردو اور بنگلہ زبانوں میں انڈو آریائی نسل کے مشترک الفاظ: پروفیسر شبیر علی کاظمی "اردو" کراچی اکتوبر ۵۷ء جنوری، جولائی، اکتوبر ۱۹۵۸ء

* اردو ہندی تنازع کا جائزہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری اسلام آباد ۱۹۷۷ء

* انگریزوں کی لسانی پالیسی : سید مصطفیٰ علی بریلوی کراچی ۱۹۷۰ء
* اردو کی کہانی : ڈاکٹر سہیل بخاری لاہور ۱۹۷۵ء
اردو کی زبان کا آغاز : " "نقوش" جنوری ۱۹۶۳ء
اُردو میں قرآن وحدیث کے محاورات : ڈاکٹر عبدالحق بصورت مقالہ "نیا دور" کراچی شمارہ ۴۹-۳۰
* اردو میں قرآن وحدیث کے محاورات : " (جلد اوّل-دوم) اسلام آباد ۱۹۸۰ء
* ترکی اردو لغت : ڈاکٹر محمد صابر
اصولیات : ڈاکٹر شہیداللہ اردو نامہ کراچی نومبر ۱۹۶۰ء
پنجاب میں اُردو: اردو کی کہانی شیرانی کی زبانی : ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار "اورینٹل کالج میگزین" شمارہ نمبر ۲۲۲-۲۲۳
* پراچین اردو : پروفیسر سید شبیر علی کاظمی کراچی ۱۹۸۲ء
* گروگرنتھ اور اردو : عنایت اللہ گیانی لاہور ۱۹۶۶ء
چند قدیم لغات : ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "اورینٹل کالج میگزین" مئی ۱۹۴۹ء
قدیم فارسی فرہنگوں میں اردو عناصر : ڈاکٹر نذیر احمد (قسط اوّل) "اردو" کراچی جولائی ۱۹۶۷ء
" " " (قسط دوم) ارمغان مالک دہلی ۱۹۷۱ء
قدیم عربی تصانیف میں ہندستانی الفاظ : ڈاکٹر سید عبداللہ "اورینٹل کالج میگزین" مئی ۱۹۴۳ء
فارسی پر اردو کا اثر : ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں "معارف" اعظم گڑھ فروری مارچ ۱۹۴۱ء
* ثقافتی اردو : ڈاکٹر عبدالحق "نیا دور" کراچی (بصورت مقالہ) سن موجود نہیں
* ہمارا علم وادب : ڈاکٹر عبدالحق حیدرآباد ۱۹۸۵ء
* ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق : ڈاکٹر مہر عبدالحق بہاولپور ۱۹۶۷ء
قدیم دکنی اور اردو کا تقابلی مطالعہ : ڈاکٹر سہیل بخاری "اردو نامہ" کراچی اکتوبر ۱۹۶۴ء
* تاریخ اردو ادب : ڈاکٹر عبدالقیوم کراچی ۱۹۶۱ء
* داستان زبان اردو : ڈاکٹر شوکت سبزواری کراچی ۱۹۶۰ء
داستان زبان اردو : ڈاکٹر شوکت سبزواری "اردو" کراچی اپریل ۱۹۵۸ء

* مقدمہ تاریخ زبان اردو : ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۱۹۴۷ء

* پنجاب میں اردو : محمود شیرانی ۱۹۲۸ء

* دکن میں اردو : نصیر الدین ہاشمی

* INTRODUCTION TO RESEARCH — Tyrus Hillway, Boston 1974

* GROWTH OF URDU LANGUAGE LITERATURE DURING SAYYID LODI PERIOD. — Journal of the Asiatic Society of Pakistan, Vol.3, Page-43 1958.

لفظ "اب" کی تحقیق "اب" کی سرگذشت : پروفیسر غضنفر "زبان و ادب" کراچی ۱۹۸۳ء

* لسانی مسائل : ڈاکٹر شوکت سبزواری کراچی ۱۹۶۲ء

* عورت اور اردو زبان : وحید نسیم کراچی ۱۹۷۹ء

* رسالہ گل کرسٹ : میر بہادر علی حسینی کلکتہ ۱۸۲۰ اور ۱۸۶۴ء

* ہندوستانی زبان کے قوائد : گل کرسٹ

* قواعد زبان اردو : گل کرسٹ : خلیل الرحمٰن داؤدی

* ہندوستانی گرامر : بنجمن سلیزے : مترجم ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لاہور ۱۹۷۷ء

اردو بمعنی زبان کے متعلق نئی تحقیق : محمد اکرام چغتائی اردو نامہ دسمبر ۱۹۶۶ء

* لغت کبیر (۲ جلدیں) "نامکمل" : مولوی عبدالحق "اردو" کراچی

* نسیم اللغات : نسیم امروہوی

* فرہنگ اقبال : نسیم امروہوی لاہور ۱۹۸۴ء

* علمی اردو لغت : وارث سرہندی

* استقاقی لغت : ڈاکٹر سہیل بخاری "مجلہ اردو" کراچی

* ادات الفضلا (لغت) : قاضی خاں بدر محمد دھاروالی

* مفتاح الفضلا : " : محمد ابن داؤد

* مؤید الفضلا : " : محمد ابن لا

* دستور الصبیان " : نامعلوم

* فارسی شاعری کا اثر اردو شاعری پر : ڈاکٹر عبدالحق ڈھاکہ

کثیر الفوائد : مولانا شاہ محی الدین : سخاوت مرزا "اردو نامہ" دسمبر ۱۹۶۶ء

* ہندستانی لسانیات : ڈاکٹر محی الدین قادری زور ۱۹۳۲ء

تاریخ

بابر کا فارسی، ترکی اور اردو کلام : ڈاکٹر محمد صابر "اردو نامہ" اکتوبر ۱۹۶۲ء

* جنگ آزادی : واقعات و شخصیات : ڈاکٹر محمد ایوب قادری کراچی ۱۹۷۶ء

* قصص ہند : محمد حسین آزاد : مرتضیٰ فاضل ۱۹۶۱ء

قصّہ احوالِ روہیلہ : سید رستم علی بجنوری : ڈاکٹر نجم الاسلام "نقوش" شمارہ نمبر ۱۰۵

* مولانا جعفر تھانیسری کی تصنیف "تواریخ عجیب" ڈاکٹر محمد ایوب قادری کراچی ۱۹۶۲ء

سائنسی ادب

* اردو میں سائنسی ادب : خواجہ حمید الدین شاہد کراچی ۱۹۶۹ء

بچوں کا ادب

* اردو میں بچوں کا ادب : محمود الرحمٰن کراچی ۱۹۷۰ء

* بچوں کا ادب : تاریخ و تنقید : اسد ادیب ملتان ۱۹۷۲ء (رحمٰن)

ادبی ادارے

* انجمن پنجاب : تاریخ خدمات : ڈاکٹر صفیہ بانو تمنائی کراچی ۱۹۷۸ء (رحمٰن)

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ : ڈاکٹر معین الدین عقیل "افکار" برطانیہ میں اردو ایڈیشن

* تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور : غلام حسین ذوالفقار لاہور ۱۹۶۲ء

* اورینٹل کالج لاہور : اساتذہ کے تحقیقی، ادبی اور درسی خدمات : ڈاکٹر وحید قریشی (مشمولہ تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور۔ لاہور ۱۹۶۲ء) لاہور ۱۹۷۰ء

* تاریخ پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو : سید ہاشمی فرید آبادی کراچی ۱۹۵۳ء

* دلّی کالج : مولوی عبدالحق

دلّی کالج : پروفیسر شفقت رضوی "اردو" اپریل ۱۹۷۸ء

* جامعہ عثمانیہ: بدر شکیب کراچی ۱۹۷۱ء

علم آگہی: خاص نمبر (علمی اداروں کا جائزہ) ڈاکٹر سلمان شاہ جہاں پوری۔ دو خاص نمبر "نیشنل کالج" کراچی ۱۹۷۶ء، ۱۹۷۸ء

فورٹ ولیم کالج: ضمیر نیازی "افکار" برطانیہ میں اردو ایڈیشن

فورٹ ولیم کالج: سید سبط حسن "اردو" جنوری ۱۹۶۶ء

* گورنمنٹ کالج لاہور (انگریزی زبان میں): ڈاکٹر عبدالحمید لاہور ۱۹۶۴ء

مخطوطات، مطبوعات۔ مائکروفلم

فہرست مخطوطات ادارہ ادبیات اردو کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ: (جلد اول) سخاوت مرزا "ہندستانی ادب" حیدرآباد جنوری ۱۹۴۶ء

فہرست مخطوطات کتب خانہ نواب سالار جنگ کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ: ایک طالب علم (سخاوت مرزا) اردو اپریل ۱۹۵۷ء

* جائزہ مخطوطات اردو: (جلد اول) مشفق خواجہ

* تحقیقی نوادر: سید قمقام حسین جعفری کراچی ۱۹۷۴ء

* یورپ میں دکھنی مخطوطات: سید نصیر الدین ہاشمی

* وضاحتی فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ: سید نصیر الدین ہاشمی حیدرآباد

وضاحتی فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ: سید نصیر الدین ہاشمی "اردو"، کراچی اپریل ۱۹۵۷ء

* مقدمہ مخطوطات شاہان اودھ: محمد اکرام چغتائی کراچی ۱۹۷۳ء

* فہرست مخطوطات شاہان اودھ: اشپرنگر

* جائزہ مخطوطات اردو: مشفق خواجہ لاہور ۱۹۷۹ء

* مخطوطات انجمن ترقی اردو: سید سرفراز علی رضوی او رافسر امروہوی (جلد ۱-۶) کراچی (۸۶-۱۹۶۵ء)

* فہرست مخطوطات: (جلد دوم) محمد صدیق خاں ڈھاکہ ۱۹۶۸ء

* مخطوطات پیرس: ڈاکٹر آغا افتخار حسین کراچی ۱۹۶۷ء

* سندھ میں اردو مخطوطات: سید احمد علی زیدی لاہور ۱۹۶۹ء

فہارس مخطوطات و مطبوعات : ایک جائزہ : سید عارف نوشاہی "اورینٹل کالج میگزین" شمارہ ۱
* فہرست مخطوطات ذخیرہ شیرانی (۳ جلدیں) ڈاکٹر محمد بشیر حسین لاہور ۱۹۶۸ء - ۱۹۷۳ء
مخطوطات ذخیرۂ شیرانی کا ایک جائزہ : ڈاکٹر محمد بشیر حسین "اورینٹل کالج میگزین" شیرانی نمبر شمارہ ۲۲۲-۳
دکنی مطبوعات : سید ہاشمی فرید آبادی "اورینٹل کالج میگزین" اگست ۱۹۶۳ء
* مآخذات احوال شعراء و مشاہیر (جلد اول - دوم) سرفراز علی رضوی "انجمن ترقی اردو"
کراچی ۱۹۷۷ - ۸۱ء
* سندھ میں اردو مطبوعات : اسلام اختر و عبدالجمیل لاہور ۱۹۷۰ء
* ممالکت حیدر آباد : (اہم مطبوعات کا جائزہ) بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی ۱۹۶۷ء
اردو ادب کا دور اوّل (دکنی ادب کے اہم مخطوطات و مطبوعات کا جائزہ) "اردو نامہ"
کراچی جولائی ۱۹۶۱ء
دکنی (دکنی مطبوعات کا ذکر) : سید ہاشمی فرید آبادی "اورینٹل کالج میگزین" اگست ۱۹۶۳ء
مائکروفلم و روٹو گراف : کتب خانہ جامعہ پنجاب میں : سید جمیل احمد رضوی "مجلہ تحقیق" لاہور جلد ۲ شمارہ

اسلامیات

اردو میں مذہبی ادب : ڈاکٹر محمد ایوب قادری "اردو نامہ" دسمبر ۱۹۷۵ء
اردو کا دینی ادب ۱۸۵۷ء کے بعد : ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں - "ہمارا علم و ادب" حیدرآباد ۱۹۸۵ء

قرآنیات

قرآن حکیم کے قدیم ترین منظوم ترجمہ و تفسیر : ضمیر نیازی "اردو" اپریل ۱۹۷۵ء
قرآن حکیم کے قدیم اردو ترجمے : محمد مسعود احمد "فکر و نظر" اسلام آباد دسمبر ۱۹۷۱ء
قرآن حکیم کے قدیم اردو ترجمے : مولوی عبدالحق "اردو" جنوری ۱۹۳۷ء

MIYAR-O-TAHQIQ